

# شہاب نامہ

## قدرت اللہ شہاب

۱۹۹۸ء

• اقبال جرم

قدرت اللہ شہاب

۹ جون ۱۹۳۸ء سے میں نے باقاعدہ ایک ڈائری رکھنے کی طرح ڈالی۔ یہ روایتی روزنامچہ کی صورت میں نہ تھی بلکہ میں نے اپنے ایک خود ساختہ شارٹ پینڈ (مختصر نویسی) میں ہر اس واقعہ یا احوال کو نوٹ کرنا شروع کر دیا جو میرے نزدیک کسی خاص اثر یا اہمیت کے حامل تھے۔ رفتہ رفتہ یہ میری عادت ثانیہ بن گئی۔

ایک روز میں نے اپنے ان کاغذات کا لپنہ ابن اثناء کو دکھایا، تو وہ بہت ہنسا۔ میری مختصر نویسی میں درج کی ہوئی کوئی بات تو اس کے پلے نہ پڑی لیکن یہ ضرور پوچھا کر ۹ جون کی تاریخ سے یہ ڈائری شروع کرنے میں کیا راز ہے۔ اس وقت تو میں نے اسے کچھ نہ بتایا۔ البتہ جو صاحب اس کتاب کا آخری باب ”چھوٹا منہ بڑی بات“ پڑھنے کا بوجھ برداشت کر لیں گے، ان پر اس تاریخ کی حقیقت از خود منکشف ہو جائے گی۔

کچھ عرصہ بعد ابن اثناء ایک مملک یماری میں بیٹلا ہو کر علاج کی غرض سے لندن چلا گیا۔ اس کی وفات سے دو ڈھائی ماہ قبل میں اسے ملنے لندن گیا۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ ایک روز اچانک ابن اثناء نے کسی قدر مزاجیہ انداز میں اپنی زندگی کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور پھر سمجھیدہ ہو کر کہنے لگا کہ اگر کسی ترکیب سے اسے دوبارہ دنیاوی زندگی مل جائے تو اسے وہ کس طرح گزرانا چاہے گا۔ اس کی تشنہ تکمیل تمناؤں، آرزوؤں اور امکنگوں کی تفصیل اتنی طویل تھی کہ اسے ناتے آدمی رات بیت گئی۔ اس کے

بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تمہیں دوبارہ زندگی نصیب ہو تو اسے کس طرح بسر کرنا چاہو گے؟

میں نے مختصرًا جواب دیا کہ بہت سی کچھ فہمیوں، کمزوریوں، خطا کاریوں اور غفلتوں کی اصلاح کر کے میں دوسری زندگی بھی مجموعی طور پر ویسے ہی گزارنا چاہوں گا جیسے کہ موجودہ زندگی گزار رہا ہوں۔

یہ سن کر ابن انشاء چوکنا ہو گیا اور کافنڈ پنسل ہاتھ میں لے کر سکول ماشر کی طرح حکم دیا۔ ”وجہات بیان کرو، تفصیل سے۔“

میں خود احتسابی کی کدائی سے اپنا اندر اور باہر کرید کرید کر بوتا رہا اور ابن انشاء ایس ایچ او کی طرح ایف آئی آر کے طور پر میرا بیان لکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی فہرست یہ تھی۔

دین کے بارے میں میں کبھی شک و شبہ یا تذبذب میں گرفتار نہیں ہوا۔ دین کے متعلق میرا علم محدود اور عمل محدود تر ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنی بے نیازی سے مجھے اسلام کی بعض جھلکیوں کی نعمت سے محروم نہیں رکھا۔

ایک دور افتادہ، پس ماندہ اور سادہ ماحول سے نکل کر میں نے اپنے زمانے کی سب سے بڑی سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں حصہ لیا اور اللہ نے مجھے کامیابی عطا فرمائی۔ سروس کے دوران میں نے کبھی اپنی پوسٹنگ یا ٹرانسفر کے لیے کسی قسم کی کوشش، سفارش یا خوشامد سے کام نہیں لیا۔ اس کے باوجود مجھے اچھے سے اچھا عملہ نصیب ہوتا رہا۔

ملازمت کے دوران میں نے دانستہ طور پر کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی جائز تنخواہ کے علاوہ میں نے کبھی کسی حکومت سے مالی یا زرعی اراضی یا پلاٹ وغیرہ کی شکل میں کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایک بار سربراہ مملکت نے مجھے آٹھ مرلے نہیں کا انعام دینے کی پیشکش کی۔ جب میں نے اسے قبول نہ کیا تو انہوں نے کسی قدر ناراضگی سے اس کی وجہ

پوچھی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ انسان کو انجام کار دو ڈھائی گز نہیں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہر کس و ناکس کو کہیں نہ کہیں مل ہی جاتی ہے۔

URDU4U.COM  
لازمت کے دوران میں نے اپنا کام ایمانداری اور بے خوفی سے کیا۔ اس کی پاداش میں چار بار استغفاری دینے کی نوبت آئی۔ چوتھی بار بعد از خرابی بسیار منظور تو ہو گیا لیکن میری پشن اور پراویڈنٹ فنڈ غالباً سزا کے طور پر تین برس تک رکے رہے۔ مجھے یہ تسلی ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب جیسی عظیم ہستی کے ساتھ میری بس یہی ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں کو اپنی اپنی پشن کے حصول میں یکساں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تین برس خاصی تشدیدتی کا زمانہ تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی انسان کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

میں خود کسی کا دشمن نہیں ہوں اور نہ ہی کسی اور کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔ پہلی بات تو یقینی ہے، دوسری تجھیں۔ دوسروں کے دل کا احوال تو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔ انسانوں کے درمیان باہمی تعلقات میں وقة فوقہ رنجشیں، کدروں میں، نفرتیں اور تازعے پیدا ہونا ایک فطری امر ہے، میں ان کمزوروں سے ہرگز مبرا نہیں۔ لیکن میں نے رنجشوں، کدروں اور تازعوں کو ہمیشہ عارضی اور دوستیوں اور محبتیوں کو ہمیشہ دائیگی سمجھا ہے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ کسی کی پیچھے پیچھے وہی بات کہی جائے جو اس کے منہ پر دھرائی جاسکے۔ اس اصول کو پوری طرح بجا تو نہیں سکا، لیکن کسی حد تک اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب ہوتی رہی ہے۔

میں نے اپنے خلاف تنقید یا الزام تراشی کا برداشت کرنا سیکھا ہے اور اس کے جواب میں تفحیک یا تردید کرنے سے گریز کیا ہے۔ البتہ بجا یا بے جا تعریف سن کر دل خوش ہو جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش جاری رکھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب بندہ کے لیے مرح و ذم دونوں یکساں ہیں۔ میں کبھی Frustrate (مايوس) یا بور نہیں ہوا۔

نتیائی کے احساس نے مجھے نہیں ستایا۔ میں اکیلے میں زیادہ خوش رہتا ہوں۔

خوش قسمتی سے مجھے ایسے دوستوں کی رفاقت نصیب ہوئی، جن کا اپنا اپنا رنگ اور اپنی URDU4U.COM اپنی شخصیت ہے۔ مثلاً ابن انشاء، ممتاز مفتی، بنو قدسیہ، اشfaq احمد، واصف علی واصف صاحب، جمیل الدین عالی، بیاض انور، ایثار راعی، مسعود کھدر پوش، ابن الحسن برلنی، اعجاز بیالوی، ایوب بخش اعوان وغیرہ۔ یہ سب اپنے اپنے میدان کے منفرد شہوار ہیں۔ باہمی محبت، خلوص، احترام اور اعتماد کے علاوہ ہمارے درمیان اور کوئی خاص قدر مشترک یا مقصدیت نہیں۔ اس کے باوجود ہر زمانے میں ہمارے تعلقات میں نہ کوئی کبھی آئی ہے اور نہ کوئی کمی پیدا ہوئی ہے۔

خاص طور پر ممتاز مفتی انتیائی ذکی الحسن، ضدی، بے باک اور شدت اور حدت پسند تخلیق کار ہیں۔ کسی وجہ سے میری کوئی حرکت انہیں پسند آگئی اور انہوں نے بیٹھے بٹھائے ایسی عقیدت کا روگ پال لیا کہ میرے چہرے پر مشکل کافور سے ممکنی ہوئی حتائی داڑھی چپا کر کے، میرے سر پر دستار فضیلت باندھی اور سبز پوشوں کا پر اسرار جامہ پہنا کر اپنی سدا بھار تحریروں کے دوش پر مجھے ایسی مند پر لا بٹھایا، جس کا میں اہل تحا نہ خواہش مند۔ اس عمل سے ان کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچا البتہ میرے لیے وہ ایک طرح کے مرشد کا کام دے گئے۔ ان کی وجہ سے میں صراط مستقیم پر ثابت رہنے پر اور بھی زیادہ مستعد ہو گیا تا کہ ممتاز مفتی کی عقیدت کے آگینوں کو خیس نہ لگے۔ بظاہر میرا نفس تو بہت پھولا، لیکن اندر ہی اندر عرق ندامت میں غوطے کھاتا رہا۔ کیونکہ من آنم کہ من دانم

میں نے دنیا بھر کے درجنوں سربراہانِ مملکت، وزراءِ اعظم اور بادشاہوں کو کئی کئی مرتبہ کافی قریب سے دیکھا ہے لیکن میں کسی سے مرعوب نہیں ہوا اور نہ ہی کسی میں مجھے اس عظمت کا نشان نظر آیا جو جھنگ شر میں شہید روڈ کے فٹ پاتھ پر پھٹے پرانے جو تے گانٹھنے والے موچی میں دکھائی دیا تھا۔

اس طرح کی زندگی کے علاوہ مجھے اور کیا چاہیے؟ اب تو بس یہی جی چاہتا ہے۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی  
URDU4U.COM  
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

ابن اثناء نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ فہرست میرے حوالے کی، اور وصیت کی کہ اپنی ڈائری کی خفیہ نویسی کو بے نقاب کرو اور دمجمی سے ایک کتاب لکھو۔ میں تو اسے پڑھنے کے لیے زندہ نہ رہوں گا لیکن میری روح خوش ہو گی۔

حای تو میں نے بھر لی، لیکن جب قلم اٹھایا تو ایک شدید الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں نے زندگی بھر کوئی ایسا تیر نہیں مارا جس پر شنجاں ل بگھار کر

اور اپنے منہ میاں مشبو بن کر ادب کے میدان میں ایک برخود غلط تمیں مار خاں بننے کی کوشش کروں ..... کیا لکھوں؟ ..... کیسے لکھوں؟ ..... اور کیوں لکھوں؟ ..... اسی شش و پنج میں کئی برس گزر گئے۔ رفتہ رفتہ میرے دماغ کی تاریک سرگنگ میں روشنی کے کچھ آثار نمودار ہونا شروع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ جن واقعات، مشاہدات اور تجربات نے مجھے متاثر کیا ہے ان کی روئیداد بے کم و کاست بیان کر دوں۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی مد نظر رہا کہ بعض غلط فہمیوں اور مفروضوں کی بنا پر میرے ماتھے پر کچھ لکنک کے شیکے لگ چکے ہیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مثلاً میرے محترم اور مریبان بزرگ ابوالاثر حفیظ جالندھری نے کسی شاعرانہ مودہ میں یہ کہہ دیا۔

جب کیس انقلاب ہوتا ہے  
قدرت اللہ شباب ہوتا ہے

اس شعر کا بہت چرچا ہوا اور یہ تاثر دیا گیا کہ وطن عزیز میں "انقلاب" کی آڑ میں جتنی غیر جمہوری کارروائیاں ہوتی رہی ہیں، ان سب میں میرا کچھ نہ کچھ ہاتھ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو جب گورنر جنرل غلام محمد نے سب سے پہلے اسمبلیاں توڑ کر آمریت کا ڈول ڈالا، اس وقت میں پنجاب کی صوبائی حکومت کے ماتحت لاہور میں ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر معین تھا۔ اس واقعہ کے سات آٹھ روز بعد مجھے اچانک گورنر جنرل کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔ اس کی وجہ مجھے اب تک معلوم نہیں۔ اس وقت تک ملک غلام محمد سے میری نہ کوئی ذاتی شناسائی تھی نہ کوئی رابطہ تھا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جب اسکندر مرزا اور کمانڈر انچیف ایوب خان کا مارشل لاء نافذ ہوا۔ اس وقت ۲۰ ستمبر سے میں جناح ہسپتال کراچی میں عارضہ قلب کے علاج کے لیے داخل تھا۔ اکتوبر کے شروع میں ہسپتال سے گھر آگیا۔ ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ مزید دو ہفتے دفتر نہ جاؤں اور گھر پر ہی مکمل آرام کرو۔ مارشل لاء لگنے کی خبر مجھے پہلی بار کرنل مجید ملک نے رات کے باہم بجے گھر پر ٹیلیفون کر کے سنائی۔ وہ ان دنوں مرکز میں پرنسپل انفارمیشن آفیسر تھے۔ دوسرے مارشل لاء کی سازش جنرل محمد یحیٰ اور ان کے ایک مخصوص ٹولے تک محدود تھی۔ پورے دس روز میں اسلام آباد کے مرکزی سیکریٹ میں بے کار بیٹھا کھیاں مارتا رہا۔ چند دنوں بعد اس دھاندی پر ہلکا سا احتجاج کر کے میں یوں بچے سمیت بیرون ملک چلا گیا اور ملازمت سے استعفی دے دیا۔ تیرے مارشل لاء کے وقت میں اسلام آباد میں گوشہ نشینی کی زندگی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ افتخار میں آنے کے پیشیں روز بعد مجھے اچانک جنرل محمد ضیاء الحق کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم ملا۔ رمضان شریف کے دن تھے۔ تراویح کے بعد رات کے تقریباً باہم بجے میں آرمی ہاؤس پہنچا۔ اس وقت جنرل صاحب اپنے ڈرائیکٹ روم میں مولانا ظفر الحق انصاری کے ساتھ مصروف

گفتگو تھے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ جزل صاحب بڑی شفقت سے پیش آئے اور فرمایا۔ ”ملک کے اس نازک مرحلے میں ہمیں تجربہ کار کارکنوں کی ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ کل سے تم وزارت تعلیم کا کام سنبھال لو۔“

یہ سن کر میرے پاؤں تلے کی نہن نکل گئی۔ میں نے معدرت کرتے ہوئے عرض کیا۔ ”جناب! اب مجھ میں کام کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ کچھ تو ضعیف العمری کا تقاضا ہے، کچھ رثا رڑ زندگی نے آرام پسندی کی عادت بڑھا دی ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ عرصہ کے لیے لندن جا کر اپنے دوست ابن انشاء کی عیادت کرنا چاہتا ہوں۔“

جزل صاحب مسکراتے رہے اور فرمایا۔ ”کوئی بات نہیں، ضرور جاؤ۔ وزارت تعلیم کے سیکرٹری ڈاکٹر محمد اجمل چند روز میں یونیسکو کی کسی تعلیمی کانفرنس کے لیے جنیوا جا رہے ہیں، میں تمہیں ان کے ساتھ ایک ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے لندن بھی ہو آتا۔ واپسی پر پھر بات ہو گی۔“

میں نے اس وقفہ کو غنیمت سمجھا اور ڈاکٹر اجمل کے ساتھ پسلے جنیوا اور پھر لندن چلا گیا۔ ہم کچھ روز ابن انشاء کے ہاں ٹھہر کر واپس اسلام آباد آگئے۔ میں اس خوش فہمی میں بتلا تھا کہ میری نال متعلق پہچان کر اب وزارت تعلیم میں کام کرنے کی بات آئی گئی ہو گی۔ لیکن میرے کئی عزیزوں اور دوستوں نے جو فوج میں ملازم تھے، مطلع کیا کہ جی اچ کیوں کے افراد کی ایک مینگ سے خطاب کرتے ہوئے جزل ضیاء الحق نے میرا نام لے کر بتایا کہ انہوں نے شعبہ تعلیم کے لیے مجھے منتخب کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ کویت سے میرے ایک دیرینہ دوست کا مبارکباد کا خط آیا کہ مشرق وسطیٰ کے دورے پر کسی مقام پر پاکستانیوں کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے جزل صاحب نے پھر یہی بات دہرائی۔ مجھے تشویش تو ضرور لاحق ہوئی لیکن میں خاموشی سے کان لپیٹ کر اسلام آباد میں بیٹھا رہا۔ اس دوران چیف مارشل لاءِ ایڈمنیسٹریٹ اور صدر مملکت جزل محمد ضیاء الحق کو اپنی مرضی کے دوسرے نورتن مل گئے تھے۔ میں ان کا تھہ دل سے

شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہ تو اس موضوع پر پھر کوئی بات چھیڑی اور نہ ہی کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اگر خدا نخواستہ میں لالج میں آ کر یہ پیشکش قبول کر لیتا تو مجھے یقین ہے کہ نوے روز کے مارشل لاء کو ساڑھے آٹھ سال (یا گیارہ سال) تک طول دینے کا سرا بھی اسی خاکسار کے سر باندھا جاتا۔

صدر ایوب کے زمانے میں جب انہوں نے جگہ جگہ عام جلوں میں سوال جواب کا سلسہ شروع کیا تو میرے دوست سید محمد جعفری نے اپنے مخصوص اور منفرد رنگ میں یہ پھیتی اڑائی۔

یہ سوال و جواب کیا کہنا  
صدر عالی جناب کیا کہنا  
کیا سکھایا ہے کیا پڑھایا ہے  
قدرت اللہ شاپ کیا کہنا

سید محمد جعفری بڑے بلند پایہ اور ہر دلعزیز شاعر تھے۔ ان کے نام کی وجہ سے یہ اشعار بہت سے حلقوں میں زبانِ زد خاص و عام ہو گئے۔ اس شرت نے یہ ظلم ڈھایا کہ ہر کوئی سمجھنے لگا کہ صدر ایوب میرے اشارے پر ناچتے ہیں اور ان کا ہر فیصلہ میرے مشوروں کا مرہون منت ہے۔

چنانچہ رائٹرز گلڈ قائم ہوا تو کچھ نے یہی سمجھا کہ میں نے ترپ چال چل کر ادیبوں اور دانشوروں کے تمام انڈے صدر ایوب کی جھوٹی میں ڈال دیئے ہیں۔ سرکاری دبारی حلقوں کو ضد تھی کہ صدر ایوب کے اعتماد کا فائدہ اٹھا کر یہ اداہ "سرخوں" کی کمین گاہ کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ جب "پاکستان نائیز" اور "امریز" اور "لیل و نہار" پر حکومت نے زردستی اپنا قبضہ جملیا، اسے بھی میرے ذہن رسما کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء کے بدnam زمانہ پریس اینڈ پبلی کیشنر آرڈی نس کا نفاذ بھی میرے ہی کھاتے

میں ڈالا گیا۔ علی ہذا القياس.....

مجھے توقع تھی کہ صحافی برادری جو بڑے بڑے "سکوپ" لے اٹنے میں مہارت رکھتی ہے، ان میں کوئی صاحب دل میرے سر تھوپے ہوئے الزامات کی تحقیق اور تفتیش کرنے کی زحمت بھی اٹھائے گا۔ یہ امید نقش بر آب ثابت ہوئی۔ اثنا بھیڑ چال کی صورت میں بہت سے حضرات بلا چوں و چاراں یہی الزامات دہراتے رہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ کتاب لکھنے کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس کا مقصد اپنی بری اور مخصوصیت کا ڈھول پیٹ کر نمبر بڑھانا نہیں۔ فقط حقائق کے ریکارڈ کو صاف کرنا مقصود ہے۔

اس کتاب میں واقعات سب صحیح ہیں، لیکن اسلوب بیان میرا ہے۔ جمال کہیں میں نے کوئی نتائج اخذ کئے ہیں یا کوئی رائے دی ہے ان کا ذمہ دار بھی میں ہی ہوں۔ ان سے بعض کو اتفاق ہو سکتا ہے بعض کو اختلاف۔ دونوں صورتیں میرے لیے برابر ہیں۔ اپنی کچھ فہیسوں یا خام خیالیوں کی اصلاح کرنے میں میری انا کوئی رکاوٹ نہ بنے گی بلکہ خوشدلی سے اظہار تشکر میں میرا ہاتھ بٹائے گی۔

کچھ صاحبان کو گلہ ہے کہ جو واقعات چٹھارے لے لے کر میں اب سن رہا ہوں، اس وقت کیوں خاموش رہا جب یہ سب کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ میں ایک مثالی یورو کریٹ تو نہیں لیکن قدرے اچھا یورو کریٹ ضرور رہا ہوں۔ اچھا یورو کریٹ بننے کے لیے چند اصولی شرائط لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کسی معاملے میں اس کا مشونہ طلب کیا جائے تو اس پر اپنی بے لائگ رائے کا بے خوفی سے اظہار کرے۔ اگر اس کی رائے کے مطابق فیصلہ ہو گیا تو فہما ..... بصورت دیگر اگر اس کی رائے یا مرضی کے خلاف فیصلہ ہوا تو ایک اتنجھے یورو کریٹ کے سامنے صرف دو ہی راستے ہوتے ہیں کہ ایک یہ کہ فیصلہ اس کی خواہش کے مطابق ہو یا مخالف، اس کا فرض ہے کہ وہ سر تسلیم ختم کر کے اس پر دیانتداری سے عملدرآمد کرے۔ بصورت دیگر استغفار دینے پر بہت چست کرے اور ملازمت چھوڑ کر جو جی چاہے کے نے۔ اپنی سروں کے دوران میں ان دونوں راستوں پر چلا ہوں۔ پہلے پر نیادہ، دوسرے پر کم۔ میرے کمزور ضمیر نے مجھے فقط چار

بار استغفاری پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ چوتھی بار جب میرا استغفاری منظور ہوا، اس وقت میری ملازمت کے سات آٹھ برس باقی تھے۔ میں اسے اپنا کمال تو نہیں سمجھتا جس پر اتراتا پھر وہ، لیکن مطمئن ضرور ہوں۔

ریڈائرمنٹ کے بعد ہر سرکاری ملازم کو حق حاصل ہے کہ وطن کے دفاع اور سالمیت کے State Secrets (امور یاست کے راز) فاش کئے بغیر وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو آزادی کے ساتھ بیان کرے۔ میں نے اسی موقف کو اپنا کریہ کتاب لکھی ہے۔ دنیا بھر میں بھی یہی چلن رائج ہے۔

اس میں کئی اہم واقعات تشنہ اظہار ہے گئے ہیں۔ مثلاً بگلہ دیش کے قیام کا پس منظر، عوامل اور عواقب یا ذوالفقار علی بھٹو کے پانچ سالہ دور حکومت اور جزل محمد ضیاء الحق کے ساتھ آٹھ برس کا مارشل لاء ..... یہ موضوعات اتنے اہم اور دور رہ ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر پوری پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ان ادوار میں میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ کسی حکومت یا حکمران کے بارے میں اندرون خانہ کی باتیں معلوم کر سکیں۔ اگرچہ میں نے ”حمدود الرحمن کمیشن روپورٹ“ پڑھی ہوئی ہے، لیکن کسی وجہ سے حکومت نے آج تک اسے ایک انتہائی خفیہ راز کے طور پر چھپا رکھا ہے۔ اس روپورٹ کی روشنی میں کوئی بات لکھنا ایک سول سروں کے ضابطہ کردار کے منافی ہو گا۔ میں نے زندگی بھر کبھی اس ضابطہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے ان موضوعات پر قلم اٹھانے سے گریز کیا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ کسی وقت کوئی اہل دل ان ادوار کے احوالات کو قلمبند کرنے کا حق ضرور ادا کرے گا۔

اس کتاب کا مقصد کسی فرد کی جان بوجھ کر کردار کشی، بت شکنی یا بت تراشی کرنا نہیں ہے۔ جو لوگ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں، ان کی ذات انفرادی نہیں رہتی، بلکہ اپنی طرز کا ایک اداہ بن جاتی ہے۔ تاریخ کی سرچ لائٹ نہایت تیز اور بے رحم ہوتی ہے۔ اس کی شعاعوں کی روشنی میں ہر شخص اور ادارے کے حقیقی خدو خال سامنے آ جاتے

ہیں۔ ان خد و خال کی لطافت یا کثافت کا ذمہ دار مصنف ہے، نہ اس کی تصنیف۔ یہ تو محض ان افراد کے ذاتی صفاتی، ظاہری یا باطنی کردار کا عکس ہے جو اپنے اپنے زمانے میں زندگی کے اشیج پر اچھا یا برا پارٹ ادا کرنے کے بعد زندہ ہیں یا مر چکے ہیں۔ دونوں صورتوں میں میں کسی معدورت کا طلبگار نہیں۔ میں نے حقائق کو انتہائی احتیاط سے ممکنہ حد تک اسی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس رنگ میں وہ مجھے نظر آئے ہیں۔ ہر طرح کی احتیاط کے باوجود انسان خطا کا پتلا ہے اور اس کی بصارت اور بصیرت دونوں دھنڈلا سکتے ہیں۔ اس لیے میں حتی طور پر اپنی پارسائی یا معمومیت کا دعویٰ کرنے سے بھی معدور ہوں اور اللہ تعالیٰ کی شان توابی، ستاری، غفاری اور بے نیازی کا سامارا لے کر ان تمام جرائم کا اقرار کرتا ہوں، جن کا مجھے علم ہے اور جن کا مجھے علم نہیں۔

محترمہ ادا جعفری نے اسلام آباد میں ایک گھریلو قسم کی ادبی تنظیم "سلسلہ" کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ انہوں نے مجھ پر ایسا دباؤ ڈالا کہ مجھے اس تنظیم کے ماہنہ اجلاس میں "شباب نامہ" کا ایک باب سنانا پڑتا تھا۔ جب وہ کراچی چلی گئیں، تو محترمہ ثار عزیز بٹ نے بھی یہی سلسلہ جاری رکھا۔ اس کتاب کے ابتدائی چند باب انہی محفوظ کے لیے لکھے گئے۔ اس سے میراست رفوار قلم کسی قدر تیزی سے روای ہو گیا۔ "سلسلہ" بند ہونے کے بعد جواں سال ادبیوں کی ایک ایسی ہی تنظیم "رباط" نے بھی میری اسی طرح مدد کی۔

حلقة ارباب ذوق اسلام آباد نے مجھے اپنی چند نشتوں میں اس کتاب کے کچھ باب سنانے کی دعوت دی۔ ان نشتوں میں پرانی اور نئی نسل کے ہونمار ادبیوں کی تنقید اور تعریف اور بحث مباحثہ نے میری رہنمائی کی اور اس طرح مجھے اپنی تحریر میں بہت سی اصلاحیں کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

نیپا (NIPA) کراچی اور پشاور میں بھی مجھے کچھ باب سنانے کا موقع ملا۔ ان اداروں میں تربیت پانے والے سینئر سرکاری افسران کا رو عمل میرے بہت کام آیا۔

سیارہ ڈائجسٹ، معاصر، دستاویز، نیا دور اور تخلیقی ادب جیسے رسالوں میں میرے کچھ باب شائع ہوئے۔ انہیں پڑھ کر بہت سے قارئین نے اپنے خطوں سے میری بڑی ہمت بڑھائی۔ ان میں کچھ خطوط ایسے قد آور انسیوں کی جانب سے بھی تھے جن کی قدر افزائی میرے لیے باعث افتخار ہے۔

اس کتاب کا پورا مسودہ ممتاز مفتی، بنو قدیسیہ اور اشراق احمد نے حرف بہ حرف پڑھ کر اپنی ثبت تجاویز سے قدم قدم پر رہنمائی فرمائی ہے۔

ان سب اداروں، رسائل اور احباب کا لفظی شکریہ ادا کر کے میں ایک فرسودہ رسم دہرانا نہیں چاہتا۔ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں ان سب کا کس قدر ممنون احسان ہوں۔  
اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش اور خوشحال رکھے۔

کئے گے۔ ”پلیگ کا چوہا، پلیگ کا چوہا“ گھر جا کر جلدی نہایو، ورنہ گلٹی نکل آئے گی۔“

ان لوگوں نے بھی پلیگ کی جملہ علامات پر حسب توفیق روشنی ڈالی اور میرے علم میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

ان دونوں جمou شر میں ہر روز دس دس پندرہ پندرہ لوگ طاؤن سے مرتے تھے۔ گلی کوچوں میں چاروں طرف خوف ہی خوف چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ گاہک دکانوں کا کن انکھیوں سے جائزہ لیتے تھے کہ کہیں بوریوں اور ڈبوں اور کنستروں کے آس پاس چوہے تو نہیں گھوم رہے۔ دکاندار گاہکوں کو شک و شبہ سے گھورتے تھے کہ ان کے ہاں پلیگ کا کیس تو نہیں ہوا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کے گھر آنا جانا اور ملنا جانا ترک کر دیا تھا۔ سڑک پر راہبگیر ایک دوسرے سے دامن پجا بجا کر چلتے تھے۔ شر کا ہر مکان دوسروں سے کٹ کر الگ تھلگ ایک قلعہ سا بنا ہوا تھا۔ جس میں پھٹی پھٹی سمی سمی آنکھوں والے محصور لوگ چپ چاپ اپنی اپنی گلٹی کا انتظار کر رہے تھے۔ میونپل کمیٹی والے درو دیوار سونگھ سونگھ کر پلیگ کے مریضوں کا سراغ لگاتے تھے۔ جہاں ان کا چھاپہ کامیاب رہتا تھا، وہاں وہ علی بابا چالیس چور کی مرجینا کی طرح دروازے پر سفید چونے کا نشان لگا دیتے تھے۔ تھوڑی بہت رشتہ دے کر یہ نشان اپنے مکان سے مٹایا اور اغیار کے دروازوں پر لگوایا بھی جا سکتا تھا۔ پلیگ کے عذاب میں بتلا ہو کر مریض تو اکثر موت کی سزا پاتا تھا، باقی گھر والے مفرور مجرموں کی طرح منہ چھپائے پھرتے تھے۔ ایک دوسرے کو ہاتھ ملانے کا رواج بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ لوگ دور ہی دور سے سلام دعا کر کے رسم مرتوت پوری کر لیتے تھے۔

یکے بعد دیگرے دو طاؤن زدہ چوہوں کو ہاتھ لگانے کے باوجود جب میرے تن بدن میں کوئی گلٹی نمودار نہ ہوئی تو میرا دل شیر ہو گیا۔ اپنے ارد گرد سے ہوئے، ہر اسال چرے دیکھ کر نہیں آنے لگی۔ اور ان کی بے بی سے شہ پا کر رفتہ رفتہ میرے دل میں خوف کی جگہ نئے نئے منصوبے سر اٹھانے لگے۔

## • جموں میں پلیگ

گرمیوں کا موسم تھا اور جموں شر میں طاؤن کی وبا بڑی شدت سے پھوٹی ہوئی تھی۔ اکبر اسلامیہ ہائی سکول میں چوتھی جماعت کے کلاس روم کی صفائی کا کام میرے ذمہ تھا۔ ایک روز چھٹی کے بعد جب میں اکیلا کمرے کی صفائی کر رہا تھا، تو ایک ڈیک کے نیچے ایک چوہا مرا پڑا ملا۔ میں نے اسے دم سے پکڑ کر اٹھایا، باہر لا کر اسے نور سے ہوا میں گھمایا اور سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر لال دین نور سے پھنکا را، اور اپنی لنگری ٹانگ گھینٹتا ہوا دور کھڑا ہو کر نور نور سے چلانے لگا۔ لال دین ہمارے سکول کا واحد چپڑا تھا۔ وہ گھنٹی بھی بجا تھا، لڑکوں کو پانی بھی پلاتا تھا اور چھاہڑی لگا کر بسکت اور بایسی پکوٹیاں بھی بیچا کرتا تھا۔

”اے بد بخت!“ لال دین چلا رہا تھا۔ ”یہ تو پلیگ کا چوہا تھا۔ اسے ہاتھ کیوں لگایا؟ اب خود بھی مر دے گے، ہمیں بھی مار دے گے۔“

اپنی لانھی پر نیک لگا کر کھڑے ہی کھڑے لال دین نے پلیگ کے مرض پر ایک مفصل تقریر کر ڈالی۔ پسلے تیز بخار چڑھے گا۔ پھر طاؤن کی گلٹی نمودار ہو گی۔ رفتہ رفتہ وہ مکنی کے بھٹے جتنی بڑی نمودار ہو گی۔ جسم سوچ کر کپا ہو جائے گا۔ ناک، کان اور منہ سے خون ٹکے گا۔ گلٹی سے پیپ بھے گی اور چار پانچ دن میں اللہ اللہ خیر سلا..... ہو جائے گی۔

چند روز بعد میں ریزیڈنسی روڈ پر گھوم رہا تھا کہ اچانک ایک چوہا تیز تیز بھاگتا ہوا سڑک پر آیا۔ کچھ دیر رک کر وہ شرایبوں کی طرح جھوم جھام کر لڑکھرا یا۔ دو چار بار نہیں پر لوٹ لگائی اور پھر دھپ سے اوندھے منہ لیٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اسے پاؤں سے ہلاایا تو وہ مر چکا تھا۔ بے خیالی میں میں نے اسے دم سے پکڑا اور اٹھا کر سڑک کے کنارے ڈال دیا۔ چند راہگیر جو دور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے، پکار پکار کر

رگھو ناتھ بazar میں حکیم گوراندہ مل کی دکان تھی۔ ایک روز حکیم صاحب اپنی کرسی پر اکیلے بیٹھے اپنی ناک پر بار بار بیٹھنے والی لکھیاں اڑا رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور گھبراہٹ کے لجھے میں بولا۔ ”حکیم صاحب! پلیگ کی دوا چاہیے۔

بہت جلد“

پلیگ کا نام سن کر حکیم صاحب چونکے اور ڈانٹ کر کھنے لگے۔ ”چھاتی پر کیوں چڑھے آتے ہو؟ دور کھڑے ہو کر بات کرو۔ کس کو پلیگ ہے؟“

میں نے روئی کا گالہ نشکر آیوؤین میں ترکر کے ایک میلی سی پیٹ کے ساتھ اپنی بغل میں باندھا ہوا تھا۔ میں کھک کر حکیم صاحب کے اور بھی قریب ہو گیا اور آستین میں سے بازو نکال کر اپنی بغل معاشرہ کے لیے ان کے منہ کے قریب لانے لگا، تو ان کی آنکھیں خوف سے ابل کر باہر کی طرف لڑک آئیں۔

حکیم صاحب بوکھلا کرتے زور سے اٹھے، کہ کری کھٹاک سے الٹ کر پیچھے کی طرف گر گئی۔ دکان کے اندر دور کھڑے ہو کر وہ چینخنے لگے۔ ”یہ دکان ہے دکان، چھوت کی بیماریوں کا ہسپتال نہیں۔ فوراً باہر نکلو اور ہسپتال جا کر حاضر ہو جاؤ۔ ورنہ بلاتا ہوں ابھی پولیس والوں کو۔“

حکیم صاحب کی میز پر گلقدنڈ کا مرتبان پڑا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ڈھکنا اٹھایا اور شیرے میں لت پت گلقدنڈ کی ایک مٹھی بھر کر دکان سے باہر چلا آیا۔

حکیم گوندراتہ کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ دکان کی کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ ایک بار روغن بادام کی کھلے منہ والی بوتل میں مردہ چھپکی نظر آئی۔ حکیم صاحب نے چمنے سے پکڑ کر اسے نکال، اور کچھ دیر تک اسے بوتل کے منہ پر الٹا لٹکائے رکھا تا کہ چھپکی سے نسلکتے ہوئے بادام روغن کے نیا نیا قطرے بوتل میں واپس گر جائیں۔

حکیم صاحب پر اس کامیاب بلیک میل نے میری ہمت بڑھائی اور حوصلہ بلند کر دیا۔ لوگوں

کی باتیں سن کر دیواروں پر لگے ہوئے ملکہ حفظان صحت کے ہدایت نامے پڑھ پڑھا کر اور پھر خود اپنی روشنی طبع کو خوفناک حد تک بروئے کارلا کر میں نے پلیگ کی علامات، کوائف اور نتائج پر خاصی طویل اور ہولناک قسم گی تقریر ازیر کر رکھی تھی۔ اسے اکا دکا لوگوں پر آزمایا تو نتیجہ خاطر خواہ پایا۔ اچھے اچھے صحت مند اور وضع دار قسم کے بزرگ پلیگ کے ذکر اذکار پر کسی نہ کسی منزل پر پھسل جاتے تھے، اور دفعہ ان کے متین و نظریں چروں پر توهہات کے کالے کالے کوئے بڑے زور و شور سے کامیں کامیں کرنے لگتے تھے۔ موقعوں پر مجھے کامیابی و کامرانی کا وہ نشہ سرشار کر جاتا تھا، جو قوالوں کی پارٹی اس وقت محسوس کرتی ہے جب ان کے کسی بول پر کوئی بے اختیار اٹھ کر حال کھیلنے لگ پڑے۔

سکول میں مولوی عبدالحنان ہمارے اردو اور دینیات کے جوان سال استاد تھے۔ بڑے خوش مزاج، بذله سننج اور مہربان۔ گورا رنگ، نیکھا ناک نقشہ، سنری فریج کٹ داڑھی، نرم نرم مترنم آواز، دیدہ نیب خوش قطع لباس۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سبق پڑھاتے پڑھاتے وہ وقت فوقہ اچانک خاموش ہو جاتے تھے اور آنکھیں بند کر کے جھوم جھوم کر فرمایا کرتے تھے۔ ”سبحان اللہ، سبحان اللہ ..... زندگی بھی عجیب نعمت ہے۔“

ایک روز مولوی عبدالحنان کلاس میں آئے تو بچھے بچھے سے تھے۔ وہ دونوں ٹانکیں میز پر پسار کر کر سی میں نیم دراز ہو گئے اور آنکھیں بچ کر اداہی سے کہا۔ آج طبیعت بحال نہیں۔ سبق نہ ہو گا۔“

باقی لڑکے تو نہی خوشی کھیل کوڈ میں مصروف ہو گئے اور میں اپنے چہرے پر فکرمندی کی قلعی کر کے بڑی سنجیدگی سے مولوی صاحب کے قدموں میں آ بیٹھا۔ ان کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ کان تتمائے ہوئے تھے اور چہرے بشرے پر ہراس و وسواس کی چمگاڑیں اللہ لٹکی ہوئی تھیں۔ کیس امید افزا تھا۔ اس لیے دو تین بار میں نے کوشش کی کہ انہیں شر میں طاؤن کی کچھ تانہ خبریں سناؤں۔ لیکن

ہر بار انہوں نے مجھے سختی سے جھڑک کر خاموش کر دیا۔ یہ حرہ کا رگر نہ ہوتے دیکھ کر میں نے لال دین چپڑا سے شکایت شروع کر دی، کہ وہ سکول کی صفائی کا خاطر خواہ دھیان نہیں رکھتا۔

”خواہ مخواہ لال دین کی چغلی کیوں کھاتے ہو؟“ مولوی صاحب نے درشتی سے کہا۔ ”کیا کیا ہے اس بیچارے نے؟“

”دیکھنے نا، مولوی صاحب“ میں نے گلہ کیا۔ ”ہمارے اس کلاس روم میں بھی پلیگ کا چوبہ مرا پڑا تھا۔“

تیر نشانے بیٹھا اور مولوی صاحب زور کا جھنکا دے کر کرسی سے یوں انھی کھڑے ہوئے جیسے طاؤن زدہ چوبہ ابھی تک وہیں پڑا ہو۔ انہوں نے کئی بار استغفار اللہ استغفار اللہ پڑھا اور غصے میں بھرے ہوئے غالباً لال دین کی تلاش میں کمرے سے نکل گئے۔

اس کے بعد وہ دو روز سکول نہ آئے۔ تیرے روز میں ان کی حالت کا سراغ لگانے ان کے گھر گیا۔ مولوی صاحب چادر پیٹھے چاپاکی پر ادھ موئے سے پڑے تھے۔ اور ایک پتلی سی ننی نویلی دہن ایک طرف بیٹھی انہیں پنچھا کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں مندی کا رنگ رچا ہوا تھا۔ پنچھے کی ڈنڈی بھی سرخ تھی۔ جب وہ ہاتھ ہلاتی تھی تو ایسے لگتا تھا کہ مولوی صاحب کی سنری داڑھی پر خون کی پھوار پڑنے لگے گی۔

مولوی صاحب مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ صادقہ بیگم نے اپنے ہاتھ سے دیکی شکر کے شربت میں ستو گھول کر مجھے پینے کو دیئے۔ پھر اس نے ایک نوکری اور کچھ پیئے میرے حوالے کئے کہ بازار سے آلو، مٹر، دھیا اور گوشت خرید لاؤ۔ سودا سلف خریدنے کا مجھے تجربہ نہ تھا۔ لیکن میں نے بڑی محنت سے خریداری کی اور واپس آ کر ہر چیز کا بھاؤ، اس کی اصلی قیمت سے کافی کم بتایا۔ پیسوں کا فرق میں نے اپنی پاکٹ منی ملا کر پورا کر دیا۔ صادقہ بیگم خوش ہوئی اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ ”واہ کاکا تم تو بڑے ہوشیار نکلے۔ بڑی اچھی خریداری کرتے ہو۔ مولوی صاحب کو دیکھنے آ جیا کرو اور مجھے سودا بھی لا دیا کرو۔“

صادقة بیگم کے حکم کی یہ شان نزول مجھے بڑی اچھی لگی۔ اب میں سکول جانے کی بجائے ہر روز سیدھا مولوی صاحب کے ہاں پہنچتا۔ کوئی نہ کوئی بمانہ بنا کر پاکٹ منی کے علاوہ گھر سے کچھ فالتو پیسے حاصل کرتا اور بڑی محنت سے صادقة بیگم کے سودا سلف میں سبستی لگاتا۔

مولوی صاحب سے رسمی مزاج پرسی کرنے کے بعد میں صادقة بیگم کے پاس باورچی خانہ میں جا بیٹھتا، کبھی مزر کی پھلیاں چھیلتا، کبھی پیاز کاتتا، کبھی مصالحہ پیتا اور جو کام بھی وہ شروع کرتی میں بھاگ بھاگ کر اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا۔ ایک روز جب میں ان کے ہاں پہنچا تو صادقة بیگم نہ دھونے کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔ کالے ریشم کا برقعہ پاس رکھا تھا۔ مولوی صاحب منہ سر لپیٹے خاموش پڑے تھے۔ میں نے حال پوچھا تو انہوں نے چادر کے اندر ہی سے کراہ کر کھا۔ ”اللہ، اللہ، حال اچھا نہیں۔“

”گلثی نکل آئی؟“ میں نے پر امید شوق سے پوچھا۔ ”تیرے منہ میں خاک“ صادقة بیگم غصے سے پھنکاری۔ ”گلثی کی بیماری تھوڑا ہے، ایسے ہی ذرا سا بخار ہے۔“

اس کی آنکھوں میں جو نیلی نیلی مخل سی نچھی تھی، اس پر آنسو پھیل گئے ..... جس طرح شبنم کے قطرے چوت کھا کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پوچھے اور اپنے مندی رنگے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔ اس نے اخروٹ کی چھال سے دانت صاف کئے ہوئے تھے اور اس کے پتلے پتلے ہونٹ سرخی سے گلنار ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر سونے اور چاندی کے ورق ہی ورق بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے وہ ابھی میسن اور دھی اور دودھ سے نہ کر بیٹھی ہو۔ دعا کے بعد اس نے مولوی صاحب پر دم کیا۔ کالے ریشم کا برقع یوں اوڑھا جیسے گڑیا کو فراک پہنیا جاتا ہے، اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”کاکا“ میرے ساتھ چلو گے؟“

میں خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے مجھے کوہ قاف پر چلنے کی دعوت مل رہی ہو۔  
”روشن شاہ ولی کے مزار پر نیاز چڑھانے جاتا ہے۔“ صادقة بیگم نے کہا۔ ”تم بھی میرے  
ساتھ چلو۔“

روشن شاہ ولی کا نام میں نے سن رکھا تھا۔ دور ہی دور سے ان کے مزار کی زیارت بھی  
کر چکا تھا۔ سنگ مرمر کے بلند چبوترے پر ایک بڑی سی قبر تھی جس پر سبز غلاف چڑھا  
رہتا تھا۔ رات کو سرہانے کئی چراغ جلتے تھے۔ مسلمان تو اندر جا کر فاتحہ درود پڑھتے  
تھے یا نذر نیاز چڑھاتے تھے لیکن کئی ہندو ڈوگرے بھی شیشے کی طرح چکتی ہوئی چار  
دیواری پر ہاتھ پھیر کر عقیدت مندی سے مزار کو سلام کیا کرتے تھے۔ میں نے بڑی پھرتنی  
سے صادقة بیگم کو یقین دلایا کہ میں روشن شاہ ولی کے مزار کا راستہ بخوبی جانتا ہوں  
اور اسے بڑی آسانی سے وہاں لے جاؤں گا۔

چینی کی ایک طشتی میں نیاز کا زردہ تیار تھا۔ صادقة بیگم نے اسے جالی کے رومال سے  
ڈھانپ کر میرے حوالے کیا۔ میں نے اظہار عقیدت کے طور پر اپنے منہ کو نیاہ سے  
نیاہ سکیر کر گول کیا اور زور سے بسم اللہ الرحمن الرحيم کہہ کر طشتی کو احتراماً دونوں  
ہاتھوں سے تھام لیا۔ مزار پر چڑھانے کے لیے کوئے لٹھر کی ایک چادر تھہ کر کے  
صادقة بیگم نے اپنے پاس رکھ لی۔ مولوی صاحب کے محلے سے نکل کر ہم نے مزار کے  
لیے سالم تانگہ کرایہ پر لیا۔ میری کوشش تو یہی تھی کہ میں پچھلی سیٹ پر یعنی صادقة  
بیگم کے ساتھ بیٹھوں لیکن بیٹنس رکھنے کے لیے تانگہ والے نے مجھے آگے بیٹھنے کا حکم  
داہا۔ پہلے تو میں بڑا آزردہ ہوا لیکن جب کپی سرڑک آئی تو مزا آنے لگا۔ دھوپ کی  
تمازت سے سرڑک پر پچھی ہوئی کول تار پکھل پکھل کر رضائی کی طرح نرم ہو گئی  
تھی۔ اس پر سرپت بھاگتے ہوئے گھوڑے کی تھپ تھپاہٹ، رزو کے نائز پیسوں کی لرزائ  
لرزائ تحرثراہٹ اور پچھلی سیٹ پر ہوا میں اڑتے ہوئے کالے ریشمی برقع کی سرسرابہت  
میرے کافنوں میں ہارمونیم اور طبلہ اور ستار بجانے لگی۔ میرا دل اندر ہی اندر گیت گانے

لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے میں تانگ سے چھلانگ لگا کہ تخت سلیمان پر جا بیٹھا جسے جن اور پیاس ہر وقت اپنے کندھوں پر اٹھائے اڑتے رہتے تھے۔ باہر سڑک پر چلتی پھرتی ساری خلق مجھے بڑی اداس، بے حد حقیر، بڑی مغلس اور لا انتہا محرومیوں کی ماری ہوئی نظر آئے گئی۔ اپنی خوش بختی اور خوش وقتی کی ترنگ میں سرشار ہو کر میں نے بے اختیار جالی کا رومال ایک طرف سر کیا اور زور دے کر بڑے بڑے نواں مزے لے لے کر کھانے لگا۔ یہ دیکھ کر تانگے والا زور سے غایا اور چلا چلا کر صادقہ بیگم سے کھنے لگا۔ ”لبی بی جی! یہ دیکھو، تمہارا لوڈا نیاز جو ٹھی کر رہا ہے۔ اب تمہاری منت خاک پوری ہو گی!“

صادقہ بیگم نے برقع اٹھا کر بڑی بے بی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پھر شبنم کے موتی بن بن کر لوٹنے لگے۔ میں گم کردہ راہ کتے کی طرح گردن ڈال کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

جب ہم روشن شاہ ولی پہنچے تو صادقہ بیگم مایوسی سے مزار کے باہر یتھیوں پر بیٹھ گئی۔

”کاکا، یہ تو نے کیا کیا؟“ وہ بولی۔ ”نیاز جو ٹھی کر دی۔ اب ہم مزار شریف پر کیا چڑھائیں گے؟“

اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے، جیسے شمع سے مووم کے گرم گرم قطرے تیز تیز قطار در قطار پکتے ہیں۔ میں نے بھی اپنا سر اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور زار زار رونے لگا۔ ہمیں روتا دیکھ کر مزار کا ایک ملنگ اٹھ کر آیا اور گرجدار آواز میں بولا۔ ”بالکلوں کی خیر ..... پیر دشکیر سب مرادیں پوری کرے، لبی بی لاو، تمہارا نذرانہ حضور میں پیش کر دوں۔“

موقع غنیمت جان کر میں نے زردوے کی پلیٹ اس کے حوالے کر دی۔ صادقہ بیگم نے لٹھر کی چادر پیش کی۔ ملنگ نے چادر کھول کر اسے اپنے بازوؤں سے ناپا اور مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”بہت چھوٹی چادر ہے۔ لبی بی دیکھتی نہیں ہو بڑی سرکار کا

مزار بھی کتنا بڑا ہے؟"

صادقة بیگم بے بسی سے سکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ ملگ کو شاید ترس آگیا۔ اس نے کہا۔ "اچھا بی بی، سوا روپیہ ساتھ چڑھا دو۔ اللہ بادشاہ قبول کرے گا۔" صادقة بیگم نے اپنی ریزگاری لگتی۔ دو ڈھائی آنے میں نے ڈالے اور بڑی مشکل سے سوا روپیہ پورا کر کے ملگ کے حوالے کیا۔

واپسی پر ہمارے پاس تانگے کا کرایہ نہ تھا۔ میری جیب میں فقط ڈیڑھ آنہ باقی تھا۔ رگھوناٹھ بازار کے ٹکڑ پر پان والے کی دکان آئی تو میں بھاگ کر دو پیسے کے دو بیٹھے پان پڑیا میں بندھوا لایا۔ سبزی منڈی میں بیرون کے نوکرے ہی نوکرے پڑے تھے۔ میں نے دو پیسے کے ڈھیر سارے بیر تکوا کر اپنی ٹوپی میں ڈلوالیے۔ اب ہم بیر بھی کھاتے جاتے تھے اور مزے مزے کی باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ میں جان بوجھ کر لبے لبے راستے اختیار کرتا تھا تا کہ ہمارا سفر طویل تر ہوتا جائے۔ ایک کوچہ میں ملائی کی برف والی لکڑی کی صندوقی بغل میں دبائے ہائک لگاتا پھر رہا تھا۔ میں نے لپک کر دو پیسے کی برف پیپل کے پتے پر رکھوائی اور بھاگ کر صادقة بیگم کو دے دی۔ اس نے برقع کے اندر ہی اندر جلدی برف کھالی۔ پتہ میں نے چاٹ لیا۔ جب ہم منڈی میں مہاراجہ کے پرانے محلات کے نزدیک آئے تو میری جیب خالی تھی۔ ورنہ صادقة بیگم کے لیے ایک آدھ راج محل خریدنے کا خیال بھی ضرور آتا۔ مولوی صاحب کا محلہ سامنے آیا تو دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ اللہ کرے ہمارے پیخنے تک مولوی صاحب مر گئے ہوں۔ اور میں صادقة بیگم کے ساتھ اسی طرح گلی گلی، کوچہ کوچہ پان چباتا، بیر کھاتا، برف اڑاتا گھومتا پھرتا رہوں۔ لیکن افسوس کہ مولوی صاحب زندہ سلامت تھے اور بدستور چاپائی پر سر منہ لپیٹے اپنی گلٹی کا انتظار کر رہے تھے۔

اس رات مجھے پوری طرح نیند نہ آئی۔ ذرا سی آنکھ لگتی تو رنگ برنگ خوابوں کے اٹن کھوئے مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ چیخ دیتے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو میں نے

جلدی جلدی اپنا بستہ سنبھالا اور بھاگتا دوڑتا سیدھا مولوی صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ خود تو موجود نہ تھے لیکن ان کی چارپائی پر صادقة بیگم ممل کا دوپٹہ اوڑھے گھری نیند سو رہی تھی۔ میں باورچی خانے میں گیا تو مولوی صاحب وہاں بھی نہ تھے۔ دوسرا کمرہ دیکھا، وہ بھی خالی تھا۔ میرے دل میں امید کا ایک چھوٹا سا سانپ خوشی سے لہرایا کہ شاید مولوی صاحب مر گئے ہوں اور راتوں رات انہیں دفن بھی کر دیا ہو۔ لیکن پھر اچانک پچھلی کوٹھڑی سے ان کی آواز آئی جیسے کوئی قبر کے اندر سے بول رہا ہو۔ ”بیٹا“ بات سننا۔“

میں بے صبری سے کوٹھڑی کی طرف لپکا اور بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ”مولوی صاحب گلٹی نکل آئی؟“

”بک بک نہ کرو۔“ مولوی صاحب نے مجھے جھوڑ کا۔ وہ اس ٹنگ و تاریک کوٹھڑی میں سب سے الگ تھلگ نہیں پر اپنا بستر بچھائے بیٹھے تھے اور چائے میں باقر خانی بھگو بھگو کر ناشتہ کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے کوٹھڑی سے باہر ہی باہر رہنے کی تلقین کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ ”صادقة بیگم“ کو تیز بخار ہے۔ رات سے دائیں بغل میں طاؤں کی گلٹی بھی نمودار ہو گئی ہے۔ اس کے ماں باپ کو خبر پہنچا دی ہے۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔ بیٹا! اس وقت تک تم بی بی کے پاس بیٹھو، اور اس کی خبر گیری کرو۔“ مولوی صاحب نے میری طرف کچھ پیسے پھینک کر کہا۔ ”بازار سے برف لے آو۔“ بی بی کے سر پر رکھو اور شربت بنا کر پلاو۔ گلاس باہر گلی کے نکلے پر دھونا، اور اس پلنگ کے پاس الگ رکھ دینا۔ باورچی خانے میں دوسرے برتوں کے ساتھ نہ ملا دینا۔“

برف لا کر میں نے ایک ڈلی توڑی اور صابن کی طرح اسے صادقة بیگم کے ماتھے پر ملنے لگا۔ برف کا نکلا گرم گرم توے پر رکھی ہوئی مکھن کی نکیہ کی طرح پکھل گیا۔ اور اس کا پانی چھوٹے چھوٹے پنالوں کی طرح اس کی آنکھوں اور کافلوں اور گالوں پر بننے لگا۔ چند لمحوں کے بعد صادقة بیگم نے آنکھیں کھول کر مجھے حیرت سے گھوڑا اور پھر

ہاتھ سے دھکیل کر مجھے اپنی چاپائی سے اٹھا دیا۔

”ہائے ہائے کاکا“ میرے پاس نہ بیٹھو۔ میرے تو پلیگ نکل آئی ہے۔ اللہ تمہیں حفاظت میں رکھے۔“

میں نے جلدی جلدی اٹھ کر شربت بنایا۔ بہت سی برف کوٹ کر اس میں ڈالی۔ صادقہ بیگم غٹ غٹ سارا گلاس ایک ہی سانس میں پی گئی۔ میں دوسرا گلاس بنانے لگا، تو اس نے روک دیا۔ ”بس بس کاکا، ابھی نہیں۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“

وہ بڑی دریہ تک بستر پر لیٹھی چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”میرا منہ بہت کڑوا ہو رہا ہے۔ کاکا مجھے ایک میٹھا پان لا دو گے؟“

وہ مجھے دینے کے لیے جیب سے کچھ پیسے نکلنے لگی۔ لیکن میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ رگھوناٹھ بازار وہاں سے دو ڈھانی میل دور تھا۔ میں بھاگم بھاگ اسی دکان پر پہنچا جہاں سے ہم نے کل بھی میٹھے پان کھائے تھے۔ چار پان خریدے۔ اور اسی طرح ہانپتا کانپتا واپس پہنچا تو صادقہ بیگم کے میکے والوں نے گھر پر چڑھائی کر رکھی تھی۔ تین چار لوگ اس کی چاپائی کے گرد حصار باندھے بیٹھے تھے۔ دو عورتیں باورچی خانے پر قابض تھیں۔ میں پانوں کی پڑیا صادقہ بیگم کو دینے لگا، تو اس کے والد نے مجھے ڈانٹ دیا اور پڑیا میرے ہاتھ سے چھین لی۔

میں کچھ دری عضو معطل کی طرح بیکار ادھر گھومتا رہا۔ پھر مولوی صاحب سے بات کرنے پچھلی کوٹھڑی کی طرف گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک چادر لپیٹے بے حس و حرکت لیئے ہوئے تھے۔ میری آواز سن کر انہوں نے ایک ہاتھ چادر سے نکال کر سرخ جھنڈی کی طرح ہلاکا اور مجھے باہر ہی باہر سے دور دفع ہو جانے کو کہا۔ کافی دری جب کسی نے بھی میرا کوئی نوٹش نہ لیا، تو میں مجبور ہو کر گھر آ گیا۔

رات کو میں نے ماں جی کو بتایا کہ ہمارے دینیات کے ماشر صاحب کی بیوی کو پلیگ ہو گئی ہے۔ مولوی صاحب کو بھی ٹکٹی نکلنے ہی والی ہے۔ میں نے ان کے لیے منت

مانی ہے۔ اس لیے مجھے وہ روشن شاہ ولی کی نیاز پکا دیں۔

"یا اللہ سب کی خیر" مان جی نے کہا۔ "میں صبح سوریے نیاز پکا دوں گی۔ سکول جاتے ہوئے مزار شریف پر چڑھاتے جانا۔ دعا بھی مانگنا۔ لیکن بیٹا! خبردار، ان کے گھر بالکل نہ جانا۔ یہ چھوٹ چھات کی بیماری ہے۔ اللہ سب پر اپنا رحم کرے۔"

صبح مان جی نے کشمکش، خوبی کی گریاں اور ناریل ڈال کر گز کے چاول پکائے اور نیاز کے لیے مٹی کے ایک بڑے سے پیالے میں ڈال دیئے۔ پھر انہوں نے سفید چھبیس کی ممل کا ایک نیا دوپٹہ نکلا اور مزار پر چڑھانے کے لیے اسے تھہ کر کے پیالے پر ڈال دیا۔ میں ایک ہاتھ میں سکول کا بستہ اور دوسرے ہاتھ میں نیاز کا پیالہ لے کر خوشی خوشی گھر سے نکلا۔ لیکن روشن شاہ ولی تک پہنچتے پہنچتے میری ساری خوشی کافور ہو گئی۔ مجھے وہ کہ مزار کے ملنگ کا خیال آنے لگا، جس نے لئے کی چھوٹی چادر کو بڑے مزار پر چڑھانے کے لیے صادقہ بیگم سے سوا روپیہ جنمانہ بھی وصول کیا تھا۔ ممل کا دوپٹہ تو چادر سے بھی چھوٹا تھا۔ اول تو میرے پاس پیسے ہی نہ تھے۔ لیکن اگر ہوتے بھی تو انہیں خواہ مخواہ اس موئی سے ملنگ پر ضائع کرنا میرا دل قبول نہ کرتا تھا۔

جونی روشن شاہ ولی کے مزار پر مجھے ملنگ کا یہ بد صورت سا گدھ منڈلاتا نظر آیا۔ میرے دل سے آٹا فلانا ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں نے مزار کو دور ہی دور سے سلام کیا۔ اور وہیں سڑک کے کنارے بیٹھ کر آدھے چاول خود کھا لیے اور باقی ایک کبڑی سی بڑھیا کو دے دیئے جو قریب ہی بیٹھی گور کے اپلے تھاپ رہی تھی۔

چھبیس کی ممل کا سفید دوپٹہ میں نے تھہ کر کے کتابوں کے درمیان اپنے بنتے میں رکھ لیا۔ چلتے چلتے میں نے دل ہی دل میں کئی خیالی پلاو پکائے۔ ایک ارادہ تو یہ ہوا کہ میں سیدھا عطااء اللہ رنگریز کی دکان پر چلا جاؤں اور یہ دوپٹہ اسے رنگنے کے لیے دے دوں۔ عنابی، گلابی، فیروزی، کاسنی، انگوری، بنستی۔ ایک ایک کر کے بہت سے رنگ میرے پرداہ خیال پر لرائے۔ کوئی رنگ ایسا نہ تھا جو صادقہ بیگم پر پھول کی طرح کھلتا نہ ہو۔

میں نے بار بار اپنے ذہن پر بڑا نور دے کر سوچا کہ اسے خود کون سا رنگ پسند ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے اپنی پسند ناپسند کا کبھی ذکر اذکار ہی نہ کیا تھا۔

لیکن جس طرح ہو آج میں اس سے ضرور پوچھ کے رہوں گا، کہ اس کا سب سے نیا ہد پسندیدہ رنگ کون سا ہے۔ اگر اس نے صاف صاف بتا دیا تو خیر ..... ورنہ دوسرا منصوبہ میں نے بنایا کہ میں یہ دوپٹہ دین محمد بٹ سے رنگوا لوں گا جو چزیوں اور صافوں پر رنگ برنگ لہریئے ڈالنے میں سارے شر میں مشور تھا۔ سکول کی استانیاں اور کالج کے لڑکے جب اس کی کاریگری سروں پر سجا کر باہر نکلتے تھے تو سڑکوں پر ہر طرف بھار ہی بھار آ جاتی تھی۔ دل ہی دل میں گونا گون رنگوں، خوشبوؤں اور خیالوں کے تانے بنے بتا جب میں مولوی صاحب کے گھر پہنچا تو شیخ چلی کے انڈوں کی نوکری کھٹاک سے نہیں پر گر گئی۔ اس کا بنا بنایا کنبہ برباد ہو گیا۔ اس کے سچے سجائے گھروندے مسماں ہو گئے۔ کیونکہ ڈیوڑھی میں صادقہ بیگم کا جنازہ تیار رکھا تھا۔ اور آٹھ دس گدھ نما آدمی قبرستان پلنے کے لیے گلی میں منڈلا رہے تھے۔

میں گھبرا کر مولوی صاحب کی طرف بھاگا۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں چادر اوڑھے بیٹھے تھے اور رو رو کر قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر انہوں نے باسیں ہاتھ سے مجھے دھتکارا اور غصے سے چلائے۔ ”میری طرف منه اٹھائے کیوں چلے آ رہے ہو؟ جاؤ بی بی کے جنازے میں شرکت کرو۔“

انہوں نے قیض کے دامن سے آنسو پوچھے اور کڑک کر کہا۔ نماز جنازہ کی نیت اور ارکان یاد ہیں یا بھول گئے؟ کئی بار پڑھا چکا ہوں۔“

”ہاں ہاں، یاد ہیں۔“ میں نے بلند آواز سے کڑک کر جواب دیا۔ اور دبے لفظوں میں نماز جنازہ کی نیت، نماز جنازہ کے ارکان اور مولوی صاحب کی ماں بہن کو بڑی تجھش گالیاں دیں۔

”یہ ہاں ہاں کیا ہوتا ہے؟“ مولوی صاحب سانپ کی طرح پھنکا رے۔ ”جی نہیں کہا جاتا، سور کیس کے!“

میں نے دل ہی دل میں انہیں چند اور گالیاں دیں اور پھر زبان باہر نکال کر ان کا منہ چڑا دیا۔ مولوی صاحب نے جھپٹ کر اپنا جوتا اٹھایا اور زور سے میری طرف پھینکا لیکن  
URDU4U.COM  
ثانہ خطا گیا۔

گھر سے تو جنازے کے ساتھ دس بارہ آدمی چلے تھے لیکن قبرستان تک پہنچتے پہنچتے صرف پانچ چھ ہی باقی رہ گئے۔ قبرستان میں خوب چھل پہل تھی۔ گورکن بھی خوب مصروف تھے۔ تین چار قبریں پاس پاس کھد رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے صادقة بیگم کو لحد میں اٹا را اور جلدی جلدی بیٹھے چلا کر اس کے تن بدن پر بھوری بھوری مشی کا اونچا سا انبار لگا دیا۔ ایک شخص نے پانی کا آدھا پیپا انڈیل کر قبر پر چھڑ کاؤ کیا اور فاتحہ پڑھ کر سب لوگ لوت گئے۔

میں نے سوچا کہ اور کچھ نہیں تو چبیس ممل کا دوپٹہ کم از کم صادقة بیگم کے مزار پر ہی چڑھا دوں۔ لیکن دوسرے جنازوں کے کچھ لوگ آس پاس کھڑے تھے اس لیے میں جھینپ گیا اور اپنا بستہ بغل میں دبا کر چپ چاپ واپس چلا آیا۔

## • نندہ بس سروس

جموں میں جب پلیگ کے کیس دن بہ دن بڑھتے ہی گئے تو گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ بچوں کو موت کے منہ سے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ عرصہ کے لیے سری نگر بیچ دیا جائے۔

سری نگر کے لیے ہم نندہ بس سروس کی لاری میں سوار ہوئے۔ اس کے اندر اور باہر چاروں طرف موٹے موٹے حروف میں کالی اور سرخی سیاہی میں ”نندہ ہاؤس برازی سستی“ کے اشتہار ہی اشتہار تھے۔ نندہ ہاؤس جموں کشمیر میں کپڑے کی سب سے بڑی اور کشادہ دکان تھی۔ اس میں آٹھ دس کارندے ہر وقت کام میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن دکان کے مالک نندہ صاحب خود بھی بنفس نفسیں صبح سے شام تک بڑے انہاک سے کام کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے فربہ تن و توش کے بے حد سعیم و سعیم آدمی تھے اور اپنا وزن قابو میں رکھنے کے لیے ہر روز علی الصبح باقاعدگی سے ورزش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ سڑک پر ایک دو فرلانگ لشتم پشم قہل قدی کیا کرتے تھے جس طرح بادبائی جہاز سطح آب پر ہچکو لے کھاتا ہے۔ اور پھر لکڑی کی دو ڈھائی فٹ اونچی چوکی پر کھڑے ہو کر بر سر عام دس بارہ چھلانگیں لگایا کرتے تھے۔ حفظان صحت کے ان تقاضوں کو پورا کر کے نندہ صاحب اپنی دکان کے فرش پر نانگیں پسارت کر گاؤں تکیہ کے سارے بینہ جاتے تھے۔ گاہک چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، ہزاروں کے مال کا خریدار ہو یا دو تین گز مملک کا طلبگار، نندہ صاحب سب کے ساتھ یکسان اخلاق، انہاک اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ان کے کارندے گاہوں کے سامنے کپڑوں کے تھانوں پر تھان کھول کھول کر ڈھیر لگاتے جاتے تھے، اور چھوٹے سے چھوٹا گاہک بھی وہاں سے عزت نفس کا ایسا احساس لے کر اٹھتا تھا کہ پھر عمر بھر اس کے لیے کسی اور دکان کا منہ دیکھنا

ہندو تنظیمیں ان کی مالی اعانت کی مرہون منت تھیں۔ خاص طور پر ہندو مہا سبھا اور جن  
سگھ کے تربیتی اکھاڑوں پر ان کی بڑی نظر عنایت تھی۔ ان اکھاڑوں میں ہندو نوجوانوں  
کو جنگی کرتب سکھائے جاتے تھے تا کہ مسلمانوں کے ساتھ مقابلے میں وہ ان پر ہمیشہ غالب  
آئیں۔ ایک خفیہ کلب میں ہندوؤں کو خصوصی ٹریننگ دے کر جوانوں کا ہر اول دستہ  
تیار کیا جاتا تھا کہ جب مسلمان عید میلاد النبی کا جلوس نکالیں تو اس پر حملہ کر کے  
اسے درہم برہم کر دیا جائے۔ نندہ صاحب ان تمام انتظامات کی بڑی خاموشی اور خوشدلی  
سے سپرستی فرماتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ عید میلاد النبی اور محرم کے جلوسوں کے  
پانی کی کچھ سبیلیں بھی وہ بڑی باقاعدگی سے لگایا کرتے تھے۔

نندہ بس سروس کی جس لاری میں ہم سوار ہوئے، اس میں پندہ کے قریب اور مسافر  
بھی تھے۔ ایک پنس آف ولیز کالج کا کشمیری پنڈت پروفیسر تھا۔ جو اپنی پنڈتانی کے ساتھ  
گرمی تعطیلات گزارنے سری گنگر جا رہا تھا۔ اس شدت کی گرمی میں پنڈتانی نے ابھی  
سے اونی فرن پن رکھا تھا، اور سر سے پاؤں تک پٹھینے کی گرم چادر اوڑھی ہوئی  
تھی، اس کے ایک ہاتھ میں پانی کی گڑوی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک کامگزی تھی۔  
کامگزی نصف کے قریب راکھ سے بھری ہوئی تھی، تا کہ چیخ در چیخ پہاڑی سڑک کے  
موڑوں پر جب پنڈتانی کا جی متلائے تو وہ بے تکلفی سے اس میں قے کرتی جائے۔

ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر ایک ادھیز عمر کی گوری چٹی، بھاری بھر کم عورت چنار  
کے درخت کی طرح پھیلی ہوئی تھی جس پر خزان کے موسم میں پت جھڑ کا عمل تیز  
رفتاری سے شروع ہو چکا تھا۔ اس کا آدمی اس کے میں پیچھے والی سیٹ پر براجمان تھا۔  
اس نے گیگرڈین کی برجس اور بند گلے کا چست کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر سلیٹی رنگ  
کی ترچھی فیٹ ہیٹ تھی جس میں مور کے کنٹی پر آویزاں تھے۔ آنکھوں پر موٹے موٹے  
شیشوں کی سیاہ عینک تھی۔ کندھے سے براون چرمی تھیلا لٹک رہا تھا۔ جس میں کیمرہ،  
دوربین، ثانیاں اور شراب کی ایک لمبی سی بوتل تھی۔ وقتہ فوقہ وہ اس بوتل سے چکلی

دشوار ہو جاتا تھا۔ یوں بھی تھان میں سے کپڑا چاڑتے وقت نندہ صاحب ایک دو انگل کپڑا گاہک کے حصے میں بڑھا دیتے تھے، اور قیمت کے مول تول میں کچھ ایسا ہنس کھ رو یہ اختیار کرتے تھے گویا ان کا اصلی مقصد منافع کمانا نہیں بلکہ خریدار کا دل خوش کرنا ہے۔ کاروبار کی اس خوش کاری کے ساتھ ساتھ نندہ صاحب کو اشتہار بازی کے فن پر بھی یہ طولی حاصل تھا۔ شر اور گاؤں کے در و دیوار ہوں یا جنگل میں درختوں کے تنے، دور دراز ویرانوں میں پھریلی چٹائیں ہوں، یا آبادیوں میں بجلی کے کھبے، ہر جگہ کونے کونے اور گوشے گوشے میں ”نندہ ہاؤس برازی سستی“ کا کتبہ موٹے موٹے حروف میں نگاہوں کا تعاقب کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نندہ صاحب کے کاروبار کو چار چاند لگ گئے۔ برازی کی دکان تو دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ اب انہوں نے لاہور سے جموں اور جموں سے سری گنگر تک ایک منظم بس اور ٹیکسی سروس بھی شروع کر دی تھی۔ ساتھ ہی جموں میں پہلا سینما ہال بنانے اور چلانے کا سرا بھی ان ہی کے سر رہا۔ مہاراجہ ہری گنگہ کی خوشابد میں انہوں نے اس کا نام ”ہری نا کیز“ رکھا۔ چالپوسی اور خوشابد کے فن میں بھی نندہ صاحب بڑے اہل کمال تھے۔ عام خریداروں سے لے کر والیان بیاست کی خوشنودی حاصل کرنا تو ان کا باسیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن داسیں ہاتھ سے وہ اپنے بھگوان کو راضی رکھنے کے لیے بھی بڑے جتن کرتے تھے۔

ان کی فیاضی اور داد و دہش کے عجیب و غریب قصے مشہور تھے۔ یہ بات زبان زد خاص و عام تھی کہ شام کو دکان بڑھا کر وہ بہت سی ہندو یواؤں، قبیلوں اور محتاجوں کے ہاں بذات خود جاتے تھے، اور ایک مخصوص قسم کا ”گپت دان“ ان میں تقسیم کرنے کے بعد اپنے گھر میں پاؤں رکھتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، بارش ہو یا آندھی، کاروبار میں نفع ہو یا نقصان، خفیہ اور خاموش خیرات کے اس تسلسل میں نامہ نہ پڑتا تھا۔ جس پابندی سے نندہ صاحب ”مایا دھرم“ کا پالن کرتے تھے، اسی طرح وہ ہندو جاتی کی سیاسی برتری قائم رکھنے کے لیے بھی خفیہ طور پر مستقل جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ شر کی بہت سی

لگا کر تھیلے سے کیمرو، دوربین اور ٹافیاں برآمد کرتا تھا اور اپنے پلو میں بیٹھی ہوئی ایک چھریری سی خوبصورت پارسی لڑکی کو کھلونوں کی طرح دکھاتا تھا۔ بس میں داخل ہوتے ہی اس شخص نے جملہ مسافروں کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ بمبئی کے ایک بہت بڑے آغا ہیں۔ ہر سال گرمیوں میں شکار کھیلنے کشمیر آتے ہیں۔ اور مہاراج اور ادھیراج کے مہمان ہونے کا شرف پاتے ہیں۔ اس بار بھی جب وہ سری نگر پنجیں گے تو امید واثق ہے کہ خبر پاتے ہی ہزہائنس انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور شاہی مہمان خانے کی زینت بنائیں گے۔ مسافروں میں کون ایسا کافر تھا جو اس امید کے بر آنے پر فی الفور ایمان نہ لے آتا۔ کیونکہ جو نیم بھار ایسے غنچے امید کو واکرتی ہے اسے آغا صاحب احتیاطاً بمبئی ہی سے پارسی لڑکی کی صورت میں اپنے ساتھ لیتے آئے تھے، اور وہ راج محل کے لیے پروانہ راہداری کی طرح ان کے پلو میں بیٹھی مزے مزے سے ٹافیاں کھا رہی تھی۔

آغا صاحب کی تقریر دلپذیر کا مسافروں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور وہ اپنی اپنی سیٹ پر اور بھی نیا وہ دبک کر سکر گئے۔ سکھ ڈرائیور بھی مرعوب نظر آتا تھا۔ اس نے کلیز کو ڈانٹا کہ وہ وقت ضائع نہ کرے اور گاڑی کو فوراً اشارث کرے۔ کلیز نے اچھل کر اچھل کر زور زور سے پینڈل گھمایا۔ انہیں نے دو چار اجتماعی سکیاں لیں اور پھر کڑک کر چالو ہو گیا۔ بس کے پیسوں نے حرکت کی تو گرم شال میں لپٹی ہوئی پینڈتائی نے بھی آغا ز سفر کا شگون لیا۔ اور عاؤ عاؤ کر کے کاگنڈی میں اپنی پہلی قہ کر ڈالی۔ شر سے نکل کر رام نگر سے گزرے تو مہاراجہ اور مہارانی کے محلات آئے۔ آغا صاحب پارسی لڑکی کے سر سے سر جوڑ کر بینٹھ گئے اور سر گوشیوں میں اسے راج محل کی داستان الٹ لیلی مزے لے لے کر سنانے لگے۔ فرنٹ سیٹ پر چھائی ہوئی خزان دیدہ بیگم کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے اپنے نازک سے صندلی ٹکھے کی ڈنڈی گھما کر آغا صاحب کا منہ پارسی لڑکی کے کافنوں سے اس طرح الگ کر دیا جیسے بلی کے منہ سے چھپی چھڑا

کھینچ لیا جاتا ہے۔ آغا صاحب نے اپنے چند رجسٹر جسے چہرے پر بھڑوں کے چھتے کی طرح لٹکی ہوئی مونچھوں کو دونوں ہاتھوں سے مروڑا اور خشونت سے پنڈتاں کو گھورا جو کانگڑی میں منہ دیئے بڑی پابندی سے اپنا فریضہ استفراغ ادا کر رہی تھی۔

”یہ بس ہے یا چمار خانہ؟“ آغا صاحب گرجے۔ ”چاروں طرف بدبو ہی بدبو پھیلا رکھی ہے۔ تو بہ تو بہ، ناک میں دم آ گیا ہے۔“

آغا صاحب کی ناراضگی بھانپ کر کلیز اپنی جگہ سے اٹھا اور پنڈت اور پنڈتاں کو دھکیل دھکال کر سب سے الگ تھلگ بس کے آخری کونے میں بٹھا دیا۔ پنڈتاں کو تو خیر آرام ہو گیا کہ وہ جب جی چاہے کھل کر بے روک ٹوک قے کرتی جائے لیکن کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب کا نخل تمنا برپا ہو گیا۔ جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ آغا

صاحب کے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ ذاتی مراسم ہیں تو انہوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ اس وسیلہ کو اپنی مقصد برداری کے لیے ضرور کام میں لا سیں گے۔ پروفیسر

صاحب کئی برس سے تجھ و دو کر رہے تھے کہ کسی طرح ان کا تباولہ پرنس آف ولیز کالج جموں سے سری پرتاب کالج سری نگر ہو جائے۔ لیکن کامیابی نہ ہوتی تھی۔ اب

بس میں آغا صاحب کو ہم سفر دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ شاید یہ فرشتہ رحمت ان کی حاجت روائی کے لیے ہی غیب سے نازل ہوا ہو۔ چنانچہ وہ بڑی محنت سے کھک کھک کر آغا صاحب کی سیٹ کے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

کچھ عجب نہیں کہ سری نگر تک پہنچتے پہنچتے وہ پاری لڑکی سمیت آغا صاحب کو شیشے میں اتار لیتے، کیونکہ کشمیری پنڈت کی شان یہ ہے کہ اسے کسی دفتر کی ادنی سے

ادنی اسای پر تعینات کر دیا جائے تو وہ دیمک کی طرح سارے عملے کو اندر ہی اندر چاٹ کر اوپر والی کرسی پر سر نکالتا ہے۔ لیکن کلیز نے انہیں پچھے دھکیل کر سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔ اب پنڈتاں تو بڑے اطمینان سے کانگڑی میں منہ ٹھونے بیٹھی تھی اور پروفیسر صاحب بھد حست و یاس ان خوش قسم مسافروں کا منہ تک رہے تھے جنہیں

اب بھی آغا صاحب کی سیٹ کا قرب حاصل تھا۔

رام مگر سے ذرا آگے سکھ ڈرائیور نے بس کی رفتار احتراماً ہلکی کر دی۔ کیونکہ یہاں پر نشیب میں درختوں کے جھنڈ کے درمیان ”بیخ پیر“ کی کمنہ اور بویسہ سی قبریں تھیں۔ کچھ مسافروں نے گردن جھکا کر ”بیخ پیر“ کو سلام کیا۔ اب پہاڑی راستہ شروع ہونے والا تھا اور بس گھاؤں گھاؤں کرتی پیچ در پیچ سڑک پر چلنے لگی جو بھورے پہاڑ اور سبز درختوں کے ساتھ کالے رن کی طرح لپٹی ہوئی کبھی اوپر اٹھتی تھی، کبھی نیچے لڑکتی تھی اور کبھی بڑے بڑے بیضوی دائرے کاٹ کر نظر سے او جھل ہو جاتی تھی۔ ایک طرف سنگلاخ چٹانیں ہی چٹانیں تھیں۔ دوسری طرف پر میب گمراہی ہی گمراہی۔ جگہ جگہ پہاڑی جھرنوں کا پانی چھوٹی چھوٹی شفاف چادریں بن کر چٹانوں کے اوپر بہتا تھا۔ سڑک کے کنارے پکے چبوترے اور حوض بنے ہوئے تھے۔ اور جھرنوں کا پانی لوہے کے ٹل کے ذریعے چوبیں گھنٹے ان پر گرتا رہتا تھا۔ ہندو ڈوگرے ان نلوں کی دھار کے نیچے کھڑے ہو کر نہاتے بھی تھے، کپڑے بھی دھوتے تھے، پانی بھی پیتے تھے۔ مسلمانوں کو ان چبوتروں کے پاس تک پہنچنے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ ان کے چھونے سے چشمے کا صاف پانی ناپاک ہو کر بھرثت ہو جاتا تھا۔ جو بچا کھچا مستعمل پانی چبوتروں سے بہہ کر لکھتا تھا، اس کی نکاس سڑک کے دوسری جانب نشیب کی طرف تھی۔ یہاں سے یہ از سر نو ایک بیماری آبجو بن کر نیچے کی طرف رواں ہو جاتا تھا۔ اس سینکڑہ پینڈ پانی کو اپنے استعمال میں لانے کے لیے مسلمانوں کو کھلی چھٹی تھی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے بس کا پانی بدلنے کے لیے ایک چشمہ کے پاس پڑا و کیا اور مسافروں کو وارنگ دی کہ یہاں سے چل کر اب وہ اودھم پور پیچ کر رکے گا۔ اس لیے جس نے کچھ کھانا پینا ہو وہ بیسیں سے کھا پی کر چلے۔ سڑک کے کنارے ایک چپر میں حلوائی اور سوڑا واٹر کی دکان تھی۔ ایک تحال میں باسی پکوڑے تھے جن پر کچھ مکھیاں بے مل سے منڈلا رہی تھیں۔ دوسرے تحال میں لڈو تھے جن پر

سری نگر بانہال روڈ کی گرد اس قدر تھے در تھے جوئی ہوئی تھی کہ ان پر مکھیوں نے بھی سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ لکڑی کے براۓ میں لٹ پت برٹ کی سل ایک میلے سے ثاث میں لپٹی ہوئی تھی اور لیمونیڈ کی بہت سی بوتلیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔

سب سے پہلے دکاندار نے پتوں کے دونے میں پکوٹیاں اور لٹو ڈال کر لیمونیڈ کی ایک ایک بوتل کے ساتھ بس کے ڈرائیور اور کلیز کو نذرانہ دیا۔ آغا صاحب اپنی بیگم اور پارسی لڑکی کو لے کر سائے میں ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور اپنی تھرموس، شراب، گلاس اور سینڈوچ نکال کر پکنک منانے لگے۔ باقی مسافروں نے لیمونیڈ کی بوتلوں پر یورش کی۔ دکاندار نے چار چار لٹو اور کچھ پکوڑے ڈال کر بہت سے دونے تیار کر رکھے تھے۔ جو مسافر لیمونیڈ طلب کرتا، اسے مٹھائی کا ایک دوتا بھی زردستی خریدنا پڑتا تھا۔ باقی سب مسافر تو خیر اپنی اپنی بوتل اور گلاس اور برٹ لے کر چھاؤں میں بیٹھ گئے لیکن سات آٹھ مسلمان پسنجروں کو لیمونیڈ پینے میں بڑی دیر گئی۔ دکان سے باہر کونے میں ایک ٹوکری لٹک رہی تھی۔ اس میں کالچ کا ایک میلا سا گلاس اوندھا پڑا تھا۔ مسلمان خریدار اس گلاس کو اٹھا کر فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلائے دکاندار کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ دکان والا دور ہی دور سے اس میں برٹ کی ڈال چھٹاک سے پھینکتا تھا اور پھر بوتل کھول کر ڈیڑھ دو فٹ کی بلندی سے گلاس میں لیمونیڈ انڈیل دیتا تھا۔ کچھ جھاگ خریدار کے ہاتھ پر پڑتی تھی، کچھ چھینتے اس کے کپڑوں پر اڑتے تھے اور دو تین گھونٹ بوتل میں نیچ رہتے تھے، جسے منہ لگا کر اور ڈکار مار کر حلوائی خود ہضم کر لیتا تھا۔ لیمونیڈ پی کر ہر مسلمان اپنا گلاس دھو کر دوسرے خریدار کے لیے باہر والی ٹوکری میں لٹکا دیتا تھا۔ بس کا ڈرائیور زور سے ہارن بجا کر جلدی مچا رہا تھا۔ کلیز بھی بے صبری سے آوازیں دے رہا تھا۔ آغا صاحب الگ ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ البتہ کشمیری پنڈت پروفیسر مطمئن بیٹھے تھے۔ انہوں نے حلوائی کی بھٹی سے پنڈتانی کی کانگڑی میں نبی راکھ مفت بھر لی تھی اور موقع پا کر آغا صاحب کے ساتھ اپنی گفتگو کی تمہید بھی باندھ لی تھی۔

کلیز سے ساز باز کر کے انہوں نے اپنی جگہ بدل لی تھی۔ اور پنڈتانی کو چھپلی سیٹ پر اکیلے چھوڑ کر اب وہ آغا صاحب کے بالکل قریب آ بیٹھے تھے۔

URDU4U.COM  
بس دویاں روانہ ہوئی تو تانہ دم تھی لیکن ڈرائیور کا مودہ بت جلد خراب ہو گیا۔ سڑک پر تاحد نظر تتر تر انسانوں کی لائن ہی لائن لگی ہوئی تھی۔ میلے میلے، بھورے بھورے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس خمیدہ کمر لوگ دو دو تین تین من وزن پیٹھے پر اٹھائے ریگ ریگ کر چڑھائی چڑھ رہے تھے، جیسے دیوار پر چیزوں کی بے ترتیب قطاریں چل رہی ہوں۔ انہوں نے خلک گھاس کے بنے ہوئے چپل پنے ہوئے تھے۔ اور ان کے تختماتے ہوئے چہرے پینے میں شرابور تھے۔ یہ کشمیری مسلمانوں کی قوم نجیب و چوب دست و تر دماغ کے نمائندے تھے۔ جنہیں عرف عام میں ”ہاتو“ کہا جاتا تھا۔ موسم سرما کے شروع ہوتے ہی وہ اپنا فردوس بر روئے نہیں چھوڑ کر پا پیا وہ قافلہ در قافلہ پنجاب کے میدانوں میں اتر جاتے تھے۔ ان کی ماں بھنیں اور بیٹیاں تو اپنے برف سے گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے چوبی گھروں میں ساری ساری رات کڑوا تیل جلا کر قالین بنتی تھیں یا شال اور غایپے کاڑھتی تھیں یا پھولدار نمدے بناتی تھیں یا اخروٹ کی لکڑی تراش تراش کر نازک نازک سگریٹ کیسون، تپائیوں اور پھولدانوں پر نقش و نگار کھوڈتی تھیں، جنہیں مقامی ساہو کار اونے پونے داموں خرید کر سیاحوں کے ہاتھ بڑی بڑی قیمت پر بیج ڈالتا تھا۔ سنان راتوں میں برفانی ہوا کے جھکڑ درختوں اور دیواروں اور چٹانوں سے نکرا کر خوفاک چینیں مارتے تھے۔ وقتہ فوقہ برف کے بڑے بڑے تودے چھتوں سے گر کر سنائے میں ززلوں کا ارتعاش پیدا کرتے تھے۔ تیل کے چراغ گل ہو جاتے تھے۔ کانگڑیوں کی آگ سلگ کر راکھ ہو جاتی تھی۔ لیکن لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کاکبوں میں محبوس بوڑھی اور جوان عورتوں کی فنکار انگلیاں اپنے کام میں لگاتار مصروف رہتی تھیں۔ دھڑکتے ہوئے دلوں سے وہ کبھی حضرت شاہ ہمدان کی حکایات میں مگن ہو جاتی تھیں، جنہوں نے وادی کشمیر میں اسلام کی شمعیں روشن کی تھیں۔ کبھی وہ لله عارفہ کے گیتوں میں صبر و قرار کا سارا ڈھونڈتی تھیں۔

صبر، بیٹا، صبر

صبر تو ایک سنری پالہ ہے

یہ اتنا بیش قیمت ہے کہ اسے خریدنے کا ہر کسی کو یارا نہیں

صبر، بیٹا، صبر

صبر تو نمک، مرج اور زیہ کا تیز مرکب ہے

یہ اتنا تنخ ہے کہ اسے چکھنے کی ہر کسی کو تاب نہیں

URDU4U.COM

جب کبھی برف و باراں کا طوفان تھائی کی راتوں کو اور بھی تاریک اور طویل کر دتا  
تھا تو ان کے شوق کی گمراہیوں سے ہبہ خاتون کے درد و فراق کے لغے لہرانے لگتے  
تھے۔

ویو میانہ پوشے مدنو ۔۔۔۔۔

میں سب رہگزاروں پر پھولوں ہی پھولوں کی سیج بچھا دوں گی  
اے میرے پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب

آ جاؤ

آؤ کہ

ہم مرغزاروں میں یاسمُن، نرین اور گلاب کے پھول چنیں  
آؤ کہ

ہم دونوں کنار دیا چلیں

ساری دنیا نیند کی آغوش میں بے ہوش پڑی ہے

میں تمہرے لیے سراپا انتظار بیٹھی ہوں

اے میرے پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب

آ جاؤ

ویو میانہ پوشے مدنو ۔۔۔۔۔

حضرت آدم علیہ السلام تو دانہ گندم کی پاداش میں خلد سے نکلے تھے لیکن ڈوگہ راج

میں کشمیری مسلمان دانہ گندم کی تلاش میں اپنی جنت ارضی سے نکلنے پر مجبور تھا۔ سرداں آتے ہی وہ گھرگ، گاندھر بل، اچھا بل، تراؤگ بل، بانڈی پور اور پانپور کے کھساروں اور مرغزاووں سے نکل کر پنجاب کی دور دراز منڈیوں میں پھیل جاتے تھے۔ دن بھر غلے اور لوہے اور کپڑے کی بار برداری کرتے تھے۔ بسوں اور تانگوں کے اڑوں پر سامان ڈھوتے تھے۔ لکڑی کے ٹالوں پر لکڑیاں پھاڑتے تھے اور شام کو مرغی کے بچوں کی طرح چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اسکھے بیٹھ کر کچھ چاول ابال لیتے تھے۔ خشکہ رات کو کھا کر کھلے آسمان تلے سو رہتے تھے اور صبح انھ کر رات کی بچی ہوئی پچھے میں نمک ملا کر دن کا کھانا بنا لیتے تھے۔ اس طرح خون پیسہ ایک کر کے گرمیوں میں جب وہ کچھ نقدی بچا کر اور دو ڈھائی من سامان پیٹھ پر لاد کر اپنی جنگ گم گشتہ کی طرف واپس لوٹتے تھے، کہیں کشم وائل ان کا مال لوٹتے تھے، کہیں کوئی ڈوگرا سردار بر سر عام ڈرا دھمکا کر ان کی پونجھی ہتھیا لیتا تھا، کہیں پولیس اور محکمہ مال کے الہکار انہیں سر راہ پکر کر کئی کئی دن کئی کئی ہفتے مفت کی بیگار میں لگائے رکھتے تھے۔ یوں بھی کشمیری مسلمان کا بال بال ڈوگرا حکومت کے لا تعداد ٹیکسوں میں جکڑا رہتا تھا۔ پھلوں پر ٹیکس، سبزی پر ٹیکس، بھیڑ، بکری اور گائے پر ٹیکس، چولہا ٹیکس، کھڑکی ٹیکس، اوں ٹیکس، شال ٹیکس، بخار اور خیاط پر ٹیکس، مزدور اور معمار پر ٹیکس، نانبائی اور لوہار پر ٹیکس، ملاح اور کھمار پر ٹیکس، ارباب نشاط پر ٹیکس ..... بس فقط ایک جام تھا، جو ٹیکسوں کی مکڑی کے جالے میں کسی وجہ سے گرفتار نہ تھا۔

کشمیری مسلمانوں کا مال و متاع تو ہر وقت یاست کے الہکاروں، خفیہ نویسوں، رئیسوں اور جاگیرداروں کے رحم و کرم پر رہتا ہی تھا، اس غریب کی جان بھی اپنی سر نہیں میں بے حد ارزان تھی۔ ایک زمانے میں کشمیری مسلمان کی زندگی کی قانونی قیمت مبلغ دو روپے تھی۔ اگر کوئی سکھ یا ڈوگرا کسی مسلمان کو جان سے مار ڈالتا تھا، تو عدالت قاتل کو سولہ سے بیس روپیہ تک جرمانہ عائد کر سکتی تھی۔ دو روپے مقتول کے لواحقین کو

عطایا ہوتے تھے اور باقی رقم خزانہ عامرہ میں داخل ہوتی تھی۔ جس وقت انگریزوں نے اس جنت ارضی کو ڈوگروں کے ہاتھ فروخت کیا تو یہ نرخ ذرا بالا ہو گیا۔ کشمیر کا سودا ۷۵ لاکھ روپے پر طے ہوا تھا۔ اس وقت کی آبادی کے حساب سے باشندوں کی قیمت سات روپے فی کس کے قریب پڑی تھی۔ ڈوگرہ راج میں کسی وقت مسلمانوں کی زندگی ایک گائے کا درجہ بھی نہ پاسکی۔ شروع شروع میں گاؤں کشی کی سزا موت تھی۔ ملزم کو رسیوں سے باندھ کر سڑکوں پر گھسیٹا جاتا تھا، اور پھر بر سر عام پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا، لیکن بعد میں بھی گائے ذبح کرنے کی سزا دس سال قید بامشقت ہمیشہ رہی۔ کئی جگہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر بھیڑ یا بکری قربان کے لیے بھی حکومت کی اجازت حاصل کرنا پڑتی تھی۔ جو کبھی ملتی تھی، کبھی نامنظور ہو جاتی تھی۔ ان سب دشواریوں، رکاوٹوں، پابندیوں اور لوٹ مار کے باوجود کشمیری ”ہاتو“ اپنی سر نہیں کے ساتھ والہانہ طور پر وابستہ تھا۔ پنجاب کے میدانوں اور منڈیوں میں اسے اجرت بھی نیاہ نہیں ملتی تھی۔ بیگار بھی کوئی نہ لیتا تھا۔ اور بڑا گوشت کھانے پر قید کی سزا نہ موت کی۔ لیکن گرمیاں آتے ہی وہ رے سے تڑا کر بھاگ اٹھتا اور اپنا مال و متاع پیٹھ پر لاد کر پاپیاہ کشاں کشاں اپنی دور افتابیہ وادیوں کی راہ لیتا تھا۔ بانسال سری گمراہ روڈ پر جا بجا ان کے قافلے اپنی جنگ گم گشٹہ کی طرف رواں دواں تھے۔ ان کو دیکھ کر پہلے تو ہماری بس کے ڈرائیور کی رُگ طرافت پھر کی۔ ایک موڑ پر بھاری بھر کم بوجھ تلتے دبے ہوئے چند خمیدہ کمر کشمیری سڑک کے بیچ آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ڈرائیور نے عین ان کے پیچھے پہنچ کر زور سے ہارن بجا دیا۔ وہ خوف سے کانپ اٹھے اور بد حواس ہو کر ایک دوسرے سے نکلائے۔ کوئی لڑک کر گھٹنوں کے بل گرا۔ کوئی بس کے ٹھگارڈ سے نکلا یا۔ کسی نے لجاجت سے ہاتھ باندھ کر ڈرائیور کی منت کی۔ کچھ مسافر کھیانی سی نہیں ہے۔ آغا صاحب نے زور دار تقصیے بلند کئے۔ نوجوان پاری لڑکی اس نظارے سے خاص طور پر محظوظ ہوئی۔ اس نے جھٹ پٹ آغا صاحب کا کیمرہ لیا اور سڑک پر گرتے پڑتے بد

حوالوں کی تصویریں اتارنے لگی۔ فوکس ٹھیک کرنے کے لیے آغا صاحب نے لڑکی کا سر اپنے سینے سے لگا کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ان کی بیگم نے صندلی پنچھے کی ڈنڈی ان کے کان میں چھبو کر اس بندوست میں رخنہ ڈالا اور بس شاداں و فرحاں گھاؤں گھاؤں کرتی اگلے موڑ پر پنچھی۔ یہاں بھی ہاتوؤں کے ساتھ وہی تماشا ہوا۔ پھر اس سے اگلے موڑ پر ..... پھر اس سے اگلے موڑ پر ..... تین چار موڑوں کے بعد سب کی طبیعت اس دلپسند مشغله سے سیر ہو گئی۔ اب اگر کوئی کشمیری سرڑک کے درمیان نظر آتا، تو ڈرائیور کے مزاج کا پاہہ چڑھ جاتا۔ اور وہ سیاہ چشمان کشمیر کی آل اولاد کو کئی پشت تک بڑی غلیظ گالیاں دیتا۔ کلیز بھی ایک موٹا سا سونٹا لے کر بس کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ اور اسے گھما گھما کر راستہ صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اپنے بوجھ کے تلے دبے ہوئے بچارے کشمیری بے بسی سے پریشان ہو کر سرڑک پر ادھر ادھر بھاگتے تھے، اور پہاڑی ڈھلوانوں پر سایہ دار درختوں کے نیچے کے چبوتروں پر بیٹھے ہوئے ڈوگروں کے لیے بڑی ضیافت طبع کا سامان فراہم کرتے تھے۔

لانے لانے کرتوں اور چوڑی دار پاچاموں میں ملبوس بڑی بڑی موچھوں والے ڈوگرے ریاست میں شاہی اولاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے پاس وسیع جنگلات ہوں یا ایک دو ایک اراضی، وہ اپنے نام کے ساتھ راجہ یا ٹھاکر یا دیوان کا دم چھلا ضرور لگاتے تھے اور چھاتی نکال کر ایسے دم خم سے چلتے پھرتے تھے جیسے وہ ابھی ابھی راج محل کے پنگھوڑے سے انگوٹھا چوتے ہوئے برآمد ہوئے ہوں۔ ان کی اراضیاں مسلمان مزارے کاشت کرتے تھے۔ ان کے مویشی مسلمان بچے جنگلاتی چڑاگاہوں میں چراتے تھے۔ اور وہ خود آلتی پالتی مار کر بیٹھے چلم پیا کرتے تھے۔ چلم پینے کے علاوہ اپنے گھٹے ہوئے سر پر بر سر عام تیل کی ماش کرانا بھی ان کا محبوب مشغله تھا۔ ماش کے بعد وہ اپنی چنڈیا پر لمراتی ہوئی سات آٹھ انج لمبی ”بودی“ کو موچھوں کی طرح تماو دیتے تھے، اور دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رسی کی طرح باث کر چچ در چچ کارک سکرو کی مانند اینٹھے لیتے تھے۔ ان عجیب الحلقہ

ڈوگروں کے آس پاس شیشم اور دیار اور چیزہ کے درختوں کے نیچے اگر کوئی بائیکی ترچھی ڈوگری سر پر پیٹل کی دمکتی ہوئی گاگر اٹھائے لٹکتی ملکتی گزر جاتی تھی تو پہاڑ کی گپڈنڈیوں پر گوٹے اور کناری اور لچکے کی جھالریں ہی جھالریں پھیل جاتی تھیں۔ اور سڑکوں پر چلتی ہوئی بسوں کے ڈرائیور منہ اٹھا کر ان ڈوگریوں کے نظارے میں اتنے محبو ہو جاتے کہ بیس گرنے سے بال بال بچتی تھیں۔

ہماری بس بھی کئی بار کھڈ میں گرتے گرتے بچی۔ آغا صاحب تو بڑے خوش تھے، کیونکہ ہر بار پارسی لڑکی خوف سے چینخ مار کر ان کے ساتھ لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ لیکن ان کی بیگم نے ڈرائیور کو خوب آئے ہاتھوں لیا۔ ایک سخت تادبی تقریر کے بعد انہوں نے ڈرائیور کو ایک ایسی طویل اور چیزیدہ گالی دی کہ اس فن میں مشاق ہونے کے باوجود وہ ہکا بکا نہ گیا، اور شرم سے اس کے کان سرخ ہو گئے۔

”ہماری خانم دراصل ملکہ دشنا میں ہیں۔“ آغا صاحب نے پنڈت مسافر کو مخاطب کر کے سب مسافروں کو مطلع کیا۔ ”بڑے بڑے مہاراجہ اور نواب اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ ایک بار سری مہاراجہ بہادر نے چشمہ شاہی پر گالی گلوچ کا بڑا شاندار نورنامہ منعقد کیا تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ الور، نواب آف پالن پور، مہارانا جھالا دار سب موجود تھے۔ گالیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ سب نے اپنے کمال کے جوہر دکھائے لیکن ٹرافی ہماری خانم نے ہی جیتی۔“

کشمیری پنڈت پروفیسر نے گھلگلیا گھلگلیا کر اپنے گلے سے کچھ آوازیں برآمد کر کے حسب توفیق داد دی۔

”جانتے ہو، خانم کی گالی کتنی طویل تھی؟“ آغا صاحب نے ڈانٹ کر پوچھا۔

پنڈت صاحب خوشامدانہ حیرت و استتعاب سے جڑے لٹکا کر بینھ گئے جیسے کبری کا میمنہ گھاس وصول کرنے کے لیے تھوڑتھی کھوتا ہے۔

”خانم کی گالی ڈیڑھ منٹ دراز تھی، پوری ڈیڑھ منٹ۔“ آغا صاحب نے اعلان فرمایا۔

پنڈت جی ایک بار پھر تانہ حق کی طرح گزگڑائے۔ اور آغا صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فن دشناں طرازی کے حق میں ایک عالمانہ تقریر جھائٹے کے لیے پرتوں لے گئے۔ لیکن ڈرامیور نے انہیں مہلت نہ دی۔ اودھم پور آگیا۔ اور بس لاڑیوں کے اڈے پر جا کر رکی۔

اوڈھم پور کے اڈے پر بڑی ریل پیل تھی۔ بس رکتے ہی پولیس کے کچھ سپاہیوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ اور یہ خوش خبری سنائی کہ سری نگر میں ہیضہ کی واپسی ہوئی ہے۔ اس لیے اناکولیشن سریفیکٹ حاصل کئے بغیر کوئی شخص آگے سفر نہیں کر سکتا۔

اوڈھم پور کی فرض شناس میونسلیٹی نے اناکولیشن کا بندوبست بھی اڈے ہی پر کر رکھا تھا۔ ایک کھلی جگہ ایک چھوپداری نصب تھی جس کے باہر بورڈ پر جملی حروف میں یہ تحریر تھا۔

”خوش آمدید ..... جی آیاں نوں  
ہیضے کا یہاں مفت لگوایے  
از طرف خادم سیاحاں  
میونسل کمیٹی اوڈھم پور“

اندر یہ کہ لگانے کا کوئی سامان نہ تھا۔ البتہ ایک بابو بہت سے خالی فارم اور ہیلتھ آفسر کی مر لیے ضرور بیٹھا تھا۔ ہر مسافر سے وہ تین روپیہ نذرانہ وصول کرتا تھا اور فارم پر کر کے اور ان پر مر لگا کے ان کے حوالے کرتا تھا۔ باہر ایک روپیہ پولیس والا لیتا تھا۔ آئٹھ آنے کلیز مانگتا تھا۔ اور اس طرح ساڑھے چار روپے میں ویائے ہیضہ کا انداد کرنے کے بعد مسافر کو بس میں دویاہ داغلہ نصیب ہو جاتا تھا۔ ہم اس سعادت سے محروم رہے کیونکہ ہم تو پلیگ سے بچنے کے لیے جموں سے نکلے تھے، ہیضے میں بتلا ہونے کے لیے سری نگر نہیں جا رہے تھے۔ اس لیے ہم بس سے اتر گئے اور اگلے روز ایک دوسری لاری سے جموں واپس لوٹ آئے۔

## • چکور صاحبے

جموں میں پلیگ، سری نگر میں کالا ..... اب ہماری جائے پناہ چکور صاحب تجویز ہوئی۔  
 جموں توی کے ریلوے اسٹیشن سے ہم ٹرین میں سوار ہوئے تو ریل کا یہ پہلا سفر مجھے  
URDU4U.COM  
 بڑا افسانوی محسوس ہوا۔ ریل چھوٹے ہی میں کھڑکی سے باہر منہ نکال کر بیٹھ گیا اور  
 گرد و پیش کے عجیب و غریب ماحول کو دیکھنے لگا۔ نزدیک کے کھمبے بر ق رفتاری سے  
 پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ دور کے درخت بڑے آرام سے ہمارے ساتھ ساتھ  
 آگے کی طرف رواں تھے۔ وسطی کائنات ساکت و جامد تھی۔ کچھ دیر کے بعد پہیوں کی  
 گڑگڑاہٹ میں تال اور سر کے ساتھ طبلوں کی تھاپ بننے لگی۔ اور انجن کی بھپا بھک،  
 چھکا چھک میں بھی موسیقی کی بہت سی دھنیں سما گئیں۔ ریل کی پیٹری میں جب کوئی  
 موڑ آتا تھا، تو ٹرین ریڈ کے سانپ کی طرح بل کھا کر انہیکیلیاں کرتی ہوئی گزر  
 جاتی تھی۔ ایک موڑ پر میں ٹرین میں لگے ہوئے ڈبوں کی تعداد گن رہا تھا کہ شا شا،  
 شوں شوں کر کے انجن نے بڑے زور سے دھواں چھوڑا اور کوئلے کا ایک ذہن میری  
 آنکھ میں پڑ گیا۔ معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میری پلکوں کے اندر یا سلامی  
 رگڑ کے جلا دی ہو۔ آنکھیں مل مل کر میرا برا حال ہو گیا۔ اور دائیں آنکھ بوٹی کی  
 طرح سرخ ہو کر سوچ گئی۔ سزا کے طور پر مجھے کھڑکی والی سیٹ سے اٹھا کر کمپارٹمنٹ  
 کے درمیان ایک محفوظ جگہ بٹھا دیا گیا۔

چھوٹے بڑے اسٹیشن آتے تھے۔ ٹرین رکتی تھی۔ گارڈ سبز جھنڈی پلاٹا تھا۔ انجن سیٹ بجا تا  
 تھا۔ اور گاڑی پھر روانہ ہو جاتی تھی۔ پلیٹ فارموں پر بڑی چھل پل پل تھی۔ قلی اور مسافر  
 بد حواسی سے ادھر ادھر بھاگتے تھے۔ چھاپڑیوں اور خوانچے والے بھانت بھانت کی صدائیں  
 لگاتے تھے۔ ”ہندو پانی“ ..... ”مسلمان پانی“ ..... گرم پوری، گوشت روٹی، لیمن  
 برف .....

میں دور ہی دور بیٹھا اس رونق کو بعد حسرت و یاس دیکھتا رہا۔ اور دل میں عزم بالجزم کر لیا کہ جب کبھی میں اکیلا سفر کروں گا تو ہر بڑے اشیشن پر اتر کے کچھ نہ کچھ ضرور کھاؤں گا۔ چلتی ہوئی گاڑی سے لپک کر پلیٹ فارم پر اترا کروں گا۔ اور جب ٹرین پھر حرکت میں آ جائے گی تو چھلانگ لگا کر دویاہ اس میں سوار ہوا کروں گا۔ گاڑ کے رعب داب نے بھی میرے دل پر گمرا اثر کیا۔ اس کے ایک اونٹ سے اشارے کے سامنے گاڑی کا دیوہیکل انجن بالکل بے بس تھا۔ سفید وردی، سفید نوپی، سرخ اور بزر جھنڈیاں، منہ میں وسل..... گاڑ کی آن بان مجھے خوب بھائی۔ اور میں نے جموں کی ہری ٹاکیز میں گیٹ کیپری کا ارادہ ترک کر کے ریلوے گاڑ بننا اپنا زندگی کا نصب العین بنا لیا۔

لدهیانہ گزر کر غروب آفتاب کے بعد دوراہا کا چھوٹا سا اشیشن آیا۔ یہاں پر گاڑی صرف نصف منٹ کے قریب رکتی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی سامان باہر پھینکا اور خود بھی کوڈ کوڈ کر نیچے اترے۔ پلیٹ فارم پر ہو کا عالم طاری تھا۔ نہ روشنی، نہ قلی، نہ کوئی سواری۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور اندر ہرے میں ٹاکٹ نویاں مارتے بڑی مشکل سے نہ سرہند کے گھاٹ پر پہنچے۔ جو اشیشن سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ چمکور صاحب سے ہوتی ہوئی روپڑ جانے والی کشتی تیار کھڑی تھی۔ کشتی مسافروں سے کچھا کچھ بھری ہوئی تھی۔ ملاحوں نے کسی مسافر کی پھیلی ہوئی نانکیں سکیریں، کسی کے بازو سمجھنے، کسی کا پچھہ اٹھا کر اس کی گود میں ڈالا اور ہمیں بھی ٹھونس ٹھانس کر کشتی میں ایسے فٹ کر دیا جس طرح بوری میں فالتو آٹا دیا دیا کر بھرا جاتا ہے۔

آدھی رات کے قریب ملاحوں نے ہر مسافر سے دو دو آنے "چراغی" وصول کی۔ ایک دھنڈی سی لاثین جلا کر ایک بانس سے لٹکا دی اور کشتی نے لنگر اٹھا دیا۔ ہمارا سفر پانی کے بہاؤ کے خلاف تھا اس لیے ایک موٹا سال مبارہ سارہ لے کر اس کا ایک سرا کشتی سے بندھا ہوا تھا اور دوسرے سرے پر دو نیل جتے ہوئے تھے۔ ایک ملاح سمار لانٹھی

کاندھے پر رکھے اور دوسرے ہاتھ میں سرکنڈے کی مشعل جلائے بیلوں کو ہاٹلتا ہوا کنارے کنارے چل رہا تھا۔

کشتی کو کئی جگہ روک کر اس کے تلے میں بھرا ہوا پانی نکلا گیا۔ بہلوں پور پنج URDU4U.COM کر بیلوں کی جوڑی تبدیل ہوئی۔ جب پوچھتی تو صبح کی زر کار کنوں میں نمر کے کنارے دور تک ایک طویل قطار نظر آئی جیسے لوہے اور چیل کی گاگروں کو الٹ کر نہیں پر رکھا ہوا ہو۔ جب نزدیک پنج کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ گاگریں نہ تھیں بلکہ سکھوں کی قطار تھی جو نمر کی طرف پشت کئے ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے تھے اور سر جھکا کر بڑے خضوع و خشوع سے بر سر عام رفع حاجت فرماء رہے تھے۔ جب کشتی ان کے قریب پنجی تو چند سکھ جوان ہماری طرف منہ کر کے ننگ دھڑنگ کھڑے ہو گئے اور منہ سے بکرے بلا بلا کر بڑے فخر سے اپنے پوشیدہ علم الابدان کی تشریح کرنے لگے۔ کشتی میں سوار عورتوں نے اپنے چہرے دوپٹوں سے ڈھانپ لیے اور مرد کھانس کھانس کر ایک دوسرے سے کھیانی کھیانی باتیں کرنے لگے۔ ملاح صاحب مسلمان تھے۔ ایک نوجوان کو جو تاؤ آیا تو اس نے بھی اپنا تمبدہ اٹھا کر سکھوں کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن عمر رسیدہ ملاح نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے بٹھا دیا۔ جب کشتی ان کے سامنے سے گزر گئی تو سکھ جوان بھی نمر کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھ گئے اور از سر نو فطرت سے ہمکلای میں مصروف ہو گئے۔ دوپھر کے قریب کشتی چمکور صاحب پنج گئی۔ دادی اماں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اپنے پلو سے کھوں کر کچھ لذو کھانے کو دیئے۔ ان کی عمر کوئی ایک سو چار برس کے قریب تھی۔ دانت مفبوط تھے۔ نظر تیز تھی۔ اور چلنے میں وہ ہم سے بھی نیاہ سبک رفتار تھیں۔

دادی اماں کے قدیمی ملازم کرم بخش نے ہمارا سامان اٹھایا۔ وہ بھی ستر برس سے اوپر تھا۔ چھدری داڑھی کے بال ایسے موٹے موٹے تھے جیسے چہرے سے رسیاں لٹک رہی ہوں۔ سامان کے بوجھ تلے بھی اسے پیٹھ تک نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ویسی جوتے لوہے کے

کھرپے کی طرح سخت تھے۔ اس نے جو تے کھول کر میرے حوالے کر دیئے، اور آگ کی طرح تپتی ہوئی ریت پر ننگے پاؤں یوں خراماں خراماں چلنے لگا جیسے سربز گھاس پر چھل قدمی کر رہا ہو۔ کرم بخش کے پاؤں کا تله نزی کے جوت کے تلے سے بھی نیا وہ سخت اور مضبوط تھا۔ وہ کھجور اور سیکر کے بکھرے ہوئے کانٹوں پر بے تکلف برہنہ پا چلتا پھرتا رہتا تھا۔ شدید سردیوں کے زمانے میں اکثر اس کے پاؤں کی ایڑیوں کی جلد خشک ہو کر پھٹ جایا کرتی تھی۔ کرم بخش فوراً گاؤں کے موچی کے پاس جاتا تھا، اور جس طرح پھٹے ہوئے جو توں کو گانٹھا جاتا ہے، عین اس طرح اپنی ایڑیوں کی جلد میں بھی خوشی خوشی نائکے لگوا کر آیا کرتا تھا۔

چمکور صاحب میں بہت سے گردوارے اور ایک خانقاہ تھی۔ گردواروں میں سب سے اونچا درجہ کلغی والے بادشاہ گرو کے گردوارے کا تھا۔ سکھوں کی روایت کے مطابق پنجاب کے ایک مسلمان صوبیدار نے گرو کے دو کم سن صاجززادوں کو اس گردوارے کی ایک دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔ صاجززادوں کے نام بابا اجیت سنگھ اور جھجھار ہری تھے۔ اب انہی کے نام پر اس گردوارے کے ساتھ بابا اجیت سنگھ جھجھار ہری خالصہ ہائی سکول بھی قائم تھا۔

دوسرے گردوارے کا نام ددمہ صاحب تھا۔ یہاں پر کسی گرو صاحب نے طبل بجا�ا تھا۔ ایک مقدس مقام کا نام مسوال صاحب تھا۔ یہاں پر ایک گرو صاحب نے اپنے دندان مبارک پر مسوک فرمائی تھی۔ ایک اور پاکیزہ جگہ جھاڑ صاحب کملاتی تھی۔ یہاں پر کسی گرو صاحب نے غالباً کچھ اور کیا ہو گا۔

چمکور صاحب کی اکلوتی خانقاہ ”بابا صاحبا“ تھی۔ بابا صاحبا دراصل شاپ الدین کا عرف عام تھا۔ وہ اپنے زبانے کے صاحب کرامت بزرگ مانے جاتے تھے۔ نہد و عبادت کے علاوہ بابا شاپ الدین اپنے علاقے کے قاضی بھی تھے اور کسب معاش کے لیے نیل کا کاروبار کرتے تھے، بابا صاحب کے صحن میں نیل کے بھرے ہوئے منکلوں کی قطاریں پڑی رہتی تھیں۔ ایک روز آدمی رات گئے سکھوں کے گرو اچانک بابا صاحب کے احاطے میں آ

گئے۔ گرو صاحب عالم روپوشی میں جان بچاتے پھر رہے تھے۔ کیونکہ ان کے تعاقب میں سرہند کا حاکم فوج کی ایک بھاری جمعیت لے کر نکلا تھا۔

URDU4U.COM

گرو صاحب نے کہا۔ ”بابا جی! اگر میں اس جلتی ہوئی بھٹی میں کوہ جاؤں تو شاید میری روحانیت مجھے آگ کے ضرر سے بچائے، لیکن سرہند کے مغل حاکم سے بچنے کے لیے انسانی وسیلہ درکار ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی وسیلہ ہو تو بتاؤ۔“

بابا صاحب نے جواب دیا۔ ”گرو جی مهاراج، وسیلہ روحانی ہو یا انسانی خدا کے حکم کے بغیر میر نہیں آتا۔ آپ اللہ کا نام لے کر نیل کے اس ملنکے میں بیٹھ جائیں۔ شاید خدا اسی میں بہتری کرے۔“

گرو صاحب گاڑھے گاڑھے نیل سے بھرے ہوئے ایک ملنکے میں بیٹھ گئے۔ بابا صاحب نے ملنکے کا منہ کپڑے کی جالی سے ڈھانپ دیا۔ سرہند کے حاکم نے اپنی فوج کی مدد سے چمکور صاحب کا کونہ کونہ چھان مارا۔ گردواروں کے گرنجھیوں اور ننگ اکالیوں کو نہیں پر لٹا لٹا کے خوب پڑوایا۔ بہت سے گھروں کی تلاشی لی۔ گئے کے کھیتوں کو کاٹ کاٹ کے رکھ دیا۔ کچھ سپاہی سلام کرنے کے بھانے بابا شب الدین کے ہاں بھی آئے۔ باتوں میں انہوں نے بابا صاحب کے گھر کا جائزہ بھی لیا اور ماہیوں ہو کر لوٹ گئے۔ راتوں رات مغل فوج اپنی موم پر آگے بڑھ گئی۔ صبح سوریے بابا صاحب نے گرو صاحب کو نیل کے ملنکے سے باہر نکلا، اور لباس تبدیل کرنے کے لیے انہیں نئے کپڑوں کا جوڑا پیش کیا۔

گرو صاحب نے کہا۔ ”بابا جی! اب میں کبھی سفید کپڑے نہ پہنوں گا، آج سے نیلا رنگ میرے پنچھے کا رنگ مقرر ہوا۔“

گرو صاحب بابا شب الدین کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔ چند روز بعد چمکور کے گردواروں کے گرنجھی ایک ونڈ کی صورت میں بابا صاحب کے پاس آئے۔ انہوں نے بڑے ادب نیاز سے بابا صاحب کی خدمت میں ریشم کی ایک تھیلی پیش کی۔ اس تھیلی میں گرو صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک فرمان تھا، جس میں سارے سکھے پنچھے کی طرف سے بابا

تقسیم کر دیا جاتا۔ چاولوں کے جو دانے مزار پر پڑے رہ جاتے، ان کو چنے کے لیے بہت سے کبوتر عالم طور پر وہاں جمع رہتے تھے۔ بابا صاحب کے ساتھ کبوتروں کی عقیدت مندی کے متعلق طرح طرح کے قھے بن گئے اور رفتہ رفتہ کبوتروں کو اپنا قدس حاصل ہو گیا کہ چمکور صاحب کی حدود میں ان کا شکار حرام شمار ہونے لگا۔

جس مقام پر بابا شباب الدین کا مزار واقع تھا، اس سے کچھ فاصلے پر ایک وسیع و عریض میدان پھیلا ہوا تھا۔ اس میدان کو ”پانڈوانہ“ کہتے تھے۔ چمکور کے خوش فہم بڑے بوڑھوں کو اس بات کا یقین تھا، کہ کورو پانڈو کی مہا بھارتی لڑائی اسی میدان میں ہوئی تھی۔ ذرا سا کریدنے پر اس میدان سے طرح طرح کے پرانے سکے اور جنگی ہتھیار مل جاتے تھے۔ یوں بھی تیز بارش کے بعد جگہ جگہ انسانی ڈھانچوں کی ہڈیاں اور کھوڑیاں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر ہوا تیز ہو تو ان ہڈیوں کی رگڑ سے جا بجا چراغ سے جل اٹھتے تھے۔ برسات کی اندری راتوں میں یہ روشنیاں خاص طور پر مافق الفطرت سماں باندھ دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ مشہور ہونے لگا کہ یہ روحانی دیے بھی بابا صاحب کی کرامت سے روشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی رات کے وقت پانڈوانہ کے میدان میں بابا صاحب کی یہ کرامت جگگاتی تو گاؤں کی بڑی بوڑھیاں سر ڈھانپ کر کوٹھوں پر چڑھ جاتیں اور دامن پھیلا پھیلا کر بابا صاحب سے برکت کی دعائیں مانگنے لگتیں۔

بابا شباب الدین کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے فرزند بھولے میاں نے نیل کا کاروبار سنبحالا۔ بھولے میاں کا اصلی نام قاسم علی تھا۔ وہ محض دیندار تھے۔ دنیاداری سے قطعی بیگانہ تھے۔ سیدھی سادی، صبر شکر کی زندگی بسرا کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے بھی اسی ڈگر پر ثابت قدم رہے لیکن چوتھی پشت میں جا کر چودھری ممتاز دین نے ایک نیا رنگ پکڑا۔ سب سے پہلے انہوں نے گردواروں کے گرتیہیوں سے مل کر نین کی پیش کش پر حق جمانے کی کوشش کی۔ یہاں سے ناکام ہو کر انہوں نے نیل کا ایک پرانا مٹکا لے کر اسے پھولوں سے خوب سجالیا۔ گھر کے صحن میں ایک زرکار

شاپ الدین کو اپنا محسن مانا ہوا تھا اور اس احسان کے بدلتے گردواروں کی کچھ نہیں بھی دامنی طور پر بابا شاپ الدین اور ان کی اولادوں کے حق میں وقف کر دینے کی پیش کش تھی۔

بابا صاحب نے اس فرمان کی پشت پر گورنمنٹی زبان میں ایک تحریر لکھ دی جس کا مفہوم یہ تھا۔ ”اگر یہ موقع گرو صاحب کے ساتھ جہاد کا ہوتا تو بخدا شاپ الدین خود اپنے ہاتھ سے ان کا سر قلم کر دیتا۔ لیکن یہ جنگ حاکم اور محکوم کا سیاسی تنازعہ ہے۔ گرو صاحب کے ساتھ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ فقط اپنا اخلاقی فرض ادا کیا ہے۔ اس کی اجرت میرے لیے حلال نہیں۔ نہیں کی پیش کش کو میں اپنی آل اولاد پر ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیتا ہوں۔ البتہ میری خواہش ہے کہ چمکور کی حدود میں سور کا گوشت لانا بند ہو جائے۔ اگر سکھ قوم یہ درخواست مان لے تو یہ اس کی عین عنایت ہو گی۔“

سکھوں نے برضاء و رغبت اس شرط کو قبول کر لیا۔ اور اس وقت سے چمکور میں سور کے گوشت کی سختی سے ممانعت ہو گئی۔

چند سال بعد جب بابا صاحب کی وفات ہوئی تو دور دور سے ہزاروں ہندو، سکھ اور مسلمان ان کے جنازے میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے۔ عقیدت مندوں نے اپنے ہاتھ سے بابا صاحب کا مقبرہ تعمیر کیا۔ مقبرہ ایک ساہے سی چار دیواری پر مشتمل تھا۔ بابا صاحب کی وصیت کے مطابق اس پر چھت نہ ڈالی گئی۔

بابا صاحب کی زندگی میں ہی یہ رسم چل نکلی تھی کہ گاؤں میں آنے یا گاؤں سے جانے والی ہر برات ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتی تھی۔ بابا صاحب کچے چاولوں میں شکر ملا کر ایک ایک مٹھی براتیوں میں بانٹ دیتے تھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان سب اس تبرک کو دولما دہن کے لیے نیک فال سمجھتے تھے۔ بابا شاپ الدین کی وفات کے بعد اس رسم میں اور بھی شدت آگئی۔ اب ہر برات بابا صاحب کے مزار پر حاضر ہوتی۔ براتی لوگ کچے چاولوں میں شکر ملا کر مزار پر پھینکتے، اور پھر ان کو اکٹھا کر کے دوبارہ براتیوں میں

شامیانہ تاں کر اس کے نیچے ایک خوبصورت تخت بچھلایا۔ اس تخت پر ریشی تکیوں اور گدوں کے درمیان اس ملکے کو جما کے رکھ دیا۔ دو خوش پوش ننگ اکالی ملازم رکھے۔ جو مورچھل نکھلے اٹھائے ہر وقت حاضر رہتے تھے، اور بڑے ادب سے ملکے پر آہستہ آہستہ پنکھا ہلاتے رہتے تھے۔ چودھری مہتاب دین نے چار دانگ عالم میں یہ چرچا کر دیا کہ یہی وہ مقدس ملکا ہے جس میں بابا شب الدین نے گرو صاحب کو چھپا کے رکھا تھا۔ پہلے اکا دکا سکھ ملکے کی زیارت کے لیے آئے۔ پھر عقیدت مند دیویاں چڑھاوے کے پھول، 'حلو،' مٹھائیاں اور پھل لا کر روشن کرنے لگیں۔ چند مہینوں کے بعد جب "نگھ سجھا" کے موقع پر چمکور میں سکھوں کا سلانہ اجتماع ہوا تو ہزاروں زائرین نے ملکے کو تعظیم دی۔ چودھری مہتاب دین نے تعظیم دینے کا عملی طریقہ یہ رائج کر رکھا تھا کہ عقیدت مند پہلے ہاتھ جوڑ کر ملکے کو نمسکار کرتے تھے، پھر گھٹنوں کے بل جھک کر اسے بصد ادب و احترام چھوتے تھے اور آخر میں چاندی کے روپوں یا سونے کی مروں کا نذرانہ ملکے میں ڈال دیتے تھے۔ پہلی نگھ سجھا پر ڈیڑھ دو ہزار روپے جمع ہوئے۔ دوسری پر پانچ چھ ہزار۔ اور اسی طرح بڑھتے بڑھتے آخر ایسا وقت بھی آیا کہ نگھ سجھا کے روز ملکا بار بار بھرتا تھا اور بار بار خالی ہوتا تھا۔

پانچ سال میں چودھری مہتاب دین ایک معمولی نیل فروش سے ترقی کر کے لکھ پتی رہیں بن گئے۔ چمکور کے ارد گرد انہوں نے سینکڑوں ایکڑ اراضی خرید لی، اور بابا شب الدین کے کچھ مکان کو مسماں کر کے ایک عالیشان حوالی تغیر کروا لی۔ جس کے چوبارے کی چھت بلندی میں آس پاس کے گردواروں کے کلس کا مقابلہ کرتی تھی۔ گرنتھیوں کو یہ گستاخی ناگوار گزرا۔ یوں بھی کچھ عرصے سے جملہ گرنتھی چودھری مہتاب دین سے خارکھائے بیٹھے تھے۔ ملکے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے گردواروں کی آمدی پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور چودھری مہتاب دین کی روز افزوں امارت میں گرنتھیوں کو اپنے حقوق کا خون نظر آ رہا تھا۔ ادھر سکھوں میں صلاح مشورے شروع ہوئے کہ چودھری مہتاب دین کے چوبارے کی بلندی گردواروں کے کلس سے بہر حال کمتر ہونی

چاہیے۔ ادھر چودھری صاحب نے نہلے پہ بھلا مارا۔ اور اس سازش کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے انہوں نے اپنے چوبارے کی چھت پر سکھ پنچھے کے بیٹھا جھنڈے گاڑ دیئے۔ اندر وہی زرکار شامیانہ تماں کر تخت پوش بچھایا، اور تخت پوش پر ریشمی گدوں اور گدیلوں کے درمیان نیل کا خالی مٹکا جما کے رکھ دیا۔ اب یہ کمرہ ”چوبارہ مٹکا صاحب“ کہلانے لگا، اور سکھوں میں دور دور تک شرت ہو گئی کہ واہ بھی واہ! چودھری متаб دین نے بھی کمال کر دیا۔ اپنے خرچ پر مٹکا صاحب کے لیے ایسا بلند و بالا چوبارہ بنایا ہے، کہ چمکور کے گردواروں کو بھی مات کر دیا۔

ہر نگھے سجا کے بعد چودھری متاب دین سونے چاندی کے سکوں کو گلا کر سلاخوں میں ڈھال لیتے تھے۔ اور ان سلاخوں کو تابنے کی گاگروں میں بھر کر اپنی حوالی کی اندروں دیواروں میں خفیہ طور پر گاڑ دیتے تھے۔ اس خزانے کی حفاظت کے لیے چودھری صاحب نے ایک نرالی ترکیب نکلی۔ انہوں نے آٹھ دس قاری اور حافظ جمع کر کے ملازم رکھ لیے۔ اندر کے کمرے میں ہر قاری باری دو دو تین گھنٹے بابا شباب الدین کے لیے قرآن خوانی کرتا تھا۔ ایک دو نوکر ان کی خدمت پر ہمہ وقت مامور رہتے تھے چنانچہ اندروں کمروں میں چوبیس گھنٹے چراغ جلتا تھا اور قرآن خوانی ہوتی تھی۔ ایک پنچھے دو کاج ..... ہم خرما و ہم ثواب۔ بابا شباب الدین کی روح کو ایصال و ثواب بھی ہوتا رہتا تھا اور چودھری متاب دین کے گڑے ہوئے خزانے کی حفاظت بھی بعنوان شائستہ ہوتی رہتی تھی۔ دن رات قرآن خوانی کی خبر پھیلی تو لوگوں نے فرط حیرت و سرست سے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ واہ بھی واہ! چودھری متاب دین کی کیا بات ہے۔ بابا صاحب کی روح پاک کے لیے دن رات چراغ جلاتا اور قرآن شریف پڑھواتا۔ چودھری صاحب نے بھی اپنی سعادت مندی کا مزید ثبوت دینے کے لیے بابا شباب الدین کے مزار کی مرمت پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ قبر کا تعویذ بیش بہا سگ مرمر کا بنوایا اور فرش اور دیواروں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے خوشنما شیشے چڑھوا دیئے۔ اب مزار پر ایک چراغ جلتا تھا، فرش اور دیواروں پر اس کے سینکڑوں عکس جگہا اٹھتے تھے۔ عقیدہمند سرشار ہو

کر جھوٹتے تھے۔ اور چودھری ممتاز دین کی امارت اور سخاوت کے گن گاتے تھے۔ دین کی طرف سے بے نیاز ہو کر اب چودھری ممتاز دین نے اپنی دولت کا سرخ دنیا کی طرف بھی موڑنا شروع کیا۔ حوالی کے بڑے احاطے میں صبح و شام دبار لگا کر بیٹھنے لگے۔ سرخ بانات پر سنری گوٹ کا شامیانہ لگتا تھا۔ نقری پایوں والی زرکار مند پر چودھری صاحب خود بیٹھتے تھے۔ پیچھے آٹھ دس چوبدار شام دار عصا لیے مستعد گھرے رہتے تھے۔ دائیں بائیں خوش پوشک خادم دست بستہ حاضر رہتے تھے۔ سامنے دباریوں کی لشتنیں تھیں۔ دباریوں میں قل اعوذیے ملاؤ، شراوہ کھانے والے پنڈتوں اور بھنگ کے ریسا نہنگ اکالیوں کی اکثریت تھی۔ ان لوگوں کو اپنے دبار سے وابستہ رکھنے کے لیے ممتاز دین طرح طرح کے پاپڑ بیلتے تھے۔ مولویوں کے لیے دو وقت پلاو، گوشت اور مرغ پکتے تھے۔ پنڈتوں کے لیے پوری کچوری، حلے اور کھیر کا دور چلتا تھا۔ نہنگ اکالیوں کے لیے بڑے بڑے کونڈوں میں بھنگ بھگوئی جاتی تھی اور باللیاں بھر بھر کے تقسیم ہوتی تھی۔ یوں بھی گرد و نوا کے اٹھائی گیرے، رسہ گیر اور نای گرامی چور اچکے وقتہ فوقہ حاضر ہوتے رہتے ہیں اور چودھری ممتاز دین کے ساتھ ذاتی رابطہ قائم رکھتے تھے۔ اپنی نوابی کا مکمل ٹھاٹھ جمانے کے لیے چودھری صاحب نے چھ چھ فٹ کے پچاس تنمند گھر سواروں کا دستہ بھرتی کیا۔ اور اپنی سواری کے لیے ایک بوڑھا سا ہاتھی بھی کہیں سے خرید لائے۔ اس ہاتھی پر چاندی کا ہوہ لگا کے چمکور کے گلی کوچوں میں ہوا خوری کے لیے نکلا کرتے تھے۔ مضائقات میں اپنی زمینداری کا دورہ کرنے کے لیے وہ اور ان کا عملہ رتحوں پر سوار ہوتا تھا۔ ان رتحوں کے لیے انہوں نے ہریانے کے چاق و چوبند بیلوں کی خوبصورت جوڑیاں پال رکھی تھیں۔ جب بیل رتحوں میں جتتے تھے تو ان پر زربفت کے جھول ڈالے جاتے تھے۔ گلے میں چاندی کی ننھی ننھی گھنیٹاں لٹکتی تھیں اور سینگوں پر سونے کے خول چڑھائے جاتے تھے۔ اپنے بیلوں سے چودھری ممتاز دین کو خاص الافت تھی۔ ہر صبح وہ ان کا چاہہ اپنے سامنے ڈلاتے تھے۔ دن میں کئی بار ان پر پھریا ہوتا

تحا، اور ہر جمعرات کو خالص گھنی اور شکر میں سکی کی روٹی کی چوری کوت کر انہیں کھلائی جاتی تھی۔ رتھہ کھینچنے کے بعد بیلوں کو پانی میں گلب کا عرق ملا کر پلایا جاتا تھا۔

جوں جوں دولت کی ریل پیل بڑھتی گئی، چودھری مہتاب دین کی دلچسپیاں بھی گھوڑوں، بیلوں اور ہاتھیوں کی دنیا سے نکل کر اپنی جوانیوں کے لیے نئے نئے میدان مارنے لگیں۔ طبیعت میں اقتدار کی ہوس اور دماغ پر امارت کا بھوت سوار تھا۔ ان کی سب سے عزیز خواہش تھی کہ چار دنگ عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجے۔ جس طرف وہ گزر جائیں، لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کمیں، یہ چودھری مہتاب دین کی سواری جا رہی ہے۔ ”چوبادہ مٹکا صاحب“ کے مالک، راجوں کے یار غار، مہاراجوں کی ناک کے بال چودھری مہتاب دین، جن کے جاہ و جلال اور ترذک و احتشام کے سامنے سارے ماچھے میں کسی اور کا چراغ نہیں جل سکتا۔ لیلائے آرزو کے اس جنون میں چودھری صاحب نے سب سے پہلے روپڑ کے راجہ بھوپ سنگھ کو بڑی خوشامد سے چکور صاحب تشریف لانے کی دعوت دی۔ بھوپ سنگھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے روپڑ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا تھا۔ دیلائے سنجھ کے کنارے اس چھوٹے سے شر کی اہمیت ابتدا میں صرف اتنی تھی کہ یہاں سے پٹیالہ، جنید اور نامجھ کے راجواڑوں پر نظر احتساب رکھنا آسان تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کا دام اقتدار پھیلتا پھیلتا دیلائے سنجھ تک پہنچ گیا، اور انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ایک سرحدی شر کی حیثیت سے اب روپڑ کو بڑا اہم مقام حاصل ہو گیا۔ راجہ بھوپ سنگھ نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں کے خلاف رنجیت سنگھ کے ساتھ، اور رنجیت سنگھ کے خلاف انگریزوں کے ساتھ اس نے ساز باز کا کچھ ایسا جال بنا کہ دونوں بھوپ سنگھ کو اپنا جگری دوست مانتے لگے اور سازشوں کے اس الجھاؤ میں بھوپ سنگھ رفتہ روپڑ کا خود مختار حکمران سا ہو گیا۔ لاہور کا دبار اور انگریزوں کے ایجنت راجہ بھوپ سنگھ کو منہ مانگی رقمیں بھیجتے رہتے تھے۔ جنہیں وہ شراب، کتاب اور عورت پر بے دریغ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اگر کبھی یہ رقمیں وصول ہونے میں تاخیر ہو جاتی، تو بھوپ سنگھ

کے سپاہی روپ کے گرد و نواح میں نفل جاتے تھے۔ اور دن دیہائے ڈال کے سونا چاندی اور غلہ کے علاوہ گائے، بھینسوں، گھوڑوں اور جوان عورتوں کو بھی ایک ہی لانٹھی سے ہانک لاتے تھے۔ راجہ بھوپ سنگھ عرصہ سے چودھری متаб دین کی دن دگنی رات چوگنی امارت کے چرچے سن رہا تھا۔ اسے وہ طسماتی مثلا دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ جو سال میں کئی بار دولت کے انبار اگلتا تھا۔ اس کے علاوہ چمکور صاحب کے مقدس گردواروں کی زیارت بھی ایک بہانہ تھی۔ چنانچہ جب بھوپ سنگھ کو چودھری متاب دین کا دعوت نامہ ملا تو اس نے بسر و چشم قبول کر لیا۔ یہ خبر سن کر چودھری صاحب کا سر وفور صرفت سے چکرانے لگا۔ اور انہوں نے فوراً بابا شب الدین کے مزار پر حاضر ہو کر دو نفل شکرانہ ادا کئے۔

راجہ بھوپ سنگھ کی خاطر تواضع اور استقبال کے لیے چودھری متاب دین نے جس پیانے پر انتظامات شروع کئے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ سارے گاؤں کے در و دیوار پر چودھری صاحب نے اپنی جیب سے سفیدی پھردائی۔ گلی کوچوں میں حلوان بچھایا۔ بچوں کو نیلے اور سبز ریشم کی وردیاں سلووا کے دیں۔ وہ رنگ بر گلی جھنڈیاں لے کر صبح و شام جلوس نکالتے تھے اور نعرے لگانے کی مشق کرتے تھے۔ ہر مشق کے بعد انہیں دودھ جیبی اور موٹی چور کے لذو بانٹے جاتے تھے۔ پانڈوانہ کے میدان میں راجہ بھوپ سنگھ کے سواروں اور سپاہیوں کے لیے خیموں اور شامیانوں کی قطاریں ایستادہ ہو گئیں جن میں سینکڑوں مشعلوں، شمعوں اور فانوسوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گرد بٹھانے کے لیے بیسیوں سفر صبح شام چاروں طرف چھڑکاؤ کرتے تھے۔ چھڑکاؤ کے پانی میں عرق گلاب کی بوتلیں بڑی فیاضی سے ملائی جاتی تھیں۔

چودھری متاب دین کی حوالی کے مردانے میں راجہ بھوپ سنگھ کی رہائش کا بندوست کیا گیا تھا۔ مہمان خانے کی دیواروں پر ابرق ڈال کر سفیدی کرائی گئی تھی۔ دروازوں پر زری اور کنخواب کے پرے لٹکائے گئے تھے۔ اور فضا کو ہر لحظہ معطر رکھنے کے لیے کئی

لازم عطر کی پچکاریاں اٹھائے مستعد کھڑے رہتے تھے۔

راجہ بھوپ سنگھ کو چمکور صاحب میں صرف ایک دن اور ایک رات قیام کرنا تھا۔ ان کی آمد سے ایک ہفتہ قبل راجہ صاحب کے کچھ افسر انتظامات کا جائزہ لینے تشریف لائے۔ انہوں نے تقریباً ہر چیز میں کچھ نہ کچھ میں میکھ نکالی۔ اور راجہ صاحب کے قیام کو آرادم وہ بنانے کے لیے چودھری متаб دین کو بہت سے مفید مشوروں سے نوازا۔ ایک مشونہ یہ تھا کہ راجہ بھوپ سنگھ کے لیے اعلیٰ درجہ کی شراب کثیر مقدار میں موجود ہو۔ شراب کے ساتھ کباب بھی لازمی ہیں، لیکن گوشت حلال نہ ہو، خالص جھنکا ہو۔ شراب اور کباب کے بعد راجہ صاحب صرف سور کا گوشت نوش فرماتے ہیں۔ سور جوان اور فربہ ہوں اور کھانے کے بعد اعلیٰ درجہ کے ناج گانے کی محفل برپا ہو، تو چودھری صاحب کے ذوق میزبانی پر راجہ صاحب کی خوشنودی کی مرثیت ہونا امر یقینی ہے۔ یہ ہدایات سن کر چودھری متاب دین ایک لحظہ کے لیے سکتے میں آگئے۔ ان کی رگوں میں بابا شب الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خون کا جو حصہ تھا، اس نے دم بھر کے لیے جوش مارا۔ لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سونے چاندی سے بھری ہوئی گاگروں کا خوش آئند تصور خون کے جوش پر غالب آگیا۔ اور جاہ و جلال کی شرت نے موروث توہمات کے تانے بانے اوہیز کر پھینک دیئے۔ چودھری صاحب نے اپنا خاص رتح دو خوش سلیقہ مصاحدوں کے ساتھ انبار کی طرف بھگایا تا کہ یکتاں روزگار موسیقار جھمکا جان اور جگا چودھری کی مشہور عالم رقصہ ترنجن بائی کو جس قیمت پر ہو سکے اپنے ساتھ لوا لا کیں۔ دونوں کے ساتھ تین تین ہزار روپیہ نقد، ایک ایک جڑاؤ گلویند اور دو دو شاہانہ جوڑوں پر معاملہ طے ہوا۔ اور پانڈوانہ کے میدان میں ان کے طائفوں کے لیے کئی ایک اور خیسے بھی نصب ہو گئے۔

شراب کے لیے چودھری صاحب نے اپنے گماشتبہ لدھیانہ روانہ کئے۔ وہاں پر انگریزوں کا پولٹیکل ایجنسٹ کرنل ویڈ تھا۔ وہ ریشہ دوانیوں کے علاوہ در پرده انگریزی شراب کا یوپار بھی کیا کرتا تھا۔ چودھری متاب دین کے آدمی اس سے منہ مانگی قیمت پر اعلیٰ درجہ

کی ولایتی شراب کی تین چار پیشیاں خرید لائے۔

فریبہ اور جوان سور فراہم کرنے کے لیے چودھری صاحب کو البتہ قدرے وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے وہ گردواروں کے گرتنهیوں نے پاس گئے کہ وہ اپنی وساطت سے منہ مانگے داموں پر چند ایک اچھے سور منگوا دیں۔ لیکن سکھ گرتنهیوں اور پاٹھیوں نے واہگورو، واہگورو کر کے کافوں کو ہاتھ لگایا کہ ہم بابا شب الدین کے ساتھ اپنے عمد کو توڑنے کے روا دار نہیں ہیں۔ ہر چند چودھری ممتاز دین نے انہیں یقین دلایا کہ عمد نامہ کی شکست و ریخت کا ویال خود ان کی اپنی گردان پر ہو گا، لیکن گردوارہ ددمہ صاحب کے بوڑھے گرنتھی گیانی کھڑک سنگھ نے انہیں سختی سے ڈاٹ دیا۔ ”چودھری ممتاز دین“، تم اپنے آپ کو کس کھیت کی مولی سمجھتے ہو؟ آج مرے کل دوسرا دن۔ کسی کو تمہارا نام بھی یاد نہ رہے گا۔ لیکن بابا شب الدین کا دوبار اور سکھ دھرم تو ہیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے معالدہ کو ہاتھ لگانے والے ہم تم کون؟

چودھری صاحب کا بس چلتا تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گیانی کھڑک سنگھ کا منہ نوج لیتے۔ لیکن راجہ بھوپ سنگھ کی آمد کے موقع پر سکھوں سے لڑائی جھੜڑا مول لینا قرین مصلحت نہ تھا۔ چنانچہ چودھری ممتاز دین خون کا گھونٹ پی کر وہ گئے اور دل ہی دل میں کڑھتے اور جملہ سکھ پنچھ کو گالیاں دیتے واپس لوٹ آئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے کوئی درجن بھر چماروں کو جمع کیا۔ اور انہیں توڑے دار بندوقوں اور تیز دھار بلموں سے مسلح کر کے بیلے کے جنگلوں میں بھیج دیا کہ وہ تنمند اور جوان سال سوروں کا شکار کر کے لاکیں۔

خدا خدا کر کے آخر وہ روز سعید بھی آپنچا جس کے انتظار میں چودھری ممتاز دین بیقراری سے گھڑیاں گن رہے تھے۔ راجہ بھوپ سنگھ اپنے جنگی رتھ پر سوار چمکور صاحب تشریف لائے۔ ان کے جلو میں ہاتھیوں، گھوڑوں، شکاری کتل اور فوجی سپاہیوں کا لاوہ لشکر تھا۔ جب یہ جلوں چمکور صاحب کی حدود میں داخل ہوا، چودھری صاحب کے بیسیوں ملازم پھلوں کے ٹوکرے اٹھائے دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ جہاں جہاں سے یہ قافلہ گزرتا گیا، یہ لوگ گلب، چنبلی اور گیندے کے پھول رتھ کے راستے میں بچھاتے جاتے تھے۔ چھوٹے

چھوٹے بچے رنگ برلنگی جھنڈیاں لہراتے تھے اور گلی گلی میں باوردی بینڈ سکھوں کے مشهور ترانے بجا بجا کر سلامی دیتے تھے۔

راجہ بھوپ سنگھ نے پہلے سارے گردواروں کی زیارت کی۔ پھر وہ بابا صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے۔ اور اس کے بعد انہوں نے چوباہ مٹکا صاحب جا کر اس طسماتی ملکے کو تعظیم دی، جس کے بطن میں سونا چاندی بڑی افراط سے پیدا ہوتا تھا۔ راجہ بھوپ سنگھ نے نیلے زربفت کا سرپوش اٹھا کر ملکے کے اندر لچائی ہوئی نظروں سے جھانکا جو آج خاص طور پر سونے چاندی کے سکوں اور زیورات سے لباب بھرا ہوا تھا۔ چودھری متаб دین نے لپک کر مٹکا اندھیل دیا، اور راجہ بھوپ سنگھ کے قدموں میں یہ زریں انبار لگا کر بڑی لجاجت سے عرض کیا۔ ”فقیر کا یہ حقیر نذرانہ قبول ہو۔“

راجہ بھوپ سنگھ کے خاص مصاہبوں نے یہ سارا انبار سمیٹ کر بڑے بڑے رومالوں میں باندھ لیا۔ راجہ صاحب نے اطمینار خوشنودی کے لیے مٹکا صاحب کو دویاہ تعظیم دی۔ انگریزی شراب کی بوتلیں راجہ صاحب کو خاص طور پر پسند آئیں۔ سر شام پانڈوانہ کے میدان میں بڑے بڑے سوروں کی کھالیں اترنے لگیں۔ اور رات گئے جب جھمکا جان اور ترنجن بائی کے طائفے اپنا اپنا ساز و سامان سجا کر محفل میں جم گئے، تو یکاکی چمکور کے ہندو، مسلمان اور سکھ بڑے بوڑھے اپنے گھروں کی کنڈیاں چڑھا کر اندر دک کر بیٹھ گئے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں آج پہلی مرتبہ چمکور میں بر سر عام سور کا گوشت کالتا گیا تھا۔ آج تک اس قصبہ کی فضا جھمکا جان کے طبلے کی تھاپ اور ترنجن بائی کے گھنگھروؤں کی جھنکار سے نآشنا تھی۔ رات کے بڑھتے ہوئے نائلے میں جب ان سازوں کی آواز خوش عقیدہ عورتیں جو ہر جمعرات کو بابا صاحبا کے مزار پر دیا جلانے جاتی تھیں، سسм کر کوٹھوں کی منڈیر سے لگی بیٹھی تھیں۔ طوفان زدہ انہیں راتوں میں وہ ان ہی کوٹھوں پر چڑھ چڑھ کے ان مقدس چراغوں سے اپنی مرادیں مانگا کرتی تھیں جو بابا صاحب کے نیض سے پانڈوانہ کے میدان میں روشن ہوا کرتے تھے۔ آج اسی میدان میں رنگ

و بو کا ایک سیلا ب سا آیا ہوا تھا۔ قندیلوں اور شمعوں کی ضیا تا حد نظر جگہ رہی تھی۔ لیکن شراب میں بد مست فوجیوں کی ہر بنکار کے ساتھ گاؤں والیوں کے دل لرزنے لگے تھے، جیسے کوئی زردستی ان کی بائیں پکڑ کر سمجھنے رہا ہو۔ بے زبان کنوایاں جو سپنوں کی بارات لے کر بابا صاحبا کے مزار پر کچھ چاول اور شکر کی مٹھیاں بھر بھر کر نچحاور کیا کرتی تھیں، یوں حیران پریشان تھیں جیسے بھرے ہوئے چورا ہے پر بر سر عام ان کا ساگ لٹ رہا ہو۔ سارا گاؤں کئی ہوئی پنگ کی طرح انجامی فضاؤں میں ڈگمگا رہا تھا۔ روایات کی ڈور ٹوٹ گئی تھی۔ ثبات کا چیخ کٹ گیا تھا۔ سکون کی دولت لٹ گئی تھی۔ تاریخ کے سانچے بے نور ہو گئے تھے۔ وقت کا پاسبان سو گیا تھا۔ صدیوں کے سکوت کو فقط ایک رات کے شور نے نگل لیا تھا۔

دوسری صبح نور کے ترکے جب راجہ بھوپ سنگھ اور اس کا لاوہ شکر رخصت ہو کر چلا گیا تو چمکور صاحب کی صورت یوں نکل آئی جیسے ہزاروں گھوڑوں نے کسی خوبصورت قبرستان کو پاؤں تلنے روند ڈالا ہو، تھکے ہارے کارندے اور خادم جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گئے۔ اندر حوالی میں چودھری ممتاز دین بھی ایک تخت پوش پر لیٹے کروٹیں بدل رہے تھے۔ ایک دو خاص مصاحب ان کا سر اور پاؤں دبا رہے تھے۔ کئی روز کے پے در پے رت جگہ نے انہیں چور کر دیا تھا۔ یوں بھی کل رات سے وہ کچھ نیا ہدی کسل مند تھے۔ رقص و نغہ کی محفل میں راجہ بھوپ سنگھ نے انہیں کئی بار شراب پینے کی دعوت دی تھی، لیکن چودھری صاحب ہر بار خوش سیقتہ جلوں بہانوں سے ٹالتے گئے۔ انجام کار جب راجہ صاحب خود لڑکھراتے ہوئے اٹھے اور شراب کا جام بہ نفس نیس ان کے ہونٹوں سے لگا کر کھڑے ہو گئے تو چودھری ممتاز دین کی مروت انکار کی تاب نہ لا سکی۔ دوسرا جام انہوں نے جھمکا جان کر ہاتھ سے پیا۔ تیرا ترنجن بائی سے۔ اولین باہہ گساری کے اس دور نے چودھری ممتاز دین کے دل و دماغ میں ایسے ایسے رنگیں قمیم روشن کر دیئے جن کی تجلیوں سے وہ آج تک روشناس نہ ہوئے تھے۔ حوالی

کے در و دیوار ایک خوبصورت غبار میں ڈوب گئے۔ جھمکا جان کے گلے سے آواز کی جگہ مہتابیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ترنجن بائی کے تحرکتے ہوئے تن بدن میں سونے اور چاندی کے تار لہرانے لگے۔ رنگ و نور کے اس سیلاں میں چودھری مہتاب دین غبارے کی طرح اڑ رہے تھے۔ لیکن جب صبح ہوئی تو ٹوٹا ہوا خمار چودھری صاحب کے رنگ و پے میں ٹیسیں مارنے لگا۔ وہ اپنے تخت پوش پر اوندو ہے پڑے کراہ رہے تھے۔ اس عالم میں سردار نونماں سنگھ نے انہیں ایک مژده جانفزا سنایا۔

سردار نونماں سنگھ ”چوباہ مٹکا صاحب“ کی سیوا پر مامور تھے۔ اور اس روحانی کاروبار میں چودھری مہتاب دین کے دست راست تھے۔

سردار نونماں سنگھ نے چودھری صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”چودھری اٹھو، اس طرح حاملہ عورت کی طرح پڑے پڑے کب تک کراہتے رہو گے؟“

چودھری صاحب اپنا دکھتا ہوا بدن سنبھال کر تخت پوش پر اکٹوں بیٹھ گئے۔ ”چودھری، ہیرا ہیرے کو کلتا ہے۔“ سردار نونماں سنگھ نے کہا۔ ”شراب کا کسل بھی شراب ہی سے جائے گا۔“

سردار نونماں سنگھ کے اصرار پر چودھری مہتاب دین نے شراب کے ایک دو گھونٹ پیئے تو ان کے کسیلے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔ زیان پر تراوت آگئی۔ گلا کھل گیا اور جسم کے دکھتے ہوئے جوڑوں پر از سر نو نشاط عود کر آیا۔ زندگی کے کیف کا یہ تیر بدف نسخہ چودھری صاحب کو بہت پسند آیا۔ انگریزی شراب کی بچی کچھ بوتلیں جو نوکرا بھر کر باہر بھجوائی جا رہی تھیں، انہوں نے واپس منگوا لیں اور اپنے دیوان خانے کی الماری میں احتیاط سے رکھ کر تالا لگا دیا۔

شام کے وقت جب چودھری مہتاب دین ہاتھی پر بیٹھ کر حسب معمول ہوا خوری کے لیے نکلے، تو انہیں اپنے گاؤں کا ماحول کچھ پرایا پرایا سا لگا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو کلکاریاں مار کر ہاتھی کی سونڈ سے لٹک جاتے تھے اور ہاتھی انہیں اٹھا اٹھا کر چودھری مہتاب دین کی گود میں ڈال دیتا تھا، آج کیسی نظر نہ آئے۔ وہ نو خیز اور شریر لڑکیاں بھی غائب

تھیں جو چودھری کا راستہ روک کر چاندی کے کنگنوں اور سونے کی بالیوں کی فرمائش کیا کرتی تھیں۔ آج کسی نے سر راہ اس کے ساتھ ہلاکا چکلا مذاق نہ کیا۔ وہ سارا گاؤں گھوم آیا، لیکن کسی کوٹھے کی چھت سے دعاوں کی آواز نہ آئی کہ ”او بابا صاحبا کے خوش بخت وارث، اللہ تجھے سدا ہی سکھی رکھے۔“ اس بے کیف سیر کے بعد جب چودھری صاحب گھر آئے، محبوب اور شرمندہ سے تھے۔ لیکن سردار نونماں سنگھ نے شراب کی بوتل کھول کر سامنے رکھ دی۔ دو تین پیگ پی کر چودھری صاحب پھر چمک اٹھے۔ چمکور کی سنان گلیاں جادو کے زور سے پھر آباد ہو گئیں، خاموش کوٹھوں پر خوبصورت پریوں کے جھرم ناپنے لگے۔ آسمان پر توں قرح چھا گئی۔

راجہ بھوپ سنگھ نے خوش ہو کر چودھری مہتاب دین کو اپنے ہاتھ سے کئی خط لکھ کر دیئے۔ کچھ پروانے کلکتہ میں بڑے بڑے انگریزوں کے نام تھے، جن میں چودھری صاحب کو ”وفا شعار حکومت انگلشیہ اور معاون دولت برطانیہ“ کے خطابات سے نوازا گیا تھا اور بڑے دلچسپ سے یہ تصدیق کی گئی تھی کہ راجہ بھوپ سنگھ کے بعد تنلیج کے اس پار انگریزوں کا سب سے بڑا بھی خواہ چودھری مہتاب دین ہی ہے۔

راجہ بھوپ سنگھ کی دوسری سند مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دبार کے نام تھی۔ اس میں چودھری مہتاب دین کو سکھ پنچھ کی آنکھ کا تارا اور خالصہ حکومت کا راج دلارا ثابت کر کے یہ سریشیکیت دیا تھا کہ تنلیج کے اس پار راجہ بھوپ سنگھ لاہور دبार کی تکوار اور چودھری مہتاب دین مہاراجہ ادھیر راج کی ڈھال ہے۔ سری اکال پورکھ نے ان دو وفادار سپوتوں کو پیدا کر کے خالصہ دبार کو تنلیج پار کی سرحد سے بالکل بے فکر کر دیا ہے۔ راجہ بھوپ سنگھ واگورو جی کا خالصہ اور چودھری مہتاب دین واگورو جی کی فتح ہے۔

چودھری مہتاب دین نے ان نایاب پروانوں کے لیے ریشم کی تھہ در تھہ تھیلیاں سلوائیں۔ دن میں کئی بار وہ ان تھیلیوں کو نسلی بیرون کی طرح ہاتھ میں لے کر کبھی سلاتے تھے، کبھی منھیاتے تھے۔ رات کے وقت چکلی لگا کر وہ تھیلیوں کو بڑے اہتمام سے کھولتے

اور خطوں کو ادب و احترام کے ساتھ سر آنکھوں سے لگاتے اور جھوم جھوم کر بار بار پڑھتے۔ بادامی کانٹہ کے یہ پرنے چودھری صاحب کے ذہن میں جل پریوں کی طرح ناپتہ، اور ان کا ایک ایک حرف الہامی پھوار کی طرح ان کی روح کے ریگزاروں پر رنگ برنگ ترش کرتا۔ لاہور اور کلکتہ کے شاہی درباروں کا تصور ان کے دل و دماغ میں پھل جدیاں سی چھوڑتا، اور خیالوں کے اس گل و گلزار میں چکور کی بستی بڑی ذیل اور بے معنی نظر آتی۔ یہاں کے لوگ طوطا چشم تھے جو چودھری ممتاز دین سے کافی کترانہ گزر جاتے تھے۔ انہوں نے کسی کو قتل نہ کیا تھا۔ کسی کے ہاں ڈاکہ نہ ڈالا تھا۔ کسی عورت کی آبرو نہ لوٹی تھی۔ اس کے برعکس وہ تو لوگوں کی مدد ہی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے تو اس گاؤں کا سر بلند کر دیا تھا۔ چودھری ممتاز دین کے طفیل آج دور تک چکور کا ڈنکا بجتا تھا۔ لیکن یہاں کے کہنے لوگ اپنی عظمت کے اس احساس سے بے بہرہ تھے۔ دن بہ دن مغارت کے ایک ٹھوس دیوار چودھری صاحب کے گرد اگرداہی چلی گئی اور رفتہ رفتہ وہ ایک کوڑھی کی طرح سب سے کٹ کر الگ تھلک پڑے رہ گئے۔ صبح کی سیر بند ہو گئی، شام کو ہاتھی کی سواری بھی موقوف ہو گئی۔ دن بھر وہ اپنی حوالی میں بند رہتے تھے، تا کہ گاؤں والوں سے مذکور نہ ہو جو آنکھیں چار ہوتے ہی منه دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ ماحول کی اس پاگل کر دینے والی بیگانگی سے گھبرا کر چودھری ممتاز دین نے رخت سفر باندھا اور ایک ہاتھی، تین رخھ، پچاس سوار اور بہت سے پیادوں کی جمعیت لے کر انہوں نے کلکتہ کا رخ کیا۔

جب چودھری ممتاز دین کی سواری روانہ ہوئی تو گویا طاعون کا چوبیا گاؤں سے نکل گیا۔ لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ بچوں نے از سر نو حوالی کے میدان میں گلی ڈنڈا کھیلتا شروع کر دیا اور جوان لڑکیوں نے حسب معمول کوٹھوں پر بینھ کر بابا صاحبا کے دوہے گاتا شروع کر دیئے جن میں آئینہ عشق تو عشق الہی کا ہوتا تھا لیکن عکس نو خیز میاروں کے آرزو انگیز سپنوں نئی دلنوں کے متلاطم ولولوں اور

منظور ساگنوں کی آس کا پڑتا تھا۔

یہاں تک آ کر دادی اماں کی سینہ بے سینہ روایات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا۔ چودھری ممتاز دین کھاں گئے؟ ان کا انجام کیا ہوا؟ ..... دادی اماں کوئی بات وثوق سے نہ بتا سکتی تھیں۔ ایک افواہ یہ تھے کہ گلکتہ کی راہ میں کوئی ندی کے کنارے ان کی ملاقات ایک مجدوب سائیں رتاشاہ سے ہو گئی جو ریت کی مٹھیاں بھر بھر کر منہ میں ڈالتے تھے اور اسے باداموں کی طرح چباتے رہتے تھے۔ چودھری ممتاز دین نے اپنے لاو لشکر کو خیر باد کہا، اور قلندرانہ وضع اختیار کر کے رتاشاہ کی خدمت میں بیٹھے گئے۔ دوسری خبر یہ تھی کہ بناres کے شر میں صبح بناres کی سیر دیکھتے دیکھتے وہ ایک برهمنی پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ جو گنگا میں اشنان کرنے کے بعد سورج دیوتا کو جل چڑھا رہی تھی۔ اس عاشقی میں انہوں نے چار ابرو کا صفائیا کروا دیا، اور ایک ہندو سوامی کا چیلا بن کر جوگ لے لیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن ہمارے بڑے بوڑھوں نے اپنی انا کی حفاظت کے لیے یہ مفروضہ پال رکھا تھا کہ یہ سب پاپڑ بیٹھنے کے بعد چودھری صاحب لاہور داتا کے دربار میں گوشہ نشین ہو گئے اور چند سال بعد سکھوں کے خلاف کسی معرکے میں جہاد کرتے ہوئے جام شادت نوش فرمایا۔ چنانچہ دادی اماں اپنی چادر کا پلو پھیلا کر بڑی عقیدت سے دعا مانگا کرتی تھیں۔ ”اللہ چودھری ممتاز دین کو قدم قدم پر جنت نصیب کرے۔ وہ دین اور دنیا دونوں سے سرخرو ہو کر اگلے جہان سدھارا۔“ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ چودھری ممتاز دین میدان جہاد میں شہید ہوئے تھے۔ یا سائیں رتاشاہ کے قدموں میں فوت ہوئے تھے یا بناres کی ہندو برهمنی کے جوگ میں سورگباش ہو گئے تھے۔ میرے دل و دماغ پر تو ان کے سیماں کی طرح مضطرب کردار کی بو قلمونی نے ایسی گرت جمالی تھی جیسے بڑے سائز کا مقناطیس چٹکی بھر لوہ چون کو اپنی کشش میں جکڑ لیتا ہے۔ میرے ذہن سے ہری نا کیز جموں کی گیٹ کیپری اور ریلوے ٹرین کا گارڈ بننے کے خیالات کافور کی طرح اڑ گئے۔ اور چودھری ممتاز دین کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو نے مجھے مگر مجھ کی طرح غڑاپ سے نگل لیا۔

عجیب و غریب خواہشات کی اس دلدل سے مجھے کرم بخش نے نکلا۔

کرم بخش بچپن ہی سے دادی اماں کا ملازم تھا۔ اب اس کی عمر ستر برس سے اوپر تھی۔  
URDU4U.COM لیکن وہ دن رات تونمند نیل کی طرح بے تکام کام کرتا تھا۔ اس کا تن بدن خاردار  
لیکر کی طرح سخت اور کرخت تھا۔ لیکن دل بڑا گداز تھا۔ کہنے کو تو وہ بالکل ان پڑھ  
اور جالل تھا لیکن یوسف نیلگا کے قصے کی کتاب ہاتھ میں اٹھ پکڑ کر وہ صحیح ترتیب  
سے ساری نظم کے اشعار فر فر نا دیتا تھا۔ اگر کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی جائے  
تو اس کی زبان پر نظم کی روانی بھی وہیں رک جاتی تھی۔ وہ خود بھی پنجابی میں بیت  
کھاتا تھا۔ کبھی کبھی چودھری مہتاب دین کے قصے نا کر جب دادی اماں عجیب سی لے  
میں بابا شباب الدین کے گورنکھی دوہے الائپنے لگتی تھیں تو کرم بخش بھی پاس بیٹھ کر  
ہمیں ان کا مطلب سمجھایا کرتا تھا، اور کہیں کہیں بابا صاحب کے کلام اور بیان میں  
حسب ضرورت اصلاح بھی دیتا رہتا تھا۔ بابا شباب الدین صاحب کے دوہوں کا رنگ کچھ  
اس طرح کا ہوتا تھا۔

”او میرے یار‘ میں نے آج تک تیرے باغ میں قدم نہیں رکھا  
میں کیا جانوں تیرے پھول پیلے ہیں یا سرخ ہیں یا سفید ہیں؟

جو تیرا رنگ ہو وہی میرا رنگ ہے  
میں تو تیرے باغ میں آنکھوں کے بل جاؤں گی“

”او میرے یار‘ تیرے دامن کو میں نے کبھی نہیں چھوا  
تیرا دامن بادلوں سے پرے ستاروں سے اونچا ہے  
میں بچاری تو کبھی تیرے خیال کے دامن کو بھی نہ چھو سکی  
تیرا خیال تجھ سے بھی نیاہ تابناک ہے  
کیونکہ اس کو میں خود اپنے ہاتھوں سے سجائی ہوں“

”او میرے یار، رات کی خلوت میں میں نے تجھ کو لمحہ بھر کے لیے آخر پا ہی لیا  
 اب میری سپیلیاں مجھے طعنہ دیتی ہیں کہ یہ محض خواب تھا  
 URDU4U.COM  
 ایسے خواب پر ہزاروں بیدایاں قربان  
 میں تو اسی کے انتظار میں پڑی سوتی ہوں“

”او میرے یار، میں بھی تو تمیرے بہت کام آتی ہوں  
 دیکھ میں نے تمیرے رخ پر اپنے تصور کا حجاب ڈال رکھا ہے  
 اگر میں اپنے تصور کی آنکھ ذرا سی بھی بند کر لوں  
 تو ساری دنیا تجھے بے نقاب دیکھ لے گی“

”او میرے یار، تو واحد ہے، تو صد ہے  
 تو ابد ہے، تو انزل ہے  
 شکر کر تو میری گلی کا البیلا جوان نہیں  
 ورنہ میں تجھے خوب ستاتی، خوب ترساتی، خوب ترپاتی  
 تجھے بڑی بڑی آزمائشوں میں ڈالتی  
 اور سارا سارا دن اپنے دروازے کی اوٹ سے جھانک جھانک کر تمیرا تماشا دیکھا کرتی“

”او میرے یار، تو عزیز ہے، تو حفیظ ہے  
 تو کرم ہے، تو حلیم ہے  
 شکر کر تو میرے سینے کا ارمان نہیں  
 ورنہ اگر میرا سینہ پھٹ جاتا پھر بھی تو نکل نہ سکتا“

”او میرے یار، تو وہاب ہے، تو ستار ہے  
 تو تو اب ہے، تو غفار ہے

شکر کر تو ہمارے کھیتوں کا راکھا نہیں  
 ورنہ میں ہر روز تجھے چوری چوری ملنے آیا کرتی  
 تو رکھوالی کر ہی نہ سکتا  
 سارے کھیت کو چڑیاں چک جاتیں”

URDU4U.COM

”او میرے یار، تو معبدو ہے، تو موجود ہے  
 تو مقصود ہے، تو موجود ہے  
 شکر کر تو میں نہیں  
 ورنہ نہ جانے تیرا کیا حال ہوتا!“

○○○

ہی یہ حکم بھی سنیا۔ ”اگلے سال ورنیکلور فائل کا امتحان دنا ہو گا۔ اگر وظیفہ نہ لیا تو کان پکڑ کر سکول سے نکال دوں گا۔“

پہلے روز جب میں اپنی جماعت میں گیا، تو نیا گرتہ کوئے لشہر کا نیا کھڑک کھڑک رکتا ہوا پاجامہ اور پھندنے والی سرخ روی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ مجھے اس بیت کندائی میں دیکھ کر بہت سے ہندو اور سکھ لڑک منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجانے لگے اور زور زور سے گال پھلا پھلا کر بکرے بلانے لگے۔ ایک لڑکے نے روی ٹوپی کا پھندنا نوج کر توڑ لیا اور اسے برش کی طرح اپنے گلوں پر پھیرنے لگا۔ دوسرے نے دھول جما کر ٹوپی کو پچکا دیا۔ تیرا ٹھوکریں مار مار کر میری پیٹھ لیدر کی کالی گرگانی کو ملنے لگا۔ کئی سکھ لڑکے میرے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور لہک لہک کر بھانت بھانت کے آوازے کرنے لگے۔

فوجاں شروع آئیاں ہیں؟

فوجاں گٹھ مت کر دی ہیں؟

فوجاں پڑھائی کریں گی؟

فوجاں بابو بنیں گی؟

فوجاں ٹوپی لیتی ہیں؟

فوجاں مسلے ہوتی ہیں؟

ان پے در پے سوالات کے بعد انہوں نے گھونے تاں تاں کر ہوا میں گھمائے اور بیک آواز زور زور سے گانے لگے۔ ”راج کرو گا خالصہ ..... باقی رہے نہ کو“

اتنے میں کوئی پکارا کہ ماشر جی آ رہے ہیں۔ سب لڑکے فوراً شرافت سے اپنے اپنے ڈیک پر بیٹھ گئے۔ میں اپنی جگہ حیرانی اور پریشانی کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ماشر منگل شنگھ اردو اور بیاضی کے استاد تھے۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک میرا جائے لیا اور روی ٹوپی کی جگہ گپڑی باندھ کر سکول آنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے تھوڑی

## • راج کرو گا خالصہ، باقی رہے نہ کو

دادی اماں اور کرم بخش مجھے بی اے ایس جے ایچ خالصہ ہائی سکول میں داخل کروانے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ سکول کا پورا نام بایا اجیت سنگھ ججھاڑ ہری خالصہ ہائی سکول تھا اور گرو کے دو صاحبزادوں کے نام پر قائم کیا گیا تھا جنہیں سکھوں کی فرض روایات کے مطابق مسلمان حاکموں نے ایک محققہ گردوارے کی دیواروں میں زندہ گڑوا دیا تھا۔

ہیڈ ماسٹر سوراج سنگھ نے رجسٹر میں میرا نام درج کرنے کے بعد دادی اماں سے پوچھا۔  
”تاںی“ بچے کی عمر دس سال لکھ دوں؟“  
دادی اماں کو سارا گاؤں تاںی کہا کرتا تھا۔

”پھوٹ تیرا فتح منہ“ دادی اماں نے ہیڈ ماسٹر کو ڈانتا۔ ”تو اندھا ہو گیا ہے، تجھے دکھائی نہیں دیتا؟ میرا پوتا پندرہ برس سے ایک دن کم نہیں۔“

دادی اماں کے نزدیک بچوں کی عمر نیا وہ جتنا باعث افتخار تھا۔ اس سے تعلیم بھی جلد ختم ہو جاتی تھی اور نوکری بھی جلد ملنے کا امکان بڑھ جاتا تھا۔

اس مسئلہ پر ہیڈ ماسٹر سوراج سنگھ اور دادی اماں کے درمیان بحث بخشی ہونے لگی، تو کرم بخش نے نبوی کی طرح نہیں پر آڑی ترجیح لکھریں کھینچ کر زانچہ بنایا اور ثالث بن کر اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ ”ماسٹر جی! اس کی عمر تیرہ سال تین مینے تین دن لکھ دو۔“

ہیڈ ماسٹر نے جز بز ہو کر انگل پچو سے رجسٹر میں میری عمر کا اندر ادرج کر دیا اور قبلہ والد صاحب کی وہ ڈائریاں دھری کی دھری نہ گئیں، جن میں انہوں نے ہر بچے کی پیدائش کی ساعت، دن، مہینہ اور سال عیسوی، ہجری اور بکرمی حساب سے الگ الگ نوٹ کی ہوئی تھیں۔

عمر کے حساب سے ہیڈ ماسٹر نے مجھے دو سال آگے کی کلاس میں داخل کر لیا، اور ساتھ

دیر سبق پڑھایا اور نیادہ دیر بہت سے لڑکوں کی بڑی طرح پٹائی کی۔ فارسی کے پیریڈ میں پنڈت سری رام نے بھی یہی عمل دہرا�ا۔ پنڈت جگن ناتھ انگریزی پڑھاتے تھے اور مارنے پیشے کی جگہ فقط کان مروٹن پر اکتفا کرتے تھے۔ البتہ تاریخ اور جغرافیہ کا سبق سکون سے ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ماشر تارا منگھ نہ کبھی ہنتے تھے، نہ مسکراتے تھے، نہ مارتے تھے۔

سکول کا اصلی ہوا ماشر منگل منگھ ہی تھے۔ اردو پڑھانے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اردو کا سبق وہ تھیجھ پنجابی زبان میں دیا کرتے تھے اور اشعار کی تشریع کرنے میں ان کا اپنا ہی نرالا انداز تھا۔ ایک بار غالب کا یہ شعر آیا۔

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری  
حسن کو تعاقف میں جرات آزا پایا

اس شعر کو انہوں نے ہمیں یوں سمجھایا۔

”سادگی تے اسدے نال پرکاری، بے خودی تے اسدے نال نال ہشیاری۔ حسن نوں تعاقف دے وچ کیا پایا؟ شاعر کہندا اے اس نے حسن توں تعاقف دے وچ جرات آزا پایا۔ لئی اینی جئی گل سی۔ غالب شعر بنا دا بنا دا مر گیا۔ میں شعر سمجھاندے سمجھاندے مر جانا اے۔ تما ذئے کوڑھ مغزاں دے پلے ککھ نہیں پینا۔ اگے چلو۔“

اردو کے علاوہ ماشر منگل منگھ علم بیاضی میں بھی کامل تھے۔ یہ اور بات ہے کہ سوالات حل کرتے وقت جمع، تفریق، تقسیم کی جگہ وہ طباء پر ضرب کا عمل نیادہ بروئے کار لاتے تھے۔ حقیقتاً ان کو اصلی شرح صدر صرف زد و کوب کے فن میں حاصل تھا۔

ذرا سی بھول چوک پر وہ قصاب کی طرح طالب علم پر لکھتے تھے۔ اسے گردن سے دیوچ کر ہوا میں اچھاتے تھے اور پھر اس پر لاتوں، مکوں اور تھپڑوں کی ایسی تاہذ توڑ بارش بر ساتے تھے کہ دیکھنے والوں کو بھی دن میں تارے نظر آنے لگتے تھے۔ ہر روز ایسی

دو دو تین تین پٹائیاں دیکھ کر سکول کا ایک ایک لمحہ میرے لیے سوہان روح بن گیا۔ ہر وقت سر پر خوف کی ننگی تکوار لکھتی رہتی تھی کہ نہ جانے کس وقت اس مار پیٹ کا قرعہ فال اچانک میرے نام نکل آئے۔ یہ خیال آتے ہی میرے روگئے کھڑے ہو جاتے تھے اور سر سے پاؤں تک پیمنہ چھوٹئے لگتا تھا۔

ایک روز میں تیار ہو کر سکول جانے کو تھا، کہ گھر میں کسی کو زور سے چھینک آئی۔ دادی اماں نے چھینکنے والے کو بڑی طرح کوسا اور مجھے واپس بلا کر بٹھا لیا۔ کیونکہ کام پر روانگی کے وقت کسی کا چھینک دینا بد شکونی کی علامت تھی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد مجھے دبایا سکول سدھارنے کی اجازت ملی لیکن اس بد شکونی نے میرے پاؤں من میں کے بھاری کر دیئے۔ میرے دل کو یقین سا ہو گیا کہ آج کا دن ہی وہ روز موعود ہے جب ماشر منگل سنگھ کے ہاتھوں میری پٹائی کی باری آنے والی ہے۔ اس خوف کا بھوت میرے سر پر کچھ ایسی شدت سے سوار ہو گیا کہ میں نے سکول جانے کی بجائے سیدھا نہر کی راہ لی۔ نہر سرہند کے کنارے پیریوں کے جنگل تھے، آموں کے باغ تھے اور کھجوروں کے جھنڈ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ میں بڑے مزے سے بیر چلنے، کچی ابیاں اور کھجوریں کھانے میں مصروف تھا کہ ایک جگہ اچانک کرم بخش سے ٹڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہ مویشیوں کے لیے چاہے لانے شاملات وہ سہ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے بھاگ کر کچھ جھنڈوں میں روپوش ہونے کی کوشش کی تو اس نے لپک کر میرا ٹیٹوا لیا۔ مجبوراً میں نے بڑی درد ناکی سے سکول کی ساری رام کمانی اسے سنا دی۔

”اب مدرسے نہیں جاؤ گے؟“ کرم بخش نے پوچھا۔

”بالکل نہیں جاؤں گا۔“ میں نے شد و مد سے جواب دیا۔

”ہاں جی ہاں“ کرم بخش بولا۔ ”کتابوں میں کیا رکھا ہے؟ عیش کی زندگی تو میری طرح گھاس کھودنے میں ہے۔ بچو، آؤ آج تمہیں یہ کرتب بھی سکھا دوں۔“

میں خوش خوش کرم بخش کے ہمراہ چل پڑا۔ وہ بڑے آرام سے بہمنہ پا چلا جا رہا تھا۔ تیز تیز نوکیلی سولوں والے کھجور کے سوکھے ہوئے ڈھوڈے جا بجا اس کے پاؤں تلتے آتے

تھے اور چمر چمر کر کے ٹوٹ جاتے تھے۔ اس کی ایڑیوں میں کئی جگہ بڑے بڑے شگاف تھے۔ ہر سال سردیوں میں وہ قصبه کے موچی کے پاس جاتا تھا اور جس طرح دوسرے لوگ اپنے ٹوٹے ہوئے جوٹے مرمت کرواتے تھے، کرم بخش UP4U.COM کھڑے کھڑے اپنی ایڑیوں کی پھٹی ہوئی کھال سلووا لیتا تھا۔

شاملات دسمہ میں کئی جگہ گھٹنے گھٹنے تک گھاس لہما رہی تھی۔ ایک مقام پر کرم بخش نے تیز تیز ہاتھ مار کر لمبی گھاس درانتی سے کائی اور چھوٹی گھاس کھرپے سے کھونے کا گر مجھے سکھایا اور حکم دیا۔ ”جلدی جلدی گھاس کی ایک پنڈ کھود لو۔ ڈنگر بھوکے کھڑے میری جان کو رو رہے ہوں گے۔“

میں درانتی اور کھرپا لے کر شروع کرنے والا تھا کہ کرم بخش نے پکار کر کچھ اور ہدایات دیں۔ بچھو اور کنکھجورا نظر آئے تو خبردار کھرپا اور درانتی خراب نہ کرنا۔

انہیں پاؤں سے مسل کر مار ڈالنا۔ سانپ سپولیا، بجو یا سنکھ پوت ملے تو فوراً مجھے ہاک مارنا۔ میں اجیپھا (وظیفہ) پڑھ کر انہیں پکڑ لوں گا۔“

سانپ سے تو خیر میں واقف تھا لیکن باقی نام میرے لیے اجبی تھے۔ بجو کے متعلق کرم بخش نے اطلاع دی کہ مہین مہین آنکھوں والا بڑا ہوشیار جانور ہے، اور قبروں سے تانہ مردے نکال کر اکڑوں بٹھا لینا یا کٹھ پتیوں کی طرح اپنے ساتھ ساتھ چلا لینا اس کا دل پسند مشغله ہے۔ سنکھ پوت انسان کی گدی پر بیٹھ کر اپنے پنجے پچ کس کی طرح اس کی کھوپڑی میں گاڑتا ہے اور چونچ سے ٹھونگیں مار مار کر تانہ بھیجا کھانے کا بڑا شوقین ہے۔

کرم بخش تو ایک درخت کے سائے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کمر سے ہزار منکوں والی تسبیح کھول کر وظیفہ کرنے لگا لیکن میری ہمت کے بادیاں کی ساری ہوا بھس سے نکل گئی۔ ایک تو مجھ سے گھاس ہی نہ کٹتی تھی، دوسرے قدم قدم پر عجیب و غریب حشرات الارض کا خوف میرے دل پر ہتھوڑے مارتا تھا۔ ایک دو جگہ سوراخوں میں سانپ کی کچلی پھنسی ہوئی نظر آئی تو میں بھاگ کھڑا ہوا، اور کرم بخش کے پاس آ کر

بڑی عاجزی سے ہتھیار ڈال دیئے۔

”اچھا اچھا“ گھاس تو میں کھو دی لوں گا۔ تم کل سے سکول جاؤ گے نا؟“ اس نے پوچھا۔  
”بالکل نہیں۔“ میں نے جازم جواب دیا۔

کرم بخش چمک کر اٹھا۔ پہلوانوں کی طرح اس نے مجھے کلاوے میں لے کر ہتھکنی لگائی اور پھر پالت مار کر منہ کے بل نہیں پر گرا دیا۔ اس نے ایک پاؤں میری گردن پر رکھا اور دوسری ایڑی سے میری کمر پر پے در پے ضرب لگانے لگا۔ مقابلہ تو دل ناتوان نے خوب کیا لیکن تابکتے؟ آخر سکول کے بارے میں بھی میں نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

”توبہ کرو اور ناک سے نہیں پر سات لکیریں کھینچو۔“ کرم بخش نے حکم دیا۔  
میں نے حکم کی تعییل کر دی۔

”تم کھاؤ کہ دوبارہ سکول سے نہیں بھاگو گے۔“ کرم بخش نے دوسرا حکم دیا۔  
میں نے فوراً تم کھالی۔

اس فرض منصبی سے فارغ ہو کر کرم بخش نے گھاس کھودی اور پھر آرام سے بیٹھ کر نہیں میں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تین تین چار چار انچ گھرے دو سوراخ کھو دے۔  
میں سمجھا کہ شاید اب ہم اخروت یا بنٹے کھلیں گے لیکن اس نے بڑی چلکدستی سے زیر نہیں نسل سی کھود کر دونوں سوراخوں کو آپس میں ملا دیا۔ ایک سوراخ میں اس نے کوئی چیز ایسی ٹھونٹی جیسے پاپ میں تمباکو بھرا جاتا ہے۔ دوسرے سوراخ میں اپنے ہونٹ فٹ کر کے وہ منہ کے بل نہیں پر لیٹ گیا اور سرکندًا جلا کر پہلے سوراخ پر رکھ دیا۔  
کرم بخش نے زور زور سے دو چار سوٹے مارے، آگ کا شعلہ سا پکا اور پھر وہ پاس پڑی ہوئی ایک اینٹ پر سر نکلا کر غث کے سو گیا۔ گانجے کے اس عمل کے دو ڈھانی گھنٹے کے بعد جب وہ جا گا تو خوب چست تھا۔

واپسی پر کرم بخش گلگری کی طرح ایک کھجور کے درخت پر چڑھ گیا اور کپی ہوئی رسیل کھجوروں کا ایک کچھا مجھے کھانے کو دیا۔ ساتھ ہی وعدہ کیا کہ آج کی بات وہ گھر

میں کسی کو نہ بتائے گا۔

دوسرے دن میں نے اپنی قسم توڑ دی اور پھر سکول نہ گیا۔ البتہ کرم بخش کی زد سے محفوظ رہنے کے لیے نمر پر جانے کی بجائے گگا ماڑی چلا گیا۔ گگا ماڑی ایک کچا کوٹھا تھا جو گاؤں سے دو ڈھائی میل باہر ایک لق و دلق ریتلے ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر چکی کے پارٹ کی طرح ایک گول چبوترہ تھا۔ مسلمان اسے گگا پیر کی قبر سمجھ کر یہاں فاتحہ درود پڑھتے تھے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ گگا سائیں کی سادھی تھی کیونکہ ان کے اعتقاد کے مطابق گگا ایک ہندو پرم بھس تھا اور مرنے کے بعد اس کی راکھ پر یہ سادھی بنائی گئی تھی۔ چھڑے چھار اسے اپنا روحانی پیشووا مان کر طرح طرح کی پوجا پاٹ اور جادو ٹوٹا کیا کرتے تھے۔ علاقے کے یہاں بھی یہاں جمع ہو کر ”گدھے“ کی محفل جاتے تھے اور عقیدت مندی سے گاتے اور ناپتے تھے۔

گگا ماڑی کے اندر کچھ لوگ اپنے اپنے طریقے سے گگا پیر کو خراج عقیدت پیش کرنے میں مصروف تھے۔ باہر دو کالے بھینگ آدمی لٹکوٹ باندھے اور گلے میں بڑے بڑے ڈھول لٹکائے دم دھناتی دھنیا، دھنکم دھنیا کی تال پر زور زور سے ڈھول بجا رہے تھے۔

ان کے گرد چار پانچ آدمی بڑے والمانہ طور پر ”حال“ کھیل رہے تھے۔ کبھی وہ پنجے اٹھا کر اپنی ایڑیوں پر لٹو کی طرح گھومتے تھے، کبھی نہیں پر چار زانو بینٹ کر مینڈک کی طرح پھدکتے تھے، کبھی سر کے بل کھڑے ہو کر ڈھول والوں کے گرد تیز تیز بیضوی دائرے کاٹتے تھے۔ ان میں ایک شخص جو سب سے نیاہ سرستی کے عالم میں حال کھیل رہا تھا، وہ کرم بخش تھا۔

کرم بخش کی آنکھوں میں لال لال انگارے چمک رہے تھے۔ اس کی داڑھی کے موٹے موٹے بال غلبناک خار پشت کے کانٹوں کی طرح چہرے پر ایستادہ تھے۔ اس کا انگ انگ یوں تحرک رہا تھا جیسے جال میں بھنسی ہوئی مچھلیاں پھڑک پھڑک کر تڑپتی ہیں۔ منہ سے کوئی لفظ کے بغیر کرم بخش نے میری گردن ناپی اور ڈھول والوں سے کچھ دور تپتی ہوئی ریت پر کان پکڑوا کر میرا مرغا بنا دیا ایک لڑکے کو اس نے میری چوکیداری

پر مامور کیا اور خود حال کھینے والوں کے حلقوں میں شامل ہو گیا۔

دھوپ میں کان پکڑے پکڑے میرے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ ڈھول کی ہر دھمک میرے دل و دماغ پر توپ کے گولے کی طرح برس رہی تھی۔ اگر کوئی اکا دکا راہگیر آپس میں بات چیت کرتے ہوئے قریب سے گزرتے تھے تو ان کی آواز میرے کان میں دیر تک یوں گونجتی رہتی تھی جیسے بہت سے کتے اندر کنوں مل کر لگا تار رو رہے ہیں۔ معلوم نہیں اس حالت میں ایک گھنٹہ گزر گیا یا ایک سال نکلا یا ایک صدی بیت گئی۔ کیونکہ جب ”حال“ سے فارغ ہو کر کرم بخش نے مجھے کان چھوٹنے کا مژہ سنایا تو میری کمر پیر فرتوں کی طرح خمیدہ ہو چکی تھی، اور مجھ سے سیدھا کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ کرم بخش نے پیچھے سے میری بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اپنا گھٹنا زور سے پیٹھے میں مار کر میری کمر سیدھی کی۔ پھر اس نے حکم دیا کہ نہیں پر ناک سے اکیس لکھریں نکال کر توبہ کروں۔

میں نے تجھی ہوئی ریت پر ناک سے اکیس لکھریں نکال دیں۔  
”قسم کھاؤ کہ اب پڑھائی سے نہ بھاگو گے۔“ کرم بخش کڑکا۔

میں نے بخوبی اللہ کی قسم کھالی۔

”رسول کی قسم کھاؤ۔“ کرم بخش نے کہا۔

میں نے بلا تکلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم بھی کھالی۔  
”قرآن کی قسم کھاؤ۔“

میں نے اس کی بھی تعییل کر دی۔

”اب اپنی جان کی قسم بھی کھاؤ۔“ کرم بخش نے حکم لگایا۔

یہ قسم کھانے سے میں ہچکچا گیا۔ کیونکہ مجھے اپنی جان اللہ اور رسول اور قرآن شریف سے بہر حال نیا ہے عزیز تھی۔ کرم بخش نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور میرے منہ پر ناٹے سے ایسا کرا را تھپڑ مارا کہ میرے سر میں بھزوں کے بے شمار چھتے بھجنھنا اٹھے۔ دوسرا

تھپڑ لگنے سے پہلے میں نے کرم بخش کا حکم مان لیا اور اپنی جان کی قسم بھی کھالی۔ جان کی قسم توڑنے کے ہولناک نتائج کا کرم بخش نے کچھ ایسا بے سروپا اور بے ربط سانقشہ کھینچا کہ مجھے بے اختیار نہی آنے لگی۔ نہی روکنے کی کوشش میں مجھے ہچکی لگ گئی اور گلے سے رندھی سی آوازیں نکلنے لگیں۔ جیسے نیل کے گلے میں تربوز کا چھلکا پھنس جاتا ہے۔ کرم بخش سمجھا کہ خوف و ہراس سے میری گھلگھی بندھ گئی ہے۔ اس تاثر کو مزید سکھ پہنچانے کے لیے میں نے اپنے بدن پر مصنوعی کپکی طاری کی اور کچھ تیز تیز جھر جھریاں بھی لیں۔ کرم بخش خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا۔ اور اس کی انا کی تسلیکین گرم گرم بھاپ کی طرح اس کے کافنوں، ماتھے اور گالوں اور ناک پر چھا گئی۔

کرم بخش کو اچھے موڈ میں دیکھ کر میں نے کہا۔ ”چاچا تمہارے پاس تو کوئی جادو ہے۔ میں سکول سے بھاگ کر جدھر جاتا ہوں، تم بھی وہاں آ جاتے ہو۔“

کرم بخش نے اصل مرغ کی طرح فخریہ چھاتی پھلانی اور دو دن کی لے کر کھنے لگا۔ ”جادو ٹونا تو پلید کافروں کا کرتب ہے۔ کرم بخش کے پاس تو رب پچے کا اجیہہ پا ہے۔ تم دل جاؤ یا دکھن چلے جاؤ،“ کرم بخش کا ہاتھ تیری گردن پر اسے جا پڑے گا جیسے مرغی کھنگار پر گرتی ہے۔“

کرم بخش کی مزید خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میں نے کہا۔ ”چاچا، تمہارے وظیفے نے تو بڑے بڑے معركے مارے ہوں گے۔“

”اسپنگول تے کچھ نہ پھر دل“ کرم بخش نے محاورتا کہا کہ ڈھکی چپی بات کو نیاہ نہ کریدو۔

”چاچا،“ وظیفے نے کچھ نہ کچھ تو رنگ لگایا ہو گا۔“ میں نے خوشامدانہ اصرار کیا۔ ”رہے نام رب پچے دا۔“ کرم بخش نے سینہ تاں کر کہا۔ ”کوئی رنگ جیسا رنگ لگایا ہے؟ بیٹ، بیلے، بار سب جگہ کرم بخش ہی کرم بخش کا نام گونجتا تھا۔ بڑے بڑے

جٹا دھاری منت، بھان متی کے جوگی اور گیانی تیرے چاچا کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔“

جوش میں آکر کرم بخش نے اپنے وظیفے کی کرامات کی محیر العقول داستانوں کا تاثرا باندھ دیا۔ بہوت پریت چڑیل، چھلاڑ، چھلیدا، وڈاوا سے مقابلہ کرنا، جن آتا رہا اور لوٹے میں سر بھر کر کے جلا ڈالنا۔ آوہ، پڑاوا، دودھ، کمصن باندھنا اور کھولنا۔ حب اور بغض کے فلیتے جلانا۔ مقہوری احدا کے لیے ہندیا چھوڑنا، بلان جلانا۔ آٹے کی پتیوں میں سویاں گاڑ کر دشمنوں کو ایذا پہنچانا۔ سانپ، پچھو اور بھڑ کے کائے اور آدھا سیسی درد کو جھاڑنا، داڑھ نکالنا، چور پکڑنے کے لیے لوٹا گھمانا، مجبوری کی حالت میں بقدر ضرورت دست غیب حاصل کرنا۔ یہ سب کرم بخش کے باہمیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن اس کے جس کمال نے میرے ذہن پر سب سے نیا ہد اثر کیا ہے تنجیرِ محبوب کا عمل تھا۔ بھرے میلے میں بڑی بڑی صاحبِ حسن و جمال چاندیاں اپنے بائکے چھبیلے جوانوں کو چھوڑ کر اس پھٹی ہوئی ایڑیوں اور پیلے دانتوں والے کریبہ المنظر بڑھے کے پیچھے یوں لگ جاتی تھیں جیسے لمکھیاں گڑ سے چپک جاتی ہیں۔ کرم بخش کچھ دیر انہیں اپنی ڈور کے ساتھ لگائے گھومتا پھرتا، اور پھر انہیں مٹھائی کے لیے کچھ پیسے دے کر رخصت کر دیتا تھا۔

”تیرے چاچے پر وجود کا عیشِ حرام ہے۔“ کرم بخش نے دبی دبی حیرت سے مجھے بتایا۔ ”اسی لیے تو مرشد نے شادی کی اجازت نہیں دی۔“

مجھے اس برهنچاری بڑھے کی حماقت پر نہیں بھی آئی اور ترس بھی آیا۔ لیکن بظاہر میں نے اس کی اتنی تعریف کی کہ وہ خوش ہو کر مجھے ماگھی بننے کی دکان پر جیلیباں کھلانے لے گیا۔ ماگھی رام چمکور صاحب کا واحد حلوائی تھا۔ وہ سارا دن لنگوٹ باندھے بڑے بڑے کڑاہوں میں جیلیباں تلتا تھا یا موتی چور کے لذو بناتا تھا۔ جنہیں سکھ جات شرطیں بد بد کر سیروں کے حساب سے وہیں کھڑے کھڑے چٹ کر جاتے تھے۔ ماگھی رام کا بوڑھا باپ ایک میلی سی دھوٹی باندھے اور سر پر ڈھیلی ڈھالی گپڑی نکائے اکڑوں بیٹھا بھٹی جھوٹکتا رہتا تھا۔ اس کا چرا پکے ہوئے انہاں کی طرح پیلی پیلی، گلابی گلابی، گدری

گدری جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور مہین مہین چند ہائی ہوئی آنکھوں پر لانبی لانبی سفید بھویں ایسے لفٹتی تھیں جیسے اس نے ماتھے پر ممل کی جھارٹھا نک رکھی ہو۔

دونوں باپ بیٹا کرم بخش کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔

”واہ بھئی واہ“ کرم بخشہ ”ماگھی رام“ بولا۔ ”پر ماتما کی کپا سے تو خود ہی آگیا۔ میں تو تیری تلاش میں نکلنے ہی والا تھا۔

ماگھی بننے نے چمک چمک کر ہمیں بتایا کہ پانچ روپے ڈال کر اس نے بازار مائی سیواں امرتر میں لاڑی کا نکٹ لیا تھا۔ لاڑی اس کے نام نکل آئی ہے۔ مال بھی چل پڑا ہے اور آج ہی کشتی سے چمکور پنج رہا ہے۔

”کرم بخشہ“ ماگھی رام نے کہا۔ ”تو گڈا (تیل گاڑی) جوڑ کے فافٹ گھاث پر پنج جد۔ کشتی آتے ہی مال چھڑا کر دکان پر لانا ہے۔ ایک سیر پختہ لڈو تجھے دوں گا۔ آدھ سیر گڑ بیلوں کے لیے ملے گا۔“

”واہ جی واہ“ کرم بخش نے ناراضگی سے جواب دیا۔ ”کرم بخش تیرے باپ کا نوکر جو ہوا، ادھر تو نے حکم دیا ادھر میں گڈا لے کر نہر پر پنچا۔ لالہ، کبھی تو نے شیشے میں اپنی صورت بھی دیکھی ہے؟“

”چلو چار آنے نقد بھی لے لینا۔“ ماگھی رام نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔ ”اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے بھلا؟“

”ہزاروں کا مال مفت آ رہا ہے اور کرم بخش کو چونی پر ٹرخاتے ہو؟ لالہ، تم بڑے ندیدے ہو۔“ کرم بخش نے کہا۔

دفعہ ماگھی رام کے بڑھے باپ نے بھی اپنی چند ہائی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کرم بخش کو غصے سے گھور کر بولا۔ ”ہزاروں کا مال کون سلا بکتا ہے، بڑی لاڑی کا نکٹ تھا کوئی مخلوں نہیں۔ لاکھ سے کم کا مال نکلے تو میں پیشتاب سے داڑھی منڈوا دوں گا۔“ کچھ مزید چق بق کے بعد تیل گاڑی کی اجرت طے ہو گئی۔ ایک روپیہ نقد، دو

سیر مٹھائی، بیلوں کے لیے ایک سیر گڑ۔ بیغانہ کے طور پر کرم بخش نے آدھ سیر جلیبیاں پیشگی تکوا لیں، اور ہم مزے مزے سے جلیبیاں ٹھوکتے کھلیاں پنچے۔ کرم بخش نے بیل گاڑی تیار کی اور تھوڑی دیر میں ہم نمر پر کشتی گھاٹ پنچ گئے۔ ماگھی رام اور اس کا باپ کا پہلے سے آئے بیٹھے تھے اور ایڑیاں اٹھا اٹھا کر آنکھیں چھاڑ چھاڑ کر دورا ہے سے آنے والی کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔

خدا خدا کر کے کشتی آئی اور ماگھی رام نے اپنے مال کی بلی چھڑائی۔ یہ مال لکڑی کی تین پیٹیوں پر مشتمل تھا، جن پر لوہے کی پتی چڑھا کر میخوں کے ساتھ ٹھونکا ہوا تھا۔ کسی پیٹی کا وزن ڈیڑھ دو من سے کم نہ تھا۔

بیل گاڑی میں ماگھی رام اور اس کا باپ ایک ایک پیٹی پر سانپ کی طرح کنٹلی مار کر بینھ گئے۔ تیری پیٹی پر میں چڑھنے لگا، تو انہوں نے ڈانت کر منع کر دیا۔ کیونکہ میرے وزن سے ان کے مال و متاع کے آبگینوں کو لحق ضرر کا احتمال تھا۔ راستہ بھر باپ بیٹا امید کے عجیب و غریب دشت و دیا میں لچائی ہوئی قیاس کے گھوڑے دوڑاتے رہے۔ لکڑی کی یہ پیٹیاں کبھی ریشم اور زربفت اور کنوارب کے تھان بن جاتی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے دہانوں سے سونے کے کنگن اور چاندی کے تھال جھانکنے لگتے تھے۔ کبھی ان کے اندر بلوری فانوسوں اور شیشہ آلات کی مدھم سی کھن کھن سنائی پڑتی تھی۔ ماگھی رام کے باپ کی قوت لامسہ پیٹیوں کے اوپر ہاتھ پھیر پھیر کر اب اس یقین کی علی الاعلان تصدیق کرنے لگی تھی کہ یہ مال ڈیڑھ دو لاکھ روپے سے کم قیمت کا نہیں ہو سکتا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ لاثری کا مال جلد از جلد بیچ باچ کر سارا کتبہ ہردووار جا بے اور وہاں آرام سے بیٹھ کر رام نام کی ملا جانے میں مصروف ہو جائے لیکن ماگھی رام کو اس لائجہ عمل سے شدید اختلاف تھا۔

”لو اور سنو۔“ وہ حقارت سے ہنسا۔ ”باپ کی عقل بھی گھاس چرنے گئی ہے۔ یہ کتبہ سدھارنے کا وقت تو اس کا اپنا آیا ہوا ہے، اور اپنے ساتھ ہردووار ہمیں بھی ہاںکتا ہے۔ باپ، تم

جم جم ہر دوار جاؤ۔ ہمارے کھانے پہنے کے دن تو اب آئے ہیں۔“

ماگھی رام کا فیصلہ تھا کہ لاڑی کا مال بچ کر وہ لدھیانہ میں دکان کھولے گا۔ وہ کتنی بار لدھیانہ جا کر بائیکوپ دیکھ آیا تھا۔ فلموں میں ناچتی ہوئی میموں کا نقشہ اس نے کچھ ایسی فصاحت و بлагافت سے کھینچا کہ اس بڈھے کے منہ سے بھی جلیبیوں کے شیرے کی طرح بے اختیار رال پہنے گلی۔ اور وہ بخوبی اس بات پر رضا مند ہو گیا کہ پہلے وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کچھ عرصہ لدھیانہ گزارے گا اور پھر اس کے بعد کسی وقت ہر دوارہ کی راہ لے گا۔

پیشوں کو دکان کے عقبی صحن میں رکھوا کر ماگھی رام نے سب سے پہلے دو دلو بانٹ کر ہمارا منہ بیٹھا کرایا اور پھر کرم بخش کے ساتھ مل کر باپ بیٹا پیشوں کھولنے میں مصروف ہو گئے۔ تینوں پیشوں سینڈ ہینڈ کتابوں، سکولوں کے پرانے رجسٹروں اور استعمال شدہ بھی کھاتوں سے اٹا اٹ بھری ہوئی تھیں۔ چند لمحے سکوت رہا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر ماگھی بیبا اور اس کا باپ نہیں پر بیٹھ گئے اور دوہنڑ مار کر اپنا سر پہنچنے لگا۔ جس قسم کا درد ناک بین وہ کر رہے تھے اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ دونوں واقعی بربادی طرح لٹ پٹ گئے ہیں۔

کچھ دیر میں جب یہ آہ و زاری قدرے فرو ہوئی تو کرم بخش نے ان کو سمجھانا شروع کیا کہ چور ہاتھ سے نکل جائے تو دانشمند اس کی لگنگوٹی پر ہی صبر شکر کر لیا کرتے ہیں۔ یوں بھی یہ کوئی اتنا گھائٹے کا سودا نہیں رہا۔ پانچ روپے کی لاڑی میں اتنی روی آ گئی ہے کہ کئی سال تک مٹھائیاں باندھنے کے کام آتی رہے گی۔ باپ تو گھنٹوں میں سر دیئے ہو لے کر اہتا رہا لیکن ماگھی رام پاگلوں کی طرح بڑیڑا ہوا پیشوں کا سامان ایک ایک کر کے باہر نکالتا، اسے الٹ پلٹ کر غور سے دیکھتا اور جب گدڑی میں چھپا ہوا کوئی لعل نظر نہ آتا، تو اسے کھٹاک سے نہیں پر دے مارتا۔ جب اس نے بڑی تقطیع کی دو تین موٹی موٹی مجلد کتابیں غصے سے نہیں پر چھین تو کرم بخش چیل

کی طرح جھپٹا اور مانگھی رام کا ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے چینج۔ ”ہاہا، لالہ، رہے نا اوت کے اوت۔ یہ تو دین اسلام کی کتابیں ہیں۔ پاک کلام کی بے حرمتی ہوئی تو گند اسالے کر تربوز کی طرح سر اتار دوں گا۔ ہاں!“

میں نے ایک جلد کھول کر دیکھی، تو رتن ناتھ سرشار کی فسانہ آزاد تھی۔

”کیوں“ ہے نہ دین اسلام کی کتاب؟“ کرم بخش نے پوچھا۔

”بڑی مقدس کتاب ہے۔“ میں نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

”میں تو پہلے ہی پچھاں گیا تھا، یہ سالا بنیا اس کو بھی کاٹھ کباڑ کی طرح روی میں پھینک رہا تھا۔“ کرم بخش نے فسانہ آزاد کی چار جلدیں کو جھاڑ پونچھ کر آنکھوں سے لگایا۔ اور انہیں ایک طرف بلندی پر رکھ دیا۔

اب کرم بخش نے حکم صادر کیا، کہ میں ساری کتابوں کو دیکھ بھال کر دین اسلام کی کتابیں الگ کر لوں۔“ اپنے دین کی کتابیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کافروں کی دکان میں روی کے طور پر انہیں نہیں چھوڑ سکتے۔“

میں نے بڑی محنت سے جائزہ لے کر کوئی تیس کتابوں کا انتخاب کیا۔ محمد حسین آزاد کی ”آب حیات“ ڈپٹی نذیر احمد کی ”مرات العروس“ ”ایام“ اور ”رویائے صادقة“ عبدالحليم شرر کی ”فتح اندرس“ ”فلورا فلورنڈا“ ”ملک العزیز ورجنا“ اور ”فردوس بریں“ محمد علی طیب کی ”رام پیاری“ محمود میاں رونق کی ”حاتم بن طے“ عرف ”افسر سخاوت“ حافظ محمد عبدالله کی ”الله دین خوش نصیب“ عرف ”چراغ عجیب“ محشر انبالوی کی ”آل ذور عین“ اور رتن ناتھ سرشار کے ”فسانہ آزاد“ کی چار جلدیں ملا کر کل ۱۸ کتابیں یہ ہوئیں۔ باقی باہ جاسوسی ناول تھے جو نفل بک ڈپٹی لاہور نے شائع کئے تھے۔ ان میں سے پانچ ناولوں

کا ترجمہ تیرنگہ رام فیروز پوری نے انگریزی زبان سے کیا ہوا تھا۔

کرم بخش ان کتابوں کو اپنی چادر میں باندھنے لگا تو مانگھی رام نے اسے جھڑک کر کہا۔ ”یہ کیا باندھ رہا ہے بے سالے؟ تھانے میں پرچہ نہ لکھوا دوں کہیں۔ میرا مال ہے۔

”ترے باپ کی جا گیر تھوڑی ہے؟“

”ہمارے پچھے دین کی کتابیں ہیں۔ تیرے پاس کیسے چھوڑ دیں؟“ کرم بخش نے مدل جواب دیا۔

”ہم نے تیرے دین کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔“ ماگھی رام بولا۔ ”ایک ہاتھ سے پیسے رکھ دو، دوسرا ہاتھ سے کتابیں لے جاؤ۔ یہاں تو نقداً نقد سودا ہے۔“  
کتابوں کی قیمت پر ماگھی رام اور کرم بخش کے مابین بڑا زردست ہندو مسلم فساد ہوا۔ دونوں کی گردن کی ریکیں چیخ چیخ کر پھول گئیں اور منہ سے جھاگ کے بلبلے اڑنے لگے۔ کوئی گھنٹہ بھر کی بک بک جھک جھک کے بعد ساڑھے چھ روپے پر معاملہ طے ہوا۔ ڈیڑھ روپیہ تو کرم بخش نے اسی وقت ادا کر دیا۔ پانچ روپے کل تک ادھار کر کے ہم نے تمیں کتابیں اٹھا لیں۔

”کل صبح رقم پنچ جائے۔“ ماگھی بنٹے نے کرم بخش کو خبردار کیا۔ ”ورنہ بیاج لگ جائے گا۔“

کتابیں لے کر ہم سیدھے اپنی بیٹھک میں آئے۔ یہ گھر سے کافی دور مسجد کے بالکل ساتھ دو پکے کرے تھے، جنہیں عام طور پر مردانہ مہمان خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کرم بخش نے ایک الماری صاف کی اور میں نے بڑے احترام سے کتابوں کو اس میں سجا تو دیا، لیکن ساتھ ہی یہ فکر بھی دامن گیر رہی کہ کل صبح تک ماگھی رام کو ادا کرنے کے لیے پانچ روپے کھاں سے آئیں گے۔

”تو پانچ روپے کو روتا ہے؟“ کرم بخش نے مجھے تسلی دی۔ ”دین پیارے کے لیے کرم بخش کی گردن بھی کٹ جائے تو پروا نہیں۔“

”چاچا،“ گردن تو مفت کٹ جاتی ہے لیکن ماگھی رام تو نقد مانگتا ہے۔ آخر پانچ روپے تم لاوے گے کھاں سے؟“

”تو فکر نہ کر۔“ کرم بخش نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”یہ تو دین اسلام کی بات ہے۔ رب پچھے نے تو مجھے مجرماً دیکھنے کے لیے بھی منہ مانگے پیسے دیئے ہیں۔“

”لیکن چاچا،“ کل صبح تک پیسے ملیں گے کیسے؟“ مجھے یہ خطرہ ستا رہا تھا کہ اگر قرض

جدبات پر مجھے شبابش دی اور بڑی رقت سے مجھے اپنے مرشد کے کچھ عارفانہ بیت ترجم سے سنائے، جن کا مطلب کچھ اس طرح کا تھا کہ دین کے علم میں غوطہ کھاؤ تو موتوی مونگا پاؤ، دنیا کے علوم میں کھو جاؤ تو مردار ہڈیاں کماو اور کتنی کی طرح بیٹھ کر ساری عمر چباو۔

ایک پنچھے دو کاج، آم کے آم گھٹھلیوں کے دام ..... سکول کو بھی سلام، ماشر منگل سنگھ سے بھی نجات اور تمیں ناولوں کی دنیا آگے پیچھے آباد۔ اب میں صبح سوریے تیار ہو کر گھر سے سکول جانے کو لکھتا۔ کرم بخش مجھے بیٹھک میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیتا۔ دوپر کے وقت وہ کچھ روٹیوں پر تانہ مکھن اور شکر ڈال کے مجھے دے جاتا۔ اور چار بجتے ہی میں بستے بغل میں دبائے، مسکین صورت بنائے پابندی سے گھر پہنچ جاتا۔ کرم بخش نے ہیڈ ماشر سوراج سنگھ کو جا کر بتا دیا، کہ ماشر منگل سنگھ کی پٹائی کے خوف سے پچھے کا دل دل گیا ہے۔ اسے تاپ چڑھتا ہے۔ تدرست ہوتے ہی سکول آنا شروع کر دے گا۔

کوئی تمیں ہفتے میں اسی طرح کرم کتابی بن کر اپنی بیٹھک میں معتکف رہا۔ جتنی محنت میں نے ان ایام میں کی ہے، ساری عمر پھر کبھی نہیں کی۔ بیس بائیس دن کے بعد جب میں نے دوبارہ سکول جانا شروع کیا، تو جس دم کرنے والے جو گیوں کی طرح میری کلپ ہو چکی تھی۔ ماشر منگل سنگھ کے خوف سے زبان میں لکنت کی جگہ ”آب حیات“ کے پر شکوہ فقرے فرائے بھرنے لگتے تھے۔ تھائی میں میری حدیث نفس بھی عبدالحليم شرر اور رتن ناٹھ سرشار کی عبارت میں ہونے لگی۔ کلاس روم میں تاہڑ توڑ تمیں چار جواب مضمون لکھ کر میں نے اپنا سکھ کچھ ایسا بھا لیا کہ کبھی کبھی ماشر منگل سنگھ اردو کا سبق میرے پرد کر کے خود عائب ہو جاتے تھے۔ چار پانچ ہندو لڑکے تو آرام سے سبق پڑھ لیتے تھے۔ لیکن سکھ طالب علم الگ بیٹھ کر بڑا اودھم مچاتے تھے۔ سبق کے دوران وہ ”جو بولے سو نہال ..... ست سری اکال“ کے نعرے لگاتے رہتے تھے، اور اخیر میں کھڑے ہو کر زور زور سے ڈیک بجاتے تھے اور میری طرف کے

ادا نہ ہوا تو ماگھی بنیا کتابیں ہی واپس لے جائے گا۔

”اجیپھا“ اجیپھا ”بچے اجیپھا“ کرم بخش نے دونوں ہاتھوں سے چکلیاں بجا بجا کر مزے سے کہا۔ ”آج رات پرانی باولی میں ڈھائی پر ایک نانگ پر کھڑے ہو کر اجیپھا پڑھ دوں گا۔ سورج بعد میں نکلے گا، پیسے پہلے پنج جائیں گے۔“

اپنے وظیفے کی شان میں کرم بخش نے پنجابی کے کچھ بیت گا گا کر پڑھے۔ ان میں اللہ کی حمد اور رسول اللہ کی شنا بھی تھی۔ رسول اللہ کا نام آتے ہی کرم بخش اپنے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتا تھا اور سکیاں بھر بھر کر رونے لگتا تھا۔ کرم بخش کو عقیدت مندی کی آگ میں کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیچ و تاب کھاتے دیکھ کر میں بھی اپنی عیاری کا جال بچھا کر تاک میں بینھ گیا۔ اور موقع پا کر بڑی صفائی سے اس کی سادہ لوچی کے نہلے پر اپنی مکاری کا دبلا دے مارا۔ وہ پچھلے ہوئے موم کا تودہ بننا بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے فن آذری کے دو چار ہاتھ چلائے اور بڑی آسانی سے اسے اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔

سانچہ یہ تھا کہ خالصہ ہائی سکول کفر کا گھواہ ہے۔ اسلام کے اركان خمس کے بجائے سکھوں کے پانچ ککھوں ..... گنگھا، کھیس، کچھ، کڑا، کپان سے واسطہ پڑتا ہے۔ شبد گانے پڑتے ہیں۔ اساوری کے کیرتن میں شامل ہونا ضروری ہے۔ جپ جی اور ارداں کا سیکھنا بھی لازمی ہے۔ گرو گرنٹھ کے پانچ میں سر نہیں پر رکھ کر نمکار بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور گیانیوں، گرنتھیوں، پانٹھکوں اور سیوا کاروں کے منہ سے دن رات مسلمانوں کے خلاف مغلظات بھی سننا پڑتی ہیں۔ اپنا دین بچانے کے لیے ضروری ہے کہ میں ان خطرات میں بنتلا ہونے سے پہلے اپنا ایمان مضبوط کر لوں اور دوبارہ سکول جانے سے پہلے کچھ دن لگا کر وہ بصیرت افروز کتابیں پڑھ لوں جو ہم اتنی محنت سے ماگھی رام کے پنج سے چھڑا کر لائے ہیں۔

کرم بخش تو پہلے ہی رس گلے کی طرح دین اسلام کے شیرے میں لھڑا ہوا بیٹھا تھا۔ میری چرب زبانی کے جالے میں وہ مکڑی کی طرح فٹ ہو گیا۔ اس نے میرے دینی

تمن تمان کر اپنا مخصوص قوی ترانہ گاتے تھے۔

راج کرو گا خالصہ ..... باقی رہے نہ کو

کچھ عرصہ کے بعد ”نگھ سجھا“ کا تواریخ آیا۔ یہ سکھوں کا  
سلامانہ میلہ تھا جو چمکور صاحب میں لگا کرتا تھا۔ اس موقعہ  
پر سکھوں کا ایک دیوان بھی منعقد ہوتا تھا۔ جس میں سکھ  
پنچھ کی شان اور گرو صاحبان کی عظمت پر بڑی دھواں دھار  
تقریس ہوتی تھیں۔ اس سال خالصہ ہائی سکول کی طرف  
سے ”دیوان“ میں گرو نانک پر مضمون پڑھنے کے لیے میرا  
انتخاب ہوا۔

میں نے عبدالحليم شرر کے ناولوں سے شجاعت و سخاوت و  
ذکاءت کے قصے نکالے، رتن ناٹھ سرشار سے میاں آزاد کا  
دم خم اڑایا، الفاظ و بیان کی شوکت محمد حسین آزاد سے  
لی اور کئی کتابوں کے صفحے نقل کر کے ان میں مناسب ترمیم  
و تحریف کے بعد ایک ست رنگ خلعت فاخرہ تیار کر کے  
گرو مہاراج شری نانک دیو کو پہنادی۔ مضمون کے آخر  
میں گرو نانک کی مح میں بیس اشعار کا ایک منظوم قصیدہ  
بھی تھا۔

اس قصیدے کی تیاری میں محشر انبالوی کی تصنیف ”آل ذورعین“  
سے بڑی مدد ملی۔ یہ کتاب دراصل اراستے برادری کی تاریخ  
تھی جس میں فاضل مصنفوں نے اس قوم کو عرب کے ایک  
نجیب الطرفین قبیلے ذورعین کی آل اولاد ثابت کیا تھا۔  
عجیب و غریب تاریخی حقائق و شواہد کے علاوہ اس کتاب میں  
ارائیوں کی عظمت و فضیلت پر بہت سی نظمیں بھی تھیں۔  
بھر طویل میں ایک لظم مجھے پند آئی۔ میں نے اس میں

”بلبان بے نظیر“ ”صلعلان ہم سفیر“ جیسی ترکیبیں حذف کر دیں۔ اور ان کی جگہ گروناک دیو کے جملہ القاب و صفات کو ٹھونس کر ایک شاندار قصیدہ تیار کر لیا۔

URDU4U.COM  
نگھے سجا کے دیوان میں ڈھائی تین ہزار کا مجمع تھا۔ مہاراجہ پیالہ کری صدارت پر مستمکن تھے۔ پنڈال میں ایک طرف ننگ اکالی بیٹھے تھے۔ دوسری طرف نزکاریوں کا اجتماع تھا۔ ایک کونے میں کلال گڑھی کے کچھ مونے سکھے تھے۔ درمیان میں عوام الناس نہیں پر بیٹھے تھے۔ اسنج پر اوپر دائیں طرف علاقے کے افراد اور رئیسوں کی کریاں تھیں۔ باسیں جانب ہمارے سکول کا شاف تھا۔

پنڈال سے باہر ایک کونے میں تیس چالیس مسلمان مردوں نے بھی اچھوتوں کی طرح الگ تھلگ کھڑے تھے۔ یہ چمکور کی ادائیں برادری تھیں جو کرم بخش کی ترغیب پر سکھوں کی بھری محفل میں میری تقریر کا محیر العقول کارنامہ دیکھنے کے شوق میں چلے آئے تھے۔

سنج پر آکر مجھے اپنی زندگی کی پہلی تقریر کرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہ آئی۔ میرا کام تو فقط زبان بلانا تھا۔ ورنہ فقرے پر فقرہ تو شرر اور سرشار اور آزاد کے قلم سے نکل کر خود بخود پرواہ کرتا تھا۔ پنڈال میں بالکل سکوت تھا۔ جب میں نے ترجم سے بحر طویل کا قصیدہ الپنا شروع کیا تو یہ سناتا اور بھی گرا ہو گیا۔ میری تقریر ولپذیر ختم ہوئی تو پنڈال میں کئی جانب سے ”شلاش۔“ ”شلاش“ کی آوازیں آئیں۔ مہاراجہ پیالہ جو کری صدارت میں نیم خوابیدہ بیٹھے تھے، اچانک چونکے انہوں نے مجھے تھکنی دی۔ اپنی جیب سے ملکہ وکٹوریہ کی مورت والا چاندی کا ایک روپیہ نکلا، اسے انگلی پر آوریاں کر کے انگوٹھے سے اچھال کر شن سے بجا یا، اور مجھے انعام میں دیا،

دیوان ختم ہوتے ہی میری جماعت کے سکھ لڑکے مجھے کشاں کشاں سکول کے پچھوٹے میں لے گئے۔ کچھ دیر انہوں نے ”راج کروگا خالصہ۔۔۔۔۔ باقی رہے نہ کو“ الپ الپ کر میرے گرد اگر بھگڑا ڈالا اور پھر مہاراجہ پیالہ کے انعام کا روپیہ زردستی چھین کر لے گئے۔

میرے مضمون اور قصیدے کی کامیابی نے گویا میرے سینے میں بندھی ہوئی بہت سی گھنٹیاں کھول دیں۔ ”آل ذور عین“ کی نظموں سے قافیے اور رویف جمع کر کے اب میں نے کچھ اپنی تک بندی بھی شروع کر دی۔ پہلے رویق جموی تخلص رکھا۔ پھر کسی ضرورت شعری سے مجبور ہو کر جعفر چمکوری سے بدل ڈالا۔ میرا ایک شعر خاص طور پر ہمارے سکول میں زبان زد خاص و عام ہو گیا، اور سکھ طلبہ بھی اسے شوق سے اپنے جواب مضمونوں میں استعمال کرنے لگے۔ شعر عرض کیا تھا

یہ ایسا عجوب شر چمکور ہے  
کہ ثانہ نمیں جس کا لاہور ہے

رفتہ رفتہ میں نے اپنی بیاض بھی کھول لی۔ ایک روز شام کے وقت میں نہر کے کنارے میل میل کر فکر خن کر رہا تھا، کہ ماشر منگل سنگھ بائیکل پر سوار ادھر سے گزرے۔ مجھے دیکھ کر رک گئے اور بیاض لے کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ ایک دو جگہ ٹھنک کر مجھے گھورا اور غھے سے ”ہوں،“ ”ہوں“ کہا۔ پھر ایک غزل پر پہنچے جس میں عرض کیا تھا۔

مرے منہ پر زلفیں گرانے کو آ جا  
مری بات گبڑی بنانے کو آ جا  
تری یاد کی گھنٹیاں بج رہی ہیں  
مرے دل کی دنیا بنانے کو آ جا  
برا حال ہے جعفر خستہ جاں کا  
مری جان جاتاں بچانے کو آ جا

ماشر منگل سنگھ بجلی کی طرح ترپے، اور بیاض چھاڑ کر نہر میں پھینک دی۔ پھر وہ دونوں

ہاتھ کمر پر رکھ کر جلاں کی طرح میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور کڑک کر بولے۔ ”ورینکلر فائل کا امتحان سر پر آیا کھڑا ہے۔ اور یہ مرزا غالب کی اولاد شاعری کے مل کھڑ کا رہی ہے۔ کیوں ہے؟ یہ کیا واهیات بکواس ہے؟“

انہوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور نانگ گھما کر نہن پر پنج دیا۔ پھر وہ دری تک لا توں، مکوں اور تھپڑوں سے میری خاطر خواہ تواضع فرمایا کہ اپنے بائیکل پر سوار ہو کے رخصت ہو گئے۔ میں نے اٹھ کر گالوں اور کہنیوں کو سلایا، کپڑے جھاڑے اور اطمینان کی سانس لے کر ازسر نو مشق خن میں معروف ہو گیا۔

ورینکلر فائل کے لیے ہمارے امتحان کا سنٹر گورنمنٹ ہائی سکول روپڑ مقرر ہوا۔ روپڑ کا شرپچکور صاحب سے کوئی گیاہ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ تین چار بیل گاڑیوں میں سوار ہو کر ہم سب فارسی کے استاد پنڈت سری رام کی قیادت میں ایک روز پہلے وہاں پنج گئے۔ سکھوں کے ایک مقامی ہوشل میں ہمیں ٹھہرایا گیا۔ سورج غروب ہوتے ہی کھانے کی گھنٹی بجی سب لڑکے اپنی اپنی رکابی، گلاں اور گھنی لے کر لنگر خانے میں حلقة باندھ کر بیٹھ گئے۔ مسلمان بس ایک میں ہی تھا۔ اس لیے مجھے چوکے سے باہر دوسروں سے الگ خاصی دور بٹھا دیا گیا۔ ایک لانگری کڑچھی ہاتھ میں لیے وال بانٹ رہا تھا۔

دو سکھ ایک بہت بڑے توے پر تیز رفتاری سے پھلکے پکا رہے تھے۔ وہ بار بار اپنی داڑھیان کھجالاتے تھے۔ اور پیسٹے کے بڑے بڑے قطرے روٹھن کے لیے گندھے ہوئے آئے میں مسلسل ٹپک رہے تھے۔ یوں بھی وقت فوقة وہ اپنی گردن اور بغلوں کا پیسٹہ پونچھ کر انہی گیلے ہاتھوں سے چپاتیاں پکانے لگتے تھے۔ والہ لانگری بھی دیگچے کے آس پاس زور زور سے ناک صاف کرتا تھا، اور رینٹ کو انگلوں کے درمیان دری تک کولڈ کرم کی طرح ملتا رہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ بار بار کھانس کر بلغم کے بڑے بڑے غلفے اپنے سامنے تھوک کر انہیں انڈوں کی زردی کی طرح پاؤں کے انگوٹھے سے مسل دیتا تھا۔ لانگریوں کے یہ بے تکلفانہ انداز دیکھ کر میرا جی متلانے لگا، اور میں سر درد کا بہانہ کر کے کھانا کھائے بغیر لنگر سے اٹھ آیا۔

ہوشل کے جس کمرے میں مجھے جگہ ملی، اس میں دس بارہ سکھ لڑکے اور بھی تھے۔ سونے سے پہلے انہوں نے کپڑے اتار ڈالے۔ کچھ دیر نگے مل کر جسم کو ہوا لگائی اور پھر ایک ایک کچھرا اور بندی پہن کر بینھ گئے۔ پہلے انہوں نے اپنے کیس کھولے اور انہیں جھٹک جھٹک کر گفتگھا کیا۔ پھر رسول کا تیل ڈال کر واڑھیاں چڑھائیں اور ان پر میلی میلی پیاس سی باندھ لیں۔ بغلوں کے لانبے لانبے بالوں کو بھی انگلیوں سے مروڑ مردوڑ کر ان میں کنڈل ڈالے، اور اس نائلک سے فارغ ہو کر وہ بڑی دیر تک آپس میں نقش گفتگو اور دھینگا مشتی کرتے رہے۔ دو لڑکوں نے آمنے سامنے بینھ کر ہتھ رسی کا مقابلہ کیا۔

لنگر سے وہ آپس میں شرطیں لگا کر پختے کی دال کے ساتھ میں میں تمیں چھاتیاں کھا کر آئے تھے۔ اب رضائی میں لیٹ کر اگر ایک لڑکا ڈکار لیتا تھا، تو باقی سب بھی اس کے مقابلے میں زور زور سے ڈکارتے تھے۔ اگر ایک لڑکے سے بادشاہ کا جھونکا سرزد ہوتا تھا، تو دوسرے بھی باآواز بلند اس کا ساتھ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ کمرے کی فضا میں سندھاس کی کثافت رچ گئی، اور رضائی میں منہ سر پیٹے بھی مجھے ساری رات ابکائیاں آتی رہیں۔ صبح نوبجے پرچہ تھا۔ پرچہ ختم ہوتے ہی میں امتحان کے ہال سے نکلا، اور پاپیاہ چلتا ہوا غروب آفتاب کے وقت چمکور صاحب پہنچ گیا۔

اگلی صبح پھر میں چار بجے دوسرا پرچہ دینے روپڑ کے لیے پیدل روانہ ہو گیا۔ کرم بخش مجھے نمر تک چھوڑنے آیا۔ شدید سردیوں کے دن تھے۔ چاروں طرف بڑی گمری وہند چھائی ہوئی تھی۔ گھاس پر کورا جما ہوا تھا۔ گھپ اندریے میں دور تک پھیلے ہوئے جو نہ یوں نظر آتے تھے جیسے بہت سے ہاتھی سونڈ اٹھائے کھڑے ہیں۔ وقت فوقہ گیدڑوں کے چینخے کی آواز بھی آتی تھی۔ ان کی چینخوں کے ساتھ گاؤں کے کتنے بھی زور زور سے رونے لگتے تھے۔ ان دنوں سارے علاقے پر جگموہن سنگھ ڈاکو اور اس کے گروہ کی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کی شجاعت، سخاوت اور بے رحمی کے عجیب و غریب قصے

زیان زد خاص و عام تھے۔ کبھی کبھی میرے دل میں ایک دلی دلی خواہش چوری چوری سر اٹھاتی تھی کہ اگر قسمت یا وری کرے اور جگموہن نگہ ڈاکو مجھے پکڑ کر اپنے گروہ میں شامل کر لے تو میری زندگی کا بھی کوئی مقصد بن جائے۔

کرم بخش نے مجھے بتایا کہ جگموہن آج کل شملہ پہاڑ کے راجوں اور رجواڑوں کی لوٹ مار میں مصروف ہے۔ اس لیے نہ سرہند کا کنارا مسافروں کے لیے بالکل محفوظ ہے۔

تاہم احتیاطاً اس نے میری پاکٹ واج اتروا کے اپنے پاس رکھ لی۔

مجھے نہ تک پہنچا کر کرم بخش واپس لوٹ گیا۔ میں نے اپنی لائھی کندھے پر رکھی اور روپڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کمنے کو تو میں روانہ ہو گیا، لیکن دراصل میرے پاؤں میں سیسہ بھرا ہوا تھا۔ کچھ سردی اور کچھ خوف سے میرا تن بدن برف کی طرح ٹھٹھتا ہو رہا تھا۔ اور آس پاس ذرا سی کھڑکھڑاہٹ سے دل اچھل کر گلے میں پھنس جاتا۔

ابھی کچھ دور ہی گیا تھا کہ نہ کی پسزی کے میں درمیان دو انگارہ سی آنکھیں مجھے گھورتی نظر آئیں۔ میں نے کھانس کھانس کر اپنی لائھی نہیں پر زور سے ماری،

تو جنگلی بلا ”میاؤں“ کر کے جھاڑیوں میں بھاگ گیا۔ چاروں طرف چھائے ہوئے سنائے کے گنبد میں وہ ”میاؤں“ دری تک صور اصرافیل کی طرح گونجتی رہی۔ دو چار گیدڑ بھاگتے ہوئے آئے اور میرا راستہ کاٹ کر گزر گئے۔ ایک درخت پر اتنی چمگادڑیں پر پھیلائے اٹھی لٹکی ہوئی تھیں کہ شاخوں پر کالا کالا سائبان ساتن گیا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سے ان کے آرام میں خلل پڑا تو چند چمگادڑیں عجیب خوفناک آواز سے چلائیں۔ آگے

گیا تو ایک ٹنڈ منڈ درخت پر بہت سے بندر اور چند لنگور شاخ بشاخ اٹھی قلابانیاں کھا رہے تھے۔ ایک لنگور بڑی عجیب بازیگری دکھا رہا تھا۔ درخت کی شاخ کے گرد وہ اپنی دم پیٹ کر جھولے کی طرح جھولتا تھا، اور پھر فضا میں قلابانیاں کھاتا ہوا کسی دوسری شاخ کی طرف پلتا تھا۔ لیکن دوسری شاخ کو چھوئے بغیر وہ اسی طرح ہوا میں قلابازی کھا کر واپس لوٹتا تھا، اور حسب سابق پہلی شاخ کے ساتھ اٹھا لٹک جاتا تھا۔ اس طرح کی اصلی لنگوری جست زندگی میں صرف اسی روز دیکھنا نصیب ہوئی ہے۔ اس کے بعد

یہ کرتب فقط امور بیاست اور سیاست اور سفارت ہی میں نظر آئے ہیں۔ دو تین بندوں نہ کسی پہنچتے کا بہانہ۔ نیت تو میری دیر سے ڈانوا ڈول ہو رہی تھی۔ اب بندروں اور لگوروں کو اپنی راہ میں حائل دیکھا تو دل نے بے اختیار گواہی دی کہ جان ہے تو جہاں ہے پیارے۔ امتحان کو گولی مارو، اور آرام سے گھر واپس لوٹ چلو۔ ورنیکلر فائل اگلے سال بھی ہو جائے گا۔ میں اسی شش دنیج میں کھڑا تھا کہ سنائے میں دور سے ”ہری اوام“ کی آواز لہرائی، اور تاریکی میں ایک پتلا سا سایہ ابھرا، اور ”ہری اوام“ ”رام رام ست ہے“ کی ملا جپتا تیز تیز میرے قریب سے گزر گیا۔ یہ مکسودون پاؤ دھا تھا۔

مکسودون پاؤ دھا چمکور صاحب کے ہندوؤں کا پروہت تھا۔ سکھ اور مسلمان بھی اس سے اپنے بچوں کی جنم پتیاں بناتے تھے۔ نجوم اور رمل میں مہارت کے باعث سارے گاؤں میں شادی بیاہ کی تاریخ، سفر پر روانہ ہونے کی ساعت، اور مرگ و حیات کی جملہ رسومات کا پروگرام وہی طے کرتا تھا۔ عام بیماریوں کا علاج تو حکیم بنت رام کے سپرد تھا۔ لیکن چیچک، خسرہ، پلیگ اور ہیضہ جیسے موذی امراض پر مکسودون پاؤ دھا کا کنٹرول تھا۔ اذان کی آواز پر وہ خالی ٹین بجانا شروع کر دیتا تھا، تاکہ بول سنائی نہ دیں۔ درود شریف سن کر وہ دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا تھا۔ جب کبھی وہ ہمارے محلے سے گزرتا تھا، تو مسلمان بچے زور زور سے درود شریف پڑھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے تھے۔ یہ سن کر مکسودون پاؤ دھا کانوں میں انگلیاں دئے اتنی تیزی سے بھاگنا شروع کر دیتا تھا کہ ہم لوگ بھی اس کے تعاقب میں بری طرح ہانپے لگتے تھے۔

مکسودون پاؤ دھا کا معمول تھا کہ وہ صبح تین چار بجے اٹھ کر زور زور سے ہری اوام، ہری اوام، رام رام ست ہے کے مہمانی کرتا ہوا نہر پر جاتا تھا۔ اور گرمی ہو یا کڑا کے کی سردی ٹھنڈتے پانی سے اشنان کر کے اپنی پوچاپاٹ شروع کرتا تھا۔ اس کے معمول میں ایسی باقاعدگی تھی کہ اس کے نہر پر جانے اور واپس آنے کی آواز لوگوں کے لیے الارم نائم پیس کا کام دیتی تھی۔

میرے قریب سے گزر کر مکسودن پا دھا جب بندروں کے پاس پہنچا، تو ان کا ایک جم غیر اس کے گرد جمع ہو گیا۔ ہنوان جی کو نمکار کر کے مکسودن نے ایک پوٹلی کھولی اور بہت سی پوریاں بندروں کے سامنے ڈال دیں۔ پھر وہ نمر کے کنارے ایک پتھر کی سل پر بینھے گیا اور پانی کی گڑویاں سر پر ڈال ڈال کر چھپا چھپ نہانے لگا۔

ایک سانچھ ستر برس کے دبلے پتلے مخنی سے برہمن کی یہ شان مردانگی دیکھ کر میرے اسلام کی رُگ حیمت بھی کسی قدر پھر کی۔ میں چھاتی نکال کر لاخھی گھماتا ہٹے آرام سے بندروں کے پاس سے نکل آیا جن کی توجہ بہر حال پوریوں پر مرکوز تھی۔ اور مکسودن پا دھا سے کچھ دور رک کر اس کی رام رام کے جواب میں زور زور سے درود شریف پڑھنے لگا۔ مکسودن پا دھا نے پہلے تو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر آواز کی سوت کا کھونج لگایا اور پھر درود شریف کے الفاظ سن کر اس نے یک لخت دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ میں درود شریف بند کرتا تھا، تو وہ کان کھول دیتا تھا۔ اور جب دوبارہ پڑھنے لگتا تو پھر انگلیاں ٹھونس لیتا۔ جی تو بہت چاہا کہ ہری اوام ہری اوام اور درود شریف کی آنکھ مچوں کا یہ کھیل جاری رکھوں۔ لیکن میری منزل کھوئی ہوتی تھی۔ اس لیے میں با آواز بلند درود شریف کا ورد کرتا آگے بڑھ گیا۔ درود شریف پڑھتے پڑھتے آہستہ آہستہ رگوں میں جمی ہوئی برف پکھلنے لگی۔ پھر جسم پر ہلکی ہلکی حرارت کی ٹکرور ہونے لگی۔ اور اس کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے الیکٹریک بلینکٹ اوڑھا ہوا ہو۔ تین سو تین گھنٹے کے بعد جب میں امتحان کے ہال میں پہنچا تو خاصا پیشہ آیا ہوا تھا۔ میں نے آرام سے پرچہ کیا، اور پھر ہال سے اٹھ کر درود شریف پڑھتا ہوا خراماں خراماں شام تک گھر پہنچ گیا۔

جب نتیجہ نکلا، تو ورنیکلر فائل کا وظیفہ تو مجھے صرف دو برس کے لیے ملا، لیکن درود شریف کا وظیفہ میرے نام تاحیات لگ گیا۔

یہ ایسی نعمت مجھے نصیب ہوئی جس کے سامنے کریم بخش کے سارے "اجیبیہ" گرو تھے۔ اس کے لیے نہ پرانی باؤلی کے پانی میں رات کو دو دو پھر ایک ٹانگ پر کھرا

ہونا پڑتا تھا۔ نہ کنوئیں میں اٹالک کر چلے معکوس کھینچنے کی ضرورت تھی۔ نہ گگماڑی میں ڈھول کی تال پر کنی کنی گھنٹے ”حال“ کھینٹنے کی حاجت تھی۔ نہ مراقبے کی شدت تھی، نہ مجہدے کی حدت تھی، نہ ترک حیوانات، نہ ترک لذات، نہ تقلیل طعام، نہ تقلیل منام، نہ تقلیل کلام، تقلیل اختلاط مع الائام، نہ رجعت کا ڈر، نہ وساوس کی فکر، نہ خطرات کا خوف۔ یہ تو بس ایک تخت طاؤس تھا، جو ان دیکھی لمروں کے دوش پر سوار آگے ہی آگے، اوپر ہی اوپر رواں دواں رہتا تھا۔ درود شریف نے میرے وجود کے سارے کے سارے افقوں کو قوس قزح کی لطیف رداوں میں لپیٹ لیا۔ گپ اندھروں میں مہین مہین سی شعاعیں رچ گئیں، جنہیں نہ خوف و ہراس کی آندھیاں بجھا سکتی تھیں نہ افکار و حوادث کے جھونکے ڈگمگا سکتے تھے۔ تھائی میں انجمن آرائی ہونے لگی۔ بھری محفل میں مجرموں کی خلوت سما گئی۔ دل شاد، روح آباد۔ جسم یوں گویا کشش ثقل سے بھی آزاد۔ سب سے بڑی بات یہ تھی، کہ درود شریف کی برکت سے پرده خیال پر ایک ایسی بابرکت ذات کے ساتھ قربت کا احساس جاری و ساری رہتا تھا۔ جس کے پاؤں کی خاک اغواٹ اور اقطاب اور اوتار و ابدال کی آنکھ کا سرمد۔ جس کے قدموں میں دنیا کامران اور عقبنی بھی با مراد۔ جس کے ذکر کے نور سے عرش بھی سر بلند اور فرش بھی سرفراز۔ جس کا ثانی نہ پلے پیدا ہوا، نہ آگے کبھی ہو گا۔ اور جس کی آفرینش پر رب البدیع الخالق الباری المصور نے اپنا صنای کی پوری شان تمام کر دی

بلغ العلی بکمالہ

کشف الدج بجمالہ

حسنۃ جمیع خصالہ

صلو علیہ وآلہ

دو برس بعد میں نے میز کیو لیشن کا امتحان بھی بالکل اسی طرح روپڑ اور چمکور صاحب کے درمیان روزانہ پاپیاہ آتے جاتے اور درود شریف کا ورد کرتے کرتے پاس کر لیا۔  
URDU4U.COM  
دادی اماں چند ماہ قبل فوت ہو گئی تھیں۔ ایک دن سخت سردی میں انہوں نے حسب معمول ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے دھوپ میں بال سکھائے۔ رات کو بخار چڑھا اور اگلے روز ڈبل نمونیہ تشخیص ہوا۔ جب حالت نیاہ گزر گئی تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر چپکے سے کہا۔ ”پت، اب چل چلاو ہے۔ مولیٰ کھانے کو جی چاہتا ہے۔ چوری چوری لا کر مجھے کھلا دو۔“

میں بھاگ کر کھیتوں سے دو بڑی بڑی تانہ مولیاں لے آیا۔ دادی اماں نے رضائی سے منہ سر ڈھانپ لیا اور نمک لگا لگا کر دونوں مولیاں مزے سے کھا لیں۔ اسی شام ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۰۸ برس کے قریب تھی۔

یوں تو کرم بخش پر خوشی نیاہ اثر انداز ہوتی تھی نہ غمی۔ اس پر کبھی گرمی کا اثر ہوتا تھا نہ سردی کا۔ کافیوں کا نہ سائب کا، بچھو، بجو اور لسنگہ پوٹ کا۔ لیکن دادی اماں کی موت کے بعد وہ بھی دنیا کے بے ثباتی سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اور گگا ماڑی جا کر ڈھول بجانے والے ملنگوں کی صفائی میں شامل ہو گیا۔  
چمکور کے گرو، نواح میں دور دور کالج نہ تھا۔ اس لیے میں بھی جموں واپس لوٹ آیا اور پرانس آف ولز کالج میں ایف، ایس، سی کا داخلہ لے لیا۔

## • مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ چائے

ببا اجیت سنگھ جہجہار ہری خالصہ ہائی سکول سے اٹھ پنس آف ویز کالج جموں کا داخلہ ویسا ہی تھا جیسے کسی دور افتاب گاؤں کا دیہاتی اچانک بڑے شر میں وارد ہو جائے۔ چند روز قدرے بوکھلاہٹ رہی۔ لیکن جب میں نے بھی دوسروں کی طرح کوٹ پتوں نیب تن کر کے گلے میں نائی کا پھندا ڈال لیا تو بڑی آسانی سے ”ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد“ کے محاورے میں ڈھل گیا۔

پتوں پن کر پہلی بار باہر نکلا تو بڑا حجاب آیا۔ کیوں ہر قدم پر یہی احساس ہوتا تھا، کہ میں سڑک پر نیگا ہی چلا آیا ہوں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جو لوگ پاجامہ پہنے باہر گھومتے پھرتے نظر آتے تھے، ان پر برہنگی کا شبہ ہونے لگا۔

اردو کا جھنڈا تو میں خالصہ ہائی سکول میں گاڑی ہی آیا تھا۔ اب کالج آ کر میں نے انگریزی زبان کو اپنا تختہ مشق بنا لیا۔ چند مہینوں کے اندر اندر میں نے کالج لابریری میں شکیسپنیر سے لے کر زمانہ حال تک جتنا انگلش لڑپچر موجود تھا، اس کا بیشتر حصہ ایسے ہی چلتے پھرتے کھنگال ڈالا۔ نامس ہارڈی اور رابرت لوئی شیونسن مجھے پسند آئے۔ لیکن میری جان کو جس کا اصلی روگ لگ گیا، وہ پی۔ جی وڈ ہاؤس تھا۔

وڈ ہاؤس طنز و مزاح کی ایک چھوٹی سی شفاف جھیل ہے۔ نیا وہ لمبی چوڑی نہ نیا وہ گھری۔ اس میں فلسفہ کا جهاڑ جھنکار آگتا ہے۔ نہ نظر بات کی لمبی اٹھتی ہیں۔ محدود وسعت کی کمائیوں سے وہ لامحدود تفنن طبع کا سامان مہیا کرتا ہے۔ زبان اس پر کبھی حاوی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ خود زبان پر اس درجہ حاوی رہتا ہے، کہ موم کی ناک کی طرح اسے جس طرف چاہے مروڑ کر اپنے بے نظیر اسلوب بیان میں ڈھال لیتا ہے۔ اس نے ۸۸ سے اوپر تصانیف چھوڑی ہیں۔ ایک ایک کتاب کئی کئی بار پڑھنے سے بھی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ انگلش لڑپچر کی تاریخ میں اس کا شمار ان لوگوں میں تو نہ ہو گا جنہیں

کلاسیکی درجہ دیا جاتا ہے لیکن اگر وڈا ہاؤس پیدا نہ ہوا تو انگریزی زبان کی بہت سی نزاکتیں اور لطفتیں تشنہ اظہار نہ جاتیں۔

علمی انگریزی تک رسائی تو لا بھری ی کے ذریعہ ہو گئی، لیکن عملی انگریزی کا تجربہ مجھے اپنے والد بزرگوار سے حاصل ہوا۔

عبداللہ صاحب ایک دیا کی طرح تھے، جو نمایت خاموشی سے نظرؤں سے او جھل زیر نہیں بہہ رہا ہو۔ پانچ چھ برس کی عمر میں جب وہ یکا یک بیتیم ہو گئے، تو اکٹشاف ہوا کہ ان کا بال بال قرضہ میں بندھا ہوا ہے، اور گھر کی ساری نیشن اور مکان سا ہو کاروں کے پاس رہن رکھے ہوئے ہیں۔ موروثی زر اور نیشن کی یہ بے شباتی دیکھ کر عبداللہ صاحب نے اب ایسی جائیداد بنانے کا تیہہ کر لیا، جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جاسکے۔ چنانچہ وہ دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہک ہو گئے۔ اس زمانے میں چمکور صاحب میں کوئی سکول نہ تھا۔ پرانگری سکول پانچ میل دور تھا، مُل سکول گیاہ میل اور ہائی سکول بیس میل۔ دو دو سال کا امتحان ایک ایک سال میں ختم کر کے اور وظیفہ لے کر عبداللہ ضلع انبارہ سے میریکولیشن کے امتحان میں اول آئے۔

ان دونوں سریںد احمد خان کی تحریک علی گڑھ کا بڑا چرچا تھا۔ لدھیانہ کی انجمن مفید عام اس تحریک سے متاثر تھی۔ پنجاب میریکولیشن میں غالباً پہلی بار کوئی مسلمان لڑکا ایک ضلع میں اول آیا تھا۔ عبداللہ صاحب کا ریملٹ دیکھ کر انجمن مفید عام کا ایک کارکن چمکور صاحب آیا، اور عبداللہ صاحب کو علی گڑھ سریںد کے پاس لے گیا۔ وہاں پر انہوں نے انگریزی، عربی، فارسی، فلسفہ اور یاضی میں اپنی دھاک بھٹھائی۔ اور علی گڑھ کالج کے ابتدائی دور میں بی۔ اے کر لیا۔

بی۔ اے کے بعد سریںد کی وساطت سے انہیں انگلستان جا کر آئی سی ایس کے امتحان کے لیے وظیفہ ملا۔ اس زمانے کے توهہات میں سات سمندر پار کا سفر بلائے ناگہانی کے مترادف تھا۔ چنانچہ دادی اماں نے اپنے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ

صاحب سعادت مند فرزند تھے۔ انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔ سر سید کو مسلمان نوجوانوں کا مستقبل سنوارنے کے دھن ہی نہیں بلکہ جنون تھا۔ انہوں نے عبداللہ صاحب کو بڑا سمجھایا بجھایا، ڈرایا اور دھمکایا۔ غصے میں آ کر کچھ پٹائی بھی کی۔ لیکن ماں کی خواہش کے سامنے وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر مالیوس ہو کر سر سید نے انہیں علی گڑھ سے نکال دیا اور حکم دیا کہ اب وہ عمر بھر اپنی منحوس صورت انہیں نہ دکھائیں، اور ایسی چلگہ جا کر مریں جہاں کوئی ان کا نام نہ لینے والا ہو۔

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند فرزند تھے، اتنے ہی اطاعت گزار شاگرد بھی تھے۔ سر سید کے حکم کی لاج انہوں نے اس طرح رکھی کہ گلگت کے دور افقارہ مقام پر جا کر کلرکی اختیار کر لی۔ ان دونوں چمکور صاحب سے سرینگر کے راستے گلگت پہنچنے کے لیے بیس بائیس روز لگتے تھے۔ ایک سو آٹھ سال کی عمر میں وفات پانے تک دادی اماں نے کبھی گاؤں سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ اس لیے وہ خوش تھیں کہ گلگت جا کر بیٹا گھر کے پاس ہی رہا، سات سمندر پار تو نہیں گیا।

گلگت کی کلرکی عبداللہ صاحب کو بڑی راس آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کشمیر راج کی طرف سے وہاں کے گورنر بن گئے۔ گلگت میں انہوں نے اٹھاہہ بیس برس گزارے۔ ان کے سب بچوں کی پیدائش بھی وہیں پر ہوئی۔ تین بیٹے، تین بیٹیاں۔ اس علاقے کی بین الاقوامی اہمیت اور چینی اور روی ہمسایوں کے معاملات پر انہیں خاصا عبور حاصل تھا۔ کشمیر کے مہاراجہ پر تاب نگہ کے ساتھ ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ اس کی وفات کے بعد جب مہاراجہ ہری نگہ گدی پر بیٹھا، تو اس سے ان بن ہو گئی۔ سینتالیس سال کی عمر میں عبداللہ صاحب نے ملازمت سے بکدوٹی حاصل کر لی، اور مستقل طور پر جموں میں قیام پذیر ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کی صدیوں سے خوابیدہ قسم انگریزی لینے لگی تھی۔ یونگ مینز مسلم ایسوی ایشن کے پردے میں چودھری غلام عباس نے اپنی

سیاسی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ نے بھی سرینگر میں ایسوی ایشن کی برابری کھوں کر سیاست کے خارزار میں پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ مسلمانان یا سیاست کے افق پر دو نوجوان تیزی سے ابھرے، اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاسی آسمان پر پوری تباہی سے چھا گئے۔

چند برس بعد آل جموں و کشمیر مسلم کافرنز کی داغ بیل ڈالی گئی، تو چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ کی جوڑی اس کی روح رواں تھی۔ لیکن جیسے جیسے بر صیر کی سیاست میں پاکستان کا نظریہ ابھرتا گیا، ویسے ویسے ان دونوں لیڈروں کے راستے بھی ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے، چودھری صاحب نے مسلم کافرنز سمیت قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں نظریہ پاکستان کا راستہ اختیار کر لیا۔ شیخ صاحب نیشنل کافرنز کا ڈیڑھ ایئٹ کا مندر الگ بنا کر مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے چونوں میں جا بیٹھے چودھری غلام عباس کی شخصیت اور سیاست صدق، خلوص، ویانت اور امانت کا مرقع تھی۔

ان کی آنکھوں میں عقاب کی تیز نگاہی تھی، اور دل میں جذبات کی طغیانی۔ اسلام پر ان کا صرف ایمان ہی نہ تھا، بلکہ عملی زندگی میں بھی وہ بڑے محروم تھی، عبادت گزار اور قلندر صفت مومن تھے۔ اسلام کے بعد ان کا دوسرا جزو ایمان پاکستان تھا۔ مسلمان کشمیر کے دل میں پاکستان کے ساتھ واپسی کا عقیدہ رائج کرنے کا سر اس سب سے نیا وہ انسی کے سر ہے۔ زندگی عزیز کے کئی سال انہوں نے جیل میں گزارے۔ پاکستان آ کر بھی انہیں دوبارہ جیل جانا پڑا۔ کچی بات دو ٹوک کہہ دینا ان کی طبیعت ثانی تھی۔ اس لیے اپنے بھی ان سے خفاظتے بیگانے بھی ناخوش۔ وہ زہر بہاں کو کبھی کہہ نہ سکے قند۔ حال کی حقیقت کو قال کی مصلحتوں میں چھپانا ان کا شیوه نہ تھا۔ ان کے اصلی جوہر کو اگر کسی نے پچھانا تو صرف قائد اعظم نے پچھانا۔ پاکستان کے باقی سب لیڈر اور سے تو ان کی عزت کرتے تھے، لیکن اندر سے کھنپے کھنپے رہتے تھے۔ چودھری صاحب کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ یہ جس نایاب ہماری سیاست کے مزاج کی خدمت تھی۔ اس لیے ذہنی تصادم کا میدان کارزار ہر وقت گرم رہتا تھا۔

اس کے بر عکس شیخ محمد عبداللہ کے کباز خانے میں بے پیندے کا لوٹا تھے۔ جب انہوں نے یونیورسٹی میں سائنس ٹپچر تھے۔ چہرے پر بڑی خوشنا داڑھی تھی اور گلے میں لحن داؤ دی کا نور بھرا تھا۔ ان کی قرات اور نعت خوانی ہزاروں لاکھوں کے مجھ کو مسحور رکھتی تھی۔ لیکن پھر مسٹر گوبال سوامی آنگنگر کشمیر کا وزیر اعظم بن کر آیا۔ کہنے کو یہ آئی۔ سی۔ ایس افسر تھا، لیکن درپردازہ وہ انڈین نشنل کامگرس کے مندر کا پچاری تھا۔ اس نے اپنے جال کچھ ایسی چلکدستی سے بچھائے، کہ شیخ صاحب سدھائے ہوئے بیٹر کی مانند بڑی آسانی سے تھہ دام آگئے، دیکھتے ہی دیکھتے۔ ان کی ذہنی، معاشی اور جسمانی کیا کلپ ہو گئی۔ امیر اکدل اور حضرت مل کے جلوں میں نعمتیں پڑھ کر لاکھوں کو رلانے والے شیخ جی اب نئے نئے اپنودیث سوت پن کر ”بندے ماترم“ کا ترانہ الائے، بمبئی کے ”تاج“ اور کلکتہ کے ”گرینڈ“ ہوٹل کی ہائی سوسائٹی میں چھپمانے لگے۔ ریزیڈنسی روڈ جموں پر انجمن اسلامیہ کے غریبانہ دفتر سے اٹھ کر ان کی نشست و برخاست بولا ہاؤس ولی، انند بھون الہ آباد اور واروہا جیسے مقامات میں منتقل ہو گئی۔ مسلم کافرنس سے ناطہ توڑ کر شیخ صاحب نے نیشنل کافرنس کی بنیاد ڈالی، تو پہلے اس کے استرے سے اپنی خوبصورت داڑھی کا صفائی کیا، اور پھر اس قضیہ کشمیر کی خشت اول بھی رکھ دی جو آج تک پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک خطرناک ناسور کی طرح رس رس کر بہہ رہا ہے شیخ محمد عبداللہ کی یہ ڈگر کسی نظریاتی اصول پرستی کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ وہ سیاست کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھ کر اسے اپنی طبیعی ہٹ دھرمی برخود غلط انانیت اور ذاتی ہوش اقتدار کی تسلیکن کے لیے بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ کی کری ان کی زندگی کا واحد مقصد بن کر رہ گیا تھا۔ اس پر ممکن رہنے کے لیے وہ سیاسی بلیک میں بھی کرتے تھے، اپنا تھوکا ہوا بھی چائے تھے، اصولوں کی قلابازیاں بھی کھاتے تھے اور مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ منافقانہ آنکھ چھوپی بھی کھلتے تھے۔ ان کے یار غار

پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کی گیڑ بھیکیوں کی قلعی کھولنے کے لیے ان کو کئی برس جیل میں ٹھونے رکھا، اور شیخ صاحب ان کے حضور بدستور وفاداری کی دم ہلاتے رہے۔

پنڈت نہرو کی بیٹی مسز اندراء گاندھی نے کالی دیوی کا روپ دھار کر آمریت کا ڈول ڈالا، تو وہ بھی اس کے فریم میں کھٹاک سے فٹ ہو گئے۔ مسز اندراء گاندھی کی معزوفی کے بعد بھارت میں ہوا کا رخ بدلا، تو شیخ صاحب نے بھی جھٹ پٹ ”قصہ کھینچا“ دری میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا؟“ چنانچہ جب جموں کے پہاڑ پر ویشنو دیوی کا میلہ منعقد ہوا، تو شیخ محمد عبداللہ نے بھی دیوی کی یاترا کے لیے کمر باندھی، اور آخری تین سو فٹ کا فاصلہ ڈنڈوت کرتے ہوئے پیٹ کے بل نہیں پر لیٹ کر رینگتے ہوئے طے کیا۔ دیوی ماتا کے چرن چھوئے، اور اس کے پاؤں کا دھونوں پی کر اپنی وزارت اعلیٰ کو آب حیات کا انجیکشن دیا۔ شیخ صاحب کی سیاست پلاس ٹی میں کی ہم صفت تھی، ان کے بھارتی آقا جب چاہیں انہیں توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کا پتلا بنا لیتے تھے۔

مسلم کانفرنس کے ابتدائی دور میں چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ والد صاحب کے پاس بڑی کثرت سے آیا کرتے تھے۔ بیاستی مسلمانوں کی زیوں حالی، ان کے حقوق اور مطالبات کے متعلق کبھی مہاراجہ کو میمورنڈم بھیجننا ہوتا تھا، کبھی وزیراعظم کو، کبھی ریزیڈنٹ کو، علامہ اقبال کو باخبر رکھنے کے لیے ان کے نام بھی طویل مراسلے تیار کئے جاتے تھے۔ ہندو مسلم فسادات کی تحقیقات کے لیے ڈلشن کمیش مقرر ہوا، تو اس کے لیے بھی مسلمانوں کا کیس تیار کرنا ہوتا تھا۔ بیاستی مسلمانوں کی شکایات، مشکلات اور حقوق کا تعین کرنے کے لیے گاندی کمیش کا تقرر عمل میں آیا تو اس کو بھی بڑے بڑے میمورنڈم پیش کرنے تھے۔ اس قسم کی سیاسی دستاویزات کی ڈرافنگ عبداللہ صاحب کے سپرد ہوتی تھی۔

ملازمت سے بسکدوشی کے بعد عبداللہ صاحب آزری سیکرٹری کے طور پر انجمن اسلامیہ جموں کا کام بھی سنبھالتے تھے، اور صبح سے شام تک ان کے پاس دور دراز سے آئے ہوئے مسلمان کاشت کاروں اور سرکاری ملازموں کا تائنا بندھا رہتا تھا، جنہوں نے اپنی کسی

تکلیف کے سلسلے میں حکومت کے پاس درخواست یا اپیل دائر کرنا ہوتی تھی، عبد اللہ صاحب بڑی خندہ پیشانی سے انہیں مشورے بھی دیتے تھے اور ان کی درخواستیں اور اپلیئن بھی ڈرافٹ کر دیتے تھے۔

ان کا طریق کاریہ تھا کہ دن میں وہ اپنا بستر لپیٹ کر گاؤں تکے کی طرح سرہانے رکھ لیتے تھے، اور بان کی کھڑی چاپائی پر اس سے نیک لگا کر نیم دراز ہو جاتے تھے۔ گرمیوں میں قیض اتار دیتے تھے، اور صرف شلوار پن کر بیٹھتے تھے۔ ان کی روی نوپی پاس ہی ایک تپائی پر پڑی رہتی تھی۔ جب کبھی ماں جی کمرے میں داخل ہوتی تھیں، تو وہ فوراً اپنی نوپی اٹھا کر سر پر رکھ لیتے تھے۔ قیض کے بغیر شلوار اور روی نوپی کا لباس ہمیں عجیب سا نظر آتا تھا۔ لیکن وہ اسی انداز سے بڑے بڑے لیدروں سے مل لیتے تھے۔ اسی طرح چاپائی پر بیٹھے بیٹھے کھانا کھا لیتے تھے، چائے پی لیتے تھے، اور انگریزی زبان میں نہایت اہم سیاسی، آئینی اور قانونی میمورنڈم لکھاتے جاتے تھے۔

جب انہوں نے کچھ لکھانا ہوتا تھا، تو میری طلبی ہوتی تھی۔ میں کاغذ پنسل لے کر پاسنٹی بیٹھ جاتا تھا۔ وہ بے تکان بولتے جاتے تھے۔ میں اپنے ہی وضع کردہ شارت پینڈ میں لکھتا جاتا تھا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی نشت میں تمیں چالیس چالیس صفحوں کا ڈکٹیشن ہو گیا۔

آئے دن کی یہ یاپت اپنا رنگ لا کے رہی، اور دل ہی دل میں مجھے اپنی انگریزی وافی پر کافی اعتماد ہو گیا۔ میں تھرڈ ائیر میں پڑھتا تھا، کہ لندن سے ایک بین الاقوامی مضمون نویسی کے مقابلے کا اعلان ہوا۔ سب سے چوری چوری میں نے بھی ایک سانچہ ستر صفحات کا مضمون لکھ کر بھیج دیا۔ حسن اتفاق سے پہلا انعام مجھے مل گیا۔ اس بات کا بڑا چرچا ہوا۔ اخبارات میں تصویریں شائع ہوئیں۔ بر صغیر کے بہت سے ہندو اور مسلمان مشاہیر کے تہنیتی خط اور تار آئے۔ کالج والوں نے چندہ کر کے میری ایک بڑے سائز کی فوٹو فریم کروائی۔ سارے کالج کا جلسہ منعقد ہوا۔ پنسل نے صدارت کی۔ مجھے ان کے ساتھ سیچ پر بٹھا دیا گیا۔ چند پروفیسروں نے تعریفی تقریں کیں۔ اور کافی لمبی چوڑی

رسم کے بعد میری تصویر کالج کے ہال میں ایک نہایت نمایاں جگہ آواریاں کر دی گئی۔ پہلے پہلے تو میں کچھ جھینپتا سارہا۔ لیکن رفتہ رفتہ اتنا کی خود پر سی غالب آئی۔ دن میں ایک بار میں ضرور کسی نہ کسی بہانے کالج کے ہال سے گزرتا تھا، اور کن انگھیوں سے جب اپنی تصویر پر نگاہ غلط انداز ڈالتا تھا، تو میرا نفس بے اختیار گول گپے کی طرح پھول جاتا تھا۔

انعام کی مبارکبادی کے دو خط میری جگہ میرے پرنسپل کو آئے۔ ایک حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری کے پرائیویٹ سکرٹری کی جانب سے تھا۔ اس میں تحریر تھا کہ سر اکبر حیدری خوش ہو کر مجھے ایک سو روپے کی کتابیں انعام میں مرحمت فرمانا چاہتے ہیں۔ پرنسپل صاحب اس قیمت کے اندر اندر کتابوں کی فہرست بنا کر بھیج دیں، اور ساتھ ہی میرے چال چلن اور بیاستی حکومت کے ساتھ وفاداری کی تصدیق بھی کریں۔

پرنسپل سیوا رام سوری نے مجھے بلا کر میری پسندیدہ کتابوں کے متعلق استفسار کیا۔ انہوں نے میری نیک چلنی اور وفاداری کے متعلق بھی ایک نہایت اچھا سرشیفکیٹ بنا رکھا تھا۔ لیکن میں نے یہ انعام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس میں انعام کی پیشکش کم اور پولیس انکوارری کا رنگ نیا ہو جھلتا تھا۔ پرنسپل صاحب نے مجھے سمجھایا کہ یوقوف نہ بنو۔ مفت میں کچھ اچھی اچھی کتابیں ہاتھ آ جائیں گی۔ جب میں نہ مانا تو تالیف قلب کے طور پر انہوں نے اپنی جیب سے مجھے پچھیس روپے نقد عطا فرمائے، کہ اپنی مرضی کی کتابیں خرید لو۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ تقریباً ڈیڑھ برس بعد جب علامہ اقبال کی زندگی میں پہلا اقبال ڈے منایا گیا، تو مجھے بھی اس میں شریک ہونے کی سعادت لفیض ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ چرچا عام ہوا، کہ سر اکبر حیدری نے نظام دکن کے تو شہ خانہ سے انہیں ایک ہزار روپیہ کا چیک بطور ”تواضع“ ارسال کیا تھا۔ علامہ نے سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد دکن کے نام یہ اشعار لکھ کر چیک واپس کر دیا تھا:

تحا یہ اللہ کا فرمان کہ شگوہ پرویز  
 دو قلندر گولہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات  
 مجھ سے فرمایا کہ لے اور شمنشاہی کر  
 حسن تدبیر سے دے آنی وقاری کو ثبات  
 میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سردوش  
 کلام درویش میں ہر تینج ہے مانند نبات  
 غیرت فقر مگر کرنہ سکی اس کو قبول  
 جب کما اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

اصل وجہ کا تو اب تک وثوق سے کوئی علم نہیں، لیکن عجب نہیں سر اکبر حیدری نے  
 اپنی عادت کے مطابق علامہ اقبال کے چال چلن اور حکومت وقت کے ساتھ وفاداری کی  
 کوئی تصدیق طلب کی ہو!

پرنسپل کے نام دوسرا خط کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ کے اے۔ ذی۔ سی کی جانب سے  
 تھا۔ اس میں حکم تھا، کہ از روئے الاف خردانہ ہر ہائیس نے مجھے چائے پر مدعو فرمایا  
 ہے۔ پرنسپل کو ہدایت کی جاتی ہے، کہ وہ مجھے "سرکار" کی حضوری کے آداب سمجھا  
 کر مقررہ وقت پر راج محل حاضر ہونے کی تائید کریں۔

پرنسپل صاحب نے بڑی وضاحت سے مجھے مہاراجہ کی بارگاہ میں حاضری اور گفتگو کے طور  
 طریقے سمجھائے، اور جب وہ روز سعید طلوع ہوا، تو میں بڑے اہتمام سے سوت بوٹ پن  
 کر شام کے چار بجے مہاراجہ پیلس پہنچ گیا۔

وہاں پر ایک صاحب نے جو "ڈیوڑھی وزیر" کہلاتے تھے، مجھے از سر نو مہاراجہ کی سرکار  
 میں پیش ہونے کے آداب سمجھائے، اور ایک آراستہ وینگ روم میں بٹھا دیا، جمل دس  
 باہہ آدمی دباری لباس پہنے چند پری چھروں کے ساتھ پہلے سے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا  
 کہ کوئی صبح کے نوبجے سے بایابی کا منتظر بیٹھا ہے، کوئی دس بجے سے۔ لیکن سرکار

نے ابھی تک یاد نہیں فرمایا۔ میں نے ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد کچھ بے صبری دکھائی، تو ڈیوڑھی وزیر غصے سے بولے، کہ میاں تم کس کھیت کی مولی ہو۔ یہ دوسرے حضرات جو یہاں بیٹھے ہیں۔ سب کری نشین درباری ہیں۔ اور یہ آراستہ پیراستہ خواتین سرکار کی منظور نظر ہیں۔ تین چار دن سے یہ ہو رہا ہے، کہ یہ سب صحیح سوریے یہاں آ کر بیٹھ جاتے ہیں، اور شام تک انتظار کر کے ہنسی خوشی واپس چلے جاتے ہیں۔ تم بھی چپکے سے بیٹھے رہو۔

میں گھنٹہ بھر اور چپکے سے بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اپنی خودی کو تھوڑا سا بلند کیا، اور ڈیوڑھی وزیر کو برملہ کہہ دیا، کہ مہاراجہ صاحب سے ملنے کی درخواست میں نے نہیں کی۔ انہوں نے خود مجھے چائے پر مدعو کیا ہے۔ اب اگر انہیں فرصت نہیں تو میں چلتا ہوں۔ ڈیوڑھی وزیر صاحب مجبور ہو کر خالص ڈوگری زبان میں بظاہر زیر لب بڑبڑاتے لیکن حقیقتاً مجھے گالیاں دیتے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دو اے۔ ڈی۔ سی آئے اور مجھے کشاں کشاں راج محل کے ایک اندروںی برآمدے میں لے گئے۔ وہاں انواع و اقسام کی وردیاں نیب تن کئے بیرون، بیرون اور درباریوں کا ہجوم ایک صوف کے گرد دست بسہ ایستادہ تھا۔ صوف پر ہزار نسیں راج راجیشور مہاراج ادھیراج شری مہاراجہ ہری سنگھ بہادر، اندر مندر، پسروں سلطنت انگلشیہ، جی۔ سی۔ آئی، جی۔ سی۔ آئی۔ ای، کے۔ سی۔ وی۔ او، نڈھال بھینے کی طرح اوندھے پڑے تھے۔ ان کے جسم کا گوشت پوست صوف پر یوں بکھرا ہوا تھا جیسے گندے کپڑوں سے بھرا ہوا سوت کیس تیز رفتار گاڑی سے باہر گر کر چکت گیا ہو۔

مہاراجہ ہری سنگھ رات بھر شراب کے ساتھ کچے اور کچے گوشت کا شغل فرماتے تھے، اور دن بھر دید، حکیم اور ڈاکٹر ان کے کشتوں کے پشتے لگا کر انہیں اگلی شب کے لیے تانہ دم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی چند عورتیں اور مردان کے اعضاً رئیسہ و غریبہ کی خفی اور جلی ماش کرنے میں مصروف تھے۔ مہاراجہ کی آنکھیں کچھ

کھلی اور کچھ بند تھیں، اور ان کے کونوں میں گید گندے بیرونی کی طرح تھے در تھے جم رہی تھی۔ ایک اے۔ ڈی۔ سی نے مجھے دھکیل کر مہاراجہ کی سرکار میں پیش کیا۔ دوسرے اے۔ ڈی۔ سی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مہاراجہ کے دست مبارک کے ساتھ ہلکے سے رگڑ دیا۔ ہاتھ ملانے کی اس رسم میں وہ کیفیت تھی جو مینڈک کے لجلحہ پیٹ کو ہتھیلی پر رکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

اس تعارف کے بعد مہاراجہ بہادر کے زخمرے سے غٹ غٹ کی کچھ آوازیں برآمد ہوئیں، جن میں دیافت فرم ا رہے تھے کہ یہ شخص کون ہے؟ اور یہاں کیوں آیا ہے؟ اے۔ ڈی۔ سی نے کمال ادب سے اطلاع دی، کہ سرکار یہ وہی شخص ہے جس کے انعام جتنے کا اخبار میں پڑھ کر حضور نے بطور رعایا پوری اور کرم گسترشی چائے پر مدعو فرمایا تھا۔

مہاراجہ بہادر نے بھد استغنا و دیا دلی ہاتھ کے اشارے سے ایک بیرے کو حکم دیا، کہ لے جاؤ اسے۔ پلاو چائے والے۔ کچھ پیشتری ویشتری بھی.....

غنوگی کے مارے مہاراجہ صاحب اپنا فقرہ بھی نہ پورا کر پائے، اور دو تین بیرے میری طرف یوں لپکے جیسے وہ میری مشکلیں کس کر چائے پلانے لے جائیں گے۔

اسی روز میں نے اپنے دل میں یہ عزم بالجزم کر لیا، کہ میں کسی صورت میں کبھی بیاست کشمیر کی ملازمت اختیار نہ کروں گا۔ چنانچہ نی۔ ایس۔ سی کرتے ہی جب مجھے شیٹ گورنمنٹ سے انگلستان جا کر فارسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ پیش ہوا، تو میں نے بڑی بے اعتنائی سے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے انگریزی کا داخلہ لے لیا۔

پرانس آف ولز کالج کے چاروں سال انگریزی کا بھوت میرے سر پر بڑی طرح سوار رہا۔ اگرچہ کالج میگزین ”توی“ کے اردو سیکشن کی ادارت میرے سپرد تھی، تاہم اردو تک بھی میری رسائی بنیان انگریزی ہی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں مجھے ہر چیز پلے انگلش میں

سوجھتی تھی، اور میں اس کر کے اردو کے قلب میں ڈھالتا تھا۔ شیلے اور کیشیں کی چند نظموں کے منظوم ترجیے بھی کئے۔ ”اے باد غرب“ مولانا صلاح الدین احمد صاحب کو بھی پسند آئی۔ اور انہوں نے اسے ”اوی دنیا“ میں شائع فرمایا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور سے ایک رسالہ ”جاوید“ جاری ہوا تھا۔ اس کے ایک ایشوع میں ”سماگ گیت“ والی نظم فرقہ گور کھپوری کے نام سے چھپی دیکھی۔ میرے لیے تو یہ بات باعث فخر تھی، کہ میری کوئی چیز غلطی سے بھی فرقہ جیسے عظیم شاعر کے نام لگ سکتی ہے۔ لیکن اگر ان کے علم میں یہ چیز آگئی ہوتی، تو وہ ضرور اسے اپنی توہین قرار دیتے!

## ○ اے باد غرب

لائی ہے مغربی گھٹا فصل خزان کا قافلہ  
رنج بھی غم بھی خار بھی باہہ بے خمار بھی  
تیرے شرار سوز سے پھول چمن میں جل اٹھے  
تیرے ہی نیش خار سے سینہ گل نگار بھی  
تیری حیات میں نہاں مانا کہ ہے خزان کی جاں  
تیری ہی گود میں جوان پل کے ہوئی بہار بھی

پیدا ہوئے تھے برگ و گل ایک ہی رات کے لیے  
تو نے دبا کے رکھ لیے تانہ حیات کے لیے

تیرے خرام ناز سے پیدا اک اضطراب ہے  
بھر میں بر میں باغ میں دشت میں کھوسار میں  
دامن تار میں نہاں تیرے ہیں لاکھ آندھیاں

چیے نہاں ہوں بجلیاں گیسوئے تابدار میں

گردش ماہ و سال کو منزل کاروان ہے تو  
تیرہ و تار رات کی آخری داستان ہے تو

نالہ جوش تھا خوش کس نے کیا ہے پر خروس؟  
بحر کی خفتہ موج کو کس نے جگایا خواب سے؟  
زلفیں عروں باغ کی تو نے صبا بکھیر دیں  
سینئہ آب کو نئے داغ دیئے حباب سے

تیری نوائے پر الٰم، تیری صدائے رنج و غم  
تیری ندائے زیر و بم پھیلی ہوئی ہے یم بہ یم

میرا چمن اجز گیا باد صبا تو کیا ہوا  
تو اور میں تو ایک ہیں درد بھری صفات میں  
گیت ہیں ہار جیت کے بھولی ہوئی پریت کے  
دونوں کی راگنی ہے غم کارگہ حیات میں  
میری صدائے ہاو ہولے جا صبا مثال بو  
جا کے سنا دے کوکو عرصہ کائنات میں

رنگ خزان نے لے لیے باغ میں برگ و بار کے  
بلبل نیم جاں نہ رو، آتے ہیں دن بھار کے  
(شیلے کی Ode to the west wind کا ترجمہ)

## ○ سماں گیتے

لڑکے:

رات! جلا دے جلدی جلدی ویپک مala تاروں کی تو  
 بھر بھر تحال لٹا دے موئی جھوی میں گلزاروں کی تو  
 چاند کی کرنوں کو بن بن کر سندر صورت بیج بچا دے  
 دکھ داتا ہے دن کی اگنی سورج دیو کی جوت بچا دے  
 آ جا سندر سپنوں والی جھوٹے حیلے اور بھانے  
 رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی یہ کیا جانے

لڑکیاں:

جاری سکھی آکاش کے تارے آج تیرے رکھا لے ہوں گے  
 سکھے نگیت کی ریت منانے جھوم جھوم متوا لے ہوں گے  
 پسیم کی اوچخ اور بیخ سے تھک کر پیاری سکھی جب تو سو جائے  
 سندر سندر کومل کومل ٹھنڈے سپنوں میں کھو جائے  
 نہ نہ کر یوں ڈرتا ہے من، تو اپنی ہے نہ بیگانے  
 رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی یہ کیا جانے

لڑکے:

رات کا پل پل بردھتا جائے دن کی گھڑیاں سوتی جائیں  
 اوچخے نیچے پریت میں سورج کی کریں کھوتی جائیں  
 کوند کوند کے بھلی جیسے کوئی بدل میں کھو جائے  
 جیسے کالے بالوں والی ناری بیٹھی بال سکھائے

لڑکیاں:

جاری سکھی پر تیرا جانا دل ہی نہ مانے دل ہی نہ مانے  
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی یہ کیا جانے

سب مل کر:

نیند کے ماتے نیند بھلا دیں پریم کا ساگر جب لراۓ  
من کا راگی من مندر میں URDU4U.COM میسھی میسھی تان اڑائے  
چسے من کی پینگ بڑھا کر چنپل آشا جھولا جھولے  
یا جسے رت آئے بنتی کھیت کھیت میں سرسوں پھولے  
روٹھ روٹھ کے بیٹھے کوئی، کوئی ڈھونڈے چور بھانے  
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی کیا جانے  
(شیلے کے bridal song سے متأثر ہو کر)

○○○

## • چندر اوٰتی

پنس آف ولز کالج جموں میں تو خیر میں کسی نہ کسی طرح اندھوں میں کاتا راجہ بیٹھا تھا لیکن گورنمنٹ کالج لاہور میں آ کر ساری شیخی کر کری ہو گئی اور یہاں میں کسی شمار قطار میں نہ رہا۔ نہ تو مجھ میں سنبری snobbery کی اہلیت تھی اور نہ ہی زبان گھما گھما کر، ہونٹ سکیر سکیر کر، حلق توڑ مروڑ کر اینگلو انگلیں لبھے میں انگریزی بولنا میرے بس کا روگ تھا۔

انگریز تو خیر اپنے مادری لبھے میں انگریزی بولنے پر مجبور ہے ہی لیکن جاپانی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، روی اور چینی بھی اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں تو اپنے فطرتی لبھے کو انگلستانی سانچے میں ڈھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ غلامی کے دور نے احساس کمتری کی یہ وراثت صرف ہمیں کو عطا کی ہے کہ اگر ہم اپنے نیچرل لبھے میں انگریزی زبان بولیں تو اسے بڑا مضمکہ خیز لطیفہ سمجھا جاتا ہے۔

اپنی اس کوتاہی کے احساس سے دب کر میں اپنے خول میں گھس گیا۔ اور ریشم کے کیڑے کی طرح سست کر اپنا ایک الگ کوکون بنایا۔ یہاں پر میری ملاقات چندر اوٰتی سے ہو گئی۔

وہ لیڈی میکلگین کالج کی سوڈنٹ تھی اور موہنی روڑ پر ہندو لڑکیوں کے ایک آشرم میں رہتی تھی۔

ایک روز پنجاب پیلک لائبریری میں ہم دونوں ایک ہی کتاب اپنے نام جاری کرنے کے امیدوار تھے۔ پہلے ہمارے درمیان ہلکا سا فساد ہوا، لیکن پھر لائبریریں نے یہ کتاب ایک ہفتہ کے لیے میرے نام ایشوع کرنے کا فیصلہ دے دیا۔

جب میں نے رجسٹر میں اپنا نام درج کروایا تو چندر اوٰتی نے آنکھیں سکیر کر مجھے غور سے گھورا اور پھر چمک کر بولی۔ ”اچھا تو تم ہی وہ تمیں مار خاں ہو جس نے انگلش

Essay کا انعام جیتا تھا۔؟ اخباروں میں تصویر تو بڑی اچھی چھپوائی تھی۔ دیکھنے میں تو ویسے نظر نہیں آتے۔“

اس غیر متوقع حملے نے مجھے لمحہ بھر کے لیے جھپٹا دیا۔ میں کوئی جواب سوچ ہی رہا تھا،  
کہ وہ دویاہ بولی۔ ”ارے تم تو بالکل لڑکیوں کی طرح شرم لجا رہے ہو۔ چلو مان لیا  
وہ تصویر تمہاری ہی تھی۔ اب پلیز یہ کتاب مجھے دے دو مجھے پرچہ تیار کرنا ہے۔“

میں نے فوراً کتاب اس کے حوالے کر دی۔ اور ساتھ ہی اپنا سارا علم و فضل بھی اس  
کے قدموں میں ڈال دیا۔

وہ دوسرے تیرے روز گورنمنٹ کالج آ جاتی تھی۔ میں اپنی کلاس چھوڑ کر اس کے ساتھ  
لان میں بیٹھا جاتا تھا، اور دیر تک اسے بڑی محنت سے پڑھاتا رہتا تھا۔

جب وہ ہمارے کالج آتی تھی، تو کئی لڑکے دو رویہ کھڑے ہو جاتے تھے، اور اسے دیکھ  
کر بڑی خوشی دل سے سیپیاں بجاتے تھے۔ ایک روز ہم لان میں بیٹھنے تھے، تو پروفیسر  
ڈکن میری کلاس کا پیریڈ لے کر قریب سے گزرے۔ مجھے دیکھ کر رک گئے، اور کافی  
دیر تک نگاہیں گاڑ کر چندراوتی کو گھورتے رہے۔ پھر مسکرا کر بولے۔ ”ٹھیک ہے،“ تمہارے  
لیے یہی مناسب مقام ہے۔ کلاس روم میں تو ایک بھی ایسی گولڈن گرل نہیں۔“

چندراوتی واقعی سورن کنیا تھی۔ وہ سپر ڈیشنری سمشیر قسم کی لڑکیوں کی طرح حسین نہ  
تھی۔ لیکن اس کے وجود پر ہر وقت سپیدہ سحر کا ہالہ چھایا رہتا تھا۔ رنگت میں وہ سونے  
کی ڈلی تھی، اور جلد اس کی باریک موی کاغذ تھی جس کے آپار نگاہ جاتی بھی ہے اور  
نہیں بھی جاتی۔ اس کی گروں میں چند باریک باریک نیلی رگوں کی بڑی خوشما پیچی کاری  
تھی۔ اور جب وہ پانی پیتی تھی تو اس کے گلے سے گزرتا ہوا ایک ایک ایک گھونٹ دور  
سے گنا جا سکتا تھا۔

چندراوتی کو لاہور میں رہتے کافی عرصہ ہو چلا تھا۔ لیکن اب تک اس نے نہ جما نگیر  
کا مقبرہ دیکھا تھا، نہ نور جہاں کے مزار پر گئی تھی، نہ شالیمار باغ کی سیر کی تھی۔ اتوار  
کے اتوار میں ایک بائیکل کرائے پر لیتا تھا، اور اسے کیرری پر بٹھا کے تاریخی مقامات

کی سیر کر لاتا تھا۔ وہ اپنے آشرم سے آلو کی بجھیا اور پویاں بنانی تھی، اور بڑی احتیاط سے میرا حصہ الگ کافند پر رکھ کر مجھے دے دیتی تھی۔ کیونکہ ذات کی وہ کثر ہندو تھی۔ اور وہ اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو ہرگز ہرگز میرا ہاتھ نہ لگنے دیتی تھی۔ ایک اتوار ہم بادامی باغ کی سیر کے لیے گئے۔ وہاں پہنچ کر ہر طرف دیکھا بھالا، لیکن نہ کہیں بادام نظر آئے اور نہ ہی کوئی باغ دکھائی دیا۔ مجبوراً ہم نے ایک گندے سے دھوپی گھٹ کے قریب بیٹھ کر اپنا پک نک منا لیا۔

چند راتوں کو سائیکل پر بٹھا کر لاہور کی سڑکوں پر فرانے بھرنے کی مجھے کچھ ایسی چیزیں پڑ گئی، کہ میں نے اپنا ذاتی بائیکل خریدنے کا تیہہ کر لیا۔ انہی دنوں ڈیلی ٹریبون میں نیڈوز ہوٹل والے مسٹر نیڈو کا اشتہار نکلا کہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے فوری طور پر پرائیویٹ ٹاؤن کی ضرورت ہے۔ میں نے عرضی ڈال دی۔ مسٹر نیڈو سفید فرنچ کٹ داڑھی والے گول مثول سے بوڑھے انگریز تھے۔ مجھے دیکھ کر بڑا مایوس ہوئے۔ کہنے لگے، ”لڑکا بڑا صدی اور سرکش ہے۔ پڑھنے لکھنے کا نام نہیں لیتا۔ تم خود نو عمر ہو۔ تم اسے کیونکر سنبھالو گے۔ میں تو کسی تجربہ کا راستہ نہیں پہنچ سکتا۔ میں تو کسی تجربہ کا راستہ نہیں پہنچ سکتا۔“

میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا، کہ میں بھی بڑا مصروف ہوں۔ ایک ماہ سے زیادہ ٹیکش نہیں کر سکتا۔ اگر اس عرصہ میں وہ لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گیا تو میری اجرت ایک عدد ریلے بائیکل ہو گی، اگر یہ مقصد پورا نہ ہوا تو میں کوئی فیس نہ لوں گا۔

یہ سووا مسٹر نیڈو کے دل کو بجا گیا۔ لیکن ریلے بائیکل کی جگہ انہوں نے ہر کویس کی پیشکش کی۔ آخر کچھ بحث بھتی کے بعد معاملہ ایک فلپس بائیکل پر طے ہو گیا۔ ان دنوں ریلے کی قیمت ۹۰ روپے، ہر کویس کی ۲۳ روپے اور فلپس ۲۷ روپے ہوا کرتی تھی۔ ٹیکش شروع کرنے سے پہلے میں نے مسٹر نیڈو سے کہا، کہ اگر لڑکا بہت بگرا ہوا ہے، تو شاید کسی قدر سختی سے کام لینا پڑے۔ انہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟ مسٹر نیڈو عصبی الزاج بزرگ تھے۔ اپنے بیٹے کے لا ابالی پن سے نالاں نظر آتے تھے۔

میری بات سن کر انہوں نے گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھا، کہ کوئی اور گوش برآواز تو نہیں۔ پھر آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ ”خدا تمہیں خوش رکھے۔ ضرور سختی کرو۔ لیکن دیکھنا کوئی ہڈی وڈی نہ توڑ بیٹھنا۔ میرے سر پر قیامت آ جائے گی۔“

JURDU4U.COM  
جان نیڈو پندھ سولہ برس کا مغروف سا لوئڈا تھا۔ ایک ملازم مجھے اس کے کمرے میں لے گیا۔ اس نے ناک سکیڑ کر نفرت سے میری طرف دیکھا، اور بد تیزی سے بولا۔ ”نکل جاؤ فوراً آپ کا اس کمرے میں کیا کام ہے؟“

”صبر بیٹا، صبر۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارا نیا ٹیوڑ ہوں۔ تمہیں پڑھانے آیا ہوں۔“ ”اوونہ، ٹیوڑ۔“ جان نے تھیقر سے الفاظ چبا کر کہا۔ ”میں کہتا ہوں چلے جاؤ۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں۔“

جان نے چھاتی پھلانی اور دونوں ہاتھ پتلوں کی جیبوں میں ڈال کر میرے سامنے اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھانپ لیا کہ یہ لا توں کا بھوت ہے، با توں سے نہیں مانے گا۔ گربہ کشتن روز اول۔ میں نے اس کے منہ پر زور سے ایک زنائے دار چانٹا رسید کیا، اور ڈانٹ کر کہا۔ ”یو سن آف چ۔“ تمہاری اماں نے تمہیں استاد سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی؟ جیب سے ہاتھ نکال کر سیدھی طرح کھڑے ہو جاؤ۔“

جان نے کچھ اور اکڑ دکھائی، تو میں نے پے درپے اس کے دو تین اور تھیڑ لگا دیئے۔ وہ روتا ہوا دروازے کی طرف لپکا، تو میں نے اسے گردن سے کپڑ کر روک لیا۔ اور کہا۔ ”تمہارا باپ اس میں کوئی دخل نہ دے گا۔ میں اس سے پوچھ آیا ہوں؟“

”نان سنس۔“ جان چلایا۔ ”میرا باپ مجھے مارنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”صرف ہڈی توڑنے کی اجازت نہیں۔“ میں نے اسے مطلع کیا۔ ”باقی سب چھٹی ہے۔“

جان نے مجھے بڑی شستہ انگریزی میں دو تین گالیاں دیں۔

میں نے اس کی کلائی مروڑ کر پیچھے پہ ایک لات جمائی اور اسے مرغا بننے کا حکم دیا۔ یہ اصطلاح اس کے لیے نہی تھی۔ میں نے خود مرغا بن کر اس کی رہنمائی کی۔ پانچ دس منٹ کان پکڑ کر اس کی طبیعت صاف ہو گئی۔ اور اس کے بعد ہمارے درمیان

دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ ایک ماہ کے بعد جب میں اپنا فلپس سائیکل وصول کر کے رخصت ہونے لگا تو سارا گھر میرے پیچھے پڑ گیا کہ میں منہ مانگی فیس پر جان کا ٹھوڑا بنا رہوں۔ لیکن میری ٹھوشن تو چندراوتی کے ساتھ گلی ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا۔

اب لاہور تھا، اور میرا بائیکل۔ کسی ٹریفک سارجنت نے بھی شر کی اتنی گشت نہیں کی ہو گی جتنا کہ ہم دونوں نے لاہور کے گلی کوچوں کو کھنگال ڈالا۔ ایک اتوار میں چندراوتی کے پاس آشرم پہنچا، تو وہی اداں بیٹھی تھی۔ اس نے کوئی اٹا سیدھا خواب دیکھا تھا۔ اور وہ اپنی ماں کے لیے فکر مند تھی۔ میں نے اسے کیریر پر بھایا، اور گرینڈ ٹرنس روڈ پر ایمن آباد کی راہ لی۔ میں سائیکل چلاتا رہا۔ چندراوتی پیچھے بیٹھی کوئی بھجن گنگتاتی رہی۔ اور چھپیں ستائیں میل کا فاصلہ دیکھتے ہی دیکھتے وقت سے بہت پہلے ختم ہو گیا۔

ایمن آباد ایک ٹنک و تاریک گلی میں دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں کا ایک بوسیدہ سا گھر تھا۔ چندراوتی کی یوہ ماں پہلے کپڑے سی کر گزانہ کیا کرتی تھی۔ پھر موتیا اتر آنے سے اس کی نظر کمزور ہو گئی تو سینے پرونے کا کام بند ہو گیا۔ اب وہ غلہ منڈی کے ایک آڑھتی چکدیش چندر کے ہاں برتن مانجھنے، کپڑے دھونے اور گھر کی صفائی کرنے پر ملازم تھی۔ چکدیش چندر اسے معقول تخلواہ دیتا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ اسے اس کا کام پسند تھا۔ بلکہ صرف اس وجہ سے کہ اس کی بیٹی خوبصورت تھی۔ ماں کی تخلواہ کے بھانے وہ دراصل چندراوتی پر سہ کھیل رہا تھا۔ یوں بھی جب کبھی وہ لاہور جاتا تھا، تو چندراوتی کو اس کی خیر خیریت بتانے آشرم ضرور جاتا تھا۔ جس روز پکنک کے لیے چندراوتی آلو کی بھجیا اور پوریوں کے علاوہ کچھ مٹھائی بھی لاتی تھی، تو میں کچھ جاتا تھا کہ چکدیش چندر آیا ہو گا۔ اور پاؤ بھر مٹھائی کا نذرانہ دے کر رسم عاشقی نبھا گیا ہے۔ ایک دو بار میں نے چکدیش چندر کا نام لے کر چندراوتی کو چھیڑنے کی کوشش کی، تو اس نے بڑے درد و کرب سے ہاتھ جوڑ کر منت کی۔ ”اس مورکھ کا

نام نہ لو۔ تمہاری زبان میں کیڑے پڑ جائیں گے۔“

چندراوتی کی ماتا مجھے بڑی پسند آئی۔ اس کے پور پور سے شکستگی، شانتگی اور شانستی پتختی تھی۔ اس نے برف ڈال کر دودھ کی کچھ لی بنائی۔ ان کے ہاں مسلمانوں کے لیے کوئی الگ برتن نہ تھا۔ اس لیے میں نے دونوں ہاتھوں کا چلو بنایا، چندراوتی نے گڑوی اٹھائی، اور دیر تک اس میں دور سے لی اندھیلتی رہی۔ ماتا جی یہ نظاہہ دیکھ کر بہت نہیں، اور پھر چندراوتی کو ڈانٹا کہ گھر آئے ہوئے پروہنے کو کبھی ایسے بھی لی پلایا کرتے ہیں؟ ”کوئی بات نہیں ماتا جی۔“ چندراوتی نے کہا۔ ”یہ تو اپنے ہی لوگ ہیں، کوئی پروہنا تھوڑی ہیں۔“

کہنے کو تو بے خیالی میں وہ یہ فقرہ بول گئی۔ لیکن پھر اپنے آپ اس کے کافنوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔ اور وہ جلدی جلدی برتن سمیٹ کر رسولی میں چلی گئی۔ میں بھی راجہ اندر کی طرح آلتی پالتی مار کر موڑھے پر بینٹھ گیا۔ اور ان پھلبجڑیوں کا مزہ لینے لگا جو چندراوتی کی بات سے میرے انگ انگ میں بڑی کثرت سے چھوٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد پیپل کے پتوں کی دال اور بھنڈی کا سالن پروسا گیا۔ کھانے کا ایک ایک لقمہ گھی اور شکر اور شد اور بالائی بن کر میرے گلے سے اتر گیا۔ تیرے پر جب ہم لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو سائیکل کے پیڈل اس طرح گھونمنے لگے جیسے دھنکی ہوئی روئی کے گالے ہوا میں اڑتے ہیں۔ سائیکل ذرا تیز ہوا، تو مجھے بھی ترنگ آئی، اور میں نے چندراوتی کو چھیڑنے کے لیے ”پروہنا“ ”سوہنا“ ”من موهنا“ ”سانوولا سلوانا“ وغیرہ کے قافية جوڑ کر کچھ بے شکے سے عاشقانہ مصرعے الاضنے شروع کر دیئے۔

دو تین بار چندراوتی نے مجھے سختی سے ٹوکا۔ لیکن میرے سر پر بھی شاعری کا بھوت سوار تھا۔ جب میں نہ مانا، تو آنا فانا اس نے چلتی ہوئی سائیکل سے چھلانگ لگا دی۔ گرینڈ ٹرنک روڑ کے عین پیچہ وہ منہ کے مل گری اور اس کی باسیں کھنپ پر خاصی گری خراش آئی۔ میں نے زخم صاف کرنے کے لیے اپنا رومال پیش کیا، تو اس نے غصے سے جھنک

کرنیں پر پھینک دیا۔

چندراوتی کو اصرار تھا، کہ اب وہ یہاں سے پیدل لاہور جائے گی۔ میرے ساتھ بائیکل پر نہ بیٹھے گی۔ میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ لاہور ابھی اٹھاہے انہیں میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ اتنا کیسے چلے گی؟ میں اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں؟ لیکن وہ بھی تریاہٹ کے سکھاں پر چڑھی بیٹھی تھی۔ ہر چند میں نے اپنے کان کھینچنے، ہاتھ جوڑے، معاف مانگی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر میں نے اپنی پیشانی نہیں پر رکھدی اور اس کے سامنے گنگن کر ناک سے لکیریں کھینچنے لگا۔ وہ کھکھلا کر ہنس دی۔ ”ارے، یہ تم کس کو ڈنڈوت کر رہے ہو؟“

”دیوی جی، ڈنڈوت نہیں کر رہا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ناک سے لکیریں کھینچ رہا ہوں تاکہ تم معاف کر دو۔“

چندراوتی نے سڑک پر پھینکا ہوا میرا رومال اٹھا کر مجھے دیا، اور کہا، ”لو رومال سے اپنی ناک صاف کر لو۔ بالکل سرکس کے کلاون نظر آ رہے ہو۔ اب شریف بچوں کی طرح بائیکل چلانا۔“

چندراوتی ہر قسم کی آرزو مندی سے بے نیاز تھی۔ اسے بس ایک حرست تھی کہ وہ کسی طرح بنا رس جا کر گنگا اشنان کر لے۔ میں نے اسے کتنی بار چھیڑا، کہ مسلمان بلی تو نو سو چوہے کھا کے جج کے لیے نکلتی ہے۔ ہندو کینا کا بھی فرض ہے کہ پہلے وہ پاپ کی گھڑی کمائے، پھر کمیں جا کر گنگا جی میں نمائے۔ یوں بھی میں نے اردو اور انگریزی ادب کے تیر بدف اشاروں، کنایوں، تلمیحوں، تشبیہوں، استعاروں، اور طرح طرح کی ترکیبیوں سے اس کا ذہن کسی قدر برانگیختہ کرنے کی بے حد کوشش کی، لیکن ہر بار منہ کی کھائی اور بڑی شرمندگی اٹھائی۔ رفتہ رفتہ ایک ہی بائیکل پر بیٹھے ہوئے بھی ہم دو الگ الگ گروں میں بننے لگے۔ جوں جوں میرے دماغ میں نفیات کی بھڑوں کا چھتہ بنتا گیا، اسی رفتار سے ہمارے درمیان ایک وسیع و عریض خلا پیدا ہوتا

شروع ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور ہوتی تھی۔ دراصل میرے دل اور دماغ نے خواہشات کے جس راستے پر چلنا شروع کر دیا تھا، وہ لحظہ بہ لحظہ مجھے اس سے دور ہی دور لے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے یہ فاصلے بڑھتے گئے، میرا مزاج چڑپڑا ہوتا گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر چند راوی کے ساتھ جھکڑا مول لینا میرا معمول بن گیا۔ دن بھر اسے بائیکل پر لادے لادے سڑکوں پر گھومانا مجھے بڑی احتفانہ اور طفلانہ حرکت محسوس ہونے لگی۔ اور میں اس گناہ بے لذت کی اکتاہٹ سے دل ہی دل میں جنبھلانے لگا۔ کتنی بار میرے سر پر یہ جنون سوار ہوا، کہ میں بائیکل کو کسی تیز رفتار موڑ کے ساتھ نکرا کر چور کر دوں۔ کبھی میرا جی چاہتا تھا، کہ میں اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دوں، اور اس کا سر نہیں پر مار کر کچے ناریل کی طرح پاش پاش کر دوں۔ ایک روز وہ ایک چھاہڑی والے کے پاس تانہ گندڑیاں کٹوانے کھڑی ہوئی، تو میرے دل میں آیا کہ میں ایک موٹے گنے سے چند راوی کو مار کر ادھ موا کر دوں، اور گندڑیوں والے کی درانتی سے اس کی نکڑے نکڑے کر کے اپنے دانتوں سے کچھ کچھ چبا ڈالوں۔ اس نے آکر میرے حصے کی گندڑیاں مجھے دیں، تو میں نے جنبھلا کر انہیں نالی میں پھینک دیا۔

جب میں اپنے کمرے میں واپس آیا، تو میرا جسم یوں ٹوٹ رہا تھا، جیسے سڑک کوٹھے والا انجمن مجھے روندتا ہوا گزر گیا ہے۔ ناشکیب آرزوؤں کے کوٹھے سفا کی سے میری کمر پر برنسے لگے۔ ناسفته خواہشات کا گرم گرم دھواں اٹی ہوئی چمنی کی طرح میرے گلے میں پھنس گیا۔ کمرے کی چار دیواری سانپ کی طرح مل کھا کھا کر مجھے اپنی لپیٹ میں جکڑنے لگی۔ میرا دم گھٹ گیا۔ میرے سر میں کالے کالے بھونڈ اور زہر ناک بھڑیں ہوائی جہاز کے انجمن کی طرح جنبھلانے لگیں۔ اور میرے جسم میں اوپر سے نیچے تک تیز رفتار چھپکیوں کی فوج در فوج اچھلنے کوئے، سرسرانے لگی۔ میں گھبرا کر اٹھا، اور باہر سڑک پر آگیا۔ آدمی رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف چھایا ہوا سنایا قہقہے مار کر مجھ پر ہٹنے لگا۔ میں بھی ایک لیپ پوست سے لپٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اور دیر

تک زور زور سے جوابی قبھے لگاتا رہا۔ دو تین راہگیروں نے رک کر مجھے گھورا۔ اور پھر شرابی کا فتوی دے کر آگے بڑھ گئے۔

LAHORI کی کوئی سرک میرے ساتھ آشنائی کا اقبال جنم گرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ دکانوں پر لگے ہوئے سائیں بورڈ بالکل اجنبی زیانوں میں لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ گلی کوچوں کی بیگانگی مجھے قدم قدم پر آواہ کتے کی طرح دھنکارتی تھی۔ گھروں کے بند درتپے اپنی بلندیوں سے آخ تھوک کے میرے منہ پر تھوک دیتے تھے۔ سرکوں کے موڑ جگہ جگہ میرا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے تھے اور میں ایک لاوارث کوڑھی کی طرح کبھی ادھر بھکلتا تھا، کبھی ادھر بھکلتا تھا۔ لاہور کی کوئی سرک، کوئی گلی، کوئی کوچہ مجھے راستہ دینے پر تیار نہ تھا۔ بیگانگی اور دیوانگی کے اس ماحول میں بس ایک دروانہ ایسا دکھائی دیا جو آدمی رات کے بعد بھی آغوش مادر کی طرح وا تھا۔ بہت سے لوگ بے روک ٹوک داتا دبار میں آ جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ یوں ہی بے وضو اندر گھس گیا اور مزار کی ایک محراب سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک میں آنکھیں بند کر کے انتہائی انسماک کے "ساتھ چندر اوتوی، چندر اوتوی" کا ورد کرتا رہا۔ پھر یک ایک میرے اندر ایک ویکیوم Vacuum سا پیدا ہوا۔ اور میری محرومیوں کا آتش فشاں بھک سے پھٹ گیا۔ دبی ہوئی خواہشات کا کھوتا ہوا لاوا ابل ابل کر میرے روئیں روئیں سے پرنالوں کی طرح بننے لگا۔ اور میں بڑی دیر تک محراب کے کونے میں سر دینے دھاڑیں مار مار کر، بلک بلک کر روتا رہا۔ اس کے بعد مجھے کچھ اونگھ سی آگئی۔

ایک موٹے سے متقلی نے میری پسلیوں میں لاثھی کا ٹھوکا دے کر مجھے بیدار کیا، اور ڈانٹ کر کہا۔

"تم یہاں خراٹے لینے آئے ہو؟ بد نصیب کیسیں کے۔ اٹھو، اپنی داد فریاد کا واویلا چھاؤ۔ حضرت داتا گنج بخش سب کی سنتے ہیں۔"

میں نے اٹھ کر مسجد کے تالاب پر وضو کرنے کے بہانے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اور پھر واپس آ کر اپنی محراب میں بیٹھ گیا۔ میرے گرد و پیش کئی لوگ بڑے خضوع

و خشوع سے اپنی اپنی مرادیں مانگ رہے تھے۔ کوئی روزگار مانگ رہا تھا۔ کوئی رزق مانگ رہا تھا۔ کسی کو یکاریوں سے شفا کی طلب تھی۔ کوئی مقدمہ جیتنے کی دعا کر رہا تھا۔ میں نے بھی بڑی یکسوئی سے اپنی مراد مانگنے کی تیاری کی۔ لیکن میری زبان دافنی کی ساری مهارت و ہدایت کی دھرمی نہ گئی۔ میرے دل کی آرزو اس قدر ننگی تھی، کہ الفاظ کا کوئے جامہ اس پر پورا نہ اترتا تھا۔ میں نے بڑی محنت اور کوشش سے فصاحت اور بلاغت اور سلاست اور شرافت اور شائستگی کے پیوند لگا لگا کر بہت سے فقرے بنائے، لیکن ایک فقرہ بھی ایسا نہ تھا جو دراصل چندراوتی کی بے آبروئی نہ کرتا ہو۔ بزرگوں کے مزار پر اس قسم کے انداز گفتگو اور اس قسم کی انہمار تمنا سے مجھے حجاب سا آ گیا۔ داتا صاحب بھی کیا سوچیں گے، کہ یہ یقیناً میرے سامنے کیسی الٹی باتیں کر رہا ہے۔ تصور ہی تصور میں مجھے داتا صاحب ایک ہاتھ تبعیج اور دوسرے ہاتھ میں جوتا اٹھائے اپنی جانب لپکتے ہوئے نظر آئے، تو مجھے زور سے نہیں آ گئی۔ ہنستے ہی ہنستے میں نے اٹھ کر ایک چھلانگ لگائی، اور آس پاس بیٹھے ہوئے کوئی زائرین کو رومندا ہوا باہر بھاگ آیا۔

بس اس ایک چھلانگ میں تحلیل نفسی کا بیڑا پار ہو گیا۔ اس کتھارسیس Catharsis کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ کر بڑے آرام سے گھوڑے بیچ کر سو گیا۔ صبح ہوئی تو نہیاں دھیوا۔ نیا سوت پہنا، اور سائیکل لے کر سیدھا چندراوتی کے آشram میں پہنچ گیا۔ وہ یقیناً لڑکی اب تک ماضی کی دلدل میں منہ پھلانے بیٹھی تھی، کہ میں نے اس کی گذریاں نالی میں کیوں پھینک دی تھیں۔ میں نے بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ لیکن وہ بدستور روانی رہی۔ اس پر میں نے اپنی ترپ چال چلی۔ باسیکل ایک طرف رکھ دی۔ اور چندراوتی کے سامنے عین بیچ بازار سڑک پر ناک سے لکیریں نکالنے کی تیاری کرنے لگا۔ آشram کے دروازے پر برسر عام ایسی حرکت سے بڑی جگہ ہنسائی کا خطروہ تھا۔ اس لیے وہ فی الفور مان گئی، اور ہم دونوں باسیکل پر سوار ہو کر لارنس گارڈن

چلے گئے۔

اس روز سارا دن چند راوی کچھ کھوئی کھوئی سی رہی۔ میرا فلاطونی راز و نیاز اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔ نہ ہی میرے غیر معمولی نشاط و انبساط کی بظاہر کوئی وجہ نظر آتی تھی۔ اس نے دو تین بار ناک سکیر سکیر کر میرا سانس سوگھنے کی کوشش کی، کہ میں کوئی نشہ تو کر کے نہیں آ رہا۔ چند راوی بھی عجب معہ تھی۔ میرے ایام جالمیت کی چھوٹی موٹی نیادیوں اور بداطواریوں کو تو وہ برداشت کر لیتی تھی۔ لیکن اب جو میں شرافت اور شائستگی کا لبادہ اوڑھ کر اس کے سامنے آیا، تو وہ بربی طرح بور ہونے لگی۔ سائیکل کی سواری سے اس کا جی بھر گیا۔ شالیمار باغ، مقبرہ جہانگیر، لارنس گارڈن کی کشش ختم ہو گئی۔ بیٹھن روڑ پر وہی بھلوں اور گول گپوں کا شوق بھی پورا ہو گیا۔ کامران کی بارہ دری میں اکٹھے بیٹھ کر گھنٹوں راوی کی لریں گئے کا مشغله بھی بند ہو گیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر میرے ساتھ الجھنے لگی۔ اس پر ایک بے نام سا اکل کھرا پن چھا گیا۔ اور وہ بات پر بربھی، جنبھلاہٹ اور آزردگی کا اظہار کرنے لگی۔ ایک روز کسی دکان سے قیض کا کپڑا خرید رہی تھی۔ رنگوں کے انتخاب میں میں نے کچھ دخل ور معقولات دیا، تو وہ بگڑ کر آپ سے باہر ہو گئی، اور خریداری چھوڑ چھاڑ کر پیدل ہی آشرم کو واپس لوٹ گئی۔ اگلے روز میں اس سے ملنے گیا، تو پنجرا خالی تھا۔ اس نے آشرم چھوڑ دیا، اور اپنا سامان لے کر وہ ایکن آباد چلی گئی تھی۔

میں اس کے تعاقب میں بھاگم بھاگ ایکن آباد پنچا وہ ایک چٹائی پر بیٹھی اپنی ماں کی مشین سے کچھ کپڑے سی رہی تھی۔ میں نے اس کے سامنے اپنے گلوں اور شکوؤں کا پورا دفتر کھول دیا۔ ابھی تو گرمیوں کی چھٹیوں میں دس بارہ روز باقی تھے۔ وہ اتنے روز پسلے ہی کالج سے کیوں چلی آئی؟ لاہور کو چپ چاپ چوروں کی طرح کیوں چھوڑ دیا؟ مجھے کیوں نہ خبر کی؟

چند راوی اپنی نظریں سلائی پر گاڑے خاموشی سے مشین چلاتی رہی۔ میرے سوالوں کا اس

نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن کپڑے سیتے سیتے، سر اور انھائے بغیر، اس نے آہستہ آہستہ دھنسے دھنسے لبجے میں مجھے آگاہ کیا، کہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ساری گرمیوں کی چھٹیاں کپڑے سی کر کچھ پیسے جمع کرے گی اور سبھر کے مینے میں اپنی ماٹا کو ساتھ لے کر گنگا اشنان کے لیے بنا رس چلی جائے گی۔

”پروگرام تو بڑا اچھا ہے۔“ میں نے طفراً کہا۔ ”لیکن کالج میں تمہاری جگہ پڑھائی کون کرے گا؟“

چند راوتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور سر جھکائے زور زور سے مشین چلاتی رہی۔ کوئی آدھ گھنٹہ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں انھ کر کھڑا ہوا، اور بولا۔ ”اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ پھر کسی روز آؤں گا۔“

”تال جی نا۔“ چند راوتی نے جلدی سے کہا۔ ”اب چھٹیاں چھٹیاں بالکل نہ آتا۔ میرے کلام میں ہرج ہوتا ہے۔“

”چھٹیوں کے بعد حاضر ہونے کی اجازت ہے یا وہ بھی نہیں؟“ میں نے کسی قدر تلقنی سے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ اس نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلا کر کہا۔ وہ سر جھکائے کھٹ کھٹ مشین چلاتی رہی۔ میں کچھ دیر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اور پھر باکیکل سنبھال کر چلا آیا۔

لاہور آ کر میں نے ٹیوشنوں کے اشتہار ڈھونڈنے شروع کئے اور گرمیوں کی چھٹیوں میں دو مینے کے لیے کیمبلپور میں ایک رائے بہادر کے ہاں ٹیوشن کر لی۔ ایک لڑکا بی اے کی تیاری کر رہا تھا۔ دوسرا سینئنڈ ائیر میں تھا۔ دو لڑکیوں نے میزریکولیشن کا امتحان دینا تھا۔ چاروں کو دو ماہ پڑھانے کا دو سو روپیہ مشاہرہ طے ہوا۔ رائے بہادر نے رہنے کے لیے مجھے اپنے پُوار خانے میں جگہ دے دی، اور دو وقت کا کھانا اپنے ایک مسلمان کارندے کے ہاں مقرر کر دیا۔

رائے بہادر کی منت سماجت کر کے میں نے ایک سو روپیہ پیشگی وصول کر لیا، اور اسے

ایک بڑے خوشامدانہ خط کے ساتھ چندر اوتو کی خدمت میں بھیج دیا۔ میں نے بڑی منت  
سماجت، ڈانٹ ڈپٹ سے اس کو لکھا، کہ وہ سلامی میشن پر اپنا وقت ضائع نہ کرے،  
بلکہ اپنے امتحان کی تیاری کرے۔ بنا رس یا ترا کے لیے دو سو روپیہ فرائیم کرنا میری ذمہ  
داری ہے۔

چند روز کے بعد منی آرڈر جوں کا توں واپس آگیا۔

اگلے ماہ میں نے پورے دو سو روپے کا منی آرڈر بھیجا۔ وہ بھی اسی طرح واپس آگیا۔  
چھٹیوں کے بعد میں خود ایکن آباد گیا۔ وہ چاپاٹی پر بیمار پڑی تھی۔ اس کی ماں پاس بیٹھی  
پنکھا کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر چندر اوتو اٹھ کر بینھ گئی۔ میں نے شکایت کی کہ اس  
نے میرے بھیجے ہوئے پیسے واپس کیوں کر دیئے تھے؟

”منی آرڈر کیوں کیا تھا؟“ چندر اوتو نے نک کر کہا۔ خود کیوں نہیں لائے؟“

”خود کیسے لاتا؟“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ چھٹیوں میں یہاں نہ  
آؤں، تمہارے کام میں ہرج ہوتا ہے۔“  
”ہائے رام۔“ چندر اوتو نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”تم میری ہر بات کو سچ کیوں مان  
بیٹھتے ہو؟“

چندر اوتو کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں بے اختیار اس غرق شدہ لاش کی طرح ہاتھ  
پاؤں مارنے لگا جس کی آنکھ یا کیکھ کھل جائے، اور اس پر یہ اکشاف ہو کہ جہاں  
وہ ڈوبی پڑی ہے وہاں پانی نہیں محض سراب ہے! میں نے ایک ایک کر کے اپنی انگلیوں  
پر ان موقع کا شمار شروع کر دیا جب مجھے چندر اوتو کی بات کو سچ نہیں سمجھنا چاہیے  
تھا، لیکن حماقت سے خواہ مخواہ سچ مان بیٹھا تھا۔

چندر اوتو نے ٹکھے کی ڈنڈی میرے سر پر مار کر مجھے چپ کر دیا، اور کہا۔ ”بس بس۔  
اب زیادہ ہندی کی چندی نہ نکالو۔ بالکل دودھ پیتے بچے ہی بن گئے۔“

”کیوں نہ بتا؟“ میں نے بھی کھیانی بلی کی طرح کھمبنا نوچنا شروع کیا۔ ”تم میرے  
ہاتھ کا چھوا ہوا پانی کا گلاس تک تو پیتی نہیں ہو۔“

اے بھی پانی کا گلاس تو پانی کا گلاس ہوتا ہے۔” چندر اوتو نے عجیب طور پر ہنس کر کہا۔ ”بندہ پرندہ تو پانی کا گلاس نہیں ہوا کرتا تا۔“

بستر پر بیٹھے بیٹھے اس نے مجھے اپنی بیماری کی رام کمانی ایسے انداز سے سنائی جیسے کوئی شوخ بچہ سکول میں اپنی شراتوں کے کارناٹے سناتا ہے۔ ایک دن یونہی بیٹھے بٹھائے اسے ہلکی ہلکی حرارت شروع ہو گئی۔ پھر کھانی کے ساتھ تیز بخار ہو گیا۔ ایکن آباد کے دید نے تپ محرقة تشخیص کیا، اور ٹھنڈے شربتوں سے علاج کرتا رہا۔ کھانی بڑھتی گئی، اور اکیس دن گزرنے کے بعد بھی جب بخار نہ ٹوٹا، تو وہ گھبرا کر گوجرانوالہ ہسپتال میں سول سرجن کے پاس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے ایکسرے لیا، خون ٹیسٹ کیا، تحوک کا معافہ کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ چندر اوتو کو تیرے درجہ کی Galloping T-B ہے۔

ٹی بی کی خبر سن کر جگدیش چندر آڑھتی نے چندر اوتو کی ماں کو اپنی گھر لیو ملازمت سے نکال دیا۔ محلے والوں نے بھی ان کے ہاں آنا جانا بند کر دیا۔ اور اب وہ ماں بیٹی اپنی سلامی مشین پیچ کر کھانے پینے اور دوا دارو کا کام چلا رہی تھیں۔

میں ہر دوسرے تیرے دن صبح سوریے اپنی بائیکسل پر ایکن آباد چلا جاتا تھا۔ سارا دن ماں بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتا اور گپیں ہائکتا۔ اور شام کو بائیکسل پر لاہور آ جاتا۔ لیکن رفتہ رفتہ چندر اوتو کی کھانی کے دورے بہت بڑھ گئے۔ کھانی کی دھونکنی گھنٹہ گھنٹہ بھر بڑے بے رحمی سے چلتی۔ اور وہ بے سدھ ہو کر بستر پر گر جاتی۔ یہ دیکھ کر میں ایکن آباد اٹھ آیا۔ دن بھر چندر اوتو کے پاس رہتا۔ رات کو ایک مقامی مسجد کے صحن میں پڑ کر سو رہتا۔

ایک روز چندر اوتو کھانس رہی تھی، تو اس کے گلے میں کوئی پھانس سی اٹک گئی۔ اس نے زور سے کھنکار کر گلا صاف کیا، تو ہولی کی پچکاری کی طرح اس کے منہ سے چلو بھر خون نکل آیا۔ ساتھ ہی اسے شدت کے اسال لگ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ سنار کی کھنکی میں گلتے ہوئے سونے کی طرح پکھل گیا۔ اور بستر پر لیٹے لیٹے اس

کا تن بدن اس طرح گھلنے لگا جیسے پانی کے گلاس میں پڑی ہوئی مصری کی ڈلی اپنے آپ رینہ رینہ ہو کر تخلیل ہونے لگتی ہے۔ اب نہ وہ اٹھ سکتی تھی، نہ بیٹھ سکتی تھی، نہ چل سکتی تھی۔ میں غلہ منڈی سے پٹ سن کی تین چار خالی بویاں خرید لایا۔ چندراوتی کی ماں نے انہیں کاٹ کر آٹھ دس گدیاں سی بنائیں۔ وہ یہ گدیاں چندراوتی کے نیچے بستر پر بچھا دیتی تھی۔ جب کچھ گدیاں میلی ہو جاتی تھیں تو میں انہیں پیٹ کر لے جاتا تھا اور گرینڈ ٹرینک روڈ کے قریب ایک کنوئیں پر دھو کر سکھا لاتا تھا۔ چندراوتی کا یہ حال دیکھ کر میں گوجرانوالہ کے سول سرجن کے پاس گیا۔ سارا احوال ہمدردی سے سن کر اس نے میرے ساتھ ایمن آباد چلنے سے انکار کر دیا، لیکن سولہ روپے فیس لے کر ایک نئے مسکپچر کا نسخہ ضرور لکھ دیا۔ میں مسکپچر بنوا کر ایمن آباد پہنچا، تو چندراوتی سرگباش ہو چکی تھی۔

شام تک ارتھی تیار ہو گئی، شمشان بھومی میں ڈھانی من سوکھی لکڑی کی چتا بنائی گئی۔ چندراوتی کو اس میں لٹا کر بہت سا گھنی چھڑکا، اور صندل کے ایک چھوٹے سے لکڑے سے اسے آگ دکھا دی گئی۔ شعلے بھڑک بھڑک کر اڑدھوں کی طرح ہوا میں زیانیں نکالنے لگے۔ دو تین برهی نزور سے منتر الائپنے لگے۔ ایک سادھو نے سکھے بجا یا۔ چنگا یاں چھ چھ کر دور تک آنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی بھی جل کر راکھ ہو گئی جس نے کبھی میرے ہاتھ کا چھوا ہوا پانی تک نہ پیا تھا۔

چندراوتی کی ماٹا نے ایک مدھم سی لاثین کی روشنی میں اپنی بیٹی کے ”پھول“ چنتے اور راکھ سمیٹ کر ایک پوٹلی میں باندھ لی۔ لاہور آ کر میں نے اپنا بائیکل بیج دیا۔ اور چندراوتی کی ماں وک بیٹی کے ”پھول“ گنگا میں بہانے کے لیے بنا رس جانے والی گاڑی میں سوار کر دیا۔

لاہور ریلوے شیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۲ سے جب بنا رس والی ٹرین روانہ ہو گئی، تو اس کی پچھلی سرخ بتی دیر تک اندر میرے میں خون آلود جگنو کی طرح ٹھٹھاتی رہی۔ پلیٹ

فارم پر تو بڑی چھل پل تھی۔ لیکن میں شیشن سے نکل کر باہر آیا، تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ لاہور کے سارے یہ پوسٹ جادو کے زور سے غائب ہو گئے تھے۔ عاد اور شمود کی بستیوں کی طرح اس شرخموشان کی عمارتیں بھی اپنی چھتوں پر اوندھی پڑی تھیں۔ ہر جانب کھنڈر ہی کھنڈر تھے۔ اس ویرانی میں مفلوج ہاتھ کی بے حس لکیروں کی طرح صرف ان مردہ شاہراہوں کا جال پھیلا ہوا تھا، جن میں چند راویٰ کے ساتھ بائیکل چلا�ا کرتا تھا۔ کتنی روز تک میں دن رات ان شاہراہوں پر پا پیا ہو گھومتا رہا۔ چلتے چلتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ جب مزید چلنے کی سکت باقی نہ رہی، تو مجبوراً میں گورنمنٹ کالج کے لان میں واپس آگیا اور اپنا پہلا افسانہ لکھنے بیٹھ گیا۔ افسانے کا عنوان ”چند راویٰ“ تھا۔ اور اس کا پہلا فقرہ یہ تھا:

”جب مجھے چند راویٰ سے محبت شروع ہوئی۔ اسے مرے ہوئے تمیرا روز تھا.....“ افسانہ لکھتے لکھتے میں کئی بار رویا، کئی بار ہنسا۔ مکمل کرنے کے بعد میں نے یہ کہانی اختر شیرانی کی خدمت میں بھیج دی۔ انہوں نے اسے پسند فرمایا، اور مجھے بڑا پیارا خط لکھا۔ افسانہ انہوں نے ”رومی“ میں شائع کر دیا۔

جب میں یہ افسانہ لکھ رہا تھا تو پروفیسر ڈکن کلاس لے کر حسب معمول لان سے گزرے۔ مجھے دیکھ کر رک گئے، اور بولے:

”Hello, she has reverted to the gold mine.“  
میری آواز مچھلی کے کانٹے کی طرح گلے میں پھنس گئی، اور میں نے سکیاں لے کر کہا:

”Sir, She has reverted to the gold mine.“

## • آئیں سے ایسے میں داخلہ

ایک روز میں جموں عجائب گھر کی لاہوری میں بیٹھا روزنامہ ٹریبون پڑھ رہا تھا، کہ اچانک میری نظر ایک خبر پڑی، جس میں آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلے کے امتحان کا نتیجہ درج تھا۔ گیاہ آدی پنے گئے تھے۔ ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ اپنا نام کامیاب امیدواروں کی فہرست میں پا کر خوشی تو ضرور ہوئی، لیکن حیرت کا پلہ نیاہ بھاری رہا۔

UPD�4U.COM

چند ماہ قبل جب میں مقابلے کا امتحان دینے والی گیا تھا، تو پسلے روز ملکاف ہاؤس پہنچتے ہی میرا دل بیٹھ گیا تھا۔ بر صغیر کے سارے صوبوں سے کوئی سائز ہے سات سو لڑکے امتحان دینے آئے ہوئے تھے۔ ہر کسی کے سر پر کوئی نہ کوئی کلغی لرا رہی تھی۔ کچھ یونیورسٹیوں کے ریکاڑ ہولڈر تھے۔ کچھ مشہور و معروف مقرر یا کھلاڑی تھے۔ کوئی آسفورڈ اور کیمبرج کے لجھے میں فرف، فرف انگریزی بول رہا تھا، کوئی شین، قاف سے درست اردو کے موتی سکھیر رہا تھا۔ کسی کا ڈیل ڈول بارعہ تھا۔ کسی کے لباس کی آرائش دیدہ نیب تھی۔

کچھ آپس میں نہیں مذاق کر رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ بحث مباحثوں میں مصروف تھے۔ ملکاف ہاؤس کے لان میں شائستہ، ذہین، فتین، خوش پوش، خوش گفتار، خوش رفتار نوجوانوں کے اس ہجوم میں میری کسی ایک سے بھی شناسائی نہ تھی۔ میں کسی سے یہ تک نہ پوچھ سکتا تھا، کہ ملکاف ہاؤس کے بے شمار دروازوں میں سے امتحان کے ہال کا گیٹ کس طرف ہے؟ ہال میں جا کر اپنے روپ نمبر کی سیٹ کس طرح تلاش کی جائے گی؟

اس ناموس ماحول میں معاً ایک شدید تذبذب اور ایک عجیب سی جھینپ کی سوئیاں میرے تن بدن میں تیز تیز چینے لگیں۔ میرے ذہن میں ایک بے نام سی ماہی کے چیونے رینگنے لگے۔ میرے پاؤں میں بیٹھا رفتار سبک رفتار پھر کیاں گھونٹے لگیں، اور بے اختیار جی چاہا کہ میں لپک کر ریل گاڑی میں سوار ہو جاؤں اور ملکاف ہاؤس سے جان چھڑا کر

گھر واپس لوٹ جاؤں۔ یہ خیال آتے ہی میرے تصور میں ماں جی کا چہرہ ابھرا۔ وہ خوشی مجھے ہاتھ لیں گی، اور بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہیں گی۔

URDU4U.COM  
”بچہ، اچھا ہی ہوا تم واپس آ گئے۔ بڑی بڑی نوکریاں تو جان کا جنجال ہوتی ہیں۔ دن میں ایک آدھ بار چلنی روئی مل جائے تو یہ نعیمت ہے۔ بس اللہ ایمان سلامت رکھے۔“

لیکن دوسرے ہی لمحے والد صاحب کا خیال آیا۔ غالباً ان کے چہرے پر کسی غم اور غصے کا رد عمل ظاہر نہ ہو گا۔ لیکن ان کے دل و دماغ کے نہاد خانے میں ضرور مایوسیوں کے انبار لگ جائیں گے، دادی اماں نے انہیں خود آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دینے کے لیے سات سمندر پار جانے سے روک دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ احساس محرومی کا یہ روگ والد صاحب کی زندگی میں اندر ہی اندر خون کے کینسر کی طرح پھیلتا رہا۔ اور وہ باشہ برس کی عمر تک ”اگر پر نتوا انڈپر تمام کند“ کے خواب کی تعبیر کے منتظر بیٹھ رہے۔ ادھر میں آئی۔ سی۔ ایس میں داخل ہوا۔ ادھر چند مہینوں کے اندر اندر انہوں نے بیٹھے بھائے چشم زدن میں بار زیست یوں اتار پھینکا جیسے ان کی زندگی کا مشن پایہ تیکیل تک پہنچ گیا ہو۔

والد صاحب اور میرے درمیان محبت کے علاوہ مروت کا بھی گمرا رشتہ تھا۔ اس احساس مروت نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی، اور میں چپ چاپ مٹکاف ہاؤس میں امتحان کا پرچہ دینے بیٹھ گیا۔

مٹکاف ہاؤس کا یہ ہال میرے لیے ایک اچھی وادی تھا، اور آئی۔ سی۔ ایس کے امیدوار صحبت ناجنس۔ سول سروس میں اٹھائیں انہیں سال گزارنے کے باوجود سول سروس والوں کے ساتھ یہ احساس اجنبیت اور ناخبیت ہمیشہ میرے ساتھ ہی ساتھ رہا۔ سول سروس کے تالاب میں نہ میں مچھلی بن سکا نہ مگر مجھ۔ زیادہ سے زیادہ میری حیثیت ایک کافندی ناؤ کی سی رہی، جسے کوئی شوخ بچہ سطح آب پر چھوڑ کر خود گھر جا بیٹھا ہو۔ شکوہ شکایت یوں بھی میری عادت نہیں، لیکن سول سروس کے متعلق میں کارکنان قضا و قدر سے

یہ گلہ زبان پر بھی نہیں لا سکتا، کہ:

درمیان قصر دیا تختہ بندم کردہ ای  
بازی گوئی کہ دامن ترکمن ہشیار باش

کیونکہ جب میں سول سروس میں داخل ہوا تو بے دامان، اور جب استعفی دے کر نکلا  
تو چاک گریبان!

یوں بھی میری سروس کا سارا عرصہ بند دیکھی میں کھولتے ہوئے پانی کی، مانند گزرا ہے،  
جس میں بلیے بنتے ہیں، ٹوٹتے ہیں، بھاپ اٹھتی ہے، اور چپ و تاب کھا کر پھر منتشر  
قطروں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دراصل اس طرز ملازمت کی بنیاد اسی روز پر گئی تھی  
جب میں آئی۔ سی۔ ایس کے انڑویو کے لیے پیش ہوا تھا۔

انڈویو کے تین ممبر تھے۔ سر گورڈن ایرے، سر عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر سر رادھا کرشن۔  
موخرالذکر وہی ذات شریف تھے جنہوں نے بعد میں ”سر“ کاٹ کر کانگریس کی بحیث  
چڑھا دیا، اور پہلے بھات کے نائب صدر اور پھر صدر بنے۔ شری رادھا کرشن بڑے بلند  
پایہ عالم اور بین الاقوامی شرست کے فلسفی تھے۔ لیکن انڈویو کے دوران میری غلطی سے  
ان کے اندر کا برہمن بر ملا باہر نکل کے بیٹھ گیا، اور اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔  
بات یوں چلی کہ آئی۔ سی۔ ایس کے فارم میں ایک کالم تھا جس میں امیدوار کو اپنی  
لپچیوں اور مشاغل Hobbies کا ذکر کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنی ایک ہالی یہ بھی درج  
کی تھی کہ مجھے مذاہب عالم کے تقابلی Comparative مطالعہ کا شوق ہے۔  
ڈاکٹر رادھا کرشن نے چھوٹتے ہی مجھ سے سوال کیا کہ تم نے مذاہب عالم کا مطالعہ  
اسلامی آنکھ سے کیا ہے یا انسانی آنکھ سے؟

اس سوال کا سیدھا سادا جواب دینے کی بجائے میں نے جوش تبلیغ میں ایک چھوٹی سی تقریر  
جھاڑ دی کہ جو لوگ اسلامی آنکھ اور انسانی آنکھ میں کوئی فرق روا رکھتے ہیں، وہ دراصل

بڑی شدید گراہی میں بیٹلا ہیں!

ڈاکٹر رادھا کرشن کے چہرے کا رو عمل صاف بتا رہا تھا، کہ انہوں نے مجھے متعصب مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال کر آئی، سی۔ ایس کے لیے ناموزوں قرار دے دیا ہے۔ اس لیے اس ایک سوال کے بعد وہ مجھ سے لاتعلق ہو کر خاموش بیٹھ گئے۔ سر گورڈن ایرے نے اصرار کیا، کہ وہ مجھ سے کچھ اور بھی پوچھیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑی بے دلی سے رضا مند ہوئے، اور پھر ایسے بے شکے اور مضمون کی بوچھاڑ کر دی جن کا واحد مقصد یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ مجھے سنجیدگی سے آئی۔ سی۔ ایس کا امیدوار تسلیم نہیں کرتے۔ مثلاً ٹینس کے گیند کا کیا وزن ہوتا ہے؟ چار اونس وزن پورا کرنے کے لیے پنگ پانگ کے کتنے بال درکار ہوں گے؟ ہاکی کے گول کی چوڑائی اور اونچائی کتنی ہوتی ہے؟ کچھ سوال جانور جنوروں کے متعلق تھے۔ ایک عجیب سوال یہ تھا، کہ اٹلی کو یورپ کا بوٹ کہا جاتا ہے۔ اس کے آس پاس کے جزاں میں سے کس کس جزیرے کو کہاں کہاں چھپاں کیا جائے کہ یہ مردانہ بوٹ نہ رہے بلکہ اونچی ایڑی کا زنانہ شو نظر آئے؟ انٹرویو کا یہ رنگ دیکھ کر بورڈ کے چنیروں میں سر گورڈن ایرے نے مداخلت کی، اور دس پندرہ منٹ میرے ساتھ بڑے ڈھنگ کی معقول باتیں کیں۔

تیرے مجرم سر عبدالرحمٰن خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے بشرے سے ہمدردی، شرافت اور شفقت تو ضرور نہیں تھی، لیکن وہ بیچارے بے بس، مجبور اور مغذور سے نظر آتے تھے۔ آزادی سے پہلے یہ دستور تھا، کہ اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ جائز ہمدردی کا اظہار کرتا بھی کپڑا جائے تو انگریزوں اور ہندوؤں کی نظر میں وہ متعصب، فرقہ پرست اور غیر منصف قرار پاتا تھا۔

سر عبدالرحمٰن نے مجھ سے صرف ایک سوال پوچھا۔ وہ یہ کہ اگر تم آئی، سی۔ ایس میں نہ لیے گئے، تو زندگی میں اور کیا کام کرنا پسند کرو گے؟ میں نے قدرے تلخی سے جواب دیا۔ ”سر، آپ کا سوال بر محل ہے۔ آج کے تجربہ

کے بعد مجھے واقعی اس مسئلہ پر سمجھی گی سے غور کرنا ہو گا۔“  
اس تماں پر میرا انٹرویو ختم ہو گیا۔

روزنامہ ٹیبیون میں اپنا ریپورٹ دیکھنے کے بعد دنیا کے باقی تمام خبروں کے ساتھ میری دلچسپی ختم ہو گئی۔ میں نے جلدی جلدی اخبار بند کیا، اور اسے لالہ رام سروپ کے حوالے کر دیا جو کچھ دیر سے میرے سامنے بیٹھے مجھے گھور رہے تھے، کہ میں کب اخبار ختم کر کے انہیں دوں اور وہ شاک ایکچینج کے صفحہ کا مطالعہ شروع کریں۔

باہر عجائب گھر کے وسیع و عریض کپاؤنڈ میں بیاست جموں و کشمیر کے سرکردہ ڈوگروں کی دو تین ٹولیاں حب معمول اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھیں۔ اس کپاؤنڈ میں سنگ مرمر کی دو بڑی تخت نما چوکیاں ایستادہ تھیں۔ سلطنت برطانیہ کے پنس آف ولز کسی وقت اپنی سیر و سیاحت کے دوران جموں شر کو بھی نواز گئے تھے۔ عجائب گھر ان کے مہمان خانہ کے طور پر تغیر کیا گیا تھا۔ اور سنگ مرمر کی چوکیاں شاہی دبار منعقد کرنے کے لیے بچھائی گئی تھیں۔ چھوٹی چوکی پر مہاراجہ، بڑے تخت پر پنس آف ولز۔ اب سر شام بیاست کے سابق دیوان اور وزیر، ریٹائرڈ حکام، اور عمر رسیدہ ڈوگرہ رئیس ان چوکیوں پر بیٹھ کر شر کے نظاہ کی سیر دیکھتے تھے، زور زور سے ڈکاریں لیتے تھے، یونہی بلاوجی کھی کھی کر کے بلند و بالا قبیقے لگاتے تھے، سرگوشیوں میں راج محل کے جنی سکینڈل ساتے تھے، شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کے گن گاتے تھے اور چودھری غلام عباس کی مسلم کانفرنس پر زہر ناک تبصرے کیا کرتے تھے۔ مجھے ان بوالوس، متعقب اور مفتون بڑھوں کی باتیں سننے کا چکا پڑا ہوا تھا۔ میں اکثر لاہوری سے نکل کر کچھ دیر ان کی چندال چوکریوں کے آس پاس منڈلایا کرتا تھا۔

آج جو میں نے ان لوگوں کی طرف کان لگایا، تو نا کہ اس محفل میں میرا ہی ذکر خیر ہو رہا ہے۔

جزل ٹھاکر سنگھ فرم� رہے تھے، کہ مسلمان ہے تو کیا ہوا، نام تو جموں کشمیر ہی کا چکے

گا۔ اس سال ہندوستان کی کسی دوسری بیاست سے اور کوئی امیدوار آئی سی ایس میں کامیاب نہیں ہوا۔

دیوان بدربی ناتھ اس نظریے سے متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا، کہ سانپ کا بچہ بہر حال سانپ ہی ہوتا ہے۔

وزیر فیروز چند نے خدشہ ظاہر کیا، کہ جب یہی سانپ کا بچہ حکومت انگلشیہ کی طرف سے کسی وقت بیاست میں ڈیپوٹیشن پر آ کر ہماری گردن پر سوار ہو گا، تو پھر کیسی رہے گی؟

”واہ جی واہ۔“ مہتمہ رام تن نے تردید کی۔ ”یہ حرای ڈیپوٹیشن پر بھلا کیوں آئے گا؟ ہم تو بس اپنے تلوکی جی کو بلا کیں گے۔“

تلوکی ناتھ کول پرنس آف ولیز کالج جموں میں میرا ایک پیشوں تھا۔ چند برس قبل ہے بیاست کا پہلا نمائندہ تھا، جو آئی۔ سی۔ ایس میں کامیاب ہوا تھا۔ کشمیری پنڈت کے ناطے سے لی۔ این کول جواہر لال نسرو کی ناک کا بال بن کے رہا۔ بہت سی کلیدی اسمیں پر فائز ہوا۔ ایران، لندن اور ماسکو میں سفارت کی اور بھارت کی وزارت خارجہ کے سیکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔

عجائب گھر میں کھولت، جہالت اور تعصب سے ڈسے ہوئے ڈوگروں کے تبصرے سے شاد کام ہو کر میں نے گھر کی راہ لی۔ راستے میں حسب معمول میں نے رگھوناتھ بازار میں حکیم گوراندہ مل، کنک منڈی میں پر بھ دیاں فروٹ مرچنٹ، عمدہ شیر فروش،..... کلبی، غنی پساری اور تاج ہوٹل کے مالک چراغانائی کے ساتھ صاحب سلامت کی۔ لیکن کسی وجہ سے میں انہیں اپنی کامیابی کی خوشخبری سنانے کی جرأت نہ کر سکا۔ یہ غریب طبیعت اور خوش خصال لوگ میرے ساتھ بڑی مروت کا بر تاؤ کرتے تھے۔ ان کی نظر میں پولیس کا سپاہی اور میونسپلی کا داروغہ بھی بہت بڑے افسر تھے۔ اب اگر میں نے انہیں یہ بتایا کہ ڈپٹی کمشنر، کمشنر اور جانے کیا کیا ہونے والا ہوں، تو شاید ان کے

ساتھ میرا رشتہ اچانک ٹوٹ جائے گا۔ اس خدشے کی ہچکپاہٹ نے میرا منہ بند کر دیا، اور یہ خبر میرے سینے میں ناکردار گناہوں کی پوٹلی کی طرح چھپی رہی۔ لیکن جونہی میں اردو بازار میں داخل ہوا، میرے دل اور دماغ نے ایک زردست قلبازی کھائی، اور یہ پوٹلی کھٹاک سے باہر نکل کر ریڑ کی بے شمار رنگیں گیندوں کی طرح میرے گرد اچھلنے کو نہیں گئی۔ اردو بازار میں سر شام سڑک کے دو رویہ بہت سی طوائفیں بن ٹھن کر اپنے درپیچوں اور دروازوں میں بھلی کے تیز تیز بلب جلا کر ان کے عین نیچے بیٹھا کرتی تھیں۔ جی تو بہت چاہا کہ آج میں ان سب کے کافنوں میں اپنی خوشخبری کی نے بجاتا جاؤں، لیکن ہمت کا سرگم جواب دے گیا۔

غیبت ہے کہ میرے گھر پہنچنے سے پہلے روزنامہ "انقلاب" نے یہ خبر وہاں تک پہنچا دی تھی۔ ورنہ میں اندر ہی اندر ڈانوادول تھا، کہ یہ خبر گھر والوں کو کس انداز سے سنانی چاہیے۔

ماں جی نے فقط اتنا کہا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ پچھہ، اب تم نوکری پر جموں سے بھلا کتنی دور جاؤ گے؟"

البته والد صاحب اپنے خاموش انداز میں بڑے خوش نظر آتے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر سرست کا ہلکا ہلکا ارتعاش تھا۔ چہرے پر اطمینان کی خنک چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے مجھے دو نصیحتیں کیں۔ وہ بھی انگریزی میں۔ ایک یہ کہ اپنے کیریکٹر کی حفاظت کرنا۔ دوسری یہ کہ کسی شخص کی پیٹھے پیچھے وہی بات کرنا جو اس کے منہ پر بھی دھرا سکو۔

اس وقت مجھے یہ دو باتیں بے حد سطحی، فروعی اور بچگانہ سی نظر آئیں۔ لیکن جب کبھی ان پر عمل کا وقت آیا ہے، تو یہ یہی سادہ ہدایات ہمالیہ کی سنگلاخ چٹانوں سے بھی نیا دشوار گزار بن جاتی رہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ان سیدھی سادی باتوں کو پوری طرح کبھی نہیں بھا سکا۔ لیکن جب کبھی ان پر جھوٹا سچا، تھوڑا بہت عمل کرنے کی

تو فیق نصیب ہوئی ہے، زندگی بڑی آسان اور آسودہ کثی ہے۔

رات کو سویا، تو نیند کے جوار بھائے نے دل کی گمراہیوں میں ڈوبی ہوئی کئی خواہشات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر میرے شعور کے ساحل پر ڈال دیا۔ میری ایک دلی سی آرزو تھی کہ میں فلمی کمانیاں، مکالمے اور گیت لکھنے کا دھندا کروں۔ اس میں فن سے لگاؤ کا عضر کم اور ایکٹروں، ایکٹرஸن کے قرب کی امنگ نیاہ تھی۔ دوسری خواہش بڑی عجیب تھی۔ بچپن سے میں نے جگہموہن سنگھ ڈاکو کے بیشار قھے سن رکھتے تھے۔ وہ امیروں کو لوٹ کر ان کی دولت غریبوں میں بانٹ دیتا تھا۔ معصوم اور جوان لڑکیوں کو ہوس کے شکاریوں سے بچاتا تھا۔ خود ہر قسم کی رنگ رلیاں مناتا تھا۔ اور چار پانچ بہترین گانے اور ناچنے والی خوبصورت عورتوں کو اغوا کر کے ہمیشہ اپنے جلو میں رکھتا تھا۔ اس طرز حیات میں میرے لیے اتنی شدید کشش اندر ہی اندر کنٹلی مارے بیٹھی تھی، کہ صبح سویرے جب میں بیدا ہوا تو واقعی یہ سوچ رہا تھا کہ آئی۔ سی۔ ایس میں داخل ہو کر کہیں میں اپنے اصلی نصب العین سے بھلک تو نہیں گیا؟

دن بھر اس قسم کے مبسم شکوک و شبہات کفران نعمت کی حد تک میرے دل میں سر اٹھاتے رہے۔ شام کے وقت دو بڑے آدمی والد صاحب کو مبارک باد دینے آئے۔ ایک شیخ محمد عبداللہ تھے۔ شیخ صاحب پڑھے ہوئے تو علیگڑھ کے تھے، لیکن ان کا دل جواہر لال نہرو کے الہ آباد میں جا انکا تھا۔ انہوں نے مبارک باد تو کوئی خاص نہ دی، لیکن اتنا ضرور کہا کہ پڑھے لکھنے نوجوانوں کو اگریزوں کو غلامی میں جھوٹکنے کی بجائے نیشنل کافرنس کی تحریک کے حوالے کر دینا چاہیے۔

چودھری غلام عباس علیگڑھ میں پڑھے تو نہ تھے، لیکن ان کے دل میں ضرور علیگڑھ آباد تھا۔ انہوں نے کہا، ”یہ لڑکا جہاں بھی ہو گا، ہمارا ہی ہو گا۔ آپ کو مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے۔“

ان دو رہنماؤں کے اس متفاہ رو عمل نے مجھے اور بھی الجھن میں ڈال دیا۔ شام ہوئی تو

میں عجائب گھر کی لاہبری جانے کی بجائے اور اپنے ذہن میں متصادم خیالات کا تانا بانا لیے "پنج پیر" چلا گیا۔

"پنج پیر" کے ساتھ میری بڑی پرانی راہ و رسم تھی۔ ہمارا پہلا تعارف بھی عجیب حالات میں ہوا تھا۔ جب میں اکبر اسلامیہ ہائی سکول جموں کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا، تو کبھی کبھی اپنے ایک دوست متاز حیسن کے ساتھ دیایے توی کے کنارے ہندوؤں کے شمشمان بھوی میں ارتھیوں کے جلنے کا تماشا دیکھنے جایا کرتا تھا۔ ایک روز کسی جلتی ہوئی لاش کا سر ایسے دھاکے سے پھٹا، کہ اس کے مغز کا ایک لوٹھڑا چٹاخ سے متاز کے گال پر لگ کے چپک گیا۔ وہ چختا چلاتا سرپت بھاگا، اور دیایے توی کے پاسنی میں سر ڈبو کر بیٹھ گیا۔ اس بھگلڈڑ میں اس کے پاؤں کا جوتا نکل گیا، اور پھسل کر گھرے پانی میں جا ڈوبا۔ اب متاز زار زار رونے لگا، کہ وہ ایک پاؤں سے ننگا گھر کیے جائے گا۔ اس کا باپ پولیس کا ہیڈ کانٹریل تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی بات پر بڑی بڑی سزا دینا اس کا روز کا معمول تھا۔ متاز کی آہ و ناری دیکھ کر ایک گجری کو ترس آگیا۔ وہ شر میں دودھ پیچ کر توی کے پار اپنے گھاؤں واپس جا رہی تھی۔ متاز کی پٹا سن کر وہ بولی، کہ یہاں بیٹھ کر رونے دھونے سے کیا ملے گا؟ تم سیدھے "پنج پیر" چلے جاؤ۔ پیر بادشاہ ضرور مدد کرے گا۔

ہم دونوں تھکے ہارے، افقل و خیزان شام گئے جموں کے ایک مضاف رام نگر پہنچے۔ وہاں پوچھ پاچھ کر پنج پیر کو تلاش کیا۔ یہ سرینگر جانے والی بانہال روڈ سے کچھ دور دامن کوہ میں درختوں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا ایک ویرانہ سا تھا۔ یہاں چند قبریں تھیں۔ جن میں ایک قدرے بڑی اور نمایاں تھی۔ اس کے سرہانے طاقچہ سا بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک بجھا ہوا مٹی کا دیا غالی پڑا تھا۔ کڑوے تیل کے دھوئیں سے یہ چراغ دان کالا سیاہ ہو چکا تھا۔ مزار پر مٹھی بھر بھنے ہوئے پنے، کچھ بتا شے اور کچھ پیسے بکھرے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ کچھ دور اپر بانہال روڈ تھی۔ اس پر بیس بھی چل

رہی تھیں، ٹرک بھی گزر رہے تھے، موڑیں بھی آ جا رہی تھیں۔ لیکن ان سب کی آواز پنج پیر کے دیرانے سے کہیں باہر ہی باہر رک جاتی تھی۔ نیچے توی کا دیبا چٹانوں سے سر پچھتا شاں شاں کرتا گزرتا تھا۔ لیکن اس کا شور بھی کہیں باہر ہی تحلیل ہو کے نہ جاتا تھا۔ سامنے ایک سر بزر پہاڑی پر مہاراجہ کا فلک بوس چلیں اور مہارانی کا بے شمار بند کھڑکیوں والا محل تھا۔ لیکن پنج پیر کی نشیب سے وہ کیڑے مکوڑوں کے بنائے ہوئے مٹی کے بھر بھرے سے گھروندے دکھائی دیتے تھے۔

ہم دیر تک خاموشی سے بیٹھے ہوئے پیر بادشاہ کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن کسی نے بچارے متاز کا کھویا ہوا بوٹ اسے واپس لا کرنہ دیا۔ آخر نگہ آ کر میں نے مزار پر پڑے ہوئے پیسے چن کر گئے۔ پندہ آنے تھے۔ پانچ آنے میں نے اپنی جیب میں ڈالے۔

پانچ آنے متاز کو دیئے، اور باقی پانچ آنے مزار پر واپس رکھ دیئے۔

اس روز کے بعد پنج پیر ہماری توجہ کا خاص مرکز بن گیا۔ ہم جعراۃ کے جعراۃ وہاں باقاعدگی سے جاتے۔ کیونکہ جعراۃ کو نذرانہ نیا ہے چڑھتا تھا۔ اور ایمانداری سے حساب کر کے اپنا حصہ وصول کر لاتے۔ تذکیرہ نفس کی خاطر ہم نے عمد کر رکھا تھا، کہ اس پیسے کو دنیاوی ضروریات پر صرف کرنا ہمارے اوپر حرام ہے۔ چنانچہ اس رقم سے ہم ہفتہ بھر گرمیوں میں صرف ملائی کی اور سردیوں میں صرف اخروت اور کشمکش کھایا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد متاز کا ہیڈ کاشیبل باپ فوت ہو گیا۔ گھر میں غربت آگئی اور متاز پڑھائی چھوڑ کر بیاست کی فوج میں سپاہی بھرتی ہو گیا۔ ساڑھے اٹھاںہ روپے ماہوار تنخواہ۔ بارک میں رہائش اور کھانا مفت۔ اب میں اکیلا باقاعدگی سے پنج پیر آنے جانے لگا۔ لیکن انصاف سے کام لے کر میں نے تقسیم زر کے فارمولے میں ٹھوڑی سے ترمیم کر دی۔ اب میں نصف رقم خود رکھ لیتا تھا اور نصف پنج پیر کے حوالے کر دیتا تھا۔ یہ سلسلہ بڑی باقاعدگی سے جاری رہا۔ پنس آف ولیز کالج سے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد میں ایم۔ اے کے لے گورنمنٹ کالج لاہور چلا گیا۔ وہاں سے کبھی چھیٹیوں پر جموں آتا

جانا ہوتا، تو میں ہر جمعرات کو پنج پیر کے ساتھ اپنی وضعداری ضرور بھاتا تھا۔ لیکن آج جب میں اپنے نام پر آئی۔ سی۔ ایس کے تین حروف ڈالے پنج پیر پہنچا تو زندگی میں پہلی بار مجھے ان صاحبان مزار پر ترس آیا۔ کسی کو اتنا بھی معلوم نہیں تھا، کہ یہ مزار کن لوگوں کے ہیں۔ ان کے بارے میں بھانت بھانت کی روایات زیان زد خاص و عام تھیں۔ کوئی کہتا تھا یہ پانچ قطب تھے۔ کسی کا خیال تھا یہ پانچ ابدال تھے۔ کسی کا عقیدہ تھا کہ یہ پانچ ولی تھے جو اس علاقے میں اسلام کی شمع روشن کرنے آئے تھے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ پانچ چور تھے، جو قتل ہو کر یہاں مدفن ہوئے۔ اپنی زندگی میں وہ جو کچھ بھی تھے ہوتے رہیں۔ اب تو وہ فقط اپنی ذات کی نفی تھے۔ کسی کو ان کا نام تک معلوم نہ تھا۔ جو کوئی جس عقیدے کا غلاف ان پر چڑھا دیتا تھا، وہ بلاچوں و چڑاؤ اسے پہن لیتے تھے۔ نذرانوں کا ایک تھائی حصہ انہیں ملے، یا نصف ان کے لیے برابر تھا۔ ولی ہوتے تو تصرف دکھاتے۔ چور ہوتے تو مارتے۔ وہ بچارے تو نفی تھے، بالکل نفی۔

نئے آئی سی ایس کو ان بیچارے منفی قسم کے مجبور و مغدور بزرگوں پر بڑا ترس آیا۔ ایک بھرپور جذبہ رحم سے سرشار ہو کر میں نے ہاتھ انھا کر فاتحہ پڑھی جو آج تک پہلے کبھی نہ پڑھی تھی اور جیب سے سوا روپیہ نکال کر مزار پر نذرانہ چڑھا دیا جو آج تک پہلے کبھی نہ چڑھایا تھا۔

نذرانہ چڑھانے کی دیر تھی کہ پنج پیر صدیوں سے چھایا ہوا خاموشی کا طسم چٹاخ سے ٹوٹ گیا۔ سرینگر روڈ پر لاریوں اور ٹرکوں کی گھاؤں گھاؤں درختوں کا حصار توڑ کر مزار سے نکرانے لگی۔ دیائے توی کی مہیب شوں شوں کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ مہاراجہ کا چلیں اور بھی فلک بوس ہو گیا۔ مہارانی کے محل کی سینکڑوں بند اور تاریک کھڑکیاں کھل کے روشن ہو گئیں۔ میرا سر تیز رفتار موڑ کے پیسے کی طرح گھونٹنے لگا۔ اور پنج پیر کی قبروں کے تعویذ چیخ چیخ کر مجھے لعنت ملامت کرنے لگے، کہ ابے

او نمک حرام، ابے او بے غیرت، ابے طوطا چشم، ہمارے ساتھ پندرہ سال کا یارانہ توڑتے ہوئے تجھے ذرا بھی شرم نہ آئی۔

URDU4U.COM

میں نے دم دا کر فوراً سوا روپیہ واپس اٹھا لیا۔ مزار پر پڑے ہوئے پیسوں سے اپنا حصہ وصول کیا۔ پاؤں سے جوتا اتار کر پانچ سات بار اپنے سر پر زور زور سے مارا۔ اور چینیں مار مار کر بے اختیار رونے لگا۔

میری چینوں سے گھبرا کر کئی پرندے درختوں سے اڑ گئے۔ لاریوں اور ٹرکل اور دیائے توی کا شور و شغپ بھی پنج پیر کے محیط سے باہر نکل گیا۔ بے برکتی کے جھکڑ بند ہو گئے۔ میرے سر کے گھومتے ہوئے پیسے پر بریک لگ گئی۔ راج محل دھڑام سے گر کر کیڑے مکوڑوں کا مسکن بن گئے۔ پنج پیر اپنے وہی پرانے سکوت اور سکون اور سنائے کی چادر تان کر لیٹ گیا۔۔۔۔۔ اور میرے دل کی کال کوٹھڑی میں ایک عجیب سی دیوار گریہ نصب ہو گئی۔

خاموش آنسوؤں میں مقناطیس ہوتا ہے۔ جو آرزوؤں کے لوح چون کے چن چن کر آہستہ سے قریب لاتا ہے۔ بلند چینوں سے لاوا پھوتا ہے، جس سے کون و مکان میں زنگے آتے ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے ایک بار اور بھی ہو چکا ہے۔ جب ماں جی نے کراچی کے جناح ہسپتال میں وفات پائی۔ تو ان کی میت کو گھر لانے کے لیے رات کے ایک بجے ایمبولنڈ میں رکھا گیا۔ میرے بھائی بن اور دوسرے عزیز بھی اسی ایمبولنڈ میں سوار ہو گئے۔ میرے پاس ڈرائیور نہ تھا۔ اس لیے میں تن تھا کار چلا کر ایمبولنڈ کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ تیسی کے اس کاروں میں چلتے چلتے دفعہ میرے تن بدن اور میری روح کا لاوا بری طرح ابلٹے لگا۔ میں نے کار کے سب شیشے چڑھا کر بند کر لیے۔ اور پھر سٹیرنگ وہیل پر سر مار کر اتنا زور زور سے، اتنا زور زور سے رویا ہوں، کہ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے ماں جی ایمبولنڈ سے اٹھ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھی ہوں۔ یہ احساس اتنا صاف اور پر یقین تھا، کہ جب گھر پہنچ کر گاڑی رکی، تو میں نے کار سے اتر کر اس کا دوسرا دروازہ بھی کھولنا چاہا تاکہ ماں جی بھی باہر آ جائیں۔

لیکن وہاں کون تھا جو باہر آتا۔ لاش ایمپولنس سے نکل رہی تھی۔

پنج پیر کے ساتھ اپنا رشتہ از سر نو استوار کر کے جب میں واپس لوٹا تو میرا برا حال تھا۔  
ہاتھ تھر تھر رہے تھے۔ ٹانگوں میں رعشہ تھا۔ پاؤں من کے بھاری ہو رہے تھے  
اور سارا جسم کچے پھوٹے کی طرح ٹیس مار رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں کچھ دور  
پیدل چلا۔ پھر ایک تانگے میں بیٹھ کر گھر پہنچ گیا۔

گھر آ کر میں نے اپنی کھانیاں لکھنے والی کالپی نکالی اور اپنا دوسرا افسانہ لکھنے بیٹھ گیا۔  
اس کا عنوان ”پہلی تختواہ“ تھا۔ اس میں میں نے پہلی تختواہ کے عجیب و غریب مخرب  
الا خلاق مصرف کچھ ایسے انداز سے بیان کئے تھے کہ اختر شیرانی نے اسے اپنے رسالہ  
میں شائع کرنے سے انکار کر دیا۔

## • صاحبہ، بنیا اور میں

آئی سی ایس نے لوٹ کھوٹ میں جنم لیا۔ مار دھاڑ میں پروان چڑھی۔ سلطنت آرائی میں عروج پایا۔ اور برصغیر میں آزادی کے نزول کے ساتھ ہی دم توڑ دیا۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنوبی ایشیا میں تجارت کے پردے میں سیاست کا جال پھیلایا،  
 تو اس کے جلو میں ملائیں کام کا ایک لاو لشکر بھی اس خطہ ارض پر ٹھی دل کی طرح امد آیا۔ یہ ملازم عام طور پر کمپنی کے ڈائریکٹروں کے بیٹے، بھانجے، بھتیجے یا ان کے دوست احباب کے عزیز و اقارت ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہ ۵ پاؤند مہوار تک مقرر تھی۔ لیکن اس کے علاوہ ذاتی تجارت کرنے کی بھی ان کو کھلی چھٹی تھی۔ چنانچہ اکثر ملازم کمپنی کا کام کم اور نجی تجارت زیادہ کرتے تھے۔ مقامی راججوں، رہواڑوں، زمینداروں اور رئیسوں سے زبردستی نذرانے وصول کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ اور اس طرح اکثر ملازم چند سال میں لاکھوں روپے سمیٹ کر انگلستان واپس چلے جاتے تھے۔ واپسی پر وہ ایک آدھ ملازم چھوکرا یا طرحدار آیا بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے، اور جب وہ انگلینڈ کے مضافات میں بیش قیمت جاسیدا دیں خرید کر اپنا خانہ جماتے تھے، تو وہاں کی سوسائٹی میں ”بنان“ کہلاتے تھے۔

مال و دولت سمیٹنے کا یہ نیا راستہ دیکھ کر دوسرے انگریزوں کی بھی رال پکنے لگی۔ اور ہندوستان میں کمپنی کی ملازمت حاصل کرنا ایک باقاعدہ مم کی صورت اختیار کر گیا۔ اب لندن میں ڈائریکٹروں کی بر آئی اور انہوں نے بھی کھلے بندوں ہاتھ رنگنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ کمپنی کی اسامیاں فروخت ہونے لگیں۔ ڈائریکٹر صاحبان ایک ایک اسامی کی قیمت دو ہزار سے تین ہزار پاؤند تک وصول کرتے تھے۔

اسامی سفارش سے مل ہو یا قیمت دے کر خریدی گئی ہو، کمپنی کے ملائیں کا واحد مقصد یہی ہوتا تھا کہ ہندوستان آ کر وہ کم سے کم عرصہ میں زیادہ دولت سمجھیں

اور پھر وطن عزیز واپس جا کر عیش و آرام کی زندگی بسر کریں۔ اس مقصد براری کی دھن میں میں انیں طرح طرح کے پاپڑ بیٹنے پڑتے تھے۔

جب کمپنی کا نیا ملازم ہندوستان پہنچ کر جہاز سے اترتا تھا، تو سب سے پہلے اسے یہاں کا بنیا ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا۔ ہر انگریز کے ساتھ ایک ایک بنیا ہر وقت اس طرح چپکا رہتا تھا جس طرح جسم کے ساتھ سایہ لگا رہتا ہے۔ انگریزوں کی ذاتی تجارت کے لیے سرمایہ بنیا فراہم کرتا تھا۔ سگلنگ کے کاروبار کے نت نئے راستے وہ نکالتا تھا۔ گھروں کے لیے فرنچر آرائش و نیائش کا سامان وہ لاتا تھا۔ باورچی خانے کی روزمرہ ضروریات اس کے دم قدم سے پوری ہوتی تھیں۔ گھریلو ملائمین کا چناو اس کے مشوہد سے ہوتا تھا۔ نذرانہ وصول کرنے کے لیے موئی موئی اسمیوں کی نشاندہی بھی بنیا کرتا تھا۔ اور اپنے فرنگی آقاوں کی جنسی حاجات پر بھی وہ بڑے رکھ دکھاؤ سے اپنی نظر التفات ہر دم مرکوز رکھتا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہر طرح کے مسائل کو آنا فانا حل کرنے میں بنیتے نے کچھ ایسے مہارت حاصل کر رکھی تھی، کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اکثر ملازم اس کے بنے ہوئے پچیدہ جال میں بے بس مکڑیوں کی طرح جکڑے بندھے رہتے تھے۔

ابتداء میں انگریزوں اور ہندو بنیوں کا گھٹ جوڑ شروع تو تجارتی لین دین سے ہوا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک عالمگیر بلا (Octopus) کی طرح اس نے باہمی خیر سگالی کے ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک بہت بڑی قدر مشربک یہ تھی کہ دونوں مسلمانوں کو اپنا واحد دشمن تصور کرتے تھے۔ یہ ملی بھگت خوب رنگ لائی۔ جب انگریزوں نے برصغیر پر اپنا سلط جمانے کا آغاز کیا، تو تجارتی بنیا ان کا دست راست تھا۔ اور آزادی کے بعد جب انہوں نے یہ خط ارض چھوڑا تو سیاسی بنیا ان کا ہدم و ہمراز تھا۔ یہ محض حسن اتفاق ہی نہ تھا، کہ ہندوؤں نے جس انگریز سے چھٹکارا حاصل کیا تھا اسی انگریز کو برضاء و رغبت بھارت کا پہلا گورنر جنرل بھی تسلیم کر لیا۔

برٹش فراست اور بنیا سیاست کی یہ کامیابی چانکیہ کے فلفہ سیاست کے میں مطابق ہے۔ جس میں راج نیتی کے کاروبار میں جھوٹ اور فریب واجب ہے، اور ضرورت کے وقت

گدھے کو بھی باپ بنانے میں کوئی ہرج نہیں۔ ڈیڑھ دو سو سال پہلے ان دونوں کا نصب العین مسلمانوں کے بننے بنائے اقتدار کو پامال کرنا تھا۔ آزادی کے بعد دونوں کا مقصد ایک نئی ابھرتی ہوئی اسلامی مملکت کو درہم برہم کرنا بن گیا۔

یوں تو بنیا گیری عام طور پر ایک انفرادی پیشہ تھا۔ لیکن کلکتہ میں چند منچلوں نے مل کر بیوں کی ایک کمپنی بھی کھول لی تھی۔ اس فرم کا نام ”چار یار“ تھا، اور یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ بڑے بڑے ٹھیکوں کا کام کیا کرتی تھی۔ ۲ مئی ۱۸۹۹ء کا وہ منحوس دن تھا جب سرناگا پٹم کے تاریخی معركے میں ٹپو سلطان شہید ہو گئے۔ اور ہندوستان پر قبضہ جمانے کے لیے انگریزوں کا راستہ بالکل صاف ہو گیا۔ اس فتح کی خوشی میں لاڑ کارنوالس نے کلکتہ تھیٹر میں ایک شاندار محفل رقص و سرور منعقد کرنے کا اہتمام کیا۔ ہال میں جگہ جگہ ”وشن“ سے چھینے ہوئے سامان حرب کی نمائش لگائی گئی۔ دیواروں پر بڑے بڑے آئینوں کے سامنے معركہ سرناگا پٹم کے مختلف مناظر کی قد آدم تصویریں بناؤ کر لٹکائی گئیں۔ ستونوں پر بڑی خوبصورتی سے رنگ برنگ ریشم کے تھان منڈھے گئے۔ چھت سے رنگیں سلک کی بڑی بڑی چادروں کو شامیانوں کی صورت میں آویزاں کیا گیا۔ انگریزوں کی جس جس رجمنٹ نے سرناگا پٹم کی جنگ میں حصہ لیا تھا، ان کے جھنڈے ہال کے عین وسط میں لرائے گئے۔ ان کے عین نیچے سلطان ٹپو شہید کے جھنڈوں کو الٹا لٹکایا گیا۔ ڈائنس رات گیا رہ بجے شروع ہوا۔ اور صبح پانچ بجے تک جاری رہا۔ میموں نے سفید سائن کی چست وردیاں پہنی ہوئی تھیں جن پر ریشم کے دھاگے سے ۲ مئی کے الفاظ جلی حروف میں کاڑھے ہوئے تھے۔ ڈائنس کے درمیان جب مے نوشی کے لیے کچھ وقفہ ہوتا تھا، تو زرق برق کپڑوں میں ملبوس ہندوستانی ناپنے اور گانے والیاں مبارکبادی کے نغمے گا کر معزز مہمانوں کا دل بھلاتی تھیں۔ ارباب نشاط کے ان طائفوں کو ”چار یار“ نے بڑے اہتمام کے ساتھ بنارس سے فراہم کیا تھا۔ اس تقریب کے لیے خاص طور پر ”چار یار“ کے بیوں نے یہ انوکھی ایچ نکالی تھی، کہ ٹپو سلطان کا درباری لباس

اس محفل میں کام کرنے والے خدمتگاروں اور چپر اسیوں کو پہنلیا گیا تھا۔ اپنے اپنے بنیئے کی سرپرستی سے کمپنی کے انگریز ملازموں کی پانچوں گھنی میں اور سر اکٹر کراہی میں رہتا تھا۔ صبح سات بجے کے قریب جب صاحب بہادر کی آنکھ کھلتی تھی، تو سب سے پہلے حمال دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر کھڑکیاں اور دروازے کھولتا تھا۔ مسالجی بستر پر تنی ہوئی مچھر دانی سمیستا تھا۔ ایک طرف سے بیرا ”چھوٹا حاضری“ کی چائے پیش کرتا تھا۔ دوسری جانب سے حمام لپک کر بڑھتا تھا، اور صاحب کے سر کے نیچے دو تین سکے رکھ کر لیئے ہی لیئے اس کی شیو بنا دیتا تھا۔ چلپھی اور آفتابہ لا کر بستر ہی میں اس کا ہاتھ منہ دھلا دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ بریک فاست کے لیے بیٹھتا تھا، تو یہی حمام کری کے پیچھے کھڑا ہو کر اس کے سر کی ہلکی ہلکی ماش کرتا تھا، بال بناتا تھا، وگ جاتا تھا۔ کافوں کی میل نکالتا تھا اور ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کو چھٹاتا تھا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی حصہ بردار ہے کی نکلی اس کے منہ میں دے کر خود پیتل کی ایک چمکدار پھکنی سے چلم کی آگ سلاکتا رہتا تھا۔ حقے کی پہلی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی صاحب کا بنیا جھک جھک کر سلام کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے بعد ملازموں کی فوج ظفر موج کا ریلا اندر آتا تھا۔ خانام، بیرا، مسالجی، حمال، مالی، بہشتی، کتے والا، نکھے والا، دھوبی، درزی۔ سب باری باری سلام کر کے اپنی دن بھر کی ضروریات پیش کرتے تھے۔ بنیا انہیں پورا کرنے کا بیڑا اٹھاتا تھا۔ اس کے بعد دفتر کے مشی، متصدی، پیشکار، ہر کارے، چوبدار اور چپر اسی پیش ہوتے تھے۔ دس بجے صاحب کمرے سے برآمد ہو کر اپنی حیثیت کے مطابق گھوڑے یا پاکلی یا فن پر سوار ہوتے تھے۔ ان کے سر پر چھاتا کھلتا تھا اور آگے پیچھے دس پندرہ چوبداروں، برقداروں اور چپر اسیوں اور جلوس چلتا تھا، جو بڑی خوبصورت رنگیں وردیوں میں ملبوس ہوتے تھے۔ کچھ وقت دفتر میں گزار کر سارے مقامی انگریز ایک بجے لفٹن کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ لفٹ میں پندرہ سے اٹھاہن تک کھانے کے کورس اور چار پانچ قسم کی شرابیں ہوتی تھیں۔ چار

بجھے کھانے سے فارغ ہو کر شام کے ساتھ بجے تک قیولہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد بارہ ایک بار پھر ان کے کان کی مل نکالتا تھا، انگلیوں کے جوڑ چٹھاتا تھا، اور بال سنوار کر سر پر وگ جاتا تھا، آٹھ بجے سب لوگ اپنی سواریوں پر ہوا خوری کے لیے نکلتے تھے، اور دس بجے ڈزر کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ ڈزر کے بعد رات گئے تک حقے اور شراب کا دور چلتا تھا۔

اس محنت شاق کے عوض یہ لوگ چند برس میں لکھ پتی بن کر اپنے وطن سدھارتے تھے۔ دولت سمینے کے اس کاربار میں نذرانوں کی وصولی کو بڑا اہم مقام حاصل تھا۔ نذرانہ دراصل رشوت ہی کا دوسرا نام تھا۔ سب سے بڑا نذرانہ کلاو نے بنگال کے غدار میر جعفر سے وصول کیا تھا۔ اس نذرانے کا تخمینہ تمیں لاکھ پاؤند کے لگ بھگ تھا۔ اپنی تاریخی غداری کے شکرانے میں اس نگ دنیا نگ دین نگ وطن میر جعفر نے اپنی وصیت میں بھی سائز ہے تین لاکھ روپے کے جواہرات اور ڈیڑھ لاکھ روپے کا سونا کلاو کے لیے ان القابات کے ساتھ چھوڑا تھا: ”ہمارے ہیرو، ہماری آنکھوں کے نور نواب والی قدر لارڈ کلاو کے نام جو میدان جنگ میں چنان کی طرح ثابت قدم رہتے ہیں۔“ نذرانوں کے علاوہ میر جعفر کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور لارڈ کلاو کمپنی پر بھی بے دریغ ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا۔ ایک بار اپنی تنخواہ وغیرہ کے علاوہ اس نے دو برس کے متفرق اخراجات کا جو بل ایسٹ انڈیا کمپنی سے وصول کیا تھا، اس کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔

یورپ سے آنے کا خرچ:  
(ان تین ہزار پاؤند کے علاوہ جو کمپنی نے لندن میں دیئے تھے) ۶۔ ۱۵۔

۷۳۳۸۹

متفرق اخراجات ۰۔ ۱۲۔ ۹۹۶۲۹

کھانے پینے کے اخراجات ۱۔ ۸۔ ۹۷۳۶۲

لبوسات ۷۔ ۳۔ ۱۲۹۸۷

ملازمیں کی تنخواہ ۱۱۔ ۳۔ ۱۹۷۲۲

دیگر چھوٹے چھوٹے اخراجات ۷۔ ۱۰۔ ۱۱۷۴۳

سیکرٹری کو انعام ۷۔ ۲۔ ۱۳۹۲۸

اپنے اپنے بیویوں کے تعاون سے کمپنی کے بہت سے انگریز ملازم خفیہ طور پر چھوٹے چھوٹے مقامی حرم بھی قائم کر لیتے تھے۔ لیکن باقاعدہ شادی وہ صرف میموں سے ہی رچاتے تھے۔

اس مقدم کے لیے کمپنی کے ڈائریکٹر انگلستان سے آنے والے ہر بھری جماز میں شادی کی خواستگار میموں کی کھیپ بھی ہندوستان بھیجتے تھے۔ یہ خواتین نئے نئے فیشن کے ملبوسات اور سامان آرائش سے لدی پہنندی آتی تھیں۔ اور اپنے دل پسند خاوند کا شکار کرنے کے لیے طرح طرح کے دامن تنوری بچھا کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ان کے دل کو نوجوانوں کی نسبت بڑھے خاوند نیا دل پسند آتے تھے۔ عمر رسیدہ انگریز ہندوستان کی آب ہوا میں سالہا سال کی بسیار خوری اور مے نوشی کے بعد قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوتے تھے۔ اور ان کی جوان بیویاں بہت جلد ان کی سمیثی ہوئی دولت کی وارث بن جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ خاوند کے مرتبے ہی بیوہ کے نام عمر بھر کے لیے تین سو پاؤند سالانہ کی پیش بھی مقرر ہو جاتی تھی۔ جو عورت ہندوستان آنے کے بعد ایک سال تک خاوند پھانسے میں کامیاب نہ ہو سکے، اسے کمپنی کے خرچ پر واپس انگلستان بھیج دیا جاتا تھا۔

ابتدہ ایک طرحدار میم مس ہالذین نے انگلستان واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اس نے ہندوستان میں کسی خاوند کا سارا لیے بغیر ہی دولت کمانے کا ایک نیا راستہ تلاش کر لیا تھا۔ ہندوؤں کی ریت ہے کہ دیوالی کی رات وہ لکشمی دیوی کی پوجا کرتے ہیں تاکہ سارا سال ان پر ملایا کی بارش برستی رہے۔ اگر کنورای کنیا کے بہنہ جسم پر سونے چاندی کے سکے رکھ کر پوجا پاٹھ کی جائے تو لکشمی دیوی کا دل نیا دل نیا آسانی سے خوش ہو جاتا ہے۔ چند بیویوں کی مدد سے مس ہالذین نے دیوالی کی راتوں کے لیے کنوازی کنیا کا روپ دھار لیا۔ دولت کے پچاری اس کے عربیاں تن بدن کو بڑی فنکاری سے روپوں اور اشرافیوں سے سجائتے تھے، اور پھر اس کے قدموں میں بیٹھ کر ساری رات بڑی عقیدت سے لکشمی دیوی کو برماتے اور اپنے قلب و نظر کو گرماتے تھے۔ رفتہ رفتہ مس ہالذین

ہلدی دیوی کھلانے لگی۔ ”دھن کی موج ہلدی دیوی“ من کی کوچ ہلدی دیوی کی پھبیوں کے ساتھ اس کا چرچا دور تک پھیل گیا۔ پوجا پاٹھ کے لیے اس کی مانگ اتنی بڑھ گئی کہ ہر رات دیوالی کی رات بننے لگی۔ کمپنی کے ملازمین ایک سفید فام عورت کی ان حرکات پر بڑے چراغ پاٹھے۔ ایک طویل سازش کے بعد آخر انہوں نے مس ہالڈین کو زیر دستی انگلستان واپس بھجوایا۔ اس نے اپنی واپسی کے خلاف عدالتوں میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی تو بہت کی، لیکن کہیں کوئی شناوائی نہ ہوئی۔ کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتیں مقدموں کا فیصلہ انصاف کی رو سے نہیں بلکہ مصلحت کی رو سے کرنے کی پابند تھیں۔

کمپنی کے عدالتی نظام میں کسی گورے کے ہاتھوں کالے کا قتل بڑا جرم شمار نہ ہوتا تھا۔ ایسے مقدمات میں مقتول اکثر بیکوں اور دفتروں کے پنکھا قلی ہوتے تھے۔ انہوں نے دن رات مسلسل پنکھا کھینچنے کی بڑی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ با اوقات وہ پنکھے کی رسی اپنے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ باندھ کر فرش پر لیٹ جاتے تھے۔ اس حالت میں اگر کبھی انہیں اوںگھے بھی آ جاتی تھی، تو ان کی ثانگ متواتر چلتی رہتی تھی اور پنکھا بدستور ہلتا رہتا تھا۔ لیکن اگر شومی قسم سے کسی وقت پنکھا بند ہو جائے، تو گرمی، نیند اور شراب کے خمار میں بوکھلایا ہوا ”صاحب“ ہڑبڑا کر اٹھتا تھا، اور سوئے ہوئے قلی کے پیٹ میں زور سے ٹھوکر مار کر اسے بیدار کرتا تھا۔ کئی بار اس ٹھوکر کی ضرب سے بچارے قلی کی تلی پھٹ جاتی تھی اور وہ وہیں لیئے لیئے دم توڑ دیتا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں صاحب کو کبھی ایک روپیہ جرمانہ ہو جاتا تھا، کبھی محض وارنگ ملتی تھی، کبھی بالکل باعزت بری۔

ہندوستانیوں کو سب سے کڑی سزا چوری کے جرم پر ملتی تھی۔ مجرم عورتیں ہوں یا مرد، عام طور پر انہیں چورا ہوں میں بر سر عام ہر روز ۳۹ کوڑے اس وقت تک لگائے جاتے تھے، جب تک کہ وہ چوری کا مال واپس نہ کر دیں۔ پتے ہوئے گرم لوہے سے چرہ، ہاتھ اور نخنے داغنا بھی ایک عام سزا تھی۔ کچھ قیدیوں کو ہفتے میں ایک یا دو بار کاٹھ

بھی مارا جاتا تھا۔ کسی کو لکڑی کے شکنچے میں کس کر اس کی نمائش کرنے میں جسمانی تکلیف کی نسبت تذیل و تشریف کا عصر نیاہ نمایاں ہوتا تھا۔ اکثر مقامات پر ہندوستانیوں کے لیے انگریزوں کے سامنے کسی سواری پر بیٹھنا ممنوع تھا اور بارش یاد دھوپ میں چھاتا کھول کر چلنے کی بھی ممانعت تھی۔

کوئی دو سو برس تک اسی طرح من مانی کارروائیوں سے کمپنی بہادر نے ایک ہاتھ سے لوٹ مار کر بازار گرم رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ملک گیری کی ممم ایسی کامیابی سے چلائی کہ ۱۸۵۳ء میں اس کا تجارتی کاروبار قانونی طور پر بند ہو گیا اور بر صیر پر انگریزوں کی باقاعدہ حکمرانی کا دور شروع ہو گیا۔ نئے سامراجی تقاضوں کے پیش نظر سب سے پہلے آئی سی ایس کی داغ بیل ڈالی گئی اور لارڈ مکالے کی قیادت میں اس سروس کو باضابطہ منظم کیا گیا۔ اب اس میں داخلہ صرف مقابلے کے امتحان کے ذریعہ ہونے لگا۔ آئی سی ایس کا پہلا امتحان لندن میں ۱۸۵۵ء میں منعقد ہوا۔ ۱۸۶۳ء میں پہلا ہندوستانی اس امتحان میں کامیاب ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں ان کی تعداد چار ہو گئی۔ اگلے چالیس پچاس برس تک اس سروس میں جتنے ہندوستانی داخل ہوئے، وہ نیاہ تر ہندو ہی تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اس بر صیر میں مسلمانوں پر تعلیم و ترقی کے بھی دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ لارڈ مکالے کا فتویٰ تھا کہ یہاں پر جو نظام تعلیم راج کیا جائے وہ ایسے انسان پیدا کرے جو رنگت میں تو پیش ہندوستانی ہوں لیکن چال ڈھال، فہم و فراست، ذوق و مذاق، اخلاق و اطهار اور ذہنی اعتبار سے انگریز ہوں۔ اس پالیسی کے تحت جب فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا تو بر صیر کے ہزاروں مسلمان علماء و فضلاء بہ یک نوک قلم غیر تعلیم یافتہ قرار دے دیئے گئے۔ اس فیصلے کا ہندوؤں نے بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اس لیے نہیں کہ انہیں انگریزی سے کوئی خاص محبت نہیں بلکہ صرف اس لیے کہ انہیں فارسی سے چڑھتی، کیونکہ اس زبان کا رابطہ مسلمانوں سے تھا۔

یوں بھی جب ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ گل ہو گیا تو انگریزوں اور ہندوؤں کی ایک مشترکہ کوشش یہ تھی کہ اس برصغیر میں ہر اس امکان کو ختم کر دیا جائے جس میں مسلمانوں کے دوبارہ سر اٹھانے کا ذرا سا شائبہ بھی موجود ہو۔ یہاں پر مسلمان ہی ایک ایسی قوم تھی جس میں حکومت کرنے کی صلاحیت بھی تھی، روایت بھی تھی اور ہزار سالہ تجربہ بھی حاصل تھا۔ چنانچہ اس قوم کا سر کچلنا دونوں کا فرض منصبی قرار پایا۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انگریزوں نے سب سے پہلے اقتصادی طور پر ہندوؤں کو آگے بڑھانے اور تعلیمی طور پر مسلمانوں کو پیچھے دھکلنے کی پالیسی کو عملی جامہ پہننا شروع کیا۔ یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا۔ حکومت انگلشیہ نے نظام تعلیم کو سیکور بنا کر اسے براہ راست سرکاری سرپرستی میں لے لیا۔ اس طرح مسلمانوں کے تہذیبی، تمدنی اور علمی گھواروں کا رشتہ اس نظام تعلیم سے بالکل منقطع ہو گیا۔ اسلامی مدرسے اور دارالعلوم تو حکومت کی سرپرستی سے محروم ہو کر اپنے اپنے خود حفاظتی خول میں چلے گئے، لیکن کرسچنڈ مشنری سکولوں کی تعداد روز بروز بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ مسلمان طلبہ گورنمنٹ سکولوں میں داخل ہونے سے بڑے طویل عرصہ تک ہچکچاتے رہے۔ اس کی تین وجہات تھیں۔ ایک تو انگریزوں کا رویہ مسلمانوں کی طرف ویسا ہی تھا جیسا کہ فتح کا مفتح کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے مسلمان قدرتی طور پر ان اداروں میں جانے سے استکاف محسوس کرتے تھے، جو غالب قوم نے خاص اپنے اغراض و مقاصد کے لیے قائم کئے تھے۔ دوسرے، گورنمنٹ سکولوں میں دینی تعلیم پر مکمل پابندی تھی۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے ناقابل فہم تھی۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد تھی کہ دین کے بغیر تعلیم کا کوئی نظام نہ مکمل ہو سکتا تھا نہ قابل قبول۔ چنانچہ انگریزوں کا یہ اقدام مسلمانوں کی نظر میں شکوک و شبہات سے اٹاٹ بھرا ہوا تھا۔ تیری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال سے شہ پا کر اس زمانے میں عیسائی مشنریوں نے بھی برصغیر پر یورش شروع کر

دی، اور وہ بڑی شدت سے مسیحیت کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ یہ پادری جگہ مسلمان علماء کو مناظرے کا چیلنج دیتے تھے۔ مناظرے اکثر گورنمنٹ سکولوں کی گراونڈ پر منعقد ہوتے تھے۔ مقامی انگریز افسر شامیانوں کا بندوست بھی کرتے تھے اور ہر ممکن طریقے سے پادریوں کی پشت پناہی کا سامان بھی کرتے تھے۔ اس سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ شبہ اور بھی پختہ ہو گیا کہ گورنمنٹ سکولوں، انگریزوں اور مسیحی پادریوں کے درمیان مسلمانوں کے خلاف ضرور کوئی خفیہ گھٹ جوڑ ہے اور مسلمانوں کا سیاسی زور توڑنے کے بعد اب یہ لوگ سرکاری نظام تعلیم کے پردے میں ان کے دین کے درپے ہو رہے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے دینی تعلیمی ادارے اور حکومت کے سرکاری سکول الگ الگ متوازنی خطوط پر چلنے لگے۔ آزادی کے بعد بھی یہ سلسہ اب تک کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۸۸۰-۸۱ء میں سارے برصغیر میں انگریزی ہائی سکولوں میں ۳۶۶۸۶ ہندو اور صرف ۳۶۳ مسلمان طلبہ پڑھتے تھے۔ اسی طرح اس سال پورے ہندوستان میں ۳۱۵۵ ہندو اور فقط ۵۷ مسلمان گریجویٹ تھے۔ قدرتی طور پر ملک کے انتظامی اور معاشی نظام میں بھی ہندوؤں کا تناسب اسی لحاظ سے تھا۔

مسلمانوں کی پسمندگی کے اس جمود کو سریبد احمد خاں کی تحریک علی گڑھ نے بڑے موثر طور پر توڑا۔ ۱۹۲۲ء میں جب آئی سی ایس کے مقابلے کا امتحان لندن اور دہلی میں بیک وقت منعقد ہونے لگا تو اس سروس میں مسلمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ شروع ہو گیا۔

۱۹۳۰ء میں جب میں آئی سی ایس میں داخل ہوا تو میرا گروپ ۳۰ افراد پر مشتمل تھا۔

ان میں سے ۱۹ کا انتخاب لندن میں اور ۱۱ کا دہلی میں ہوا تھا۔ گروپ میں ۱۵ انگریز، ۱۲ ہندو اور ۳ مسلمان تھے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے لندن میں ٹریننگ کے راستے بند تھے۔ اس لیے ہماری ٹریننگ کا کمپ دہرہ دون میں کھولا گیا۔

جب میں پہلے روز کمپ میں حاضر ہوا تو ٹریننگ کے ڈائریکٹر مسٹر پنیل (Pinnell) اپنے روزمرہ کے معمول کے مطابق کمپ کی صفائی کا معافہ کرنے گشت پر لگے ہوئے تھے۔

مجھے بھی انہوں نے اپنے ساتھ لے لیا۔ پرویشنرز کے خیموں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد جب ہم ملازموں کے بیت الخلاء کے قریب پہنچے تو یکا یک مسٹر پنیل کے چہرے پر رونق آگئی۔ انہوں نے اپنی عینک اتار کر جیب میں رکھ لی، رومال سے اپنی گلی گلی آنکھوں کی نمی صاف کی، اور پھر جھک جھک کر بیت الخلاء کے قدچوں میں ناک ڈال کر زور سے یوں سانس لینے لگے جیسے شکاری کتا جھاڑیوں میں چھپے ہوئے زخمی بیٹر کو سونگھ سونگھ کر تلاش کرتا ہے۔ ایک قدچے پر پہنچ کر مسٹر پنیل رک گئے، اور مجھے بھی اس مقامِ مثام پر نواز کو سونگھنے کی دعوت دی۔ میں نے یونہی کھڑے کھڑے دو چار لمبے سانس لیے تو مسٹر پنیل خفا ہو گئے۔ انہوں نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر میرا سر جھکایا اور میری ناک عین قدچے کے پاس لا کر مجھے نہایت زور سے سونگھنے کا حکم دیا۔ ابھی گھنٹہ بھر پہلے آٹھ دس پر خور بیرون نے اس قدچے پر اپنے صحت مند معدوں کو صاف کیا تھا۔ مہتر نے صفائی کے لیے فینائل چھڑک کر اس پر چونا ڈال دیا تھا۔ اس ملغوبے پر ناک لٹکا کے میں نے ایک طویل سانس کھینچا، تو عفونت کے پے در پے بھبھکوں سے میرا دماغ پھٹنے لگا، اور مجھے بے اختیار بڑے زور کے قے آگئی۔ قے کے چھ چھینٹے مسٹر پنیل کے چمکیلے براون جوتوں پر بھی پڑے۔ انہوں نے مجھے قدر آلود نگاہوں سے گھورا، اپنی ناک کو سکیڑرا جو ہد کی چونچ کی طرح لبی، تیکھی، اور ٹیزھی تھی اور اپنے ذہن میں مجھے آئی سی ایس کے لیے قطعی غیر ناموزوں کھاتے میں ڈال دیا۔

دہرہ دون ٹریننگ کیمپ کے قیام کے دوران کئی ایسے اور موقع بھی آئے جنہوں نے مسٹر پنیل کے دماغ میں آئی سی ایس کے لیے میری ناہلیت پر ایک کے بعد دوسرا، دوسرا کے بعد تیسرا مر تصدیق ثبت کر دی۔

کیمپ میں ہر پرویشنرز کو اپنا اپنا ذاتی بیرا رکھنے کا حکم تھا۔ میں جموں سے اپنے ساتھ ادھیزر عمر کا ایک کشمیری ملازم رمضان لیتا آیا تھا۔ کیمپ کے میں میں بیٹھ کر بیرون

کو بلانے کا طریقہ یہ تھا کہ دونوں ہاتھ سے تالی بجاو اور بلند آواز سے ”کوئی ہے؟“ کا نعرہ لگاؤ۔ ”کوئی ہے؟“ کی سیٹ پر بچارے میرے لپک کر دم ہلاتے ہوئے حاضر ہو جاتے تھے۔ مجھے یہ رسم بڑی معیوب محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے میں ہمیشہ اپنے میرے کو ”رمضان صاحب“ کے نام سے آواز دیتا تھا۔ اور ”تم“ کی بجائے ”آپ“ کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ مشر پنیل کو میرا یہ انداز بری طرح کھلتا تھا۔ میرے دوسرے انگریز اور دیسی ساتھی بھی اس پر کافی ناک بھون چڑھاتے تھے۔ ایک رات مشر پنیل صاحب نے مجھے اپنے خیمے میں کافی پینے کے لیے مدعو کیا اور کافی کے ساتھ ساتھ مجھے ایک طویل پیکھر بھی اس موضوع پر پلایا کہ اچھا افسر بننے کے لیے لازی ہے کہ عوام الناس کے ساتھ پورا پورا فاصلہ برقرار رکھا جائے۔ ان کے بھاشن میں یوروکسی کے وہ سارے برخود اصول جھلک رہے تھے، جنہوں نے نوکر شاہی کو اندر وون شر سے کاٹ کر سول لائنز کی الگ تھلک اجنبی دنیا میں آباد کر رکھا تھا۔ میں نے مشر پنیل کی کافی تو بڑے شوق سے پی، لیکن ان کی تقریر ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑا دی۔

ٹریننگ کے بعد آئی سی ایس پرویشنرل کے امتحان میں تاریخ، نظم و نق، قانون اور ہندی زبان کے پرچے تو میں نے بڑی آسانی سے پاس کر لیے۔ لیکن گھوڑ سواری کا امتحان میرے لیے بڑا ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ گھوڑے پر سوار ہونا تو درکنار ساری عمر مجھے کسی نے گھوڑے کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا تھا۔ اس کی وجہ ایک واہمہ تھی۔ جب روس میں کیمونٹ انقلاب برپا ہوا تھا تو سنترل ایشیا سے بہت سے مسلمان بالشویکی مظالم سے نگ آ کر دوسرے ملکوں کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ کئی سال تک یہ مهاجرین گلگت بھی آتے رہے۔ ان میں بخارا کے ایک درویش حضرت نوری کے نام بھی تھے۔ ان کی عمر کوئی سو برس کے لگ بھگ تھی۔ والد صاحب نے انہیں اپنے ہاں ہی رکھ لیا۔ وہ چھ سال برس تک ہمارے ہاں رہے اور وہیں وفات پائی۔ جب میں پیدا ہوا تو وہ ہمارے پاس ہی مقیم تھے۔ میرا نام بھی انہی کا تجویز کردہ تھا۔ میری پیدائش پر انہوں نے فارسی

نظم میں ایک طویل "فالنامہ" لکھا۔ اس میں باقی سب باتیں تو مبہم تھیں، لیکن دو چیزیں صاف صاف درج تھیں۔ ایک یہ کہ اس پچے کو ساری عمر کثرت سے نکیر پھونٹا کر گی، لیکن اس میں فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ بالکل صحیح ثابت ہو گئی۔ مجھے اب تک برفانی سردیوں میں بھی بیٹھنے بٹھائے بلا وجہ نکیر آنے لگتی ہے۔ ناک سے کچھ دیر خون بہ جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جسم سے آگ کی چنگا بیاں نکل گئی ہیں۔ دوسری پیشین گوئی نوری صاحب نے یہ کی کہ اسے گھوڑے کی سواری سے جان کا خطرہ ہے۔ لکھنے کو تو یہ بات نوری صاحب نے اپنے فالنامہ میں لکھ دی، لیکن مجھے ساری عمر کسی نے گھوڑے کی دم تک کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ اس زمانے میں گلگت سے سری نگر کا سفر عورتیں بھی گھوڑے پر بیٹھ کر طے کیا کرتی تھیں۔ لیکن اس سفر میں بھی مجھے اپاہجوں کی طرح پاکی میں بٹھایا جاتا تھا۔ اب آئی سی ایس کے پروپیشنری امتحان میں رائڈنگ ٹیسٹ پاس کرنا لازمی شرط ٹھرا تو مجھے بڑی فکر دامن گیر ہو گئی۔ مسٹر پنیل کو امید واشق تھی کہ میں اس ٹیسٹ میں ضرور فیل جاؤں گا۔ مجھے خود بھی یہی خطرہ تھا۔ اس لیے امتحان سے کچھ عرصہ پہلے میں کیمپ کے رائڈنگ انسلکٹر دفعدار جمال خاں سے ملا اور اسے اپنی پتتا کی رام کھانی صاف صاف جا سنائی۔ وہ جملم کا ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اس نے بڑے اعتماد سے میری پیٹھے ٹھوکنگی اور کہا۔ "صاب! آپ فکر مت کرو، آپ کا بس اتنا کام ہے کہ گھوڑے پر پیٹھے پر جم کے بیٹھ رہیں۔ باقی سب کام اللہ کے حکم سے میں خود سنبھال لوں گا۔"

دفعدار جمال خاں نے مجھے گھوڑے پر جم کر بیٹھنے کے کچھ ایسے گر سکھائے، کہ گھوڑا تو کبھی ٹھوکر کھا کر گر بھی جاتا تھا لیکن میں اس کی پیٹھے کے ساتھ جونک کی طرح چمٹا رہتا تھا۔ امتحان والے دن دفعدار صاحب نے مجھے ایسا گھوڑا دیا جو سرکس کے جانوروں کی طرح بالکل سدھایا تھا۔ جب امتحان لینے والے کرتل نے پکار کر حکم دیا "ثراث" تو ایڑ یا لگام کے کسی اشارے کے بغیر ہی میرے گھوڑے نے بڑے مزے سے دلکی

چال چلانا شروع کر دی۔ ”گلیپ“ کی آواز پر میرا گھوڑا خود بخود سرپٹ بھاگنے لگا۔ راستے میں ایستادہ رکاؤں کو بھی وہ خود ہی اپنی ہنرمندی سے چھلانگتا گیا۔ آخر میں جب کرٹل صاحب نے فگر آف 8 بنانے کا آئڈر دیا تو میرے گھوڑے نے ایسے خوبصورت دائرے کاٹ کر انگریزی 8 کا ہندسہ بنایا کہ ممتحن نے مجھے شلباش دے کر بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر دیا۔

پرویشنری امتحان کے بعد جب مجھے صوبہ بہار میں تعیناتی کا حکم ملا تو مسٹر پنیل نے وہاں کے چیف سیکرٹری کو میرے متعلق جو رپورٹ بھیجی اس میں میری چند خصوصیات کو بڑی فصاحت سے اجاگر کیا گیا تھا۔ حفیف الحركات، ہائی سوسائٹی کے لیے نامزوں، رفیلوں میں خوش، آئی سی ایس کی روایات اور وقار کے لیے ناکافی، اہم ذمہ داریوں کے لیے نااہل مجموعی طور پر انڈین سروس کے لیے غلط انتخاب ..... اگر ملازمت کے دو یا تین سال بھی پورے کر لے تو اس کی انتہائی خوش نصیبی اور برٹش انڈین گورنمنٹ کی انتہائی بد نصیبی ہو گی۔

## • بھاگلپور اور ہندو مسلم فساداتے

پنہ سے بھاگلپور کے لیے مجھے ٹرین کے جس کمپارٹمنٹ میں جگہ ملی، اس میں ایک مارواڑی خاندان بھی سوار تھا۔ ایک موٹا سا سینھ، اس سے بھی موٹی سیٹھانی اور ان دونوں کی فربی کا مرکب ایک گول مثول سائز کا، جس کی عمر تو دس گیا ہے برس سے زیادہ نہ تھی لیکن جسم کا پھیلاواً اپنے سن و سال سے کئی گناہکا ہوا تھا۔ سامان کے طور پر ان کے ساتھ چھے بڑے بڑے ٹرنک اور بستر تھے۔ پانچ بویاں اور تین ٹوکریاں جن میں میلے کچھیلے کپڑے، جوٹھے برتن، جوتے، ٹوپیاں، چمنے، پھل وغیرہ اٹا اٹ بھرے ہوئے تھے۔

اچار کا مرتبان، دو تین ناشتا دان، انگلیٹھی، کوئلے، گڑویاں، تھال، دو باللیاں، جن میں اشیش کے غل سے پانی بھر کر کمپارٹمنٹ میں رکھ لیا گیا تھا۔ ڈبے کے ایک کونے میں خشک مٹی کی ڈھیری تھی جسے صابون کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ فرست کلاس کا غسل خانہ ناپاک سمجھا جاتا تھا، اس لیے سینھ، سیٹھانی اور ان کے فرزند ارجمند ڈبے ہی میں کلیاں کرتے تھے، مٹی مل کر ہاتھ دھوتے تھے، اور تھوڑے تھوڑے وقہ کے بعد انگلیٹھی سلگا کر پوپیاں، بھاجیاں اور حلے گرم کر کے تناول فرماتے تھے۔ فرست کے اوقات میں وہ اوٹھتے تھے، خراٹے لیتے تھے اور زور زور سے ڈکاریں مارتے تھے۔

چند ہی گھنٹوں میں کمپارٹمنٹ کی فضا میں مجھی کی دکان ایسا نقشہ جم گیا۔ وہی بو، وہی کثافت، وہی سجنگھناتی ہوئی کھیاں، وہی غل کپاٹہ۔ کیونکہ سینھ صاحب اور سیٹھانی سانس توڑے بغیر اونچی آواز میں لگاتار اپنی گھریلو سیاست پر تبصرہ کرنے کے شوقین تھے۔ اس دوران ان کا فرزند دلپذیر بھی کبھی احتجاجاً کبھی اثباتاً اپنی چیخ و پکار کا اضافہ کرتا رہتا تھا۔ سیٹھانی کو غالباً پرانے دے کی شکایت تھی۔ کیونکہ جب وہ کھاتی یا بولتی یا ڈکاریں نہ لے رہی ہو تو وہ بڑی شدت سے کھانستی تھی۔ اور کھنکار کھنکار کر گائے کے مکھن

کی طرح زرد بلغم اپنی سیٹ کے نیچے تھوکتی جاتی تھی۔

باہر گرد تھی اور انہیں سے بھک بھک لکھا ہوا دھواؤ میلوں تک ایک بے کیف اور اداس یکسانیت چھائی ہوئی تھی۔ کھیتوں میں چرتے ہوئے نحیف و نزار موشی۔ گدے گدے جوہروں پر کپرے دھوتی ہوئی، پانی بھرتی ہوئی عورتیں، کمیں کمیں کسی جانور کی لاش پر کتول اور گدھوں کا ہجوم۔ کسی جگہ قضاۓ حاجت کے لیے سر جھکائے ریل کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھے ہوئے بے تکلف انسان۔ آبادیوں کے آس پاس دھول میں اٹھے ہوئے لڑکے جو گاڑی کو دیکھ کر اس پر تھوکتے تھے، پھر مارتے تھے، اور اپنی غلیظ دھوتیاں کمر سے اوپر اٹھا کر مسافروں کا منہ چڑھاتے تھے۔ اسٹیشنوں پر میلی ورویوں میں ملبوس تکڑت چیکر گرنہ بھیزیوں کی طرح منڈلاتے پھرتے تھے۔ اور مڑی تڑی ہڈیوں والے اپاچ چھوکرے، اندھی عورتیں اور جذام کے مارے ہوئے بھکاری ان گنت خداوں کا واسطہ دے دے کر خیرات مانگ رہے تھے۔

اپنے کمپارٹمنٹ کے اندر ہونی اور بیرونی ماحول سے اکتا کر میں ڈائینگ کار میں جا بیٹھا۔ یہاں پر ایک اور طرح کا ہڑبوگنگ مچا ہوا تھا۔ ایک کرسی طر بھاگلپور کے بیرونی نور الحسن بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹے قد کے فربہ اندازم گول مثول بزرگ تھے۔ انہوں نے ہلاک نیلا سوت نیب تن کیا ہوا تھا۔ جس کی پتلون ان کے بھاری بھر کم پیٹ پر یوں تھی ہوئی تھی جیسے کسی ملکے کے پیندے پر ایک ٹنگ ٹنگ سا غلاف چڑھایا ہوا ہو۔ ان کی پھولدار بوٹائی گردن کے ڈھیلے ڈھالے گوشت کی جھریوں میں دبی ہوئی تھی۔ اور ان کی تیز سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی کا موٹا سا کالا ریشمی پھندنا گردن کی ہر جنبش کے ساتھ گھڑی کے پنڈولم کی طرح رقص کرتا تھا۔ بیرونی صاحب نے اپنی سفید گھنی موچھوں کو فکسو کے ساتھ تاؤ دے کر سیٹ کیا ہوا تھا اور وہ ان کے دونوں گالوں پر ننگی عُگینیوں کی طرح ایستادہ تھیں۔

بیرونی صاحب کے سامنے بھاگلپور کی راشٹریہ سوائیم سیوک سنگ کے کرتا دھرتا کمار اندر

دیو زائن سنگھ براجمن تھے۔ چھریا بدن، لکتا ہوا قد، بند گلے کا یاستی وضع کا کوٹ۔ جود پوری برجس۔ سر پر بالکے انداز میں ترجیح رکھی ہوئی فیکٹ جس میں بیش قیمت ہیروں کا بروج لگا ہوا تھا۔ منہ میں پائپ، بغل میں بید کی نازک سی چھڑی، ہاتھ میں دو بڑے بڑے غصب ناک اور بھیانک شکاری کتف کی زنجیریں، جو ان کے دامیں باسیں چوکیداروں کی طرح کھڑے بیرون نور الحسن کی طرف یوں دیکھ رہے تھے گواہ چشم زدن میں لپک کر انیں زخمی مرغابی کی طرح دیوپنے والے ہوں۔

کمار صاحب کے پیچھے ایک کرسی پر ست زائن پانٹے بیٹھا تھا جو بیک وقت ان کے پرائیویٹ سیکرٹری، مصاحب، قانونی مشیر، باڈی گارڈ اور ہر قسم کی دلائلی کے فرائض سر انجام دیا کرتا تھا۔ ست زائن پانٹے نے سفید برائق دھوتی اور باریک تن نیب کا بنگالی کرتہ پہنا ہوا تھا جس میں اس کے کسرتی جسم کے پیچھے بڑی صفائی سے جھلک رہے تھے۔ اس کے سر پر کھدر کی گاندھی ٹوپی تھی جس کے کنارے سے اس کی گھنی چیا نکل کر ایک کان کے قریب بچھو کے ڈنک کی طرح بل کھا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بہت سی زنجیروں کا گچھا تھا، جن کے ساتھ انواع و اقسام کے چھوٹے بڑے کتے بندھے ہوئے تھے۔ اور ڈائینگ کار میں آنے جانے والے مسافروں پر مختلف آوازوں میں بھونک رہے تھے۔

کمار اندر دیو زائن سنگھ بڑے زور و شور سے آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاست پر گرج برس رہے تھے، اور بیرون نور الحسن کی توند میں بار بار انگلیاں چھو کر انیں خبردار کر رہے تھے، کہ اگر آپ کے جناح صاحب نے پاکستان کا مطالبہ ترک نہ کیا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگی حرام ہو جائے گی۔ بچارے بیرون صاحب مرنجان مرنج قسم کے بزرگ نظر آتے تھے، اور بھیگی بلی بنے بڑے تحمل سے کمار صاحب کی لعن طعن برداشت کر رہے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنی ترکی ٹوپی اتار کر میز پر رکھی تو کمار صاحب کا ایک الیشن کتا زیان نکال کر اس کا پھندنا چاٹھے لگا۔ بیرون صاحب نے جلدی سے ٹوپی انھا کر سر پر رکھ لی تو کتنے نے اپنے اگلے پاؤں ان کی توند پر رکھ دیئے اور تھوٹھنی

اٹھا کر ان کے سر کی جانب لپکا۔ یہ نظارہ دیکھ کر ست زائن پانٹے اپنی جگہ سے اٹھا اور قبھہ لگا کر کھینچنے لگا۔ ”مولی بی جی‘ جرا سنبھل کے۔ ای کتنا بڑا جالم ہوت۔ تمری نوپا کا پھندنوا ای کو بھڑکاوت جاوٹ ہو۔ اپن تو کھیال ہے کہ جان بچانا چاہت ہو، تو ای نوپا اتار کر باہر پھینک دیو۔ ہاں‘ جے شری گنیش جی کی۔“

کمار اندر دیو زائن سنگھ نے کتے کو کھینچ کر پیچھے ہٹایا، اور آنکھ مار کر ست زائن پانٹے کو خاموش رہنے کا اشانہ کیا۔ اس نے کرسی پر بینھ کر گاندھی کیپ سر سے اتاری اور اپنی چٹیا کو مرودھ مرودھ کر بیدڑ نور الحسن کی موچھوں کے مقابلے پر تاؤ دینے لگا۔

جب بھاگلپور کا اشیشن آیا تو بیدڑ نور الحسن ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہوئے۔ کمار اندر زائن سنگھ کے لیے ان کی ڈریپ ہیڈ یوک آئی ہوئی تھی۔ اور ست زائن پانٹے اپنے درجن بھر کتوں کے ساتھ ایک ویگن میں جم کے بینھ گئے جو کمار صاحب نے خاص اسی مقصد کے لیے بنوائی تھی۔ اس میں کتوں کے لیے الگ الگ سپرینگ دار نشیں تھیں، اور ہر سیٹ کے اوپر تانہ ہوا کے لیے جالی سے ڈھنیہ ہوئے گول گول سوراخ تھے۔ یہ ویگن کتوں کی سواری کے علاوہ راشریہ سوایم سیوک سنگ کے والنیٹروں کے لیے ملک ہتھیار پلاٹی کرنے کا فرض بھی سرانجام دیتی تھی، اور ہندو مسلم فسادات کے موقع پر مسلمان لڑکیوں کو اغوا کرنے کا کام بھی اسی سے لیا جاتا تھا۔

بھاگلپور کے ریلوے اشیشن پر مجھے لینے کے لیے وہاں کے گلکٹر مسٹر ایڈون ٹیری پریڈو (E.T.Prideaux) خود آئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے سیدھے اپنے بنگلے پر لنج کے لیے لے گئے۔ وہاں پر انہوں نے میرا تعارف ڈی آئی جی، ایس پی اور ڈی ایس پی سے کروایا۔ یہ سب انگریز افسر تھے اور غالباً میرا جائزہ لینے کے لیے گلکٹر کے ہاں جمع ہوئے تھے، کھانے کے بعد میں نے دفتر جا کر اسٹنٹ کمشنر کے عہدہ کا چارج سنبھالا، اور سول کلب کے ایک کمرے میں رہائش اختیار کر لی۔

اسٹنٹ کمشنر کا چارج لیتے ہی میں نوکر شاہی کے ایک ایسے خود ساختہ زندان خانے

میں محبوس ہو گیا، جس کی تھائی جیل میں عادی مجرموں کی کال کوٹھڑی سے بھی نیا وہ سمجھیں تھی۔ بھاگلپور کی آبادی ڈھائی تین لاکھ سے اور تھی۔ لیکن ضلعی انتظامیہ کے اوپر والے آٹھ دس افران اعلیٰ کوہو کے بیل کی طرح صرف اپنے ہی مخصوص دائرے میں چکر کائے پر مجبور تھے۔ سول لائے میں یہ ایک دوسرے کی ہمسایگی میں رہتے تھے، اور شام کو کلب میں جمع ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ ہی ٹینس، بلیرڈ یا بر ج کھیلتے تھے، باری باری سے ایک دوسرے کے لیے شراب کا آرڈر دیتے تھے، اور باہم موقع پا کر ایک دوسرے کے خلاف حسب توفیق چغلیاں بھی کھا لیتے تھے۔ وقت فوقة گھروں میں دعوتوں کا اہتمام ہوتا تھا، تو میزبان اور مہمان بھی یہی آٹھ دس خاندان ہوتے تھے۔ افران بالا کے اس چھوٹے سے حصے کا باقیمانہ دنیا کے ساتھ بس اتنا ہی رابطہ اور واسطہ تھا جتنا کہ ایک بہمن کو شودر کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

ضلع بھاگلپور کے اندر ہنی مضافات میں پندرہ میں ایسے انگریز خاندان بھی تھے، جو ایک ایک دو دو پشت سے وہاں آباد تھے۔ یہ لوگ اکثر نیل کا کاروبار کرتے تھے یا بڑی بڑی جاگیروں پر قارم بنا کر نفع بخش زمینداری چلاتے تھے۔ ان میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جنہوں نے کبھی خواب میں بھی انگلستان نہ دیکھا تھا، لیکن بات پر وہ ہندوستان کے مقابلہ میں ہوم لینڈ کے موسم، ہوم لینڈ کے دودھ، ہوم لینڈ کے مکھن اور ہوم لینڈ کی صفائی و نفاست کا حوالہ ایسی بے ساختگی اور چوب زیانی سے دیتے تھے گویا ابھی ابھی روڈ بار انگلستان کو عبور کر کے یہاں وارد ہوئے ہوں۔ مینے میں ایک بار یہ لوگ شاپنگ کے لیے شر آتے تھے، اور کلب میں بینہ کر سرگوشیوں میں ٹکٹر اور ڈی آئی جی اور ایس پی کو اپنے اپنے علاقوں کے سیاسی اور سماجی کوائف سے آگاہ کر جاتے تھے۔ کالے افروروں کو وہ اس قسم کی بات چیت کے لیے در خور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

مقامی باشندوں میں سے صرف دو ہندو بھاگلپور کلب کے ممبر تھے۔ ایک کمار اندر نزاں نگھے جو راشٹریہ سوایم سیوک سنگ کے صدر ہونے کے علاوہ ضلع کے بہت بڑے جاگیردار

بھی تھے۔ دوسرے مسٹر کمل دھاری لال۔ لال صاحب آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ سمجھے ہوئے وسیع المشرب رہیں تھے۔ یورپین ٹھاٹھ بانٹھ سے رہتے تھے اور میں میں ایک دو بار بڑے شاندار ڈنر دیا کرتے تھے۔ ان کی بیوی تو وفات پا چکی تھی، لیکن دو بیٹیاں رینکا اور تاما رہیں سلیقہ شعار اور خوش اخلاق میزبان تھیں۔ دونوں نے بچپن ہی سے لندن کے گرینس سکولوں میں تعلیم پائی تھی، اور انہیں عام طور پر رانو اور ٹونو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ لال صاحب کے ڈنر دراصل ضلع کی انتظامیہ کے لیے رابطہ عامہ کا واحد ذریعہ تھے۔ جب کبھی بھاگلپور میں امن عامہ کا کوئی عگین مسئلہ سراٹھا تھا تو مسٹر کمل دھاری لال بڑی موقع شناسی سے متعلقہ فریقین کو اپنے ڈنر پر مدعو کر لیتے تھے، اور رانو اور ٹونو کی خوشنگوار میزبانی کے ساتھ میں باہمی افہام و تفہیم کے کئی مشکل مرحلے طے ہو جاتے تھے۔

بھاگلپور کا کوئی مسلمان کلب کا ممبر نہیں تھا۔

ایک شام مسر پریڈو کلب میں آئے تو مجھے ایک طرف لے گئے اور بڑی راز داری سے کہنے لگے۔ ”کمشنر کی منظوری سے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کل سے تمہیں نتھہ گمرا کا اپیشل محسٹریٹ مقرر کیا جائے۔ وہاں پر رائے بہادر سیٹھ بدھی پرشاد ججھنجیا ایک سلک فیکٹری تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کی راہ میں روٹے انکا رہے ہیں۔ تمہارا کام ہے کہ سب رکاوٹیں دور کروتا کہ کمشنر جلد سے جلد فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھ سکے۔“

ساتھ ہی انہوں نے مجھے مقامی امن و امان کمل طور پر برقرار رکھنے کی تلقین کی اور اس سلسلے میں کمار اندر دیو زائن سنگھ اور سیٹھ بدھی پرشاد ججھنجیا کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی ہدایت بھی دی۔

نتھہ گمرا بھاگلپور شر کے ساتھ ملتی ایک گنجان آباد صنعتی علاقہ تھا۔ یہاں پر مارواڑی سیٹھوں کی کئی سلک اور سوتی کپڑے کی فیکٹریاں تھیں۔ کچھ عرصہ قبل سیٹھ بدھی پرشاد

جھنجھنیا نے وار فنڈ میں ایک لاکھ روپیہ چندہ دے کر رائے بہادری کا خطاب حاصل کیا تھا۔ اب وہ کمشز کے ہاتھوں اپنی نئی سلک فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھوا کر وار فنڈ میں ایک اور گراں قدر عطیہ کا اعلان کرنے والے تھے۔ اس لیے سب کو عجلت تھی کہ یہ کار خیر جتنی جلدی سر انجام پا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ سینھ صاحب نے نتھے مگر کے کاشت کاروں سے فیکٹری کے لیے نہیں خرید تو لی تھی، لیکن بستی گنگا میں ڈبکی لگانے کے لیے ایک منیچلے ہندو نوجوان نے بننے بنائے کام میں کھنڈت ڈال دی۔ اس نے ”کسان سانتا پرسد“ کے نام سے ایک انجمن بنا کر اعلان کر دیا کہ کسانوں کو دھوکہ دے کر نہیں اونے پونے داموں خرید گئی ہے، اور جب تک ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا، فیکٹری کی تغیر شروع نہیں ہو سکتی۔ شروع میں اس انجمن میں کچھ سکول کے لوئڈے، چند یکہ چلانے والے، دو چار پنواڑی اور کچھ اشیش پر مزدوری کرنے والے قلی شامل تھے۔

دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر وہ کانگڈ کی سیاہ جھنڈیاں لیے جلوس کی صورت میں نکلتے تھے اور گلی کوچوں کا چکر لگانے کے بعد اس قطعہ نہیں میں مینگ منعقد کرتے تھے جس کے گرد سینھ صاحب کے انجینئروں نے چونے کی لکیر کھینچ کر فیکٹری کی نشاندہی کی ہوئی تھی۔ دن بہ دن تماش بینوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، اور رفتہ رفتہ اپنے فرصت کے اوقات میں ہر قسم کے لوگ بڑے شوق سے جوق در جوq ان میشنگوں میں شامل ہونے لگے۔ سر شام فیکٹری کی نہیں والا قطعہ ”انقلاب زندہ باد“ ”مورکھ سینھ ناٹھ ہو“ ”ہندوستان چھوڑ دو“ ”نیتا جی ..... جے ہند“ جیسے انواع و اقسام کے نعروں سے گوئختے لگا۔ نمرے لگانے والوں میں اکثر کو یہ علم نہ تھا، کہ وہ کس غرض سے ان حرکات میں اس قدر زور شور سے حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن نعروں کی واہیئے کی طرح پھیلیتے گئی اور نتھے مگر کے مضائقات بڑی سرعت سے اس کی زد میں آنے لگے۔

نتھے مگر میں مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ اس لیے دو چار روز میں نے بڑی آزادی سے گھوم پھر کر وہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ روزوں کے دن تھے، می افطار ایک مسجد میں

کرتا۔ تراویح کے لیے کسی دوسری مسجد میں چلا جاتا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ جھگڑا تو سینہ کے ساتھ فیکٹری کی نین کا تھا لیکن نعرے بالکل سیاسی نوعیت کے لگ رہے تھے۔ اور خوف و ہراس بچارے مسلمانوں میں پھیلا ہوا تھا۔ ”ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ“ مسلمانوں کا فیکٹری کی نین سے کوئی واسطہ تھا نہ کانگریس کے سیاسی نعروں سے کوئی تعلق تھا۔ پھر بھی ان کے اذہان خوف اور خطرے کے ایک آہنی شکنے میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ دن بھر ان کے چہروں پر ہوائیاں سی اڑتی تھیں۔ اور سر شام وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ٹاریک گھروں کے کواڑ بند کر کے نتھے مگر کے گلی کوچوں سے بالکل غائب ہو جاتے تھے۔ رات کی تاریکی میں ایک دو چھکڑ بھی آتے تھے۔ کچھ مسلمان خاندان ان میں اپنا سامان لاد کر اور سمی ہوئی عورتوں اور ہر اسال بچوں کو سوار کر کے انہیں اندھیرے ہی اندھیرے میں بڑی خاموشی سے رخصت کر دیتے تھے۔ نتھے مگر سے، مسلمانوں کا یہ پر اسرار اخلاء دیکھ کر میں نے وہاں کے پولیس انپکٹر بشیش ناتھ تیواری سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بگلا بھگتا بن کر اپنی چھیلی ہوئی توند پر ہاتھ پھیرا، اور میری آنکھوں میں خاک جھونکنے کی بڑی بھونڈی سی کوشش کی۔ ”حضور“ بشیش ناتھ تیواری نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ”مسلمان لوگ آج کل رونہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد عید ہوتی ہے۔ یہ لوگ تھوار منانے کے لیے اپنے بال بچوں کے ساتھ رشتہ داروں کے ہاں جیا کرتے ہیں۔“

نتھے مگر کے مسلمان بڑی مظلوم الحال اور غریب لوگ تھے، میں نے پولیس انپکٹر سے دیافت کیا کہ ایسے مفلس انسان اپنے بال بچوں کے ساتھ چھکڑوں پر سامان لاد کر فقط عید منانے کی غرض سے اس قدر کثیر تعداد میں کماں جا سکتے ہیں؟“

”حضورا یہاں کا ایسا ہی دستور ہے۔“ انپکٹر نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا اور نتھے مگر کے مسلمانوں کے ساتھ اپنے جملہ فرانسیسی منصبی سے کلیتہ بری الذمہ ہو گیا۔

پولیس انپکٹر سے مایوس ہو کر میں نے براہ راست مسلمانوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ بیسیوں گھروں میں جا جا کر دیافت کیا، کہ وہ لوگ اس قدر پریشان کیوں ہیں

اور اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کے ساتھ تھے مگر کیوں چھوڑ رہے ہیں؟ مسجدوں میں بہت سے نمازیوں سے کرید کرید کر سوال کئے۔ لیکن سب کا بس یہی ایک جواب تھا، کہ بابو خطرہ ہے؟ کیا خطرہ ہے؟ کس سے خطرہ ہے؟ اس بات کی وضاحت کرنے پر کوئی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ ایک مسجد کے پیش امام نے مجھے صرف اتنا بتایا، کہ کوئی مسلمان کسی سرکاری افسر کے سامنے منہ کھولنے کی ہمت نہ کرے گا، کیونکہ انہیں یہ خوف بھی ہے کہ اگر انہوں نے سچ مجھ کھری کھری بات بیان کر دی تو مقامی پولیس انہیں فوراً شر انگلیز انواہیں پھیلانے کے الزام میں دھر لے گی۔

نتھے مگر کے مسلمانوں کو اس قدر بستہ پا کر ایک رات میں بھاگلپور کے یورش نور الحسن کے ہاں چلا گیا، اور ان سے درخواست کی کہ اس معہ کی عقدہ کشائی میں وہ میری رہنمائی فرمائیں۔ پہلے تو وہ بڑی دیر تک ٹال مثول کرتے رہے لیکن میرے مسلسل اصرار پر انہوں نے مجھ سے حلف لیا کہ اگر نتھے مگر میں کبھی کوئی انکواری ہوئی تو میں ہرگز ہرگز کسی کو یہ نہ بتاؤں گا کہ مجھے کوئی معلومات یورش نور الحسن سے بھی حاصل ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی خوشی سے حلف اٹھا کر انہیں یقین دلایا کہ کسی جگہ کسی صورت میں ان کا نام کبھی نہ آئے گا۔

میری یقین دہانی سے مطمئن ہو کر یورش صاحب نے اپنی انگریز یووی کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ ڈرائیک روم کی کھڑکیاں اور دروازے بند کئے اور میرے کان کے پاس منہ لا کر ہلکی ہلکی سرگوشیوں میں بتایا کہ پچھلے پندرہ برس سے یہ رواج چل نکلا ہے کہ نتھے مگر میں جب کوئی نئی فیکٹری تعمیر ہونے لگتی ہے تو اس وقت وہاں پر ایک آدھ ہندو مسلم فاد ضرور ہوتا ہے۔ سینھ صاحبان ہندو کاشت کاروں سے فیکٹری کے لیے نہیں کا سودا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ قیمتیں بڑھانے کے لیے کسانوں سے ابھی ٹیکش شروع کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ ابھی ٹیکش سیاسی رنگ پکڑ لیتی ہے۔ اس مرحلے پر بھاگلپور کی راشٹریہ سویم سیوک سنگ کا صدر کمار اندر دیو نرائن سنگھ سیٹھوں سے منہ مانگی رقم

وصول کرتا ہے اور اس کا سیکرٹری ست زائن پانڈے اپنے مسلح غنڈے مسلمانوں پر چھوڑ کر ہندو مسلم فساد کروا دیتا ہے۔ کچھ مسلمان مارے جاتے ہیں۔ چند مسلمان لڑکیاں اغوا ہو جاتی ہیں۔ ہندو کسان اپنی ابھی ٹیشن کو بھول کر بڑی وجمعی سے مسلمانوں کی لوٹ مار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ رات بھر کی لوٹ کھوٹ کے بعد علاقے پر کرفیو نافذ ہو جاتا ہے۔ کرفیو کی آڑ میں کمشنز یا کلکٹر فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھ دیتا ہے۔ سینئھ صاحبان گورنمنٹ کے کسی فنڈ میں خاطر خواہ عطیہ کا اعلان فرماتے ہیں اور اس طرح نتھہ نگر میں بڑی خوش اسلوبی سے ایک نئی فیکٹری کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

”کیا اس بار بھی سینئھ بدربی پرشاد جنجنخیا نے کمار اندر دیو زائن سنگھ کے ساتھ کوئی ساز باز کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

بیرسٹر نور الحسن نے اپنے بند ڈرائیگ رومن میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، اور پھر اپنے ہونٹوں کو عین میرے کان کے ساتھ ملا کر آہستہ سے بولے۔ ”سننے میں آیا ہے کہ اس بار پچھاں ہزار روپے پر سودا طے ہوا ہے۔“

اگلا سارا دن میں نے بھاگلپور کلکٹریٹ کے ریکارڈ روم میں صرف کیا۔ پچھلے دس برس کے دوران نتھہ نگر میں جتنی نئی فیکٹریاں گلی تھیں، ان سب کی فائلیں نکال کر پڑھیں۔ واقعی بیرسٹر نور الحسن کی بات حرف بہ حرف صحیح تھی۔ ہر فیکٹری کی بنیاد ہندو مسلم فساد پر کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ان فسادات کے سلسلے میں نہ کہیں کمار اندر دیو زائن سنگھ کا نام آتا تھا، نہ ست زائن پانڈے کا۔ بلکہ پولیس اور مجسٹریٹوں کی تحقیقاتی رپورٹوں میں بالاترزاں مسلمانوں ہی کو مورد الزام ٹھہرا�ا گیا تھا۔

نتھہ نگر میں کچھ مزید تحقیقات کے بعد ایک روز میں نے رائے بہادر سینئھ بدربی پرشاد جنجنخیا کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ رائے بہادر بادای سلک کی شیروانی اور سفید براق دھوتی میں ملبوس، زری دار گپڑی پہنے اور ماتھے پر ڈیڑھ دو انج لانا بانپ کے پتے کی شکل کا تلک لگائے خراماں خراماں تشریف لائے اور کسی پر بیٹھتے ہی انہوں نے سرکار والا مدار

کے ساتھ اپنی خاندانی وفاداری پر ایک طویل تقریر جھاڑ دی۔

میں نے حکومت کے ساتھ ان کی خیر سگالیوں اور وفا شعرا یوں کی جی بھر کر تعریف کی، اور ساتھ ہی کہا۔ ”سینھ صاحب“ آپ اپنے وقت کے حاتم طائی بھی تو ہیں۔ کار ہائے خیر میں آپ کے فیاضانہ چندوں کی شریت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔“

میری اس بات پر سینھ معاً محتاط ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کے دل میں یہ خطرہ ابھرا کہ اس تمہید کے بعد غالباً میں ان سے کسی فند کے لیے چندہ مانگنے والا ہوں۔ اس لیے حفظ مانقدم کے طور پر پڑھ بولے۔ ”اے جناب کماں کے حاتم طائی۔ دن رات کوہو میں جت کر نکلا کماتے ہیں۔ جب کبھی پرماہما کی دیا ہوتی ہے تو حضور لوگ کی سیوا بھی کر لیتے ہیں۔ آج کل ہاتھ بڑا تگ ہے۔ اس فیکشہ کے جھنجھٹ نے سارا کاروبار ٹھپ کر دیا۔“

”سینھ جی، آپ کا ہاتھ کب تگ ہوتا ہے۔“ موقع پا کر میں نے ترب کا پتا پھینکا۔

”ابھی تو آپ نے کمار اندر دیو زائی نگھ کو پچاس ہزار روپے کا دان دیا ہے۔“

یہ سنتے ہی سینھ صاحب کو ایک جھٹکا سالگا۔ ان کے ہونٹ خشک ہو کر یوں پھٹپھڑانے لگے، جیسے چڑیا کا بچہ اٹھے سے نکل کر نہیں پر گر پڑتا ہے، اور بڑی بے بسی سے سک سک کر سانس لینے کے لیے چونچ کھوتا ہے۔

”آپ پریشان کیوں ہو گئے، سینھ صاحب؟“ میں نے اپنے لمحے میں ذو معنی طنز بھر کر کہا۔ ”کمار اندر دیو زائی نگھ بڑے نیک آدمی ہیں۔ وہ آپ کا روپیہ بڑی ایمانداری سے اسی کار خیر میں لگائیں گے جس کے لیے آپ نے دان دیا ہے۔“

رائے بہادر سینھ بدربی پرشاد جھنجھنیا کے منہ میں مصنوعی دانتوں کا جڑا کسی قدر ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اپنے پوپلے منہ سے اسے سنبھالتے ہوئے انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی، تو میں نے بڑی بے رخی سے انہیں روک دیا۔

”رائے بہادر، اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔“ میں نے رکھائی سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

رائے بہادر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے گھورا۔ وہ طوعاً و کہاً کری کے بازوؤں کا سارا لے کر کھڑے ہوئے، تو ان کی پتلی پتلی نانگوں پر دھوتی کے پلے ادھ مونی مرغی کے پروں کی طرح پھرپھرا رہے تھے۔ ان کی زری دار گپڑی بھی بے ترتیبی سے ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی، اور مصنوعی دانتوں کا جڑا بل جانے کی وجہ سے الائچی اور باداموں کا لعاب جنمیں وہ عرصہ سے چبا رہے تھے منہ کے ایک کونے سے پان کی پیک کی طرح بے اختیار بننے لگا تھا۔

رائے بہادر نے جوں توں کر کے الائچی اور باداموں کے لعاب کا ایک لمبا سا گھونٹ نگلا، اور بڑی لجاجت سے بولے۔ ”حضور“ میں آپ کا داس ہوں۔ آپ نے جس سیوا کے لیے مجھے بلایا تھا، اس کا حکم دیں، میں ہر طرح حاضر ہوں۔“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”رائے بہادر، کمار اندر دیو زائن سنگھ کو پچاس ہزار کا دان دے کر آپ نے جو سیوا کرنی تھی، وہ تو کہہ چکے ہیں۔ اب آپ گھر جا کر شانتی سے سکھ کی نیند سوئیں۔“

میری اصلی بات سنی ان سنی کر کے سینھے صاحب جاتے جاتے دروازے میں رکے، اور پکار کر ایک بار پھر اپنی وہی پرانی رٹ لگائی۔ ”حضور“ میں آپ کا داس ہوں، آپ جس سیوا کا حکم دیں گے، میں اس کے لیے حاضر ہوں۔“

اگلے روز میں نے کمار اندر دیو زائن سنگھ کو اپنے دفتر میں بلایا۔ انہوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ اور کہلوا بھیجا کہ شام کو وہ کلب میں آ ہی رہے ہیں۔ جو بات کرنی ہو وہیں کر لی جائے۔

شام کے وقت کمار اندر دیو زائن سنگھ کلب تشریف لائے۔ ایک ہاتھ میں وہ سکلی کا گلاں اٹھائے وہ بڑے طمطراق سے میری طرف لپکے اور لمک لمک کر بولے۔ ”جناب استاذ کمشنر بہادر، آداب عرض ہے۔ آج کل بڑی بڑی طلبیاں ہو رہی ہیں۔ مجھے بندہ حاضر ہے۔ فرمائیے کیا حکم ہے؟“

پہلے تو میں نے ان کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ لیکن جب دوسری بار انہوں نے اسی طرح بلند آہنگی سے اپنی موجودگی کا اعلان کیا، تو میں نے خفک سا جواب دیا۔ ”مسٹر سنگھ“ میں دفتر کی باتیں دفتر ہی میں کیا کرتا ہوں۔ کلب میں سرکاری باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

کمار اندر دیو زائن سنگھ نے غٹ غٹ کر کے وہ سکی کا گلاس ختم کیا اور گردن جھٹک کر غصے سے بولے۔ ”باپ رے باپ“ یہ ٹھاٹھ ہیں جناب کے! ارے، شکر وار شکر وار آٹھ دن تو آپ کی سروس ہے، ابھی سے دماغ آسمان پر چڑھا ہوا ہے۔“

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کمار صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے بار میں گے اور وہ سکی کا ایک تانہ گلاس بھروا کے لائے۔ میرے سامنے کھڑے کھڑے انہوں نے دو تین سانس میں گلاس خالی کیا اور گرج کر بولے۔ ”اسٹنٹ کمشنر بہادر کلب میں بات کرنے کے عادی نہیں۔ کمار اندر دیو زائن سنگھ کو دفتروں میں حاضری بھرنے کی عادت نہیں۔ اب بات بنے تو کیسے بنے؟“

”مسٹر سنگھ؟“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کل صبح دس بجے میرے دفتر میں تشریف لا سکتے ہیں۔“

کمار صاحب نے تھیکر و استہزا سے بھرپور بڑے زور کا ققہہ لگایا اور چھاتی پھلا کر بولے۔ ”آپ کا یہ خاکسار کمشنر اور کلکٹر سے نیچے کسی ٹٹ پونچنے دفتر میں نہیں جایا کرتا۔ یہ بات اب تک آپ کو معلوم ہو جانی چاہیے تھی۔“

کمار صاحب کو نظر انداز کر کے میں اٹھا، اور بلیڑ کھیلنے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کمار صاحب چیچ و تاب کھاتے چند قدم میرے ساتھ چلے۔ پھر رک گئے اور پکار کر بولے۔ ”مجھے غلطی سے سینھ بدربی پرشاد جھنجھنیا نہ سمجھ بیٹھنا۔ ہاں،

میرا نام کمار اندر دیو زائن سنگھ ہے۔ ہاں“

جس طرح کچھ مسلمان چپکے چپکے نتھے گر سے ہجرت کر رہے تھے، اسی خاموشی سے کچھ اور لوگ نتھے گر میں داخل بھی ہو رہے تھے۔ ان میں اکثریت کرتی جسموں والے

غیر مسلم لامھیاں کی تھی، جو ہر روز بردوان، در بھنگر اور مونگھیر کی طرف سے آ آ کر نتھے مگر میں خون کے کینسر کی طرح سرایت کر رہے تھے۔ پولیس انپکٹر بشیش ناتھ تیواری نے تو مجھے یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ یہ لوگ نتھے مگر کی فیکٹریوں میں کام کرنے والے چوکیداروں کے عزیز و اقارب ہیں جو ان سے ملنے ہر سال آتے جاتے رہتے ہیں، لیکن یہ سراسر جھوٹ تھا۔ اگر یہاں پر ان کے کوئی رشتہ دار ہوتے تو یہ کچھ نہ کچھ وقت تو ان کے ساتھ ضرور گزارتے۔ اس کے بر عکس یہ لوگ سدار لامھیاں، برچھے، بھالے اور گینتیاں اٹھائے سارا دن گلیوں اور بازاروں میں مڑ گشت کرتے تھے، اور سر شام چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر کھلی جگنوں میں منڈلیاں جاتے تھے۔ بھنگ گھونٹتے تھے۔ چرس اور گانجا پیتے تھے۔ ڈھولکیاں بجا بجا کر پوبی زبان کے نخش گیت گاتے تھے۔ نشے میں دھت ہو کر اچھلتے، کوڈتے تھے، ناپتے تھے اور ساری ساری رات اسی طرح دھما چوکڑی مچاتے رہتے تھے۔

ایک روز میں چند پولیس کا نشیل کے ساتھ بائیکل پر شر کا گشت کر رہا تھا تو دور سے دیکھا کہ ایک گلی میں ست زائن پانچے بندوقیں پنسے جھپٹا چلا جا رہا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چار پانچ لامھیاں تھے اور دو چوکیدار بندوقیں کندھے پر رکھے تیز تیز چل رہے تھے۔ میں نے بندوق والوں کو لکار کر روکا اور ان سے ان کا لائسنس مانگا۔ یہ ان کی اپنی بندوقیں تھیں اور نہ ہی ان کے پاس کوئی لائسنس تھا۔ میں نے بندوقیں ضبط کر لیں اور دونوں آدمیوں کو بغیر لائسنس کے اسلحہ رکھنے کے الزام میں کپڑ کر ایک سپاہی کے ساتھ تھانے بھجوا دیا۔

ساری رات تھانے میں بیٹھ کر میں نے نتھے مگر کے تمام لائسنسداروں کی فرست تیار کی جنیں بندوق یا رائفل یا ریوال اور رکھنے کی اجازت تھی۔ تمیں ہندوؤں کے پاس پچاس بندوقوں اور آٹھ پستولوں کے لائسنس تھے۔ صرف دو مسلمانوں کے پاس ایک ایک بندوق تھی۔ دونوں کے دونوں ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔

میں نے پولیس انپکٹر بشیش ناتھ تیواری کو ساتھ لیا اور راتوں رات ایک ایک لائسنس

ہولڈر کے گھر جا کر ان کے اسلحہ کا معاشرہ کیا۔ ہندو لانسنڈاروں کی سات بندوقیں اور دو روپالور غائب تھے۔ ان میں وہ دو بندوقیں بھی شامل تھیں جنہیں آج ہی میں نے سست زرائی پانٹے کے جلو میں جانے والے دو غیر مجاز مشنڈوں کے قبضہ سے چھین کر ضبط کیا تھا۔ لاپتہ اسلحہ کے متعلق ان کے مالکوں کے پاس بس ایک ہی بندھا بندھالیا پامال اور فرسودہ جواب تھا کہ صفائی یا مرمت کے لیے بھیجا ہوا ہے۔ کب بھیجا ہے؟ کس کے پاس بھیجا ہے؟ کس کے ہاتھ بھیجا ہے؟ کوئی رسید ہے؟ ..... ان سوالوں کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

لانسنڈاروں کی اکثریت بڑے بڑے سیٹھوں پر مشتمل تھی۔ ان کے اسلحہ کی جانچ پڑتاں کے سلسلے میں مجھے ان کی وسیع و عریض حوصلیوں کے کچھ اندرونی حصے دیکھنے کا موقع بھی میسر آیا۔ ایک چیز جو ان سب میں مشترک تھی وہ پوجا پانچھ کا کمرہ تھا۔ سنگ مرمر کے اس کمرے میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کے ساتھ کئی گھروں میں گاندھی جی کا بت بھی نصب تھا۔ ایک جگہ یہ بت سونے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اس کے پاس کئی چراغ جل رہے تھے۔ اور سامنے پھولوں سے لدی ہوئی چنگیر پڑی تھی جیسے ابھی ابھی کسی نے آرتی اتنا ری ہو۔

ایک شاندار حوصلی میں جب ہم پہنچے تو رات کے دو ڈھانچے بجے تھے۔ ایسے ناوقت پولیس انپکٹر کے ساتھ مجھے آتا دیکھ کر گھر کے ملازم گھبرا گئے۔ بوکھلاہٹ ہی بوکھلاہٹ میں وہ ہمیں والاں در والاں گھما کر حوصلی کے اندر ایک عجیب کمرے میں لے گئے۔ یہ ایک لمبا سا ہال نما کمرہ تھا جس میں کسی قسم کا کوئی فرنیچر نہ تھا۔ نین پر چاندی کا فرش تھا، اور طاقچے میں ایک مدھم اور میلی سی لاشیں جل رہی تھی۔ کمرے کے ایک سرے پر ایک بے حد موٹا سینٹھ گاؤں تکیے کے سارے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میں بائیس فٹ کے فاصلے پر کمرے کے دوسرے کنارے ایک اسی قدر موٹی سینٹھانی بالکل اسی طرح آس جائے بیٹھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف منہ کئے ”صم بکم“ یوں

بیٹھے تھے جیسے گیان دھیان میں مگن ہوں۔ دونوں کے عین سامنے چھت سے لوہے کی دو موٹی موٹی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ زنجیروں کے جو سرے سیئنھے اور سیٹھانی کے چوروں کے قریب آؤ رہا تھا، ان میں پیتل کے چمکدار گول گول ہینڈل لگے ہوئے تھے۔ یہ سارا سماں مجھے بڑا الف لیلوی سا نظر آیا۔ شاید کہ یہ زنجیریں سیئنھے کے پوشیدہ خزانوں کی کنجیاں ہوں اور میاں یوں اسی طرح اکڑوں بیٹھ کر ساری رات ان کی حفاظت کرتے ہوں۔ یا شاید یہ زنجیریں کھینچنے سے کمرے کے فرش میں پر اسرار سرگمیں کھل جاتی ہوں جو پولیس انپکٹر کے ساتھ مجھے نگل کر ایسے تھے خانوں میں پہنچا دیں گی جہاں سے ساری عمر کسی کو ہمارا نشان تک بھی نہ مل سکے گا۔ میرا ذہن کچھ ایسے ہی افسوں کی خیالات کے تانے بنے بن رہا تھا، کہ اچانک سیئنھے نے اپنے سامنے والی زنجیر کے ہینڈل کو دونوں ہاتھوں سے دبوچا اور اسے زور سے کھینچ کر ہاتھی کی طرح جھولنے لگا۔ کچھ دیر کی تگ و دو کے بعد جب وہ لشتم پشم ہانپتا کانپتا اپنی دو ٹانگوں پر ایستادہ ہو گیا تو یہ عقدہ کھلا کہ یہ پر اسرار زنجیریں اور اصل سیئنھے اور سیٹھانی کے موٹاپے کا سارا ہیں۔ وہ انہی کے ساتھ لٹک جھٹک کر بیٹھتے ہیں اور انہی کے ساتھ جھوول جھوول کر اٹھتے ہیں۔

اس سیئنھے کے پاس تین بندوقیں اور ایک روپالور کا لائسنس تھا۔ تین میں سے دو بندوقیں غائب تھیں۔ نمبروں کا جائزہ لینے سے منکشف ہوا کہ یہی وہ دو بندوقیں تھیں جو ست زائیں پانچ کے دو ساتھیوں سے ہم نے اسی روز اپنے قبضہ میں لی تھیں۔

میں نے ذرا سخت لبجے میں سیئنھے صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے اپنی دو بندوقیں غیر قانونی طور پر ست زائیں پانچ کے کس مقصد کے لیے دی ہیں؟ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے سیئنھے صاحب گندم کے بوئے کی طرح ٹیڑھے ہو کر لڑکے اور تھپ سے نہیں پر پھرکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ اب اس نے منه میں گھنگھنیاں ڈال کر بلا کی چپ سادھ لی اور میرے پے در پے سوالوں کے جواب میں گم سم بیٹھا فقط اپنی گول گول آنکھیں گھماتا رہا۔ میں نے پولیس انپکٹر کو حکم دیا کہ وہ سیئنھے کے خلاف آرمز ایکٹ آنکھیں گھماتا رہا۔

کی مناسب دفعہ کے تحت فوراً باضابطہ رپورٹ درج کرے۔ یہ سنتے ہی سینھ کی بیوی نے واویلا مچا دیا۔ اور اپنی زنجیر کے ساتھ جھول کر کھڑا ہونے کی سر توڑ کوشش میں لگ گئی۔

اس ساری کدو کاوش کے بعد میرے پاس اب تھے نگر کی اصلی صورت حال کے متعلق کافی قرائینی شادوت جمع ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں نے بڑی محنت سے گلکھر کے لیے ایک مفصل! اور مدلل رپورٹ لکھی کہ تھے نگر میں عنقریب ہندو مسلم فساد کا شدید خطرہ ہے۔ فساد کا منصوبہ ایک منظم سازش کا نتیجہ نظر آتا ہے، جس کا سراغنہ کمار اندر دیو زائیں سنگھ کا سیکرٹری ست زائیں پانڈے ہے۔ اس مقصد کے لیے سینھ بدربی پرشاو جھنجھنیا نے غالباً کمار اندر دیو سنگھ کو کچھ مالی امداد بھی ہے۔ بظاہر اس فساد کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ ہندو کسانوں کی حالیہ ایجی ٹیشن کا سخ سینھ جھنجھنیا کی سلک فیکٹری سے موڑ کر مسلمانوں کی لوٹ مار کی طرف پھیر دیا جائے۔ تھے نگر کے مسلمان بڑی بے بی سے یہ نوشہ دیوار پڑھ رہے ہیں۔ ان کی اکثریت بے حد خوفزدہ ہے۔ کچھ مسلمانوں نے ان خطرات کے پیش نظر اپنی مستورات اور بچوں کے دوسرا محفوظ مقامات پر بیچیج دیا ہے۔ تھے نگر میں بغیر کسی ظاہری وجہ کے اچانک بت سے خطرناک قسم کے غنڈوں کا جہنمگتا نمودار ہو گیا ہے۔ ان کی کچھ ٹولیوں نے نشے میں دھت ہو کر نماز تراویع کے دوران چند مسجدوں کے قریب ڈھول بجانے اور غل غپاٹھ مچانے کا وظیرہ بھی اختیار کر رکھا ہے۔ تھے نگر کے ہندو لائسنس ہولڈروں کی سلت بندوقیں اور دو روپیوال ان کی تحویل سے غائب ہیں۔ ان میں سے دو بندوقیں ایسے مشکوک کرداروں سے برآمد ہوئیں جو ست زائیں پانڈے کی قیادت میں تیز تیز قدم کہیں جا رہے تھے۔ اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ کسیں باقی کا لاپتہ اسلحہ بھی ست زائیں پانڈے کے ذریعہ شرپسند عناصر میں تقسیم نہ ہو گیا ہو۔ مقامی پولیس انپکٹر اور اس کا عملہ تھے نگر کی اس صورت حال سے حیرت انگیز حد تک لا تعلق اور غیر متاثر ہے۔ اس کی وجہ ان کی نااہلی اور بے

حی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ سب بڑے ہوشیار اور مستعد کارکن ہیں۔ لیکن فی الحال یہ الزام لگانا بھی مشکل ہے، کہ سازشی عناصر کے ساتھ ان کی کسی قسم کی سائنس گاٹنے ہے۔ ان سب کوائف کے مد نظر میں نے گلکٹر کی خدمت میں استدعا کی کہ مندرجہ ذیل اقدامات کو فوری طور پر بروئے کار لایا جائے۔

- نتهہ گنگر میں دفعہ ۱۳۲ کا نفاذ کر دیا جائے۔

- نتهہ گنگر کے تمام لائسنس ہولڈروں کا اسلجہ فوراً تھانے میں جمع کروا لیا جائے۔

- کچھ عرصہ کے لیے کمار اندر دیو زائن اور ست زائن پانٹے کا نتهہ گنگر میں داخلہ منعو قرار دیا جائے۔

- در بھنگر، برداں اور مونگھیر کی طرف سے آئے ہوئے لاٹھیالوں کے جتھوں کو منتشر کر کے نتهہ گنگر سے باہر بھیج دیا جائے۔

- مقامی پولیس کی امداد کے لیے ماڈنڈ ملٹری پولیس کا ایک دستہ فوری طور پر نقطہ گنگر کے تھانے میں تعینات کیا جائے۔

میرا گمان تھا کہ میری رپورٹ پاتے ہی گلکٹر میری معاملہ نہیں اور نفس شناسی کی داد دے گا اور میری سفارشات کو بغیر کنج و کاؤ قبول کر کے ان پر فوراً عملدرآمد شروع کر دے گا۔ لیکن سارا دن گزر گیا اور کسی کے کان پر جوں تک رینگنے کے آثار نمودار نہ ہوئے۔ شام گئے ایک چڑپا سی میرے پاس آیا اور پیغام دیا کہ کمشز صاحب اپنے بنگلے پر سلام بولتے ہیں۔

بیورو کسی میں بڑے افراد نے اپنے کسی ماتحت کو اپنے پاس طلب کرنا ہو تو چڑپا سیوں کے ہاتھ سلام ہی بھجوایا جاتا ہے۔

میں وعلیکم سلام کرنے کمشز کے ہاں پہنچا تو وہاں پر گلکٹر، ڈی آئی جی اور ایس پی بھی موجود تھے۔ چاروں کے منہ کسی قدر پھولے سے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی کمشز نے میری رپورٹ کے کاغذ زور سے میز پر پٹھے اور غصے سے کہا۔

”ہم نے تمہارے پرہ دیکھنے کی نہیں۔“

تم کس نوعیت کے قریب خیال میں بتلا ہو کہ اس روپورٹ میں خواہ مخواہ رائی پریت بنا لائے ہو۔“

ڈی آئی جی نے نیا وہ صاف گوئی سے کام لیا اور کہا کہ یہ روپورٹ مریضانہ ذہن کی پیداوار ہے۔ جس شخص کے اپنے ذہن میں فرقہ وارانہ تعصباً سماں ہوا ہو اسے ہر جگہ کے مسلمان ہر وقت خطرات ہی خطرات میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ایس پی نے فرمایا کہ تنهہ گنگر کی پولیس پر بے اعتمادی کا اظہار کر کے میں نے اس کی توہین کی ہے جس پر مجھے اس سے معافی مانگنی چاہیے۔

کلکٹر مسٹر پریڈو البتہ خاموش بیٹھے رہے۔

”سر“ میں نے کمشنر کو مخاطب کر کے کہا۔ ”تنهہ گنگر کی جو حقیقی صورت حال ہے۔ اس کا نقشہ میں نے بے کم و کاست آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب اس پر سنجیدگی سے غور کرنا آپ کا کام ہے۔“

اس بات پر کمشنر غصے میں آ کر آپ سے باہر ہو گیا اور گرج کر بولا۔ ”کیا تمہارا مطلب ہے کہ ہم صرف مسخروں کا جھنڈ ہیں اور تمہاری بعید از کار روپورٹ کے رطب و یاں پر سنجیدگی سے غور کرنے کی الہیت نہیں رکھتے؟“

کمشنر نے میری روپورٹ میری طرف چھینکی اور کہا۔ ”یہ نادر دستاویز تمہاری اپنی تحولی ہی میں رہے تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے فائل میں لگا کر تمہیں سارے دفتر کا نشانہ تفحیک بننے دیا جائے۔“

اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے تنهہ گنگر کے چارج سے بسکدوش کر دیا۔

اس میئنگ سے فارغ ہو کر جب میں اٹھنے لگا تو کمشنر نے پکار کر کہا۔ ”اور ہاں‘ کمار اندر دیو زائیں نگھے کے ساتھ خواہ مخواہ الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رائے بہادر بدربی پرشاد جھنجھنیا کو ہر اسال کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ان دونوں کے ساتھ نارمل تعلقات استوار رکھنا ہی مناسب ہو گا۔“

میں نے اپنی روپورٹ چکے سے جیب میں ڈالی اور پٹے پٹائے کتے کی طرح دم دا کر کمشنر

کی کوئی سے باہر چلا آیا۔ کلب تک پہنچتے پہنچتے میرے وجود میں خود اعتمادی کے سارے انڈے نٹ پھوٹ کر چکنا چور ہو گئے۔ خاص طور پر کمشنر اور گلشنر بڑے پڑھے لکھئے، عالم فاضل، جہاندیدہ، تجربہ کار اور منصف مزاج افر تھے۔ ان کے رد عمل کے پیش نظر مجھے نہ کر اپنے مشاہدے کی کوتاہی، اپنے فہم کی کمی اور نظم و نق کے معاملے میں اپنی شدید نااہلی پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اندر ہی اندر نہادت اور نجات کے پے در پے ریلوں نے مجھے کچھ ایسے احساس کرتی میں بتلا کر دیا کہ دو ایک روز میں کلب میں کسی سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت تک نہ کر سکا۔

بھاگلپور کلب ایک نہایت وسیع و عریض کھلے میدان میں واقع تھا۔ طلوع آفتاب سے قبل ہی اس میں انواع و اقسام کی رونق لگ جاتی تھی۔ ایک حصے میں شر کے نوجوان جسمانی ورزشوں کے کرتب دکھاتے تھے۔ دوسری طرف بھاری بھر کم لائے اور لالیاں وزن گھٹانے اور بھوک بڑھانے کا جتن کرتے تھے۔ ایک کہنہ سال پیپل کے کھوکھلے تنے میں شوہی مہاراج کی سورتی نسب تھی۔ عقیدت مند صبح سوریے اس پر سیندور، نکصن، پھول اور حلوہ پوری کے چڑھاوے بڑی فراوانی سے چڑھایا کرتے تھے۔ ایک جٹا دھاری منت بڑی پابندی سے ان چڑھاووں کو سمیٹ لیتا تھا، اور پھر سورتی کے سامنے بیٹھ کر پاٹھ آر بندہ کر دیتا تھا۔ اس کے ساتھ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کا ایک گروہ بھی آنکھیں بند کر کے پوچھا میں مستغرق ہو جاتا تھا۔ پھر کہیں دور پیچھے گھوڑوں کے ناپوں کی آواز آنا شروع ہو جاتی تھی۔ جوں جوں یہ آواز قریب آتی تھی، اس ماخول کی عبودیت کا ظلم نٹھنے لگتا تھا۔ جٹا دھاری منت کے علاوہ اور بھی بہت سے پچاریوں کی محیت میں گھوڑے کے ناپوں کی آواز بڑی شدت سے خلل انداز ہونے لگتی تھی۔ جب یہ آواز پیپل کے عین قریب پہنچ جاتی تھی تو منت جو دیر سے کن انگھیوں سے دور سے آتے ہوئے گھوڑوں اور ان کے سواروں کا جائزہ لے رہا ہوتا تھا، یہاں کیک ہری اوم ہری اوم کہتے ہوئے آنکھیں کھول کر اور آسن بدل کر بیٹھ جاتا تھا۔ کئی دوسرے پچاری بھی

گردنیں موڑ کر عبادت کا حق ادا کرتے تھے، اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان عربی النسل گھوڑوں کا نظارہ کرنے لگتے تھے جن پر رانو اور ٹونو ہر صبح اپنی مارنگ رائڈ کے لیے نکلا کرتی تھیں۔ رانو نے سرخ کارڈے کی پتلون اور زرد رنگ کا جمپر پہنا ہوتا تھا اور اپنی چچ در پچ زلفوں کو سمیٹ کر وہ بزر ریشم کے سکارف میں بر میوں کی طرح بڑی سمارٹ گرہ باندھ لیتی تھی۔ ٹونو برجس اور چیکدار رائندگ کوٹ پہنتی تھی۔ اس کے سر پر کاسنی مخل کی گول ٹوپی ہوتی تھی۔ جس کے نیچے سے اس کے سرکش بالوں کی لٹیں سنپولیوں کی طرح اس کے گالوں کو ڈستی رہتی تھیں۔ ان کے گھوڑے ایک ساتھ متانہ چال سے بھاگتے تھے۔ اور ان کے زیر و بم کے ساتھ فضا میں طرح طرح کے رنگیں غبارے بنتے اور بکھرتے تھے۔ جب وہ پیپل کے درخت کے پاس سے گزر جاتیں تو جٹا دھاری منت دویاہ آنکھیں موند کر بینہ جاتا اور دوسرے پچاری بھی سر جھکا کر از سر نو گیان دھیان میں مشغول ہو جاتے۔

پچاریوں کی آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا کرنے کے بعد رانو اور ٹونو کلب میں میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس رکتی تھیں اور چند لمحے خوش گپیاں کر کے اپنے گھوڑوں کو ایڈ لگا کر میدان کے دوسرے سرے پر کمشز کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔ بوڑھا کمشز بھی غالباً انہی کے انتظار میں اپنا پیلا ڈرینگ گاؤن پن کر صبح سوریے لان میں نکل آتا تھا، اور اپنے مالی کے ساتھ مل کر با غبانی کے شغل میں وقت گزارا کرتا تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے بڑا افسر تھا، اس لیے رانو اور ٹونو بھی اس کے ساتھ نیا وہ دیر باتیں کیا کرتی تھیں۔

نتھے نگر کی رپورٹ کے متعلق کمشز سے ڈانٹ کھانے کے چند روز بعد ایک صبح میں نے رانو اور ٹونو کے درشن کرنے کے لیے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی تو سامنے والا میدان بالکل خالی تھا۔ وہ پیپل تلے پچاریوں کی منٹلی تھی، نہ کسرتی نوجوانوں کا جہنمگنا تھا، نہ بھاری بھر کم لالوں اور ہانپتی ہوئی لا لیوں کی قطار تھی۔ کمشز کے لان میں بھی

کوئی چیلا ڈرینگ گاؤں گلاب کے پودوں پر جھکا ہوا دکھائی نہ دیتا تھا۔ سورج نکل آیا، لیکن رانو اور ٹونو کے گھوڑے بھی کسی جانب سے نمودار نہ ہوئے۔ میں تیار ہو کر اپنے دفتر پہنچا، تو کچھری میں بھی مقدمہ بازوں کا کوئی خاص رش نہ تھا۔ وکیل وکلاء بھی خال خال نظر آتے تھے۔ میرا پیشکار بھی غیر حاضر تھا۔ کچھ عرصہ بعد میرا کوٹ انپکٹر چند کاغذات لے کر آیا، تو اس نے مجھے بتایا کہ کل رات نتهہ گنگر میں ہندو مسلم بلوہ ہو گیا۔ اب نتهہ گنگر میں کرنفول اور بھاگلپور میں دفعہ ۱۳۲ نافذ ہے۔ اس وجہ سے کچھریاں بے رونق ہیں۔

نتہہ گنگر میں فساد کی خبر میرے دل نے اس طرح وصول کی جیسے ماہ صیام کا اولین رونہ دار ہال عید کو خوش آمدید کرتا ہے۔ میرے نفس کی ساری کینگی مسرت و انبساط کے تھپیڑوں سے جوش کھا کھا کر سمندر کی لطیف جھاگ کی طرح میرے وجود پر چھا گئی۔ یورو کسی کا بے نام ساپلا جو خفیہ طور پر میرے اندر ہی اندر پرورش پا رہا تھا، ایک دم انگڑائی لے کر جوان ہو گیا۔ اور دم اکڑا کر، چھاتی پھلا کر، تھوتحنی اٹھا کر باوے کتے کی طرح بے تحاشا بھوں بھوں کرنے لگا کہ ”دیکھا پھر؟“ میں نے تو پہلے ہی کما تھا.....”

نتہہ گنگر کی گلیوں میں خون تو نہتے مسلمانوں کا بھا تھا، لیکن اس فتح و نصرت کا سارا سرا میری انا فقط اپنے ہی سر باندھنے پر مصر تھی۔ مسجد میں تراویح پڑھتے ہوئے نمازیوں پر حملہ تو نشے میں چور مسلح لاثھیالوں نے کیا تھا، لیکن میرا پھولا ہوا نفس کچھ اس طرح دوں کی لے رہا تھا گویا یہ سب اس کے اپنے ہی بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ سرکاری اعلان کے مطابق اس فساد میں چار مسلمان شہید اور ایک لڑکی اغواہ ہوئی تھی۔ اس خبر سے مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ کمشٹر اور ٹکٹھر اور ڈی آئی جی اور ایس پی کے سر پر غرور کو نیچا دکھانے کے لیے تو مجھے اس سے کہیں نیا ہ کشت و خون کی ضرورت تھی۔

نتہہ گنگر کے اس ایک واقعہ نے میری ذات کو افسرانہ وقار کی بھٹی میں تپا کر یورو

کسی کی اس روایتی میں میں باضابطہ فٹ کر دیا جو حسد اور رقابت اور کشاکشی اور ضدا صدی کے تیل سے چلتی ہے اور جس میں انفاس اور الماک اور ناموس کا نقصان احساس کے پیانے سے نہیں ناپا جاتا، بلکہ چار قتل، ایک اغواء باہ نجمر زیاد، آئھ آتش روگیوں کا حساب جوڑ کر اعداد و شمار کے گوشواروں میں ڈھال لیا جاتا ہے۔

مجھے بڑی توقع تھی کہ جب کمشنر اور گلکھر اور ڈی آئی جی اور ایس پی کلب میں آئیں گے، تو میرے ساتھ آنکھیں چار کرنے سے شرمائیں گے اور کترائیں گے۔ لیکن یہ امید بھی نقش بر آب ثابت ہوئی۔ یہ حضرات بدستور کلب آتے تھے۔ نینس، بلیرڈ اور رم کھلیتے تھے۔ ”کوئی ہے؟“ ”کوئی ہے؟“ کے نعرے لگا کر وہ سکی اور جن اور دم منگواتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ حسب دستور ہی ہی ہا ہا کر کے ڈز کے وقت اپنے گھر روانہ ہو جاتے تھے۔

انہی دنوں ایک روز کمشنر نے نتھہ مگر کی متازعہ سلک فیکٹری کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا۔ رائے بہادر سینھ بدری پرشاد جھنجھنیا نے وار فنڈ میں ایک لاکھ روپے کا گراں قدر عطا دیا اور مقامی پولیس کی حفاظت میں فیکٹری کی تعیر کا کام بعنوان شائستہ شروع ہو گیا۔ نتھہ مگر کے فساد کی فائل تو بہت جلد داخل دفتر ہو کر طاق نیاں کی نہیں بن گئی لیکن میں اپنی مسترد شدہ روپورٹ کو بڑی احتیاط سے سینے سے لگائے بیٹھا رہا۔ ڈی آئی جی اور ایس پی تو نبٹا کم تعییم یافہ اور ثامی ٹاپ کے روایتی پولیس افسر تھے لیکن کمشنر اور گلکھر دونوں بڑے شائستہ، مہذب، باوقار اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ کمشنر بڑا سنجیدہ تاریخ دان تھا اور فرصت کے اوقات میں خوبصورت مصوری کرنے کا شوقین تھا۔ گلکھر فلسفے کا طالب علم رہا تھا، اور انسانی اور اخلاقی اقدار پر اس کی گھری نظر تھی۔ کیا صحیح انہیں اس بات کا ایمانداری سے یقین تھا کہ نتھہ مگر میں ہندو مسلم فساد کا خدشہ محض میرا فرضی وہمہ تھا؟ کیا پولیس کی روپورٹوں نے واقعی ان کی آنکھوں پر ایسی مضبوط پی باندھ دی تھی کہ انہیں اس فساد کا کوئی شائیبہ تک بالکل نظر ہی نہ آتا تھا؟ کیا

کچھ ایسی دوسری مصلحتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ اس صورت حال کو جان بوجھ کر انداز کر رہے تھے؟

کچھ عرصہ تو یہ سوالات کائیں کی طرح میرے دل میں کھلتے رہے۔ لیکن جیسے جیسے انگریز افسروں کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ بڑھتا گیا، ویسے ویسے ان سوالوں کے جواب بھی خود بخوبی مجھے ملتے گئے۔

انگریز افسر اپنی ذات میں کتنے ہی مذب اور متبدن اور منصف مزاج اور بااخلاق کیوں نہ ہوں، ان کے سامنے ایک اور فقط ایک نصب العین ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ ہر حالت میں ہر طرح سے ہر سطح پر برٹش راج کا انتظام اور بالا دستی برقرار رہے۔ جس طرح جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے، اسی طرح اس مقصد کی برآوری میں بھی ان کے لیے سب کچھ حلال تھا۔ ذاتی تہذیب و تہمن، انصاف پسندی اور اخلاقی اقدار کو اس بنیادی نصب العین کے راستے میں حائل نہ ہونے دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب نتھہ مگر کا واقعہ رونما ہوا، اس وقت بر صغیر میں برٹش حکومت طرح طرح کے خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ مغرب میں ہٹلر کی فوجیں سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھیں۔ مشرق میں جاپان فتح و نصرت کے ڈنگے بجا تا برا تک آ پہنچا تھا۔ ہندوستان میں بھی کانگریس کے تیور بری طرح بدلتے ہوئے تھے۔ ان حالات میں بھاگلپور کے انگریز افسروں کو اپنے راج کی مصلحت اسی میں نظر آتی تھی کہ وہ ہر قیمت پر مقامی با اثر ہندوؤں کی خوشنودی اور خیر سکالی اپنے ساتھ رکھیں۔ اسی وجہ سے وہ نہ تو کمار اندر زائن سنگھ کے خلاف کوئی بات سننے پر تیار تھے کیونکہ وہ راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ کا سربرا آورہ لیڈر تھا۔ اور نہ ہی وہ ست زائن پانڈے پر کسی شک و شبہ کی گنجائش دیکھتے تھے۔ کیونکہ وہ لا تعداد ہندو غنڈوں کے لاو لشکر کا سرغناہ تھا۔ اگرچہ رائے بہادر بدربی پرشاد جنجنھنیا اور دوسرے سینھ اپنے اپنے گھروں میں بڑی عقیدت سے گاندھی کی مورتیاں سجا سجا کر رکھتے تھے، اور غالباً ان کی پوجا بھی کرتے تھے، لیکن وہ علی الاعلان سرکار والا مدار کی حلقة بگوشی کا دم بھرتے تھے اور وار فنڈ میں بڑی فیاضی سے چندہ بھی دیتے تھے۔ اس لیے وہ بھی فی الوقت انگریز افسروں

کی آنکھ کا تارا اور مقامی انتظامیہ کے راج دلارا تھے۔ ہندو اکثریت کی خوشنودی پر مسلمان اقلیت کی جان و مال اور عزت و ناموس کی قربانی رموز سلطنت کا ایک اونٹی سا تقاضا تھی، جس میں ایک نتھہ مگر چھوڑ بیس نتھہ مگر بھی بڑی آسانی سے سامنے کیے جاتے تھے۔ لیکن ایک برس کے اندر اندر جب ہوا کا سخ بدلا، تو انگریز کی حکمت عملی نے بھی گرگٹ کی طرح اپنا رنگ تبدیل کر لیا۔ جولائی ۱۹۳۲ء میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے واروہا میں اپنا وہ ریزولوشن پاس کیا جسے عرف عام میں ”ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک“ (Movement) کہا جاتا ہے۔ اس میں مطالبہ کیا گیا تھا، کہ برطانیہ ہندوستان کا اقتدار فوراً ہندوستانیوں کے حوالے کر کے حکومت چھوڑ دے۔ ورنہ اقتدار زردستی چھیننے کی غرض سے گاندھی جی کی سرکردگی میں ایک زردست عوای تحریک چلائی جائے گی۔ بظاہر اس تحریک کو عدم تشدد اصولوں کی بنیاد پر چلانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن گاندھی جی سمیت سب کانگریسی لیڈر ”Do Or Die“ (یعنی کریں گے یا مرن گے) کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ یہ نعرہ تشدد کا راستہ اختیار کرنے کے لیے ایک کھلی دعوت تھی۔

۷ اگست ۱۹۳۲ء کو بمبئی میں آل اعlia کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا، جس میں واروہا والے Quit India ریزولوشن کی توثیق ہونا تھی۔ اس شام میں ٹینس کھیل کر کلب میں اپنے رہائشی کمرے کی طرف آیا، تو برآمدے میں میرے کلکٹر مسٹر پریڈو کی بیوی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مزر پریڈو بڑی بنس کھو اور خوش اخلاق خاتون تھی، لیکن نتھہ مگر کے سانحہ کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں کسی قدر سرد مردی پیدا ہو چکی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آج رات ان کے ہاں ایک انتہائی اہم ڈر ہے۔ جس میں میرا شریک ہونا لازمی ہے۔ اس لیے وہ خود مجھے مدعو کرنے آئی ہیں۔

میں رات کے آٹھ بجے کلکٹر کے ہاں پہنچا، تو وہاں پر دو اور انگریز افسر بھی موجود تھے۔ ایک ایس پی، دوسرا ایک فوجی میجر جو کسی خاص ڈیوٹی پر بھاگلپور آیا ہوا تھا۔ کلکٹر نے شروع ہی میں یہ وضاحت کر دی کہ یہ ڈر دو اصل ایک Top Secret اپیشل کمیٹی

کا پہلا اجلاس ہے جس کے ہم چاروں افراد ممبر مقرر کئے گئے ہیں۔ اگر آل انڈیا کا انگریز ورکنگ کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس نے ”ہندوستان چھوڑ دو“ ریزولوشن کی توثیق کر دی تو کا انگریز کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر تمام بڑے بڑے لیڈروں کو فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد خطرہ ہے کہ بہت سے لیڈر زیر نہیں روپوش ہو جائیں گے، اور عوام کو تجزیبی کارروائیوں پر اکسائیں گے۔ یہ اپیشل کمیٹی ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔

مشرپریڈو نے مجھے مخاطب کر کے خاص طور پر نور دیا، کہ میں اس کمیٹی کے قیام اور کام کی اطلاع مشرٹی پی سنگھ کو ہرگز نہ دوں۔ مشرٹی پی سنگھ بھی آئی سی اس کے افراد تھے اور مجھ سے پانچ برس سینتر تھے۔ کچھ عرصہ قبل وہ انگریز افروں کی ناک کا بال تھے۔ نتھے نگر کا چارچ میرے ہاتھوں سے چھین کر انہی کے سپرد کیا گیا تھا۔ لیکن اب بدلتے ہوئے ماحول میں صورت حال بر عکس ہو گئی تھی۔

۸ اگست کو بمبئی میں آل انڈیا کا انگریز ورکنگ کمیٹی کے اجلاس نے Quit India قرار داد کی توثیق کر دی۔ گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اس موقع پر نہایت سخت تقریبیں کیں۔ ۹ اگست کی صبح کو کا انگریز کی جماعت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اس کے بہت سے سربرا آورده لیڈر ہر جگہ گرفتار ہو گئے۔ باقی سینکڑوں کارکن روپوش ہو کر زیر نہیں چلے گئے۔ اس کے بعد جگہ جگہ قتل و غارت، لوٹ مار اور دہشت انگریزی کا دور دور شروع ہو گیا۔ بھاگلپور کا ضلع اس طوفان کی لپیٹ میں بڑی شدت سے آیا۔ سب سے پہلے ہم نے دور دور بکھرے ہوئے اکا دکا انگریز خاندانوں کو جمع کر کے بھاگلپور کلب میں کیجا کیا۔ پھر ایک سینیر جہاز خالی کرا کے دیا کے عین مسجد ہمار میں گورا فوج کی نگرانی میں لنگر انداز کر دیا۔ تا کہ اگر مقامی حالات بالکل بے قابو ہو جائیں۔ تو انگریز افروں اور دوسرے انگریز خاندانوں کو اس میں بٹھا کر کسی محفوظ مقام کی طرف روانہ کر دیا جائے۔ دن رات کا انگریزی ہجوم جگہ جگہ ایسی

قیامت بپا کر رہے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے بھاگلپور کا شر ضلع کے دوسرے حصوں سے اور ضلع باقی صوبہ سے کٹ کر الگ تھلک ہے گیا۔ ہڑتاں کی وجہ سے کھانے پینے کا سامان کمیاب ہو گیا، اور کلب میں محصور انگریز خاندان صبح شام دال چاول پر گزارہ کرنے لگے۔ پندرہ روز بعد پنڈ سے ایک فوجی ہیلی کاپڑ نے آ کر کلب کی گراونڈ میں بنزیوں اور گوشت کے کچھ تھیلے پھینکے تو بہت سے بوڑھے انگریز مرد اور عورتیں دفور جذبات سے سک سک کر رونے لگیں۔

اس تحریک کے دوران بھاگلپور کے ضلع میں تشد و تحریب کاری کے جو واقعات رونما ہوئے، ان کی نوعیت کچھ اس طرح کی تھی۔

ایک پولیس کائنٹیبل کو جان سے مار کر اور یونین جیک میں لپیٹ کر درخت سے لٹکا دیا گیا۔

دو چوکیداروں نے ملازمت سے استغفار دینے سے انکار کیا تو ایک کی ناک اور دوسرے کے کان لکٹ ڈالے گئے۔

جگہ جگہ ریل کی پہزی کو اکھاڑنا، اور ریل کے پلوں کو سمار کر کے وہاں سرخ جھنڈیاں لگانا تا کہ ریل گاٹیاں حادثوں سے دو چار نہ ہوں۔

میلیفون اور ٹیلیگراف کی تاریں تاریں بار بار اور جگہ جگہ سے کاٹنا۔

ریلوے اسٹیشنوں، تھانوں، ڈاک خانوں، سرکاری دفتروں، کچھریوں، مال خانوں، خزانوں پر حملے کرنا، لوٹنا اور نذر آتش کرنا۔

عدالتوں میں گھس کر مجرمینوں کی کرسیوں پر قبضہ کر کے بیٹھنا اور مقدمات کی مسلوں کو درہم برہم کر کے ضائع کرنا۔

ریل گاڑیوں میں بغیر نکٹ کے سفر کرنا، اور جگہ جگہ اور بار بار گاڑی روکنے والی ہنگامی زنجیر کو کھینچنا۔

انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، مالیہ، آبیانہ اور دوسرا ہر قسم کا ٹیکس حکومت کو ادا کرنے سے انکار کرنا۔

ہر تالیں کرنا اور سرکاری سرپرستی میں چلنے والی دکانوں اور بدشی مال کی دکانوں اور گوداموں کو لوٹنا اور جلانا۔

کالجوں اور سکولوں کو نزدیکی بند کروانا۔

سرکاری ملازموں کا حقہ پانی بند کرنا۔

برطانوی نظام حکومت کے متوازی ہر سطح پر اپنا قوی نظام حکومت قائم کرنا اور چلانا۔

کاغذ کے نوٹوں کو رد کر کے صرف چاندی کے سکے اس طرح ذخیرہ کرنا کہ انگریزی کرنی کا نظام معطل ہو کر ناکام ہو جائے۔

بھاگلپور کے ضلع میں یہ تمام حرбے کسی نہ کسی حد تک کئی جگہ آزمائے گئے۔ لیکن رفتہ رفتہ تحریک کا زور ٹوٹ گیا اور حکومت کا پلہ بھاری رہا۔ اس ابھی ٹیشن میں پولیس اور فوج کی فائرنگ سے سارے صوبہ میں جتنے لوگ مارے گئے، ان کا صحیح شمار ناممکن ہے۔ جو گاؤں اس تحریک میں پیش پیش تھے، ان پر سزا کے طور پر اجتماعی جرمانہ Fine Collective بھی لگایا گیا۔ صوبہ بہار کے آٹھ ضلع کے ۲۰ ایمانات سے ۹ لاکھ ۷۸ ہزار روپے کی رقم اجتماعی جرمانہ کے طور پر وصول کی گئی۔ اس میں بھاگلپور ضلع کے ۲۳ گاؤں کا ایک حصہ ایک لاکھ روپیہ تھا۔

## • ایسہ ڈی او

بھاگلپور کے بعد مجھے ضلع "گیا" میں اورنگ آباد کی سب ڈویژن کا چارج ملا۔ گیا کے شر میں دو چیزیں قابل دید تھیں۔ ایک تو بدھوں کا قدیمی معبد تھا، جہاں ایک درخت کے نیچے تمپا کر کے مہاتما بدھ نے نروان حاصل کیا تھا۔ دوسرا عجوبہ روزگار ضلع کے ٹکلکٹر مسٹر والز تھے۔ یہ ایک آدھے کالے، آدھے گورے، نیم تیز، نیم بیڑر قسم کے اینگلو انڈین تھے، جن کا اپنا مشغله شراب پینا تھا، اور ان کی بھدی سی فربہ اندام منہ پھٹ میم صاحبہ کا فرض منصبی رشوت وصول کرنا تھا۔ اس کارخیر میں ان کی دو جوان بیٹیاں بھی اپنی ماں کا بڑھ چڑھ کر ہاتھ بیٹایا کرتی تھیں۔

اورنگ آباد پہنچ کر پہلی صبح میں ابھی سیاہی پڑا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کوئی دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ بڑی بڑی سفید موچھوں اور سفید بھوؤں والا ایک کالا بھینگ آدمی میرے سینے پر جھکا ہوا ہے اور میرا سر اٹھا کر اس کے نیچے ایک موٹی سی گدی ٹھونس رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ اورنگ آباد کا سب سے زیادہ فیشن ایبل جام ہے جو منہ اندھیرے بستر میں لیئے لیئے ایس ڈی او صاحب کی شیو کرنے آیا تھا۔ میں کچھ جیلہ بہانہ کر کے اسے ٹالنے لگا، تو میرا ہیڈ ارڈلی شبجو ناتھ تیواری جو کہیں آس پاس ہی منڈلا رہا تھا، کھٹ سے نمودار ہوا اور میری ڈھارس بندھانے لگا۔ "ہجور فکر نہ کریں، اس جگہ کا ایسا ہی دستور ہے۔"

پوپٹ رام جام نے شیو کرتے کرتے مجھے اطلاع دی کہ وہ خالص "گورمنٹی بالبر" ہے اور عرصہ بیس سال سے صاحب لوگوں کو موٹلنے میں مہارت رکھتا ہے۔ اس نے مجھے مسٹر آئف، مسٹر مارٹن، مسٹر جوائس، مسٹر فشر وغیرہ کے دینے ہوئے سرٹیفیکیٹ دکھائے، اور ساتھ ہی ساتھ مجھے اورنگ آباد کے منصف، سب نج، سب رجسٹرار، سب ڈپٹی ٹکلکٹر،

ڈی ایس پی، کورٹ انپکٹر، شی مஜھریٹ، سب اسٹنٹ سرجن، اسٹنٹ سول سپلائز آفیسر، سب انپکٹر آف سکوائر، گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر اور گرلز ٹول سکول کے ہیڈ مسٹریں کے جملہ خصائص و اطوار کے متعلق بھی بڑی تفصیلی معلومات بھم پہنچائیں۔

پہلے روز سارا دن شبجو ناتھ تیواری مجھے گردن سے کپڑے قدم قدم پر نئے ایس ڈی او کے لیے مقامی دستوروں کے چوکھے میں بڑی تنہی سے فٹ کرتا گیا۔ چند یوم بعد میں اسی دستور کی تعییل میں گلکھر سے ملاقات کرنے گیا، شر کے لیے روانہ ہونے لگا تو دیکھا کہ میری جیپ میں انڈوں سے بھرا ہوا ایک بڑا سا چھابا اور قین قین کرتی ہوئی مرغیوں کا ایک ٹوکرہ پہلے سے موجود ہے۔

میرے استغفار پر شبجو ناتھ تیواری نے بتایا کہ یہ بھی اس جگہ کا دستور ہے۔ جب کبھی ایس ڈی او صاحب بہادر گلکھر صاحب بہادر کی ملاقات کو جاتے ہیں، سو ٹھور انڈا اور بیس ٹھور مرغی لازمی اپنے سنگ لے جاتے ہیں۔ گلکھر میم صاحب بہادر کو اور نگ آباد کا مرغی انڈا بہت پسند ہے۔“

”یہ انڈے اور مرغیاں کہاں سے آئی ہیں؟“ میں نے دیافت کیا۔  
”بجھو سب ڈپٹی گلکھر بابو نے تھانوں کی باریاں لگائی ہوئی تھیں۔ آج تھانہ اوبرا کی باری تھی۔“ شبجو ناتھ تیواری نے وضاحت کی۔

میں نے سب ڈپٹی گلکھر کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھایا، اور انڈوں اور مرغیوں کی کھیپ لے کر تھانہ اوبرا پہنچا جو اورنگ آباد سے پندھہ بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس وقت تھانیدار صاحب ماش کروا کر لگوٹ باندھے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے اور دو حوالاتی کنوں سے بالٹیاں بھر کر ان کے سر پر ٹھنڈے پانی کی دھاریں چھوڑنے میں مصروف تھے۔ ایک سپاہی ان کے لیے دودھ گرم کر رہا تھا اور چند دسمائی جو اپنی شکایتوں کی رپورٹ درج کروانے آئے تھے، ایک طرف دھول میں بیٹھے گھیاں مار رہے تھے۔  
مرغیاں اور انڈے واپس کرنے میں ہمیں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ تھانیدار نے

یہ رسد اوبرا کے ایک بنئے سے حاصل کی تھی جس کے پاس مٹی کے تیل کا ڈپو تھا۔ ہم نے اس بنئے کو تھانے طلب کیا، تو وہ گھبرا گیا کہ شاید کچھ انٹے گندے نکلے ہوں یا مرغیاں خاطر خواہ طور پر فربہ نہ تھیں۔ اس لیے حفظ ماقبلہ کے طور پر وہ اپنے ساتھ گرم گرم دودھ کی ایک گڑوی اور تانہ مٹھائیوں کا ایک تحال بھی لیتا آیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرا مہ کلکٹر صاحب بہادر کے لیے انٹے اور مرغیاں فراہم کرنے کے علاوہ اوبرا آنے والے سرکاری افسران کی خاطر و مدارت کا فریضہ بھی تھانے کی طرف سے اسی بنئے کے پرداز تھا۔ اس خدمت گزاری کے عوض سے اپنے ڈپو میں مٹی کا تیل بلیک کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ وہ تیل میں ملادٹ بھی جی بھر کرتا تھا۔ دام بھی من مانے وصول کرتا تھا۔ اور ذخیرہ اندوڑی کے کاروبار میں بھی یہ طولی رکھتا تھا۔ تھانے میں اس کے خلاف ہر وقت چند روپرٹیں زیر تفتیش رہتی تھیں، جنہیں تھانیدار تنگی تکوار کی طرح وقتہ فوقہ اس کے سر پر لکھتا رہتا تھا، تا کہ بنئے کا جذبہ خدمت کسی آن بھی سرد نہ ہونے پائے۔

تھانے کے ریکارڈ سے میں نے بنئے کے خلاف تین "زیر تفتیش" شکایتوں کو برآمد کیا اور سب ڈپٹی کلکٹر سے کہا کہ وہ ان کا جائزہ لے کر باقاعدہ کارروائی کا آغاز کرے۔ وہ کافذات سمیٹ کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر کے بعد میں اچانک سب ڈپٹی کلکٹر سے کوئی بات پوچھنے وہاں گیا، تو وہ دونوں پاؤں میز پر پارے بنئے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا، اور ساتھ ہی ساتھ اس کے لائے ہوئے دودھ اور مٹھائیوں پر بھی بڑی خوش ملی سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

مرغی، انڈا، دودھ، وہی اور مٹھائیوں کی فراہمی کے علاوہ اوبرا کا تھانیدار اور بھی کئی لحاظ سے ہر فن مولا تھا۔ ایک دفعہ اس کو ہمراہ لے کر میں ایک نہایت دور افراہ علاقہ کے دورے پر گیا۔ یہ مقام کمکھیوں اور چھرروں کے لیے مشور تھا، اس لیے ہم دونوں اپنی چھر دانی کے ساتھ لے کر گئے تھے۔ رات کو ہم دونوں نے جس چھوٹے سے رستہ ہاؤس میں قیام کیا، وہاں چارپائیاں تو تھیں لیکن چھر دانیاں لگانے کے لیے کسی قسم

کے ڈنڈے موجود نہ تھے۔ مجبوراً چھر دانی لگائے بغیر میں سامنے والے برآمدے میں لیٹ گیا، اور تھانیدار نے اپنی چاپائی پچھلے برآمدے میں بچھالی۔ لیتتے ہی مزر کے دانوں کی طرح موٹے موٹے چھروں نے چاروں طرف سے زردست یورش کر دی۔ وہ قطار در قطار پیس پیس کرتے ہوئے آتے تھے اور اس قدر بے رحمی سے کاشتے تھے جیسے کوئی دہکتے ہوئے انگارے چمٹے سے اٹھا اٹھا کر مسل رہا ہو۔ چھروں کے حملوں سے میرا تو برا حال ہو رہا تھا، لیکن عقبی برآمدے سے برابر تھانیدار کے پر سکون خراثوں کی آواز آ رہی تھی۔ آدمی رات کے قریب میں نے دبے پاؤں اٹھ کر اس کی طرف جھانا کا تو دیکھا کہ تھانیدار صاحب کی چاپائی پر ان کی چھر دانی بڑی آن بان سے تی ہوئی ہے اور چار مقامی چوکیدار اسے چاروں کونوں سے تھامے بالکل بے حس و حرکت پھر کے ستونوں کی طرح ایستادہ ہیں۔

فرض شناسی اور خوش تدبیری کے باب میں رفع گنج کا تھانیدار بھی اپنی مثال آپ تھا۔ رفع گنج بڑا قصبہ تھا اور وہاں کھاتے پیتے مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ ان دونوں صوبہ بہار کے ادبی حلقوں میں حضرت شفقت عماو پوری کے کلام کا خوب چرچا تھا۔ ان کی رباعیوں کا ایک مجموعہ شائع ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شفقت رفع گنج ہی میں رہتے ہیں تو دل میں ان کی نیارت کا شوق پیدا ہوا۔ ایک روز رفع گنج کا تھانیدار اور نگ آباد آیا ہوا تھا، میں نے اس سے کہا کہ میں اگلے روز اس کے تھانے کا معاونہ کرنے آ رہا ہوں۔ شامت اعمال سے میں نے اتنا اور بھی کہہ دیا کہ رفع گنج میں ایک صاحب شفقت عماو پوری رہتے ہیں۔ میرے پہنچنے تک وہ ان کا اتاہ پتہ معلوم کر رکھے۔ بس اب کیا تھا، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ راتوں رات پولیس کے سپاہیوں نے شفقت صاحب کا سراغ لگایا اور نصف شب کے قریب انہیں کشاں کشاں لا کر تھانیدار صاحب کے روپو پیش کر دیا۔ جب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ شفقت صاحب کے میرے ساتھ کوئی ذاتی تعلقات نہیں ہیں، بلکہ وہ مجھے جانتے نہیں

نہیں تو تھانیدار نے بڑی تفصیل سے ان کی ولدیت، جائے سکونت، ذریعہ معاش، سیاسی رجحانات اور دیگر کوائف کا اندر اج کر کے ایک فائل کھولی اور تحریری طور پر انہیں اگلی صبح طلوع آفتاب کے وقت دویابہ تھانے میں حاضر ہونے کا پابند کر دیا۔

اگلے روز دوپہر کے قریب تھانے کی انپکش سے فار ہو کر میں نے تھانیدار سے دیافت کیا، کہ کیا انہوں نے معلوم کر لیا ہے کہ شفق صاحب کماں رہتے ہیں۔  
”حاضر حضور“ تھانیدار صاحب نے ائینش ہو کر جواب دیا اور ایک سنتری کو زور سے پکار کر کہا۔ ”سخن سپہنخ کو ترت حاضر کرو۔“

آنٹا فناً ایک طرف سے دو تین ساپھیوں کے نزغے میں مجرموں کی طرح گھرے ہوئے ایک سفید ریش، ضعیف البدن بزرگ نمودار ہوئے۔ انہوں نے نیلے چار خانے کا تبند اور لمبا سفید کرتہ پہنا ہوا تھا۔ سر پر ممل کی دوپلی ٹوپی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے نہیں نکل گئی۔ شرم و ندامت کے مارے میرا جی چاہتا تھا کہ میں شفیق صاحب سے آنکھیں چار کئے بغیر ہی وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ میں ڈرتے ڈرتے اٹھا اور آگے بڑھ کر سلام کیا۔ شفق صاحب کو ٹھلے ساعت کا عارضہ تھا۔ اس لیے میرا سلام انہیں سنائی نہ دیا۔ تھانیدار لپک کر آگے بڑھا، اور اپنا منہ ان کے کان کے پاس لا کر زور سے چیخا۔ ”ابے سخن جی، ایس ڈی او صاحب بہادر ہیں، سلام کرو۔“

شفق صاحب نے فوراً حکم کی تعییل کی اور بڑے سیلے سے جھک کر مجھے سلام کیا۔ مجھ پر گھڑوں پانی تو پہلے ہی پڑا ہوا تھا۔ اب تو میں بالکل غرق ہو گیا۔ شفق صاحب کو جیپ میں بٹھا کر انہیں ان کے گھر لے گیا۔ بڑی منت سماجت سے اصلی ماجرا سنایا اور ”اویلی دنیا“ کے چند پرچے ان کی نذر کئے جن میں میرے کچھ افسانے چھپ چکے تھے۔ جب شفق صاحب کو تھانیدار کی حماقت اور میری بے گناہی کا یقین ہو گیا تو وہ مسکرائے اور فرمایا۔ ”گنجے کے ناخنوں کی طرح اب تو یہ دعا بھی مانگنا چاہیے کہ خدا ایس ڈی او کو ادب سے ملنے کا شوق نہ دے۔“

اس حادثہ کے بعد میں جب کبھی شفق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے ہمیشہ شفقت ہی فرمائی۔ ایک بار میں ان کے ہاں پہنچا، تو وہاں ایک ہندو کوئی بھی بیٹھے تھے۔ شفق صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ ہندو کوئی نے بھی ترجمہ کے ساتھ اپنی چند کوتائیں پڑھیں۔ اس کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئے اور بولے۔ ”اچھا، اب آپ بھی کچھ بکھئے۔“

کوئی صاحب کے اس بے تکلفانہ انداز پر میں کچھ حیران ہوا تو شفق صاحب نے ہنس کر فرمایا۔ ”آپ برا نہ مانیں۔ ان اطراف کے ہندی محاورے میں کہنا فرمانے کے متراوف ہے۔ بڑے بڑے جلوسوں سے معزز مقرر کو اسی اعلان کے ساتھ اسٹیج پر لایا جاتا ہے کہ اب ہمارے ماں بکتا اسٹیج پر پدھار کر کھٹا بکھیں گے۔“

شفق صاحب ہی نے مجھے منتبہ کیا کہ شام کے وقت اگر کوئی میزبان یہ اصرار کرے کہ ناشتے تک رک جاؤ، تو اس انتظار میں ساری رات وہاں گزارنے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ بہار میں شام کی چائے وغیرہ کو بھی اکثر ناشتے ہی پکارا جاتا ہے۔

اورنگ آباد میں مجھے ابھی ایک برس ہی گزرا تھا، کہ پہنچ سے چیف سیکرٹری کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہم تمہارے کام سے مطمئن ہیں اور اب تمہیں اورنگ آباد سے بڑی اور نیا وہ اہم ڈویژن کا چارج دینا چاہتے ہیں۔ تین ماہ بعد سسرام کا چارج لے لو۔ اگر تین ماہ کا نوٹس کافی نہ سمجھو تو ہمیں لکھ بھیجو، تا کہ تبادلے کا وقت تمہاری سولت کے مطابق معین کر دیا جائے۔

سسرام کی سب ڈویژن آہ کے ضلع میں واقع تھی۔ اس ضلع میں مسلمانوں کے کئی خوشحال اور مقتدر خاندان آباد تھے۔ چند خاندانوں کے پاس بڑی نادر کتابوں، قلمی نسخوں اور قدیمی مخطوطات کے نہایت اعلیٰ کتب خانے تھے۔ ایک صاحب نے مجھے حضرت سید احمد شہید بریلوی، حضرت شاہ اسماعیل شہید، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی اور کئی دوسرے اکابر کے چند خطوط بھی دکھائے جو ان کے خاندان میں بڑی محنت اور محبت سے محفوظ چلے آ رہے تھے۔ ان نوادرات میں ایک تعویذ بھی تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران

کسی بزرگ نے مجاہدوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس تعویذ کے متعلق روایت تھی کہ اسے بازو پر باندھ کر جو شخص انگریزی فوج کا مقابلہ کرتا تھا، اسے کوئی گزند نہ پہنچتی تھی۔ اسی زمانے کا ایک اور تعویذ کھول کر گلاس کیس میں محفوظ کیا ہوا تھا۔ اس میں درج تھا۔

اللہ جی مہاراج  
ظفر کے سرتاج  
موا فرنگی تاراج

سسرام شر کے بیچوں بیچ جرنیلی سڑک یعنی گرینڈ ٹرنس روڈ گزرتی تھی۔ اس عظیم شاہراہ کا معمار شیر شاہ سوری قریب ہی ایک سنگاخ مقبرے میں آسودہ تھا۔ مقبرے کے ساتھ ایک وسیع و عریض پختہ تالاب تھا، جس کی سیڑھیوں پر سر شام اچھا خاصا میلہ سالگ جاتا تھا۔ ایک کنارے پر ہندو راجپوتوں کی نولیاں منٹلی جاتی تھیں۔ دوسری جانب پھر ان مسلمان پھرکڑا مار کر حقہ گڑھاتے تھے۔ ان دونوں گروہوں کی نگاہوں کا مرکز چند نوجوان ہوتے تھے، جو صاف سترے کپڑے پہنے، کنگھی پٹی سے آراستے، کافوں میں پھول سجائے، ناز نخرے دکھاتے، کولے مٹکاتے، پان چباتے تالاب کے درمیان والی سیڑھیوں پر انہکیلیاں کرتے ہوئے منڈلایا کرتے تھے۔

شیر شاہ سوری کے مقبرے کے ارد گرد جتنی زرعی اراضی تھی، وہ تقریباً سب کی سب سید الطاف حسین شاہ کے قبضے میں تھی۔ شاہ صاحب ایس ڈی او کے ہیڈ ارڈنی تھے۔ جو ایس ڈی او سسرام میں اپنا وقت پورا کر کے تبدیل ہوتا تھا، سید الطاف حسین شاہ جاتے جاتے اس سے اپنی خدمت گزاری کا واسطہ دے کر مقبرے کے ساتھ والی سرکاری نہیں کا کچھ حصہ بخشیش کے طور پر اپنے نام طویل ٹھیکے پر منتقل کروا لیتے تھے۔ چنانچہ اب ان کا ثمار شر کے اچھے خاصے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ پچھلے چند برس سے وہ اپنے وارڈ سے سسرام میونسپل کمشنر بھی بڑی باقاعدگی سے نامزد ہو رہے تھے۔ ایس ڈی او کے دفتر میں ایک کافینڈ نسل فائل تھی، جس میں تقریباً ہر ایس ڈی او کی

یہ پر زور سفارش درج تھی کہ جب سید الطاف حسین شاہ ہیڈ ارڈلی کے عمدے سے ریٹائر ہوں تو انہیں "خان صاحب" کے خطاب سے ضرور سرفراز کیا جائے۔

URDU4U.COM  
درمیانہ قد، چھپے دار کچھڑی داڑھی، کلف سے تانہ دم طرے والی ٹوپی، چست اچکن، اس کے نیچے وضعدار تو نہ، تگ پانچھوں کی سفید شلوار، کمر کے گرد اپنے عمدے کی پیٹی، کندھے پر شالی رومال، آنکھوں میں جلالی قسم کی سرخی، چہرے پر خشونت گزیدہ سی متانت۔

سید الطاف حسین شاہ پر نظر پڑتے ہی یوں لگتا تھا جیسے کوئی ہزاری دو ہزاری درجے کا سردار ابھی کسی مغلیہ دربار سے عتاب شاہی کا پروانہ لے کر برآمد ہو۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نے کبھی بھول کر بھی گزرناہ کیا تھا۔ گفتگو میں بھی اس کا انداز درباری، الفاظ ثقیل اور لمحہ گرجدار ہوتا تھا۔

اگر میں کبھی دفتر میں بیٹھا فائیلیں دیکھ رہا ہوتا تھا، اور کوئی ملاقاتی آ جاتا تھا، تو الطاف حسین شاہ انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیتا تھا، کہ "صاحب بہادر اس وقت امور سلطنت میں مصروف ہیں۔"

کچھری کا وقت قریب آتا تھا، تو وہ بربی راز داری سے سرگوشی کر کے مجھے خبردار کر دیتا تھا۔ "حضور، نزول اجلاس کی ساعت آگئی ہے۔"

ایک روز میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ الطاف حسین شاہ نے آہستہ سے کہا۔ "حضور والا کو امور سلطنت سے جب کچھ فراغت یابی ہو، تو بندہ بلدیہ سسرام کے میونپل کمشنز کو حاضر خدمت کرنے کا اذن چاہتا ہے۔"

"میونپل کمشنز صاحب تشریف لے آئے ہیں یا ابھی آتا ہے؟" میں نے پوچھا۔  
"حضور حاضر ہیں۔"

"انتظار کروانا مناسب نہیں۔" میں نے کہا۔ "انہیں ابھی لے آؤ۔"

الطاف حسین شاہ کمرے سے باہر گیا۔ ہیڈ ارڈلی کی پیٹی اتاری۔ کمر کے ساتھ بزر ممل کا پٹکا باندھا۔ کندھے پر شالی رومال ڈالا، اور واپس آ کر مجھے جھک کر سلام کیا۔ "حضور بندہ بلدیہ سسرام کا میونپل کمشنز حاضر خدمت ہے۔"

میں نے اٹھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ کرسی پیش کی۔ اور کوئی آدھ گھنٹہ تک ہمارے درمیان سسرام میونپل کمیٹی کے کچھ مسائل پر بڑا پر مغز تبادلہ خیالات ہوا۔ اس انٹرویو کے بعد الطاف حسین شاہ نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ہاتھ ملا کر رخصت ہوا اور ہیڈ ارفل کی پیٹی باندھ کر پھر اپنی ڈیوٹی پر ایستادہ ہو گیا۔

سید الطاف حسین شاہ کے علاوہ میرے عملے میں عبدالکریم خاں نام کے ایک اور مرغ زریں بھی تھے۔ یہ صاحب سب ڈپٹی گلفر کے طور پر ملازمت میں داخل ہوئے تھے، اور پورے تیس برس کی سروں کے بعد عین اسی عمدہ جلیلہ سے ریٹائر ہونے والے تھے۔ ساری عمر ان کے ضمیر نے ترقی کی خواہش کا بوجھ اٹھانے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ اگر دل میں کبھی کوئی ایسی حرص پیدا بھی ہوئی، تو دماغ نے اس کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ خوش گپیوں، لاف نہیوں، چائے پر چائے پینے، پان پر پان چبانے اور میز پر سر نکا کر اونٹھنے میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ دفتر کے کام کی طرف متوجہ ہونے کا کبھی ناممہم ہی نہ ملتا تھا۔ لیکن اپنی ملازمت کے آخری برس کے دوران ان کے دل و دماغ پر ایک آرزو ایسی شدت سے چھا گئی تھی جس طرح میریا کے مریض پر بے اختیار کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ان کی تمنا تھی کہ پیش پر رخصت ہونے سے پہلے کسی طرح ان کو ”خان صاحب“ کا خطاب مل جائے۔

”جناب عالی“ عبدالکریم خاں صاحب فرمایا کرتے تھے۔ ”خاکسار نے ساری عمر خون پیسہ ایک کر کے حکومت عالیہ کا حق نمک ادا کیا ہے۔ اب اگر بے خطاب کے لندورا ہی گاؤں واپس چلا گیا، تو انگشت نمائی ہو گی کہ لوئڈا دھوپ میں بال سفید کرا کے خالی ہاتھ لٹکائے لوٹ آیا ہے۔ جناب عالی! اس میں حکومت کی اپنی جو بدنائی ہے، اس کا ذکر خاکسار ب پر لانے سے شرماتا ہے۔“

ان دنوں سر فرانس مودی صوبہ بھار کے قائم مقام گورز مقرر ہو کرنے نے آئے تھے۔ انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کرسمس منانے کے لیے رہتاں فورٹ کو منتخب کیا۔ سسرام سے کچھ دور ایک دشوار گزار پہاڑی پر گھنے جنگلات میں گھرا ہوا یہ

ایک پر فضا مقام تھا، جس کی تسبیح کے لیے شیر شاہ سوری اور راجہ رہتاں کے درمیان جنگی معرکوں کے عجیب و غریب افسانے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اپنے اپنے رنگ میں مشہور تھے۔ انگریز افروں میں یہاں کی شکار گاہ بڑی مقبول تھی اور صوبے کا گورنر ہر دوسرے تیرے سال یہاں کرسس کیمپ لگایا کرتا تھا۔

عبدالکریم خاں صاحب کے کان میں سر فرانس موڈی کے پروگرام کی بھٹک پڑی تو وہ میرے سر ہو گئے کہ اس بار گورنر کے کیمپ کا پورا انتظام ان کے سپرد کیا جائے۔ سب ڈویژن کے باقی سب افروں نے ان کے اس مطالبے کی شدید مخالفت کی اور دل کھول کر مذاق بھی اڑایا۔ سب نے باری باری مجھے خاں صاحب کی ناہلی، سستی، کاہلی، کام چوری اور تن آسانی کی جملہ تفصیلات سے از سر نو آگاہ کیا اور گورنر کیمپ میں کسی بد انتظامی کے خطرناک عواقب سے بھی حسب توفیق خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے کیمپ کا چارج عبدالکریم صاحب ہی کے حوالے اس شرط پر کر دیا، کہ کیمپ کے اخراجات کے لیے تاجری اور زمینداروں سے کسی قسم کا کوئی چندہ وصول نہ کیا جائے گا بلکہ گورنر کے ملکیتی سیکرٹری کو صحیح مل دے کر پورا پورا حساب بے باقی کیا جائے گا۔ ورنہ اب تک رسم یکی بندھی ہوئی تھی کہ صوبائی گورنر یا دوسرے بڑے افر رہتاں فورٹ میں کیمپ لگاتے تھے، شکار کھلتے تھے اور کچھ گھنٹی اور کچھ ناگھنٹی دادیش دے کر ہنسی خوشی رخصت ہو جاتے تھے۔ سب ڈویژن کا کوئی افران کے آرام و آسائش کا ہر ممکن خیال رکھنے پر مامور ہو جاتا تھا۔ کیمپ کے اختتام پر وہ ایک علامتی سابل پیش کر کے قدرے قلیل سی رقم وصول کرتا تھا اور مہمان خانے کے رجسٹر میں ”All Bills Paid“ کا باضابطہ اندرجہ ہو جاتا تھا۔ اصلی اخراجات پورا کرنے کے لیے میزان افر علاقے کے زمینداروں، رئیسوں اور راشن ڈپوؤں ہو لڈروں سے من مانے چندے وصول کرتا تھا۔ چندوں کا کچھ حصہ بلوں کی ادائیگی پر صرف ہو جاتا تھا۔ باقی ساری پونجی بڑی آسانی سے متعلقہ افر کی جیب گرم کرتی تھی۔

میری شرط سن کر عبدالکریم صاحب سوچ میں پڑ گئے اور نمایت سنجدگی اور ہمدردی سے بولے۔ ”جتاب عالی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن گورنمنٹ ہاؤس کے اشاف کو سالہا سال سے مفت خوری کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ اس نئے بندوست پر وہ ضرور بد کیں گے۔ اور لاث صاحب بہادر کے حضور میں بھی لگائی بجھائی سے بازنہ آئیں گے۔ جتاب عالی، خاکسار فکر مند ہے کہ آپ کی نیک نامی پر اس وجہ سے خواہ مخواہ کوئی وہبہ نہ آئے۔“

میں نے ان کی ڈھارس بندھائی کہ بل تو لاث صاحب ہی ادا کریں گے۔ اس وجہ سے کسی پر کوئی آنج نہ آئے گی۔ البتہ اگر کیمپ کے بندوست میں کوئی کوتاہی یا خرابی واقع ہوئی تو کچھ عجب نہیں کہ انہیں پشن سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

عبدالکریم صاحب نے ایک جھر جھری لی اور پھر لنگر لنگوٹ کس کر کیمپ کے انتظام میں جٹ گئے۔ اب کیا تھا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ اپنی تیس سالہ ملازمت کے دوران وہ جن انتظامی صلاحیتوں کو بچا بچا کر رکھتے آئے تھے، یا کیا وہ انہیں اس طرح حرکت میں لے آئے جیسے مداری خالی پٹاری سے پے در پے زندہ کبوتر برآمد کرنے لگتا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے کیمپ کے سارے ملازموں، ’خاکروں‘، ’قليوں‘، ’مايلوں‘ اور بہشتیوں کے لیے نیلے رنگ کی نئی وردیاں سلوائیں۔ وہ زمانہ انگریزوں کے لیے جنگ عظیم کا تاریک دور تھا۔ اپنی قوم کے حصے بلند رکھنے کے لیے ونسن چرچل نے V (victory) کا نشان عام کر رکھا تھا۔ چرچل کی پیروی میں عبدالکریم خاں نے بھی انگریز مہمانوں کے استقبال کے لیے یہی دلکش خوش کن نشان وسیع پیانے پر اپنایا۔ نیلی وردیوں کے آگے پیچھے اور کندھوں پر V کے سفید نشان بڑی خوش اسلوبی سے سلے ہوئے تھے۔ ٹوپیوں پر بھی داسیں باسیں یہی نشان تھے۔ رہتاں فورٹ کی دشوار گزار چڑھائی چڑھنے کے لیے میموں کے لیے دلنبوں والی ڈولیاں فراہم کی گئی تھیں۔

ڈولیوں کے کمار بھی سرتاپا V کے نشان والے نئے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ کیمپ میں چاروں طرف بھلی کے سینکڑوں رنگین بلب جا بجا V کی صورت میں آؤڑاں تھے اور ہر

صحیح مہمانوں کے خیموں میں تانہ پھولوں کے جو گلdestے سجائے جاتے تھے، وہ بھی ۷ کی صورت میں بنے ہوتے تھے۔ صحیح، شام، دن، دوپر جس طرف بھی نگاہ اٹھتی تھی، ہر جانب ۷ for Victory کا دلفریب کا نشان ہی غنچہ امید کی طرح کھلا ہوا نظر آتا تھا۔

اس طرح معزز مہمانوں کی ذہنی آسودگی کا خاطر خواہ بندوست کرنے کے بعد عبدالکریم صاحب نے اپنی توجہ کی لگام ان کے لیے لذت کام و دہن کی طرف موڑی۔ اس میدان میں بھی انہوں نے پیشہ ورانہ مہارت کے ایسے ہاتھ دکھائے، کہ گورنر سے لے کر گورنمنٹ ہاؤس کے بیٹھ اور بیرے تک بے اقتیار عش عش کر اٹھے۔ کلکتہ سے ایک ٹرین علی الصبح سسرام سے گزرتی تھی اور دوسری شام کے وقت آتی تھی۔ ہر ٹرین سے عبدالکریم صاحب کا ہر کارا کلکتہ سے تانہ بہ تانہ سامان لے کر صحیح و شام بڑی پابندی سے رہتاس فورٹ پہنچ جاتا تھا۔ آری اینڈ نیوی شور سے کپر، ہیرنگ، سوکلڈ سامن، تانہ ییکٹی، پامفرے اور ہلسا مجھلی، وہاٹ اینڈ لیڈلا سے تانہ مکھن اور پنیر، فربوز کے کیک اور پیسٹری، گریٹ ایشن کے کولڈ چکن اور استیک، نولی گنج مارکٹ کی تانہ سبزیاں اور پھل، شیمپن کی بوتلیں ٹھہنڈی کرنے کے لیے برف کی سلیں ..... اس قسم کی ساری نعمتیں رہتاس فورٹ کے دور افقارہ کیمپ میں روز کے روز ایسی پابندی سے فراہم ہوتی تھیں کہ پہنہ کے گورنمنٹ ہاؤس کو بھی شاید ہی کبھی نصیب ہوئی ہوں۔ شام پڑتے ہی کیمپ کے کھلے میدان میں لکڑی کے بہت سے بڑے بڑے کندوں کا ڈھیر لگا کر عظیم الشان الاؤ سلگا دیا جاتا تھا۔ ڈنر اور ڈانس کے بعد سب مہمان اپنے ہاتھوں میں شیمپن کے جام اٹھائے باہر آ جاتے تھے اور کچھ دری تک الاؤ کے گرد گرد چل قدمی کرتے تھے۔ محفل برخاست ہونے سے پہلے عبدالکریم خان صاحب کیمپ کے ایک کنارے سے چند راکٹ ہوا میں چھوڑتے تھے، جو انہوں نے پہنہ کے ایک باکمال آتشباز سے بنا رکھے تھے۔ راکٹ زوں کر کے چھوڑتے تھے، اور کافی بلندی پر جا کر ٹھاہ کر کے پھٹ جاتے تھے۔ راکٹ پھٹتے ہی ان سے رنگ برلنگی پھلبجیریاں کی پھوار برنسے لگتی تھی، جو

بڑی نفاست سے ۷ کی شکلیں بناتی ہوئی رفتہ رفتہ فضا میں تحلیل ہو جاتی تھی۔ یہ روح پرور نظارہ دیکھنے کے بعد ڈزر، ڈانس اور شیمپین سے گرمائے ہوئے اجسام نفس مطمئنہ کی طرح شاداں و فرحاں اپنے اپنے خیموں کی راہ لیتے تھے۔ ان دونوں انگریزوں کو محاذ جنگ پر شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ لیکن عبدالکریم صاحب کے فیض سے ہمارے عزیز مہمانوں کو رہتاں کے خوشنا جنگل میں فتح و نصرت کا منگل ہی منگل دکھائی پڑتا تھا۔ کرس کے روز گورز نے مجھے بھی رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ ڈزر کے بعد باقی مہماں تو باری باری اٹھ کر ڈانس والے خیے میں چلے گئے لیکن گورز اور مس میکوین میرے ساتھ کھانے کی میز پر ہی بیٹھے رہے۔

مس میکوین چوڑے چکلے بدن کی قدرے فربی مائل کافی خوبصورت اور ہنس کمکھ خاتون تھی۔ دراصل وہ سر فرانس مودی کی مسٹریس تھی، لیکن حفظ مراتب کے خیال سے عرف عام میں اسے گورز کی بھتیجی ہی کہا جاتا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تقریبات میں وہ اکثر خاتون اول کے فرائض سر انجام دیا کرتی تھی۔ گورز کے دل اور دفتر دونوں پر ہی اس کی یکساں حکمرانی تھی۔

جب ہم نیبل پر اکیلے رہ گئے تو مس میکوین نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ جب سے میں اس کیمپ میں آئی ہوں، مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی فینری لینڈ میں آنکھی ہوں۔“ سر فرانس مودی بھی مسکرائے اور بولے۔ ”اپنی سروس کے ابتدائی دور میں ہم نے بھی کئی گورزوں کے کیمپ بھگتائے ہیں۔ لیکن ایسا شاندار بندوبست تو ہمیں کبھی نہ سوچا۔ اچھے گورزوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی کام کی تعریف کرتے ہیں، تو ساتھ ہی احتیاطاً اس کے چند نقائص بھی گناہ دیتے ہیں۔ میں نے کوشش تو ضرور کی کہ اس کیمپ کے بھی کچھ نقائص پکڑوں، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔“

اتنا کہہ کر سر فرانس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور شرارت سے اپنے چہرے

پر سنجیدگی طاری کر کے کما۔ ”اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اچھا گورنر نہیں ہوں، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ تم نہایت اچھے ایس ڈی او ہو۔“

میں نے انتہائی خلوص اور سچائی سے گورنر اور مس میکوین کو یقین دلایا کہ یکمپ کے بندوست میں میرا کوئی عمل دخل نہیں، بلکہ یہ سب کیا دھرا آفیسر انچارج عبدالکریم خاں کے حسن انتظام کا نتیجہ ہے۔

عبدالکریم خاں کا نام سنتے ہی مس میکوین اپنی کرسی سے اچھل پڑی۔ ”سویٹ“ سویٹ۔ مسٹر خاں تو یکمپ کی سب خواتین کا ڈارلنگ ہے۔“

مس میکوین کی باتوں سے معلوم ہوا کہ عبدالکریم خاں صاحب یکمپ کی جملہ خواتین کی آنکھ کا تارا بھی بنے ہوئے ہیں۔ دن کے وقت جب مرد بندوقیں لے کر شکار کھیلنے چلے جاتے تھے تو خواتین کی ولبستگی کا سامانِ کرم صاحب بذاتِ خود فراہم کرتے تھے۔ کبھی ریچھ والا بلایا جاتا ہے، کبھی بندر والا آتا ہے، کبھی سپیرے اپنا کرتب دکھاتے ہیں، کبھی بازگروں کا تماشا ہوتا ہے۔ کبھی بھانڈ اپنا رنگ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہِ کرم صاحب نے اردو مثنوی کی طرز پر انگریزی نظم میں ہر میم صاحب کا تفصیلی سرداپا بھی تصنیف کر رکھا تھا، جسے وہ ترجمہ کے ساتھ لیکر لیکر عورتوں کی منڈی میں بیٹھ کر سنایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو سب نے یہی سمجھا، کہ یہ بھی ایک پڑھے لکھے مسخرے اور بھانڈ کا سوانگ ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس ڈرامے کے تفنن آمیز اور خنده انگریز پسلوؤں پر عبدالکریم خاں کے مقصد کی متنانت، فلاتت اور بے رحم جفاکشی ہی غالب آئی۔ ان بچاری میموں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ان کی زلفوں، پیشاتیوں، بھوؤں، آنکھوں، گالوں، ہونٹوں، دانتوں، ٹھوڑیوں، گردنوں، سینوں، بازوؤں، انگلیوں، ناخنوں، کمروں، کولبوں، پنڈلیوں اور ایڑیوں کو فصاحت و بلاغت کے مبالغوں میں بھگو بھگو کر عجیب و غریب تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں کے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ پائیویا کے مارے ہوئے مسوڑھوں اور چھائیوں زدہ چروں والی میموں نے جب سنا کہ ان کے

منہ میں موتی کی لڑیاں اور رخ نیبا پر تانہ گلاب اور چمبیلی کھلی ہوئی ہے تو وہ بے اختیار عبدالکریم خاں کی شائستگی، وفاداری، مستعدی اور انتظایی کارکردگی کا کلمہ پڑھنے لگیں۔ ہر میم نے اپنے اپنے سراپا کی نقل بھی بڑے شوق سے بنوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔

مس میکوین کے منہ سے یہ تفصیلات سن کر گورز صاحب مسکرانے، اور بولے۔ ”تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایسا جہاندیدہ، کارگزار اور تجربہ کار افسر میر ہے۔“

”جی ہاں“ میں نے موقع غنیمت جان کر مطلب کی بات کہہ دی۔ ”لیکن عبدالکریم خاں کی حسن کارکردگی کی مشین ایک بڑے پاور فل ڈانسمو سے چل رہی ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ ریٹائر ہونے سے قبل وہ اپنی ذات کو ”خان صاحب“ کے خطاب کا اہل ثابت کرتے جائیں۔“

”اگر وہ خطاب کا مستحق نہیں تو میں نہیں جانتی اور کون خطاب کا نام تجویز کیا ہے۔“

مس میکوین نے بڑے جذبے سے کہا۔ ”کیا تم نے نئے سال کی آزر لست کے لیے عبدالکریم خاں کا نام تجویز کیا ہے؟ گورز نے پوچھا۔

میں نے عذر کیا کہ میں اس سب ڈویژن میں نیا نیا آیا ہوں۔ میرے لیے مناسب نہ تھا کہ میں اس قسم کی کوئی سفارش کرتا۔

”کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔“ گورز نے کہا۔ ”ابھی وقت ہے، کل صبح تم مجھے اس کے متعلق ایک مناسب سلٹیشن (Cintation) بنا کے بھیج دیں۔“

”تھینک یو ڈارلنگ، تھینک یو ویری ٹھی“ مس میکوین نے اپنے نہاد پچا کے گل کو چٹانخ سے چوم کر کہا۔

لوہے کو اس قدر گرم دیکھ کر میں نے لگے ہاتھوں اس پر دوسری ضرب بھی لگا دی، اور گورز کو مطلع کیا کہ عنقریب ہی میں اس جوہر قابل کی خدمات سے محروم بھی ہو جاؤں گا، کیونکہ عبدالکریم چند ماہ بعد ریٹائر ہونے والے ہیں۔

”اے نو، اے نو“ مس میکوں نے اپنی گردن کو تاسفانہ جھٹکے دے کر کہا۔ ”جنگ کے نازم زمانے میں ایسے وفادار افسر کو ہاتھ سے جانے دینا بڑی شرمناک حماقت ہو گی۔“

”مسٹر کرم کی جسمانی صحت کیسی ہے؟“ گورنر نے مجھ سے دیافت کیا۔

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا، مس میکوں چمک کر بولی۔ ”ہی از فٹ ایز اے قتل ڈارنگ، ہی از فٹ ایز اے قتل“

(He is fit as a Fiddle Darling ----- He is fit as a Fiddle)  
وہ ہمارے ساتھ دس دس میل بے تکان چلتا ہے اور اوپھی اوپھی پہاڑیوں پر میمنے کی

طرح بے کان ہلائے چڑھ جاتا ہے۔“

توہوڑے سے مزید سوال جواب کے بعد گورنر نے اپنی ڈائری منگوائی اور اس میں اپنے ہاتھ سے یہ یادداشت لکھ لی کہ نئے سال کے اعزازات میں عبدالکریم خاں کو خطاب دینا ہے اور اس کی ملازمت میں دو سال کی توسعی کرنی ہے۔

کرسمس کے دو روز بعد گورنر کا دوہرہ ختم ہوا، تو میں نے حساب کتاب کی پڑتال کے لیے یکمپ کے کلفذات طلب کئے۔ یکمپ کے اخراجات پر پچیس چھبیس ہزار کی رقم انھی تھی۔ لیکن گورنمنٹ ہاؤس کے عملے سے صرف دو ہزار روپے وصول کئے گئے تھے۔

میں نے کلفذات کا پلندہ عبدالکریم خاں کے منہ پر دے مارا اور چیخ کر کہا۔ ”آخر آپ بھی اسی پرانی تھیلی کے پتے ہے نکلے۔ آپ نے تو میں نے پر ہاتھ رکھ کے وعدہ کیا تھا کہ میرے حکم کے مطابق آپ پورے اخراجات گورنمنٹ ہاؤس سے وصول کریں گے۔

یا ایں شورا شوری یا ایں بے نمکی۔ کرم صاحب یہ کیا فضول حرکت ہے؟“

عبدالکریم خاں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈیا آئے۔ انہوں نے ہاتھ باندھ کر سر جھکا لیا اور قسم کھا کر کہا کہ یکمپ کے اخراجات پورا کرنے کے لیے انہوں نے کسی سے ایک پیسہ بھی چندہ نہیں لیا، بلکہ یوی کا زیور گروی رکھ کر تیس چوبیس ہزار روپے کی رقم اپنی جیب سے صرف کی ہے۔

”خان صاحب“ کے خطاب کی لیالے آرزو سے ہمکنار ہونے کی دھن میں کرم صاحب

جو پاپڑ بیل رہے تھے، اس پر مجھے غصہ کی بجائے ترس آنے لگا۔ رفتہ رفتہ ترس کا یہ احساس بھی مٹ گیا اور اس کی جگہ حیرت و استعجاب نے لے لی۔ کیونکہ پہلے خطاب اور اس کے بعد ملازمت میں دو سال کی توسعی طبقے ہی خان صاحب کی کیا ہی پلٹ گئی۔ ایک ست الوجود، کام چور، ہمہ وقت پان چبانے، چائے پینے اور میز پر سر نکا کر اونچھنے والے عبدالکریم خان نے یا کیک ایسا روپ بدلا کہ فرض شناس، مستعدی، دیانتداری اور پیلک کی خدمت گزاری میں وہ اپنے سب ہم منصبوں پر سبقت لے گئے۔ انہوں نے داڑھی بڑھا لی، کوت پتوں کی جگہ مولویانہ لباس اختیار کر لیا اور پانچوں نمازیں پابندی سے مسجد میں ادا کرنے لگے۔

چند ماہ بعد ایک روز میں دفتر سے فارغ ہو کر گھر پہنچا ہی تھا کہ ہیڈ ارمنی الطاف حسین نے اطلاع دی کہ خان صاحب عبدالکریم خان تشریف لائے ہیں اور تخلیہ میں کوئی بات بعضیغہ راز عرض کرنا چاہتے ہیں۔

”جناب عالی!“ خان صاحب نے اندر آ کر کہا۔ ”دنیا کی جتنی کالک ہے وہ تو سمیت سمیت کر اپنے منہ پر مل ہی چکا ہوں۔ اب جی چاہتا ہے، کہ مرنے سے پہلے کوئی خدمت دین کی بھی کرتا جاؤ۔“

”برٹا مبارک خیال ہے۔“ میں نے کہا۔ ”در کار خیر حاجت یعنی استخارہ نیست“

”جناب عالی، استخارہ کی تو نہیں لیکن آپ کی مدد کی ضرور حاجت ہے۔“

خان صاحب نے بڑی وضاحت سے مجھے آگاہ کیا، کہ مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار ڈالنے کے لیے ہندو کانگرس نے ایک نیا ڈھونگ رچایا ہے۔ پسند کے ایک شخص قوم انصاری نامی کو اکسا کر مومن کانفرنس کا ڈول ڈالا گیا ہے۔ یہ نئی جماعت کانگرس کی ہمنوا ہے اور خاص طور پر نور باف برادری کو بہلا پھسلا کر مسلم لیگ سے توڑنے اور مومن کانفرنس میں شامل کرنے کی سر توڑ کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس صورت حال سے مسلم لیگ کے زماء خاصے فکر مند ہیں۔ خان لیاقت علی خان، نواب اسماعیل، اے بی اے، جلیم صاحب اور دیگر مسلم لیگی مشاہیر اس سلسلے میں صوبہ بہار کا دونہ کرنے والے ہیں۔

وہ حضرات سسرام بھی ضرور تشریف لائیں گے، کیونکہ اس علاقے میں نور بافوں کی بڑی کثیر آبادی ہے۔

”جتاب عالی“ خان صاحب نے فرمایا۔ ”خاکسار کا ارادہ ہے کہ مسلم لیگ وفد کے دورے سے پہلے اس سب ڈویژن کے تمام نور بافوں کو مسلم لیگ کا ممبر بنا ڈالوں۔“ میں نے ہنس کر کہا، کہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے وہ یہ سیاسی خدمت کیسے سر انعام دے سکتے ہیں؟“

”جتاب عالی“ خان صاحب نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”آپ سوت کے کوٹے کی تقسیم اس خاکسار کے پرورد کر دیں۔ باقی میں جانوں اور میرا کام۔“ خان صاحب کا لائچہ عمل ظاہر تھا۔ وہ سوت کا کوئہ صرف ان نور بافوں کو دیں گے جو مسلم لیگ کے ممبر ہوں گے۔ مومن کانفرنس کے حامی سوت سے محروم رہیں گے۔ ان کی کھڈیاں بیکار ہو جائیں گی۔ ان کا روزگار معطل ہو جائے گا۔ ”خان صاحب“ میں نے کہا۔ ”جو لوگ سوت کے لائق یا دھونس میں آ کر مسلم لیگ کا ممبر بنیں گے، ان کی ممبری کس کام کی؟“

”جتاب عالی“ خان صاحب نے جواب دیا۔ ”یہ اصولوں یا عقیدوں کی جنگ تھوڑی ہے، اس وقت تو ہندسوں کی لڑائی ہے۔ مسلم لیگیوں کی تعداد گھٹانے کے لیے کانگریس ڈنڈی مار رہی ہے۔ ہم ان کی تعداد بڑھانے کے لیے ڈنڈا مارنے میں حق بجانب ہیں۔“

اس زمانے کے سیاسی پس منظر میں خان صاحب کی بات بڑی وزنی تھی۔ چنانچہ میں نے سوت کی تقسیم کی ذمہ داری بلا تامل ان کے حوالے کر دی۔ خان صاحب عبدالکریم نے یہ ذمہ داری ایسے سلیقے سے بھائی کہ مومن کانفرنس کے دانت کھٹے کر دیئے۔ چند ہفت بعد جب مسلم لیگ کے قائدین کا وفد سسرام سے گزرا تو ساری سب ڈویژن کے ہزاروں نور بافوں نے ان کی شان میں بڑی پر تپاک مظاہرے کئے۔ چند برس بعد جب مسلم لیگ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے دیئے

ہوئے خطاب احتجاجاً واپس کر دیں تو عبدالکریم صاحب پشن پر رٹائر ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس اپیل پر بلا ہچکا ہٹ لیک کہا، اور یوی کا زیور گروی رکھ کر اور فرنگی میموں کے سامنے بھانڈوں کی طرح سوانگ رچا رچا کر حاصل کیا ہوا ”خان صاحب“ کا خطاب بڑی خوشی سے واپس کر دیا۔

سرام سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر دیائے سون کے کنارے ڈیری آن سون کا پر فضا قصبہ تھا، جس کے ساتھ دالیا گنگر کی صفتی بستی متحق تھی۔ دالیا گنگر میں چینی، سینٹ، بکٹ اور دیگر مصنوعات کی متعدد فیکٹریاں تھیں، جن میں کئی ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ ان کے مالک بھارت کے کروڑ پتی سینٹھ رام کرشن دالیا تھے۔ وہ خود تو نیا وہ تر دلی اور بمبئی میں رہتے تھے۔ اور دالیا گنگر کا انتظام شانتی پرشاد جیں کے پرد تھا جو سینٹھ دالیا کی اکلوتی بیٹی کے شوہر تھے۔

dalila گنگر کے پلک ریلیشنز یعنی تعلقات عامہ کے نگران ایک جواں سال خوش پوشک اور خوش گفتار ہندو پریم ناتھ اگروال تھے۔ یہ صاحب لاہور کے ڈی اے وی کالج کے گرینجویٹ تھے اور اتوار کے اتوار میرے ساتھ ٹینس کھیلنے اور پنجابی بولنے سرام آیا جیا کرتے تھے۔

ایک بار دالیا گنگر کی فیکٹریوں کی انتظامیہ اور مزدوروں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ کشیدگی بڑھتے تشدید اور فساد تک نوبت پہنچی جس میں ایک مزدور جان سے مارا گیا۔ حفظ امن کے پیش نظر میں نے فیکٹریاں بند کر کے دالیا گنگر میں دفعہ ۱۳۲ نافذ کر دی اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ جب تک باہمی افہام و تفہیم کے ذریعہ مالک اور مزدور کسی متفقہ صلح نامہ پر دستخط نہیں کرتے، فیکٹریاں بدستور بند رہیں گی۔

فیکٹریوں کا بند ہونا تھا کہ سینٹھ رام کرشن دالیا اور ان کے داماد شانتی پرشاد جیں نے دلی اور پٹنہ میں اپنے جیک لگائے اور ڈینفس ڈیپارٹمنٹ، جی ایچ کیو، چیف سیکرٹری، کمشنر اور گلکھر کی جانب سے میرے نام تاروں کا تائنا بندھ گیا، کہ فیکٹریاں بند ہونے کی وجہ سے جنگی ضروریات کی سپلائی میں رخنہ پڑ رہا ہے۔ اس لیے شرپسند مزدوروں

کو گرفتار کر کے تمام فیکٹریاں پولیس کی حفاظت میں فوراً کھول دی جائیں۔ یہ خواہ مخواہ کے احکامات مقامی حالات سے مکمل طور پر لا علیٰ پر منی تھے، اور سینئھے والمیا اور ان کے داماد کے یکطرفہ دباؤ کے تحت جاری ہو رہے تھے۔ اس لیے میں نے ان کا کوئی نوٹ نہ لیا۔

فیکٹریوں کو بند پڑے ہفتہ بھر گزرا تھا کہ ایک روز والمیا کے پلک ریلیشنز افر پریم ناٹھ اگروال مجھے ملنے آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بھاری بھر کم بریف کیس تھا اور ساتھ ایک تجی سجائی شمع و شنگ نوجوان لڑکی تھی۔

چھوٹتے ہی پریم ناٹھ اگروال اپنا رونا رونے لگا کہ فیکٹریاں بند ہونے سے والمیا نگر کو دو ڈھائی لاکھ روپے روزانہ نقصان ہو رہا ہے۔ اگر چندے اور یہی حال رہا تو کمپنی کا دیوالیہ نکل کر رہے گا۔

”آپ ایک بار ہماری صفائت پر فیکٹریاں کھول دیں۔“ پریم ناٹھ اگروال نے کہا۔ ”ان ہرامزادے مزدوروں سے ہم خود نپٹ لیں گے۔“

میں نے سختی سے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ مزدوروں کے ساتھ باضابطہ صلح نامہ کر کے آئیں تو اس کے بعد ہی اس موضوع پر مزید بات چیت ہو سکتی ہے۔ چائے آگئی تھی۔ میں پیالیوں میں چائے انڈیلینے لگا تو پریم ناٹھ اگروال نے بجلی کی طرح ترتب کر اپنا بھاری بھر کم بریف کیس میز پر رکھ کے کھول دیا۔ یہ ہزار ہزار روپے کے نوٹوں سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔

نوٹوں کی طرف اشارة کر کے اگروال نے کہا۔ ”آپ یہ قبول فرمائیں۔“ پھر لڑکی کو میری طرف دھکیل کر کہا۔ ”یا یہ قبول فرمائیں ..... لیکن بھگوان کے لیے ہماری فیکٹریاں کھول دیں۔“

چائے دانی میرے ہاتھ میں تھی۔ پیالی میں چائے ڈالنے کی بجائے میں نے ساری چائے دانی پریم ناٹھ اگروال کے سر پر انڈیل دی۔ اس کی پنڈیوں پر اپنے پاؤں سے دو چار ٹھوکریں ماریں۔ پنجابی زبان میں اسے کئی قفس گالیاں دیں۔ اور اپنے ہیڈ ارڈل کو بلا

کر زور سے کما۔ ”ان دونوں خبیشوں کو کان سے کپڑ کر باہر نکال دو۔“ سید الطاف حسین بھی ڈیوٹی کا پابند ہیڈ ارڈل تھا۔ اس نے نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس اگروال کو تھما کر اسے کان سے کپڑا اور لڑکی کو ڈنڈے سے دھکیلا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔

اس روز مجھے ساری رات نیند نہ آئی۔ مجھے نہ کریوں محسوس ہوتا تھا کہ پریم ناتھ اگروال نے گرون سے کپڑ کر میرا منہ غلافت کے ڈھیر میں جھونک دیا ہے۔ تمام شب میں اسی ادھیر بن میں چیخ و تاب کھاتا رہا کہ اگروال کو آخر یہ خیال کیسے آیا کہ وہ مجھے رشوت دے کر اپنا کام نکال سکتا ہے۔ میں جتنا اپنے آپ کو کریڈتا تھا، میری رُگ رُگ میں احساس کرتی، ندامت اور سکلی کے تعفن پر نالے چھوٹنے لگتے تھے۔ میرے اندر خفت اور خجالت کی پیپ سی بننے لگی۔ اور سگن اور بدبو کے بھجکے میں میرا وجود نالی میں پڑی ہوئی او جھڑی کی طرح سڑنے لگا جو دھوپ میں پھول پھول کر پھٹ گئی ہو۔ سپر مارکیٹ میں بننے والی اشیاء کی طرح کیا انسان کی پیشانی پر بھی قیمتوں کے لیبل چپاں ہوتے ہیں؟ ہزار ہزار کے نوٹوں سے بھرا ہوا ایک بریف کیس۔ گڑیا کی طرح بنی ٹھنی ایک بے زبان لڑکی۔

چند دنوں میں دالمیا نگر کی انتظامیہ اور مزدوروں کے درمیان صلح صفائی ہو گئی۔ اور ساری فیکٹریاں از سر نو چلنے لگیں۔ اس واقعہ کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ایک روز سینھ رام کرش دالمیا اچانک بہ نفس نفیس میرے دفتر میں آ گئے۔ اس ملاقات کی تقریب انہوں نے یہ بتائی کہ جو لوگ رشوت لیتے ہیں، ان سے ملنے تو ان کے ملازم جایا کرتے ہیں لیکن جو شخص رشوت نہیں لیتا اس سے ملنے کو ان کا اپنا جی چاہتا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے اگلے روز دالمیا نگر میں لنج پر مدعو کیا۔

لنج پر ہم دونوں اکیلے تھے۔ سینھ صاحب چھوٹ چھات کے آدمی تھے، اس لیے ہمارے لیے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر الگ الگ تپائیں لگائی گئیں۔ سینھ صاحب کا بھوجن کیلے کے بڑے بڑے پتوں پر پروسا گیا۔ میری تپائی پر ایک گول سنری تحال میں دس

باہر خوبصورت کٹویاں اور طشتیاں تھیں جن میں باور دی ملازم بڑی نفس سے بزیاں،  
والیں، دہی پویاں اور مٹھائیاں ڈالتے جاتے تھے۔

کھانے کے دوران سینھ دالیا نے مجھے رشوت لینے اور دینے کے فن پر بڑے محیر العقول  
قصے سنائے۔

”اب ان برتوں کو ہی لیجئے جن میں آپ بھوجن کر رہے ہیں۔“ سینھ صاحب نے میرے  
تحال کی طرف اشادہ کر کے کہا۔ ”ان کی قیمت سانچھ ہزار روپے سے کم نہیں۔ اگر  
آپ اگروال جی کے سر پر گرم گرم البتی ہوئی چائے نہ ڈال چکے ہوتے تو آج چلتے  
وقت میں ان برتوں کو آپ کی کار میں رکھوا دیتا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں بھرثہ ہونے  
کے بعد اب یہ ہمارے کام کے تو رہے نہیں، اس لیے آپ اپنے ساتھ لے جائیں اور  
غريب غراء میں دان پن کر دیں۔“

برتوں کے حوالے سے سینھ دالیا نے مجھے بتایا کہ کرسس کے موقع پر جب گورنر نے  
رہتاس فورٹ پر یکمپ لگایا تو دستور کے مطابق پریم ناتھ اگروال بڑے دن کی ڈال لے  
کر وہاں گیا تھا۔ ڈال میں ایک بڑے سائز کا کیک تھا اور کچھ بادام، کشمکش، پستہ اور  
چھوارے تھے۔ ان سب اشیاء کو بڑی خوبصورتی سے ایک خاص سونے کی طشتی میں  
سجایا گیا تھا جو ہر سال خاص اسی مقصد کے لیے بنوائی جاتی تھی۔ سر فرانس نے ڈال  
قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ کرسس پر تختے تحائف قبول کرنا آداب گورنری  
کے خلاف ہے۔ چنانچہ گورنمنٹ ہاؤس کے تجربہ کار بیلر نے بندھائے دستور کے  
مطابق کیک اور خشک میوے ایک الیوینیم کی ٹرے میں ڈال کر پریم ناتھ اگروال کو  
واپس لوٹا دیئے، اور سونے کی طشتی جھاڑ پوچھ کر مس میکوں کے ذاتی سامان میں رکھ  
دی۔

## • نندی گرام اور لارڈ دیول

ایک روز میں اپنے ایک دوست کو یعنی سسرام روپے اشیش گیا ہوا تھا۔ کلکتہ سے جو گاڑی آئی وہ مسافروں سے کچھا کچھ بھری ہوئی تھی۔ فرست، سینڈ اور انٹر کلاس میں مارواڑی کا ہجوم تھا، جو اپنا مال و متاع بڑی بڑی پیٹیوں میں سنبھالے جاپانی حملہ کے خوف سے کلکتہ سے فرار ہو رہے تھے۔ باقی ڈبوں میں بھوکی پیاسی مخلوق کا ایک جم غیر چھپکیوں کی طرح ایک دوسرے سے چمنا ہوا بیٹھا تھا۔ کھڑکیوں میں پھٹی پھٹی آنکھوں والے بے شمار نڈھال پچے غنوڈگی کے عالم میں سر ڈھلکائے لٹک رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر پپریاں جبی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے گرنگی و خشنگی کی نقاہت سے منخ ہو رہے تھے۔ ان کی گرد نیس نیم سوختہ شاخوں کی طرح بل کھا کر شانوں پر گری ہوئی تھیں۔ یہ لوگ اپنے دور افتاب ہرے بھرے گاؤں چھوڑ کر مٹھی بھر چاول کی تلاش میں پہلے کلکتہ آئے تھے، اور پھر کلکتہ سے مایوس ہو کر اب انہیں خود بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ کس کے پاس جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟

سارا بنگال ہیبت ناک اور بھیانک قحط کی زد میں آیا ہوا تھا۔ بھوک سے سک سک کر جان دینے والوں کی تعداد دوسری جنگ عظیم میں مرنے والوں کی تعداد سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ قحط کے ساتھ سمندر میں بھی جوش آیا، اور مغربی بنگال کے ساحلی علاقوں میں جوار بھائے کی ایک عظیم لبر سائیکلوں کے دوش پر سوار ہو کر کنی میل تک خشکی میں در آئی، اور بے شمار بستیوں، انسانوں اور مویشیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر سمندر کی تہ میں لے گئی۔

بھوک، افلاس، طوفان اور سیلاب کی بلا ہائے ناگہانی میں گرفتار انسانوں کے حال زار کی خبریں روز بروز اتنی ہولناک ہوتی جا رہی تھیں کہ سسرام کے دفتر میں بیٹھ کر آرام

و آسائیں سے افری کرنا مجھے ایک جم عظیم محسوس ہونے لگا۔ بڑی سوچ پچار کے بعد میں پنہ گیا اور گورنر اور چیف سیکرٹری سے درخواست کی کہ مجھے امدادی کام کے سلسلے میں بنگال پہنچ دیا جائے۔ پہلے تو انہوں نے سمجھا بجھا کر مجھے اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ تمہارے پاس صوبے کی ایک اہم ڈویژن کا چارج ہے، تمہارا کام بھی تسلی بخش ہے۔ اس لیے تمہارے کیریئر کے حق میں یہی بہتر ہو گا کہ تم دلجمی سے یہیں اپنے فرائض سر انجام دیتے رہو۔ لیکن جب میں نے بڑے خلوص سے انہیں یقین دلایا کہ میرا دل واقعی نارمل کام سے اچاٹ ہو گیا ہے تو وہ مان گئے اور میری خدمات عارضی پر بنگال کی صوبائی حکومت کے سپرد کر دی گئیں۔

کلکتہ پہنچ کر جب میں ہوئے اشیشن پر ٹرین سے اترا تو چاروں طرف بنگال کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ بڑی بڑی کشاور سڑکیں دودھی قمقموں کی متالی روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ بازاروں کی دکانیں آرستہ و پیراستہ ساز و سامان سے چمک دکھ رہی تھیں۔ نازک اندام بنگالیں زلفیں لرائے، جوڑے سجائے، بندیا لگائے بڑے انہاک سے خرید و فروخت میں مصروف تھیں۔ خوش پوش بنگالی مرد کاروں میں، ٹیکیوں میں، بسوں میں، ٹراموں میں، رکشاوں میں اور پیدل ہنسی خوشی ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ کچھ اپنے آپ میں مت تھے۔ کچھ اپنے اپنے کام میں مت تھے۔ ان سب کی نگاہوں سے اللہ کی وہ بے شمار مخلوق بالکل او جھل تھی جوان کے آگے پچھے، داسیں بائیں سڑکوں پر، فٹ پاتھوں پر، گلیوں میں، کوچوں میں، میدانوں میں بھوکے پیاسے کیڑے مکوڑوں کی طرح سک سک کر ریگ رہی تھی۔ زندگی کے دو مختلف دھارے ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ اس طرح رواں دواں تھے جیسے متوازی خطوط جو آپس میں کبھی نہیں ملتے۔

بنگال کا نقط بلائے ناگمانی کا نتیجہ کم اور حکومت کی بد انتظامی کا نتیجہ نیاہ تھا۔ مشرق بعید میں ملک پر ملک فتح کرنے کے بعد اب جاپانی فوجیں آسام کی سرحد پر ہندوستان کا دروازہ کھنکھتا رہی تھیں۔ کلکتہ اور مدراس پر جاپانی ففتھہ کالم کے ایجنٹوں کے اترنے کی

خبریں بھی متواتر پھیل رہی تھیں۔ ۱۹۳۲ء کی Quit India تحریک کے بعد برلن گورنمنٹ بھی تنبذب میں تھی کہ اگر جاپان نے واقعی حملہ کیا تو خدا جانے مقامی آبادی کس کا ساتھ دے۔ بنگال میں سجاش چندر بوس کے فارورڈ بلاک کا خاصاً اثر تھا۔ اس لیے جاپانی حملے کی صورت میں اس صوبے کی وفاداری کے متعلق حکومت کے ذہن میں بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔ ان تمام خطرات کے پیش نظر حکومت نے ایک طرح کی Policy Scorched Earth کو اپنی حکمت عملی کا حصہ بنایا۔ اس پالیسی کے تحت صوبے میں چند بڑے بڑے Procurement Agents مقرر کر دیئے گئے۔ انہوں نے شروع اور بڑے بڑے میں جگہ جگہ اپنے گودام کھول لئے اور ایڈمنیسٹریشن کی مدد سے دھان اور چاول کی ساری فصل سے داموں خرید کر اپنے گوداموں میں بھرنی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے صوبے کی تقریباً ساری خوراک پروکیورمنٹ ایجنٹوں کے گوداموں میں مغلبل ہو گئی۔ یہ ذخیرے نیا ہدہ تر حکومت کی اپنی سول اور ملٹری ضروریات پوری کرنے کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق مستقل احکام یہ تھے کہ جاپانیوں کی پیش قدی کی صورت میں ان سب کو جلا کر تباہ کر دیا جائے، تا کہ خوراک کا کوئی ذخیرہ دشمنوں کے ہاتھ میں نہ آنے پائے۔

جو تھوڑا بہت چاول پروکیورمنٹ ایجنٹوں کی دسترس سے نجٹ رہا تھا، اسے مقامی زمینداروں بیویوں اور امیر لوگوں نے دھونس، دھاندلی یا لالج کے نور سے خرید کر اپنے ذاتی ذخیروں میں جمع کر لیا۔ رفتہ رفتہ اناج کی منڈیاں بند ہو گئیں، کاشتکاروں کے اٹاٹے ختم ہو گئے اور زمینداروں اور بیویوں کے چاول کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی۔

شروع شروع میں غریب دیہاتیوں نے چاول کی جگہ ساگ پات پر گزارا کرنا شروع کر دیا۔ پھر وہ درختوں کے پتے ابال ابال کر کھانے لگے۔ گاؤں گاؤں میں بھوک اور موت نے چھاؤنی ڈال دی۔ آدمیوں کی کمریں خمیدہ ہو گئیں۔ عورتوں کی چھاتیاں سوکھ کر مردار گوشت کی طرح لٹکنے لگیں۔ بچوں کی پسلیاں تڑ مڑ کر اندر گھس گئیں اور پیٹ غباروں کی طرح پھول کر باہر نکل آئے۔ اس حالت میں وہ گھبرا کر اپنی ویران جھونپڑیوں

سے باہر نکل آتے تھے۔ باہر سڑک پر آ کر وہ اکیلے نہ رہتے تھے۔ ان کے پیچھے ایک جہاں تھا جو امداداً چلا آ رہا تھا۔ ان میں بچے تھے جو بلکہتے ہوئے جا رہے تھے، بوڑھے آدی جو سکتے ہوئے جا رہے تھے، عورتیں جو بر سر عام بکتی ہوئی جا رہی تھیں۔ کچھ مر گئے، کچھ لٹ گئے۔ لیکن جو چل سکتے تھے، وہ چلتے رہے۔ جو رینگ سکتے تھے، وہ سینگتے رہے۔ اور ایک آسودہ منزل کا مقناطیس لوہ چون کی طرح سمیٹ کر انہیں اپنی طرف کھینچتا رہا۔ ان کی امیدوں کا کعبہ کلکتہ تھا جہاں اونچے اونچے مکان ہیں، رنگ برلنگی دکانیں، موئے موئے سینہ، جہاں کتن کو گوشت ملتا ہے، بیلیاں دو دو چیتی ہیں، لوگ ناپتے ہیں۔ وہاں چاول بھی تو ہوں گے۔ نیم جان ڈھانچوں کے قافلے در قافلے اسی ایک امید کا سامارا لیے چلتے رہے۔ ان کے تخیل نے کلکتہ کے بلند و بالا مکانوں میں اور سڑکوں پر چاولوں کے بورے ہی بورے بچھا رکھتے تھے، جو محض ان کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ خوش آئند ذہنی سراب ان کی نوٹی ہوئی کمر میں رسے باندھ باندھ کر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ قدم قدم پر گرتے تھے۔ اور ہر نئے موڑ پر ان کی امیدوں کا ہجوم چھپما اٹھتا تھا۔ امیدوں کا ہجوم ہی نہیں کلکتہ کی چمکیلی سڑکوں اور تگ گلیوں میں بھی نیم جان ڈھانچوں کے ہجوم ہی ہجوم تھے، جو سیالب کے ریلے کی طرح ہر لمحہ بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔

”او ماں چاول ..... او بابا چاول ..... او بابو چاول ..... او دادا چاول .....“ لیکن ماں کہاں تھی؟ بابا کہاں تھے؟ اور پھر وہ چاولوں کے بورے کیا ہوئے جو کلکتہ کی سڑکوں پر بکھرے ہوئے تھے؟ یہاں تو دروازوں پر دربان تھے۔ سڑکوں پر موڑیں ..... اور سپاہی۔ یہ بھوکے اور پیاسے لوگ موت سے لڑتے آئے تھے۔ اب کلکتہ پہنچ کر وہ زندگی سے لڑنے لگے۔ وہ نالیوں میں تیرتے ہوئے موںگ پھلی کے چھلکوں اور گوبجھی کے پتوں کو نکال کر کھاتے تھے۔ وہ گندگی کے ڈھیروں کو کرید کرید کر اپنا پیٹ بھرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ کارپوریشن کی کوڑے کرکٹ والی گاڑی پر چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے لڑتے تھے، منہ نوچتے تھے۔ بال کھینچتے تھے۔ ان کی لڑائی کتنی

سے ہوتی تھی۔ اور جب وہ نڈھاں ہو کر سڑک کے درمیان گر جاتے تھے، تو لال گپڑی والے سپاہیوں کا دستہ انہیں ناگنوں سے گھیٹ کر ایک طرف کنارے لگا دیتا تھا، تاکہ سڑک پر چلنے والے سب رفقارِ ٹریفک کی آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

شام پڑتے ہی دیائے ہگلی کے ہوٹہ برج پر فاقہ زدہ عورتوں اور بچوں کا ایک میدہ سا لگ جاتا تھا۔ اس طویل پل کے دونوں جانب بے شمار مائیں اپنے سے ہوئے کمن بچوں کو گلے سے لگائے آہنی جنگلوں اور محرابوں کے ساتھ قطار در قطار کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی کھاتا پیتا خاندان ان کے بچوں کو خرید لے یا مفت اپنے ساتھ لے جائے۔ کبھی کوئی ماں اپنے لخت جگر کو آخری بار مینے سے لگاتی تھی، اور پھر آنکھیں بند کر کے اسے غراب سے دیائے ہگلی میں پھینک دیتی تھی۔ کبھی کوئی عورت اپنے بچوں سمیت خود دیائے میں چھلانگ لگا دیتی تھی۔ ہگلی میں بجرے اور سینیر خراماں خراماں چلتے رہتے تھے۔ پل پر دونوں جانب تیز رفقارِ ٹریفک روائی دواں رہتا تھا۔ اور برٹش حکومت کے لیے ایک اور رات جاپانی حملے کے بغیر خیر و عافیت سے گزر جاتی تھی۔

بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ اس زمانے میں برٹش حکومت کی ذہنی مشغولیت قحط اور سیلاں کے ساتھ نہیں بلکہ تمام تر جاپانی حملے کے امکانات کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ جب میں چیف سیکرٹری کو اپنی حاضری کی رپورٹ دینے رائٹرز بلڈنگ پہنچا تو سیکرٹریٹ کی چھت پر دو طیارہ ٹکن توپیں نصب تھیں اور برآمدوں میں جا بجا بمباری سے بچاؤ کے لیے ریت کی بوڑیوں کے بنکر بنے ہوئے تھے۔ رائٹرز بلڈنگ کے آس پاس دور تک ان بھوکے پیاسے انسانوں کا نام و نشان تک نہ تھا جو کلکتہ کے شر میں چاروں طرف حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ سیکرٹریٹ کے چھوٹے چھوٹے تاریک کمروں میں باہو نما کالے اور گورے افسر نیبل لیپ جلائے تیز رفقار، بھلی کے پنکھوں کے نیچے اپنی موٹی گردیں ایسی فائلوں پر جھکائے بیٹھے تھے جن کا تعلق نہ چاول سے تھا، نہ قحط سے، نہ سیلاں

سے، نہ سائیکلوں سے اور نہ جاپان کے متوقع حملے سے۔ میں چیف سیکرٹری کے دفتر میں پہنچا تو ایک افسر نے کھٹ سے میرا پوسٹنگ آرڈر مجھے تھما دیا۔ جو پہلے ہی ٹائپ ہوا پڑا تھا۔ اس حکم کے مطابق مجھے بنگال سیکرٹریٹ میں ملکہ سول سلائیز کا انڈر سیکرٹری تعینات کیا گیا تھا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں بار چھوڑ کر اس لیے تو نہیں آیا تھا کہ گلکتہ کی رائٹرز بلڈنگ میں بینہ کر سیکرٹریٹ کی فائلوں کا پیٹ بھروں۔ انگریز چیف سیکرٹری سے مایوس ہو کر میں سیدھا خواجہ ناظم الدین صاحب کے دفتر میں چلا گیا۔ جو ان دونوں بنگال کے چیف منشیر تھے، اور ان کے گزارش کی کہ مجھے تقط و اور طوفان زدہ علاقے میں کوئی کام دیا جائے۔

خواجہ صاحب بڑے شریف النفس، فرشتہ سیرت لیکن انتظامی امور میں کسی قدر ڈھیلے بزرگ تھے۔ انہوں نے میرا پوسٹنگ آرڈر پڑھا اور بچوں کی سی معصومیت سے سر ہلا کر بولے۔ ”چیف سیکرٹری نے تو تمہاری پوسٹنگ کر دی ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے بڑے ادب سے گزارش کی کہ سب کچھ ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ صوبے کے وزیر اعلیٰ ہیں۔

خواجہ صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ”اچھا بیٹھو، میں کوشش کرتا ہوں۔“ میرا خیال تھا کہ خواجہ صاحب چیف سیکرٹری کو اپنے کمرے میں بلا کر کوئی حکم صادر کریں گے۔ لیکن وہ بچارے خود اٹھئے، اور بنفس نفس چیف سیکرٹری کے کمرے سے تشریف لے گئے۔ وس بارہ من کے بعد واپس آئے اور بڑی بے بی سے سر ہلا کر بولے۔ ”وہ نہیں مانتا، تم دو تین ماہ سیکرٹریٹ میں کام کر لو۔ اس کے بعد میں تمہیں کسی متاثرہ علاقے میں بھجوں دوں گا۔“

میرے دل پر خواجہ ناظم الدین کی شرافت اور بے بی کا یکساں طور پر گمرا اثر ہوا۔ میری ان کے ساتھ پہلے سے کوئی واقفیت نہ تھی اور نہ کسی نے ان کے پاس میری کوئی سفارش کی تھی۔ ایک نہایت جو نیز افسر کی بات اس قدر ہمدردی سے سن کر بذات خود چیف سیکرٹری کے کمرے میں اٹھ کر جانا ہر چیف منشیر کا کام نہیں۔ اور نفی میں

جواب پا کر اسی طرح چپ چاپ لئے پاؤں لوٹ آتا بھی ہر چیف منڈر کا شیعہ نہیں۔

انپی پوسنگ کا یہ حشر دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ بنگال سیکرٹریٹ میں بے کار وقت ضائع کرنے کی بجائے میرے لیے یہی مناسب ہے کہ میں واپس بھار چلا جاؤ۔ چنانچہ خواجہ ناظم الدین کا شکریہ ادا کرنے اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے اسی شام میں تھیسٹر روڈ پر ان کے گھر چلا گیا۔ اس پر آشوب زمانے میں بھی چیف منڈر کی قیام گاہ پر کوئی خاص حفاظتی انتظامات نہ تھے۔ باہر ایک لکڑی کے نیچ پر دو سپاہی لانٹھی سے ٹھیک لگائے اوٹنگ سے رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، اور کوئی کے اندر کیوں جا رہے ہو؟ اندر ایک ملازم بھی دوسری منزل پر لے گیا، جہاں خواجہ صاحب کھلی چھت پر چاندنی میں بیٹھے تھے۔ خواجہ شباب الدین اور حسین شہید سروردی صاحب بھی ان کے پاس تشریف رکھتے تھے۔ دونوں صوبائی وزیر تھے۔ سروردی صاحب کے پاس سعل سپلائز کا محلہ تھا۔

میری رام کہانی سننے کے بعد سروردی صاحب نے کچھ سوال جواب کئے۔ اور پھر خواجہ ناظم الدین سے کہا۔ ”ایک طرف تو یہ روتا ہے کہ ریلیف کے کام کے لیے افسر نہیں ملتے۔ دوسری طرف جب کوئی افسر والنشیر بن کے آتا ہے تو اسے خواہ مخواہ سیکرٹریٹ میں ٹھونسا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے اس نوجوان کو فوراً تملوک بھیج دینا چاہیے۔ وہاں ہمیں اس وقت مسلمان ایس ڈی او کی شدید ضرورت ہے۔“

خواجہ صاحب نے بڑے نور سے اپنا گول مثول سر اثباتمیں ہلایا، اور فرمایا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔“ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔ ”او، بڑا ٹنگ کرتے ہیں آپ بھی۔ کل صبح سروردی صاحب کے دفتر میں پہنچ جانا۔ یہ تمہیں چیف سیکرٹری سے نیا آرڈر دلوا دیں گے۔“

سروردی صاحب مسکراتے اور میرا اثر دیو ختم ہو گیا۔

اگلی صبح دفتر کھلتے ہی میں سروردی صاحب کے آفس میں حاضر ہو گیا۔ وہ خود گیاہ بجے

کے بعد تشریف لائے۔ پہلے تو انہوں نے مجھے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا لیکن جب میں نے رات والی گفتگو کا حوالہ دیا تو انہوں نے مجھے کمرے میں بٹھا لیا۔ کوئی گھنٹہ بھر وہ مختلف کاغذات دیکھتے اور ٹیلیفون پر ٹیلیفون سنتے رہے۔ پھر اچانک میری طرف دیکھا اور حیرت سے بولے۔ ”ہاں جناب“ تو آپ کیا کام لے کر آئے ہیں؟“ میں نے از سر نو چیف منڈر کے گھر پر رات والی گفتگو کا حوالہ دینا شروع کیا، تو ان کی یاد فوراً تانہ ہو گئی۔ ”اچھا“ تو اپنا نام لکھاؤ۔“ انہوں نے قلم ہاتھ میں لے کر کہا۔

میں نے ایک ہی سانس میں اپنا پورا نام بول دیا، تو وہ بگڑ گئے۔ ”ایسے نہیں بھائی، پھر نہ لڑھاؤ۔“ سرورودی صاحب نے کہا۔ ”دھیرے دھیرے سپلنگ کر کے بتاؤ۔“

میں نے اپنے نام کے انگریزی میں یہے کر کے بولنا شروع کیا۔ ”کیو یو ڈی آر اے ٹی ..... قدرت“

سرورودی صاحب نے اپنا قلم ہاتھ سے رکھ دیا، اور سر ہلا کر بولے۔ ”غلط، سرا سر غلط“ کیو کے بعد ہمیشہ دو حروف علت آنا لازی ہے۔ تم U کی جگہ ڈبل O استعمال کیا کرو۔ یا Q کی جگہ K سے اپنا نام لکھا کرو۔“

انگریزی زبان کے اس اہم نکتہ کی وضاحت کے بعد سرورودی صاحب نے چیف سیکرٹری سے ٹیلیفون ملایا، اور گرجدار آواز میں تحکمانہ انداز سے انگریزی میں کہا۔ ”بھار سے ڈیپوٹیشن پر آنے والا ”کیو یو شب“ میرے پاس بیٹھا ہے۔ چیف منڈر کی منظوری کے ساتھ ہم اسے آج ہی تملوک بھیج رہے ہیں۔“

چیف سیکرٹری نے غالباً کسی قسم کا احتجاج کیا ہو گا۔ سرورودی صاحب نے خفگی سے آواز بلند کر کے جواب دیا۔ ”نہ، نہ، یہ فیصلہ فائل ہے۔ پوسٹنگ آرڈر یہاں بھجوا دیجئے۔ ابھی، فوراً ..... میں انتظار کر رہا ہوں۔“

یہ نادر شاہی حکم صادر کر کے سرورودی صاحب نے اپنا کوت اتار کر کری کی پشت پر

لکا دیا۔ کٹھائی کی گہڑہ ڈھیلی کی اور دونوں پاؤں ایک تپای پر رکھ کے اپنی گھونٹے والی کری میں کمر خمیدہ کر کے بیٹھ گئے۔ پہلے کسی انگریزی گیت کے کچھ الفاظ گنگناۓ۔ پھر اسی ٹھون پر سیئی بجائی، اور اس کے بعد تملوک کی تاریخی حیثیت پر یکچھ شروع کیا۔ چینی سیاح، ہیون سانگ نے اپنے سفر نامے میں اس مقام کا ذکر تمراپتا کے نام سے کیا ہے۔ کسی نامے میں یہاں وید پڑھانے کی بہت بڑی پاٹھ شالہ تھی۔ اب بھی کچھ لوگوں کے پاس سنسکرت کی قدم اور نادرستیاں موجود ہیں۔ وارن ہینگر اور لارڈ کلائیو نے ان نوادرات کو برٹش میوزم کے لیے حاصل کرنے کے لیے بہت سے جتن کئے تھے۔ لیکن انہیں پوری کامیابی نہ ہوئی۔

سرور دی صاحب کی عالمانہ تقریر جاری تھی کہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کا ایک انگریز انڈر سیکرٹری دروازے پر دستک دے کر اندر آیا۔ اس نے میری پوسٹنگ کا نیا حکمنامہ سروردی صاحب کے سپرد کیا، اور مجھے قرآنکاروں سے گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔ تملوک کلکتہ سے پچاس میل کے فاصلے پر مدنا پور ڈسٹرکٹ کی سب ڈویژن تھی۔ مدنا پور کا ضلع دہشت پند انقلابیوں کا گڑھ تھا۔ یہاں کے تین انگریز کلکٹر تحریفی عناصر کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے قتل ہو چکے تھے۔ اب کی اس دو ساحلی سب ڈویژن، کوٹھائی اور تملوک، میں سیالب، طوفان اور قحط نے قیامت ڈھا رکھی تھی۔

ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ تملوک کا ایک علاقہ تھا جسے نندی گرام کہتے تھے۔ جب سائیکلوں آیا تو سمندر کی ایک پہاڑ جیسی اوپنی لہر دس باہ کوس تک خشکی میں گھس آئی اور کوئی ڈیڑھ سو مرلے میل کے گنجان آباد رقبے کو صفحہ ہستی سے حرفاً غلط کی طرح مٹا دی گئی۔ اب یہ سارا علاقہ ایک متعدد دلمل کی صورت اختیار کر چکا ہے، جس میں جا بجا بکھری ہوئی انسانی کھوپڑیوں، مویشیوں کے ڈھانچوں اور گلی سڑی ہوئی مجھلیوں کے علاوہ صرف سانپوں کا بسیرا تھا۔ اس وسیع و عریض دلمل میں انواع و اقسام کے چھوٹے بڑے بے شمار سانپ اس طرح سرسراتے پھرتے تھے جس طرح برسات میں تالاب کے کنارے جھیٹکروں اور مینڈکوں کا ہجوم تھا۔ خصوصاً رات کے نائلے میں وہاں کا سماں بڑا

حیرت ناک اور بیبٹ ناک ہوتا تھا۔ سمندری لبروں کی شاہ شاہ کے پس منظر میں سانپوں کے جھنمگئے سے مسلسل ایک پر اسرار ارتعاش بلند ہوتا تھا، جیسے سینکڑوں قلم صیقل شدہ شیشے کی سطح پر بیک وقت تیز تیز چل رہے ہوں۔ کبھی کبھی کھلکھلتی ہوئی سیپیاں سی بھی بجتی تھیں، جس کے بعد سارے میدان پر چند لمحوں کے لیے مکمل سناتا چھا جاتا تھا۔ کبھی کوئی سانپ اندھیرے میں بجلی کی تڑپ کی طرح کوندنے لگتا تھا۔ کبھی کسی جگہ اچانک جگنوں کا جھرمٹ سا ٹھمانے لگتا تھا۔ سانپوں کی آپس میں لڑائی بھی ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے مقابل آ کر پھنکارتے بھی تھے۔ اور دشمن سے مار کھانے کے بعد دم دبا کر بھاگ جانے کا دستور بھی ان کے ہاں بعینہ راجح تھا۔

کلکتہ کی ایک فرم کے کچھ نمائندے بھی نندی گرام پہنچے ہوئے تھے۔ یہ کمپنی زندہ سانپوں کا روبار کرتی تھی اور خاص خاص قسم کے زہر لیے پکڑ کر انہیں یورپ اور امریکہ ایکسپورٹ کیا کرتی تھی۔ ان لوگوں کے پاس سانپ پکڑنے کی عجیب و غریب ترکیبیں تھیں۔ لیکن ان سب کے باوجود انہوں نے ایک نگک دھڑنگ لٹکوٹی پوش جٹا دھاری جوگی بھی اپنے عمل میں شامل کیا ہوا تھا۔ یہ جوگی سوکھی لکڑیوں کا ایک بیہوی الاؤ جلا کر چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اس کے عین نیچے بیٹھ کر سارا دن مala جپتا رہتا تھا۔ اس کے سامنے دو انسانی کھوپڑیاں پڑی رہتی تھیں۔ ایک میں دودھ کم ہوتا تھا، دوسرا میں میں شراب۔ شراب تو غالباً وہ خود نوش فرماتا تھا، اور دودھ پر دم کر کے رات کو اس کے جا بجا چھینتے اڑاتا تھا۔ کہتے ہیں، اس دودھ پر سانپ کمھیوں کی طرح گرتے تھے اور اسے سونگھے یا چکھ کر بے اختیار مدهوش ہو جاتے تھے۔ فرم کے نمائندے ان میں سے اپنی مرضی کے سانپ چھانٹ چھانٹ کر پکڑ لیتے تھے۔

طوفان اور سیلاب کی آفت نندی گرام میں تو زیر نہیں دبے ہوئے سانپوں کو کھینچ کر باہر لے آئی تھی، لیکن تملوک کے باقی علاقوں میں تحفظ کے آلام نے انسان کی فطرت میں سوئے ہوئے سانپوں اور سپولیوں کو شدت سے جنگجوڑ کر بیدار کر دیا تھا۔ انسان کے

باطن کا سارا زہر، سارا ظلم، سارا لائق، ساری حرص و ہوا، ساری خبات، ساری خود غرضی اور ساری بے رحمی سمندر کی جھاگ کی طرح ابل کر باہر نکل آئی تھی اور اشرف المخلوقات کی شرافت اور نجابت نے دیکھتے ہی دیکھتے بر سر عام بری طرح دم توڑ دیا تھا۔ تملوک کے گاؤں گاؤں میں ایسے گھر آباد تھے جن میں صبح و شام چائے بھی بنتی تھی، بجات بھی ابلا تھا، مجھلی بھی تلی جاتی تھی، سالن بھی بگھارے جاتے تھے، کھیر بھی پکتی تھی۔ لیکن مٹھی بھر لوگ یہ نعمتیں بند کواڑوں کے پیچھے ہی پیچھے بینہ کر ڈکار لیے بغیر ہضم کر جاتے تھے۔ ان آسودہ حال گھرانوں کے آگے پیچھے، داسیں باسیں دور دور تک قطار در قطار ایسے جھونپڑے تھے جن میں ہفتوں اور مہینوں سے چراغ جلا تھا نہ چولہما سلگا تھا۔ ان کے کمین مر چکے تھے یا مر رہے تھے۔ کچھ جھونپڑے بالکل غالی تھے۔ کسی میں ایک آدھ لاش دنوں سے بے گور و کفن پڑی سڑ رہی تھی۔ کہیں پر نیم جاں ہڈیوں کے ڈھانچے اپنے دروازوں سے لگے پیلی پیلی، گلی گلی آنکھیں خلا میں گاڑے، خوشحال گھروں سے آنے والی الیتے ہوئے چاولوں کی خوشبو سونگھ سونگھ کر ترقیتے تھے، سکتے تھے، کلبلاتے تھے اور بڑی بے بی سے موت کا انتظار کرنے لگتے تھے۔ لیکن فاقہ کی موت اتنی ارزان نہیں کہ آسانی سے ہاتھ آ جائے۔

بُنی نوع انسان نے موت کا ذائقہ جن جن طریقوں سے چکھا ہے ان میں بھوک کی موت سب سے نیازہ پر عذاب، کرناک اور اذیت وہ ہے۔ اس میں طائر روح ایک جست میں قفس عنصری سے پرواز نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی کا جو ہر رُگ اور نس نس سے کشید ہو کر بدن کے پور پور، مسام مسام، روئیں روئیں سے قطرہ قطرہ دنوں اور ہفتوں پلکتا رہتا ہے۔ آگ پر رکھے ہوئے بال کی طرح جسم تشنج کے حلقوں میں بٹ جاتا ہے۔ پنڈلی پنڈلی سے لپٹتی ہے۔ بانو بازو سے آویزاں ہوتا ہے۔ ہڈیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح جلد میں ابھر آتی ہیں۔ پسلیاں کمان کی طرح تن جاتی ہیں۔ آنکھیں پھرا کر گدلائے ہوئے بنٹوں کی طرح پوپٹوں میں جم جاتی ہیں۔ لیکن دل وہڑکتا رہتا ہے، اور دماغ کا

مرکز اعصاب جسم کی ساری روئیداد کو احساس کے پیانے میں پوری تفصیل سے ریکارڈ کرتا جاتا ہے۔ بھوک میں انسان کا جسم بہت پہلے مر جاتا ہے۔ لیکن اس کا دماغ بڑی دیر تک زندہ رہتا ہے۔ آخری دم تک ذہن کے کسی نہ کسی نہ خانے میں یہ امید ٹھیک رہتی ہے کہ یہ موت عام قضا کی طرح نہ اٹھ ہے نہ لابد ہے، نہ بمبرم ہے، نہ ناگریز ہے۔ شاید ابھی کسی ہمسائے کے گھر سے چاولوں کی ایک پلیٹ آجائے۔ شاید ابھی کوئی راہگیر دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لیے غیب سے نمودار ہو جائے۔ شاید! راحیل خونڈ کر کئی روز سے اسی طرح موت و حیات، امید و یہم کے ٹھیکنے میں جکڑا ہوا اپنی جھونپڑی کے دروازے میں اکیلا پڑا تھا۔ کسی راہگیر یا ہمسائے نے تو اسے دودھ یا چاول لا کر نہیں دیئے تھے، البتہ فرینڈز ایبو لینس یونٹ کی ایک امدادی ٹیم ضرور وہاں آپنچی تھی۔ پاؤڈر ملک، گلوکوز کے ڈبوں، بسکٹوں کے پیکٹوں اور وٹامن کی گولیوں سے بھری ہوئی ان کی جیپ دور ایک درخت کے سائے میں کھڑی تھی۔ مشر رچڑ سائمنڈز فیلابیٹ پنے، کالا چشمہ لگائے جھونپڑی کے عقب میں گھنٹوں کے بل اس طرح دم سادھے بیٹھا تھا جیسے مچھلی کا شکاری کنڈی لگا کر خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ ایک ناریل کے درخت کی اوٹ میں مس بینکر بھی باتینا کوڑ آنکھوں سے لگائے جھونپڑی کی طرف لکھنکلی باندھے بیٹھی تھی۔ جھونپڑی کے قریب ان کا تیرا ساتھی دبے پاؤں مورچہ جما کر مختلف کیسروں سے کھٹاکھٹ تصویریں کھینچنے میں مشغول تھا۔ راحیل خونڈ کر جھونپڑی کے دروازے میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ ابھی مرا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو موم بیٹی کے پچھلتے ہوئے قطروں کی طرح لٹکے ہوئے تھے، اور ایک گیدڑ اس کے پاؤں کی ایڈی میں دانت گاڑے کچر کچر منہ مار رہا تھا۔ راحیل کی ناٹگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ گیدڑ کے منہ سے اپنا پاؤں کھینچ لے۔ یہ ایسا نیا ب منظر تھا جو امریکی فونڈ گرافر کو کہیں اور ملنا دشوار تھا۔ اس لیے جب میری جیپ کی آواز سن کر گیدڑ بھاگ گیا، تو فرینڈز ایبو لینس یونٹ کی امدادی ٹیم نے بڑا برا متلا اور وہ دیر تک آپس

میں زیرِ لب بڑھاتے رہے۔

فرینڈز ایبو لنس یونٹ کی طرح انٹر بیشل ریڈ کراس کے امدادی گروپ بھی وقفہ فوقة تملوک کے مضافات کا چکر کائتے رہتے تھے۔ لیکن ان کا دائرہ کار نیاہ تر غریب خانوں (Houses) کی امداد تک محدود تھا۔

تملوک میں حکومت کی طرف سے مختلف مقامات پر آٹھ غریب خانے کھلے ہوئے تھے۔ ریڈ کراس کی جانب سے ہر غریب خانے کو وقفے وقفے پر دودھ کے ڈبے، گلوکوز، بیکٹ، وٹامن کی گولیاں، صابن اور تیل اچھی خاصی مقدار میں تقسیم ہوتا تھا۔ پورے ہاؤس کے سپردائزر ان اشیاء کو وصول کر کے بڑی پابندی سے قصبوں اور شروں کی دکانوں میں فروخت کر ڈالتے تھے۔ ہر پورے ہاؤس کے رجسٹر میں مکینوں کی تعداد بڑھا چڑھا کر دگنی تکنی درج کی جاتی تھی تا کہ فالتو راشن حکومت سے وصول کر کے با آسانی بلیک مارکیٹ میں بکتا رہے، مکینوں کو بھی ان کی مقررہ مقدار سے کبھی نصف خوراک ملتی تھی، کبھی نصف سے بھی کم۔ چائے، چینی اور دودھ روزانہ وصول ہوتا تھا، لیکن تقسیم اسی روز ہوتا تھا جب کوئی بلا افسر معلمے پر آیا ہوا ہو۔

غریب خانے میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے بھوک اور افلاس کافی شرط نہ تھے۔ سب سے پہلے گاؤں یا علاقے کا نکھیا، زمیندار یا معزز شری ایک پرچی جاری کرتا تھا۔ جس میں متاثرہ افراد کی تعداد، نام، ولدیت، سکونت، اخلاقی کردار اور سیاسی رہنمائی کے کوائف کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ اس کے بعد سرکل افسر اس پرچی کی تصدیق کرتا تھا۔ ان دونوں مرحلوں میں تاخیر و تعویق کے بڑے امکان تھے۔ لیکن اگر خوش قسمتی سے کسی خاندان میں کوئی جوان اور قبول صورت لڑکی بھی شامل ہے تو ہر مرحلے پر وہ بڑے موثر پروانہ راہداری کا کام دے سکتی تھی۔ غریب خانے میں داخل ہونے کے بعد بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہی رہتا تھا۔ بچوں اور بوڑھوں کو تو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تھا لیکن سپردائزر سے لے کر شور کلرک، اکاؤنٹ کلرک، باورچی، سقہ، مہتر سب اپنی اپنی توفیق کے مطابق جوان عورتوں کی پذیرائی میں منمک ہو جاتے تھے۔ کوئی انہیں

چوری چوری خوشبو دار صابن کی نکیاں دیتا تھا، کوئی دودھ کا ڈبہ، کوئی بسکٹ، کوئی سگریٹ، کوئی وٹامن کی گولیاں ..... غریب خانہ ہو یا راحیل خونڈ کر کی جھونپڑی، بھوک کی منڈی میں جسم، جاں اور جس کا ایک ہی ریٹ تھا۔

ایک روز میں ایک پورے ہاؤس کا معاشرہ کر رہا تھا تو چودھ پندرہ برس کی ایک بے حد حسین و جمیل بچی کو دیکھا، جو اپنی نیم جاں ماں کا سر اپنی گود میں رکھے سب سے الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ اس کا نام نور جمال تھا۔ اگر اس کے ہاتھ میں دو کبوتر ہوتے اور شنزراہہ سلیم اسے دیکھ لیتا تو غریب خانے کی بجائے وہ تاج پہنے کسی محل میں بیٹھی ملکہ عالم کھلاتی۔

پورے ہاؤس کا سارا عملہ بڑی بے چینی سے اس کی ماں کے مرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے منہ سے گز گز بھر کی رال لٹکتے دیکھ کر میں نے ماں بیٹی کو اٹھا کر اپنی جیب

میں ڈالا، اور انہیں قریب کے ایک گاؤں کولا گھاٹ لے گیا۔ وہاں پر ایک کھاتے پیتے مسلمان زمیندار حاجی عبدالرحمٰن رہتے تھے۔ وہ خدمت خلق کے لیے مشور تھے۔ اور وار فند، ریڈ کراس فند، سیالاب ریلیف فند وغیرہ میں بڑی فیاضی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ ان کی عمر ستر برس سے اوپر تھی۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر وہ ان ماں بیٹی کو اپنے ہاں پناہ دے دیں، تو یہ بڑے ثواب کا عمل ہو گا۔ حاجی صاحب بڑی گرمجوشی سے رضا مند ہو گئے۔ بچاری ماں تو چند روز میں اللہ کو پیاری ہو گئی، اور پھر یہ خبر ملی کہ اس کا چالیسوائی کرنے کے بعد حاجی صاحب نے خود نور جمال سے فی سبیل اللہ نکاح کر لیا ہے۔ اگر حاجی صاحب اس کا رخیر میں تاخیر کرتے، تو ان کے کئی بیٹے بھی یہ ثواب کمانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے بے قرار تھے۔

غریب خانوں کے علاوہ تحط اور طوفان زدہ لوگوں کی مدد کے لیے تملوک میں سیالاب کی روک تھام کے چھ سات بند بھی تغیر ہو رہے تھے۔ یوں تو ان بندوں کا مقصد سمندری لہروں کو خشکی میں آنے سے روکنا تھا، لیکن دراصل ان بندوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ان کی تغیر کے بہانے مقامی آبادی کو محنت مزدوری کر کے روزگار کمانے کا موقع

فراہم کیا جائے۔ ان بندوں کی تغیر کے متعلق بھی عجیب و غریب شکایات سننے میں آتی تھیں۔ ایک روز میں بائیکل پر سوار ہو کے سب سے بڑے بند کا معائنہ کرنے اچانک وہاں پہنچ گیا۔ وہاں پر نہ کسی زیر تغیر بند کا نام و نشان تھا، نہ کہیں کوئی مزدور کام کر رہے تھے۔ ایک چھوپداری میں البتہ ٹھیکیدار کے پاس پی ڈبلیو ڈی کا کچھ عملہ بیٹھا ہوا تاثری پی رہا تھا۔ مزدوروں کی حاضری کے رجسٹر (Muster Roll) میں ڈیڑھ سو کارندوں کی حاضری کے انگوٹھے بڑی باقاعدگی سے لگے ہوئے تھے، اور اس روز کے لیے ان کی مزدوری کی رقم بھی تقسیم ہو چکی تھی۔ ٹھیکیدار کے عملے میں دو تین شخص ایسے تھے جو پچھلے دو ماہ سے لگاتار فرضی مزدوروں کے نام پر رجسٹر میں ہزاروں جعلی انگوٹھے ثبت کر رہے تھے۔ اس عمل میں ان کے دامیں ہاتھ کے انگوٹھے پھٹ کر زخمی ہو چکے تھے۔ باقی کے تمام بندوں پر بھی غبن، خیانت اور بد دیانتی کا کم و بیش ایسا ہی بازار گرم تھا۔

انہی دنوں کلکتہ سے اچانک ایک فوجی افسر کرٹل سمتہ تملوک میں وارد ہوا۔ اس کے ساتھ سی آئی ڈی کے دو انگلو انڈین انسپکٹر بھی تھے۔ انسپکٹر تو ریست ہاؤس میں ٹھہرے اور کرٹل سمتہ کو میں نے اپنا مہمان بنا لیا۔ تینوں صبح سوریے اپنی جیپ میں بیٹھ کر نکل جاتے تھے اور کافی دن ڈھلنے واپس لوئتے تھے۔ ایک روز قیامت کی گری تھی۔ شام کے وقت کرٹل سمتہ اپنی گشت سے واپس آیا تو پینے میں شرابور تھا۔ وہ اپنے فوجی بوٹ اور اونی جراییں اتار کر میرے پاس برآمدے میں آیا اور دونوں پاؤں ایک تپائی پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان پینے اور میل سے جبی ہوئی کیٹ کو مسل مسل کر کھرچ کر دیر تک کریدتا رہا، اور اس کی گولی سی بنا کر منہ میں ڈال لی۔ ایک پاؤں سے فارغ ہو کر اس نے دوسرا پاؤں کی انگلیوں کی کیٹ بھی بڑے اہتمام سے کھرچ کر چاٹی اور ”ٹو جیم“ (Toe Jam) کے جملہ فوائد پر کچھ بے ربط سی تقریر بھی کی۔ اس کے بعد کرٹل سمتہ نے نہایت راز داری سے مجھے مطلع کیا کہ وائرس ائے ہند لارڈ ویول تھوڑے اور سیلاپ زدہ علاقوں

کا دوہر کر رہے ہیں۔ کل وپر ساڑھے باہہ بجے کے قریب وہ ہوائی جہاز کے ذریعہ نندی گرام بھی پہنچیں گے۔ ان کے دورے کا انتظام سول افروں کی ذمہ داری نہیں، بلکہ یہ سارا بندوست فوج کے ڈویشل ہیڈ کوارٹر کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ کل صبح کرنل سمته مجھے اپنی جیپ میں نندی گرام ضرور لے جائیں گے، تا کہ وائزرائے کے معائنے کے وقت میں موقع پر موجود رہوں۔

وہ رات میں اپنے گھر میں قریباً نظر بندی کی حالت میں گزاری۔ سی آئی ڈی کے دونوں انگلو انڈین اسپکٹر بھی ریست ہاؤس سے میرے ہاں اٹھ آئے تھے۔ منہ سے کچھ کہے بغیر انہوں نے گھر کا کٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میری اور میرے ملازموں کی نقل و حرکت پر کچھ ایسی غیر محسوس سی پابندی عائد ہو گئی کہ نہ ہم کسی سے مل سکتے تھے اور نہ باہر کا کوئی آدمی ہم سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔ غالباً یہ احتیاطی تدابیر وائزرائے کے دورے کو صیغہ راز میں رکھنے کے لیے اختیار کی گئی تھیں۔ کیونکہ تملوک کی سیاست میں دہشت پندوں کا عضر نمایاں طور پر غالب تھا۔

اگلے روز جب میں کرنل سمته کے ساتھ نندی گرام پہنچا، تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ بہت سے فوجی ٹرک پلے ہی سے وہاں پہنچے ہوئے تھے اور برٹش فوج کا ایک دستہ حفاظتی پوزیشن لیے باقاعدہ ڈیوٹی پر ایستادہ تھا۔ نندی گرام کے قریب کئی میل لمبا ریتلہ سمندری ساحل تھا۔ ایس ڈی او کے ریکارڈ روم میں ایک پرانی مطبوعہ مسل (Printed File) تھی جس میں گورز جزل کے طور پر وارن ہینٹنگز نے حکم دیا تھا کہ اس مقام کو باقاعدہ سمندری سیرگاہ کے طور پر ترقی دی جائے۔ آج اس جگہ سیپرز اور ملنرز (Miners and Miners) کے کچھ جوانوں نے جہاز اترنے کے لیے ایک ہنگامی ائیر سٹرپ (Air Strip) (Sapper) بھی تیار کر رکھی تھی۔

ٹھیک ساڑھے باہہ بجے فوجی ڈکوٹا آیا۔ وائزرائے کے ہمراہ بنگال کے گورز رور فورڈ اور تین فوجی افسر تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے بندوقوں، راکفلوں، نامی گنوں اور مشین گنوں کے سائے میں کھڑے ہو کر نندی گرام کی دلمل میں بکھری ہوئی انسانی کھوپڑیوں

اور حیوانی ڈھانچوں کا نظارہ کیا۔ پھر کرنل سمتہ کی قیادت میں معزز مہمان ایک قربی پورہ ہاؤس میں گئے جس کی تانہ تانہ صفائی ہوئی تھی، اور ساری فضا فینائل اور لشرين کی خوبیوں سے ممکنی ہوئی تھی۔ کچھ بچوں نے وائسرائے کو گیندے کے پھول پیش کئے۔ غریب خانے کے پردازرنے کچن کے قریب آج کے کھانے کا نمونہ دکھایا جو چاول، مچھلی اور دہی پر مشتمل تھا۔ سوریکپر نے پاؤڈر ملک، گلوکوز، صابن، ٹوٹھ پیسٹ، وٹامن کی گولیوں، کپڑوں اور کمبلوں کے اشاك دکھائے۔ کچھ بوڑھی عورتوں نے ہاتھ جوڑ کر وائسرائے کو سلام کیا اور غریبوں کے مائی باپ کو زور زور سے کورس میں دعائیں دیں۔

اس کے بعد Procurement Agent کے گودام کی باری آئی۔ ایجنت کا نمائندہ اپنے بھی کھاتوں کو ایک اسٹول پر سجائے پہلے سے منتظر تھا۔ گودام میں ڈھائی ڈھائی من دھان کی پانچ ہزار بوبیاں تھیں، جو نمایت سیقیت سے ایک دوسری کے اوپر تھے در تھے رکھی ہوئی تھیں۔ نمائندے نے دھان کو چھوپ، کیڑے مکوڑوں اور نمی کے اثرات سے بچانے کے لیے حفاظتی اقدامات کی تفصیل بیان کی اور وائسرائے کے ملاحظہ کے لیے ایک گوشوارہ پیش کیا، جس میں بتایا گیا تھا کہ تملوک کی سب ڈویژن میں ان کے گوداموں میں ایک لاکھ بیس ہزار من دھان کا اشاك موجود ہے۔ وائسرائے نے نمائندے کو شباباش دی۔

اس کے بعد وائسرائے کی پارٹی ہوائی جہاز کے پاس واپس آگئی۔ لنج کا نائم ہو گیا تھا۔ ایک فوجی افسر نے ہیلی کاپڑ سے ایک خاصی وزنی پکنک باسکٹ نکالی اور سب نے ناریل کے درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر لنج کیا جو ابلے ہوئے انڈوں، کولڈ چکن، سور کے گوشت کے سینڈوچ، پیشتری اور برفلی بیسٹ پر مشتمل تھا۔ ایک افسر نے کسی قدر بے دل سے مجھے بھی ایک انڈا اور پیشتری پیش کی، لیکن میں نے معدرت کر لی کیونکہ ماہ رمضان کی وجہ سے میرا رونہ تھا۔

لنج کے اختتام پر لارڈ ویول نے غالباً ایسے ہی رسمی خوش سگالی کے طور پر مجھ سے دیافت

کیا کہ اس سب ڈویژن کے عوام کی فلاج و بہبود کے لیے میرے ذہن میں کوئی خاص تجویز ہے؟

موقع غنیمت جان میں نے کھٹ سے اپنی ایک ولپسند تجویز پیش کر دی ہے اس سے پیشتر ملکتہ میں ریلیف کمشنز کے سامنے پیش کر کے میں کئی بار منہ کی کھا چکا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ تملوک کی سب ڈویژن میں جو لاکھ سوا لاکھ من دھان ایجنٹوں کے گوداموں میں مقفل پڑا ہے، اس کا کم از کم نصف حصہ بھوک کے مارے ہوئے نادار لوگوں میں مفت تقسیم کر دیا جائے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ نیاہ سے نیاہ مستحق لوگوں میں مفت تقسیم کر دیا جائے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ نیاہ سے نیاہ مستحق لوگوں کو نیاہ سے نیاہ بچ بچ کا فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔

میری تجویز سنتے ہی واٹسرائے کی پارٹی پر ایک عجیب سی سرد مری چھا گئی۔ گورنر رور فورڈ نے اپنی آنکھوں کے گوشے سمیٹ کر مجھے ترچھی نظر سے گھورا۔ لارڈ ویول نے اپنی برف جیسی پتھر کی آنکھ میرے چہرے پر بڑی تختی سے گاڑی۔ اور فوجی افسروں نے بے اعتنائی، حقارت اور خفیگی کے ملے جلے انداز سے اپنے کندھوں کو اچکایا۔ میری تجویز پر اس خاموش تبصرے کے بعد واٹسرائے کی پارٹی تملوک سے رخصت ہو گئی۔

چند ماہ بعد اچانک سمندر کے جوار بھائی میں ایک بار پھر جوش انٹھا۔ اور تملوک کی دو ندیوں میں غیر معمول سیلاب آگیا۔ ان دو ندیوں کے درمیان آنکھ دس گاؤں آباد تھے، جو چاروں طرف سے پانی میں گھر کر باقی دنیا سے بالکل کٹ گئے۔ پانی کی دھار اس قدر تیز تھی کہ کشتیوں کے ذریعہ بھی گھری ہوئی آبادی تک پہنچنا دشوار تھا۔ رسول و رسائل کے ذرائع منقطع ہوتے ہی وہاں پر فاقہ کی موتلوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ سیلاب سے گھرے ہوئے علاقے میں ایک گودام تھا، جس میں آنکھ ہزار من دھان بوریوں میں بند پڑا تھا۔ میں نے تار پر تار دے کر صوبائی حکومت سے درخواست کی، اس گودام سے کچھ غلمہ متاثرہ آبادی میں تقسیم کرنے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔

لیکن وہاں سے کوئی جواب آتا تھا نہ آیا۔ ایک روز گودام کے آس پاس تین بچوں اور دو عورتوں کی لاشیں پائی گئیں۔ اب مزید انتظار فضول ہی نہیں بلکہ مجرمانہ غفلت کے متراوف تھا۔ چنانچہ میں نے کاگریں، مسلم لیگ اور فارورڈ بلاک سے ایک ایک نمائندہ چن کر پولیس کی سرکردگی میں گودام کا تالہ تزوا دیا، اور آدھا دھان ان کے حوالے کر دیا۔ اس کمیٹی نے بڑی محنت اور ایمانداری سے یہ غلہ سیالب زدہ دیبات کے مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

میں نے اس کمیٹی میں ہندو سجھا کا نمائندہ جان بوجھ کر شامل نہیں کیا تھا۔ اس پر مہا سجھائی لیڈر ڈاکٹر شیام پرشاد مکر جی نے گلکتہ کے اخباروں میں میرے خلاف بڑے سخت بیان دیئے۔ Procurement Agent کے وکیل نے مدنا پور کی سول کورٹ میں میرے خلاف کئی لاکھ روپے کے ہرجانہ کا دعویٰ دائر کر دیا۔ بنگال کے چیف سیکرٹری نے ایک بے حد روکھے سے خط میں مجھے صوبائی حکومت کی بے اطمینانی، ناپسندیدگی اور خفگی سے آگاہ کیا اور میری خدمات صوبہ بھار کو واپس کر دیں۔ بھار کے چیف سیکرٹری نے ایک اسی قدر روکھی ٹیلیگرام کے ذریعہ غالباً سزا کے طور پر میرا تبادلہ اڑیسہ کر دیا۔

مدنا پور کے سپرننڈنٹ پولیس کے زیر انتظام تملوک سے میری روانگی راتوں رات کچھ اس طرح بعینہ راز عمل میں آئی جیسے کچھ عرصہ قبل لارڈ ویول نے خفیہ طور پر نندی گرام کا دوہہ کیا تھا۔ اگلی صبح مسلم لیگ، کاگریں اور فارورڈ بلاک کے والنتیر اپنے پروگرام کے مطابق ایس ڈی او کی کوئی پر میرے تبادلے کے خلاف احتجاجی پیکنگ کرنے جمع ہو گئے۔ مجھے غیر موجود پا کر وہ مشتعل ہو گئے۔ اور انہوں نے گھر پر حملہ کر دیا۔ میرے سامان میں جو اشیاء پولیس والوں کو پسند آئیں، وہ انہوں نے حملہ آوروں کے نام لگا کر اپنے پاس چن کر رکھ لیں اور بچا کھچا اسباب کچھ دنوں کے بعد میرے پاس اڑیسہ روانہ کر دیا۔

## • بُللا کماری کا بے چین روح

کلک پہنچ کر میں نے اڑیسہ کے چیف سیکرٹی مسٹر آر ڈبلیو ولیمز کو اپنی آمد کی اطلاع دی تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ غالباً اسے تردود تھا کہ جنگ کے زمانے میں خوراک کے ذخیرے کا تالا توڑ کر چار ہزار من دھان بھوکے لوگوں میں مفت تقسیم کرنے والے ایس ڈی او کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ چند روز کی پیش بیض کے بعد آخر مسٹر ولیمز نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس زمانے میں ایک آئی سی ایس دوسرے آئی سی ایس کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ اور میری پوسٹنگ برہام پور گنجم کے ایس ڈی او اور ساورا اجنبی کے سب ایجنس ٹو گورز کے طور پر ہو گئی۔

اگرچہ اس علاقے میں مسلمانوں کی آبادی ایک فیصد سے بھی کم تھی، لیکن کسی زمانے میں یہاں مسلمان بادشاہوں کا خزانہ ہوا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے برہام پور کے ساتھ ”جنگ عام“ کا لقب لگا ہوا تھا، یہ لقب گزر کر گنجم بن گیا تھا۔

برہام پور کے قریب ایک بستی چکا کول نام کی تھی۔ دراصل اس کا اصلی نام ”سکہ کھول“ تھا کیونکہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں یہاں نکال قائم تھی۔

مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد صرف شروع اور قصبوں کے نام ہی نہیں بگڑے تھے بلکہ برہام پور کے کچھ دور افقارہ علاقوں میں مسلمانوں کی اپنی حالت بھی عبرتاک حد تک ناگفته ہے تھی۔ سنگاخ پہاڑیوں اور خاردار جنگل میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جس میں مسلمانوں کے بیس پچیس گھر آباد تھے۔ ان کی معاشرت ہندوانہ اثرات میں اس درجہ ڈوبی ہوئی تھی، کہ رویش علی، صدر پانڈے، محمود مہنستی، کلثوم دیوی اور پر بھادی جیسے نام رکھنے کا رواج عام تھا۔ گاؤں میں ایک نہایت مختصر کچی مسجد تھی، جس کے دروازے پر اکثر تالا پڑا رہتا تھا۔ جمعرات کی شام کو دروازے کے باہر ایک مٹی کا دیا جلایا جاتا تھا۔ کچھ لوگ نہا دھو کر آتے تھے اور مسجد کے تالے کو عقیدت

سے چوم کر ہفتہ بھر کے لیے اپنے دینی فرائض سے بکدوش ہو جاتے تھے۔

ہر دوسرے تیرے میں ایک مولوی صاحب اس گاؤں میں آ کر ایک دو روز کے لیے مسجد کو آباد کر جاتے تھے۔ اس دوران میں اگر کوئی شخص وفات پا گیا ہوتا تو مولوی صاحب اس کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے تھے۔ نوزائیدہ بچوں کے کان میں اذان دیتے تھے۔ کوئی شادی طے ہو گئی ہوتی تو نکاح پڑھوا دیتے تھے۔ بیماروں کو تعویذ لکھ دیتے تھے اور اپنے اگلے دورے تک جانور ذبح کرنے کے لیے چند چھریوں پر تکمیر پڑھ جاتے تھے۔ اس طرح مولوی صاحب کی برکت سے گاؤں والوں کا دین اسلام کے ساتھ ایک کپا سارشہ بڑے مضبوط دھانگے کے ساتھ بندھا رہتا تھا۔

برہام پور گنجم کے اس گاؤں کو دیکھ کر زندگی میں پہلی بار میرے دل میں مسجد کے ملا کی عظمت کا کچھ احساس پیدا ہوا۔ ایک زمانے میں ملا اور مولوی کے القاب علم و فضل کی علامت ہوا کرتے تھے۔ لیکن سرکار انگلشیہ کی عملداری میں جیسے جیسے ہماری تعلیم اور ثقافت پر مغربی اقدار کا رنگ و روغن چڑھتا گیا، اسی رفتار سے ملا اور مولوی کا تقدس بھی پاماں ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ یہ دونوں تعظیمی اور تحریکی الفاظ تفحیک و تحقیر کی ترکش کے تیر بن گئے۔ داڑھیوں والے ٹوٹھ اور ناخواندہ لوگوں کو مذاق ہی مذاق میں ملا کا لقب ملنے لگا۔ کالجوں، یونیورسٹیوں اور دفتروں میں کوٹ پتلون پہنے بغیر دینی رجحان رکھنے والوں کو ظفر و تشنج کے طور پر مولوی کہا جاتا تھا۔

مسجدوں کے پیش اماموں پر جمراۃ، شبراۃ، عیدی، بقر عیدی اور فاتحہ درود پڑھ کر روٹیاں توڑنے والے قل اعوفے ملاؤں کی پھبٹیاں کسی جانے لگیں۔ لو سے جلسی ہوئی گرم دوپھروں میں خس کی ٹیکاں لگا کر پنکھوں کے نیچے بیٹھنے والے یہ بھول گئے کہ محلے کی مسجد میں ظهر کی اذان ہر روز عین وقت پر اپنے آپ کس طرح ہوتی رہتی ہے؟ کڑکڑاتے ہوئے جائزوں میں نرم و گرم لحافوں میں لپٹنے ہوئے اجسام کو اس بات پر کبھی حیرت نہ ہوئی کہ اتنی صبح منہ اندر ہرے اٹھ کر فجر کی اذان اس قدر پابندی سے کون دے جاتا ہے؟ دن ہو یا رات، آندھی ہو یا طوفان، امن ہو یا فساد، دور ہو یا نزدیک، ہر

زنانے میں شر شر، گلی گلی، قریہ قریہ، چھوٹی بڑی، کچھی کچھی مسجدیں اسی ایک ملا کے دم سے آباد تھیں جو خیرات کے نکشوں پر مدرسون میں پڑا تھا، اور در بدر کی ٹھوکریں کھا کر گھر بار سے دور کیسی اللہ کے کسی گھر میں سر چھپا کر بیٹھ رہا تھا۔ اس کی پشت پر نہ کوئی تنظیم تھی، نہ کوئی فنڈ تھا، نہ کوئی تحریک تھی۔ اپنے کی بے اعتمانی، بیگانوں کی مخاصمت، ماحول کی بے حسی اور معاشرے کی کچھ ادائی کے باوجود اس نے نہ تو اپنی وضع قطع کو بدلا اور نہ اپنے لباس کی مخصوص وردی کو چھوڑا۔ اپنی استعداد اور دوسروں کی توفیق کے مطابق اس نے کہیں دین کی شمع، کہیں دین کا شعلہ، کہیں دین کی چنگاری روشن رکھی۔ برہام پور گنجم کے گاؤں کی طرح جہاں دین کی چنگاری بھی گل ہو چکی تھی، ملانے اس کی راکھ ہی کو سمیت سمیت کر باد مخالف کے جھونکوں میں اڑ جانے سے محفوظ رکھا۔ یہ ملا ہی کا فیض تھا کہ کہیں کام کے مسلمان، کہیں نام کے مسلمان، کہیں محض نصف نام کے مسلمان ثابت و سالم و برقرار رہے۔ اور جب سیاسی میدان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی درمیان آبادی کے اعداد و شمار کی جنگ ہوئی تو ان سب کا اندرج مردم شماری کے صحیح کالم میں موجود تھا۔ بر صغیر کے مسلمان عموماً اور پاکستان کے مسلمان خصوصاً ملا کے اس احسان عظیم سے کسی طرح بسکدوش نہیں ہو سکتے۔ جس نے کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی حد تک ان کے تشخض کی بنیاد کو ہر دور اور ہر زمانے میں قائم رکھا۔

مسلمانوں کی اس انتہائی پسمندہ تھوڑی سی تعداد کے علاوہ، برہام پور گنجم میں ایک اور علاقہ تھا جسے ساورا ایجنسی کہا جاتا تھا۔ اس ایجنسی کا لفظ و نطق براہ راست گورز کے ماتحت تھا، اور مقامی ایس ڈی او اس مقصد کے لیے سب ایجنسٹ ٹو گورز کہلاتا تھا۔ ساورا ایجنسی بے حد سنگلاخ پہاڑوں اور انتہائی دشوار گزار جنگلوں کے درمیان واقع تھی۔ بھیل، گونڈ اور دراوڑ جیسے قدیمی قبائل کی طرح یہاں پر ساورا قوم آباد تھی۔ ان کی اپنی زبان تھی، اپنا لباس تھا اور اپنی الگ طرز معاشرت تھی۔ مرد صرف لگوٹھی باندھتے تھے، عورتیں

کمر سے گھٹنوں تک کپڑا لپیٹتی تھیں اور بچے بالکل ننگ دھڑنگ رہتے تھے۔ جو کی روئی اور شکار کے گوشت پر ان کا گزارا تھا اور پینے کے لیے وہ وسیع پیانے پر جو کی شراب کشید کرتے تھے۔ ان پر اچھیں لوگوں میں نہ جھوٹ بولنے کی عادت تھی، نہ چوری کا رواج تھا، نہ ڈاکہ نہیں کا نہ دھوکہ اور فریب کا۔ ان کی لڑائیاں فقط زن اور نشن پر ہوتی تھیں۔ زرا بھی ان کی زندگی پر مسلط نہیں ہوا تھا، کیونکہ ان کا معاشی نظام چیز کے بدلتے چیز کے دلیں دین پر مبنی تھا۔

ساورا ایجنسی میں پولیس کی ایک چھوٹی سی چوکی تھی، لیکن اسے کسی واردات میں تنقیش کی زحمت گوارا کرنے کا کبھی موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اگر کسی قتل ہو بھی جاتا تھا تو ملزم مقتول کی گردن کاٹ کر اسے بالوں سے کپڑا کر ہاتھ میں لٹکائے خود پولیس کی چوکی پر حاضر ہو جاتا تھا۔ عدیلیہ اور انتظامیہ کے اختیارات سب ایجنت ٹو گورز کے پاس تھے۔ لیکن وکیلوں کو کسی مقدمے میں پیش ہونے کی اجازت نہ تھی۔

وکیلوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے بھی ایجنسی کے داخلہ پر کڑی پابندی تھی۔ سفر کی دشواریوں کے علاوہ ایجنسی کے علاقے کی آب و ہوا ناخوشگوار تھی، زہریلے حشرات الارض کی بھرمار تھی، اور کالا آزاد یرقان اور گردن توڑ بخار جیسی یہاریوں کی دبا عام تھی۔ باہر کے لوگوں میں سے صرف دو شخص ایسے تھے، جو وہاں مدت سے قیام پذیر تھے۔ ایک تو ہسپانوی عیسائی مشنری تھا جو ساورا نیان اور تاریخ کا ماہر تھا اور عرصہ دس برس سے وہاں جم کر بیٹھا ہوا مسیحیت کی تبلیغ میں دل و جان سے مصروف تھا۔ تبلیغ کے ساتھ وہ کسی قدر علاج معالجہ بھی کرتا تھا۔ لیکن دس سال کے طویل عرصہ میں وہ صرف چار آدمیوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تو ہسپانوی مشنری کا اسنٹ بن کر اس کے ساتھ ہی مقیم تھا۔ باقی تین گلکٹہ کے ایک مسیحی ادارے میں مشنری بننے کی ٹریننگ حاصل کر رہے تھے۔ وقتہ فوقہ کچھ اسلامی ایجنسیں اور آریہ سماجی سگھنٹوں بھی اس علاقے میں تبلیغ کرنے کی اجازت مانگتے رہتے تھے، لیکن انگریز گورز ہمیشہ

انکار کر دیتا تھا۔

باہر کا دوسرا آدمی جو ساورا ایجنسی میں دس پنڈوں برس سے قیام پذیر تھا، ایک پنجابی سکھ سردار ہر نام سنگھ تھا۔ اس علاقے میں خود روکیوڑا کثیر مقدار میں آگتا تھا۔ سردار جی طویل مدت کے لیے اس کا حکیم لے کر کیوڑے کی تجارت کرتے تھے۔ وہ ساورا زبان بڑی روانی سے بولتے تھے، اور کپڑوں سے بے نیاز کچھرا پہنے، کمر سے کپان باندھے، کیس کھولے مقامی لوگوں کی طرح ان میں مکمل طور پر گھل مل کر رہتے تھے۔ سردار صاحب نے ساوروں سے شراب کشید کرنے کا راز پالیا تھا، اور وہ سارا دن ایک ملنکے سے گلاس بھر بھر کر پانی کی طرح جو کی شراب پیتے رہتے تھے۔

ساورا قوم اعتقاداً مظاہر پرست تھی۔ پوچا تو غالباً وہ کسی چیز کی نہ کرتے تھے، لیکن بھوت پریت کے قائل تھے اور سنگ و شجر، آب و آتش، باد و باراں میں روح کی حاضرات پر عقیدہ رکھتے تھے۔ بتت کے لاماؤں کی طرح ان کا روحانی پیشوائی بھی بڑی شدید اور کٹھن بیاضتیں کاٹتا تھا۔ اور اپنے باطنی تصرفات سے لوگوں کو علاج معالجه بھی کرتا تھا، ان کے دل کی مرادیں بھی بر لاتا تھا، موت و حیات کی رسومات بھی نجاتا تھا، پولیس کی چوکی میں ان کے معاملات کی پیروی بھی کرتا تھا، اور گورنر کے سب ایجنت کی عدالت میں ان کے مقدمات کی وکالت بھی کرتا تھا۔

سب ایجنت کی حیثیت سے مجھے ہر دوسرے ماہ دس بارہ دن کے لیے ساورا ایجنسی کا دوہر کرنا پڑتا تھا۔ ان دوڑوں پر ہم بچوں کے لیے رنگ برنگی میٹھی گولیاں، عورتوں کے لیے کانچ کی چوٹیاں، منکوں کے ہار، پتیل اور تانبے کی بالیاں، اور مردوں کے لیے چاقو چھریاں اور ریڑ کے چپل تھنے کے طور پر بانٹنے کے لیے اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ ایجنسی میں سرکاری نسخ پر سالم بکرے کی قیمت دو روپے تھی۔ ایک روپے میں آٹھ مرغیاں آ جاتی تھیں، اور چار آنے میں پچاس انڈے مل جاتے تھے۔ ساورا قبیلے کو ہر بات میں حکومت کا دست نگر رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ انہیں روپے پیسے کی قدر و قیمت سے نا آشنا رکھا جائے۔ چنانچہ ان چیزوں کی تجارت قطعی طور پر ممنوع تھی اور کھانے

پینے کی اشیاء کو ایجنسی سے باہر لانے پر کڑی پابندی تھی۔

ساورا ایجنسی کے طول و عرض میں کوئی سڑک نہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے جنگلی راستے اور پاڑی گلڈنٹیاں تھیں، جن پر دوہ کرنے کے لیے مجھے ایک سرکاری ہاتھی ملا ہوا تھا۔ یہ ہاتھی برس سے اسی خدمت پر مامور تھا اور ہر نئے ایس ڈی اس کے ساتھ ۷ بڑی جلدی نہایت خوشگوار تعلقات استوار کر لیتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی سونڈ متک پر رکھ کر سلام کرتا تھا اور پھر انعام کے طور پر کسی کھانے کی چیز کا انتظار کرنے لگتا تھا۔ اگر کسی سلام کے بعد اسے اپنا متوقعد انعام نہ ملے، تو وہ روٹھ جاتا تھا اور اگلی بار سونڈ ماتھے پر رکھنے کی بجائے ایسے ہی بے اعتنائی سے پنڈوم کی طرح ہوا میں گھماتا رہتا تھا۔

ہاتھی پر سوار ہونے کے لیے ہودج کے ساتھ بانس کی ایک چھوٹی سی یہڑھی لٹکتی رہتی تھی۔ لیکن ہاتھی کی اپنی خواہش یہی ہوتی تھی کہ میں اس کی سونڈ کے ساتھ لپٹ جاؤں اور وہ مجھے گیند کی طرح اچھال کر اپنی گردن پر ڈال دے۔ کبھی کبھی اس کی خوشنودی برقرار رکھنے کے لیے ایسا بھی کرنا پڑتا تھا لیکن ہاتھی پر سوار ہونے کا آسان ترین طریقہ یہ تھا کہ ایک آدمی اس کی دم کو باسیں طرف کھینچ کر پاسیدان سا بنا لیتا تھا اور دوسرا اس پر قدم رکھ کر پیٹھ پر کوڈ جاتا تھا۔ ایک روز میں ہاتھی پر سوار ساورا ایجنسی کے ایک گھنے جنگل سے گزر رہا تھا، کہ سامنے ایک درخت کے شاخوں سے بڑا موٹا سانپ لکھتا ہوا دکھائی دیا۔ سانپ کو دیکھتے ہی ہاتھی نے سونڈ اٹھا کر زور کی جیخ ماری اور پھر پیٹھ پھیر کر اس قدر بے تحاشا بھاگا کہ ہمارا ہو وہ درختوں سے نکلا نکلا کر نہیں پر گرنے کے قریب آگیا۔

ہاتھی جب خوف اور غصے کی حالت میں بھاگ نہ رہا ہو، تو اس کی چال بڑی مستانہ ہوتی ہے۔ اس کے ہنگلوں میں روانی اور تناسب کا ایسا قاعدہ تو اتر ہوتا ہے، کہ مجھے تو اس کی پیٹھ پر بیٹھتے ہی نیند کا خمار چڑھنے لگتا تھا۔ تعجب نہیں کہ راجوں، مہاراجوں اور بادشاہوں

کی یہ پسندیدہ سواری رہی ہے۔ خواب غفلت میں سرشار رہنے کے لیے اس سے بہتر سواری ملنا محال ہے۔ ہاتھی پر بینھ کر نہیں پر چلنے والی مخلوق واقعی بہت فاصلے پر بڑی بے مایہ،  
بے حد پست اور نہایت بے حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔

میرا سرکاری ہاتھی اپنے مہاوت کے مقابلہ میں نیا وہ عظیم اور ہوشیار تھا۔ اگر کسی روز مہاوت بے ایمانی سے کام لے کر اس کے راتب میں ڈنڈی مار جاتا تھا، تو وہ اسے اپنی سونڈ کے حلقة میں لے کر جکڑ لیتا تھا۔ ایسے موقع پر ایس ڈی او کو خود آ کر مہاوت کو چھڑراٹا پڑتا تھا۔ مہاوت ہاتھ جوڑ کر ہاتھی سے معافی مانگتا تھا اور بھاگ کر خوراک کی مقدار پوری کرنے کے لیے ایک نوکری میں اضافی راتب لے آتا تھا۔ اپنا پورا راشن وصول کرنے کے بعد ہاتھی مہاوت کے منہ پر کوچی کی طرح سونڈ پھیر کر اس کے ساتھ صلح کر لیتا تھا۔

اس فہیم و سلیم اور خوش مذاق ہاتھی کے ساتھ میری رفاقت بہت کم عرصہ رہی۔ برباد پور گنجم میں ایک سال گزارنے کے بعد میرا تبادلہ کٹک ہو گیا اور اڑیسہ کے سیکرٹریٹ میں مجھے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں پہلے انڈر سیکرٹری اور پھر ڈپٹی سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔ کٹک میں سرکاری رہائش گاہوں کی قلت تھی۔ خصوصاً غیر شادی شدہ افسروں کے لیے سرکاری مکان ملنا محال تھا۔ اس لیے میں کافی عرصہ کٹک کلب کے ایک کمرہ میں مقیم رہا۔ چند ماہ بعد جب صوبے میں کاگرس کی وزارت بر سر اقتدار آئی تو شری ہر کرش مہتاب چیف نسٹر مقرر ہوئے۔ باقی کئی محکموں کے علاوہ ہوم ڈیپارٹمنٹ بھی ان کے چارج میں تھا۔

شری ہر کرش مہتاب بڑے خوش مزاج اور خوش اطوار وزیر اعلیٰ تھے اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے ذاتی مسائل میں بھی گمراہی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ ایک روز میں چند فائلیں لے کر ان کے پاس گیا، تو انہوں نے میرے مکان کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ باتوں میں معلوم ہوا کہ کٹک کی سول لائنز میں ایک کوئھی ہے، جو سالماں سے غیر

آباد چلی آ رہی ہے۔ جب کبھی کوئی کوئی خوشی میں رہائش اختیار کرتا ہے تو چند ہی روز میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ کیونکہ اس گھر کے متعلق مشور ہے، کہ یہ آسی زدہ ہے۔ مہتاب صاحب نے کہا کہ اگر تم وہی طبیعت کے مالک نہیں ہو تو بڑی خوشی سے اس بنگلے کو آزا کر دیکھ لو۔

میں کلب میں ایک کمرے کی گھنٹن سے بگ آیا ہوا تھا، اس لیے میں نے فوراً حامی بھر لی اور سول لاکنٹر کی کوئی نمبر ۱۸ میرے نام الٹ ہو گئی۔

یہ ایک ہلکے زرد رنگ کی چھوٹی سی خوشنما کوئی تھی جس کے گرد ڈیڑھ دو ایکڑ کا وسیع و عریض لان پھیلا ہوا تھا۔ لان میں گھنٹوں گھنٹوں تک اونچی گھاس اگی ہوئی تھی اور چاروں طرف سوکھے ہوئے کالے پیلے پتوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جا بجا سوکھے ہوئے اور تانہ گوبیر پر مکھیاں بجھنا رہی تھیں۔ ایک طرف جامن اور آم کے کچھ پیڑ تھے، جن کے نیچے بلیاں اور کتے وقتہ فوقہ اپنی مخصوص آواز میں رویا کرتے تھے۔ دوسری طرف پیپل کا پرانا درخت تھا، جس کی شاخوں سے بے شمار کالی کالی بھوری بھوری چکاؤڑیں الٹی بٹگی رہتی تھیں۔ کوئی کے عقب میں ایک کچا تالاب تھا، جس کے پانی پر سبز کالی کی دیز تھے جبی ہوئی تھے اور کناروں پر مینڈکوں، جھینگروں اور دوسرے کیڑوں مکوڑوں کا جم غیر موجود رہتا تھا۔

کوئی ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر باورچی خانہ تھا۔ اسی کے ساتھ دو سرونوٹ کوارٹر تھے، جن میں میرا کشمیری خانامان رمضان اور بنگالی ڈرائیور روز محمد رہتے تھے۔

۱۸ سول لاکنٹر میں ایک ڈرائیگ روم، ایک ڈائینگ روم اور تین بیڈ روم تھے۔ میں نے اپنے استعمال کے لیے جو بیڈ روم منتخب کیا، اس کا ایک دروانہ ڈائینگ روم کی طرف کھلتا تھا۔ دوسرا دروانہ اور ایک کھڑکی برآمدے میں کھلتے تھے جس کے سامنے عقبی لان کا وسیع پھیلاوہ تھا۔ اس بیڈ روم کے ساتھ ایک ڈرائیگ روم اور غسل خانہ بھی ملحق تھا۔

ایک رات میں سب دروازے اور کھڑکی بند کر کے بستر پر لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرے پاس کوئی نیبل یمپ نہ تھا، اور بھلی کا سوچ پنگ سے دور والی دیوار پر لگا ہوا تھا۔ گیاہ بجے کے قریب میں نے کتاب بند کر کے تپائی پر رکھ دی، اور بھلی بجانے کے لیے اٹھنے لگا تھا کہ پیتل کا سوچ کھٹاک سے بجا اور بھلی اپنے آپ بجھ گئی۔ میں نے سوچا کہ سوچ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہو گا۔ اس لیے اس کا بٹن اپنے آپ ہل گیا ہے۔ لیکن پھر خیال آیا، کہ بھلی آف کرنے کے لیے سوچ بٹن کافی زور سے اوپر کی طرف گھمایا جاتا ہے۔ اگر وہ ڈھیلا ہو گیا ہے، تو اسے نیچے کی طرف گرنا چاہیے تھا۔ وہ خود بخود اوپر کی طرف کیسے اٹھ سکتا ہے؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سوچ پھر کھٹ سے بجا اور بھلی آن ہو گئی۔ ساتھ ہی ڈرائیک روم والے بند دروازے پر تین بار دھیمی سے دستک ہوئی جیسے کوئی انگلی بند کر کے اس کے جوڑ سے دروانہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اٹھ کر دروانہ کھولا تو ڈرائیک روم بالکل خالی تھا۔ البتہ صوفی کے قریب سفید دھوئیں کا ایک چھلا ضرور نظر آیا جو دیکھتے ہی دیکھتے فھا میں تحلیل ہو گیا۔ اس چھلے کی بیت کچھ اس طرح کی تھی جس طرح کہ سگریٹ کا کش لے کر دھوئیں کے رنگ بنائے جاتے ہیں۔ جس جگہ یہ چھلا ہوا میں معلق تھا، وہاں پر انگریزی سینٹ اور حنا کے عطر کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اب یہ روز کا معمول ہو گیا، کہ اوہر میں کتاب بند کرتا تھا، اوہر بھلی خود بخود کھٹ سے بجھ جاتی تھی۔ دوسرے تیرے دن دروازے پر دستک بھی بدستور ہوتی تھی، اور ہر بار دھوئیں کا چھلا پلے کی نسبت بڑا نظر آتا تھا، اور نیاہ دیر تک قائم رہتا تھا۔ ایک رات میں اپنے بیڈ روم میں آیا، تو میرے سلیپر غائب تھے۔ کافی دیر ڈھونڈتا رہا، لیکن کہیں نہ ملے۔ لیکن جب میں بستر پر لیٹا، تو تکیے سے چمر چمر کی آواز آئی۔ اٹھ کر دیکھا تو دونوں سلیپر تکیے کے غلاف کے اندر پڑے تھے۔ سلیپر پن کر منہ ہاتھ دھونے باٹھ روم گیا۔ تو صابن دافی غائب پائی۔ واپس آ کر بستر پر لیٹا تو وہ بھی تکیے کے غلاف

سے برآمد ہوئی۔ صابن دانی غسل خانے میں رکھ کر دوبارہ کمرے میں آیا تو تکیے پر بسکٹوں کا ذبہ کھلا پڑا تھا جو میرے بیٹھ روم کی الماری میں رکھا رہتا تھا۔ دو تین بسکٹ باہر گرے ہوئے تھے۔ میں نے ان بسکٹوں کو اٹھا کر کھایا اور ذبہ الماری میں رکھ کر پلٹنگ کی طرف مڑا، تو دیکھا کہ تکیے پر سگریٹ کیس کھلا ہوا رکھا ہے جو ڈرائیور میز پر مہمانوں کے لیے پڑا رہتا ہے۔ اپنی آٹو مینک سروس ایجنسی کی اس دل گلی پر مجھے نہیں آگئی۔ میں سگریٹ پیتا تو نہ تھا، لیکن سوچا کہ اپنے نادیدہ بامداد خدمت گزار کر دل خوش کرنے کے لیے آج سگریٹ نوشی میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ میں نے ایک سگریٹ منہ میں رکھا اور ماقص جلائی۔ دیا سلامی کا سلگنا تھا کہ سگریٹ میرے ہونٹوں سے کھنج کر دور جا پڑا۔ ساتھ ہی ڈرائیور میز والے دروازے پر وہی مخصوص دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو قریب ہی ریشم کے کپڑے کی سرسرابہث سنائی دی۔ پھر سفید دھوئیں کا حلقة تقریباً نصف کمرے میں پھیل گیا۔ سارے کمرے میں بھیں بھیں خوبیوں کی پھوار سی برس رہی تھی، اور فضا میں کچھ اس طرح کا ارتعاش لرزائ تھا جیسا کہ فوارہ چلنے سے محسوس ہوتا ہے۔ ان دنوں مجھے موسیقی کا شوق تھا اور اسراج بجانے میں کچھ بیاض بھی کیا تھا۔ میں نے ڈرائیور میز کی بیٹی جلائی تو میری اسراج صوف کے قریب قالین پر یوں پڑی تھی، جیسے ابھی ابھی کسی نے وہاں لا کر رکھی ہو۔ میں بغیر سوچے سمجھے فرش پر بینھ گیا اور اسراج بجانے لگا۔ لیکن تار بالکل Dead تھے۔ ان میں سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ چند لمحے ایک عجیب سا بولتا ہوا سناثا رہا، پھر اچانک ایک زور کا دھماکا ہوا جیسے کمرے میں بارود سے بھرا ہوا گولہ پھٹ گیا۔ سفید دھوئیں کا حلقة مکڑی کے جالے کے تاروں کی طرح ٹوٹ کا رینہ رینہ ہو گیا۔ اور اس کے نکڑے ہوا میں اس طرح کپکپانے لگے جس طرح بادل کی لڑی کا عکس پانی کی متلاطم لہروں میں ٹوٹ ٹوٹ کر لہراتا ہے۔ ساتھ ہی بالکل بند کمرے میں چاروں طرف سے پھرلوں اور اینٹوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اب میں جہاں کہیں بھی بیٹھتا تھا، میرے

آگے پیچھے، دائیں بائیں پتھری پتھر برستے تھے۔ بستر پر لیٹا تو پنگ کے ارد گرد سنگ و خشت کا انبار لگ گیا۔ ایک پتھر جو پنگ کے اوپر میرے عین قریب آ کے گرا، اس کا وزن کئی سیر تھا۔ کمروں کے روشن دان، کھڑکیاں، دروازے سب بند تھے۔ لیکن پتھر بڑے زور سے سنبھاتے ہوئے آتے تھے۔ اور میرے بالکل قریب نہیں پر گر جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے کوئی پتھر مجھے لگانا نہ تھا۔ ورنہ ان میں کچھ اتنے وزنی اور نوکدار ہوتے تھے کہ چند ہی ضربوں میں انسان کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کے لیے کافی تھے۔ اس واقعہ کے ساتھ ہی اگلے چند ماہ کے لیے میری زندگی کا ڈھرا بالکل تبدیل ہو گیا۔ آٹو ینک سروس کی پر لطف آنکھ چھوٹی بند ہو گئی۔ ڈرائیور روم کے دروازے پر ایک جانی پچانی شائستہ اور معطر سی دستک بھی موقوف ہو گئی۔ اس غیر مرئی سے ماحول میں ایک عجیب قسم کی لطافت، رفاقت اور ادراکی اشتراک کا جو عصر تھا اس کی جگہ اب فوق الفطرت، پر اسرار اور بیبت ناک واقعات کا ایسا تسلسل شروع ہو گیا جسے پوری تفصیل سے بیان کرنا آسان نہیں، اس لیے نمونے کے طور پر فقط چند چیزوں کی جیہے اور نسبتاً اہم واقعات ہی درج ذیل کرتا ہوں۔

میرا کشیری ملازم اور بنگالی ڈرائیور روزِ محمد عموماً رات کے دس ساڑھے دس بجے کام کا ج سے فارغ ہو کر اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے تھے، جو کہن کے ساتھ کوئی سے دو سو گز کے فاصلے پر واقع تھے۔ ان کے جاتے ہی کارروائی کا آغاز اینٹوں اور پتھروں سے شروع ہو جاتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ اور کمرے کے اندر جو اینٹیں اور پتھر برس رہے ہیں وہ بالکل خشک ہیں۔ صبح سوریے منہ اندر ہرے میں اس ملے کو نوکروں کے حساب سے سمیٹ کر لان کے تالاب میں پھینک آتا تھا، تا کہ اس ماجرے کی خبر پا کر رمضان اور ڈرائیور خوفزدہ نہ ہوں۔ یہ کارروائی روزمرہ کا دستور تھی۔

ایٹوں کی بارش کے بعد گھر کے سب دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان کھٹ کھٹ

کر کے خود بخود کھل جاتے تھے اور اپنے آپ بند ہو جاتے تھے۔ بند ہوتے وقت دروازوں اور کھڑکیوں کے پٹ ایک دوسرے سے اس نور سے نکراتے تھے جیسے شدید آندھی آئی ہوئی ہو۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد یہ عمل کمی مرتبہ دہرایا جاتا تھا۔ گھر کی سب بجلیاں بھی اسی رفتار سے جلتی اور بجھتی رہتی تھیں۔ کبھی کسی کھلے دروازے کو بند کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بند نہ ہوتا تھا۔ اور اگر بند دروازے کو کھولنا چاہتا تو وہ کھلتا نہ ہوتا۔ ایک بند درواز کو کھولنے کے لیے ذرا نیاہ نور لگایا، تو اس کی چوکھت اکھر کر دھڑام سے نہیں پر گر گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ خود بخود اچھل کر اپنی جگہ فٹ ہو گئی۔

آدھی رات کے قریب میرے ڈرائیگ روم کی چھت چرچا کر اس طرح بولنے لگتی تھی جیسے اس پر بے حد و نہی بوجہ ڈالا جا رہا ہو۔ کبھی تو یوں محسوس ہونے لگتا تھا، کہ اس بوجھ کے تلے چھت ٹوٹ کر بیچے آپڑے گی۔ پھر چھت پر ایسی آوازیں ابھرتیں جیسے بہت سے لوگ لکڑی کی کھڑاویں پنے اچھل کو رہے ہوں۔ ساتھ ہی بڑے بڑے ڈھول دھما دھم اتنا نور سے بختے لگتے کہ ان کی دھمک سے میرا کمرہ گونج اٹھتا۔ ڈھول کے ساتھ کمی دوسرے ساز بھی بجا شروع ہو جاتے تھے، جن میں طبلہ، چمنا، ستار، نفیری اور شہنائی کی آواز خاص طور پر نمایاں ہوتی تھی۔ پھر یا کیک سکھے بختے لگتا اور دیر تک لگاتار بجتا رہتا۔ رفتہ رفتہ سکھے کی دخراش گونج باقی سب آوازوں پر پوری طرح غالب آ جاتی۔

میرے بیٹہ روم کے ساتھ عقبی لان کی طرف برآمدہ تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی اور دروانہ برآمدے میں کھلتتے تھے۔ رات کے وقت میں دونوں کو بند کر کے اندر سے کنڈی لگایتا تھا۔ ایک روز چھت پر سکھے کی آواز بلند ہوئی تو یوں سنائی دینے لگا جیسے برآمدے کے پکے فرش پر بہت سے شہر نور گھوڑے بیک وقت سر پٹ بھاگ رہے ہوں۔ سمول کے ٹاپوں کی آواز کے ساتھ ان کی دم کے بالوں کی سرسرابہث اور نھنوں سے نور نور سے سانس لینے کی پھر پھر اہٹ بھی واضح طور پر سنائی دیتی تھی۔ جب یہ آوازیں

بڑی دیر تک جاری رہیں، تو میں نے کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھول کر برآمدے میں جھانک۔ وہاں پر گھوڑا تو کوئی نہ تھا، البتہ لال لال انگارہ سی آنکھوں والا لوکی شکل و صورت کا ایک بھاری بھر کم پرندہ پر پھیلائے ہوا میں متعلق ہو کر اس طرح ہپکو لے کھا رہا تھا جیسے وہ واقعی بھاگتے ہوئے گھوڑے کی پیچھے پر سوار ہو۔ میرے جھانکتے ہی وہ اس قدر زور سے چینا کہ میں نے فوراً کھڑکی بند کر لی۔ کافی دیر تک وہ چینج برآمدے میں سائز کی طرح بھجتی رہی۔ اور اس کے بعد کچھ عرصہ یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ عجیب اتفاق پرندہ اپنے پنجوں سے کھڑکی کو کرید کر توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ان دونوں میرے پاس ساگوان کی لکڑی کا بہت بڑا ڈائینگ نیبل تھا، جس کا وزن ڈیڑھ دو من ہو گا۔ ایک رات کوئی چیز لینے کے لیے میں نے ڈائینگ روم کی الماری کھولی تو ہینڈل سے لپٹا ہوا ایک باریک سانپ بل کھاتا ہوا اچھل کر میرے پاؤں پر آ گرا۔ ساتھ ہی الماری میں رکھے ہوئے چینی کے برتن کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اڑن طشتريوں کی طرح میز پر آ جمع ہوئے۔ اس کے بعد ڈائینگ نیبل آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھنا شروع ہوا، اور اس قدر بلند ہو گیا کہ اس کے اوپر پڑے ہوئے چینی کے برتن شن شن کر کے بجلی کے نکھے کے ساتھ مکرانے لگے۔ نکھے کو چھو کر میز یکخت دھڑام کر کے فرش پر واپس آ گیا۔ اس کا ایک پایہ میرے بائیں پاؤں کے انگوٹھے پر اس قدر زور سے لگا کہ انگوٹھے کا کچھ حصہ آج تک بالکل بے حس ہے۔

ایک رات میرے کمرے میں اینٹوں اور پتھروں کی جگہ مردار ہڈیاں برسنے لگیں۔ ہڈیوں میں چند انسانی کھوپڑیاں بھی تھیں۔ جا بجا بکھرا ہوا ہڈیوں اور کھوپڑیوں کا یہ انبار اتنا کہہہ انتظر تھا کہ صبح کا انتظار کئے بغیر میں نے انیں اکٹھا کر کے ایک چادر میں باندھا اور انیں تالاب میں پھینکنے کے لیے باہر لان میں نکل آیا۔ لان میں پہنچتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زنجیروں کے گچھے سے میرے دونوں ٹخنوں پر پے در پے زور زور کی ضربیں لگ رہی ہیں۔ تالاب سے اس قسم کی آواز برآمدہ ہوئی جیسے کوئی غوطہ

خور پانی سے باہر ابھرتا ہے۔ ساتھ ہی تالاب کے کنارے سبز کائی میں لپٹا ہوا ایک کالا سیاہ سایہ سانمودار ہوا، اور خون خون کرتا ہوا گوریلے کی طرح میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے ہڈیوں کا گٹھا وہیں پھینکا اور پیچھے پھیر گر اپنے کرے کی طرف بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں رسیوں کے تانے بنے میں الجھ گئے ہیں۔ برآمدے کے قریب پہنچ کر میں بری طرح لڑکھڑایا، اور منہ کے بل نہیں پر گر پڑا۔ اب کھڑا ہونے کی سکت باقی نہ تھی۔ اس لیے میں پیٹ کے بل رینگتا رینگتا بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ میرے ٹخنوں میں شدید سوزش اور جلن ہو رہی تھی، گھٹنے بری طرح چھپل گئے تھے۔ اور منہ کے بل گرنے کے باعث تھوڑی سے خون بہ رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے میں نے جا کر واش بیس کا نلاکا کھولا تو کچھ دیر سوں سوں کی آواز آتی رہی۔ اس کے بعد یکاکی غٹ غٹ کر کے نلکے سے گرم گرم گاڑھے گاڑھے خون کی دھار بننے لگی۔

ایک رات ہڈیوں کی بوچھاڑ کے بعد یکاکی سارے گھر میں ایسا بدبودار تعفن پھیل گیا جیسے غلاظت سے بھرا ہوا گز چھٹ گیا۔ کبھی ہوا میں پسی ہوئی مرچوں کی دھانس اٹھنے لگتی تھی۔ کبھی سوچی بھونے اور ہلدی جلنے کی بو آنے لگتی تھی۔ کبھی سڑی ہوئی مچھلی کی بساند پھیل جاتی تھی۔

ایک بار دن ہو یا رات، میں جو کھانے پینے کی چیز منہ میں ڈالتا تھا اس میں کنکر، مٹی اور ریت کی ملاوٹ ہوتی تھی۔ پھلوں کے اندر بھی کنکر ملتے تھے۔ میں نے ایک کھیلا چھیل کر درمیان سے توڑا تو اس کے اندر جو سیوں سی ہوتی ہے، اس میں بھی ریت اس طرح جبی ہوئی تھی جیسے تھرمائیز کی نالی میں پانہ بھرا ہوا ہوتا ہے۔

ایک روز آدھی رات کے بعد ڈرائیک روم میں ٹیلفون کی گھنٹی بجی۔ ڈرائیک روم میں جانے کے لیے میں نے دروانہ کھولا، تو وہ آدھا کھل کر زور سے بند ہو گیا۔ میں جتنا زور لگاتا تھا، دروانہ تھوڑا سا کھلتا تھا۔ اور پھر لوہے کے سپرنگ کی طرح اچٹ کر بند ہو جاتا تھا۔ آخر میں نے اپنا کندھا دروازے کے ساتھ جوڑ کر پوری قوت سے زور

لگایا، تو میرا باوڑ پڑنے سے پہلے ہی دونوں پٹ آرام سے واہو گئے اور میں زور میں بھرا ہوا لڑکھڑاتا ہوا پہلے ایک کری سے ٹکرایا اور پھر دھڑام سے قالین پر جا گرا۔ قالین پر سفید چادر میں لپٹی ہوئی انسانی جسم کی طرح کوئی چیز لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کو چھوتے ہی میں ترپ کر اٹھا، اور بیڈ روم میں واپس آ کر دروازہ بند کر لیا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی ڈیڑھ دو گھنٹے تک متواتر بھجتی رہی۔

ایک روز بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ رات کے دو بجے میرے بیڈ روم کے باہر لان میں بائیکل کی گھنٹی بجی اور پھر آواز آئی۔ ”تار والا“ تار والا“ میں نے دروازے کی دراڑ سے جھانکا تو واقعی باہر تار والا کھڑا تھا۔ اس نے خاکی وردی پہنی ہوئی تھی۔ سر پر جھاڑ والی خاکی گپڑی تھی۔ گلے میں چڑے کا تحیلا لٹکا ہوا تھا۔ اور وہ سرخ مڈگارڈ والے بائیکل کے ساتھ نیک لگائے کھڑا تھا۔ اس ماہول میں ایک جیتے جاگتے انسان کو اپنے لان میں دیکھ کر میرا دل بڑا مطمئن ہوا۔ میں خوشی خوشی دروازہ کھول کر برآمدے میں آگیا۔ تار والے نے مجھے سلام کیا۔ اپنی گپڑی میں کان کے اوپر ٹھونسی ہوئی پنسل نکالی اور تحیلے سے تار کی رسید کا فارم نکال کر مجھے دیا۔ میں نے فارم پر دستخط کر کے واپس کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میرے سامنے تار والے کی جگہ انسانی ہڈیوں کا ایک خوفناک ڈھانچہ کھڑا تھا۔ لمبے لمبے ناخنوں والی الگیوں کی ہڈیوں نے کافند اور پنسل میرے ہاتھ سے جھنکا دے کر کھیچ لیے اور ڈھانچے کا جڑا کٹ کٹ کر کے اس طرح دانت بجانے لگا جیسے زور زور سے ہنسنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک برآمدے کے پکے فرش پر ہڈیوں کے کنکنے اور دروازے پر ناخنوں سے کھرونقے مارنے کی آواز آتی رہی۔

اس قسم کے کچھ کے اور بہت سے ان کے واقعات رات کو سائز ہے دس یا گیاہ بجے شروع ہوتے تھے اور صبح کے ٹھیک تین بجے خود بخود بند ہو جاتے تھے۔ میرے طویل و عریض لان کی گھاس میں بے شمار مینڈکوں اور جھیتگروں کا بیسرا تھا۔ شام پڑتے ہی

ان کے ٹرانے کی آواز اور پیپل کے درخت پر الٹی لٹکی ہوئی چمگادڑوں کی چین و پکار آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی۔ لیکن جیسے ہی واقعات کا تسلسل شروع ہوتا تھا، پورے لان پر مکمل سکوت چھا جاتا تھا۔ تین بجے کے قریب جب پلے مینڈک یا جھیٹک یا چمگادڑ کی آواز کان میں پڑتی تھی تو میں بھی سکھ کا سانس لیتا تھا کہ چلنے آج کی رات کی منزل بھی طے ہوئی۔

لیکن رات کے یہ چار ساڑھے چار گھنٹے تن تھا گزارنا بڑی جان جو کھوں کا کام تھا۔ میں بڑی آسانی سے وہ گھر کسی وقت بھی چھوڑ سکتا تھا یا ڈرائیور اور خانہ مان کو کوئی کے اندر سلا سکتا تھا یا اپنے دوست احباب میں سے کسی کو ہمراز بنا کر اس تجربے میں شریک کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے ایسا کوئی اقدام نہ کیا اور اپنی ذات کو جان بوجھ کر تن تھا کہی میں نے لگاتار اس کریباک عذاب میں بٹلا رکھا۔ آج چونتیس پنیتیس برس گزرنے کے بعد بھی مجھے اپنے اس غیر منطقی رویے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

سوائے اس کے کہ غالباً یہ میری انا کی احتفاظہ ضد تھی، جس نے ان عجیب و غریب واقعات کے چیزیں کو قبول کرنے پر اصرار کیا۔ تفتیش و تجسس کے اس خار زار میں میری تنہ روی محض شوقيہ ہی نہ تھی بلکہ اس کی تھے میں غالباً یہ خطرہ بھی کار فرماتھا کہ کسی دوسرے کی شرکت سے کہیں بھان متی کا یہ سارا کھیل بالکل ٹھپ ہی نہ ہو جائے۔ اس کا بین ثبوت یہ تھا کہ جب تک میرا ملازم اور ڈرائیور کوئی کے اندر موجود رہتے تھے، کسی قسم کا کوئی غیر معمول واقعہ رونما نہ ہوتا تھا۔ کارروائی کا آغاز ہی اس وقت ہوتا تھا جب وہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کوارٹروں میں چلنے جاتے تھے۔

اس سارے عرصہ میں میرا کشمیری ملازم رمضان اور بنگالی ڈرائیور روز محمد جمیعی طور پر ہر طرح کی ابتلاء سے محفوظ رہے۔ فقط دو تین بار ان کے ساتھ کچھ بہکی سی چھیڑ خانی ہوئی۔ ایک رات رمضان اپنے کوارٹر کی کنڈی چڑھا کر اندر سیاہ ہوا تھا، تو کسی نے

اس کی چاپیائی الٹ دی۔ ان دنوں بنگال، بمار کے کچھ حصوں میں بڑے شدید ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے۔ رمضان نے یہ سمجھا کہ یہ بھی کسی ہندو کی شرارت ہے۔ اپنے حملہ آور کا تعاقب کرنے والے باہر کی طرف بھاگا تو انہیمے میں اس کا منہ کھلاک سے دروازے کے ساتھ نکلا گیا کیونکہ کنڈی بدستور اندر سے بند تھی۔

”اگر والے ہندووں والے آیا تھا والے دروازے کی کنڈی اندر سے کس طرح بند ہو گئی؟“

میں نے اس سے پوچھا۔

”صاحب“ یہ قوم بڑی چالاک ہے۔“ رمضان نے مخصوصیت سے جواب دیا۔ ”اس میں بھی سالے ہندوؤں کی کوئی چال ہو گی۔“

روز محمد ڈرائیور کے کوارٹر میں کبھی کبھار مختلف قسم کی ہڈیاں پڑی ملتی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سب آوازہ بلیوں اور کتلوں کی کارستانی ہے، جو دن بھر کوئی کے لان میں آزادانہ منڈلاتے رہتے تھے۔ روز محمد اپنے کوارٹر کا دروازہ احتیاط سے بند کر کے رکھا کرتا تھا۔ اس کے سیدھے سارہ دماغ کو اس تشیش نے کبھی پریشان نہ کیا تھا، کہ بلیاں اور کتنے بند دروازے سے گزر کر اس کے کمرے میں ہڈیاں کس طرح ڈال آتے ہیں؟

اس ساری ہنگامہ آرائی کا اصلی ہدف صرف ۱۸ نمبر کا بگلہ تھا۔ رات ڈھلتے ہی یہ کوئی میرے لیے خوف و ہراس، عذاب و عتاب کا جنم بن جاتی تھی۔ ہر نئے واقعہ میں اپنی قسم کی دہشت، اپنی قسم کا ہول، اپنی قسم کی وحشت سمائی ہوتی تھی۔ ”پتا کھڑکا“ دل دھڑکا“ والا مقولہ مجھ پر حرف بہ حرف صادق آتا تھا۔ یوں تو رات بھر ڈر کے مارے میں بار بار پسینے میں شرابوں ہوتا ہی رہتا تھا، لیکن کبھی کبھی میرے تن بدن پر خوف و ہبہت کی ایسی تحریری، کچکی اور بد حواسی چھا جاتی تھی۔ کہ نبضیں بینخنے لگتی تھیں، دل دھڑکنے لگتا تھا اور دم گھٹ کر گلے میں کائے کی طرح پھنس جاتا تھا۔ اس وحشت ناک اور لرنہ خیز ماحول میں میرے پاس خود حفاظتی کا ایک اور صرف ایک ہتھیار تھا۔ وہ ہتھیار کلمہ طیبہ تھا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

اگر سو برس کا کافر اپنے آخری سانس میں ایمان لا کر صرف ایک بار یہ کلمہ پڑھ لے، تو دونخ کی آگ سے اس کی نجات ہو جاتی ہے۔ میری مصیبت تو دونخ کے عذاب سے کمیں کم تھی۔ مشکل صرف یہ تھی کہ اب تک یہ کلمہ میں نے صرف حلق سے پڑھا تھا۔ دل سے پڑھنے کی نہ کبھی توفیق نصیب ہوئی تھی، نہ ضرورت پیش آئی تھی۔ لیکن خوف و ہراس کی شدت میں بڑا مجبور کن اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اب جو بے کسی و بے بسی کے عالم میں کبھی مجھ پر سانپ گرتا تھا، کبھی میرے پاؤں کا انگوٹھا بھاری میز کے پائے تلے کچلا جاتا ہے، کبھی فرش پر سفید چادر میں لپٹی ہوئی لاش سے نکر ہوتی تھی، کبھی چھت پچھنے لگتی تھی، کبھی پھر آتے تھے، کبھی اینٹیں برستی تھیں، کبھی انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ سامنے کھڑا ہو کر کٹ کٹ دانت بجا تھا۔ اس طرح کے خوف کے دباو میں آ کر صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ کبھی کبھی دل سے بھی کلمہ طیبہ کا ورد ہو جاتا تھا۔

ان دنوں میرے پاس ایک چھوٹا سا جپانی گرامو فون تھا جو چالی چڑھا کر بجا یا جاتا تھا۔ ایک رات میں نے سہگل کا ایک پسندیدہ ریکارڈ سننے کے لیے گرامو فون کو چالی دی تو وہ آگے کی طرف گھونٹنے کی بجائے سپرنگ کی طرح لپک کر پیچھے کی جانب لوٹ آئی۔ چالی خود ہی اپنے آپ پہلے سے چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے گرامو فون پر ریکارڈ رکھ کر چلا یا، تو اس میں سے کے ایل سہگل کے گانے کی جگہ عجیب و غریب خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ کچھ آوازیں ایسی تھیں جیسے کسی کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔ بیچ بیچ میں عورت کی سکیاں سنائی دینے لگتی تھیں۔ کبھی کبھی نخنے سے بچے کے رونے کی آواز بھی آتی تھی۔ میں نے ایک کاغذ پر کلمہ طیبہ لکھ کر گراموفون پر رکھا، تو فوراً یہ آوازیں بند ہو گئیں اور ریکارڈ کا اصلی گانا بنجنے لگا۔ اب میں کاغذ اٹھاتا تھا تو خوفناک آوازیں شروع ہو جاتی تھیں، واپس رکھتا تھا تو اصلی گانا بنجنے لگتا تھا۔ تجربہ کے طور پر میں نے کلمہ طیبہ کا اردو ترجمہ لکھ کر گرامو فون پر رکھا تو کوئی اثر نہ ہوا۔ کلمہ

کے الفاظ کو رومی حروف میں لکھ کر رکھا تو پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ کلمہ طیبہ کی یہ تاثیر صرف عربی زبان میں پائی۔

HRDUU.COM

کلمہ طیبہ کے علاوہ میں اپنی تقویت کے لیے آیت الگری، سونہ فلق اور سونہ ناس کا ورد بھی اکثر کرتا رہتا تھا۔ ایک رات میرے گرد و پیش ہول و بیت کی فضا اپنے نکتہ عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ انتہائی شکستگی، مایوسی، اضطرار کے عالم میں میں نے قرآن شریف کھولا تو سونہ صفت نکلی۔ اس کی ۱۸۲ آیات کا ایک ایک حرف میرے لیے آب حیات کا گھونٹ ثابت ہوا۔ خوف و ہراس کے ماحول میں جب کبھی میں نے اس سونہ کی تلاوت کی، ہر بار تانہ زندگی اور تابندگی پائی۔

کئی ماہ کی لگاتار بیت، وحشت اور آسیبیت کی تہ میں انجمام کار یہ راز کھلا کہ اٹھاہے میں برس پلے اس گھر میں آئی سی ایس کا ایک اویاش افسر رہا کرتا تھا۔ شادی کا جھانس دے کر اس نے اللہ آبا میں کالج کی ایک طالبہ بلا کماری کو ورغلایا اور خفیہ طور پر اسے اپنے ساتھ کٹک لے آیا۔ شادی اس نے کرنی تھی نہ کی۔ سلت آٹھ ماہ بعد جب بلا مان بننے کے قریب ہوئی تو ظالم نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور لاش کو ڈرائیک روم کے جنوب مشرقی کونے میں دفن کر دیا۔ اس وقت سے بلا کی نحیف و نزار مان اللہ آباد میں بیٹھی بڑی شدت سے اپنی بیٹی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی وقت سے بلا کماری بھی اس کوشش میں سرگردان تھی کہ کسی طرح وہ اپنی مان تک صحیح صورت حال کی خبر پہنچا دے تا کہ انتظار کے اس کریباک عذاب سے اسے نجات حاصل ہو۔ اس کے علاوہ اس کی اپنی خواہش بھی تھی، کہ اس کی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھود کر باہر نکلا جائے اور اس کے دھرم کے مطابق اس کا کیا کرم کیا جائے۔ اس عرصہ میں قاتل خود بھی مر چکا تھا، اور اب بلا کی طرف سے پیغام رسانی کی ہر کوشش کو ناکام کرنے میں سرگرم عمل تھا۔

جس روز بلا کی مان کو اصلی صورت حال کی خبر ملی اور بلا کی بوییدہ لاش کو چتا میں

رکھ کر جلا دیا گیا، اسی روز ۱۸ سول لائنز کے در و دیوار، سقف و فرش سے آئیں کا سایہ اس طرح اٹھ گیا جیسے آسمان پر چھائے ہوئے بادل یا کمپ چھٹ جاتے ہیں۔ اس رات نہ مینڈکوں کا ٹرانا بند ہوا۔ نہ جھینکروں کی آواز خاموش ہوئی نہ پیپل کے درخت سے لٹکی ہوئی چپگاؤزوں کا شور کم ہوا۔ صبح تین بجے کے قریب اچانک فضا میں لا الہ الا اللہ کی بے حد خوش الحان صدا بلند ہوئی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ آواز مشرق کے افق سے ابھرتی ہے۔ ۱۸ سول لائنز کے اوپر قوس بناتی ہوئی گزرتی ہے اور مغرب کے افق کو جا کر چھوٹی ہے۔ تین بار ایسا ہی ہوا اور اس کے بعد اس مکان پر امن اور سکون کا طبعی دور دونہ از سر نو بحال ہو گیا۔

اس عجیب و غریب واقعہ نے ایک طرف تو خوف و ہیبت کے تھپیڑوں سے میرا اچھا خاصا کچومر نکال دیا، اور دوسری طرف اس کی بدولت مجھے حقیقت روح کا قلیل سا اور اک حاصل ہوا۔ مشرق اور مغرب کی تقریباً ہر زیان میں اس موضوع پر بڑا ضخیم لٹریچر پایا جاتا ہے۔ ہر زمانے میں اس پر تائید و تردید، انکار و اقرار، توثیق و تفییخ، تفتیش و تحقیق کے شدید بحث و مباحثے جاری رہے ہیں۔ ضعیف الاعتقادی اسے عبودیت کے درجے تک پہنچاتی رہی ہے۔ بے اعتمادی اسے مجدوب کی بڑی قرار دیتی ہے۔ اور جدید خود اعتمادی اسے سائنسیک فارمولوں میں ڈھال کر ایک ایسی آٹو میک مشین بنانے کی فکر میں ہے۔ کہ ادھر بٹن دبایا ادھر مطلوبہ روح کھٹ سے حاضر۔

انگریزی میں اس علم پر سب سے مستند کتاب جو میری نظر سے گزری ہے وہ فریڈرک ڈبلیو ایچ مائز کی تصنیف ”انسانی شخصیت اور جسمانی موت کے بعد اس کی بقا“ (Death and Human Personality and Its Survival of Bodily Death) ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۳۶۰ صفحات کی اس کتاب میں سینکڑوں پر اسرار واقعات، حادثات، تجربیات اور آثار و شواہد کا منطقی اور سائنسی تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جسمانی موت کے بعد انسان کی شخصیت کا وہ غضر باقی رہتا ہے جسے ”سپرٹ“ کہتے ہیں۔ مصنف کا اسلوب عالمانہ، استدلال علوم جدیدہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور تفصیلات بڑی

معتبر ہیں لیکن ذہنی اور اعتقادی اعتبار سے وہ عیسائیت کے بندھے ہوئے قوانین اور مفروضات سے آزاد نہیں ہو سکا۔

ماڑون سائنسی دور میں دور سنتسدافنو نے اس علم کے میدان میں کچھ نئی راہیں ہموار کی ہیں۔ سر ولیم کروکس پلے سائنس دان تھے جنہوں نے مادی دنیا پر مافق الفطرت روحلی اثرات کا سائنسیف مطالعہ اور تجزیہ کیا۔ سر اولیور لاج کی کتاب Raymond بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ ان دونوں کی تحقیق و تجربات پر اس مسلک کی بنیاد پڑی ہے ماڑون پرپکوژم کے نام سے پکارا جاتا ہے اور جو آج کل مغرب کی دنیا میں بڑے وسیع پیلانے پر زیر مشق ہے۔ ماڑون پرپکوژم کے اکثر اداروں کی حیثیت تجارتی دکانداری سے نیاہ نہیں۔ حاضرات روح کے شعبے میں دھوکہ بازوں، فریبیوں، ڈھونگیوں اور لپائیوں کی گنجائش دوسرے ہر شعبے سے نیاہ ہے۔ اس کے علاوہ مغربی پرچویل اداروں میں عامل و معمول اور پلانچنٹ وغیرہ کے ذرائع سے غبی پیغامات کی ترسیل و تحصیل نیاہ تر اوہام و وساوس کی الہہ فرمی ہوتی ہے یا شعوری اور لا شعوری متخلیہ کی کرٹھ سازی نکلتی ہے۔ مشرق میں بھی بہت سے نام نہاد عاملوں اور جھوٹے مدعیوں کا کاروبار بڑے زور شور سے انہی خطوط پر چلتا ہے۔

البتہ موجودہ دور میں پیراسائیکالوجی کے عنوان سے تحقیق و تفتیش کا جو نیا باب کھلا ہے، اس میں نفس انسانی کی نئی نئی اور عجیب و غریب دنیائیں دیافت ہونے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ انسان کے ظاہر و باطن میں فوق العادت تو انائیوں کے جو پر اسرار مخزن پوشیدہ ہیں۔ پیراسائیکالوجی کا مقصد ان کی نشاندہی کرنا اور انہیں کھود، کرید کر دنیاوی ضروریات کے کام میں لانا ہے۔ امریکہ، روس اور ہالینڈ کے علاوہ یورپ کے دوسرے کئی ملکوں میں بھی پیراسائیکالوجی کے ادارے بڑے اعلیٰ پیلانے پر کام کر رہے ہیں۔ ایسی لیمارٹیوں کی طرح پیراسائیکالوجیکل سرچ کے بعض پروگرام بھی انتہائی رازداری میں رکھے جاتے ہیں۔ ایک شبہ یہ بھی ہے کہ کچھ بڑی طاقتیں اس سائنس کو اپنے سفارتی تعلقات، یعنی الاقوامی معاملات اور جنگی انتظامات میں کسی حد تک استعمال بھی کر رہی ہیں۔ یہ احتمال

بعید از قیاس نہیں کہ ایسی تو انتائی کی طرح پیرا سائینکالوجی کی ترقی میں بھی انعام کار عالمی سیاست کی آلہ کار بن جائے۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ سے بھی پیرا سائینکالوجی کی صلاحیت کار محمود نظر آتی ہے۔ اب تک اس میدان میں بھنپھنی پیش رفت ہوئی ہے، اس میں تفییش نفس کا تو پورا اہتمام ہے، لیکن تہذیب نفس کا کمیں نام و نشان تک نہیں۔ انسان مشرق میں ہو یا مغرب میں، امیر ہو یا غریب، کلا ہو یا گورا، ترقی یافتہ یا غیر ترقی یافتہ، دیندار ہو یا بے دین، اس کے نفس کے لیے صرف تین حالتیں ہی مقدر ہیں، نفس مطمئنہ، نفس لواحہ اور نفس امامہ۔ اگر پیرا سائینکالوجی کی ترقی نیا ہدہ تر ماڈی مقاصد کے زیر نگلیں رہی تو بلاشبہ یہ ترقی معمکوس ثابت ہو گی۔ کیونکہ اس صورت میں روحانیت کی بسیط شاہراہوں پر آگے بڑھنے کی بجائے، یہ جدید سائنس نفس امامہ کے کولبو کا نیل بن جائے گی، جو آنکھوں پر کھوپڑے چڑھا کر ایک ہی ٹنگ دائرے میں بار بار چکر کائیں پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس ڈگر پر چل کر پیرا سائینکالوجی کی ترقی کا انتہائی کمال یہ ہو گا کہ وہ استدرج کی اس منزل تک رسائی حاصل کر لے جمال پر جوگی، کاہن، ساحر دوسرے کئی راستوں سے پہنچتے ہی رہتے ہیں۔

مغربی سپریچوژزم کی تان نیا ہدہ تر ماڈی پر ٹوٹی ہے۔ مشرق کی چند اقوام میں روح کا تصور سفلیات کے گنبد میں مقید ہے یا آواگوں کے چکر میں سرگردان ہے۔ اس علم کی علوی صفات صرف اسلامی روایات میں نظر آتی ہیں۔

علامہ حافظ ابن قیم کا رسالہ "كتاب الروح" اس سلسلے کی ایک نمایت مستند دستاویز ہے۔ اس میں مصنف نے حقیقت روح کے ہر پہلو کا قرآن اور حدیث کی روشنی میں جائزہ لے کر بہت سے علمائے سلف کے اقوال و احوال پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس علم پر یہ کتاب ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

علم اسلام کے بہت سے بزرگان دین اور اولیائے کرام کے حالات اور ملغوظات میں بھی روح کے تصرفات، اتصال، انفصل اور امثال کے واقعات اور شواہد تواتر کی حد تک

پائے جاتے ہیں۔

راہ سلوک میں سلسلہ اویسیہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔

اسلامی تصوف میں کشف ارواح اور کشف قبور بھی ایک باقاعدہ فن کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان تمام علوم و فنون، تجربات و تصرفات، مشاهدات و نظریات، عملیات و تصورات کے

باوجود حقیقت روح کے بارے میں سارے علم، سارے وجدان، سارے عرفان اور سارے ایمان کی آخری حد یہی ہے کہ

”وَيُسْنَلُونَكُ عن الرُّوحِ“، قل الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيِّ وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا۔“

(اور لوگ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیں کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے اور نہیں دیئے گئے ہو تم علم سے مگر تھوڑا)

## • پاکستان گا مطلبے کیا

اڑیسہ سیکرٹریٹ میں ہوم ڈپارٹمنٹ کے ڈپٹی سیکرٹری کی حیثیت سے پاسپورٹ جاری کرنے کا کام میری تحویل میں تھا۔ ایک روز میں دفتر سے گھر واپس آیا، تو ادیبز عمر کے ایک صاحب برآمدے میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ سرورودی صاحب اب بنگال کے چیف منستر تھے، اور وہ ان کا خط لے کر مجھے ملنے آئے تھے۔ ان کا اصلی نام تو کچھ اور تھا لیکن سرورودی صاحب نے انہیں حامد علی کے نام سے موسم کیا تھا۔

اپنے خط میں سرورودی صاحب نے لکھا تھا، کہ منستر حامد علی کلکتہ میں مسلم لیگ کے ایک انڈر گرواؤنڈ ورکر ہیں، اور ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کے تحفظ کے لیے نہایت اہم فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ اب قائد اعظم کی اجازت سے انہیں فوری طور پر ایک خفیہ مشن پر مصر بھیجا مقصود ہے۔ لیکن پاسپورٹ کی مشکل درپیش ہے، کیونکہ منستر حامد علی کا نام حکومت کی بلیک لسٹ میں درج ہے۔ تملوک میں میرے چاول کا گودام توڑنے کی طرف مزاہ اشارہ کر کے سرورودی صاحب نے لکھا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ غیر قانونی حرکات کا تمہیں عملی تجربہ حاصل ہے اس لیے میں حامد علی کو تمہارے پاس بغیر کسی معذرت کے بھیج رہا ہوں۔“

میں نے اس سہ ماہی کی آل انٹیا سول لسٹ اٹھا کر دیکھی تو اس بات پر حیرت ہوئی کہ اس وقت ہندوستان بھر میں اڑیسہ ہی کا سیکرٹریٹ تھا جس میں ایک مسلمان ڈپٹی سیکرٹری کے پاس پاسپورٹ جاری کرنے کا پورا اختیار تھا۔ اس انوکھے حسن اتفاق سے فائدہ اٹھا کر اگلے روز میں نے منستر حامد علی کا پاسپورٹ بنا کر ان کے حوالے کیا، اور سرورودی صاحب کے نام صرف اتنا پیغام لکھ بھیجا۔

Order Obeyed, Law Broken  
اس فقرے میں کلکتہ کے بنگالی اخبار ”امریت بازار پریکا“ کے ایک ایڈیٹوریل کی طرف

اشاہ تھا، جس میں مشر سروردی پر یہ پھیتی کسی گئی تھی، کہ ہندو مسلم فسادات میں بنگال کے چیف نیشنر کا فرض منصبی صرف اتنا رہ گیا ہے کہ مسلمان بے روک ٹوک قانون شکنی کرتے رہیں، پولیس بے چوں و چڑاں، وزیر اعلیٰ کا حکم مانتی رہے اور ہندو بے دریغ قتل ہوتے رہیں۔

مشر حامد علی جتنا وقت پاسپورٹ بنانے کی خاطر لٹک میں ٹھرے، ان کے منہ سے بار بار بس ایک ہی بات نکلتی تھی۔ وہ یہ کہ ہندوستان بھر میں کا گنگریں، ہندو ماہا سجا، راشٹریہ سیوک سنگ، اکالی دل، اور کئی دوسرے اور سکھ اداروں کی سرپرستی میں بڑے وسیع پیانے پر مملک ہتھیار جمع کئے جا رہے ہیں جو یقیناً ننتے مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جائیں گے۔ ان ہتھیاروں کی فراہمی کے لیے بہت سے ہندو اور سکھ راجے اور مہاراجے بڑی فراغلی سے چندہ دے رہے ہیں۔ ان میں مہاراجہ پیالہ کا نام سر فرست ہے۔

پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ مشر حامد علی جذبات کی رو میں بہ کرمبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن بہت جلد مجھے اس بات کا میں ثبوت مل گیا کہ آل انڈیا کا گنگریں جیسی بزعم خود نیشنلٹ سیاسی جماعت بھی مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بندی میں بری طرح ملوث ہے۔

اڑیسہ کے چیف نیشنر شری ہری کرشن و متاب کا گنگریں کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ایک بار دہلی سے وہ کا گنگریں کی کسی مینگ سے واپس آئے، تو اپنے معمول کے مطابق انہوں نے کاغذات کی کالی صندوقی میرے حوالے کر دی۔ ہمارا طریق کا رہتا تھا کہ سیاسی کاغذات چھانٹ کر میں ان کے پرنسل پرائیویٹ سیکرٹری کے پرداز کر دیتا تھا، اور سرکاری کاغذات متعلقہ مکھموں کو بھیج دیتا تھا۔ ان کا پرنسل پرائیویٹ سیکرٹری بڑا متعقب ہندو تھا۔ وہ اکثر اس بات پر سر پیٹتا تھا کہ متاب صاحب کے سیاسی کاغذات میرے ہاتھ سے کیوں گزرتے ہیں۔ چند بار اس نے چیف نیشنر کے پاس اس طریق کا رہ کے خلاف بڑا سخت احتجاج بھی کیا لیکن متاب صاحب نے کبھی سمجھدگی سے اس کی باتوں پر کان نہ دھرا۔ جب کبھی میں سیاسی نوعیت کے کاغذات کا لپندا پرنسل پرائیویٹ

سیکرٹری کے حوالے کرتا تھا تو وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بڑی فوں فال کیا کرتا تھا۔ ”گجب ہو گیا، گجب ہو گیا۔ اپنے نے تو سینت سینت کر ایک ایک کا گچ جرور پڑھ لیا ہو گا۔ اپنے نے تو ایک ایک کا گچ کی نقل بھی رکھ لی ہو گی۔ بڑے گجب کی بات ہے۔“  
متا ب جی کی بدھی تو بالکل ماری گئی ہے۔“

اس بار جو میں نے چیف منٹر کے لائفز کا جائزہ لیا، تو ان میں ایک عجیب دستاویز ہاتھ آئی۔ یہ چھ سات صفحات کا سائیکلو شائلڈ انتائی خفیہ (Top Secret) حکم نامہ تھا، جو کانگری چیف منٹروں کے نام اس ہدایت کے ساتھ جاری کیا گیا تھا کہ ہر چیف منٹر اسے اپنی ذاتی تحولی میں رکھے۔ اس میں لکھا تھا کہ تقسیم ہند کا معاملہ تقریباً طے پا چکا ہے۔ اس لیے جن صوبوں میں کانگرس کی وزارتیں قائم ہیں وہاں پر مسلمان افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کر دیا جائے۔ خاص طور پر ہوم ڈیپارٹمنٹ، فائنس ڈیپارٹمنٹ اور پولیس ڈیپارٹمنٹ میں باعتماد ہندو افسروں کو تعینات کیا جائے۔ ڈی سی، آئی جی اور ایس پی عموماً ہندو ہوں۔ تھانوں کے انچارج بھی نیا ہے سے نیا ہے ہندو ہوں۔ محلہ پولیس اور ضلعی انتظامیہ میں مسلمانوں کو فیلڈ ورک سے ہٹا کر بے ضرر قسم کے دفتری کام کاچ پر لگا دیا جائے۔ پولیس کی نفری میں مسلمان پاہیوں کو بتدربیغ غیر مسلح کر کے پولیس لائن اور تھانوں کے اندر معمولی فرائض پر مامور کیا جائے۔ جن صوبوں میں سرحدی مسلمانوں سے بھرتی شدہ ماڈنڈ ملٹری پولیس ہے، اسے فوراً توڑ دیا جائے اور افسروں اور نفری کو اختتام ملازمت کی مناسب رقم یکمشت ادا کر کے رخصت کر دیا جائے۔ سرکاری خزانوں، اسلحہ خانوں اور محلہ مال کے ریکارڈ آفسوں کی حفاظت کے لیے ہندو گارڈ تعینات کئے جائیں۔ اسلحہ رکھنے والے مسلمان لائسنس ہولڈرز کی نقل و حرکت کی گنگرانی کی جائے۔ ایسے ہنگامی منصوبے تیار رکھے جائیں جن کے تحت ان لائسنسداروں سے قلیل ترین نوٹس پر ہر قسم کا اسلحہ قربی تھانے میں جمع کروایا جا سکے۔ کاروں، بسوں، بیکیوں اور ٹرکوں کے مسلمان مالکوں کی فرسیں بنا کر ان پر کڑی نظر رکھی جائے۔ مسلمان آتش بازوں

کے لائنس م uphol کر دیئے جائیں اور ان کا آتش گیر اسٹاک فوری طور پر پولیس کی حفاظت میں لے لیا جائے ..... وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیز مشر کو نہایت سخت تاکید کی گئی تھی کہ وہ ان ہدایات پر ایسی خوش اسلوبی سے عملدرآمد کرے کہ اس سے آبادی کے کسی فرقے کے خلاف کسی قسم کے امتیازی سلوک کا پہلو مترشح نہ ہو۔ بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کا اس سے بہتر ظہور چشم تصور میں لانا محال ہے۔

یہ حکم نامہ پڑھ کر مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔ مہاتما گاندھی کی نام نہاد بے تعصی کی لگوٹی باد مخالف کے جھوٹکوں میں اڑاڑ کر دور جا پڑی، اور وہ اپنے اصلی رنگ و روغن میں بالکل برہنہ ہو گئے۔ اپنے اپرم دھرم کے اس جھوٹے پچاری کے اشاروں پر ناچنے والی انڈین بیشٹ کا گنگر کے عزائم مسلمانوں کے خلاف اتنے ہی خطرناک اور سمجھیں نکلے جتنے کہ ہندو مہا سبھا یا راشٹریہ سیوک سنگ کے سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ کا گنگریں کے سازشانہ منصوبے دوسرا فرقہ وارانہ جماعتوں سے بھی زیادہ پر خطر اور ہولناک تھے، کیونکہ ہندوستان کے کئی صوبوں میں کا گنگر کی حکومت تھی اور مرکز کی عبوری گورنمنٹ میں ۱۲ میں سے چھ کا گنگری اور دو مزید غیر مسلم وزیر تھے۔ فوج کا مکمل سردار بلدیو سنگھ کے قبضے میں تھا۔ اور سارے ہندوستان کی پولیس، سی آئی ڈی، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ کی مشین سردار دلبہ بھائی پٹیل کے متعصبانہ ہاتھوں میں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کا گنگر اپنی قوت کے تمام وسائل مسلمانوں کا سر کچلنے کے لیے ہر طرح کے کیل کائے سے لیں ہو رہی تھی۔

یہ دستاویز پڑھ کر تھوڑی دیر میرے دل میں ایک عجج سی کشکش ہوتی رہی۔ ڈپٹی ہوم سیکرٹری کا پیشہ وارانہ ضمیر میرے اندر چھپے ہوئے بے عمل، ناقص اور خوابیدہ سے مسلمان کے ضمیر کے ساتھ نکلا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تھوڑی سی لڑائی کے بعد جیت ٹوٹے پھوٹے مسلمان ہی کی ہوئی۔ چنانچہ میں نے یہ دستاویز اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی، اور اسی رات قائدِ عظم سے ملاقات کرنے کی نیت سے دہلی روانہ ہو گیا۔

ان دنوں مسٹر کے ایچ خورشید قائدِ اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اگر وہ دلی میں موجود ہوتے تو غالباً مجھے قائدِ اعظم سے ملنے میں کوئی وقت پیش نہ آتی۔ لیکن وہ موجود نہ تھے۔ ایک دو روز کی تگ و دو، منت سماجت اور جیلے بہانوں کے بعد آخر بڑی مشکل سے مجھے قائدِ اعظم تک رسائی حاصل ہوئی۔ جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ فارغ ہو کر ایک نظر مجھ پر ڈالی اور گرجدار آواز میں بولے۔

”کیا بات ہے؟“

”سر،“ میں آپ کے لیے ایک مفید دستاویز لے کر آیا ہوں۔ میرا نام قدرت اللہ شب  
ہے۔ میں ایسیہ میں ڈپٹی ہوم سیکرٹری ہوں۔“ میں نے ایک ہی سانس میں زیادہ سے  
زیادہ باتیں کھنے کی کوشش کی۔

”کیسی دستاویز؟“

میں نے آگے بڑھ کر کانگرس کا سرکلران کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ بڑے سکون سے اسے پڑھتے رہے۔ میں کھڑا ہوا ان کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ ان کے جذبات میں ہلاک سا ارتقاش بھی پیدا نہ ہوا۔ ایک بار پڑھ چکے تو مجھے کری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور فرمایا۔ ”ہاں،“ یہ ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ دوبارہ اس کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ اس کے بعد مجھ سے دیافت کیا۔ ”یہ تم نے کہاں سے حاصل کی ہے؟“

میں نے فر فر ساری بات کہہ سنائی۔

”ویل، ویل،“ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ This is breach of Trust  
میں نے اپنا قوی فرض پورا کرنے کے موضوع پر تقریر کرنے کی کوشش کی، تو قائدِ اعظم نے مجھے کسی قدر سختی سے نوک دیا، اور فرمایا۔

Don't You see each copy is numbered! Its disappearance would be easily tracked down to you. Are you prepared to face the consequences!

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”کیا میں اسے اپنا پاس رکھ سکتا ہوں؟“ قائدِ عظم نے دستاویز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”جی ہاں، سرا! یہ میں آپ ہی کے لیے لایا ہوں۔“

”آل رائٹ، تم جا سکتے ہو۔“ قائدِ عظم نے حکم دیا۔

میں دروازے سے باہر نکلنے لگا تو قائدِ عظم نے بلند آواز سے پکار کر پوچھا۔ ”تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟“

”قدرت اللہ شبب“

”بوائے، دوبارہ ایسی حرکت مت کرنا۔“ قائدِ عظم نے فرمایا، مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت ان کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ تھی یا نہیں تھی۔ لیکن ان کے لمحے میں مجھے شفقت کا ہلکا سا گدگاڑ ضرور محسوس ہوا۔

یہ اپریل ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ اس وقت ہندوستان کی بساط سیاست پر مسلمانوں کے خلاف جو خطرناک چالیں چلی جا رہی تھیں۔ ان کا پس منظر بڑا سبق آموز ہے۔

جب سے لاہور میں ۱۹۴۰ء کا پاکستان ریزولوشن منظور ہوا تھا، اسی وقت سے گاندھی جی، لنگر لنگوٹ کس کر اسے ناکام بنانے کے لیے میدان عمل میں اترے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جب برطانیہ کو جرمنی اور جاپان کے ہاتھوں چاروں طرف شکست نصیب ہو رہی تھی، تو انہوں نے ایک مخفی ہوئے سیاسی جواری کی طرح حالات کو آئک تول کر اپنا پانہ پھینکا، اور مسلمانوں کو اعتماد میں لیے بغیر ”ہندوستان چھوڑ دو“ (Quit India) تحریک کا کھڑا کھڑا کر دیا۔ جب یہ پوچھا جاتا تھا کہ اگر انگریز واقعی چلے جائیں، تو ہندوستان کس کے حوالے کر کے جائیں..... تو گاندھی جی کے چیلے چانٹوں کا جواب بڑا جازم اور غیر مبسم ہوتا تھا۔

”To God or to Anarchy“ طوائف الملوكی کی صورت میں پو بانہ اکثریت ہی کی تھی اور برصغیر میں اکثریت ہندو قوم کی تھی۔

ڈیڑھ دو برس بعد جب جنگ عظیم کا پانسہ پلٹنا شروع ہوا، اور برطانیہ کا پلہ بھاری دکھائی دینے لگا، تو گاندھی جی نے بھی پینٹرا بدلا۔ جس وقت برطانیہ پر شکست کھا رہا تھا، گاندھی جی جنگ کے بائیکاٹ کا پرچار اس اصول کی بنا پر کر رہے تھے کہ جنگ و جدال اہنگاں پر  
دھرم کے منافی ہے۔ لیکن لڑائی کا نقشہ بدلتے ہی اہنا کا اصول بھی موم کے ناک کی طرح مزگیا۔ اب گاندھی جی نے بریش حکومت کو یہ پیش کی، اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر کے اقتدار فوراً منتقل کر دیا جائے، تو جنگ کے ہر شعبے میں برطانیہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا جائے گا۔ مہاتما گاندھی کے سیاسی دین میں اہنا کے اصول کو مصلحتوں کی بے حد لپک حاصل تھی۔ جب جی چاہا ہارتے ہوئے انگریز کے خلاف جنگی بائیکاٹ کے لیے استعمال کر لیا اور جونہی حالات بدلتے جیتے ہوئے انگریز کے ساتھ جنگی تعاون کے لیے کام میں لے آئے۔ امور ریاست اور سیاست میں یا کاری کو فنون لطیفہ کا درجہ دینے والے کوٹلیا کا ارتھ شاستر بھی گاندھی جی کے عملی ہنگمنڈوں کے سامنے بازیچہ اطفال نظر آتا ہے۔

جنگ ختم ہوتے ہی انگلستان میں لیبر پارٹی بر سر اقتدار آگئی۔ اس پارٹی کے ساتھ کانگرس کے گھرے تعلقات تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر گاندھی جی نے گرگٹ کی طرح ایک اور رنگ بدلا۔ اب انہوں نے بریٹا یہ رث لگانی شروع کر دی، کہ انگریزوں کے بعد ہندوستان میں سیاسی اقتدار کی وارث صرف آل انڈیا کانگرس ہے۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے، اقتدار حاصل کرنے کے بعد کانگرس خود اس سے نپٹ لے گی۔ اہنگاں پر دھرم دھمکیاں دے رہا تھا۔

مطلوبہ پاکستان کے متعلق گاندھی جی کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان ایک اٹوٹ اور ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ اس کو تقسیم کرنے کی کوشش گنو ماٹا کا جسم کائیں کے متراوٹ ہے۔ جراحی کا یہ عمل بھارت ماٹا پر کرنے سے پہلے ان کی اپنی لاش پر کرنا پڑے گا۔

اس پس منظر میں برطانوی کی بنت مشن آزادی ہند کی گتھی سلجنے مارچ ۱۹۳۶ء میں ہندوستان وارد ہوا۔ مشن میں لارڈ پیٹھک لارنس، سر ٹیفورڈ کرپس، اور مسٹر اے وی الیگزینڈر شاہ تھے۔

رجحان طبع اور میلا خاطر کے لحاظ سے لارڈ پیٹھک لارنس گاندھی جی کی مہاتمائی کے اسی تھے۔ وہ گاندھی جی کو مشرقی دانائی اور روحانیت کا منع سمجھتے تھے۔ اور ان دونوں کا آپس میں گرو اور چیلے کا سا تعلق تھا۔

مشن کے سب سے نیا نیز، طرار اور فعال ممبر سر ٹیفورڈ کرپس تھے۔ پنڈت نہرو کے ان کے ساتھ گھرے مراسم تھے۔ مشن کی بیشتر اہم تجاویز پنڈت نہرو اور گاندھی جی کے خفیہ مشورے کے بعد متب کی جاتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے سر ٹیفورڈ کرپس اپنے ایک ذاتی دوست سدھیر گھوش کو ولال کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

مشن کے تیرے ممبر اے وی الیگزینڈر کو کانگریس یئڈروں کے ساتھ کسی قسم کی ذہنی یا جذباتی یا ذاتی وابستگی تو نہ تھی، لیکن ان کو یہ وہم لاحق تھا، کہ کانگرس کے مرد آہن ولہ بھائی پیٹل کی خوشنودی حاصل کئے بغیر مستقبل میں آزاد ہندوستان اور انگلستان کے باہمی تعلقات خوشنگوار نہیں رہ سکتے۔

اس ملی بھگت کے مقابلہ میں قائد اعظم کی ذات یا وہم تھا تھی۔ ان کا واحد ہتھیار ان کا ذاتی کردار تھا جس کا ایک نمایاں جوہر ان کی سیاسی بصیرت تھی۔ لیکن اس سے بھی بڑا جوہر ان کی کامل ثابت قدی اور دیانتداری تھی، جسے نہ خوف دبا سکتا تھا، نہ خوشامد ڈگما سکتی تھی، نہ لائق خرید سکتا تھا۔

جب کی بنت مشن ہندوستان آ رہا تھا، تو وزیر اعظم کلیمنت ایٹلی نے اپنے بیان میں یہ اعلان کیا تھا۔ ”ہندوستان میں اقلیتوں کے حقوق کا ہمیں خیال ہے۔ لیکن ہم یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ کوئی اقلیت اکثریت کے حقوق پر کسی قسم کا ویٹو استعمال کر سکے۔“

اس اعلان پر کانگرس نے بڑی بغلیں بجائیں۔ مسلم لیگ کے لیے یہ ایک طرح کی دارنگ

تھی کہ وہ کانگریس کے عزائم میں نیا دہ روٹے انکانے کی کوشش نہ کرے۔ قائد اعظم نے اس دھمکی کا بڑا خوبصورت جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک مکٹری اپنا جلا بن کر تیار کرے اور پھر مکھی کو مدعو کرے کہ وہ تشریف لائے اور جائے میں آ کر پھنس جائے۔ اب اگر مکھی اس دعوت کو قبول نہیں کرتی۔ تو وزیر اعظم ایشیلی کے الفاظ میں یہی کہا جائے گا، کہ مکھی مکٹری کے خلاف ویٹو استعمال کر رہی ہے۔

کینٹ مشن ہندوستان میں تین ماہ کے قریب رہا۔ اس عرصے کی داستان انگریزوں اور ہندوؤں کی سیاسی چیزہ دستیوں، منافقتوں، یا کاریوں، دروغ بائیوں اور فریب سازیوں کی عجیب و غریب بھول بھلیاں ہے۔ کانگریس نے اپنا دام تزویر قدم پر بچھا رکھا تھا۔ اور برٹش حکومت کے نمائندے مسلم لیگ کو گھیر گھار کر اسے اس میں پھسانے کے لیے طرح طرح کے ہتھنڈے استعمال کر رہے تھے۔ قائد اعظم نے ان سب کا مقابلہ بڑی بے لائگ راست بازی اور ثابت قدی سے کیا۔

کینٹ مشن کا فیصلہ یہ تھا کہ برصغیر کو پاکستان اور بھارت کے دو الگ الگ اور خود مختار حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ متحده ہندوستان میں امور خارجہ، دفاع اور ذرائع آمد و رفت مرکزی حکومت کے اختیار میں ہوں گے۔ صوبوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ایک گروپ میں ہندو اکثریت کے صوبے ہوں گے۔ دوسرے گروپ میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوجستان ہوں گے۔ تیسرا گروپ میں بنگال اور آسام کے صوبے ہوں گے۔ تین مرکزی شعبوں کو چھوڑ کر باقی سب امور میں ہر گروپ خود مختار ہو گا۔

اب تناقضانہ سیاست کاری کا ایک نیا منظر ظہور میں آیا۔ ایک الگ پاکستان کا مطالبہ کرنے والی مسلم لیگ نے تو یہ تجویز منظور کر لی۔ لیکن انھنہ بھارت کی رٹ لگانے والی کانگریس نے اسے مسترد کر دیا۔

مسلم لیگ کی طرف سے اس تجویز کی منظوری قائدِ اعظم کی سیاسی بصیرت کا عملی شاہکار ہے۔ مطالبہ پاکستان رو ہو جانے کے بعد یہ تجویز بھاگتے چور کی سب سے اچھی لگوٹی تھی۔ اس میں کم از کم یہ گارنٹی تو موجود تھی، کہ صوبوں کی گروپ بندی کی وجہ سے ایک طرف پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان اور دوسری طرف بنگال اور آسام کے مسلمانوں کو اپنے معاملات میں بڑی حد تک ہندو مرکوزیت کے اثر سے خود مختاری حاصل ہو گی۔ اس کے علاوہ قائدِ اعظم ہندو ذاتیت سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔ شاید ان کے ذہن میں یہ خیال بھی ہو کہ جس وجہ سے مسلم لیگ اس فارمولے کو منظور کر رہی ہے یعنی اسی وجہ سے کانگرس اسے مسترد بھی کر سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو مطالبہ پاکستان قدرتی طور پر از سر نو بحال ہو جائے گا۔

کانگرس کی گنگا جمنی سیاست نے وہی کیا جس کیکی اس سے توقع تھی۔ ہندو قیادت اتنا بھی برداشت نہ کر سکی کہ کسی فارمولے میں مسلمانوں کو ان کے اکثریتی صوبوں میں بھی کسی قسم کا سیاسی اختیار حاصل ہو۔ گاندھی جی چراغ پا ہو گئے۔ پنڈت نہرو اور سردار ولیہ بھائی پیل نے کیبینٹ مشن پلان کی دھیان اڑا دیں۔ ہندو پرلس نے شور و غور کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کیبینٹ مشن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہوں نے کانگرسی لیڈروں کے ساتھ کچھ ظاہری اور کچھ خفیہ رابطے قائم کئے۔ کانگرس کے دباؤ میں آ کر مشن کے ممبروں نے اپنا تھوکا ہوا خود ہی چاننا شروع کر دیا۔ اور کانگرس کے ایماء پر خود اپنے ہی پلان میں انہوں نے ترمیم و تجدید اور غلط تعبیر، غلط تفسیر اور غلط اخراج کے ایسے ایسے پوند لگانے شروع کر دیئے کہ اس کی شکل بدل گئی، اس کے معنی بگڑ گئے اور متحده ہندوستان میں مسلمانوں کے جمہوری حقوق کامل طور پر ہندو آمریت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جس طور پر کانگرس نے اپنی یہ تحریک چلائی اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا بنیادی مقصد انگریزی راج سے آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ مسلم لیگ کو شکست دینا ہے۔ کانگرس کی نظر میں ہندوستان کی آزادی اسی صورت میں قابل قبول

تھی جبکہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے زیر نگیں رکھنے کے لیے پلے سے پورا پورا بندوست کر لیا جائے۔

قائد اعظم اپنا فرض پورا کر چکے تھے۔ کیونٹ مشن کے پلان کو تسلیم کر کے انہوں نے پاکستان کا مطالبہ داؤ پر لگا دیا تھا۔ لیکن کانگرس کے خوف و خوشامد میں آ کر مشن نے حب اپنے پلان کی صورت کی صورت خود ہی منسخ کر دی، تو مجبوراً مسلم لیگ نے بھی اپنی منظوری واپس لے لی۔ اس طرح انھنڈ بھارت کی آخری ہندیا کانگرس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی مسلم کش پالیسیوں کے چوراہے میں پھوڑ دی۔ کانگرس کے بلیک میل کے آگے سر جھکا کر اور دم بلا کر خود اپنے ہی تیار کردہ پلان میں تحریف و تخریب کرنے والے کیونٹ مشن نے بھی متعدد ہندوستان کے تابوت میں آخری کیل گاڑ دی۔

چنانچہ قائد اعظم نے اعلان کیا کہ ہم نے مفہومت کی ہر کوشش، دلیل اور جدت کو کام میں لا کر دیکھ لیا ہے۔ اب یہ بات حتیٰ طور پر پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ ان تمام مسائل کا واحد حل قیام پاکستان ہے۔ دوسروں سے مدد یا ہمدردی کی امید رکھنا بیکار ہے۔ ایسی کوئی عدالت نہیں جس کا دروازہ ہم انصاف حاصل کرنے کے لیے کھنکھتا سکیں۔ ہماری فقط ایک عدالت ہے، وہ مسلمان قوم ہے۔

اب تک مسلم لیگ کی سیاست بڑی احتیاط سے آئینی حدود کے اندر رکھی جاتی تھی۔ لیکن اب وقت آگیا تھا کہ انگریزوں کی موجودہ اور ہندوؤں کی مجونہ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے سیاست کے اس اسلوب کو ترک کر دیا جائے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے ”ڈائریکٹ ایکشن“ کا اعلان کیا، اور ۱۶ اگست ۱۹۴۷ء ”ڈائریکٹ ایکشن ڈے“ مقرر ہو گیا۔ ساتھ ہی تمام مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے دیئے ہوئے خطابات واپس کر دیں۔

۱۶ اگست کو ”ڈائریکٹ ایکشن ڈے“ ہر جگہ امن و امان سے گزر گیا، لیکن ٹکلتہ میں بڑا زردست فساد ہو گیا۔ مسٹر حسین شہید سروری بنگال کے چیف منستر تھے۔ انہوں نے

۱۶ اگست کو عام تعطیل کا دن قرار دے دیا۔ کانگری حلقے اس اعلان پر بڑے سخن پا ہوئے۔ کلکتہ کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ۲۳ فیصد کے قریب تھی۔ ۱۶ اگست کو وہ لاکھوں کی تعداد میں ”ڈائریکٹ ایکشن ڈے“ کے جلسے میں شریک ہوئے۔ مسٹر سروردی نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی۔ جلسے کے بعد جب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے، تو شر کے گلی کوچوں میں مسلح ہندوؤں نے اچانک ان پر قاتلانہ حملہ شروع کر دیئے۔ جلسہ گاہ سے واپس آنے والے مسلمانوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح یا کیک ایک پلے سے ٹھانی ہوئی ساڑش کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ بالکل نہتے تھے۔ اس کے بر عکس ہندوؤں کے جتنے ہر قسم کے ملک ہتھیاروں سے لیس تھے۔ وہ جگہ جگہ گھات لگا کر بے خبر اور بے شان و گمان مسلمانوں کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ تاریخ یہ کبھی نہ بتا سکے گی کہ اس روز کلکتہ کے گلی کوچوں، سڑکوں اور بازاروں میں کتنے مسلمان شہید ہوئے۔ ان کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تھی۔ یہ قیامت صغری کی روز تک شر کے طول و عرض میں بربا رہی۔ کلکتہ کے ہندو پلے سے تیار بھی تھے، مسلح بھی تھے، اور تعداد میں بھی مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھے۔ لیکن ہندو پرنس یہی اودھم مچاتا رہا کہ نیادتی سراسر مسلمانوں کی ہے اور صوبے کے چیف منٹر سروردی ان کی خفیہ طور پر مدد کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے شروں میں ہندو مسلم فاد کوئی نہیں یا عجیب چیز نہیں تھی۔ لیکن جس پیانے پر کلکتہ میں کشت و خون کا بازار گرم ہوا اس نے سب کو ورطہ حرث میں ڈال دیا۔ یہ دو فرقوں یا دو گروہوں کی لڑائی نہ تھی۔ بلکہ دراصل یہ دو قوموں کی جنگ تھی۔ بر صغیر میں پہلی بار دو قومی نظریہ بساط سیاست سے نکل کر میدان کارزار میں اتر آیا تھا، اور اس Great Calcutta Killing نے مستقبل کے نقشے پر بڑے گرے اور دور رس اثرات مرتب کئے۔

اس کا سب سے پہلا اثر عبوری حکومت کی تشکیل پر ہوا۔ کینٹ مشن کی سفارش کے مطابق واتسرائے ہند لارڈ ویول کانگرس، مسلم لیگ اور دوسری اقلیتوں کے نمائندوں پر

مشتعل مرکزی کابینہ بنانے کی تگ دو کر رہا تھا۔ یہاں پر بھی کانگرس کی یہی خواہش اور کوشش تھی کہ وائسرائے پہلے کانگرس کو عبوری حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دے۔ اس کے بعد مسلم لیگ سمیت دوسری جماعتیں وائسرائے کی دعوت پر نہیں بلکہ کانگرس کے ساتھ اپنا اپنا معاملہ طے کر کے کابینہ میں شریک ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی گدی پر بیٹھنے کا حق تو صرف کانگرس کو حاصل ہو۔ باقی جماعتیں کی خوشنودی حاصل کر کے محض طفیلیوں اور حاشیہ نشینوں کی حیثیت سے حکومت میں شامل ہو سکیں۔ لارڈ ویول اس چکھے میں آ گیا۔ اور اس نے کانگرس کے نمائندوں کو عبوری حکومت میں شامل ہونے کی براہ راست دعوت دے دی۔ گاندھی جی کا نخل تمنا ایک دم سربراہ ہو گیا۔ جب کسی نے ان سے پوچھا کہ عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کا کیا بنے گا، تو گاندھی جی نے خوشی سے چمک چمک کر جواب دیا کہ مسلم لیگ کو اب وائسرائے کی بجائے کانگرس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ جناح صاحب کو چاہیے کہ اس بارے میں وہ پنڈت نہرو سے اثر ویو مانگیں۔

ابھی عبوری حکومت قائم نہیں ہوئی تھی، کہ کلکتہ کا ہولناک فساد برپا ہو گیا۔ فساد کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے لارڈ ویول نے کلکتہ کا دورہ کیا، تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ سپاہی پیشہ وائسرائے میدان جنگ کی نفیات اور فن حرب کا تجربہ کار ماہر تھا۔ اس کے فوجی ذہن نے بڑی آسانی سے یہ اندازہ لگا لیا، کہ کلکتہ میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوا، بلکہ سول وار ہوئی ہے۔ اور مسلمانوں کے جائز حقوق کو مزید پامال کیا گیا، تو سارا برصغیر ایک خوفناک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔

لارڈ ویول دیانتدار سپاہی اور باضمیر سیاست دان تھا۔ کلکتہ سے واپس آ کر اس نے اخلاقی جرأت سے کام لیا، اور کانگرس سے مشورہ کئے بغیر مسلم لیگ کو بھی عبوری حکومت میں شامل ہونے کی براہ راست دعوت دے دی۔

وائسرائے کے اس اقدام سے کانگرس د کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ انگریزوں کے

سائے تلے ہندوستان پر اکیلے راج کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ اس وقت ہندوستان کے سعل اور فوجی اداروں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اگر عبوری حکومت کی باگ ڈور صرف کانگرس کے ہاتھ میں آ جاتی، تو بلاشبہ اسے سارے ہندوستان پر رام راج کی راہ ہموار کرنے میں بڑی مدد ملتی۔ مند اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد مسلم لیگ کو مستقل طور پر عبوری حکومت سے باہر رکھنا اس کے باسیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کانگرس کے ہاتھ میں ایسے جی حضوریے مسلمان موجود تھے جو بڑے شوق سے انٹرم گورنمنٹ (عبوری حکومت) میں مسلم لیگی سینیوں کی خانہ پری کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس طرح مسلم لیگی سیاست کا بڑھتا ہوا سیلاپ سرکاری رکاوٹوں کی مدد سے اقليقوں کی بند کھاڑی میں دھکیل دیا جاتا۔ اور تسلیم حکومت کا بہانہ بنا کر کانگرس اپنے اس دعوے کو بھی مستحکم کر لیتی کہ ہندوستان میں وہ برٹش حکومت کی واحد جانشیں ہے۔

لیکن واسرائے کے بر وقت اقدام نے ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس پر کانگرس نے بڑا کرام مچایا۔ طرح طرح کے جیلے بہانوں کی آڑ لے کر گاندھی جی نے لارڈ ویول کو بڑی سختی سے برا بھلا کھا۔ اور لندن میں برٹش گورنمنٹ کے پاس یہ شکایت لکھ بھیجی کہ واسرائے کلکتہ کے فسادات سے بوکھلا کر بدحواسی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ وہ اعصابی تناؤ میں بھلا ہے اور آئینی امور میں اس کی قوت فیصلہ کمزور پڑ گئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ واسرائے کی مدد کے لیے انگلستان سے کوئی ایسا قانونی ماہر بھیجا جائے جو لارڈ ویول سے نیا ہد قابل اور صائب الرائے ہو۔

لارڈ ویول پر کانگرس کا یہ پہلا حملہ تھا۔ اس کے بعد کانگریسی لیڈر مسلسل اسی تاک میں رہتے تھے کہ جس طرح ہو سکے قدم قدم پر واسرائے کو ہر معاملے میں زک پہنچائی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے لندن میں اپنے بھی خواہوں کے ذریعہ ریشنہ دوانیاں شروع کر رکھی تھیں کہ لارڈ ویول کی جگہ کوئی ایسا شخص واسرائے مقرر ہو جسے کانگرس آسانی سے کٹھ پتلی کی طرح اپنے مفاد کی تار پر نچا سکے۔

کانگرس ۲ ستمبر ۱۹۳۶ء کو عبوری حکومت میں آئی تھی۔ ۱۵ اکتوبر کو مسلم لیگ بھی اس

میں شامل ہو گئی۔ مسلم لیگ کی شمولیت کا گرس کی مرضی کے خلاف عمل میں آئی تھی۔ اس لیے کابینہ میں ان دونوں کی رفاقت شروع ہی سے معاندانہ اور مخاصمانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

عبوری حکومت ۱۳ اکتوبر پر مشتمل تھی۔ چھ کاگرس، پانچ مسلم لیگی، ایک سکھ، ایک عیسائی اور ایک پارسی۔ امور خارجہ اور کامن ویلتھ نہرو کے پاس تھے۔ ہوم، انفارمیشن اور براڈ کاستنگ پیل کے پاس اور ڈپیٹس سردار بلدیو سنگھ کے پاس ..... جو ہر لحاظ سے کاگرس ہی کا کل پرنسپل تھا۔ کاگرس نے جان بوجھ کر فائننس کا پورٹ فولیو مسلم لیگ پر اس وجہ سے ٹھونے کی پیشکش کی کہ مسلمان مالیاتی حساب کتاب میں کمزور مشہور تھے اور کاگرس کو امید تھی کہ وہ وزارت خزانہ چلانے میں بری طرح ناکام ہوں گے۔ خان لیاقت علی خان نے یہ وزارت سنبھال کر اس چیلنج کو ایسی خوش اسلوبی سے قبول کیا کہ بہت جلد کاگرسی وزیر کف افسوس ملنے لے گے کہ انہوں نے فائننس کا چارج مسلم لیگ کو دے کر بڑی فاش غلطی کی ہے۔

ہر حکومت میں وزارت خزانہ کا یہ ناخوٹگوار فرض ہوتا ہے کہ وہ وسائل اور اخراجات میں توازن برقرار رکھے۔ اس مقصد کے لیے عبوری حکومت میں جب خان لیاقت علی خان کسی کاگرسی وزیر کی اخراجاتی تجویز میں جائز میں بخی نکال کر اسے گھٹاتے یا نامنظور کر دیتے تھے تو اسے ان کی ضد اور سیاسی خصوصت پر محلول کیا جاتا تھا۔ مالیاتی امور کے علاوہ باقی بہت سے معاملات میں بھی دونوں گروہوں میں مستقل پنج پنج چلتی رہتی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا عیقق اور وسیع تضاد سیاسی سطح پر تو کیبنت مشن کے روپرو آشکار ہو چکا تھا۔ ان دو قوموں کا باہمی عناد کلکتہ کے خوزیرز فسادات نے اجاگر کر دیا تھا۔ رہی سی کسر اب عبوری حکومت کے تجربے نے نکال دی۔

ایک طرف تو حکومت کے اندر مسلم لیگ اور کاگرس کی کشاکشی روز بروز زور پہنچتی جا رہی تھی دوسری طرف برصغیر کے کئی حصوں میں ہندو مسلم فسادات باضابطہ خون کی

ہوئی کھیل رہے تھے۔ کلکتہ میں مسلمانوں کے قتل عظیم کے بعد مشرقی بنگال کے ضلع نواکھلی میں فساد ہو گیا، جہاں تین سو کے قریب افراد مارے گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس واقعہ کو ہندو پریس نے مبالغے کا رنگ چڑھا کر ایسے انداز سے پیش کیا کہ ملک کے طول و عرض میں شدید بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ ہندو تو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ اب نواکھلی کو بہانہ بنا کر انہوں نے بھار میں جوابی کارروائی شروع کر دی۔ یہاں پر مسلمان اقلیت پر جو قیامت نوٹی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ صوبے میں کانگریس وزارت بر سر اقتدار تھی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہاں آٹھ ہزار سے اوپر مسلمان شہید ہوئے۔ لیکن اصلی تعداد کا کسی کو پورا علم نہیں۔ جن علاقوں میں یہ خونی طوفان اٹھا وہاں پر مسلمانوں کی آبادی سات آٹھ فیصد سے بھی کم تھی۔ ہندوؤں کے مسلح جتنے ہاتھیوں، گھوڑوں اور بیل گاڑیوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے اور گاؤں گاؤں جا کر مسلمان آبادیوں کو نیست و نابود کر دیتے تھے۔ پیدل بلوائیوں کے جھنڈ کے جھنڈ مذہبی دل کی طریقیلے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر، چن چن کر برچھیوں اور بھالوں سے مار ڈالتے تھے یا گھروں میں بند کر کے زندہ جلا دیتے تھے۔ درجنوں مسجدیں کھود کر ہل چلا دیا گیا۔ سینکڑوں عورتوں نے اپنی عصمت بچانے کی خاطر کنوں میں کو کر جان دے دی۔ بہت سے بچوں کو درختوں کے تنوں کے ساتھ مینخوں سے ٹھونک کر مصلوب کر دیا گیا۔ ایک بھاری اکثریت کے ہاتھوں ایک قلیل، بے ضرر اور بے یار و مددگار اقلیت پر ظلم و بربریت کی اس سے نیا وہ گھناؤنی مثال ملتا محال ہے۔

بھار کے بعد یو پی کی باری آئی۔ گڑھ مکیتسر میں ہر سال ہندوؤں کا میلہ لگتا تھا جس میں لاکھوں ہندو شامل ہوا کرتے تھے۔ چند ہزار غریب مسلمان بھی اس میلے میں خرید و فروخت کا سامان لے کر جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک روز ہندوؤں نے اچانک مسلمانوں پر حملہ شروع کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے میلے میں موجود تمام مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو بڑی بیدردی سے موت کے گھاث اتار دیا۔

جب کلکتہ پر مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے تو ہندو پریس نے اسے مسلمانوں کی

نیادتی کا رنگ دے کر بڑا شور و غونما کیا تھا۔ نواکھلی کے واقعات کو بھی ہندو پریس نے بڑے ڈرامائی اور سنسنی خیز مبالغے کے ساتھ اچھالا تھا۔ لیکن بھار اور گڑھ مکیتسر میں مسلمانوں کے قتل عام پر اس پریس کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ بھار اور یوپی کی کاگری وزارتوں کی شہہ پا کر سارے پریس نے ایک طرح کی اجتماعی چپ سادھ لی۔ لیکن جادو کی طرح خون ناحق بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ان دونوں لرنہ خیز واقعات کی خبریں بڑی سرعت سے پھیل گئیں اور رفتہ رفتہ سارا برصغیر ہندو مسلم تاؤ اور کشیدگی کی انتہائی خطرناک زد میں آ گیا۔

جب نواکھلی میں فساد ہوا تو گاندھی جی فوراً وہاں پہنچے اور کئی ماہ تک انہوں نے متاثرہ علاقوں کا پیدل دورہ کیا۔ وہ روزانہ تین چار میل پاپیاہ چلتے تھے، اور ہر جگہ مسلمانوں کو تلقین کرتے تھے کہ ہندو تمہارے بھائی ہیں اور ان کی حفاظت کرنا تمہارا فرض منصبی ہے۔

اسی دوران بھار میں فسادات بربا ہو گئے۔ بھار کے کچھ کاگری مسلمانوں کی بار بار استدعا پر گاندھی جی نے نواکھلی کا پیچھا چھوڑا، اور بڑی مشکل سے بھار تشریف لائے۔ یہاں پر انہوں نے جو کچھ دیکھا، اس نے ہندو جاتی کی امن پسندی، صلح جوئی اور غیر تشدید پسندی کے متعلق ان کے بہت سے مفروضات کی کیا پلٹ دی۔ یہاں پر وسیع و عریض علاقوں میں مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا۔ گھر لٹ چکے تھے۔ مسجدیں ویران پڑی تھیں۔ کنوئیں مسلمان عورتوں کی لاشوں سے اٹاٹ بھرے ہوئے تھے۔ کئی جگہ نخنے منے بچوں کے ڈھانچے اب تک موجود تھے جنہیں لوہے کے کیل گاڑ کر درختوں اور دیواروں کے ساتھ ٹاک دیا گیا تھا۔ یہ روح فرسانہ کے دیکھ کر گاندھی جی کو غالباً زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ہندو قوم اتنی نرم دل، امن پسند اور غیر تشدید نہیں ہے جتنا کہ وہ سمجھتے اور پر چار کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف بچھر کر ہندو بھی خونخوار درندگی کا پورا پورا مظاہرہ کرنے پر قادر ہیں۔ گاندھی جی کے جیون ساتھی، سیکرٹری اور سوانح

نگار پیارے لال نے اپنی کتاب "Mahatma Gandhi: The Last Phase" میں بڑے واضح طور پر اس بات کا اعتراف کا ہے کہ بھار کی خونزی دیکھ کر گاندھی جی کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا، اور متحده ہندوستان کے متعلق ان کا دریښہ خواب ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔

ان المناک واقعات نے ایک طرف تو گاندھی جی کے ذاتی، سیاسی اور اخلاقی فلسفے میں انقلاب عظیم بپا کر دیا، اور دوسری طرف وائسرائے ہند لارڈ ویول کے فوجی تربیت یافتہ زمین کے سامنے بھی تین حقائق کے انبار لگا دیئے۔ سارا برٹش انڈیا خانہ جنگلی کی مہیب پیش میں گھرا ہوا تھا۔ اس بڑھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے وائسرائے کے وسائل خوفناک حد تک محدود تھے۔ جنگ عظیم کی وجہ سے اعلیٰ انتظامی سروں میں انگریز افسروں کی تعداد پہلے سے نصف تک گئی تھی۔ برٹش گورنمنٹ کے سینیل فریم (آلی سی ایس) میں پانچ سو سے بھی کم انگریز افسر تھے۔ ان کی اکثریت بھی آزادی سے پہلے رہنماز ہو کر گھر واپس جانے کے لیے پرتوں رہی تھی۔ ہندوستان پر برٹش ایمپائر کا سایہ قائم رکھنے کے لیے ان لوگوں نے بڑے بڑے معمر کے سر کئے تھے۔ لیکن اب ایمپائر کا سایہ ڈھل رہا تھا۔ اب محض ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی قتل و جدال میں کئی نمایاں حصہ لینے میں انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہندوستان کی مسلح افواج میں بھی برٹش افسروں کی تعداد گیاہ ہزار سے گر کر فقط چار ہزار تک گئی تھی۔ گورا فوج کے یونٹ بھی بڑی سرعت سے انگلستان واپس جا رہے تھے۔ کیونکہ جنگ کے بعد ملک کی تغیر نو کے لیے برطانیہ کو اپنی افرادی قوت کام پر لگانے کی شدید ضرورت تھی۔ سول اور ملٹری وسائل کی اس تقلیل و تنحیف کے پیش نظر برصغیر کے گزرتے ہوئے حالات پر کنٹرول رکھنا وائسرائے کے بس کا روگ نہ تھا۔ عوایی سطح پر کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ سیاسی سطح پر عبوری حکومت میں مسلم لیگی اور کامگری گروپوں کی باہمی سکھش اور چقپلش روز بروز تین سے تین تر ہو رہی تھی۔ انتظامی سطح پر غیر جانبدار اور موثر وسائل سراسر ناکافی

تھے۔ ان تمام حقائق کا جائزہ لے کر لارڈ ویول اس نتیجے پر پہنچا کہ برطانیہ کے لیے ہندوستان پر مزید حکومت کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے اس نے برٹش گورنمنٹ کے پاس پر زور سفارش کی کہ بر صغیر کا اقتدار مقامی لوگوں کو منتقل کر کے برطانیہ کو جلد از جلد اپنی اس ذمہ داری سے بے کدوش ہو جانا چاہیے۔

اس پس منظر میں وزیر اعظم ائلی نے ۲۰ فروری ۱۹۳۷ء کو یہ تاریخی اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ ۱۵ جون ۱۹۳۸ء تک لازمی طور پر ہندوستان کے اقتدار سے دستبردار ہو جائے گی۔ یہ اقتدار کس کو سونپنا جائے گا؟ کیا اقتدار برٹش انڈیا کی کسی واحد مرکزی حکومت کو منتقل کیا جائے گا یا الگ الگ صوبوں کے سپرد کیا جائے گا یا کوئی اور مناسب اور متبادل طریقہ اختیار کیا جائے گا؟ اس کا فیصلہ وقت آنے پر حالات کے پیش نظر طے پایا جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی وزیر اعظم ائلی نے یہ اعلان بھی کیا، کہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیشن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس اعلان پر کانگریس نے خوشی کے بڑے شادیاں بجائے۔ لارڈ ویول مدت سے کانگریس کی تنقید و تنقیض کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ کانگریسی گرگے کافی عرصہ سے حکمران لیبر پارٹی کے حلقوں میں لارڈ ویول کے خلاف اپنا اثر و رسوخ مستعدی سے استعمال کر رہے تھے۔ فیلڈ مارشل ویول کا قصور صرف اتنا تھا، کہ کانگریس کے رحم و کرم پر چھوٹنے کی بجائے اس نے مسلم لیگ کو براہ راست عبوری حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ اب یہ بات تاریخی شواہد سے پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ لارڈ ویول کی معزولی اور لارڈ ماؤنٹ بیشن کی تقریبی کا پنڈت جواہر لال نہرو کو پہلے سے علم تھا، اور اس نے فیصلے کو ان کی اشیر باد بھی حاصل تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیشن برطانیہ کے شاہی خاندان کا فرد تھا اور ذاتی طور پر بڑی پر کشش اور چکا چوند کر دینے والی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی سرشت میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اور اپنا کام نکلنے میں اسے بلا کی تیزی، طراری اور انتحک محنت اور مستعدی کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ شرست کا ولد اداہ، ذاتی پلبھی کا رسیا اور رائے عامہ کو اپنی

خواہشات میں ڈھالنے کا باکمال ماہر تھا۔ لارڈ ویول کا حشر دیکھ کر ماونٹ بیشن نے یہ سبق پلے باندھ لیا تھا کہ اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرنے لیے اسے کانگرس کی خیر سگالی اور خوشنودی کو ہر قیمت پر خریدنا پڑے گا۔ یہ قیمت اس نے بڑی فراخدی سے مسلمانوں کے کھاتے سے ادا کی۔

لارڈ ماونٹ بیشن نے خاص طور پر پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ بہت جلد بڑے گھرے تعلقات استوار کر لیے۔ اس رشتے کی آبیاری میں لیڈی ماونٹ بیشن کا بڑا ہاتھ تھا جو ظاہری حسن و جمال، ذہنی رفاقت اور تمدنی و تمذبی نزاکت کا خوبصورت مرقع تھی۔

ہندوستان کے آخری والسرائے کے طور پر لارڈ ماونٹ بیشن یہاں حکومت کرنے نہیں آیا تھا بلکہ بر صغیر سے برٹش حکومت کی بساط پیشے آتا تھا۔ ۱۵ جون ۱۹۴۸ء تک اس فرض کو پورا کرنے کے لیے اس کے پاس فقط پندرہ ماہ تھے۔ ونسن چرچل کے نزدیک اتنی بڑی سلطنت کے کارروبار کو اتنے قلیل عرصہ میں منتقل کرنے کی کوشش شدید خطروں سے خالی نہ تھی۔ اس میں اس جلد بازی کو شرمناک فرار قرار دیا تھا، جیسے جہاز کو خطرے میں گھرا دیکھ کر اس کے پیندے میں سوراخ کر کے اسے ڈبو دیا جاتا ہے۔ لیکن لارڈ ماونٹ بیشن کے ضمیر پر ایسا کوئی بوجھ نہ تھا۔

مارچ ۷ ۱۹۴۸ء میں جب لارڈ ماونٹ بیشن نے والسرائے کا عمدہ سنبھالا، تو تقسیم ہند کا اصول قریباً قریباً طے شدہ امر تھا۔ ستم ٹرینی تو یہ ہے کہ پاکستان کا مطالبه تو مسلم لیگ نے کیا تھا لیکن اس مطالبے کو جلد از جلد پورا کرنے کی فکر اب کانگرس کو گلی ہوئی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ ”پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے“ ہندوستان کی تقسیم پر کانگرس اس لیے آماہ نہیں ہوئی تھی کہ اسے مسلمانوں کے ساتھ کوئی منصانہ یا فیاضانہ یا دوستانہ سلوک کرنا منظور تھا۔ کانگریسی لیڈروں نے یہ کڑوا گھونٹ بڑے غم و غصہ سے شدید مجبوری اور مغدوری کے عالم میں اپنے گلے سے اتنا رکھا۔

عبوری حکومت کے تجربہ سے پنڈت نہرو، سردار پیل اور ان کے ساتھیوں کو اس بات

کا یقین ہو گیا تھا، کہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ اقتدار میں شریک کر کے کانگرس کبھی بھی اپنی من مانی کارروائیاں کرنے پر قادر نہ ہو سکے گی۔ عبوری حکومت میں مسلم لیگی وزیر کانگرس کی بالا دستی تسلیم نہیں کرتے تھے اور نہ ہی وہ اپنی پالیسیوں میں کانگرس کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح ناچنے پر تیار تھے۔ کابینہ کے مسلم لیگی گروپ نے اپنا الگ تشخض قائم کر رکھا تھا اور ذاتی الہیت، دیانت اور فہم و تدریں میں بھی وہ اپنے کانگری رفق کاروں سے کسی طرح سکتمتے نہ تھے۔

وہ آخری تنکا جس نے عبوری حکومت کے اونٹ کی کمر توڑ دی، خان لیاقت علی خاں کا بجٹ ثابت ہوا جو انہوں نے ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر خزانہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ اسے عام طور پر ”غیریب آدمی کے بجٹ“ کے لقب سے نیا نہ کیا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ضروریات زندگی مہنگی ہو گئی تھیں، بلیک مارکیٹ عروج پر تھی، روپے کی قیمت گر رہی تھی، اور دولت گنتی کے چند منافع خوروں، بڑے صنعت کاروں اور تاجریوں کے ہاتھ میں مرکوز ہو گئی تھی۔ اپنی بجٹ تقریر میں خان لیاقت علی خاں نے اعلان کیا، کہ وہ قرآن حکیم کے اس معاشی فلفہ پر ایمان رکھتے ہیں جو دولت کو فقط امیروں کے درمیان گردش کرنے سے روکتا ہے۔ اس لیے اس بجٹ میں انہوں نے چند ایسی تجویزیں شامل کیں جو سماجی انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی طرف پہلا قدم تھیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ جن لوگوں نے نیکس ادا نہ کر کے دولت سمیٹی ہے، ان کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جائے گا۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ ایک لاکھ روپے سے اوپر تجارتی منافع پر ۲۵ فیصد ایشیل انکم نیکس وصول کیا جائے گا۔ اسی طرح کے چند اور نیکس تھے جن کی زد برآہ راست دولت مند افراد پر پڑتی تھی۔ دولت مندوں میں بھاری اکثریت ان بولاوں، والیوں اور دوسرے ہندو سیمیٹھوں کی تھی جن کی درپرہ مالی اعانت سے کانگرس کا سارا کاروبار چل رہا تھا۔ بجٹ کا اعلان ہوتے ہی ہندو سرمایہ داروں کے حلقوں میں کرام بھی گیا۔ انہوں نے کانگری لیڈروں کو آڑے ہاتھوں لیا اور کانگرس کی

مالی امداد بند کر دینے کی دھمکی دی۔ سردار ولہ بھائی پیل نے کابینہ میں زردست اودھم مچایا اور خان لیاقت علی خان پر یہ الزام عائد کیا کہ یہ بجٹ غریب عوام کی مدد کے لیے نہیں بلکہ ہندو سرمایہ داروں کو زک پہنچانے اور کانگرس کو مشکل میں ڈالنے کی نیت سے بنایا گیا ہے۔ ہندو پریس نے بھی بڑا واپیلا مچایا لیکن نوابزادہ لیاقت علی خان اپنے موقف پر ثابت قدم رہے اور انہوں نے بجٹ میں کوئی تبدیلی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

بجٹ کے واقعہ نے ہندو تاجروں، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی آنکھیں کھول دیں۔ انہیں یکایک یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ متحده ہندوستان کی حکومت میں اگر مسلمانوں کا کچھ عمل دخل ہوا تو سماجی انصاف، انسانی مساوات وغیرہ کے نام پر ان کے مفادات پر ہمیسہ کوئی نہ کوئی ضرب پڑتی رہے گی۔ ہمیشہ کے لیے یہ درد سر مول لینے کی بجائے یہی بہتر ہے کہ مسلمانوں کو نہیں کا کچھ نکلا دے کر الگ ہی کر دیا جائے، تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ چنانچہ ہندو سرمایہ دار بھی دل و جان سے مطالبه پاکستان کے حامی ہو گئے۔

کانگرس کے مرد آہن سردار ولہ بھائی پیل اب اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے، کہ حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی شراکت بالکل لا یعنی اور عبیث ہے۔ مسلمان اکثریت کے جو علاقے پاکستان بننے کے خواب دیکھ رہے تھے وہ بھارت ماتا کے پوتہ بدن پر گلے ہوئے، سڑے ہوئے ناسور ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ ان ناسوروں کو جلد از جلد کاٹ کر الگ کر دیا جائے تا کہ ان زہر صحت مند حصوں تک پہنچنے نہ پائے۔

پنڈت نرسو پلے ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو زیان دے چکے تھے کہ اگر پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر دیا جائے تو انہیں پاکستان کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

کانگرس نے ایک ہاتھ سے مطالبه پاکستان کو طوعاً و کہاً تسليم کیا، اور دوسرے ہاتھ سے فوراً سر توڑ کوششیں شروع کر دیں کہ یہ نوزائیدہ ملک زندہ رہنے کے قابل نہ ہونے پائے۔ اس کوشش میں اسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی صورت میں بڑا کارآمد معاون و مددگار

مل گیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیشن کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ پاکستان کن حالات میں جنم لیتا ہے اور جنم لینے کے بعد زندہ رہتا بھی ہے یا نہیں۔ اس وقت اس کا سب سے بڑا نصب العین یہ تھا، کہ آزادی کے بعد بھارت جیسا وسیع و عریض ملک برٹش کامن ولیتہ آف نیشنز (دولت مشترکہ) میں ضرور شامل رہے۔ ماؤنٹ بیشن کا ریفارمز کمشنز وی پی مین سردار ولبد بھائی پیل کا بھی دست راست تھا۔ اس کی ولائی میں وائسرائے اور سردار پیل کے درمیان سودا بازی ہوئی، اور یہ طے پایا کہ اگر پندرہ مینے کی بجائے اقتدار دو ماہ میں منتقل کر دیا جائے، تو بھارت دولت مشترکہ کا ممبر بننا رہے گا۔

اقتباس پندرہ ماہ میں منتقل ہو یا دو ماہ میں، بھارت کی ہر طرح پو بارہ تھے۔ اسے بنی بناۓ راجدھانی ملتی تھی، جسے جمائے دفتر ملتے تھے، اور صدیوں سے قائم شدہ چالو ادارے ملتے تھے۔ اس جلد بازی میں اگر کوئی مشکل در پیش تھی تو وہ صرف پاکستان کو تھی جسے ایک نئی مملکت کا آغاز انتباہی بے سرو سامانی اور سراسریگی کی حالت میں کرنا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیشن کے اپنے قول کے مقابلہ: ”انتظامی طور پر پاکستان کی حکومت کو اپنا کام شروع کرنے کے لیے ہم نہ کوئی بنی بناۓ عمارت دے سکتے ہیں نہ ٹین کی چھت دے سکتے ہیں بلکہ فقط ایک خیمه دے سکتے ہیں۔ اس سے نیا ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

اس مشکل کے علاوہ کانگریس قیادت نے پاکستان کا گلا شروع ہی سے گھونٹنے کے لیے اور بھی کئی چالیں چلیں۔ شمال مشرقی سرحدی صوبے میں اکثریت تو مسلمانوں کی تھی جو پاکستان کے حامی تھے، لیکن ہندوؤں کے گھٹ جوڑ کے وہاں ڈاکٹر خان صاحب نے حکومت کا نگرس کی قائم کر رکھی تھی۔ گاندھی جی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ صوبہ سرحد میں ہمہ پری (ریفرنڈم) نہ ہو بلکہ صوبائی اسمبلی کو اختیار دیا جائے کہ اگر وہ چاہے تو صوبے کو بھارت میں شامل کرنے کا فیصلہ کرے۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو سینڈوچ کی طرح ہر طرف سے بھارت کے شکنے میں جکڑ دیا جائے۔ یہ تجویز اتنی غیر اصولی اور

احقانہ تھی کہ کانگرس کا ماؤنٹ بیٹن جیسا فرمانبردار آلہ کار بھی اس کی حمایت نہ کر سکا۔

دوسری چال یہ تھی کہ آزادی کے بعد دونوں مملکتوں کا ایک ہی مشترکہ گورنر جنرل ہو۔ پنڈت نہرو نے تو تحریری طور پر ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ کمٹمنٹ بھی کر لی تھی کہ انتقال اقتدار کے بعد وہ آزاد بھارت کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اپنی اتنا بھی یہی چاہتی تھی کہ پاکستان کی طرف سے بھی اسے ایسی ہی پیشکش ہو۔ لیکن قائد اعظم نے دو اندیشی سے کام لے کر اس دام ہم رنگ نہیں میں پھنسنے سے انکار کر دیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور کانگرس میں ایسی گاڑھی چھن رہی تھی کہ کچھ ہندوؤں نے لاڈ سے اسے پنڈت ماؤنٹ بیٹن کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان حالات میں اسے دونوں ملکوں کا مشترکہ گورنر جنرل مقرر کرنا پاکستان کی گروں پر کانگرس کی چھری لٹکانے کے مترادف ہوتا۔ دراصل اس تجویز کا مقصد ہی یہ تھا کہ روز اول ہی سے پاکستان کی پالیسیوں کو بھارتی مفاد کے تابع رکھا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ماؤنٹ بیٹن دونوں ملکوں کا پہلا مشترکہ گورنر جنرل بن جاتا تو وہ اپنی افاد طبع، سیاسی میلان اور ذاتی اور جذباتی وابستگی کے باعث پاکستان کو بھارت کا حاشیہ بردار سیٹلائٹ بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔

اس قسم کی مکاریوں، عیاریوں اور چالبازیوں میں ناکام ہونے کے بعد کانگرس نے ایک اور گل کھلایا۔ کانگری لیڈر عموماً اور سردار ولیہ بھائی پیل اور اس کے حواری خصوصاً اب بیانگ دل دوں کی لینے لگے کہ مسلمانوں کو وہ پاکستان نہیں مل رہا جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے بلکہ انہیں بے حد کثا کھلایا، لٹکڑا لولا (Truncated) پاکستان دیا جا رہا ہے جس میں زیادہ دیر زندہ رہنے کی صلاحیت اور توائی ہی نہیں۔ اس قسم کا پاکستان بہت جلد دم توڑ دے گا، اور گھنٹے نیک کر دیا رہ بھارت میں شامل ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔ کھر پھر کی یہ زہریلی مم مسلمانوں کے حوصلے اور عزم پست کرن کے لیے چلائی

گئی تھی۔ یہ مم اتنی منظم تھی کہ بہت سے مسلمانوں کے انفصال اور اعتماد نفس پر بڑا برا اثر پڑا۔ کئی ذہنوں میں یہ سوال ابھرنے لگا کہ اس قسم کا Truncated پاکستان قابل قبول ہے بھی یا نہیں؟

اس گومگو کے عالم میں سب کی نظریں قائداعظم پر لگی ہوئی تھیں۔ خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھی یہ خدشہ تھا کہ کیسیں قائداعظم اس کے پارٹیشن پلان کو مسترد نہ کر دیں۔ اس خطرہ کے پیش نظر اس نے حکومت برطانیہ کی منظوری سے ایک ”دستبرداری پلان“ (Demission Plan) بھی تیار کر رکھا تھا۔ اس پلان کی رو سے اگر مسلم لیگ پارٹیشن پلان نہ مانے، تب بھی اقتدار دو ماہ کے اندر اندر منتقل کر دیا جائے گا۔ صوبائی اختیار موجودہ صوبائی حکومتوں کو منتقل کر دیئے جائیں گے اور مرکزی اختیارات موجودہ عبوری حکومت کو دے دیئے جائیں گے۔ مسلمانوں کے لیے کوئی خاص تحفظات نہیں رکھے گئے تھے۔ مسلمان کلی طور پر ہندو اکثریت کے سامنے ایک اقلیت کا درجہ رکھیں گے۔ اب قائداعظم کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک پارٹیشن پلان تھا۔ اس کے تحت ہندوستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت اور پاکستان کی دو آزاد خود مختار مملکتوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ پاکستان میں مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ اور بلوچستان براہ راست شامل تھے۔ سلہٹ اور صوبہ سرحد میں ریفرندم ہونا تھا۔ سرحدوں کے تفصیلی تعین کے لیے باونڈری کمیشن قائم کیا جانا تھا۔

اگر مسلم لیگ فوری طور پر پارٹیشن پلان کو منظور نہ کرتی تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا Plan Demission یکطرفہ عمل درآمد کے لیے میز پر تیار پڑا تھا۔ اس منصوبے کے تحت صوبہ سرحد سمیت ہندوستان کے آٹھ صوبوں کا کنٹرول ۱۴ اگست کو براہ راست کانگرس کے ہاتھ میں چلا جاتا کیونکہ وہاں پر کانگرسی وزارتیں قائم تھیں۔ پنجاب میں گورنر راج تھا لیکن وہاں بھی یونینٹ پارٹی کے گرے موجود تھے جو ہندو کانگرسیوں اور سکھ اکالیوں کے ساتھ مل کر ہر چڑھتے ہوئے سورج کو سلام کرنے کا عملی تجربہ رکھتے تھے۔ صرف

سندھ اور بنگال میں مسلم لیگی وزارتیں تھیں جن کے خلاف کانگریسیوں اور دوسری ہندو پارٹیوں کے پریشر گروپ نژادست ریشہ دوائیوں میں مصروف تھے۔ Demission Plan کے تحت مرکزی کنٹرول عبوری حکومت کو ملنا تھا جس کے چھ کانگریس ممبر اپنے ہم خیال میں اقلیتی نمائندوں کے ساتھ مل کر کسی وقت بھی پانچ مسلم لیگیوں کو بیک وقت بنی و دو گوش نکال کر باہر کر سکتے تھے اور ان کی جگہ اپنی مرضی کے مسلمان شو بوائز کو حکومت میں بھرتی کر سکتے تھے۔ اس صورت میں پورے ہندوستان کا اختیار بلا شرکت غیرے کانگرس کے قبضہ میں آ جاتا اور مسلمان قوم ایک اقلیت کی حیثیت سے بے یار و مددگار ان عناصر کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جاتی جو سر سے پاؤں تک وسیع پیانے پر مسلح تھے اور کلکتہ، بہار، گڑھ، مکیتیسر اور دوسرے مقامات پر اپنے خون آشام ہاتھ بڑی سفاکی سے دکھا چکے تھے۔

ایک طرف Truncated پاکستان تھا، دوسری طرف ہندوؤں کی ابدی غلامی کا عفریت منہ کھولے بیٹھا تھا۔ ان دو تقابل صورتوں کے درمیان قائدِ عظم نے وہی راستہ اختیار کیا جو ایک عملی سیاست دان، دور اندیش میر اور صاحب فراست مسلمان کے شلیان شان تھا۔ انہوں نے بڑے واضح احتجاج کے ساتھ پارٹیشن پلان منظور کر لیا۔

جن لوگوں کے دل میں اب بھی یہ وہم ہے کہ اس وقت Truncated پاکستان قبول کرنے کے سوا اور بھی کوئی چاہہ کار تھا، انہیں لاڑہ ماونٹ بیٹن اور کانگرس کی ملی بھگت کے پس منظر میں Demission Plan کا تفصیلی مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

آخر ۳ جون ۱۹۴۷ء کا تاریخی دن طلوع ہوا، اور تقسیم ہند کے منصوبے کا باضابطہ سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا۔

یہ اعلان کانگرس کی منظوری کے ساتھ کیا گیا تھا۔ رسی تو جل گئی لیکن مل نہ گیا۔ چنانچہ گیاہ روز بعد ۱۲ جون کو آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کا جو اجلاس ہوا، اس میں تقسیم ہند کے "سانحہ" پر بڑے گھرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور سب نے انتہائی

وثق سے اس امید اور عزم کا اعلان کیا کہ یہ ایک عارضی بندوست ہے جو وقت کی مجبوریوں اور مصلحتوں کی وجہ سے ناگزیر ہو گیا تھا ورنہ وہ دن دور نہیں جب بھارت ایک بار پھر متحہ ہندوستان بن کے رہے گا۔ اس موقع پر کامگرس ورکنگ کمپنی نے جو ریزولوشن پاس کیا، اس میں مندرجہ ذیل پیراگراف آج تک جوں کا توں موجود ہے۔

"Geography and the mountains and the seas fashioned India as She is, and no human agency can change that shape or come in the way of her final destiny. Economic circumstances and the insistent demands of international affairs make the unity of India still more necessary."

"ہندوستان کی شکل و صورت اس کی جغرافیائی"

حدود اس کے پہاڑوں اور اس کے سمندروں  
نے وضع کی ہے۔ کوئی انسانی تدبیر اس صورت  
کو بدل سکتی ہے نہ اس کے حقیقی مقدار کو  
ٹال سکتی ہے۔ معاشریاتی حالات اور میں الاقوامی  
امور کے شدید تقاضوں کے پیش نظر ہندوستان  
کی وحدت اور بھی زیادہ ضروری ہے۔"

ہندو ماں سجنے بھی کوئی لگی رکھے بغیر صاف اعلان کر دیا۔

India is one and indivisible and there will never be peace unless and until the separated areas are brought back into the Indian Union and made integral parts thereof.

"ہندوستان واحد اور عیر قسم ہے۔ جب تک

الگ کئے ہوئے علاقوں کو انہیں یونین میں  
واپس لا کر انہیں اس کا مکمل حصہ نہیں  
بنایا جاتا، اس وقت تک امن ہرگز قائم نہیں  
رہ سکتا۔"

اب بھارت میں اقتدار کا گرس کا ہو یا کا گرس کے مخالفین کا، دونوں صورتوں میں ہر بھارتی حکومت اس نصب العین کو پورا کرنے کی پابندی ہے جس کا ذکر مندرجہ بالا اعلانات میں بڑی وضاحت سے موجود ہے۔ بھارت ہمارے ساتھ خیر سگال کی بات کرے یا تعلقات معمول پر لانے کا آغاز کرے، تجارتی لین دین ہو یا زراعتی گفت و شنید ہو، یا ثقافتی ہیر پھیر ہو۔ ہر شعبے میں بھارت کی حکمت عملی کی سڑک ایک اور صرف ایک منزل کی طرف جاتی ہے۔ وہ منزل اکھنڈ بھارت ہے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو لاڑہ ماونٹ بیٹن، پنڈت جواہر لال نہرو، قائد اعظم محمد علی جناح اور سردار بلدیو سنگھ نے پارٹیشن پلان پر آل انڈیا ریڈیو سے اپنے اپنے بیانات نشر کئے۔ میں نے یہ تاریخ براؤ کاست کٹک کی ۱۸ سوں لائنز میں بلا کماری والے ڈرائیک روم میں بیٹھ کر سن۔ میرا کشمیری خانام اور بنگالی ڈرائیور روز محمد بھی ریڈیو کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب قائد اعظم کی تقریر کا اعلان ہوا تو رمضان نے بڑی عقیدت اور پیار سے ریڈیو سیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

تقریں ختم ہوئیں تو رمضان نے بڑی سادگی سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ایسے بڑے بڑے انگریز، ہندو اور سکھ "صاحب لوگ" مل جل کر مسلمانوں کے لیے پاکستان بنا رہے ہیں۔ "رمضان، تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "ہاں صاب، بالکل مالوم ہے۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ ..... لا الہ الا اللہ" رمضان نے لہک لہک کر ترنم کے لجھ میں کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ یہ کیسے بنا ہے؟" میں نے اسے مزید کریدنے کی کوشش کی۔ "ہاں صاب، مالوم، بالکل مالوم۔ بس لا الہ الا اللہ، بس لا الہ الا اللہ" رمضان نے وثوق سے جواب دیا۔

رمضان کے پاس ایمان کی دولت تھی۔ اس لیے اس کے لیے اتنا یقین ہی کافی تھا۔ میرے پاس اخباری تراشیوں کی ضخیم سکریپ بک تھی۔ میں نے کافہ پنسل سنبھالی اور اپنی دانشوری

کا بھرم رکھنے کے لیے تاریخی حوالوں کو کھنگال کر پاکستان کا مطلب نکلنے بیٹھ گیا۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی مسحیل کی طرف ایک ثابت قدم

URDU4U.COM

پاکستان کا مطلب کیا؟

سرسید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ کا تدریجی اور منطقی ارتقاء

پاکستان کا مطلب کیا؟

حکیم الامت علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر جو انہوں نے اپنے خطبہ الہ آباد میں پیش کیا تھا۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

دینی، سماجی، معاشری، ثقافتی، تمدنی اور سیاسی بنیادوں پر مسلمانوں کا ایک الگ قوم کی صورت میں ابھرتا ہوا تشخص۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

ہندو گنو رکھشا، مسلمان کا ذیجہ، ہندو کی چیلیا، مسلمان کا ختنہ، ہندو کے مندر کا ناقوس، مسلمان کی مسجد کی اذان، ہندو کی چھوت چھات، مسلمان کی اخوت اور مساوات ..... ان اختلافات کی وجہ سے مستقل اور مسلسل خوزیریز تصادمات اور فسادات۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

قومیت کی اجازہ داری پر ہندوؤں کی ضد اور ہٹ وھری

پاکستان کا مطلب کیا؟

آزاد اور متحده ہندوستان پر بلا شرکت غیرے حکمرانی کرنے کا کانگری جنون۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

مسلمانوں کو ایک معمولی اقلیت کی طرح اکثریت کے رحم و کرم پر ہیشہ کے لیے ہندوؤں کے زیر نگیں رکھنے کا منصوبہ۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

مسلم اکثریتی علاقوں میں بھی مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے جمیوری حقوق دینے سے انکار۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

آزاد اور متحده ہندوستان کی حکومت میں مسلمانوں کو کوئی موثر کردار دینے کے خلاف ہندو سرمایہ داروں کی زردست مخالفت اور مزاحمت۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

مسلم اکثریتی علاقوں کو بھارت ماتا کے پوتربدن پر گندے ناسور سمجھ کر انہیں کاٹ کر الگ کر دینے کا شدھ کا گنگری اپریشن۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

بھارت کو برٹش کامن ویلٹہ میں شامل رکھنے کے لیے لاڑ ماؤنٹ بیٹن اور کاگرس کی سودا بازی۔ اقتدار کو پندرہ میینے کی بجائے دو ماہ میں منتقل کرنے کی سازش، تا کہ پاکستان کی نوازائیدہ مملکت کو وجود میں آتے ہی ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

لاڑ ماؤنٹ بیٹن کو بھارت اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل بنانے کی کوشش۔ تا کہ شروع ہی سے اس نئی مملکت کو بھارت کی حاشیہ نشینی کی عادت ڈال دی جائے، اور اس کی پالیسیاں بھارت کی پالیسیوں کے ہم رنگ اور تابع ہوں۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

پاکستان کی پیشکش کے مقابلے میں Demission Plan کی شمشیر برہمنہ۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

کاگرس کا عزم کہ تقسیم ہند ایک عارضی عمل ہے۔ بھارت ایک ہے اور ایک ہو کے رہے گا۔ کوئی انسانی طاقت اس حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

ہندو مہا سبھا کا اعلان کہ بھارت ناقابل تقسیم ہے۔ الگ ہونے والے علاقوں کو ہر قیمت

پر دوبارہ بھارت میں شامل کیا جائے گا۔  
پاکستان کا مطلب کیا؟

ہندوؤں کی جاریت اور انگریزوں کی منافقت کے گھن جوڑ کے مقابلے میں قائد اعظم محمد علی جناح کی بے لوث، بے لاغ، بے بل، بے خوف ایماندارانہ اور مدبرانہ قیادت۔

پاکستان کا مطلب کیا؟  
مسلمانوں کا قائد اعظم کی رہنمائی پر مکمل اعتماد۔

پاکستان کا مطلب کیا؟  
تحریک پاکستان کے دوران مسلمان قوم کا اتحاد، ایمان اور نظم۔

آدمی رات ہو چکی تھی لیکن ابھی تک میری سکریپ بک کا عشر عشر بھی ختم نہ ہوا تھا۔ میں نے تھک کر تراشوں کا انبار سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا، اور اپنی تن آسانی کو سارا دینے کے لیے رمضان کی طرح کروڑوں مسلمانوں کا ہر دلعزیز شارٹ کٹ اختیار کر لیا۔ ”پاکستان کا مطلب کیا؟ ..... لا الہ الا اللہ“

سیا لکھ کے اصغر سودائی کا یہ لافقی مصرع ایک ضرب الشل کی صورت اختیار کر چکا ہے۔  
میں بڑی دری تک سرور کے عالم میں ”پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ“ گنگتا رہا۔

اس رات مجھے بڑی میٹھی اور پر سکون نیند آئی۔ خواب بھی بڑے دلفریب دیکھے۔ سب کے پو بانہ نظر آئے۔ سب کے وارے نیارے دیکھے۔ اپنی ترقی کی راہیں بھی بڑی کشاہ محسوس ہونے لگیں۔ دل و دماغ میں خوش امیدیوں کا جشن چراغاں ہونے لگا۔ ساری رات خوب عیش و نشاط میں گزری۔ نیند میں بھی ”پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ“ کی طربناک گونج میرے کانوں میں رس گھولتی رہی اور میرے پردہ خیال کو ایک لمحہ کے لیے بھی اس فکرنے آلوہ نہ کیا کہ

خود نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل؟  
 دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

# • سادگی مسلم کی دیکھ

۱۹۴۷ء کے اگست کے مینے میں ایک روز میں اپنی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ اس میں معمول سے کھرد رے سے بادامی کاغذ پر ایک سائیکلو شائلڈ خط نکلا، جسے میں اپنی زندگی کا ایک نہایت عزیز خط سمجھتا ہوں۔ آغا ہلالی نے نئی دلی سے حکم بھیجا تھا کہ مجھے پاکستان کی وزارت تجارت میں انذر سیکرٹری تعینات کیا گیا ہے اور میں ۱۳ اگست کے بعد جلد از جلد کراچی پہنچ کر اپنے عمدہ کا چارج لے لوں۔ اس خط کا نمبر اور تاریخ اس طرح درج تھے۔

No. CPS (ESTS)/4/47  
Cabinet Secretariat (Pakistan)  
New Delhi, the 7 August 1947

حکومت پاکستان کے نام سے اپنی زندگی کا پہلا خط پا کر جوش مرت میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے ایک پونٹ آرڈر نہیں بلکہ ایک سلطنت مل گئی ہے۔  
اس خط کا ایک ایک حرفاً کی لہر کی طرح میرے رُگ و پے میں سرایت کر گیا۔  
میں نے اسے بار بار پڑھا، آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا اور بھاگ وزیر اعلیٰ کے کمرے میں پہنچ کر ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شری ہری کرش منتاب بڑے خوش اخلاق اور نیک نیت ہندو تھے۔ میرے چہرے پر مرت کا غیر معمولی ہیجان دیکھ کر کچھ افسرہ سے ہو گئے اور بولے۔ ”میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ جب جی چاہے چلے جانا۔ مجھے تو اس بات کی چلتا ہے کہ اگر سب مسلم آفسروںی طرح چلے گئے تو یہاں پر مسلمانوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“

منتاب صاحب کی یہ چلتا محض ان کی ذات تک محدود تھی۔ ورنہ سرکاری اور سیاسی طور پر تو وہ ان ہدایات کے پابند تھے جن میں کانگرس نے حکم دے رکھا تھا کہ ان کے

صوبے میں کوئی مسلمان پولیس اور انتظامیہ کی کسی کلیدی اور موثر اسمی پر معین رہنے نہ پائے۔ یہ ہدایات آزادی سے چھ ماہ پہلے جاری ہوئی تھیں۔ آزادی کے بعد بھارت میں کانگریس کی سیکور حکومت نے جو گل کھلائے، اس کا بڑا واضح نقطہ کے ایل گبا کی کتاب ”Passive Voices“ میں لتا ہے۔

کے ایل گبا کا پہلا نام کہیا لال گبا تھا۔ وہ پنجاب کے ایک انتہائی متول خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انہوں نے بچپن ہی سے انگلستان میں تعلیم پائی۔ بیرشی کرنے کے بعد انہوں نے لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ وہ انگریزی زبان کے بڑے صاحب طرز انشاء پرواز تھے اور تیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کئی کتابیں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔

مشر گبا نے ۱۹۳۳ء میں اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال سے کم تھی۔ ان کا اسلامی ناک خالد لطیف گبا رکھا گیا۔ اس خبر نے چاروں طرف بڑا تمکہ مچایا۔ قبول اسلام کے بعد مشر گبا نے سیرت النبی پر اپنی مشہور کتاب ”the Desert“ کیا۔

”The Prophet of“ لکھی جو آج تک بہت سے حلقوں میں شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

کئی نیشنل مسلمانوں کی طرح مشر گبا بھی تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے لاہور چھوڑ دیا، اور بمبئی منتقل ہو کر وہاں کی ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔۔۔ پہنچیں برس تک انہوں نے بھارتی حکومت کے اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ سلوگ کا گرا مطالعہ کیا اور انجام کارروہ بڑے دکھ سے اس نتیجے پر پہنچے کہ بر صیغہ میں دو قوی نظریہ ہی صحیح نظریہ ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب Passive Voices میں بھارت کی نام نہاد سیکور ازم کے ڈھول کا پول کھولا اور سرکاری اعداد و شمار کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ بھارتی حکومتیں کس باقاعدگی اور ترتیب کے ساتھ مسلمانوں کو سرکاری، نیم سرکاری، سیاسی اور معاشری زندگی سے خارج کرتی رہی ہیں۔ آزادی کے بعد چند برس کے اندر اندر اڑیسہ کے سیکرٹریٹ، ہائیکورٹ اور پلیک سروس کمیشن میں ایک مسلمان افر

بھی نہ رہا۔ اڑیسہ سے دس ممبر راجیہ سجا اور بیس لوک سجا کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ ان میں بھی مسلمانوں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں۔ اڑیسہ کی صوبائی اسمبلی میں ایک سو چالیس سینیس ہیں۔ ایک مسلمان بھی اسمبلی کا ممبر منتخب نہیں ہو سکا۔

چیف مشر سے فارغ ہو کر میں چیف سیکرٹری مشر بی سی مکر جی کے پاس گیا۔ یہ بڑے شوقین مزاج، آزاد خیال اور دہریہ قسم کے آدمی تھے۔ گائے کا گوشت شوق سے کھاتے تھے اور غالباً اسی وجہ سے تعصباً کے جذبات سے خالی تھے۔ آئی سی ایس کی ٹریننگ

کے دوران انہوں نے لندن میں کسی کے پاس سونہ فاتحہ کا انگریزی ترجمہ دیکھا تھا۔ وہ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اسے حفظ کر لیا۔ کبھی کبھی مودہ میں آ کر مجھے سنایا کرتے تھے اور کہتے تھے۔ ”یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا، سات چھوٹے چھوٹے فقروں میں اتنا کچھ آگیا ہے کہ سات کتابوں میں بھی نہیں سا سکتا۔“

جب میں نے مشر مکر جی کو چیف مشر کی یہ تشویش بتائی کہ اگر مسلمان افسر پاکستان چلے گئے تو یہاں پر مسلم آبادی کی دیکھ بھال کون کرے گا، تو وہ زور سے ہنسے اور بولے۔ ”مہتاب جی رسی باتیں کرتے ہیں۔ تم یہاں وہ بھی جاؤ تو ۱۵ اگست کے بعد تمہیں ہوم ڈیپارٹمنٹ سے نکال کر غالباً ریکارڈ آفس کا افسر بکار خاص لگا دیا جائے گا تا کہ بند کرے میں بینھ کر پرانی پرانی فائلوں کی گرد جھاڑتے رہو۔“

مشر مکر جی نے میز کی دراز سے ایک فائل نکالی اور اسے کھول کر مجھے ایک صفحہ دکھایا جس میں صوبے کے نئے گورنر چندو لال تریویدی نے چیف سیکرٹری کو انتہائی درشت الفاظ میں بڑی سخت ڈانٹ پلانی تھی۔ نیا گورنر بھی آئی سی ایس افسر تھا اور حال ہی میں ڈینپس سیکرٹری کے عمدے سے ترقی پا کر اڑیسہ کا پہلا ہندوستانی گورنر مقرر ہوا تھا وہ بڑا تیز طرار، دھانسو قسم کا نبرد جو ہندوستانی اور کانگرس کے ساتھ اپنا قارونہ ملانے کی لیے ہر قسم کے اوچھے تھیمار استعمال کرنے پر کمر بستہ رہتا تھا۔ چیف مشر اور دوسرے کانگری وزیروں کے سامنے وہ بڑی فرمانبرداری سے دم بلاتا رہتا تھا لیکن چیف سیکرٹری سمیت باقی

افروں پر وقت بے وقت، جائز ناجائز دھونس جانا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ چیف سیکرٹری کے طور پر میں بھی چند روز کا مہمان ہوں۔“ مسٹر مکر جی نے کہا۔ ”یہ لوگ مجھے درجہ اول کا ہندو نہیں سمجھتے۔ اس لیے بہت جلد مجھے بھی کسی بے ضرر اور بے اثر مجھے کی پول میں دھانس دیا جائے گا۔ مجموعی طور پر یہ چھوٹے دل کے کمینے لوگ ہیں۔ ان کے پتھریلے ضمیر انسان دوستی کی شہنما سے نآشنا ہیں۔

تم ان کی باتوں میں نہ آتا۔ بڑے شوق سے پاکستان جاؤ۔ وہاں جانا تمہارا فرض ہے۔

چند روز بعد گورنر ہاؤس میں کسی ڈری کی تقریب تھی۔ اسی روز اعلان ہوا تھا کہ 15 اگست سے مسٹر چندو لال تریویدی مشرقی پنجاب کے گورنر ہوں گے۔ اس خبر پر وہ بے حد مسرور تھے، کیونکہ پنجاب کی تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب کو لازمی طور پر ایک پراملہم صوبہ ثابت ہونا تھا۔ ایسے صوبے کی گورنری کے لیے مسٹر چندو لال تریویدی کا انتخاب ان کی برتری و تفوق کا بڑا نمایاں طرہ امتیاز تھا۔ چنانچہ وہ وہسکی کا گلاس ہاتھ میں لیے اور ایک موٹا سا سگار کلے میں دبائے پائٹی میں بلبل کی طرح چمک رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ گورنلے کی طرف لپکے اور بڑی بلند آواز میں بولے۔ ”میں نے سنا ہے تم بھی پاکستان جانے کی تیاری کر رہے ہو۔ بہت خوب! ..... اگر کبھی لاہور کی طرف آتا ہوا، تو مجھے ضرور ملنا۔ مجھے لاہور کا گورنر ہاؤس خاص طور پر پسند ہے۔ اس کے سامنے لارنس گارڈن کی بڑی اچھی سیر گاہ ہے۔“

گورنر کی یہ بات سن کر میرا منہ حرمت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میرے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے آثار دیکھ کر تریویدی صاحب نے اپنا بھاری بھر کم بھدا سا ہاتھ میرے شانے پر زور سے مارا اور ققہہ لگا کر بولے۔ ”ہاں، ہاں، لاہور۔ میرے دوست، گذ اولڈ لاہور۔ مشرقی پنجاب کا نیچرل دارالخلافہ لاہور ہی تو ہے۔“

”کیا یہ فیصلہ ہو چکا ہے؟“ میں نے کسی قدر پچکھاتے ہوئے پوچھا۔

چیف سیکرٹری مسٹر بی سی مکر جی جو قریب ہی کھڑے وہسکی کا گلاس سوڑا ملائے بغیر غٹاغٹ

پی رہے تھے، میری بات سن کر آگے بڑھے اور نہایت طنزیہ تلنخی کے ساتھ بولے۔ ”سریل ریڈ کلف نے تو ابھی تک کسی فیصلے کا اعلان نہیں کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر ہر ایکسیلینسی کو لاہور کا گورنمنٹ ہاؤس پسند ہے تو لاہور مشرقی پنجاب کو ہی ملتا چاہیے۔“

گورز چندو لال تریویدی نے خونی آنکھوں سے چیف سیکرٹری کو گھورا، اور اپنا سگار دانتوں میں چبا کر جنگلی بلے کی طرح غرائے۔ جواباً مسٹر مکر جی نے بھی دھمکی کے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے۔ صورت حال کی نزاکت کو دیکھ کر شری ہری کرشن مہتاب تیزی سے جھپٹے اور گورز کو بازو سے تھام کر دوسری طرف لے گئے۔

”یہ حرامزادہ کیتا کا پچھہ ہے۔“ چیف سیکرٹری نے شستہ انگریزی میں ٹھیکھ انگلستانی گالی دی۔ ”مشرقی جا کر یہ ضرور سکھوں سے شدید فساد کروائے گا۔ گند اکتا۔ سن آف گن“

مسٹر مکر جی کا پاہ خوب چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے گلاس میں بہت سی مزید نیٹ وہ سکی اندیلی اور گورز کی طرف بڑھنے کا رخ کرتے ہوئے بڑھایا۔ ”یہ سلا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ کامگری چوڑڑے اور چماروں کے تکوے چاٹ چاٹ کر سیاسی بد رو میں رینگنے والا ذیل کیڑا۔ میں ابھی اس کا دماغ ٹھیک کر کے آتا ہوں۔“

میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ چندو لال تریویدی اور بی سی مکر جی کے مابین لپاڑگی کے امکان بڑے روشن ہو رہے تھے۔ ریڈ کلف کا فیصلہ تو جب آتا ہے، آتا رہے گا، فی الحال گورنمنٹ ہاؤس کٹک کے لان پر ایک کثر ہندو گورز اور نیم ہندو چیف سیکرٹری کے درمیان لاہور کے قبضہ پر کچھ دست بدست تبادلہ خیال ہو جائے تو کوئی مفاداً قہ نہیں۔ لیکن صد حیف کہ میری یہ تمبا پوری نہ ہو سکی۔ کچھ اور لوگوں نے مسٹر مکر جی کو اپنے حافظتی گھیرے میں لے لیا، اور ان کا موڈ بدلنے کے لیے ان کی تانہ ترین محبوہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسٹر مکر جی کے سر سے گورز اور لاہور دونوں کے بحثات اتر گئے اور وہ وہ سکی پر اپنے گونا گوں معاشقوں کے ذکر اذکار میں گم ہو گئے۔

اس کے برعکس نئی ولی کے وائسرائیگل لاج میں کام کرنے والے لوگ مسٹر مکر جی کی نسبت نیا دہ قوی الارادہ اور مستقل مزاج تھے۔ انہوں نے اپنے جی میں ٹھان رکھی تھی کہ تقسیم ہند کے عمل میں پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو ہر پہلو سے نیا دہ سے نیا دہ بے بس اور پاٹکتہ کرنا ہے۔ شب و روز کی انتہک محنت سے ہ اپنے اس عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انتہائی نظم و ترتیب سے مصروف کا رہتھے۔

سارے ہندوستان کی حکومت کا مرکز اعصاب ولی میں تھا۔ ریلوؤں، بندرگاہوں اور پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف سسٹم کا نظام کار ولی سے کنٹرول ہوتا تھا۔ صنعتی مرکز اور سرچ کے ادارے بھارتی علاقوں میں تھے۔ امپریل لائبریری کلکتہ میں تھی۔ بربی، بحری اور ہوائی فوج کے ہیڈ کوارٹر ولی میں تھے۔ سولہ کی سولہ آرڈیننس فیکٹریاں اور فوجی سامان کے تمام ڈپو بھی بھارت کے علاقے میں واقع تھے۔ اس کے علاوہ برٹش راج کا سب سے نیا دہ رفع الشان اور نظر فریب گورنر جنرل لارڈ ماونٹ بیٹن بھی بھارت کے حصے ہی میں آیا تھا۔

تحده ہندوستان کے دفتری، مالی اور فوجی اثاثوں کا منصانہ حصہ پاکستان کو دینا پارٹیشن کونسل کی ذمہ داری تھی جس کا صدر لارڈ ماونٹ بیٹن تھا۔ ہندو قدم قدم پر ڈنڈی مارتا تھا اور سردار پیل نے تو گویا قسم کھا رکھی تھی کہ پاکستان کو کام کی کوئی چیز ملنے نہ پائے۔ پاکستان کے حق کی وکالت کرنے کا سرا چودھری محمد علی کے سر ہے۔ انہیں قائد اعظم اور نوابزادہ لیاقت علی کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے انتہک محنت، لگن اور قابلیت سے اپنے فرانپس کو نجھایا۔ پاکستان کے عالم ظہور میں آنے کے وقت اس کی راہ میں جو دشواریاں، رکاوٹیں اور مزاحمتیں حائل کی جا رہی تھیں ان کا احاطہ چودھری صاحب نے بڑی خوبی اور وضاحت سے اپنی کتاب Emergence of Pakistan میں کیا ہے۔ اس موضوع پر یہ نہایت اہم، مستند، بے لارگ اور واقعیت پسندانہ دستاویز ہے اور تقسیم ہند کے عمل میں لارڈ ماونٹ بیٹن، اس کے انگریز مشوروں اور کانگریسی لیڈروں

کی ملی بھگت کے بہت سے پوشیدہ گوشوں کو بڑی وضاحت سے بے نقاب کرتی ہے۔ تقسیم کے وقت حکومت ہند کے پاس چار ارب روپے کا کیش بیلنٹس تھا۔ بڑی طویل تکرار، جنت اور مول تول کے بعد پاکستان کو ۵۷ کروڑ روپیہ دینا طے ہوا۔ بیس کروڑ کی ایک قطع ادا کرنے کے بعد بھارت نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان وجود میں آیا تو اس نئی حکومت کے پاس بس یہی نقد اٹاٹھ تھا۔ اس وقت مملکت خدا داد کے سامنے مسائل اور اخراجات کی غیر معمولی بھرمار تھی۔ بھارت کے لیے یہ سنری موقع تھا کہ کیش بیلنٹس کی ادائیگی روک کر روز اول ہی سے اس نئی مملکت کے دیوالیہ پن کو ساری دنیا میں مشترک رہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ پاکستان کے لیے مالی لحاظ سے بڑا نازک اور پر خطر تھا لیکن یہ منزل بڑی خوش اسلوبی سے گزر گئی۔ کیونکہ حکومت اور عوام دونوں آزادی کے نشے میں سرشار، کام کی لگن میں چست اور ہر مشکل پر قابو پانے کے لیے تیار تھے۔ آخر ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی کے ”مرن برت“ سے گھبرا کر بھارتی حکومت نے کیش بیلنٹس کی باقی قطع بھی بادل نخواستہ پاکستان کو ادا کر دی۔

فوجی سامان کا ایک تھائی حصہ پاکستان کے حصے میں آتا باہمی رضا مندی سے منظور ہوا تھا۔ آرڈیننس فیکٹریاں اور ملٹری شورڈ پوسپ کے سب بھارت میں تھے۔ اس لیے ان پر بھارتی حکومت کا پورا قبضہ تھا۔ مسلح افواج اور فوجی سامان کی تقسیم کے لیے جو ادارہ قائم ہوا تھا، فیلڈ مارشل آکنلیک اس کے سپریم کمانڈر تھا۔ جیسے ہی انہوں نے کوشش کی کہ پاکستان کو ملٹری شورز وغیرہ کا منظور شدہ حصہ ملنا شروع ہو جائے، کامگری حکومت نے آسمان پر اٹھا لیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مل کر ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ فیلڈ مارشل آکنلیک کو استعفی دے پر کر پسا ہونا پڑا۔ نتیجہ کے طور پر فوجی ساز و سامان میں پاکستان کے حق کا کوئی حصہ آج تک ہمیں وصول نہیں ہو سکا۔

وہی سے سرکاری ملازمین، دفتری فائدلوں اور دوسرے متعلقہ سامان کو کراچی پہنچانے کے لیے ہر روز ایک سپیشل ٹرین چلانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ لیکن بہت جلد یہ بندوست ترک

کر دینا پڑا کیونکہ ان گاڑیوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے شدید حملے شروع ہو گئے۔ ان گنت لوگ مارے گئے۔ بہت سا ریکارڈ تلف ہو گیا۔ بے شمار سامان لٹ گیا۔ ٹرینوں کا سلمہ بند ہونے کے بعد کچھ دنوں بی او اے سی کے ہواںی جمازوں سے "آپریشن پاکستان" چلا کر کسی حد تک یہی کام لیا گیا۔

ان گوتا گوں مسائل کے علاوہ ایک بہت بڑا مسئلہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا تھا۔ ایک تجویز یہ تھی کہ یہ نازک اور اہم کام یو این او کی سرکردگی میں کروایا جائے لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے دو ٹوک رو کر دیا۔ قائد اعظم کا مطالبہ تھا کہ صوبوں کی تقسیم کے لیے جو باونڈری کمیشن بنائے جائیں۔ ان میں انگلستان کے تین لاے لارڈز کو شامل کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ لاے لارڈز کمنہ سال لوگ ہیں اور وہ ہندوستان کی گری برداشت نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ لاڑ ماؤنٹ بیٹن کی نامزدگی پر قرعہ فال ایک انگریز وکیل سر سیرل ریڈ کلف کے نام لکا۔ اور بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے لیے جو باونڈری کمیشن ترتیب دیئے گئے اسے ان دونوں کا مشترکہ چیئرمین بنا دیا گیا۔

ریڈ کلف کو اپنی شخصیت کے مقناتیں کے زیر اثر رکھنے کے لیے لاڑ ماؤنٹ بیٹن نے اسے واٹسر انگل لاج میں مہمان رکھا۔ ریڈ کلف نے بھی اس مسافر نوازی اور تواضع کا پورا پورا صلدہ دیا کیونکہ اب یہ بات تاریخی شواہد سے پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے متعلق ریڈ کلف ایوارڈ پاکستان کے خلاف بد دیانتی، فراڈ اور سراسر نا انصافی پر مبنی تھا۔ چودھری محمد علی صاحب نے اپنی کتاب میں اس کے متعلق کئی حیرت انگیز، چشم دید اور براہ راست واقعات بیان کئے ہیں۔ اس بات کا دو ٹوک فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ریڈ کلف کی شرمناک جانبداری فقط لاڑ ماؤنٹ بیٹن کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھی یا اس کی تہ میں سیم و زر کے کچھ محرکات بھی کار فرماتھے۔ یوں اس زمانے میں یہ افواہ بڑی گرم تھی کہ کامگرس نے ریڈ کلف کی خدمت میں دو کروڑ روپے کا نذرانہ چڑھایا ہے۔ ایسی باتوں کا حصہ ثبوت نہیں ملا کرتا۔ رشوت لے کر تو

چونگی کا محرر بھی صاف بیج نکلتا ہے۔ کاگنرس، لارڈ ماونٹ بیٹن اور ریڈ کلف کا گھٹ جوڑ تو بڑی بات تھی۔ بر صغیر میں لارڈ کلائیو اور وارن پیشترگر جیسے مشاہیر باج، خراج اور نذرانہ وصول کرنے کی جو روایات چھوڑ گئے ہیں، ان کے پیش نظر اس بات کی کون ضمانت دے سکتا ہے کہ لندن کا ایک غیر معروف وکیل اس زمانے کی دو کروڑ روپے کی خطیر رقم کو شانبے نیازی کے ساتھ پائے حفارت سے ٹھکرا دے گا؟ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایک ماہر قانون دان ایسے فیصلے کرے جو نہ صرف خلاف عقل، خلاف ضابطہ اور خلاف شادوت ہوں بلکہ میں طور پر بد نہادی، کجھ رائی، تمرد اور خود سری پر مبنی ہوں۔

ایک فیصلہ تو کلکتہ کے متعلق تھا، جسے ریڈ کلف نے بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے مغربی بنگال میں شامل کر دیا۔ جب کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ کلکتہ شر کی رائے معلوم کرنے کے لیے وہاں ریفرندم کروا لیا جائے تو لارڈ ماونٹ بیٹن نے توبہ توبہ کر کے کانوں کو ہاتھ لگائے، کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہاں کی اچھوت آبادی مسلمانوں کے ساتھ مل کر مشرقی بنگال میں شمولیت کے حق میں رائے نہ دے دے۔ دو برس بعد سردار ولبدہ بھائی پٹیل نے کلکتہ میں ایک تقریر کے دوران یہ اکشاف کیا، کہ کاگنرس نے ہندوستان کی تقسیم اس شرط پر مانی تھی کہ کلکتہ ہندوستان کے حصے میں آئے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ خفیہ معاملہ لارڈ ماونٹ بیٹن کے ساتھ ہی ہوا ہو گا۔ مسلم لیگ کو اس سازش کی کوئی خبر نہ تھی۔

پنجاب کی تقسیم میں ریڈ کلف نے اس سے بھی نیا ہو خطرناک گل کھلایا۔ گورداسپور کے ضلع کی آبادی میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی۔ تقسیم کے متفقہ فارموں، کی ہر شق کی مطابق یہ ضلع پاکستان کے حصے میں آتا تھا۔ لیکن ریڈ کلف نے بغیر کوئی وجہ بتائے اسے بڑی ڈھنائی اور بے حیائی کے ساتھ بھارت کو دے دیا۔ اس طرح بھارت کو بیاست جموں و کشمیر کے ساتھ آمد و رفت کا وہ راستہ مل گیا، جو کسی اور طریقے

میر نہ آ سکتا تھا۔ ریڈ کلف کا یہ فیصلہ دور رس سیاسی بد نیتی کا مظہر تھا، کیونکہ گورداسپور کے بغیر بھارت کو کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا موقع ہاتھ آ سکتا تھا نہ راستہ مل سکتا تھا۔

URDU4U.COM

پہلی ۱۸۳۶ء میں انگریزوں نے جب کشمیر ڈوگروں کے ہاتھ فروخت کیا تھا تو اس کی قیمت مبلغ ۷۵ لاکھ روپے پڑی تھی۔ اب عین ایک سو برس بعد فرنگیوں نے جب دوسری بار کشمیر ہندوؤں کے قبضہ اختیار میں دینے کی چال چلی تو اس کی بھاری قیمت بھارت سے نہیں بلکہ پاکستان سے وصول کی گئی۔ گورداسپور کے راستے بھارت کشمیر کے ساتھ براہ راست مسلک کر کے برطانیہ نے پاکستان کی نظریاتی، جغرافیائی اور معاشری سرحد پر ایک ننگی تکوار لٹکا دی اور حربی نقطہ نظر سے اس نئی مملکت کو غیر متوقع اطراف و جوانب سے بھارت کے بے جواز گھیراؤ میں دھکیل دیا۔

مغربی چنگاپ کی معاشری زندگی کو بھارت کے پنجہ اختیار میں دینے کے لیے ریڈ کلف نے گورداسپور کے نہلے پر فیروز پور کا دہلا بھی مار دیا۔ فیروز پور میں ان نسروں کے ہیڈور کس تھے، جو مغربی چنگاپ کو سیراب کرتی تھیں۔ ریڈ کلف نے یہ ہیڈور کس بھی بھارت کی جھوپی میں ڈال دیئے۔ آٹھ مینے کے اندر اندر اپریل ۱۹۴۸ء میں بھارت نے ان نسروں کا پانی بند کر کے پاکستان کو اپنی برتری کا مزا بھی چکھا دیا۔

۱۶ اگست ۱۹۴۸ء کو جب ریڈ کلف کے معاندانہ، مفسدانہ اور نامنصافانہ الیوارڈ کا اعلان ہوا، اس وقت مشرقی چنگاپ اور دہلی کے مسلمانوں پر قتل و غارت کی قیامت ٹوٹی ہوئی تھی، ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح جنگی فوجیوں اور پولیس کی مدد سے کلمہ گو مردوں، عورتوں اور بچوں کے جان، مال اور ناموس سے درندوں کی طرح کھیل رہے تھے۔

کتنے لوگ ڈیتھ ہوئے؟  
کتنی عصمتیں لیں؟

کتنے معصوم بچے مارے گئے؟

ان سوالوں کا جواب تاریخ کے حساب دان دینے سے سراسر قادر ہیں۔ ان کا جواب صرف

پاکستان کی بنیادوں میں محفوظ ہے۔

دہلی اور مشرقی پنجاب کے علاوہ بھارت کے طول و عرض میں بہت سی اور جگہ بھی ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھینے میں حسب توفیق مصروف عمل تھے۔ مسلمانوں کے لیے بھارت کی ہر شاہراہ، ہر گذنڈی پاکستان کی طرف جاتی تھی اور چند ماہ کے اندر اندر ڈیڑھ کروڑ سے اوپر لئے پئے مهاجر پاکستان میں ہجرت کر کے آگئے۔

۱۵ اگست کو جب بھارت پر آزادی کی دیوی کا نزول ہوا تو امرتر شر نے اس روز سعید کو عجیب طور پر منیا۔ جان کوئی نے اپنی کتاب "آکنلیک" میں لکھا ہے کہ اس روز سکھوں کے ایک ہجوم نے مسلمان عورتوں کو ہرمنہ کر کے ان کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس شر کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ پھر سارے جلوس کی عصمت دری کی گئی۔ اس کے بعد کچھ عورتوں کو کرپانوں سے ذبح کر دیا گیا۔ باقی کو زندہ جلا دیا گیا۔ واہ گرو کا خالصہ، واہگرو کی فتح!

## • کراچی کی طوطا کمانی

اگست کے شروع ہی میں کلک سے کراچی پنجنے کے سارے رستے مسدود ہو چکے تھے۔ جوں توں کر کے میں کسی نہ کسی طرح بگال نا گور ریلوے کے ذریعے ۱۲ ستمبر کو بھینی پنج گیا اور اگلے روز ائمہ اٹیا کے ہوائی جہاز سے کراچی آگیا۔

جب ائمہ اٹیا کا واپسی کاؤنٹ جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر لینڈ ہوا تو میرا خیال تھا کہ ہم سب مسافر ارض پاک پر سر کے بل اتریں گے اور اترتے ہی اپنی جان اور ایمان سلامت لے آنے پر باجماعت سجدہ شکرانہ ادا کریں گے۔ لیکن جہاز سے نکلتے ہی ہمیں نفاسی کے آسیب نے دبوچ لیا، اور ہم ایک دوسرے سے نکراتے، ایک دوسرے کو پچھاڑاتے، ایک دوسرے سے دھکم دھکا ہوتے اپنے اپنے سامان کی تلاش میں سرگردان ہو گئے۔ سامان وصول کر کے ہم اسے سینے سے لگا کر بیٹھ گئے اور آج تک اسی سامان کو بڑھانے، سجانے، چپکانے میں دل و جان سے مصروف ہیں۔ جو شجدہ شکرانہ کراچی ائمہ پورٹ پر قضا ہو گیا تھا، سامان کے جھمیلے میں وہ اب تک واجب الادا چلا آ رہا ہے۔ کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر!

وزارت تجارت، صنعت اور ورکس چیف کورٹ بلڈنگ میں واقع تھی۔ مسٹر آئی آئی چندر گیر وزیر، مسٹر میکفار سیکرٹری اور مسٹر شجاعت علی حسني جائش سیکرٹری تھے۔ انڈر سیکرٹری کے طور پر مجھے امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا چارج دیا گیا۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ تجارت کے کہتے ہیں اور برآمدات و درآمدات کس چیزا کا نام ہے۔ بندر روڈ پر ایک کباڑیے کی دکان میں سے میں نے ایک انٹر نیشل ٹریڈ ڈائریکٹری اور ایک سیکنڈ پینڈ فلپس اٹلس خریدی اور اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔

کام کرنے کے لیے مجھے ایک چھوٹا سا کیبن ملا ہوا تھا۔ پہلے روز اس میں فقط ایک میز تھا۔ دوسرے روز ایک کری بھی مل گئی۔ چند روز بعد ایک دو کریاں اور بھی آگئیں۔

فائلوں کے لیے کافنڈ، پن، ٹیگ کبھی دفتر سے مل جاتے تھے، کبھی ناگہ ہو جاتا تھا۔ اس روز میں یہ اشیاء بازار سے خود خرید لاتا تھا۔

ان دونوں پاکستان میں اچانک چینی اور کوئلے کی شدید قلب پیدا ہو گئی۔ بھارت سے ان دونوں اشیاء کی درآمد یکایک بند ہو گئی۔ چینی کی جگہ تو خیر لوگوں نے گڑ کا استعمال شروع کر دیا اور کراچی میں جا بجا طرح طرح کا گڑ ریڈھیوں پر بننے لگا۔ لیکن کوئلے کی کمی بڑی باعث تشویش تھی۔ اس وقت ہماری سب ریل گاڑیاں کوئلے پر چلتی تھیں، اور اس کی قلت سے رسول و رسائل کے سارے لظم کے معطل ہو جانے کا شدید خدشہ تھا۔ اس صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے چند ریگر صاحب نے متعلقہ وزارتوں کے افراد کی ایک ہنگامی میٹنگ منعقد کی۔ میں سینئر پینڈ فلپس اٹلس اور انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری کی مدد سے اپنا ہوم ورک کر کے گیا تھا۔ اس لیے میری چند تجویزی بڑی سولت سے منظور ہو گئیں۔ اس سے میرے وزیر، سیکرٹری، جائیش سیکرٹری کو غالباً یہ خوش نہیں ہو گئی کہ مجھے بین الاقوامی تجارت کے معاملات پر کوئی خاص عبور حاصل ہے۔ لیکن مجھے علم تھا کہ میں اندر سے کھوکھلا ہوں۔ تاہم اپنی ہمہ دانی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے میں نے بازار سے تجارتی معاشیات اور فن اعداد و شمار پر کئی کتابیں خرید کر چند روز میں پڑھ ڈالیں اور مکملانہ میشتگوں میں زبانی کلامی حد تک دخل در معمولات دینے کی شد بد حاصل کر لی۔

میرے اس سطحی قسم کے علم سے چند ریگر صاحب خاص طور پر مرعوب تھے۔ اور اپنی بہت سی میشتگوں میں مجھے اکثر اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ ایک روز وزیر خزانہ غلام محمد صاحب کے کمرے میں میٹنگ تھی۔ کراچی میں دفتری اور رہائشی ضروریات کے لیے جو نئی عمارتیں اور کوارٹر تعمیر ہو رہے تھے، ان کے لیے سینیٹری سامان درآمد کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میٹنگ میں چار وزیر اور کچھ افسر شریک تھے۔ وزیروں میں مولوی فضل الرحمن بھی موجود تھے۔ جن کے پاس امور داخلہ، اطلاعات اور تعلیم کا چارج تھا۔

کچھ بحث و تمحیث کے بعد جب سینیٹری کے سامان کا کوئہ طے ہو گیا تو وزیر تعلیم مولوی فضل الرحمن نے دبے الفاظ میں تجویز پیش کی کہ اگر اس امپورٹ کا کچھ حصہ ڈھاکہ کے لیے بھی مخصوص کر دیا جائے تو مناسب ہو گا۔

URDU4U.COM  
اس تجویز پر بڑی نہیٰ اڑی۔ کسی نے کہا کہ ڈھاکہ میں کئی خاص تعمیری کام شروع نہیں ہوا، اس لیے وہاں پر سینیٹری سامان بھیجنے کی کوئی تک نہیں۔ کسی نے کہا کہ جو سامان ڈھاکہ جائے گا وہ لازمی طور پر سمجھل ہو کر کلکتہ پہنچے گا۔ ایک صاحب نے مذاق ہی مذاق میں یہ پھیتی اڑائی کہ بنگالی لوگ تو کیلے کے گاچھ کی اوٹ میں بیٹھ کر رفع حاجت کرنے کے عادی ہیں، وہ ابھی سے کموڈ اور واش نیس لے کر کیا کریں گے۔

مولوی فضل الرحمن مسکرانے نہ گزرے۔ انتہائی متانت اور سنجیدگی سے انہوں نے ایک بار پھر نور دے کر کہا کہ نیا ہد نہیں تو اس سامان کا ایک قلیل علامتی سا حصہ ڈھاکہ کے لیے ضرور مخصوص کیا جائے، کیونکہ نفیاتی طور پر یہ مناسب اقدام ہو گا۔ کچھ مزید بحث و مباحثہ اور طنز و مزاح کے بعد مولوی فضل الرحمن صاحب کی بات مان لی گئی، اور ڈھاکہ کے لیے سینیٹری سامان کا کچھ حصہ مخصوصاً ہو گیا لیکن ایسی بد مزگی کے ساتھ جس طرح دودھ میں مینگنیاں ڈال کر پیش کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں لا شعوری طور پر بغلہ دیش کی بنیادوں کی کھدائی کا کام اسی روز شروع ہو گیا تھا۔ کامرس مشری میں امپورٹ اور ایکسپورٹ کا اندر سیکرٹری بننے ہی میرے دفتر کا چھوٹا سا کمرہ بڑے بڑے تاجریوں اور سیٹھوں کی محبوب گزرگاہ بن گیا۔ سارا دن بھانت بھانت کے نئے اور پرانے تاجر میرے کمرے میں منڈلاتے رہتے تھے۔ کچھ کام سے آتے تھے، کچھ دیسے ہی کنٹیکٹ بنانے کی فکر میں چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان سب میں ایک مضبوط قدر مشترک یہ تھی کہ وہ یکساں لگن سے پیسہ بنانے کی دھن میں سرشار تھے۔ جائز و ناجائز کے سوال پر وہ حیرت و استجواب سے بھوئیں چڑھاتے تھے۔ کیونکہ یہ بے

وقت کی راگنی ان کے ذوق سماں پر بڑی گراں گزرتی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پاکستان کو فوری طور پر تجارتی وسعت اور معاشری پھیلاؤ کی ضرورت ہے۔ اس وقت اخلاقی موشگافیوں کی عیاشی میں وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں۔ یہ سب لوگ پاکستان کی ترقی کے دل و جان سے خواہاں تھے۔ اور مملکت خدا داد کی ترقی کا پیانہ ہر ایک کی اپنی اپنی ذاتی تجوہی میں نصب تھا۔ میرے چھوٹے سے دفتر میں فقط ایک کھڑکی تھی جو حرص و ہوا کے اس غبار کو خارج کرنے کے لیے بالکل ناکافی تھی جو ہر آنے والا میرے کمرے کی فضا میں متعددی سکی بخارات کی طرح چھوڑ جاتا تھا۔

ایک روز میرے پاس ریفریجریٹروں کی درآمدی فرم کے ایک زیشن تاجر کسی کام سے بیٹھے تھے۔ میرا اربیل پینے کے پانی کا ایک جگ لا کر میز پر رکھ گیا۔ جگ میں برف کا ایک بڑا سا ڈلا تیرتا ہوا دیکھ کر تاجر صاحب بڑے حیران ہوئے اور بولے۔ ”کیا اپ بازار کی برف استعمال کرتے ہیں؟“

میں نے اثبات میں جواب دے کر کراچی کی برف کی کچھ تعریف کی تو تاجر صاحب نے بازاری برف کی مضر صحت اور ملک خصوصیات پر ایک طویل تقریر کی۔ ”غالباً آپ کا ریفریجریٹر ابھی کراچی نہیں پہنچا۔“ انہوں نے پوچھا۔

جب میں نے انہیں آگاہ کیا کہ میرے پاس سرے سے ریفریجریٹر ہے ہی نہیں تو تاجر صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے عجیب قسم کی حرمت سے گھورا۔

اس شام جب میں سرست ہاؤس واپس آیا، تو دو مستری ایک نیا ریفریجریٹر میرے کمرے میں کھٹا کھٹ فٹ کرنے میں مصروف تھے۔ ایک مستری نے مجھے ایک لفافہ دیا جس میں تاجر صاحب کا وزنگ کارڈ تھا۔ کارڈ پر ہاتھ سے یہ مصروع تحریر تھا۔ ”برگ بزر است تحفہ درویش“

ریفریجریٹر دودھ کی طرح سفید اور لوہے کی طرح سخت تھا۔ اور تاجر صاحب اسے برگ بزر کا نام دے کر میرے حلق سے اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے ان کی اس بد فوتو پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے ریفریجریٹر ایک گھوڑا گاڑی پر لدوایا اور مستریوں کو

ساتھ لے کر ان کے شوروم میں پہنچا جو وکٹوریہ روڈ کے ایک فیشن ایبل علاقے میں واقع تھا۔ تاجر صاحب خود تو وہاں موجود نہ تھے لیکن اگلے روز وہ نفس نشیں میرے دفتر میں تشریف لائے۔ ان کے منہ پر بیرنگ لفافون کی طرح گلوں شکوؤں کی بے شمار مریں لگی ہوئی تھیں۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں پہپر ویٹ اٹھا کر ان کے سر پر زور سے دے ماروں۔ لیکن حکومت پاکستان نے ابھی تک ہمیں پہپر ویٹ میا نہیں کئے تھے۔ اس لیے میں اپنی دل خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے محفوظ رہا۔ البتہ دروانہ بند کر کے میں نے انہیں نندہ بس سروس والی ملکہ دشام کی وہ طویل اور چیچیدہ گالی دی جسے سن کر سکھ لاری ڈرامیور کے کان بھی سرخ ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی انہیں خبردار کیا کہ اگر وہ دوبارہ میرے کمرے میں تشریف لا سکیں، تو احتیاطاً اپنے گوڑے اور گٹے ساتھ نہ لائیں۔

والیا گنگر کا پریم ناتھ اگروال ہو یا مملکت خدا داد کا مسلمان تاجر، رشوت کی نیلام گاہ میں دونوں ایک ہی طرح سے بولی دیتے ہیں۔

ایک روز کامرس سیکرٹری مسٹر میکفارقر نے امپورٹ ایکسپورٹ سیکشن کی ایک فائل طلب کی۔ بڑی ڈھنڈیا پڑی، لیکن فائل ملنی تھی نہ ملی۔ میرے سیکشن کے اسنٹ سیکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ نے چھان بین کے بعد سارا الزام اپنے ایک اسنٹ کے سر تھوپ دیا، کہ مطلوبہ فائل اس کی لاپرواہی سے گم ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے نوٹ میں یہ بھی لکھا، کہ یہ اسنٹ لا ابالی قسم کا منہ زور اور منہ پھٹ قسم کا انسان ہے۔

دفتری دستور العمل کی چند اس پابندی نہیں کرتا۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف سخت انضباطی اور تادبی کارروائی کر کے قرار واقعی سزا ضرور دینی چاہیے۔ میں نے ”ملزم“ کو اپنے کمرے میں طلب کیا، تو ایک خوش پوش، بانکا ترجمہ، گورا چٹا چھریے بدن کا جوان لکھتا ملتا ہے اعتنائی سے آیا اور دونوں کہنیاں میز پر ٹیک کر سامنے والی کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ خود میری جواب طلبی کرنے والا ہو۔ میں نے اس سے فائل کے متعلق دیافت کیا، تو اس نے بے حد رکھائی سے بے حد مختصر جواب

دیا۔ ”مل نہیں رہی۔“

”کیوں نہیں مل رہی؟“ میں نے بھی لمحے میں تیزی پیدا کر کے کما۔  
”گم ہو گئی۔“ اسٹنٹ نے وضاحت کی۔

”کیسے گم ہو گئی؟“ میں نے اور بھی تیزی سے پوچھا۔

”بس جی گم ہو گئی، بتا کے تو نہیں گئی۔“ اسٹنٹ نے اپنے باسیں ہاتھ کی پشت ناک رگڑ کر کھوں کھوں کیا اور جس طرح لکھتا ملکتا کرے میں داخل ہوا تھا اسی طرح لکھتا ملکتا واپس چلا گیا۔

یہ نکا سا جواب سن کر میں کچھ دیر کے لیے سنائے میں آگیا۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنے سوال کی حماقت اور اسٹنٹ کے جواب کی بے ساختہ معقولیت پر نہیں آنے لگی۔ اگر ہر لادپتہ چیز یہ اعلان کر کے جائے کہ وہ کیسے گم ہو رہی ہے تو گشادگی کے واقعات ہی کیوں رونما ہوں؟

میں نے اپنے افسران بالا کو نوٹ لکھ کر بھیج دیا، کہ فائل نہیں ملی اور غالباً گم ہو گئی ہے۔ چونکہ یہ لغزش میرے سکیشن میں وقوع پذیر ہوئی ہے، اس لیے انچارج افسر کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور اس کا خمیانہ بھگتتے کے لیے تیار ہوں۔ اس پر مجھے سیکرٹری میکفارقر، جائش سیکرٹری ایس اے حسنی، ڈپٹی سیکرٹری ایم ایوب اور دوسرے ڈپٹی سیکرٹری اشرف سعید سے درجہ بہ درجہ تحریری طور پر خاطر خواہ ڈانت پڑی اور ہر ایک نے مجھے آئندہ محتاط رہنے کی شدید وارنگ دی۔

وہ دن اور آج کا دن، جمیل الدین عالی سے میرے تعلقات کچھ اسی نوعیت کے خطوط پر استوار چلے آ رہے ہیں۔ کیونکہ امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا المزبے باک اور منہ زور اسٹنٹ جو فائل گم کر بیٹھا تھا، جمیل الدین عالی ہی تھا۔ میں اس واقعہ کو اپنی زندگی کا بڑا تیقی اور خوشگوار حادثہ سمجھتا ہوں۔ اس کی بدولت مجھے عالی کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے خوبصورت دوہوں اور ملی نعمتوں نے مجھے شاد کام

کیا ہے۔ جس کے خلوص کی دولت نے مجھے ملا مال کیا ہے اور جس کی نازک مزاجی، زود رنجی، تملناہست، جمنجلاہست اور کچ کلاہی نے میرے دل میں کبھی کوئی آزروگی پیدا نہیں کی۔

وزارت تجارت میں کام کرتے ہوئے مجھے مشکل سے ایک ممینہ ہوا تھا کہ جموں و کشمیر میں آزادی کی لہر انھی اور اس کے ساتھ ہی مہاراجہ ہری سنگھ کی قیادت میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ماں جی اور دوسرے عزیز جموں سے جان بچا کر سیالکوٹ اٹھ آئے۔ اب مجھے کراچی میں مکان کی فوری ضرورت پڑ گئی تا کہ انہیں اپنے پاس لے آؤں۔ ہماری مشرقی میں ایک صاحب درکس ڈویژن کے جائش سیکرٹری تھے۔ سرکاری ملازمین کو مکان دینے کے سلسلے میں وہ مختار کل تھے۔ میرے کئی جانے والوں کو وہ بڑی شفقت اور عنایت سے مکان الٹ بھی کر چکے تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی ضرورت بیان کی، تو انہوں نے بڑی رکھائی سے نکا سا جواب دے دیا۔ میں نے چند افسروں کے نام گنوائے جنہیں وہ حال ہی میں مکان فراہم کر چکے تھے تو انہوں نے لا تعلقی سے انگریزوں کی طرح اپنے شانے اچکائے اور پھر عینک لگا کر فالٹیں دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

یہ صاحب بھی دراصل بڑی مشکل میں گرفتار تھے۔ اس وقت کراچی میں رہائشی مکانوں کا وہی حال تھا کہ ایک انار صد یا تار مکان بے حد کمیاب تھے اور مکان مانگنے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ ایسے حالات میں وہ صاحب کس کو مکان دیں اور کس کو نہ دیں؟ حقدار سمجھی تھے۔ لیکن ترجیحی حقدار کون تھا؟ اس کا فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ یہ صاحب بھی کام چلاو طریقوں پر عمل کرنے پر مجبور تھے۔ کوئی کسی وزیر یا افسر کبیر کی سفارش لے آیا تو اسے مکان مل جاتا تھا۔ یا کسی صاحب ہمت نے جائش سیکرٹری کی نظر کرم حاصل کرنے کے لیے خوشامد اور چالپوسی سے کام لیا تو اس کا مقصد بھی آسانی سے پورا ہو جاتا تھا۔ میں ان دونوں لوازمات سے عاری تھا، اس لیے ان صاحب کی

عنایت بے نایت سے محروم رہا۔

تحوڑی بست دوڑ دھوپ کے بعد مجھے جواہر لال نہرو روڈ پر (جو اب قائد اعظم کے مزار کے سامنے ہے) ایک مکان کا نچلا آدھا حصہ کرائے پر مل گیا۔ اور واپسی منزل میں ہندو مالک مکان خود رہتا تھا۔ اس نے اپنا خاندان اور مال و اسباب تو بھارت بھیج دیا تھا اور اب مکان اور دکان کو اچھی قیمت پر فروخت کرنے کے انتظار میں یہاں رکا ہوا تھا۔ سانحہ ستر برس کا یہ بڑھا بڑا سخت گیر مالک مکان ثابت ہوا۔ ایک تو اس نے تین چار کمروں کا کرایہ ایسا کس کے لگایا کہ اس میں میری آدمی تنخواہ صاف نکل جاتی تھی۔ دوسرے وہ بھلی اور پانی کے استعمال پر نہایت کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ آدمی رات کو بھی ضرورتا کسی کرے کی بھلی جلانی جائے تو سوئے ہوئے مالک مکان کی چھٹی حس فوراً بیدار ہو جاتی تھی، اور وہ واپسیا چاہانا شروع کر دیتا تھا کہ ”بُتی بند کرو، بُتی بند کرو۔“ بھلی مفت نہیں ملتی کہ ساری ساری رات جلا کر عیش کیا جائے۔“ ایک روز مالک مکان کمیں سے گھوم کر واپس گھر آیا تو ماں جی برآمدے میں بیٹھی اپنے بال سکھا رہی تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ان کو بے نقط سنانی شروع کر دیں کہ میں تو نلکا بند کر کے گیا تھا، میری غیر حاضری میں پانی کھول کر نہایت کیوں ہو؟ ماں جی نے ہزار سمجھایا کہ انہوں نے نلکا نہیں کھولا۔ بلکہ صبح سے اپنے لیے پانی کی بالٹی بھر کر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن اس شریف آدمی کو بالکل یقین نہ آیا اور اس نے مسلمانوں کے جھوٹ فریب اور مکر پر بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا۔

انہی دنوں کراچی میں ہلکا سا ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ کچھ سامان بیچ باج کر ہمارے مالک مکان نے ڈھائی لاکھ روپیہ نقد جمع کیا ہوا تھا۔ اسے خدشہ محسوس ہوا کہ اگر مسلمانوں نے اس کے مکان پر حملہ کیا تو نقدی بھی لٹ جائے گی۔ حفظ ماققدم کے طور پر وہ یہ پوچھی ماں جی کے پاس امانت رکھنے کے لیے لے آیا۔ وہ روپے گن کر دینا چاہتا تھا لیکن ماں جی کو دس کے بعد کتنی ہی نہ آتی تھی۔ اس لیے مجھے سامنے بٹھا کر اس نے ڈھائی لاکھ روپیہ دو بار گنا۔ اور اسے ایک چڑے کی تھیلی میں تالہ لگا کر ماں جی

کے حوالے کر دیا۔ مجھ سے اس کی رسید لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔ مان جی نے اس امانت کی بڑی رکھوائی کی۔ رات کو وہ اس تخلی کو اپنے تکنیے کے نیچے رکھ کر سوتی تھیں۔ نماز کے لیے بھی وہ اسے اپنے گھٹنے کے ساتھ لگا کر بیٹھتی تھیں۔ دو تین روز میں امن و امان قائم ہو گیا۔ بڑھے مالک مکان نے مجھے پھر سامنے بٹھا کر ڈھائی لاکھ روپیہ دو بار گنا۔ رسید مجھے لوٹائی۔ اور اپنی امانت بغل میں دبا کر اوپر والی منزل میں واپس چلا گیا۔

میرا خیال تھا کہ ہماری اس خدمت گزاری کے عوض مالک مکان بھلی اور پانی کے سلسلے میں شاید اب ہمارے ساتھ کسی قدر نری کا برداشت دکھائے گا۔ لیکن ”ایں خیال است و محال است و جنوں“ اس کی وہی دانتا کل کل بدستور جاری رہی۔ کئی بار تو وہ بھلی کا میں سوچ سر شام ہی بجھا کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور ہم موم ہتی جلا کر اپنا کام چلاتے تھے۔ رات کو پنکھا چلا کر سونا تو بڑی دور کی بات تھی، ایک دو بار میں نے ارادہ بھی کہ اس نامعقول بڑھے سے اس بارے میں جھگڑا کروں۔ لیکن مان جی نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ بچارا دکھی ہے۔ بے گھر ہو کر بسمی جا رہا ہے۔ اس وقت اس کا دل بالکل نہیں دکھانا چاہیے۔

مالک مکان نے ایک طوطا بھی پال رکھا تھا، جسے اس نے سندھی زبان میں پاکستان کے خلاف چند گالیاں بڑے شوق سے سکھا رکھی تھیں۔ باہر جاتے وقت وہ طوطے کا پنجرا مان جی کی رکھوائی میں دے جاتا تھا۔ جب کوئی گھر والا طوطے کے سامنے سے گزرتا تھا تو وہ بڑی بے تکلفی سے اسے اپنی مخصوص گالیاں سنا دیتا تھا۔ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر جب بڑھا گھر واپس لوٹتا تھا تو مان جی اکثر اسے چائے یا شربت بنا دیتی تھیں۔ اس کے بعد وہ طوطے کا پنجرا لے کر اوپر چلا جاتا تھا اور تانہ دم ہو کر پھر ہمیں بھلی اور پانی سے محروم کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتا تھا۔

ایک روز چند ریگر صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ انہوں نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ میں ان

کے دفتر میں پڑی ہوئی سب فائلیں لے کر ان کے گھر آ جاؤ۔ مجھے ان کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ جب میں نے ان سے گھر کا پتہ پوچھا تو وہ بڑی حیرت سے بولے۔

”تعجب ہے، تمہیں اپنے منشہ کا گھر تک معلوم نہیں۔“

میں اس بات کا کیا جواب دتا؟ مجھے اپنے یا دوسرے وزیروں کے گھر اس وقت معلوم تھے نہ کبھی بعد میں معلوم کرنے کا شوق چرا گا ہے۔

چند ریگر صاحب کے دفتر میں تمیں چالیس فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ میں نے انہیں سمیٹ کر گھوڑا گاڑی میں ڈالا، اور وزیر صاحب کے بنگلے کی راہ لی۔ کوئی پر پولیس کا پھرہ تھا۔ انہوں نے گھوڑا گاڑی کو اندر جانے سے روک دیا۔ کیونکہ وزیروں کی کوئی ٹھیکانے کے اندر صرف موڑ کاروں ہی کو باریابی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

چند ریگر صاحب باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس عبدالرب نشرت بھی تشریف فرماتھے۔

”آپ شاف کار میں کیوں نہیں آئے؟“ چند ریگر صاحب نے پوچھا۔

”شاف کار فارغ نہ تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

چند ریگر صاحب نے یکے بعد دیگرے دو تین افراد کے نام لیے، اور بولے۔ ”ہاں، ان میں سے کسی کے بچوں کا لکھنٹ کی سیر کرنے گئی ہو گی۔“

کسی وجہ سے چند ریگر صاحب مجھے مسٹر سوباب کہا کرتے تھے۔ انہوں نے نشرت صاحب سے میرا تعارف یوں کرایا۔ ”یہ میرے اندر سیکرٹری مسٹر سوباب ہیں جو اپنے وزیر کا گھر تک نہیں جانتے۔“

”سحاب آپ کا تخلص ہے؟“ نشرت صاحب نے دلچسپی کے انداز میں پوچھا۔

میں نے انہیں اپنا پورا نام بتایا، تو نشرت صاحب پیشانی سیکڑ کر کچھ سوچ میں پڑ گئے اور بولے۔ ”کیا ہم پہلے کبھی مل چکے ہیں؟ مجھے اس نام سے کسی قدر شناسائی کی بو آتی ہے۔“

میں نے عرض کیا کہ اس سے پہلے مجھے ان کی نیازمندی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

نشتر صاحب نے میرے سروس کیریئر کے متعلق پے در پے چند سوال پوچھے۔ جب تقطیع بنگال کی بات آئی تو وہ یکاکیک چونکے اور فرمایا۔ ”ہاں، ہاں، خوب یاد آیا۔ ایک بار ولی میں شہید سروروی نے آپ کی کچھ مزے کی باتیں سنائی تھیں۔“

چند ریگر صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے کامرس، ورکس اور انڈسٹریز ڈویژنوں کی فائلز چھانٹ کر الگ کر کے رکھ دیں تو نشتر صاحب بھی فارغ ہو کر چلنے کو تیار تھے۔ انہوں نے ازراہ نوازش مجھے اپنی کار میں لفت دینے کی پیش کش کی۔

راتے میں ایک مقام پر کچھ ہندو خاندان آٹھ دس اوونٹ گاڑیوں پر اپنا سامان لاوے بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ نشتر صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ”یہ لوگ کتنے آرام سے اپنا تنکا تنکا سمیٹ کر یہاں سے لے جا رہے ہیں۔ اس طرف سے ہمارے لوگ جس حالت میں یہاں پہنچتے ہیں، اس کے تصور سے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔“

نشتر صاحب کی تفہن طبع کے لیے میں نے انہیں اپنے ہندو لینڈ لارڈ کے کچھ لطفے سنائے تو وہ حیرت سے بولے۔ ”آپ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں؟ لینڈ لارڈ کیا کرایہ وصول کرتا ہے؟“

”تقریباً آدمی تھواہ“ میں نے بتایا۔

”سرکاری مکان کیوں نہیں ملا؟“ انہوں نے پوچھا۔

میں نے خلیلی صاحب کی مجبوبیاں اور معذوبیاں بیان کیں، تو وہ خاموش ہو گئے۔ دو تین روز کے بعد نشتر صاحب کا پی اے میرے دفتر میں آیا اور لارنس روڈ پر نوشیروان جی مہتمہ بلاک کے ایک فلیٹ کا الائمنٹ آرڈر میرے حوالے کر گیا۔ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ فلیٹ انہوں نے میرے لیے کس طرح حاصل کیا۔ لیکن اس وقت اس گھر کا ملنا میرے لیے ایک نعمت غیر متربقہ سے کم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس جہان میں بھی خوش رکھے۔

یہ فلیٹ ملنے کے چند روز بعد اتفاق سے میری ملاقات جائش سیکرٹری ورکس سے ہو گئی۔ وہ میرے جائش سیکرٹری حصی صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ حصی صاحب نے از

خود میری سفارش ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اے بھائی! تم اس غریب کو مکان کیوں نہیں دیتے؟ یہ بھی تو تمہاری سروس کا ہی آدی ہے۔“

”نہیں!“ انہوں نے چونک کر سر سے پاؤں تک میرا جائیں لیا، اور بے اعتباری سے پوچھا۔ ”کیا تم واقعی آئی سی ایس کے ممبر ہو؟“

میں نے اعتراف جرم کیا تو ان صاحب نے بڑے تپاک سے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر کہا۔ ”میرے دفتر میں آتا۔“ مکان کا بندوست ہو جائے گا۔“

میری ضرورت پوری ہو چکی تھی، اس لیے میں دوبارہ ان کے دفتر تو نہ گیا لیکن اس بات پر حیرت ضرور ہوئی کہ پاکستان بننے کے بعد بھی انہیں سعل سروس (I.C.S.) کا جادو ہمارے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم آئی سی ایس کے تین حروف بھارت پر ڈال کر پاکستان آگئے ہیں، لیکن رسی تو جل گئی تھی پر بل نہیں نکلا تھا۔ یہاں پر کئی حضرات اپنے تعارف میں اولٹا آئی سی ایس کا دم چھلانگ لگانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ایک صاحب نے اپنے دفتر اور گھر پر جو نیم پلیشس لگوائی تھیں ان پر اپنے نام کے ساتھ آئی سی ایس لکھوا کر ان تین حروف پر ایک ہلکی سی لکیر ایسی چلکدستی سے کھنچوادی تھی جس طرح چشم محبوب میں کاجل کی تحریر ..... تا کہ ان کا جو بن اور بھی نکھر آئے۔ چند حضرات اپنے وزنگ کارڈز پر Former I.C.S. کے الفاظ بڑے اہتمام سے چھپاتے تھے۔ ایک صاحب کا ذاتی رائٹنگ پیدا ان گنگہار آنکھوں نے

بھی دیکھا ہے جس پر Former I.C.S. کے نیچے بریکٹ میں سیکرٹری آف سٹیشن اپریل سروس کے الفاظ بھی درج تھے۔

ہم کہ اپنی نوکری کے تین فرسودہ حروف تک اپنے نام سے علیحدہ کرنے سے قاصر تھے، ہم آزادی کے کارروبار کو غلامی کی روایات سے الگ رکھنے پر کس حد تک قادر ہو سکتے تھے؟ اس کا جواب ہم خود دیں یا نہ دیں، لیکن حالات نے دے دیا ہے اور آج تک دے رہے ہیں۔

لارنس روڈ والے فلی میں دو بڑے بیٹھ روم اور ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ با اوقات اس میں ہم تمیں پینتیس پینتیس لوگ گزانہ کرتے تھے۔ بہت سے عزیز و اقارب اور دوست احباب بھارت اور کشمیر سے جان بچا کر ہمارے پاس پہنچ رہے تھے۔ سب کے سب انتہائی خستہ حالی اور درماندگی کا شکار تھے۔ کوئی پا پیادہ قافلوں کے ساتھ مہینوں کے سفر کے بعد پاکستان پہنچا تھا۔ کوئی ان گاڑیوں پر سوار تھا جنہیں جا بجا روک کر لوٹا مارا جاتا تھا۔ کوئی طویل عرصے تک مهاجر کیپوں کی دلمل میں دھنسا رہا تھا۔ کسی کو کپڑوں کی حاجت تھی۔ کسی کو علاج معالجے کی ضرورت تھی۔ اور زندگی کے ساتھ از سر نو ناطہ جوڑنے کے لیے سب ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ ایک روز میں نے اپنا بونہ کھولا تو اس میں فقط سولہ روپے موجود تھے۔ مجھے بڑی تشویش لاحق ہوئی کیونکہ ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا تھا اور اگلی تھنواہ ملنے میں آٹھ دس روز باقی تھے۔

اس زمانے میں میرے پاس کوئی بینک بیلنس نہ تھا۔ بلکہ اس وقت تک میں نے سرے سے کوئی بینک اکاؤنٹ ہی نہ کھولا تھا۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ میں میرا قاعدہ تھا کہ میں پہلی تاریخ کو اپنی تھنواہ نقد وصول کرتا تھا۔ کچھ پیسے ماں جی کو جموں بھیج دیتا تھا۔ اور باقی رقم میں کے آخر تک ٹھکانے لگا دیتا تھا۔ اب جو میں نے دیکھا کہ گھر میں دو ڈھائی درجن مہماں اور بونے میں صرف سولہ روپے موجود ہیں تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میرا واحد اٹاٹہ اور نیٹل لائف انشورنس کمپنی کی ایک انشورنس پالیسی تھی جو چند سال قبل میں نے بھاگلپور میں خریدی تھی۔ انشورنس ایجنت مشہور کانگری لیڈر (اور بعد میں بھارت کے پہلے صدر) ڈاکٹر راجندر پرشاد کا بیٹا تھا۔ جو پالیسیاں اس کے ذریعہ لی جاتی تھیں، وہ ان پر تھنھا۔ اپنے والد کے آنوجراف کا بیگ بھی ضرور چپاں

کیا کرتا تھا۔ میں اپنی پالیسی لے کر کراچی اور نیٹل انشورنس کمپنی کے دفتر گیا اور مینجز سے کہا کہ واجب الادا رقم وصول کر کے میں بیسہ پالیسی سے دستبردار ہونا چاہتا ہوں۔

ہندو مینجر کا نگری لیڈروں کا پرستار نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پر شاد کا آئو گراف دیکھ کر وہ وفور عقیدت سے بوکھلا گیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ اس آئو گراف کی وجہ سے یہ پالیسی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ تمیں برس بعد جب یہ پالیسی واجب الادا ہو گی تو اپنے آئو گراف کی وجہ سے اس کا شمار بیش بہا نوادرات میں ہو گا، اور یقینی طور پر اس کی اصلی قیمت اس کی عرفی قیمت سے کمی گنا زیادہ پڑے گی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ بیسہ پالیسی سنبحال کر اپنے پاس رکھوں اور اس سے دستبرداری کا خیال دل سے نکال دوں۔

میں نے مینجر کی کارروباری فرات کی تعریف کی، لیکن دستبرداری کے ارادہ پر مستقل مزاجی سے اڑا رہا۔ کچھ مزید رد و کد کے بعد مینجر نے حساب جوڑا، اور پالیسی واپس لے کر مجھے تین ہزار سات سو روپے ادا کر دیئے۔

یہ گرانقدر رقم ہاتھ میں آتے ہی تھی دستی کے لمحات کی یاد کافور کی طرح اڑ گئی اور میرا دماغ از سر نو آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے کوئی سستی سی سینڈ پینڈ موڑ کار مل جائے تو بڑا آرام نصیب ہو۔ اڑیسہ میں میرے پاس بڑی سمارٹ اور باگنی سپورٹ کار تھی۔ لکھ سے روائگی کے وقت سب نے یہی زور دیا کہ میں اسے فروخت کر دوں کیونکہ فسادات کی وجہ سے اس کا ریل کے ذریعہ پاکستان پہنچنا امر محال تھا۔ لیکن اس کار کے ساتھ کچھ ایسی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں کہ اسے بیچنے پر دل رضا مند نہ ہوا اور میں نے اسے ریل کی ایک بوگی میں مقفل کر کے اللہ توکل کراچی کے لیے بک کروا دیا۔ یہ بوگی کسی نہ کسی طرح جالندھر تک تو ضرور پہنچی لیکن وہاں پر کسی صاحب ذوق کی نظر انتخاب اس پر پڑ گئی اور اس نے کار کو ریل گاڑی سے اتار لیا۔ اب کراچی میں پیدل جوتیاں چلھاتے چلھاتے طبیعت اکتنے گئی تھی۔ جب انشورنس پالیسی کے پیسے جیب میں آگئے تو دلبی دلبی اکتاہٹ کا یہ احساس آنا فناً شدید تکان اور ماندگی میں تبدیل ہو گیا، اور کار خریدنے کی خواہش نے دل کو بری

طرح اپنے شکنے میں کس لیا۔

URDU4U.COM  
اب کار کے خریدار کی حیثیت سے میں نے کراچی پر نگاہ ڈالی، تو سڑک پر چلنے والی ہر دوسری یا تیسری کار بکنے کے لیے تیار تھی۔ کیونکہ بمبئی جانے والے بہت سے ہندو ہوائی جہاز یا سمندری جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آخری چیز اپنی کار فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی خوش پوشاک، چرب زیان ہندو نوجوان مسٹر وڈوانی سے میری ملاقات سر راہ ہو گئی۔ اس کے پاس پندرہ بیس سال پرانی شورٹ کار تھی، جسے وہ شام کے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے فروخت کرنے کی عجلت میں تھا۔ اس نے اپنی کار کی مح میں رطب اللسان ہو کر ایسے ایسے گیت گائے اور سالہا سال سے اس کی بے عیب خدمت گزاری اور بے لوث و فاداری کے اتنے قصے سنائے کہ مجھے ایک گونہ افسوس ہونے لگا کہ یہ شخص اپنی اس قدر محبوب اور کار آمد شے کو بہ امر مجبوری پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ میں نے مسٹر وڈوانی سے قیمت کے متعلق استفسار کیا تو اس نے دونوں ہاتھ اپنے کافلوں سے لگا کر بڑا توبہ تله کیا اور قسم کھائی کہ وہ اپنی محبوب کار کی قیمت لگانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اس کی نظر میں یہ کار بالکل انمول تھی، اور نہ ہی وہ پیسہ کمانے کے لیے اسے بیچنا چاہتا تھا۔ وہ تو بس ایک ایسے قدر دان کی تلاش میں تھا، جسے سپرد کر کے اسے یہ اطمینان ہو کہ اس کی چیزی مسوڑ کار واقعی صحیح ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ کسی وجہ سے اسے یہ میرے چہرے پر قدر دانی کی مرثیت نظر آئی۔ اور میں بھی اس کی چرب زیانی کی چکنائی پر ایسا پھسلا کہ پانچ ہزار سے شروع کر کے ڈھائی ہزار روپے پر سودا طے کر لیا۔ مسٹر وڈوانی نے مجھے اپنے ساتھ کار میں بٹھایا اور قدم قدم پر اس کی خوش رفتاری کی تعریف و توصیف کرتا ہوا مجھے ہمارے گھر لے آیا۔ میں نے اسے ڈھائی ہزار روپے نقد ادا کر کے کار کے کاغذات وصول کئے اور وہ بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہو کر رخصت ہو گیا۔

مسٹر وڈوانی کے جانے کے بعد میں نے کار چلانے کی کوشش کی تو اس نے اسارت

ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ اب یہ عقدہ کھلا کہ انجن اسارت ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دو چار آدمی اسے کافی دور تک دھکا دیں۔ انجن چالو ہوتا تھا تو پسے رک جاتے تھے۔ پسے حرکت میں آتے تھے تو انجن دم توڑ دیتا تھا۔ گیر بدلا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ اور بریک کبھی لگتی تھی کبھی صاف مکر جاتی تھی۔ میل ڈیڑھمیل چلنے کے بعد پانی جوش میں آ کر ابلنے لگتا تھا، اور ہارن کی جگہ اس کے دروازے اور مدد گارڈ بڑے نور سے بجتے تھے۔ کار کی اگلی اور پچھلی بیوں میں سے کوئی بھی کام نہ کرتی تھی اور کئی بار اندھیرے میں موڑ چلانے کے ہم لوگ اس کے سامنے لاٹھیں جلا کر لٹکا لیا کرتے تھے۔

انہی دنوں چودھری غلام عباس صاحب شیخ عبداللہ کی جیل سے رہا ہو کر پاکستان پہنچے تھے۔ کراچی آ کر وہ ہمارے ہاں ٹھہرے اور ٹیلیفون پر قائد اعظم کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ قائد اعظم نے انہیں اگلے روز لنج پر مدعو کیا۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر انہیں سواری کی ضرورت ہو تو گورنر جزل ہاؤس کی کار انہیں لینے وقت پر آ جائے گی۔ چہدری صاحب ہمارے ہاں کار کھڑی دیکھے چکے تھے، اس لیے انہوں نے عرض کیا کہ سواری کا انتظام ہے اور وہ خود ہی حاضر ہو جائیں گے۔

سواری کا جو انتظام موجود تھا، اس کی اصلیت سے ہم نے چہدری صاحب کو آگاہ کیا تو وہ بولے۔ ”کوئی پرواہ نہیں“، ہم ایک گھنٹہ پہلے ہی گھر سے روانہ ہو جائیں گے تا کہ کار کے سارے ناز خرے اٹھانے کے بعد بھی کافی وقت باقی میں رہے۔“

لنج کا نائم سوا بجے تھا۔ ہم دھکا لگانے والی نفری کار میں بٹھا کر باہر بجے ہی روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے کار کا موڑ ٹھیک رہا اور ہم ساڑھے باہر بجے ہی گورنر جزل ہاؤس پہنچ گئے۔ اے ڈی سی بڑا پریشان ہوا کہ چہدری صاحب اتنی جلدی کیوں آ گئے ہیں۔ چہدری صاحب نے اس کی ڈھارس بندھائی کہ وہ بڑی گرم جوشی سے اے ڈی سی کے کمرے میں بیٹھ کر آدھ گھنٹہ انتظار کر لیں گے۔

”انتظار کی بات نہیں۔“ اے ڈی سی نے جواب دیا۔ ”قائد اعظم کا حکم ہے کہ جب چودہ ری صاحب تشریف لائیں، تو وہ خود پورچ میں آ کر کار کے دروازے پر ان کا استقبال کریں گے۔ اس لیے فی الحال آپ واپس چلے جائیں اور ٹھیک ایک نج کر پنڈہ منٹ پر پورچ میں پہنچ جائیں۔“

اس گفتگو کے دوران کار کا انجن بند ہو گیا تھا۔ ہم نے دھکا دے کر اسے اشارت کیا اور باہر آ کر گیٹ کے قریب ہی گورنر جزل ہاؤس کی دیوار کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے رک گئے۔ سیکیورٹی والے بڑے مستعد تھے۔ وہ فوراً ہماری طرف لپکے اور وہاں رکنے کی وجہ پوچھی۔ ہم نے انہیں اصلی صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ حیران ہوئے کہ قائد اعظم کا معزز مہمان ایسی پھیپھیر کار پر سوار ہو کر گورنر جزل ہاؤس آیا ہے۔ سیکیورٹی شاف کے کچھ لوگوں نے آ آ کر چودہ ری صاحب کے ساتھ عقیدتاً ہاتھ بھی ملائے۔

گورنر جزل ہاؤس کی دیوار کے ساتھ اس وقفہ انتظار کے دوران چودہ ری غلام عباس نے کہا کہ بیاست جموں و کشمیر کا جو علاقہ آزاد ہو چکا ہے، وہاں پر نظم و نق قائم کرنے کے لیے وہ میری خدمات حکومت پاکستان سے مستعار مانگنا چاہتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں؟ چودہ ری صاحب نے دراصل میرے منہ کی بات چھین لی، کیونکہ میں خود ان سے یہی درخواست کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں جتنی جلد آزاد کشمیر جا سکوں اسی قدر اسے اپنے لیے باعث سعادت سمجھوں گا۔

وقت ہو چکا تھا۔ سیکورٹی کے کچھ سپاہیوں نے بڑی خوشی سے کار کو دھکا لگایا اور ہم بڑے زور شور سے پھٹ پھٹ کرتے ٹھیک سوا بجے گورنر جزل ہاؤس کی پورچ میں جا رکے۔ عین اسی لمحے قائد اعظم بھی اندر سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے چودہ ری صاحب کے ساتھ معاونت کیا اور انہیں بازو سے تھام کر اندر لے گئے۔

ہم نے احتیاطاً کار کا انجن چالو رکھا تھا۔ اس کے شور شرابے میں قائد اعظم کا صرف ایک فقرہ سنائی دیا۔

قدرت اللہ شباب

شباب نامہ

Ghulam Abbas, I am really happy  
You are here!

○ ○ ○

## • کچھ ”یا خدا“ کے بارے میں

ستمبر ۱۹۷۴ء میں جب میں کراچی پہنچا تو چاروں طرف سے لٹے پڑے، کئے پھٹے مهاجرین کا ایک سیالاب عظیم پاکستان میں امدا چلا آ رہا تھا۔ انہی میں کسیں میرا ایک نہایت قریبی عزیز اپنی بیوی اور بچوں سمیت بھی شامل تھا۔ وہ کئی ماہ پہلے مشرقی پنجاب کے گاؤں چکور صاحب سے کسی قافلے میں روانہ ہوا تھا۔ اور ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ پاکستان تک زندہ سلامت پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر پہنچا ہے تو کہاں پر ہے۔

اس عزیز کی تلاش میں ایک ایک کر کے میں نے تقریباً تمام مهاجر کیمپوں کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا۔ ہجرت کا اصلی اندازہ صرف وہی لوگ لگ سکتے ہیں جو خود اس بھٹی سے گزرتے ہیں۔ گھروں میں بیٹھ کر یا دفتروں کی چار دیواری میں اعداد و شمار کے گوشوارے بنائیں گے اور جلوسوں میں دھوواں دھار تقریبیں سن کر ہجرت کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور نہ ہی مهاجر خانوں میں سکتے ہوئے ترتیب ہوئے ایڈیاں رگڑتے ہوئے اور اپنوں اور پرایوں کے ہاتھوں لٹتے ہوئے مهاجرین کی داستان پوری طرح سنائی دیتی ہے۔

اپنی اس تلاش کے دوران ظلم، بربریت اور مصائب کی چادر میں لپٹے ہوئے لاکھوں مهاجرین میری نظریوں کے سامنے سے گزرے۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں بچے بھی تھے اور جوان اور بوڑھی عورتیں بھی۔ درجنوں نے ترپ ترپ کر، رو رو کر بین کرتے کرتے مجھے اپنی پتਾ بھری جیون کہانیاں سنائیں۔ اس کریناک مجموعی مشاہدے نے اندر ہی اندر سلگ سلگ کر آخر ایک روز دلشاہ کا روپ دھار لیا۔ ایک شام میں قلم لے کر بیٹھا اور فجر تک ایک ہی نشت میں ”یا خدا“ کی کہانی مکمل کر کے اٹھا۔

یہ طویل افسانہ سب سے پہلے ”نیا دور“ کے فسادات نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد احباب کا اصرار ہوا کہ ناول کے طور پر اسے کتابی صورت میں بھی ضرور چھانپا چلہیے۔

محترمہ ممتاز شیریں مرحومہ نے ایک دیباچہ تحریر فرمادیا اور "یا خدا" کا پہلا ایڈیشن کراچی سے جون ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ عام قاری کو یہ اتنا پسند آیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چھ ایڈیشن نکل گئے۔ لاہور کے ایک پبلشر نے اس ناول کا نام "یا خدا" کی جگہ "آزادی کے بعد" رکھ کر بھی کچھ کاروبار کیا۔

"یا خدا" کے کتابی صورت میں شائع ہوتے ہی ترقی پسند مصنفین کی صفت میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو۔ کئی ممینوں تک بڑے بڑے مقدر رسالوں میں اس کے خلاف خوب لبے لبے تقیدی مضمایں آتے رہے۔ میں نے کسی تقید کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا، کہ یہ نقاد اگر حق بجانب ہیں تو یہ کہانی بست جلد مردہ ہو کر دفن ہو جائے گی۔ لیکن پچھلے ۲۳ سال سے ایسا نہیں ہوا۔ مخالفانہ تقید کسی کو یاد بھی نہیں۔ البتہ "یا خدا" کے ایڈیشن پر ایڈیشن باقاعدہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ اللہ کا فضل اور پڑھنے والوں کا کرم ہے۔

آج کل کالمجنوں کے نوجوان طلبہ کے کچھ طبقوں میں یہ کتاب خاص طور پر پسند کی جا رہی ہے۔ بست سے لڑکوں اور لڑکیاں "یا خدا" کی جلدی پر آنوجراف لینے آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر حیرت سے یہ سوال پوچھتے ہیں۔ "کیا واقعی ہمارا وطن ایسے واقعات سے گزرا ہے جو اس کتاب میں درج ہیں؟ اگر یہ حق ہے تو دوسرے ادیب کیوں نہیں لکھتے؟" وغیرہ وغیرہ

"یا خدا" کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالنے کے لیے میں یہاں پر تین دستاویزات کی نقول درج کر رہا ہوں۔

اول : محمد حسن عسکری کا خط مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۳۸ء بناًم محترمہ ممتاز شیریں۔

دوم : اگست ۱۹۵۰ء کے ادب لطیف لاہور میں ابوالفضل صدیقی کا مضمون بعنوان "یا خدا" اور اس کا دیباچہ۔

سوم : "نوائے وقت" کے ایک نوجوان صحافی اظہر سیمیل کے تاثرات جو لاہور، راولپنڈی، ملتان اور کراچی کے میگزین سیکشن ۲۹ مارچ ۱۹۸۵ء اپریل ۲۰۱۴ء میں شائع ہوئے۔

## ○ محمد حسن عسکری گاخط

متاز شیریں کے نام  
معرفت مکتبہ جدید، انارکلی لاہور  
۲۰ جولائی ۱۹۷۸ء

محترمہ، آداب!

اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔ میں نے اسی وقت قدرت اللہ شب کی کتاب "یا خدا" پڑھ کر ختم کی ہے۔ سب سے پہلے تو میں اپ کو ایسا "دیباچہ" لکھنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے بڑے بے لاغ طریقے سے اور بالکل بے جھگ حیثیت کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے جس طرح فسادات کے متعلق انسانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ مجھے بہت پسند آیا۔ خصوصاً کرشن چندر کے متعلق تو آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ آپ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ آپ کا ذہن ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہے اور آپ کسی کی رو رعایت نہیں کرتیں۔ ہمارے ادب اس خوف سے اپنی زبان بند رکھتے ہیں کہ ہمارا کوئی ہندو دوست برانہ مان جائے یا ہمیں رجعت پسند نہ کجھ لیا جائے۔ اس قسم کا خوف ہمارے قومی نقطہ نظر سے جو کچھ بھی ہو، خالص ادبی نقطہ نظر سے بھی بڑی پست چیز ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے انتہائی سرست ہوئی کہ ہمارے یہاں کم سے کم ایک لکھنے والے نے تو دیانتداری برتنی۔ میں تو یہ ذرا بھی نہیں چاہتا کہ محض قومی فائدے کے لیے لوگ اپنی اصلی رائے کی چھپائیں یا حقیقت کو مسخ کریں۔ اگر ہمارے یہاں واقعی کوئی ایسا آدمی ہے جو Rimbaud کی طرح کا کوئی Vision اپنے اندر رکھتا ہے اور وہ پاکستان کی بربادی کی دعائیں مانگتا ہے تو میں اس سے اختلاف رکھنے کے باوجود اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔ اسے اظہار کی پوری آزادی دوں گا۔ اور اس کے حق کی حمایت میں قائد اعظم تک سے لڑنے کو تیار رہوں گا، مگر دکھ تو اس بات سے

ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب محض دوسروں کو خوش کرنے کے لیے یا دوسروں کے کہنے سے پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف نفرت یا کم سے کم بد فتنی پھیلاتے ہیں۔ پاکستان حاصل کرنے کے لیے تو عوام کے ووٹوں کی ضرورت تھی، ان پر نام نہاد Intellectuals کا کوئی اثر نہیں تھا۔ عوام نے پاکستان حاصل کر لیا، لیکن پاکستان کا احکام محض ووٹوں سے تو نہیں ہو سکتا اس کے لیے تو پوری قوم کی ذہنی اور اخلاقی کاوش کی ضرورت ہے، اور زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں سے لے کر بڑی سے بڑی باتوں تک میں پڑھے لکھے لوگوں کی پوری جدوجہد کے بغیر ہمیں احکام کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ لیکن ہمارے ادیب ہیں کہ وہ پاکستان ہی کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور وہ بھی اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں، محض غیر جانبداری، آزاد خیالی اور ترقی پسندی کا تمغہ حاصل کرنے کے لیے۔ ان حالات میں تو یہ بڑی مبارک فال ہے کہ آپ مسلمانوں کی طرف سے بولیں اور آپ نے اس سازش کا پردہ فاش کیا جو ادب کے پردے میں مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے۔ اس پر آپ کو جتنی بھی مبارکباد وی جائے کم ہے۔ کیونکہ یہ بات تو ذرا مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی ادیب اس حد تک مسلمانوں کا حامی ہو، پھر آپ نے کوئی جذباتی بات بھی نہیں کہی، سیدھی سیدھی دو اور دو چار والی باتیں کی ہیں۔ میں اس بات کو پاکستان کے حق میں کوئی اچھی بات نہیں سمجھوں گا کہ پاکستانی ادیب ہر بات میں قوم یا حکومت کی حمایت کرنے لگیں۔ یا ہر بات کو صرف قومی مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھیں۔ میں تو صرف و محض معروضیت اور پچھی غیر جانبداری چاہتا ہوں، اور قوم کی پچھی تغیر کا راز اسی میں سمجھتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ آج کل فرانس میں ”ذمہ دار ادب“ کا بڑا چڑھا ہے۔ اس کے متعلق Andre Gide نے کہا تھا۔

میں تو اس مقولے کا بڑی طرح قائل ہوں۔ اگر میں اپنے لیے کسی شاندار مستقبل کا خواب دیکھتا ہوں تو ”وفادر“ کی حیثیت سے نہیں بلکہ بھگوڑے کی حیثیت سے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ Gide افریقہ میں Resistance Committee

Writer's کا سیکرٹری بھی تھا۔ (حالانکہ بعد میں آراؤ گون صاحب نے بھی یہ مطالبہ کیا کہ ٹرید پر مقدمہ چلایا جائے، کیونکہ وہ جرمن سپاہیوں کے رویے کے تعریف کرتا ہے، تو ایسے نازک وقت میں تو ٹرید تک تو می خدمت پر آمادہ ہو گیا تھا، کیونکہ اس وقت ذہنی ایمانداری کا تقاضا یہی تھا۔ مگر ہمارے یہاں ایمانداری صرف اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ پاکستان کی مخالفت کی جائے یا جو ادیب ایسے ہیں جنہوں نے قبر درویش بجان درویش پاکستان کے وجود کو تسلیم کر ہی لیا ہے۔ وہ بے تعلق رہنا چاہتے ہیں، بلکہ پاکستان کی عملی حمایت کا مطلب جاہ پرستی سمجھتے ہیں۔ یہاں چند نوجوان ایسے ادیبوں کی ایک نئی انجمن بناتا چاہتے تھے جو پاکستان کے وفادار ہوں۔ مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے تاشیر صاحب کو بھی شرکت کے لیے راضی کر لیا۔ لیکن جب یہ نوجوان قیوم نظر صاحب وغیرہ کے پاس گئے تو انہیں یہ جواب ملا کہ تاشیر اور عسکری کو کسی ملازمت کی تلاش ہے۔ ادیبوں کے انجمن بنا کے اپنا پروپیگنڈا کرنا چاہتے ہیں تا کہ لمبا ہاتھ مار سکیں۔ اب بتائیے کہ ایسے عالم میں آدمی کیا کرے کیا نہ کرے، ترقی پسندوں نے میرے بارے میں یہ اڑا رکھا ہے کہ اسے حکومت سے پیسے ملتے ہیں۔ غرضیکہ بولیں تو یہ سب سنیں، اور چپ کیسے رہیں، قوم کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے تو آپ کی یہ تحریر دیکھ کر بڑا تجھب ہوا۔ خدا کرے کہ آپ نیا ہد لکھا کریں۔ ہماری ضرورت تو قوم کو اسی وقت ہے۔ کہیں تریاق بعد از وقت نہ پہنچے۔

قدرت اللہ شب کا افسانہ بھی مجھے بہت پسند آیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ کتاب ہر پاکستانی کے گھر میں ہونی چاہیے۔ اگر شباب صاحب پسند کریں تو میری یہ رائے اپنی کتاب کے اشتہار میں دے دیں۔ میں اس پر اخبار "امرور" میں تبصرہ کر رہا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ نیا ہد سے نیا ہد اخباروں میں اس پر تبصرہ ہو جائے۔ خیر، یہ کوئی لااقلی افسانہ تو نہیں ہے مگر اپنے مقصد کے پیش نظر بڑا کامیاب ہے۔ آخر Vercors کی Sea Silence of the

ان کتابوں کا ایک مقام ہے، اور ان مصنفوں کی قویں بجا طور پر ان کی شکر گزار ہیں۔ شب صاحب بھی اسی طرح ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے غیروں کے مظالم دکھانے پر اتنا وقت صرف نہیں کیا، جتنا اپنوں کے مظالم پر۔ کتاب کا تیرا حصہ سب سے اچھا اور سب سے زیادہ با اثر ہے۔ خصوصاً آخری سین کی تو داد نہیں دی جا سکتی۔ میں کتاب پر مفصل تبصرہ کر رہا ہوں۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ذہنوں پر سے ترقی پند کی وہند تو چھٹنے لگی۔ شب صاحب کو میری مبارکباد پہنچا دیجئے۔

ذرا یہ تو بتائیے کہ کراچی کا ادبی ماحول کیا ہے۔ کتنے لوگ پاکستانی ہیں اور کتنے ترقی پسند؟ ذرا جلدی جواب دیں تو اچھا ہے۔ صد شاہین صاحب کو آداب!

نیاز مند ..... محمد حسن عسکری

## ○ "یا خدا" اور اس کا دیباچہ

### ابوالفضل صدیقی!

ابلی تخلیقات کی رفتار جتنی تیز ہوتی ہے اتنی ہی ان فنکاروں کی پیداوار میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ جن کے یہاں انفرادیت ہوتی ہے اس دلچسپ حقیقت کو ہم نے اردو ادب میں بھی دیکھ لیا ہے۔ بیدی، کرشن چندر، عصمت اور دو ایک نام اس فہرست میں اور اضافہ کر لیجئے جنوں نے اردو افسانہ نگاری میں انفرادیت کی کچھ ایسی مر لگائی اور اپنی بے پناہ فکر و استعداد سے پچھے آنے والے ادبیوں کو اس طرح متاثر کیا کہ ۱۹۳۳ء کے بعد ہر نیا ادیب اپنی افسانہ نگاروں کی دنیا میں کھو کر رہ گیا۔ کرشن چندر، ان داتا کے بعد آہستہ آہستہ انحطاط کی جانب مائل ہونے لگے۔ بیدی نے ادب کو کبھی کبھار کا مشغله بنا لیا اور عصمت جس سے نکل کر جب مزدوروں اور کسانوں کی دنیا میں آئیں تو اپنے پچھے چلنے والوں سے بھی پچھے رہ گئیں۔ جب ہمارے ادب کا یہ حال ہو تو ایسی

صورت میں جب کوئی بت شکن اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اسے دیکھ کر خواہ بڑے پچاری اور پرانے بت کتنے ہی خفا اور جزبز کیوں نہ ہوں۔ لیکن ایک سچا نقاد داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قدرت اللہ شب ۳۲۳ء کے بعد کا ایک بہت بڑا بت شکن ہے جس نے اپنے افسانوں سے صرف چونکلایا ہی نہیں بلکہ بتوں اور پچاریوں کی صفوں میں ایک عجیب انتشار سا بھی پیدا کر دیا ہے۔ اس کا آخری افسانہ ”یا خدا“ تو اس منزل کا سنگ میل ہے جہاں پہنچ کر ہمیں نہ معلوم کتنے لات و مرات اور فتنی پچاریوں کو تملماہث محسوس ہوتی ہے۔ اس افسانہ پر جب لوگوں کی برهی کا اظہار دیکھا تو میں نے اسے دوبارہ پڑھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں غلط طور پر اس سے متاثر ہو گیا ہوں اور تقاضائے بشریت کے تحت جذبات کی رو میں بہہ گیا ہوں اور افسانہ کے موضوع کی عجین قسم کی رنگینی میں گم ہو کر اسے اردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک اور فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں میں بہترین خیال کرنے لگا ہوں۔ لیکن آج پھر ایک بار بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف میرا پہلا خیال صحیح ہی تھا بلکہ دوبارہ مخصوص نظر سے پڑھنے کے بعد میری رائے راخ تر ہو گئی اور نہ صرف رائے راخ تر ہو گئی بلکہ مجھے اس میں چند خوبیاں الی نظر آئیں جن پر پہلے مطالعہ میں نگاہ نہ پہنچی تھی اور اب مجھے کہنا پڑتا ہے کہ لوگوں کی برهی کے پردے میں کچھ اور ہے جس کی تشرع کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ آخر یہ ”یا خدا“ پر برهی کیوں؟ جب سجاد ظییر اور احمد علی انگارے میں پرانی اقدار پر چوٹ کرتے ہیں۔ جب کرشن چندر بڑے بڑے ان داتاؤں کی زراتی کا بھانڈا پھوڑتا ہے، جب عصمت لحاف کا موٹا پردہ چاک کرتی ہے اور منتو ادبی بھٹی کے ہون کنٹے دھواد اٹھاتا ہے تو آپ انہیں بڑا فکار مان لیتے ہیں حالانکہ انہی افسانوں پر ایک خاص سکول کے افراد تملما اٹھتے ہیں۔ لیکن جب قدرت اللہ شب غریب، سڑے گلے سماج کے رستے ناسوروں اور مبروص سیاست کے گینگریوں (Gangrenes) کی پیشی ہٹا کر نقاب کشائی کرتا ہے تو وہ عقاب قسم کے لوگ بھی گزر جاتے ہیں جن کا دعویٰ

ہے کہ وہ سورج جیسی حقیقت سے بھی آنکھیں چار کرنے کی تاب رکھتے ہیں۔ فنکار چند بندھے بلکہ بیاضیاتی فارمولوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ایک فنکار ہے اور سچا فنکار تو اسے براہ راست زندگی اور اس کی پہنچائیوں میں داخل ہونا پڑے گا اور اگر وہ صرف اخبار کے اعداد و شمار سامنے رکھ کر اپنے فارمولوں کی مدد سے "تفصیل" اور "ضرب" اور "ضرب" اور "تفصیل" کا عمل کرے گا۔ تو چاہیں اسے کچھ اور کہہ لیں لیکن وہ "فنکار" نہیں ہے اور ترقی پسند ادب تو بالکل ہی نہیں ہے کیونکہ ترقی پسندی مصلحت کی قائل نہیں۔ یہاں زخموں پر پردہ نہیں ڈالا جاتا یہاں پھوٹوں کو دبایا نہیں جاتا۔ وہ انہیں عربیاں کرتا ہے۔ خواہ سیاست اور مصلحت انسانی چیخت اور کراہتی ہی کیوں نہ رہے۔ حقیقی معنوں میں ترقی پسند فنکار ایک ماہر سرجن کی طرح "چڑھا" سے نشر لگا دیتا ہے۔

قدرت اللہ شاپ پر چونکہ نکتہ چینی کی جاتی ہے اسے میں وہ تنقید سمجھتا ہوں، جسے ادب کی تو بالکل ہوا ہی نہیں لگے گی۔ البتہ اس میں نہایت گھری قسم کی سیاسی دور انسانی کے نشانات ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر جب یہ تنقید کرنے والے اپنی ان تنقیدوں کے ادبی اصولوں پر مبنی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر داستان گوئی کے عشرت خانے سے نکل کر تنقید کے میدان میں آنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک ایسا قلم ہاتھ میں لے کر جو تکوار سے بھی نیا ہد تیز ہو اور جو اس غلیظ تنقید کا خاتمه کر دے۔ میں ایک افسانہ نگار اور ناول نویس ہوں۔ تخلیقی ادب کی میرے نزدیک اہمیت بھی نیا ہے اس لیے نہ تو تنقید کو میں اپنا ادبی مشغله بنا سکتا ہوں اور نہ ہر نئے اور پرانے ادب و شاعر کی قسم کا فیصلہ کرنے کی اجازہ داری کا بوجھ میرے نحیف شانے سنبھال سکتے ہیں۔

اس لیے میں قدرت اللہ شاپ کے کئے والوں کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مگر قدرت اللہ شاپ کے بارے میں چند باتیں کہنی نہایت ضروری سمجھتا ہوں اس لیے کہ میری ادبی ایمانداری اور فنی خلوص بار بار مجھے اکسرا رہا ہے کہ اس ہنگامہ میں جبکہ سیاہ و سفید کی تمیز دنیا کے کسی شعبہ میں باقی نہیں رہ گئی تو کم سے کم ادب کے چشمہ کی صاف پھواروں کو ہر قسم کی آمیزش پہنانا ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ اخلاقی فرض ہے

اور ایسے موقع پر چپ بیٹھے رہنا بھی ایک بلا فنی جرم ہے۔

قدرت اللہ شاپ کی افسانہ نگاری اور میرا نام دیکھ کر ممکن ہے کہ لوگ پہلی نظر میں یہ خیال کریں کہ اس مضمون کے ترکش سے کوئی نیا تیر چھوٹے گا، لیکن جب وہ یہ مضمون پڑھیں گے تو انہیں بڑی مایوسی ہو گی کہ انہی کے گروہ کا ایک خادم ادب جس کا ترقی پسندی پر پورا ایمان ہے، آج اپنے ہی اصولوں کی بنا پر ایک سچی بات کہنے میں اس کی بالکل پروا نہیں کر رہا ہے کہ خود اس کے اپنے حلقوہ سے کتنی آوازیں اس کے بر عکس اٹھ چکی ہیں۔

اس ہنگامہ نے مجھے قدرت اللہ شاپ کے تقریباً تمام پچھلے مشہور افسانے پڑھنے کے لیے اکسالیا۔ میں پچھلے دو تین سال سے ہر نئے اور پرانے افسانہ نگار کی تخلیق کو ذرا غور کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کتنے افسانے ایسے ہیں جو ادبی اور افسانوی معیار پر پورے اترتے ہوں۔ میری رائے ناقص میں ان افسانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ انہی محدودے چند افسانوں میں چند افسانے قدرت اللہ شاپ کی جدت و قدرت فکر کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو قدرت اللہ شاپ کے یہاں ہمیں متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر افسانہ نگار کی شخصیت ہمارے سامنے مکمل طور پر ابھر کر آ جاتی ہے۔ اور افسانہ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ نکھرتی چلی جاتی ہے اور یہی ایک چیز ہے جس نے شاپ کو نہ صرف ایک کامیاب افسانہ نگار بنا دیا بلکہ ایک صاحب طرز ادیب اور ایک حساس شاعر کے ساتھ ایک منفرد انشاء پرداز بھی بنا دیا اور ہر جھنی طور پر وہ ایشیا کا ایک عظیم فنکار ہے جس کے پاس گھلاؤٹ اور شیرینی کے خوشگوار گھونٹ ہیں۔ جس کی آستینوں میں طنز و تشنیع کے تیز نثر اور مسموم پیکان ہیں جس کی دستار پر با نکپن اور نیکھنے پر کے

رنگیں طرے لہرا رہے ہیں اور اس کو یہ تمام چیزیں ان تمام افسانہ نگاروں سے ممیز

کرتی ہیں جو پاٹ اور بے جان طریقے سے ایک "اچھی بات" کو پیش کر دینا ہی سب سے بڑی نیکی اور سعادت سمجھتے ہیں۔ "اچھی بات" کا تو میں بھی قائل ہوں لیکن اچھی بات، اچھے طریقے سے پیش نہ کرنا بھی "بری بات" سے کم نہیں۔ ادب میں موضوعات کچھ نیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ ایک دور کے اکثر ادیبوں کا تجربہ اور مطالعہ تقریباً ایک ہی سا ہوتا ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات میں جو چیز امتیازی شان پیدا کرتی ہے وہ ان کے پیش کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ ادب میں "ابلاغ" کو بہت اہمیت ہے۔ آپ کے پاس خواہ کتنا ہی عمدہ موضوع ہو لیکن اگر طرزِ ادا بھونڈا ہے تو صرف موضوع آپ کی ادبی تخلیق کو جاندار نہیں بنا سکتا۔ موضوع اور طرزِ اظہار کا جسم و روح والا رشتہ ہے اور وہ بھی خوشنگوار تناسب کے ساتھ۔ موضوع اور فن کو جن ادباء نے صحیح طور پر جانا ہے ان میں یہ نوجوان افسانہ نگار بھی ہے۔ پہلے پہل ادبی دنیا میں میں نے شباب کے افسانے دیکھے تو باوجود نام کے نئے پن کے مجھے ان کی انفرادیت نے متاثر کیا اور سب سے شروع کی ہی چند چیزوں میں مجھے شباب کے اندر مستقبل قریب کا ادبی بت شکن ابھرتا نظر آیا۔ یہ نوجوان فنکار جس سے میں باوجود اشتیاق ملاقات کے بھی ابھی تک نہیں مل سکا ہوں۔ افسانوں میں ہم سے اس طرح ملتا ہے کہ ایک حد تک اشتیاق ملاقات کی تشکیل بھی پا جاتی ہے اور تیز تر بھی ہو جاتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جب میں قدرت اللہ شباب سے ملوں گا تو مجھے ماہیوسی ہو گی یا مسرتا! مگر اس میں شک نہیں کہ وہ قدرت اللہ شباب جو اپنے افسانوں میں ہمیں چلتا پھرتا اینڈتا نظر آتا ہے جو اپنی کتابوں میں "یک چمن گل، یک نیتاں، نالہ ایک خمخانہ مے" کبھی زہر خند نہیں ہنتا اور گاہے موسم بہا کے غنچوں والی لطیف مسکراہٹ مسکراتا، کبھی آگ برساتا اور کبھی گل فشاںیاں کرتا نظر آتا ہے۔ قدرت اللہ شباب تو ضرور اس قابل ہے کہ ہم اس سے محبت کریں۔

"محبت" کا لفظ میں نے خوب سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے اس لیے کہ قدرت اللہ شباب

اپنے افسانے کے کرداروں کو ہم پر مسلط کر کے ہمیں متاثر نہیں کرتا بلکہ افسانوں کے کرداروں سے نیا ہدایت ادا خود افسانہ نگار کی شخصیت کو ہم پر سوار کر دیتا ہے۔ یہ ہے کچھ عجیب سا پہلو، شباب کی بے پناہ فنکاری کا اور اس مخصوص صفت میں ہمیں دور موجودہ میں اپنی صفت میں صرف وہ تنہا ہی نظر آتا ہے۔ شباب اپنی ادبی تخلیقات میں نہ تو ہمارے پاس ایک بزرگ و رہنمای پیغمبر کی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے جس کو دیکھ کر سوائے زانوئے ادب نہ کرنے کے اور کچھ ہمارا فرض ہی نہ ہو اور نہ ایسا بانکا سپاہی جو اتنا طرار ہو کہ اس سے ہر وقت یہ خطرہ محسوس ہوتا ہو کہ نہ معلوم کس وقت اس کی تکوار ہمیں زخمی کر دے۔ اور نہ ہاتھ میں پوائنٹر لیے بلکہ

بورڈ کی طرف اشارة کر کے پیچھر دیتا ہوا، سکول ماشر ہوتا ہے۔ ان افسانوں کا شباب تو ایک "یار" کی صورت میں سامنے آتا ہے اور رخصت ہوتے وقت ایک جدید قربت، ایک نئی ہم آہنگی ایک مزید خلوص چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

قدرت اللہ شباب کے افسانے پڑھتے وقت ہم خود کو محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کے بیان کا طرز ہم پر کچھ ایسا سحر طاری کر دیتا ہے کہ ہم کو ذہنی طور پر ہی نہیں صریحاً مادی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شباب ہمارے گلے میں بانیں ڈالے ہمیں اپنی دنیا میں لیے پھر رہا ہے وہی دنیا جہاں "تلائش" ہے۔ جہاں بے بس و مجبور روح انسانی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کیا مجھے چھی محبت کبھی نہ مل سکے گی؟ جہاں سب کا مالک بنگال کی گنگتاتی ہوئی وادیوں میں بھوک کی کھیتیاں اگاتا ہے اور جہاں رینا بوس مالک کے سامنے بل کھا کھا کر ناقچتی اور اہل ہوس کی ہوس صرف اس لیے بھڑکاتی ہے کہ اس کو بھوک کی موت کے چنگل سے ہوس کے سیاہ دامن میں پناہ مل سکے۔ یہ دنیا ہمیں جلترنگ، شینوگرافر، غریب خانہ، ایک رات کی بات، ماما اور دو رنگا کے محوروں پر گھومتی سینما کے سکرین کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان افسانوں میں ہمیں ایک زردست طفر ملتا ہے جس کے نیکھے پن کی نشریت، نہ صرف شباب کو رومانیت کے کوچے ہی سے نکال لاتی ہے

بلکہ یاسیت کے گھرونوں کو بھی پاش پاش کر دیتی ہے۔ شاب کے یہاں نمایاں شخصی انفرادیت ہے۔ لیکن وہ انفرادیت نہیں جو عام انفرادیت پسند ادباء کے یہاں پائی جاتی ہے وہ گھٹن اور تختن اور ابہام جوان انسانہ نگاروں کا طرہ امتیاز ہے۔ شاب کے یہاں بالکل نہیں ہے اور سماجی احساس سے بہت کر چلنے کی روشن کامیں پر پتہ نہیں ہے۔ شاب کے افسانے سماج کے لوگوں کے ساتھ وہ کر اور اپنے مسائل کو ان کے مسائل کے ساتھ ہی نکلا کر لکھے گئے ہیں۔ ان میں چلتا پھرتا اصلی انسان ہی ملتا ہے ان کے کردار خوابوں کی تخلوق نہیں، بلکہ وہ ایک طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ طبقہ جو داخلی طور پر خوش نہیں ہے جس کے سفید لباس کے نیچے بھی زخموں سے چور بدن ڈھکا ہوا ہے جہاں کوڑھ کے بڑے گھناوے داغ ہماری آنکھوں کو بند کر لینے پر مجبور کرتے ہیں جہاں کوئوں کے نیچے بھوکے پیٹ پناہ لیے ہوئے ہیں۔ جہاں دور نگاہی کی روحانی اور جسمانی برص کے وہبے داخلی اور خارجی تعفن سے شامہ و باصرہ پر ضرب کرتے ہیں جہاں اپنی محبوباؤں کے جسم دوسروں کے بستروں کی نیت بنتے ہیں اور خود افسانے کے ہیرو اپنی راتیں دفتر کے کلرکوں اور چپڑا سیبوں کی یہویوں اور بیٹھیوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ عورت، روپوں کی بھری تھیلی، چھوکھری کا بھرا ہوا جسم یہ ہے۔ وہ دنیا جہاں قدرت اللہ شاب ہمیں لے جاتا ہے، جہاں پنچ کر ہم تقاضائے فطری کے تحت آنکھیں بند کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں تو کبھی بے ساختہ نہنہوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں، وہ کہیں ہمارے باصرہ کو خیر کرتا اور کہیں ہمارے شامہ کو زیر و زبر کرتا ہمیں لیے چلا جاتا ہے اور ہم بیزاری اور اختلاج کی حالت میں اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جسے دیکھ کر ہماری رُگ میں کراہت، نفرت اور بیزاری کا شدید احساس ابھرتا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں کی شرع میں سور کے گوشت سے لے کر چیل کے انٹے تک ہر چیز ہلال ہے۔

قدرت اللہ شاب ہمیں رنگ محل در رنگ محل، شیش محل در شیش محل لیے لیے نہیں

پھرتا۔ اس کی دنیا میں غریب خانہ بھی ہے جہاں تھالیوں میں لوگ کتنی کی طرح پڑ  
پڑ کھاتے ہیں اور ”غریب خانہ“ میں ہمیں مینڈک کی طرح ریتی ہوئی بوڑھی عورتیں،  
رعشہ بر اندام بوڑھے، پھولے ہوئے پیٹ، گزگراتے ہوئے پچ، گھمگھیاتے ہوئے ہڈیوں  
کے ڈھانچے اور وہ نو خیز لڑکیاں جن کو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے جنی بھوک مٹانا  
پڑتی ہے، ملتی ہیں، غریب خانہ وہ جگہ ہے جہاں بڑے میاں سے لے کر سقہ اور مہتر  
تک ہر نوجوان لڑکی اپنا حق سمجھتے ہیں اور جب اللہ دو شیرہ اپنی دنیا سے بھاگ کر شاپ  
کی دنیا والے غریب خانہ میں پناہ لینا چاہتی ہے تو سارے کی ہر ڈوری کے دوسرے  
سرے پر ایک ننگا سا وحشی، حیوان کھڑا ہوتا ہے۔ اس دنیا کی کامنی کوشل جب اپنے  
ٹھاکر کے پنجے سے نکل کر بھاگتی ہے اور یہاں آ کر پناہ لینا چاہتی ہے تو بقول شاپ،  
وہ کسی چیز سے نکراتی ہے اور منہ کے بل گر پڑتی ہے۔ اور شاپ نہایت خلوص کے  
ساتھ شروع سے آخر تک گلے میں بازو حائل کے کہیں انگلی کے اور کہیں ابروہی کے  
اشارے سے اور کہیں کہیں نہایت آہستہ سے کاتا پھوی کر کے ہر چیز دکھاتا جاتا ہے  
اور نہایت سلامت روی کی چال سب کچھ بتاتا چلا جاتا ہے۔ آؤ یہ دیکھو یہ میری دنیا،  
کوڑوں کے انبار والی دنیا، سماجی بھوکوں، سیاسی بھوکوں، اقتصادی بھوکوں والی دنیا، جنی بھوکوں  
اور ہنکمی بھوکوں والی دنیا، نہایت معمولی سی بات کی طرح بغیر مسکراۓ غصب کی ڈھنائی  
سے، بغیر پیشانی پر ایک ادنیٰ سی بھی چیز لائے ہوئے بلا کی ست مطریفی کے ساتھ ناظر  
کے طبق پر کوئین کی نہ پڑتے چڑھاتا بڑے انداز میں چلا جاتا ہے۔

میں نے جب شاپ کے یہ افسانے پڑھے تو مجھے ایسے معلوم ہوا کہ یہ افسانہ نگار زردست  
لاشموری طور پر جرات اور خدا داد بے باکی کا حال ہے اور اپنی انگلیوں میں داؤ دی مجذہ  
لے کر آیا ہے جو لوہے کو مووم کی طرح گوندر کر اپنی مرضی کے مطابق زنجیر تشکیل  
کر دتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنے لیے جو موضوع انتخاب کیا ہے اس میں حسن  
و رعنائی کے بجائے کوڑھ کے بد نما داغ ہیں، روحانی جذام اور جسمانی جذام کی بھتی  
ہوئی پیپ جس پر مکھیوں کے چھتے بھختاتے ہیں، افلاس کی سیاہیوں کے بادل منڈلاتے ہیں

اور گناہوں کی تاریکیوں کی اندر یا پڑی ہوئی ہیں۔ یہ ایک بہت نازک مقام ہے اور جب ایک افسانہ نگار ان چیزوں کو اپنے یہاں جگہ دیتا ہے اسے بہت چاق و چوند ہو کر اور اپنی صلاحیتوں کو بھرپور کام میں لا کر افسانہ لکھنا پڑتا ہے کیونکہ موضوع کی غیر شعربیت اور بے رنگی جو کرداروں اور ماحول کی کراہتوں کی صورت قاری کے سامنے آ کر سرے سے انہیں پڑھنے سے ہی روکتی ہے، چہ جائیکہ دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرے اور میں بھی شب کے افسانے ہرگز نہ پڑھتا، اگر ان میں بے پناہ خلوص اور اشائیں میں اس غصب کی جان نہ ہوتی۔ اس تاریک دنیا کو شب کے جاندار اشائیں نے اور اس پر خلوص زور بیان نے اس قدر روشن اور گوارا بنا دیا ہے کہ بے اختیار شب سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کشمیر کی فردوسی وادیوں اور پنجاب کے وسیع میدانوں کے متعلق بھی افسانہ لکھتے ہیں اور جنسی جذبات کو ابھار کر اپنی کہانیوں میں لذت پیدا کر لینا تو عام رسم اور سل نسخہ ہے لیکن ایسی کہہ دنیا میں پیش کر کے اور ہمیں اس دنیا میں دوش بدش اپنے ساتھ ایسے چلاتا جیسے ہم ہالی ووڈ اور بمبیٹ کے اسٹوڈیو میں گھوم رہے ہیں یا سوئٹر رلینڈ اور کشمیر کی وادیوں کا چکر لگا رہے ہیں۔ آج کل کے افسانہ نگاروں میں صرف قدرت اللہ شب کی انگلیوں کا معجزہ ہے۔ میں کسی قسم کے تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں آپ ہی بتائیے کہ کرشن چندر سے کشمیر کی رنگیں وادیاں چھین لی جائیں اور نہم سے پنجاب کے گنگناتے روشن میدان لے لیے جائیں، شفیق الرحمن سے دیہ دون اور شملہ کے ہرے بھرے نشیب و فراز نکال لیے جائیں، عصمت، منتو اور مفتی کے یہاں اعصابی تشنج نہ ہو تو کیا آپ ان کے افسانوں کو پڑھیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا سوال یہ جس کا پوچھنا میری جرات رندانہ ہے اور جس کا جواب بھی کچھ دل گرے والا انسان ہی دے سکتا ہے۔ خوبصورت اور جذباتی موضوعات پر افسانہ لکھ کر مقبول ہونا تو بہت آسان ہے لیکن گھناؤنے موضوعات کو کرید کر مقبول اور ہر دلعزیز بہانا صرف شب ہی کے زور قلم کا حصہ ہے اور یہ قلم اس وقت تک

نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک افسانہ نگار کی شخصیت میں وہی باقاعدہ اور

ویسے ہی ہمدردی اور خلوص نہ ہو جو شباب کے اندر ہے۔

اب کچھ "یا خدا" کے متعلق ..... شباب کا یہ افسانہ نہ صرف اس کے پچھلے تمام افسانوں میں بڑھ چڑھ کر ہے بلکہ اس کا شمار زبان اردو کے بہترین افسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح قحط بنگال کے افسانوں میں کرشن چندر کا "ان داتا" سب سے زیادہ بھرپور اور موثر افسانہ ہے، اسی طرح قدرت اللہ شباب کا "یا خدا" فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں میں ہے۔ "یا خدا" فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں کا بادشاہ ہے۔ اس کے اندر وہ بے پناہ حقیقت نگاری اور ایسی شدید روح ملتی ہے کہ بعض مصلحت اندیش لکھنے والے اس پر ارتاداد و کفر کا فتوی صادر کر بیٹھے۔ اپنی عمر میں جن معدودوںے چند چیزوں سے قاری انتہائی متاثر ہوا کرتا ہے، ان میں ایک "یا خدا" بھی ہے۔

لیکن جب ظمیر بابر اور مجتبہ حسین کے مضامین دیکھے تو مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں میں غلط راہ پر تو نہیں جا پڑا ہوں۔ جذبات کی رو میں کہیں رجعت پسندی کا شکار تو نہیں ہو گیا ہوں۔ لیکن جب میں نے "یا خدا" کا دیباچہ اور یہ مضامین پڑھے تو یہ محسوس کیا کہ ان مضامین اور "دیباچہ" کو "یا خدا" سے کوئی علاقہ نہیں ہے کیونکہ دیباچہ میں "یا خدا" کے متعلق کہنے کی بجائے کچھ اور کہا گیا ہے اور مضامین میں "یا خدا" سے زیادہ دیباچہ پر بحث کی گئی ہے اور اصل مصنف سے زیادہ دیباچہ نگار پر نکتہ چینی کی گئی ہے اور کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت اللہ شباب بے چارے ایک جانب سے آللہ کار ہیں اور دوسری جانب سے چکلی کے دو پاؤں میں گیوں کے ساتھ گھن بن کر پے گئے ہیں اور ان پر کسی اور جذبے کے تحت تیر و نشتر چلائے گئے ہیں اور اس بے مثال افسانہ میں فرقہ پرستی کے ناپاک جراشیم تلاش کئے گئے ہیں اس میں شک نہیں

کہ افسانہ کا فریم دیکھ کر پہلی نظر میں ضرور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس تصویر میں چالاک سیاست دان کی طرح ایک ہی رخ پیش کیا گیا ہے اس کے پیش کرنے والے کے

خلوص میں مجھے ذرا برابر بھی شبہ نہیں ہے۔ فکار کے قلم نے صرف ان احساسات کی عکاسی کی ہے جو ایک مخصوص ماحول میں، ایک خاص طبقہ کی نمائندگی کرنے والے کردار سے وابستہ ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان میں ظالم و مظلوم کی تمیز اٹھ گئی تھی۔ ظالم ادھر بھی تھے اور ظالم ادھر بھی اور جانبین میں سے کسی ایک کی بھی یہ منطق ظلم کے لیے وجہ جواز نہیں ہو سکتی کہ پہلے اقدام کس کی جانب سے ہوا۔ ہر ہر مہا دیو اور نمرہ تجیر کے نعروں اور جے کاروں میں مٹنے والے وہ مظلوم تھے جنہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک ماحول کا مصنف صرف اپنے ماحول کے مظلوموں کی عکاسی صحت نیت کے ساتھ کر دتا ہے تو اس کے یہ معنی کب ہو گئے کہ اس کے ماحول کی حدود کے باہر مظلوم ہیں ہی نہیں۔ ترقی پسند نقطہ نظر تو یہ کہتا ہے کہ ہم اس کی تخلیق کو اس بات کے پیش نظر جانچیں کہ آیا فکار کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے یا اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کسی بھی بات سے چشم پوشی تو نہیں کر رہا ہے اور اس تصویر کے پیش کرنے میں کہیں افراط و تفریط سے تو کام نہیں لے رہا ہے۔ شباب کے اس افسانہ کو پڑھ کر جو لوگ اس میں فرقہ واریت کے کیڑے دیکھتے ہیں وہ دراصل حقیقت سے آنکھیں چراتے ہیں۔ حقیقت کو پیش کر دینے سے خواہ لوگوں کے روگنگے کھڑے ہو جائیں یا حلق کڑوے ہو جائیں لیکن حقیقت تو حقیقت ہے اور اس کی تلخی یا ترشی مسلم اسے شیریں بناتا کسی کے بس کی بات نہیں۔

”یا خدا“ میں صرف ان لوگوں کو فرقہ پرستی کے کیڑے ملتے ہیں جو یا تو مصلحت اندیش ہیں یا پھر جو ان فسادات میں آگ اور خون کی دنیا سے بہت دور بیٹھے صرف پلیں کی مدد سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے اور رائیں قائم کرتے رہے اور اخباری دور بیزوں سے مشاہدہ کر کے افسانے لکھتے رہے اور نہایت سستی قسم کی موٹی مصلحت اندیشی کے تحت جانبین کے ظالموں اور مظلوموں میں توازن رکھتے ہوئے، دونوں قوموں میں صلح کرانے کا فورتھہ کلاس قسم کا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ خیر ان افسانہ نگاروں کے

جدبہ کو مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم اس کے اندر سطحی مخصوصیت ضرور ملتی ہے اور اگر اس سے قوم کی حالت سدھ رکھتی ہے اور نفرت کی آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے تو ایسا ضرور کرنا چاہیے لیکن ہر فکار سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنے مزاج کو بدل کر اور اپنے اوپر اعتدال و توازن کا خول چڑھا کر اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹائے تو یہ چیز بہت بے معنی ہے۔ یہ ایک ٹھنڈی طبیعت کا ادب تو کر سکتا ہے لیکن شاپ جیسا شعلہ مزاج اور تند طبیعت نوجوان فکار اس پر کیسے قادر ہو سکتا ہے، جسے اپنا خلوص اس قدر عزیز ہے کہ خود اپنی تلاشی لیتے ہوئے بھی اسے باک نہیں ہے۔ ایسے ادب سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنی نوک قلم بجائے حقیقت کی آگ کے مصلحت کی برف میں ڈبو کر لکھے، فضول ہے۔ کیونکہ اس کے پچھلے افسانے یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے اندر مصلحت (Compromise) کے عناصر پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔

وہ اس مقدس آگ کے دبانے سے مجبور ہے جو انسانیت سوز آگ کے شعلوں کو دیکھ کر ایک فکار کے اندر بھک سے بھڑک اٹھتی ہے اور اس شعلہ فشانی کے بغیر شاپ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ”یا خدا“ میں اس کے احساسات کی یہ آگ اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس کی وسیع انسانی ہمدردی کے جذبہ کو غلط سمجھ کر بد حواسی میں اسے فرقہ پرست کہہ دیا لیکن میں پھر سوچتا ہوں اور بار بار میرے ذہن میں ایک بات ٹھکنگی ہے کہ قدرت اللہ شاپ پر یہ تمام عتاب اس لیے نازل ہوا ہے کہ محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں نے اس کو سراہا ورنہ ”یا خدا“ کی نوعیت وہی تھی جو خواجہ احمد عباس کے ”سردار جی“ کی تھی۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ”سردار جی“ میں تو ایک تفہیقی کا احساس باقی رہ جاتا ہے اس میں کوئی بھرپور کردار ملتا ہے، اور نہ ایسی فضا جس کے مطابق ہم ماحول کا تجزیہ کر کے اس چیز پر مطمئن ہو سکیں جو فکار کرنا چاہتا ہے۔ سردار جی کا آخری حصہ تو اتنا غیر فطری اور بے جان ہے کہ مصنف کی مصلحت انسانی اور توازن قائم کرنے کا پول نہایت پھس پھس طریقہ سے کھل جاتا ہے اور افسانہ ایک

بچگانہ کوشش بن کر آپ اپنا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ اس افسانہ کی ابتدا میں سکھوں سے جو نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے وہ سردار جی کے خاتمہ پر زائل نہیں ہوتا کیونکہ اس کا خاتمہ بہت کمزور ہے اور بچوں کے بھلانے کا بھجنہنا سا بجٹا سنائی دیتا ہے۔ شباب کے افسانہ کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں ایک زندہ سال ہے اور اس کی فضا میں آپ کو شروع سے آخر تک نہایت خوبصورت یکسایت ملتی چلی جاتی ہے اور ایک ایسا تحریک جس کی روشنی میں نہ صرف آپ کو فسادات کا صحیح پس منظر معلوم ہو جاتا ہے بلکہ اس گھناؤنے ماحول سے نفرت ہونے لگتی ہے اور اس نفرت کو ابھارنا اور اجاگر کرنا ہی مصنف کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ شاید ترقی پسند فقاد اس افسانے پر لکھتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ لینن نے کہا ہے۔ ”اگر اپنے ماحول کو بدلتا ہے تو سب سے پہلے اس ڈھانچہ سے نفرت کرو۔“ قدرت اللہ شباب جب بھی نفرت کا جذبہ ابھارتا ہے تو کیا اس کا یہ فعل عین ترقی پسند نہیں ہے۔ فرقہ پرستی کے جراشیم کو ختم کرنے کے لیے صرف ولی کے گورنمنٹ ہاؤس میں بیٹھ کر صلح کی بات چیت کرنا ہی کافی نہیں ہے کیونکہ فسادات کی بنیاد صرف مذهب یا عقیدہ نہیں ہے اس کی = میں بہت سے عناصر کا ر فرمایا ہے۔

عناصر دونوں جگہوں پر یکساں ہیں اور انہی سے مل کر یہ ماحول بنتا ہے اس لیے جب تک ان بنیادی عناصر سے نفرت پیدا نہ کی جائے اس وقت تک اس ماحول کا پردہ چاک نہیں ہو سکتا اور اصل جراشیم نہیں مٹ سکتے۔ ”یا خدا“ کے مصنف کا سب سے بڑا فتنی کمال یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہندو یا سکھ سے من جیث القوم نفرت کا احساس بیدار نہیں ہوتا بلکہ خخبر بھونکنے والے سے زیادہ خخبر بھونکنے کے عمل اور وحشت و بربریت کی جانب ہم متوجہ ہوتے ہیں۔ دشاد سے ہمیں اس لیے بڑی ہمدردی نہیں ہوتی کہ وہ ایک مسلمان لڑکی تھی اور ملا علی بخش کی بیٹی تھی بلکہ شباب کے خلوص بیان نے اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھتے وقت ہم یہ تو بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں کہ وہ کون ہے۔ وہ ہمیں صرف ایک معصوم لڑکی دکھائی دیتی ہے جسے چند وحشی درندے نوچتے

دکھائی دیتے ہیں اور کچھ طرز بیان کا جادو ہم پر ان درندوں کے اس طاغوتی فعل سے ایسا جذبہ نفرت اور لڑکی کی مصیبت پر اپنی ہمدردی بیدار کرتا ہے کہ ہم شیطانی عناصر کے خلاف کمر بستہ ہو جاتے ہیں اور یہی ایک فنکار کا سب سے بڑا کمال ہے کہ اس کا مقصد قاری کے اندر رج کر لے جائے اور جب دلشاو کو عمل کے آثار نظر آتے ہیں تو اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے اور ہم بلکہ اٹھتے ہیں مگر ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ مظالم ایک کلمہ گو خاتون پر ثوٹ رہے ہیں بلکہ دلشاو کے کردار کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ریگتی ہوئی مخلوق جیسا پیش ہوتا ہے جسے عورت کہتے ہیں۔ اور پھر عورت بے بس و مجبور، عصمت و عفت کی دیوی، جس کے بطن کا مقدس صندوق خالق مطلق نے اپنی تخلیقی شاہکار کی امانت کے لیے منتخب کیا ہے اور دلشاو کا بچہ ہمارے سامنے صرف ایک ناجائز اولاد ہی کی شکل میں نہیں آتا بلکہ اس وحشت اور بربریت کی زندہ تشكیل ہے۔ جب انسانیت دشمن بوالہوس انسان نما درندے انسانی تہذیب و تمدن کے تمام سرمایہ کو ملیا میٹ کر کے اپنی ہوس کی آگ بجاتے ہیں۔ یہ دلشاو اگر گیتا یا سیتا ہو گی تو بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ یہ مریک سنگھ اور دیوار سنگھ اگر شہباز خان اور گلزار خان ہوں گے تو اس عمل میں ماحول کے لحاظ سے ایک ہلاکا سا فرق محسوس ہو سکتا ہے۔ لیکن گیتا اور سیتا کی مظلومیت بھی اسی نوعیت کی ہو گی، جیسی دلشاو کی تھی اور ان کی ناجائز اولاد بھی اسی طرح انسانیت کے نام پر طنز و تشنج کا ایک تیر پھینکتی اور پکار پکار کر کہتی۔ ”او میاں ہندوستانی صاحب! دیکھو ہم ہیں بیسویں صدی کی آئینی اور اخلاقی دنیا کے روشن اور سفید صفحہ پر تمہارے پہکائے ہوئے کالے وہبے، وہ وہبے جن کی مثال ہندوستان سے باہر اس صدی میں باوجود دنیا کی دو عظیم جنگوں کے بھی کیس اور نہیں ملتی۔“

”یا خدا“ کو پڑھ کر اور اس کے ماحول کا تجویز کر کے قاری کے اندر ایک وسیع انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد سنگھ اور مسلم پر نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم

پر ہے۔ اس کے کردار اپنے ماحول کے لحاظ سے اپنا عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ماحول کو خواہ یوپی میں رکھ لجھتے چاہے بمار میں یا بنگال، آسام اور سندھ میں، اس کی بنیاد نہیں بدل سکتی۔ البتہ دلشاہ اپنا نام بدلتی جائے گی۔ وہ کہیں گیتا ہو گی اور کہیں سیتا اور کہیں سعیدہ اور کہیں رقیہ، مگر اس کے ساتھ چند درجنے بیداری سے انسانیت کی بے گور و کفن نگلی لاش کی بوٹیاں نوچتے نظر آئیں گے۔ اب بتائیے کتنا بڑا ظلم ہے اور افسانہ نگار کی کاؤشوں کی کتنی بڑی بے قدری ہے۔ جب آپ اپنی خاص عینک سے دلشاہ کو صرف مسلمان ہی سمجھ لیں حالانکہ ”یا خدا“ کے خلوص بیان اور ترقی پسند تنقید نگاری کا تقاضا یہ تھا کہ دلشاہ صرف ایک عورت کی صورت میں نظر آتی۔ ایک مظلوم و بے بس عورت۔ ان کے دل میں دلشاہ ہی ہمدردی کرتے وقت خود مسجد اور گردوارے کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے دل کا چور مصنف کے سر تھوپ دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ تصنیف میں کوئی ادبی نشان بھی اس قسم کا نظر نہیں آتا۔ ایک بات اور قابل افسوس ہے کہ اس افسانے کو شائع کرتے وقت قدرت اللہ شباب نے ممتاز شیریں سے دیباچہ لکھوایا۔ مگر انہوں نے بھی مصنف اور تصنیف دونوں کے ساتھ خلوص کا ثبوت دیا جو شیریں جیسے ممتاز اور بلند پایہ فنکار کے کسی صورت سے بھی شایان شان نہ تھا۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ اپنی ناقدانہ قوتیں افسانہ کے حسن و فتح پر صرف کرتیں بلکہ ترقی پسندوں کے خلاف زور قلم دکھایا۔ حیرت ہے کہ ابھی دو سال پہلے جب محترمہ دور افسانہ نگاری کا جائزہ لینے بیٹھی تھیں تو کرشن چندر انہیں افسانہ نگاری کا دیوتا نظر آتا تھا اور اس کے روی سے روی افسانہ میں بھی وہ باریکیاں دیکھتی تھیں اور ایسی ایسی تشریحیں کرتی تھیں کہ بے چاہہ افسانہ نگار ”مصنف سوچتا ہے کس کی یہ تصنیف ہے“ کا مصدق ہو کر دانتوں میں انگلیاں دیا کر رہا جاتا تھا اور ”پیراں نبی پرند مریداں می پراند“ کا مضمون تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک سے الگ ہوتے ہی انہیں کرشن چندر کے ”ان داتا“ میں بھی کیڑے دکھائی دینے لگے، حالانکہ اس سے پہلے مختلف

پہلوؤں سے وہ اس پر قصیدہ خوانی کر چکی تھیں مگر اب نہ معلوم ادب میں کیا لپٹ  
ہو گئی یا وہ خود کیا کلپ ہو گئیں کہ ترقی پند فنکاروں کی تمام کوششیں سرے سے  
مholm اور بے جان نظر آنے لگیں اور اس کے اظہار کے لیے وہ موقع کی تلاش میں  
اس درجہ سرگرم ہو گئیں کہ مناسب اور نامناسب کی تمیز بھی کھو بیٹھیں۔ شیریں جیسی  
صاحب فکر و نظر سے ہمیں امید اس چیز کی تھی کہ وہ اپنی اعلیٰ و ارفع استعداد کے  
مطابق سنجیدگی کے ساتھ ”یا خدا“ کا جائزہ لیں گی۔ اور اپنے تبھیر علمی کے شایان شان  
تنقید کریں گی۔ شیر شاہ کی بڑی یا سلیم شاہ کی بڑی کا مقابلہ تو یوں بھی تنقید میں کوئی  
متحسن چیز نہیں ہے اور دیباچوں اور تبصروں کو ادبی پالی نہ کوئی ادبی خدمت نہیں ہے۔  
خیر ہر شخص کو اپنے قول و فعل کا اختیار ہے۔ انہیں اس کی قطعاً آزادی ہے کہ  
وہ اپنی پچھلی چھ سالہ ادبی خدمت کا گلہ گھونٹ کر ایم اسلام اور قیسی رامپوری کو بیدی  
اور کرشن چندر پر فضیلت دیں، مگر قدرت اللہ شاپ کو اس اکھاڑے میں اتار کر بیدی  
اور کرشن چندر سے بھڑانا اور اصولی طور پر غلط ہے۔ انہوں نے قدرت اللہ شاپ کو  
عقیدت کے ہار پہنا کر اور ”یا خدا“ کا کچھ ”سعدی ویگر است“ قسم کا دیباچہ لکھ کر  
شاپ کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نادان دوست والی دشمنی کا ثبوت دیا ہے اور ذاتی اغراض  
کی بنا پر ایک عظیم فنکار کو آلہ کار بنا لیا ہے آپ کی غرض پوری ہو یا نہ ہو مگر فنکار  
کا مطلب تو بگڑ ہی جائے گا۔ اس بنا پر میں ان تمام لوگوں کو دعوت دیتا ہوں جو ادب  
کا خلوص کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں کہ وہ ”یا خدا“ کا جائزہ نہیں۔

ترقبی پند ناقدين سے دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ وہ ”یا خدا“ یا ”یا خدا“ ایسی اور  
چیزوں کو تبصروں اور دیباچوں کے سرٹیفیکیٹ دیکھے بغیر بھی پڑھا کریں اور انہیں قدرت  
اللہ شاپ کا یہ شہ پارہ ممتاز شیریں اور عسکری کے دیباچہ اور تبصرہ کے لیبل ہٹا کر  
پڑھنا چاہیے تھا۔ انہیں معلوم ہوتا کہ قدرت اللہ شاپ کم از کم ”یا خدا“ تک تو  
انہی کا ہمنوا ہے اور اس کا مقام انہی کی صفت میں ہے اور ممتاز شیریں اسے انہی سے

نکرانا چاہتی ہے اور اسے کرشن چندر اور بیدی کی قطار سے ایم اسلم اور قیسی رامپوری کی صفت میں گھسیٹ رہی ہیں۔ یہاں پر مجھے ان ترقی پسند نادین سے شکایت ہے کہ انہوں نے "یا خدا" پر صرف اس لیے کہ اس پر ممتاز شیریں کا دبیاچہ تھا اس کی سب خوبیوں پر پانی پھیر دیا اور جذباتیت اور ہٹ دھرمی میں جو فیصلہ صادر کیا وہ نہ صرف علمی و ادبی بد دیانتی ہے بلکہ ترقی پسند اصولوں کے سخت منافی ہے۔ یہ لوگ اس سے پیشتر فسادات نمبر میں "یا خدا" دیکھے چکے ہوں گے اور ممکن ہے کہ پسند بھی کر چکے ہوں گے۔ مگر ان بے چاروں کو اس پر تنقید کرنے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب اس میں ممتاز شیریں کا مقدمہ شامل ہوا، اس کو پرانی بد شکونی کے پیچھے ناک کاٹنا کہتے ہیں۔

آخر میں پھر عرض کروں گا کہ اس میں شک نہیں کہ "یا خدا" کا دبیاچہ ایک قسم کی سازش کا پہلو لیے ہوئے ہے مگر اس کی بنا پر اصل شہزادہ کی عظمت سے منکر ہوتا اور نہ صرف منکر ہوتا بلکہ اس کی خوبیوں کو برائیوں کا نام دینا خود اس ادبی بد دیانتی کے ارتکاب سے کم نہیں جس سے دبیاچہ کی تیاری میں کام لیا گیا ہے اور مجھے رجعت پسند دبیاچہ نگار کی صفت میں ان ترقی پسند تبصرہ نگاروں کو بھی کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ ارے صاحب ترقی پسندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ دبیاچہ نگار کی سازش کو بے نقاب کیا جاتا اور "یا خدا" کے مصافت کے متعلق یہ بتایا جاتا کہ کم از کم "یا خدا" تک تو ہماری انجمن کے اصولوں کا سچا ترجمان ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے اب ایک خاص مقصد کے لیے Exploit کیا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ دبیاچہ نگار اور تبصرہ نگار اپنے اپنے رویہ پر غور کریں۔ خصوصاً تبصرہ نگار حضرات جو انجمن ترقی پسند مصطفین کے افراد ہیں ذرا اسپورٹنگ سپرت سے کام لیں اور "یا خدا" کو انصاف کے ساتھ پڑھیں اور پھر اپنے تبصروں کو اور ممتاز شیریں اور عسکری کے اظہار خیال کرنے کے قصور "یا خدا" سے معاف کر کے دوبارہ تبصرہ لکھیں، یوں تو تنقید میرا میدان نہیں ہے۔ اور اس میدان میں راقم الحروف نووارو سے زیادہ نہیں اس لیے قدرت اللہ شاپ جیسے عظیم

فکار اور "یا خدا" جیسے بے مثل شہ پاروں کے شلیان شان نہ لکھوں گا اور قرار واقعی  
تنقید نہ کرنے کا "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" لیکن اگر میری اس تحریر پر مصنف،  
دیباچہ نگار اور تبصرہ نگار حضرات میں سے کوئی غور کریں گے تو میں اپنی سعادت خیال  
کروں گا اور اردو ادب کے لیے نیک فال۔

## ○ نظرے خوش گزے

یہ بہت پہلے کی بات ہے، شاید ۱۹۵۹ء کی  
تب میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا کہ والد صاحب ایک چھوٹی سی کتاب لائے اور  
میں نے دیکھا کہ اسے پڑھتے ہوئے انہوں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔  
اس کے بعد موقع ملتے ہی میں نے وہ کتاب ان کی الماری سے اڑائی اور پڑھنا شروع  
کر دیا۔ چھوٹی سی کتاب تھی، گھنٹہ بھر میں ختم ہو گئی مگر اسے پڑھ کر مجھے رونا نہیں  
آیا۔

چار سال قبل، میں نے یہ کتاب دوبارہ پڑھی تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔  
تب، ایک دم، جیسے بھلی چمکتی ہے، مجھ پر اکٹھاف ہوا کہ یہ کتاب اس وقت رلاتی ہے  
جب آپ کا شعور پوری طرح بالغ ہو چکا ہے، اس کتاب کا نام "یا خدا" تھا اور اس  
کے مصنف تھے، قدرت اللہ شب۔ قدرت اللہ شب، جو ایک زمانے میں انڈین سول  
سروس کے ستوں تھے، پھر سی ایس پی کے کافی بلند پایہ ستوں رہے، آج کل ممتاز مفتی  
کے سعیت میں تصوف کے ایک پورے سلمہ شبایہ کے بانی مبانی بنے ہوئے ہیں۔ نستعلیق  
کتابی چہرے پر نیم مترشیع سی ڈاڑھی بھی بڑھا لی ہے۔ یہ الگ بات کہ صوفیوں کی متداول  
عادت کے بر عکس اب وہ مزید نرم دل، مزید آہستہ گو ہو گئے ہیں۔

آج کل انہیں دیکھ کر، ان کی باتیں سن کر بے اختیار صائب کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے  
کہ

فروتنی ست دلیل رسیدگان کمال  
کہ چوں سوار بے منزل رسد پیادہ شود

URDU4U.COM

ان میں اتنی عاجزی اور انکسار ہے کہ گلتا ہی نہیں، یہ شخص کبھی بہت زردست اور  
معرکے کا سرکاری افسر بھی رہا ہو گا۔ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، رزم میں تو ہم  
نے دیکھا نہیں مگر بڑم میں وہ پاک دل و پاک باز ہی محسوس ہوئے۔  
وہ ساری عمر اپنے متعلقین اور واپسگان کو حیران ہی کرتے رہے۔ تب بھی جب صدر  
پاکستان کے سیکریٹری تھے، تب بھی جب اطلاعات کے سکتر تھے، اور تب بھی جب نوکری  
چھوڑ کر یونیکسکو میں جا بیٹھے، اور ایک روز پتہ چلا کہ خفیہ طور پر وہ اسرائیل کا چکر  
بھی لگا آئے ہیں۔ تب ان کے ایک مرحوم دوست ابن اثناء نے جو کالم لکھا، اس کی  
سرخی یہ شعر تھا۔

قدرت اللہ شاپ کی باتیں  
ایسے ہیں جیسے خواب کی باتیں

باتیں وہ اب بھی خواب و خیال ہی کی سی کرتے ہیں، یقین نہیں آتا کہ مثنوی کے  
مصرعہ جیسی دھان پان قامت میں ایسی قیامت کی شخصیت چھپی ہوئی ہے، ان کی قامت  
مختصر، مگر داستان طویل ہے، اس میں طوفانوں کی شورش بھی ہے اور جذبوں کی یورش  
بھی۔

گئے دونوں سے ہم نے کبھی کچھ نہیں سیکھا، یہ داستان بھی بلا سے کوئی اثر  
مرتب نہ کرے مگر سن تو لجھتے کہ اس میں کتنی عبرتیں، کتنی قیامتیں پہنچ ہیں، قدرت  
اللہ شاپ کی کہانی، خود انسی کی زبانی.....

من آنچہ شرط بлагع است، با تو می گویم  
 تو خواه از سخنم پند کیرو خواه ملال  
 افہر سیل

○○○

## • آزاد کشمیر

بیاست جموں و کشمیر کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ اس کے چار ہزار سال کے فقص و روایات کا کچھ حصہ ”راج ترکنگی“ کی کلاسیکی سنکریت میں درج ہے۔ اس کے برعکس تحریک آزادی جموں و کشمیر کی داستان اگرچہ ظاہری طور پر ۱۹۴۵ء سے شروع ہوتی ہے، مگر تعالیٰ ادھوری ہے۔ اس کے باوجود تحریک آزادی کشمیر کی سانحہ سالہ داستان کئی لحاظ سے ”راج ترکنگی“ کے ہزاروں سالوں پر بھاری ہے۔ جدوجہد آزادی کی اس تحریک کے ایک ایک پہلو پر ایک مستند اور مکمل راج ترکنگی تصنیف ہو سکتی ہے۔ اتنا بڑا کام سر انعام دینا میرے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے اس باب میں میں اس ڈرامے کی چند چیزوں کی جھلکیاں ہی پیش کر سکوں گا۔

۱۶ مارچ ۱۹۴۶ء کے روز عمد نامہ امرتر کے ذریعہ انگریزوں نے بیاست جموں و کشمیر ایک ڈوگہ مسمی گلاب نگہ کے ہاتھ ۲۵ لاکھ نانک شاہی روپیہ کے عوض فروخت کر دی۔ بیاست کا رقبہ ۸۳۳۷۱ مرلیں میل تھا۔ اس نزخ پر یہ سر نہیں رشک فردوس بریں تقریباً ۱۵۵ روپے فی مرلیں میل یا موجود نہانے کے ایک پیسہ میں تقریباً ۲۷۰ مرلیں گز پر اٹھی۔ اس وقت کی آبادی کے حساب سے انسانوں کی قیمت تقریباً سات یا سوا سات روپے فی کس پڑی۔

گلاب نگہ کا جائشیں رنبیر نگہ بھی اپنے باپ کی طرح قطعی ان پڑھ اور جاہل تھا۔ البتہ اس نے اپنے ولی عمد پرتاپ نگہ کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ انتالیق ضرور مقرر کئے۔ کہا جاتا ہے، کہ ان میں ایک مسلمان انتالیق کی بہت جلد چھٹی ہو گئی۔ پرتاپ نگہ پڑھائی میں بے حد غبی اور کند ذہن تھا۔ کسی بات پر ناراض ہو کر اس کے مسلمان

استاد نے اس کو ڈائنا اور کہا۔ ”ابے لوٹے محنت سے پڑھا کر، ورنہ باپ کی طرح جلال کا جلال نہ جائے گا۔“ یہ بات مهاراجہ رنیبر سنگھ تک پہنچی تو وہ بہت گبڑا۔ اور اس نے اپنے بیٹے کے اتاائق کو ملازمت سے برخاست کر دیا۔

مهاراجہ پر تاپ سنگھ انتہائی کلیاں اور ”دیوانہ بکار خویش ہوشیار“ قسم کا انسان تھا۔ اسے افیون کھانے کی لت تھی جس کی وجہ سے وہ دن بھر خمار آلود غنوگی کی کیفیت میں بیٹلا رہتا تھا۔ اس صورت حال کو ڈھال بنا کر وہ اپنی ذات پر ایک مصنوعی محبوب الحواسی، بے بناؤٹی اور کسی قدر احتمانہ حد تک سادگی کا لبادہ اوڑھئے رکھتا تھا۔ لیکن اس ملمع کاری کے پیچھے وہ انتہائی چالاک، ہوشیار اور دور رس سمجھ بوجھ کا مالک تھا۔ انگریزوں کے ساتھ وہ اپنے تعلقات انتہائی استوار رکھتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ سادگی اور درویشی کا ڈھونگ رچا کر وہ ان کے خلاف ظلم و استبداد کے سارے قوانین کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی حکمت عملی سے ڈوگہ خاندانوں کو ریاست میں سیاہ و سفید کا مالک بنانے میں کمال ہوشیاری سے کام لیتا تھا۔

میں نے نہایت کم عمری میں صرف ایک بار مهاراجہ پر تاپ سنگھ کو پیچشم خود دیکھا تھا۔ انگریز ریزیڈنٹ کی کرکٹ ایلوں کے ساتھ پیچ کھیلنے کے لیے مهاراجہ نے اپنے افسروں کی ایک ٹیم کھڑی کر رکھی تھی۔ میرے والد مهاراجہ کی ٹیم میں شامل تھے۔ مهاراجہ بذات خود اس ٹیم کا کپتان تھا۔ لیکن جب وہ کھیلنے کے لیے میدان میں اترا تو اس کا حلیہ بھروسیوں جیسا تھا۔ اس کے سر پر ایک سفید ٹوکرا نما ڈھیلی ڈھالی گپڑی تھی، جس کی پیشانی پر سامنے کی طرف اور دائیں بائیں ہیرے جواہرات سے جگلگ کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی کلگیاں تھیں۔ گلے میں رنگ برنگ موتیوں کے بہت سے ہار تھے۔ گھنٹوں تک لمبا نیلے رنگ کا انگلش کٹ کوٹ تھا۔ نیچے سفید پتلون اور سفید بوٹ تھے۔ اس بیت کذائی کا ایک گول مثُل اور ٹھکانا سا شخص جب بیٹ گھماتا ہوا وکٹ کے سامنے

آکر ایستادہ ہو گیا، تو ایسے نظر آتا تھا کہ کمی ماوس کا رنگین کارٹون کسی کتاب کے صفحے سے بھاگ کر امر سنگھ کلب سری نگر کے بزرہ زار میں آکھڑا ہوا ہے۔ ریزیڈنٹ کی ٹیم کا باولر مہاراجہ کی جانب گیند اس قدر آہنگ سے لڑھاتا تھا جیسے دو سال کے بچے کی طرف پیار سے پچکار کر لٹو پھینکا جاتا ہے۔ اس پر بھی مہاراجہ بار بار وکٹ آؤٹ ہوتا رہتا تھا، لیکن امپائر بلند آواز سے NO بال کا اعلان کر کے شاہی سکور میں ایک رن کا اضافہ کر دیتا تھا۔

اگرچہ بیاست میں سرکاری طور پر بجٹ بنانے کا دستور راجح ہو چکا تھا، لیکن مہاراجہ پر تاب سنگھ کے ذاتی اخراجات کی تفصیل بصیرتی راز رکھی جاتی تھی۔ راج محل کے اخراجات کی ایک میڈیا پن کہلاتی تھی۔ قضائے حاجت سے فارغ ہونے کے بعد مہاراجہ بہادر کو طہارت کرانے پر تین ملازم مامور تھے۔ دو ملازم چبیس کی ململ کے ایک پورے تھان کو کھول کر اس کے دونوں سرے تھام کر ایک برآمدے میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ درمیان میں ایک خاص بناوت کی چوکی کا سارا لے کر مہاراجہ صاحب ململ کے تھان پر مناسب آسن جما کر جھک جاتے تھے۔ تیرا ملازم چاندی کی گڑوی سے صحیح موقع و مقام پر پانی انڈیلتا تھا اور دوسرے دونوں ملازم آہ کشوں کی طرح ململ کا تھان آگے پچھپے کھینچ کر مہاراجہ کی صفائی کر دیتے تھے۔ اس عمل کے بعد یہ پورا تھان ان تینوں ملازموں کو دان کر دیا جاتا تھا۔ چبیس کی ململ اس زمانے میں نہایت اعلیٰ اور مہنگے قسم کے کپڑے میں شمار ہوتی تھی۔ مشہور تھا، کہ مہاراجہ کا ”ڈیوڑھی وزیر“ (Waiting Minister in) کبھی کبھی اپنے آقا کو دودھ میں کچھ مقدار جمال گوشہ کی ملا دیا کرتا تھا، جس کی وجہ سے اسے بار بار بیت الحلاء جانے کی حاجت پیش آتی تھی۔ چبیس کی ململ کا ایک تھان تو حسب دستور تینوں ملازموں میں تقسیم ہو جاتا تھا، لیکن اس کے علاوہ باقی سب تھان ”ڈیوڑھی وزیر“ کے حصے میں آتے تھے۔

مہاراجہ پر تاپ سنگھ بے اولاد تھا۔ اپنی جائشی کے لیے اس نے اپنی برادری کا ایک لڑکا

مختب کر کے متبینہ بنا رکھا تھا۔ لیکن ہری سنگھ کے باپ راجہ امر سنگھ کو یہ بات گوارا نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو بیاست کا وارث بنانا چاہتا تھا۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس نے بیاست کے طول و عرض میں سازشوں کا جال بچھا دیا۔ اس ساز باز میں راجہ امر سنگھ کو حکیم نور دین سے بڑی مدد ملی۔ حکیم نور دین مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے سے بیاست کا شاہی طبیب تھا۔ اس کے علاوہ وہ مرزا غلام احمد قابیانی کا دست راست بھی تھا۔

راجہ امر سنگھ کا بیٹا ہری سنگھ انتہائی بد کردار، بد اخلاق، آواہ گرد، لچا لفڑا اور بدمعاش شخص تھا۔ اس کی جنسی بے راہریوں اور بد تماشیوں کے بہت سے قصے زیان زد خاص و عام تھے۔ مسٹر X کے پردے میں ایک انگریز عورت کے ہاتھوں بلیک میل ہو کر وہ کافی ذات، بدنایی اور مالی نقصان اٹھا چکا تھا۔ اس کے باوجود انگریز حکمرانوں نے پر تاپ سنگھ کے مختب متبینہ کی بجائے رسوائے زمانہ ہری سنگھ کو ہی بیاست کی گدی پر بٹھایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس فیصلے میں طرح طرح کی مالی، سیاسی اور جنسی رشوت کا بھی بہت کچھ عمل دخل تھا۔

مہاراجہ ہری سنگھ ۱۹۲۵ء میں گدی نشین ہو کر اپنے لہو و لعب اور عیش و نشاط کی بد مستیوں میں ایسا غرق ہوا کہ بیاست کے چھوٹے بڑے ڈوگروں ہندو ملائیں کو اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ مسلمانوں کی آبادی ایک صدی سے زیادہ سکھوں اور ڈوگروں کی غلامی میں ہر طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ اب ان کے مصائب میں کئی گناہ مزید اضافہ ہو گیا۔ لیکن اسی زمانے میں مسلمانوں کی نئی نسل میں اچانک رو عمل کے بیجان نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں سری نگر میں شیخ عبداللہ نے ”ریڈنگ روم پارٹی“ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اسی زمانے میں جموں میں بھی چودھری غلام عباس نے اے آر ساغر اور دیگر چند ساتھیوں کے ساتھ

مل کر ”ینگ میز مسلم ایسوی ایشن“ کی بنیاد ڈالی۔ ان دونوں تنظیموں کا ظاہر سماجی لیکن باطن سیاسی تھا۔ انہوں نے بیاست کے مسلمان نوجوانوں کو پلیٹ فارم پر مل بیٹھنے، اپنے ماحول کا جائزہ لینے اور معاشرے کی ناہمواریوں اور نااصنافیوں پر صدائے احتجاج بلند کرنے کا آہنگ سکھایا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کا نیا وہ وقت گلکتہ، بمبئی، لندن اور پیرس کے عشرت خانوں میں گزرتا تھا۔ میدان صاف پا کر بیاست کے ہندو اہلکاروں کی چیزہ دستیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ اب وہ مسلمان رعایا کے مال و دولت اور عزت و ناموس کے علاوہ ان کے دین و ایمان پر بھی ہاتھ ڈالنے لگے۔ ۱۹۳۱ء میں پہلے بیاسی میں ایک مسجد شہید کر دی گئی۔ پھر کوئی میں مسلمانوں کے ایک جم غیر کو زردستی جمعہ کی نماز ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ اس کے علاوہ جوں میں ایک ہندو پولیس کا نشیبل نے جان بوجھ کر قرآن حکیم کی سخت بے حرمتی کی۔ ان واقعات نے بیاست بھر کے مسلمانوں میں شدید غم و غصے کی آگ بھڑکا دی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے اور جلوس شروع ہو گئے۔ خاص طور پر سری نگر میں عبدالقدیر نامی ایک شعلہ بیان مقرر نے بڑے بڑے جلسوں میں تقریں کر کے مہاراجہ کی حکومت کی دھمکیاں اڑا دیں۔ اسے گرفتار کر کے جیل میں مقدمہ چالایا گیا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو مسلمانوں کے ایک جم غیر نے جیل کا محاصرہ کر کے مطالبہ کیا کہ انہیں عبدالقدیر کے زیر سماعت مقدمہ کی کارروائی سننے کی اجازت دی جائے۔ اجازت دینے سے انکار کر کے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے گولی چلا دی۔ جس میں ۲۷ افراد ہلاک اور بے شمار زخمی ہوئے۔ شیخ عبداللہ اور چودہری غلام عباس گرفتار کر لیے گئے۔ تین روز بعد پھر سری نگر میں فائزگنگ ہوئی جس میں دویاہ مسلمانوں کا خون بہا۔ آزادی کے نام پر کشمیر کی سر نہیں پر خون کی یہ قربانی آج تک بدستور جاری ہے۔ ۱۳ جولائی کو ہر سال شدائے کشمیر کی یاد بھی پابندی سے منائی جاتی ہے۔

سری نگر میں ۱۳ جولائی کی وحشیانہ فائزگنگ سے سارے برصغیر کے مسلمانوں میں بھی رنج

و اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

سب سے پہلے لاہور میں خان بہادر رحیم بخش سیشن جج کی ملکان روڈ والی کوٹھی پر مشورہ کرنے کے لیے چند مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ جموں کی Men's Muslim Association Young کی نمائندگی کرنے کے لیے اے آر سافر بھی اس میں شامل تھے۔ اس میں طے پایا کہ ہندوستان بھر کے سر بر آورده مسلمان اکابرین کو اکٹھا کر کے اس بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں فیصلہ ویو نام کی ایک دو منزلہ کوٹھی میں ایک مینگ کے نتیجہ میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ اس مینگ میں جو حضرات شامل ہوئے، ان میں علامہ اقبال، نواب سر ذوالفقار علی، خواجہ حسن نظامی، نواب کنج پورہ، نواب باغپت، سید محسن شاہ، خان بہادر شیخ رحیم بخش، عبدالرحیم درد، سید حبیب، اسماعیل غزنوی، صاحبزادہ عبداللطیف اور اے آر سافر کے نام سرفراست تھے۔ چند دوسرے حضرات کے علاوہ وادی کشمیر کے ایک نمائندے غالباً میرک شاہ بھی اس مینگ میں شریک ہوئے تھے۔

بد قسمتی سے صدارت مرزا بشیر الدین محمود نے کر ڈالی اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر بھی وہی بن بیٹھے۔ یہ قادریوں کی ایک سوچی سمجھی چال ثابت ہوئی۔ اس کمیٹی کے قائم ہوتے ہی مرزا بشیر الدین محمود نے ہر خاص و عام کو یہ تاثر دنا شروع کر دیا، کہ ان کی صدارت میں اس کمیٹی کو قائم کر کے ہندوستان بھر کے سرکردہ مسلمان اکابرین نے ان کے والد مرزا غلام احمد قادری کے مسلک پر مر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس شر انگیز پروپیگنڈا کے جلو میں قادریوں نے انتہائی عجلت کے ساتھ اپنے مبلغین کو جموں و کشمیر کے طول و عرض میں پھیلانا شروع کر دیا تا کہ وہ بیاست کے سامنے لوح عوام کو ورگلا کر انہیں اپنے خود ساختہ نبی کا حلقة بگوش بناانا شروع کر دیں۔ یہ مضم کافی کامیاب رہی۔ کئی دوسرے مقامات کے علاوہ خاص طور پر شوپیاں میں مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد قادری بن گئی۔ پونچھ کے شر میں بھی مسلمانوں کی اکثریت نے قادری نمہب اختیار کر لیا۔ یہ خبر سنتے ہی رئیس الاحرار مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری پونچھ شر

پنچے اور اپنی خطیبانہ آتش بیانی سے قادیانیت کے ڈھول کا ایسا پول کھولا کہ شر کی جو آبادی مرزاں بن چکی تھی، وہ تقریباً ساری کی ساری تائب ہو کر از سر نو مشرف بہ اسلام ہو گئی۔

آل اغیانہ کشمیر کمیٹی کی صدارت کی آڑ میں مرزا بشیر الدین محمود کی یہ چالبازیاں اور حرکات دیکھ کر علامہ اقبال نے شملہ والی کشمیر کمیٹی سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے کشمیر کے متعلق اس تحریک کی اعانت اور سرپرستی فرمانا شروع کر دی، جو مجلس احرار نے بطور خود نہایت جوش و خروش سے شروع کر رکھی تھی۔

۱۳ اگست ۱۹۴۱ء کو جموں شر میں پہلی بار کشمیر ڈے منایا گیا۔ اے آر ساغر اور ان کے دیگر رفقائے کارنے یہ پروگرام بنایا تھا کہ ریزیڈنسی روڈ پر انجمن اسلامیہ کے احاطے سے مسلمانوں کا ایک جلوس مرتب کر کے شر بھر میں گھمایا جائے۔ بیاستی حکومت تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے ڈوگہ فوج کو پہلے ہی سے وہاں پر بھیج دیا تا کہ یہ جلوس نلکنے ہی نہ پائے۔ جلوس کے مظہرین نے خفیہ پیغام رسانی سے کام لے کر انجمن اسلامیہ کے احاطے کی بجائے جامع مسجد میں مسلمانوں کا جم غیر اکٹھا کر لیا۔ ڈوگہ حکومت نے صورت حال بجانپ کر ایک مسلمان مجریٹ کو مسجد کے باہر تعینات کر دیا کہ مزید مسلمان مسجد میں داخل نہ ہونے پائیں۔ اے آر ساغر جب مسجد میں جانے لگے تو مجریٹ نے انہیں روکا اور پوچھا۔ ”تم اس وقت مسجد میں کیا کرنے جا رہے ہو؟“

ساغر نے جواب دیا کہ وہ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جا رہے ہیں۔

صحیح کے آٹھ یا ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ مجریٹ نے پوچھا۔ ”یہ کون سی نماز کا وقت ہے؟“

ساغر صاحب نے حاضر جوابی سے کام لے کر کہا۔ ”میں نماز اشراق پڑھنے جا رہا ہوں۔“

مسجد میں داخل ہو کر ساغر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جمع شدہ مسلمانوں کا جلوس مرتب کیا اور ”اللہ اکبر“ کے نفرے لگاتا ہوا جلوس مسجد سے برآمد ہوا۔ اس وقت تک

نیزوں سے مسلح ڈوگہ فوج کا ایک دستہ بھی یہجر محمد خان کی کمان میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ مسلمان یہجر نے ڈوگہ فوجیوں کو حکم دیا کہ جلوس منتشر کرنے کی خاطر وہ اپنے نیزے سے کسی شخص کو زخمی نہ کریں بلکہ ڈرا دھماکا کر جلوس روک دیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے سے یہجر محمد خان نے یہ حکم تو صریحاً اپنی ذمہ داری پر دیا تھا لیکن کسی طرح ڈوگہ فوجیوں کو یہ تاثر بھی دے دیا کہ حکومت کا بھی یہی مفتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد جب حکام بالا اور مہاراجہ تک یہ خبر پہنچی تو مسلمانوں کے ساتھ اس ہمدردانہ رویے کی پاداش میں یہجر محمد خان کو فوری طور پر فوج سے نکال دیا گیا۔ زندگی کے آخری آٹھ دس برس انہوں نے پاکستان میں انتہائی گمنامی اور مفلسی کی حالت میں گزارے۔ کچھ عرصہ انہوں نے جملم میں لکڑی کے ٹھیکیداروں کے گوداموں کی چوکیداری کر کے گزر اوقات کی۔ یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ حکومت پاکستان یا آزاد جموں و کشمیر کی حکومت میں کسی کو یہ خیال تک نہ آیا کہ یہجر محمد خان جیسے مرد مجاهد کی قربانی اور خدمت بھی ہماری اعانت کی مستحق ہے۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو پہلی بار ”کشمیر ڈے“ منایا گیا تھا۔ عین سولہ برس بعد ۱۹۴۸ء میں اسی تاریخ کو پاکستان کا قیام بھی وجود میں آیا۔ اب ۱۳ اگست کو ہر سال ”پاکستان ڈے“ منایا جاتا ہے۔ لیکن یوم پاکستان کا جشن آزادی اس وقت تک ہرگز شرمندہ تحریک نہیں ہو سکتا، جب تک کہ کشمیر کا ایک بڑا حصہ بھارت کے قبضہ استبداد سے آزاد نہیں کروایا جاتا۔

علامہ اقبال کی سرپرستی میں تحریک کشمیر کی رہنمائی مرزا بشیر الدین محمود کی کشمیر کمیٹی سے نکل کر مجلس احرار میں آگئی تو قادیانیوں نے متوازی خطوط پر اپنی کمیٹی چلانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن احراریوں کے مقابلے میں ان کی دال نہ گل سکی۔ کسی وجہ سے جس کا مجھے علم نہیں قادیانی عرصہ دراز سے کشمیر پر اپنا تسلط جمانے کا خواب

ویکھتے چلے آئے ہیں۔ بیاست میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ابھی ٹیش میں انہیں غالباً اپنے اس خواب پریشان کی تعبیر نظر آنے لگی۔ لیکن مجلس احرار نے ان کی یہ امنگیں اور آرزویں خاک میں ملا دیں۔

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں پسلے تو احرار کے چند سرکردہ قائدین نے خود سری نگر جا کر مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے وزیراعظم سر ہری کرشن کول سے مل کر افہام و تفہیم کے ذریعہ معاملات سلبھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو لاتوں کے بھوت تھے، باتوں سے کیسے مان جاتے؟ مایوس ہو کر احراری لیڈر واپس آئے تو سارا پنجاب ”کشمیر چلو، کشمیر چلو“ کے نعروں سے گونج اٹھا اور آزادی کشمیر کے متواں رضا کاروں نے سر پر کفن باندھ کر بیاست کی سرحدیں عبور کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ پہلی یورش سیالکوٹ کی جانب سے شروع ہوئی۔ اس جیالے شر کے مسلمانوں نے گھر گھر کو جذبہ جہاد کی حرارت سے پکھلا کر رکھ دیا۔ ماں نے بیٹوں کو، بہنوں نے بھائیوں کو اور یوں یوں نے خاوندوں کو خوشی خوشی دعائیں دے کر بیاست میں داخل ہونے کے لیے رخصت کیا۔ بیاستی حکام کا اندازہ تھا کہ نیاہ سے نیاہ پانچ ہزار رضا کار جموں تک آپائیں گے، جنہیں آسانی سے گرفتار کر کے محبوس کیا جا سکے گا۔ لیکن جب ویکھتے ہی ویکھتے دس ہزار سے بھی اوپر مجاہدین گرفتاریاں پیش کرنے کے لیے جموں پر چڑھ آئے تو مقامی پولیس بے بس اور بد حواس ہو گئی۔

دوسری جانب میر پور میں بھی تحریک آزادی کے شعلے تیزی سے بھڑک رہے تھے۔ خاص طور پر جب ایک مسلمان سیاسی کارکن کو دن دہائے ایک ڈوگرہ افرانے بر سر عام نوک سنگین سے سینہ چھید کر شہید کر ڈالا تو چاروں طرف غم اور غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ پنجاب کے کونے کونے سے مسلمان نوجوانوں کے جتھے کلمہ شادت کا ورو کرتے جملم کے راستے کشمیر کی سرحدوں کی طرف پاپیاہ روانہ ہو گئے۔ جس طرف سے وہ پیدل مارچ کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ ”کشمیر چلو، کشمیر چلو“ کی صدائے بازگشت کا نقش لوگوں کے دلوں پر چھوڑتے جاتے تھے۔

تیری جانب تیس رضا کار قرآن شریف پر یہ حلق اٹھا کر راولپنڈی سے روانہ ہوئے کہ وہ جان کی بازی لگا کر دیا یے جنم پر کوہاں کا پل بند کر کے رہیں گے۔ تین دن کی سر توڑ ہمت مردانہ سے کام لینے کے بعد انہوں نے یہ پل اپنے بقہہ میں کر لیا اور اس طرح وادی کشمیر کے ساتھ تجارت کی یہ واحد شاہراہ بند ہو گئی۔ آن کی آن میں دونوں جانب رکی ہوئی گاڑیوں، لاڑیوں اور ٹرکوں کی طویل قطاریں بندھنا شروع ہو گئیں۔

کچھ رضا کاروں نے گوردا سپور اور گجرات کی جانب سے بھی اپنی یلغار شروع کی۔ لیکن ان علاقوں میں ہندو آبادی کی اکثریت تھی۔ اس لیے یہ محاذ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے۔

مہاراجہ کشمیر کی درخواست پر ہندوستان کی برطانوی حکومت بھی لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اتر آئی۔ چنانچہ رضا کاروں کو کشمیر میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے اب صوبہ پنجاب میں بھی ان کی گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ پنجاب کی جیلیں بھی بہت جلد اٹاٹ بھر کر کم پڑ گئیں۔ شدید بد انتظامی اور ضروری سامان کی کمیابی کی وجہ سے کئی درجن رضا کار نمونیہ میں بیٹلا ہو کر جیلوں ہی میں وفات پا گئے۔ کئی مقامات پر جیلوں میں جگہ کی تلت کی وجہ سے پولیس والے بہت سے نئے گرفتار شدہ رضا کاروں کے گلے میں تنخیاں لٹکا کر احرار کے دفتروں میں چھوڑ جاتے تھے تا کہ جگہ خالی ہونے پر انہیں جیلوں میں لے جائیں۔ انداز ہے کہ صرف پنجاب سے تقریباً ۲۵ ہزار نوجوان گرفتار ہوئے، پانچ ہزار سے زائد رضا کار دوسرے صوبوں سے بھی شامل ہوئے۔

یاست کے اندر اور باہر مسلمانوں کی منظم ابھی ٹیکش سے متاثر ہو کر نومبر ۱۹۳۱ء میں گلینیسی کمیشن قائم کیا گیا۔ سربی جی گلینیسی اس کے صدر اور غلام محمد عشاٹی، پنڈت پریم ناتھ براز اور چھڈری غلام عباس اس کے ممبر تھے۔ کمیشن کے مقاصد میں یاست

کے مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لے کر ان کے حقوق کی نشاندہی کرنا اور جولائی کی پولیس فارنگ کے صحیح کوائف کی تحقیقات کرنا شامل تھے۔

دیگر کئی اقدامات کے علاوہ اس کمیشن نے بیاست میں ایک قانون ساز اسمبلی قائم کرنے کی بھی پر زور سفارش کی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کے دباؤ سے مجبور ہو کر مہاراجہ ہری سنگھ نے انتہائی بے دلی سے یہ سفارش قبول کر کے ایک اسمبلی قائم کر ڈالی جس کا فریضہ حکومت کو فقط مشورہ دینا تھا۔ اس سے نیا ہد اس نامہ اسمبلی کے پاس کوئی خاص اختیار نہ تھا۔ ۵۷ اراکین کی اس اسمبلی میں صرف ۳۳ ممبر انتخاب کے ذریعہ لیے جاتے تھے۔ ۲۱ مسلمان اور ۱۲ غیر مسلم۔ باقی ۲۲ ممبر حکومت خود نامزد کرتی تھی۔ اس طرح اس نوعیت کی محدود مشاورتی اسمبلی میں بھی بیاستی حکومت کے اپنے نامزد کردہ اراکین کی تعداد منتخب ممبروں کی تعداد سے کہیں نیا ہد تھی۔

گلینیسی کمیشن کے قیام کے ایک برس بعد ۱۹۳۳ء میں سری نگر پتھر مسجد میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی۔ شیخ محمد عبداللہ اس کے صدر اور چودہ ری غلام عباس جزل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں جب اسے اسمبلی کے لیے پہلی بار انتخابات ہوئے تو شیخ عبداللہ مسلم کانفرنس کے نمکٹ پر کامیاب ہو کر اسے اسمبلی میں شامل ہوئے۔

سات برس تک شیخ صاحب اور چودہ ری غلام عباس کا گرا پر خلوص اور برادرانہ باہمی تعاون اور ساتھ رہا۔ مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ان دونوں رہنماؤں نے پاپیا ہد چل چل کر بیاست کے چپے چپے میں عوام الناس میں سیاسی بیداری کی زبردست روح پھونکنے کا شاندار کارنامہ سر انجام دیا۔ ان دونوں شیخ صاحب اپنی تقریر قرآن حکیم کی قرات اور اس کے بعد نعمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کرتے تھے۔ ان کی آواز لحن داؤ دی کا سماں باندھ دیتی تھی۔ ان کی تقریر میں آتش بیانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ اسی طرح چودہ ری غلام عباس بھی سادگی، خوش بیانی، سلاست اور جذبات کی

فراوانی کا بے حد خوبصورت مجسمہ تھے۔ ان دونوں کی تقریروں کو لوگ سحر زدہ سامعین کی طرح مبہوت ہو کر سنتے تھے، تڑپتے تھے اور بعض دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ اس قسم کے جلسے میں نے زندگی بھر میں اور کمیں نہیں دیکھئے۔ ان دونوں حضرات کے علاوہ ایسے جلوں میں اے آر ساغر کی آتش پیانی بھی فصاحت و بلاغت کی لاجواب فضا باندھ دیتی تھی۔

مسلمان عوام کو بیاست کے طول و عرض میں اس طرح بیدار اور منظم ہوتے دیکھ کر ہندوؤں کے پیٹ میں بھی مرود اٹھا اور انہوں نے ڈوگہ حکام سے مل کر ہندوستان سے ایک جارحانہ ہندو تحریک راشریہ سیوم سیوک سنگ (R.S.S) کو دعوت دی کہ وہ جموں اور کشمیر میں بھی اپنے اڈے قائم کرنا شروع کر دے۔ چنانچہ مسلم کانفرنس کے قیام کے دو برس بعد ۱۹۳۳ء میں آر ایس ایس نے اپنا کام شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سری نگر، جموں، میر پور، کوٹلی، سائبہ، اودھم پور اور کٹھوڑہ کے علاوہ دیگر کئی مقامات پر بھی اپنے اکھاڑے قائم کر لیے۔ بظاہر ان کا مقصد یہ نظر آتا تھا کہ ہندو نوجوانوں کی جسمانی ورزشوں کے لیے یہ جمناسٹک کلب قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن در حقیقت ان اڈوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے بیاست کی ہندو اقلیت کو جنگی تربیت دے کر کیل کائے سے لیس کر دیا جائے۔

ادھر عوای سطح پر راشریہ سیوم سیوک نے اپنا کام شروع کیا، ادھر آل اٹھیا کا گرس کی قیادت نے شیخ عبداللہ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اس سیاسی م Mum کے سر غنہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو بنفس نہیں پیش پیش تھے۔ یہ تو غالباً وثوق سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کا گرس کے کیوپڑ دیوتا نے شیخ صاحب کے دل پر کیا کیا تیر چلائے، لیکن یہ بات سب جانتے ہیں کہ مسلم کانفرنس کی سات سالہ بے تاج بادشاہی

کے بعد ۱۹۳۹ء میں شیخ عبداللہ سیاست اسلامیہ کی ہمایہ کی چوٹی سے لڑک کر منہ کے بل گرے اور ہندو کا گرس کی جھوپی میں دھم سے آپڑے۔ زوال کے اس عمل میں ان کے چہرے پر بھی ہوئی نہایت خوبصورت اور دیدہ نیب ریش مبارک آنا فاناً غائب ہو گئی اور ان کے سر کی وجہ دھج ایک سرک رنگ کی ترکی ٹوپی بھی راستے میں کمیں گر کر کا گرس کی گنگا ماتا میں ڈوب گئی۔ مسلم کانفرنس سے رشتہ توڑ کر شیخ صاحب نے آل انڈیا کا گرس سے فیضان اور وجدان اور رہنمائی حاصل کر کے جموں و کشمیر نیشنل پارٹی کا ڈول ڈالا۔ یہ پارٹی شروع ہی سے آل انڈیا کا گرس کی داسی بنی رہی ہے۔ اس کے بر عکس چودہ ری غلام عباس کی قیادت میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے ہمیشہ پاکستان کے ساتھ غیر مشروط وفاداری سے ساتھ دیا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی اس کالپ کے بارے میں وقت فوقة طرح طرح کی قیاس آرائیاں اور افواہیں جنم لیتی رہی ہیں۔ اس زمانے میں ایک افواہ جو بیاست کے طول و عرض میں انتہائی شدت سے گردش کر رہی تھی، اس کا تعلق جموں و کشمیر کے وزیراعظم سر گوپال سوامی آئینگر سے تھا۔ یوں تو یہ حضرت انڈین سول سرسوں کے افر تھے لیکن در پردہ کا گرسیوں کے ساتھ بھی گری ساز باز رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد وہ بھارت کی کابینہ میں بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ مشورہ ہے کہ شیخ عبداللہ کو کا گرس کی جھوپی میں ڈالنے کے لیے وزیراعظم کی حیثیت سے انہوں نے انواع و اقسام کی ریشہ دوانیوں سے کام لیا۔ ان میں سے ایک افواہ یہ گرم تھی کہ کسی ہیر پھر سے انہوں نے شیخ صاحب کو دو کروڑ روپے کا جنگلات کا ٹھیکہ بھی دے دیا تھا۔ واللہ اعلم۔

بر صغیر میں جوں جوں حصول پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا گیا، بیاست میں بھی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے مسلم کانفرنس کا پله اسی رفتار سے بھاری ہوتا گیا۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی ۸۰ فیصد شتیں جیت لیں۔ مسلمانوں

کی سیاسی بیداری کا یہ حال دیکھ کر ڈوگرہ حکومت بد حواس ہو گئی اور انہوں نے فوری طور پر ریاست میں ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کر دیں۔ فقط راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کو ہر قسم کے جلسے کرنے اور جلوس نکالنے کی آزادی تھی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مسلم کانفرنس نے سیاسی پابندیوں کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کی تو اس کے تمام رہنماؤں اور بے شمار کارکنوں کو بغیر مقدمہ چلائے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کا فارمولہ منظور ہوا تو بر صیر کی ۵۶۲ ریاستوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جغرافیائی اور معاشریاتی حقوق کے پیش نظر اپنی آبادی کی خواہشات کے مطابق بھارت یا پاکستان سے الحاق کر لیں۔ ریاست جموں و کشمیر کی آبادی ۸۰ فیصد مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اس کی سرحدوں کے چھ سو میل مغربی پاکستان کے ساتھ مشترک تھے۔ ریاست کی واحد ریلوے لائن سیالکوٹ سے گزرتی تھی اور بیرونی دنیا کے ساتھ ڈاک اور تار کا نظام بھی مغربی پاکستان کے ذریعہ قائم تھا۔ ریاست کی دونوں پختہ سڑکیں راولپنڈی اور سیالکوٹ سے گزرتی تھیں اور کشمیر کی تمام درآمدات اور برآمدات کا راستہ بھی پاکستان سے وابستہ تھا۔ ان سب حقوق کے پیش نظر ریاست جموں و کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق لازمی طور پر ایک قدرتی اور منطقی فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مہاراجہ ہری سنگھ اور کانگریس لیڈروں کے ولی عزائم اس فیصلہ کے بالکل برعکس تھے۔ اپنے ان مذموم عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے لاڑ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مل کر سازشوں کا ایسا جال بنا جس کے پھندے میں مقبوضہ ریاست کے بے بس اور مظلوم باشندے آج تک بری طرح گرفتار ہیں۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کے فارمولے کا اعلان ہوتے ہی سب سے پہلے مہاتما گاندھی اور کانگرس کے صدر مسٹر جے بی کرپلانی فوراً کشمیر پہنچے اور مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ ساز باز کر کے اپنی سازشوں کے جال کی منصوبہ بندی کر آئے۔

پاکستان کے وجود میں آتے ہی مہاراجہ کشمیر نے یہ چال چلی کہ حکومت پاکستان کے

ساتھ ایک Standstill Agreement طے کر لیا، جس کی رو سے نیاست کے ڈاک، تار اور تجارتی کاروباری نظام کو برقرار رکھنے کے لیے پاکستان کی سرنشیں پر پہلے جیسی سوتیں بدستور برقرار رہیں گی۔ پاکستان نے اسے مہاراجہ کی خیر سکالی کا مظاہرہ سمجھا تا کہ الحق کا فیصلہ کرنے سے پہلے بیاست کے ذرائع رسائل و رسائل اور درآمدات، برآمدات میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔ لیکن مہاراجہ کی جانب سے یہ معاهدہ مخفی دھوکے کی ٹھی تھی۔ کیونکہ ساتھ ہی ساتھ اس نے ہندوستان کے ذریعہ جزل پوسٹ آفس لندن کو یہ ہدایات بھی جاری کر دیں کہ آئندہ بیاست جموں و کشمیر میں آنے والی سب ڈاک نئی ولی کی معرفت ارسال کی جائے۔ مہاراجہ کی منافقت میں لاڑ ماؤنٹ بیشن سمیت بھارتی حکومت کی سازشانہ شرکت یہ ایک بین ثبوت تھا۔

۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے بارے میں جب ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تو ضلع گورداسپور کی آبادی میں واضح مسلمان اکثریت کے باوجود اسے بغیر کوئی وجہ بتائے انتہائی شرانگیز بد نیت کے ساتھ بھارت کو دے گیا تھا۔ کیونکہ گورداسپور کے بغیر بھارت کو کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا موقع ہاتھ آ سکتا تھا، نہ راستہ مل سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اب ایسے تاریخی آثار و شواہد منکشف ہو رہے ہیں جن سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ لاڑ ماؤنٹ بیشن بذات خود اس سازش میں پوری طرح ملوث تھا۔ البتہ یہ بات فی الحال پر وہ راز میں ہے کہ ماؤنٹ بیشن نے ریڈ کلف کو اس کھلی بد دیانتی، اور نا انصافی کا مرتكب ہونے کے لیے کیا کیا حرbe اختیار کئے۔ ان حربوں میں بڑی بھارتی رشوت بھی بعد از قیاس نہیں۔

پاکستان کے ساتھ Standstill Agreement طے ہوتے ہی مہاراجہ ہری سنگھ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جموں کے صوبے میں پوری مسلمان آبادی کو موت کے گھاث اتار دیا جائے۔ اس مضم کی کمان مہاراجہ نے خود اپنے ہاتھ میں لے کر ڈوگرہ فونج، پولیس اور راشٹریہ سیوک سینگ کے دستوں کو جگہ جگہ خونخوار بھیڑیوں کی طرح مسلم رعایا

پر چھوڑ دیا۔ قتل و غارت، لوث مار، خواتین کی بے حرمتی اور جوان لڑکیوں کے اغوا کی جو قیامت برپا ہوئی، اسے الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں۔ اس شورش میں جو بے شمار پچیاں اغوا ہوئیں ان میں چودھری غلام عباس کی ایک چیتی بیٹی بھی شامل تھی۔ بے شمار مسلمانوں کو پناہ کا جھانسا دے کر بسو اور ٹرکوں میں سوار کیا گیا تا کہ انہیں سیا لکوٹ کی جانب پاکستان کی سرحد تک پہنچا دیا جائے لیکن راستے میں ڈوگہ پولیس کی گمراہی میں آرائیں ایس کے درندوں نے انہیں انتہائی بیدروی سے شہید کر ڈالا۔ صوبہ جموں کے پیشتر علاقے مسلمان آبادی کا صفائی کرنے کے بعد اب مہاراجہ نے مسلمانان پونچھ کی طرح اپنا سخ پھیرا۔

پونچھ کی آبادی میں ۹۵ فیصد مسلمان تھے۔ اس آبادی کا ایک کثیر حصہ ریٹارڈ فوجیوں پر مشتمل تھا، جو دوسری جنگ عظیم میں دنیا کے کئی محاذاوں پر داد شجاعت دے چکے تھے۔ صوبہ جموں کے مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں سن کر ان کا خون پہلے ہی جوش میں آیا ہوا تھا۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ گلگت میں مقامی مسلمانوں نے گلگت سکاؤٹس اور ریاستی فوج کے مسلمان عناصر کے ساتھ مل کر علم بغاوت بلند کر دیا ہے اور مہاراجہ کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ کر آزادی کا اعلان کرنے والے ہیں۔

اس پس منظر میں مہاراجہ کے بھیانہ عزائم کو بھانپ کر پونچھ کے غیور اور بہادر مسلمانوں نے بھی سر دھڑ کی بازی لگا کر پاکستان کے ساتھ الحاق کا عزم بالجسم کر لیا۔ سارے علاقوں میں ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ گونجئے لگا۔ ڈوگہ حکومت نے جگہ جگہ اپنی فوج اور پولیس کی تعداد بڑھا کر عوام الناس کو تشدد سے سکلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ۲۵

اگست ۱۹۴۷ء کے روز دھیر کوٹ کے قریب نیلابٹ نامی گاؤں میں الحاق پاکستان کے حق میں ایک جلسہ عام ہو رہا تھا۔ ڈوگہ فوج کے ایک دستے نے وہاں آ کر اس پر امن جلے پر بلا وجہ گولی چلا دی۔ اس ظالمانہ واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ دو روز بعد سردار عبدالقیوم خاں نے گوریلا مجاہدین کا ایک دستہ منظم کیا اور دھیر کوٹ میں ڈوگہ

پولیس اور فوج کے ایک کیپ پر حملہ کر کے اس کا صفائیا کر دیا۔

اپنی فوج کی اس نکست فاش پر مہاراجہ ہری سنگھ غیظ و غصب سے تملک کر دیوانہ ہو گیا۔ اس نے بیاست کے ہر حصے سے ڈوگہ فوج، پولیس، آر ایس ایس کے دستوں کو مجتمع کر کے اپنے خاص اخاص افراد کی سرکردگی میں پونچھ کے مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ان کو سب سے ضروری ہدایت یہ تھی کہ جتنے مسلمان مرد، عورتیں اور بچے ہے تھے ہو سکیں انہیں بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ باقیمانہ باغیوں کو کسی نہ کسی طرح پاکستان کی جانب دھکیل دھکال کر بیاست بدر کر دیا جائے۔ پونچھ کی آبادی کے قائل سدھن، عباسی، چب، راجپوت، دانیال اور گکھڑ وغیرہ درانی اور افغانی نسل سے تھے اور پاکستان کے کئی متحقہ اضلاع مثلاً سیالکوٹ، گجرات، جہلم اور راولپنڈی میں ان کی بیشتر رشتہ داریاں اور عزیز داریاں تھیں۔ ڈوگہ فوج اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے تیور دیکھ کر بہت سے مقامی مسلمانوں نے اپنی خواتین اور بچوں کو پاکستان میں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے ہاں بھیج دیا اور خود سر سے کفن باندھ کر ڈوگہ حکومت کے ساتھ جہاد کے لیے تیار ہو گئے۔

دھیر کوٹ میں سردار عبدالقیوم خاں نے بہادری کی جو مثال قائم کی تھی، اس کی تقلید میں اب جگہ جگہ مقامی گوریلا دستے منظم ہو گئے اور انہوں نے پے در پے ڈوگہ فوج کے پھرے چھڑا کر اپنی سرنیمیں کو ڈوگہ حکومت کے پنجہ استبداد سے آزاد کروانا شروع کر دیا۔ کپتان حسن خان اور سخنی دلیر نے اپنے اپنے گوریلا دستوں کے ساتھ دیایے جملم پر پھمن پتن پل پر معین ڈوگہ فوج پر حملہ کر دیا، اور کئی گھنٹے کی شدید دست بدست جنگ کے بعد پل کو صحیح سالم اپنے قبضے میں لے لیا۔ ڈوگہ فوج پسا ہو کر پلندری کی طرف بھاگی، تو کپتان حسن خان نے تعاقب کر کے اسے وہاں سے بھگا کر پونچھ شر کی جانب دھکیل دیا۔ پونچھ شر کے نزدیک تولی پور کے مقام پر ایک اور شدید معرکہ ہوا جس میں ڈوگہ فوج نے ایک بار پھر منہ کی کھائی۔ اس معرکہ میں کپتان حسن خان

نے بھی جام شادت نوش کیا۔ پھر منگ کا نام اب آزاد چن ہے۔ یہاں پر دیائے جملم پر واقع پل مجہدین کے قبضہ میں آنے کے بعد ان کا رابطہ کوئی کے راستے راولپنڈی کے ساتھ برداشت قائم ہو گیا۔

میر بوستان خان نے اپنے گوریلا دستے سے منگ کے مقام پر حملہ کر کے وہاں پر مقیم ڈوگرہ فوج کی کمپنی کو مار بھگایا۔ اس کے جواب میں راولا کوت کے ڈوگرہ کمانڈر نے سارے علاقے میں قتل عام کا حکم دے دیا، اور گاؤں گاؤں میں ایک ایک گھر کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ یہ آتش نہیں اس قدر شدید اور وسیع پیلانے پر تھی کہ اس کے شعلے پاکستان میں مری کے باشندوں کو بھی نظر آتے تھے۔ میر بوستان خان نے ہمت نہ ہاری اور اس کے مٹھی بھر مجہدین ڈوگرہ فوج کو قدم قدم پر پسا ہونے پر مجبور کرتے رہے۔

کیپٹن فیروز خان نے اپنے مجہدین کے گروپ کی مدد سے تراڑ خیل، دیوی گلی، اور ہجیرا کو آزاد کرایا پونچھہ شر کا محاصرہ کر لیا جو کم و بیش ایک برس تک جاری رہا۔ میر نصر اللہ نے کچھ سابقہ فوجیوں کو منظم کر کے راولا کوت میں ڈوگرہ فوج کی مضبوط چھاؤنی پر حملہ کیا، اور ادھر ادھر دیہات میں بکھری ہوئی پلنٹوں کو گھیر گھار کر ان کا مکمل صفائی کر دیا۔ مجہدین کی اس پیش رفت کی تاب نہ لاء کر ڈوگرہ فوج راولا کوت سے بھاگ اٹھی، اور پونچھہ شر میں جا کر پناہ گزین ہو گئی۔

ان جنگی کارروائیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ پونچھہ شر اور اس کے گرد و نواح کا تھوڑا سا رقبہ چھوڑ کر اب باقی سارا علاقہ آزاد تھا۔ یہ آزادی مٹھی بھر گوریلا لیڈروں نے اپنے طور پر مقامی مجہدین کو منظم کر کے جسم و جان کی بے مثال قربانیاں دے کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل کی تھیں۔ ان کے پاس نہ کوئی خزانہ تھا جس سے لڑنے والوں کو تنخواہیں ادا کی جاتیں۔ اور نہ ان کے پاس کوئی رسیدگاہیں تھیں جہاں سے کھانے پینے اور گولہ بارود کا سامان باقاعدگی سے مجاہذ گنگ پر پہنچایا جا سکتا۔ ان کے پاس کوئی فوجی

جی اسچ کیوں بھی نہیں تھا جہاں سے سپاہیوں کی وردی، آلات حرب اور مرکزی جنگی حکمت عملی کے متعلق ہدایات جاری کی جاسکتیں۔ گوریلا لیڈروں اور مجہدین فقط ایک جذبے سے سرشار تھے۔ ان کے دلوں میں ایک بے لوث اور سچا جذبہ جہاد موجز نہ تھا۔ وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑے اور ٹوٹے پھٹوٹے جوتے پین کر اپنے سے کئی گنا نیا وہ مضبوط اور مسلح دشمن سے دن رات بے جگری سے لڑتے تھے۔ باد و باراں کے طوفان میں وہ کئی کئی روز اپنی خندقوں میں بھوکے پیاسے پڑے رہتے تھے۔ ان کے معصوم بچے یا ان کی ماں میں، بہنیں اور بیویاں اپنے سروں پر راشن لاد کر کئی کئی میل پاپیاہ چلتی تھیں، اور دشمن کی نظر بچا کر اپنے لڑنے والے مجہدوں کو رسد کا سامان پہنچا دیا کرتی تھیں۔ برفاری کے دنوں میں پاؤں میں صحیح جوتے نہ ہونے کی وجہ سے کئی مجہدوں اور رسد لے کر آنے جانے والے بچوں اور خواتین کے پاؤں متورم ہو کر لمباہن ہو جاتے تھے، لیکن ان کے دل میں بھڑکنے والا جہاد کا شعلہ کبھی مدھم نہ پڑتا تھا۔

جب پونچھ کا بیشتر علاقہ آزاد ہو کر ڈوگرہ حکومت کی لعنت سے پاک ہو گیا تو رفتہ رفتہ چاروں طرف پھیلے ہوئے گوریلا لیڈروں اور مجہدین کا بھی آپس میں رابطہ ہوتا گیا اور ۱۹۴۷ء کے ماہ اکتوبر کے وسط میں انہوں نے باہمی تعاون سے ایک مرکزی جنگی کونسل قائم کر لی۔ اس کے بعد آزاد شدہ علاقے کا نظم و نتیجہ سنبھالنے کے لیے ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جموں و کشمیر حکومت کا قیام عمل میں آیا، جس کے پہلے صدر سردار محمد ابراہیم خان تھے۔ اس حکومت کے قائم ہونے کے بعد مجہدین آزادی نے باقاعدہ منظم ہو کر ڈوگرہ حکومت کے رہے سے اقتدار کا قلع قلع کرنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دس ہزار مرلیع میل سے نیا وہ رقبہ آزاد کر لیا۔ ان میں وہ معرکے خاص طور پر نمایاں ہیں جن میں کامیاب ہو کر بھمبر، میر پور، کوٹلی، منیڈھر، راجوری اور نوشہرہ کو آزادی نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ پونچھ شر کا طویل محاصرہ بھی ایک یادگار واقعہ ہے۔ ان تمام معرکوں میں آزاد کشمیر کے مجہدین نے ڈوگرہ فوج کے علاوہ ہندوستانی افواج کے ساتھ بھی سر

توڑ مقابله کیا۔ کیونکہ بیاست کا بھارت کے ساتھ الحق ہوتے ہی بھارتی مسلح افواج نے بھی فوراً کشمیر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا اور اب بر سر عام مجہدین آزادی کے خلاف میدان جنگ میں اتر آئی تھیں۔

پونچھ میں اپنی حکمرانی کی بساط اللہ دیکھ کر مہاراجہ ہری سنگھ کو اب جہلم وادی کی فلک دامن گیر ہوئی، جس کی آبادی ۹۵ فیصد مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ان میں شیخ بھی تھے، مغل بھی اور پٹھان بھی۔ پٹھانوں میں کمکی خیل آفریدیوں، یوسف زیوں اور مچھی پوریوں کا تناسب خاص طور پر نمایاں تھا۔ یہ لوگ پہلے پہل درانیوں کے ساتھ کشمیر آئے تھے اور بعد میں یہیں پر آباد ہو گئے تھے۔ البتہ شمال مغربی صوبہ سرحد میں ان کے اپنے قبیلوں کے ساتھ گھرے مراسم اور رشتہ داریاں بدستور قائم رہیں۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے مسلمانوں کی اس کثیر آبادی کو قابو میں رکھنے کے لیے سری نگر کے علاوہ وادی کے دوسرے اہم شرودیں میں بھی ڈوگہ فوج اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے بڑے بڑے گروہ جمع کر رکھے تھے۔ جموں اور پونچھ کے واقعات کی خبریں سن کر وادی کے مسلمان بھی اپنے درندہ صفت حکمران کے عزائم سے بے خبر نہ تھے۔ جیسے جیسے مختلف مقامات پر ڈوگہ فوج اور آر ایس ایس کے مظالم مسلم رعایا پر بڑھتے گئے، اسی رفتار سے مظفر آباد اور ٹیوال کے علاوہ وادی کے بہت سے باشندوں نے بھی اپنے بال بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے پاکستان کے سرحدی اور قبائلی علاقوں میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے پاس بھیجا شروع کر دیا۔ ان لوگوں کی آمد کے ساتھ بیاست میں مسلمانوں پر جو قیامت بپا تھی، اس کا چرچا بھی عام ہو گیا۔ ڈوگروں کے مظالم کی دلدوز تفصیلات پھیلتے ہی پاکستان اور افغانستان کے قبائلی علاقوں میں غم اور غصے کی آگ لگ گئی اور پٹھان قبائلیوں کے لشکروں کے مظلوم بھائیوں کی امداد کے لیے جو حق در جو حق ایبٹ آباد کی راہ سے بسوئے کشمیر اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ قبائلی لشکر نہ کسی تنظیم میں مسلک تھے اور نہ ہی ان کی رہنمائی اور خبرگیری کے لیے کسی قسم کا اداہ موجود تھا۔ جمال کہیں سے وہ گزرتے تھے، عوام الناس حیرت انگیز کشاہ دل سے ان کی آؤ بھگت کرتے تھے، خوراک مہیا کرتے تھے اور جگہ جگہ ٹرک، تانگے اور بیل گاڑیاں مفت نذر کرتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر پاپیاہ مارچ کرتے تھے، یا بسوں اور ریل گاڑیوں کی چھتوں پر بیٹھ کر سفر کرتے تھے اور بعض بعض مقامات پر دیباوں کو تیر کر یا بکری کی کھال کے بننے ہوئے مشکیزے کا سارا لے کر عبور کر لیتے تھے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء تک ایبٹ آباد اور مظفر آباد کے درمیان بتراسی کے جنگل میں ہزارہا محسودی، وزیری، آفریدی اور محمد قبائلیوں کا ایک عظیم الشان لشکر جمع ہو گیا۔ وہاں پر اس لشکر کی نگہداشت مردان کے خان خوشدل خان نے بڑی محنت اور فیاضی سے کی، اور ہندوستانی فوج کے ایک ریناڑڈ میجر خورشید انور نے اس لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس زمانے میں میجر خورشید انور پاکستان مسلم لیگ کی نیشنل گارڈ کے کمانڈر بھی تھے۔

بیاست کے اندر لوہار گلی اور رام کوٹ وغیرہ میں جو ڈوگرہ فوج معین تھی، اس میں چند مسلمان افسر بھی موجود تھے۔ ان میں کیپن شیر خان کا نام سر فرست تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر میجر خورشید انور سے خفیہ رابطہ قائم کیا اور مظفر آباد سمیت دیائے کرش گنگا، دو میل اور کوہاں کے پلوں کو صحیح سالم فتح کر کے اپنے قبضہ میں لینے کی حکمت عملی تیار کر لی۔ بیاستی فوج کے ایک ریناڑڈ افسر میجر ایم اسلام خان، ایم سی بھی اس منصوبہ بندی میں شامل ہو گئے۔ وادی جملم کے مقامی باشندوں نے بھی اندر ہی اندر اپنی صفوں کو منظم کرنا شروع کر لیا۔ ”مجاہدین ہوم فرنٹ“ کے نام سے ایک خفیہ تنظیم بھی قائم ہو گئی۔ بہت سے رضا کار گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کر کے ایک نیم فوجی تنظیم میں شامل ہو گئے جس کا نام حیدری کالم تھا۔ ثناء اللہ، محمد اقبال اور عبدالرشید نامی چند رضا کاروں نے کچھ خواتین کو اپنے ساتھ ملا کر سری نگر شر میں کچھ اسلحہ تقسیم کرنے

کی کوشش بھی کی۔ لیکن بد قسمتی سے ان میں سے کئی ایک گرفتار ہو کر جیل میں ڈال دیئے گئے۔

اس قسم کے ابتدائی اقدامات کسی حد تک مکمل ہو چکے، تو ۲۰ اکتوبر کی رات کو مجاہدین نے پیش قدمی شروع کی اور اگلے دو روز کے دوران ڈوگہ فوج اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے دستوں کو ٹکست دے کر کوہاں، دو میل اور مظفر آباد کو فتح کر لیا۔ مظفر آباد سے آگے دس میل دور گڑھی دوپٹہ کے مقام پر ڈوگہ فوج کو ایک اور ٹکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد اوڑی، باہہ مولا اور سری گھر تک راستہ صاف تھا۔ ۲۳ اکتوبر کو مجاہدین نے مسونہ پر قبضہ کر کے وہ پاور ہاؤس اڑا دیا جس سے سری گھر شر کو بھلی فراہم ہوتی تھی۔ رات کے نوبجے جب اچانک سارا شر گھپ انہیں میں ڈوب گیا، اس وقت مہاراجہ ہری سنگ اپنے راج محل میں دسرہ کا دبار لگائے بیٹھا تھا۔

مسونہ سے مجاہدین کا لشکر باہہ مولا پہنچا، تو دیکھا کہ ڈوگہ فوج اور آر ایس ایس کے درندے اس شر کو اپنے ہاتھوں تاخت و تاراج کر کے پہلے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ سری گھر کی طرف مجاہدین کی یلغار کی خبر پا کر انہوں نے بے شمار نہتے اور معصوم مسلمان شریوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ ان کے گھر لوٹ کر نذر آتش کر دیئے تھے اور ایک عیسائی خانقاہ کے مکینوں اور اس کے ساتھ ملحق ہسپتال کے مریضوں تک کو اپنی بربریت کی سان پر چڑھانے سے گریز نہ کیا تھا۔ باہہ مولا کا شر ملبے کا ڈھیر بنا پڑا تھا۔ وہاں سے سری گھر فقط ۳۵ میل دور تھا۔ آگے کی جانب سڑک بالکل صاف تھی۔ دشمن کی طرف سے اب کسی مقام پر کسی قسم کی مزاحمت کا شائیبہ تک موجود نہ تھا۔ مجاہدین کا لشکر فتح و نصرت کے ڈنگے بجا تا باہہ مولا تک آ پہنچا تھا۔ اب فقط چند گھنٹوں میں وہ آگے بڑھ کر سری گھر کے ہوائی اڈے کو قبضے میں لے کر اس مظلوم بیاست کے مسلمانوں کی تاریخ کا دھارا بدل سکتا تھا۔

قسم کی خوبی دیکھنے نوٹی کہاں کمند  
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام وہ گیا  
URDU4U.COM

مہاراجہ کے دسرہ دربار کے عین درمیان مہونہ کا بھلی گھر مجہدین کے ہاتھوں شکستہ ہو کر جب سری نگر کا شر تاریکی میں ڈوب گیا تو ڈوگہ نسل کے ہندو راجپوت ہری سنگھ کو آٹا فلانا اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اپنے محلات کا جس قدر بیش قیمت سامان وہ آٹھ دس ٹرکوں پر لاد سکتا تھا، انہیں ساتھ لے کر وہ راتوں رات بانہال روڈ کے راستے جموں کی طرف فرار ہو گیا۔ راستے میں جگہ جگہ رک کر اس نے اپنی ڈوگہ رعایا کو خبردار کیا کہ راج ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اس لیے وہ بیاست کی سرنیں پر مسلمانوں کی بغاوت کا سر کچلنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے پر کمر بستہ ہو جائیں۔ جموں کا شر اور اس کے مضائقات مسلمان آبادی سے یکسر خالی ہو چکے تھے۔ اس مکمل ہندو ماہول کے حصار میں پہنچتے ہی بھگوڑے مہاراجہ نے بھارت سے درخواست کی۔ اس کے جواب میں سردار ولہ بھائی پیل اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا منظور نظر مسٹر وی پی مینہن ہوائی جہاز سے پرواز کر کے جموں پہنچا اور بھارتی حکومت کی جانب سے مہاراجہ ہری سنگھ کو دھمکی دی کہ اگر اس نے فوری طور پر اپنی بیاست کا ہندوستان سے الخاق نہ کیا تو اسے کسی قسم کی کوئی مدد نہ دی جائے گی۔ بزدل مہاراجہ نے بلا چوں و چراں گھٹنے نیک کر بھارت کے ساتھ الخاق کی درخواست پر دستخط کر دیئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جن الفاظ میں اس درخواست کا منظور کیا، وہ درج ذیل ہیں۔

My Dear Maharaja Sahib.

You Highness letter dated ۲۰ October has been delivered to me by Mr. V.P.Menon. In the special circumstances mentioned by Your Highness my Government has decided to accept the accession of Kashmir State to the Dominion of India. In consistence with their policy that in the case of any state where the issue of accession has been the subject of dispute, the question of accession should be

decided in accordance with the whishes of the people of the state, it is my Government's wish that as soon as law and order have been restored in Kashmir and her soil cleared of the invader, the question of the state's accession should be decided by a reference to the people. Meanwhile, in response to Your Highness appeal for military aid, action has been taken today to send troops of the Indian Army to help your own forces to defend your territory and to protect the lives, property and honour of your people.

My Government and I note with satisfaction that Your Highness has decided to invite Sheikh Abdullah to form an interim Government to work with your Prime Minister.

I remain

Your sincerely,

Mountbatten of Burma

New Delhi,

۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء

مندرجہ بالا خط پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دستخط کی سیاہی ابھی خلک بھی نہ ہوئی تھی کہ اسی روز صبح نوبجے سے بھارتی ہوائی جہازوں نے ہندوستانی فوج کے دستے سری گنگ کے ہوائی اڈے پر آتا رہا شروع کر دیئے۔ ایک ایک دن میں پچاس پچاس پروازیں یہ فرض ادا کرتی تھیں۔ ساتھ ہی گرداسپور کے راستے بھارتی فوج کی کثیر تعداد نے بھی صوبہ جموں میں مارچ کرنا شروع کر دیا۔ بھارت نے یہ جنگی تیابیاں پہلے ہی سے مکمل کر رکھی تھیں۔ الحاق کے متعلق مہاراجہ کی درخواست محفوظ ایک بہانہ تھی۔ اس بہانہ کے باقاعدے آتے ہی بھارت نے اپنے جارحانہ عزم پر فی الفور عملدرآمد شروع کر دیا۔

سری گنگ کے ہوائی اڈے پر بھارتی افواج، اسلحہ اور ٹینک انڈین ائیر فورس کے جہازوں سے برآمد ہوتے ہی آزادی کشمیر کی جنگ کا پانسہ اچانک لپٹ گیا۔ مجاہدین کے لشکر کا نیا حصہ دو روز سے خواہ مخواہ بانہ مولا میں اٹکا ہوا تھا۔ اگر اس لشکر کا تھوڑا سا حصہ بھی یلغار کر کے سری گنگ ائیر پورٹ پر قابض ہو جاتا تو بھارتی فوج وادی کشمیر پر تسلط جملے میں کسی طرح بھی کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے بر عکس مجاہدین کی

ہمت نوٹ گئی، ان میں ایک طرح کی بھگدار مج گئی اور وہ انتہائی غیر منظم طور پر اپنے علاقوں کی طرف واپس لوٹنا شروع ہو گئے۔ یہ صورت حال کیوں اور کیسے پیدا ہوئی؟ اس کا کوئی حقیقی جواب مجھے نہیں مل سکا۔ اس بارے میں طرح طرح کے مفروضے، امکانات اور قیاس آراءیاں سننے میں آتی ہیں۔

ایک نظریہ تو یہ مشہور ہے کہ لشکر کے کمانڈر میجر خورشید انور نے مجاہدین کو باہہ مولا میں اس وجہ سے روکے رکھا کہ سری گنگر پچنے سے پہلے وہ کشمیر کے سیاسی مستقبل میں اپنی ذاتی پوزیشن کو صاف طور پر متعین اور مستحکم کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے سری گنگر کی جانب مجاہدین کی پیش قدمی معرض التوا میں پڑی رہی۔ دوسرا گمان یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کی نیشنل پارٹی کے ایجنسیوں کے علاوہ ہندوستان کے چھوٹے ہوئے بہت سے جاسوس بھی ففتھہ کالم کا لبادہ اوڑھ کر حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے طرح طرح کے نفیاتی حربوں سے کام لے کر مجاہدین کی صفوں میں اس قسم کی افواہیں پھیلا دیں کہ ہندوستان کی منظم فوج کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان جنگ میں اتر آئی ہے۔ ہندوستان کے بمباء اور لڑاکا طیارے بھی مجاہدین کو اپنا نشانہ بنانے کے لیے پرتوں رہے ہیں اور ان کی پسپائی کے راستے بھی رفتہ رفتہ بھارتی فوج کے قبضے میں آتے جا رہے ہیں۔ قبائل لشکر دست بدست گوریلا جنگ لڑنے کے غازی تو ضرور تھے۔ لیکن ففتھہ کالم کے ساتھ اس طرح کی نفیاتی جنگ میں مقابلہ کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے بے بی اور کمپرسی کے عالم میں وہ بد نظمی اور انتشار کا شکار ہو کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

تمیرا قیاس یہ ہے کہ مقبول شیروانی نام کے ایک نیشنل کانفرنسی سیاست دان نے مجاہدین کے ایک لشکر کی باہہ مولا تک رہنمائی کرنے کے بہانے اسے ایسے طویل اور پچیدہ راستوں پر ڈال دیا کہ وہ دو روز تک غلط اور دشوار گزار گھائیوں میں ہی بھکلتے رہے۔ باقیمانہ لشکر باہہ مولا میں بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ اس طرح سری گنگر کی جانب بڑھنے کا

انتہائی قیمتی اور فیصلہ کن وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ باہم مولا پنج کر جب مقبول شیر وانی کی غداری کا راز فاش ہوا تو مجاهدین نے اسے وہیں پر ڈالنے کر ڈالا۔

چوتھی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بھارتی ففتہ کالم کے علاوہ قادیانیوں کے ایک منظم گروہ نے بھی اس موقع پر مسلمانوں کے ساتھ غداری کو عملی جامہ پہنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اصلی آزاد کشمیر گورنمنٹ تو ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے روز قائم ہوئی تھی۔ لیکن پونچھ میں جماں کا رنگ اور سخ بھانپ کر غلام نبی گلکار نامی ایک کشمیری قادیانی نے میں روز قبل ہی ۳ اکتوبر کو اپنی صدارت میں آزاد جمورویہ کشمیر کے قیام کا اعلان کر دیا تھا۔ غالباً یہ اعلان راولپنڈی صدر کے ایک ہوٹل ”ڈان“ میں بیٹھ کر کیا گیا تھا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مسٹر گلکار نے اپنی تیرہ رکنی کابینہ بھی منتخب کر لی تھی، جو زیادہ تر ایسے افراد پر مشتمل تھی جن کا تعلق قادیانی مذہب سے تھا۔ اس اعلان کے دو روز بعد ۶ اکتوبر کو گلکار مظفر آباد کی راہ سے سری نگر میں اس کی حرکات و سکنات عام طور پر پرده راز میں ہیں لیکن باور کیا جاتا ہے کہ باہم مولا سے سری نگر کی جانب مجاهدین کی پیش قدی سے قادیانیوں کے اپنے منصوبے خاک میں مل گئے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہ جنت ارضی بلا شرکت غیرے قادیانیوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ پاکستان جانے والی ہے تو انہوں نے بھی ففتہ کالم کا روپ دھار کر اس امکان کو ملیا میٹ کر دیا۔

میرے خیال میں یہ سب اندازے اور قیاس آرایاں اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی حد تک حقائق پر مبنی ہیں۔ کشمیر کے محاذ سے مجاهدین کی غیر متوقع، بے محل اور بے وقت پسپائی ان سب وجوہات کا اجتماعی نتیجہ تھی۔

جس مجرمانہ مکاری، دعا، فریب اور سازشانہ جارحیت کے ذریعے بھارت نے کشمیر پر اپنا قبضہ جا لیا تھا، اس کی حقیقت ساری دنیا پر اظہر من الشمس تھی۔ اپنی اپنی گھناؤنی کارروائیوں

پر پردہ ڈالنے کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو نے بین الاقوامی سطح پر بانگ ول رٹ لگانی شروع کر دی کہ بھارت فیصلہ جموں و کشمیر کے باشندوں کی آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری (Plebiscite) کے ذریعہ کروایا جائے گا۔

بھارتی وزیراعظم کے اس نویت کے بے شمار اعلانات کے انبار میں سے میں نے یہاں پر صرف چند ایک کا انتخاب کر کے درج کیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان میں سے ایک بیان پر ایک اعلان بھی سچائی، خلوص، ویانتداری اور نیک نیت پر منی نہ تھا۔ یہ ساری لفاظی پر فریب وعدوں کی نمائش تھی جس کے ذریعہ اقوام عالم کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنا او سیدھا کرنا تھا۔ راج نیت میں پنڈت جی اپنے ما گرو چانکیہ کے نہایت کامیاب چیلے تھے۔ ایک طرف وہ سلامتی کونسل کی بنیادی قرار دادوں کو برضاء و رغبت قبول کئے بیٹھے تھے جن کی رو سے انہوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ کشمیر سے فریقین کی مسلح افواج کے انخلاء کے بعد الحاق کا مسئلہ ایک آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعہ طے ہو گا، جس کا بندوبست یو این او کا متعین کردہ کرے گا۔ لیکن دوسری جانب جنگ بندی کے فوراً بھارت کی حکومت نے ان قرار دادوں پر عملدرآمد میں طرح طرح کے روڑے الکٹانا شروع کر دیئے تھے۔ جوں جوں کشمیر پر بھارت کا قبضہ مستحکم ہوتا گیا، اسی رفتار سے وزیراعظم جواہر لال نہرو کی وعدہ خلافیوں، بے وفاویوں اور فریب کاریوں کا راز بھی طشت از بام ہوتا چلا گیا۔ اس سلسلے میں پنڈت جی کی کلابازیاں کی فرست نہایت طویل ہے۔ محض نمونہ کے طور پر ان کی مختصر سی تفصیل درج ذیل ہے۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں یو این او کے کمیشن (U.N.C.I.P.) نے ایک مینگ اس غرض سے منعقد کی کہ سلامتی کونسل کی قرار داد کے مطابق پاکستانی اور بھارتی افواج کو کشمیر سے واپس بلانے کا پروگرام طے کیا جائے۔ پاکستان نے اپنا پروگرام پیش کر دیا۔ ہندوستان ٹال

مثول کر کے اپنی فوجیں بیاست کی حدود سے باہر نکلنے سے مکر گیا۔ اسی برس اگست میں یو این او کے کمیشن نے یہ تجویز پیش کی کہ کشمیر سے مسلح افواج کے انخلاء کا فیصلہ ایک ثالث کے ذریعہ طے کروایا جائے۔ ایڈمیرل نیمٹز (Admiral Nimitz) استصواب رائے کے ناظم (Plebiscite Administrator) نامزد ہو چکے تھے۔ کمیشن کی تجویز تھی کہ ثالثی کا فریضہ بھی انہی کو سونپ دیا جائے۔ یہ تجویز اتنی معقول تھی کہ امریکہ کے صدر ٹرمین اور برطانیہ کے وزیر اعظم ایلی نے بھی اعلانیہ طور پر سفارش کی کہ دونوں فرقے اسے مان لیں۔ پاکستان نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن بھارت نے اسے مسترد کر دیا۔

اس ناکامی کے بعد سلامتی کونسل نے اپنے اس ماہ کے صدر (دسمبر ۱۹۴۹ء) کو یہ اختیار دیا کہ وہ فریقین کے ساتھ گفت و شنید کے ذریعہ موجودہ بحران کا کوئی حل نکالیں۔ ان کا اسم گرامی جزل میکنائن تھا اور وہ کینیڈا کے رہنے والے تھے۔ کافی افہام و تفہیم اور سچ و بچار کے بعد انہوں نے کچھ تجاویز مرتب کیں۔ پاکستان نے ان تجاویز کو قبول کر لیا۔ لیکن بھارت نے میں بخ نکال کر ان میں تراجم کی ایسی بھرمار کی کہ وہ عملی طور پر مسترد ہو کر رہ گئیں۔

جزل میکنائن کے بعد سلامتی کونسل نے سر اون ڈکسن کو اسی مقصد کے لیے میدان عمل میں آتا رہا۔ انہوں نے بھی حالات کا پورا پورا جائزہ لے کر بہت سی تجاویز پیش کیں۔ پاکستان حسب معمول مان گیا، لیکن بھارت بدستور اپنی ضد پر اڑا رہا۔

اب سر اون ڈکسن کی جگہ ڈاکٹر فریک پی گراہم نے سنبھالی۔ سلامتی کونسل نے ایک بار پھر اپیل کی کہ استصواب رائے کی راہ ہموار کرنے کے لیے متنازعہ امور پر دونوں فرقے ثالثی فیصلہ قبول کر لیں۔ بین الاقوای انصاف کی عدالت کا صدر ٹالشوں کو مقرر کرنے کا مجاز ہو گا۔ پاکستان نے سلامتی کونسل کی یہ تجویز منظور کر لی۔ بھارت نے اسے مسترد کر دیا۔

۱۹۵۸ء کے درمیان ڈاکٹر گراہم نے ہر طرح کے مکمل فارمولوں کی بنیاد پر سلامتی کو نسل کو چھپ رپورٹ میں پیش کیں۔ اس کے تقریباً ہر فارمولہ کو پاکستان منظور اور بھارت نامنظور کرتا رہا۔ ڈاکٹر گراہم کی پہلی رپورٹ میں جو تجویز پیش کی گئی تھیں۔ ان کو سلامتی کو نسل کی تائید بھی حاصل تھی۔ اسی لیے کو نسل نے ان تجویز کو ایک قرارداد کی صورت میں بھی منظور کر لیا تھا۔ یہ قرارداد ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو منظور ہوئی تھی، لیکن بھارت نے اسے قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔

ڈاکٹر گراہم کی پانچویں رپورٹ کے بعد سلامتی کو نسل نے اپنے صدر اور سویڈن کے سفیر گنار یارنگ کو اختیار دیا کہ وہ اس تعطل میں دخل دے کر اسے توڑنے کی کوشش کریں۔ ہندوستان کی نازک مزاجی کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے ٹالشی کا لفظ استعمال کئے بغیر اسی کے لگ بھگ چند نہایت معقول تجویز پیش کیں۔ پاکستان نے انہیں تسلیم کر لیا، لیکن بھارت نے نامنظور کر دیا۔

اس ناکامی کے بعد دسمبر ۱۹۵۷ء میں سلامتی کو نسل نے دوبارہ ڈاکٹر فریلک گراہم کو اپنا مشن سنبھالنے کی پیش کش کی۔ اس بار انہوں نے پانچ نکات پر مبنی ایک نہایت منصفانہ، معتدل اور واجبی تجویز مرتب کی۔ پاکستان نے اس کے پانچوں نکات کو خوش ملی سے تسلیم کر لیا۔ لیکن بھارت نے اسے مکمل طور پر مسترد کر دیا۔

ڈاکٹر گراہم نے اپنی آخری اور چھٹی رپورٹ ۱۹۵۸ء میں پیش کی تھی لیکن اس پر غور کرنے کے لیے سلامتی کو نسل کو چار برس بعد اپریل ۱۹۶۲ء میں فرصت ملی۔ غالباً اس وقت تک بین الاقوامی سطح پر کشمیر کا معاملہ کافی ٹھہٹا پڑ چکا تھا۔ چنانچہ سلامتی کو نسل میں کسی خاص گرجوٹی کا مظاہرہ کئے بغیر آئر لینڈ کی جانب سے ایک نہایت ہلکی اور دھیمی سی قرارداد پاس ہوئی جس میں فریقین سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سلامتی کو نسل کی سابقہ قراردادوں کی روشنی میں باہمی افہام و تفہیم سے اس قضیے کو نپانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ لیکن یہ کمزور اور بے اثر سی قرارداد بھی کسی کام نہ آسکی کیونکہ

سوویت روس نے اسے ویٹو کر دیا۔ یوں بھی ابتدا ہی سے سوویت یونین نے کشمیر کے بارے میں کسی قرارداد پر نفی یا اثبات میں ووٹ دالنے سے ہمیشہ احتراز بردا تھا۔

۱۹۶۵ء تک پچھلے ۱۸ سال کے دورانِ سلامتی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ ۱۳۳ بار زیر بحث آپنکا ہے۔ کبھی بھارت کی درخواست پر، کبھی پاکستان کی تحریک پر۔ اب کوئی کس منہ سے کہہ سکتا ہے کہ یہ مسئلہ بھارت کا اندروںی معاملہ ہے؟ سوویت یونین جیسی ایک عظیم پر پاور اس مسئلہ کو بھارت کے اندروںی معاملات میں دخل اندازی کا نام دے کر اپنا ویٹو استعمال کرنے پر اپنے ضمیر کو کس طرح آمادہ کر سکتی ہے؟ ان پریشان کن اور حیران کون سوالات کے جواب چاکریہ اور کوئیہ کے شاستروں میں ہوں تو ہوں لیکن مہذب اور شائستہ اقوام کی تواریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکیں گے۔

سلامتی کونسل کی میں الاقوامی اسٹیج پر بھارت نے جو ڈرامہ رچا رکھا تھا، اس کی کچھ جھلکیاں تو مختصر آ بیان ہو چکیں۔ لیکن خود مقبوضہ کشمیر کے اندر جو ناٹک کھیلا جا رہا تھا اس کی داستان الگ ہے۔ اس المتن میں شیخ عبداللہ کا اپنا کردار بھی گرگٹ کی طرح بار بار رنگ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔

کشمیر کا مسئلہ جب پہلے پہلے میں الاقوامی سطح پر اٹھایا گیا تھا تو بھارتی وفد کے ساتھ شیخ عبداللہ بھی یو این او گئے تھے۔ پاکستان وفد کے ہمراہ چند ایسے افراد بھی تھے جن کے شیخ صاحب کے ساتھ کسی قدر دریہنہ اور گرے تعلقات تھے۔ ان میں سے کسی نے شیخ صاحب کو پاکستان کے موقف کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، تو وہ طیش میں آ گئے اور انتہائی غرور اور تکبر سے بولے۔ ”بھارت کے ساتھ کشمیر کا الحاق قطعی اور اٹل ہے۔ اب تو خدا بھی خود آ کر اسے توڑنا چاہے، تو یہ نہیں ٹوٹ سکتا۔“ (نوعز باللہ) یہ قصہ مجھے ابوالاثر حفیظ جالندھری نے سنایا تھا، جو اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے۔ اپنے اس دعوے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شیخ عبداللہ نے پنڈت نہرو کے زر خرید

غلام کا روپ دھار کر طرح طرح کے پاپڑ بیلے۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں بھارت نے اپنے آئین میں ایسی ترمیم کر ڈالیں جس کی رو سے ہندوستان کو مقبوضہ کشمیر میں بھی اپنی مرضی کے قوانین نافذ کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ پاکستان کے طوٹی نے حسب توفیق یو این او کے نقار خانے میں اپنی آواز انھائی، لیکن بے سوو۔

اس اقدام کے ایک برس بعد بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں ایک آئین ساز اسمبلی کا سوانح رچا کر اس سے بیاست کے الحاق پر تصدیق کا انگوٹھا لگوانے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ اس اسمبلی کی حیثیت کے بارے میں سلامتی کونسل نے ایک قرار داد کے ذریعہ پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ اسے بیاست کے الحاق کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ فیصلہ لازمی طور پر انہی قرار دادوں کے مطابق کیا جا سکتا ہے جنہیں یو این او بھارت اور پاکستان کی منظوری حاصل ہے۔ اس موقع پر سلامتی کونسل میں بھارتی نمائندہ نے بر سر عام اور کھلے بندوں میں الاقوامی رائے عامہ کو یہ یقین دہانی کرائی کہ مقبوضہ کشمیر میں قائم ہونے والی آئین ساز اسمبلی کا ان معاملات سے ہرگز کوئی واسطہ نہ ہو گا جن کا فیصلہ سلامتی کونسل کے دائیہ اختیار میں ہے۔ بھارتی نمائندہ نے واضح طور پر یہ بھی کہا کہ یہ اسمبلی الحاق کے مسئلہ پر اظہار رائے تو کر سکے گی لیکن اسے کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا بالکل کوئی اختیار نہ ہو گا۔ اس وعدہ وعید کے بعد مقبوضہ کشمیر میں اس نام نہاد آئین ساز اسمبلی کے لیے انتخابات ہوئے، جو سراسر چالبازی، دھاندی اور فریب کا دھنہ تھے۔ ان کے نتیجہ میں شیخ عبداللہ کی جماعت نے تمام کی تمام ۷۵ نشیطین بلا مقابلہ جیت لیں۔ انتخابات کے تقریباً دس ماہ بعد جولائی ۱۹۵۲ء میں شیخ عبداللہ نے اس منہوس اور شرمناک دستاویز پر دستخط کر دیئے جو ”معاہدہ دہلی“ کے نام سے موسم ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے بیاست کا پورا وجود مکمل طور پر بھارتی حکومت کے زیر نگئیں آگیا۔ ایک سو چھ برس قبل انگریزوں نے اس بہشت ارضی کو ”معاہدہ امر تر“ کے ذریعہ مبلغ ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپیہ کے عوض گلاب سنگھ ڈوگہ کے ہاتھ فروخت

کر ڈالا تھا۔ اب ۱۹۵۲ء میں شیخ عبداللہ نے ”معاہدہ ولی“ کے نام پر اس سرنیشن کو پنڈت جواہر لال نہرو کے قدموں میں فقط اپنی کرسی کے عوض ڈال دیا۔ پنڈت جی کو یہ سودا راس آیا، کیونکہ ایک سال اور ایک ماہ کے اندر انہوں نے شیخ صاحب کو کرسی اقتدار سے اٹھا کر منہ کے بل نیچے دے مارا اور لگے ہاتھوں گھیث کر جیل کی کال کو ٹھڑی میں بند کر دیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر پر بھارت کا فوجی قبضہ استبداد تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ لیکن ”معاہدہ ولی“ کے وجود میں آتے ہی ہندوستان کو بیاست کے تمام امور میں دخل اندازی کا بزعم خود آئینی اور قانونی جواز بھی پیدا ہو گیا۔ بھگوڑا مہاراجہ ہری سنگھ عرصہ دراز سے امور بیاست سے کناہ کش ہو کر جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ اب ڈوگہ راج کی موروثی گدی کو موقوف کر کے مہاراجہ کے ۳۵ سالہ بیٹے کرن سنگھ کو بیاست کے آئینی سربراہ کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ اس پر بیاست کے طول و عرض میں ہندو آبادی میں شدید رو عمل رونما ہوا اور جگہ جگہ شیخ عبداللہ کے خلاف مظاہروں کا تانتا لگ گیا۔ بیاست بھر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بھی زور پکڑ گئی۔ اب شیخ صاحب کی آنکھیں کھلیں اور انہیں ہندوؤں کے ساتھ اپنی وفاداری کا نوشتہ دیوار صاف طور پر ظاہر ہو کر سامنے نظر آنے لگا۔ مایوسی کے عالم میں بوکھلا کر انہوں نے ایک بار پھر پینتراء بدلا اور اپنی تقریروں میں بھارت کے خلاف گلے شکوئے کے علاوہ کشمیر کی خود مختاری اور آزادی کا راگ بھی الائچا شروع کر دیا۔ ان کے اس رویے میں بھارت کو کشمیر کے خلاف بین الاقوامی سازشوں کو بو آنے لگی۔

چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو کی اشیر باد حاصل کرنے کے بعد کرن سنگھ نے ۱۹۵۳ء کے روز شیخ عبداللہ کو معزول کر کے جیل بھیج دیا۔

شیخ صاحب کی جگہ بخشی غلام محمد مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی ڈنکے کی چوت یہ اعلان فرمایا کہ پاکستان جس استصواب رائے کے خواب دیکھ رہا

ہے، کشمیر میں رائے شماری کا وہ دن کبھی طلوع نہ ہو گا۔ پانچ ماہ بعد فروری ۱۹۵۳ء میں انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور کشمیر کی نام نہاد اسیبلی نے بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کی توثیق کر دی۔ اسی کے ساتھ بھارت نے بھی اپنا پورے کا پورا آئین مقبوضہ کشمیر پر مسلط کر دیا اور یوں پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں کشمیر بھارت کا انٹ انج بن گیا۔

پاکستان نے ان اقدامات کے خلاف بھارت سے احتجاج کیا تو پنڈت نہرو اپنی عادت کے مطابق بگلا بھگت بن کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ ”یو این او“ کی قرار دادوں کے مطابق بھارت کشمیر میں استھواب رائے کا وعدہ نجاح نے کا تختی سے پابند ہے۔ بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کی اس سے نیا وہ واضح مثال چراغ لے کر ڈھونڈنے سے ملنا بھی محال ہے۔ کشمیر کے حوالے سے پنڈت جی کی ایسی بہت سی فلا بازیوں کا تذکرہ بھی اس کتاب کے ایک دوسرے باب ”صدر ایوب اور پاکستان کی خارجہ پالیسی“ میں ”بھارت“ کے ذیلی عنوان کے تحت کئی جگہ آتا ہے۔

اردو زبان کا ایک فصح و بلیغ محاونہ ہے۔ ”نہ رہے نہ بجے بانسری“ ..... اگر آزادی کا بانس شروع ہی میں پوری طرح کشمیریوں کے ہاتھ آ جاتا، تو یقیناً پنڈت جواہر لال نہرو سلامتی کو نسل، مقبوضہ کشمیر اور پاکستان کے اشیخ پر اپنی منافقانہ ہٹ دھرمی اور دوغنی پالیسیوں کی بنسڑی بجانے سے محروم رہتے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ جب مجاہدین کا لشکر مظفر آباد کے راستے سری گر کی جانب روانہ ہوا تھا، اس کے ساتھ ہی بیک وقت سوچیت گڑھ کی طرف سے جموں کی طرف بھی چڑھائی کر دی جاتی۔ اٹھاواہ بیس میل کا یہ میدانی فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر کے جموں کا شر اور وسیع علاقہ با آسانی فتح کیا جا سکتا تھا۔ مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چودہری حمید اللہ اور خواجہ دین وانی کے علاوہ پروفیسر محمد اسحاق قریشی اور چودہری غلام عباس کے بھائی محمد زبیر صاحب نے

یکے بعد دیگرے لاہور اور کراچی میں زمانے پاکستان کی توجہ اس حکمت عملی کو آزمائے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کسی وجہ سے کسی صاحب اقتدار شخص نے ان کی تجویز پر عمل کرنے کی حادی نہ بھری۔

اس کے علاوہ کشمیر کو مکمل طور پر آزاد کروانے کا ایک اور موقع بھی آیا تھا، جو ہاتھ سے نکل گیا۔

بھارتی افواج تو کشمیر میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی صبح سے داخل ہونا شروع ہوئی تھیں لیکن ہمارے جی اچ کیو کو ان کے اس ادارے کی خبر ایک رات قبل ہی مل چکی تھی۔ یہ اس طرح کہ لاہور اپریا ہیڈ کوارٹر نے بھارتی چیرا شوت بریگیڈ کا ایک خفیہ پیغام راستے ہی میں پکڑ کر اس کے روز پڑھ لیے تھے اور اسے فوراً اپنے جی اچ کیو تک پہنچا دیا تھا۔ اس روز قائد اعظم لاہور میں موجود تھے، لیکن کسی نامعلوم وجہ سے کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کے حملے کی خبر انہیں اسی روز شام کے وقت سنائی گئی۔

فوری رد عمل کے طور پر قائد اعظم نے پاکستان کی بری افواج کے قائم مقام کمانڈر انچیف جزل سرڈ گلس گرسی کو حکم دیا کہ پاکستانی افواج کو بھی بلا تاخیر کشمیر میں بھیج دیا جائے۔ جزل گرسی نے بت و لعل کر کے اس حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے نبی دہلی میں فیلڈ مارشل سر کلاؤ اوکنلیک کو مطلع کر دیا، جو اگلی صبح بنفس نفس لاہور تشریف لے آئے۔ اوکنلیک نے دھمکی دی کہ قائد اعظم کی ہدایات پر عمل کرنے کی صورت میں افواج پاکستان کے تمام برطانوی افسروں کو واپس بلا لیا جائے گا۔ جس کا نتیجہ صرف یہی نکلے گا کہ فوج کا تمام تر ڈھانچہ غیر منظم ہو جائے گا۔

اس کے بعد قائد اعظم نے لارڈ ماونٹ بیشن کو دعوت دی کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو، مہاراجہ کشمیر اور کشمیر کے وزیر اعظم کو اپنے ہمراہ لاہور لے آئیں تا کہ ۲۹ اکتوبر کو ایک مینگ میں بال مشافہ گفت و شنید کے ذریعہ اس تکمیل صورت حال کا حل تلاش کیا جائے۔ دعوت تو منظور کر لی گئی۔ لیکن مقررہ تاریخ پر پنڈت جی حقیقتاً یا مصلحتاً یا پر

گئے۔ اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیشن کیم نومبر کو اکیلے لاہور تشریف لائے۔ قائد اعظم نے اس کے سامنے کئی معقول مصالحتی تجویز پیش کیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیشن ٹال مثول کر کے دامن بچاتے رہے کہ وہ محض آئینی گورنر جزل ہیں۔ ولی واپس جا کر وہ یہ تجویز بھارتی حکومت کے سامنے رکھیں گے اور پھر ان کے فیصلے سے قائد اعظم کو آگاہ کریں گے۔ ولی جا کر ماؤنٹ بیشن نے قائد اعظم کو خود تو کوئی جواب نہ بھیجا، لیکن اگلے روز وزیر اعظم نرسو نے آل انجیا ریڈیو سے کشمیر کے حوالے سے پاکستان کے خلاف ایک نہایت تند و تیز اور تلغیتی تقریر نشر کر ڈالی۔ جس سے بھارت کے اصلی عزم طشت از بام ہو گئے۔ وہ دن اور آج کا دن، بھارت کے ان عزم میں رتنی بھر فرق نہیں آیا۔

آزاد جموں و کشمیر حکومت جو ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے قائم ہے، بیاست کے تقریباً ایک تماں حصے کو کنٹرول کرتی ہے۔ گلگت اور اسکردو سمیت بیاست کے شمالی علاقے حکومت پاکستان کی براہ راست نگرانی میں ہیں۔ وفاقی وزارت امور کشمیر حکومت پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر کے درمیان باہمی رابطے کا کام دیتی ہے۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد کشمیر حکومت کے قیام کی خبر سننے ہی میں فوراً چودھری محمد علی سیکرٹری جزل کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے فوراً تراڑ خیل روانہ ہونے کی اجازت عطا فرمائی جائے تا کہ میں اس نئی حکومت کی کوئی خدمت بجا لاسکوں۔ انہوں نے فرمایا کہ کشمیر کی جنگ آزادی میں پاکستان کی حکومت کسی طرح بھی ملوث ہونے کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتی۔ تم پاکستان کی ایک اہم سروں کے سرکاری ملازم ہو اس لیے تم آزاد کشمیر نہیں جا سکتے۔

میں نے گذارش کی کہ آپ میرا استعفی لے کر اپنے پاس رکھ لیں۔ اگر کسی وقت آزاد کشمیر میں میری موجودگی پاکستان کے لیے کسی الجھن یا پریشانی کا باعث بنے تو آپ بے شک میرا استعفی منظور کر کے مجھے اپنی ملازمت سے دستبردار سمجھ لیں۔ چودھری صاحب

مکرائے اور بولے۔ ”جدباتی نہ بنو، پاکستان بھی صرف دو ڈھائی ماہ پہلے وجود میں آیا ہے، یہاں پر بھی خدمت کی بہت گنجائش ہے۔“

URDU4U.COM

میں مایوس ہو کر واپس آگیا۔ کام تو میں وزارت تجارت میں اندر سیکرٹری کے طور پر کرتا رہا لیکن دل بدستور آزاد کشمیر میں انکا رہا۔ پھر مارچ ۱۹۴۸ء میں اچانک چودہ ری غلام عباس مقبوضہ کشمیر سے رہا ہو کر پاکستان آگئے۔ آتے ہی وہ فوراً قائدِ اعظم کی خدمت میں حاضر دینے کا پھر آئے اور ہمارے ہاں فروش ہوئے۔ اگلے روز قائدِ اعظم نے انہیں لپخ پر مدعو فرمایا۔ جس وقت ہم انہیں ایک نہایت ناقابل اعتبار اور پھیپھر سی کار پر گورنر جنرل ہاؤس چھوڑنے جا رہے تھے تو راستے میں ان کو میں نے آزاد کشمیر کے متعلق اپنی دل خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا کیا کارروائی کماں کماں پر ہوئی البتہ کچھ عرصہ بعد چودہ ری محمد علی صاحب نے ایک روز مجھے اپنے دفتر میں بلا کر یہ مژہہ سنایا کہ تمہیں آزاد کشمیر حکومت میں جا کر کام کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن تمہاری موجودہ تنخواہ تمہیں وزارت تجارت ہی سے ملا کرے گی۔ کیونکہ سرکاری گزٹ میں تمہارا نام اسی وزارت کے ملازمین کی فہرست میں شامل رہے گا۔ میں نے پوچھا کہ وہاں جا کر میرا کام کیا ہو گا۔ چودہ ری صاحب نے فرمایا۔ ”وہاں پر کابینہ بن چکی ہے، اس کے ماتحت نظم و نتق کا سارا کام تمہیں سنبھالانا پڑے گا۔“

چلتے چلتے چودہ ری محمد علی نے مجھے ایک اور مشونہ بھی دیا۔ ”تم نوجوان اور نو آموز ہو۔ کام نیا اور مشکل ہے۔ اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ اگر کبھی کسی معاملہ میں کوئی مشکل پیش آئے تو میرے ساتھ رابطہ قائم کرنے سے ہرگز نہ بچکچانا۔“

پاکستان کے سیکرٹری جنرل کی اس خیر سگالی کو پلے باندھ کر میں نے خوشی خوشی رخت سفر باندھا اور آزاد کشمیر کی راہ لی۔ اس زمانے میں کہوں سے آزاد پن ہوتے ہوئے پلندری اور ترازو خیل تک انتہائی تگ اور بالکل کچی سڑک تھی۔ کسی کسی موڑ پر تو گاڑی کا اگلا ایک پیہے سڑک سے نکل کر کھٹ کی جانب معلق ہو جاتا تھا۔ خاص طور پر

بارش کے دنوں میں اس قدر پھسلن ہوتی تھی کہ جیپوں اور ٹرکوں وغیرہ کے پھسل کر گھری کھڈ میں گرنے کے حادثات آئے دن وقوع پذیر ہوتے رہتے تھے۔ میں بھی ایک روز جیپ میں سوار ہو کر شدید بارش میں پھسلتا اور ہچکوئے URDU4U.COM کھاتا حکومت آزاد کشمیر کے صدر مقام پہنچ گیا، جو پلندری اور تراڑ خیل کے درمیان جنجال بل ناہی ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں پر ڈھائی تین درجن چھوٹے چھوٹے کچے مکان تھے۔ چند مکانوں میں حکومت کے دفاتر تھے۔ باقی گھر صدر، وزراء اور دیگر سرکاری ملائمین کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ یہاں پر مجھے بھی ایک کمرے پر مشتمل ایک کچا کوٹھا مل گیا، جس کے ایک کونے میں باورچی غانے کے طور پر مٹی کا چولنا بنا ہوا تھا۔

جنجال بل ایک نایت ہی پر فضا مقام تھا اور طرح طرح کے سربز درختوں کے گھنے جنگل میں گھرا ہوا تھا۔ آس پاس ایک دو پہاڑی جھرنے تھے، جن کی ہلکی ہلکی، مددم مددم سی موسیقی دن رات اپنی تائیں اڑاتی رہتی تھی۔ دفتروں کے کمرے روایتی ساز و سامان سے بڑی حد تک محروم تھے۔ فائلوں کے لیے نہ زیادہ المایاں تھیں نہ شیافت۔ عام طور پر پتھر کی سلوں کو ہموار رکھ کر ان سے کام لیا جاتا تھا۔ موسم کے لحاظ سے باہر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر دفتری کام کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ دن بھر بھارت کے بمبے طیارے ہمارے اوپر سے یا دائیں بائیں پرواز کرتے ہوئے گزرتے رہتے تھے اور اپنے نشانوں پر انہا وہند بم برسا کر خراماں خراماں واپس لوٹ جاتے تھے، ہماری جانب سے ان کی مزاحمت یا روک تھام کا کوئی بندوقست نہ تھا۔ کئی بار بھارتی طیاروں کی اڑان اس قدر پیچی ہوتی تھی کہ ہمیں پائلوں کے منہ اور سر تک صاف نظر آ جاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہمارا سارا صرف اللہ پر توکل تھا۔ جب کبھی کوئے بھارتی طیارہ آس پاس بم برستا یا مشین گن سے بے تحاشا گولہ باری کرتا عین ہمارے اوپر سے گزرتا تھا تو ہم دم سادھ کر اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھ جاتے تھے تا کہ ہماری نقل و حرکت سے ہوا باز ہماری چھوٹی سی آبادی کا سراغ نہ پا لیں۔

ایک روز آزاد کشمیر کے سپریم ہیڈ چھڈری غلام عباس اور صدر سردار ابراہیم پندری کے قریب ایک مقام پر ہزاروں لوگوں کے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ عین اس وقت بھارتی ائمہ فورس کا ایک بمبار طیارہ ان کے اوپر آگیا۔ بیسیوں جانشوروں نے اپنے دونوں لیدروں کے اوپر اپنے اجسام کا ایسا حفاظتی حصہ بنا لیا گیا کہ گولہ باری کی صورت میں ان کو کوئی گزندہ نہ پہنچے۔ باقی ہزاروں سامعین بے حس و حرکت اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ ہندوستانی طیارہ کچھ عرصہ آس پاس منڈلایا اور غالباً جلسہ گاہ میں زندگی کے کوئی آثار نہ پا کر کوئی بم یا گولیاں بر سائے بغیر آگے بڑھ گیا۔

بھارتی ائمہ فورس کا ایک خصوصی ہدف دو میل (مظفر آباد) میں دیاۓ جملم اور دیاۓ نیم (سابق کرش گنگا) کے پل تھے، جو فوجی نکتہ نظر سے اس علاقے میں شہ رُگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ شروع شروع میں خوش عقیدہ مقامی مسلمانوں نے ان پلوں کی حفاظت کے لیے ان کے دونوں سروں پر قرآن حکیم کا ایک ایک نسخہ بطور تعویذ باندھ رکھا تھا۔ بھارتی بمباروں نے ان پلوں کو نشانہ بنانے کے لیے سینکڑوں حملے کئے لیکن ان کا ایک بھی نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا۔ کچھ عرصہ بعد جب پاکستانی فوج کو مجبوراً اس جنگ کے مجاز پر آتا پڑا تو ان پلوں کی حفاظت کے لیے ایک طیارہ ٹکن توپ بھی وہاں پر نصب ہو گئی۔ اس بندوست سے مطمئن ہو کر لوگوں نے پلوں پر باندھے ہوئے قرآن شریف احتراماً اتار کر رکھ لیے۔ کچھ روز بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بھارتی بمباروں کے حملے میں ایک بم سیدھا ایک پل پر آ کے لگا اور پہنچے بغیر سوراخ کر کے نیچے دیا میں جا گرا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت تھی کہ پل میں ایک معمولی سا سوراخ ہونے کے علاوہ اس بم سے اور کوئی نقصان نہ پہنچا۔

جنجال میں سول حکومت کے سب کارندے بھی اپنی اپنی جگہ جذبہ جماو سے سرشار تھے۔ سردار محمد ابراہیم کی صدارت میں کابینہ کے تمام اراکین بے حد فعال، خوش خصال اور دیانتدار تھے۔ سید علی احمد شاہ وزیرِ دفاع نہایت نیک سیرت اور پابند صوم و صلوٰہ بزرگ تھے۔ انہیں ثقلِ ساعت کا عارضہ تھے۔ غالباً اسی وجہ سے وہ خود بھی ضرورت سے نیا وہ

بلند آواز میں بولنے کے عادی ہو گئے تھے۔ عام طور پر وہ دوسروں کی بہت کم سنتے اور اپنی بہت زیادہ سنانے کے شوقین تھے۔ ان کے پاس ایک چھوٹا سا بھونپو نما آلہ ساعت ہوتا تھا۔ اگر کبھی وہ کسی اور کی کوئی بات سننے کا ارادہ کرتے تو اس آلہ کو کان سے لگا کر بینہ جاتے تھے۔ ورنہ عام طور پر وہ اسے جیب میں ڈال کر یکطرف گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ دفتری قواعد و ضوابط پر انہیں خوبصورت مہارت حاصل تھی اور دساتیر عالم کا مطالعہ کرنے کا بھی انہیں خاص شوق تھا۔ کشمیر کے آئینی مستقبل کا تانا بانا اپنے ذہن میں بننے رہنا ان کا دلپسند مشغله تھا۔ بعد ازاں وہ کچھ عرصہ تک آزاد کشمیر کے صدر بھی رہے۔

وزیر خزانہ سید نذری حسین شاہ بڑے نیک مزاج، رحمد اور نرم گفتار انسان تھے۔ جنگ کی وجہ سے خزانہ خالی تھا۔ لیکن سرکاری چیک بک ہمیشہ شاہ صاحب کی جیب میں موجود رہتی تھی۔ جہاں کہیں کوئی ضرورت مند کچھ امداد یا کوئی محکمانہ اخراجات کے لیے کچھ رقم طلب کرتا، وہ وہیں پر کھڑے کھڑے چیک کاٹ کر ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں نہ تو ابھی تک کوئی بحث بنانے کی نوبت آئی تھی اور نہ ہی آمدی اور خرچ پر محکمہ فائنس اور محکمہ اکاؤنٹسٹ جزل کا روایتی کنٹرول تھا۔ آزاد کشمیر کا نظم و نق سنبھالتے ہی جب میں نے پہلے پہل بحث تیار کر کے محکمہ فائنس اور اکاؤنٹسٹ جزل کے سرخ فیتنے کا نظام رائج کیا اور شاہ صاحب سے سرکاری خزانے کی چیک بک واپس لے لی تو وہ بڑے حیران اور غالباً کسی قدر آزردہ سے ہوئے۔ ایک روز انہوں نے میرے ساتھ گلہ کیا۔ ”اگر ہر خرچ کی منظور فائنس ڈیپارٹمنٹ سے حاصل کرنی ہے اور ہر چیک اکاؤنٹسٹ جزل کے دفتر سے جاری ہونا ہے تو وزیر خزانہ کس مرض کی دوا وہ جاتا ہے؟“

خواجہ غلام دین والی دھنسے مزاج کے روشن دماغ اور خاموش طبع وزیر تھے۔ وہ اپنے فرانچوزیانہ دم خم سے کم اور فقیرانہ انداز سے زیادہ سر انجام دیتے تھے۔ ان کا تعلق وادی

کشمیر سے تھا اور وہ مقبوسة علاقے کے تمام بڑے بڑے قائدین مثلاً شیخ عبداللہ، مرزا افضل بیگ اور بخشی غلام محمد کے طور طریقوں اور عادات و خصائص سے گھری واقفیت رکھتے تھے۔ شاء اللہ شیم صاحب کا تعلق بھی وادی کشمیر سے تھا۔ وہ پڑھے لکھے، جو شیئے، انقلاب پسند اور سیماں صفت جوان سال وزیر تھے۔ وہ اپنے مکھموں کی کارکردگی اور کارگزاری پر مضبوط گرفت رکھتے تھے اور بحث مباحثہ اور منطق و استدلال میں ان سے بازی لے جانا امر محال تھا۔

میرے زمانے میں کچھ عرصہ بعد میر واعظ محمد یوسف شاہ بھی کابینہ میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ وادی کشمیر کے ایک عظیم رہنما تھے جہاں پر ان کے لاکھوں مرید تھے۔ سنا ہے کہ ان کے بعض مریدوں کے دل میں ان کے لیے اتنا گمرا جذبہ عزت و احترام تھا کہ جس قائلین پر میر واعظ صاحب ایک بار بیٹھ جاتے تھے اس پر کوئی شخص دوبارہ پاؤں نہیں رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ ایسے قائلینوں کو گھر والے تبرک دیوار پر آوریاں کر دیتے تھے۔ میر واعظ صاحب محض زاہد خشک نہ تھے بلکہ بذله سنجھی، لطیفہ گولی اور پر لطف محفل آرائی میں بھی یہ طولی رکھتے تھے۔ دھیمی دھیمی مہین سی آواز میں وہ مزاح ہی مزاح میں ایسے پتے کی بات کہ جاتے تھے کہ سننے والا عش عش کر اٹھتا۔ میرے ساتھ وہ نہایت مشغله برداشت کرتے تھے اور رات کا کھانا اکثر مجھے اپنے ساتھ کھلانے پر اصرار فرمایا کرتے تھے۔ غریب الوطنی کے باوجود ان کا دستر خوان بڑا وسیع ہوتا تھا۔ ان کی وفات حسرت آیات کے بعد اب اس طرح کے کشمیری کھانے خواب و خیال ہو گئے ہیں۔

میر واعظ صاحب جعلی پیروں فقیروں کے ہتھکنڈوں کے متعلق عجیب و غریب حکایات سنایا کرتے تھے۔ خاص طور پر دو واقعات قابل بیان ہیں۔

ایک جعلی پیر صاحب کا معمول تھا کہ وہ صرف جمرات کے دن اپنے مریدوں یا دیگر حاجت مندوں کو تعویذ لکھ کرتے تھے۔ جب فاؤنٹین پین نئے نئے ایجاد ہوئے تو پیر صاحب نے اسے بھی اپنی جملہ کرامات میں شامل کر لیا۔ وہ اس طرح کہ جمرات

کو وہ اپنے قلمدان کی روشنائی پھٹکوا کر خالی دوات اپنے سامنے رکھ لیتے۔ البتہ فاؤنسین ہیں کو سیاہی سے بھر کر قلمدان میں سجا لیتے تھے۔ غرض مند لوگ دور دور سے پاپاہ تعویذ لینے آتے تھے۔ پیر صاحب کی خدمت میں نذرانہ پیش کر کے اپنی حاجت بیان کرتے تھے۔ پیر صاحب تعویذ لکھنے کے لیے فاؤنسین ہیں کو دوات میں ڈبوتے تھے۔ اسے خالی پا کر قلم واپس رکھ دیتے تھے اور سرد آہ بھر کر افسوس کرتے تھے۔ ”اوہو، آج تو سیاہی ختم ہے۔ خیر اگلی جعرات کو آ جانا۔ تعویذ لکھ دوں گا۔“ دس دس یا بیس کوس سے پیدل آیا ہوا حاجت مند مایوس ہو کر جانے لگتا تو پیر کے چھوڑے ہوئے دلال اسے حضرت پیر و مرشد کے ابر کرم کو جوش میں لانے کی ترکیبیں سمجھاتے۔ حاجت مند از سر نو پیر صاحب کے قدموں میں پہلے سے تین گنا نذرانہ ڈالتا اور گڑگڑا کر آہ و زاری کرتا کہ اللہ اور رسول کی خاطر میری دشمنی فرمائی۔ پیر صاحب نجح ہو کر کہتے۔ ”اوہو، آپ لوگ بڑا نیک کرتے ہیں۔ اچھا خیر اللہ مالک ہے۔“ وہ کچھ پڑھ کر فاؤنسین ہیں پر پھونک مارتے اور پیر و مرشد کی کرامت سے دوات میں سیاہی کے بغیر قلم ڈبو کر وہ کھٹ سے تعویذ لکھ دیتے۔

ایک دوسرے پیر صاحب نے پہلی بیٹری والی ثارچ کی ایجاد سے بھی ایسا ہی فائدہ اٹھایا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ جو شخص ان کے پاس ہے کر چالیس دن کا چلنہ کاٹ لے، وہ کھلی آنکھوں سے اللہ کے نور کا دیدار کر سکتا ہے۔ بہت سے لوگ ان کے پاس چلنہ کاٹنے آئے۔ ان چالیس ایام کے دوران پیر صاحب ہر شخص سے روزانہ صدقہ کے لیے ایک بکرا اور دوسری خیر خیرات کے لیے کچھ رقم بٹوتے رہتے تھے۔ چلنہ کاٹنے والے دن بھر رونہ رکھتے تھے اور رات بھر عبادت اور ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ چالیسویں دن پیر صاحب اگر بیوی اور عود و لوبان سے مرکائے ہوئے مجرے میں چلنہ کش کو اپنے سینے سے لگا کر بیٹھ جاتے اور اس کے چرے کو اپنے فن (کشمیریوں کا نخنوں تک لانا) کرتے نما پیرا ہیں) میں ڈال اسے حکم ہوتا تھا کہ وہ کلمہ طیبہ کا ورد کرے اور

پلکوں کو جھپکائے بغیر اپنی آنکھیں پوری توجہ سے پیر صاحب کے قلب کی جانب گھنٹی  
باندھ کر جمائے رکھے۔ جھرے میں بہت سے مریدان باصفا حلقة باندھ کر ذکر جہر کی محفل  
برپا کرتے تھے۔ اس ڈرامائی ماحول میں کسی خاص لمحے پر پیر صاحب اپنے فرن میں چھپائی  
ہوئی ثارچ کا بٹن دا کر اس کی شعاعوں سے اپنے سینہ کو بقعہ نور بنا دیتے۔ بعض چلمے  
کش ”نور الہی“ کے اس دیدار کی تاب نہ لاء کر بے ہوش ہو جاتے تھے۔

یہ کہانیاں سنائے کر میر واعظ محمد یوسف شاہ فرمایا کرتے تھے کہ اصلی کرامات تو انسان  
کی اپنی عقیدت مندی میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ روشنائی سے خالی دوات میں ”قلم“ ڈبو  
کر لکھے ہوئے تو یہ زیادہ موثر ثابت ہوتے تھے اور چالیس ایام کی نفس کشی اور عبادت  
و ریاضت کے بعد یہتری ثارچ کی آڑ میں ”نور الہی“ کے دیدار سے مشرف ہونے والے  
اکثر افراد اپنی بقیہ زندگی سچ مجھ عابد شب زندہ دار بن کر گزار دیتے تھے!

کچھ عرصہ کے بعد صوبہ جموں کے چودہ ری عبده اللہ بھلی بھی کرسی وزارت پر ممتنکن ہوئے  
تھے۔ یہ بڑے سادہ لوح اور دلچسپ انسان تھے۔ ایک روز میں ان کے ہمراہ بھمبر اور  
کوٹلی کی جانب دورے پر گیا ہوا تھا۔ ایک مقام پر ہم کسی کام کے لیے ٹھہرے تو اچانک  
فضا میں دو تین بھارتی بمبے طیارے نمودار ہوئے اور ادھر ادھر انکل پکو سے چند بم گرا  
کر چلتے بنے۔ بھلی صاحب انتہائی رازداری سے سرگوشی میں بولے: ”واہ بھئی واہ۔ ہندوستان  
کی سی۔ آئی۔ ڈی نے بھی کمال کر دیا۔ ہمارے پہنچتے ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ آج  
گورنمنٹ یہاں آئی ہوئی ہے اور ان کے طیارے بم لے کر فوراً آ موجود ہوئے!“

جموں کے باسی کیپٹن نصیر الدین بڑی سوجھ بوجھ کے مالک، متحمل اور بردار وزیر تھے۔ ان  
کی ساری ملازمت انذین پولیسیکل سروس میں گزری تھی۔ کچھ عرصہ تک وہ قلات کے  
وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے۔ آزاد کشمیر کی کابینہ میں کافی تاخیر کے بعد شامل ہوئے اور  
بعد ازاں کسی وقت صدارت کی کرسی پر بھی بیٹھئے۔

پاکستان میں چودہ ری محمد علی سکرٹری جنرل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شجنی میں آ کر میں

نے آزاد کشمیر پہنچ کر اپنے عمدہ کا نام بھی سیکرٹری جزل رکھ لیا تھا۔ اس پر چہدری صاحب نے سرزنش کر کے مجھے نوکا کہ مجھے اپنے عمدے کا لقب چیف سیکرٹری رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے معذرت کی کہ میں تو اب یہ غلطی کر بیٹھا ہوں۔ اب فوری طور پر اسے بدلنے میں مقامی سطح پر بہت سی الجھنیں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ البتہ میرے بعد اگر اس عمدے کو چیف سیکرٹری کا نام دیا جائے تو کوئی مضاائقہ نہیں۔ چہدری صاحب میری بات مان گئے۔ چنانچہ آجکل آزاد جمو و کشمیر کی حکومت میں چیف سیکرٹری ہی مقرر کیا جاتا ہے۔

جنجال ہل میں میرے دوسرے رفقاء کا رجھی اپنی مثال آپ تھے۔ ان جیسے مختی، دیانت دار، سچے اور نذر افسروں کی اتنی بڑی متحده جماعت مجھے ساری عمر اور کہیں نظر نہیں آئی۔ یہاں پر ان سب کا نام بنام ذکر کرنا تو امر محال ہے۔ البتہ مثال کے طور پر ان میں سے چند ایک کا کچھ احوال بیان کرنا باعث دلچسپی ہو گا۔

سرفرست مجھے ملکہ تعلیم کے سیکرٹری کیپشن محمد صدر کا نام یاد آتا ہے۔ وہ سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور انگلستان سے تاریخ میں ایم، اے کر چکے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں کچھ عرصہ ایم جنپی کمیشن حاصل کر کے فوجی ملازمت کی۔ پھر پنجاب میں کسی کالج میں ملازم ہو گئے۔ جب کشمیر میں جہاد آزادی نے زور پکڑا، تو استعفی دے کر حکومت آزاد کشمیر میں آگئے۔ وہ جذبہ جہاد کا چلتا پھرتا پیکر تھے۔ ملکہ تعلیم کے سیکرٹری کی حیثیت سے وہ کوئی تنخواہ قبول نہ کرتے تھے۔ آزاد علاقوں میں سرکاری دوروں کا سفر خرچ اور یومیہ بھتہ بھی وصول نہ کرتے تھے۔ وہ جہاد کی اصلی روح ساتھ لے کر کام کرنے آئے تھے اور اس کام کی کوئی اجرت حاصل کرنا صریحاً حرام سمجھتے تھے۔

ہمہ وقت کام کرنے کی ان میں ایسی لگن تھی کہ میں نے انہیں کبھی بیکار بیٹھے یا گپیں ہاں کر وقت ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب آزاد کشمیر کا دار الحکومت مظفر آباد منتقل ہوا تو صدر صاحب نے اپنی فائلوں کی بوری کندھے پر اٹھائی اور جنجال ہل سے

لگاتار چل کر سارا راستہ دو روز میں پاپیاہ طے کر لیا۔

محلہ مال کے سیکرٹری راجہ محمد یعقوب تھے۔ وہ بڑے خوش لباس، خوش کلام اور خوش اخلاق انسان تھے۔ وہ بے خوابی کے دیرینہ مریض تھے۔ کئی کئی راتیں مسلسل جاگ جاگ کر گزارنے کے باوجود دفتر میں بھی بیشہ دن بھر چاق و چوبید اور خوش و خرم ہی نظر آیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ بے خوابی کی وجہ سے ساری ساری رات جاگتے جاگتے انہوں نے انگریزی زبان کی ایک پوری ڈکشنری حفظ کر لی تھی۔ ان کا یہ جوہر ہمارے بہت کام آیا۔ جنجال ہل میں آزاد حکومت کے کسی دفتر یا ملازم کے پاس انگریزی کی کوئی ڈکشنری موجود نہ تھی۔ وہاں پر ہم سب ضرورت پڑنے پر راجہ صاحب ہی سے ایک چلتی پھرتی ڈکشنری کے طور پر استفادہ کر لیا کرتے تھے۔

قانون کی ڈکشنری خواجہ عبدالغنی کی ذات تھی۔ ہوم اور لاءِ سیکرٹری کی حیثیت سے وہ جیل خانوں سے لے کر ہائی کورٹ تک تمام قواعد و ضوابط کی روگ روگ سے واقف تھے۔ دیکھنے میں وہ نہایت بھولے بھالے اور سیدھے سادے نظر آتے تھے۔ لیکن چچیدہ سے چچیدہ مسائل کو قانونی موشگافیوں کے سانچے میں ڈھال کر آسان اور عام فہم بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہنگامی احکام اور قوانین وغیرہ کے خاکے بنانے اور منظوري کے بعد انہیں باضابطہ مسودوں کی شکل دینے میں بھی انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ شدید ترین ہنگامی حالات اور بمباری کے دوران بھی وہ پرستون رہتے تھے اور کسی گھبراہٹ کے آثار کے بغیر ان کا دماغ ان کے زیر غور مسودوں کی کتری یونٹ پر مسلسل کام کرتا رہتا تھا۔

محمود ہاشمی حکومت آزاد کشمیر کے چیف پلیٹی افسر تھے۔ وہ اپنی خوش کلامی، خوش بیانی اور ایک عجیب درویشانہ ادائے دلنوازی سے بہت جلد ہر کس و ناکس کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔ وہ ایک پیدائشی ادیب تھے، کیونکہ ان کی بول چال اور تحریر و تقریر پر ایک واضح ادبی چھاپ ہوتی تھی۔ دن بھر وہ دفتر میں بینہ کر کام کرتے تھے۔ ہر روز شام

کو یوسف بچ اور میں ان کو اپنے ہمراہ لے کر طویل سیر پر نکل جاتے تھے اور واپس آکر لائین کی مددم سی روشنی میں رات گئے تک گپ شپ ہانکا کرتے تھے۔ پھر اچانک ایک روز خبر ملی کہ محمود ہاشمی کی کتاب "کشمیر اداس" شائع ہو کر بازار میں آ گئی ہے۔ میری طرح جس کسی نے اس کتاب کو پڑھا، وہ اس سے بے حد متاثر ہوا۔ بیاست کشمیر کے متعلق اس سے بہتر رپورٹ اور کسی نے نہیں لکھا۔ مجھے آج تک اس بات پر حیرت ہے کہ جہنمجال ہل میں ہم سب کی نظر بچا کر محمود ہاشمی نے ایسی عجیب و غریب کتاب کب اور کیسے تصنیف کر ڈالی؟ کافی عرصہ سے اب یہ کتاب نایاب ہے۔ معلوم نہیں پاکستان بھر میں کسی پبلشر کو یہ کتاب دوبارہ شائع کرنے کا خیال اب تک کیوں نہیں آیا؟ کشمیر کا مسئلہ لکھتا رہے یا حل ہو جائے، اس کتاب کی ادبی اہمیت اور افادیت دونوں صورتوں میں برقرار رہے گی۔

۱۹۵۳ء میں محمود ہاشمی اچانک انگلستان چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ پہلے ملکہ تعلیم سے وابستہ رہے۔ پھر ریس ریلیشنز (Race Relations) کے اداروں کے ساتھ ملک ہو گئے۔ اس کے بعد لندن میں اردو کا پہلا باقاعدہ اخبار ہفت رونہ "مشرق" عنایت اللہ مرحوم کے تعاون سے جاری کیا۔ اس اخبار کا ڈنکا کئی برس تک خوب بچتا رہا۔ پھر یہ ریت چل نکلی اور رفتہ رفتہ اردو صحافت نے انگلستان میں بھی اپنے پاؤں جما لیے۔ آجکل وہاں اردو کے غالباً رو روزنامے اور متعدد ہفت رونہ اور ماہنہ رسائل باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔ انگریزی کی سرنیں پر اردو صحافت کا پودا لگانے کا سرا محمود ہاشمی کے سر ہے۔ آجکل وہ ایک نئے انداز میں اردو زبان کا پہلا قاعدہ لکھ رہے ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انگلستان میں مقیم لاکھوں پاکستانی بچوں کو اپنی قومی زبان سیکھنے میں آسانی ہو اور بہت سے انگریز جو شوقیہ طور پر یا ضرورتا یہ زبان سیکھنے کے خواہشمند ہیں، ان کے کام بھی آ سکے۔

جنجال ہل میں شام کے وقت طویل سیر کے بعد گپ شپ کی شہینہ محفلوں میں دوسرے

ساتھی یوسف نجع تھے۔ انگریزی پر انہیں ایسا عبور حاصل تھا، کہ ان کی تحریر پڑھ کر اہل زبان بھی دنگ لے جاتے تھے۔ دفتر میں بینہ کر فالٹیں کرنے سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ اس لیے انہیں تحریک آزاد کشمیر کے سپریم ہیڈ چوہدری غلام عباس کے ساتھ ایڈواائزر کے طور پر لگا دیا گیا تھا۔ کیونکہ مشاورت کا کام زیادہ تر زبانی کلائی ہی ہوا کرتا تھا۔ جب محمود ہاشمی انگلستان سدھارے تو یہ بھی نیویارک چلے گئے اور یو۔ این۔ او میں پاکستانی سفارت خانہ کے ایک گوشہ میں آزاد کشمیر سنٹر (Free kashmir Centre) کھول کر بینہ گئے۔ یو۔ این۔ او کی جزل کافرنس اور سلامتی کونسل میں ہمارے مشاہیر جتنی تقریں کرتے تھے، ان میں اکثر و پیش یوسف نجع کی ڈرافٹ کردہ ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ بھی ان کے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ جب بھٹو صاحب اقتدار میں آئے تو انہوں نے یوسف نجع کو اپنے پیشل اسٹنٹ کے طور پر پاکستان بلا لیا۔ جاتے جاتے بھٹو صاحب انہیں سوئٹر رلینڈ میں بطور سفیر معین کر گئے لیکن مارشل لاء کی حکومت نے بہت جلد انہیں اس عمدے سے فارغ کر دیا۔ یوسف نجع دوبارہ نیویارک جا پہنچے۔ وہاں پر یو این او کے سیکرٹری جزل کرٹ والڈیم نے انہیں ہاتھ لیا اور اپنے شاف میں شامل کر لیا۔ نئے سیکرٹری مسٹر کوئیر نے آکر ان کی اسامی کو اسٹنٹ سیکرٹری جزل کا رتبہ دے دیا۔ پروفیسر پٹرس بخاری کے بعد یوسف نجع واحد پاکستانی ہیں جو یو۔ این۔ او کے ادارے میں اس رتبے کی اسامی پر فائز ہوئے ہیں۔ بخاری صاحب کو حکومت پاکستان کی پوری پوری تائید حاصل تھی۔ یوسف نجع نے محض ذاتی الہیت اور حسن خدمت کی بنا پر یہ رتبہ حاصل کیا ہے۔

ڈاکٹر نور حسین صاحب میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ تھے۔ وہ میرے بڑے بھائی مرحوم کے ہم جماعت اور دوست تھے۔ اس لیے میں ان کا ادب و احترام اپنے بزرگوں کی طرح کرتا تھا۔ وہ بھی مجھے بچہ سمجھ کر ویسا ہی برتاو کرتے تھے۔ آزادی سے پہلے وہ مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کی مہارانی کے ذاتی معالج بھی تھے۔ اس لحاظ سے انہیں مہاراجہ اور مہارانی کے محلات کے اندر ٹوپی کوک شاستروں کا پورا علم تھا۔ کبھی کبھی وہ موڈ میں

آکر ڈوگہ حکمران کی ذاتی زندگی کے بارے میں عجیب و غریب قھے ناتے تھے۔ جیسے ہی اس طلسم ہو شربا کا سخ مہاراجہ اور مہارانی کی جنپی ہے نہ رویوں کی طرف مرتا تھا، تو ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر مجھے محفل سے انٹھا دیتے تھے۔ ”کافی دیر ہو گئی ہے۔ پچھوں کو جا کر اب سو جانا چاہیے!“

ڈاکٹر صاحب نے پاکستان کے فوجی مینیکل یونٹ کے ساتھ مل کر آزاد کشمیر کے طول ععرض میں ہسپتاں اور ڈپنسریوں کا ایسا نظام قائم کیا جو ڈوگہ مہاراجہ کے عمد میں کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ جنگ بندی کے بعد جب مسئلہ کشمیر کے حل کا امکان دور سے دور تر ہوتا چلا گیا تو ڈاکٹر صاحب بھی مایوس ہو کر سیالکوٹ چلے آئے۔ یہاں پر انہوں نے دین اسلام کی روح اور عمل کو اپنا اوڑھنا پچھوٹنا بنا لیا اور زندگی کے آخری ایام انہوں نے کچھ ایسے کیف و مستی و سرور میں کائے جسے حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے زاہد و عابد ساری ساری عمر ذکر شغل اور مراقبہ و مجاہدہ میں گزار دیتے ہیں۔ ہمارے نامور صاحب طرز انگریزی زبان کے صحافی خالد حسن ڈاکٹر صاحب کے بیٹے، قائدِ اعظم کے سیکریٹری اور آزاد کشمیر کے سابق صدر مسٹر کے۔ اپنے خورشید

ان کے داماد ہیں۔

ڈاکٹر نور حسین ہمیصر اور دوست انور شیخ علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ وہاں پر انہوں نے یونین کے مباحثوں میں نمایا حصہ لے کر بڑا نام پیدا کیا، وہیں پر شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم بھی استوار ہو گئے تھے۔ کشمیر واپس آکر انہوں نے اکاؤنٹنٹ جزل کے دفتر میں ملازمت تو ضرور اختیار کر لی تھی لیکن عملی طور پر وہ ہمیشہ کافرنس کی سیاست سے وابستہ رہے۔ جماد کشمیر کے آغاز کے بعد جب شیخ عبداللہ ہندوستانی تکلینوں کے سائے میں اقتدار میں آئے تو انہوں نے انور شیخ کو اعلانیہ طور پر پاکستان کے حق میں سرگرم عمل پا کر کافی عرصہ تک جیل میں ٹھونے رکھا۔ رہائی کے بعد ان کو بھی آزاد کشمیر میں یوسف نجع کی طرح چودہ ری غلام عباس کے ساتھ بطور

مشیر معین کر دیا گیا۔

ان سب سے نرالی اور دلچسپ شخصیت حام شاہ کی تھی۔ وہ سرینگر کے ایک متول اور بارسونگ خاندان کا چشم و چراغ تھا، جس کا پیشتر حصہ مقبوضہ کشمیر ہی میں وہ گیا تھا۔

جب وہ پہلی بار مجھے ملنے آیا، تو میں نے پوچھا کہ وہ خود سوچ کر بتا دے کہ یہاں پر اسے کس نوعیت کا کام پرداز کرنا چاہیے۔ اس نے فوراً نہایت سادگی سے جواب دیا کہ اسے کوئی خاص کام نہیں آتا۔ گرمیوں کے یہن میں ہندوستان بھر سے جو مسلمان مشاہیر سرینگر آتے تھے، حام شاہ کے گھر والے اکثر اس کی ڈیوٹی ان کی خاطر مدارت اور دیکھ بھال پر لگا دیا کرتے تھے۔ اس طرح علامہ اقبال سمیت ہندوستان کے تقریباً تمام نامور مسلمانوں کے ساتھ اس کی روشناسائی تھی۔ حام شاہ نے کسی قدر معذرا رانا لجھے میں کہا، ”جناب مجھے تو بس دوسروں کی خدمت کرنے کا تجربہ ہے۔ اس میں مجھے خود بھی لطف آتا ہے۔“

حام شاہ کی یہ ادا مجھے بہت بھائی۔ رسماً ملازمت تو اس کی سول سالائی کے مجھے میں مقرر کر دی گئی، لیکن عملًا میں نے اس سے کام چیف آف پروٹوکول کا ہی لیا۔ اس کام کو شائستگی سے بھانے کی الہیت بھی اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

عبدالجید سلمیریا کا نام شامل کے بغیر آزاد کشمیر میں میرے ہمصروروں کا تذکرہ ناکمل وہ جائے گا۔ میرے زمانے میں وہ محکملہ جنگلات میں کنزرویٹو تھے۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے چیف کنزرویٹو اور ترقیاتی مکھموں کے سیکرٹری بھی رہے۔ اگر کسی نے اس گھرے ہوئے، فاسد اور ناقص زمانے میں اپنی آنکھوں سے ایسے شخص کو دیکھنا ہو جو شروع ہی سے جوان صالح رہا ہو، جس نے زندگی بھر دیانت، امانت اور سچائی کا دامن نہ چھوڑا ہو، جس کے خون میں لقمه حلال کے علاوہ اور کسی خوراک کی آمیزش نہ ہو، اور جو ہر آنماش میں اللہ کی رضا، توکل اور تقویٰ پر ثابت قدم رہا ہو تو وہ عبدالجید سلمیریا کو دیکھ لے جو رثائز ہونے کے بعد اب سینٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں اپنی معمولی سی پنشن

پر صبر و شکر سے گزارا کر رہا ہے۔ جنگلات کا محلہ سونے کی کان سمجھا جاتا ہے۔ سلمرا اس سونے کی کان سے دامن بچا کر اس قدر پاک و صاف نکلا کہ اس کا کردار بذاب خود سونا بن گیا۔

باقی سارا کام تو میں نے سنحال لیا، لیکن محلہ پولیس کی تنظیم نو میرے بس کا روگ نہ تھی۔ اس مقصد کے لیے پنجاب کے ایک ڈی۔ آئی۔ جی سید نذیر عالم ڈیپوٹیشن پر آزاد کشمیر آ گئے۔ کسی مصلحت سے یہاں آ کر انہوں نے اپنا نام مسٹر ضرار رکھ لیا۔ وہ انہیں پولیس سروس کے ایک تجربہ کار افر تھے اور بڑی شاہانہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کا اپنا قیام تو راولپنڈی کے سرکٹ ہاؤس میں ہوتا تھا جہاں وہ بڑے ٹھاٹھ باثٹھ سے رہا کرتے تھے۔ لیکن آزاد کشمیر میں پے درپے دورے کر کے انہوں نے محلہ پولیس کو ازسر نو منظم کرنے میں بڑی گرانقدر خدمات سر انجام دیں۔ ان کو آئے ہوئے تھوڑا عرصہ گزارا تھا کہ ایک روز میں اچانک ان سے ملنے راولپنڈی سرکٹ ہاؤس چلا گیا۔ وہاں دیکھا کہ کچھ لوگ برآمدے میں جمع ہیں اور ضرار صاحب درمیان میں بیٹھے چند قیمتی بندوقیں فروخت کر رہے ہیں۔ اس خرید و فروخت کے بعد جب ہم دونوں اکیلے ہ گئے، تو میں نے پوچھا کہ انہیں اپنی خوبصورت بندوقیں یا کیک فروخت کرنے کی کیوں سوچھی؟

”بھائی“ کیا کرتا؟“ وہ بولے۔ ”ڈھیر سارے بل جمع ہو گئے تھے۔ انہیں ادا کئے بغیر یہاں سے کیسے چلا جاتا؟“

”یہ آپ پہلیاں کیوں بھجو رہے ہیں؟“ میں نے جیران ہو کر پوچھا۔ ”یہاں سے کون جا رہا ہے؟ کیوں جا رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟“ ”میں جا رہا ہوں۔ یہ تار مجھے کل شام ملا تھا۔“ ضرار صاحب نے ایک سرکاری ٹیلیگرام میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ پنجاب کے چیف سیکرٹی کا تار تھا، جس میں سید نذیر عالم ڈی۔ آئی۔ جی کے لیے مرکزی حکومت کے یہ احکام درج تھے کہ وہ فوراً بہاولپور روانہ ہو جائیں جہاں پر ایک انتظامی

اہم انکواری ان کے سپرد کی جا رہی ہے۔

میرے استفار پر عالم صاحب نے قیاساً یہ بتایا کہ ممکن ہے یہ انکواری بہاولپور کے سابق وزیر اعظم نواب مشاق احمد گورمانی کے بارے میں ہو۔ کیونکہ کچھ عرصہ سے ان کے متعلق پلک میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

سید نذیر عالم کا یوں اچانک آزاد کشمیر سے چلے جانے کا مجھے بڑا افسوس ہوا۔ ان کی اعلیٰ انتظائی قابلیت کے علاوہ ان کی دیانت داری اور خوش اخلاقی کا درجہ بھی بڑا بلند تھا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد میں اپنی جیپ میں سوار راولپنڈی کی مال روڈ پر گزر رہا تھا تو دیکھا کہ رس کورس کے نزدیک سید نذیر عالم خرامان خرامان گھوڑ سواری کا شوق فرم رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر رک گئے۔ میں نے پوچھا، ”کیا آپ ابھی تک بہاولپور نہیں گئے؟“

”میں لاہور تک تو پہنچا تھا۔“ وہ نہ کر بولے۔ ”وہاں پر کراچی سے حکم آگیا کہ انکواری موقوف ہو گئی ہے۔“

”چلو اچھا ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”اب آزاد کشمیر میں واپس آ جائیے۔“ ”تاں بھائی تاں۔“ انہوں نے کافوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ”میری توبہ۔ ب میں وہاں کیسے آ سکتا ہوں؟“

”وہ کیوں؟“ میں نے حرمت سے پوچھا۔ ”ابتدائے عشق ہی روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا۔“ انہوں نے ذمہ دار انداز سے یہ شعر الاپ کر پڑھا۔

میں نے گلہ کیا کہ ان کی یہ پہلی میری سمجھ میں نہیں آئی۔

”تحوڑی دیر صبر سے کام لو۔“ وہ بولے۔ ”رفتہ رفتہ ساری بات سمجھ لو گے۔“ چند ماہ بعد جنگ بندی کے احکام نافذ ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی طرح طرح کی افواہوں کا تاثرا لگ گیا۔ ایک افواہ جو بہت جلد حقیقت بن گئی یہ تھی کہ بہاولپور کے سابق وزیر اعظم نواب مشاق احمد گورمانی امور کشمیر کے وزیر بن کر راولپنڈی تشریف لا رہے ہیں۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں ”اقوام متحده کا کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان“

(United Nations Commission for India and Pakistan - UNCP) کراچی پہنچا اور اس نے بھارت، پاکستان، مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے قائدین سے رابطہ قائم کر کے مسئلہ کشمیر کا کوئی قابل حل تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک روز اس کمیشن کو آزاد کشمیر حکومت کی جانب سے منگلا کے مقام پر لنج کی دعوت دی گئی۔ کمیشن کے دو رکن امریکہ کے مسٹر ہڈل۔ اور بھیم کے مسٹر جریف سفیروں کا درجہ رکھتے تھے۔ میری یہ ڈیوٹی گلی کہ مشایعت کی غرض سے راولپنڈی سے منگلا تک موڑ کے سفر کے دوران میں ان کے ہمراہ رہوں۔ میں اگلی نشست پر ڈرامائور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھے۔ وہ چند روز قبل نئی دہلی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولہ پٹیل سے مل کر آئے تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے کے اس سفر کے دوران وہ مسلسل ان ملاقاتوں پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ میں بھی آگے بیٹھا کان لگا کر ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ بھارتی قیادت نے چکنی چڑی باتیں کر کے ان دونوں کو کسی طرح سے یہ باور کرایا ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں ہندوستانی فوج صرف دفاعی غرض و غایت سے بیٹھی ہے اور آزاد کشمیر میں پاکستانی اور آزاد افواج کا واحد مقصد جارحیت اور ملک گیری ہے۔ چنانچہ کمیشن کا اولین فرض یہ ہے کہ سب سے پہلے پاکستانی فوج کو آزاد کشمیر سے مکمل طور پر باہر نکلا جائے اور ساتھ ہی ساتھ آزاد مجاہدین کو بھی پوری طرح نہتا کر دیا جائے۔ اب کمیشن کے یہ دونوں مدراراکین موڑکار میں بیٹھے ہوئے سر سے سر جوڑ کر ہندوستان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے عملی تدابیر و وسائل پر انتہائی سنجیدگی سے غور و خوض کر رہے تھے۔ مجھے ان فریب خورہ سفیروں کے ارادوں سے خطرے کی بو آئی۔ منگلا پہنچتے ہی میں نے ایک مختصر سی روپورٹ تیار کی۔ جسے ایک مقامی فوجی یکمپ کے ذرائع رسول و رسال سے فوراً چہدری محمد علی کو بھیج دی۔ ساتھ ہی ایک نقل میں نے وزیر اعظم لیاقت علی

خان کے نام بھی ارسال کر دی۔ وہ کشمیر لبریشن کمیٹی کے صدر تھے اور ہر ماہ راولپنڈی تشریف لا کر اس کمیٹی کی میٹنگ کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے مجھے ان تک براہ راست رسائی حاصل تھی۔ اپنی رپورٹ کی تیسری لفظ میں نے جسٹس دین محمد کی خدمت میں پیش کر دی جو اس کمیٹی کے اہم رکن تھے اور بعد میں اس کے صدر بھی رہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میری اس رپورٹ پر کسی نے کوئی وحیان دیا یا نہیں۔ البتہ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اونٹریو کمیشن (UNICIP) نے ہمیں اپنے ساتھ مذاکرات میں الجھایا ہوا تھا، دوسری جانب بھارت نے اچانک ایک شدید حملہ کر کے وادی مینڈھر ہمارے قبضہ سے چھین لی اور راجوری اور پونچھ شر کو آپس میں مسلک کر لیا۔ پونچھ شر کا محاصرہ جو تقریباً سال بھر سے جاری تھا، ٹوٹ گیا اور وادی مینڈھر اور دوسرے مفتوحہ علاقوں سے دو لاکھ سے اوپر مهاجرین اپنے ہلکے ہلکے سامان کی گھٹڑیاں سروں پر اٹھائے، دشوار گزار پہاڑی راستوں کو پاپیاہ طے کرتے ہوئے پاکستان روانہ ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں، عورتوں اور بوڑھے مهاجرین کے اس قافلے کو بھی انڈین ائیر فورس کے جہازوں نے جگہ جگہ اور بار بار اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد بھارت نے لداخ کے محاذ پر ایک اور شدید حملہ کر کے ہمیں دراس اور کرگل سے نکال کر اسکردو تک دھکیل دیا۔ اس طرح لداخ تحریک کا اپنے صدر مقام لیہ کے ساتھ رابطہ قائم ہو گیا اور جموں سے لیہ تک پورا راستہ بھارت کے قبضہ اختیار میں آگیا۔

یو۔ این۔ کمیشن کے ساتھ صلح صفائی کی گفت و شنید کے دوران بھارت کے ان جارحانہ فوجی پیش قدیموں اور کامیابیوں نے سارے آزاد کشمیر میں خوف و ہراس اور مایوسی کی لہر دوڑا دی۔ آزاد مجاہدین نے آزاد کشمیر میں موجود فوجی کمانڈروں کے ساتھ مل کر بھارت کے مزید جارحانہ عزم کی روک تھام کے لیے کئی دور رس منصوبے بنائے۔ پہلے انہوں نے محاذ پر آگے بڑھ کر کئی ایسے مقامات پر قبضہ جما لیا جمال سے اکھنور اور بیری پتن

میں دشمن کی نقل و حرکت صاف نظر آتی تھی۔ ان حرکات و سکنات سے عیاں ہوتا تھا کہ بھارت بھبھر پر حملہ کرنے کی بھرپور تیاریاں کر رہا ہے۔ ہندوستان کے ان ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے ہماری افواج نے اکھنور اور نوشہ کے درمیان فوجی رسول و رسائل کی سڑک کو کائیں اور مناورتوی کے مغرب میں خاص طور پر چھمب پر حملہ کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ لیکن اے با آرزو کہ خاک شدہ! خدا جانے اس منصوبے کی بھنگ ہندوستان کے کان میں پڑ گئی، یا اس کا علم یو۔ این۔ او کمیشن والوں کو ہو گیا کہ دسمبر کے دوسرے نصف میں کراچی سے اچانک چودھری غلام عباس اور سردار ابراہیم کو بلاوا آگیل۔ میں بھی ان کے ہمراہ کراچی گیا۔ وہاں پر وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے ہاں ایک ہنگامی میٹنگ تھی، جس میں وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں بھی موجود تھے۔ میں خود تو اس میٹنگ میں موجود نہ تھا، لیکن بعد ازاں اس کا احوال چودھری غلام عباس کی زبانی سن۔ دونوں کشمیری لیڈروں کو حکومت پاکستان کے اس فیصلے سے آگاہ کیا گیا کہ کشمیر میں جنگ بندی کی تجویز مان لی گئی ہے اور سیز فائر کے احکامات کیم جنوری ۱۹۴۹ء سے نافذ ہو جائیں گے۔ یہ فیصلہ کشمیری لیڈروں سے مشورہ کئے بغیر اور ان کو اعتقاد میں لیے بغیر ہی کر لیا گیا تھا۔ غالباً دونوں لیڈر چھمب پر حملے کی تیاریوں سے کسی قدر آگاہ تھے۔ اس لیے چودھری غلام عباس نے دریافت کیا کہ اس خاص موقع پر جنگ بندی کا فیصلہ تسلیم کرنے میں کوئی خاص وجوہات یا مصلحتیں ہیں؟ اس موضوع پر چودھری غلام عباس اور چودھری ظفر اللہ خاں میں خاصی گرامکرم بحث شروع ہو گئی، بلکہ تلخ کلامی تک نوت آگئی۔ لیکن فیصلہ اپنی جگہ برقرار رہا اور دونوں کشمیری قائدین اپنا سامنہ لے کر کراچی سے واپس آگئے۔

وہ دن اور آج کا دن۔ کیم جنوری ۱۹۴۹ء سے مسئلہ کشمیر یو۔ این۔ او کی قدیمی دستاویزوں کے محافظ خانے میں سال بہ سال جمع ہو کر مقلع ہوتا گیا۔ پھر ۱۹۶۶ء میں اسے معاهدہ تاشقند کے تابوت میں ٹھونس دیا گیا۔ چھ برس بعد معاهدہ شملہ نے اس تابوت میں غالباً

آخری کیل بھی گاڑ دی۔ اسے آخری کیل کا نام میں نے اس لیے دیا ہے کہ ہندوستان اتنا نازک مزاج ہو گیا کہ مسئلہ کشمیر کی کمھی اب اپنی ناک پر بیٹھنے نہیں دلتا۔ اگر ہم کسی بین الاقوامی فورم پر مسئلہ کشمیر کا ذکر تک کر بیٹھیں تو بھارت کو پاکستان کی سرحدوں پر جنگ کے بادل منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کشمیر کا نام لینا ہندوستان کے اندر وہی معاملات میں دخل دینے کے مترادف ہو گیا ہے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام  
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

جنگ بند ہوتے ہی ہم نے حکومت آزاد کشمیر کا ہیڈ کوارٹر جنجال ہل (تراڑخیل) سے مظفر آباد منتقل کر لیا۔ کچھ دفاتر پرانی ضلع کچمری کے چند ٹوٹے پھوٹے کروں میں سا گئے۔ باقی دفتروں کے لیے اسی عمارت کے احاطے میں بست سے خیے نصب ہو گئے۔ قریب ہی ایک ٹیلے پر سرکاری ملازموں کے لیے خیموں کی ایک رہائشی کالونی بھی وجود میں آگئی۔ ان سب کے لیے ایک مشترکہ باورچی خانہ تھا اور سب کے لیے کھانے کا ایک بڑے خیمه میں مشترکہ بندوست تھا۔

مظفر آباد آ کر امن و امان کی فضا میں سانس لیتے ہی ہمیں پہلی بار آزاد کشمیر میں ٹیلیفون کی ضرورت کا احساس دامن گیر ہوا۔ میں نے مری آ کر مقامی پوسٹ آفس سے ٹنک کال کر کے سردار عبدالرب نشرت کی خدمت میں آزاد کشمیر کی اس ضرورت کے متعلق گذارش کی تو چند روز بعد وہ مرکزی محلہ ٹیلیفون کے چند بڑے افران کرام کو ہمراہ لے کر خود ہی مظفر آباد تشریف لے آئے۔ یہاں پر انہوں نے حالات کا جائزہ لے کر مظفر آباد کے علاوہ آزاد کشمیر کے دوسرے اہم مقامات پر بھی ٹیلیفون کا نایت اچھا نظام رائج کرنے کے خصوصی احکام جاری کر دیئے۔ نشرت صاحب پاکستان کے پہلے مرکزی وزیر تھے جنہوں نے آزاد کشمیر میں قدم رنجا فرمایا تھا۔

جنگ بندی کا اعلان ہوتے ہی مرکزی وزراء کرام نے جان کی امان پائی اور جو ق در جو ق اپنے ورد مسعود سے آزاد کشمیر کی سرنیشن کو سرفراز فرمائے گے۔ دو وزریوں کا دورہ خاص طور پر میرے دل پر نقش ہے۔ ان کی آمد پر دو میل کے پاس کئی سو افراد ان کے والہانہ استقبال کے لیے پل کے قریب جمع ہو گئے۔ دونوں وزری کار سے نیچے اتر کر کچھ لوگوں سے ہاتھ ملانے گے، تو ایک چھوٹے موٹے جلسہ عام کی صورت پیدا ہو گئی۔ مسلم کافرنیس کے چند کارکنوں نے بڑی جوشیلی استقبالی تقریروں کیں۔ سامعین میں سے ایک بزرگ صورت شخص نے اٹھ کر رفت بھری آواز میں کہا: جناب پاکستان ایک عظیم ملک ہے۔ آزاد کشمیر تھوڑا سا علاقہ ہے۔ آپ اس علاقے کو لیبارڈی اور ہم لوگوں کو تجرباتی چوبوں کی طرح استعمال میں لا کیں۔ اسلامی احکامات اور قوانین کو پہلے یہاں آزمائیں اور پھر اس تجربہ کی روشنی میں انہیں پاکستان میں نافذ کرنے کا سوچیں۔

اس بوڑھے کی یہ بات سن کر سارا مجمع نائے میں آگیا۔ پھر اچانک دونوں میں سے ایک وزیر باتدیپ، جوش و خروش سے اٹھ کر فصاحت و بلاغت کے دیبا بھانے گے۔ جوش خطابت میں انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک لاکٹ نما سی چیز نکال کر مجمع کے سامنے لہرائی اور بولے: بھائیو، آپ اور ہم کس کھیت کی مولی ہیں کہ اللہ کے قانون کو آزمائنا کر تجربہ کریں۔ یہ دیکھو یہ اللہ کا قانون ہے جو چودہ سو برس پہلے نافذ ہو چکا ہے اور جس پر عمل کرنا ہم سب کا دینی، اخلاقی اور ایمانی فرض ہے.....” وزیر صاحب کی تقریر میں اسلامی جذبات ایسی شدت سے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے کہ سامعین میں سے چند حقیقی القلب لوگ بے اختیار روپڑے۔

واپسی پر احتراماً میں ان دو وزریو صاحبان کو کوہاٹ کے پل تک چھوڑنے کے لیے ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ ایک وزیر نے دوسرے وزیر کی شاندار تقریر پر تحسین و آفرینش کے ڈونگرے برسانے کے بعد پوچھا: ”بھائی صاحب، آپ کے پاس قرآن شریف کا لاکٹ بڑا خوبصورت ہے، یہ تاج کمپنی کا بنا ہوا ہے یا کسی اور کا؟“

دوسرے وزیر صاحب کھلکھلا کر ہنسے اور لاکٹ جیب سے نکال کر بولے۔ ”اے کہاں بھائی صاحب، یہ تو مخفی سگریٹ لائٹر ہے؟“

وزیروں کی یہ جوڑی ملک غلام محمد اور نواب مشتاق احمد گورانی پر مشتمل تھی۔

URDU4U.COM

سیکرٹری جزل کے طور پر میں نے آزاد کشمیر کا پہلا بجٹ بنایا۔ آمنی کا تخمینہ پچاس سالھ ہزار روپے کے قریب تھا اور اخراجات کا اندازہ دو لاکھ روپے کے لگ بھگ تھا۔ حکومت پاکستان سے ایک لاکھ تیس ہزار روپے کی امداد حاصل کرنے کے لیے میں اپنا بجٹ لے کر کراچی میں حکومت پاکستان کے سیکرٹری جزل چودھری محمد ولی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے اس بات پر ڈالنا کہ میں نے اپنے عمدے کا نام چیف سیکرٹری کی بجائے سیکرٹری جزل کیوں رکھ چھوڑا ہے؟ میں نے معافی مانگ کر گزارش کی کہ اب تو یہ غلطی ہو گئی ہے۔ فوری طور پر کوئی تبدیلی کرنا مناسب نہیں۔ میرے بعد بے شک اس اسمی کا نام چیف سیکرٹری رکھ دیا جائے۔ چنانچہ اب یہ عمدہ اسی نام سے موسم ہے۔

میرے بنائے ہوئے بجٹ پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر چودھری صاحب نے کافنوں کا لپنہ میز پر دے ما را اور کسی قدر ترشی سے بولے۔ ”ایک لاکھ تیس ہزار روپے کی رقم پاکستان کے درختوں پر نہیں اگتی۔ تمہارا فرض ہے کہ تم مقامی وسائل کو کام میں لا کر اپنے بجٹ کی ضروریات پوری کرو۔“

جنگ کی وجہ سے مقامی طور پر غیر معمولی دشواریاں کا رونا رو کر میں نے مزید منت سماجت کی، تو چودھری صاحب کسی قدر پیچے اور انہوں نے بڑی مشکل سے مبلغ نوے ہزار روپے کی امداد منظور کی۔ یہ منظوری لے کر میں عبدال قادر صاحب کے پاس پہنچا جو اس زمانے میں وزارت فناں میں غالباً جائش سیکرٹری تھے۔ بعد میں وہ پاکستان کے وزیر خزانہ بھی رہے۔ انہوں نے میرے سامنے راولپنڈی میں شجاعت علی صدیقی ملٹری اکاؤنٹنٹ جزل کو ٹیلیفون کر دیا کہ وہ فلاں فنڈ سے آزاد کشمیر حکومت کو نوے ہزار روپے کی رقم ادا

کر دیں۔ آزاد کشمیر کے ساتھ لین دین کے معاملات میں صدیقی صاحب "محتب" کھلاتے تھے۔

شجاعت علی صدیقی صاحب بھی مردِ مومن کی ایک جیتی جاگتی اور پر اثر تصویر تھے۔ مسجدیں تعمیر کرنا اور انہیں بنا سنوار کر آباد رکھنا ان کا محبوب مشغله تھا۔ میں جتنی بار ان سے ملنے کے دفتر یا گھر گیا ہوں، تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ نماز کا وقت آنے پر وہ وہیں پر باجماعت نماز کا اہتمام کر لیتے تھے۔ ان کا رہن سمن انتہائی سادہ اور ظاہر و باطن شیشے کی طرح صاف اور شفاف تھا۔ سنا ہے کہ راولپنڈی میں سیٹلائز ٹاؤن قائم کرنے کا منصوبہ انہی کے ذہن رسائی کی اختراع تھا۔

آزاد کشمیر میں ضلع کی سطح پر کامِ سنبھالنے کے لیے ہم نے پنجاب گورنمنٹ سے چند پی۔ سی۔ ایس افسر ڈیپوٹیشن پر بھی لیے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کا نام کیپن میاں محمد سعید تھا۔ ۱۹۵۲ء کے دوران جب میں جنگ کا ڈپٹی کمشنر تھا، تو حسن اتفاق سے یہ بھی ضلع میں متعین تھے۔ ۱۹۳۸ء میں پہلی بار آزاد کشمیر میں میرے ان کے ساتھ نہایت خوشگوار تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ میاں صاحب بے حد صاف گو، بے باک محنتی اور دیانت دار افسر تھے۔ ایک بار انہیں راولپنڈی سے پچاس ہزار روپے کی رقم دے کر تنخواہیں تقسیم کرنے کے لیے لپندری بھیجا گیا۔ سڑک بھی خراب تھی اور بارش بھی موسلا دھار برس رہی تھی۔ آزاد کشمیر کے علاقے میں جیپ چسل کر ایک گھری کھنڈ میں جاگری۔ میاں سعید کے نہایت شدید زخم آئے اور بہت سی ہڈیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ اپنی تکلیف بھلا کر انہوں نے پچاس ہزار روپے کی رقم کا بیگ اپنی بغل میں دبایا اور اس کی حفاظت کرنے کے لیے مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔ حادثہ کی خبر سن کر آس پاس کے بہت سے دیہاتی بھی جائے وقوع پر جمع ہو گئے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ شدید زخموں کے باوجود میاں صاحب سرکاری رقم کی حفاظت کی وجہ سے پریشان ہیں تو سب نے مل کر بہیک آواز درخواست کی کہ وہ آرام سے لیٹ جائیں۔ یہ رقم بیت المال

کی امانت ہے۔ اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ کئی گھنٹوں کے بعد جب ایک امدادی ٹیم وہاں پہنچی تو میاں صاحب زخمیوں کی تاب نہ لاء کر نڈھال ہو چکے تھے اور سرکاری رقم دہماتیوں کی حفاظت میں جوں کی توں موجود تھی۔

جس مقام پر اب منگلا ڈیم واقع ہے، وہاں پر پہلے میر پور کا پرانا شر آباد تھا۔ جنگ کے دوران اس شر کا بیشتر حصہ ملے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ ایک روز میں ایک مقای افسر کو اپنی جیپ میں بٹھائے اس کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا۔ راستے میں ایک مفلوک الحال بوڑھا اور اس کی بیوی ایک گدھے کو ہائکتے ہوئے سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دونوں کے کپڑے میلے کچھیلے اور پھٹے پرانے تھے۔ دونوں کے جوتے بھی ٹوٹے پھوٹے تھے۔ انہوں نے اشارے سے ہماری جیپ کو روک کر دیافت کیا۔ ”بیت المال کس طرف ہے؟“ آزاد کشمیر میں سرکاری خزانے کو بیت المال ہی کہا جاتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”بیت المال میں تمہارا کیا کام ہے؟“

بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا۔ ”میں نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر میر پور شر کے ملے کو کرید کرید کر سونے اور چاندی کے زیورات کی دو بولیاں جمع کی ہیں۔ اب انہیں اس کھوٹی پر لاو کر ہم بیت المال میں جمع کروانے جا رہے ہیں۔“

ہم نے ان کا گدھا ایک پولیس کا نشیبل کی حفاظت میں چھوڑا اور بوریوں کو جیپ میں رکھ کر دونوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیا تاکہ انہیں بیت المال لے جائیں۔

آج بھی جب وہ نحیف و نزار اور مفلوک الحال جوڑا مجھے یاد آتا ہے تو میرا سر شرمندگی اور ندامت سے جھک جاتا ہے کہ جیپ کے اندر میں ان دونوں کے برابر کیوں بیٹھا رہا۔ مجھے تو چاہیے تھا کہ میں ان کے گرد آلوو پاؤں اپنی آنکھوں اور سر پر رکھ کر بیٹھوں۔ ایسے پا کیزہ سیرت لوگ پھر کھاں ملے ہیں؟

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخ نیبا لے کر

یو این کمیشن کے ایک سب کمیشن نے ”مقوضہ کشمیر“ اور ”آزاد کشمیر“ میں نظم و نسق

کی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے دونوں علاقوں کے تفصیلی دورے کے تھے۔ سب کمیشن کا ایک رکن مسٹر رچرڈ سائمنڈز تھا، جو ۲۹۳۴ء میں تخط بگال، سیلاب اور سائیکلوں کی تباہ کاریوں کے بعد فرینڈز ایمبولنس یونٹ (friends Ambulance Unit) کی جانب سے تملوک میں میرے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اس وجہ سے ہماری آپس میں تھوڑی سی بے تلفی تھی۔ یہ وہی مسٹر سائمنڈز ہیں جو Making of Pakistan کے مصنف بھی ہیں۔ پاکستان پر انگریزی میں یہ اگر پہلی نہیں تو اولین چند کتابوں میں سے ایک ضرور ہے۔ آزاد کشمیر کے لظم و نق میں ہمارے پاس کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جو ہم بڑھا چڑھا کر سب کمیشن کے سامنے نمائش کے طور پر پیش کر سکتے۔ ہماری ایڈنٹریشن سادہ تھی۔ افسر دیانت دار اور محنتی تھے۔ لوگ جہاد کے جذبہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ دشمن کے حق میں شمشیر بے نیام اور آپس میں ہمدرد اور غنوار تھے۔ مقبوضہ کشمیر سے واپسی کے بعد ایک بار مسٹر سائمنڈز نے مجھے اعتماد میں لے کر کہا، اس جانب رقبہ زیادہ، وسائل بے شمار اور ہندوستان کی سهل اور فوجی پشت پناہی بے حساب ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کے بیشتر امور میں زور اور زردستی، دھونس اور دھاننی، بے صبری، بے ایمانی اور نمائشی ملمع کاری کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ فرق اپنی رپورٹ میں واضح طور پر بیان کریں گے؟ وہ بہس کر ٹال گئے اور بولے ”ہمارا مقصد فرق نمایاں کرنا نہیں بلکہ پڑا برابر رکھنے کی کوشش کرنا ہے!“

جنگ بندی کے بعد بہت جلد آزاد کشمیر سے میرا جی بھر گیا۔ اسی زمانے میں راولپنڈی میں وزارت امور کشمیر نئی نئی قائم ہوئی تھی اور نواب مشتاق احمد گورمانی اس کے وزیر انچارج تھے۔ وزارت کا دفتر ضلع کچھری کے مقابل ایک متروکہ عمارت ”شزارہ کوٹھی“ میں کھولا گیا تھا۔ گورمانی صاحب کی رہائش اس شاندار بلڈنگ میں تھی جسے چودھری نفضل الہی کے زمانے میں ایوان صدر کے طور پر استعمال میں لایا گیا تھا۔ آزاد کشمیر سے مجھے کسی قدر

اکتیا ہوا دیکھ کر چھڈری محمد علی نے مجھے ڈپنی سیکرٹری کے طور پر وزارت امور کشمیر میں معین کر دیا۔

اس زمانے میں گورمانی صاحب کی بہت سی ادائیں نزالی تھیں۔ وہ رات بھر جاگ کر اپنا دبابر لگاتے اور دن بھر سوتے تھے۔ ان کے اس لائجہ عمل کی پابندی نبھانا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے وہ میرے ساتھ ہمیشہ ناخوش ہی رہتے تھے۔  
مسئلہ کشمیر کے حوالے سے گورمانی صاحب کے ہاتھ میں کوئی ایسا کام نہ تھا جس میں وہ اپنی ثبت صلاحیتوں کو بروائے کار لا سکتے۔ چنانچہ ان کی توجہ کا سارا نزلہ بچارے آزاد کشمیر پر ہی گرا۔ یہاں پر ان کی حکمت عملی اور ریشه دو ایں نے آزاد کشمیر کی قیادت میں ایسے ایسے تفرقے ڈالے جو آج تک رفع نہیں ہو سکے۔ رفتہ رفتہ مندرجی آف کشمیر افیئرز Ministry of Kashmir Affairs کی بابت یہ پھتنی زبان زد خاص و عام ہو گئی کہ اس کے دائے عمل سے کشمیر تو غائب ہو گیا ہے اور اب اس کے پاس فقط افیئرز Affairs ہے گئے ہیں!

ایک بار سری پرتاب کالج سرینگر کا ایک بنی ایس۔سی کا طلب علم ہندوستان کے غاصبانہ قبضہ کی گھنٹن سے بچ آ کر آزادی کا سانس لینے پاپیا وہ گرتا پڑتا سیز فائز لائن عبور کر کے پاکستان آ پہنچا۔ راولپنڈی پہنچ کر وہ مجھے ملا اور اپنی ولی خواہش یہ بیان کی کہ آزاد پاکستان کے کسی وزیر سے مل کر اس کی نیادوت کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کوشش کر کے گورمانی صاحب کے ساتھ اس کی ملاقات کی منظوری حاصل کر لی۔ ملاقات کا وقت رات کے ڈیڑھ بجے مقرر ہوا۔ جون کا مینہ تھا۔ آدمی رات گئے بھی شدید گری تھی۔ میں اس لڑکے کو ساتھ لے کر مقررہ وقت پر گورمانی صاحب کی شاندار قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ گورمانی صاحب کے کمرے میں کئی شن کا ائیر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ وہ گلے میں ایک سرخ ریشم کے اسکارف باندھے اور جسم پر ایک پٹینے کی چادر لپیٹے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ان کا محبوب حقہ پڑا تھا، جس کے خوبصوردار تمباکو

کی ملک سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کشمیری لڑکے کو دیکھتے ہی گورمانی صاحب کا مزاج براہم ہو گیا اور انہوں نے اس پر پے در پے اس قسم کے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی: تم سرینگر چھوڑ کر کیوں آئے ہو؟ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے اور کس مقصد کے لیے بھیجا ہے؟ واپس کب جاؤ گے؟ کیسے جاؤ گے؟ اور یہاں سے کیا لے کر جاؤ گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہ غیر متوقع سوالات سن کر بچارا لڑکا بوکھلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس نے صرف اتنا وجہ دیا کہ وہ صرف آزاد فضا میں سانس لینے یہاں آیا ہے۔ اب واپس جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں۔

یہ سن کر گورمانی صاحب کو پھر تاؤ آگیا اور کسی قدر درشتی سے بولے۔ ”پاکستان میں مهاجرین کی پہلے ہی کوئی کمی نہیں۔ خدا کا خوف کرو۔ یہ نوزاںیہ مملکت اس سیالاب کو کیسے سنبھالے گی؟“

اس کے بعد انہوں نے مهاجرین کی تکالیف اور مشکلات پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور انگریزی میں لڑکے کو مخاطب کر کے کہا:

“Now that You have come, do'nt expect luxuries.  
All of us have to rough it out here.”

یہ سن کر لڑکے کی رُگ طرافت بھی پھڑک اٹھی اور اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

“Sir, If this room is roughing it out here, I am all for it!”  
اس پر میں لڑکے کا بازو کھینچ کر اسے باہر لے آیا۔ ورنہ طیش میں آ کر گورمانی صاحب نہ جانے اس کا کیا حشر کرتے۔

گرمی کی چھٹیوں کے بعد جب کالج کھلے، تو میری درخواست پر اسے لاہور کے سنگ ایڈورڈ کالج میں داخلہ مل گیا۔ آزاد کشمیر حکومت نے اسے وظیفہ دے دیا۔ لڑکا قابل تھا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے انگلستان چلا گیا اور آجکل ایک کامیاب اور خوشحال ڈاکٹر کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

چند ماہ بعد وزیر اعظم لیاقت علی خاں کشمیر لبریشن کمیٹی کی صدارت کرنے را ولپنڈی تشریف لائے۔ میلنگ ختم ہونے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے پاس روک لیا۔ جب وہ اکیلے وہ گئے تو فرمایا۔ ”تمہارے وزیر گورمانی صاحب تم سے اس قدر ناخوش کیوں رہتے ہیں؟“ میں نے عرض کیا۔ ”سر، میرے خیال میں اس کی شدید دوجوہات ہوں گی۔ ایک تو وہ رات کو کام کرتے اور دن میں سوتے ہیں۔ اس پروگرام میں ان کا ساتھ دینے سے میں بار بار چوک جاتا ہوں۔ دوسری وجہ شاید یہ ہو کہ وہ آزاد کشمیر کے سیاسی لیڈروں کو آپس میں لڑاتے بھڑاتے رہتے ہیں۔ اس کارروائی میں میری روک ٹوک غالباً انہیں پسند نہیں آتی۔“

وزیر اعظم کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر اچانک انگریزی میں پوچھا۔

Tell me, is Gurmani Straight?

میں نے فوراً جواب دیا۔ ”No, Sir. He is not straight.“

وزیر اعظم نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ پھر آہستہ آہستہ دھواں چھوڑتے ہوئے سمجھی دی گئی سے بولے:

”I do not agree with you. He is as straight as a crokscrew!“

اس گفتگو کے چند ہفتے بعد میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ جماں پر مجھے وزارت اطلاعات و نشریات میں فارن پبلیشن کا انچارج ڈپٹی سیکرٹری لگا یا گیا۔

## • صلہ شہید

جب میری پونٹ کراچی میں وزارت اطلاعات و نشریات کے ڈپٹی سیکرٹری کے طور پر ہوئی تو آزاد کشمیر کی کھلی فضا کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک پنجرے میں بند ہو گیا ہوں۔

خواجہ شباب الدین صاحب وزیر تھے۔ مسٹر جی، احمد سیکرٹری اور شیخ محمد اکرم صاحب جائش سیکرٹری تھے۔ اکرم صاحب بڑے علم فاضل، شریف الطبع اور نیک دل انسان تھے۔ مسٹر جی، احمد بھی پڑھے لکھے آدمی تھے اور ان کے پاس کتابوں کا بڑا عمدہ ذخیرہ تھا۔ ان کا تعلق پولیس سروس سے تھا، اور Intelligence کے کام میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ طبع وہ اپنے زیردستوں سے کھنچے کھنچے اور زردستوں کے سامنے جھکے جھکے رہتے تھے۔ جو فائل اور مسٹر یا پرائم مسٹر تک جانی ہو، اس کی نوک پلک سنوارنے میں وہ خاص محنت کرتے تھے۔ نیچے کی سطح کی فائلوں پر ٹھیٹ پولیس آفیسر کی طرح فقط احکامات صادر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو کسی قدر شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا بھی ان کا شیوه تھا۔ البتہ سفید قام غیر ملکیوں کی طرف عموماً اور امریکینوں کی طرف خصوصاً ان کا دل بڑے خضوع و خشوع سے فرش را رہتا تھا۔

ایک روز مسٹر جی۔ احمد نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ ان کے پاس ایک ادھیز عمر کا موٹا سا امریکین بیٹھا تھا۔ مسٹر جی۔ احمد نے کہا کہ یہ ہمارے ایک معزز مہمان ہیں۔ میں انہیں شاف کار میں اپنے ساتھ لے جا کر کراچی شر کی سیر کر لاؤں۔

کار میں بیٹھ کر میں نے یونہی اخلاقاً اس کا اسم شریف دیافت کیا، تو وہ بگڑ گیا، اور بڑی تیزی سے بولا۔ ”تمہیں میرے نام سے کیا واسطہ؟“  
”اس سے گفتگو میں آسانی ہو گی۔“ میں نے وضاحت کی۔  
”گفتگو کون کرنا چاہتا ہے؟“ امریکین نے غصے سے کہا۔ ”خیر، تمہیں اتنا ہی اصرار ہے،“

تو مجھے ہنری کہہ کر پکار سکتے ہو۔“

کچھ دیر خاموشی کے بعد میں نے دوسری غلطی یہ کی، کہ اس سے پوچھ بیٹھا، ”کیا آپ صحافی ہیں؟“ ”میں نہ یور اون بنس“ ہنری نے چڑ کر کہا۔

اس کے بعد ہم دونوں لب بستہ ہو کر بیٹھ گئے۔ ہنری کے اشارے پر ہماری کار پلے امریکی سفارت خانے گئی۔ مجھے کار میں چھوڑ کر وہ اندر چلا گیا اور کوئی ایک گھنڈ کے بعد واپس آیا۔ اب اس کے ساتھ ایک اور امریکی بھی تھا۔ وہ دونوں چھلکی سیٹ پر بیٹھ گئے اور مجھے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کا حکم دیا۔ دوسرا امریکین غالباً سفارت خانے میں کام کرتا تھا کیونکہ وہ کراچی شر سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی ہدایات پر ڈرائیور نے ہمیں ”کلفشن“، ”کیماڑی“، ”بندر روڈ“، ”ہاکس بے“ اور ”سینڈنپٹ“ کی سیر کرائی۔ میری موجودگی کو یکسر نظر انداز کر کے دونوں امریکی آپس میں مزے مزے کی خوش گپیاں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے صرف ایک کام کی بات میرے پلے پڑی، وہ یہ کہ امریکہ پاکستان کو گندم کی امداد دے رہا ہے۔ جب یہ گندم کراچی پہنچے گی تو جن اونٹ گاڑیوں پر لاد کر بندرگاہ سے نکالی جائے گی، ان اونٹوں کے گلے میں ”تحمینک یو امیرکہ“ کی تختیاں آؤیں گی۔

یہ احتمالہ تجویز سن کر مجھے غصہ بھی آیا، رنج بھی ہوا، شرم بھی آئی۔ اس وقت تو میں چپ رہا لیکن اگلے روز سیدھا مسٹر جی۔ احمد کے پاس جا کر انہیں ساری رسیداد سناؤالی۔ جب میں نے اونٹوں کے گلے میں شکریہ کی تختیاں لٹکانے کا مذاق اڑایا تو مسٹر جی۔ احمد یا ایک سنجیدہ ہو گئے اور گرجدار آواز میں بولے۔ ”تمہیں اس میں کیا ہرج نظر آتا ہے؟“

میں نے اس تجویز کے خلاف ایک چھوٹی سی جذباتی سی تقریر کی تو مسٹر جی۔ احمد کے چہرے پر بناوٹی کٹہ نہیں کا تمسم لہرایا اور انہوں نے طنزآ کہا، ”گندم مانگ کر کھانے میں تو کوئی برائی نہیں لیکن شکریہ ادا کرنے کا برا مناتے ہو۔“

”نہیں سر۔ ہم تو کوئی برا نہیں مناتے، لیکن شاید اونٹ برا مان جائیں۔“ گمرا گرمی کی

لپیٹ میں آ کر میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دے دیا۔

غالباً یہ بات مجھے اس طور پر نہیں کہنی چاہیے تھی۔ کیونکہ اس نے میری ذات کو مشرب جی۔ احمد کے دماغ کے اس کاک میں بٹھا دیا جہاں پولیس والے ناپسندیدہ افراد کو رکھنے کے عادی ہیں۔ یوں بھی اس نمانے میں ماحول کا رنگ کچھ ایسا بتتا جا رہا تھا کہ امریکیوں کی کسی خفیف حرکت پر معمول سا جائز اعتراض بھی بڑی آسانی سے غیر حب الوطنی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا تھا۔

ایک روز میری ڈیوٹی گلی کہ میں امریکی صحافیوں کے ایک گروپ کے ساتھ مغربی پاکستان کے دورے پر جاؤں۔ دونہ بڑا کامیاب رہا۔ ہم لاہور، راولپنڈی پشاور اور طورخم تک گئے۔ ہر جگہ مقامی حکام نے بڑی خاطر مدارت کی۔ صحافی بڑے خوش خوش واپس آئے۔ کراچی پنج کر گروپ کے لیڈر نے مجھے ایک سو ڈالر کا نوٹ پیش کیا۔ میرے انتفار پر اس نے بتایا کہ یہ میرا ”ٹپ“ ہے۔ میں نے شکریہ کے ساتھ نوٹ واپس کر دیا اور کہا کہ ”ٹپ“ کے حقدار تو ہوٹلوں کے یہرے اور خدمت گار ہوتے ہیں۔ ایک سرکاری ملازم کو ”ٹپ“ کی پیشکش کرنا اس کے لیے عزت کا باعث نہیں۔ گروپ کے لیڈر نے کسی قدر جھینپ کر نوٹ واپس لے لیا۔ چند روز بعد جب میں انہیں الوداع کھنے ائیرپورٹ گیا، تو انتظار گاہ میں بینہ کر گروپ لیڈر نے اس مسئلہ پر میرے ساتھ کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی۔ اس نے بتایا کہ اب اس نے ”ٹپ“ ”بجنشش“ اور ”نذرانہ“ کے فلفہ کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ ”ٹپ“ بیرون اور خدمتگاروں کو دیا جاتا ہے۔ ”بجنشش“ بھک منگوں کے لیے مخصوص ہے، اور ”نذرانہ“ سرکاری ملازمین کا حق ہے۔ اس نے بتایا کہ دو تین حضرات تو ان سے مانگ مانگ کر کچھ نذرانہ وصول کر چکے ہیں۔ ایک صاحب نے تو اپنی کسی احتیاج کا روتا رو کر ان پر پانچ سو ڈالر کے ”نذرانہ“ کا تاوان لگایا۔

لیکن کسی قدر مول تول کے بعد ایک سو ڈالر پر بڑی خیر سگالی سے معاملہ طے ہو گیا! امریکہ کی مضبوط کرنی کے ساتھ ہماری نئی نئی شناسائی بڑی تاریخی دم تھی۔ ڈالر کی چکا چوند سے آنکھوں کا خیرہ ہونا تجھ کی بات نہیں۔ ”ٹپ“ ”بجنشش“ اور ”نذرانہ“ کے

اسی تانے بانے نے بین الاقوامی ایڈ اور ٹریڈ کا وہ طلسماتی جال بننا تھا، جس میں آج ہماری قوم کا بال بال کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپے کے قرضہ میں بڑی بے کسی سے بندھا ہوا ہے۔

ایک روز مسٹر جی احمد نے صبح سویرے مجھے گھر پر ٹیلیفون کیا کہ میں دفتر نہ آؤں بلکہ سیدھا ہو ٹل میزروپول چلا جاؤں۔ وہاں پر حکومت کے ایک نہایت معزز اور اہم مہمان مسٹر پیکٹر بولیتو ٹھرے ہوئے ہیں۔ میں ان کے پاس جا کر ان کے آرام و آسانش کا پورا پورا خیال رکھوں۔ ہو ٹل کے کمرے میں ایک بڑھاپے اور فربی کی طرف مائل صاحب کسی قدر جنبھلاہٹ کے عالم میں صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ایک خوش صورت نوجوان بھی بیزار سا بیٹھا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کی خدمت گزاری کے لیے حاضر ہوا ہوں تو نوجوان نے فوراً کہا۔ ٹھیک ہے، تم جلدی سے ہمارے جوتے پاش کرا دو۔“

بیرے کو بلانے کے لیے میں گھنٹی بجانے کو اٹھا تو نوجوان نے بڑے غصے سے آواز بلند کر کے کہا۔ ”گھنٹی تو ہم خود بھی بجا سکتے تھے۔ تمہارے آنے سے ہماری سوالت میں کیا اضافہ ہوا؟“

میں نے نہایت فرمانبرداری سے جوتے اٹھائے اور باہر آ کر بیرے کو دیئے کہ جلدی سے اچھی طرح پاش کر دے۔ جوتے پاش ہو گئے تو میں کمرے میں واپس آ کر دویاں بیٹھنے ہی لگا تھا کہ نوجوان نے پھر مجھے جھڑک دیا۔ ”یہاں کیوں گھٹتے ہو؟ تمہارے یہاں بیٹھنے سے ہمارے کام میں ہرج ہوتا ہے۔ تمہیں بیٹھنا ہی ہے تو کہیں اور جا کر بیٹھو۔“

میں چکے سے کان لپیٹ کر باہر آ گیا۔ برآمدے میں دیکھا کہ شیخ محمد اکرم صاحب بھی خراماں خراماں اسی کمرے کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ حکومت پاکستان کی دعوت پر مسٹر پیکٹر بولیتو انگلستان سے تشریف لائے ہیں اور قائداعظیم کی سوانح عمری لکھنے کا کام ان کے سپرد ہوا ہے۔ مختارہ مس فاطمہ جناح نے ان سے ملنے اور انہیں قائداعظیم کے ذاتی کاغذات دکھانے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے بولیتو صاحب

کا مزاج بہم ہے۔ ہمیں ان کا "موڈ" خوشنگوار رکھنے کی ہر ممکن تدبیر کرنا چاہیے۔ اس وقت تک میں نے مصنف کے طور پر مشریق بولیتھو کا نام تک نہیں تھا۔ چند پڑھے لکھے دوستوں سے پوچھ گئے کی، تو انہوں نے بھی اپنی لائگنی کا اظہار کیا۔ آخر انگریزی ادب کے ایک "Who is Who" کی ورق گردانی سے منکشf ہوا کہ موصوف سرکاری دبابری قسم کے ادیب ہیں۔ چند غیر معروف ناولوں کے علاوہ انہوں نے زیادہ تر انگلستان کے شاہی خاندان کے افراد اور دیگر مختلف امرا اور روسا کی سوانح عمریاں تحریر کی ہیں۔

مشریق بولیتھو صفحہ اول کے ادیب تو نہ تھے لیکن انہیں روایتی طرز کی سوانح نگاری پر اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔ لیکن اس وقت بہت سے دوسروں کی طرح مجھے بھی اس انتخاب پر مایوسی ہوئی تھی۔ محترمہ مس فاطمہ جناح کو بھی غالباً یہی اعتراض تھا کہ قوی اہمیت کے اس کام کے لیے ایک غیر ملکی شخص کو کیوں چنا گیا ہے۔ لیکن ۱۹۵۳ء میں جب مشریق بولیتھو کی کتاب لندن میں ایک معروف پیلسنگ ہاؤس سے شائع ہوئی تو بے شک اس نے پیرون ملک پاکستان کو متعارف کرنے میں ضرور کسی قدر مدد دی۔" محترمہ فاطمہ جناح کی اپنی خواہش یہی تھی کہ قائد اعظم کی سوانح حیات کسی پاکستانی اہل قلم کے ہاتھوں مرتب ہو۔ پچھلے تین بیس میں کچھ کتابیں لکھی ضرور گئی ہیں۔ قائد اعظم کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریب پر بھی بہت سی فرمائشی کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ لیکن ابھی تک ایسی کوئی کتاب اردو، انگریزی یا کسی اور زبان میں شائع نہیں ہوئی جو اس عظیم رہنماء کی سیرت، کردار اور سیاست کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتی ہو۔ قائد اعظم اکیڈمی نے ایک مفصل اور مکمل سوانح حیات تیار کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اب دیدہ باید کہ یہ بیل کب تک، کہاں تک اور کس طرح منڈھے چڑھتے ہے۔

مادر ملت کے ذاتی کاغذات میں البتہ ایک مسودہ ضرور موجود ہے، جس کا عنوان "Brother

My "میرا بھائی" ہے۔ اسے انہوں نے مسٹر جی الانا کے تعاون سے تحریر کیا تھا۔ قائد اعظم کی زندگی کے چند گوشوں کا یہ ایک خوبصورت مرقع ہے۔ لیکن اب تک اس کا پورا متن غالباً کہیں شائع نہیں ہوا۔ قائد اعظم کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی تحریک ہوئی لیکن یہ منصوبہ بھی بعض سیاسی "اعتیاقوں" کی نذر ہو گیا۔ مشاہیر کے اقوال اور افعال سے اگر کسی قسم کے تنازعے کی صورت نکلتی ہو تو عصری لحاظ سے ایک محدود مدت تک انہیں صیغہ راز میں رکھنا قرین مصلحت ہے۔ لیکن تمیں بتیں سال کی مدت بڑی طویل ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں متعلقہ مشاہیر تاریخ کی بے رحم بھٹی سے گزر کر اپنے اپنے مستند مقام پر منحصر ہو چکے ہوتے ہیں۔ جزوی طور پر کسی ناخوشنگوار تفصیل کا افشا ان کے اس مقام کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ یوں بھی آزاد دنیا میں بہت سی جگہ تمیں برس کے لمع خفیہ دستاویرات تک کو عام کر دیا جاتا ہے۔

مادر ملت کے مسودہ "میرا بھائی" میں دو مقام ایسے آتے ہیں جن کی وجہ سے اس کی اشاعت میں پس و پیش ہوتا رہا ہے۔

پہلا واقعہ جولائی ۱۹۳۷ء کا ہے، جب قائد اعظم عالت کی وجہ سے علاج اور آرام کے لیے نیارت میں تشریف رکھتے تھے۔ مترجمہ مس فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ جولائی کے اخیر میں ایک روز وزیر اعظم لیاقت علی خان اور سیکرٹری جنرل مسٹر محمد علی اچاونک نیارت پہنچ گئے۔ ان کے آنے کی پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی۔ وزیر اعظم نے ڈاکٹر الی بخش سے پوچھا کہ قائد اعظم کی صحت کے متعلق ان کی تشخیص کیا ہے؟ ڈاکٹر نے کہا کہ اسے مس فاطمہ جناح نے یہاں بلایا ہے، اس لیے وہ اپنے مریض کے متعلق کوئی بات صرف انہیں کو بتا سکتے ہیں۔

"لیکن وزیر اعظم کی حیثیت سے میں قائد اعظم کی صحت کے متعلق تفکر ہوں۔" ڈاکٹر نے ادب سے جواب دیا۔ "جی ہاں" بے شک۔ لیکن میں اپنے مریض کی اجازت

کے بغیر کچھ نہیں بتا سکتا۔"

جب مس فاطمہ جناح نے قائد اعظم کو وزیر اعظم کی آمد کی اطلاع دی، تو وہ مسکرائے اور فرمایا۔ "تم جانتی ہو وہ کیوں آئے ہیں؟ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میری عالات کتنی شدید ہے۔ میں کتنا عرصہ زندہ نہ سکتا ہوں۔ تم نیچے جاؤ اور پرائمری مفسٹر سے کہہ دو کہ میں انہیں ابھی ملوں گا۔"

مس فاطمہ جناح نے کہا اب کافی دیر ہو گئی ہے۔ وہ کل صبح ان سے مل لیں۔ "نہیں۔" قائد اعظم نے فرمایا۔ "انہیں ابھی آنے دو، اور بچشم خود دیکھ لینے دو۔"

وزیر اعظم نصف گھنٹہ کے قریب قائد اعظم کے پاس رہے۔ اس کے بعد جب مس جناح اندر گئیں۔ تو قائد اعظم بے حد تھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے کچھ جوس مانگا اور پھر چودہ روی محمد علی کو اپنے پاس بلایا۔ سیکرٹری جزل پندرہ منٹ تک قائد اعظم کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد مس فاطمہ جناح دوبارہ قائد اعظم کے کمرے میں گئیں اور پوچھا کہ کیا وہ جوس یا کافی پینا پسند فرمائیں گے؟ قائد اعظم نے کوئی جواب نہ دیا، کیونکہ وہ کسی سوچ میں محو تھے۔ اب ڈر کا وقت آگیا تھا۔ قائد اعظم نے مس فاطمہ جناح سے فرمایا۔ "بہتر ہے کہ تم نیچے چلی جاؤ اور ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

"نہیں۔" مس جناح نے اصرار ادا کیا۔ "میں آپ کے پاس ہی بیٹھوں گی اور یہیں پر کھانا کھا لوں گی۔"

"نہیں۔" قائد اعظم نے فرمایا۔ "یہ مناسب نہیں۔ وہ یہاں پر ہمارے مہمان ہیں۔ جاؤ اور ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

مس فاطمہ جناح لکھتی ہیں، کہ کھانے کی میز پر انہوں نے وزیر اعظم کو بڑے خوشنگوار موڑ میں پایا۔ وہ نہی خوشی پر مذاق باتیں کرتے رہے، جبکہ مس جناح کا دل اپنے بھائی کے لیے خوف سے کانپ رہا تھا، جو اوپر کی منزل میں بستر عالات پر اکیلے پڑے تھے۔

کھانے کے دوران چودہری محمد علی چپ چاپ کسی سوچ میں گم رہے۔  
کھانا ختم ہونے سے پہلے ہی مس فاطمہ جناح اور چلی گئیں۔ انہوں نے بڑے ضبط سے  
اپنے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ قائد اعظم انہیں دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا، ”خطی، تمہیں  
ہمت سے کام لینا چاہیے۔“

اس واقعہ کے دو ڈھائی ہفتے بعد ۱۳ اگست کو پاکستان کی آزادی کی پہلی سالگرہ آئی۔  
اپنی گمزوری صحت کے باوجود یوم پاکستان پر قائد اعظم نے قوم کے نام بڑا ولولہ انگریز  
پیغام جاری کیا۔ مس جناح نے اپنے مسودے میں لکھا ہے کہ یوم پاکستان کے چند روز  
بعد وزیر خزانہ مسٹر غلام محمد قائد اعظم سے ملنے کوئی آئے۔ لفظ کے وقت جب مس فاطمہ  
جناح ان کے ساتھ اکیلی بیٹھی تھیں، تو مسٹر غلام محمد نے کہا۔ ”مس جناح میں ایک  
بات آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں۔ یوم پاکستان پر قائد اعظم نے قوم کے نام جو پیغام  
دیا تھا، اسے خاطر خواہ اہمیت اور تشریف نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس وزیر اعظم کے پیغام  
کے پوسٹر چھاپ کر انہیں شر شر دیواروں پر چھپاں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہوائی جہازوں  
کے ذریعہ اسے بڑے بڑے شروں پر پھینک کر منتشر بھی کیا گیا ہے۔“  
مس جناح نے یہ بات خاموشی سے سن لی۔ کیونکہ اس وقت انہیں اپنے بھائی کی صحت  
کی فکر تھی، پبلیٹی کی نہیں۔

مسٹر غلام محمد کی اس حرکت میں کھلم کھلا شر، شرارت اور سازش کی آمیزش تھی۔  
قائد اعظم بستر عالات پر لیئے ہوئے تھے۔ محترمہ مس فاطمہ جناح ان کی حماداری میں پریشان  
تھیں۔ ایسے حالات میں اس قسم کی لگائی بھائی کرنا بڑی نذموم حرکت تھی۔ اگر مسٹر  
غلام محمد کو واقعی ایسی کوئی شکایت تھی تو ان کا فرض تھا کہ اس بات کو کابینہ میں اٹھاتے۔  
اگر اس کے باوجود ان کا گلہ قائم رہتا تو اصولی طور پر انہیں مستعفی ہو جانا چاہیے تھا۔

لیکن اصولوں پر استعفی دینا ہمارے حکمرانوں کی کمزوری نہیں۔ غلط فہمیاں پیدا کر کے اختلافات کو ہوا دینا انہیں نیادہ راس آتا ہے۔ یہ واقعہ ایک طرف تو مسٹر غلام محمد کے ان ذاتی ربحات کی غمازی کرتا ہے جنہوں نے آگے چل کر ملک کے کاروبار میں کئی اور گل کھلانے تھے۔ دوسری طرف اس سے یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ پاکستان کی زندگی کے پہلے سال سے مرکزی کابینہ میں ایسے عناصر نے سر اٹھا لیا تھا جو وزیر اعظم کے خلاف ریشه دوائیوں میں مصروف عمل تھے۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد محترمہ مس فاطمہ جناح اور حکومت کے درمیان سرد مری کا غبار چھایا رہا۔ قائد کی دو برسیاں آئیں اور گزر گئیں دونوں بار مس جناح نے بری کے موقع پر قوم سے خطاب کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی شرط تھی کہ براڈ کاست کرنے سے پہلے وہ اپنی تقریر کا متن کسی کو نہیں دکھائیں گی۔ حکومت یہ شرط ماننے پر آمادہ نہ تھی۔ غالباً اسے خوف تھا کہ نہ جانے مس جناح اپنی تقریر میں حکومت پر کیا کچھ تنقید کر جائیں گی۔ آخر خدا خدا کر کے قائد اعظم کی تیسری بری پر یہ قرار پایا کہ محترمہ فاطمہ جناح اپنی تقریر پہلے سے سنر کرائے بغیر ریڈیو سے براہ راست نشر کر سکتی ہیں۔ تقریر نشر ہو رہی تھی کہ ایک مقام پر پہنچ کر اچانک ٹرانسمن بند ہو گئی۔ کچھ لمحے ٹرانسمن بند رہی۔ اس کے بعد خود بخود جاری ہو گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مس جناح کی تقدیر میں کچھ فقرے ایسے تھے جن میں حکومت پر کچھ تنقید تھی۔ وہ تو بدستور ان فقروں کو مائک پر پڑھتی گئیں، لیکن ٹرانسمن بند ہو جانے کی وجہ سے وہ فقرے براڈ کاست نہ ہو سکے۔ اس بات پر بڑا شور شرابا ہوا۔ اخباروں میں بہت سے احتجاجی بیانات بھی آئے۔ اگرچہ ریڈیو پاکستان کا موقف یہی تھا کہ ٹرانسمن میں رکاوٹ کی وجہ یہ تھی کہ اچانک بجلی فیل ہو گئی تھی، لیکن کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ مس جناح کی تقریر میں ضرور کوئی ایسی بات تھی جسے عذف کرنے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ اس ایک واقعہ نے حکومت

کے اعتماد کو جتنی شخصی پہنچائی اتنا نقصان مس فاطمہ جناح کے چند تقيیدی جملوں سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔

جن دنوں یہ قفسیہ اپنے عروج پر تھا، ایک روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وزیر داخلہ و اطلاعات کے کمرے میں یہ بات طے کرنے کے لیے مینگ ہوئی کہ اس قسم کے متعلق پلک میں جو چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، ان پر کس طرح قابو پایا جائے۔ بے حد طویل اور بعد از کار بحث و تمحیص کے بعد آخر مسٹر جی۔ احمد نے تجویز پیش کی کہ کسی نامور شخصیت سے انکوارری کروا کے یہ ثابت کیا جائے کہ مس جناح کے براؤ کاسٹنگ کے دوران بھلی کی کرنٹ فیل ہو گئی تھی۔ اس انکوارری روپورٹ کی اشاعت کے بعد زبان خلق خود بخود بند ہو جائے گی اس کے بر عکس وزیر اطلاعات خواجہ شاپ الدین کو اصرار تھا کہ انکوارری بے لاغ اور غیر جانب دار ہونی چاہیے۔ اگر یہ ثابت ہو کہ بھلی فیل نہیں ہوئی تو اس بات کا بھی بر ملا اعتراف کرنا ضروری ہے تاکہ پلک کے ذہن میں مزید بد گمانیاں پیدا نہ ہوں۔ سیکرٹری اور وزیر کے درمیان اس بحث کی تلخ کلامی نے بڑا طول کھینچا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب بھی یہی سمجھتے تھے کہ بھلی فیل نہیں ہوئی، اور اب وہ اس بات کو کھلم کھلا منظر عام پر لانے کے لیے بے تاب تھے۔ وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی حکومت کے لیے وہ اس قسم کی پریشانیاں اور مشکلات کیوں پیدا کرنا چاہتے تھے؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان دنوں یہ افواہ گرم تھی کہ وزیر اعظم انہیں مرکزی کابینہ سے بکدوش کر کے مشرقی بنگال بھیجنा چاہتے ہیں۔

ان دنوں مرکزی کابینہ سے علیحدگی کی تلوار خواجہ صاحب کے علاوہ اور بھی کئی سروں پر لٹک رہی تھی۔ وزیر خزانہ ملک غلام محمد پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ خرابی صحت کی بنا پر کابینہ سے ان کی رخصتی متوقع تھی۔ نواب مشائق احمد گرمانی آزاد کشمیر کی سیاست میں چیچ در چیچ الجھنیں ڈال کر کشمیری لیدروں کو آپس میں دست و گربان کرنے کا گل کھلا چکے تھے۔ اب وزارت امور کشمیر میں کشمیر تو غائب ہو چکا تھا، فقط امور ہی

امور باقی رہ گئے تھے۔ کچھ گفتگی، کچھ ناگفتگی۔ چنانچہ افواہ گرم تھی کہ عنقریب گرمانی صاحب بھی کابینہ سے چھٹی کرنے والے ہیں۔ یہ حضرات تو کینٹ سے نکالے جانے والے خوف میں بنتا تھے، لیکن ایک حضرت ایسے بھی تھے جو کابینہ میں شامل کئے جانے پر برہم و آزدہ مشہور تھے۔ ان کا نام نای خان عبدالقیوم خال تھا۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے طور پر وہ فرنٹیر کے ”مرد آہن“ کہلاتے تھے۔ وہاں سے اٹھا کر جب انہیں مرکزی کابینہ میں ڈال دیا گیا تو انتظامی اور عاملانہ امور کے علاوہ وہ اپنی سیاسی اساس سے بھی دور ہو گئے۔ یوں بھی ایک طاقتور صوبائی وزیر اعلیٰ کا ٹھاٹھ بانٹھ کچھ اور ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں مرکز کی وزارت چیزے دگر۔ اس لیے عام اطلاع یہی تھی کہ وہ اپنی اس ”ترقی“ سے چندار خوش نہیں تھے۔

اس قسم کی افواہوں، قیاس آرائیوں اور خبر تراشیوں کی گرم بازاری اپنے عروج پر تھی کہ یکايك آل قدر بشکست و آں ساقی نہیں۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کی شام کو چار بج کر چھ منٹ پر راولپنڈی کے جلسہ نامہ میں ایک گولی چلی اور اس نے پاکستان کی قیادت کو سیاست کی شاہراہ سے موز کر موقع پری، ابن الوقت، زمانہ سازی، طالع آزمائی اور مصمم جوئی کے ایسے خارزار میں ڈال دیا جہاں ذاتی خواہشات قوی ضرورت اور ذاتی مفاد، قوی مفاد کے مترادفات بننے چلے گئے۔

قائد ملت لیاقت علی خاں نے جام شادت نوش کر کے تب و تاب جاؤانہ کا صلمہ پایا۔ جلسہ گاہ میں راولپنڈی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نجف خاں نے اپنے سپاہیوں کو للاکار کر حکم دیا کہ گولی چلانے والے قاتل کو فوراً مار ڈالو۔ سید اکبر بھی گولی کا نشانہ بن کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ راز بھی دفن ہو گیا کہ وہ راولپنڈی کیوں آیا؟ ہر طرح کی سیکیورٹی کے باوجود جلسے کی اگلی صفوں تک کیسے رسائی حاصل کی؟ کسی نبی طاقت یا روحانی یا شیطانی یا انسانی اشارے نے اس کی انگلی پستول کی لبی پر رکھ کر دبادی؟ اسے زندہ گرفتار کرنے کی بجائے پولیس والوں نے اسے خواہ مخواہ جلسہ گاہ میں مار کیوں ڈالا؟ اس بے ضابطہ کارروائی کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس کے خلاف کیا کروائی

ہوئی؟ اسے ڈی۔ آئی۔ جی کے عمدے پر ترقی کس کارگزاری کے صلے میں ملی؟ عای قہن میں یہ سوال آج بھی جوں کے توں قائم ہیں۔ اب تک کسی ایسی بے لائگ انکوارری کا نتیجہ برسر عام نہیں آیا، جو ان سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکے۔ قائد ملت کی ہر برسی پر کسی نہ کسی پیرائے میں ایک مکمل اور بھرپور انکوارری کا مطالبہ اٹھتا ہے اور پھر اگلی برسی تک طاق نیاں کی نہیں بن جاتا ہے۔ درمیانی عرصہ میں وہی پرانے شکوک و شبہات خاموشی سے نشوونما پاتے رہتے ہیں اور اجتماعی رُگ و ریشے میں بے اعتمادی کا سرطان پھیلاتے رہتے ہیں۔

خان لیاقت علی خاں کی شادوت نے پاکستان سے اس کا پہلا وزیرِ اعظم ہی نہیں چھینا بلکہ ہمیں ایک نہایت بلند پایہ مدر، سیاست دان اور انتظامی اور انصرافی قابلیت کے رہنماء سے بھی محروم کر دیا۔ تحریک پاکستان میں وہ قائدِ اعظم کے دست راست تھے۔ اس حیثیت میں انہیں مسلمانوں کی تنظیم اور انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ سیاسی نبرد آزمائی کا وسیع تجربہ حاصل تھا۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس نوازیہ ملک کو چاروں طرف سے انتہائی شدید مصائب نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک نئی حکومت کا قیام، مسلح افواج کی تنظیم نو، لاکھوں مهاجرین کی آباد کاری، بھارت کی ریشہ دوائیوں کی وجہ سے وسائل کا فقدان اور پھر کشمیر کی جنگ آزادی کا آغاز..... اس قسم کے بے شمار عکسین مسائل کو نوازاں لیاقت علی خاں نے بڑے تدریج، تحلیل اور انتظامی قابلیت سے سنبھالا۔ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد پاکستان کی قیادت کا سارا بوجہ لیاقت علی خاں صاحب کے کندھوں پر ہی آپڑا تھا۔ اس بارگراں کو بھی انہوں نے بغوان شائستہ اٹھایا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی وزارتِ عظمیٰ کو دور پاکستان کے لیے اتحاد، استقلال اور سر بلندی کا زمانہ تھا۔ لیکن دو ایسی باتوں کا ذکر بھی ضروری ہے، جنہوں نے ہمارے حالات پر منفی اثرات مرتب کئے۔

اس زمانے میں پاکستان اسلامی دنیا میں سب سے بڑا اور ساری دنیا میں پانچوں بڑا ملک

سمجھا جاتا تھا۔ اس کی اس اہمیت کے پیش نظر روس نے وزیر اعظم اور بیگم رعناء لیاقت علی کو روس کا دوہرہ کرنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت نامہ ملنا تھا کہ بھارتی صفوں میں سکھلیلی مج گئی۔ بھارت خود روس سے پینگیں بڑھانے کا بھن کر رہا تھا۔ انہوں نے روسیوں کے کافی بھرنا شروع کر دیئے کہ پاکستان خود تو روس کا دوہرہ نامہ قبول نہ کرے گا بلکہ اسے اچھال کر امریکہ کی نظر میں اپنی قدر و قیمت بڑھانے کی کوشش کرے گا۔ دوسری طرف امریکہ کی نظر میں بھی یہ دعوت نامہ بری طرح کھٹکنے لگا۔ پاکستان میں ہر سطح پر ایسے افراد کی کمی نہ تھی، جو مغربی تہذیب کے ذہنی غلام تھے۔ سیاسی آزادی نے ان کے دل اور دماغ کو مغرب پرستی کے احساس کمتری سے نجات نہیں دی تھی۔ ان کے قلوب اور اذہان پر غلامی کے دور کی روایات اور اقدار برف کی سلوں کی طرح جی ہوئی تھیں اور آزادی کی تپش نے ابھی تک انہیں پکھلایا نہ تھا۔ اعلیٰ سطح کے بیشتر افسر برطانوی عہد کے تربیت یافتے تھے۔ ان کے کمال کا جوہر بندھائی پالیسیوں پر عمل کرنے، سکونیاتی جمود کو ثبات دینے اور مروجہ روشن کا جوں کا توں برقرار رکھنے میں مضر تھا۔ وہ انگریزی نظام حکومت کی لکیر کے فقیر تھے۔ آزادی کے تقاضوں کو نہیں پالیسیوں کے سانچے میں ڈھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ تغیرات کے عمل سے وہ نا آشنا تھے۔ خاص طور پر میں الاقوامی امور کا انہیں کوئی تجربہ نہ تھا۔ ہماری وزارت خارجہ کے بالائی افسر قریباً سب کے سب پرانی آئی۔ سی۔ ایس کے ممبر تھے۔ اس سروس کی روایات کے مطابق وہ برطانیہ اور امریکہ کے خصوصاً اور مغرب کے عموماً والہ و شیفۃ اور ان کے حریفوں کے ان سے بھی بڑھ چڑھ کر حریف تھے۔ وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان بذات خود اس نسلے پر دبلا تھے۔ اپنے مزاج کی افتاد، پس منظر، رحمات، تعصبات اور ٹریننگ کی وجہ سے یہ سب لوگ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو میں الاقوامی تعلقات کے تنے ہوئے رے پر حقیقت پسندانہ مہارت سے چلانے سے قاصر تھے۔ چنانچہ روس کا دعوت نامہ کھٹائی میں پڑا رہا اور جب امریکہ نے اپنے دعوت نامہ کا دانہ پھینکا تو ہماری وزارت خارجہ اس پر چیل کی طرح چھپی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وزیر اعظم روسیوں کی

دعوت پر روس کا دوہہ کرتے اور امریکنوں کی دعوت موصول ہونے پر امریکہ تشریف لے جاتے۔

انپی وزارت عظمیٰ کے دوران نوابزادہ لیاقت علی خاں نے کسی وجہ سے مسلم لیگ کی صدارت کا عہدہ بھی خود سنپھال لیا تھا۔ آگے چل کر یہ ادغام مسلم لیگ کے وجود کے لیے صحت مند ثابت نہ ہوا۔ اس نے مسلم لیگ کو حکومت ساز پارٹی کی بجائے حکومت نواز پارٹی میں تبدیل کر دیا۔ حکومت اور سیاست کے امتراج سے حکومت کو تو ضرور تقویت ملتی ہے لیکن سیاسی عمل آزاد نہیں رہتا بلکہ وہ سرکاری مصلحتوں کے تابع ہو کر مصلح ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس میں حکومت کی سرپرستی کے بغیر فعال رہنے کی صلاحیت سلب ہونے لگتی ہے اور حزب مخالف کے طور پر سیاسی کروار ادا کرنے کی قوت ماند پڑ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ کا اپنا انعام اظہر من الشمس ہے۔

قائد ملت کی شادوت کی خبر میں نے پشاور میں سنی۔ میں قبائلی علاقوں اور سوات، دری، چترال، کافرستان وغیرہ کا طویل دوہہ ختم کر کے ن۔ م۔ راشد کے ہاں ٹھبرا ہوا تھا، جو ان دنوں پشاور ریڈیو شیشن کے ڈائریکٹر تھے۔ یہ المناک خبر نشر ہوتے ہی ریڈیو شیشن پر مختلف قسم کے لوگوں کا جمگھتا لگ گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بھانت بھانت کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ کچھ لوگ ن۔ م راشد کے گھر بھی آگئے اور صبح تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آدمی رات کے قریب ایک صاحب نے ٹیلیفون پر کراچی کی سوگواری کا حال بیان یا اور ساتھ ہی بتایا کہ شر کی ایک مشہور فیشن شاپ راتوں رات کچھ امیر کبیر بیگمات کے لیے فیشن ایبل ماتھی ملبوسات تیار کرنے کے لیے صبح تک کھلی رکھنے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

قائد ملت کی شادوت کے ساتھ ہی یہ سوال ابھر آیا تھا کہ نیا وزیر اعظم کون ہو گا؟ ایک خبر یہ گرم تھی کہ شاید یہ قرعہ سردار عبدالرب نشتر کے نام نکلے۔ لیکن ابھی پاکستان کی قسمت میں آزمائش کی جگہ آزمائش لکھی تھی۔ اس لیے حکمرانی کا مال غنیمت باشے

والوں نے وزیر اعظم کا عہدہ تو خواجہ ناظم الدین کو سونپا اور گورنر جنرل کی کرسی پر ملک غلام محمد بر اجمان ہوئے۔ چودھری محمد علی وزیر خزانہ بنے اور وزارت داخلہ اور اطلاعات کا  
چارج مشائق احمد گرمانی نے سنبھالا۔

گرمانی صاحب کے آنے کے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد مجھے حکم ملا کہ میری خدمات پنجاب کی صوبائی حکومت کے پرداز کر دی گئی ہیں۔ پنجاب کی حکومت نے مجھے ضلع جھنگ کا ڈپٹی کمشنر مقرر کر دیا۔ ”ڈپٹی کمشنر کی ڈائری“ اسی زمانے کی چند یاداشتوں کا مجموعہ ہے۔

## • چنانچہ رنگے

جنگ کی سر نمین حسن و عشق، انوار و معرفت اور انوکھی حکمرانیوں کا ایک تاریخی گموار ہے۔ جنگ اور ملتان کے پہلے مقامی حکمران ملک کبیر خان نے رضیہ سلطانہ کو تخت دہلی پر بٹھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی نے بھی جنگ کی سرنیشن کو اپنے بابرکت قدموں سے نوازا۔ وہ نواب سعد اللہ خاں کے دوست تھے اور ان کی معیت میں ایک ہفتہ چھبوٹ میں قیام فرمایا۔ نواب سعد اللہ خاں بعد میں شاہجمان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کی "ہو" کی گونج نے اس سرنیشن کو شاد اور آباد کیا۔ عشق حقیق کی ماہتاب مائی "ہیر" بھی جنگ کے ایک گاؤں میں چوچک سیال کے ہاں پیدا ہوئی جو ایک معمولی زمیندار اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ یہ اولاد اسے حضرت شیر شاہ جلال سرخ بخاری کی دعا سے نصیب ہوئی تھی، جن کا مدفن بہاولپور ہے۔ پھر کا نام عزت بی بی رکھا گیا، لیکن اپنی عبادت گزاری، ریاضت اور نہد و تقویٰ کے باعث عوام الناس پیار سے اسے "ہیر" کے لقب سے پکارنے لگے۔ اس کے ایک مرید اور خلیفہ کا نام مراود بخش تھا۔ جس کی ذات راجحہ تھی۔ عشق حقیق کے یہ دونوں پرستار بھی جنگ شر میں ایک ہی قبر میں آسودہ ہیں۔ وارث شاہ کے رومانی شاہکار ہیر راجحہ کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وارث شاہ خود بھاگ بھری تھی ایک عورت کی محبت میں گرفتار تھا۔ جب ان کے عشق کا راز فاش ہوا تو گھر والوں نے بھاگ بھری کی شادی کہیں اور کر دی، اور صاحب حیثیت ہونے کی وجہ سے وہ لوگ بھی ہاتھ دھو کر غریب وارث شاہ کے پیچھے پڑ گئے۔ محبت کی ناکامی کے غم میں ڈوب کر موزوں طبیعت والے نامراد عاشق نے اپنا وہ شاہکار تصنیف کیا جس میں اپنے وقت کی ایک عارفہ اور پاکباز خاتون بھی ان کے قلم کی زد میں آ کر عشق مجازی کا ایک لازوال کردار بن گئی۔

مرزا صاحبیں کا خونپکال ڈرامہ بھی اسی علاقے میں رونما ہوا۔ میں نے وہ چھوٹی سی خستہ حال مسجد بھی دیکھی ہے جہاں مقامی روایات کے مطابق صاحبیں مرزا کی سلامتی کے لیے URDU4U.COM دن رات سر بسمجود ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعائیں مانگا کرتی تھی۔

اٹھائیں ہزاری میں مخدوم تاج الدین کا مزار ہے جن کے بارے میں اب تک مشور ہے کہ چور اور ڈاکو اس کی حد میں آ کر اندر ہے ہو جایا کرتے تھے۔ اسی طرح بھوانہ کے نزدیک حافظ برخوردار مدفن ہیں، جن کے جلال کا اب بھی یہ عالم ہے کہ، چور، ڈاکو اور مجرم ان کے مزار کے دروازہ کی کنڈی کو ہاتھ لگانے سے ڈرتے ہیں۔ اس علاقے میں چوری کی واردات پر مشتبہ شخص کی پاکدامنی کے فیصلے کا یہی طریقہ راجح ہے کہ وہ حافظ برخوردار کی کنڈی کو ہاتھ لگا دے۔ اصلی چور اور مجرم ہاتھ نہیں لگاتے، کیونکہ اس طرح قسم جھوٹی ہو جاتی ہے اور باور کیا جاتا ہے کہ یہاں پر جھوٹی قسم کھانے والا سخت ذہنی اور جسمانی عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

فروری ۱۹۵۱ء میں جب میں اس رنگین ضلع میں ڈپٹی کمشنر کا چارج لینے یہاں پہنچا تو اس کا حال اس کے ماضی سے بے حد مختلف تھا۔

میں اپنا واحد سوت کیس اور بستر لے کر ریلوے اسٹیشن پر اترنا اور ایک تانگے میں سوار ہو کر ڈاک بنگلے آ گیا جہاں پر چند روز کے قیام کے لیے میرے لیے جگہ ریزو کروائی ہوئی تھی۔ ڈاک بنگلے کے خانام اور چوکیدار نے ناک سیکر کر مجھے گھورا اور دونوں نے بہ یک زبان وہنگار کر کہا، ”جاو جی جاؤ۔ آئے بڑھ ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے والے۔ بنگلے نئے ڈپٹی کمشنر بہادر کے لیے ریزو ہے۔“

جی میں تو آیا کہ انہیں بتا دوں کہ میں ہی یہاں کا نیا ڈپٹی کمشنر ہوں۔ لیکن خانام اور چوکیدار کے تیور دیکھ کر مجھے ایسا کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

میں نے کسی قدر لجاجت سے خانام سے پوچھا کہ کیا میں یہاں سے ایک ٹیلیفون کر سکتا ہوں؟

”کہاں کرنا ہے؟“ خانسامان نے دھمکی آمیز لمحے میں پوچھا۔  
”ڈی سی صاحب کو۔“ میں نے کہا۔

خانسامان اور چوکیدار نے زور سے ققہہ لگایا جس میں طزر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ  
یہ منہ اور سور کی دال! خیر میری مزید منت سماجت پر انہوں نے ڈی سی کے پی اے  
اللہ وہ صاحب کے ساتھ فون ملا دیا۔ میرا نام سن کر اس نے فوراً تبدیل ہونے والے  
ڈی سی سرور صاحب کو ٹیلیفون دیدیا۔

”آپ کب آئے؟“ سرور صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

”ابھی آیا ہوں۔“

”کیسے آئے؟“

”ریل گاڑی سے۔“ میں نے وضاحت کی۔“

”اشیش سے کیسے آئے؟“ انہوں نے پوچھا۔“

”تائنگے پر۔“ میں نے جواب دیا۔“

”لاحوال ولا قوه۔“ سرور صاحب نے فرمایا۔ ”بھائی صاحب، خبر تو دے دی ہوتی۔ ہم لوگ  
شیش پر آپ کا شاندار استقبال کرتے۔ اب کچھ لوگ گلہ کریں گے کہ آپ کے  
استقبال کے اعزاز سے کیوں محروم رہے۔“

چند لمحوں بعد سرور صاحب تشریف لے آئے اور ان کے ساتھ ہی نظارت کے عملے کا  
ایک جم غیر بھی آنازل ہوا۔ سب لوگ میرا سامان ڈاک بنگلے میں سجا کر رکھنے کے  
لیے مضطرب تھے۔ لیکن میرے سامان میں صرف ایک معمولی سا سوت کیس اور بستر  
دیکھ کر وہ سب مایوس ہو گئے۔ سرور صاحب بھی۔

سرور صاحب اچھے آدمی تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ مسلمان مجرموں کو سزا دینے  
سے پسلے وہ ان سے دعائے قوت نا کرتے تھے۔ اگر کسی نے ٹھیک نہ کیا تو وہ سزا  
میں مناسب تخفیف کر دیتے تھے۔ غلط سنانے پر سزا بڑھ جاتی تھی۔

## • چارج

میں نے اپنے ضلع کا چارج تو بعد میں سنبھالا۔ سب سے پہلے دفتر کے ناظر نے بہ نفس  
تھیں خود میرا چارج لے لیا۔

URDU4U.COM

ناظر صاحب سے پہلی ملاقات کچھ غیر رسمی طور پر ہوئی۔ مجھ سے زیادہ انہوں نے میرے سامان کا جائزہ لیا۔ میرے ساتھ مخفی ایک سوت کیس اور ایک بستہ کو دیکھ کر وہ قدرے مایوس ہو گئے۔ ضابطہ کی رو سے ڈپنی کمشٹر کی آمد سے پہلے ان کے بیڑے اور خانامان کو آنا چاہیے۔ اس کے بعد ان کے سامان کی ویگن اور موڑ کار آنی چاہیے۔ پھر صاحب بہادر خود تشریف لا کیں اور ان کے جلو میں اگر چند کتے اور کچھ گھوڑے بھی ہوں تو عین شیلیان شان ہے۔

ناظر صاحب کی معیت میں ایک کار، دو بڑے ٹرک اور کوئی درجن بھر وردی پوش لوگ تھے۔ کار انہوں نے شر کے ایک ریس سے طلب کی ہوئی تھی۔ ٹرک مقامی ٹرانسپورٹ کمپنی نے پیش کئے تھے اور وردی پوش لوگ دفتروں کے چڑھائی اور چوکیدار تھے۔ سامان کی طرف سے مایوس ہو کر ناظر صاحب نے مجھے ہر دیگر کار لائقہ سے یاد فرمانے کی ہدایت کی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ اگر مجھے ضرورت محسوس ہوئی، تو ان کی خدمات سے فائدہ اٹھاؤں گا۔

ناظر صاحب کو رخصت کر کے میں نے ڈاک بگلہ کے بیڑے سے کچھ گرم پانی کی فرماش کی۔ گرم پانی کا نام سن کر یکایک دروازے کر پردا ہلا، اور اس کے عقب سے ناظر صاحب نمودار ہوئے۔

”حضور گرم پانی غسل خانہ میں تیار ہے۔“ انہوں نے اعلان کیا۔

منہ ہاتھ دھو کر میں نے ڈاک بگلہ کے بیڑے سے چائے مانگی۔ اس فرماش پر ایک بار پھر ناظر صاحب پرہ غیب سے ظہور میں آ گئے۔

”حضور ڈائیگ روم میں چائے تیار ہے۔“

ڈائیگ روم میں چائے کم تھی اور مرغ نیاہ تھے۔ ایک قاب میں مرغ مسلم تھا۔ دوسری میں مرغ روست تھا۔ ایک پلیٹ میں چکن سینڈوچ تھے۔ کچھ طشتیاں مٹھائیوں سے بھری رکھی تھیں۔ دائیں باہمیں پیشہ کے ڈبے تھے اور ان سب کے درمیان جملہ متعرضہ کے طور پر کچھ چائے بھی موجود تھی۔ چائے کا سیٹ چمکدار سلور کا بنا ہوا تھا اور چائے دانی پر مالک کا نام اور پتہ نقش کیا ہوا تھا۔ یہ بزرگ پیشے کے لحاظ سے پیر، خاندانی لحاظ سے رئیس اور نسا سید زادے تھے۔ چنانچہ ان کے نام کے ساتھ یہ ساری صفات چائے دانی پر کندہ تھیں۔

ڈاک بغلہ میں میرے سوا اور کوئی صاحب فروکش نہ تھے۔ لیکن اندر دونوں جگہ خاصی غیر معمول چہل پل تھی۔ ناظر صاحب کی سرکردگی میں کئی چپڑاں اور چوکیدار کسی خاص کام کے بغیر بڑی مستعدی اور بدحواسی سے مصروف نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف برآمدے میں کچھ پنوخاری نما لوگ کسی نامعلوم اشارے کے منتظر بیٹھے تھے۔ باہر لان میں بہت سے غیر سرکاری قسم کے حضرات ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔ اس سارے مجھ میں صرف ایک شخص تھا جو اس تمام کروائی سے لاتعلق الگ تحملگ بیٹھا تھا۔ یہ ڈاک بغلہ کا سرکاری خانسماں تھا۔ نظارت کے عملہ نے باورچی خانہ پر اپنا سلط جما کے اسے بے دخل کر دیا تھا اور وہ ایک خاموش حقارت اور بیزاری کے عالم میں سب سے الگ ایک طرف بیٹھا اپنا حقہ پی رہا تھا۔

ایک دوبار میں نے کوشش کی کہ خانسماں کو بلا کر اسے اپنے کھانے کے متعلق کچھ ہدایات دے دوں۔ لیکن ہر بار میرے اردوی نے مجھے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ”حضور کا سارا بندوبست ناظر بابو کی تحویل میں ہے۔“

یہ اردوی ایک نمایاں اور رعب دار شخصیت کا مالک تھا۔ بڑی بڑی تاؤ دار سندھی موچھیں۔ طرے والا مورچہل صافہ۔ سرخ بانات کا کوٹ۔ گلابی پیٹی۔ گول گول چمکدار آنکھیں،

جن میں ادب بھی تھا اور بیا بھی، مگر بھی تھا اور تملق بھی۔ وہ عموماً اپنی پچھلی ہوئی تو نہ پر دونوں ہاتھ رکھ کے گردن میں ایک تعظیمی خم ڈال کر ایستادہ رہا کرتا تھا۔ اس کی زبان میں محققہ مال کے الفاظ اور اصطلاحوں کا خاصہ اثر تھا اور اگر اس کی پیشی کا بلا اس کے اصلی عمدے کا غماز نہ ہوتا، تو اس پر بڑی آسانی سے تین ہزاری قسم کے سردار کا دھوکہ ہو سکتا تھا، جو ابھی ابھی ”بادب با ملاحظہ ہوشیار“ کا نعرہ لگانے والا ہو۔

شام کے وقت میں نے سوچا کہ اکیلے پاپیاہ گھوم کر شر دیکھنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ ایک دو روز کے بعد میرے پاؤں میں ڈپٹی کمشنر کی مندی لگ جائے گی اور میرے چہرے پر اس عمدے کا نہ پہہ شبت ہو جائے گا اور میرے سر میں اس کری کا سودا سما جائے گا۔ اس کے بعد مجھے اس نے شر کے ان گلی کوچوں کو دیکھنے کی توفیق نہ ہو گی جمل حکام کو دعویٰ میں دینے والے عائدین رہائش نہیں رکھتے۔

ڈاک بغلہ سے نکلتے ہی میرا ارڈلی تیز تیز قدم میرے آگے آگے ہو لیا۔ سب سے پہلے اس نے زور کا دھکا دے کر ایک چوکیدار کو میرے راستے سے ہٹایا جو نئے ڈپٹی کمشنر کی جان و مال کی حفاظت کے لیے رات کی ڈیوٹی پر حاضر ہو رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے کڑک کر ایک سقہ کو ڈانٹا جو میونسل سکیٹ کے زیر اہتمام آج خاص طور پر ڈاک بغلہ کے آس پاس پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ اگر میں اصرار کر کے ارڈلی کو واپس نہ کر دیتا، تو بے شک وہ اسی طرح ہٹاؤ بچاؤ کر کے سارے شر میں میرا جلوس نکالتا۔ ارڈلی تو طوطاً و کہاً واپس لوٹ گیا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد ناظر صاحب ایک موڑ کار لیے میرے تعاقب میں نکل آئے۔ کار میرے عین مقابل آہستہ سے کھڑی ہو گئی اور اس میں سے ناظر صاحب برآمد ہوئے۔

”حضور کی سواری کے لیے موڑ حاضر ہے۔“

میرے انکار پر انہوں نے میرے ساتھ ساتھ پیدل چلنے کی پیشکش کی۔ میں نے پھر دوبارہ شکریہ ادا کر کے انہیں رخصت کر دیا۔ ناظر صاحب چلنے تو گئے، لیکن راستہ بھر مجھے

یہی خدشہ رہا کہ کہیں وہ اچانک اگلے موڑ پر دست بستہ کھڑے نظر نہ آ جائیں۔ دراصل ضلع کے اندروں نظام میں ناظر کا وجود الہ دین کے چراغ کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس چراغ کی روشنی زیادہ تر ڈپٹی کمشنر کے اپنے بنگلے ہی کو منور کرتی ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے باورچی خانے سے لے کر کوٹ پتلون کے بُنؤں تک ناظر صاحب کی تفصیلی نظر رہتی ہے۔ گئے بھیں کا چارا، گھوڑوں اور کتوں کی خوراک، چولہے کا ایندھن، گوشت، سبزی ترکاری، بچوں کی کلپیاں اور نسلیں، یہوی کے لیے کپڑوں کے تھان، خالص گھمی، نمک، مرچ، پیاز، لسن، چائے چینی، یہ سب چیزیں ناظر صاحب کی وساطت سے خاص ارزاز نرخوں پر دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ناظر کے نرخ عام بازار کے بھاؤ سے کافی ارزاز ہوتے ہیں اور ایک بار جب ڈپٹی کمشنر کو ان نرخوں کا چسکا پڑ جائے تو اس کی اقتصادی زندگی کا نقشہ بہت خوشگوار طور پر بدلتا ہے۔ سچ تو یہ ہے، یہ چسکا بچارے ڈپٹی کمشنر کے اپنے اختیار کی بات بھی نہیں۔ روز اول سے جس طرح ناظر صاحب ڈپٹی کمشنر کی ذاتی ضرورت پر چھا جاتے تھے اور جس سلیقے سے وہ ان کے گھر بار کا نظام سنبھال لیتے ہیں اس میں مسئلہ جبر و قدر کا بھی بہت کچھ ہاتھ ہے۔

اشیائے خورد و نوش کے علاوہ ناظر صاحب کے مداری کے پارے میں اور بھی بہت سی تن آسانیاں ہیں۔ کمروں کے لیے دیباں، غسلخاتوں کے ثب اور نوکروں چاکروں کی چارپائیاں وہ اپنے سرکاری اسٹاک سے برآمد کر لاتے ہیں۔ بجلی کے فالتوں پکھے اور الماریاں وہ دفتر کے کمروں سے اٹھوا لاتے ہیں۔ بیگم صاحبہ، باوا لوگ اور باورچی کا فرمائشی فرنچیز مقامی دکانوں سے معمولی کرائے پر یا عاریٹا آتا رہتا ہے۔ بے وقت کے مہمانوں کے لیے پکایا کھانا اور صاف ستھرے بستر فراہم کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اگر کبھی حسن اتفاق سے شر کی بجلی فیل ہو جائے، تو آنا فلانا ناظر صاحب کے سورہ سے جمگاتے ہوئے پیسوں میکس اور ہری کین لائیں ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کو بقعہ نور بنا دیتی ہیں۔ چونکہ

ڈپٹی کمشنر کا سارا وقت بکار سرکار صرف ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے چراغاں میں عموماً سرکاری تیل ہی جلایا جاتا ہے۔

یادش بخیر، انگریزوں کے زمانے میں ایک ڈپٹی کمشنر ولایت سے تانہ تانہ شادی کر کے واپس آئے۔ ناظر صاحب نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں رسم ہے کہ جب نئی نیہ دلسن گھر میں قدم رکھے، تو اس کی نیک شگونی کے لیے اس کے سر پر صدقہ اتنا را جاتا ہے۔ چنانچہ وہ دونوں میاں یوی ایک کمرے میں بٹھا دیئے گئے اور نظارت کے اہل کاروں اور چپر اسیوں کی ایک طویل قطار کپڑوں کے تھان اٹھائے ان کے سامنے سے گزرنے لگی۔ صاحب بہادر ہر تھان کو ہاتھ سے چھوٹے تھے، پھر اسے میم صاحبہ کے سر پر تین مرتبہ گھمایا جاتا تھا اور اس عمل کے بعد وہ تھان سیدھا براز کی دکان پر واپس پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح کپڑوں کی ایک پوری دکان نئی دلسن کے سر پر نچحاور کی گئی۔ شام کے وقت نظارت کے زیر انتظام کچھری اور کوئھی کی عمارتوں پر چراغاں کیا گیا اور اس کے بعد ناظر صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی چھت پر بیڈروم کے روشنдан کے ساتھ چھپ کر بیٹھ گئے۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر جب میاں یوی اپنے جملہ عروی میں داخل ہوئے تو عین مناسب موقع پر ناظر صاحب نے کھڑے ہو کر ایک بلند نعرہ لگایا اور باہر لان میں چھپا ہوا بینڈ بڑے اہتمام سے انگلستان کا قومی ترانہ بجانے لگا۔

اگرچہ انتظامی قابلیت کا ایسا معيار آجکل دیکھنے میں نہیں آتا، پھر بھی ہر فرض شناس ناظر اپنے عمدے کی درخشاں روایات کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن سع کرتا ہے۔ ایک روز محلہ مال کے ایک بہت بڑے افسر دوسرے پر آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی سات آدمیوں کا عملہ تھا۔ دو چپر اسی، ایک ڈرائیور، ایک پی۔ اے، ایک نائب تحصیلدار اور دو پنواری۔ بڑے صاحب ڈاک بنگلہ میں فروکش ہوئے۔ نائب تحصیلدار اور پی۔ اے صاحب کے لیے چولدا بیاں نصب ہو گئیں۔ پنواریوں کو خود ناظر صاحب نے اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا اور باقی لوگ شاگرد پیشوں میں سا گئے۔ تین دن کے قیام کے بعد صاحب بہادر نے حسب معمول بل طلب کیا۔ ناظر صاحب نے جو بل پیش کیا، اس کی تفصیلات کچھ

یوں تھیں۔

مرغی، چار عدد ..... دو روپے پانچ آنے  
گوشت، پانچ سیر ..... ایک روپیہ تیرہ آنے  
سبری ..... چھ آنے تین پائی  
دودھ، آٹھ سیر ..... ایک روپیہ نو آنے  
چائے چینی ..... آٹھ آنے چھ پائی URDU4U.COM  
مترقات ..... ایک روپیہ دو آنے  
کل میزان ..... سات روپے گیاہ آنے نو پائی

ایک زمانہ تھا کہ اس قسم کے دوروں پر بل مانگنا یا بل پیش کرنا ناقابل تصور تھا۔ لیکن اپنے نظم و نسق میں دیانت داری کو فروغ دینے کے لیے حکومت نے بڑی سخت تاکیدی ہدایات جاری کر رکھی ہیں کہ ہر افراد پر اپنے دورے کے بعد اپنے اخراجات کا پورا بل ادا کیا کرے۔ اس بدعت کو بھانے کے لیے ناظر صاحبان نے جو سوتیں پیدا کر رکھی ہیں، ان پر بے ساختہ داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہو گی۔ ضابطہ کی پابندی کے لیے ہر بل کے ساتھ قصاص، سنجڑے، گوالے وغیرہ کی دستخطی رسیدیں بھی مسلک ہوتی ہیں تاکہ سند رہیں اور ناگہانی مصیبت کے وقت کام آئیں۔

ڈپنی کمشنر کے لیے دارونگہ منڈی کے فرائض انجام دینے کے علاوہ ناظر صاحب کی ذمہ داریوں میں ایسے کام بھی ہیں جو وہ محض بکار سرکار انجام دیتے ہیں۔ ضلع کے نظام میں نظارت خانہ ایک مکٹی کے جالے کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ عدالتون کے سمن نظارت کے ذریعہ (Serve) پہنچائے جاتے ہیں۔ گواہوں کا بھتہ ناظر کے ذریعہ ادا ہوتا ہے۔ وزیروں کے جلوسوں اور جلوسوں کا اہتمام ناظر کرتے ہیں۔ عید میلاد اور یوم استقلال پر جھنڈیاں اور جھنڈے ان کے ذریعہ لگائے جاتے ہیں۔ سیلاب کے موقعہ پر رضا کاروں کا کھانا وہ فراہم کرتے ہیں۔ وباوں میں لاوارث لاشوں کے کفن وہ بناتے ہیں۔ تادلے پر

افروں کا سامان وہ پیک کرواتے ہیں۔ گرمیوں میں خس کی ٹھیاں ان کے حکم سے لگتی ہیں۔ سردیوں میں دفتروں اور گھروں کے آتشدان ان کی توجہ سے گرم ہوتے ہیں اور جو مجھریت یا الہکار ایک وفع ناظر کی نظر سے گر جائے، اس کے لیے زندگی کی بہت سی رنگینیاں فی الفور سلب ہو جاتی ہیں۔

آزادی کے بعد ناظر کے اختیارات میں تو کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی الجھنوں میں کچھ اضافہ ضرور ہو گیا ہے۔ ایک تو ملبوں کی ادائیگی کا مسئلہ ہے۔ جو نرخ وہ خوب سوچ چمار کے لگاتے ہیں ان کی گرانی پر تو کسی افسر کو شکایت کا موقع نہیں مل سکتا۔ لیکن ایک تشویش جو ناظر کو اکثر ستائی رہتی ہے وہ یہ ہے کہ کہیں کوئی مائی کا لال ان قیتوں کی غیر معمولی ارزانی پر بجٹ نہ چھیڑ دے۔ الحمد للہ، کہ اکثر ویژت ناظر صاحبان کو ایسا ناخوشنگوار حادثہ پیش نہیں آیا!

ناظر صاحب کی دوسری الجھن ذرا نیاہ تشویش ناک ہے۔ انگریزی راج کی برکتوں میں ایک خاص برکت یہ بھی تھی کہ پہلے ہر ڈپٹی کمشنر اپنے ضلع میں تین چار برس جم کے رہتا تھا۔ ناظر صاحب و جمعی سے ان کی خدمت کرتے تھے اور تبادلے پر جاتے جاتے ڈپٹی کمشنر صاحبان اپنے فالتو فرنچپر کا اچھا خاصہ حصہ ناظر کو بطور عطا یہ مرحمت فرمادیا کرتے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد حالات ڈگرگوں ہو گئے ہیں۔ اول تو سال بھر میں ایک ایک یا دو بسا اوقات تین تین ڈپٹی کمشنر بدلتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ جو ڈپٹی کمشنر جاتا ہے، اس کے سامان کے ساتھ نظارت کے پنکھوں، میزوں اور کرسیوں کی ایک تعداد بھی سواؤ ناٹب ہو جاتی ہے۔

## • درونہ خانہ

حسن اتفاق سے آئی۔ سی۔ ایس کے بارے میں ایک ایسا پرانا کتابچہ دستیاب ہو گیا جسے  
بجا طور پر ہدایت نامہ ڈپٹی کمشنر کما جا سکتا ہے۔ یہ کتابچہ ۱۸۸۹ء میں ایک انگریز  
ڈپٹی کمشنر نے مرتب کیا تھا۔ اس میں کام کان، رہنے سننے کے وہ سب آداب تفصیلی  
درج ہیں جن پر ہر ڈپٹی کمشنر کو کارند رہنا لازم ہے تاکہ ”رعیت“ پر اپنے حاکم کا  
وقار خاطر خواہ قائم رہے۔ ان ہدایات کی رو سے ڈپٹی کمشنر کے ذاتی عملہ میں مندرجہ  
ذیل اضاف ضرور ہونا چاہیے:

بھرا ..... ۱  
بٹر ..... ۱

خانسامان ..... (بڑے کھانوں کے موقعوں پر دو مزید باورچیوں کی گنجائش رکھنا مناسب ہے)

خدمت گار ..... ۱  
سگ برادر ..... (کتنی کی خدمت کے لیے)

سائیس ..... ۲

مساچی ..... ۱

حال ..... ۱

آیا ..... ۱

حقہ بردار ..... ۱

دھولی ..... ۱

درزی ..... ۱

بہشتی ..... ۱

مالی ..... ۱

نائی ..... ۱

دو دھ وala ..... ۱

متر ..... ۱

پنچا قلی ..... ۳

پسہ دار (چپڑاں) ..... ۵

یہ ۱۸۸۹ء کی بات ہے۔ جب ملکہ کا راج تھا اور سلطنت برطانیہ کا آفتاب طلو ہونے کے بعد غروب نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر لوگ ابلا ہوا پانی پیتے تھے، پھلوں کو لال دوالی میں بھگو کر کھاتے تھے، جوں جولائی میں لوکے اثرات سے بچتے کے لیے دوسرے کے وقت گرم فلاں کے قیض پہنچتے تھے اور چھروں سے حفاظت کے لیے سر شام لمبے دستانے اور فل بوٹ چڑھا لینے کا فیشن عام تھا۔ میم صاحبہ سال کا آدھا حصہ پہاڑ پر اور آدھا ولایت میں برس کرتی تھیں۔ باوا لوگ ولایت میں پیدا ہوتے تھے اور پولیس لائن میں رائیڈنگ سکھنے کے لیے کبھی کبھی گرمیوں کی چھٹیاں ڈیڈی ابا کے پاس گزارنے آیا کرتے تھے۔

ڈپٹی کمشنر اور دیگر ”بڑے صاحب“ لوگوں کے گھروں میں عام طور پر نوکروں کا ایک پورا لشکر ہوا کرتا تھا۔ ان نوکروں میں حقہ بردار کا ایک خاص منصب تھا۔ ان دونوں ابھی سگریٹ اور سگار عام نہیں ہوئے تھے۔ البتہ پائپ پئے جاتے تھے۔ لیکن جہاں کمپنی بہادر نے ملکہ معلمہ کے لیے ہندوستان کا ملک چھوڑا تھا، وہاں سفید فام مائی بوپوں کو حقہ کی وراثت بھی تفویض کی تھی۔ یہ رواج تقریباً بیسویں صدی کے شروع تک خاصہ عام تھا۔ انگریز افسروں کے گھروں میں بڑے بانکے اور سجیلے حقے رہا کرتے تھے۔ حقہ میں پانی بھی عرق گلب ملا کر استعمال ہوتا تھا اور جب صاحب بہادر کوچ پر لیٹ کر حقہ پیتے تھے تو ایک خادم نگلی تھام کے کھڑا ہوتا تھا اور حقہ بردار ایک تانبے کی پچکنی سے برابر چلم پر پھونکیں مارا کرتا تھا۔ بڑی بڑی دعوتوں میں ہر افسر کے ساتھ اس کا حقہ بردار بھی آیا کرتا تھا۔ کھانے کے بعد حقہ برداروں کا جلوس حقے اٹھائے کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ ہر حقہ بردار اپنے آقا کے پاس حقہ جما کے دست بستہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ حقوق کی نشت بڑے رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے جنمتی تھی اور کسی دوسرے کے

حقے کی نگلی کے اوپر سے گزرنما انتہائی بے ادبی اور گستاخی سمجھا جاتا تھا۔ حقے کی لٹ میموں میں بھی عام تھی۔ وہ حقوق کی لانبی لانبی رنگ برلنگی لچکدار نلکیوں کو اپنی کمر کے گرد سانپوں کی طرح لپیٹ کر بڑے ٹھاٹھ باثھ سے بینہ کر حقہ نوش فرمایا کرتی تھیں۔ تمباکو میں الایچی کاست، زعفران اور سونے کے ورق ملائے جاتے تھے اور ولایت میں ان میموں کی مائیں اور پچیاں بڑے فخر اور استغاب سے اپنے ہمسایوں کو بتایا کرتی تھیں کہ ہندوستان میں ہماری صاجزا دیاں سونا پھانکتی ہیں اور سانپوں سے کھیلتی ہیں!

اگر ڈپنی کمشز کی یوی کسی کی عزت افزائی کرنا چاہتی تھی تو وہ اسے اپنے حقے سے دو چارکش لگانے دیتی تھی۔ اس کے مقابلے میں سیشن نج کی یوی بھی بڑھ چڑھ کے اپنے حقے کی نمائش کیا کرتی تھی۔ ان دونوں یویوں میں بڑے زوروں کی چشمک رہا کرتی تھی، لیکن ٹھاٹھ باثھ رعب دا ب اور طنطئے میں عموماً ڈپنی کمشز کی یوی کی یوی کا پلہ ہی بھاری رہتا تھا۔ سیشن نج کی یوی کے قدم تو اسی وقت جمٹے تھے جبکہ ڈپنی کمشز مجرد ہوتا تھا۔ کنوارے ڈپنی کمشز عام طور پر اپنے لیے باقاعدہ مقامی حرم قائم کرتے تھے۔ شولا پور میں ایک تاریخی ڈپنی کمشز گزرے ہیں۔ ان کا نام میڈوز ٹیلر تھا۔ آپ کے حرم میں باشہ عورتیں تھیں۔ ان میں ایک پندرہ سالہ مرہٹہ لڑکی تھی، جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ صاحب بہادر کی آنکھیں بڑی ملارت سے ملا کرتی تھی!

بھاگلپور میں مسر سینڈریز ایک سیشن نج تھے۔ ان کی یوی نے قدم قدم پر ٹکلٹر کی یوی سے بڑے بڑے معركے جمائے۔ مقابلہ تو دل ناتوان نے خوب کیا! لیکن ٹکلٹر کی یوی آخر ٹکلٹر کی یوی تھی۔ جیت اسی کی ہوتی تھی۔ لੱگ آ کر مسر سینڈریز نے سیشن نج کا جھنڈا سر بلند کرنے کے لیے ایک اچھوٹی تجویز نکالی۔ اس نے نج صاحب کی عدالت پیپل کے ایک پرانے درخت کے اوپر قائم کر دی۔ ایک مضبوط تنے پر سینٹ کی چوکی بنا دی گئی۔ اس پر مغلی تکیے رکھے گئے اور اب ہر روز نج صاحب اس نشت پر بینہ کر اپنا اجلاس کرنے لگے۔ ایک قربی شاخ پر یشکار صاحب بیٹھتے تھے۔ کسی ثُنی پر

ملزم ڈگا ہوتا تھا، کسی پر گواہ۔ البتہ وکیل صاحبان کو نہیں پر کھڑا ہو کر بحث کرنے کی اجازت تھی! اگر ڈپٹی کمشنر کی یوی اب بھی اپنی ہارند مانتی تو غالباً ان کے شوہر کو اپنا دفتر کھجور کے پیڑ پر کھولنا پڑتا۔

پرانے زمانے میں ایک صاحب مسٹر سنوڈ گراس برہم پور گنجام کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کو اور ان کی میم صاحبہ کو تیراکی کا بے حد شوق تھا۔ ضلع میں ایک بہت بڑی چلکا لیک نامی جھیل تھی۔ اس میں ایک چھوٹا سا جزیہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے وہاں پر ایک خوبصورت سا کمرہ تعمیر کروالیا۔ ہر صبح میاں یوی تیر کر وہاں چلے جاتے تھے۔ صاحب بہادر تو بیرپی کر سو رہتے اور میم صاحبہ ان کی فانکلوں سے کافندی ناؤ بنا بنا کر اپنا جی بھلایا کرتیں۔ ہوتے ہوتے سارے کا سارا دفتر غرق میں ناب ہو گیا! انجام کار لیفٹیننٹ گورنر نے فوج کا ایک دستہ بھیج کر میاں یوی کو ان کے حسین جزیرے سے برآمد کیا۔

ڈپٹی کمشنر کی یہ تاریخی جنس اب بالکل نایاب ہے۔ وہ پچھلے شاہانہ ٹھاٹھ بائٹھ بھی اب قائم نہیں رہے۔ نوکروں چاکروں کا ہجوم اب گھستے گھستے قریباً مفقود ہو رہا ہے۔ اب ڈپٹی کمشنر کے عملے کا ایک اردوی احتیاطاً موڑ ڈرائیوری سیکھ رکھتا ہے۔ دوسرا اردوی کھانا پکانے کی تربیت حاصل کر لیتا ہے اور نظارت کے کچھ چپر اسی وقت فوکٹے بیرون اور خدمت گاروں کی ڈیوٹی کے لیے بھی آماہ رہتے ہیں۔ شروع شروع میں ان اردویوں اور چپر اسیوں نے یہ اضافی ٹریننگ مخفی حفظ ماقبل کے طور پر لینا شروع کی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ڈپٹی کمشنر کی کار، کچن اور بگلہ چلانا ان کا پیدائشی حق بتا جا رہا ہے۔ اب اگر کوئی ڈپٹی کمشنر اپنے ساتھ اپنا خانام یا ڈرائیور لے آئے تو مقامی عملہ اسے اپنی حق تلفی سمجھتا ہے۔

اگرچہ آجکل ڈپٹی کمشنوں کو پچھلے زمانے والے جہانگیری ٹھاٹھ میر نہیں ہیں، لیکن ان کی یویوں میں نور جمال کی روح اکثر و بیشتر حلول کرتی رہتی ہے۔ انگریزوں کے بعد ہمارے سیشن نجع صاحبان کی بیگمات نے ڈپٹی کمشنر کی یوی کے ساتھ رقبت کا میدان قریباً قریباً

خالی کر دیا ہے۔ لیکن اب یہ خلا کپتان پولیس کی بیوی بڑی کامیابی سے پورا کرتی ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی اپنے آپ کو ضلع کی خاتون اول سمجھتی ہے لیکن تھانیداروں، ہیڈ کانٹیبلوں اور عادی مقدمہ بازوں کی بیویاں ہمہ وقت ایس۔ پی کی بیوی کو احساس دلاتی رہتی ہیں کہ تمہارا میاں بھی تو ضلع کا برابر کا مالک ہے۔ اگر پولیس کا سارا نہ ہو تو ڈپٹی کمشنر کی مجال ہے کہ بنگلے سے باہر قدم بھی رکھ سکے۔

ڈپٹی کمشنر کی بیوی کہتی ہے کہ ”لو مینڈ کی کو بھی زکام ہوا۔ یہ منہ اور مسور کی دال! کپتان پولیس ہے تو اپنی بیوی کے لیے ہو گا۔ وردی پن کر سلیوٹ تو میرے میاں ہی کو کرتا ہے۔“ اس سلسلے میں محترم صاحبان، وکیلوں، تھانیداروں، میونپل کمشنروں اور ممبر ان ڈسٹرکٹ بورڈ کی بیگمات بڑی شد و مر سے ڈی۔ سی کی بیوی کی تائید کرتی ہیں۔ اب ضلع میں خواتین کی سرگرمیاں دو متوازی خطوط پر چلنے لگی ہیں۔ اگر وہاں پر کوئی انجم خواتین ہے تو وہ دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ لڑکیوں کے اسکول تقسیم انعامات کے لیے دو دو جلسے منعقد کرتے ہیں۔ بیتیم خانوں کی تقریبات تعداد میں دگنی ہو جاتی ہیں۔ میلاد شریف کی مخلفیں بھی دونوں بیویوں کی صدارت میں الگ الگ منعقد ہوتی ہیں۔ روئسا اور زمینداروں کی بیویاں اکثر دونوں قسم کی تقریبات میں شرکت کرتی ہیں اور حسب توفیق اس متوازی ماحول کو تقویت پہنچاتی رہتی ہیں۔

بیویوں کی یہ چپقلش رفتہ رفتہ نوکروں میں سرایت کرنے لگتی ہے اور ڈپٹی کمشنر اور کپتان پولیس کے بیروں، خانسماوں، آیاؤں اور چپراسیوں میں بڑے زور سے ٹھن جاتی ہے۔ جازار میں ڈپٹی کمشنر کا جام کپتان پولیس کے جام پر دھونس جاتا ہے اور ایس۔ پی کا قصاب ڈپٹی کمشنر کے قصاب کو طعنے دیتا ہے۔ اگر یہ تفرقات ان بیویوں کے شوہروں پر بھی اثر انداز ہونا شروع ہو جائیں تو ضلع بھر میں خانہ جنگلی کا سماں بندھ جاتا ہے۔ محترم صاحبان پولیس کے مقدمات پے در پے خارج کرنا شروع کر دیتے ہیں اور

تحانیدار مجرمیوں کے خلاف بیانات جمع کرنے لگتے ہیں۔ اس مسموم فضا میں اگر کوئی پنپتا ہے تو وہ شر کے غذے اور عادی مجرم ہوتے ہیں۔ کیونکہ دونوں پارٹیوں کے کارکن ان کی خدمات سے مستفید ہونے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں!

URDU4U.COM  
بھلے وقتوں میں ہمیشہ ڈپٹی کمشنز کا پلہ بھاری رہا کرتا تھا کیونکہ قانون نے ضلع کا بڑا حاکم اسی کو تسلیم کیا ہے۔ یوں تو قاعدے کی رو سے اب بھی کپتان پولیس ڈپٹی کمشنز کے ماتحت ہوتا ہے۔ لیکن اب جمہوریت کا دور دوہے ہے۔ جمہوری نظام کی برکتوں میں سب سے بڑی برکت الیکشنیں ہیں۔ کبھی میونسل کمیٹی کی الیکشن، کبھی ڈسٹرکٹ بورڈ کی الیکشن۔ کبھی اسیبلی کے انتخابات۔ ہر وقت ایک نہ ایک الیکشن کا ہنگامہ گرم رہتا ہے۔ ان ہنگاموں میں امن عامہ کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں وہ کسی صاحب بصیرت کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ان خطرات کی روک تھام کے لیے ہمیشہ پولیس ہی خوش اسلوبی سے کام آتی ہے۔ چنانچہ ارباب سیاست بھی عام طور پر پولیس کپتانوں کی خوشنودی برقرار رکھنا قرین مصلحت سمجھتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر مقامی نازعوں میں فتح کا سرا سپرنژنڈنٹ پولیس ہی کے سر رہتا ہے اور ڈپٹی کمشز اپنا سامنہ لے کر تبدیل ہو جاتا ہے یا طویل رخصت پر وداع ہو جاتا ہے۔

خدا کے فضل و کرم سے میں فی الحال یوں کی نعمت سے محروم ہوں۔ میرے ایس پی کی یوں بھی پردے کی پابند ہے۔ اس لیے ہمیں اس داخلی نزاع کا مسئلہ درپیش نہیں آتا۔

اگرچہ میری یوں نہیں ہے لیکن جس بغلہ میں میں رہتا ہوں، اس میں ایک چھوڑ دو دو یوں کی گنجائش ہے۔ کوئی کی پشت پر ایک وسیع صحن ہے۔ اس میں کچھی دیوار کھینچ کر اسے دو حصوں میں منقسم کیا ہوا ہے کیونکہ میرے ایک پیشوں وہ یک وقت دو یوں کے خاوند تھے۔ اللہ کے فضل سے یہ دو صحن بھی کافی وسیع ہیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ جب کوئی صاحب یہاں چار یوں لے کر آئے گا تو ان کا اس کوئی میں

گزارہ بھی بڑی سوlut سے ہو جائے گا۔

○○○

## • الیکشن

مہینہ بھر سے سارے صوبے میں تبادلوں کا ہیضہ سا پھوٹ پڑا تھا۔ ڈپٹی کمشنروں کے تبادلے ہو رہے تھے۔ تحصیلداروں اور تھانیداروں کی تبدیلیاں زوروں پر تھیں اور سیاست کی بساط پر افروں اور اہلکاروں کے مرے بڑے چلکدستی سے سجائے جا رہے تھے کیونکہ الیکشن کی شذرینج شروع ہونے والی تھی اور اس تکمیل پر وزیروں اور وزارتؤں نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔

اسی زمانے میں ”نیا ہدایت انجمن“ کی م Mum بھی اپنے جو بن پر تھی اور افزائش غلبہ کے سلسلے میں کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں، پولیس کپتانوں اور محکمہ مال، محکمہ زراعت، محکمہ جنگلات اور محکمہ سول سپلائی کے جملہ افروں کی ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس صوبائی دارا حکومت میں طلب کر گئی۔

فضیلت ماب چیف منیر اور جملہ عزت ماب منیر صاحبان نے خاص طور پر اس کانفرنس کو اپنے قدوم مینت لزوم سے سرفراز کیا۔

چیف منیر نے انجمن کی فضیلت اور کیمیائی کھاد کی برکتی پر ایک برجستہ تقریر کی، جو وہ لکھوا کر لائے ہوئے تھے۔

اس کے بعد انہوں نے اخلاقیات پر کچھ کلمات خیر فی البدیہہ وعظ فرمائے اور بر سبیل تذکرہ الیکشن کے دوران سرکاری ملازموں کو شدید طور پر غیر جانبدار اور بلند کردار رہنے کی تلقین کی۔

”حضرات۔“ چیف منیر نے مریانہ سرپرستی کے انداز میں سنجیدگی سے کھنکار کر کما۔ ”یہ الیکشن آپ کی ایفی شنسی کی آذناش ہے۔ اگر آپ نے اپنے فرائض بخوان شائستہ انجام دیئے تو سمجھئے آپ کامران ہیں۔“

”ورنه“ چیف منیر کے چہرے پر رموز سلطنت کی خشوندگی نمودار ہوئی۔ ”ورنه حکومت اپنا

فرض پورا کرنے میں تسلیل نہ کرے گی۔ اگرچہ وہ کتنا تلغیہ کیوں نہ ہو۔“ فرانسیس منصبی کی اس تلغیہ گتھی کو وزیر صاحبان کے ناخن تدبیر نے کھول کر رکھ دیا۔

URDU4U.COM  
جب ”نیاہ اناج اگاؤ“ کی کانفرنس اپنا اہم ایجنسڈا پورا کر چکی، تو ہر عزت ماب وزیر اپنے علاقے کے ڈپٹی کمشنز کے کندھے پر دست شفقت رکھ کے الگ لے گیا اور اس کے حوالے ایک بنی بنائی فہرست کر دی جس میں تفصیلاً تفصیلاً یہ درج تھا کہ کون سے علاقے سے کونسا امیدوار عوام کا حق نمائندگی پوری طرح ادا کرنے کا اہل ہے اور کون کون سے امیدوار کو ہر قیمت پر ناکام کرنا باعث ثواب ثابت ہو گا۔

ڈپٹی کمشنر صاحبان نے دل و جان سے لاغذ کے بنے ہوئے یہ ”جھرلو“ اپنی جیب میں ڈال لیے۔ عام زندگی میں ”جھرلو“ گھمنا مداریوں کا کسب ہے۔ جادو کی یہ چھڑی گھما کر مداری خالی تھیلے سے زندہ کبوتر اور بند ٹوکروں سے آم لگے ہوئے پیڑ برآمد کرتے ہیں لیکن جب یہ ”جھرلو“ ایکشن کے موقع پر ڈپٹی کمشنر کے اشارے پر گھومتا ہے تو عوام کی ہتھیاریوں پر سرسوں کے کھیت کے کھیت جم جاتے ہیں۔ پولیس کی حفاظت میں مقلع تھے خانوں کے کواڑ ”کھل جاسم“ کے جادو سے وا ہو جاتے ہیں۔ لوہے کی سر بھر صندوقچیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور نااہل امیدواروں کے نام پڑے ہوئے ووٹ تالخ ارواح کے اصول پر لائق و فائق امیدواروں کے بکسوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہی ”جھرلو“ ووٹوں کی جعلی پرچیاں بناؤ دیتا ہے۔ اسی ”جھرلو“ کے فیض سے ووٹوں کی تعداد ووٹوں کی تعداد سے کئی گناہ بڑھ جاتی ہے اور یہ اسی ”جھرلو“ کی برکات کا نزولی ہے کہ افسروں کے ترقیاں ہوتی ہیں، ان کے تبادلے رکتے ہیں اور ان کے عزیزوں، رشتہ داروں اور طفیلیوں کو نوکریاں اور امپورٹ پرمٹ ملتے ہیں۔

ایکشن کا کاروبار بلیک مارکیٹ سے نیاہ وسیع اور دست غیب سے نیاہ ظلماتی ہے۔ دو ڈھائی لاکھ کی آبادی میں سے صرف ایک مائی کا لال منتخب ہوتا ہے۔ بے زبان کاشت کاروں، مزارعوں، مزدوروں کی یہ آبادی سینکڑوں مردیں میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں نہ نیاہ ریڈیو ہیں، نہ اخبار پڑھے جاتے ہیں اور یوں بھی آمدورفت کے وسائل

بیل گاڑیوں، چھکڑوں اور مسافروں سے اٹاث بھری ہوئی اکا دکا بسوں سے آگے نہیں بڑھے۔ چنانچہ ایک عام، سیدھا سادا امن پسند و ساتی شادی، غمی اور دیگر بلاہائے ناگہانی کی مجبوریوں کے علاوہ یونہی خواہ تجوہ سفر و سیلہ ظفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوتا۔ عوام جو گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، بکھرے ہوئے ہیں اپنے ذاتی ماحول، اپنے آس پاس کے چند ہمسایوں اور اپنے دکھ درد کے ساتھیوں کے علاوہ باقی دنیا سے نہ تو شناسا ہیں اور نہ اس قسم کی شناسائی پیدا کرنے کے وسائل ان کو میر ہیں۔ دو ڈھائی لاکھ گذریوں میں چھپا ہوا ایک لعل ڈھونڈ نکالنا جو ان کی نمائندگی کا حق ادا کر سکے ہرگز ہرگز ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔

چنانچہ عوام کے نمائندوں کا چنانچہ اکثر لاہور، پشاور، حیدر آباد، کراچی اور ڈھاکہ کے شرود میں بینہ کر ہوتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے دفاتر، اسٹبلی ہالوں، حکومت کے ایوانوں میں پس پرده سودا ہوتا ہے۔ نکٹ دینے اور نکٹ حاصل کرنے پر تن، من، دھن کی بانیاں لگتی ہیں۔ قرآن شریف کے صفحوں پر وفاداری کے حلف نامے تحریر ہوتے ہیں۔ پرانی دشمنیاں موقوف، نئی دشمنیاں شروع ہوتی ہیں۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے پرمٹوں کا بازار گرم ہوتا ہے۔ نئے ٹرکوں اور نئی بسوں کے روٹ پرمٹ جاری ہوتے ہیں۔ عدالتوں میں چلتے ہوئے سگین مقدمات داخل دفتر ہو جاتے ہیں۔ نئے الزامات اور نئے مقدموں کی مسلیں کھل جاتی ہیں۔ ڈپٹی کمشنروں، پولیس کپتانوں، مال افسروں، محسٹریوں، تحصیلداروں، تھانیداروں، گرداداروں، پُواریوں، نمبرداروں، زمینداروں، گماشتوں، صنعت کاروں، بڑے بڑے تاجریوں کے زیر سایہ ایکشن کے "جھرلو" بڑی سرعت سے چلنے لگتے ہیں اور ووڑوں کو بھیز بکریوں کی طرح ہائک کر پیدل یا چھکڑوں میں یا ٹرکوں میں لاد لاد کر پولنگ بوتھ پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ آزاد مملکت کے آزاد شری اپنا جمیوری حق ادا کرنے کے لیے کافند کی پرچیاں اس صندوقتی میں ڈال آئیں جس پر لاہور، پشاور، حیدر آباد یا ڈھاکہ کی خوشنودی کی مر پلے ہی ثبت ہو چکی ہے!

اگر ماحول سازگار ہے، تو پرچیاں ڈالنے کے فوراً بعد جملہ ووٹروں کو آزاد کر کے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جس طرح اور جس طرف ان کے سینگ سائیں اور بڑی خوشی سے تشریف لے جاسکتے ہیں ورنہ اگر مقابلہ سخت ہے تو ووٹروں کو ایک وقت کا کھانا اور ان کے سربراہوں کو نقد نذرانہ دے کر بصد عزت و احترام رخصت کر دیا جاتا ہے۔

جمهوریت کے اس مضمونہ خیز ڈھونگ میں بعض ووٹروں کو اکثر اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جس کے حق میں اس نے اپنی پرچی ڈالی ہے، وہ انسان ہے یا تار کا کھبما!

جب پاکستان بن رہا تھا تو کامگرس کے مقابلہ میں جنگ آزادی کو فروغ دینے کے لئے قائد اعظم نے اپیل کی تھی کہ ہر مسلمان صرف اس کو ووٹ دے جس پر مسلم لیگ کا لیبل لگا ہوا ہو ..... خوہ وہ بجلی کے تار کا کھبما ہی کیوں نہ ہو۔

مسلمان عوام نے اپنے محبوب رہنمای ارشاد سر آنکھوں پر لیا اور چن چن کر ایسے تار کے کھبموں کو جی بھر کر ووٹ دیئے کہ پاکستان بن بھی گیا، حکومت چل بھی پڑی، حالات معمول پر آ بھی گئے لیکن یہ تار کے کھبے بدستور اپنی اپنی جگہ ایستادہ رہے۔ نہیں جنبند نہ جنبند گل محمد۔ حتیٰ کہ کھبموں کے تار الجھ الجھ کر، جھنجھنا جھنجھنا کر ٹوٹے گے..... بجلی کے بلبل فیوز ہو گئے..... نور کی جگہ ظلمت چھانے لگی اور مارشل لاء کی ریت وجود میں آ گئی۔

ایک علاقے کے چند کھاتے پیتے، تعلیم یافتہ نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ الیکشن کے موقع پر کسی قسم کے ”بھرلو“ کے دام فریب میں گرفتار نہ ہوں گے بلکہ رائے عامہ کو آزادانہ اور بے باکانہ طور پر اثر انداز کرنے کا جہاد کریں گے۔ اس علاقے کے مستقل اور سند یافتہ عزت ماب وزیر نے یہ خبر سن کر بہت واہ واہ کی۔ تعلیمی ترقی اور جموروی بیداری کے عنوان پر بڑی خوشگوار قصیدے گائے اور ان نوجوانوں کے نیک ارادوں پر حکومت وقت کی خوش سگائی کی سند چپکانے کے لیے وزیر صاحب نے ان سب کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو فرمایا۔ پر تکلف دعوت اڑی۔ نہی مذاق کی باتیں ہوئیں اور جب وہ نوجوان کافی

کی پیالیاں لے کر آرام سے صوفون پر بیٹھ گئے تو یا ایک کمرہ بند کر کے باہر قفل لگا دیا گیا! ایک یا دو روز بعد جب الیکشنوں کی ممکن اچھی طرح سر ہو گئی تو یہ بلند ہمت نوجوان بھی رہائی پا کر خیر سے بدھو گھر کو آئے!

ایک مزارع کی بیوی چار بچوں، دو بیلوں، چند برتوں اور کچھ کپڑوں کا اٹاٹہ سمیت سرراہ خانہ بدوشوں کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کے خاوند نے زمیندار کی مرضی کے مطابق اپنا ووٹ ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس جرم کی سزا میں اسے کھڑے کھڑے نہیں سے بے دخل کر دیا گیا۔ مکان چھین گیا۔ زمیندار کے گماشہ مزارع کو پکڑ کر تھانے لے گئے۔ تھانیدار نے چوری کے الزام میں اس کا پرچا کالتا اور بیوی بچے اپنے دو بیلوں سمیت سرک کے کنارے بیٹھ کر جمہوری راج کی برکتوں کا فیض پانے لگے۔

ایک اچھے خاصے متوسط درجہ کے خاندان کا سربراہ اچانک لاپتہ ہو گیا۔ الیکشن کے سلسلے میں وہ کچھ ناپسندیدہ قسم کی اکڑفون دکھا رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے درخواست دی کہ الیکشن کے روز میرے باپ کو مخالف پارٹی نے اٹھا کر کر نہر میں پھینک دیا تھا۔ اب تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ درخواست پر تفتیش کا حکم جاری ہوا۔ رپورٹ آئی۔ ”مسی مذکور عرصہ سے مفقود ہے۔ پر مسی مذکور کا الزام بے بنیاد ہے۔ چنانچہ پر مذکور کو زیر جرم قانون دروغگوئی ماخوذ کیا جائے۔ چالان زیر تکمیل ہے۔ درخواست ہذا داخل دفتر ہو۔“

ایک دور افتادہ قصہ میں ایک مولوی صاحب تھے۔ پا کیزہ صورت، پا کیزہ سیرت، علم و فضل سے بہرہ مند، خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار، ضعیفی اور نحیفی میں بھی جوانوں سے نیا وہ ہمت اور عزم کے مالک۔ انہوں نے ایک دارالعلوم اور ایک ہائی سکول بھی قائم کر رکھا تھا۔ بچوں سے کوئی فیس نہ لی جاتی تھی۔ کتابیں بھی سکول کی طرف سے مفت تقسیم ہوتی تھیں۔ اس علاقے کی بیشتر آبادی مولوی صاحب کے خلوص کی قائل اور ان کی بزرگی کی عقیدت مند تھی۔ غریب سے غریب کسان بھی فصل آنے پر حسب

توفیق گندم یا کپاس یا دھان مولوی صاحب کے بیت المال میں ڈال آتا تھا، جس سے سکول بھی چلتا تھا، دارالعلوم بھی۔ اور یوں بھی کئی طرح سے غریب غرباً کی امداد ہوتی رہتی تھی۔ اس تجربے کی کامیابی نے ہمت بڑھاتی اور مولوی صاحب کو شوق ہوا کہ سکول کو وسعت دے کر کالج بنایا جائے اور اگر کالج بھی چل لٹکے تو اس بنیاد پر ایک مکمل اسلام یونیورسٹی کی داغ نیل ڈالی جائے۔ منصوبہ بلند و بالا تھا اور اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا شوق رفتہ رفتہ جنون کی صورت اختیار کر گیا۔ مولوی صاحب کے بہت سے عقیدت مند زندگی کا گرم سرد دیکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے رائے دی کہ ایسے عالیشان منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ مولوی صاحب صوبائی اسمبلی میں ممبر بن کر جائیں اور وہاں پر اپنے تعلیمی عزائم کے حق میں آواز اٹھائیں۔

مولوی صاحب گوشہ نشین بزرگ تھے۔ سیاسی ریشه دو ائمہ سے الگ تھا۔ اقتدار کی ہوس سے بے نیاز۔ لیکن اپنے تعلیمی منصوبوں کی تڑپ میں وہ چار و ناقار سیاست کے میدان میں اتر ہی آئے اور اگلی ایکشن میں کسی سیاسی پارٹی سے ناطہ جوڑے بغیر ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہو گئے۔ ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ سب سیاسی جماعتوں کے ساتھ مساوی سلوک روا رکھیں تاکہ ان کے تعلیمی پروگرام کو ان سب کی حمایت یکساں طور پر حاصل ہو سکے۔

اپنے علاقے میں دور دور تک مولوی صاحب کا ڈنکہ بج رہا تھا۔ لوگوں نے جو ق در جو ق ان کے نام ووٹ ڈالے۔ یہاں تک کہ صوبے میں جس جگہ سب سے نیا ہو عورتوں نے ووٹ ڈالے وہ مولوی صاحب ہی کا حلقة تھا۔ بہت سی عورتوں نے حسن عقیدت کے جوش میں ”فتولی“ صادر کر دیا تھا کہ جو مرد مولوی صاحب کو ووٹ نہ دے گا، اس کا نکاح اپنی بیوی سے فق ہو جائے گا! ایکشن کے روز گاؤں گاؤں کی عورتیں ٹولیاں بنانے کر نکلیں اور حمد و شنا کے گیت اور نعمتیں گاتی مولوی صاحب کی صندوقی میں اپنے ووٹوں کے علاوہ جوش عقیدت میں چاندی کے چھوٹے چھوٹے زیور، نقدی، ریشم کے دھاگے بھی ڈال آئیں۔

سیاست کی بائی کڑھی میں خدمت اور خلوص کا یہ ابال ایک نیا عجوبہ تھا۔ شام کو جب ووٹوں کی سرببر صندوقچیاں مسلح کانشیبلوں کی حفاظت میں تحصیل کے خزانے میں پہنچ گئیں تو راتوں رات سیاست کا "جھرلو" گردش میں آیا اور صبح ہوتے ہوتے قبلہ مولوی صاحب تو اپنے مجرے میں بیٹھے کے بیٹھے نہ گئے اور ان کا وہ حریف بھاری اکثریت سے الیکشن جیت گیا، جو پچھلے کئی سال سے اسمبلی کی اس موروثی نشست کا جانشین بنا بیٹھا تھا، جس کے سر پر سرکار کی خوشنودی کا سایہ اور ہاتھ میں ایک منظم سیاسی پارٹی کا جھنڈا تھا اور جس کے گھر تین منکوحہ بیویوں کے علاوہ بہت سے کئے اور کئی دوسری طرح کے لوازمات بھی موجود تھے۔

## • ابے مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

جس طرح ”نیا وہ اناج اگاؤ“ کی ممکن ایک مستقل نعرہ بن گئی ہے اسی طرح رہبر بنو اور رہبر بناؤ کی تحریک بھی ایک ہمہ گیر مشغلوں کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

URDU4U.COM  
نیایی جڑی بونیوں کی طرح رہبروں کی بھی دو خاص صورتیں ہیں۔ ایک انتخاب جیتنے سے پہلے دوسری انتخاب ہارنے کے بعد پہلی صورت میں عموماً سفیر یا وزیر پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں جو رہبر وزارت اور سفارت کی اسامیوں سے بال بال فتح جائیں، انہیں قوم کا غم کھانے اور ڈپٹی کمشنوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔

قوم کا غم کھانے والے رہبر قوم کا غم بڑی خوش اسلوبی سے کھاتے ہیں۔ اگر یہ غنوار طبقہ عالم وجود میں نہ رہے تو پچاری قوم بت جلد گنجی ہو جائے۔ لیکن جو رہبر فقط ڈپٹی کمشنوں کا ہاتھ بٹانے پر مامور ہیں، ان کی ذات سے چشم ما روشن اور دل ماشاد ہوتے ہیں۔

اسی طرح کے ایک رہبر اس وقت مجھے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی چال ڈھال اور ان کے سارے انداز پکار پکار کر پوچھتے ہیں ”کہنے صاحب کوئی عکین واردات تو نہیں ہوئی؟ اگر نہیں ہوئی تو کیوں نہیں ہوئی؟ ضرور ہوئی ہو گی۔ یہ بھی کوئی بات ہے بھلا کہ ہر روز زنا بالبجر ہو؟ خون خرابہ نہ ہو؟ مالک اور مزارع کی لڑائی نہ ہو؟ رشتہ ستانی نہ ہو؟ خویش پروری نہ ہو؟ نافضانی نہ ہو؟ ..... ارے صاحب، یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور ڈنکے کی چوٹ ہو رہا ہے۔ فقط آپ کی اطلاعات کمزور ہیں۔“ وہ میز پر مکار کے اعلان کرتے ہیں۔

”کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔“ رہبر صاحب بے الجھن میں ہیں۔ ”اگر ایک قصہ ہو تو کچھ تفصیلات بھی عرض کروں۔ لیکن ایں خانہ تمام آفتاب است۔۔۔۔۔ یہاں پر تو قدم

قدم پر یہی روتا ہے۔ آہ! نہ جانے اس بدنصیب قوم کا کیا انجام ہونے والا ہے۔“  
جی تو بہت چاہتا ہے کہ پچاری قوم کے انجام سے پیشتر میں انہیں ان کے چھوٹے بھائی  
کے انجام کی بشارت دوں، جو اگلے روز چینی کی بیک مارکیٹ کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔

لیکن مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ میں خاموش رہوں۔ یہ رہبر صاحب کئی بار اعلان کر  
چکے ہیں کہ صوبے کے کئی اخبار ان کی مٹھی میں ہیں اور اگر ابھی تک ان میں میرے  
خلاف کوئی بیان شائع نہیں ہوا، تو یہ محض ان کی نظر التفات کا فیض ہے۔

باتیں کرتے کرتے اچانک دور سے کئی بندوقیں چلنے کی آواز آتی ہے۔ رہبر صاحب  
اپنی کرسی پر اچھل پڑتے ہیں۔ ”آپ نے کچھ سن؟ یہ مهاجر کالونی میں فائرنگ ہو رہی  
ہے۔ آج صبح میں نے پولیس کے کئی ڈرک اس طرف جاتے دیکھے تھے۔ کئی سال سے  
غیرب مهاجر وہاں امن سے بیٹھے ہیں۔ اب پولیس انہیں زردستی وہاں سے اٹھا رہی ہے۔  
میں پوچھتا ہوں آخر یہ ظلم کب تک جاری رہے گا؟ مجھے اجازت دیجئے۔ میرا وہاں  
پہنچنا اشد ضروری ہے۔“

میں انہیں اطمینان دلات ہوں کہ یہ پولیس کی فائرنگ نہیں بلکہ رائفل کلب میں بندوق  
چلانے کی مشق ہو رہی ہے۔ اور اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے میں شری دفاع پر وہ پوری  
تقریر دہراتا ہوں جو آج صبح میں نے رائفل کلب کی رسم افتتاح پر کی تھی۔

میری تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوتا ہے۔ اور جناب رہبر مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔۔۔  
یوں بھی یہ حضرت مایوسی کے دائی مریض ہیں۔ اگر کوئی برقدع پوش عورت ان کے  
سامنے بازار میں صحیح سالم گزر جائے تو وہ بے حد مایوس ہو جاتے ہیں کہ کسی صاحب  
دل نے آگے بڑھ کر اس کا برقدع کیوں نہیں نوچ ڈالا؟ اگر عورتیں اسی طرح امن  
و امان، عزت و آبرو سے چلتی پھرتی رہیں تو جلوں میں گلا پھاڑ پھاڑ کر قوم کی خدمت  
کیسے ہو گی؟ اگر ہر روز امن عامہ میں خلل واقع نہ ہو تو اخباروں میں دھواں دھار  
بیانات کون چھپوائے گا؟

جاتے جاتے رہبر صاحب اپنی قیمتی قرآنی ثوپی جان بوجھ کر میری میز پر بھول جاتے ہیں۔

یہ اس بات کی علامت ہے کہ کچھ وقفہ کے بعد وہ اپنی ٹوپی لینے کے بمانے دوبارہ تشریف لا سئیں گے اور اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں میری معلومات میں اضافہ فرمائیں گے جو اگلے روز چینی کی بلیک مارکیٹ کرتے پکڑا گیا تھا!

یہ لیڈر ذرا جلالی ٹائپ کے رہبر ہیں۔ ان کے بر عکس ایک سرتاپا جمال رہبر ہیں، جو مجھے ملتے ہی پوچھتے ہیں۔ ”آپ کے تبادلے کی کوئی خبر تو نہیں؟“  
”جی نہیں، میں نے تو کوئی خبر نہیں سنی۔“

”کوئی پروا نہیں۔“ جمالی رہبر صاحب بڑے اصرار سے میری ڈھارس بندھاتے ہیں۔ ”اگر کوئی ایسی وسی خبر اڑے، تو بلا تامل مجھے بتا دیجئے گا۔ میں لاہور جا کر سارا بندوقت کر دوں گا۔“

مجھے بار بار ان کو یقین دلانا پڑتا ہے کہ فی الحال میرے تبادلہ کا کوئی اندیشہ نہیں۔ میرے بھائی بندوں پر کوئی مقدمہ نہیں چل رہا۔ میرے بھتیجیوں اور بھانجوں پر کوئی آفت نازل نہیں ہوئی..... لیکن جمالی لیڈر صاحب مضر ہیں کہ اگر آج نہیں تو کل مجھے اس قسم کے حادثات سے لازمی طور پر دوچار ہونا ہی پڑے گا۔ لہذا میری عافیت اسی میں ہے کہ میں ان کی فرمانبرداری، سعادت مندی اور ان کے خلوص پر مکمل اعتماد رکھوں۔ اس یقین دہانی کے بعد وہ یکاکی اپنی جیب سے ایک فہرست برآمد کرتے ہیں۔ اس فہرست میں چند پشاوریوں اور تھانیداروں کے نام درج ہیں جنہیں رہبر صاحب رفah عame کے خیال سے کسی اور جگہ تبدیل کرانا چاہتے ہیں۔

”مجھے ذاتی طور پر ان ملازموں سے کوئی پرخاش نہیں۔“ جمالی صاحب فرماتے ہیں۔ ”البتہ عوام کی سولت اور خیر سگالی کا خیال ہے۔ اگر یہ صاحبان تبدیل ہو جائیں تو عوام کے سر سے ایک بہت بڑی بلا ٹیل جائے گی۔“

سرکاری ملازموں کا یہ رد و بدل ان رہبروں کی محبوب مشغله ہے۔ رفah عame کی آڑ میں دراصل یہ حرہ علاقائی کارندوں پر دھونس قائم رکھنے کا موثر ذریعہ ہے۔ اگر ڈپٹی کمشنز اس قسم کے ہنگمنڈوں سے بے نیاز رہنے کی کوشش کرے تو بہت جلد اس غریب کا

اپنا تبادلہ ہو جاتا ہے!

لیڈروں کے طبقہ میں سب سے مشکل پسند برادری ان رہنماؤں کی ہے جو سیاست کی جگہ خالص مذہبی پیشوائی پر گزارہ کرتے ہیں۔ عید بقر عید کی طرح ان کا کارروبار بھی سال بھر میں فقط ایک یا دو بار چلتا ہے۔ خاص طور پر محرم کے دنوں میں ان کی کارگزائیاں بہت زور پکڑ لیتی ہیں۔ کہیں جلوس کے راستوں پر تنازعہ ہے، کہیں تعزیوں کی لمبائی پر تکرار ہے۔ کسی نامے میں جب ہولی یا دسرے کے جلوس مسجدوں کے آگے سے گزرتے تھے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اچھا خاصا میدان کارزار گرم ہو جاتا تھا لیکن آزادی بھی ملی، اور ہندو بھی گئے۔ پھر بھی جلوسوں اور مساجد کا تصادم اسی گرم بازاری سے جاری ہے۔

ظہر کا وقت ہے۔ محرم کا جلوس نکلا ہوا ہے۔ سینوں کی مسجد میں معمول سے نیا نہ نمازی جمع ہیں۔ جلوس نے اپنی رفتار جان بوجھ کرست کر دی ہے تاکہ جب اذان کی آواز بلند ہو تو لپک کر مسجد کے عین سامنے پہنچا جائے۔ ادھر موذن کو انتظار ہے کہ جلوس نزدیک آئے تو خدا کے بندوں کو نماز کے لیے پکارا جائے۔ ..... باہر جلوس اور اندر جماعت دو مختلف فوجوں کی طرف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ لیکن عین اس وقت اس علاقہ کا تھانیدار یا مجریت دوں فریقوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے نمائندے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجیں۔ فریقین کے پیشووا اپنے اپنے ”وفود“ لے کر بھد ترک و احتشام ڈپٹی کمشنر کے پاس آتے ہیں۔ اب اگر ڈپٹی کمشنر نے سال بھر سے ان رہنماؤں کے ساتھ مربیانہ خیر سگالی کے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ تو بہت جلد مصالحت کے آسان آسان راستے نکل آتے ہیں۔ ورنہ اگر بد قسمتی سے ”وفور“ میں سے کسی صاحب کا راشن ڈپٹی ان کی بدعوانیوں کی وجہ سے منسون ہو چکا ہے، یا کسی صاحب کو ٹرک چلانے کا لائنس نہیں ملا، یا کسی صاحب کی دکان کی الائمنٹ معرض التوا میں ہے، یا کسی صاحب کے فرزند ارجمند کو ضلع کچری میں ملازمت نہیں ملی، تو.....

ایک گاؤں میں اچانک خطرناک قسم کی کشیدگی نمودار ہو گئی۔ مسئلہ تنازعہ یہ تھا کہ

دروود و سلام کے دوران ”یا رسول اللہ“ کہنا جائز ہی نہیں بلکہ باعث برکت بھی ہے۔ دوسرے مولوی صاحب اسے ناجائز اور بدعت قرار دیتے تھے۔ علماء کرام کے دائرے سے پھیلتی پھیلتی یہ بحث سارے گاؤں میں سراحت کر گئی۔ اس آڑ میں بہت سی ذاتی رنجشوں، اقاربتوں اور مخاصموں نے بھی اپنا رنگ دکھایا اور رفتہ رفتہ گاؤں کے بہت سے لوگ آپس میں برس پیکار ہو گئے۔ ایک دوسرے کے مویشی چڑائے گئے۔ سر پھٹول ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں فساد اور بدآمنی کے ایک مستقل چکر میں بڑی طرح پھنس گیا۔ آخر کار دونوں مولویوں کو گرفتار کر کے باہر بیج دیا گیا اور جب پوری تفییش کے بعد اس جھٹکے کا پہاڑ کھودا گیا تو اس میں سے سیاست کی ایک چھوٹی سی چوہیا برآمد ہوئی۔ گاؤں میں ایک نمبردار صاحب تھے جو کسی زمانے میں صوابی اسیبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ تک انہوں نے بڑے ٹھانٹھ سے ممبری کی۔ لیکن پھر ان کے مخالف امیدوار نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ انتخاب ناجائز طریقوں سے ہوا تھا، اس لیے کالعدم قرار دیا جائے۔ مقدمہ منظور ہوا اور ایک دن بیٹھے بٹھائے ایم۔ اے صاحب اسیبلی کی رکنیت سے خارج ہو گئے۔ جن دنوں یہ نمبردار صاحب ایم۔ ایل۔ اے تھے، ان کی شان ہی کچھ اور تھی۔ لاہور جاتے تھے تو وزیریوں کے دوش بدوش بیٹھتے تھے۔ ضلع کی تقریبوں میں انہیں اگلی صاف میں جگہ ملتی تھی۔ تحصیلدار اور تھانیدار دورے پر آتے تھے تو ان کے گھر کا کھانا ضرور کھاتے تھے۔ چند پڈواریوں اور ضلعداروں کو بھی انہوں نے اپنے اثر سے ادھر ادھر تبدیل کرایا تھا۔۔۔۔۔ اتنا سارا کون منہ کو لگنے کے بعد جب اسیبلی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تو زندگی کے سارے مزے کر کرے ہو گئے۔ اب نہ وزیریوں کی بات پوچھتے تھے۔ نہ ڈپٹی کمشنر انہیں اپنی دعوتوں میں بلاتا تھا۔ ہاں، تحصیلدار اور تھانیدار البتہ ان کا کھانا اب بھی کھا لیتے تھے، لیکن گھر پر جا کر نہیں بلکہ حسب ضرورت اپنے کیمپوں ہی میں منگوا بھیجتے تھے!

زندگی کی اس بے کیفی کو ختم کرنے کے لیے سابق ایم۔ ایل۔ اے نے بہت سے نئے آزمائے۔ لیکن سیاسی وقار کی جو عمارت منہدم ہو چکی، اس کے مینارے کسی صورت دوبارہ

بلند نہ ہوتے تھے۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد آخر انہوں نے اپنے خرچ سے دو متصاد مولویوں کو بلا کر گاؤں میں یہ نیا فساد برپا کر دیا۔ بچارے مولوی صاحبان تو گرفتار ہو گئے، لیکن کچھ روز کے لیے نمبردار صاحب کی لیڈری کا بازار بھی خوب گرم ہو گیا۔ پولیس اور مال کے افسر اور محسریٹ صاحبان جو اس ہنگامہ کے سلسلے میں وہاں جاتے تھے وہ سب سابق ایم۔ ایل۔ اے کے ہاں فروکش ہوتے تھے اور حفظ عامہ کے سارے منصوبوں میں ان کی رائے بڑی مفید ثابت ہوتی تھی۔

لیڈروں کی منڈی میں بازار کے بھاؤ اکثر اولتے بدلتے رہتے ہیں۔ منڈی غلمہ کی ہو یا سیاست کی، تجارتی اصول سب جگہ قریباً ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ آج کل بڑی بڑی دکانوں میں مختلف چیزوں پر قیتوں کے لیبل لگانے کا رواج عام ہے۔ یوں بھی حکومت نے قیتوں پر کنٹرول کرنے کے لیے بہت سے قانون بنایا رکھے ہیں۔ لیکن رہنماؤں کی جس جنس سے ڈپٹی کمشنر کو مخفی اپنی کاروباری فراست اور نظر شناسی سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سیاست اور تجارت کی اس کش کمش میں کبھی کبھی بچارے ڈپٹی کمشنر کا بھی دیوالہ نکل جاتا ہے!

## • رپورٹ پٹواری مفصل ہے

مرزا غالب نے فرمایا تھا

جانے کیا گزرے ہے قطرے پر گھر ہونے تک  
 اگر مرزا آج زندہ ہوتے اور انہیں ضلع کے دفاتر کی نیارت  
 نصیب ہوتی تو ان پر راہ سلوک کی وہ تمام منزلیں منکش  
 ہو جاتیں جن سے گزر کر قطرے کو گھر ہونا پڑتا ہے!  
 میرے سامنے چھ درخواستوں کا لپندا ڈا ہے۔ یہ درخواستیں  
 عیدو ولد چینا قوم جوگی سابق سکنہ موبہن ماجہ تحصیل روپڑ حال  
 مقیم موضع روڈو سلطان تحصیل شورکوت ضلع جھنگ کی ہیں  
 جو اس نے درجہ بہ درجہ فضیلت ماب گورنر پنجاب، عزت  
 ماب وزیر اعلیٰ، عزت ماب وزیر بحالیات، فانشنل کمشنر، کمشنر  
 اور ڈپٹی کمشنر کے نام بصیرہ رجسٹری ارسال کی تھیں۔ ان  
 سب درخواستوں کا مضمون واحد ہے:

”جناب عالیٰ“  
 بکمال ادب گذارش ہے کہ فدوی ضلع انبارہ کا مهاجر ہے۔ موضع موبہن ماجہ تحصیل روپڑ  
 میں فدوی کے پاس ۱۸ گھماوں اراضی چاہی و بارانی تھی۔ فدوی نے کلیم فارم داخل  
 کئے تھے، لیکن کسی وجہ سے خالی واپس آ گئے۔ فدوی نے عذرداری کی ہوئی ہے، لیکن  
 ابھی تک سنترل ریکارڈ آفس سے جواب نہیں آیا۔ فدوی نے ثقہی کلیم فارم بھی دیئے  
 ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی شناوائی نہیں ہوئی۔

موضع روڈو سلطان تحصیل شورکوت ضلع جھنگ میں فدوی کو ۱۲ گھماوں متروکہ اراضی عارضی

طور پر الٹ ہوئی تھی۔ فدوی چار سال سے اس پر قابض ہے اور فصل کاشت برداشت کر رہا ہے۔ فدوی لگان بھی باقاعدگی سے ادا کرتا رہا ہے۔ لیکن اب پُواری حلقہ بہ طمع نفسانی یہ نہیں کسی اور مهاجر کو الٹ کر رہا ہے۔ جناب عالی اگر فدوی کی الٹ منٹ ٹوٹ گئی تو فدوی کا کنبہ فاقوں سے مر جائے گا۔ دوسرا کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ فقط کھیتی باڑی پر گزانہ ہے۔ لہذا التماس بحضور انور ہے کہ فدوی کا عارضی رقبہ تا تصفیہ عذرداری بحال رکھا جائے تاکہ فدوی اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے۔ فدوی تازیت حضور انور کی جان و مال کی دعا دے گا۔ ”

لاث صاحب، وزیر اعلیٰ، وزیر مهاجرین، مناشنل کمشنر اور کمشنر کے دفاتر سے یہ درخواستیں یکے بعد دیگرے ڈپٹی کمشنر کے پاس ”برائے مناسب کارروائی آتی گئیں۔ صدر کا مسل خواں ہر درخواست پر حسب ضابطہ نوٹ لکھتا گیا۔ ”بطلب روپورٹ بخدمت جناب افسر مال صاحب مرسل ہو۔“ ڈپٹی کمشنر نے تیز رفتار مشین کی طرح اپنے دستخط ثبت کئے اور درخواستیں ”بطلب روپورٹ“ افسر مال سے تحصیلدار، تحصیلدار سے نائب تحصیلدار، نائب تحصیلدار سے گرداؤر قانونگو، اور گرداؤر قانونگو سے اسی پُواری کے نام مرسل ہوتی گئیں جو ”بہ طمع نفسانی“ اس الائمنٹ کو منسون کرنے کے درپے تھا۔

پُواری حلقہ نے چھ کی چھ درخواستوں کو جمع کر کے رجسٹر میں نصیح کیا اور ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ازہر فرض شناسی عیدو کو طلب فرمایا۔

”عیدو بھائی، اب تم بہت اونچا اٹنے لگے ہو۔ لو، جی کھول کر اڑ لو۔“ پُواری صاحب نے درخواستوں کا پنڈہ رجسٹر سے نکال کر عیدو کے منہ پر دے مارا۔

عیدو کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لاث صاحب، وزیر اعلیٰ، وزیر مهاجرین، فناشنل کمشنر، کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی ساری تجلیاں اس وقت پُواری صاحب کی ذات میں مرکوز ہو گئی تھیں۔ اگر عیدو کو تصوف سے کچھ مس ہوتا تو وہ اسی وقت ”ہمہ اوست“ کا نعرہ لگا کر معرفت کی بہت سے منزلیں ایک ہی قدم میں طے کر لیتا۔

”اب تم یہ درخواستیں جھنگ، ملٹان یا لاہور لے جاؤ۔“ پڑواری نے عرضیوں کو رجسٹر میں دوبارہ نتھی کرتے ہوئے کہا۔ ”اور ان کی بتیاں بنا کر اپنے سالے باپوں کو دے آؤ۔“

اگر اس عمل سے عیدو کی الائمنٹ بحال نہ سکتی تو وہ بڑی خوشی سے یہ رائے بھی قبول کر لیتا۔ لیکن پڑواری نے درخواستوں کو نتھی کر کے پھر رجسٹر میں بند کر لیا، اور عیدو کو چند جدید طرز کی گالیاں سنا کر گھر جا کر آرام سے سونے کی ہدایت کی۔ ایک مینے، دو مینے، تین مینے ..... عیدو ہر دوسرے تیرے روز تحصیل اور ضلع کے دفتروں میں جاتا اور وہاں سے گھر کیاں، جھٹکیاں اور دھکے کھا کر واپس آ جاتا۔ کبھی کبھی اسے نہایت پیچیدا گالیوں کے ساتھ کوئی مفید مشوہ بھی مل جاتا تھا۔ جس کا سلیمان اردو میں یہ ترجمہ ہوتا تھا کہ تمہارے کاغذات پر مناسب کارروائی ہو رہی ہے۔ تم ہر روز یہاں آ کر دق نہ کرو ..... اسی ہیرا پھیری اور مشوروں کی تلاش میں اس کے برتن اور بیوی کے زیور بھی بک گئے۔ اب بیلوں کی جوڑی کی باری تھی لیکن پڑواری صاحب نے بروقت فیصلہ کر کے عیدو کو اس افتادے سے بچا لیا۔

پڑواری صاحب نے عیدو کی نئی نسخہ کر کے کسی دوسرے مہاجر کے نام تجویز کر دی اور اس تجویز کے کفرم ہونے تک ساری درخواستوں کو رجسٹر میں بڑی احتیاط سے ایک طرف نتھی رکھا۔ جب یہ سب منزلیں بخیر و خوبی طے ہو گئیں تو انہوں نے اپنا فرض منصبی انجام دینے کے لیے عیدو کی درخواستوں پر اپنی روپورٹ تحریر فرمائی:

”جناب عالی۔ سائل مسمی عیدو فضول درخواست ہاء دینے کا عادی ہے۔ اسے متعدد بار سمجھایا گیا کہ اس طرح حکام اعلیٰ کا وقت ضائع کرنا درست نہیں۔ لیکن سائل اپنی عادت سے مجبور ہے۔ سائل کا چال چلن بھی مشتبہ ہے اور اس کا اصلی ذریعہ معاش فرضی گواہیاں دینا ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس کے پاس کوئی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کا کلمیں فارم خالی واپس آ چکا ہے۔ سائل نے دو مرتبہ عذرداری بھی کی لیکن بے سود۔ متعدد گواہاں

کے بیان بھی لیے گئے۔ ان سب سے ثابت ہوتا ہے کہ سائل کے پاس مشرقی پنجاب میں کوئی نہیں نہ تھی۔ چنانچہ کھیوٹ نمبر ۱۳، مریعہ نمبر ۲۵، موضع روڈو سلطان میں ۱۲ گھماوں نہیں جس پر سائل کا ناجائز قبضہ تھا، اس کے نام سے منسخ ہو کر مسمی نوربخش کے نام حسب صابطہ کنفرم ہو چکی ہے۔ مسمی نوربخش ضلع جالندھر کا مهاجر اور سابق سفید پوش ہے۔ اس کے مصدقہ کلیم فارم واپس آگئے ہیں اور موضع روڈو سلطان میں متروکہ اراضی سے اس کی حق رسی کر دی گئی ہے۔ نیز آنکہ مسمی نوربخش کا رسرکار میں ہر وقت امدادی ہے اور خاکسار کی رائے میں صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی خوشنودی کی سند کا مستحق ہے۔ بہراد حکم مناسب رپورٹ ہذا پیش بخفور انور ہے۔“  
گرداؤر قانوںگو نے لکھا۔ ”رپورٹ پڑواری مفصل ہے۔ بہراد حکم مناسب بخفور جناب نائب تحصیلدار پیش ہو۔“

جناب نائب تحصیلدار صاحب نے لکھا۔ ”رپورٹ پڑواری مفصل ہے۔ بہراد حکم مناسب بخفور جناب تحصیلدار صاحب پیش ہو۔“

جناب تحصیلدار صاحب نے لکھا۔ ”رپورٹ پڑواری مفصل ہے۔ بہراد حکم مناسب بخدمت افسر مال بہادر پیش ہو۔“

صاحب افسر مال بہادر نے لکھا۔ ”رپورٹ پڑواری مفصل ہے۔ بہراد حکم مناسب صدر پیش ہو۔“ مسل خواں نے حکم لکھا۔ ”رپورٹ پڑواری مفصل ہے۔ درخواست ہائے مسمی عیدو نضول ہیں۔ داخل دفتر ہوں۔ مسمی نوربخش کے کافذات بوقت انتخاب برائے سندات پیش کئے جائیں۔“ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے اس حکم پر اپنے دستخط ثبت فرمائے۔۔۔۔۔ اور مسیمان عیدو اور نوربخش پر بڑی باصلطگی کے ساتھ دولت خداداد کی مریں لگ گئیں۔

یہ اور بات ہے کہ مر نوربخش کی پیشانی پر گلی اور عیدو کی پشت پر!

## • جس کھیت سے دھنل کو میر نہ ہو روزی

نور محمد کا خاندان کوئی چار پشت سے موضع غوثہ والا آباد تھا۔ اس کے پاس ایک مرربعہ نہیں تھی جو وہ بطور مزارعہ بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔ نہیں کا مالک حاجی اللہ یار تھا۔ جس کے پاس کل ملا کر کوئی ساڑھے سات ہزار ایکڑ یا پانچ سو مربعہ اراضی تھی۔ حاجی اللہ یار کے دو لڑکے فوج میں کپتان تھے۔ ایک لڑکا صوبائی سول سروس کا افسر تھا، اور چوتھا بیٹا زمینداری میں باپ کا مددگار و معاون تھا۔

حاجی اللہ یار کی زمینداری کا کارخانہ بت وسیع تھا۔ پانچ سو میں سے کوئی ڈھانی سو مربعوں میں کاشت کاری ہوتی تھی۔ پچاس مربعے باغات کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور ان میں طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں کے ذخیرے تھے۔ حاجی صاحب کے باغات اعلیٰ قسم کے ریڈ بلڈ مالٹوں اور کوئی انیس قسم کے تخمی اور پیوندی آموں کے لیے دور دور تک مشہور تھے۔ میں پچیس مربعوں میں جنگل آباد تھا۔ اس جنگل میں بڑے اہتمام سے ہر قسم کے شکاری پرندوں کو پala جاتا تھا اور سال میں ایک دو بار حاجی صاحب کے ملازم بیٹوں کے بڑے بڑے سول اور ملٹری افسر یہاں شکار کھیلنے آیا کرتے تھے۔ ایسے شکاروں کے موقع پر جنگل میں منگل منایا جاتا تھا۔ سرخ سرخ، پیلے پیلے بانات کے خیموں کا ایک شر سا آباد ہو جاتا تھا۔ تیل سے بھلی پیدا کرنے والا انجمن خیموں کی اس کالونی کو بقعہ نور بنا ڈالتا تھا۔ حاجی اللہ یار کی وسیع زمینداری سے کوئی ساٹھ ستر جواں سال مزارعے اپنا گھر بار چھوڑ کر جنگل میں آ رہتے تھے تاکہ شکار کے انتظامات میں بیگار ادا کریں۔ افسر لوگ تو گھوڑوں یا جیپوں پر سوار ہو کر شکار کھیلنے جاتے تھے لیکن ان کی نازک اندام یویاں عام طور پر پالکیوں میں بیٹھ کر شکار کا نظائرہ کرتی تھیں۔ شام کو ہر خیمے میں گرم گرم ایٹتے ہوئے پانی کے ٹب بھر دیئے جاتے تاکہ دن بھر کی یاضت کے بعد تھنگے ہوئے اجسام نہ دھو کر تانہ دم ہو جائیں۔ ذہن کی استراحت کے لیے شراب

اور کتاب کا وافر اہتمام ہوتا تھا اور روح کی بایدگی کے لیے رات کو بڑے نہیں کا مجرما منعقد ہوتا تھا۔ دل، دماغ اور جسم کی اس تسلیکین کے بعد جب معزز مہمان نرم، گرم گرم رضاۓیوں میں دبک کر لیٹ جاتے تھے، تو خاص تربیت یافتہ ملازم ان کے پاؤں دبانے پر مامور ہو جاتے تھے۔ نازک اندام بیبوں کی کمریں اور کولے دبانے کے لیے دائیاں آ جاتیں تھیں۔ دبانے والوں کے ہاتھوں پر خس اور حنا کے عطر مل دیئے جاتے تھے تاکہ وہ قلنی پینے کی بو شری نقصنوں میں گھس کر کوئی نامانوس رد عمل پیدا نہ کر سکے۔

ڈھائی سو مربعوں میں فصل، پچاس مربعوں میں باغات، پچھیس مربعوں میں شکار..... حاجی اللہ یار کے یاتی پونے دو سو مربعے یونہی بخیر پڑے رہتے تھے۔ خدا نے حاجی صاحب پر اپنا فضل اتنا عام کر رکھا تھا کہ ان پونے دو سو مربعوں میں کسی قسم کی کاشت کرنے کی حاجت کبھی محسوس ہی نہ ہوتی تھی، لیکن حاجی صاحب اپنی بخیر نہیں کی ایک ایک باشت کی حفاظت بھی اسی تندی سے کرتے تھے جس طرح اپنے پھلدار باغوں اور درختوں کی۔ ایک بار نور محمد کے باپ نے نظر بچا کر بخیر نہیں کے دو کھیتوں میں کپاس بیج لی تھی۔ اس سال اسے کچھ کپڑے کی ضرورت تھی کیونکہ اس کی بڑی لڑکی کا جیزیر تیار ہونا تھا۔ جب حاجی اللہ یار کو اس چوری اور سینہ زوری کا علم ہوا تو انہوں نے کھڑے کھڑے کپاس کی فصل کو آگ لگوا دی اور چاک مار مار کر نور محمد کی کھال ادھیز دی۔ اس مار دھاڑ میں اچانک ان کی نظر جیزیر والی بڑی لڑکی پر بھی پڑ گئی۔ پھول سی کھلی ہوئی جوانی۔ متانہ نگاہیں۔ گدرا گدرا جسم..... وہ تو خیریت ہوئی کہ حسن کے اس امڈتے ہوئے سیلاپ میں ان کا غصہ دھیما پڑ گیا۔ ورنہ وہ نور محمد کو نہیں سے بے دخل کر کے ہی دم لیتے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ چودہ برسیں اللہ یار نے ابھی حج نہیں کیا تھا!

سال بھر کی محنت مشقت کے بعد نور محمد مزارعہ اور اس کے تین جوان بیٹے فصل تیار

کر کے گندم اور پنے کی ڈھیریاں بنائیتے ہیں۔ ایک ڈھیری میں کوئی آٹھ آٹھ من غلہ ہوتا ہے۔ یہ ڈھیریاں مالک اور مزارعہ کا مشترکہ کھاتا ہوتا ہے۔ یوں تو بیانی کی شرح نصفاً نصف ہے لیکن تقسیم سے پہلے ان ڈھیریوں میں سے زمیندار کچھ جائز اور کچھ ناجائز حقوق مالکانہ وصول کر لیتا ہے۔ سالماں سال سے یہ جزیہ ایک قانونی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ گاؤں کے کاغذات میں ان حقوق کی تفصیل اس طرح درج ہے:

تحم بذمه مزارعہ ..... معاملہ بذمه مالک

بزرہ چانہ سالم حق مزارعہ

ڈھیری جس بحصہ نصف۔ نصف مابین مالک و مزارعہ بعد وضع خرچ ہائے ذیل:  
خرچ کیاں:

ترکھان ..... ساڑھے چار پائی فی ہل

لوہار ..... ساڑھے پائی فی ہل

چھاچی ..... پانچ ٹوپہ فی ڈھیری

موچی ..... نو پائی فی ڈھیری

نائی ..... نو پائی فی ڈھیری

جس یا فتنی مالک از ڈھیری مشترکہ:

مصلی (ملازم مالک) ..... ۱ پائی فی ڈھیری

محاصل ..... ۱ ٹوپہ فی ڈھیری

مالک کا پتواری ..... ۳ ٹوپہ فی ڈھیری

مشی ڈیرے دار ..... ۲ پائی فی ڈھیری

دادا (مراٹی) ..... ۱ پائی فی ہل

جگہ ..... ۱ ٹوپہ فی ڈھیری

دھواں دار (برائے تکیہ فقیراں) ..... ۱ پائی فی ڈھیری

رسول ارواحی ..... ا نوپہ فی ڈھیری  
خرج گھوڑا ..... کاھیاں (شیاں) ایک گذھ  
یا دو پائی گندم فی ڈھیری

ملبہ (برائے خرج در ڈاک بنگلہ برائے افران دودھ گشتی) ۲ پائی فی ڈھیری

URDU4U.COM

دیگر مراعات جو مالک مزارعہ سے لیتا ہے:

مالک کی شادی یا موت پر ..... ایک بھیڑ یا بکری یا گائے  
مزارعہ کی شادی پر ..... مال کے ملازم کے لیے ایک روپیہ  
بصورت یکاری یا مہمان ..... جتنے مرغ مالک کھلا بھیجے

حسب خواہش و پسند ..... لیاری یعنی دودھ دینے والی گائے یا بھینس دودھ کے عرصہ تک۔  
اچھا بیل معمول عوضانہ پر۔

گاہ کے موقعہ پر ..... ایک جوڑا بیل و آدمی یا پندرہ پائی گندم  
لپائی مکان ..... حسب موسم  
چکلی کی پسوائی ..... حسب ضرورت

اس کتر یونٹ کے بعد مزارعہ کے پاس جو بچتا ہے، اس میں علاقہ کے پذاری کا فصلانہ  
اور تھانیدار کا نظرانہ الگ ہوتا ہے۔ باقی مانہ جنس میں مزارعہ اپنا پیٹ بھی پاتا ہے  
اور اپنے خاندان کا بھی۔ اگر حسن اتفاق سے مالک دل پھینک ہے اور مزارعہ کے خاندان  
میں کوئی لڑکی کپکی ہوئی فصل کی طرح تیار کھڑی ہے، تو ہماری میں ایسے آگئیں بھی آ  
جاتے ہیں جو دھرتی ماتا کی کوکھ سے جنم نہیں لیتے!

تو قادر و عاول ہے مگر تیرے جہاں میں  
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات!

نوٹ:

ا نوپہ ..... قرباً ڈھائی سیر

قدرت الله شباب

شباب نامہ

۳ نوچ ..... ا پائی  
ڈھیری ..... تقریباً آٹھ من

○ ○ ○

## • گھر پیر گا بھل کے چراغوں سے ہے روشن

”حضرت قبلہ و کتبہ فخر سالکاں رہنمائے عاشقان آفتاب طریقت ماتحت معرفت  
جناب مخدوم زادہ غلام مرشد خاں صاحب پیر، لینڈ لارڈ اینڈ لیدر“

URDU4U.COM

یہ کسی مزار کا کتبہ نہیں بلکہ ایک جیتے جاگتے انسان کا تعارفی کاڑ ہے جو ایک بہت  
بڑی گدی کے سجادہ نشین ہیں۔ آپ کمپنی سڑکوں پر ماشر یوک استعمال کرتے ہیں۔ کچی  
سڑکوں کے لیے شیورلٹ اسٹیشن ویگن ہے۔ شکار کے لیے جیپوں کا انتظام ہے۔ اس کے  
علاوہ دس باہہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے ہیں جن پر وہ خود کبھی سوار نہیں ہوتے۔ تین ساڑھے  
تین درجن نسلی کتے ہیں، جن کی خدمت کے لیے بہت سے خادم مامور ہیں۔ کبوتروں  
کا بھی شوق ہے اور گاہے ماہے۔ بیوروں کی پالی سے بھی جی بھلا لیا کرتے ہیں۔  
درگاہ شریف پر درویشانہ ٹھاٹھ ہیں لیکن مریدوں کی سولت کے لیے کئی بڑے بڑے شروں  
میں جدید طرز کی کوٹھیاں بنائی رکھی ہیں۔ گدی کے نام دو ہزار ایکڑ اراضی وقف ہے۔  
یوں بھی سال بھر میں مریدان باصفا سے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ نذرانہ وصول ہو جاتا ہے۔  
صوفیائے کرام کا ملک ہے کہ دنیاوی مال و متاع کا اجتماع راہ سلوک کا راہزمان ہوتا  
ہے۔ چنانچہ اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے سجادہ نشین صاحب روپیہ روپیہ جمع کرنے  
کی خطا نہیں کرتے اور ہر سال درگاہ شریف کی ساری آمدنی بڑے سلیقے سے ٹھکانے لگاتے  
رہتے ہیں۔ گرمیوں میں مری، کونک، آئیبٹ آباد اور سردیوں میں لاہور، پشاور اور کراچی  
کے شروں کو فیض پہنچایا جاتا ہے۔ سالانہ عرس کے موقعہ پر گاؤں کے لوگ روحانی ثواب  
حاصل کرتے ہیں اور اس طرح سجادہ نشین صاحب سارا سال اپنے مریدین کی خاطر  
دینی اور دنیاوی مجاہدوں میں منہک رہتے ہیں۔  
سالانہ عرس شریف کا آخری دن ہے۔ محفل سماع کے لیے دھوم دھام کا اہتمام ہے۔

عود، لوبان اور اگر تیاں سلگ رہی ہیں۔ گلاب پاش بجے ہوئے ہیں۔ مشک کافور کی مہک فضا میں رچی ہوئی ہے۔ سجادہ نشین صاحب منقش عبا پنے گدری پر ممکن ہیں۔ چرے پر جمال اور آنکھوں میں جلال ہے۔ سامے باریک چھوٹ کے پیچھے عورتوں کی مجلس ہے۔ سجادہ نشین صاحب کی چشم بصیرت بڑی خوش اسلوبی سے چھوٹ کے آپا رگھوم رہی ہے۔ گدی کے باسیں ہاتھ افران ضلع کی نشیں ہیں۔ داسیں جانب پیر بھائی، روئسا اور سیاست پیشہ اصحاب برآ جمان ہیں۔ ایک کونے میں درویشوں کا گروہ ہے، جن پر قوالی کے دوران یکے بعد دیگرے ”حال“ طاری ہو گا۔ وجدان کی سوت کے لیے لاہور سے طریقت پسند لڑکوں کی ایک پارٹی بھی آئی ہوئی ہے اور وہ باریک ململ کے کرتے اور ترجیحی نوبیاں پنے بڑے ادب سے دوزانو بیٹھے ہیں۔ ان سب کے درمیان قوالوں کی چوکڑی اپنا ساز و سامان تیار کئے متعدد بیٹھی ہے اور پیچھے حدنگاہ تک زائرین کا اجتماع ہے۔ یہ عقیدت مند دور دراز مقامات سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس سوار کے لیے نہ موڑیں ہیں، نہ گھوڑے اور پالکیاں ہیں۔ لیکن ہر سال روحانیت کی کشش انہیں سفر و سیلہ ظفر کی ہر دشواری اور صعوبت کے باوجود یہاں کھیج لاتی ہے۔ شاید یہ لوگ اپنے ہل کا بیل فروخت کر کے یہاں آئے ہیں؟ شاید انہوں نے اپنی یویوں کا زیور یا اپنی بیٹھیوں کے جیز گروہ رکھ کر نذرانے کا بندوقت کیا ہے؟ شاید جب یہ واپس لوٹیں گے تو انہیں کئی کئی روز فاقوں کا سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ ان کی گندم کے فالتو ذخیرے درگاہ شریف کے لنگر کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

قالوں کی پارٹی نے بڑی خوش مستی کے ساتھ ہارمونیم کا ساز چھیڑا۔ طبلہ پر تحاب پڑی۔ جای کی غزل فضا میں لرائی۔ درویشوں کے سر گھونمنے لگتے ہیں، طریقت پسند لڑکے بیٹھے ہی بیٹھے بڑی ادا سے کمریں مٹکاتے ہیں۔ سجادہ نشین صاحب کا مور چھل طرہ بھی جنبش میں آ جاتا ہے۔ جیسے میں کی آواز پر سانپ کا پھن لرا رہا ہو۔ ایک ایک بول، ایک ایک تال پر روہیں بے اختیار پھڑکتی ہیں۔ افسر لوگ اپنے وقار کی بندشوں سے مجبور ہو کر کبھی کبھی محض سر ہلا دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سیاست پیشہ اصحاب بھی اپنے

منصب کی رعایت سے سر کی جگہ چوری چوری پاؤں ہلاتے ہیں۔ دیناتی عقیدت مندوں کا ہجوم جو اکثر فارسی زبان سے بے بسرہ ہے نہ سر ہلاتا ہے نہ پاؤں۔ لیکن پیر بھائی، درویش اور طریقت پسند لوٹے آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ وہ بے اختیار گردنیں ملکاتے ہیں۔ سجدوں میں گرتے ہیں۔ گھننوں کے بل کھڑے ہو ہو کر ہاتھوں نزت کے ساتھ راگینیوں کی تان پر جھوٹتے ہیں اور جب قوالوں کے گلے خوب گرا جاتے ہیں تو کئی ایک درویش ہو حق کا نفرہ لگا کر میدان میں کوڈ پڑتے ہیں۔

ایک صاحب اپنی سفید داڑھی کو مٹھیوں میں بھینچ کر والہانہ رقص کر رہے ہیں۔ دو درویش ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے رموز بے خودی کے راز و نیاز میں مشغول ہیں اور بار بار ترچھی ٹوپیوں والے لڑکوں کے پاس جا جا کر پچھاڑیں کھاتے ہیں جو ان کی وارفتگی کو سارا دینے کے لیے خاص طور پر لاہور سے مدعو کئے گئے ہیں۔ ساری محفل مودبانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ عقیدت مند جھک جھک کر دونوں ہاتھوں پر ایک ایک، دو دو، پانچ روپے رکھ کر سجادہ نشین کے حضور میں پیش کرتے ہیں، جو انہیں چھو چھو کر قوالوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایک طالب علم نے اپنا فونٹین پین نذر کیا۔ ایک صاحب دل نے اپنا کوت اتار کر پھینک دیا۔ ایک کسان جو کے ستواں کی پوٹلی پیش کرتا ہے جسے غالباً وہ زاد راہ کے طور پر اپنے ساتھ لایا تھا۔

جائی، حافظ، خرو، اقبال، بلحے شاہ، خواجہ فرید ..... رات کے ڈیڑھ بجے جب محفل سماع برخاست ہوتی ہے تو سجادہ نشین صاحب بڑے اخلاق سے اپنے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے افسروں اور رئیسیوں کو اس خیے میں چلنے کی دعوت دیتے ہیں جو درگاہ شریف سے کچھ ہٹ کر ایک حویلی کے صحن میں نصب کیا گیا ہے۔ اس خیمہ میں مقریبین خاص کے علاوہ اور کسی کا گزر ممکن نہیں۔ ”راہ سلوک“ میں یہ خیمہ اس مقام پر واقع ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر! کیونکہ اس خیمے میں لاہور، ملتان اور لائلپور کی نای گرامی گانے اور مجرما کرنے والی فنکاریں اتری ہوئی ہیں۔

قوالی خدا اور مریدوں کو خوش کرنے کا ذریعہ تھی۔ فکاروں کا مجرما افسروں اور رئیسوں کی خوشنودی کے لیے منعقد ہوتا ہے۔ دین اور دنیا کے اس امتزاج میں سجادہ نشین کے لیے بہت بڑی برکات کا نزول مضر ہے۔ مجرے والے خیمه میں پہنچ کر سجادہ نشین صاحب اپنی زرکار قبا ایثار دیتے ہیں اور لہراتے ہوئے طرے والی بزرگی بھی خادم خاص کے حوالے کر دیتے ہیں۔ خادم اس دستار فضیلت کو چاندی کی طشتی میں رکھ کر باہر لے جاتے ہیں۔ خدا جانے اب یہ گپڑی کہاں جائے گی؟ شاید یہ گپڑی نبی بخش لوہار کے گھر چلی جائے جس کی بیٹی نے ابھی ابھی اپنی عمر کا سولہواں سال پورا کیا ہے ..... شاید یہ گپڑی روشن دین معمار کے گھر پہنچ جائے جس کی جمیلہ پر شباب کے پھول تانہ تانہ کھلے ہیں۔ شاید.....

یہ گپڑی بڑی عصمت اور وقار والی گپڑی ہے۔ اس گپڑی میں اولیائے کرام کی وراثت پارینہ محفوظ ہے۔ اس گپڑی کے ساتھ بزرگی، عظمت اور معرفت کی روایات صادقہ وابستہ ہیں۔ اس گپڑی کے سارے اوتاؤ اور ابدال اور اقطاب عرش منیر کے گنگروں تک پہنچتے رہے ہیں۔ اس گپڑی کی سلوٹوں سے فیض کے چشمے بنتے آئے ہیں۔ صدیوں سے بندگان خاص و عام کو یہ گپڑی انور و تجلیات و مشاهدات سے سرفراز کرتی رہی ہے۔ یہ بڑی مرادوں والی گپڑی ہے۔ اس پر ایجاد و قبول کے سب دروازے وا ہیں۔ یہ گپڑی خدا کی بارگاہ سے بھی خالی نہیں لوٹتی ..... لیکن جب یہی سحر کار دستار کسی نبی بخش لوہار یا روشن دین معمار یا چراغ علی کسان کے گھر اچانک جا پہنچتی ہے، تو پیاری پیاری، نازک نازک معصوم جوانیاں سم کر مرجحا جاتی ہیں۔ خادم خاص گپڑی اٹھائے گھر کا ایک چکر لگاتا ہے اور اسی طرح خاموش واپس لوٹ آتا ہے لیکن یہ خاموشی چیخ چیخ کر اعلان کرتی ہے کہ اے گھر والو، مبارک ہو۔ تمہاری بھویا بیٹی پر حضرت قبلہ و کعبہ فخر سالکاں، رہنمائے عاشقل، آفتاب طریقت، ماہتاب معرفت کی نظر اختاب پڑ گئی ہے۔ اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے نصیبوں پر رحمت خداوندی کا سایہ قائم رہے۔ تمہاری کھیتیاں سر بزر لہماتی رہیں۔ تمہارے جھونپڑوں کو آگ نہ لگے۔ تمہارے مویشی گم نہ

ہوں۔ تمہارے دالان میں ہتھکریاں نہ جھنچھنا گئیں اور جیل خانوں کے دروازے تم پر اچانک  
وا نہ ہوں، تو برضاء و رغبت.....  
”مالک“ ہمارے گھر گپڑی آگئی ہے۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ از طرف سکینہ دختر غلام  
محمد۔ رحبانہ.....“

URDU4U.COM

یہ مختصر ساخت مجھے ایک روز ڈاک میں ملا۔ میں نے اسے ایک بڑا پڑھا۔ دوبار پڑھا۔ لیکن  
کوئی بات سمجھے میں نہ آئی۔ کراچی میں جو گپڑی رائج تھی اس کا تعلق دکانوں یا مکانوں  
سے ہوتا تھا لیکن گپڑی کا یہ نیا روپ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں نے پولیس والوں  
اور مجرمین سے پوچھا۔ وکیل صاحبان سے دریافت کیا، لیکن یہ انوکھی گتھی کسی سے  
حل نہ ہو سکی۔ معاملہ کی تھے تک پہنچنے کے لیے ہم نے اسی رات اچانک سکینہ کے  
گھر پر چھاپے مارا۔ سکینہ تو بچ گئی لیکن افسوس کہ وہ گپڑی ہمارے ہاتھ نہ آسکی جس  
کی ایک ایک سلوٹ میں بیا کاری اور سیاہ کاری کے ساتھ لمرا رہے تھے۔

## • ڈسٹرکٹ بورڈ

جمهوری راج کی برکتوں میں سب سے افضل برکتیں ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونپل کمیٹیاں ہیں۔ میرے ضلع میں خدا کے فضل سے ایک ڈسٹرکٹ بورڈ اور تین میونپل کمیٹیاں ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کو میں نے خاص طور پر روشن ضمیر اور فرض شناس پایا ہے۔ ایک اوورسینیر صاحب تھے جو دس بارہ سال سے لگاتار دونوں ہاتھوں سے رشوت کھا رہے تھے۔ ایک روز اچانک ڈسٹرکٹ بورڈ کے ضمیر نے انگڑائی لی اور قوم کا اخلاق درست کرنے کے لیے اوورسینیر صاحب کو معطل کر دیا گیا۔ معلوم نہیں معطلی کے ایام میں اوورسینیر صاحب نے کن کن فقیری و ظائف اور اوراد کا عمل کیا کہ رفتہ رفتہ ڈسٹرکٹ بورڈ کو احساس ہونے لگا کہ رشوت بے شک بری بات ہے لیکن اوورسینیر بھی تو آخر بال بچوں والا آدمی ہے۔ اگر یہ ملازمت سے برطرف ہو گیا تو اس کے اہل و عیال کا کیا بنے گا؟ چنانچہ تجویز یہ ٹھہری کہ نہ صرف اوورسینیر کو بحال کیا جائے بلکہ اس کے منصب میں بھی خاطر خواہ ترقی کر دی جائے۔ یہ تجویز بورڈ کی مینگ میں منظوری کے لیے پیش ہوئی۔ مینگ کی کاروانی قرآن خوانی اور دعائے خیر سے شروع ہوا کرتی تھی تاکہ خدا بورڈ کو نیک اور صالح اعمال کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ لیکن اس روز سب نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ اوورسینیر کا معاملہ قرآن خوانی سے پہلے طے کر لینا چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خدا مسبب الاسباب ہے اور ہر آزمائش میں اپنے منتخب بندوں کا ایمان سلامت رکھتا ہے!

ایک دفعہ میں ایک طویل دورے سے واپس آ رہا تھا۔ ایک پروفیسیونل مقام پر ڈسٹرکٹ بورڈ کا ڈاک بغلہ نظر آیا۔ جی چاہا کہ گھنٹہ دو گھنٹہ یہاں قیام کیا جائے۔ ڈاک بغلہ کھلا پڑا تھا۔ اندر گیا تو دیکھا کہ چھت غائب ہے۔ پہلے خیال آیا کہ شاید یہ اوپن ائمہ تھیم کی طرح اوپن ائمہ ڈاک بغلہ ہو۔ لیکن چوکیدار نے بڑی خندی پیشانی سے وضاحت کی

کے دراصل یہ ۱۹۵۰ء کے سیالب کا نتیجہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ بھائی سیالب تو نہیں پر آیا تھا لیکن چھت آسمان سے کیونکر گر پڑی؟ چوکیدار نے سادہ لوگی سے جواب دیا کہ صاحب، اس میں بھی اللہ کی کوئی حکمت ہو گی! اس ڈاک بگلہ میں چینی کی چند پرچ پیالیاں اور کچھ رکابیاں بھی موجود تھیں۔ ان سب کی پشت پر انگریزی میں درج تھا 1854 Jhonson, London، لیکن ہماری تعمیر کی ہوئی ڈاک بگلہ کی چھت سیالب کے ایک سو برس پرانے تھے۔ لیکن ہماری تعمیر کی ہوئی ڈاک بگلہ کی چھت سیالب کے ایک ہی ریلے سے بہ کر گر گئی تھی۔

ڈاک بگلہ کی رعایت سے مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کی ایک ڈپنسری یاد آگئی، جو ایک نہایت دور افたہ گاؤں میں واقعہ ہے۔ بغیر اطلاع دیئے دور دراز دیہات میں اکیلے گھونٹے کا مجھے بے حد شوق ہے۔ اس طرح ایک انسان کی آنکھ ان نظاروں کا مشاہدہ کرتی ہے جو ڈپٹی کمشنر کی آنکھ کو نصیب نہیں ہوتا۔ ان دو آنکھوں میں بلا عجیب و غریب فرق ہے۔ انسان کی آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے اور ڈپٹی کمشنر کی آنکھ فقط ان نظاروں کا مشاہدہ کرتی ہے جو ڈپٹی کمشنر کی آنکھ کو نصیب نہیں ہوتا۔ ان دو آنکھوں میں بلا عجیب و غریب فرق ہے۔ انسان کی آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے اور ڈپٹی کمشنر کی آنکھ فقط وہی دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہے جو اسے دکھایا جائے۔ اس کے علاوہ انسان کی آنکھ عموماً سیدھی ہوتی ہے اور ڈپٹی کمشنر کی آنکھ اپنے ٹیڑے ترچھے زاویوں کی وجہ سے کسی قدر بھینگی ہو جاتی ہے..... خیر، اس دور افتاب گاؤں میں مجھے ایک اصل نظر آیا جو دراصل وہاں کا ہسپتال تھا۔ ڈاکٹر صاحب دھوتی اور بنیان پنے کری پر اکڑوں بیٹھے تھے اور اپنے گھنٹوں پر پرچیاں رکھے نخے لکھ کر مریضوں کو دے رہے تھے، جنہوں نے کرسی کے چاروں طرف گھیرا ڈالا ہوا تھا۔

”کیا مرض ہے؟“ ڈاکٹر صاحب ہر مریض سے سوال کرتے تھے۔ مریض اپنی بساط کے مطابق اپنے مرض کی خود تشخیص کرتا تھا اور ڈاکٹر صاحب بڑی سرعت

سے نخنہ لکھ کر اس کے حوالے کر دیتے تھے۔ غالباً یہ نخنہ تعویذ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، کیونکہ مریض نخنہ لے کر بغیر کوئی دوا مانگے وہاں سے چلا جاتا تھا۔

میری خاکی پتلوں اور سفید بیش شرت کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے سامنے ایک نیج پر بٹھا لیا، جس پر ان کا حقہ اور پانداناں پڑا تھا۔ انہوں نے کہنی بار مجھے دوسرے مریضوں پر ترجیح دینے کی کوشش کی، لیکن میں نے جواب دیا کہ میری تکلیف ذرا پیچیدہ قسم کی ہے، اس لیے میں سب سے آخر میں اپنا حال بیان کروں گا۔

جب مریضوں کا ہجوم ختم ہو گیا، تو ڈاکٹر صاحب بڑی خیر سگالی سے میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے اپنی تکلیف بیان کی۔

”ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”میرے دماغ میں کچھ خلل واقع ہو گیا ہے۔ مجھے بیٹھے بیٹھے وہم ہونے لگتا ہے کہ میں ضلع جھنگ کا ڈپٹی کمشنر لگ گیا ہوں۔“

ڈاکٹر صاحب نے بڑی پھرتی سے اپنی ٹانگیں کرسی سے نیچے اتار لیں اور عینک کے خول کے اوپر سے مجھے بڑے غور سے گھورا۔ جب انہیں اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ میری تراش خراش اور وضع قطع میں ڈپٹی کمشنر کی کوئی علامت موجود نہیں ہے، تو وہ پھر کرسی پر اکٹوں بیٹھ گئے اور ایک کافند گھٹنے پر رکھ کر غالباً نخنہ لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وقت انہیں مملت دیتا تو وہ میرے لیے بدہضمی کا علاج تجویز فرماتے۔ لیکن میں اس وقت گاؤں کے نمبردار نے وہاں پہنچ کر میرے جنون کا راز فاش کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب بے تحاشا بھاگ کر اپنے کواٹر میں گئے اور کچھ دری کے بعد بنیان کے اوپر شیر وانی پہنے اور ہاتھ میں سیستھو سکوپ لے کر برآمد ہوئے۔ اب انہوں نے خالص افرانہ انداز میں میری تشریف آوری پر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا اور مجھے ہسپتال کا معائینہ کرنے کی دعوت دی۔ میں نے بھی بڑی وضعداری سے ڈپٹری کا معائینہ کیا، جس میں تنچھر آیوڈین، سوڈا بائی کا زب، ایسپرین اور بڑی بوتلوں میں کئی دن کے باسی پانی کے علاوہ اور کوئی دوائی موجود نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ڈسٹرکٹ بورڈ میں ہسپتال

کا بجٹ تو باقاعدگی کے ساتھ سال کے شروع میں منظور ہو جاتا ہے۔ لیکن دوائیوں کا اسٹاک اکثر سال کے اخیر میں یا بعض اوقات اگلے سال موصول ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یقین تھا کہ اس تاخیر کا ہپتال کی ہر دلعزیزی یا افادیت پر ہرگز کوئی برا اثر نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ دوائیاں موجود ہوں یا نہ ہوں، مریض بہر حال آتے ہی رہتے تھے اور پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنے رجسٹر کے اعداد و شمار سے مجھے یہ خوش خبری بھی سنائی کہ متواتر کئی برس سے مریضوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس مقام پر پورے نو برس سے میکائی فرمائے رہے تھے۔ انہیں فخر تھا کہ اس دوران میں میریا کے مریضوں میں ۵۷ فیصد، پچش کے مریضوں میں ۵۰ فیصد اور خارش کے امراض میں ۲۵ فیصد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ڈپنسری کا آخری معائنہ ۱۹۳۱ء میں ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہپتال کا ان ڈور وارڈ بھی دکھایا، جس میں غالباً ان کی بھینس باندھی جاتی تھی کیونکہ ایک کونے میں تانہ گور کے نشان تھے، جسے ابھی ابھی صاف کیا گیا تھا۔

معاینے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے وزیرز بک پیش کی کہ میں میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔ میں نے فی البدیہ عرض کیا:

”دنیائے طب میں یہ ہپتال سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں پر دوائیوں کی جگہ نہ نہ سے علاج کیا جاتا ہے اور مریضوں کی تعداد روز افزون ترقی پر ہے۔ ہپتال میں داخل ہونے والے مریضوں کے لیے بھینس کے خالص دودھ کا خاطر خواہ انتظام ہے کیونکہ وارڈ میں بھینس باندھنے کا بھی اچھا بندوست ہے۔ گور بھی وقت پر اٹھایا جاتا ہے اور کھیلوں کی آمد و رفت پر کوئی خاص پابندی عائد نہیں ہے۔“

چند ماہ بعد جب میں دوبارہ اسی ڈپنسری کو دیکھنے گیا تو وارڈ میں ڈاکٹر صاحب کی بھینس تو بدستور بندھی ہوئی تھی لیکن وزیرز بک کے جس ورق پر میرے پہلے معاینے کی رائے درج تھی، وہ غائب تھا۔

## • علی بخش

ایک روز میں کسی کام سے لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں پر ایک جگہ خواجہ عبدالرحیم صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ علامہ اقبال کے دینہ اور وفادرار ملازم علی بخش کو حکومت نے اس کی خدمات کے سلسلے میں لانڈپور میں ایک مریع نہیں عطا کی ہے۔ وہ بچارا کئی چکر لگا چکا ہے لیکن اسے قبضہ نہیں ملتا، کیون کچھ شریر لوگ اس پر ناجائز طور پر قابص ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا: ”جھنگ لانڈپور کے بالکل قریب ہے۔ کیا تم علی بخش کی کچھ مدد نہیں کر سکتے؟“

میں نے فوراً جوا دیا، ”میں آج ہی اسے اپنی موڑ کار میں جھنگ لے جاؤ گا اور کسی نہ کسی طرح اس کو نہیں کو قبضہ دلوا کے چھوڑوں گا۔“

خواجہ صاحب مجھے ”جاوید منزل“ لے گئے اور علی بخش سے میرا تعارف کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جھنگ کے ڈپٹی کمشٹر ہیں۔ تم فوراً تیار ہو کر ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ یہ بہت جلد تمہاری نہیں کا قبضہ دلوا دیں گے۔“

علی بخش کسی قدر چکچالیا، اور بولا، ”سوچنے تو سی میں نہیں کا قبضہ لینے کے لیے کب تک مارا مارا بھروں گا؟ قبضہ نہیں ملتا تو کھائے کڑھی۔ لاہور سے جاتا ہوں تو جاوید کا نقصان ہوتا ہے۔ جاوید بھی کیا کے گا کہ بابا کن جھگڑوں میں پڑ گیا؟“

لیکن خواجہ صاحب کے اصرار پر وہ میرے ساتھ ایک آدھ روز کے لیے جھنگ چلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ میرے ساتھ کار میں بیٹھ جاتا ہے تو غالباً اس کے دل میں سب سے بڑا وہم یہ ہے کہ شاید اب میں بھی بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح علامہ اقبال کی باتیں پوچھ پوچھ کر اس کا سر کھپاؤں گا۔ لیکن میں نے بھی عزم کر رکھا ہے کہ میں خود علی بخش سے حضرت علامہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اگر واقعی وہ علی بخش کی زندگی کا ایک جزو ہیں، تو یہ جوہر خود بخود عشق اور مشک کی

طرح ظاہر ہو کے رہے گا۔

میری توقع پوری ہوتی ہے اور تھوڑی سی پریشان کن خاموشی کے بعد علی بخش مجھے یوں گھورنے لگتا ہے کہ یہ عجیب شخص ہے جو ڈاکٹر صاحب کی کوئی بات نہیں کرتا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور ایک سینما کے سامنے بھیڑ بھاڑ دیکھ کر وہ بڑیانے لگا۔ ”مسجدوں کے سامنے تو کبھی ایسا رش نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب بھی یہی کہا کرتے تھے۔“

ایک جگہ میں پان خریدنے کے لیے رکتا ہوں، تو علی بخش بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے، ”ڈاکٹر صاحب کو پان پسند نہیں تھے۔“

پھر شاید میری وجہ کے لیے وہ مسکرا کر کھاتا ہے، ”ہاں حقہ خوب پیتے تھے۔ اپنا اپنا شوق ہے۔ پان کا ہو یا حقہ کا؟“

شیخوپورہ سے گزرتے ہوئے علی بخش کو یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک بار یہاں بھی آئے تھے۔ یہاں پر ایک مسلمان تحصیلدار تھے جو ڈاکٹر صاحب کے پکے مرید تھے۔ انہوں نے دعوت دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو پاؤ اور سیخی کتاب بہت پسند تھے۔ آموں کا بھی بڑا شوق تھا۔ وفات سے کوئی چہ برس پہلے جب ان کا گلا پہلی بار بیٹھا، تو کھانا پینا بہت کم ہو گیا۔“

اب علی بخش کا ذہن بڑی تیزی سے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہا ہے اور وہ بڑی سادگی سے ڈاکٹر صاحب کی باتیں سناتا جاتا ہے۔ ان باتوں میں قصوں اور کہانیوں کا رنگ نہیں بلکہ ایک نشے کی سی کیفیت ہے۔ جب تجھ علی بخش کا یہ نشہ پورا نہیں ہوتا، غالباً اسے ذہنی اور روحانی تسلیم نہیں ملتی۔ ”صاحب، جب ڈاکٹر صاحب نے دم دیا ہے، میں ان کے بالکل قریب تھا۔ صبح سوریے میں نے انہیں فروٹ سالٹ پلائیا اور کہا کہ اب آپ کی طبیعت بحال ہو جائے گی لیکن میں پانچ نج کر دس منٹ پر ان کی آنکھوں میں ایک تیز تیز نیلی نیلی سی چمک آئی، اور زبان سے اللہ ہی اللہ نکلا۔ میں نے جلدی سے ان کا سر اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور انہیں جھنجھوڑنے لگا۔ لیکن وہ رخصت ہو گئے

تھے۔

کچھ عرصہ خاموشی طاری رہتی ہے۔

پھر علی بخش کا مودود بننے کے لیے میں بھی اس سے ایک سوال کر ہی بیٹھتا ہوں۔ ” حاجی صاحب کیا آپ کو ڈاکٹر صاحب کے کچھ شعر یاد ہیں؟“

علی بخش نہ کر ثاتا ہے۔ ”میں تو ان پڑھ جائیں ہوں۔ مجھے ان باتوں کی بحلا کیا عقل۔“ ”میں نہیں مانتا۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”آپ کو ضرور کچھ یاد ہو گا۔“

”کبھی اے حقیقت منتحر والا کچھ کچھ یاد ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کو خود بھی بہت گنگنا کرتے تھے۔“

”ڈاکٹر صاحب عام طور پر مجھے اپنے کمرے کے بالکل نزدیک سلایا کرتے تھے۔ رات کو دو ڈھانی بجے دبے پاؤں اٹھتے تھے اور وضو کر کے جاء نماز پر جا بیٹھتے تھے۔ نماز پڑھ کر وہ دیر تک سجدے میں پڑے رہتے تھے۔ فارغ ہو کر بستر پر آ لیتے تھے۔ میں حق تانہ کر کے لا رکھتا تھا۔ کبھی ایک کبھی دو کش لگاتے تھے۔ کبھی آنکھ لگ جاتی تھی۔ بس صبح تک اسی طرح کروئیں بدلتے رہتے تھے۔“

میرا ڈرائیور احتراماً علی بخش کو سگریٹ پیش کرتا ہے۔ لیکن وہ غالباً حجاب میں آ کر اسے قبول نہیں کرتا۔

”ڈاکٹر صاحب میں ایک عجیب بات تھی۔ کبھی کبھی رات کو سوتے سوتے انہیں ایک جھنکا سا لگتا تھا اور وہ مجھے آواز دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کر رکھی تھی کہ ایسے موقعہ پر میں فوراً ان کی گردن کی پچھلی رگوں اور پھونوں کو زور زور سے دبایا کروں۔ تھوڑی دیر کے وہ کہتے تھے بس۔ اور میں دبانا چھوڑ دیتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مجھے اپنے نزدیک سلایا کرتے تھے۔“

ہر چند میرا دل چاہتا ہے کہ میں علی بخش سے اس واردات کے متعلق کچھ مزید استفسار کروں لیکن میں اس کے ذہنی ببط کو توڑنے سے ڈرتا ہوں۔

”ڈاکٹر صاحب بڑے درویش آدمی تھے۔ گھر کے خرچ کا حساب کتاب میرے پاس رہتا

تحا۔ میں بھی بڑی کفایت سے کام لیتا تھا۔ ان کا پیسہ ضائع کرنے سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اکثر اوقات ریل کے سفر کے دوران میں کئی کمی اشیائیں بھوکا رہتا تھا کیونکہ وہاں روٹی مہنگی ملتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ناراض ہو جاتے تھے۔ کہا کرتے تھے، علی بخش انسان کو ہمیشہ وقت کی ضرورت کے مطابق چلنا چاہیے۔ خواہ مخواہ ایسے ہی بھوکے نہ رہا کرو۔ اب اسی مربعہ کے نتیجے کو دیکھ لیجئے۔ لانڈپور کے ڈپٹی کمشنر صاحب، مال افسر صاحب اور سارا عملہ میری بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ بڑے اخلاق سے مجھے اپنے برادر کری پر بھاتے ہیں۔ ایک روز بزار میں ایک پولیس انسپکٹر نے مجھے پہچان لیا اور مجھے گلے لگا کر دیر تک روتا رہا۔ یہ ساری عزت ڈاکٹر صاحب کی برکت سے ہے۔ مربعہ کی بھاگ دوڑ میں میرے سر کچھ قرضہ بھی چڑھ گیا ہے۔ لیکن میں اس کام کے لیے بار بار لاہور کیسے چھوڑوں۔ جاوید کا نقسان ہوتا ہے۔“

”سنا ہے اپریل میں جاوید چند مہینوں کے لیے ولایت سے لاہور آئے گا۔ جب وہ چھوٹا سا تھا، ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اللہ کے کرم سے اب بڑا ہوشیار ہو گیا ہے۔ جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ اور منیرہ بی بی بہت کم عمر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے نرس کے لیے اشتخار دیا۔ بے شمار جواب آئے۔ ایک بی بی نے تو یہ لکھ دیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شادی کرنے کے لیے بھی تیار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی قدر پریشان ہوئے اور کہنے لگے، علی بخش دیکھو تو سی اس خاتون نے کیا لکھا ہے۔ میں بڑھا آدمی ہوں۔ اب شادی کیا کروں گا۔ لیکن پھر علی گڑھ سے ایک جرمن لیڈی آگئی۔ علی بخش کا تخيیل بڑی تیز رفتاری سے ماضی کے دھنڈکوں میں پرواز کر رہا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسے اپنے ڈاکٹر صاحب یا جاوید یا منیزہ بی بی کی کوئی نہ کوئی خوشنگوار یاد آتی رہتی ہے۔

جنگ پہنچ کر میں اسے ایک رات اپنے ہاں رکھتا ہوں۔ دوسری صبح اپنے ایک نہایت قابل اور فرض شناس مجسٹریٹ کپتان مہابت خان کے سپرد کر دیتا ہوں۔

کپتان مہابت خان علی بخش کو ایک نہایت مقدس تابوت کی طرح عقیدت سے چھو کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ وہ علی بخش کو آج ہی اپنے ساتھ لانڈپور لے جائے گا اور اس کی نہیں کا قبضہ دلا کر ہی واپس لوئے گا۔ ”حد ہو گئی۔ اگر ہم یہ معمولی سا کام بھی نہیں کر سکتے تو ہم پر لعنت ہے۔“

○○○

## • ملاقاتی

”جو صاحبان ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کرنا چاہیں، وہ سموار اور جمعرات کے روز صح نو بجے سے ۱۲ بجے دوپر تک بے روک نوک تشریف لے آئیں۔“

”بے مقصد کے ملاقاتی اور سفارشی حضرات آنے کی تکلیف نہ اٹھائیں۔“

یہ اس نوٹس بورڈ کی عبارت ہے جو میں نے شروع ہی سے اپنے دفتر کے سامنے لگا دیا تھا۔ پہلے تو اس سلیس عبارت کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہ آیا اور پیشہ ور ملاقاتیوں اور سفارشیوں کے علاوہ اور کوئی شخص میرے نزدیک تک نہ پہنچا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات بڑی سرعت سے بدلتے گے۔

پھر اور جمعرات کے روز دو گلک صح آٹھ بجے سے دفتر کے برآمدے میں بیٹھ جاتے تھے۔ جو جو آتا تھا، ان کے نام اسی ترتیب سے ایک فہرست میں درج کرتے جاتے تھے اور ملاقاتی اسی فہرست کے مطابق باری باری سب میرے پاس آتے تھے۔ اول اول شر کے حاجت مند لوگ آنا شروع ہوئے، پھر آس پاس کے قصبوں سے کچھ لوگ آنے لگے اور کچھ عرصہ کے بعد دور دراز کے دیہات سے ہر طبقہ کے لوگ آنے لگے۔ شروع شروع میں ملاقاتیوں کی تعداد پندھ بیس کے قریب ہوتی تھی۔ دو مینے کے اندر ان کی تعداد سو سوا سو کے لگ بھگ پہنچ گئی اور کچھ عرصہ کے بعد ایسا وقت بھی آیا کہ ملاقات کے روز مجھے تین تین چار چار سو لوگوں کے ساتھ ملنا پڑتا تھا۔

ایک ایک روز میں اتنے لوگوں کو بھگتنا بڑا صبر آزا مرحلہ ہوتا تھا۔ لیکن جب میں ایمانداری سے جائزہ لیتا ہوں تو ملاقاتوں کے یہی چند روز میری ساری ملازمت کا اصلی سرمایہ نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں اس کی وجہ کردار کی کمزوری یا ماحول کی کجھی ہے، لیکن حق تو یہ ہے کہ سرکاری کری اچھے خاصے انسان کا حیہ بگاڑ دیتی ہے۔ اس کی فطرت

ٹیڑھے ترچھے سانچوں میں ڈھلنے لگتی ہے۔ نگاہ کا زاویہ بہت حد تک بھینگا ہو جاتا ہے۔ دفتر کی فضا میں سانس لینے کے بعد باہر کھلی ہوا میں گھونٹنے والے ایک دوسری مخلوق نظر آنے لگتے ہیں۔ دفتری ماحول زندگی کے ہر پہلو پر ایک کثیف غبار کی طرح چھا جاتا ہے اور زندگی کی بے اندازہ وسعت سمٹ سمتا کر ایک چھوٹے سے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔

خاص طور پر ڈپٹی کمشنر کا رشتہ بنی نوع کے ساتھ بے حد محدود ہو جاتا ہے۔ اس کے گرد صرف چند مخصوص عناصر رہ جاتے ہیں، جو اسے مکری کے جالے کی طرح اپنے تانے بننے میں جگڑے رکھتے ہیں۔

ان عناصر میں پہلا عضر سرکاری ملازموں اور وکیل صاحبان کا ہے۔ ملازموں میں مجسٹریٹ بھی شامل ہیں۔ تحصیلدار، نائب تحصیلدار، تھانیدار، قانونگو اور پپواری بھی۔ اور دفتر کا عملہ بھی جن میں سپرنئنڈنٹ، ناظر، مسل خوان، پیشکار، واصل باقی نویں اور پی۔ اے پیش پیش ہوتے ہیں عدالت کی کرسی کو احتراماً ”عزت ماب“ کے لقب سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ طرز مخاطب بہت سے وکلاء کا تکمیلہ کلام بن جاتا ہے اور وہ کمرہ عدالت کے اندر اور باہر ڈپٹی کمشنر کو اسی طرح مخاطب کرتے کرتے اس بچارے کو عزت مابی کے ذہنی پکے میں بری طرح بتلا کر دیتے ہیں۔ نارمل زندگی میں ”آپ“ کا لفظ کافی عزت و احترام کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن ضلع کے افراد اور اہلکاروں کے نزدیک احترام کی یہ حد ڈپٹی کمشنر کی ذات کے لیے ناقابلی اور ناموزوں ہے۔ چنانچہ وہ ہر وقت اسے ”جناب“ یا ”حضور“ کے القابات سے مخاطب کرتے ہیں۔ پہلے پہلے تو ایسے القاب کی تکرار کافی ناماؤس ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ڈپٹی کمشنر کے کان ان الفاظ کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس کا دل و دماغ ان کے سحر آفرین سرور میں اس درجہ مخمور ہو جاتا ہے کہ اگر کبھی کوئی دل جلا اسے ”آپ“ کہہ کر مخاطب کرے تو یہ حرکت ڈپٹی کی شان میں گستاخی اور نظام حکومت کے خلاف بغاوت نظر آنے لگتی ہے!

دوسرے عنصر جو ڈپنی کمشنر کی ذات پر ایک زہرناک غبار کی طرح چھایا رہتا ہے۔ شری روئسا اور دیبات کے بڑے بڑے زمینداروں کا ہے۔ ان میں سے معدودے چند حضرات اپنے یا دوسروں کے جائز معاملات لے کر آتے ہیں۔ کچھ لوگ تاجائز مطالبات اور سفارشیں لاتے ہیں۔ لیکن اکثر بزرگ محض شوقيہ ملاقات فرمانے کی لٹ پوری کیا کرتے ہیں۔ اضلاعی اصطلاح میں شوقيہ ملاقاتیں سلام کہلاتی ہیں اور زمینداروں کی برادری میں اس سلام کو بڑی سماجی اور سیاسی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

اتوار کا روز ہے۔ ہفتہ بھر کی دفتری بک بک جھک جھک کے بعد جی چاہتا ہے کہ آج کچھ گھنٹے اپنی مرضی کے مطابق گزارے جائیں۔ لیکن یہ امید محض خواب و خیال ہے۔ کیونکہ صبح ہی سے کوئی کے صحن میں بھانت بھانت کے معزز ملاقاتی جمع ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ معزز اس لیے ہیں کہ عام ملاقات کے روز دوسرے لوگوں کے ساتھ تشریف لانا ان کے نزدیک کرشان ہے۔ ان میں ایک بہت بڑے زمیندار ہیں۔ ان کے پاس پندرہ بیس ہزار ایکڑ سے نیاہ نہیں ہے اور ضلع کے صدر مقام میں ان کے کئی شاندار بنگلے ہیں۔ مینے میں ایک یا دو بارہ پچاس ساتھ میل کا سفر طے کر کے ڈپنی کمشنر سے ملاقات کرنے ضرور آتے ہیں۔ جب وہ شر آتے ہیں تو ان کے جلو میں مزارعون اور ملازموں کی ایک فوج کی فوج ہوتی ہے۔ کتنے پالنا اور شکار کھیننا ان کا محبوب مشغله ہے۔ ناج گانے کا شوق بھی ہے اور عورت ذات کے ساتھ ان کی دلچسپی الف لیلی کی داستانوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ ان کی کوئی کے صحن میں بندوقوں، گھوڑوں اور کتیں کے لاو لشکر دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کا کوئی شنزادہ ٹل سجانی کے خلاف بغاوت کر کے دارالسلطنت پر چڑھائی کرنے جا رہا ہے۔

اپنے علاقے میں یہ بزرگ زمینداری کا حق ہی ادا نہیں کرتے بلکہ مقامی نظم و نرق کی باگ دوڑ بھی بڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ کسی مزارعہ کا نیل چوری ہو جائے تو تحانے میں رپورٹ ان کی منظوری سے لکھائی جاتی ہے۔ کسی کو بندوق کا لائسنس درکار ہو تو اس کی درخواست زمیندار صاحب کی وساطت سے آگے بڑھتی ہے۔ مقدموں

کی پیر دیاں بھی زمیندار کی خوشنودی کے ساتھ پروان چڑھتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ مقامی افراد اور عوام کے درمیان اس قسم کے زمیندار دیوار چین کی طرح حائل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بڑی بڑی زمینداریاں ایک مضبوط چھلتی کا کام دیتی ہیں۔ جو لوگ یا جو معاملات اس چھلتی سے بخوبی گزر جائیں وہ خداوندان حکومت کی توجہ کے مستحق بن جاتے ہیں۔ باقی ساری مخلوق زمینداری کی پر چیچ غلام گردشوں میں پس پردہ وہ جاتی ہے۔ اس باریک چھلتی سے گزرنے کے لیے انسان کو خوب اچھی طرح پسنا پڑتا ہے۔ اثانت، خودداری، خوداعتمادی اور آزادی کے روٹے اس چھلتی کے مہین سوراخوں سے گزرنے کی الہیت نہیں رکھتے۔

چھاج اور چھلتی کے اس نظام میں کئی فوائد ہیں۔ ایک طرف تو ضلع کی انتظامیہ اعلیٰ نسل کے برہمن کی طرح عوام الناس کے شودروں سے بڑی حد تک دور رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ بڑے زمینداروں کی اپنے مزارعوں پر گرفت مضبوط رہتی ہے تاکہ یہ برتری وہ حسب ضرورت حکومت اور اپنے ذاتی مفاد میں کام لا سکیں۔ میں نے اس روایتی نظام میں کسی قدر دخل دے کر عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو زمیندارہ برادری میں بڑی تشویش پھیل گئی۔ کچھ لوگ یہ کہہ کر ہنہے کہ یہ نوجوان اور ناتجربہ کار آدمی ہے۔ چار دن میں منہ کی کھا کر ہمارے سامنے ہی گھٹنے لیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ دوسروں نے غصے سے کہا کہ ہم لوگ بھی مٹی کے مادھو نہیں ہیں۔ ہم اس بچگانہ نظام کو ایک پھونک سے اڑا کر مکٹی کے جالے کی طرح تتر پر کر دیں گے۔

لیکن میں بھی ثابت قدی سے اپنے طریق کار پر ڈٹا رہا۔ دن بہ دن ملاقاتیوں کا حلقة وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ کسی منجلے نے کچھری کے احاطے میں ”ملاقاتی ہوٹل“ کے نام سے ایک ہوٹل بھی کھول لیا، دور دراز سے آنے والے لوگ سر شام ہی یہاں پہنچ جاتے تھے اور ”ملاقاتی ہوٹل“ میں بان کی چاپائی پر رات گزارتے تھے تاکہ صبح صبح ملاقاتیوں کی فرست میں دوسروں سے پہلے اپنا نام درج کروا سکیں۔

ملاقات کے روز میں بھی ایک رجسٹر کھول کر سامنے رکھ لیتا تھا۔ ہر سائل کی شکایت اس میں درج کر لیتا تھا۔ اگر معاملہ مقامی نوعیت کا ہوتا تو متعلقہ افسر کو اپنے پاس بلا کر اسی وقت وہیں فیصلہ کر دیتا تھا۔ اگر ملاقات میں کسی پُواری، نائب تحصیلدار، تحصیلدار یا تھانے دار سے کوئی رپورٹ طلب کرنا ضروری ہوتا، تو عرضی پر یہ حکم لکھ کر سائل کے حوالے کر دیتا کہ یہ رپورٹ ساتھ لے کر فلاں تاریخ کو دوبارہ حاضر ہو۔ یہ حکم اور اگلی پیشی کی تاریخ میں اپنے رجسٹر میں بھی درج کر لیتا تھا۔

پہلے تو کسی کسی پُواری یا تھانیدار وغیرہ نے ایسی درخواستوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا، اور سائکلوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا۔ جب مقررہ تاریخ پر کوئی سائل رپورٹ حاصل کئے بغیر خالی ہاتھ واپس آتا، تو میں اسے اپنی کار میں بٹھا کر دور دراز علاقوں میں متعلقہ تھانوں یا پُواریوں کے ڈیرے پر جا پہنچتا اور سائل کے کلفذات برآمد کر کے اس کے مسائل پر وہیں کھڑے کھڑے مناسب احکام جاری کر دیتا۔ میرے اس طرز عمل کا چرچا پھیلا تو رفتہ رفتہ محکمہ مال اور پولیس کا عملہ بھی اپنی اپنی جگہ محتاط ہو گیا اور میرے ملاقاتیوں کے کام بڑی حد تک نچلی سطح پر حل ہونا شروع ہو گئے۔

میرا ایک ملاقاتی سفید ریش، بزرگ صفت اور نیکدل انسان تھا۔ اس کی باری آئی تو اس نے اپنا عصا کئی بار زور سے میری میز پر مارا اور گرجدار آواز میں کڑک کر بولا:

”انصاف کی رسی ہاتھ سے مت چھوڑو۔ یہ بات ہرگز نہ بھلو کہ قیامت بہت قریب ہے اور ہر شخص خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے اعمال کا جواب دہ ہو گا۔“

اس قسم کے خالص تبلیغی ملاقاتی شاذو نادر ہی نظر آتے تھے۔ ورنہ اکثریت تو ایسے لوگوں کی ہوتی تھی جو کسی محکمانہ کارروائی یا کسی مفسد کی چیزہ دستی یا محض قدرت کی ستم طرفی کا شکار ہوتے تھے۔ جوں جوں ایسے ملاقاتیوں کا دائہ وسیع ہوتا گیا، اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذاتی مسائل میں بھی عجیب و غریب تنوع پیدا ہوتا گیا۔

ایک طوائف کو شکایت تھی کہ اس کی ہمسائی رات کے وقت نیم عریاں لباس پہنچتی ہے اور برسراں اپنی بے حجابی اور بداخلانی کا مظاہرہ کر کے شریفانہ مارکیٹ پر برا اثر ڈالتی ہے۔

ایک ساس اپنی لڑاکا بھو کے خلاف شکایت نامہ لائی۔

ایک مل سکول کی استانی کو خطرہ تھا کہ اگر اس نے ایک امیر تاجر کی کند ذہن لڑکی کو اچھے نمبروں سے پاس نہ کیا تو اسے غنڈوں کے ذریعہ اغوا کر لیا جائے گا۔

ایک روز ایک بے حد مغلوب الحال بڑھیا آئی۔ رو رو کر بولی کہ میری چند ییگھہ نہیں ہے جسے پُواری نے اپنے کاغذات میں اس کے نام منتقل کرنا ہے لیکن وہ رشوت لیے بغیر یہ کام کرنے سے انکاری ہے۔ رشوت دینے کی توفیق نہیں۔ تین چار برس سے وہ طرح طرح کے دفتروں میں دھکے کھا رہی ہے لیکن کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔

اس کی درود ناک پتا سن کر میں نے اسے اپنی کار میں بٹھایا اور جھنگ شر سے سانحہ ستر میل دور اس کے گاؤں کے پُواری کو جا پکڑا۔ ڈپٹی کمشٹر کو اپنے گاؤں میں یوں اچانک دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ پُواری نے سب کے سامنے قسم کھائی کہ یہ بڑھیا بڑی شر انگیز عورت ہے اور نہیں کے انتقال کے بارے میں جھوٹی شکایتیں کرنے کی عادی ہے۔ اپنی قسم کی عملی طور پر تصدیق کرنے کے لیے پُواری اندر سے ایک جزو ان اٹھا کر لایا اور اسے اپنے سر پر رکھ کر کہنے لگا، حضور دیکھنے میں اس مقدس کتاب کو سر پر رکھ کر قسم کھاتا ہوں۔“

گاؤں کے ایک نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ ”جتاب ذرا یہ بستہ کھول کر بھی دیکھ لیں۔“

ہم نے بستہ کھولا، تو اس میں قرآن شریف کی جلد نہیں بلکہ پُوار خانے کے رجسٹر بندھے ہوئے تھے۔ میرے حکم پر پُواری بھاگ کر ایک اور رجسٹر لایا اور سر جھکا کر بڑھیا کی انتقال اراضی کا کام مکمل کر دیا۔

میں نے بڑھیا سے کہا، ”بی بی، لو تمہارا کام ہو گیا۔ اب خوش رہو۔“

بڑھیا کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ اپنی تشفی کے لیے اس نے نمبردار سے پوچھا، ”کیا سچ مجھ میرا کام ہو گیا ہے؟“

نمبردار نے اس بات کی تصدیق کی تو بڑھیا کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو بننے لگے۔ اس کے دوپٹے کے ایک کونے میں کچھ ریزگاری بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے کھول کر سولہ آنے گن کر اپنی مٹھی میں لیے اور اپنی دانت میں دوسروں کی نظر پچا کر چکپے سے میری جیب میں ڈال دیئے۔ اس ادائے مخصوصانہ اور محباویہ پر مجھے بھی بے اختیار روتا آگیا۔ یہ دیکھ کر گاؤں کے کئی دوسرے بڑے بوڑھے بھی آبدیدہ ہو گئے۔

یہ سولہ آنے واحد ”رشوت“ ہے جو میں نے اپنی ساری ملازمت کے دوران قبول کی۔ اگر مجھے سونے کا ایک پورا پاڑ بھی مل جاتا، تو میری نظر میں ان سولہ آنوں کے سامنے اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی۔ میں نے ان آنوں کو ابھی تک خرچ نہیں کیا۔ کیونکہ میرا گمان ہے کہ یہ ایک ایسا متبرک تحفہ ہے جس نے مجھے ہمیشہ کے لیے مال مال کر دیا ہے۔

میرا ایک عجیب ملاقاتی نو یا دس سالہ پچھے تھا۔ جو شر کے ایک دور افتادہ محلے سے مجھے ملنے آیا تھا۔ دفتر کے اجنبی ماحول میں وہ کچھ سما سما تھا۔ لیکن اس نے بڑی صفائی سے کہا۔ ”میری ماں مر رہی ہے۔“

”تمہاری ماں کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میری ماں اپنے گھر ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا تمہاری ماں بیمار ہے؟“ میں نے پوچھا۔

پچھے نے اس سوال کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ دیر تک اپنے سامنے کسی خلا میں ٹکٹکی باندھ کر گھورتا رہا اور پھر غصے سے مٹھیاں بھیجن کر بولا۔ ”اگر میری ماں مر گئی تو میں سارے شر کو آگ لگا دوں گا۔“

میں نے پچھے کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور جب کام ختم ہوا تو میں نے اسے کہا کہ

وہ مجھے اپنے گھر لے چلے۔

ایک نگ و تاریک گلی میں ایک نگ و تاریک کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی میں بان کی ایک چاپائی تھی۔ چاپائی پر کچھ روی کے کافند اور چند پچھے ہوئے کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ ان کی سیچ پر ایک ادھیر عمر کی عورت بے ہوش پڑی تھی۔ اسے ڈبل نمونیہ تھا۔ اس کا کرہ کنی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ کوٹھڑی میں دو تین خالی برتن تھے اور در و دیوار پر موت کا سایہ لرز رہا تھا۔

”تمہارے گھر میں اور کونی ہے؟“ میں نے پچ سے پوچھا۔

”میری دادی ہے۔ باہر گور چن رہی ہے۔“

میں پچ کے ساتھ باہر آیا۔ گلی میں ایک گونگی اور بھری عورت تانہ گور اٹھا اٹھا کر نوکری میں جمع کر رہی تھی۔ اس کی کمر خمیدہ تھی۔ چہرے پر افراد انگوروں کی طرح جھریوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ گور کی نوکری میں ڈالنے سے پہلے وہ اسے اپلوں کی صورت میں ڈھال لیتی تھی تاکہ سکھا کر وہ اسے گھر میں ایندھن کے طور پر استعمال کر سکے۔

ایک روز ایک پرانگری سکول کا استاد رحمت اللہ آیا۔ وہ چند ماہ کے بعد ملازمت سے ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس کی تین جوان بیٹیاں تھیں۔ رہنے کے لیے اپنا گھر بھی نہیں تھا۔ پیش نہایت معمول ہو گی۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ ریٹائر ہونے کے بعد وہ کہاں رہے گا؟ لڑکیوں کی شادیاں کس طرح ہو سکیں گی؟ کھانے پینے کا خرچ کیسے چلے گا؟ اس نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ پریشانی کے عالم میں وہ کئی ماہ سے تجد کے بعد رو رو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فریادیں کرتا رہا ہے۔ چند روز قبل اسے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیارت ہوئی۔ جس میں حضور نے فرمایا کہ تم جھنگ جا کر ڈپی کمشنر کو اپنی مشکل بتاؤ۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ یہ شخص ایک جھوٹا خواب نا کر مجھے جذباتی طور پر بلیک میں

کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے چہرے پر شک اور تندبڑ کے آثار دیکھ کر رحمت الہی آبدیدہ ہو گیا اور بولا۔ ”جناب میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اگر جھوٹ بولتا تو اللہ کے نام پر بولتا۔ حضور رسول پاک کے نام پر کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں؟“

اس کی اس منطق پر میں نے حیرانی کا اظہار کیا، تو اس نے فوراً کہا، ”آپ نے سنا نہیں کہ باخدا دیوانہ وبا مصطفیٰ ہشیار باش۔“

یہ سن کر میرا شک پوری طرح رفع تو نہ ہوا لیکن سوچا کہ اگر یہ شخص غلط بیانی سے بھی کام لے رہا ہے تو ایسی عظیم ہستی کے اسم مبارک کا سارا لے رہا ہے جس کی لاج رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ چنانچہ میں نے رحمت الہی کو تین ہفتے کے بعد دوبارہ میرے پاس آنے کے لیے کہا۔ اس دوران میں نے خفیہ طور پر اس کے ذاتی حالات کا کھوج لگایا اور یہ تصدیق ہو گئی کہ وہ اپنے علاقے میں نہایت سچا، پاکیزہ اور پابند صوم و صلوٰہ آدی مشہور ہے اور اس کے گھریلوٰ حالات بھی وہی تھے جو اس نے بیان کئے تھے۔

اس نامے میں کچھ عرصہ کے لیے صوبائی حکومت نے ڈپٹی کمشنر کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ سرکاری بخبر نہیں کے آٹھ مربعے تک ایسے خواہشمندوں کو طویل میعاد پر دیئے جا سکتے ہیں جو انہیں آباد کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ میں نے اپنے مال افسر کو بلا کر کہا کہ وہ کسی مناسب جگہ کراون لینڈ کے ایسے آٹھ مربعے تلاش کرے جنہی جلد از جلد زیر کاشت لانے میں کوئی خاص دشواری پیش نہ آئے۔ غلام عباس مال افسر نے غالباً یہ سمجھا کہ شاید اراضی میں اپنے کسی عزیز کو دینا چاہتا ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پکی سڑک کے قریب نیم آباد سی نہیں ڈھونڈ نکلی اور رحمت الہی کے نام الامنٹ کی ضروری کارروائی کر کے سارے کاغذات میرے حوالے کر دیئے۔

دوسری پیشی پر جب رحمت الہی حاضر ہوا تو میں نے یہ نذرانہ اس کی خدمت میں پیش کر کے اسے مال افسر کے حوالے کر دیا کہ قبضہ وغیرہ دلوانے اور باقی ضریبات پوری کرنے میں وہ اس کی پوری پوری مدد کرے۔

تقریباً نو برس میں صدر ایوب کے ساتھ کراچی میں کام کر رہا تھا کہ ایوان صدر میں میرے نام ایک رجڑہ خط موصول ہوا۔ یہ ماشر رحمت اللہ کی جانب سے تھا کہ اس نہیں پر محنت کر کے اس نے تینوں بیٹیوں کی شادی کر دی ہے اور وہ اپنے اپنے گھر میں خوش و خرم آباد ہیں۔ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ حج کا فریضہ بھی ادا کر لیا ہے اور اپنے گزارے اور رہائش کے لیے تھوڑی سی ذاتی نہیں خریدنے کے علاوہ ایک کچا سا کوٹھا بھی تغیر کر لیا ہے۔ ایسی خوشحالی میں اب اسے آٹھ مرتعوں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ اس الامتحنث کے مکمل کانخذات اس خط کے ساتھ واپس ارسال ہیں تاکہ کسی اور حاجت مند کی ضرورت پوری کی جاسکے۔

میں یہ خط پڑھ کر کچھ دیر تک سکتے میں آگیا۔ میں اسی طرح گم سم بیٹھا تھا کہ صدر ایوب کوئی بات کرنے کے لیے میرے کمرے میں آگئے۔

”کس سوچ میں گم ہو؟“ انہوں نے میری حالت بجانپ کر پوچھا۔

میں نے انہیں رحمت اللہ کا سارا واقعہ سنایا تو وہ بھی نہایت حیران ہوئے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر وہ اچانک بولے۔ ”تم نے بلا نیک کام سر انعام دیا ہے۔ میں نواب صاحب کو لاہور ٹیلیفون کر دیتا ہوں کہ وہ یہ اراضی اب تمہارے نام کر دیں۔“

میں نے نہایت لجاجت سے گزارش کی کہ میں اس انعام کا مستحق نہیں ہوں۔

یہ سن کر صدر ایوب حیرانی سے بولے، ”تمہیں زرعی اراضی حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں؟“

”بھی نہیں سر۔“ میں نے الجا کی۔ ”آخر میں فقط دو گز نہیں ہی کام آتی ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح مل ہی جاتی ہے۔“

میرا اندازہ ہے کہ میری یہ بات سن کر صدر کچھ چڑھ سے گئے۔ نہیں حاصل کرنے کے وہ خود بڑے رسیا تھے۔

ایک روز میری ایک ملاقاتن بیشراں طوائف تھی۔ وہ بڑے نہیں سے دفتر میں داخل ہو

کر کری پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے رنگین لباس سے حنا کے عطر کی باسی باسی خوشبو آ رہی ہے اور اس کی آنکھیں رت جگئے اور رونے کی آمیزش سے سوچی ہوئی ہیں۔

URDU4U.COM  
میں اس کی تراش خراش کا سرسری سا جانہ لے گز اپنی آنکھیں پچی کر لیتا ہوں اور میز پر پڑے ہوئے مستطیل شیشے کی جانب ٹکنکلی لگا کر بیٹھ جاتا ہوں۔

بیشراں طوائف کھنکار کر گلا صاف کرتی ہے۔ ”سرکار میری بات سنو۔“ اس کی آواز میں ایک بلغی سا بوجھ اور کھردرا پن ہے۔

”کیا بات ہے؟“

”میری بات سنو سرکار۔“ وہ دویابہ تھکن آلود آواز سے کہتی ہے۔

”سن تو رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟“

لیکن بیشراں مطمئن نہیں ہوتی۔ غالباً اس کا دعا یہ ہے کہ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات کروں۔ لیکن میں بدستور میز پر پڑے ہوئے مستطیل شیشے کی طرف ٹکنکلی باندھے بیٹھا رہتا ہوں۔ اس پر بیشراں طوائف ایک ہنگلی لے کر رونے لگتی ہے۔ میں گھبرا کر اس کی طرف نظر اٹھاتا ہوں اور کسی انجانے خوف سے لرز اٹھتا ہوں۔ اس کی بڑی سوجھی ہوئی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہیں۔ مجھے وہ کہ ڈر لگتا ہے کہ شاید اس کی آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کی جگہ خون کے قطرے یا کچے گوشت کے لوتحڑے گرنے لگیں گے۔

مجھے اپنی جانب متوجہ کر کے بیشراں طوائف دوپٹہ کے آنچل سے آنسو خٹک کرتی ہے اور اس کے ہونٹوں پر اس کی پیٹھہ ورانہ مسکراہٹ ازسر نو نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ مسکراہٹ ایک میکائی عمل ہے۔ اس میں ہونٹوں کے پھیلاؤ کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں ”سرکار، میرے گھر پر کل رات میونسلی والوں نے چھاپہ مارا ہے۔“ وہ اپنی شکایت شروع کرتی ہے۔

”کوئی وجہ ہو گی؟“

کوئی وجہ ہوتی تو میں کبھی شکایت نہ کرتی۔” وہ خود اعتمادی سے کہتی ہے۔ ”مجھے ناچ دل کیا جاتا ہے۔ میں باہر برس سے اسی جگہ بیٹھی ہوں۔ اپنی محنت سے روٹی کماتی ہوں۔ منڈی کا داروغہ، کمپنی کا انپکٹر اور شر والے لوکل سب مجھ سے خوش ہیں۔ لیکن پانی پت کے پناہ گیر جواب میرے محلے میں آ کر آباد ہوئے ہیں، ہر روز میرے خلاف عرضیاں دیتے رہتے ہیں کہ مجھے اس مکان سے نکال دیا جائے تاکہ ان کی بھو بیٹھیوں پر خراب اثر نہ پڑے اور.....“

”مکان کس کا ہے؟“ میں بات کاٹ کر پوچھتا ہوں۔

”میرا ہے سرکار۔ لالہ شنکرDas نے میری نگہ اتروائی پر میرے نام کروایا تھا۔“ بشیراں نے اپنی پتاری سے لالہ شنکرDas کے کاغذات نکال کر میز پر رکھ دیئے۔

”بھالیات کے محلہ سے بھی اجازت لی ہے یا نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ کنفرم ہے۔“ اس محلہ بھالیات کے کاغذات بھی میز پر دے مارے۔

”سرکار میں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر حج کے لیے رقم جمع کی ہے۔ کراچی سے حج کا قرعہ بھی میرے نام آگیا ہے۔ اب اگر میں حج پر چلی گئی تو پانی پت والے کمپنی سے مل کر میرے مکان پر قبضہ کر لیں گے۔ حاضری کا بلاوا تو آگیا ہے۔ اگر نہ گئی تو اس کا عذاب کون بھگتے گا؟ آخر میں نے بھی تو قوم کی بہت خدمت کی ہے۔“

”کیا خدمت کی ہے؟“ میں نے کس قدر طنزیہ لجھے میں پوچھا۔

”اپنے تھیلے سے آزاد کشمیر فنڈ، قائد اعظم ریلیف فنڈ، قائد اعظم میوریل فنڈ، یونہ گھر، اور تیسم خانوں میں دیئے گئے چندوں کی رسیدیں نکال کر میز پر ڈھیر لگا دیتی ہے۔

یہ دیکھ کر میں ایک عجیب مخہ سے میں گرفتار ہو جاتا ہوں۔ یہ پیشہ ور بدنام عورت ماہنگی بے آب کی طرح حج پر جانے کے لیے ترپ رہی ہے۔ اللہ اور رسول کا کوئی قانون اسے اس عظیم سعادت کی نعمت سے محروم نہیں کرتا۔ لیکن جھنگ مگھیا نہ میونسلی

کا قانون اس کا مکان چھین سکتا ہے۔ اگر اس کا مکان چھن گیا تو وہ حج پر جانے سے نہ جائے گی..... اگر دس نمازی اور متوفی حج پر نہ جا سکیں تو شاید جنت کی آبادی میں

کوئی کمی واقع نہ ہو گی۔ لیکن اگر یہ طوائف حج پر جا کر توبہ کرنے سے نہ گئی تو دونخ کے شعلے کس کے لیے سرد پڑیں گے؟

URDU4U.COM  
میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتا ہوں اور آغا شجاعت علی صاحب ایں۔ پی کو ٹیلیفون پر یہ صورت حال سناتا ہوں۔ آغا صاحب بڑے باخلاق، شاستہ اور نیک خو پولیس افسر ہیں۔ وہ اپنی نرم آواز میں بڑے جذبے سے کہتے ہیں، ”میں اس قبضے سے واقف ہوں۔ آپ اسے ضرور حج پر جانے دیں۔ اس کا مکان کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس کی غیر حاضری میں پولیس اس کے مکان کی حفاظت کرے گی؟“

واپس آ کر میں بشیراں سے کہتا ہوں۔ ”تم ضرور حج پر روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے مکان کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تمہاری واپسی تک پولیس اس کی حفاظت کرے گی۔“ ”خدا سرکار کو سلامت رکھے۔“ وہ خوشی سے اچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے اور جلدی جلدی آزاد کشیر فنڈ، قائد اعظم ریلیف فنڈ، قائد اعظم میموریل فنڈ، یونہ گھر اور یتیم خانوں کے چندوں کی رسیدیں سمیٹ کر اپنی جھوپی میں ڈال لیتی ہے۔

اندر ہی اندر میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس سے کہوں کہ جب تم حرمین شریفین کی زیارت کرو تو میرے لیے بھی دعا کے دو لفظ بول دینا۔ لیکن ڈپٹی کمشنز کا شدید احساس کمتری مجھے یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ بشیراں محض ایک طوائف ہے۔ یوں بھی محمد صدیق اربی دیر سے دفتر کے دروازے پر منڈلا رہا ہے اور میرا اس قدر وقت ”ضائع“ کرنے پر بشیراں کو بڑی سنگدلی سے گھور رہا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب وہ میرے دفتر سے باہر نکلے تو محمد صدیق اپنی خالص گڑگانوی زبان میں اسے دو چار گالیں بھی سنا

دے۔

ایک روز ایک ملاقاتی آیا، جس کا نام عبداللہ تھا۔ آتے ہی اس نے زور سے اسلام علیکم کہا، اور بولا۔ کسی نے بتایا کہ آپ بھی جوں کے رہنے والے ہیں۔ میرا بھی وہیں بسیرا تھا۔ بس یونہی جی چاہا کہ اپنے شر والے کے درشن کر آؤں، اور کوئی کام نہیں۔

میں نے اسے تپاک سے اپنے پاس بٹھا لیا اور کرید کرید کر اس کا حال احوال پوچھتا رہا  
جسے سن کر میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

جموں میں عبداللہ کی کوئی دکان تو نہ تھی لیکن وہ اپنے گھر پر ہی رنگریزی کا کام کر کے گزر اوقات کیا کرتا تھا۔ یہوی تین بیٹیاں چھوڑ کر فوت ہو چکی تھی۔ ۹ برس کی زہرہ، ۱۲ برس کی عطیہ اور سولہ برس کی رشیدہ۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں جب مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنی ذاتی گرانی میں جموں کے مسلمانوں کا قلع قع کرنے کا پروگرام بنایا تو مسلمان خاندانوں کو پولیس لائن میں جمع کر کے اس بنا نے بسوں اور ٹرکوں میں سوار کرا دیا جاتا تھا کہ انہیں پاکستان میں سیالکوٹ کے باڑوڑ تک پہنچا دیا جائے گا۔ راستے میں راشٹریہ سیوک سنگ کے ڈوگرہ اور سکھ درندے بسوں کو روک لیتے تھے۔ جوان لڑکیوں کو انگوا کر لیا جاتا تھا۔ جوان مردوں کو چن چن کر تھق کر دیا جاتا تھا اور پچھے کھجھ بچوں اور بوڑھوں کو پاکستان روانہ کر دیا جاتا تھا۔ جب یہ خبریں جموں شر میں پھیلنا شروع ہوئیں تو عبداللہ پریشان ہو کر پاگل سا ہو گیا۔ اس کی زہرہ، عطیہ اور رشیدہ پر بھی جوانی کے تانہ تانہ پھول کھل رہے تھے۔ عبداللہ کو یقین تھا کہ اگر وہ ان کو اپنے ساتھ لے کر کسی قافلے میں روانہ ہوا تو راستے میں اس کی تینوں بیٹیاں درندہ صفت ڈوگرہ جنتہوں کے بہتے چڑھ جائیں گے۔ اپنے جگر گوشوں کو اس افاد سے محفوظ رکھنے کے لیے عبداللہ نے اپنے دل میں ایک پختہ منصوبہ تیار کر لیا۔ نہادھو کر مسجد میں کچھ نفل پڑھے۔ قصاب کی دکان سے ایک تیز دھار چھری مانگ لایا اور گھر آ کر تینوں بیٹیوں کو عصمت کی حفاظت اور سنت ابراہیمی کے فضائل پر بڑا موقر وعظ دیا۔ زہرہ اور عطیہ کم عمر تھیں اور گڑیا گڑیا کھلینے کی حد سے آگے نہ بڑھی تھیں۔ وہ دونوں اپنے باپ کی باتوں میں آگئیں۔ دونوں کی طرح سعی دھج کر انہوں نے دو دو نفل پڑھے اور پھر نہی خوشی کے دروازے کی دلیز پر سر نکلا کر لیٹ گئیں۔ عبداللہ نے آنکھیں بند کئے بغیر اپنی چھری چلائی اور باری باری دونوں کا سر تن سے جدا کر دیا۔ عجب اتفاق تھا کہ اس روز آسمان کے فرشتے بھی اس قربانی کے لیے دو دنبے لانے سے چوک گئے۔ چنانچہ

دہلیز پر زہرہ اور عطیہ کی گردنیں کئی پڑی تھیں۔ کچے فرش پر گرم گرم خون کی دھاریں بسہ بسہ کر تیل بولے کاڑھ رہی تھیں۔ کمرے کی فضا میں بھی ایک سوندھی سوندھی سی خوببو روچی ہوئی تھی اور اب عبداللہ اپنے ہاتھ میں خون آشام چھری تھا میں رشیدہ کو بلا رہا تھا۔ لیکن رشیدہ اس کے قدموں میں گری کپکپا رہی تھی، تھر تھرا رہی تھی، گڑ گڑا رہی تھی..... اگر وہ پڑھی لکھی ہوتی تو بڑی آسانی سے اپنے باپ کو للاکار سکتی تھی کہ میں کوئی پیغمبر زادی نہیں ہوں۔ نہ ہی تم کوئی پیغمبر ہو۔ کیونکہ ہمارا دین تو صدیوں پسلے کامل ہو چکا ہے۔ پھر تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ میری گردن کاٹ کر ادھوری سنتیں پوری کرو..... لیکن رشیدہ انجان تھی، کم عقل تھی اور فصاحت و بلاغت کی ایسی تشبیہات اور تلمیحات استعمال کرنے سے قاصر تھی۔ وہ محض عبداللہ کے قدموں پر سر رکھے بلکہ کر رو رہی تھی، ”ابا..... آپا..... آپا....“

رشیدہ کی گڑ گڑاہٹ پر عبداللہ کے پاؤں بھی ڈگمگا گئے۔ اس نے چھری ہاتھ سے پھینک دی۔ بھروسیوں کی طرح اس نے رشیدہ کو ایک بد صورت سی بڑھیا کے روپ میں ڈھالا اور کلمہ کا ورد کرتا ہوا اسے ساتھ لے کر ٹرک پر بینھ گیا۔ جب ٹرک والے نے قافلے کو سوچیت گڑھ لا کر اتارا اور وہ لوہے کا چھانک عبور کر کے پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گئے تو یا کیک عبداللہ کو زہرہ اور عطیہ کی یاد آئی جن کے سر جموں میں دروازے کی دہلیز پر کئے پڑے تھے اور جو بچھی بچھی نجمد آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتی دیکھتی دم توڑ گئی تھیں..... وہ کمر تھام کر سڑک کے کنارے بینھ گیا اور رشیدہ کو گلے سے لگائے دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔

سیا لکوٹ کے مہاجر کمپ میں آ کر رفتہ رفتہ رشیدہ کی زلفیں پھر لرانے لگیں۔ اس کی سرگمیں آنکھوں میں پھر وہی پرانی چک جگمانے لگی۔ لیکن ہولے ہولے عبداللہ نے محسوس کیا کہ اس چمک میں جو شبتم کی سی تازگی اور ستاروں کی سی پا کیزگی اور ستاروں کی سی پا کیزگی جھلا کرتی تھی، وہ ماند پڑ رہی ہے اور ایک دن اس نے خود اپنی آنکھوں

سے دیکھ لیا کہ ناموس ملت کے جن انمول آنکھیوں کو وہ ڈوگروں اور سکھوں کے زخم سے بچا کر لایا تھا وہ خدا کی مملکت میں سر بازار بک رہے ہیں۔ آدمی آدمی رات گئے جب رشیدہ کمپ میں واپس آتی تو اس کا دامن پھلوں، مٹھائیوں، رنگ برنگ کپڑوں، پاؤڑر اور کسیم وغیرہ کے خوبصورت پیکٹوں سے بھرا ہوتا تھا۔ عبداللہ غصب ناک ہو کر اسے مارتا پیٹتا اور رشیدہ کو پچھاڑ کر اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتا، جب رشیدہ کا سانس اکھرنے لگتا اور اس کی آنکھیں ابھر کر باہر نکلنے لگتیں، تو اچانک اسے جموں کی وہ خون آلوو دلیز یاد آ جاتی جس پر وہ زہرہ اور عطیہ کی بے نور آنکھوں کو چھت کی جانب گھورتے چھوڑ آیا تھا۔ عبداللہ کے ہاتھ رعشہ کھا کر لرزائختے۔ اس کا سر لٹو کی طرح اس کی گردن پر گھونٹنے لگتا اور وہ رشیدہ کو چھوڑ کر کمپ کے دوسرے کنارے پر بیٹھا ساری رات روتا رہتا۔

ایک روز رشیدہ نے ترس کھا کر خود ہی اپنے باپ کو روز روز کی افیت سے نجات دے دی۔ اس نے کمپ چھوڑ دیا اور راتوں رات کسی کے ساتھ فرار ہو کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔

عبداللہ بھی کمپ چھوڑ کر پہلے گجرات، پھر لانڈپور اور اس کے بعد جھنگ آگیا۔ جھنگ میں اس نے پہلے ریڑھی کا انتظام کیا اور دوسروں کی دیکھا دیکھی ریل بازار میں سبزی بیچنے کام کا کام شروع کر دیا۔ لیکن تجارتی بورڈ نے پے در پے ریزویشن پاس کر کے ان کا ناک میں دم کر دیا کیونکہ ریل بازار میں ریڑھیوں کی بھرمار سے بڑی دکانوں کے بڑنس میں خلل پڑتا تھا۔ سخت جان ریڑھی والے تو تجارتی بورڈ کی قراردادوں، سکپیٹی والوں کی دھونس اور پولیس کے دباو کے باوجود وہیں جسے رہے لیکن سما ہوا عبداللہ شہید روڈ پر اٹھ آیا، جہاں قوم کا غم غلط کرنے کے لیے مسجد، سینما اور ریڈیو اور گراموفون دن رات مسلسل مصروف عمل رہتے تھے۔

ایک روز میں عبداللہ سے ملنے شہید روڈ گیا۔ اس کی ریڑھی پر باسی سبزیوں کا ڈھیر لگا پڑا تھا۔ عبداللہ نے بتایا کہ دو روز سے کاروبار مندا ہے اور اس کی ریڑھی کی سبزیاں

پڑی پڑی گل سڑ رہی ہیں۔ میں نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر ریڈھی کی ساری سبزیاں تکوا کر کار میں رکھوا ہیں۔ پیسے ادا کرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہونے لگا تو سڑک کے دوسرے کنارے نہیں پر بیٹھے ہوئے ایک موچی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں اس کے پاس گیا تو وہ دوسروں کے نوٹے ہوئے جوتے گانٹھنے میں منہمک تھا۔ میری جانب نظر انھائے بغراہ بڑیا، ”خوب بچا بے سالے۔ ٹھہری تھی کہ یونہی گزر جاتے تو سالے کو کوڑھی کر کے اسی ریڈھی میں بٹھا دیا جائے۔“

اس کے بعد میں متعدد بار اس پر اسرار موچی سے باشیں کرنے کے اڈے پر گیا لیکن اس نے پھر کبھی کوئی لفٹ نہ دی۔

جھنگ کا ایک جانا پچانا ادیب اور صحافی بلاں زیری مجھے ملنے آیا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ لاہور میں سعادت حسن منشو اتنا شدید بیمار ہے کہ جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ منشو سے میری کافی پرانی صاحب سلامت تھی۔ چند روز بعد میں لاہور میں اس سے ملنے گیا۔ بیگم منشو نے بتایا کہ جگر میں خرابی ہے۔ دوائیں کام نہیں کرتیں کیونکہ وہ پینے پلانے سے پرہیز نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی کہا کہ اگر وہ کچھ عرصہ شراب کو منہ نہ لگائیں تو شاید ہمارا علاج بھی کارگر ثابت ہونے لگے۔ میں نے بیگم منشو سے اجازت لی اور بھلا پھسلا کر منشو کو اپنے ساتھ جھنگ لے آیا۔ دو تین دن وہ بڑا خوش رہا۔ میرے ساتھ شر سے نکل کر دیساتی ماہول میں گھومتا پھرتا۔ کہیں کہیں چلتے ہوئے رہت پر نما بھی لیتا۔ لیکن چوتھے روز اس کا موڈ بگڑ گیا۔ جنجلہ کر کنے لگا، ”یہ گھر ہے یا حوالات؟ نہ کوئی دوست یا، نہ کوئی میل ملاقاتی، نہ کوئی رونق، نہ کوئی محفل، توبہ توبہ۔ کیا بیووہ جگہ ہے۔“

میں نے وعدہ کیا کہ کل ہم ایسے علاقے کا دورہ کرنے جائیں گے، جسے دیکھ کر اس کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ لیکن وہ بدستور آزادگی سے خاموش بیٹھا رہا۔ شام کو جب میں دفتر سے واپس آیا۔ تو اس کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ صدیق ارولی نے بتایا کہ ”مممان

صاحب کو فوراً لاہور جانا پڑ گیا تھا۔ میری فرماںش پر کمپنی کی بس انہیں لینے کوئی پر ہی آگئی تھی۔ ڈرائیور نے فرنٹ سیٹ ان کے لیے خالی رکھی تھی۔ راستے میں ان کا خیال بھی ضرور رکھے گا۔ میں نے تاکید کر دی تھی۔”

جھنگ میں منشو کا دل کیسے لگتا؟ وہ تو بقول فیض اس عقیدے کا آدمی تھی

آئے کچھ ابر کچھ شراب  
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

جھنگ کا ایک پڑھا لکھا نوجوان ایثار راعی بھی کبھی مجھے ملنے کے لیے آ جایا کرتا تھا۔ وہ ان دنوں فاقہ مستی کا شکار تھا اور آئے دن روز گار کی تلاش میں شر شر گھوما کرتا تھا۔ اس کا ایک دوست لانڈپور کے محلہ مواصلات میں سینر کلرک تھا۔ اس محلہ میں ایک کلرک کی آسامی نکلی تو اس نے ایثار راعی کو بلا کر اپنے پاس رکھا اور اس سے کلرک کی خالی جگہ کے لیے درخواست دلوادی۔ اثریو ہوا تو ہوا، لیکن کلرکی نہ مل سکی۔

کچھ دنوں بعد اسی دفتر میں ایک چپڑاں کی جگہ خالی ہوئی۔ ایثار نے سوچا کہ اگر میں چپڑاں کے طور پر بھرتی ہو جاؤں تو شاید ترقی کرتے کرتے کسی وقت کلرک کا عہدہ جلیلہ بھی حاصل کر سکوں۔ چنانچہ اس نے چپڑاں کی آسامی کے لیے بھی عرضی داغ دی۔ محلہ کے سربراہ نے اسے سب سے آخر میں بلایا۔ اور اثریو کرنے کی بجائے اپنے سامنے کری پر بٹھا کر حوصلہ مندی پر تقریر فرمائی۔ تقریر ختم کر کے انہوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ ایک پڑھے لکھے نوجوان کو وہ اپنے دفتر میں چپڑاں نہیں لگا سکتے۔

یہ حالات مجھے ایثار راعی کے ایک خط سے معلوم ہوئے۔ میں نے فوراً تاروے کر اسے جنگ واپس بلا لیا۔ ملازمت تو میرے پاس بھی کوئی نہ تھی لیکن یکاںکھی مسلم لیگ کے سالار شیر زمان خان کا نام میرے پردہ خیال پر ابھرا۔ تقسیم ملک سے پہلے وہ آنکھوں

میں ٹھنڈک پہنچانے والا سرمه بیچا کرتا تھا اور پاکستان میں آ کر جھنگ شر کی مسلم لیگ کا سالار بن بیٹھا تھا۔ اسی دھونس میں دیگر کئی مراءات کے علاوہ اسے چینی کا ایک ڈپو بھی ملا ہوا تھا جس میں وہ جی بھر کر چینی کی بلیک مارکیٹ کرتا تھا۔ ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرول کے دفتر میں اس کے خلاف شکایات کی ایک بھاری بھرکم فائل بنی پڑی تھی، لیکن اس کے سیاسی بدبے کی وجہ سے کوئی اس کے خلاف کسی قسم کی کارروائی شروع کرنے سے بچکھاتا تھا۔ میں نے فوڈ کنٹرول سے یہ فائل طلب کر کے انکوارری کے لیے شی مجزیت کے حوالے کر دی۔ بلیک مارکیٹ اور دوسری بدعنویں کا ثبوت میا ہونے پر میں نے شیر زمان خان کا ڈپو منسوخ کر کے اسے ایثار رائی کے حوالے کر دیا۔ دوسری شام ایثار ڈپو میں گندم اور چینی کا حساب کتاب کر کے واپس لوٹ رہا تھا کہ پولیس کے دو سپاہی کپڑ کر اسے تھانے لے گئے۔ اسٹنٹ انسپکٹر آنکھیں سرخ کئے بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پہلے تو اس نے چھوٹتے ہی ایثار کو دو تین گلاس گالیاں دیں اور پھر ایک نوجوان کو سامنے کھڑا کر کے کہا کہ تم نے اس سے جو نقد رقم اور گھٹری چینی ہے وہ فوراً واپس کر دو۔

یہ ڈرامہ شری مسلم لیگ کے سالار شیر زمان خان کے ایما پر ہو رہا تھا، جو ساتھ والے کمرے میں چند سپاہیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ پولیس اشیشن سے ہی فون کر کے ایثار نے اپنی یہ نئی افتاد مجھے سنا دی۔ میں نے فوراً ایس۔ پی۔ صاحب کو ٹیلیفون پر اس وہاندی سے مطلع کیا۔ انہوں نے نہ معلوم کیا کارروائی کی کہ تھانیدار نے ایثار کو کرسی پر بٹھا کر معافی مانگی اور شیر خان کو اپنے سامنے بلا کر اسے مغلظات سے نوازنے میں مصروف ہو گیا۔

ڈپو کا سارا پا کر ایثار رائی نے ادب، ثقافت اور صحافت کی جانب رخ کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے جسٹس سردار عبدالجبار خان اور ریاض انور کے ساتھ مل کر ملکان میں بہم ثقافت کی بنیاد رکھی اور ہر سال جشن فرید منانے کی نہایت شاندار تقریبات منعقد کرنے کا اہتمام

کیا۔

آجھل وہ ملتان میں روزنامہ "مشرق" کے سب آفس کا انچارج ہے۔ اس کا ایک بھائی صدیق راعی بھی صحافت کی دنیا سے وابستہ ہے اور اپنی عبات گزاری اور شب بیداری کی برکت سے قناعت کی دولت سے ملا مال ہے۔

ایک دور افتادہ گاؤں کا نمبردار ملاقات کے روز آیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ عرصہ سے ایک ملگ نے گاؤں میں ڈیرہ ڈالا ہوا ہے۔ دوپر کے وقت موسم گرم کی شدید تمازت میں بھی وہ آگ جلا کر باہر دھوپ میں بیٹھتا ہے اور دن بھر چلم پیتا رہتا ہے۔ دورے سے لوگ اپنی مرادیں لے کر اس کے پاس آتے ہیں۔ کسی سے وہ گھنی کا کنتر وصول کرتا ہے۔ کسی سے گندم کی بوری یا چاول یا چینی کے انبار خاص طور پر عورتوں سے سونے چاندی کی مرکیاں، انگوٹھیاں اور چوٹیاں تک اتر والیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی فرمائیں پوری نہ کر سکے تو وہ جلال میں آ کر سائل کی جانب کئی بار ہاتھ جھکلتا ہے۔ اس عمل سے سائل کے بدن کا کوئی حصہ سن ہو کر مفلوج سا ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے چاپائی پر لٹا کر گھر لے جاتے ہیں جمل پر ڈیڑھ دو ماہ وہ یہ اذیت کاٹ کر ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے درجنوں کیس اس علاقے میں رونما ہو چکے ہیں۔ نمبردار نے کہا، "ساری آبادی اس کے خوف سے سمی ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں کیا نہ کریں۔"

یہ عجیب واقعہ سن کر مجھے چرایا کہ میں خود وہاں جا کر اس بھید کا کھونج لگاؤں۔ حفظ ماقبلہ کے طور پر میں نے سعل ہسپتال سے ایک اسٹرپچر منگوا کر گاڑی میں رکھوا لیا اور ایک ارڈل اور نمبردار کو اپنے ساتھ بٹھا کر گاؤں کی جانب روانہ ہو گیا۔ پچاس پچپن میل کا سفر تھا۔ راستے بھر میں لگار آئیہ اکری اور چاروں قل صمیم قلب سے پڑھتا رہا۔ میں نے گاڑی گاؤں کے قریب رکوائی۔ نمبردار اور ارڈل سے کہا کہ وہ گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہیں۔ میں اکیلا ملگ کے ڈیرے پر جاؤں گا۔ اگر میں نصف گھنٹہ تک

والپس نہ آیا تو وہ اسٹرپچر لے کر وہاں آ جائیں۔

ڈیرے پر ایک کالا بھنگ، فربہ بدن، کریمہ المنظر شخص دھوپ میں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی کے بال اس طرح لٹک رہے تھے۔ جیسے کھجور کے درخت کی شاخوں سے تیز تیز لانے لانے کاٹنؤں کے گچھہ لٹک رہے ہوتے ہیں۔ سامنے آگ کے الاو کے قریب چند چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چٹائیوں پر کچھ مرد اور چند عورتیں ادب سے دوزانو بیٹھی تھیں۔ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ باری باری ہر شخص ملنگ کو مخاطب کرتا تھا، ”حضرت جی“ میری عرض سنو۔ لیکن سرخ سرخ آنکھوں والا ملنگ کسی کی عرض سننے کے موڑ میں نہ تھا۔ بلکہ کش پرکش لگا کر گم سم بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے ملنگ کو لکارا۔ ”اے او بدمعاش غنڈے۔ بولتا کیوں نہیں۔ کیا تو گونگا ہے؟“

یہ سنتے ہی چٹائوں پر بیٹھے لوگ اٹھ کر بھاگ گئے اور دور کھڑے ہو کر مجھے فصیحت کرنے لگے، ”شری بابو، تجھے معلوم نہیں۔ یہ جلالی بابا ہے۔ تم کو جسم کر ڈالے گا۔ میری لکار سن کر ملنگ بھی غصے میں آ گیا۔ اس نے چلم ہاتھ سے رکھ دی اور زور سے چلکھاڑ کر سروقد کھڑا ہو گیا۔ میرے وجود میں بھی کوئی سپرگ کھلا اور میں بھی اس کے ساتھ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ ملنگ نے پانچ سات بار زور سے جھک کر میری جانب اپنا ہاتھ مارا۔ ایک دو لمحوں کے لیے میرے بازوؤں میں ہلکی سی سفناہت تو ضرور ہوئی۔ لیکن فوراً ہی رفع بھی ہو گئی۔ اپنے عمل کی اس ناکامی پر ملنگ گھٹنوں میں سر دے کر نہیں پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران نمبردار اور میرا اردوی بھی کار لے کر وہاں آ گئے۔ اب گاؤں کی آبادی کی بڑا حصہ یہ تماشہ دیکھنے وہاں جمع ہو گیا۔ میں نے لوگوں سے کہا۔ ”یہ کوئی شیطانی عامل ہے۔ اللہ کے کلام کی برکت سے اس کا عمل ٹوٹ گیا ہے۔ اب تم بے خوف ہو کر آگے آؤ اور لا حوصل ولا قوہ الا باللہ پڑھ کر اس کے ایک ایک جوتا لگاؤ۔“

یہ سن کر گاؤں کا ایک زندہ دل نوجوان زور سے لاحول پڑھتا ہوا آیا اور ملنگ کو نہیں پرالٹا اٹا کر اس کی پیٹھ پر گھوڑے کی طرح سوار ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد باری باری مرد، عورتیں اور بچے آتے اور لاحول پڑھ کر ملنگ کو ایک یا دو جو تے رسید کر جاتے۔

میرے کہنے پر نمبردار نے ملنگ کا جمرا بھی کھولا، جو گھنی کے کنستروں، شد کی بوتلوں، گندم اور چاول کی بوڑیوں، نئے کپڑوں کے بندلوں اور سونے چاندی کے زیورات کے ڈبوں سے اٹاٹ بھرا ہوا تھا۔ میں نے مقامی معززین کی ایک کمیٹی بنا کر یہ سارا مال غنیمت اس کے سپرد کر دیا کہ جن جن لوگوں کی ملکیت ثابت ہو وہ مال انہیں واپس کر دیا جائے۔ اگر کچھ اشیاء فتح جائیں تو انہیں غریب غربا میں بانٹ دیں۔

اس کے بعد میں ملنگ کو اپنی کار میں بٹھا کر جھنگ لے آیا۔ میں نے اسے بہت کریدنے کی کوشش کی کہ اس نے یہ شیطانی اور سفلی عمل کب اور کیسے سیکھا ہے؟ لیکن سارا رستہ وہ چپ سادھے بیٹھا رہا۔

جنگ پہنچ کر میں وہاں کے ایس۔ پی۔ آغا شجاعت علی کے ہاں گیا اور ساری روئیاں سنا کر پوچھا، کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

آغا صاحب بولے۔ ”مقدمہ بھی دائر ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ ایسے مقدمات میں بیشتر لوگ ملنگوں کے خلاف گواہی دینے گھبراتے ہیں۔ اس لیے ایسے مقدمے اکثر کامیاب نہیں ہوتے۔ آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں۔ ہمارا ”چھتراؤ“ کرنے والا بڑا اچھا ماہر ہے وہ دو دن میں ”چھتراؤ“ کر کے اس کے سر سے شیطان کا بھوت اتار دے گا۔ اس کے بعد ہم اسے ضلع جھنگ سے نکال باہر کریں گے۔ جہاں اس کے سینگ سماں میں وہاں چلا جائے۔

بعد میں یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس سفلی عامل کے سینگ کہاں سمائے۔

جنگ میں میری ملاقات ایک ایسے بزرگ سے بھی ہوئی جن کا شمار اپنے زمانے کے اولیا

صفت بزرگوں میں ہوتا تھا۔ ان کا اسم گرامی مولانا محمد ذاکر تھا، جنہوں نے محمدی شریف میں ایک دارالعلوم، سکول اور کالج بھی قائم کر رکھا تھا۔ نرم خو، آہستہ خرام، خاموش طبیعت کے مالک اس عالم باعمل اور زاہد شب زندہ دار کی ملاقات میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش اثاثہ ہے۔ میں نے ان کی نظر نہ کبھی اوپر اٹھتے دیکھی اور نہ ان کی آواز کبھی بلند ہوتے سنی۔ اپنے دور افتادہ علاقے میں انہوں نے دینی اور دنیاوی علم کی ایسی شمع جلالی جو روز بروز روشن سے روشن تر ہوتی جا رہی ہے۔ ضلع جھنگ میں پہلی ملاقات کے بعد تادم زیست ان کی نظر کرم ہیشہ اور ہر جگہ اس بندہ گنگار پر رہی۔ جب میں لاہور پوسٹ ہوا تو وہ وہاں بھی ایک دو بار تشریف لائے۔ بھنوں دور میں بھی وہ قومی اسمبلی کے ممبر تھے۔ اس وقت ضعیفی اور نقاہت کا یہ عالم تھا کہ اسمبلی کے سیشن کے لیے بیماری کے باوجود طویل سفر اختیار کرتے تھے اور اسمبلی ہال میں پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر لے جائے جاتے تھے۔ اس کے باوجود اسمبلی میں یا اس کے باہر نماز باجماعت کبھی قضا نہ ہوتی تھی۔ استقامت کی یہ کرامت میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔

اب ان کے فرزند مولانا رحمت اللہ صاحب اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر نمایت خوش اسلامی سے چل رہے ہیں۔ جامعہ محمدی شریف کے ناظم اعلیٰ ہونے کے علاوہ وہ اپنے علاقے سے موجودہ اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے منتخب ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور صلاحیت میں روز افزون ترقی دے تاکہ وہ اپنے والد گرامی کے مشن کو بعنوان شائستہ پایہ تکمیل تک پہنچا دیں۔

جھنگ نے مجھے شاعر چناب رنگ شیر افضل جعفری کی دوستی کا تحفہ بھی عطا کیا۔ اردو زبان میں ایک خاص انداز کی بانگلی شاعری ان کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ ان کی مرمت اور خوش اخلاقی ہے کہ انہوں نے آج تک اپنے اس مدح کو فراموش نہیں کیا۔ درویش صفت اور عبات گزار آدمی ہیں۔ تاہم اس بندہ عاجز کو نوازتے رہتے ہیں۔ کبھی شرف

ملقات سے، کبھی خطوط دلناز سے۔ اللہ تعالیٰ ان کو شادماں اور ان کے قلم کو دیر تک رواں رکھے۔

دو بڑے زمینداروں کا تذکرہ کئے بغیر جھنگ میں میرے ملاقاتیوں کا سلسلہ تکمیل ہے جائے گا۔

ایک روز ایک بڑے زمیندار صاحب ملاقات کے لیے آئے۔ خود تو بڑی حد تک ناخواندہ تھے لیکن تعلیم کے فضائل اور فوائد پر ایک طویل تقریر کرنے کے بعد بولے، ”جناب آپ اس پس ماندہ ضلع کے لیے نیکی کا ایک اور کام بھی کرتے جائیں۔ فلاں گاؤں میں اگر ایک پرائزمری سکول کھول دیا جائے تو اس علاقے پر یہ ایک احسان عظیم ہو گا۔ اگر آپ قبول فرمائیں تو بندہ سکول کے لیے نہیں مفت، کمروں کی تعمیر کے لیے بیس ہزار روپیہ نقد اور ایک استاد کی ایک برس کی تنخواہ اپنی جیب سے ادا کرنے کے لیے حاضر ہے۔“

میں نے ان کی روشن خیالی اور فیاضی کی تعریف کر کے کہا، ”نیکی اور پوچھ پوچھ؟ آپ جب فرمائیں گے، سکول کھولنے کا بندوبست ہو جائے گا۔ بلکہ میں تو یہ کوشش بھی کروں گا کہ اس سکول کا افتتاح کرنے کے لیے عزت ماب وزیر تعلیم کو بذات خود یہاں مدعو کیا جائے۔“

زمیندار صاحب خوش خوش میری جان و مال کو دعائیں دیتے ہوئے تشریف لے گئے۔ کوئی ایک ہفتہ بعد اسی علاقے کے ایک اور بڑے زمیندار ملنے آئے۔ چھوٹے ہی انہوں نے روہا ہو کر گلہ شکوہ شروع کر دیا۔ ”جناب میں نے کیا قصور کیا ہے کہ مجھے اس قدر کڑی سزا دی جا رہی ہے؟ بندہ بالکل بے گناہ ہے۔“

میں نے حیران ہو کر اس شکوے کی وضاحت طلب کی کہ ان کے ساتھ کیا ظلم ہو رہا ہے اور کون یہ ظلم کر رہا ہے؟ انہوں نے گلوگیر آواز میں یہ تفصیل سنائی، پچھلے ہفتے سکول کے بارے میں جو شخص ملنے آیا تھا، وہ یہ سکول اپنے گاؤں میں نہیں بلکہ

میرے گاؤں میں کھلوا رہا ہے۔ ہمارے درمیان پشتوں سے خاندانی دشمنی چلی آ رہی ہے۔ پہلے ہم ایک دوسرے کے مویشی چڑا لاتے تھے۔ کبھی ایک دوسرے کے مزارعوں کو قتل کروا دیتے تھے۔ کبھی ایک دوسرے کی فصلیں اجازہ دیتے تھے۔ لیکن اب وہ کمینہ میرے گاؤں کی نسلیں برباد کرنے پر اتر آیا ہے۔ اسی لیے آپ سے سکول کھولنے کا وعدہ لے کر گیا ہے۔“

فرودغ تعلیم کے فضائل پر یہ نرالی منطق سن کر میں سکتے میں آگیا۔ چند منٹ سوچنے کے بعد میں نے گزارش کی۔ ”آپ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے کیوں نہیں دیتے؟ جو پیشکش انہوں نے کی ہے، اگر وہی بار آپ بھی اٹھائیں۔ تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان کے گاؤں میں بھی بھی یہ یک وقت ویسا ہی سکول قائم کر دیا جائے گا۔“

یہ سن کر ان کی کسی قدر تشغیل تو ہوئی، لیکن اس کے بعد دونوں میں سے کوئی بھی اپنی اپنی فیاضی کی پیشکش لے کر دویاہ میرے پاس نہ آیا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے یہ واقعہ جھنگ کے بیرون یوسف صاحب کو سنایا، تو وہ مسکرا کر بولے۔ ”حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تعلیم جیسی خطرناک ویا کو اپنے اپنے گاؤں سے دور رکھنے کے لیے دونوں نے اسے اپنا مشترکہ فرض سمجھ کر مکا کر لیا ہو گا۔ بڑی زمینداروں اور جاگیروں میں ابھی تک تعلیم ہی کو سب سے بڑا اور تباہ کن دشمن سمجھا جاتا ہے۔“

## • تباہ دلہ

جنگ سے تعینات ہوئے مشکل سے ایک برس گزرا تھا کہ اچانک میں نے اڑتی اڑتی ہی خبر سنی کہ مجھے عنقریب وہاں سے تبدیل کر دیا جائے گا۔ یہ خبر میرے لیے نبی نہ تھی۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کی افواہیں کئی بار اڑچکی تھیں۔ جب سے میں نے ہفتے میں دو دن عام ملاقاتوں کا سشم راجح کر کے عوام الناس کے چھوٹے بڑے مسائل براہ راست پہنانے شروع کئے تھے، اس وقت سے ضلع کے بڑے بڑے زمینداروں، رئیسوں اور پیشہ ور سیاست دانوں میں رنجش اور بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ حضرات عام لوگوں کے مسائل اپنی وساطت سے حل کروانا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس طرح لوگوں پر بھی ان کی گرفت مضبوط رہتی تھی اور افراد کے ساتھ بھی ان کا رابطہ قائم رہتا تھا۔ میرے طریقہ کارنے جب ان کی اس اجائیداری کو ختم کر دیا تو اس میں ان سب کو اپنی بڑی حق تلفی محسوس ہوئی۔ چنانچہ وہ لاہور جا کر صوبائی وزیروں کے پاس اکثر اپنا یہ روتا روتے رہتے تھے۔

صوبائی وزیر صاحبان بھی مجھ سے کسی قدر آزردہ خاطر ہی رہتے تھے۔ ایک وزیر صاحب پیر کے روز دورے پر تشریف لائے، جو میری عام ملاقات کا دن تھا۔ اس روز ست، اسی کے قریب ملاقاتی جمع تھے۔ ان میں سے کچھ پچاس پچاس، ساتھ ساتھ میل کا سفر طے کر کے آئے تھے۔ میں نے ریسٹ ہاؤس میں جا کر وزیر صاحب کا استقبال تو ضرور کیا، لیکن پھر ایک اور افسر کو ان کی خدمت میں چھوڑ کر خود واپس چلا آیا۔ کیونکہ اتنے کثیر ملاقاتیوں کو سارا دن انتظار کی زحمت میں بیٹلا رکھنا مناسب نہ تھا۔ ایک اور وزیر صاحب جمعرات کو آئے۔ اس روز بھی یہی واقعہ پیش آیا، کیونکہ وہ بھی ملاقات کا دن تھا۔ میں نے اپنے عملے کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وزیروں کے دورے پر ریسٹ ہاؤس

میں شر کے لوگوں سے مانگ مانگ کر قالین اور صوف نہ ڈلوائے جائیں۔ بلکہ حکومت نے ریسٹ ہاؤس میں جس قدر فرنچ پر رکھا ہوا ہے، وہ سب کے گزارہ کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ ایک وزیر صاحب جوں کے مینے کی شدید گری میں تشریف لائے۔ ریسٹ ہاؤس کے ٹھڈ منڈ کمرے کو دیکھ کر وہ بگڑ گئے اور ائمہ پاؤں واپس لوٹ گئے۔ میں نے انہیں اپنے گھر نھرا نے کی پیشکش بھی کی لیکن دماغ کا جو پارہ ایک دفعہ چڑھ چکا تھا، وہ نیچے نہ اترा۔ اس کے بعد اور کسی صوبائی وزیر نے جھنگ کا دونہ کرنے کی زحمت نہ اٹھائی۔

میرے قیام جھنگ کے دوران پہلی بار مادر ملت مختارہ مس فاطمہ جناح، اور دوسری بار وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین ضرور مختصر دورے پر جھنگ تشریف لائے تھے۔ دونوں کا قیام جھنگ میں چند گھنٹے تھا لیکن دونوں موقعوں پر ہم نے ریسٹ ہاؤس کو دلسی کی طرح سمجھایا تھا۔ لوگوں نے بڑی خوشی سے سرکوں پر رنگ بر گلی جھنڈیاں لگائیں اور استقبالیہ دروازے بنائے تھے۔ ریسٹ ہاؤس کے اندر میں نے اپنے گھر کا ذاتی ساز و سامان سجا دیا تھا۔

اسی نانے میں موجودوالہ کا المناک واقعہ پیش آیا۔ پولیس کے کچھ سپاہی اس گاؤں میں کسی تفتیش کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ گاؤں والوں کے ساتھ ان کا کچھ جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے نے طول کھینچ کر فساد کا رنگ اختیار کر لیا، جس میں ایک سپاہی جان سے مارا گیا۔ اب کیا تھا۔ مقامی پولیس انتقام لینے کے لیے گاؤں پر چڑھ دوڑی اور راتوں رات اسے تھہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اگلے روز میں خود جائے وقوع پر پہنچا، تو سارا گاؤں سنان پڑا تھا۔ پولیس کی گارڈ اور چند نحیف و نزار بورڈھی عورتوں کے علاوہ گاؤں میں اور کوئی فرد و بستر موجود نہ تھا۔ کچھ لوگ گرفتار ہو چکے تھے اور باقی سب مرد، عورتیں اور بچے خوف سے اپنے گھر بارکھلے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ سارے علاقے میں پولیس کے ظلم و تشدد کی داستانیں طرح طرح کی رنگ آمیزی کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن پولیس والوں کی اپنی رام کہانی یہ تھی کہ ظلم تو خود ان پر ہوا ہے جن

کا ایک کانٹیل جان سے مارا گیا۔ ان کا موقف تھا کہ ضابطہ کے مطابق قانونی چاہ جوئی کے علاوہ انہوں نے کسی قسم کی نیادتی نہیں کی اور اب گاؤں والے چند مقامی سیاست دانوں کی شہ پر پولیس کو بدنام کرنے کے لیے مختلف قسم کے ہتھنڈے استعمال کر رہے ہیں۔

صوبائی اخباروں میں اس واقعہ کا خاصہ چرچا ہوا۔ کئی جانب سے اس کی مکمل انکواری کروانے کا مطالبہ بھی اٹھا۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ اس کی انکواری ہونی چاہیے تاکہ صحیح صورتحال واضح ہو جائے۔ ایک روز میں لاہور میں چیف سیکرٹری کے پاس بیٹھا اسی سلسلے میں کچھ بات چیت کر رہا تھا کہ یکاکیٹ ٹیلیفون کی گھنٹی بھی۔ دوسری طرف انپکٹر جزل آف پولیس خان قربان علی خاں تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں بھی چیف سیکرٹری کے پاس موجود ہوں تو انہوں نے ہم دونوں کو اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔

خان قربان علی خاں عام طور کے انپکٹر جزل آف پولیس نہیں تھے۔ صوبائی حکومت میں ان کا طویلی بولتا تھا۔ وزیر اعلیٰ میاں متاز دولت نہ انہیں۔ برسر عام ”انگل“ کہا کرتے تھے۔ صوبہ کے وزیر، سیکرٹری اور دوسرے سول افسران سے بے حد خم کھاتے تھے۔ قربان علی خاں بھی ان سب پر رب عرب گانٹھنے، دھونس جمانے اور پولیس کے مقابلے میں انہیں نیچا دکھانے میں کوئی دیقتہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ اپنی بات منوانے کے لیے وہ دلیل سے نیادہ ضد اور ہٹ دھری سے کام لیتے تھے اور دوسروں کو زیر کرنے کے لیے وہ تفحیک و توہین کے ہتھیار بڑی مہارت سے استعمال کرتے تھے۔ جو بات ایک بار ان کے منہ سے نکل جائے وہ اس موضوع پر حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ رشوت نہیں لیتے تھے، نماز پڑھتے تھے۔ لیکن ان فضائل نے ان کی خوبی کی سفا کی اور مزاج کی بے رحم درشتی پر اعتدال اور عجز کا ہلکا سارنگ بھی نہ چڑھایا تھا۔ ان کے دل و دماغ میں تکبر کے بلند و بالا پہاڑ ایستادہ تھے اور دوسروں کی اتنا اور عزت کو پاؤں تلے روندا ان کے باسیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اگر کسی VIP کی آمد پر اعلیٰ حکام ائمپورٹ وغیرہ پر

جمع ہوتے تھے تو قربان علی خاں ان کے ساتھ استقبالیہ لائے میں کھڑے ہونا اپنی ہٹک سمجھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو باقی سب سے مختلف، اعلیٰ اور ارفع چیز گردانتے تھے۔ اور بید کی باریک سی چھڑی ہاتھ میں گھماتے کسی نہ کسی بہانے گورنر یا چیف منیر کے قرب و جوار میں منڈلاتے رہتے تھے۔

جب خاں قربان علی خاں نے چیف سیکرٹری کو اور مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا تو ہم نے فوراً حکم کی تعیین کی۔ اس زمانے کا دستور یہی تھا کہ انپکٹر جزل آف پولیس سول افسروں کے کروں میں شاذو نادر ہی تشریف لے جاتے تھے۔ سب لوگ اکثر ان کے کمرے ہی میں حاضری دیا کرتے تھے۔ مجھے مخاطب کر کے قربان علی خاں نے موجہ والہ میں پولیس کی اعلیٰ کارکردگی پر بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا اور انکوواری کے سب مطالبوں کو واہیات خرافات قرار دے کر مسترد کر دیا۔ چیف سیکرٹری صاحب جو چند لمحے پہلے اپنے کمرے میں میرے ساتھ انکوواری کے حق میں گفتگو فرمائے تھے اب ہوا کا رخ دیکھ کر آنا فنا بدلتے گئے اور انپکٹر جزل آف پولیس کے ہمنوا ہو گئے۔ جھنگ میں پولیس کی نیک نای کی خاطر میں نے انکوواری کی اہمیت پر کچھ کہنے کی کوشش کی تو خاں قربان علی خاں نے ناک سکیپر کر کچھ دیر سوں سوں کی آواز برآمد کی اور پھر کچھ تبصرہ کئے بغیر مینگ برخاست کر دی۔ میرا خیال ہے، ساتھ ہی انہوں نے میرا نام اپنے رجسٹر میں جھنگ کے ناپسندیدہ ڈپٹی کمشنر کے خانے میں درج کر لیا۔

لیکن جس واقعہ نے جھنگ میں میری ڈپٹی کمشنر کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکی، اس کا تعلق ایک فوجداری مقدمہ سے تھا جو میری عدالت میں زیر ساعت تھا۔ دونوں فریق ضلع کے بااثر خاندان تھے اور سالما سال سے باہمی رقبتوں، عداوتوں اور مقدمہ بازیوں میں لمحے ہوئے تھے۔ ایک روز کے مقدمے کی پیشی شروع ہوئی تو ایک فریق نے بڑے ٹمپریاں سے آگے بڑھ کر ایک بند لفافہ میری میز پر دے مارا۔ لفافہ پر ایک صوبائی وزیر کی مر تھی اور اس کے اندر غالباً سفارشی خط تھا۔ یہ ماجرا دیکھ کر دوسرا فریق بھی میدان میں اتر آیا اور اس نے بھی ایک بند لفافہ میری میز پر پڑھ دیا۔ اس پر ایک دوسرے

صوبائی وزیر کی مر تھی اور اس کے اندر بھی غالباً سفارشی خط تھا۔ وزیر صاحبان کی سفارشیں وصول کرنا اور ان پر عملدرآمد کرنا ہمارا روزمرہ کا معمول تھا۔ لیکن ایک زیر سماعت مقدمے میں تحریری سفارشیں کرنا بڑی بے اصولی اور کذب بات تھی۔ میں نے فریقین کے وکیلوں کو دونوں بند لفافے دکھائے اور کہا۔ ”آپ مجھے مشونہ دیں کہ ان خطوط کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں خط کھول کر عدالت میں پڑھ کر سنائے جائیں اور پھر انہیں مقدمے کی فائل میں لگا دیا جائے۔ بصورت دیگر انہیں اس طرح بند کے بند آپ کے موکلین کو واپس لوٹا دیئے جائیں۔

دونوں وکیل اپنے موکلوں کی اس حرکت پر نالاں تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے موکل پر خوب لعن طعن کی اور بند خطوط مجھ سے واپس لے لیے۔

میرا خیال تھا کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن جب یہ خبر وزیر صاحبان تک پہنچی تو وہ بڑے چراغ پا ہوئے۔ چند روز بعد میں کسی کام سے لاہور گیا تھا۔ اسمبلی کی غلام گردش میں میری ان سے اتفاقاً مذکور ہو گئی۔ انہوں نے اپنے دو تین اور ہم منصوبوں کے ساتھ مل کر مجھے بڑے بڑے آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کا بار بار یہی اصرار تھا کہ بھری عدالت میں ان کے خطوط کا تماشا بنا کر میں نے وزیروں کی جملہ برادری کو تفحیک واستہزا کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی کہ ایسے خطوط لکھ کر انہوں نے بھی کوئی ناروا حرکت کی ہے۔

میں نے یہ واقعہ ملتان جا کر اپنے کمشنز مشر آئی۔ یو۔ خان کو سنایا تو انہوں نے فرمایا۔ ”بھائی، دیا میں نہ کر مگر مجھ سے بیر لینا کیا ضروری ہے۔ اب یہ لوگ خواہ مخواہ تمہیں دق کرتے رہیں گے۔ میری مانو تو تم کسی طرح اس صوبہ سے رفو چکر ہو جاؤ۔“

اتفاق سے ان دونوں ہالینڈ کے دارالخلافہ ہیگ میں ”اٹر نیشنل انٹھی ثیوٹ آف سوشنل سٹڈیز“ کا اداہ نیا نیا قائم ہوا تھا۔ اس میں پلیک ایڈمنیسٹریشن پر ایک چھ ماہ کا کورس شامل تھا۔ مرکزی حکومت نے جب میرا نام اس کورس کے لیے تجویز کیا تو پنجاب گورنمنٹ نے بلا حیل و جھٹ بڑی خوش مل سے اس پر آمد و صدقہ کہہ دیا۔

## • ہالینڈ میں حج کا نیتے

ہالینڈ کی سرنشیں پر قدم رکھتے ہی چند روز تک میں حواس باختہ رہا۔ ڈچ قوم کے سر پر صفائی کا جو بھوت سوار ہے، اسے دیکھ دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگی۔ سڑکوں اور گلیوں میں دو رویہ تاحد نظر ایک ہی طرح کے دو منزلہ مکان بنے ہوئے ہیں۔ اوپر بیدروم نیچے ڈرانینگ ڈانگ روم، سب کی ایک طرح کی شیشے کی کھڑکیاں اور ایک ہی طرز کے لکڑی کے دروازے ہیں۔ بیدروم کی کھڑکیوں میں ایک ہی طرح کے پھول گلدانوں میں بجے ہوئے ہیں۔ ہر ڈرانینگ روم کی دیوار پر ایک یا دو تصاویر آؤڑاں ہیں۔ صوفوں پر ہر گھر میں ایک ہی ڈیل ڈول کے میاں یوی ایک ہی طرح کی مصروفیات میں منہمک ہیں یوی اونی جرایں یا مفلر یا سویٹر بن رہی ہیں۔ میاں کتاب پڑھ رہا ہے یا اٹی وی پر فٹ بال کا بیچ دیکھ رہا ہے۔ بچوں کی ایک کثیر تعداد ڈائنگ نیبل پر جھکی سکول کا ہوم ورک کر رہی ہے۔ رات کے دس بجے سے گھروں کی بجلیاں بجھتا شروع ہو جائیں گی اور گیارہ بجے تک بالکل سناثا چھا جائے گا۔

صحیح ہوتے ہی بچے سکول سدھاریں گے۔ مرد کام کاج پر نکل جائیں گے اور عورتیں رنگ برنگ اپر انداز کر گھر بار کی صفائی میں مشغول ہو جائیں گی۔ قالینوں، پردوں، صوفوں، کرسیوں، میزوں، تصویریوں، پھولدانوں، چھتوں اور دیواروں کی جھاڑ پونچھ کے بعد کھڑکیوں کے شیشے دھوئے جائیں گے۔ دروازوں کی اندر اور باہر سے رگڑائی ہو گی۔ دروازے پر لگے ہوئے کیلوں، کنڈوں اور مٹھوں کو پاش کر کے چکایا جائے گا اور آخر میں گھر کے باہر فٹ پاتھ کا جتنا حصہ مکان کے سامنے سے گزرتا ہے اسے بھی صابن سے دھو کر خوب صاف کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد خاتون خانہ لباس تبدیل کر کے گھر کو تالا لگائے گی اور خود وقت گزارنے کے لیے شاپنگ کو چلی جائے گی یا انمار و اشجار کی سیر کو نکل جائے گی۔ اب اس بے چاری کی خواہش اور کوشش یہی ہو گی کہ

شام ہونے سے پہلے کسی کا قدم اس کے گھر کی چار دیواری میں نہ پڑے، تاکہ اتنی محنت سے کی ہوئی صفائی، مجھائی اور رگڑائی مفت میں برباد نہ ہو۔

URDU4U.COM  
مکان اور سامان کی صفائی کا اس قدر اہتمام کرنے والی قوم اپنے اجسام کی صفائی کی چندال پرواد نہیں کرتی۔ نمائے سے اسے خاص طور پر پرہیز ہے۔ غسل کی نوبت کافی طویل وقوف کے بعد آتی ہے۔ درمیانی عرصہ میں عورتیں تو پاؤڈر، اوڈری کلوں وغیرہ سے کسی قدر ڈرائی کلینینگ کا اہتمام کرتی رہتی ہیں، لیکن مرد حضرات اس کی بھی چندال ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

یہ جفاکش قوم سمندر کی تہ سے نہیں نکال کر بڑی خوبصورت تانہ بستیاں آباد کرتی ہے۔ پھولوں کی بہترین اقسام اس سرنیشن پر اگتی ہیں۔ دنیا کے کئی عظیم فن کار اس قوم کی آغوش میں پلے ہیں۔ یہاں کے میونیم آرٹ اور فن کا بے مثال گھواہ ہیں۔ قدرتی مناظر کو ان کی اصلی صورت میں برقرار رکھنے کے لیے بڑے بڑے مجھے قائم ہیں۔ جنگلات میں ایک ایک درخت کی فائل بنی ہوئی ہے۔ پون چکیوں کی دیکھ بھال کا منظم انتظام ہے۔ بازاروں میں کتابوں کی دکانوں کی نمایاں بہتات ہے۔ دنیا کے کسی حصے میں کوئی مشہور کتاب شائع ہو تو وہ فی الفور ڈچ زبان میں ترجمہ ہو کر مارکیٹ میں آ جاتی ہے۔ کتابیں خریدنے کا اس قوم کو شوق بھی ہے اور شعور بھی ہے۔ ثقافتی روایات اور اقدار اس کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ لیکن مزاجا یہ لوگ سرد مر، کم آمیز اور دیر آشنا ہیں اور زہن ان کا بغیر کسی آمیزش کے خالصتاً تا جرانہ ہے۔ دولت کمانے میں وہ کسی قدر سفاک اور خرچ کرنے میں حد درجہ محتاط ہیں۔

ہالینڈ اپنی اعلیٰ ترین کوالٹی کے انڈے، مرغ، گوشت، مکھن، پنیر، دودھ اور پھول تو برآمد کر دیتا ہے اور اپنے گزارہ کے لیے انہوں نے قومی سلیخ پر کھانے پینے، رہنے سننے کا ایسا دستور العلی اختیار کر رکھا ہے جس میں چھوٹے بڑے، امیر غریب سب برضاء و رغبت یکساں طور پر شریک ہیں۔ ناشتا میں مکھن کی جگہ ماجرین لگے ہوئے توں، چینی اور دودھ

کے بغیر چائے اور پنیر، لفخ پر پنیر کے سینڈوچ، شام کو چھ اور سات بجے کے درمیان ڈزر جسے وہ لوگ Hot Meal کہتے ہیں۔ ادھر شام کے چھ بجے، ادھر سڑکیں اور بازار خالی ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ سات بجے تک اچھا خاصا سناٹا چھا جاتا ہے۔ اور پوری قوم بیک وقت ڈائنگ نیبل کے گرد بیٹھ جاتی ہے۔ گرا گرم ابلا ہوا سوپ موجود ہے تو گوشت ندارد۔ گوشت موجود ہے، تو سوپ غائب۔ اب لے ہوئے آلوؤں کا ڈھیر کا ڈھیر البتہ ہر ڈزر کا لازمی جزو ہے۔ یوں آلو و لندزینیوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔ ڈچ زبان میں آلو کے لیے جو لفظ ہے۔ اس کا مطلب بھی ”ٹھوس سیب“ ہے۔ اتوار کے اتوار انٹے کی عیاشی بھی ہو جاتی ہے۔ اس دن دس گیاہ بجے کے قریب انٹے اور کافی کے ساتھ ”برنج“ کر کے بریک فاست اور لفخ دونوں سے فراغت حاصل کر لیتے ہیں۔ پیاس بھانے کے لیے اکثر مرد بنیں اور بولز چڑھاتے ہیں اور عورتیں اور بچے بڑی فراوانی سے دودھ پیتے رہتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہالینڈ میں موٹی عورتیں بھدے مرد، اور صحت مند بچے کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں۔

ڈچ لوگ اپنے یار دوستوں کو کسی ریسٹوران میں کھانے کی دعوت تو نہیں دیتے، لیکن کھانے پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے کی دعوت ضرور دیتے ہیں، کھانا ہوتا ہے، خوش گپی ہوتی ہے اور جب پیرا بل لاتا ہے، تو سب لوگ ٹپ سمتیت حساب لگا کر اپنے اپنے حصے کی رقم بٹوے سے نکال کر میز پر رکھ دیتے ہیں۔ رسمی تکلفات کو وہ اپنی جیب کا بوجھ نہیں بننے دیتے۔ خودکفیلی کے اس طور طریقے میں جو سوتیں میسر ہیں، انہوں نے اس آدابِ مہمانی و میزبانی کو دوسرے مغربی معاشروں میں بھی مقبول عام کر رکھا ہے۔ انگریزی زبان میں تو اس کے متعلق Going Dutch کا محاوہ بھی موجود ہے۔ انٹرنسیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشن سنڈیز قائم کرنے کے لیے ہالینڈ کی ملکہ جولیانا نے اپنا ایک پورا محل عطا کر دیا تھا۔ یہ شاندار محل ہیگ کے ایک فیشن ایبل اور امیرانہ حصے میں واقع تھا۔ ایک طرف وسیع و عریض سربراہی باغ تھا۔ دوسری طرف شر کی سب سے مہنگی دکانوں والا بازار تھا۔ درمیان میں انہوں کے فرش کا ایک کھلا میدان تھا۔ محل

کے الگ الگ حصوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے رہائشی کمرے تھے۔ ایک منزل پر ڈائینگ روم، کامن روم اور لابریری تھی۔ دوسری منزلوں پر کلاس روم اور مذاکروں کے لیے کشاہی ہال تھے۔ دیواروں پر دیدہ نیب نقش و نگار تھے۔ چھتوں سے بڑے خوبصورت بلوری فانوس لٹک رہے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کا سارا ماحول شاہانہ تھا۔ پہلا کورس اسی سال شروع ہوا تھا اس میں آٹھ ملکوں سے ۳۲ طلباء شامل تھے، جن میں چھ لڑکیاں تھیں۔ لڑکیوں میں پاکستان سے صرف ایک لڑکی تھی جو بین الاقوامی امور پر ایم اے کا کورس مکمل کرنے آئی تھی۔ اس کا نام مس خورشید حسن تھا جو بعد میں خورشید حیدر بنیں۔ پاکستان واپس آ کر انہوں نے کچھ عرصہ تک کراچی اور اسلام آباد کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا۔ پھر فارن سروس میں داخل ہو کر ہالینڈ میں سفیر کے عمدہ پر فائز ہوئیں اور آج کل وزارت خارجہ میں ایڈیشنل سیکرٹری ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ میں خورشید نے اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا ہوا تھا۔ وہ نہایت صاف گو، بے باک، بے خوف، باصول اور خوش خصال لڑکی تھی۔ پاکستانیوں کے گروپ میں ہم چہ مرد تھے۔ ہیگ میں پنچتھی ہی خورشید نے ہمیں فوراً اپنے ڈسپلن کے چھاتے تلنے دھر لیا۔ کبھی نزی اور کبھی گرمی سے اس نے ہم پر واضح کر دیا کہ غیر ملک میں ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں کہنا چاہیے جس سے پاکستان کے وقار پر کوئی حرف نہ آئے۔ میں نے فوراً اس کی اس برتری اور بالا دستی کو تسلیم کر لیا اور انسٹی ٹیوٹ میں اپنی زندگی کو اس کے ہدایت نامہ کے سانچے میں ڈھالے رکھا۔ غالباً اس کی وجہ پاکستان کا وقار بڑھانا کم اور خورشید کی خوشنودی کو برقرار رکھنا نیا ہے تھی۔

اپنی دیگر گونا گوں خصوصیات کے علاوہ خورشید صوم و صلوہ کی پابند بھی تھی۔ اس کی ایک گھری سیلی ایک چینی لڑکی و کٹوریہ تھی۔ دینی لحاظ سے وہ بھی اپنے مذہب کی خوب پابند تھی۔ بارش ہو یا برف، جھکڑ ہو یا طوفان وہ ہر اتوار کو منہ اندر ہرے ایک مقامی گرجے

میں جا کر عبادت کرنے سے ہرگز نہ چوکتی تھی۔

اس برس رمضان شریف کا مدینہ گرمیوں میں آیا۔ ادارے میں ڈنر کا وقت تو شام کے سات بجے ختم ہو جاتا تھا لیکن خورشید نے ایسا بندوقت کیا کہ رونہ رکھنے والوں کے لیے باورچی خانہ ساری رات کھلا رہتا تھا۔ ان دنوں افطاری تقریباً نو ساڑھے نو بجے ہوتی تھی۔ ہم میں سے جو لوگ رونہ رکھتے تھے، خورشید خود ان کے لیے افطاری اور کھانے کا اہتمام کرتی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد جب سحری کا ٹائم آ جاتا، اس وقت بھی وہ اپنے ہاتھوں ہماری سحری کا انتظام کرتی تھی۔

جون کے آخر میں میرا کورس ختم ہو گیا۔ پچھلے چھ ماہ کے دوران خورشید نے مجھے ترتیب اور اطاعت کے جس سانچے میں ڈھال رکھا تھا۔ اس کی برکت سے میں نے واپسی پر حج کا فریضہ ادا کرنے کی نیت باندھ لی۔ اس حج نے اگر کچھ ثواب کمایا ہے، تو اس کے بیشتر حصہ کی حقدار خورشید ہی ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ میں ہالینڈ کے نظام حکومت کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضع بناؤں۔ یہ چھوٹا سا ملک سیاسی استحکام، فلاجی انصرام اور معاشری برد مندی کا بڑا عملہ نمونہ ہے۔ یہاں پر باوقار لیکن بے تکلف، عام پسند اور دسترس پذیر بادشاہت ہے۔ بہت سی مختلف الاصول سیاسی پارٹیوں کے باوجود جمہوریت نہ قابل کاشکار ہوتی ہے نہ تشدد کا۔ حکومت اکثر چند پارٹیوں کے اشتراک اور اتحاد سے تخلط صورت میں بنتی ہے۔ کولیشن کسی وقت نوٹ جائے تو ملک میں ہنگامی حالات پیدا نہیں ہوتے۔ نئی کولیشن بن جاتی ہے یا نئے انتخابات ہو جاتے ہیں۔ ہر پارٹی کی مجموعی رکنیت کے تناسب سے پارلیمنٹ میں ان کی نشیں محفوظ اور مقرر ہیں۔ بغیر جواز کے ووٹ نہ ڈالنا جرم ہے۔ نمایت اعلیٰ پیمانہ کی صنعتوں کے باوجود ملک میں ہڑتاں کا رواج عام نہیں۔ ٹیکسون کا نظام ایسا ہے کہ ذاتی سرمایہ داری کا گھوڑا بے لگام ہو کر نہیں بھاگتا۔ ایک حد چھو لینے کے بعد ذاتی آمدنی کی شرح برائے نام نہ جاتی ہے لیکن اس منزل تک پہنچنے کے بعد بھی صنعت کار اور سرمایہ

کار ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہتے، بلکہ ملک کی معیشت کی خاطر پیداوار بڑھانے میں بدستور مصروف عمل رہتے ہیں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں اس نظام حکومت کا تفضیلی مطالعہ کروں جس کے زیر تنگیں سیاسی استحکام معاشری ترقی اور عوای امان و بہبودی کا اس قدر خوبصورت امتزاج نشوونما پا رہا ہے، لیکن ادارے کے ڈائریکٹر نے معدودت کی کہ یہ انسٹی ٹیوٹ کا پہلا کورس ہے اور فی الحال اس میں اس موضع پر کام کرنے کے لیے کوئی بندوقت موجود نہیں۔ اس کی جگہ مجھے ہالینڈ کے کوپریٹو اور میونپل سسٹم کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ سسٹم ہالینڈ کی سرزمین کے ساتھ مخصوص ہے اور وہاں کی روایات، ضروریات اور مفادات کے مطابق صدیوں میں پروان چڑھا ہے۔ پاکستان کے سیاق و سبق میں اس کی کمی خاص افادیت یا مناسبت نہیں۔ اس قسم کا مطالعہ مجھے تضییع اوقات نظر آیا۔

میرا پہلا رو عمل یہ تھا کہ میں اپنی حکومت سے اجازت لے کر واپس لوٹ جاؤں۔ اس خیال کا تذکرہ میں نے ہالینڈ میں پاکستانی سفارتخانہ کے ناظم الامور مسٹر لال شاہ بخاری سے کیا تو وہ مسکرائے۔ بخاری صاحب بڑے زندہ دل اور تجربہ کار افسر تھے اور اپنے زمانے میں بین الاقوامی شرخ کے ہاکی کے کھلاڑی ہے چکے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”صرف چھ ماہ کی تو بات ہے۔ اتنا وقت تو تمہیں واپسی کی اجازت حاصل کرنے ہی میں لگ جائے گا۔ ڈچ گورنمنٹ کا دیا ہوا مفت کا وظیفہ ہے۔ بہتر ہے تم یہ کورس مکمل کر لو۔ بیٹھے بھائے ہالینڈ کی سیر ہو جائے گی اور تمہارے علم میں بھی ضرور اضافہ ہو گا۔“

اس کورس سے میرے علم میں تھوڑا بہت اضافہ تو ضرور ہوا، لیکن پاکستان کی ضروریات کے لحاظ سے یہ علم غیر نافع تھا۔ البتہ اس بھانے ڈچ قوم کی تہذیب و تمدن کو کافی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انڈونیشیا پر کئی سو برس حکومت کرنے کی وجہ سے ہالینڈ کا مسلمانوں کے ساتھ بڑا طویل واسطہ رہا ہے۔ لائیڈن یونیورسٹی کی ایسٹرن انسٹی ٹیوٹ میں اسلامی علوم کا عظیم الشان مرکز ہے لیکن اس کے باوجود ولندرینیوں کے دل مسلمانوں

کے خلاف تعصب اور بغض کے جذبات سے خالی نہیں۔ ہالینڈ میں ہر بچے کی پیدائش میونسپلی کے دفتر میں رجسٹر کرانی لازمی ہے۔ اس مقصد کے لیے جو فارم بھرنا پڑتا ہے۔ اس کے ایک خانے میں بچے کا مذہب بھی درج کرنا ہوتا ہے۔ کچھ والدین یہ خانہ خالی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ سن بلوغت کو پہنچ کر بچہ اپنی مرضی سے جو مذہب اس کا جی چاہے اختیار کرے۔ کئی میونسپلیوں میں مجھے ایسے فارم بھی نظر آئے، جن میں والدین نے مذہب کا خانہ خالی چھوڑ کر اس کے لیے اپنے ہاتھ سے یہ شرط لکھی ہوئی تھی: ”جو ان ہو کر اپنی پسند کا کوئی بھی مذہب اختیار کرنے کے لیے آزاد ہے، سوائے اسلام کے۔“

ایک روز میں آرنہم کے وسیع و عریض جنگل میں گھوم رہا تھا۔ تھک کر درختوں کے جنہد میں ایک نیچ پر بیٹھا تو قریب کے نیچ سے دھیمی دھیمی خوش الحان آواز میں سونہ رحمن کی تلاوت کی آواز آئی۔ ایک نہایت خوش پوشک، فرجخ کٹ سفید داڑھی والا ڈچ آنکھیں بند کئے جھوم جھوم کر سونہ رحمن کی قرات کر رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے انھ کر السلام علیکم کہا۔ اس نے وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ کہہ کر جواب دیا۔

”کیا آپ ڈچ مسلمان ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا نام عبداللہ ڈی ہو گ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میرا وطن پاکستان ہے، تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ اسلام کا تحفہ اسے کراچی میں نصیب ہوا تھا۔ وہ پہلے ڈچ نیوی میں اعلیٰ افسر تھا۔ وہاں سے قبل از وقت فراغت حاصل کر کے وہ مرچنٹ فلیٹ میں شامل ہو گیا اور ایک کارگو شپ کا کپتان بن گیا۔ یہ جہاز مشرقی بند رگاہوں اور یورپ کے درمیان سامان ڈھوتا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں ایک بار اس کا جہاز کراچی کی بند رگاہ پر کچھ سامان لدواںے کے لیے رکا۔ گرمی اور جس کا موسم تھا۔ سامان لادنے والے مزدور پیسے میں شرابور تھے۔ جہاز کے عملے نے انہیں ٹھنڈا پانی دیا تو سب نے پینے سے انکار کر دیا، کیونکہ ان کا رونہ تھا۔ ایک بوڑھے

مزدور پر ڈی ہوگ کو بڑا ترس آیا جو گرمی، جس اور سامان کے بوجھ تلے بدحال ہو رہا تھا۔ دوسروں کی نظر بچا کر وہ اس بڑھے کو اپنے کیبن میں لے گیا اور اسے ٹھنڈے جوس کا گلاس دے کر اشارے سے کہا کہ یہاں پر اسے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ وہ چکپے سے اسے پی لے۔ بوڑھے مزدور نے نفی میں سر ہلا کر جوس کا گلاس واپس کر دیا اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اللہ، اللہ کہتا ہوا کیبن سے باہر چلا گیا۔ ان دیکھے خدا کی ذات پر اس قدر مکمل، بے ابہام اور غیر متزلزل ایمان دیکھ کر ڈی ہوگ کا دل تو اسی وقت مسلمان ہو گیا تھا، لیکن اس کے دماغ نے یہ تبدیلی ایک برس کے بعد قبول کی۔ اس ایک برس کے دوران اس نے اپنے جماز کے عملے میں ڈچ زبان جانے والا ایک انڈونیشی مسلمان عالم بھرتی کر لیا۔ اس سے انہوں نے قرآن شریف پڑھا، حدیث سے واقفیت حاصل کی اور پھر قاہرہ کی ایک مسجد میں جا کر باقاعدہ اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ دو برس اور مرچنٹ فلیٹ میں رہا۔ لیکن اپنا اسلام خفیہ رکھا۔ اب ریٹائر ہونے کے بعد وہ آر نہم کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کی یہوی بھی مشرف ہے اسلام ہو چکی تھی، لیکن دو بیٹے جو ترک وطن کر کے آسٹریلیا میں آباد ہو گئے ہیں، اس نعمت سے محروم رہ گئے تھے۔

عبداللہ ڈی ہوگ صاحب نے اپنے ایک دوست کا ذکر بھی کیا، جو ہالینڈ کے ایک بڑے بینک میں اعلیٰ عمدے پر فائز تھے۔ وہ بھی کئی برس سے مسلمان ہو چکے ہیں۔ لیکن اپنی ملازمت کے دوران یہ راز افشا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے، کیونکہ اس سے اس کی ترقی کے امکانات ہی مسدود ہو نے کا خدشہ نہیں، بلکہ خود ملازمت بھی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔

یہ تعقبات صرف ہالینڈ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مغرب کے کئی اور معاشرے بھی اسلام کے متعلق اسی قسم کی تلگ نظری کا شکار ہیں۔ یہ معاشرے اپنی جگہ بڑے متمدن تعلیم یافتہ، آزاد خیال، متتحمل، روادار اور سیکور شمار ہوتے ہیں، لیکن اسلام کے سات

میں ان کی آزاد خیالی، بردباری اور سکولرزم بڑی حد تک سلب ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وہ زہر ہے جو مسیحی پادری اور یہودی مذہبی پیشوں صدیوں سے اسلام کے خلاف طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے پھیلاتے رہے ہیں۔ دوسری وجہ یورپین مستشرقین کا ایک خاص گروہ ہے، جس نے علم و دانش کے پروے میں اسلام اور مسلمانوں کے خدوخال منع کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کے گمراہ کن اقوال و افکار صرف دوسروں ہی کو اسلام سے بدظن نہیں کرتے، بلکہ احساس کمتری میں بنتا بعض مسلمانوں کے لیے بھی سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہالینڈ میں اس گروہ مستشرقین کی ایک واضح مثال پروفیسر سنوک ہر گوئین (prof.C. Snouch Hurgronje) ہے۔ یہ صاحب لائیڈن یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۸۳ء میں انہوں نے چھ ماہ جدہ میں گزارے اور پھر ایک فرضی اسلامی نام رکھ کر چھ ماہ کے لیے مکہ معظمہ چلے گئے۔ حدود حرم میں غیر مسلموں کا داخلہ منوع ہے، لیکن پروفیسر صاحب جعلی مسلمان کے بھیں میں وہاں رہے اور بلد الامیں میں مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت پر جرمن زبان میں دو جلدیوں کی ایک کتاب "Mekka" نایی لکھی۔ اس کے علاوہ وہ ڈچ زبان میں حج کے موضوع پر ایک کتاب "جشن مکہ" (Het Mekkansche Feest) کے عنوان سے بھی لکھے چکے ہیں، جو لوگ دھوکہ بازی اور فریب کاری کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی رسومات اور مسلمانوں کے حالات کا کھوچ لگانے لگتے ہوں۔ ان کے مقاصد میں خوش نہادی، خیر سگالی اور انصاف طلبی کی تلاش سعی لاحاصل ہے۔ یہ ایسی ہی تحریروں کا نتیجہ تھا کہ ایک عام ولندیزی کے ذہن میں مسلمانوں کا تصور حرم گشتگی، بے راہروی، بربریت اور بد معاملگی کے متراوف تھا۔

میونسپلیشیوں کے نظام کے مطالعہ کے سلسلے میں مجھے ہالینڈ کے چھوٹے چھوٹے شروں اور قصبوں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ ایک جگہ میری رہائش کا بندوست ایک ایسے خاندان میں ہوا، جس میں پانچ بیٹیاں اور چار لڑکے تھے۔ یہ خاصاً مذہبی گھرانہ تھا۔ پہلی شام جب ہم اکٹھے بیٹھے، تو سارے لڑکے اور لڑکیاں میرے گرد ہو گئے کہ بتاؤ پاکستان میں تمہاری

کتنی بیویاں، کتنی لوئیاں اور کتنے غلام ہیں۔ وہ بڑی دیر تک مجھ پر اسی موضوع پر جرح کرتے رہے۔ میرے جوابوں سے ماہیں ہو کر ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یا تو یہ شخص واقعی مسلمان نہیں، یا ہمارے ساتھ مصلحت جھوٹ بول رہا ہے!

اتوار کے روز سارے خاندان نے بائیسکلوں پر سوار ہو کر پک نک پر جانے کا پروگرام بنایا۔ گھر میں گیاہ بائیسکل موجود تھے۔ جو میاں یوی اور نوبچوں میں بٹ گئے۔ میرے لیے بارہواں بائیسکل کسی ہمائے سے عاریتاً مانگ لیا گیا۔ ہمارا قافلہ سائیکلوں پر سوار ہو کر باہر نکلا، تو چاروں طرف سڑکوں پر بائیسکل ہی بائیسکل نظر آئے۔ ہالینڈ کی سرنٹن اتنی ہمارہ ہے کہ بائیسکل کو یہاں پر قریباً قریباً قومی سواری ہونے کا درجہ حاصل ہے، بت سی سڑکوں پر بائیسکل چلانے والوں کے لیے الگ الگ راستے ہیں۔ کبھی کبھار ملکہ جولیانا بھی سائیکل پر سوار ہو کر شر میں نکل جاتی ہیں۔ ان کی شنزادیاں بھی بائیسکل چلانے کی شوقیں ہیں ہمارا قافلہ سولہ سترہ کلومیٹر سائیکلنگ کرنے کے بعد ایک خوبصورت پارک میں جا کر رکا۔ بھوک سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اب ہماری خاتون خانہ کوئی غبی تو شہ دان کھول کر ہماری لذت کام و دہن کا انتظام فرمائیں گی۔ لیکن اس خیال است و محال است و جنوں۔ اس کے بر عکس انہوں نے اپنا پرس کھولا اور پیپر منٹ سویٹ کی ایک ایک گولی تقسیم کر کے ہم سب کو ہدایت کی، ”اسے چباتا ملت۔ دھیرے دھیرے چونا۔ اس سے تمہارا سانس مصفا ہو جائے گا۔“

گولیاں چوس کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہم پارک میں فطرت سے ہم کلام رہے اور جب ہمارا دل شاد اور آنکھیں اچھی طرح آباد ہو گئیں، تو اسی طرح بھوکے پیاسے پھر بائیسکلوں پر سوار ہو کر رخت سفر باندھا۔ راستے میں ایک گاؤں سے گزر ہوا جمال بلا بارونق ہٹ لگا ہوا تھا۔ خوب گما گھمی تھی اور طرح طرح کا مال و اسباب بک رہا تھا۔ ایک دکان پر گمرا گرم مچھلی تلی جا رہی تھی۔ میں نے اس طرف ذرا لچائی ہوئی نظر میں سے دیکھا، تو میری میزبان نے بڑی مروت سے پوچھا۔ ”تمہیں تلی ہوئی مچھلی پسند ہے؟“

میں نے بڑے زور سے اثبات میں سر ہلاایا اور منہ میں سیروں پانی بھر کر انتظار میں کھڑا ہو گیا لیکن یہ مچھلی بھی پانی سے نہیں سراب سے کپڑی ہوئی تھی۔ اس عفیفہ نے پاؤ بھر مچھلی تکوا کر ایک موی کافند میں پیش اور اسے اپنے پرس میں حفاظت سے بند کر لیا۔ جب ہم واپس گھر پہنچے، تو ڈزر کا نام قریب تھا۔ خاتون خانہ نے تلی ہوئی مچھلی کو چورا کر کے ایک پیالہ میں ڈالا اور اس میں ٹماڑ کی چننی اور سرکہ ملا کر لئی بنا لی۔ اسے اس نے مکھن کی طرح بہت سے توسل پر لگا دیا۔ ساتھ ہی بھاپ دیتے ہوئے سوب کا بال دیا اور ابلے ہوئے آلوؤں کا ڈھیر کھانے کی میز پر آگیا اور دن بھر کی مشقت کے بعد ہم اتوار کے خصوصی ڈزر سے سرندھر ہو گئے۔ ایسے موقعوں کے لیے میں احتیاطاً بسکٹوں کے کچھ پکیت اپنے سوت کیس میں چھپا کر رکھا کرتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ بستر میں لیٹ کر رہی سمی کسر اپنے بسکٹوں سے پوری کر لوں گا، لیکن اس کا موقع بھی ہاتھ نہ آیا۔ کیونکہ دو بڑے لڑکے میرے کمرے میں سوتے تھے اور وہ دیر تک آج کے پک نک کے خوشنگوار پہلوؤں پر بڑی گرم جوشی سے تبرہ کرتے رہے۔

ایک اور قبیلے میں میرے میزان ایک ایسے صاحب تھے جنہیں پیدل سیر کرنے کا شوق تھا۔ چھٹی کے روز وہ مجھے ساتھ لے کر نکل جاتے تھے، اور سارا دن پاپیاہ گھماتے رہتے تھے۔ لنج کے وقت وہ اپنی جیب سے میٹھی ڈبل روٹی کے دو توں برآمد کرتے تھے۔ ایک توں وہ خود نوش فرمائیتے تھے۔ دوسرا مجھے عنایت ہوتا تھا۔ ان دونوں ان کے چھوٹے سے باغیچے میں صرف ایک ٹیولپ کا پھول باقی تھا۔ شام کے وقت وہ اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر گھنٹوں بڑے گیان دھیان سے اس پھول کا نظاہہ کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ فطرت کی نیرنگیوں میں خدا کی قدرت کا مشاہدہ کر رہے ہیں، لیکن فن باغبانی ان کا پیشہ تھا۔ اس لیے وہ پھولوں کی تجارت سے اپنے ملک کا زر مبادله بڑھانے کی سوچ میں غلطان و پیچاں رہتے تھے۔

ایک روز اتفاق سے میرا تعارف ایک ڈچ صوفی سے ہو گیا۔ اس کا ڈچ نام تو ایڈون

کینگ تھا، لیکن صوفی نام کرم دین تھا۔ یوں کا صوفی نام کلثوم تھا اور دو بچوں کے نام بھی نور دین اور شرف دین تھے۔ عام زندگی میں تو وہ اپنے اپنے ڈچ نام استعمال کرتے تھے، لیکن صوفی برادری کے جملہ ارکان باہمی میل جوں میں بڑی بے تکلفی سے اپنے دوسرے نام استعمال میں لاتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا آدھا نام ڈچ تھا، آدھا دوسرا۔ مثلاً شوکت خان ہاؤزن۔ منیزہ فولٹن۔ رحمت برکلے۔ بشیراں کیسنگ۔ ڈچ صوفیوں کے کئی جگہ اپنے مراکز ہیں، جنہیں صوفی چرچ (Sufi Kerk) کہا جاتا ہے۔ چرچ کا امتیازی نشان انسانی دل ہے، جس کے دونوں طرف پر لگے ہوئے ہیں۔ دل کے اندر چاند تارا بنتا ہوتا ہے۔

Witteveen ۱۹۶۳ء میں جب ہالینڈ میں سفیر بن کر گیا، تو وہاں کے وزیر خزانہ پروفیسر ون فین (International Monetary Fund) کے سربراہ بھی رہے۔ بھی صوفی تحریک سے وابستہ تھے۔ بعد ازاں وہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (International Monetary Fund) کے سربراہ بھی رہے۔

یورپ میں اس سلسلہ کے بانی صوفی عنایت خان تھے۔

## • یورپ کے صوفی

صوفی عنایت خاں ۱۸۸۲ء میں بڑوہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد رحمت خان پنجاب کے رہنے والے تھے۔ یہ موسیقاروں کا خاندان تھا اور ان کے اجداد میں شیخ جما شاہ ایک صاحب باطن بزرگ بھی گزرے تھے۔ رحمت خان خود بھی اچھے موسیقار تھے۔ خاص طور پر دھرمد راگ میں انہیں استاد مانا جاتا تھا۔

ایک بار اپنی سیر و سیاحت کے دوران استاد رحمت خان اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ پر حاضر ہوئے۔ سماع کی محفلیں برپا تھیں۔ استاد رحمت خان نے بھی بڑھ چڑھ کے اپنا کمال دکھایا۔ اس کے بعد وہ مزار کے پاس کھڑے ہو کر مراقب ہو گئے ”رفتہ رفتہ ان کا بدن سن ہو گیا۔ آنکھوں میں انہیرا چھا گیا۔ اور ان پر غنوگی چھا گئی۔ ساتھ ہی انہیں صاحب مزار کی زیارت ہوئی جن کا چہرہ پھولوں کی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ حضرت خواجہ نے دونوں ہاتھوں سے پھول ہٹا کر اپنا چہرہ بے نقاب کیا اور اشارے سے رحمت خان کو ایک راستے کا نشان بتایا جس پر چلتے چلتے وہ آخر کار بڑوہ پہنچ گئے۔“

ان دونوں بڑوہ میں استاد مولا بخش کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کا پہلا نام چولے گھیسن خاں تھا لیکن کسی مجدد کی ہدایت پر انہوں نے یہ نام بدل کر اپنا نام مولا بخش رکھ لیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے گائیکی گھرانے کے سربراہ تھے۔ بڑوہ کے مہاراجہ سیاجی راس گانگوڑ پر ان کا بڑا اثر تھا۔ مہاراجہ خود بھی موسیقی کے ریسا تھے اور استاد مولا بخش کی سرپرستی میں انہوں نے موسیقی کی اکیڈمی گیان شالہ کے نام سے کھول رکھی تھی۔ اس میں ہندوستانی موسیقی کے علاوہ مغربی موسیقی کے شعبے بھی موجود تھے۔

استاد مولا بخش کی بیوی ایک مسلمان شنزادی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے مسلمانوں پر مظالم کی قیامت ڈھانی تو دو وفادار ملازم اس شنزادی کو خفیہ

طور پر بڑوہ لے آئے۔ مولا بخش نے اسے اپنے پاس پناہ دی اور بعد ازاں اس کے ساتھ شادی کر لی۔ دونوں ملازم بھی تاحیات اسی گھر میں رہے، لیکن شنزادی کے حسب نب کے متعلق کبھی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اسکا رشتہ ٹپو سلطان کے خاندان سے ملتا تھا۔

جب استاد رحمت خاں بڑوہ پہنچے تو استاد مولا بخش نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی۔ کچھ عرصہ بعد یہ خاتون وفات پا گئی، تو استاد مولا بخش نے اپنی دوسری بیٹی کو رحمت خاں سے بیاہ دیا۔ صوفی عنایت خاں اسی بیوی کے بھن سے پیدا ہوئے۔

عنایت خاں نے گیان شالہ اکیڈمی میں راگ و دیا پر عبور حاصل کیا۔ مہاراجہ گانگیواڑ کی خواہش تھی کہ وہ مستقل طور پر ان کے دربار کے ساتھ وابستہ ہو جائیں، لیکن عنایت خاں کے دل میں جماںگردی کی دھن سائی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے دور دراز کے سفر کرنے لگے۔

سب سے پہلے وہ نیپال گئے۔ کھنڈو میں ان کی ملاقات ایک پنجابی بزرگ سے ہوئی جو وہاں کے رانوں اور مہارانوں کی تربیت پر لگے ہوئے تھے، اس بزرگ نے عنایت خاں کا تعارف ایک ہندو یوگی سے کرایا، جو سالما سال سے آنکھیں بند کئے پہاڑ کی کھوئی میں سماں ہی لگائے بیٹھا تھا۔ عنایت خاں صبح و شام اس غار میں جاتے اور یوگی کے سامنے بیٹھ کر دیر تک وینا بجاتے، ایک روز یوگی نے خوش ہو کر آنکھیں کھول دیں اور عنایت خاں کو ”ونا یک راجہ“ کا خطاب عطا کیا۔

نیپال سے عنایت خاں نے برماء اور سیلوں کا سفر کیا اور پھر گجرات، کالھیاوار، میسور، مدراہ، ملا بار کی سیاحت کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ میں انہوں نے مدرسہ کالج، پرینیڈنی کالج اور یونیورسٹی ہال میں کئی پیچھر دیئے، جن میں سے کچھ کی صدارت رابندرناٹھ ٹیگور نے بھی کی۔ کلکتہ سے آپ ڈھاکہ آئے، جمال نواب ڈھاکہ نے احسن منزل میں محفلیں منعقد کر کے ان کا تعارف سہل کیا اور آسام کے مشاہیر سے کرایا۔ مہاراجہ وینا

پور عنایت خاں کی موسیقی پر خاص طور سے عاشق تھے اور اس فن میں انہیں اپنا گرو تسلیم کرتے تھے۔

اسی دوران میں عنایت خاں حیدر آباد دکن پہنچے اور میر محبوب علی خاں کے دربار میں بایاب ہوئے۔ نظام تصوف اور موسیقی کے دلداہ تھے اور رفتہ رفتہ دونوں میں خوب گاڑھی چھٹنے لگی۔ دربار عام کے علاوہ عنایت خاں کو نظام کی خاص مجلسوں اور نجی محفلوں میں بھی عمل دخل حاصل تھا۔ میر محبوب علی کے اصرار پر عنایت خاں اس بات پر رضا مند ہو گئے کہ وہ حیدر آباد میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لیں۔ لیکن کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

حیدر آباد میں عنایت خاں کی ملاقات چشتیہ سلسلہ کے ایک بزرگ سید محمد ابو ہاشم منی سے ہوئی۔ سید صاحب نے عنایت خاں کو راہ سلوک کے پیچ و خم سے آشنا کیا۔ اس راستے میں مجہدے کے ریگزار بھی تھے، اور مشاہدے کے گل و گلزار بھی۔ سفر کی دشوار گزار گھائیاں بھی تھیں اور منزل مقصود کے پراسرار سنگ میل بھی، عنایت خاں نے سید ابو ہاشم منی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور مرشد کی رہنمائی میں وہ اپنے گلے کا نور برستا، وینا بجا تے، اس نئے راستے پر چلتے گئے، چلتے گئے، حتیٰ کہ ان کے اپنے الفاظ میں ”ایک ایسی منزل آگئی جہاں پر میرا جسم وینا کا ساز بن گیا۔ میری روح وینا کے تار بن گئی اور میری زندگی ایک سرمدی راگ بن گئی۔ اس مقام پر پہنچ کر میں نے اپنے فن کا سارا اثاثہ اس انلی اور ابدی موسیقار کے سپرد کر دیا جو کائنات کے سرگم پر ہر لمحہ آفاتی تائیں اڑانے میں مصروف ہے۔“

جب عنایت خاں کی موسیقی میں معرفت کا رنگ اچھی طرح رچ گیا، تو ان کے مرشد سید ابو ہاشم منی نے حکم دیا کہ اب وہ مغربی ممالک میں چلے جائیں، اور اپنے فن کے ذریعہ روحانیت کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں۔

عنایت خاں نے مرشد کے حکم پر سر تسلیم خم کیا اور ۳ ستمبر ۱۹۱۰ء کو امریکہ روانہ

ہو گئے۔ ان کے ایک حقیقی اور ایک پچا زاد بھائی بھی ساتھ تھے۔ اس وقت ان تینوں کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی۔

نیویارک پنج کر عنايت خان نے اپنا پہلا لیکھر گولبیا یونیورسٹی میں دیا۔ اس کے بعد وہ بہت سے دوسرے شرکوں اور اداروں میں اپنی محفلیں منعقد کرتے رہے۔ ان کے مذاہوں میں سانتا روازا کے فن با غبانی کے ماہر لو تھر بونبیک بھی شامل تھے۔ وہ تھوہر کے پودے کو کانٹوں کے بغیر پیدا کرنے کا تجربہ کر رہے تھے۔ بے خار حیات عنايت خان کا نصب العین تھا، اور بے خار نباتات لو تھر بونبیک کا۔ یہی ان کی دوستی کی قدر مشترک بن گئی۔

امریکہ میں دو برس گزارنے کے بعد عنايت خان اپنے بھائیوں سمیت انگلستان آ گئے یہاں سے وہ روس گئے۔ ماسکو میں ٹالشائی کا بیٹا کاؤنٹ سرجے ٹالشائی عنايت خان کا مداح بن گیا۔ اس نے انہیں بہت سے روی موسیقیاروں سے متعارف کرایا اور ماسکو کے علاوہ دوسرے کئی شرکوں میں ان کے فنی شو منعقد کرانے میں مدد دی۔ کاؤنٹ ٹالشائی ہی کی کوشش سے عنايت خان کی کتاب (A Sufi Message of Spiritual Liberty) کا روی زبان میں ترجمہ ہو کر ماسکو میں شائع ہوا۔

ایک روایت کے مطابق صوفی عنايت خان کے ملاقات زار روس سے بھی ہوئی تھی۔ اس ملاقات کا بندوبست راسپوچن نے انتہائی خفیہ طور پر کرایا تھا۔ ملاقات کے دوران راسپوچن کے علاوہ اور کوئی شخص وہاں پر موجود نہ تھا۔ اس ملاقات کی پوری تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکیں۔

ماسکو میں عنايت خان کا ایک مداح بے بیگ تھا۔ بے بیگ تماڑیوں کا سردار تھا اور امیر بخارا کی جانب سے زار روس کے دببار میں سفیر کے عمدے پر مامور تھا۔ بے بیگ نے بہت کوشش کی کہ عنايت خان بخارا کا دوہ بھی کریں، لیکن انہی دنوں پہلی جنگ عظیم سر پر آ گئی اور عنايت خان انگلستان واپس لوٹ آئے۔

جنگ کے پانچ سال عنايت خان نے انگلستان میں بسر کئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے ”صوفی

تحریک" کی منظم طور پر بنیاد ڈالی اور لندن میں ایک اشاعتی ادارہ "صوفی پیلشنگ سوسائٹی" کے نام سے قائم کیا۔

جنگ کے بعد انہوں نے یورپ کے چھے چھے کا دورہ کیا۔ ہر جگہ مریدوں کی خاصی تعداد ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے صوفی تینظیم میں داخل ہونے لگی۔ اب وہ موسیقار عنایت خان کی جگہ مرشد عنایت خان کہلانے لگے اور چار پانچ سال کے اندر اندر یورپ کے بہت سے ملکوں میں صوفی تحریک کے سفر قائم ہو گئے۔ خاص طور پر ہالینڈ، سویٹزر لینڈ، فرانس، جرمنی، اٹلی، آسٹریا، سویڈن، ناروے، ڈنمارک اور انگلستان کے بہت سے شروع میں ان کی شاخیں بڑی سرگرمی سے چلنے لگیں۔ امریکہ اور جنوبی افریقہ میں بھی اس کے کئی سفر قائم ہو گئے۔

اپنی تحریک کو اس طرح دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتے دیکھ کر عنایت خان نے جنیوا میں اپنی تحریک کا بین الاقوامی مرکز (Headquarters of the Sufi Movement) کے نام سے قائم کر دیا۔ اس کی ایک براخچ پیرس میں کھولی جہاں اب انہوں نے اپنا مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ یہاں پر ان کی رہائش گاہ کا نام "فضل منزل" تھا۔ بین الاقوامی ہیڈ کوارٹر کی دوسری براخچ ہیگ کے قریب (Katwijk) کے مقام پر تھی۔ اس کا نام "مراد حاصل" تھا۔ یہاں پر اب "مراد حاصل فاؤنڈیشن" قائم ہے۔

۱۹۶۶ء میں عنایت خان کو ہندوستان چھوڑے سولہ برس ہو چکے تھے۔ یورپ میں ان کی صوفی تحریک اپنے نکتہ عروج پر تھی کہ یکاکیں ان کے دل میں خاک وطن کی کشش نے زور مارا، اور نومبر کے مہینے میں وہ ہندوستان روانہ ہو گئے۔ ان کی یورپیں سیکرٹری قسمت شام ان کے ہمراہ تھی۔ پیرس میں ان کے حلقوں گوشوں کی کثیر تعداد نے ان کو الوداع کہا اور دوسرے شروع میں ان کے بہت سے اور مرید اپنے مرشد کی واپسی کے انتظار میں بیٹھے گئے۔

ہندوستان پہنچ کر صوفی عنایت خاں نے دلی اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں میں پیکھر دیئے اور بنا رہ، آگہ، جے پور اور بڑودہ کا دوہہ بھی کیا۔ انہوں نے لوگوں کو مغرب میں اپنے مشن کی کامیابیوں سے آگاہ کیا، لیکن یہاں پر ان کے مسلک کو کسی قسم کی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ یہاں پر ان کو فقط ایک یا دو مرید نصیب ہوتے۔ ان میں سے ایک مزر شاستری تھی جو ایک ہندو ڈاکٹر کی امریکین بیوی تھی۔ اپنی اس ناکامی سے مايوس ہو کر انہوں نے یورپ واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ اجیر شریف گئے۔ دسمبر کی سردی کے ایام تھے۔ صوفی عنایت خاں کئی رات متواتر محفل سماع میں شریک ہوتے رہے۔ اس کڑاکے کی سردی میں ساری ساری رات ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر بیٹھنے کی وجہ سے انہیں نمونیہ ہو گیا۔ دلی واپس آ کر وہ کئی ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں نے بھی ان کے علاج معالجہ میں حصہ لیا۔ ۲

فروری ۱۹۲۷ء کی رات کو صوفی عنایت خاں بے ہوش ہو گئے۔ مس قمت شام جو ان کے ساتھ یورپ سے آئی تھی۔ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی کہ اس کا مرشد قریب المرگ ہے وہ یہی سمجھتی رہی کہ مرشد مراقبہ میں غرق ہو کر سماودھی میں گیا ہوا ہے۔ وہ کئی گھنٹے مرشد کی چاپائی کے ساتھ گھنٹے ٹیک کر نہیں پر بیٹھی رہی۔ صبح کے آٹھ بج کر بیس منٹ پر دو ڈاکٹروں اور مزر شاستری نے بڑی مشکل سے اسے یقین دلایا۔ مرشد اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ صوفی عنایت خاں کو خواجہ نظام الدین کی درگاہ کے قریب دفن کر دیا گیا۔

صوفی عنایت خاں کی وفات کے بعد ان کے سلسلہ کو ان کے بھائیوں محبوب خاں محمد علی خاں اور مشرف خاں نے چلایا۔ عنایت خاں کی بیوی ایک امریکین خاتون امینہ بیگم تھیں۔ ان کے بطن سے کئی بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں، لیکن صوفی تحریک کی جائشیں ان میں سے کسی نے نہ سنبھالی۔ ان کی ایک بیٹی نے البتہ ایک دوسرے میدان میں بڑا نام پیدا کیا اس کا نام نور النساء عنایت خاں عرف ”بابلی“ تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جب

جرمن افواج نے فرانس پر قبضہ کیا، تو نورالنساء پیرس میں مقیم تھی۔ اس نے ”میڈیلین“ کا کوڈ نام اختیار کر کے لندن میں اتحادی فوجوں کے ہیڈکوارٹر کو خفیہ پیغامات سمجھنے کا فریضہ سنپھال لیا۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک وارلیس سیٹ استعمال کرتی تھی۔ یہ کام اس نے بڑی جانشینی اور دلیری سے سرانجام دیا۔ جنگ کے دوران ایک ایسا وقت بھی آیا جب لندن میں اتحادی ملٹری ہیڈکوارٹر کا فرانس کے ساتھ واحد رابطہ نورالنساء عنایت خان عرف ”میڈیلین“ کی ذات کے ذریعہ قائم تھا۔ لیکن پھر کسی نے دعا دے کر اس کا راز فاش کر دیا اور جرمن فوجوں نے اسے گرفتار کر کے گولی سے اڑا دیا، ہتلر کی شکست کے بعد جب جزل ڈیگال نے فرانس کی حکومت سنپھالی، تو نورالنساء عنایت خان کو بعد از موت فرانس اور برطانیہ نے بہادری کے نہایت اعلیٰ اعزازات سے نوازا۔ ان اعزازات کی نقول اس باب کے آخر میں مسلک ہیں۔

عنایت خان کے مرشد سید محمد ابوہاشم مدفنی نے انہیں اسلامی تصوف کے رموز سے آشنا کیا تھا اور رشد و ہدایت کے اسی طریق کو مغربی ممالک میں پھیلانے کی تلقین کی تھی، لیکن امریکہ اور یورپ پہنچ کر انہوں نے وہاں کے ماحول کے ساتھ سمجھوتا کر لیا۔ وہاں کے لوگوں کو اس سلسلہ میں داخل کرنے کی بجائے انہوں نے اپنے سلسلہ کو ہی مغربی مزاج کے ساتھ میں ڈھال لیا۔ چنانچہ اسلام کی تبلیغ کرنے کی بجائے ان کا مسلک تھیوسوفیکل سوسائٹی کی طرز پر مختلف مذاہب کا ایک مجموعہ اخلاقیات سا بن کر رہ گیا۔ اس مسلک میں اسلام سمیت دنیا کے سب مذاہب یکساں درجہ رکھتے ہیں۔ کسی ایک مذہب کو دوسرے پر فوکیت حاصل نہیں۔ اسی طرح ”صوفی“ یا ”مرید“ بننے کے لیے بھی کسی خاص مذہبی عقیدے کی ضرورت نہیں مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں اور زرتشتیوں کے علاوہ ہندو، بت پرست، مشرک اور ملحد بھی یکساں طور پر اس سلسلہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس مسلک میں کتاب فطرت انسان کا واحد مقدس صحیفہ ہے اور عالمگیر انسان کا واحد مشترکہ مذہب ہے۔ عبادت کو بین الاقوامی اتحاد کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں اور اس مقصد کے لیے اس تحریک میں ”عالمگیر عبادت“ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

"عالیگیر عبادت" میں حصہ لینے والے ایک بند کمرے میں قطار در قطار بیٹھ جاتے ہیں۔ سامنے ایک کشاہ میز کے عین وسط میں ایک بڑی موم بیتی روشن کی جاتی ہے جو علامتی طور پر خدائے واحد کا نشان ہوتی ہے جو ساری روشنی اور علم کا منبع و ماوئی ہے۔ اس موم بیتی سے نیچے کی سطح پر چھپی موم بیتوں کی قطار ہوتی ہے جو علی الترتیب ہندو مت، بدھ مت، زرتشتیت، یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہر موم بیتی کے سامنے اس مذہب کا صحیفہ بھی رکھا ہوتا ہے۔ عالیگیر عبادت کے اس مجمع کو (Church For All) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

اس قسم کی اجتماعی عبادت کے علاوہ مریدوں کا مرشد کے ساتھ اپنا اپنا ذاتی رشتہ بھی قائم ہوتا ہے جس میں انہیں الگ الگ ذکر و اذکار کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم صیغہ راز میں رکھی جاتی ہے جو مرید ترقی کرتے جاتے ہیں، ان کو حسب مراتب حاجز اور نور زادی، شنزادہ شنزادی، سراج، چراغ وغیرہ کے خطاب دیئے جاتے ہیں، خاص خاص اجازت یافتہ مرید وقتہ ذکر کا حلقہ بھی قائم کرتے ہیں۔ یہ حلقوں کی انتہائی خفیہ طور پر قائم کئے جاتے ہیں۔

اس تحریک کا اسلام اور اسلامی تصوف کے ساتھ صرف اتنا تعلق ہے کہ اس میں بہت سی عربی اور فارسی کی اصطلاحات بڑی روانی سے استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً ذکر، اسم اعظم، پیر و مرشد، شیخ المشائخ، بیعت، مراد حاصل، دربار، بھرت، ولادت، وصالت، تبروک، رحمت، فضل وغیرہ۔ اس ظاہری تعلق کے علاوہ اس تحریک کا اسلام اور اسلامی تصوف کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں، اسلام میں طریقت کے لیے لازم ہے کہ وہ شریعت کی پابند ہو اس لحاظ سے عنایت خان کے مشن کو تصوف کا نام دینا ہی اس اصطلاح کا غلط استعمال ہے۔

ہالینڈ میں اس تحریک کے آخری مسلمان سربراہ صوفی عنایت خان کے چھوٹے بھائی مشرف مولا میاں خان تھے۔ ۱۹۶۳ء میں جب میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ہیگ میں معین تھا تو مشرف خان صاحب سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں، ان کی بیگم ایک ڈچ

خاتون تھیں، جن کو صوفی تحریک کی طرف سے "شزادی" کا خطاب ملا ہوا تھا۔ وہ اپنے میاں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں اور ان کی زندگی میں ہی تحریک پر اپنا سلط جما رہی تھیں۔

URDU4U.COM

ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک روز صوفی مشرف خاں نے بڑے دکھ سے کہا کہ ان کی وفات کے بعد یہ تحریک مکمل طور پر یورپیں لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور پھر رفتہ رفتہ اسلام کے ساتھ اس کا جو تھوڑا بہت اصطلاحی سا رابطہ ہے، وہ بھی ختم ہونا شروع ہو جائے گا۔ صوفی مشرف خاں کی وفات کو چند برس گزر چکے ہیں اور جس خدشہ کا انہوں نے اظہار کیا تھا وہ بھی آہستہ آہستہ اپنا رنگ لا رہا ہے۔

صوفی مشرف مولا میاں خاں بڑے سادہ طبیعت مرجح انسان تھے۔ ڈچ زبان روائی سے بولتے تھے۔ کسی قدر انگریزی سے بھی شناسا تھے۔ اردو بول تو لیتے تھے، لیکن پڑھنے میں وقت پیش آتی تھی۔ ایک روز میں ان کے ہاں بیٹھا تھا، تو انہوں نے کچھ "عارفانہ" کلام سنانے کی پیش کش کی۔ پیانو پر پہلے انہوں نے غالب کی اس غزل کے کچھ اشعار گائے:

ابن مریم ہوا کرے کوئی  
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس کے بعد انہوں نے اقبال کی یہ غزل سنائی:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی  
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

اس غزل کا ایک شعر ہے:

کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ  
کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی

اس شعر کو گاتے وقت وہ "موسیٰ" کو لگاتار "موسیٰ" ہی پڑھتے گئے۔ ان دو غزلوں کو وہ "غارفانہ کلام" غالباً اس وجہ سے سمجھتے تھے کہ ایک میں ابن مریم اور دوسرے میں موسیٰ کا نام آتا تھا۔

ڈچ مرید صوفی مشرف خاں کو "حضرت پیر و مرشد" کے لقب سے مخاطب کرتے تھے وہ خود بھی اپنے آپ کو مرشد مشرف خاں کے نام سے متعارف کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنی تصنیف (Pages in the Life of a Sufi) (مجھے تحفہ) دی۔ اسے انہوں نے ایک انگریز خاتون مس مارگٹ سکنر کے تعاون سے لکھا تھا۔ میری درخواست پر انہوں نے اس پر انگریزی میں جو آٹو گراف یا وہ یہ تھا: (Murshid Musharaff Khan) ان کے مریدوں میں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں وہ خاص طور پر ہر دلعزیز تھے۔ غالباً اسکی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ کسی مرید سے کسی بات پر کسی قسم کا اختلاف رائے نہ کرتے تھے! ان کا سر ہمیشہ اثبات میں چلتا تھا۔ میں نے کبھی ان کا سر دائیں سے باسیں اور باسیں سے دائیں جانب ملتے نہیں دیکھا! ان سب باتوں کے باوجود ہالینڈ کے وزیر خزانہ پروفیسر Wiueyeen پر ان کا بڑا اثر تھا اور وہ بہت سے ذاتی اور سیاسی معاملات میں استخانہ کروانے صوفی مشرف خاں کے پاس آیا کرتے تھے۔

ہتلر کی شکست کے بعد فرانس کے صدر جزل ڈیگال نے نورالنساء عنایت خاں کو بہادری کا ایک بہت بڑا اعزاز بعد از موت عطا کیا۔ اس اعزاز کا نام یہ تھا:

(The Croix de Guerre with Gold Star)  
اسی طرح برطانیہ کے بادشاہ نے بھی اسے بعد از موت "جارج کراس" کے بیش بہا سے نوازا۔

## • تو ابھی راہگذر میں ہے

جون کا مہینہ ختم ہوتے ہی انٹرنیشنل انٹریٹیوٹ آف سوشنل سائنسز میں میرا کورس پورا ہو گیا۔ وطن کو واپس لوئے سے پہلے میں نے حج کی نیت کر لی۔ اس سال حج کا دن اگست کے مہینے میں پڑتا تھا۔

سفر حج کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک روز میں ہیگ میں امریکن ایکسپریس کے دفتر گیا۔ ہالینڈ کے دارالخلافہ میں سفری انتظامات کرنے والے جتنے ادارے تھے، ان میں امریکن ایکسپریس کا نام سب سے زیادہ وسیع اور قابل اعتماد شمار ہوتا تھا۔ یہاں ہر وقت ایسے سیاحوں کا تانٹا بندھا رہتا تھا جو کم سے کم وقت میں لبے سے لمبا سفر کرنے کے خواہش مند تھے۔ یہ سفر عموماً دنیا کی جانی پچھانی شاہراہوں پر ہوتے تھے اور سیاحوں کے سنگھائے میں نیویارک، لندن، پیرس، جنیوا، روم، بیروت، قاہرہ، ہانگ کانگ، ٹوکیو، جیسے شروں میں ہوتے تھے۔ اس قسم کا سفر کتنا ہی طویل اور پیچیدہ کیوں نہ ہو، امریکن ایکسپریس کے بحری، بری، اور ہوائی شعبوں کے ماہر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پوری تفصیلات تیار کر دیتے تھے..... ریل اور جماز کے لکٹ، چلنے اور ٹھہرنا کے اوقات نامے، ہوٹلوں کے پتے اور کرائے۔ مختلف شروں میں قابل دید مقامات کی فرست، رقص گاہوں اور نائٹ کلبوں کے ٹیلی فون نمبر.....

امریکن ایکسپریس کے ہال میں پہنچ کر سب سے پہلے میرا سامنا انکواری آفس کی ایک لڑکی سے ہوا اس نے خالص ڈچ انداز میں اپنی گردن کو لوچ دے کر امریکن لبھ میں میرا استقبال کیا۔ ”گڈمارنگ سر میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“ ”شکریہ۔“ میں نے کہا۔ ”میں سعودی عرب جانا چاہتا ہوں۔ اس سفر کے متعلق معلومات حاصل کرنے یہاں حاضر ہوا ہوں۔“

”ساعو عودی عیرے بیا..... ساعو عو عودی عیرے بی..... بی..... یا...“

لڑکی نے کئی بار زیر لب گنگنالیا اور پھر امریکن انداز میں اپنے شانے سکیر کر میری طرف یوں حرمت سے دیکھنے لگی جیسے میں نے اس سے کوئی عجیب و غریب سوال پوچھ لیا ہو۔

URDU4U.COM

کچھ دیر اور گنگنالنے اور کندھوں کو نیم بیضوی جنبشیں دینے کے بعد وہ بادل خواستہ انھی اور مجھے اپنے ہوائی شعبے کے ماہر کے پاس لے گئی سعودی عرب کا نام سن کر ہوائی شعبے کے ماہر نے بھی مجھے کن انگلیوں سے گھورا اور پھر نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے بھری شعبے کے ماہر کے حوالے کر دیا۔ بھری شعبے والے نے مجھے بری شعبے میں بھیج دیا اور بری شعبے کا ماہر کچھ دیر اپنا سر کھجلانے کے بعد مجھے اپنے مینجر کے پاس لے گیا۔

سعودی عرب کا نام سن کر مینجر بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے اس نے اپنے میز کی دراز سے ایک ضخیم اٹلس نکال کر اس میں مشرق وسطی کے نقشوں کا مطالعہ کیا۔ پھر اٹھ کر وہ سامنے دیوار پر لگے ہوئے چارٹ کا جائزہ لینے لگا، جس میں ساری دنیا کے ہوائی، بھری اور بری راستوں کے مفصل خاکے بنے ہوئے تھے۔ میں نے جدہ، مکہ اور مدینہ پر انگلی رکھ کر مینجر سے کہا کہ اگر میں ان تینوں شرروں میں سے کسی ایک جگہ بھی پہنچ جاؤں تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔

مینجر نے اپنی میز سے سرخ جھنڈیوں والے تین پن اٹھا کر ان مقامات پر نشاندہی کے طور پر لگا دیئے۔

دنیا میں مشرق سے مغرب اور شمال اور جنوب تک ہر قسم کے سفری راستوں کے بے شمار جال بچھے ہوئے تھے، لیکن اس زمانے میں یہ شاہراہیں بغداد اور تران، دمشق اور بیروت، قاہرہ اور پورٹ سعید سے ہوتی ہوئیں سیدھی آگے یا پیچھے، دائیں یا بائیں ہو کر نکل جاتی تھیں اور ان کے درمیان حجاز کی مقدس سر نہیں الگ تھاگ پڑی ہے جاتی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک ابھی سعودی عرب میں دولت دنیا کی ریل پیل شروع نہیں ہوئی تھی، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے نام مسلمانوں کے دل پر تو بے شک خوب نقش تھے۔

لیکن کسی بین الاقوامی سفری گائیڈ میں ان کا ذکر تک نہ آتا تھا۔۔۔ حالانکہ ہر سال دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں مسلمان قافلہ در قافلہ اس ارض مقدس کا سفر اختیار کرتے رہے ہیں۔۔۔ پیدل، اونٹوں پر، موڑوں پر، ٹیلوں پر، کشتیوں میں، ہوائی جہازوں کے ذریعہ۔۔۔ روئے نہیں پر اور کوئی ایسا مقام نہیں جہاں اتنی رنگتوں اور نسلوں اور قومیتوں کے انسان بیک وقت اس قدر تعداد میں جمع ہوتے ہوں۔

”مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہے۔“ امریکن ایکپریس کے مینجر نے نقشوں کا سرسری سا جائزہ ختم کر کے کہا۔ ”لیکن اگر مجھے دو روز کا وقت دیں تو شاید میں آپ کو اس سفر کے متعلق کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔“

دو روز کے بعد جب میں دوبارہ امریکن ایکپریس کے دفتر میں گیا تو مینجر کے سامنے بہت سے سفری گائیڈز کا انبار لگا ہوا تھا، لیکن اس ساری کاؤش کا عملی نتیجہ فقط اس قدر تھا کہ یورپ کا یہ وسیع اور ماہر سفری اداہ اس بات میں میری مدد کرنے سے قاصر تھا کہ میں قاہرہ یا بیروت یا بغداد سے جده یا مکہ یا مدینہ پہنچنے کے لیے سفر کا کون سا طریقہ اختیار کروں۔

”اس سلسلے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔“ مینجر نے معدتر تانہ انداز سے کہا۔ ”ہاں، جج کے زمانہ میں کتنی حکومتیں اپنے اپنے حاجیوں کے لیے ہوائی جہازوں، سمندری جہازوں اور خشکی کے قافلوں کا خاص انتظام کرتی ہیں۔ یہ انتظام ہر جگہ سرکاری طور پر ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔“

برسیل تذکرہ مینجر نے مجھے ایک اور مشورہ بھی دیا۔ ”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس موسم میں سعودی عرب کا سفر صحت کے لیے خطرات سے خالی نہیں۔ گرمیوں میں وہاں کا درجہ حرارت ۱۲۵ ڈگری سے بھی اوپر پہنچ جاتا ہے۔ یوں بھی اس ملک میں حفظان صحت کا کوئی بندوقست نہیں۔ اگر کسی وجہ سے آپ اپنا ارادہ بدلنے والے ہوں، تو حسن اتفاق سے میرے پاس کیپری کی ایک بکنگ خالی ہے۔ کیپری سے تو آپ ضرور واقف ہوں گے“ نیلے نیلے بھیرہ روم کے درمیان وہ خوشنا جزیرہ

جمال چکیلی دھوپ ہے۔ خوبصورت سیر گاہیں ہیں۔ اطالیہ کے انگوروں کی بہترین شراب ہے۔ مصر کا سابق شاہ فاروق ہے۔ دراصل کیپری آج کل دنیا بھر کے سیاحوں کا مکہ ہے اگر آپ زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں، تو میری رائے میں کیپری ضرور جائیے۔“  
میں نے مینجھر کا شکریہ ادا کیا اور دل ہی دل میں یہ شعر گنگتا ہوا وہاں سے اٹھ آیا۔

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی  
میں موت ڈھونڈتا ہوں نہیں جہاز میں

اس سفر کے متعلق بیروت، دمشق اور بغداد سے بھی سفارت خانوں، سفری ایجنسیوں اور مقامی دوستوں کی وساطت سے جو خبریں موصول ہوئیں، وہ بڑی مایوس کن تھیں۔ وہاں قاہرہ سے البتہ امید کی ایک مدد ہی کرن ضرور جعلملائی۔ مصر کی انقلابی حکومت نے اعلان کر رکھا تھا کہ حج سے ایک ماہ پہلے ہر تیرے روز بھری اور ہوائی جہاز مصر سے جہاز جایا کریں گے۔ یہ جہاز مصری حاجیوں کے لیے مخصوص تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان جہازوں میں ایک پاکستانی مسافر کیلئے بھی جگہ نہیں سکے گی یا نہیں۔ بہر حال یہ خبر اس لحاظ سے اطمینان بخش تھی کہ آخر ایک راہ تو ایسی نظر آئی جس کے لیے انسان کچھ دوڑ دھوپ کر سکتا ہے۔ باقی سب راہیں یا تو مسدود تھیں یا ان پر لاعلمی کے کراਬے چھائے ہوئے تھے۔

جب میں نے مصر والی خبر اپنے ایک لبنانی دوست مصطفیٰ الخیری کو سنائی تو اس نے مایوسانہ انداز سے سر ہلایا۔ ”تم جا کر کوشش کر دیکھو۔ مجھے بالکل امید نہیں کہ تمہیں کامیابی

اور چھر امریکن ایکپریس کے مینجھر کی طرح مصطفیٰ الخیری نے بھی مجھے ایک مشورہ دیا۔ ”اگر قاہرہ پہنچ کر بھی تم ناکام رہو، تو سیدھے بیروت پلے آنا، وہاں میرے بہت سے دوست احباب ہیں۔ وہ تمہیں خوب سیر کرائیں گے۔ بیروت مشرق وسطی کا پیرس ہے۔

وہاں کے نائٹ کلب یورپ کی نشاط گاہوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آج کل سمیعہ جمال بھی وہاں آئی ہوئی ہے۔ وہ مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقصہ تھی۔“

URDU4U.COM  
مصر کے سابق شاہ فاروق کے ساتھ اب مجھے ایک قسم کی ذاتی رنچ پیدا ہونے لگی تھی۔  
جائز کے لیے میں جو راستہ بھی نکالتا تھا۔ اس پر وہ الف لیلی کے جادوگر بادشاہوں کی طرح کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہو کے رہتا تھا۔ کیپری میں وہ نفس نفیس موجود تھا۔ بیروت میں اس کی محبوب رقصہ تھی۔

برسلز، پیرس، جنیوا، برلن، لوزان، لوگانو، میلان، فلورنس، وینس، روم۔۔۔۔۔ روم میں اشراق احمد وہاں کی یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا تھا اور ریڈیو روم میں اردو کا پروگرام بھی کرتا تھا۔ جس وقت میں روم پہنچا، ان دونوں ریڈیو روم میں اشراق احمد کی جواب طلبی ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان کا ایک جنگی بیڑا یورپ کی کچھ بندوگاہوں کا خیر سگالی دوہرہ کر رہا تھا۔ ریڈیو کے اردو پروگرام میں اس دورے کی خبر کو نشر کرتے وقت اشراق احمد جنگی بیڑے کو ہندوستان کا جنگی بیڑا کہہ دیتا تھا اور پھر معافی مانگ کر صحیح تلفظ ادا کرتا تھا اس پر ہندوستانی سفارت خانہ نے بڑا شور مچایا کہ یہ شخص جنگی بیڑے کو جان بوجھ کر جنگی بیڑا کہہ کر بھارت ماتا کی توہین کر رہا ہے۔ اب اشراق احمد اردو املاء میں بیڑے اور بیڑے کی باہمی ممائش اجاگر کر کے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ پروفیسر الیگزنڈر باوسانی اس مقدمے میں اس کی مدد فرماء رہے تھے۔

روم میں ایک کئی منزلہ عمارت میں اشراق احمد کے پاس ایک کمرہ تھا۔ اس نے میرا سوت کیس اپنے کمرے میں رکھتے ہی پوچھا۔ ”لی پو گے؟“

روم میں لی؟ نیکی میں پوچھ پوچھ کیا۔ میں نے فوراً حامی بھر لی۔ اشراق مجھے بازار میں ایک اطالوی کی دکان پر لے گیا جو دودھ، دہی، مکھن، کریم اور پنیر بیچتا تھا۔ اس نے دکان میں داخل ہوتے ہی دکاندار کو ”چاچا“ کہہ کر پنجابی کی ایک نجاشی گالی دی۔ دکاندار نے بھی پے در پے دو تین پنجابی گالیاں دے کر اسے خوش آمید کیا۔ اس کے بعد

اشفاق احمد نے میرا تعارف کرایا۔ دکاندار نے پنجابی زبان میں چند گالیاں دے کر میرے ساتھ اپنی خیر سگالی کا اظہار کیا اور ہمیں نہایت لنیز نمکین لسی بنا کر پلائی۔

URDU4U.COM

ان دونوں اشفاق کے پاس ایک سکوڑ ہوتا تھا۔ اس پر بٹھا گر اس نے مجھے روم دکھانے کا پروگرام بنایا۔ ہم تھوڑی سی دور ہی گئے تھے کہ اشفاق نے پوچھا۔ ”ہمیں سکوڑ پر بیٹھ کر روانہ ہوئے تین منٹ ہو گئے؟“  
”ہاں‘ ہو گئے“ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

”تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ ہم خیریت سے ہیں۔“ اشفاق نے کہا۔ ”روم کی سڑکوں پر ہر تین منٹ میں ٹریفک کا ایک حادثہ ہوتا ہے۔“

نصف گھنٹہ کے بعد اشفاق نے پھر مجھے کلمہ شکر پڑھنے کی تلقین کی، کیونکہ روم میں ہر تیس منٹ کے بعد جو حادثہ ہوتا تھا وہ ملک ثابت ہوتا ہے۔ یوں بھی سکوڑ چلاتے چلاتے ہاتھ چھوڑ کر جس طرح اشفاق احمد مجھے روم کے قابل دید مقامات کی نیارت کرا رہا تھا، اس سے یہ امر یقینی تھا کہ ہم کسی وقت بھی ٹریفک کے حادثات کے اعداد و شمار میں اضافے کا باعث بن جائیں گے۔ چنانچہ میں نے سکوڑ پر مزید سیر کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بسوں پر بیٹھنا بھی دشوار تھا، کیونکہ اشفاق کو بسوں کے حادثات کی تفصیل بھی بخوبی اندر تھی۔ اس لیے ہم نے رومتہ الکبریٰ کی سیاحت نیا وہ ترپاپیاہ کی کئی روز متواتر پیدل جوتیاں چلھاتے چلھاتے میرے بتوں کا اکلوتا جوڑا دم توڑ گیا۔ نیا جو تا خریدنے میں اشفاق نے میری رہنمائی کی۔ جو توں کی دکان میں جا کر میں نے جو پہلا جوڑا ٹرائی کیا۔ وہ فٹ تھا۔ میں نے اسے خریدنے کی ٹھانی، تو اشفاق احمد نے ڈائٹا کہ روم میں جوتا خریدنے کے یہ آداب نہیں ہیں۔ یہاں پر آٹھ دس جوتے ٹرائی کر لو، اس کے بعد دوسری جگہ چلیں گے۔ بڑی مشکل سے تیسری دکان میں جا کر کوئی پندرھواں جوڑا اشفاق کی نظر میں نجح گیا۔ وہ بڑی دیر تک دکاندار کے ساتھ اطالوی زبان میں اس جوتے کے محاذ پر گفتگو کرتا رہا۔ کسی بات پر تاؤ کھا کر دکاندار نے جوتے کا جوڑا تھا در تھہ مروڑ کر میری پتلون کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ

یہ جوتا ہے حد نازک، سبک اور لچکدار ہے، اشراق نے بھی میری جیب پر ہاتھ پھیر کر تصدیق کی کہ جیب میں جوتا نہیں بلکہ رومال پڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کچھ مزید مول قول کے بعد اشراق نے اپنے پاس سے ساڑھے تین ہزار لیرے ادا کئے اور یہ جوتا خرید کر مجھے بطور تحفہ دے دیا۔ اس مم کے بعد میں نے اشراق کو الوداع کہا اور اپنا نیا جوتا پہن کر نیپلز کو روانہ ہو گیا۔

نیپلز پہنچ کر میں نے اپنا سامان ہوٹل میں رکھا اور پہلی ٹرین پکڑ کر پومپیائی کا شر دیکھنے چل پڑا۔ اتوار کا دن تھا۔ پومپیائی کے کھنڈرات میں سیاحوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ صدیوں پہلے اس شر کے باشندوں نے حیوانی، شہوانی اور نفسانی عیش و نشاط کو جو فرودغ یا تھا اس کے آثار ملاحظہ کر کے عبرت تو کسی آنکھ میں آنکھ میں نظر نہ آئی، البتہ حرث کا غبار بہت سے چروں پر چھایا ہوا تھا۔ قدم قدم پر مشتبہ شکل و صورت کے دلال جیبوں میں ہاتھ ڈالے چیلوں کی طرح منڈلا رہے تھے اور نقش تصاویر کے الیم بیچنے میں مصروف تھے جن میں پومپیائی کی لذت پرستی کے عجیب و غریب مرقع جمع تھے۔ قریب ہی ماڈنٹ ویسووی اس کا جو والا کمھی پاڑ بجھے ہوئے آتش فشانی مادے میں لپٹا ہوا کھڑا تھا۔ وقتہ فوقہ اس کی چوٹی کا آتش فشانی دہانہ بھڑک بھڑک کر پومپیائی کے انجمام کی یاد دہانی کرتا تھا لیکن سیاحوں کا جہنمگھٹنا عقوبت کے اس اشارے سے بے نیاز ان کھنڈروں میں دبی ہوئی جنسی بے راہروی کی لذت میں سرتاپا ڈوبیا ہوا تھا۔ پومپیائی کی پتھریلی سڑکوں اور گلی کوچوں میں گھومتے گھومتے یکاکیک میرے نئے اطالوی جوته کے دونوں تلے اکھر کر الگ ہو گئے۔ میں نے یہ نازک اور لچکدار جوته مروڑ کر رومال کی طرح جیب میں ڈال لیے اور اس عبرت کدھ کی باقی یا ترا نہ گے پاؤں کی۔

شام کو نیپلز واپس پہنچا تو ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ایک اور مشکل پیش آئی۔ جو ویٹرس میری میز پر مامور تھی وہ انگریزی زبان سے قطعی نا آشنا تھی۔ کھانے کا مینو اطالوی زبان میں چھپا ہوا تھا اور میری سمجھ سے بالکل بالاتر تھا۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ کھانے کے اختیاب کے متعلق کسی طرح اس پر اپنا مفہوم واضح کر سکوں۔ لیکن وہ ہر بار اپنی

گردن مٹکا کر اور شانے اچکا کر مسکرا دیتی تھی۔ میری کمپرسی کو بھانپ کر قریب والی میز سے ایک نوجوان انٹھ کر آیا اور نہایت شستہ انگریزی میں بولا۔ ”کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“

”شکریہ“ میں نے کہا۔ ”میں ویٹرس کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ میرے لیے گوشت اور شراب نہ لائے۔ اگر مجھلی یا انٹے موجود ہوں تو وہ لے آئے، لیکن وہ سور کی چبی میں تلے ہوئے نہ ہوں۔“

ویٹرس آڑر لے کر چلی گئی تو نوجوان نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں؟“

”جی نہیں۔ میں پاکستانی ہوں۔“

”الحمد للہ۔“ نوجوان نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”میں شام کا رہنے والا ہوں آئیے آپ ہماری میز پر آ جائیے۔ میں آپ کو اپنی ملگتیر سے ملاوں گا۔ ہم دونوں کو پاکستان سے بڑی دلچسپی ہے۔“

اپنی میز پر پہنچ کر وہ شامی نوجوان خالص مغربی انداز سے تعارف کی رسوم ادا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ ”میرا نام رشید مومن ہے۔ یہ میری ملگتیر نہیں ہے۔ ہم دونوں دمشق کے رہنے والے ہیں۔ روم میں فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آجکل نیپلز آئے ہوئے ہیں کیونکہ داناؤں نے کہا ہے:

See Naples and then die

پھر اس نے نہیں سے میرا تعارف کرایا۔ ”آپ پاکستانی ہیں۔ الحمد للہ ہمیں پاکستان سے بڑی محبت ہے۔ ہے نا نہیں؟ آپ گوشت نہیں کھاتے۔ شراب نہیں پیتے۔ غالباً سکریٹ سے بھی پرہیز ہو گا۔ انٹے اور مجھلی سے بھی بھاگتے ہیں، اگر وہ چبی میں تلے ہوئے ہوں تو۔ معلوم نہیں نہیں، ایسے لوگ یورپ آ کر کیا کرتے ہیں؟“ رشید مومن نے طنزیہ نہیں کر کہا۔

”معلوم ہوتا ہے آپ میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔“ نہیں نے اخلاقاً کہا۔

”جی ہاں، چھوٹی کمزوریاں تو نہیں ہیں۔“ میں نے بھی مذاقاً جواب دیا۔

رشید مومن نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ننسہ کچھ جھینپ سی گئی۔

”واللہ، ننسہ، جب تم شرماتی ہو تو تمہارا چہرہ اس گلاس کی طرح عتابی ہو جاتا ہے۔“ رشید مومن نے ریڈ وائٹ کا گلاس انھا کر کھا۔ پھر انہوں نے اپنے اپنے گلاس بلند کیے اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرا جام صحت نوش کیا۔

کچھ دیر طرح طرح کی پرطف باتیں ہوتی ہیں۔ رشید مومن کی باتوں میں نہایت سلحدا ہوا مزاح تھا۔ ننسہ کے خلوص کی سادگی بڑی دلاویز تھی۔ رفتہ رفتہ گفتگو کا سرخ میرے سفر جاز کی طرف پھر گیا۔ اگرچہ اس وقت تک رشید مومن اور ننسہ سرخ اطالوی شراب کی تین بوتلیں ختم کر چکے تھے اور ان کی آنکھوں میں سرور کی ایک لطیف سی غنووگی بھی اتر آئی تھی۔ لیکن جاز کا ذکر آتے ہی وہ دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔

”آپ جاز جا رہے ہیں؟ آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔ واللہ آپ بہت ہی خوش نصیب ہیں۔“ ننسہ نے بڑے جوش سے کہا۔ اب اس کی آنکھوں میں عقیدت کی ایک ایک چمک، ایک ایسا کیف چھلک آیا تھا جو سرخ اطالوی شراب کے نشے سے کہیں نیاہ گمرا اور خوشنما تھا۔

”آپ ننسہ کی باتوں میں نہ آئیں۔“ رشید مومن نے کسی قدر تنگی سے کہا۔ ”سب جوان لڑکیاں وہی اور زود اعتماد ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جاز پہنچ کر آپ بہت پشیمان ہوں گے۔“

”خدا کے لیے رشید ایسی باتیں نہ کرو۔“ ننسہ نے احتجاج کیا۔ ”اگر تم ایسی باتیں کرو گے تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ خدا کی قسم، کبھی معاف نہ کروں گی۔“

”میرا تجربہ ہے کہ ننسہ کا غصہ ہیشہ عارضی ہوتا ہے۔“ رشید مومن نے لاپرواٹی سے کہا ”میں اس کی وقتو خفگی گوارا کر لوں گا، لیکن جاز کے متعلق اپنے دوست کو کسی قسم کی لاعلمی میں بتلانہ رہنے دوں گا۔“

ہوٹل ہریمنس کے ڈرائیورنگ روم میں بیٹھے بیٹھے اب رشید مومن کے تن بدن میں ان مغربی

مستشرقین کی روح حلول کر آئی تھی جنہوں نے حج اور اسلام کے متعلق گمراہ کن کتابیں لکھ کر اپنے زہریلے تھقفات کو علم و دانش کا لباس پہنا رکھا ہے۔ رشید مومن کا ذہن بھی اس علم کے زیور سے پوری طرح آراستہ تھا۔ اس نے یہ غلیظ مواد ایک متugen قے کی طرح ہمارے سامنے میز پر انٹیلنا شروع کر دیا۔ ریڈ دائن کی ترنسٹ میں وہ بڑے جوش و خروش سے اپنی خرافات بکتا رہا اور نہیں اس کے سامنے ایک زخم خورہ ناگن کی طرح بیٹھی بل کھاتی رہی۔ وہ بار بار اپنے گلاس کو غصے سے چھکلاتی تھی۔ کبھی بوتلوں کو اٹھا اٹھا کر زور سے میز پر مارتی تھی کبھی نیپکن کو اپنی کلامی کے گرد یوں بھیجن کر پیشی تھی کہ اس کی سُدُول بانہوں میں خون کی ریگس ابھر کر بڑی حدت سے کپکپانے لگتی تھیں۔ نہیں کی آنکھوں سے ڈر گلتا تھا کہ شاید ابھی ان سے آگے کے دو شعلے لپک پڑیں گے۔ اس کے چرے کے اثار بتا رہے تھے کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کے ذہن سے زہر کے فوارے پھوٹ کر بننے لگیں گے۔ ہماری میز پر بڑا شدید تناؤ چھا رہا تھا۔ گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے میں نے آرکسٹرا کی تعریف شروع کر دی جو ایک نئے ڈائنس کی سریلی دھنیں بجا رہا تھا۔

”بے شک آرکسٹرا بڑی حسین موسیقی بجا رہا ہے۔“ رشید مومن نے گویا چونک کر کہا۔ ”تم دونوں یہاں بیٹھ کر دین کی باتیں کرو۔ میں اس اطالوی لڑکی کے ساتھ ناچنا چاہتا ہوں جو بے چاری بہت دیر سے تھا بیٹھی ہے۔“

رشید مومن نہایت بھدے پن سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک دوسری میز پر چلا گیا، جہاں ایک خوبصورت اور آراستہ لڑکی لائم جوس سے جی بہلا رہی تھی۔ اس نے رشید مومن کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور کچھ دیر بعد لائم جوس چھوڑ کر وہ شمپین پینے میں مشغول ہو گئے۔

رشید مومن دیر تک اس لڑکی کے ساتھ ڈائنس کرتا رہا۔ نہیں اپنی کری پر بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب حرث، ایک عمیق غصہ اور ایک شدید انتقام چھلک رہا تھا۔ وہ بار بار کچھ بولنا چاہتی تھی، لیکن اس کے ہونٹ کپکپا کر، کپکپا کر وہ جاتے

تھے۔

آدمی رات گئے جب ہوٹل ٹرینس کا بال روم بند ہونے لگا تو رشید مومن اطاولی لڑکی کے بازو میں بازو ڈالے ہمارے پاس آیا۔ دونوں نشے میں دھت تھے۔

”یہ کیا واہیاتی ہے“ رشید مومن ناراض ہونے لگا۔ ”ابھی رات شروع بھی نہیں ہوئی اور یہ کم بخت ہوٹل والے ڈانس بند کر رہے ہیں۔ چلو ہم سب کاسینو چلیں۔ وہ صبح تک کھلا رہتا ہے۔“

”میں بہت تحک گئی ہوں۔ تم خوشی سے جاؤ۔“ ننسہ نے بیزاری سے کہا۔

”بہت اچھا۔ شب بخیر۔ مجھے امید ہے کہ ہمارا پاکستانی بھائی بدستور تمہارا دل بھلاتا رہے گا۔ خدا کی قسم، پاکستانی بڑے اچھے لوگ ہیں۔ شراب نہیں پیتے۔ سور نہیں کھاتے۔

گرمیوں کے موسم میں حج پر جاتے ہیں اور ننسہ جیسی خوبصورت لڑکیوں کا جی بھلاتے ہیں..... ہاہاہا..... ہاہاہا.....“ رشید مومن پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا، جھومتا، لڑکھرا تا ہوا اطاولی لڑکی کے ساتھ باہر چلا گیا۔

کچھ دیر ننسہ میز پر کہنیاں لیکے دم بخود بیٹھی رہی۔ اس کا سر اس کی ہتھیلیوں کے درمیان جھکا ہوا تھا۔ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر اب اس نے رونا شروع کر دیا، تو میں کیا کروں گا؟ ہر لمحہ مجھے ڈر لگتا تھا کہ میز پر پڑے ہوئے مینو کارڈ پر اچانک ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگیں گے اور میں دل ہی دل میں ان الفاظ اور فقرنوں کی تلاش کر رہا تھا، جو ایسے نازک موقعوں پر لڑکیوں کی وجہی کے لیے استعمال ہوا کرتے ہیں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ننسہ نے مجھے اس آنائش سے بال بال بچا لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے اپنی ہتھیلیوں سے سر اٹھایا، تو اس کی آنکھیں بالکل خلک تھیں۔۔۔۔۔ سوکھی ہوئی ٹھنیوں کی طرح جو چنگاری دیکھتے ہی بھک سے شعلہ پکڑ لیتی ہیں۔ اس کا چہرہ تھکن آلود تھا اور اس نے نیم غنوگی کے عالم میں کہا۔ ”آؤ ہم بھی کسی دوسرے ناٹ کلب میں چل کے بیٹھیں۔ یہاں پر مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے۔“

”آپ بہت تحک گئی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں

تو زیادہ بہتر ہو گا۔“

”نہیں۔ میں اپنے کمرے میں ہرگز نہ جاؤں گی۔ اس وقت اگر میں اکیلی رہ گئی، تو رو رو کر میرا برا حال ہو جائے گا۔“

”آپ اکیلی نہیں ہوں گی۔“ میں نے کہا۔ ”جب تک آپ کو نیند نہ آ جائے میں آپ کے پاس بیٹھوں گا۔“

زنہ سہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی، ”ہمارے ملک میں ایک کماوت ہے کہ اگر مرد اور عورت کسی جگہ اکیلے رہ جائیں، تو ان کے ساتھ تمرا ساتھی شیطان ہو جاتا ہے۔“

”شیطان کے ساتھ میرے بھی دیرینہ مراسم ہیں۔“ میں نے مذاقا کہا۔ ”لیکن اب میں نے اس کے داؤ چیز سے بچنا سیکھ لیا ہے۔“

زنہ سہ ہنسنے لگی۔ اوپر جانے کے لیے جب ہم لفت میں سوار ہوئے تو زنہ سہ کے ساتھ رشید مومن کی جگہ ایک اجنبی کو دیکھ کر لفت بوائے عجیب انداز سے مسکرا�ا۔

”آپ کی شب خوش خوش بسر ہو۔“ لفت بوائے نے شرارت سے ایک آنکھ مج کر کہا۔

”شکریہ۔“ میں نے اسے ایک سولیرا کا ٹپ دیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر زنہ سہ کہنے لگی۔ ”اب اگر میں ساری عمر ایک فرشتہ بن کے رہوں پھر بھی لفت بوائے کی نظر میں تو وہی رہوں گی جو اس نے مجھے اس وقت سمجھا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”انسان غلط فہمیوں کا پتلا ہی تو ہے۔“

”ہمارے ملک میں اسے گناہ بے لذت کہتے ہیں۔“ زنہ سہ کہنے لگی۔

”گناہ کا امکان گناہ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بری بات ہو جائے تو وہ ماضی کا ایک واقعہ بن جاتا ہے، جس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے اور آئندہ اس سے بچ کر رہنا بھی انسان کے اپنے اختیار میں ہے، لیکن بری بات کا امکان خون میں رچے ہوئے زہر کی طرح ہر وقت رُگ و پے میں گردش کرتا رہتا ہے۔“

زنہ سہ نے بستر سے کبل اٹھا کر اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور صوفے کی بڑی کری پر تکمیلہ

لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ ”یہ عجیب بات ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی فریب سے آلووہ ہوتا ہے۔ کبھی ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ کبھی دوسرے ہمارے متعلق دھوکا کھانے لگتے ہیں۔“

نہہ اب اچھے موڑ میں تھی۔ اس نے سگریٹ سلاگا کر اپنا سگریٹ لاٹھر مجھے دیا۔ ”اس سگریٹ لاٹھر کو دیکھو۔ اس پر بڑی خوبصورتی سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ نقش کیا ہوا ہے۔ امریکن کمپنیاں یہ لاٹھر خاص طور پر اسلامی ممالک کے لیے بنا کر بھیجنی ہیں۔“ ”پہلے کلمہ طیبہ سے ایمان کی شمع روشن ہوتی تھی۔ اب اس کی مدد سے سگریٹ سلاگائے جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

نہہ ہنسنے لگی۔ اب وہ لفت بوائے مجھے جو جی چاہے سمجھے، لیکن دمشق میں میری بزرگ ماں کسی اور ہی خیال میں سرور ہو گی۔ شاید اس وقت وہ میرے لیے دعا مانگ رہی ہو۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ میں اب بھی اسی پابندی سے نماز اور قرآن پڑھتی ہوں۔ جس طرح اپنے گھر میں پڑھا کرتی تھی۔“

نہہ نے کروٹ لے کر اپنا اپنی کیس کھولا، جو صوفی کے قریب ایک تپائی پر پڑا تھا۔ اور اس میں سے ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا چھوٹی تقطیع کا قرآن مجید نکلا۔ ”جب میں یورپ آ رہی تھی، تو میری ماں نے مجھے یہ تحفہ دیا تھا۔ سال بھر سے میں نے اسے ایک بار بھی کھول کر نہیں دیکھا، لیکن میں جہاں کہیں جاتی ہوں اسے اپنے ساتھ ضرور رکھتی ہوں۔“

”یہ بھی آپ کی عین سعادت مندی ہے۔“ میں نے کہا۔

”مجھے یہ وہم سا ہو گیا ہے کہ اگر قرآن مجید کی یہ جلد مجھ سے جدا ہو گئی تو شاید میری پیاری ماں کو کچھ ہو جائے گا۔“

”دنیا کی الہامی کتابوں میں قرآن شریف بلا مظلوم صحیفہ ہے۔“ میں نے جان بوجھ کر طفر سے کہا۔ ”کچھ لوگ اسے تعویذ بنا کر گلے میں یا بازوؤں پر باندھتے ہیں۔ بعض لوگ پاکٹ سائز کے قرآن جیبوں میں رکھتے ہیں۔ یوں بھی ہر مسلمان گھرانے میں ایک

دو قرآن خوبصورت غلاف میں لپیٹ کر ضرور رکھے جاتے ہیں خواہ وہ طاق نیاں کی نیت ہی کیوں نہ ہوں آپ نے بھی ایک جلد اپنی کیس میں بند کر کے رکھ چھوڑی ہے،

تو یہ رسم زمانہ کے عین مطابق ہے۔“

اب ننسہ کا موڈ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنئے گئی اور مجھے تسبیحوں کے قصے سنانے گئی۔ کس طرح مشرق وسطی میں کچھ لوگ اپنے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح لیے پھرتے ہیں۔ بعض عادتاً بعض فیشن کے طور پر، بعض محض اعصاب کی آسودگی کے لیے۔

کچھ دیر کے لیے جب میں رخصت ہونے لگا، تو ننسہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی، پھر اس نے ہچکاتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ میرے لیے ایک تکلیف گوارا فرمائیں گے؟“

”برو چشم۔“ میں نے جواب دیا۔

ننسہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ”جب آپ خانہ کعبہ کی نیارت کریں، تو وہاں پر فقط ایک بار میرا نام لے دیں۔“

”یہ تو بڑی آسان فرمائش ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں پر میں آپ کے لیے دعا بھی ضرور مانگوں گا۔“

”آپ ایک بار بس میرا نام ہی لے دیں۔ اس سے نیاہ مجھے کوئی اور حق بھی تو نہیں۔“ ننسہ نے اس نبی کو چھپانے کی ناکام سی کوشش کی جو معاً اس کی خوبصورت آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

”میں ضرور آپ کی فرمائش پوری کروں گا۔ ایک بار نہیں، کئی بار،“ اور جب میں روضہ اقدس پر حاضر ہوں گا، تو آپ کا سلام بھی ضرور عرض کروں گا۔“

روضہ اقدس کے ذکر پر ننسہ نے جلدی سے اپنے گلے کا ریشمی سکارف اتار کر اس سے سر ڈھانپ لیا۔ پھر کچھ کہنا چاہا، لیکن ہچکچا کر خاموش ہو گئی۔

لفٹ بوائے لفت سے ٹیک لگائے اوٹگھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی ٹوپی درست

کی، اور کن انگھیوں سے گھور کر مسکرایا، میں نے پھر اسے ایک سولیرا کا ٹپ دیا۔  
کچھ دیر بعد جب رشید مومن واپس آئے گا، تو اسے دیکھ کر یہ لفت بوائے ایک بار پھر  
کن انگھیوں سے گھور کر مسکرائے گا۔ شاید رشید مومن بھی اسے ایک سولیرا کا ٹپ

اور میں آج تک احساس کے اس گداز پر رٹک کرتا ہوں جو ننسہ کے مقدر میں اسے  
نصیب تھا۔ ننسہ جو بیٹھ وائے پی کر بھی رشید مومن سے روٹھ جاتی ہے، کیونکہ وہ حج  
کے متعلق بے سروپا باتیں کرتا ہے۔ ننسہ جو اب قرآن نہیں پڑھتی، لیکن اپنی ماں  
کا تحفہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ ننسہ جس کے نزدیک خدا کے گھر پر اس کا صرف  
اتنا حق ہے کہ ایک اجنبی فقط ایک بار اس کا نام وہاں لے لے۔ ننسہ جو روضہ اقدس  
کے نام پر اپنے سکارف سے اپنا سر ڈھانپ لیتی ہے۔ ننسہ جو اپنا سلام وہاں پیش کرنے  
سے بری طرح چکچاتی ہے۔

تو غنی ازہر دو عالم من فقیر  
روز محشر عذر ہائے من پذیر  
یا اگر بینی حاصم ناگزیر  
از نگاه مصطفیٰ پنهان گبیر

نیپلز کی بندرگاہ سے ایس۔ ایس۔ ایشورتานے لنگر انھیا تو جہاز میں بڑی چھل پہل تھی۔  
یہ سیاحی جہاز تھا جو اپنے مسافروں کو بھیرہ روم کی گشت کرتا ہوا کیپری، بیروت اور  
اسکندریہ کی سیر کرنے نکلا تھا۔ مسافروں میں زیادہ تعداد تماش بین سیاحوں کی تھی۔  
کچھ عرب طبلاء تھے جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے  
وطن واپس جا رہے تھے۔ چار عیسائی پادری تھے جو لمبے لمبے لبے پنے مسیحیت کی  
تبیغ کے لیے مصر جا رہے تھے۔ آٹھ فرانسیسی نر سیں تھیں جو بیروت کے کسی مشتری

ہسپتال میں ڈیوٹی پر حاضر ہو رہی تھیں۔

کیپری میں مصر کا سابق شاہ فاروق تو ہمیں کہیں نظر نہ آیا، البتہ جواہا کمھی پہاڑ اسٹر مبولی کے دہانے سے آتش فشاں شعلوں کو بھڑک بھڑک کر بلند ہوتے کئی بار دیکھا۔ کیپری کا جزیرہ مسیحی پادریوں کو خاص طور پر راس آیا۔ فرانسیسی نرسوں پر قبضہ جما کے وہ کئی گھنٹوں کے لیے غائب ہو گئے اور جب جہاز میں واپس آئے تو سب کے چہروں پر ساغر و مینا کی کرامات تھی اور ہاتھوں میں اطالوی شراب کی دو دو صراحیاں تھیں۔

ایس۔ ایشورتا بڑی مست خرامی سے چلا جا رہا تھا۔ بحر روم غیر معمولی حد تک پر سکون تھا۔ سورج کی کرنوں میں اس کی شفاف نیلگاؤں لہریں زرکار شامیانوں کی طرح جھلملاتی تھیں۔ خوش قسمتی سے ان دنوں چاندنی بھی پورے شباب پر تھی۔ رات کے نائلے میں وہ وہ کریبی محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی ٹلسماتی سفینہ پر بیٹھے ایک ایسی دنیا میں سفر کر رہے ہیں جس کی فضا احساس سے بھی نیا وہ نازک اور خیال سے بھی نیا وہ رنگیں ہے۔ سکوت شب میں انہن کی دھیمی دھیمی مسلسل بھک بھک، جہاز کے قدموں میں بچھپھ کر ابھرنے والی موجودوں کے جل تھل ساز، آسمان پر تاروں کے جگمگاتے ہوئے ہیرے اور جواہرات، چاندنی میں دھلی ہوئی بھیگی بھیگی فضا، لہروں کے زیر و بم میں ممتازی کرنوں کے چیخ و خم، جیسے نیلم کی کان میں پھلپھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔۔۔ جوں جوں رات جوان ہوتی جاتی تھی ماہول کی اس خوبصورتی پر ایک عجب دیوانگی، ایک شدید جنون پھیلنے لگتا تھا، جیسے انسان کے دل پر غم اترتا ہے۔ ارض و سما کے درمیان ایک بے آواز سکی لرزنے لگتی تھی اور چاروں طرف پھیلا ہوا بے پایاں سمندر ایک آنسو کا گنجینہ بن جاتا تھا۔

موئی مونے شیشوں کی عینک والی ایک آرٹ نمائی کی جو نیپلز سے ہمارے ساتھ سوار ہوئی تھی۔ دن کا بیشتر حصہ اپنے کیبن کے اندر گزارا کرتی تھی، لیکن ڈر کے بعد وہ اپنا کمبل اٹھا کر ڈیک پر آ جاتی تھی۔ کبھی وہ کمبل لپیٹ کر آرام کری پر دراز ہو جاتی تھی۔ کبھی ڈیک کے ہنگے پر جھک کے لٹک جاتی تھی۔ کبھی بے چینی سے ادھر

ادھر گھونٹے لگتی تھی..... صبح کے وقت جب وہ ڈائنگ روم میں ناشتا کی میز پر نظر آتی، تو مجھے ایک گونہ خوشی کا احساس ہوتا کیونکہ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ شاید کل رات اس نے چاندنی کے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہو۔

تیرے روز صبح سوریے بیروت کا ساحل نظر آنے لگا۔ عرب طالب علم دوڑ دوڑ کر سب سے اوپر والے عرش پر چڑھ گئے اور بڑی خوش الحانی سے اپنے اپنے قوی ترانے گانے لگے۔ فرانسیسی رسول کو خاص طور پر یہ گیت بہت پسند آئے، لیکن مسیحی پادریوں نے انہیں ان نوجوانوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے بڑی ہنر مندی سے باز رکھا۔

جب جہاز بندرگاہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے جو چیز نظر آئی، وہ بہت سے لوگوں کا ہجوم تھا جو ساحل پر کھڑے زور زور سے جیخ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور گردنوں کے خشگیں اشارے بھی برا بر ان کی آواز کا ساتھ دے رہے تھے۔ دور سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساحل پرپلوہ ہو رہا ہے۔ جب ہم نزدیک پہنچے تو گمان گزرا کہ شاید وہ لوگ جہاز والوں کو غصے سے گالیاں دے رہے ہیں۔ لیکن کچھ دیر یہ راز کھلا کہ دراصل یہ لوگ بندرگاہ کے قلی ہیں۔ اور یہاں اترنے والے مسافروں کو اپنی اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔ ساحل پر جا بجا سرخ نوبیاں نظر آتی تھیں جن کے کناروں پر تیل کی چکنائی اور تھہ در تھہ جبی ہوئی گرد خاص طور پر نمایاں تھی۔ یوں شور و غل، ریل پیل، دھکما کافی عام تھے اور اس دشت کو دیکھ کر بے اختیار گھر یاد آتا تھا۔ پولیس کے سپاہی غیر معمولی طور پر موٹے تھے اور اس گرمی میں اپنی ورویوں سے بیزار نظر آتے تھے۔ یہ سپاہی نیا وہ تر ٹھیلوں یا کھمبیوں کا سامان لیے اوپنگھ رہے تھے اور جب ان کی آنکھ کھلتی تھی تو وہ کسی کو دھکا دے کر، کسی کو زور سے ڈانت ڈپٹ کر اپنے فرائض منصبی سے عمدہ برآ ہو جاتے تھے۔

فرانسیسی رسول کی منزل آگئی تھی اور وہ اپنا سامان اتردا کر اب مسیحی پادریوں سے رخصت ہو رہی تھیں۔ پادریوں نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں دیر تک سملایا

اور پھر انہوں نے بڑی بے صبری سے نرسوں کے چٹاخ چٹاخ الوداعی بوسے لیے۔ ان کی حرست بھری نگاہیں دور تک نرسوں کا پیچھا کرتی رہیں جو ساحل پر پہنچتے ہی اپنے اپنے چھروں کا میک از سر نو درست کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔ بوسے روحاںی ہوں یا نفسانی، عورتوں کے پاؤڈر اور لپ اسٹک پر ان کا اثر ایک ہی سا ہوتا ہے۔

یہاں پر جہاز نے چند گھنٹے رکنا تھا۔ بیروت کا شر دکھانے کے لیے ایک ٹورسٹ اینجنسی نے بہت سی ٹیکسیوں کا بندوست کیا ہوا تھا۔ جیسی شاندار ٹیکسیاں یہاں نظر آئیں۔ وہی موزوں کاریں یورپ کے بڑے بڑے شہروں کو بھی کم ہی نفیب ہوتی ہو گی۔ فورڈ، شیورے اور پیوک کے ماڈل عام تھے کہیں کہیں کیدی لک کاریں بھی ٹیکسیوں کے طور پر چلتی نظر آتی تھیں۔ یوں بھی بیروت کے چہرے مرے پر کئی طرح کا میں الاقوامی رنگ و روغن چڑھا ہوا ہے۔ زبان اور آداب میں یہ شر فرانسیسی ہے۔ موزوں کے ماڈل، بش شہروں کے ڈیرائن، اور یونیورسٹی ڈگریوں کے لحاظ سے یہ شر امریکن ہے۔ ہوٹلوں کے کاروبار اور پر فضا پہاڑی مقامات کی نسبت سے نہ صرف بیروت بلکہ سارا لبنان مشرق وسطیٰ کا سوئٹر رلینڈ ہے اور جیسا کہ میرے لبنانی دوست مصطفیٰ الخیری نے مجھے ہالینڈ میں بتایا تھا، بیروت کی نشاط گاہوں اور نائٹ کلبوں کو پیرس کی ہمسری کا بھی بجا طور پر دعویٰ ہے۔ چنانچہ بہت سے عرب شزادے جو اپنے ملک یا اپنے محلات میں شراب پینے سے معدور ہیں۔ اپنے پرائیویٹ ہوائی جہازوں میں جوں در جوں یہاں آتے ہیں اور راتوں رات دادیش دے کر صبح سوریے اپنے فرائض منصبی پر واپس حاضر ہو جاتے ہیں۔ میری ٹیکسی کے ڈرائیور نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے وہ ہوٹل بھی دکھایا جس میں مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقصہ سمیعہ جمال اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ہوٹل کے دروازے پر سمیعہ جمال کی ایک بہت بڑی تصویر آؤ رہا تھا۔ تصویر میں اس کے بال باولوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے باہر چوک کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جمال ایک پولیس کا نشیبل نہایت مستعدی سے ٹریفک کنٹرول

کرنے میں مصروف تھا۔ سمیعہ جمال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری نیکسی کے ڈرائیور نے پہلے ایک راہ گیر کو اور پھر چوک والے ٹریفک کانٹیبل کو اپنی زد میں لینے کی سر توڑ کوشش کی۔ راہگیر بے چارا تو کپڑے جھاڑ کر انھوں کھڑا ہوا، لیکن ٹریفک کانٹیبل نے سیئی بجا کر ہمارا تعاقب کرنے کی تھوڑی بہت کوشش کی۔ نیکسی ڈرائیور نے ایکسی لیٹر دبا کر رفتار اور بھی تیز کر دی اور ہم خطرناک پہاڑی موڑوں اور پیچدار راستوں کو کسی غبی میجھے کی مدد سے طے کرتے ہوئے ٹریفک کانٹیبل اور سمیعہ جمال دونوں کی زد سے باہر نکل آئے۔

روم کی طرح بیروت کی سڑکوں پر بھی مجھے ہر دم یہی احساس ہوتا تھا کہ ہم ایک مسلسل حادثے کی زد میں معلق ہیں۔ کھلی سڑکیں ہوں یا گنجان آباد گلیاں، نیکسی ہر جگہ ایک ہی رفتار سے چلنے پر مصروف تھی۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ کوٹ پتلون والے راہگیروں کے درمیان تو وہ بڑے اطمینان سے ہارن بجاتا ہوا گزر جاتا ہے، لیکن عباوں والے لوگوں کو دیکھ کر وہ بے اختیار تنذیب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت اس نے یوں کی کہ پتلون والے راہگیر کی ناگزینی دور سے صاف نظر آ جاتی ہیں اور ڈرائیور آسانی سے دیکھ سکتا ہے کہ وہ کس طرف جا رہا ہے۔ اس کے برعکس عبا کے نیچے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ موڑ کو دیکھ کر ان ناگزینوں کا رخ آگے کی طرف مائل ہے یا پیچھے کی طرف۔ میں نے اعتراف کیا کہ مغربی لباس کا یہ افادی پہلو اب تک میری نظر سے پوشیدہ تھا۔

امریکن یونیورسٹی کے قریب ایک فیشن ایبل ریستوران کے سامنے نیکسی روک کر ڈرائیور نے مجھے آگاہ کیا کہ کوئی خوش مذاق سیاح اس ریستوران میں بنیا کا گلاس یا چائے کی پیالی نوش کئے بغیر بیروت سے واپس نہیں جاتا۔ اپنی سیاحت اور خوش مذاق کی لاج رکھنے کے لیے میں نے بھی اندر جا کر چائے کا آرڈر دیا۔ ریستوران میں اکثر لوگ غیر ملکی تھے اور غالباً وہ سب سیاح تھے اور یہاں اپنی نیکیوں کے ڈرائیوروں کی ہدایات

کے مطابق اپنی خوش مذاقی کی داد دینے آئے تھے۔

ایک نوجوان بیرے نے مجھے چائے لا کر دی۔ اس کی باریک باریک تیکھی مونچھیں تھیں اور اپنی سفید و روشنی میں وہ جاسوسی ناولوں کا پراسرار ہیرو دکھائی دیتا تھا جو بھیں بدل کر کسی گھرے راز کی تلاش میں ہوٹلوں کی ملازمت کر رہا ہو۔ چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر وہ میرے پاس مودب کھڑا ہو گیا اور فرنچ نما انگریزی میں بولا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں پاکستانی ہوں۔“

”مرجا، مرجا۔“ بیرے نے خوشی سے ہاتھ مل کر کہا۔

”اور آپ؟“ میں نے بھی اخلاقاً دیافت کیا۔

”الحمد لله،“ میں مسلمان ہوں۔“

بیرے کے اس بے ساختہ جواب نے مجھے چونکا دیا۔ عربوں کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سب سے پہلے عرب ہوتے ہیں۔ پھر شامی، یا لبنانی یا عراقي یا مصری ہوتے ہیں اور اس کے بعد کہیں جا کر مسلمان کھلانا پسند کرتے ہیں، لیکن یہ نوجوان بیرا نہ صرف سب سے پہلے مسلمان تھا، بلکہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر بغیر کسی حجاب کے خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا۔

”مجھے بھی مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہے۔“ میں نے کہا۔

”الحمد لله۔ الحمد لله۔“ بیرے نے اپنے ہاتھ پھر خوشی سے ملے۔ ”آپ نے اخوان المسلمين کا نام سنा ہے۔“

”اخوان کو کون نہیں جانتا؟“ میں نے جواب دیا۔

”میں بھی اس تحریک کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔“ بیرے نے فخر سے کہا۔

”هم ساری دنیا کے مسلمانوں کے بھائی اور خدمت گار ہیں۔“

”کیا آپ پاکستان کی فارن سروس میں ہیں؟“ بیرے نے اچانک پوچھا۔

”جی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟“

”مشرق وسطی میں جو سیاح آتے ہیں، وہ اکثر سفارت خانوں کے افسر ہوتے ہیں یا وہ گرجوں کے مشنری ہوتے ہیں یا ان کا تعلق تیل کی سیاست سے ہوتا ہے۔“ بیرے کے چھرے پر اب غیر معمولی سنجیدگی آگئی تھی۔ ”سفارت خانوں سے وہ ہماری حکومتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گرجوں کے ذریعہ وہ ہمارے دین میں دخل دیتے ہیں اور تیل کی سیاست سے وہ ہماری معاش پر کنٹرول رکھتے ہیں۔“

بیرے نے کن اکھیوں سے اوھر اوھر دیکھا اور گردن جھکا کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ ”ہم اخوان ایسے سیاحوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔“

بیروت کے مضافات میں جایجا چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کی آبادیاں پھیلی ہوئی تھیں ان میں فلسطین کے مهاجر رہتے تھے مهاجر کراچی میں ہوں یا بیروت میں، ان کے جھونپڑوں پر وہی کثافت اور ان کے چھروں پر وہی فلاکٹ برستی ہے۔ جس طرح کراچی میں مهاجر بستیوں کے درمیان بڑی سرعت سے سینٹ کی بڑی بڑی عمارتی بلند ہو رہی تھیں، اسی طرح فلسطینی مهاجروں کے گرد و پیش بھی بلند و بالا خوبصورت مکان تغیر ہو رہے تھے۔ چند امریکین سیاح جو ان جھونپڑوں اور مکانوں کی تصویریں کھینچ رہے تھے، ساتھ ہی ساتھ عربوں کی سیاست پر بھی بڑی بے تکلفی سے رائے نہیں فرمائے تھے۔

”خدا کی قسم۔“ ایک سیاح کہہ رہا تھا۔ ”جس وقت ان جھونپڑوں والوں نے اٹھ کر ان خوبصورت عمارتوں کو جلانا شروع کر دیا اسی روز مشرق وسطی میں کیونزم کا سیالب آجائے گا۔“

”بائی جو تم میرے پالتو خرگوش کے بچوں سے بھی نیاہ کوتاہ انڈیش ہو۔“ دوسرے سیاح نے اپنے ساتھی کو پیار سے گالی دی۔ ”کیونزم آگ لگنے کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ کیونزم کا راستہ تو اسی روز ہموار ہو گیا تھا جب عربوں کے ہاتھ میں لا انتہا تیل کی دولت آئی اور ان غلیظ جھونپڑوں کو مکانوں میں تبدیل کرنے کی بجائے ان کے درمیان یہ نامعقول عمارتیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔“

”تم دونوں کتیا کے پچھے ہو۔“ تیرے امریکن نے فتوی صادر کیا۔ ”جب تک یہاں پر

مذہب کا جذبہ غالب ہے کیونکہ آنے یا نہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“  
 مذہب کا یہ کارآمد جذبہ غالب رکھنے کے لیے مغربی ممالک بھی حسب توفیق اپنا فرض انجام دینے میں کوئی نہیں کرتے۔ نہ سہ کے پاس جو سگریٹ لائٹر تھا، اس پر نقریٰ حروف میں بڑا خوبصورت کلمہ طبیبہ لکھا ہوا تھا۔ بیروت اور بغداد اور دمشق اور قاہرہ میں ایسے سگریٹ لائٹر جا بجا فروخت ہوتے ہیں۔ ایک امریکین کمپنی نے خانہ کعبہ کی تصویر والی بنیانوں اور جرسیوں کا ڈول بھی ڈالا ہے۔ بہت سے مغربی سفارت خانے اپنے ملائیں کو خفیہ طور رمتباہ کرتے ہیں کہ مشرقی ممالک میں کچی سبزیاں، سلاو اور ٹماٹر نہ کھائیے، کیونکہ ان میں عورتیں ہوتی ہیں۔ جب تک مشرقی عورتیں خود آنکھ نہ لڑائیں۔ ان سے آنکھ نہ ملائیے، کیونکہ اس سے ان کا اخلاق خراب ہوتا ہے اور جب تک صاحب خانہ خود شراب نہ پیئے، اس سے شراب نہ مانگئے کیونکہ اس سے ان کا مذہب بگڑ جاتا ہے۔

بندرگاہ کے قریب ایک کھلا میدان ٹھا اور ٹین اور چٹانوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ میدان کے چاروں طرف کانٹوں والی لوہے کی تار کھینچنی ہوئی تھی اور جگہ جگہ پولیس کے کچھ پاہی پرے پر ماہور تھے۔ اس میدان میں سینکڑوں مرد اور عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح محصور تھیں۔ تمازت آفتاب میں سارا میدان انگیٹھی کی طرح دہک رہا تھا، اور کچھ ضعیف عورتیں ایک چادر کو پانی میں ترکر کے بار بار اپنے چہروں پر مل رہی تھیں۔ نیکسی ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ فلسطینی مهاجر نہیں بلکہ یہ میدان حاجیوں کا یکم ہے جو حکومت نے خود اپنے خرچ سے قائم کر رکھا ہے۔ کئی کئی مہینوں تک دور دراز سے لوگ آ آ کر اس یکم میں جمع ہوتے رہتے ہیں جو خوش نصیب ہیں ان کو کسی ہوائی جہاز یا سمندری جہاز میں جگہ مل جاتی ہے۔ باقی لوگ انتظار کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ نیکسی ڈرائیور کے اعداد و شمار کے مطابق اس یکم میں ایسے لوگ بھی تھے جو دو دو، تین تین، چار چار سال سے مسلسل یہاں آ کر مہینوں انتظار کرتے تھے اور پھر بے نیل و مرام واپس چلے جاتے تھے۔

حاجی کیمپ کے ایک گوٹے میں عصر کی جماعت ہو رہی تھی۔ باقی بہت سی جگہوں کی طرح اس کیمپ میں بھی حاجی نیا دہ تھے اور نمازی کم۔ ایک بے حد بوڑھی عورت بڑے خضوع و خشوع سے سر بسجود تھی۔ اس کی چادر میلی تھی اور کرتے کا دامن پھٹا ہوا تھا۔ اپنے آس پاس حقے کا شغل کرتے ہوئے بہت سے لوگوں کے برعکس حج کی طلب میں اس نے محض انتظار کا دامن نہیں کپڑا تھا، بلکہ وہ نماز کا دامن کپڑے بیٹھی تھی۔ لیکنی ڈرامیور نے بڑے پتے کی بات کہی کہ مسلمانوں میں جہاں کہیں کچھ برکت اور فراغت کے آثار پائے جاتے ہیں وہ ایسے ہی افاس قدیمہ کے دم قدم سے قائم ہیں۔ اگر یہ بزرگ ماں بھی نماز چھوڑ کر حقہ گڑھلانے بیٹھ جائے، تو ممکن ہے کہ ہم لوگ لیکیوں میں ورنہ نے کی بجائے سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آئیں۔

بیروت کا شمار بھی دنیا کے ان مہذب شرروں میں ہے جہاں غریب ہونا تو کوئی جرم نہیں، البتہ بھیک مانگنا ضرور منع ہے۔ بندگاہ کے باہر پولیس کا ایک سپاہی بید کی چھڑی گھما گھما کر بہت سے گداگروں کو منتشر کر رہا تھا جو سیاحوں پر بھوکی چیلوں کی طرح جھپٹنے تھے۔ فلسطینی مهاجروں کا ایک خاندان سپاہی کی نظر بچا کر ایک طرف سما کھڑا تھا۔ ظاہراً وہ دست سوال دراز نہیں کر رہے تھے، لیکن ان کے چہرے اپنی بے نیانی سے پکار پکار کر ان کی بے بسی اور خستہ حالی کی فریاد کر رہے تھے۔

اس خاندان میں ایک چھ سال کا لڑکا تھا۔ ایک آخر نو سال کی لڑکی تھی اور ان کی ماں ایک ادھوری بھار کی طرح تھی، جسے وقت سے پہلے ہی خزان نے پامال کر دیا ہوا۔ کبھی اپنے بچوں کی طرف دیکھتی تھی۔ کبھی راہگیروں کی طرف اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی گھما گھما کر بھیک منگوں کو بھٹکا رہا تھا۔

مجھے رکتا دیکھ کر وہ لڑکا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا۔ ”کیا آپ ہماری تصویر کھینچتا چاہتے ہیں؟“

جس طرح ہمارے ہاں کے فقیر یا سلامی یا بوث پالش کا سارا لے کر بھیک مانگتے ہیں،

اسی طرح فلسطین کے مهاجر تصویریں کھنچوا کر بخشش کی امید رکھتے ہیں۔ ان کے خوبصورت خدوخال، تیکھے نقش اور اداس آنکھیں تصویر کشی کے لیے بڑے تباہاک موضوع ہیں اور کبھرے والے سیاح ان کے فونڈ اتار کر بڑا فراخدی سے بخشش دیتے ہیں۔

تصویر کی فرمائش سن کر میرا جی چاہا کہ میں اس پچے کو اٹھا کر گلے سے لگا لوں اور کہوں کہ میرے مقصوم فرشے! ابھی خدا نے وہ مصور پیدا نہیں کیا جو تمیری تصویر کا حق ادا کر سکے۔ تمہارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ اس جھلکی ہوئی دھوپ میں تمہارے پاؤں نگنے ہیں اور تمہاری سسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی خلک ہو چکی ہے۔

وہ تمیری ماں ہے جسے قدرت نے شباب کی منزل سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا ہے اس کے بھنپھے ہوئے ہونٹوں پر شاید کوئی فریاد لرز رہی ہے، لیکن وہ سپاہی کے ڈر سے اپنا منہ نہیں کھول سکتی یا شاید اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک غصب ناک بدوعا ترپ رہی ہے جو اس نے صرف اس ڈر سے روکی ہوئی ہے کہ کہیں اس دنیا کا بھی وہی حشر نہ ہو جو نوح اور عاد اور ثمود کی بدنصیب اقوام کا ہوا تھا اور وہ تمیری گڑیا سی بن ہے جس نے ایک ہاتھ سے اپنی ماں کا دامن تھاما ہوا ہے۔ اور دوسرے ہاتھ سے وہ تمہیں واپس بلا رہی ہے تاکہ کوئی راہ گیر تمہیں زردستی اٹھا کر اپنے ساتھ نہ لے جائے۔ اس نئھنی سی مقصوم پچی کے پاؤں بھی نگنے ہیں۔ اس کے کپڑوں میں بھی بہت سے سوراخ ہیں۔ اس کے سنری بال ریشم کے الجھے ہوئے گھوٹوں کی طرح پریشان اور گھنگھریا لے ہیں۔ ان خوبصورت بالوں میں ریت کے ذرے ابرق کی طرح چمک رہے ہیں۔ پچی کی پلکیں گھنی اور نوکدار ہیں اور اس کی اداس آنکھوں میں نیلی نیلی جھیلوں کی اتھا گمراہیاں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگر یہ پچی آسمان پر پیدا ہوتی تو بے شک وہ جنت کی حور بنتی۔ لیکن وہ اس بے رحم نہیں پر پیدا ہوتی، اور بنی آدم بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں خدا کا یہ نادر شاہکار بھوک سے مر جھایا ہوا ہے، خوف سے سما ہوا ہے، بے گھر ہے، بے سارا ہے، اداس ہے۔ پامال ہے۔

اس پچی کی جلد نبیوں کے تبل کی طرح تانہ اور شفاف ہے اس کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کے چشموں کا پانی اور فلسطین کے پھولوں کی نگت اور فلسطین کے انگوروں کا رس رچا ہوا ہے۔ اس لڑکی کے وجود میں یروشلم کی ان گنت پدیوں کے قدس کی امانت پوشیدہ ہے۔ اس کی پورش بڑے بڑے برگزیدہ پیغمبروں کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ اس کی تربیت میں آسمانی صحیفوں کا ہاتھ ہے جو خدا نے اس برکت والی سرنیشن پر نازل فرمائے۔ اس لڑکی کے آباو اجداد ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کی خاک میں دفن ہو رہے ہیں، لیکن آج یہ لڑکی روٹی کے ایک نکٹے اور سارے کی ایک جھونپڑی کے لیے ننگے پاؤں اور ننگے سر پیروت کی گلیوں میں پریشان حال ٹھوکریں کھا رہی ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کی بھیزوں کو ایک بار پھر وہ گھر یاد آنے لگا ہے جہاں سے ڈھائی ہزار سال قبل خدا نے انہیں نکال باہر کیا تھا۔

یہودیوں کا جدید ترین مقدس صحیفہ ”اعلان بلفور“ (Baffour Declaration) ہے، جو ۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو برطانیہ کے دفتر خارجہ کی جانب سے نازل ہوا اور جس میں بشارت دی گئی تھی کہ شاہ انگلستان کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قوی گھر میا کرنے کے حق میں ہے اور اس سلسلے میں یہودیوں کی ہر ممکن مدد کرے گی۔

جس عقیدت مندی سے یہودی اس انسانی بشارت کی پیروی کر رہے ہیں۔ اگر اسی طرح انہوں نے اپنی الہامی کتاب تورات کو بھی مانا ہوتا تو شاید بنی اسرائیل کو ہزاروں سال تک دبدر کی خاک نہ چھاننا پڑتی۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا جہاں کے لوگوں پر فضیلت دی۔ جب خدا نے تمہیں قوم فرعون کے پنج سے چھڑایا جو تمہیں بڑے بڑے دکھ دیتے۔ تمہارے لڑکوں پر تو چھری پھیرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔ جب خدا نے تمہارے لیے دیا کو نکٹے نکٹے کر دی اور تم کو بچا کر فرعون کے آدمیوں کو تمہارے دیکھتے دیکھتے ڈبو دیا۔ جب خدا نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلوٹی اتارا۔ جب موئی نے اپنی لاثمی پتھر پر ماری اور اس

میں سے تمہارے لیے پانی کے باہر چھٹے پھوٹ نکلے۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن بھی یاد کرو جب خدا نے تم سے عمد لیا تھا کہ تم حق کے ساتھ باطل کونہ ملانا اور خدا کی آیات کو سستے دامون نہ بیچنا، لیکن تم اس وعدہ کو وفا نہ کر پائے اور تم نے بڑی ہٹ دھرمی سے بچھڑے کو اپنا خدا بنا لیا۔ تم نے من و سلومنی کی نعمت کو ٹھکرا کر ساگ پات اور ککٹری اور لمن اور مسور اور پیاز کی فرمائش کی۔ اپنی اکڑ میں آ کر تم نے بعض پیغمبروں کو جھٹالیا اور بعض کو ناحق جان سے مار ڈالا اور خدا نے تمہاری نافرمانیوں کی پاداش میں کبھی تم کو خود اپنے ہاتھوں سے ایک دوسرے کو قتل کرنیکا حکم دیا۔ کبھی تم کو بجلی نے لے ڈالا۔ کبھی تم راندہ درگاہ ہو کر بندر بنا دیئے گئے۔ کبھی تمہارے سر پر طور کا پہاڑ لٹکا دیا گیا۔

اے بنی اسرائیل! بے شک تمہارے دل پتھر ہو گئے ہیں، بلکہ اس سے بھی نیا وہ سخت۔ پتھروں میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے نہیں جاری ہو جاتی ہیں اور بعض ہوتے ہیں کہ ان میں دراڑ پڑ جاتی ہے اور ان سے پانی رنسے لگتا ہے۔

اے بنی اسرائیل! آج تمہاری نسل بالکل اسی طرح مسخ ہو چکی ہے جس طرح کہ تم نے خدا کے کلام تورات کی شکل بدل ڈالی تھی۔ تمہاری رگوں میں جو لوگوں کو رہا ہے، اس میں اسرائیلی خون کی آمیزش بہت ہی کم ہے۔ ہزاروں سال سے تم دنیا کے گوشے گوشے میں مارے پھر رہے ہو اور تمہاری نسل دوسری قوموں میں غلط ملط ہو کر اب اپنی کوئی امتیازی حقیقت نہیں رکھتی۔ یوں بھی تم نے خدا کے رسولوں کی جگہ اب امریکہ اور انگلستان میں اپنی مرضی کے پیغمبر تلاش کر رکھے ہیں اور تمہاری موجودہ تورات ”اعلان بالغور“ ہے لیکن یاد رکھو، اس عرب بچی کا سما ہوا دل اور اس کی غم دیدہ ماں کی دلی ہوئی آہ تمہارے سر پر کوئی طور سے بھی نیا وہ خطرناک پہاڑ کی طرح لٹک رہا ہے۔ اس معصوم لڑکے کی نگاہ میں غصب ناک، قبرناک، زہرناک بجلیاں تڑپ رہی ہیں اور اگرچہ آج کل بندر بنانے کا رواج عام نہیں، لیکن خدا اپنے وعدہ

کا سچا ہے۔ تم امریکہ اور انگلستان میں ڈھلنے ہوئے سونے چاندی کے پچھروں کی جس قدر جی چاہے پوچھا کر لو، لیکن عذاب کا جو طوق تمہاری گردن میں پڑا ہوا ہے، اس سے تمہیں نجات نہیں مل سکتی۔

قاہرہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ مصر کی انقلابی حکومت نے حاجیوں کی آمد و رفت کے لیے نہایت اعلیٰ درجہ کے انتظامات کر رکے ہیں۔ حاجیوں کو لے کر ہر روز دو ہوائی جہاز پرواز کرتے تھے۔ ہر تیرے روز ایک سمندر جہاز بھی جدہ کے لیے روانہ ہوتا تھا۔ وزارت خارجہ کا جو افسران انتظامات کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ وہ میری درخواست دیکھ کر بڑا چیس بھجیں ہوا۔

”آپ پاکستانی ہو کر انگریزی میں درخواست کیوں لکھتے ہیں؟“ اس نے میری جواب طلبی کی۔

میں نے معدودت کی کہ مجھے عربی نہیں آتی، اس لیے درخواست انگریزی میں لکھنا پڑی۔ ”آپ کی اپنی زبان کیا ہے؟“ افسر نے پوچھا۔

”اردو“ میں نے جواب دیا۔

”پھر انگریز کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟“ افسر نے طنزیہ پوچھا۔

میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چاہہ نہ تھا کہ میں یہ تسلیم کروں کہ انگریزی کے ساتھ میرا فقط غلامی کا رشتہ ہے۔

میرا یہ اقبال جرم سن کر افسر مطمئن ہو گیا اور بولا۔ ”اس صورت میں بہتر یہی تھا کہ آپ اپنی درخواست اردو ہی میں لکھتے۔“ پھر اس نے کچھ عرصہ تک ہر ملک کی قوی زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ غلامی کے دور کی یادگاروں کی ندمت کی اور پھر انقلاب مصر کے حوالے سے عرب نیشنلزم کی فضیلت پر ایک دھواں دھار تقریر کی۔ اس کے بعد اس نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے ایک مصری جہاز ”السودان“ میں جدہ تک سفر کرنے کی اجازت دے دی۔

اگرچہ مصر کا علامتی صدر ابھی تک جزل نجیب ہی تھا، لیکن ملک میں اصلی ڈنکہ جمال

عبدالناصر کا بیج رہا تھا۔ چاروں طرف عرب نیشنلزم کا تصور زور شور سے ابھر رہا تھا اور مختلف طبقات میں مختلف رنگ کے جذبات پیدا کر رہا تھا۔ اس کا ایک رنگ حاجی موسیٰ رضا کی دکان کا رنگ تھا۔ یہ دکان اندر وہن قاہرہ ایک بیجید ٹنگ اور گنجان بازار میں واقع تھی اس بازار میں چٹائیاں، پلنگ، جوتے، اچار، ہلدی، مرچ، شربت، کباب اور تربوزوں کی کئی ہوئی قاشیں برس رعام دوش بدش فروخت ہو رہی تھیں۔ حاجی موسیٰ رضا کی دکان میں یہ خصوصیت تھی کہ اس میں پھلوں اور سبزیوں کے علاوہ پرانی بوسیدہ کتابوں کے انبار تھے اور ایک کونے میں قدیم مصری نوادر کا مجموعہ بھی تھا۔ پھلوں میں ایک نوکری آموں کی تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ میہہ ہندوستان سے آیا ہے یا پاکستان سے؟

”جی نہیں۔“ حاجی موسیٰ رضا نے برا منا کر کہا۔ ”یہ پھل خاص مصر کی پیداوار ہے“ اور پھر اس نے بڑی تفصیل سے مجھے باری باری وہ پھل اور سبزیاں دکھائیں جو وادی نیل کی خاص پیداوار ہیں۔ ان پھلوں اور سبزیوں میں انار بھی تھے۔ انگور بھی، آلو بھی اور لوکی اور چقندر بھی جس انداز سے حاجی موسیٰ رضا مجھے ان سے متعارف کر رہا تھا، اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اب اگر میں یہ کہوں کہ یہ اشیاء دنیا کی کسی اور نہیں میں بھی پیدا ہوتی ہیں، تو حاجی موسیٰ رضا پھر برا منائے گا کہ میں آب نیل کی بے حرمتی کر رہا ہوں!

حاجی موسیٰ رضا کی دکان میں جو نوادرات تھے، وہ اکثر فرعونوں کے مقبروں سے نکلے ہوئے زیوروں، برتوں، منقش پتھر کی سلوں وغیرہ پر مشتمل تھے حاجی صاحب کا بیٹا جو بیروت کی یونیورسٹی کا انڈر گریجویٹ تھا، بڑی فصاحت سے گاہوں کو ان نوادرات کے حوالے سے مصر کی شاندار تہذیب کا پس منظر سنایا کرتا تھا۔ قاہرہ اور اسکندریہ کی بڑی بڑی دکانوں میں عورتوں کے ملبوسات کی بناوٹ اور زیورات کے نقش و نگار کا رجحان بھی زمانہ فراعین کے فیشننوں کی طرف مائل تھا اور تزئین و آرائش کے جملہ لوازمات صریحاً ان خطوط کی پیروی کر رہے تھے جو آج سے کئی ہزار سال پہلے مصر کی تہذیب و تمدن کا طرہ امتیاز تھے۔ اگر آپ مصر کی اصلی اندروںی زندگی دیکھنے کی خواہش کا اظہار کریں، تو قاہرہ

کے سند یافتہ نورست گائیڈ آپ کو ایک خاص ریستوران "عمر خیام" میں لے جائیں گے جو باہر سے قدرے غیر آباد نظر آتا ہے۔ اندر ایک چوکور کمرہ ہے جس کے دروازوں پر سرخ باتات کے پردے لٹک رہے ہیں دیواروں کے ساتھ ساتھ گاؤں تکیے لگے ہوئے ہیں اور فرشی نشتوں کے سامنے کھانا کھانے کے لیے لکڑی کی چھوٹی چھوٹی چوکیاں رکھی ہوئی ہیں۔ کمرے میں بیجید مدھم روشنی سے اور دیواروں پر چاروں طرف فرعونی مقبروں کے اندروںی مناظر کی تصویریں اور علامتیں آؤریاں ہیں۔ پردوں کے پیچھے کسی جگہ آرکشرا بج رہا ہے، جو نظر نہیں آتا اور اس کی دھن پر ایک لڑکی آپ کے سامنے طرح طرح کے بل کھا کھا کر ناچنے لگتی ہے۔ لڑکی کی کمر اور پنڈلیاں اور باہیں اور سینہ کھلا ہے اور اسکے باقی جسم پر جو باریک لباس ہے وہ پرانی تصویریں کے مطابق فرعونوں کے دببار کی رقصائیں پہنا کرتی تھیں۔ ریستوران کے عملے میں سے ایک خوش پوش معزز نما انسان آپ کے پاس آ کے بیٹھ جائے گا اور سرگوشی کے انداز میں اس لڑکی کے ناج پر محققانہ تبصرہ کرنے لگے گا کہ یہ ناج کس فرعون کی محبوب رقصہ کا خاص ناج ہے اور اسے کتنے مقبروں کے اندروںی نقش و نگار کی تحقیق کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے دل اور دماغ پر اس ناج اور بصرے کا خاطر خواہ اثر ہو رہا ہے، تو یہ خوش پوش، معزز نما شخص بڑی رازداری سے اپنی جیب سے ایک الہم نکال کر آپ کے ہاتھ سنتے داموں فروخت کرنے کی پیش کش کرے گا۔ اس الہم میں بہت سے فرعونوں کی جنی عیش کوٹی کے خفیہ راز پوشیدہ ہیں۔

تصویریں کے بعد یہ خوش پوش، معزز نما انسان آپ کو چند مقوی طلا اور تیل خریدنے کی ترغیب دے گا، جن کے نئے تین ہزار سال پرانے مقبروں کے کتبوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔

چوٹیاں ہوں یا بندے، سبزیاں ہوں یا قدم نواذر، جنی تصویریں ہوں یا مقوی ادویات.....  
قاہرہ میں زندگی کا ہر رخ فرعونوں کی تہذیب سے رشتہ جوڑ کر فخر محسوس کرتا ہے۔

یہاں پر نئی نسل کا ایک ایسا طبقہ بڑی سرعت سے نشوونما پا رہا ہے جس کا تصوری، فکری اور عملی مطیع نظر اس قدر شدید جذبہ قومیت ہے کہ اس کے سامنے دین کی حیثیت محفوظی اور ضمیمی ہے جاتی ہے۔ اس کتب خیال کی نظر میں مصر کی تہذیب کا اصلی ورش زمانہ فراعین کے آثار ہیں۔ اس تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں وہ اسلام کو ایک ثانوی سی تحریک شمار کرتے ہیں، جو تیرہ چودہ سو برس قبل اس سر نہیں پر آئی اور اپنے ساتھ کئی دیر نقوش لائی۔ دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح مصر کے عوام بھی بڑے مخلص اور سیدھے سادھے مسلمان ہیں۔ یہ صرف نئی روشنی کے نوجوانوں کا ایک طبقہ ہے، جو نیشنلزم کی شدید رو میں بہہ کر اسلام کو اپنی قومیت کی بنیاد نہیں بناتا، بلکہ ہزاروں سال پہلے کے زمانہ کفر و ضلالت کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کر کے فخر و مبارکہ محسوس کرتا ہے فرازدنی اس طبقے کی منہ بولتی مثال ہے۔

فرازدنی سے میری ملاقات ایمسٹرڈم کے رائک میونیم میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں پر آثار قدیمہ کی بحالی، تجدید اور حفاظت کا فن سیکھنے آئی تھی اور اب مصر کے کسی شفافی ادارے میں بڑے اچھے عمدے پر فائز تھی۔ قاہرہ میں ایک روز اس نے مجھے اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا۔ شر کے جس حصہ میں اس کی رہائش تھی، اس کا نام امام شافعی تھا۔ اس علاقے میں اینٹوں اور سینٹ کے بے شمار کچے مکانات سلسلہ وار بنے ہوئے تھے، اور ان کی تعمیر میں ایک غیر معمولی یکسانیت نمایاں تھی۔ دیکھنے کو تو وہ رہائشی مکان نظر آتے تھے، لیکن یہ محلہ امیروں کا قبرستان تھا۔ قاہرہ کے کھاتے پیتے لوگ اپنے مردوں کو عوامی قبرستان میں دفن کرنے کے قائل نہیں ہیں جس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے شاہان مصر اپنی قبروں پر بلند و بالا اہرام تعمیر کرتے تھے، اسی طرح قاہرہ کے امرا آج بھی اپنی لاشوں کی تدفین کے لیے کچے کمروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہر خاندان کے لیے ایک الگ چار دیواری ہوتی ہے۔ اس کے اندر ایک کشاہی صحن ہے، جس کے نیچے دو نہیں دو زکرے ہوتے ہیں۔ ایک کمرہ مردانہ لاشوں کے کے مخصوص ہوتا ہے،

دوسرے عورتوں کے لیے۔ جب کبھی کوئی نئی میت تیار ہوتی ہے، تو پرانے مردے کی ہڈیوں کو سمیٹ کر ایک کونے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور نئی لاش کو ان تھے خانوں میں لے جا کر ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد تھے خانوں کے دروازے کو بڑی بڑی سلوں کے ساتھ پاٹ دیا جاتا ہے اور جن سیڑھیوں کے ذریعہ ان نئیں دوز کروں میں اتر جاتا ہے۔ ان کے بالائی حصہ کو بھی پتھر کی سلوں سے بند کر دیا جاتا ہے۔ باہر صحن کے ایک کونے میں ایک باقاعدہ کمرہ بھی بنا ہوتا ہے۔ خاندان کے لوگ بعض تقاریب پر یہاں آ کر ٹھہرتے ہیں۔ فاتحہ درود پڑھا جاتا ہے۔ قرآن خوانی ہوتی ہے اور یوں بھی رات کے وقت شر کی آبادی ان کمروں سے اور بھی کئی طرح کے کام لینا جانتی ہے۔

اس انوکھے شر خوشیاں سے گزر کر ایک نگلی میں فرازدنی کا گھر تھا۔ گھر کی عمارت باہر سے کھنڈ اور بویسیدہ تھی، لیکن اندر جا کر دیکھا تو کچھ اور ہی عالم پایا۔ فرازدنی کا اپنا کمرہ جدید ترین فرنچیپ سے آراستہ تھا۔ دیواریں فرعونی مقبروں کے آثار، علامات اور نقوش سے بھری پڑی تھیں۔ ایک طرف مغربی موسیقی کے ساز اور بے شمار ریکارڈ جمع تھے۔ دوسری طرف ہوٹلوں کے بار روم کی طرح رنگ برنگ سینپھون کی بنی ہوئی تپائی تھی، جس پر کئی قسم کی شراب کٹ گلاں کی خوبصورت صراحیوں میں سمجھی ہوئی تھی۔ تیرے کونے میں زرد فارمیکا کی شفاف میز کے پیچھے بجلی کا ایک خوبصورت چھوٹا سا آٹویٹک پکن تھا، سب سے پہلے فرازدنی نے میرے ساتھ اس بات پر گھری ہمدردی کا اظہار کیا کہ میں اس قدر گرم موسم میں خواہ مخواہ حج پر جانے کا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ پھر اس نے اپنی دیواروں پر لگے ہوئے نقوش و نگار کی وضاحت کر کے فرعونی زمانوں کی تہذیبی و تمدنی عظمت پر طویل تقریر کی اور مسلمانوں کے دل میں فرعون کے خلاف جو بعض بھرا ہوا ہے، اس پر بڑی کڑی تنقید کی۔ اس کے بعد وہ بجلی کا چولما جلا کر چائے بنانے میں مصروف ہو گئی اور مجھے حکم دیا کہ سینڈوچ بنانے کے لیے میں اس کی الماری سے اپنی پسند کی کوئی چیز نکال لوں۔ فرازدنی کا نعمت خانہ طرح طرح

کے سامان سے لدا ہوا تھا، لیکن جتنے ڈبے میں نے اٹھائے۔ ان سب میں لحم خزیر کا حصہ غالب تھا۔ اس لیے میں نے صرف خشک بسکٹوں کا ایک پکیٹ نکلا۔ میری اس حرکت پر وہ ہنسنے لگی، اور بولی۔ ”مسلمان آپ ہی نہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں،“ لیکن میں نے اپنے ذہن کو ان قیود سے آزاد کر لیا ہے جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔“

ترقی کی اس بے معنی منطق کے بعد فرازدنی مجھے اپنے باپ سے ملانے مکان کے ایک دوسرے حصے میں لے گئی۔ یہاں ایک اور طرفہ تماشا دیکھا۔ ایک نیم تاریک کمرے میں سانچھ پینیشہ سال کے ایک بزرگ گاؤں تکیہ لگائے قالین پر بیٹھے تھے۔ ان کا رنگ گندھے ہوئے میدے کی طرح سفید اور ملائم تھا۔ ان کی واڑھی سنری اور فرنچ کٹ تھی اور ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور سرخی جھلک رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ بت سے اونچے اونچے گلدان تھے، جن میں نیم سوتھہ اگربیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ دیواروں پر فلکیات کے نقشے اور اجرام فلکی کی تصاویر آؤ رہا تھیں۔ سامنے ایک تپائی پر بت سے جنتریاں اور کچھ کہ ارض کے گلوب اور چند اصطلاح پڑے تھے۔ فرازدنی نے شکوہ کیا کہ اس کا باپ اس قدر قدامت پرست ہے کہ ابھی تک بابل اور ہاروت اور ماروت کے زمانے سے آگے نہیں بڑھا۔ عملیات اور جادوگری اس کا پیشہ تھا۔ مصر میں جادوگری خلاف قانون ہے۔ یہ صاحب دو بار جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ لیکن اب بھی صبح و شام حاجت مندوں کا ان کے ہاں تافتہ بندھا رہتا تھا۔

فرازدنی کے والد بزرگوار نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اور نمایت تپاک سے اپنے قریب بٹھایا۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ ان کے جادو ٹونے کی شرت سن کر ایک نیا گاہک ان کے دام میں آیا ہے، لیکن جب فرازدنی نے انہیں آگاہ کیا کہ میں مفت کا ملاقاتی ہوں اور عنقریب جج پر جا رہا ہوں، تو اس مرد بزرگ کی گرمجوشی یک لخت سرد پڑ گئی اور انہوں نے بے اعتمانی سے منه موڑ کر ایک جنتری کا مطالعہ شروع کر دیا۔

والد صاحب سے فارغ ہو کر فرازدنی مجھے اپنی والدہ کے پاس لے گئی، جو پچھلے برآمدے

میں جاء نماز پر بیٹھی تسبیح کرنے میں مشغول تھی۔ فرازدنی نے جب اسے بتایا کہ میں حج پر جا رہا ہوں، تو اس بزرگ خاتون کی آنکھوں میں تیز تیز چمک آئی۔ جانماز سے انھے کر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، اور پھر ہاتھ اٹھا کر میرے لیے دعائے خیر کی۔ قاہرہ کے اس گھر کی ایک چھت کے نیچے زندگی کے تین دھارے بھے رہے تھے۔ ایک طرف صاحب خانہ تھا، جو فلکیات، عملیات اور قدیم ساحری کی بھول بھلیوں میں مال و دولت کی تلاش میں سرگردان تھا۔ دوسری طرف اس کی فیشن ایبل بیٹی تھی جو پرانی کافرانہ تہذیب کے مردہ خانوں میں نئی روشنی کے چراغ لے کر لذت پرستی کے ٹلنت کدوں میں بھلک رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان فرازدنی کی بے زیان ماں تھی جو اپنی جانماز پر اللہ کی رسی مضبوطی سے تھاے بیٹھی تھی۔

بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبروں اور ظالم اور سرکش فرعونوں کی اس سرنیں پر خروش  
کی قوتیں عجیب و غریب روپ دھار کر نت نئے انداز سے ایک دوسرے کے ساتھ دست  
و گریباں تھیں، لیکن حق تو ہے کہ مصر کے سواد اعظم کا دل اور دماغ اسلام کے رشتے  
میں اسی طرح پرواہ ہوا ہے جس طرح کہ دنیا کے اور مسلمانوں کا، اس کا روح پرور  
نظامہ میں نے حاجیوں کے جہاز ”السودان“ میں دیکھا۔

## • سرابے منزل

جس وقت "السوڈان" نے اساعیلیہ کی بندگاہ سے لفڑ اٹھایا، اس میں ساڑھے سات سو عازمین حج سوار تھے۔ اس سارے قافلے میں فقط میں ایک غیر مصری مسافر تھا۔ میرے پاس ڈیک (Deck) پر سفر کرنے کا ٹکٹ تھا۔

URDU4U.COM

جہاز چلتے ہی مائیکروفون پر اعلان ہوا کہ پاکستانی مسافر بالائی عرشہ پر کپتان سے آ کر ملے۔ ایک سیوارڈ میری رہنمائی کر کے اوپر لے گیا۔ جہاز کا کپتان نہایت چاق و چومند نوجوان تھا اور بڑی روانی سے شتر انگریزی بولتا تھا۔ اس نے میرے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کا معاونہ کیا اور پھر قوہ پلا کر پاکستان میں میری ملازمت کی نوعیت کے متعلق کچھ سوالات کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنے عملے کے ایک آدمی کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ مجھے ساتھ لے جا کر محمد نوفل کے کیبین میں برتحہ دلوادے۔

محمد نوفل اسکندریہ کے بہت بڑے تاجر، صنعت کار اور رئیس تھے۔ وہ دس برس سے ہر سال متواتر حج پر جا رہے تھے۔ دو برتحہ کا پورا کیبین انہوں نے اپنے لیے ریزرو کروایا ہوا تھا۔ ایک برتحہ پر وہ خود بیٹھے تھے۔ دوسرے برتحہ پر ان کا سامان بکھرا پڑا تھا۔

جہاز کے ملازم نے عربی میں انہیں کچھ کہا اور نوفل صاحب نے اہلا و سلطہ کہہ کر بڑی خوشی سے اپنا سامان اٹھا کر دوسرا برتحہ میرے لیے خالی کر دیا۔

نوفل صاحب کی رفاقت میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ وہ بڑی اچھی انگریزی بولتے تھے اور مناسک حج کے متعلق مجھے ان سے نہایت مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ پاکستان کے متعلق وہ نیا دہ نہ جانتے تھے۔ شام کو مغرب کی نماز کے بعد انہوں نے بہت سے لوگوں کو اپنے ڈیک پر جمع کیا، اور فرمائش کی کہ میں انہیں پاکستان کے متعلق کچھ باتیں بتاؤ۔ جہاز کا کپتان اور اس کے عملے کے کچھ افراد بھی وہاں آ کر بیٹھے گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر میں نے انہیں تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے چیزوں چیزوں واقعات سنائے۔

میں انگریزی میں ٹھہر ٹھہر کر بولتا تھا اور نوفل صاحب اس کا عربی میں ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ آزادی کے وقت لاکھوں مسلمانوں کی شادوت، عورتوں کی بے حرمتی اور مهاجرین کے حالات سن کر سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ جب میں نے انہیں پاکستان کی آبادی، رقبہ اور دیگر تفصیلات بتانے کے بعد یہ کہا کہ دنیا کی اس پانچھویں بڑی مملکت کا نصب العین یہی ہے کہ: ”پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ“ تو سارے مجع نے بے ساختہ کلمہ طیبہ کا ورد کیا اور پھر سب نے کھڑے ہو کر پاکستان کے حق میں دعا مانگی۔ محمد نوفل صاحب بلند آواز سے دعا کے الفاظ بولتے تھے اور باقی سب لوگ زور سے آمین آمین کہتے تھے۔ اس کے بعد کپتان نے قبوہ کا آرڈر دیا۔ یکے بعد دیگرے بت سے لوگوں نے مجھے قوے کے اتنے فنجان پلائے کہ اس کی حدت سے مجھے رات بھر کئی بار نکسیر پھوٹی۔

یوں بھی بحر احمر میں گری اپنے پورے شباب پر تھی۔ سمندر کی لمبیں جہاز سے نکراتی تھیں تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے چاروں طرف بڑی دیگوں میں ابلا ہوا پانی جوش کھا رہا ہے۔ ہوا بھاپ کی طرح گلی گلی سی تھی اور فضا کا سارا ماحول گرم پانی میں بھیگنے ہوئے کمبلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دن بھر کیبین کی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے کھولتے ہوئے پانی کے پنالوں کی طرح اندر گرتے تھے۔ رات کو پورٹ ہول کی ہوا نیم گرم بخارات کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ کچھ کمروں میں بھلی کے نکھے لگے ہوئے تھے، لیکن ان کی گردش رطوبت سے لدی ہوئی بو جھل ہوا کو اپنی جگہ سے ہلانے سے قاصر تھی۔ دھوپ میں آفتاب کی کرنیں لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی طرح لٹک رہی تھیں اور جہاز کے ہر مسافر کا چرہ پینے کی جھار میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے باوجود عانین حج کی نولیاں بڑے اطمینان سے عرش پر جا بجا بیٹھی تھیں۔ کچھ لوگ تلاوت قرآن میں مصروف تھے۔ کچھ تسبیح کر رہے تھے۔ کچھ حج کی دعائیں یاد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں محمد نوفل صاحب بھی کرسی پر بیٹھے تھے اور کئی ہوئی برف کی

پوٹلی بار بار سر پر پھیر رہے تھے۔

دھوپ میں اطمینان سے بیٹھے ہوئے عازمین حج کی طرف دیکھ کر محمد نوفل نے سرد آہ بھری اور کہا۔ ”میں بھی ان لوگوں کا ہم وطن ہوں، لیکن ہمارے درمیان ایک بہت بڑا فرق ہے۔ یہ غریب لوگ ہیں۔ ان کے سینے میں قناعت کی اتنی خنکی ہے کہ گرم موسم کی شدت ان پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میں بڑا کامیاب تاجر اور صنعتکار ہوں۔ میں جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں اس پر ہن برنسے لگتا ہے، لیکن میرا دل نہیں بھرتا میرے اندر ہر وقت حرص کی بھٹی سلکتی رہتی ہے۔ سردی کے موسم میں بھی برف کے بغیر میری پیاس نہیں بجھتی۔“

میں نے اسے ایک بزرگ کا مقولہ سنایا کہ دنیا کی مثال آدمی کے سایہ کی سی ہے اگر کوئی اپنے سایہ کی طرف دوڑے تو وہ اس کے آگے ہی آگے بھاگتا نظر آئے گا اور اگر سایہ کو پس پشت ڈالے تو وہ خود اس کا چیچھا نہ چھوڑے۔ جو کوئی دنیا کو ترک کرتا ہے دنیا اس کا چیچھا کرتی ہے اور ترک کرنے والے کو تلاش کرتی ہے اور جو کوئی طلب دنیا میں کوشش کرتا ہے، اسے لچا لچا کر کوسوں دور بھاگتی ہے۔

محمد نوفل نے ماہی سے سر ہلا کر کہا۔ ”میرے لیے دونوں حاتمیں یکساں ہیں۔ میں دنیا کے چیچھے بھاگوں یا دنیا میرے چیچھے بھاگے۔ دونوں صورتوں میں حرص کی آگ میرے تن من میں بدستور بھڑکتی رہتی ہے۔

محمد نوفل کا یہ دسوائی حج تھا۔ ہر سال حج کے موقع پر وہ کمہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں لاکھوں یاں کی خیرات بانٹ کر آتے تھے۔ ”لیکن“ انہوں نے بڑی حسرت سے کہا: ”حضوری کی جو کیفیت مجھے پہلے حج میں حاصل ہوئی تھی۔ وہ بعد میں کبھی نصیب نہیں ہوئی اس وقت میں بالکل غریب تھا اور میرے پاس معلم کی فیس ادا کرنے کے لیے بھی پوری رقم موجود نہ تھی۔ اب یاں سے بھرے ہوئے تھیں مجھے اپنے حضور میں حاضر رکھتے ہیں۔ طواف کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کا گھر مجھ سے ہزاروں میل دور رہتا ہے۔“

اس قسم کی باتیں کرتے محمد نوفل کی چیخ نکل گئی اور وہ بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر بہت سے عازمین حج وہاں جمع ہو گئے۔ اپنے ملک کے اتنے بڑے رئیس پر گریہ و زادی کا یہ عالم دیکھ کر ان پر بھی رفت طاری ہو گئی اور وہ بڑے خضوع و خشوع سے باآواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ذکر کا یہ حلقة پہلیتا گیا اور سارے عرشہ پر تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہی۔

اگلے روز نماز عشاء کے بعد اعلان ہوا کہ رات کے ساڑھے گیاہ بجے جہاڑ میقات حرم سے گزرے گا۔ اس لیے سب لوگ احرام باندھنے کی تیاری کر لیں۔ یہ اعلان سنتے ہی مسافروں میں بھل کی رو دوڑ گئی اور سب لوگ احرام کی تیاریوں میں منہک ہو گئے۔ ان میں بڑھے بھی تھے جوان بھی تھے، عورتیں بھی تھیں، مرد بھی تھے اور ان سب کے ذوق و شوق میں پیا ملن کی آس رنگیں پچکاریوں کی طرح سارے جہاڑ کو شرابور کر رہی تھی۔ ساڑھے گیاہ بجے تک سب مسافر احرام باندھ کر جہاڑ کے عرشوں پر جمع ہو گئے۔ گیاہ نج کر چالیس منٹ پر جہاڑ کا سائز بجا اور ساڑھے سات سو حاجیوں نے بیک زبان تلبیہ کا آواونہ بلند کیا۔

لَبِيكَ اللَّهُمَّ لَبِيكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبِيكَ اَنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَةَ

اے اللہ میں تیرے دبار میں حاضر ہو گیا۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ تحقیق ہر طرح کی تعریف اور نعمت

لَكَ وَالْمَلَكُ لَا شَرِيكَ لَكَ۔

تیرے لیے ہے اور ملک تیرے لیے ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

تلبیہ کا نظرہ لگاتے ہی ساڑھے سات سو افراد کا یہ مجمع چشم زدن میں خالق کائنات کے حضور میں جا کھڑا ہوا۔ اس مجمع میں پاکباز بھی تھے، گناہگار بھی تھے۔ ہوسکار بھی تھے قاعات شعار بھی تھے، خوش اخلاق بھی تھے، بیاکار بھی تھے۔ عبادت گزار بھی تھے۔

غفلت کا شکار بھی تھے، لیکن اس وقت وہ سب بلا کسی امتیاز کے ایک ہی وردی میں ملبوس

ایک ہی قطار میں کھڑے ہوئے، ایک ہی کلمہ پڑھتے ہوئے اپنے پروڈگار کی بارگاہ میں بیک وقت حاضر تھے، کسی فرشتے نے ان کے لیے رسائی کا دروازہ نہ کھولا تھا۔ کوئی ابیس ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا تھا۔ وہ تو بس اپنے رسول کے بتائے ہوئے چند کلمات زیان پر لاتے ہی کھٹ سے اس بادشاہ کے دببار میں پہنچ گئے تھے جس کا کوئی ثانی ہے نہ شریک۔ جس کے چھانک پر نہ کوئی پھرہ ہے نہ دربان، نہ اے ڈی سی ہے، نہ پی اے ہے، نہ سیکرڈی ہے، نہ ملٹری سیکرڈی ہے۔ رات کے نائل میں تلبیہ کی گونج کالی گھناؤں میں بھل کی چمک کی طرح کوندی تھی۔ جماز کے انجن کی چمک چمک اور سمندر کی لبروں کی شاں شاں کسی کو سنائی نہ دیتی تھی۔ بھرا احمر کا پانی کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ آسمان کے تارے بھی سب کی آنکھوں سے او جھل تھے۔ ساری کائنات ایک خلا بن گئی تھی جس میں عبد اور معبد کے علاوہ اور کسی کا وجود باقی نہ رہا تھا۔ اگلے روز صبح سوریے "السودان" جدہ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہو گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس مقدس سرنیشن پر سر کے بل اتروں، لیکن میرے ہاتھوں میں سامان اور سر پر گناہوں کی گنجیدھی تھی اس لیے اس خواہش کو عملی جامہ پنانے سے قاصر رہا۔ کشم ہاؤس کے آس پاس بہت سے معلموں کے وکیل اپنا اپنا دفتر لگائے بیٹھے تھے ایک جگہ عبدالرزاق محبوب معلم کا بورڈ لیکا ہوا تھا اور اس کے اردو گرد سہلٹ کے بہت سے بنگالی زائرین جمع تھے۔ معلم کا وکیل حساب لگا کر انہیں چیخ چیخ کر سمجھا رہا تھا کہ جس کے پاس تین سو پچاسی بیال کی رقم موجود نہیں، وہ نہ چیخ کے اخراجات پورے کر سکتا ہے اور نہ مدینہ منورہ کی نیارت سے فیض یاب ہو سکتا ہے جو شخص اسے پوری رقم گن کر دکھا دیتا تھا وکیل اس کا نام معلم کے رجسٹر میں درج کر لیتا تھا۔ میں نے بھی تین سو پچاسی بیال نقد دکھا کر عبدالرزاق محبوب کو اپنا معلم مقرر کر لیا۔ اس وقت میرے پاس بارہ سو بیال کی رقم موجود تھی۔ اس میں تین سو پچاسی بیال اپنے لیے رکھ کر باقی آٹھ سو پندرہ بیال میں نے چپکے سے شاکر میاں اور تقاضل علی میں برابر بانٹ

دیئے، جو خالی ہاتھ تھے اور معلم کے وکیل نے انہیں اپنے رجسٹر میں درج کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ شاکر میاں اور تفضل علی نے سمجھا کہ گری کی شدت سے میرا دماغ چل گیا ہے اور میں یہ حرکت دماغی توازن خراب ہو جانے کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ انہوں نے یہ ساری بات معلم کے وکیل کو بتائی وکیل نے بھی اس بات کی تائید کی کہ گری نے میرے دماغ میں خلل ڈالا ہوا ہے۔ جب میں نے بت اصرار کیا، تو وہ مجھے کشم ہاؤس کی پولیس چوکی میں لے گئے۔ ہم سب کے بیانات سن کر پولیس والوں نے حکم دیا کہ یہ رقم معلم کا وکیل اپنے پاس امانت رکھے۔ اگر چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد بھی میں اقرار کروں کہ میں یہ پیسے بقاگی ہوش و حواس شاکر میاں اور تفضل علی کو دے رہا ہوں، تو بے شک ان کو ادا کر دیئے جائیں۔

جده کے حاجی یکمپ میں ہمارے معلم نے اپنی اسمائیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک طبقہ تو آسودہ حال حاجیوں کا تھا جو معلم کی فیس کے علاوہ مکہ معظمه میں اس سے رہائش کرے کرائے پر لینے کی توفیق بھی رکھتے تھے۔ دوسرا طبقہ ہمارے جیسے تین سو پچاسی بیال والوں کا تھا جو بڑی مشکل سے صرف ضروری واجبات ادا کرنے کی پوزیشن میں تھے جده سے مکہ کو روائی کے وقت پہلے طبقہ کو بسوں کے اندر سیٹوں پر بٹھایا جاتا تھا، اور ہمیں چھت پر جگہ ملتی تھی۔

ہماری بس آدمی رات کے قریب مکہ معظمه میں داخل ہوئی۔ معلم عبدالرزاق محبوب کا بارہ تیرہ برس کا بیٹا ہمارے گروپ کو ایک گندے نالے کے کنارے لے گیا اور تمیں پنیتیس گز نہیں گھیر کر اسے ہماری اقامت گاہ قرار دے دیا۔ کچھ لوگ چادریں بچھا کر لیئے گئے، تو معلم کے بیٹے نے ڈانٹا کہ یہ پاؤں پسار کر سونے کا وقت نہیں، بلکہ ہم وضو کر کے تیار ہو جائیں، کیونکہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آ کر ہمیں عمرہ کرانے لے جائے گا۔ ہم نے بھاگ دوڑ کر کسی نہ کسی طرح وضو کیا اور معلم کے بیٹے کے انتظار میں بیٹھے گئے۔ ۹ برخودار ڈھائی تین گھنٹے کے بعد نمودار ہوا اور ہم بیس چھیس

آدمی اس کی رہنمائی میں تلبیہ پڑھتے ہوئے بیت اللہ شریف کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جو شخص حرم شریف میں داخل ہوتا ہے، وہ اپنا جوتا، اپنے گناہوں کی گھٹھڑی، اپنی دستار فضیلت اور اپنی بزرگی کا عمامہ دروازے کے باہر چھوڑ جاتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب وہ باہر آئے گا تو اس کا جوتا، یا اس کے گناہوں کی گھٹھڑی، یا اس کی فضیلت کی دستار، یا اس کی بزرگی کا عمامہ اس کو واپس بھی ملے گا یا نہیں۔ بعض لوگوں کے جوتے گم ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کے گناہوں کی گھٹھڑیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگ اپنی فضیلت اور بزرگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

میرے پاس حرم شریف کے باہر چھوڑنے کے لیے اپنے پاؤں میں ریڑ کے چپل اور سر پر گناہوں کی گھٹھڑی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ میں نے دل و جان سے دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک مارا اور باب السلام کے راستے حرم شریف میں داخل ہو گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی دم بھر کے لیے بھلی سی کونڈی اور نہیں کی کشش ثقل گویا ختم ہو گئی۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گاڑی کو مضبوط بریک لگا کر میرے وجود کو پنکھر شدہ نائز کی طرح جیک لگا کر ہوا میں معلق کر دیا گیا ہو، جیسے میری پنڈیوں کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو رہا ہو، میرے جسم کے اعضا کا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ ٹوٹ سا گیا۔ ہاتھ بے لوج ہو کر لٹک سے گئے اور سر بھنور میں پھنسے ہوئے خس و خاشاک کی طرح بے بی سے چکر کائے لگا۔ اس طرح اپانچ سا ہو کر میں طواف کے لیے آگے بڑھنے کی بجائے بے ساختہ لڑکھڑا کر وہیں بیٹھ گیا۔

نماز فجر کے بعد ہمارے معلم کا بیٹا حاجیوں کی ایک اور پارٹی کو عمرہ کرانے میرے قریب سے گزرا۔ ان کے ساتھ شامل ہونے کو جی تو چاہا، لیکن ہمت نہ ہوئی۔ میرے قریب ہی چند قدم کے فاصلے پر قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی تھی۔ میں نے بھی قرآن شریف کی ایک جلد اٹھائی اور ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر تلاوت شروع کر دی۔ ابھی چند سطریں ہی پڑھ پایا تھا کہ مجھے نیند کے سخت جھوٹکے آنے لگے جیسے کسی نے کلوروفارم

سگھا دیا ہو۔ اب یہ روگ جان کو لا گو ہو گیا کہ ویسے تو میں بالکل چوکس و بیدار رہتا تھا لیکن قرآن شریف کھولتے ہی آنکھیں نیند کے خمار سے بے اختیار بند ہونے لگتی تھیں۔ کچھ دیر اس کشمکش کی اذیت جھیلنے کے بعد میں انھا اور باہر آ کر ڈھونڈتا ڈھونڈتا بڑی مشکل سے اپنی جائے قیام پر واپس پہنچا۔ میرے کچھ ساتھی عمرہ کرنے کے بعد احرام کھول کر آرام سے سو رہے تھے۔ باقی نہیں پر بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ میں نے ان سے بیت الحلا کے متعلق دریافت کیا، تو انہوں نے ایک جانب اشارة کر کے کہا کہ نالے کے ساتھ سیدھے چلتے جاؤ۔ پندھ بیس منٹ میں بیت الحلا پہنچ جاؤ گے۔

کوئی نصف میل چلنے کے بعد ایک کچھ چار دیواری آئی۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے دروازے بنے ہوئے تھے۔ ہر دروازے کے سامنے لوگوں کی طویل قطار ہاتھوں میں لوٹے لیے منتظر کھڑی تھی۔ ایک شخص نے چند قرش لے کر مجھے بھی پانی سے بھرا ہوا لوٹا دے دیا جسے سنبھال کر میں بھی ایک قطار میں لگ گیا۔ کافی دیر کے بعد میری باری آئی۔ میں اندر گیا، تو قدیمے کے اوپر تک بول و برآز کا ڈھیر تیر رہا تھا۔ اندر جاتے ہی مجھے اس قدر زور کی قہ آئی کہ میں پھسل کر پاخانے کی اس دلمل میں گر گیا۔ کمر سے اوپر تک میرا بدن اور احرام غلاظت سے بھر گیا اور میں اسی طرح بدبو اور تعفن میں شرابور نالے کے کنارے واپس پہنچا۔

راستے میں جو کوئی میرے قریب سے گزرتا تھا وہ فوراً گھن کھا کر ناک پر ہاتھ یا کپڑا رکھ لیتا تھا۔ میرے ساتھی بھی میری اس بیت کذاں پر خوب نہیں اور چھی چھی کر کے مجھے اپنی جگہ سے دور بٹھا دیا۔ میرے پاس دوسرا احرام نہ تھا۔ میں نے ایک بنگال ساتھی سے لگنی مانگی اور اسے باندھ کر احرام دھویا اور غسل کیا۔ ظہر کی نماز تک نہ دھو کر میں نے پھر حرم شریف کی راہ لی۔ اب میرے ظاہر سے تو کسی کو بدبو نہ آ رہی تھی، لیکن اپنے اندر کے تعفن سے میرا دماغ بڑی طرح پھٹ رہا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ حج کے ایام میں تین سو ساتھ اولیاء اللہ ہر وقت حرم شریف میں

حاضر رہتے ہیں۔ میں نے حطیم میں کھڑے ہو کر زور زور سے پکارنا شروع کر دیا کہ آپ لوگ جو تین سو سالہ کی تعداد میں یہاں پر فوج در فوج موجود ہیں، آخر آپ کس مرض کی دوا ہیں؟ میرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی ہے اور میں اب تک عمرہ ادا نہیں کر سکا۔ میری آنکھوں میں نیند کا خمار چھایا رہتا ہے اور میں قرآن شریف کی تلاوت سے مغدور ہوں کیا آپ حضرات کے پاس ایسے مریض کا کوئی علاج نہیں ہے؟

میرا خیال تھا کہ میری پکار سن کر حرم شریف کے چاروں کونوں سے نورانی صورت والے خرقہ پوش بزرگ بھاگتے ہوئے آئیں گے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے میری مشکل سے نجات دلوائیں گے، لیکن ایسا کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ البتہ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرے پاؤں طواف کے لیے آزاد ہو گئے اور میری آنکھوں میں تلاوت کے لیے بیداری آگئی۔

نالے کے کنارے میرے بالکل قریب بہاول پور کے ایک خاندان نے ڈیرا لگایا ہوا تھا۔ ایک بوڑھے میاں یوی کے ساتھ ان کی جوان بھو تھی۔ بڑے میاں تو خاموش بیٹھے حصہ پیتے رہتے تھے، لیکن ساس اور بھو میں بات بات پر بڑی طویل لڑائی ہوا کرتی تھی۔ لڑائی میں ہار اکثر بھو کی ہوتی تھی اور ہر شکست کے بعد وہ روتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی تھی اور ساس سے کھتی تھی۔ ”اچھا“ تم نے جتنا ظلم کرنا ہے مجھ پر کر لو۔ میں بھی ابھی جا کر طواف کرتی ہوں اور اللہ میاں کے پاس اپنی فریاد پہنچاتی ہوں۔“

یہ دھمکی سنتے ہی اس کی ساس فوراً پسچ جاتی تھی اور بھو کا دامن پکڑ کر بری لجاجت سے کھتی تھی۔ ”نہ بیٹی نہ۔ تو تو میری بیٹی ہے۔ ایسی غلطی نہ کرنا۔ خواہ مخواہ کوئی اٹھ سیدھی بات منہ سے نہ نکال بیٹھنا۔ طواف میں جو منہ سے نکل جائے وہ پورا ہو کے رہتا ہے۔“

یہ ڈرامہ رات دن میں کئی بار ہوتا تھا۔ ایک روز بڑی شدید گرمی تھی۔ دوپہر کے وقت اچانک آندھی آئی اور خوب تیز بارش ہونے لگی۔ نالے کے کنارے مقیم حاجیوں کا سامان کچھ میں لٹ پت ہو گیا۔ اب ساس بھو میں بڑی سخت چیخ چیخ ہونے لگی۔ غصے

میں آ کر ساس نے بھو کو چوٹی سے کپڑا لیا اور اسے جنجنھوڑ جنجنھوڑ کر کئے گلی۔ ”آج صح طوف میں یہ حرام زادی کہہ رہی تھی۔ اللہ میاں بڑی گرمی ہے۔ اللہ میاں بڑی گرمی ہے۔ اللہ میاں بارش، اللہ میاں بارش۔ اری کالے منہ والی، تمہیں پتہ نہیں یہاں ہر دعا قبول ہو جاتی ہے؟ لے اب بارش کا مزا چکھ۔ اب یہ سالمان تمرا باپ آ کے سکھائے گا۔

اس خاندان سے ذرا ہٹ کر ایک جوان جوڑے کا بیسرا تھا۔ یہ میاں یبوی بے اولاد تھے اور بچے کی آرزو لے کر جو کرنے آئے تھے۔ اپنا پہلا طوف کر کے یہ واپس آئے تو یبوی نے بڑے وثوق سے کہا کہ اب ان کی مراد ضرور پوری ہو جائے گی، کیونکہ طوف کے دوران اس نے اللہ تعالیٰ سے بچہ کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگا۔

”لڑکا مانگا تھا یا صرف بچہ مانگا تھا؟“ خاوند نے وکیلوں کی طرح جرح کی۔

”لڑکے کی بات تو میں نے کوئی نہیں کی۔ فقط بچہ مانگنے کی دعا کرتی رہی۔“ یبوی نے جواب دیا۔

”رہی نہ اوت کی اوت۔“ خاوند نے گبڑ کر کہا۔ ”اب اللہ کی مرضی ہے، چاہے تو لڑکا دے، چاہے تو لڑکی دے۔ اب وہ تجوہ سے پوچھنے تھوڑی آئے گا۔ اس وقت لڑکے کی شرط لگا دیتی تو لڑکا ہی ملتا۔ یہاں کی دعا کبھی نامنظور نہیں ہوتی۔“

یہ سن کر بیچاری یبوی بھی کف افسوس ملنے گلی۔ پھر چمک کر بولی۔ ”کوئی بات نہیں۔ تم کچھ فکر نہ کرو۔ ابھی بہت سے طوف باقی ہیں۔ اگلی بار میں اپنے خداوند کو لڑکے کے لیے راضی کر لوں گی۔“

ان سیدھے سادھے مسلمانوں کا ایمان اس قدر راخ تھا کہ خانہ کعبہ کے گرد طوف کرتے ہی وہ کوئی طور کی چوٹی پر پہنچ جاتے تھے اور اپنے معبود حقیقی سے راز و نیاز کر کے نفس مطمئنہ کا انعام پاتے تھے۔ ان سب کو حق الیقین کی دولت حاصل تھی اور وہ بڑی بے تکلفی سے اپنی اپنی فرمائیں رب کعبہ کے حضور پیش کر کے کھٹاکھٹ قبولیت کی مرجگانی لیتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مجھے اپنی نمازیں، اپنے طوف اور اپنی ادائیں بے

حد سطحی اور کھوکھلی اور بے جان اور جعلی اور نقلی اور فرضی نظر آنے لگیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس لڑاکا ساس اور بہو اور اس نوجوان کی بے اولاد یوی کے پاؤں کی خاک تبرک کے طور پر اپنے سر پر ڈالوں، تاکہ کسی طرح مجھے بھی ان کے یقین حکم کا ایک چھوٹا سا ذرہ نصیب ہو۔

منی کے لیے روانگی مقرر ہوتے ہی مجھے شدید لرزہ کے ساتھ بخار آنے لگا اور ساتھ ہی بڑے زور کی نکسیر چلنے لگی۔ میری علاالت کی خبر سن کر معلم عبدالزاقد محظوظ نصیس نالے کے کنارے آیا اور میری نبض دیکھ کر بولا کہ منی اور عرفات میں بڑی سخت گرمی ہو گی۔ اس حالت میں وہ مجھے اپنے ساتھ ہرگز نہیں لے جا سکتا۔ دوسرے حاجیوں کو اس نے تاکید کی کہ نماز فجر کے فوراً بعد وہ بس پر سوار ہونے کے لیے اس کے ڈیہ کے سامنے جمع ہو جائیں۔ معلم کا حکم سن کر میرے بعض ساتھیوں نے میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ بعض نے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ حج پھر کبھی نصیب ہو جائے گا۔ بعض نے تاسفانہ سر ہلاکا اور خاموش رہے، لیکن بہاول پوری بہو کی لڑاکا ساس کڑک کر بولی۔ ”تم جوان آدمی ہو۔ یہاں ڈھیری ڈھا کر لبے کیوں پڑے ہو؟ جاؤ، اٹھ کر طواف کرو۔ اللہ میاں یہاں تک لاایا ہے تو اب خالی ہاتھ واپس بھیجنے اسے شرم نہ آئے گی؟“

میں اٹھ کر چلنے لگا، تو چلانہ جاتا تھا۔ نقاہت کے مارے میرا برا حال تھا۔ یہ دیکھ کر اس بے اولاد یوی کا جوان سال میاں اٹھ کر آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”آؤ میں تمہیں طوف کر لاتا ہوں۔“

مطاف میں بڑا ہجوم تھا، لیکن اس نوجوان نے بڑی محنت سے سارا دیکر مجھے طواف کرایا۔ ساتھ ہی بلند آواز سے میرے لیے دعا مانگتا جاتا تھا۔ اس دعا اور طواف نے میری ہمت بندھائی اور اس کے بعد میں نے خود ہی کئی طواف اور بھی کئے۔ صبح سوریے میں بھی تانہ دم تھا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ معلم صاحب کے ڈیرے جا پہنچا۔ وہاں

پر صرف ایک بس کھڑی تھی جو سواریوں سے اٹاٹ بھری ہوئی تھی۔ چھت پر بھی لوگ سوار تھے۔ اور تل رکھنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ بس کے اردو گرد سانچھ ستر حاجیوں کا ہجوم جمع تھا۔ معلم کا بیٹا انہیں سمجھا رہا تھا کہ انہوں نے انظام تو تین بسوں کا کیا تھا، لیکن کسی وجہ سے اب تک صرف ایک بس میر آئی ہے۔ اب جو لوگ نیکی کا کرایہ ادا کر سکتے ہیں، وہ نیکی تلاش کر لیں۔ باقی حضرات پیدل منی کو روانہ ہو جائیں۔ یہ سن کر نالے کے کنارے والے میرے ساتھی نہی خوشی پیدل چل پڑے۔ میں بھی ان کے ہمراہ ہو گیا۔

شر سے نکل کر جب کھلی سڑک پر آئے تو احرام پوش مخلوق کا ایک جم غیر سیالب کی لہروں کی طرح منی کی طرف پاپا دہ روائی دواں تھا۔ ان کے درمیان بسوں اور ٹرکوں اور موڑکاروں کی بے ترتیب قطاریں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ ریگ رہی تھیں۔ بڑی سڑک پر پہنچتے ہی نالے کے کنارے والے ساتھی بھی ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اب میں بالکل اکیلا اور آزاد تھا، اور اس آزادی کی لذت ایک تیز و تند نشے کی طرح میری رگوں میں سرسرانے لگی۔ فضا میں تلبیہ کی گونج کا سائبان تنا ہوا تھا اور نہن پر ہزاروں مضطرب قدم تیز رفتاری سے ایک ہی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہر شخص اپنی دھن میں مست اور بے خود تھا۔ ہر شخص گنم تھا۔ ہر شخص بے جنس تھا۔ ہر شخص لا تشخص تھا۔ چلتے چلتے ایک ضعیف العمر آدمی لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ کسی نے اس کی نبض شنول کر اعلان کیا۔ ”خلاص“ کسی دوسرے نے اٹا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ اور اس کی لاش کو گھیٹ کر سڑک کے کنارے لگا دیا۔ باقی لوگ بدستور چلتے رہے۔ لبیک اللہم لبیک۔ منی کے چپے چپے پر کلاہ باراں کی طرح خیموں کی چھتری بنی ہوئی تھی۔ گرد و پیش کی پہاڑیوں پر جا بجا چونے کی سفیدی بکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ قریب جا کر دیکھا، تو یہ چونے کی قلعی نہ تھی بلکہ احرام پوش حاجیوں کے گرد تھے جو پہاڑیوں کی ڈھلوانوں

پر بسیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ ان کی تقلید میں میں نے بھی ایک چٹان کے سائے میں پناہ ڈھونڈھ لی۔ اگلی صبح لاکھوں کا یہ قافلہ میدان عرفات کی جانب روانہ ہوا، ان کے پیچھے پیچھے میں بھی وہاں پہنچا۔ کچھ لوگوں نے جبل رحمت کے دامن میں بیٹھ کر وقوف کیا۔ میں نے بھی کمیں قریب ہی جگہ ڈھونڈھ لی۔ شام کو سب کے پیچھے پیچھے مزدلفہ پہنچا۔ مزدلفہ کی چاندنی رات ختم ہوتے ہی۔ اس عظیم الشان تہائی کے لمحات بھی رخصت ہو گئے جو منی اور عرفات اور مزدلفہ میں لاکھوں کے ہجوم نے مجھے عطا کئے تھے دشت و بیابان اور کنج عزلت کی تہائی میں سکوت ہوتا ہے۔ ہجوم عرفات کی تہائی میں سکون ہی سکون تھا۔

منی واپس پہنچ کر قربانی کے مقام پر اچانک میری ڈبھیز اپنے معلم عبدالرازاق محبوب سے ہو گئی وہ بڑا خوش تھا کہ میں اس کے لیے کسی جگہ بھی درد سر نہیں بنا۔ انعام کے طور پر اس نے قربانی کے سلسلے میں میری خواطر خواہ مدد کی اور دوسرے روز جب ہم کہ معلمہ کو واپس لوئے، تو مجھے اپنی بس کی چھت پر بیٹھنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ کہ معلمہ واپس آتے ہی میرے سر پر مدینہ منورہ پہنچنے کی دھن سوار ہو گئی، لیکن معلم عبدالرازاق محبوب نے بڑی سنگدلی سے مجھے سمجھایا کہ میرے مدینہ شریف روانہ ہونے کی تاریخ سعودی حکومت سے مقرر ہو کر آئے گی۔ اس وقت تک میں صبر سے کام لوں اور بار بار اپنا پاسپورٹ مانگ کر اسے دن نہ کرو۔ ساتھ ہی اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر میں نے مدینہ مدینہ کی رٹ لگا کر اسے نیا ہو ٹنگ کیا، تو وہ رئیس المعلمین کے پاس میری شکایت کر دے گا اور رئیس المعلمین کو اختیار ہے کہ وہ میرا پاسپورٹ ضبط کر کے مجھے پولیس کے حوالے کر دے۔

معلم کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے خانہ کعبہ کی راہ لی۔ راستے میں چلتے چلتے میں دل ہی دل میں بڑی چالبازی اور چلکدستی اور بڑی فن کاری سے ایسے دعاۓیہ فقرے تراشتا خراشتا رہا، جن سے یہ مطلب نہ نکلے کہ میں خدا نخواستہ کہ معلمہ سے ٹنگ آ کر یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں، بلکہ جن سے فقط یہ ظاہر ہو کہ میں اللہ کے رسول

مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت میں مدینہ منورہ جانے کے لیے بے تاب ہوں۔ میں اسی اوھیز بن میں چلا جا رہا تھا کہ سڑک پر سامنے سے پاکستان ایمبیسی کی ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ کار میں سفارت خانے کا کچھ ٹولہ سوار تھا۔ ان میں سے ایک صاحب مجھے پہچانتے تھے۔ انہوں نے کار روکی اور علیک سلیک کے بعد چھوٹے ہی پوچھا:

آپ مدینہ منورہ چلیں گے؟“

”جی ہاں‘ ضرور۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”لیکن کیسے؟“

انہوں نے بتایا کہ خیکی کے راستے آیا ہوا پاکستانی حاجیوں کا ایک قافلہ آج شام جدہ سے مدینہ منورہ روانہ ہو رہا ہے۔ اگر میں اس میں شامل ہونا چاہوں تو ابھی ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر جدہ روانہ ہو جاؤ۔

میں نے بھاگ دوڑ کر کے روا روی میں الوداعی طواف کیا۔ نالے کے کنارے سے اپنے سامان کی پوٹلی اٹھائی۔ ایمبیسی کے عملے نے میرے معلم سے میرا پاسپورٹ وصول کیا اور پورے سارے تین گھنٹے کے اندر اندر میں راولپنڈی کی حج ٹرانسپورٹ کمپنی کے قافلہ میں بیٹھا ہوا جدہ سے بسوئے مدینہ رواں تھا۔ آں خنک شرے کہ آں جا دلبراست!

اس زمانے میں جدہ سے مدینہ منورہ جانے والی سڑک کپی نہ بنتی تھی۔ بس ایک کشادہ سا روزے دار راستہ تھا، جو کہیں سے کچا تھا، کہیں سے سنگاخ تھا، کہیں اوچا تھا، کہیں نیچا تھا اور بسیں اور ٹرک اور موڑ گاڑیاں اس پر ہجکوئے کھاتی کشاں کشاں چلتی رہتی تھیں۔ شدید گرمی کی وجہ سے دن کے بیشتر حصہ میں ٹریفک بند رہتا تھا اور ساری رات اس پر گاڑیوں کی گما گمی رہتی تھی۔ ہمارا قافلہ بھی رات بھر چلتا رہا اور صبح دس بجے کے قریب مدینہ منورہ سے چار پانچ میل اس طرف رک گیا۔ یہاں پر ایک کنوں تھا جس پر رہت چل رہا تھا۔ قافلے والوں نے یہاں اتر کر غسل کیا اور نئے کپڑے پہنے۔ کچھ عقیدت مند بسوں پر دوبارہ سوار ہونے کی بجائے یہاں سے احتراماً پیدل چلنے لگے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دور چل کر خیال آیا کہ

دیار حبیب میں جوتے پن کر داخل ہونا بھی ایک طرح کی بے ادبی ہے۔ میں نے فوراً اپنے چپل کھول کر ہاتھ میں اٹھا لیے اور برہنہ پا چلنے لگا۔ دھوپ میں تپتے ہوئے سگریزوں پر پاؤں پڑتے ہی میرے تکوؤں میں آگ کے شعلے سے لپکے اور حرارت کی لمبیں بھل کی کرنٹ کی طرح میرے جسم میں پھیل کر دماغ سے نکرانے لگیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر چکپے سے اپنے چپل دوبارہ پن لیے۔ اپنے جذبہ احترام کے اس بودے پن پر مجھے اس قدر جنبلاہٹ اور ندامت محسوس ہوئی کہ میں نے اپنے چپل پھر کھولے اور انہیں اٹھا کر سڑک سے دور جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اب ننگے پاؤں چلنا ایک امر مجبوری تھا، لیکن میری خود فرمی اس مجبوری کو احترام کا نام ہی دیتی رہی۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد ایک موڑ آیا جس کی گولائی پر چند گاٹیاں رکی ہوئی تھیں اور بہت سے لوگ سڑک پر کھڑے والمانہ انداز میں دردووو و سلام پڑھ رہے تھے یہ اس بات کی علامت تھی کہ ان حضرات کو اپنا گوہر مقصور نظر آگیا ہے۔ میری عمر اس وقت بیس تیس برس تھی۔ اس طویل عرصہ میں میری آنکھوں نے زندگی کی کثافت اور رذالت اور رکاکت اور خباثت کے علاوہ اور کچھ بہت کم دیکھا تھا۔ اب جی چاہتا تھا کہ گنبد خضرا پر نگاہ ڈالنے سے پہلے ان گناہگار آنکھوں کو کسی قدر صاف کر لوں۔ اس مقصد کے لیے شاہراہ مدینہ کی خاک سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی تھی؟ میں نے اضطراراً چلتی ہوئی سڑک سے خاک کی ایک چکلی اٹھائی اور اسے اپنی آنکھوں کا سرمه بنا لیا۔

مسجد نبوی تک پہنچتے پہنچتے میری آنکھیں سرخ ہو کر سوچ گئیں، اور راستہ نظر آنا مشکل ہو گیا۔ قدم قدم پر راہگیروں سے نکر لگتی تھی۔ مجھے انہا سمجھ کر ایک بھلے آدمی نے میری رہنمائی کی اور مجھے باب جبریل تک پہنچا دیا۔

باب جبریل پر عاشقان رسول کا ہجوم تھا۔ اندر جانے والوں اور باہر آنے کا غیر منقطع تاثنا بندھا ہوا تھا۔ ایک نورانی بزرگ چٹائی پر بیٹھے لوگوں کے جوتے سنبھالنے میں مصروف تھے۔

میری آنکھوں میں اب تک دھند سی چھائی ہوئی تھی اور بھیڑ کے سیلے میں پھنس کر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں آگے بڑھ رہا ہوں یا پیچھے جا رہا ہوں۔ ایک مقام پر میں چند لوگوں سے نکلا کر بری طرح لڑکھڑایا اور جو توں کے ڈھیر پر اوندھے منہ گر پڑا۔ جو توں کی رکھوالی کرنے والے صاحب نے سارا دے کر مجھے اٹھایا اور اپنے پاس چٹائی پر بھٹا لیا، وہ نوئی پھوٹی اردو بول لیتے تھے۔ میری آنکھیں سوچی ہوئی اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ اپنی صراحی سے پانی کا گلاس پلا کر انہوں نے ازراہ ہمدردی دیافت کیا کہ میری آنکھوں کو کیا مرض لاحق ہے۔ میں نے شاہراہ مدینہ کی خاک کی چٹکی والا واقعہ بے کم و کاست بیان کر دیا۔ اسے سن کر وہ بے اختیار روپڑے اور مجھے وہیں بیٹھے رہنے کی ہدایت کی۔ عصر کی نماز سے پہلے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے اور جالی مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر بڑے سوز و گداز سے درود و سلام پڑھایا۔ نماز کے بعد وہ مجھے پھر اپنے پاس باہر چٹائی پر لے آئے۔

یہ صاحب مشرق اور مغرب میں بہت سے ملکوں کی سیاحی کر چکے تھے۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ ترکی، فارسی اور انگریزی خوب جانتے تھے۔ کسی قدر فرانسیسی زبان سے بھی آشنا تھے۔ اٹھاہے انیں برس سے روپسہ رسول اور مسجد نبوی کی صفائی کے انتظامات کے ساتھ وابستہ تھے۔ حج کے زمانے میں جب زائرین کا رش بڑھ جاتا تھا، تو یہ صاحب رضا کارانہ طور پر باب جبریل کے باہر جوتے سنبھالنے کے کام میں بھی ہاتھ پہلیا کرتے تھے۔ انہوں نے میرا پاسپورٹ دیکھا اور ہنس کر بولے۔ ”تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ میری اردو بڑی کمزور ہے۔ آؤ انگریزی میں گفتگو کریں۔“

جب انہیں معلوم ہوا کہ میرے رہنے کا کوئی نہ کھانا نہیں ہے، تو مغرب کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ جو مسجد نبوی کے بالکل قریب واقع تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا، اپنے کپڑوں کا ایک صاف جوڑا عنایت کیا۔ بازار سے نئے چپل لا کر دیئے اور ایک ڈاکٹر کی دکان پر جا کر میری آنکھوں میں دوا ڈلوائی۔ ساتھ ہی انہوں نے فرمایا کہ میں رات بھی ان کے ہاں گزاروں۔ میں نے احتساب کی کہ اگر وہ مجھے باب جبریل

کے باہر اپنی چٹائی پر شب برسی کی اجازت دے دیں تو مجھ پر بڑا احسان ہو گا اس پر وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے اور پھر بولے۔ ”اس کی اجازت تو نہیں، خیر، عشا کے بعد دیکھا جائے گا۔“

عشاء کے بعد جب مسجد نبوی کے دروازے بند ہو گئے تو وہ اندر ہی رہے، ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد اپنے سرکاری فرانس سے فارغ ہو کر باہر آئے اور مجھے ایک کافنڈ دیا جس پر عربی میں کچھ لکھا ہوا تھا اور نیچے مر گئی ہوئی تھی۔ فرمایا۔ ”تم اس چٹائی پر رات گزار سکتے ہو۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو یہ اجازت نامہ دکھا دینا۔“

تجدد کی اذان ہونے تک کئی سپاہیوں نے کئی بار آ کر مجھے ٹوکا، لیکن اجازت نامہ دیکھ کر وہ خاموش ہو جاتے تھے۔

ایک روز تو جوتے رکھنے والے صاحب نے اپنی کرم فرمائی کی انتہا کر دی۔ عشاء کے بعد جب مسجد نبوی کے دروازے بند ہونے لگے تو انہوں نے مجھے باہر نکلا اور تجد کی اذان تک اپنے ساتھ اندر ہی رہنے دیا اور تھوڑی دیر کے لیے جالی مبارک کے اندر اس عرش بریں جیسی مقدس نہیں پر مجھے اپنی پلکوں سے جاروب کشی کی اجازت بھی عطا فرمائی۔

اگلے روز انہوں نے مجھے مدینہ منورہ سے رخصت کر دیا۔ میں نے بہت عذر کیا کہ میرا یہاں سے ہلنے کو جی نہیں چاہتا، لیکن وہ نہ مانے۔ فرمائے لگے۔ پانی کا برتن بہت دیر تک آگ پر پڑا رہے، تو پانی ابل ابل کر ختم ہو جاتا ہے اور برتن خالی نہ جاتا ہے۔ دنیا داروں کا ذوق و شوق وقتی ابال ہوتا ہے۔ کچھ لوگ یہاں نہ کر بعد میں پریشان ہوتے ہیں۔ ان کا جسم تو مدینہ میں ہوتا ہے، لیکن دل اپنے وطن کی طرف لگا رہتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان رہے تو اپنے وطن میں لیکن دل مدینہ میں لگا رہے۔“

وہ مجھے بسوں کے اڈے تک چھوڑ آئے اور جدہ جانے والی ایک بس میں مجھے ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی سیٹ دلوادی۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد ہم نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک سیاہ قام افریقی نوجوان نگہ سر دھوپ میں پیدل چلا آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ

اس کی بیوی تھی۔ بیوی کی گود میں ایک نخا سا بچہ تھا۔ اس شدید دھوپ میں بھی یہ جوڑا بڑے اطمینان سے پاپیاہ مدینہ شریف کی طرف جا رہا تھا۔ ڈرائیور رحمل آدمی تھا۔ بس روک کر اس نے ان مسافروں کو اپنی صراحی سے پاتی پلایا۔ پانی دیتے ہوئے ڈرائیور نے انہیں بتایا کہ یہ پانی مدینہ سے آیا ہے۔ یہ سنتے ہی ان کے چہرے خوشی سے جگ لگا اٹھے۔ انہوں نے ایک گھونٹ اپنے بچے کے منہ میں بھی ٹکلایا۔ پانی کے کچھ قطرے نہیں پر گر گئے تھے۔ میاں بیوی نے جھک کر بھیکی ہوئی ریت اٹھائی، اور منہ میں ڈال لی۔

جده پنج کر بس اپنے اڈے پر رکی، تو سامنے طرح طرح کے ٹھنڈے مشروبات کی دکان نظر آئی۔ جده کی بندرگاہ پر اترنے کے بعد اب تک مجھے کوئی ٹھنڈی چیز پینے کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ اب اس دکان کو دیکھ کر کوئی ٹھنڈی بوتل پینے کے لیے میرا دل بے اختیار مخلنے لگا۔ میں پیاسے اونٹ کی طرح اس دکان کی جانب لپکتا ہوا گیا۔ دکان میں عین سامنے ایک قد آدم آئینہ بھی لگا ہوا تھا۔ جب میں دکان کے قریب پہنچا، تو اس آئینے میں نظر آیا کہ میرے عین پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا ایک نحیف و نزار، شکستہ صورت بڑھا بھی ہانپتا اسی دکان کی طرف چلا آ رہا ہے۔ اس حالت زار پر رحم کھا کر میں ایک طرف ہو گیا، تاکہ مجھ سے پہلے اپنی خریداری کر لے، لیکن میں نے آئینے میں دیکھا کہ میری طرح وہ بھی اچک کر ایک طرف ہو گیا ہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر مجھے بے اختیار نہیں آگئی، کیونکہ آئینے میں دراصل وہ میرا اپنا ہی عکس تھا۔ ”آئینہ دیکھ اپنا سامنہ لے کر وہ گئے؟“ میں نے زور زور سے بہس بہس کر عرب دکاندار کو مخاطب کر کے یہ مصرعہ اتنی بار گلتگیا کہ وہ ٹنگ آ گیا۔ پاگل سمجھ کر اس نے یہ احتیاط بھی برتبی کر کوکا کولا کی قیمت پہلے وصول کی اور بوتل مجھے بعد میں دی۔ بوتل ابھی پوری طرح ختم نہ ہوئی تھی کہ دکاندار نے جھپٹ کر اسے میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ غالباً اسے یہ گمان گزرا ہو گا کہ یہ مخطوط الحواس شخص کہیں خالی بوتل کو پتھر پر مار کر توڑنے ڈالے۔ اپنی اس بیت کذائی پر کچھ حیران، کچھ پریشان اور کسی

قدر خوشی میں یہ شعر گنگتا ہوا حاجی کیمپ کی جانب روانہ ہو گیا

مرا اک کھیل خلقت نے بنایا  
تماشہ دیکھنے بھی تو نہ آیا

حاجی کیمپ میں معلم عبدالرازاق محبوب کا دفتر حاجیوں سے بدستور بھرا ہوا تھا۔ مکہ معظمہ میں نالے کے کنارے والے میرے چند سلہشی ساتھی بھی وہاں بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”بابو، ہم نے خواب دیکھا کہ عبدالصور نے دس یہاں رشوت لے کر تمہارا ریشن ٹکٹ بنا دیا ہے۔“

ریشن ٹکٹ کا لفظ سنتے ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا، اور میں نے بے صبری سے پوچھا ”عبدالصور کون ہے؟“

”بڑا چھپا ہوا بدمعاش ہے۔“ سلہشی ساتھی نے کہا۔ ”نوکھیلی میں دس نمبر غنڈہ تھا۔ اب بھاگ کر کئی برس سے یہاں آ بیٹھا ہے۔ حاجیوں کو گھیر گھار کر پیسے بُورتا ہے۔“

”اس وقت وہ کہاں ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہیں کہیں حاجی کیمپ میں بیٹھا کسی کو ٹھنگ رہا ہو گا۔ اول درجے کا لفگا ہے۔“

”خدا کے لیے مجھے اس سے ملاو۔“ میں نے منت کی۔

میرے سلہشی ساتھی نے بہت منع کیا کہ میں اس لپائے کے چکر میں نہ پڑوں۔ لیکن میری مسلسل منت سماجت پر وہ میرے ساتھ چل کر اسے تلاش کرنے پر راضی ہو گیا۔ بڑی تگ و دو کے بعد وہ ایک چائے کی دکان پر بیٹھا مل گیا۔

میں نے اپنا سمندر جہاز کا ٹکٹ نکال کر اسے دکھایا اور کہا۔ ”بھائی عبدالصور، یہ جدہ سے کراچی کا ٹکٹ ہے۔ میری درخواست ہے تم اسے ریشن بنوا دو۔“

عبدالصور نے بڑے نور کا قیقهہ لگایا۔ ”اللہ کی نگری میں واپس آنے کا ٹکٹ یہاں نہیں بتتا۔ اوپر بتتا ہے۔“ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

میں نے دس بیال اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ ”بھائی اور ہی سے بنو دو۔“ عبدالمصور نے دس بیال جیب میں ڈالے ہاتھ اٹھا کر بنگالی زبان میں کچھ من من کی، اور بولا۔ ”چلو ریشن نکٹ تو ہو گیا۔ اب چائے پلاو۔“

دکان پر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ یہ تماشہ دیکھ کر خوب ہنسنے، انہوں نے عبدالمصور پر بہت سے پھیتیاں کیں اور میرا بھی خوب مذاق اڑایا۔ میرے سلہٹی دوستوں نے میری چھیڑ ہی ”ریشن نکٹ“ ڈال دی۔ اب وہ مجھے میرے نام سے نہیں پکارتے تھے، بلکہ مذاق سے ”ریشن نکٹ“ کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ لیکن جج تو یہ ہے کہ بات آخر عبدالمصور کی ہی پوری ہوئی، کیونکہ اس کے بعد مجھے ایک بار اور جج اور پانچ بار عمرہ ادا کرنیکی سعادت نصیب ہوئی۔

دو تین روز بعد کراچی جانے والا جہاز جده کی بندرگاہ پر آگیا۔ ہماری ایمبیسی کا عملہ حاجیوں کو الوداع کرنے آیا ہوا تھا۔ انہوں نے جہاز میں مجھے ایک سنگل کیبن دلوایا جو ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ اس میں فوم کے گدے کا برٹھ تھا جس پر صاف سحرابستر لگا ہوا تھا، کیبن کا اپنا ہاتھ روم تھا۔ واش میس پر خوشبودار صابن کی نئی نکلیا پڑی تھی۔ دائیں باسیں مختلف سائز کے رنگ دار تولیے لٹک رہے تھے..... کیبن میں داخل ہوتے ہی میری انا کا بے لگام گھوڑا چھے میں اپنی دانت میں کہ معظمه میں نالے کے کنارے چھوڑ آیا تھا۔ دولتیاں جھاڑتا سرپٹ بھاگتا ہوا آیا، اور ہنہنا کرازر نو اپنے تھا پر کھڑا ہو گیا۔

ساتھ ہی میرے ذہن میں حاجی امدا اللہ مہاجر کی کی وہ غزل بھی دھند گئی جو جج کے دوران میری رگوں میں خون کی طرح رچ بس گئی تھی۔ یہ غزل ایک عجیب اور نادر فن پاہ ہے۔ ارکان حج، طواف کعبہ اور صاحب کعبہ کے حوالے سے ایک عاشق صادق کے جذب و مستی کا یہ ایک بے مثال اظہار ہے:

رقم چو بمکہ ہوس کوئے تو کر دم  
دیدم رخ کعبہ ہوس روئے تر کردم

URDU4U.COM

محراب حرم گرچہ بہ پیش نظرم شد  
من سجدہ دلے درخم ابروئے تو کردم

درستی طواف و بخطیم بمقایعے  
ہر سمت تمنا رخ نیکوئے تو کردم

لبیک دعا خواں ہمہ مخلوق بعرفات  
چوں قبلہ نما من دل خود سوئے کردم

در عرصہ عرفات پاہ حشر نمو دم  
چوں یاد من آں قامت و بجوئے تو کردم

قربانی حیوان بمعنی میکندعا  
قربان سر خود من بسر کوئے تو کردم

"جب میں مکہ گیا تو میرے دل میں تمہارے کوچے کی آرزو تھی  
کعبہ کا رخ دیکھا تو دل میں تمہارا رخ دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی  
اگرچہ حرم کعبہ کی محراب میری نظر کے سامنے تھی  
لیکن میں نے سجدہ صرف تمہارے خم ابروہی میں کیا  
سمی میں طواف میں خطیم میں اور مقام ابریشم پر  
ہر جگہ ہر طرف میں نے تمہارے کوچے کے رخ کی تمنا کی

میدان عرفات میں ساری مخلوق لبیک کہہ کر دعائیں مانگ رہی تھی  
 لیکن میرا دل قبلہ نما کی طرح صرف تمہاری طرف متوجہ تھا  
 اپنے دل میں تمہارے دل پند قد کا تصور کر کے میں نے  
 میدان عرفات میں قیامت بربپا کر دی

URDU4U.COM

مقام منا پر ایک دنیا جانوروں کی قربانی دیتی ہے  
 میں نے تمہارے کوچے کے سرے پر اپنا ہی سر قربان کر دیا”

وطن واپس پہنچ کر مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں حج کی منزل طے کر کے نہیں بلکہ  
 محض سراب منزل کے پیچھے بھاگ کر واپس آیا ہوں، خدا جانے تھنگی کا یہ احساس کبھی  
 کم بھی ہو گایا نہیں۔

سمندر سے ملے پیاسے کو خبتم!

## • جھوٹے، فریبے، فراڈ اور حرص کے دلدل

سر تو میں نے منی میں منڈوایا تھا لیکن اولے کراچی آکر پڑے۔ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن والوں نے بتایا کہ میری پوسٹنگ صوبہ پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر کر دی گئی ہے۔ اس لیے میں فوراً لاہور حاضر ہو جاؤ۔

URDU4U.COM

یہ عجب بے شکنی پوسٹنگ تھی۔ صنعت و حرفت کا نہ مجھے کچھ علم تھا اور نہ اس کا کاروبار سے کوئی دلچسپی تھی۔ لاہور پہنچ کر یہی بات میں نے وزیر اعلیٰ ملک فیروز خاں نون سے کہی اور اس کام کے لیے اپنی ناموزونیت کا کھل کر رونا روایا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے، اور کہنے لگے۔ اس پوسٹ پر آنے کے لیے بہت سے لوگ ایڈھی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو پیسے نہ بنائے۔“

علوم نہیں کہ چیف مفسٹر کی اس بات سے میری ستائش منظور تھی یا میری آزمائش۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی پوسٹ سونے کی کان سمجھی جاتی تھی۔ میرے پیشو مفسٹر بی۔ اے قریشی بڑے قابل اور دیانت دار افر تھے۔ انہوں نے سالہا سال کی محنت سے اس محکمہ کو نہایت اعلیٰ خطوط پر منظم کیا تھا اور اب وہ اتنے سینئر ہو گئے تھے کہ ترقی پا کر یہاں سے تبدیل ہو رہے تھے۔

صنعت و حرفت کے علاوہ انہیں ادب، فنون لطیفہ اور علم آثار قدیمه سے بھی گھری دلچسپی تھی۔ چارج چھوڑنے سے پہلے انہوں نے دو ڈھائی ماہ مجھے اپنے سائی یا عاطفت میں رکھ کر مجھے کے پچ و نم سے آگاہ کیا اور عملی ٹریننگ کا یہ وقفہ میرے لیے بڑا مفید ثابت

شیخ مسعود صادق وزیر صنعت تھے۔ یہ امرتر کے ایک امیر کبیر اور مشہور مسلم لیگی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور بڑے شریف النفس، سیر چشم اور خوش باش انسان تھے۔ البتہ

سیاست ان کی گھٹی میں پڑی تھی، اس لے دفتری باضابطگیوں کو سیاسی مصلحتوں پر بے دریغ قربان کرنا ان کا باسیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ذاتی لحاظ سے البتہ وہ بڑے صاف گو اور دیانتدار تھے۔

اس زمانے میں سیاسی مصلحت دراصل سیاسی رشوت کا دوسرا نام تھا۔ ایک روز میں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ پنجاب کی کابینہ نے صوبہ میں بناپتی گھنی کی چند نئی فیکٹریاں قائم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ مجھے اس منصوبے کا کوئی علم نہ تھا اور نہ ہی محلہ صنعت کے ذریعہ اس قسم کی کوئی تجویز کابینہ میں پیش کی گئی تھی۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ ہمارے دفتر میں فیکٹری لگانے کے خواہشمندوں کی درخواستیں دھڑا دھڑ آتا شروع ہو گئیں۔ درخواستوں کے ساتھ ساتھ پیروی کرنے والے سفارشی حضرات کا بھی تائماً بندھ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں، کیونکہ مجھے اب تک اس فیصلہ کے متعلق سرکاری طور پر کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تھی اور دوسرے لوگوں کی طرح میری معلومات بھی فقط اخباری خبر تک محدود تھیں۔ جب لوگوں کا دباؤ بڑھ گیا تو میں نے یہ صورت حال وزیر صنعت کے گوش گذار کی اور ان سے رہنمائی کا طلب گار ہوا۔ انہوں نے فرمایا۔ ”درخواستیں داخل دفتر کرتے جاؤ اور جو لوگ ملنے آئیں انہیں خوش اسلوبی سے ظلتے جاؤ۔“

اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ اخباروں میں شاید غلط خبر شائع ہو گئی ہے۔ اس لیے میں نے تجویز پیش کی کہ اگر اس خبر کی تردید کر دی جائے تو ہماری جان بہت سے بکھیروں سے نجع جائے گی۔

”خبر صحیح ہے۔“ شیخ مسعود صادق نے فرمایا۔ ”تنی فیکٹریاں منظور ہوئی ہیں اور انہیں مستحق پارٹیوں میں تقسیم بھی کر دیا گیا ہے۔“

یہ سن کر مجھے بڑی بیکی محسوس ہوئی اور سرکاری لحاظ سے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی پوسٹ نہایت بے ضرورت، فالتو اور غیر موثر نظر آنے لگی۔ میں نے وزیر صاحب سے گلہ

کیا کہ اگر وہ اپنے ڈائریکٹر کو اس فیصلے سے قبل اعتماد میں نہیں لے سکتے تھے تو کم از کم بعد میں ہی کچھ بتا دیا ہوتا۔

وزیر صاحب نے جواب دیا۔ ”یہ فیصلہ ایک ہنگامی ضرورت کے تحت کیا گیا ہے۔ سیاست میں ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان معاملوں میں نیا وہ حاس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

بڑی بڑی صنعتوں کے فیصلے اسی طرح ڈائریکٹر کے علم اور مشورے کے بغیر اوپر ہی اوپر طے ہو جاتے تھے۔ ان فیصلوں میں کسی مربوط ترقیاتی پلانگ کا عمل دخل بہت کم ہوتا تھا۔ ان کا داروددار نیا وہ تر انواع و اقسام کی مصلحتوں، خوشنودیوں اور عنایت فرمائیوں پر ہوا کرتا تھا۔

جہاں تک چھوٹی صنعتوں کا تعلق ہے اس زمانے میں پنجاب میں بجلی سے چلنے والی کھڈیوں پاور لووم کا پرمث اور آرٹ سلک کی گرم بازاری تھی۔ جسے دیکھو اس کے سر میں ایک ایک سلک یارن کا امپورٹ لائنس حاصل کرنے کا سودا سماں ہوا تھا۔ ارباب صنعت و تجارت کے علاوہ اسمبلیوں کے ممبر، سیاسی پارٹیوں کے باائز کارکن، وزیریوں کے حاشیہ نشین، کچھ بڑے افسروں کی بیگنات اور جلدی دولت کمانے کے دوسرے ریسا صرف اسی لیلائے آرزو کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ اس دھما چوکڑی میں اگر کوئی سب سے پیچھے تھا، تو وہ بچارا پشینی نور باف تھا، جس کے آباواجداد صدیوں سے کھڈیوں کی دستکاری کے ساتھ وابستہ چلے آ رہے تھے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ سب سے پہلے ان لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا جاتا اور اس کے بعد نئے آنے والوں کی باری آتی۔ رجسٹر آف کوپریٹو سولیٹیز کے ساتھ مل کر ہمارے مجھے نے اس سلسلے میں تھوڑی بہت کوشش بھی کی لیکن نقار خانے میں طوٹی کی آواز کسی نے نہ سنی۔

پاور لووم کے پرمث مانگنے والوں کا نیا وہ زور پانچ پانچ پاؤر لووم حاصل کرنے پر تھا۔ اس کے ساتھ انہیں کافی مقدار میں آرٹ سلک یارن کا امپورٹ لائنس مل جاتا تھا، جسے بلیک مارکیٹ کر کے خاطر خواہ منافع کمایا جا سکتا تھا۔ کچھ لوگ تو پاؤر لومز کا پرمث

بھی دست بدست بلیک مارکیٹ میں بیچ ڈالتے تھے۔ معدودے چند لوگ جو اپنے پاور لوم خود چلانا چاہتے تھے، وہ بھی اپنی مشینوں کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ بڑھاتے تھے، کیونکہ اس طرح وہ فیکٹری ایکٹ کی پابندیوں سے آزاد رہتے تھے۔ دو دو پاور لوم مائٹنے والوں کی تعداد بھی بے شمار تھی۔ ان کا مقصد بھی پرمٹ حاصل کر کے اسے بلیک مارکیٹ میں بیچنا ہی ہوتا تھا ایسے بہت کم لوگ تھے جو ان مشینوں کو خود چلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

وزیر صاحبان جب دوروں سے واپس آتے تھے تو ان کے جلو میں پرمٹ لینے والوں کا ایک جم غیر لاهور پنج جاتا تھا اور وزیروں کی سفارشات سے مزین درخواستیں لے کر میرے دفتر کا گھیراؤ کر لیتا تھا۔ اس سارے عرصہ میں فقط ایک پرمٹ ایسا تھا جو میں نے اس قسم کی سفارش یا دباؤ کے بغیر جاری کیا تھا۔ ایک روز ہمارے ممتاز ادیب اور دانشور مسٹر اے حمید مجھے ملنے آئے۔ وہ ان دونوں بے کار تھے اور پاور لوم کی کرشمہ سازی کا چرچا سن کر انہیں بھی اس لائن میں قسم آزمائی کا خیال آیا۔ میں نے بڑی خوشی سے انہیں چند پاور لوموں کا پرمٹ دے دیا۔ دو ڈھنائی ماہ بعد وہ پھر میرے دفتر میں آئے اور بولے۔ ”اس کاروبار کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کام میرے بس کا روگ نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے پرمٹ مجھے واپس کر دیا۔ اس کی دلنشیں تحریروں کی طرح اس صاحب طرز ادیب کا کردار بھی اتنا صاف اور بے داغ تھا کہ اس نے اپنے پرمٹ کو بلیک مارکیٹ میں بیچنا بھی گوارا نہ کیا۔ پاور لوم اور آرٹ سلک یارن کے علاوہ میرا براہ راست واسطہ گندگی کے ایک اور ڈھیر سے بھی تھا۔ اس کا تعلق تارکین وطن کی صنعتی الملاک سے تھا۔

آزادی کے وقت جو ہندو اور سکھ بھارت چلے گئے تھے، وہ صوبہ پنجاب میں بہت سی فیکٹریاں، سینما گھر اور دیگر صنعتی ادارے چھوڑ گئے تھے۔ حکومت پاکستان کا فیصلہ تھا کہ ان فیکٹریوں اور صنعتوں کو کسی صورت میں بھی بند نہ ہونے دیا جائے اور انہیں ان مسلمان مهاجرین کو الٹ کر دیا جائے جو اسی قسم کا کاروبار یا جائداد بھارت میں چھوڑ آئے ہیں۔ اس

مقصد کے لیے ایک بورڈ قائم کیا گیا تھا اور ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے میں بھی اس بورڈ کا ممبر تھا۔

بورڈ قائم ہوتے ہی درخواستوں کا ایسا سیلاب امد آیا کہ الامان والحفظ۔ جو کلمیں داخل ہوئے ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ امرتر سے لے کر دہلی، لکھنؤ اور پٹنہ تک جتنے صنعتی ادارے اور سینما گھر تھے، وہ نیا ہہ تر مسلمانوں ہی کی ملکیت تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ مطالبے ضرور جائز حقوق پر منی ہونگے لیکن بہت سے کلمیں صریحاً جھوٹ فریب اور جعلسازی کی پیداوار تھے۔ جتنا بڑا آدمی ہوتا تھا، اتنا ہی بڑا کلمیں ہوتا تھا اور اس کی تہ میں اتنا ہی بڑا جھوٹ اور فریب کارفرما تھا۔ کچھ لوگ بہ نفس نفس بھارت جاتے تھے اور وہاں پر متروکہ الالاک کے کشوڈین کے دفتر سے اپنی مرضی کے مطابق کافیزات اور سرٹیفیکیٹ بنو لاتے تھے۔ بھارتی کشوڈین کے دفتر میں جعلسازی کی فیکٹری کھلی ہوئی تھی۔ رشوت کے ریٹ مقرر تھے اور منہ مانگی رشوت دے کر ہر قسم کی ملکیت کی تصدیق کرائی جا سکتی تھی۔ اس صنعتی الالاک کی تقسیم نے حرص و ہوا کے جو دروازے کھولے، اس نے ہمارے معاشرے میں اخلاقی گلن، سُرن، بداطواری، بد دیانتی، جھوٹ، فریب اور جعلسازی کو بڑا فروع دیا۔

ایک روز میں دفتر سے گھر واپس آیا، تو برآمدے میں ایک صاحب بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے عربی لباس پہنا ہوا تھا اور عطر کی خوشبو میں بے ہوئے تھے۔ ان کی بڑی شاندار سیاہ داڑھی تھی، آنکھوں میں سرمہ تھا اور ہاتھ میں سفید منکوں کی تسبیح کھلاکھٹ چل رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی حال ہی میں عمرہ کر کے آئے ہیں اور کل رات داتا صاحب کے مزار پر مراقبہ کر رہے تھے۔ داتا صاحب نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ میری خدمت میں حاضر ہو کر مجھے تخفہ دیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے ایک جانماز، ایک تسبیح، آب زمزم کی ایک سر بھر کپی اور چند کھجوروں کا تخفہ دیا اور ساتھ ہی فرمایا، ”حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ میں آپ

کو اپنے ساتھ لے کر ان کے مزار پر حاضری دوں۔ آپ وضو کر کے تیار ہو جائیں۔  
میں آپ کو لینے آیا ہوں۔”

یہ نادر شاہی حکم مجھے عجیب سا لگا۔ بھلا داتا صاحب کو کیا پڑی ہے کہ وہ ایک اجنبی  
کو اس طرح میرے پیچھے بھگاتے پھریں۔ ان کی بات کا مجھے یقین تو نہ آیا، لیکن ان  
کی نورانی وضع قطع کے سامنے صاف طور پر انکار کرنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ میں نے  
کسی اور وقت حاضری دینے کا بہانہ بنایا تو وہ جلال میں آگئے اور بزرگوں کے احکام کی  
نافرمانی کے عقین نتائج سے مجھے خوب ڈرایا۔ ان کی چرب زبانی سے مرعوب ہو کر  
میں نے طوعاً و کہاً انہیں اپنی کار میں بٹھایا اور داتا صاحب پہنچ گیا۔

داتا صاحب پہنچتے ہی دس بارہ آدمیوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک صاحب نے بزر  
رنگ کی باریک ململ کا دوپٹہ میرے سر پر گزدی کے طور پر باندھ دیا۔ کچھ لوگوں نے  
میرے گلے میں گیندے کے پھولوں کے ہار ڈالے اور پھر وہ سب مجھے دھکیل دھکال کر  
ایک جمرے میں لے گئے۔ جمرے میں بیٹھتے ہی نعت خوانی شروع ہو گئی اور پھر پلاو،  
زردہ، قورمه، کباب، مرغ مسلم اور طرح طرح کی نعمتوں سے بھری ہوئی قابوں کا  
تانتا لگ گیا۔ میں نے کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے صاف انکار کر دیا۔ سب نے شور مچایا  
کہ یہ داتا صاحب کا تبرک ہے۔ اسے کھا کر برکت حاصل ہوتی ہے لیکن میں معافی  
ماںگ کر اٹھنے لگا، تو اچانک عربی لباس والے بزرگ نے کاغذوں کا ایک پندا میرے  
حوالے کر کے کھا۔ آپ اسے گھر جا کر پڑھیں۔ اس میں جو لکھا گیا ہے وہ حضرت  
داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایات کے عین مطابق ہے۔ اس پر عمل کرنے سے  
آپ کو فلاح نصیب ہو گی۔”

یہ کاغذات ایک متروکہ سینما ہاؤس کی الائمنٹ کے متعلق تھے۔ میں نے دفتر سے متعلقہ  
فائل نکلا کر دیکھی تو یہ عقدہ کھلا کہ عربی لباس والے بزرگ ایک شر کے لوکل باشندے  
اور پیر تھے۔ وہاں پر ایک مقامی سینما انہوں نے جلسازی سے اپنے نام الٹ کر رکھا

تھا۔ اب انہوں نے درخواست دے رکھی تھی کہ یہ الائمنٹ ان کے نام کنفرم کر دی جائے! میں نے داتا صاحب والے ڈھونگ کا قصہ بورڈ کے ایک اور ممبر کو سنایا، تو انہوں نے بتایا کہ یہی حضرت ان کے پاس کچھ ”اور طرح کا سامان“ لے کر تشریف لائے تھے اور غصہ میں آ کر انہوں نے ان پر اپنا کتا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ بورڈ نے صرف ان کے سینما کی الائمنٹ منسوخ کی اور ان پر جعلسازی کا مقدمہ دائرہ نہ کیا۔

ایک صاحب نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ وہ جامداؤ بھارت چھوڑ آئے ہیں ان میں مل کا لال قلعہ بھی شامل ہے۔ انہیں اس کی قیمت اور تاریخی عظمت کے مطابق معاوضہ دیا جائے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کا شجرہ نب آخربی مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ براہ راست ملتا ہے۔

ایک سرکس والے نے اپنے شیر کا معاوضہ مانگا تھا، جسے وہ بھارت چھوڑ آیا تھا۔ بورڈ کے ممبروں نے اسے بتایا کہ ہم تو صرف غیر منقولہ جامداؤ کا معاوضہ دیتے ہیں۔ شیر تو چلتا پھرتا متحرک درندہ ہے، اس کا معاوضہ دینا بورڈ کے اختیار میں نہیں۔ سرکس والے نے برجستہ جواب دیا، ”صاحب، شیر تو پھرے میں بند رہتا ہے۔ پھرہ تو غیر منقولہ ہے۔“

ایک صاحب پانچ تالگے بھارت چھوڑ آئے تھے اور ان کے عوض کسی فیکٹری کے طلبگار تھے۔ ان سے بھی یہی کہا گیا کہ تالگے غیر منقولہ جامداؤ کے شمار میں نہیں آتے، اس لیے ہمارا بورڈ ان کا معاوضہ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس پر درخواست دہندہ نے کہا، ”جتاب، میرے تالگے غیر منقولہ تھے، کیونکہ میں ان میں گھوڑے نہیں جوتا تھا۔“

ایک شخص محمد دین نے ضلع لدھیانہ کے کسی گاؤں میں آٹا پینے کی مشین لگائی ہوئی تھی۔ اس نے اس کی مالیت دو ہزار دو سو روپے درج کی ہوئی تھی۔ مشین خریدنے کی اصل رسید بھی درخواست کے ساتھ مسلک تھی۔ ہمارا بورڈ پانچ ہزار روپے سے نیا ہو مالیت کے اثنوں کا فیصلہ کرتا تھا۔ میں نے محمد دین سے کہا کہ اگر اس نے اپنی مشین کی قیمت دو ہزار دو سو کی جگہ پانچ ہزار روپے سے درج کی ہوتی تو بورڈ اسے ضرور معاوضہ دے

دیتا۔ کیونکہ اس کے کاٹنڈات بڑے صاف اور پچے ہیں۔

اس نے جواب دیا۔ ”اچھا میری قسمت ہی دو ہزار دو سو ہے تو میں پانچ ہزار کیسے لکھ دیتا۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے یہ مشین آٹھ برس پلے خریدی تھی۔ اب تو قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ اب تو اس کی قیمت پانچ ہزار سے اوپر ہو گی۔“

محمد دین ہنسا۔ ”صاحب‘ آپ بھی بڑے بھولے ہیں۔ پرانی ہو کر تو مشین کی قیمت سختی ہے، بڑھا نہیں کرتی۔“

محمد دین کو ہم کچھ نہ دے سکے، لیکن وہ ہمیں بہت کچھ دے گیا۔ صبح سے لے کر شام تک ہمارے بورڈ کو جھوٹ، فریب اور لالج کے جس طوفان بے تمیزی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس ماحول میں محمد دین جیسے انسان دیانت اور امانت اور پاکیزگی کے وہ ستون تھے جن کی برکت سے قومیں زندہ رہتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں۔

اسی زمانے میں حکومت پنجاب نے بوریوالا میں ایک ٹیکشائل مل قائم کرنے کا ڈول بھی ڈال رکھا تھا۔ باقی بہت سے سرکاری منصوبوں کی طرح اس فیکٹری کی تغیری میں بھی غیر معمولی تاخیر واقع ہو رہی تھی۔ مل کی تغیر پر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا جو عملہ مامور تھا اس کا مستقل واویلا یی رہتا تھا کہ رقم ختم ہو گئی ہے۔ مزید فنڈ فوراً فراہم کئے جائیں۔

ایک روز میں وزیر صنعت شیخ مسعود صادق کے ہمراہ بوریوالا گیا۔ صورت حال کا معائنہ کرنے پر منکشف ہوا کہ تخمینہ سے کہیں زیادہ رقم خرچ ہو چکی ہے لیکن کام ابھی تک جوں کا توں ادھورا پڑا ہے۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے چند سینٹ افروں کو جمع کر کے وزیر صاحب نے ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا اور یہ دھمکی دی: ”تم لوگوں کا ہاضمہ بڑا تیز ہے۔ سارے کا سارا بجٹ ہضم کر بیٹھے ہو اور کام ابھی پورا نہیں ہوا۔ اب مزید کچھ رقم نہیں آئے گی۔ دو ماہ کے اندر اندر کام ختم نہ ہوا تو ہماری بجائے پولیس ہٹکڑیاں لے کر آئے گی۔“

یہ دھمکی کا رگر ثابت ہوئی اور خدا خدا کر کے فیکٹری کی تغیر پایہ تک پہنچی۔ دوراندشی سے کام لے کر صوبائی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اس ٹیکٹشائل مل کو چلانے کے لیے مناسب شرائط پر جبیب بُنک کے حوالے کر دیا جائے۔ ورنہ فیکٹری کی کارگزاری بھی مکملانہ سرخ فیتنے میں الجھ کر دے جائے گی۔

اس سلسلے میں جبیب بُنک کے جو نمائندے چند بار مجھے ملنے آئے، ان سے میں بہت متاثر ہوا۔ یہ جواں سال، خوش لباس اور خوش کلام نمائندے اپنے بینک کی نمائندگی نمایت رکھ رکھاؤ، خوش اخلاقی، خودداری اور صاف گوئی سے بھاجاتے تھے۔ ان کا نام آغا حسن عابدی اور ابن حسن برلنی تھا۔ متروکہ صنعتوں کی الٹ منٹ حاصل کرنے اور جھوٹ، فریب، فراڈ اور حرص کے مارے ہوئے ہجوم سے نپٹ کر جب ان دو حضرات سے ملاقات ہوتی تھی تو اچانک یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تانہ ہوا کا جھونکا آ جائے۔ بوریوالا مل کے علاوہ کبھی کبھی ادب آرت اور موسیقی پر بھی دلچسپ گفتگو ہو جاتی تھی۔ سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر میں نے ان دونوں کے ساتھ کوئی خاص یا غیر معمولی سلوک نہیں کیا۔ لیکن یہ ان کے حسن اخلاق کی دلیل ہے کہ اس زمانے سے لے کر آج تک انہوں نے میرے ساتھ انتہائی باخلوص، بے لوٹ، بے غرض دوستی کا رشتہ بھایا ہے۔

بنکاری کی دنیا میں آج آغا حسن عابدی کا نام سارے جہان میں نمایت آب و تاب سے گونج رہا ہے۔ جبیب بُنک لاہور کی براچنچ سے اٹھ کر انہوں نے بنکاری کی عالمگیر براوری میں جو مقام پیدا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن یہ حیرت ناک کامیابی ان کی خوش اخلاقی، خوش کلامی اور انسان دوستی پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ اپنے جیٹ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر دنیا بھر میں مشین کی طرح کام کرتے ہوئے بھی اگر کہیں ان کا کوئی پرانا دوست یا رفق کا رنظر آ جائے تو اس کے ساتھ خلوص اور تپاک سے ملنے میں بیشہ پل کرتے ہیں۔ ان کی شدید مصروفیت کا یہ علم ہے کہ با اوقات وہ ایک ایک ملک میں چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ٹھہر پاتے۔ لیکن کوئی دوست مل کر گھنٹوں بیٹھا رہے تو نہ تو وہ کسی بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ ہی بار بار اپنی گھڑی کی جانب

نگاہ ڈالتے ہیں۔

جبیب بینک میں تقریباً ۱۲ سال گزارنے کے بعد انہوں نے یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ (یو۔ بی۔ ایل) کی بنیاد ڈالی، جس نے پاکستان میں بینکاری کو ایک نئی روشن اور ایک نئے معیار سے روشناس کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نیشنل بینک کے بعد ہمارے وطن کا یہ دوسرا سب سے بڑا بینک مان لیا گیا، جس کی پاکستان میں ۹۱۲۔ اور بیرون ملک میں ۲۳ برانچیں کھل گئیں۔ اندروں براخچوں میں ۲۲۳ شاخیں مشرقی پاکستان میں قائم تھیں۔ یو۔ بی۔ ایل نے میں الاقوای سطح پر اپنا خاص رنگ جھلیا اور خلیج کی امارات سمیت مشرق وسطی میں تسل کی حکومت میں جب یو۔ بی۔ ایل قومیا لیا گیا تو آغا صاحب نے بھی اپنی مالیاتی مہارت کا رخ مغرب کی جانب موڑ دیا۔

مغربی دنیا میں آغا حسن عابدی کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی حقیقت ایک افسانے سے بھی زیادہ عجیب اور حیران کرنے ہے۔

انہوں نے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل کے نام سے ایک میں الاقوای ادارہ قائم کیا، جس کے صدر نشین وہ خود ہیں۔ یہ بینک ایک واحد اور مکمل بالذات ادارہ نہیں، بلکہ اپنے ساتھ متحق ایک وسیع اور متنوع مالیاتی فنون کے اداروں کے مجموعے کا مرکز ہے۔ تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن بھی اس مجموعے کا ایک حصہ ہے۔ بی۔ سی۔ سی۔ اینڈ آئی کی دنیا بھر کے ستر ممالک میں ساڑھے تین سو سے زیادہ شاخیں کام کر رہی ہیں۔ اس کا ہیڈ کوارٹر نمبر ۱۰۰ لیڈن ہال شریٹ لندن میں ہے۔ اسی گلی میں ذرا سے فاصلے پر وہ مقام ہے جہاں پر ۳۱ دسمبر ۱۹۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی گئی تھی، جس نے رفتہ رفتہ برطانیہ کی ایسی شہنشاہی کی داغ بیل ڈالی جس کی قلمرو پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔

اکتوبر ۱۹۸۱ء میں لندن میں وہاں کے ایک مشہور رسالے ”نیو سٹیشنمن (New Statesman)“ کا ایک شمارہ میری نظر سے گزرا۔ اس کے سروق پر آغا حسن عابدی کی بڑے سائز کی رنگیں تصویر تھیں، جس کے نیچے یہ درج تھا: ”ہائی شریٹ کا پینکر جو حکومتیں خرید

لیتا ہے۔“) The High- Street Banker who buys Governments) رسالے کے اندر بی۔ سی۔ آئی کے حوالے سے آغا صاحب کے بارے میں چار صفحات کا طویل مضمون بھی درج تھا۔ مضمون کا فقرہ حد، رقبابت، خوف، اور نفرت کی بھی میں بھجا ہوا تھا، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ صاحب مضمون کے مطابق بی۔ سی۔ اینڈ آئی ایک ایسا بینک تھا، جو خطرناک تیز رفتاری سے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل رہا تھا۔ اس مضمون کے مطابق جنوبی امریکہ، لاطینی امریکہ، افریقہ، ایشیا، مشرق وسطی اور یورپ کے اہم کاروباری مراکز میں پاؤں جمانے کے علاوہ انگلستان میں بھی اس کی پچاس سے اوپر برانچیں قائم ہو چکی تھیں۔ ترقی اور وسعت کی یہ تیز رفتاری انگلستان کے اوپرگستے ہوئے ست رو، سردمز، بے حسن اور سرخ فیتوں میں جکڑے ہوئے غیر مثالی بینکوں کے لیے ایک زردست خطرے کا نشان بن گئی تھی۔ ایک طرح سے ایک پاکستانی اس بینک کو قائم کر کے برطانوی سامراج کی ڈیڑھ دو صدی کا قرضہ کم از کم اقتصادی شعبے میں بڑی کامیابی سے چکا رہا تھا۔

اس تنقیدی اور تنصیبی مضمون کے مطابق بی۔ سی۔ اینڈ آئی کی مثال ترقی اور تغیر کا راز اس کے پریزیڈنٹ آغا حسن عابدی کی مالیاتی اور اقتصادی مہارت میں نہیں بلکہ ان کی سیاسی شعبدہ بازی میں مضر تھا۔ اس سیاسی مہارت سے کام لے کر وہ بہت سے ملکوں کے سربراہوں اور حکومتوں کو اپنی مٹھی میں رکھتے تھے اور ان کی سرپرستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے بینک کو ترقی دیتے تھے۔

یہ مضمون پڑھ کر مجھے یہ کرید لگ گئی کہ میں آغا صاحب سے مل کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ ان کی ترقی کا اصلی راز کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے خلاف حد اور بعض کے اتنے بڑے بدنام کن شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد یہاں ہال شریٹ والے ہیڈ کوارٹر میں مجھے یہ موقع مل گیا۔ بینک کی ایک پانچ چھ گھنٹے کی طویل میٹنگ سے فارغ ہو کر جب وہ مجھے ملے تو ہشاش بٹاش تھے۔ ہماری ملاقات تقریباً دو گھنٹہ تک جاری رہی۔ اپنے کام کے حوالے سے انہوں نے کوئی بلند بانگ دعویٰ کئے

بغیر اپنے طریق کار پر بڑی فضاحت اور اکساری سے جو روشنی ڈالی، میرے لیے وہ کاروباری دنیا میں ایک نئے اور اچھوتے انداز کا قلفہ تھا۔ ان کی گفتگو سے میں نے جو تاثر لیا، وہ کچھ یوں تھا۔

بینک ہو یا فیکٹری، کاروباری ادارے ہوں یا کمپنیاں ان میں سرمایہ کاری کا بنیادی مقصد منافع کمانا ہوتا ہے۔ منافع کی کمی بیشی اس ادارے کی کامیابی یا ناکامی کا واحد پیمانہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ پیمانہ صحیح نہیں۔ کامیابی کا اصلی راز اس امر کے ساتھ وابستہ ہے کہ ادارے کے انتظامی اور انصرامی امور کے افراد (Management) مادی سرمایہ میں اخلاقی سرمایہ کس تناسب سے ملاتے ہیں۔ اگر یہ تناسب صحیح ہو، تو انصرام میں مادی اور اخلاقی اقدار کا امتزاج ایک پچی کامیابی کو جنم دتا ہے۔

مینجر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی نفیات میں پوری طرح گھل مل جائے، یا ان کی نفیات کو خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔ اس عمل سے مینجر اور اس کے رفقاء الگ الگ فرد نہیں رہتے، بلکہ ہر کوئی اپنی جگہ ایک اداہ بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے انصرامی انتظامیہ کا بالا دست گورنگ بورڈ صرف بورڈ روم کی چار دیواری میں مقید نہیں رہتا، بلکہ سارے کام سارا بورڈ ہر سطح پر ایک فعال کارکن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس عمل سے اختیارات کی مرکزیت مکٹرے مکٹرے ہو کر ہر سطح پر اختیارات کا خود اپنا مرکز بن جاتی ہے۔ اس بندوست کی کامیابی کا گر لامرکنیت ہے۔

مینجر میں محض فہم ہی نہیں بلکہ فراست کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اگر اس کی فراست حالیہ ماحول اور مقصدیت کے محدود دائرے سے نکل کر آگے پھیل جائے تو مستقبل کے امکانات کے علاوہ زندگی کا اعلیٰ مقصد بھی اس پر عیاں ہونے لگتا ہے۔ اس سے محدود مقصد اور لامحدود امکانات میں حقیقت پسندانہ توازن بھی قائم ہو کر برقرار رہتا ہے۔

وہ مینجر ناکام ہے جو اپنے سے بہتر اپنا جانشین تیار نہیں کرتا۔

صرف مالی منافع کمانا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ روحانی منافع کمانا بھی ضروری ہے۔

روحانی منافع صرف اس صورت میں وجود میں آتا ہے۔ جب ہم سچائی سے یہ کہہ سکیں کہ ہم نے اپنی جانب سے دیا تو نیا ہے اور دوسروں سے حاصل کم کیا ہے۔

URDU4U.COM

روحانی منافع عجز اور اکساری کو فروغ دیتا ہے اور دل میں دوسروں کو دینے کی امنگ ابھارتا ہے۔ دنیا ذات الہی کی صفت ہے۔ اس صفت کو اپنانے سے قلب، ضمیر اور روح میں ایک عجیب نور جنمگانے لگتا ہے۔

دوسروں کو دینے کا راستہ کشاہ کرنے کی ذمہ داری بی سی آئی فاؤنڈیشن کے دائرے کار میں شامل ہے۔ فاؤنڈیشن کے زیر انتظام انواع و اقسام کے فلاہی ادارے چل رہے ہیں۔ کہیں پر ہسپتال، کہیں محروم اور نادر بچوں کے لیے اعلیٰ سکول، کہیں ایسی کمیٹیاں جو بیمار یا معذور یا مرحوم ادیبوں، فناکاروں اور کھیل کے میدان میں نام پیدا کرنے والے کھلاڑیوں کے خاندانوں یا پسمندگان کے لیے طرح طرح کی مالی امداد فراہم کرتی ہیں۔ جس ملک میں بینک کی برائی جس قدر منافع کرتی ہے۔ اس کا ایک مقررہ حصہ اسی ملک کے اس طرح کے فلاہی اداروں پر ضرور صرف کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بینک کے ۱۰۰۰ ملائیں کو ہر برس پورے سال کی تنخواہ کی ۲ ۱/۲ سے ۳ ۱/۲ فیصد تک اضافی رقم بھی اس شرط پر ادا کی جاتی ہے کہ وہ اسے اپنی ذات پر خرچ نہیں کریں گے بلکہ دوسروں کے کام میں لا کیں گے۔ کوئی ملازم اس کو کس حد تک پورا کرتا ہے، اس کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہیں کی جاتی۔ یہ معاملہ شخص کے اپنے ضمیر اور اعتماد پر چھوڑ دیا جاتا ہے، تاکہ بینک کے ملائیں میں دوسروں کو دینے کی عادت ڈالنے کی ترغیب دی جائے۔

جس وقت یہ طویل ملاقات ختم ہوئی تو شام کے ساری سوچ چھ بجے تھے۔ بینک کی دس گیارہ منزلہ عمارت سنائی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سب لوگ گھر جا چکے تھے۔ آغا حسن عابدی کے عملے کا صرف ایک افسر موجود تھا۔ آغا صاحب مجھے لفت تک چھوڑنے آئے اور اپنے افسر کو میرے ساتھ نیچے بھیجا کہ وہ مجھے بینک کی کار میں بٹھا کر میری قیام گاہ تک پہنچانے کا بندوقست کر آئے۔

میری قیام گاہ وہاں سے بیس پچھیں میل کے فاصلے پر تھی۔ سڑکوں پر لندن کی شام کا ٹریفک سیالاب کی طرح اٹھا ہوا تھا اور میں کار میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ آغا حسن عابدی سرمایہ داروں کے جھرمٹ میں درویشی کی تعلیم دے رہے ہیں یا درویشوں کی منڈی میں سرمایہ داری کا بیچ بو رہے ہیں!

آغا صاحب کے ایک ہدم دینہ ابن حسن برلنی کے ساتھ میری بیس باعیسیں برس پرانی دوستی ہے۔ پہلے وہ حبیب بنک میں ملازم تھے۔ بوریوالا ییکشاپ مل حبیب بنک کے پاس آئی، تو اس کے جزل میونگر مقرر ہوئے۔ یونائیٹڈ بنک کی بنیاد پڑی تو آغا صاحب انہیں اپنے ساتھ یو۔ بی۔ ایل لے گئے۔ آج کل بی۔ سی۔ سی اینڈ آئی کے لندن ہیڈکوارٹر میں ایک اہم اسائی پر تعینات ہیں۔

برلنی صاحب محض بینکنگ کے تجربہ کار ماہر ہی نہیں بلکہ ایک نہایت اعلیٰ اور شائستہ ادبی ذوق کے مالک بھی ہیں، جو ان کو ورشہ میں ملا ہے۔ ان کے والد مرحوم سید حسن برلنی صاحب ایک کامیاب وکیل ہونے کے علاوہ ایک صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ اپنے زمانے کے اخبارات اور رسائل میں علمی، ادبی، تاریخی اور تمدنی موضوعات پر ان کے مضامین کثرت سے چھپتے رہتے تھے۔ ان مضامین کو دلچسپی اور افادیت کے پیش نظر انہم ترقی اردو نے کافی محنت اور رسروچ سے ان کا کھوج لگا کر انہیں دو جلدیوں میں مرتب کیا۔ پہلی جلد ”مقالات برلنی“ کے عنوان سے انہم کے تحت شائع ہو چکی ہے۔ دوسری جلد کی تحریک پر بھی کام ہو رہا ہے۔ یہ مضامین اردو زبان کے ایک خاص دور کے اسلوب بیان اور ماضی اور حال کی سیاست، ثقافت اور شرافت کا دلچسپ قابلی مرقع ہیں۔

مشہور زمانہ ”قادیانی مذہب“ نامی کتاب کے مصنف الیاس برلنی بھی برلنی صاحب کے نہایت قریبی عزیز تھے۔ اس علمی اور ادبی ماحول میں آنکھ کھول کر ابن حسن برلنی نے بھی طالبعلمی کے زمانے میں لکھنے لکھانے کا شوق کسی حد تک نبھایا۔ لیکن کارکنان قضا و قدر نے ان کا نام بینکنگ کے کھاتے میں ڈال رکھا تھا۔ جب نوابزادہ لیاقت علی خاں متحده ہندوستان کی عبوری حکومت میں وزیر خزانہ تھے، تو انہوں نے برلنی صاحب کو مشورہ دیا

کہ حبیب بینک پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کو پاکستان میں بینکاری کا نظام بنھانے کی تربیت دے رہا ہے۔ انہوں نے یہ مشورہ بروچشم قبول کر لیا، اور بمبئی جا کر حبیب بینک میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن پہنچتیں چھتیں برس کی انتہائی مصروف اور کامیاب بینک کی زندگی نے ان کے علمی اور ادبی ذوق پر کوئی زنگ نہیں لگنے لیا۔ وہ اب بھی نہایت شفاقتہ نثر اور اچھی نظمیں لکھنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ابن اثاث کی پہلی برسی پر لندن کے ”جنگ“ ایڈیشن میں ”پھر ترا وقت سفر یاد آیا.....“ کے عنوان سے ان کا جو مضمون شائع ہوا تھا وہ آسانی سے فراموش ہونے والی تحریر نہیں۔ ایک روز انہوں نے لندن میں اپنی بیاض کے کچھ حصے مجھے تخلیہ میں سنائے تھے ان میں بیان کا نکھار اور خیالات کی پچشگی اور گمراہی تھی۔ میں نے بہت زور دیا کہ ان کی بیاض کے کچھ حصے ضرور شائع ہونے چاہیں، لیکن وہ نہ مانے۔ خدا کرے کسی روز مان جائیں۔

برنی صاحب پابند صوم و صلوٰہ ہی نہیں بلکہ دفتر کی گونا گون مصروفیات میں بھی چمکے سے انٹھ کر کسی خاموش کونے میں جا کر نماز ادا کر آتے ہیں۔ حج کا فریضہ ادا کرنے کے علاوہ عمرہ کی سعادت بھی کئی بار حاصل کر چکے ہیں۔ لندن اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی حلال یا غیر حلال گوشت کی تمیز روا رکھتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پروان چڑھنے والے منصوبوں کے طفیل بے شمار نادار مریض شفایاں ہو رہے ہیں، بہت سے سوگوار خاندان سکون کی زندگی گزار رہے ہیں، یتیم بچوں کی تعلیم جاری رکھنے کے بندوست ہو رہے ہیں اور یتیم بچوں کی شادی کے اخراجات میں فیاضی سے حصہ لیا جا رہا ہے اور بے شمار بیواؤں کے ماہانہ گزانہ الاؤنس بھی مقرر ہیں۔ اس وسیع پیانے پر ایسے فلاحتی اور امدادی اقدامات کی کوئی تشیر نہیں کی جاتی۔ ان کی بیاض کی طرح ان کی انتظاں اور فلاحتی کا رگنا بیاں بھی صیغہ راز ہی میں رہتی ہیں۔ لیکن خدائے رحیم و کریم اور خالق علیم و بصیر سے یہ کار خیر کس طرح چھپا نہ سکتا ہے؟

پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے اے حمید، آٹا پینے کی چکی والا محمد دین،

آغا حسن عابدی اور ابن حسن برلنی کے ساتھ میری ملاقات اسے زمانے کی خوشگوار یادیں ہیں۔ باقی متروکہ صنعتوں کی الاشمندوں کا سارا کام ایک متعفن دلدل کی ناگوار سڑانڈ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

## • گورنر جزل ملکے غلام محمد

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو میں ایک مینگ کے سلسے میں لاہور سے کراچی گیا ہوا تھا۔ مینگ شروع ہوتے ہی ٹیلیفون آیا کہ کینٹ سیکرٹری مسٹر عزیز احمد مجھے اپنے دفتر میں بلا رہے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انہوں نے کہا کہ گورنر جزل مسٹر غلام محمد تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم ابھی گورنر جزل ہاؤس چلے جاؤ۔

غلام محمد صاحب کے ساتھ میری بالکل کوئی واقفیت نہ تھی۔ وزیر خزانہ کے طور پر انہیں فقط چند بار دیکھا تھا۔ میں نے مسٹر عزیز احمد سے اس بلاوے کا مقصد دیافت کیا تو انہوں نے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

غلام محمد صاحب کے ایک بھائی نے لاہور کی فیکٹری کی الائمنٹ کے لیے درخواست دی ہوئی تھی۔ مجھے گمان گزرا کہ شاید گورنر جزل اس سلسے میں کوئی سفارش کرنے والے ہوں۔ میں نے اپنے اس خدشے کا مسٹر عزیز احمد سے ذکر کیا، تو انہوں نے اس سے بھی اپنی مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے مشوہد دیا کہ مسٹر غلام محمد شک طبیعت کے آدمی ہیں۔ اس لیے میں ان کے ساتھ بات چیت میں احتیاط سے کام لوں۔

مسٹر عزیز احمد کا مشوہد پلے باندھ کر میں گورنر جزل ہاؤس پہنچا۔ ایک اے ڈی سی مجھے اپنے ساتھ اوپر والی منزل میں لے گیا۔ وہاں پر برآمدے میں قالین بچھا ہوا تھا اور اس پر صوف لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک گول میز پر بڑے خوبصورت پھول بجے ہوئے تھے۔ مسٹر غلام محمد ایک گدے والی آرام کری پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے نیلے رنگ کا دھاریدار سوت پہنا ہوا تھا۔ رومال اور جرایں نائی کے ہرگز تھیں۔ کوٹ کے کار میں گلاب کا پھول منگا تھا۔ سر پر کالی جناح کیپ تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ ان کے قریب والی کرسی پر گورنر جزل کی پرنسپل پرائیویٹ سیکرٹری مس روٹھ بول بیٹھی تھی۔ یہ بڑی

طرحدار، نازک اندام، خوبصورت، نیم امریکین، نیم سوس لڑکی تھی، جسے وہ واشنگٹن سے منتخب کر کے اپنے ساتھ پاکستان لائے ہوئے تھے۔ مس بول پر نگاہ پڑتے ہی میں نے دل ہی دل میں مسٹر غلام محمد کے حسن انتخاب کی داد دی۔

اے ذی سی نے میری آمد کا اعلان کیا تو دونوں نے نظریں گاڑ کر مجھے سر سے پاؤں تک گھورا۔ اس کے بعد مسٹر غلام محمد نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایک کری پر بیٹھنے کو کہا۔ چند لمحے عجیب سی خاموشی طاری رہی۔ پھر گورنر جزل نے بچوں کی طرح غول غال کر کے کچھ بولنا شروع کیا۔ وہ کافی دری تک اسی طرح بولتے رہے، لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کس زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔ جب وہ خاموش ہوئے تو مس بول بولی۔ ”ہزا یکسیلینسی فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو سیکرٹری ٹو گورنر جزل کی پوسٹ کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس نازک زمانے میں یہ بڑی اہم ذمہ داری ہے۔ ابھی ای امید رکھتے ہیں کہ آپ ان کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کریں گے۔ ابھی ای کا حکم ہے کہ آپ ابھی نیچے جائیں اور اپنی پوسٹ کا چارج سنبحال لیں۔“

یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے نہیں نکل گئی۔ صاف انکار کرنا تو مشکل تھا، اس لیے میں نے ایک عذر لنگ پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”میں اس وقت پنجاب گورنمنٹ میں ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ جب تک صوبائی حکومت مجھے وہاں سے فارغ نہ کرے کسی اور پوسٹ کا چارج لینا بڑی بے ضبطگی ہو گی۔“

یہ بات سن کر مسٹر غلام محمد غصے میں آ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور انہوں نے کڑک کر کچھ دری پھر غول غال کی، جس کا مفہوم مس بول نے مجھے یوں سمجھایا۔ ”ہزا یکسیلینسی فرماتے ہیں پنجاب گورنمنٹ جنم میں جائے۔ جس بے ضبطگی کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ بھی آپ کے سمیت جنم میں جائے۔ پنجاب کے چیف نسٹر ملک فیروز خاں نون اتفاق سے نیچے بیٹھے ہیں۔ انہیں ابھی یہاں بلایا جا رہا ہے تاکہ وہ آپ کو پنجاب سے فارغ کر دیں۔ اس کے بعد آپ فوراً نیچے جا کر اپنی پوسٹ کا چارج سنبحال لیں۔“

یہ تیر نشانے پر نہ بیٹھا، تو میں نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ ”جتاب میری والدہ اور سامان لاہور میں ہے۔ چارج لینے سے پہلے میں وہاں جا کر انہیں کراچی لا سکتا ہوں؟“

اب مسٹر غلام محمد کا پانہ بید اوپر چڑھ گیا اور وہ کرسی میں بل کھا کھا کر زور زور سے چینختے گئے۔ ان کے منہ کے ایک کونے سے لعاب دہن کی پچکاری سی چلی اور کوٹ کی آستین پر گرنی۔ مس بول نے نیپکن سے ان کا کوٹ صاف کیا اور مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”ہزاریکسیلینسی نے اپنی شدید خفگی کا اظہار کیا ہے کہ آپ جدت بہت کرتے ہیں۔ اچھ۔ ای کا حکم ہے کہ آپ اس ناپسندیدہ عادت کو فوراً ترک کریں ورنہ آپ کو پچھتنا پڑے گا۔“

یہ سین ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک اے۔ ڈی۔ سی پنجاب کے چیف مسٹر ملک فیروز خاں نون کو لے کر برآمدے میں نمودار ہوا۔ ملک صاحب کو دیکھتے ہی مسٹر غلام محمد نے ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیا اور گاؤں گاؤں کر کے کچھ بولتے رہے۔ مس بول ترجمانی کے فرانس سر انجام دیتی رہی۔ اس کے بعد چیف مسٹر نے مجھے کہا۔ ”یہ پوسٹنگ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ مبارک ہو۔ فوراً چارج سنبھالو۔ باقی ضابطے کی کارروائیاں بعد میں ہوتی رہیں گی۔“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو چیف مسٹر نے آنکھ مار کر مجھے چپ کر دیا۔ اس طرح سربراہ مملکت سے میرا پہلا انترویو ختم ہوا اور میں اگلے نو برس کے لیے اس بیت المجن میں مقید ہو گیا۔

نیچے آ کر میں مسٹر اے۔ جی۔ رضا کے کمرے میں گیا، جو اس وقت گورنر جزل کے سیکرٹری تھے۔ اس وقت تک غالباً انہیں کوئی علم نہ تھا کہ ان کا تبادلہ کر دیا گیا ہے اور ان کی جگہ میری تقریبی ہو گئی ہے۔ یہ خبر انہوں نے شاید پہلی بار مجھ سے سنی۔ اس طرح بے خبری میں ناگمانی طور پور سیکرٹری بدلنے کا انداز مجھے بڑا بدنما اور نازیبا نظر آیا۔ کسی سربراہ مملکت کے شیلان شان نہیں کہ وہ اپنے ماتحت عملے کے ساتھ ایسا سلوک

روا رکھے۔ اس قسم کا طریق کار وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کا ذہن پیچدار اور سازشی ہو۔ جہاں تک میری تقریب کا تعلق ہے، میں نے تو اسے بلائے ناگمانی ہی سمجھا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ مسٹر غلام محمد نے مجھے اس پوسٹ کے لیے کیوں چنا اور کس کے کرنے پر چنا۔ نومبر ۱۹۵۳ء کے اوائل میں میں نے اس پوسٹ کا چارج سنھال لیا۔

گورز جزل ہاؤس کا ماحول آئیب زدہ سانظر آتا تھا۔ چاروں طرف ایک غیر وجودی سا ننانا چھایا ہوا تھا، جس میں گورز جزل، مس بول، ملٹری سیکرٹری، اے ڈی سی، گارڈ کے سپاہی، چپر اسی، بیرے اور خدمت گار اس طرح دکھائی دیتے تھے جیسے لکڑی کے متھر ڈھانچوں کو زردستی کپڑے پہنا دیتے ہوں۔ سیکرٹری کی پوسٹ کا چارج لینے کے بعد کئی روز تک میں خاموشی سے اس شخصیت کا جائزہ لیتا رہا، جس کے ساتھ اب مجھے دن رات پالا پڑنے والا تھا۔ مسٹر غلام محمد کافی عرصہ سے فالج کے مریض تھے۔ ان کا بلڈ پریشر مستقل طور پر بہت اونچا رہتا تھا۔ وہ چند قدم سے نیاہ چلے پھرنے سے قطعاً معدنور تھے اور اکثر مریضوں والی پیسہ دار کری میں بیٹھ کر گورز جزل ہاؤس کا گشت کیا کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور وہ اپنے دستخطوں کے علاوہ مزید کچھ لکھنے کے ناقابل تھے۔ فالج نے ان کی زبان اور چہرے کو بھی متاثر کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کی گفتگو کسی کو سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کے ذہن کا عضلاتی نظام اس قدر کمزور ہو گیا تھا، کہ جب وہ کھانے پینے کی کوئی چیز منہ میں ڈالتے تھے، تو اس کا کچھ حصہ دونوں کونوں سے باہر گرتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں جب کوئی غیر ملکی سفیر اپنی اسناد پیش کرنے آتا تھا تو اسے گورز جزل کے ساتھ لنج بھی کھلایا جاتا تھا۔ شاف کے ممبر بھی لنج میں شریک ہوتے تھے۔ جس وقت مسٹر غلام محمد لقمہ منہ میں ڈال کر سفیر کے ساتھ گفتگو فرمانے کی کوشش کرتے تھے، وہ سماں بڑا عبرتاک ہوتا تھا۔

ان جسمانی عوارض کے علاوہ مسٹر غلام محمد کا ذہن بھی گنڈے دار تھا اور کسی قدر وقته اور نانے سے بھم بھم کر کام کرنے کا عادی تھا۔ کبھی تو ان کا دماغ بالکل صاف،

شفاف اور تیز و طرار ہوتا تھا اور وہ ہر چیز کو بھلی کی سی تیزی کے ساتھ سمجھ لیتے تھے۔ لیکن کبھی وہ بلب کی طرح فیوز ہو کر مخلل ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ کبھی بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے تھے، کبھی بالکل دیوانے نظر آتے تھے۔

ذہن کی طرح ان کا مزاج بھی پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتا رہتا تھا۔ کبھی گرم، کبھی سرد، کبھی نرم، کبھی سخت۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے مزاج کی گری اور سختی میں آمدِ کم ہوتی تھی اور آورد نیا وہ۔ وہ دوسرے پر رعب گانٹھنے کے لیے، یا محض تفنن طبع کے طور پر گیدڑ بھیکیوں سے کام لینا شروع کرتے تھے۔ آواز بلند کر کے اپنے اور بناؤٹی غصہ طاری کرنا ان کا پسندیدہ مشغله تھا۔ اس عمل کے دوران رفتہ رفتہ بلڈ پریشر کا عفریت ان کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا تھا اور اصلی غصہ ان کے حواس پر قابو پا لیتا تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی تھی اور وہ چیخ چیخ کر نڈھال ہو جاتے تھے۔

اس نوعیت کے نظارے بڑے ناگفته بہ ہوتے تھے۔

کرمل سرور اور ڈاکٹر حفیظ اختر صاحب گورنر جزل کے شاف پر ان کے ذاتی معاجع تھے۔ ڈاکٹر حفیظ اختر ہر صبح گورنر جزل کا طبی معائنہ کر کے جب نیچے آتے تھے تو ہم ان کے چہرے بشرے اور محتاط سوال جواب سے یہ اندازہ لگا لیا کرتے تھے کہ ہمارا آج کا دن کیا گذرے گا۔ اگر معلوم ہوتا تھا کہ گورنر جزل کی طبیعت نیا وہ نڈھال ہے، تو ہمارا نخل تمنا ہرا ہو جاتا تھا کیونکہ ملک غلام محمد کا نیچے آ کر اپنے اشاف پر مار دھاڑ کرنے کا احتمال باقی نہیں رہتا تھا۔ اس کے بر عکس اگر ڈاکٹر حفیظ اختر کی چال ڈھال سے اندازہ لگتا تھا کہ گورنر جزل کی طبیعت بحال ہے تو ہمارا نخل تمنا یا کایک مر جھا جاتا تھا۔ چنانچہ کام شروع کرنے سے پہلے ہم ڈاکٹر حفیظ اختر کے نیچے اترنے کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے تاکہ ہم اس روز کے رنگ ڈھنگ کا قیاس کر کے صورت حال سے نمنٹئے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔

مسٹر غلام محمد کے کردار میں کسی قسم کی کوئی آئیندیل ازم نہ تھی۔ ان کے مقاصد میں

اولیت کا شرف ہوں اقتدار کو حاصل تھا۔ دوسرے درجہ پر صنف نازک کی طرف ان کا شدید رنجان تھا جو اکثر مریضانہ حد تک پہنچ جایا کرتا تھا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ خود غرضی، خود سری، ہٹ دھرمی دھونس، دھاندلی اور ایچ پیم کے سمیت ہر قسم کا حریب استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے جن لوگوں نے ان کے ساتھ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی کابینہ میں کام کیا تھا، ان پر مسٹر غلام محمد کے کردار کے یہ سب پہلو روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی جب انہیں بستر عالالت سے اٹھا کر گورز جزل کی کرسی پر بٹھا دیا گیا تو یہ ایک ایسی غلطی کا ارتکاب تھا جس کا خمیانہ پاکستان آج تک بھگت رہا ہے۔

یہ مخلوق، مغدور اور مغرور شخص ایسی مٹی سے بنا ہوا نہیں تھا کہ گورز جزل کے ستری اور آئینہ پنجرے میں بند ہو کر صبر و شکر سے بیٹھا رہے۔ ڈیڑھ برس کے اندر اندر اپریل ۱۹۵۳ء میں اس نے قلم کی ایک جنبش سے خواجہ ناظم الدین کو ملک کی وزارت عظیمی سے موقوف کر دیا۔ ابھی چند روز قبل خواجہ صاحب کا بجٹ توی اسیبلی نے بھاری اکثریت سے منظور کیا تھا۔ مسٹر غلام محمد کے اس آمرانہ عمل نے پاکستان میں جمہوریت کی بنیاد کو پہلی بار ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اگر مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی میں کچھ دم خم ہوتا تو اس کا فرض تھا کہ وہ گورز جزل کے اقدام کی نذمت کر کے خواجہ ناظم الدین میں اپنے اعتماد کی توثیق کر دیتی۔ لیکن مسلم لیگ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے منہ پر یہ چپت بھیگی بلی بن کر قبول کر لی اور گورز جزل کے نامزد وزیر اعظم محمد ولی بوگہ کو بڑی فرمانبرداری سے اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ آئندہ دس ماہ بعد ۱۹۵۳ء کے اوائل میں جب مشرقی پاکستان میں انتخابات منعقد ہوئے تو اس میں مسلم لیگ کو نیکست فاش ہوئی اور ۷۲۳ مسلم نشتوں میں سے ۲۲۳ جگتو فرنٹ نے جیت لیں اور صرف دس نشتبیں مسلم لیگ کے ہاتھ آئیں۔ اب مشرقی پاکستان سے یہ مطالیبہ ہونے لگا کہ موجودہ مرکزی قانون ساز اسمبلی عوام کی صحیح نمائندگی کا حق ادا کرنے کے قابل

نہیں رہی۔ لہذا اس کے لیے بھی نئے انتخابات ہونے چاہئیں۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کا حشر دیکھ کر مرکزی اسمبلی کے مسلم لیگی نمائندے نے انتخابات کے نام ہی سے کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ اب انہیں یہ فُلر دامن گیر ہو گئی کہ کہیں گورنر جنرل سچ مچ ہی مرکزی اسمبلی کو برخاست کر کے نئے انتخابات کا ڈول نہ ڈال دیں۔ اس کے علاوہ خواجہ ناظم الدین کی ناجائز برطرفی کا کائنٹا بھی اب سترہ ماہ بعد اچانک ان کے حاس دل میں چینے لگا تھا۔ چنانچہ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۳ء کو آئین ساز اسمبلی نے گورنر جنرل کے وہ تمام اختیارات چھین لیے جنہیں استعمال کر کے وہ وزیر اعظم یا کابینہ کو معطل کر سکتے تھے۔

گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنے کا جو قدم اسمبلی نے اٹھایا، وہ نہایت مناسب اور صحیح تھا لیکن جس طریقے سے یہ قدم اٹھایا گیا وہ مضمون خیز تھا۔ اسمبلی کے ممبر مفلوج غلام محمد سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ انہوں نے یہ کارروائی چوروں کی طرح دبے پاؤں چھپا کر کی۔ ترمیمات کا ریزرویشن چھپوا کر ممبروں کو فوراً تقسیم نہ کیا گیا بلکہ آدمی رات کو اسمبلی میں ان کے پیجن ہولوں میں رکھوا دیا گیا۔ اگلی صبح اسمبلی کا اجلاس مقرر ہوتے سے ایک گھنٹہ قبل شروع ہوا اور گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنے کا ریزرویشن بالکل دس منٹ کے اندر اندر پاس ہو گیا۔ اس قرارداد کے بعد مسٹر غلام محمد کی پوزیشن بالکل کابینہ اور اسمبلی کے رحم و کرم پر تختصر ہو گئی۔ اس شب خون کا جواب گورنر جنرل نے ۳ دن کے بعد دیا اور ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو اچانک ملک بھر میں ہنگامی حالات کا اعلان کر کے قانون ساز اسمبلی کو برخاست کر دیا، کابینہ برطرف کر دی اور مسٹر محمد علی بو گرا کی سرکردگی میں اپنی مرضی کی ایک نئی کیبنٹ تشکیل دے دی۔ مسٹر غلام محمد کے اس اقدام نے پاکستان میں جمہوریت کا رہا سماں بھر میں پامال کر دیا اور ذاتی اقتدار کی ہوس پر آئینی اور قانونی اصولوں کو بے دریغ پامال کرنے کی ایسی مثال قائم کی جس نے آگے چل کر ایسے سدا بمار گل کھلائے جو آج تک مرجحانے کا نام تک نہیں لیتے۔

قانون کی عظمت اور آئین کی حرمت چادرِ عصمت کے مترادف ہے۔ یہ اگر ایک دفعہ چاک ہو جائے تو اسے رفو کرنا انسان کے اختیار میں نہیں رہتا۔ ایک لغزش دوسری لغزش کا پیش خیمه بن جاتی ہے اور اگر عقوبت کا تازیانہ شروع ہی میں اس کا راستہ نہ روکے تو ارتکاب جرم عادت ثانیہ بن جاتی ہے اور رفتہ رفتہ راج زاج، حکومت اور طوائف الملوكی، قانون اور بد نظمی، آئین اور آمریت کے فرق کا ادراک کمزور ہو جاتا ہے۔ نظام حکومت سے آئینی شائستگی رخصت ہو جاتی ہے اور نظم و نسق میں عدل و انصاف کا عنصر ماند پر جاتا ہے۔ آئین کا تقدس ختم ہو کر اس کی حیثیت ایک سرکاری سرکلر کے برابر نہ جاتی ہے، جسے وقتی یا ذاتی مصلحتوں کے مطابق توڑا مروڑا جا سکتا ہے، معطل کر کے معرض التوا میں ڈالا جا سکتا ہے، یا بالکل منسوخ کر کے کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ملک کے دستور کا جب یہ حشر ہونے لگے تو دوسری بہت سی قابلِ احترام روایات اور اقدار کا تقدس بھی اسی تناسب سے کم ہونے لگتا ہے۔ سیاست کا عمل رک جاتا ہے، یا روک دیا جاتا ہے، یا غلط رخ اختیار کرنے لگتا ہے۔ سیاست کا میدان مثل باغیچہ ہے۔ اس کی نشوونما کا عمل جاری رہے تو پھول اور کانٹے اپنے اپنے تناسب سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آبیاری بند ہو جائے تو جھاڑ جھنکار کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ ایسے حالات میں آئینہ لیزم کی جزیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ جذبہ وطنیت و قومیت کے فروع میں وہ پہلا ساجوش و خروش باقی نہیں رہتا۔ بے یقینی، تذبذب اور ٹکوک و شبہات کی فضا میں سانس لے کر معاشرہ کلبیت اور یا سیت کا شکار ہونے لگتا ہے یا تخریب کاری کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ آئینی نظام کا نعم البدل صرف آئینی نظام ہے۔ اس کے علاوہ سب دعوے باطل ہوتے ہیں اور عام طور پر چند محدود عناصر کے ذاتی مفادات کی فریب کاری کا نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔

مسٹر غلام محمد اپنے سارے چل پھر سکتے تھے، نہ کچھ لکھ سکتے تھے، اور نہ ہی ان کی بات کوئی آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ ان تمام معدودیوں کے باوجود انہوں نے ملک بھر

میں ہنگامی حالات کا اعلان کس برتبے پر کیا؟ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے اپنی کتاب "جس رنق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" میں لکھا ہے کہ ہنگامی حالات کا اعلان ہونے سے پہلے وہ پرائم مینٹری محمد علی بو گرا، چودھری محمد علی اور اسکندر مرزا کے ساتھ امریکہ گئے ہوئے تھے۔ وہاں پر وزیر اعظم کو گورنر جنرل کا پیغام ملا کہ فوراً واپس آؤ۔ یہ پیغام پا کر ان سب نے جلد سے جلد واپس آنے کی ٹھان لی۔ جب وہ لندن پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس روز کوئی ہوائی جہاز مشرق کی طرف نہیں جا رہا۔ اس لیے انہوں نے کراچی کے لیے ایک ہوائی جہاز چارڑ کر لیا۔ اس کے بعد واقعات ایوب خاں کے اپنے الفاظ میں اس طرح رونما ہوئے:

لندن ائیر پورٹ پر گورنر جنرل نے مجھے ٹیلیفون پر بلوایا۔ لیکن ان کی بات میری سمجھ میں بالکل نہ آئی، میں نے ٹیلیفون اسکندر مرزا کو دے دیا۔ ہمیں بس اسی قدر معلوم ہو سکا کہ گورنر جنرل مجھے فوراً پاکستان بلانا چاہتے ہیں۔ انہیں دوسروں سے غرض نہ تھی..... اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی اور میں، ہم تینوں گورنر جنرل کی کوئی پہنچ..... گورنر جنرل اوپر کی منزل پر اپنی خوابگاہ میں لیئے ہوئے تھے۔ ان کے خون کا دباؤ بڑھ گیا تھا اور پیٹھ میں بڑی سخت تکلیف تھی۔ جس کی وجہ سے وہ سیدھے ایک تختے پر چاروں شانے چلت لیئے پر مجبور تھے۔ وہ غھے سے آگ بگولہ ہو رہے تھے اور گالیوں کی بوچھاڑ تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی لیکن خوش قسمتی سے یہ گالیاں کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ چودھری محمد علی نے جرات کر کے کچھ کہا، اس کے جواب میں ان پر بوچھاڑ پڑی۔ اس کے بعد اسکندر مرزا کچھ بولے، ان پر بھی بوچھاڑ پڑی۔ ہم ان کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتے تھے کہ آپ (وزیر اعظم) محمد علی (بو گرا) کو ایک موقع اور دیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے غرا کر کہا "جاو۔ جاو۔ دور ہو جاو۔" ان کی زبان سے بار بار "نمیں، نمیں" کے الفاظ نکلتے تھے، وہ بس ہم کو بھگا دینا چاہتے تھے۔ ہم ایک کے پیچھے ایک ان کی خواب گاہ سے نکلے۔ آگے آگے اسکندر مرزا، ان کے

پچھے چہدری محمد علی اور سب سے پچھے میں۔ میں کرے سے باہر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ اس نر نے جوان کی خدمت پر مامور تھی، میرا کوت پکڑ کر کھینچا۔ میں پڑا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں ایک بالکل مختلف آدمی سے دو چار ہوں۔ یہی ہمارے بیمار اور بوڑھے گورز جزل جو لمحہ بھر پہلے غصے سے دیوانے ہو رہے تھے، اب ان کا چہرہ صرف سے کھل اٹھا تھا اور وہ قسمی لگا رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا ”آپ بھی بڑے حضرت ہیں۔“ انہوں نے ایک خاص صرفت کی چمک آنکھوں میں لیے مجھے اشانہ کیا۔ ”مری پر بیٹھ جاؤ۔“

اس کے بعد انہوں نے تکیے کے نیچے سے دو دستاویزیں نکالیں۔ ان میں سے ایک پر کچھ اس قسم کی عبارت تھی کہ ”میں، غلام محمد فلاں فلاں وجہ کی بنا پر فلاں فلاں اختیارات جزل ایوب خاں کو سونپتا ہوں اور انہیں حکم دیتا ہوں کہ وہ تمن میں کے اندر اندر آئیں تیار کریں۔“ میں نے اس کافند پر نظر ڈالی اور دل میں کہا۔ ”خدا آپ سے سمجھے۔ پچھلے آٹھ برس تو آپ کو ہوش نہ آیا اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں تمن میں دستور بنا کے پیش کر دوں۔“

دوسری دستاویز اس مضمون کی تھی کہ میں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے میں ان تاریخی دستاویزوں کو اپنے ہاتھ میں تھامے رہا۔

جیسے ہی میں نے ان کافندوں پر نظر ڈالی میرا تن بدن پکار اٹھا کہ ”نہیں، ہرگز نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ اس سے ملک کو سخت نقصان پہنچے گا۔ میں فوج کی تعمیر میں معروف ہوں۔ ہمارا ایک دشمن ہے ہندوستان، جس کو رام کرنا بڑا دشوار ہے۔ ہم ہزار چاہیں کہ وہ ہمیں دشمن نہ سمجھے مگر وہ دشمن سمجھنے پر ملا ہوا ہے۔ میں اپنے پیشے میں وہ کر ملک کی بہتر خدمت کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں کچھ مفید کام سر انجام دے سکتا ہوں۔ آپ اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں کوئی بات کر گزنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ آگے چل کر سوائے ملک کے نقصان کے اور کچھ نہیں ہو گا۔“

اس کے جواب میں انہوں نے مجھ پر گالیوں کی ایک اور بوچھاڑ کر دی۔ لیکن انہیں احساس ہو گیا کہ میں اس جلد بازی کے کام میں ان کا ساتھ نہیں دوں گا۔

جو کمانڈر انچیف اپنے گورز جزل کو ایسی کھری باتیں سنانے کی ہمت رکھتا ہو،<sup>URDU4U.COM</sup> اس کا یہ فرض بھی تھا کہ وہ اسے کوئی اور غیر جمہوری اور غیر آئینی قدم اٹھانے سے باز رہنے کی تلقین بھی کرے۔ لیکن ایوب خاں نے مسٹر غلام محمد کو ایسی کوئی وارنگ نہ دی۔ بلکہ اس کے بر عکس جب ہنگامی حالات کا اعلان ہوا اور اس بیملی کی بر طرفی کے بعد نئی کابینہ بنی تو ایوب خاں نے کمانڈر انچیف کے عمدہ کے ساتھ ساتھ اس میں وزیر دفاع کا منصب بھی قبول کر لیا۔ اسکندر مرزا اس نئی کابینہ میں وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔ ان دونوں حضرات کی رفاقت مسٹر غلام محمد کے لیے بڑی زرودست پشت پناہی تھی اور غالباً یہی وہ شہر تھی جس کے زور پر انہوں نے اتنا بڑا قدم بھی اٹھایا تھا۔ اس نے میں اس کابینہ کو Cabinet of Lent کما جاتا تھا۔ وطن عزیز ایسے جو ہر نایاب سے غالباً نہیں، جو صرف ہنگامی حالات میں اپنا جو بن دکھاتا ہے اور کابینہ میں شامل ہو کر ملک کی خدمت کرنے میں پچکچاہت سے کام نہیں لیتا۔ یہ صورت حال آج تک جاری و ساری ہے۔

میرے چارج لینے کے چند روز بعد نومبر میں کراچی میونسل کارپوریشن نے گورز جزل کو ایک استقبالیہ پر مدعو کیا۔ استقبالیہ سے چند گھنٹے قبل مجھے انٹیلی جنس کی ایک چیل رپورٹ موصول ہوئی، جس میں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ جب گورز جزل کارپوریشن کے استقبالیے میں شریک ہونے جائیں گے تو راستے میں شاید کچھ لوگ مظاہرہ کریں اور مخالفانہ نظرے لگائیں۔ میں اس رپورٹ کو فوراً مسٹر غلام محمد کے پاس لے گیا۔ اسے پڑھتے ہی ان کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر سنائے کے عالم میں رہے، پھر بولے کہ میں یہ رپورٹ لے کر وزیر داخلہ اسکندر مرزا اور وزیر دفاع ایوب خاں کے پاس جاؤں اور ان سے کہوں کہ وہ دونوں گورز جزل کے ساتھ ان کی گاڑی میں کراچی کارپوریشن چلیں۔

اسکندر مرزا صاحب کے دفتر پہنچ کر میں نے انہیں اٹھیلی جس کی رپورٹ دکھائی اور گورنر جزل کا پیغام سنایا تو وہ اپنے خصوص انداز میں خی خی کر کے خوب ہنسے اور بولے۔  
”بڑھا بست نیا وہ ڈر گیا ہے۔ اس قدر خوف کی بات نہیں۔ چلو ایوب سے چل کر بات کرتے ہیں۔“

اسکندر مرزا صاحب کی گاڑی میں بیٹھ کر ہم ایوب خاں کے پاس پہنچے۔ دونوں پہلے کچھ دیر آپس میں کھر پھر کرتے رہے۔ پھر زور زور سے قبیلے لگا کر گورنر جزل کی خوفزدگی کا مذاق اڑاتے رہے۔ پھر مجھ سے کہا کہ میں واپس جا کر مسٹر غلام محمد کو تسلی دوں کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ شوق سے کارپوریشن کے استقبالیہ میں تشریف لے جائیں۔ میں نے جواب دیا کہ گورنر جزل میری نیا نی بات پر نیا وہ یقین نہ کریں گے۔ اگر وہ یہی بات لکھ کر دے دیں تو بہتر ہو گا۔

یہ سن کر اسکندر مرزا نے فوراً اپنا قلم نکلا اور اٹھیلی جس رپورٹ کے حلشیے پر ایک نوٹ لکھ دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں گورنر جزل کو مکمل یقین دلاتا ہوں کہ حالات پوری طرح قابو میں ہیں۔ وہ بے فکری سے کارپوریشن کے جلسے میں جائیں۔ راستے میں کوئی گزبرد نہ ہو گی۔

تیرے پھر میں مسٹر غلام محمد کے ساتھ ان کی کار میں بیٹھا اور ہمارا قافلہ کراچی کارپوریشن کی طرف روانہ ہوا۔ ہمارے آگے پچھے مسلح پولیس کی اتنی کثرت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم استقبالیہ میں شریک ہونے نہیں جا رہے بلکہ کوئی مورچہ فتح کرنے جا رہے ہیں۔ سڑکیں سنان پڑی تھیں، اور اکا دکا راہگیروں کو بھی پولیس والے لاٹھیوں سے کھدیڑ کر گلی کوچوں میں بھگا رہے تھے۔ راستے میں اس قدر امن و امان دیکھ کر مسٹر غلام محمد ایک دم شیر ہو گئے۔ انہوں نے اپنی چھڑی کا ہینڈل میری پسیلوں میں چھو کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور اٹھیلی جس والوں کو موٹی گالی دے کر کہا۔ کہاں گئے میرے خلاف مظاہرہ کرنے والے؟ کہاں مر گئے میرے خلاف نظرے لگانے والے؟“

میں نے پولیس کے انتظام کی کچھ تعریف کی تو انہوں نے پولیس والوں کو بھی بڑی سخت گالی دی اور اپنی چھاتی پر ہاتھ مار کر بولے۔ ”میں کسی سے ڈلنے والا نہیں۔ اگر کوئی میرے سامنے آئے گا میں اس کی نانگیں توڑ دوں گا۔ اگر کوئی میرے خلاف نفرہ لگائے گا، میں اس کے منہ پر تھوک دوں گا۔“ اپنے اس عزم کا عملی مظاہر کرنے کی خاطر مسٹر غلام محمد نے کار میں زور سے تھوکا، جو اچٹ کر ان کے کوٹ کے کار پر گرا۔ اے۔ ڈی۔ سی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک نیپکن مجھے دیا۔ میں نے اس سے کوٹ کا کار صاف کرنے کی کوشش کی تو مسٹر غلام محمد نے چھڑی گھما کر مجھے غور سے گھوڑا اور کھنے لگے۔ ”تم کشمیری ہو نا؟ کشمیری ہا تو بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ تم صبح سے سے ہوئے بیٹھے تھے۔ سڑک پر یہ ہو جائے گا۔ وہ ہو جائے گا۔ اب بولو کیا ہوا؟ غلام محمد کے سامنے کون کھڑا ہو سکتا ہے؟ تھو۔ تھو۔ تھو.....“ انہوں نے نفرت سے کئی بار تھوکا اور کارپوریشن کے لان تک پہنچتے پہنچتے بڑی مشکل سے ان کے کوٹ کا کار اور آستین صاف کی گئی۔

مسٹر غلام محمد کا معمول تھا کہ وہ دن کے گیاہ بجے اپنے عملے کے کچھ افراد کو اپنے ساتھ چائے پر اکٹھا کیا کرتے تھے۔ کارپوریشن کے اسقبالیہ کے بعد کئی روز تک وہ چائے پر میرا مذاق اڑا کر مجھے رگیدتے رہے کہ انتیلی جنس کی روپورٹ دیکھ کر اس شخص کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور یہ کار میں اس طرح سما ہوا بیٹھا تھا جس طرح چوہا بلی کے ڈر سے تھر تھر کاپتا ہے۔ تیرے یا چوتھے روز انہوں نے مجھے مخاطب کر کے سوال کیا۔ ”چجچ بتاؤ، ڈر کے مارے کار میں تمہار پیشاپ بھی خطا ہوا تھا یا نہیں؟“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ یور ایکسیلیننسی، اس روز مجھ پر کوئی خوف طاری نہ ہوا تھا۔“

یہ جواب سن کر مسٹر غلام محمد سکتے میں آگئے۔ پھر غصے سے بولے۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ میں خاموش رہا۔

”ہاں، ہاں۔“ مسٹر غلام محمد چیخ کر بولے۔ تمہارا یہی مطلب ہے کہ میں جھوٹ بکواس کر رہا ہوں۔“

میں پھر خاموش رہا۔ بس اب کیا تھا۔ گورز جزل غصے میں آپ سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے چائے کی پیالی قایلین پر چیخ دی اور چیخ چیخ کر اس بات کا ماتم کرنے لگے کہ اب دو دو ٹکے کے سرکاری ملازم بھی سربراہ مملکت کے منہ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگانے کی جرات کرنے لگے ہیں، جو ملک کے سربراہ کا وفادار نہیں وہ ملک کا وفادار نہیں۔ ایسے غداروں کے متعلق انہوں نے بڑی ہولناک سزا میں تجویز کیں اور ہم سب منہ لٹکائے اپنے اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مس بول میرے کمرے میں آئی اور میری ڈھارس بندھانے لگی کہ اس گھر میں ایسے واقعات وقتہ فوقۃ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ مسٹر غلام محمد کی نفیات پر تبصرہ کر ہی رہی تھی کہ اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور گورز جزل اپنی وہیل چنیرو پر بیٹھے ہوئے اندر تشریف لائے۔ آتے ہی انہوں نے مس بول سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ میرے آنسو پوچھنے آئی تھی، کیونکہ میں چائے والے واقعہ پر سخت شرمندہ تھا، اور اس وقت سے اب تک زار و قطار روتا رہا تھا۔

اچھا! مسٹر غلام محمد نے بچوں کی طرح خوش ہو کر پوچھا۔ ”کتنا رویا ہے؟“ ”بکٹ فل، ایکسیلنسی، بکٹ فل،“ مس بول نے ہاتھوں سے بڑی بالٹی کا سائز بنا کر کہا۔

”کیا یہ اب ایک پیالی چائے کا مستحق ہو گیا ہے؟“ گورز جزل نے پوچھا۔

”ہاں ایکسیلنسی، چائے کے ساتھ کیک کا بھی۔“ مس بول نے کہا۔ ”نہیں، کیک تم کھانا۔“ مسٹر غلام محمد نے محمل کر کہا۔ ”اس کو ہم صرف بکٹ دیں گے۔“

اس مول تول کے بعد وہ دونوں مجھے اپنے ساتھ اوپر لے گئے۔ مسٹر غلام محمد نے چائے کے ساتھ مجھے گن کر صرف ایک بکٹ دیا اور خود وہ کیک کی کریم الگیوں سے چاٹ

چاٹ کر کھاتے رہے۔

ایک رات میں اپنے گھر سیا ہوا تھا۔ آدھی رات کے قریب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میرا ڈپٹی سینکڑی فرخ امین بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آپ جس حالت میں ہیں اسی طرح فوراً گورنر جزل ہاؤس آ جائیں۔“

مسٹر غلام محمد بیمار تو رہتے ہی تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید اچانک انہیں کچھ ہو گیا ہے۔ میں نے فرخ امین سے پوچھا، بڑے میاں تو ٹھیک ہیں؟“

ٹیلیفون پر تھوڑی دیر کچھ کھسر پھسری ہوئی۔ پھر اس نے گول مول سا جواب دیا۔ ”ہاں لیکن آپ فوراً یہاں پہنچ جائیں۔“

میں بھاگم بھاگ گورنر جزل ہاؤس پہنچا اور سیدھا مسٹر غلام محمد کے بیڈ روم میں گیا، جو تیز روشنیوں سے بقہ نور بنا ہوا تھا۔ گورنر جزل اپنے بستر پر بمت سے تکلیف کا سارا لیے بیٹھے تھے اور ان کے اٹاف کے کئی ممبر کمرے میں اوہر اوہر سے ہوئے کھڑے تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو مسٹر غلام محمد کچھ دیر تک اپنی پیلی پیلی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑے مجھے گھورتے رہے۔ پھر بڑے تنخ انداز میں بولے۔ ”مجھے زندہ دیکھ کر آپ کو بڑی مایوسی ہو گی۔ آپ تو بڑے شوق سے میرا جتناہ اٹھانے آ رہے تھے۔“

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی، تو انہوں نے ڈانٹ کر مجھے چپ کرا دیا اور کھنے لگے۔

”جب تم ٹیلیفون پر فرخ امین سے بات کر رہے تھے، تو میں بھی ریسیور سے کان لگا کر سن رہا تھا۔ تم نے بڑے شوق سے پوچھا تھا کہ کیا یہ بڑھا مر گیا ہے؟“

میں اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ دو ڈھانچے تک انہوں نے اسی ایک بات کو طول دے کر بار بار ایسی رث لگائی کہ آخر بالکل ندھال ہو کر تکلیف پر گر گئے۔ ہم نے ان کے ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے آکر انہیں کچھ گولیاں کھلا کیں اور یہکہ لگا کر سلا دیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مسٹر غلام محمد یہ کچھری رات کے دس بجے سے لگائے بیٹھنے تھے۔ ان کے ذاتی عملے کے کسی ملازم سے کوئی قصور سرزد ہو گیا تھا۔ دس بجے سے اس پر مقدمہ چل رہا تھا اور سزا تجویز ہو رہی تھی۔ آخر تنگ آکر آدمی رات کے قریب کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ سارا کیس سیکرٹری صاحب کے پرداز کر دیا جائے، وہ پوری انکواری کر کے اپنی روپورٹ گورنر جزل کی خدمت میں پیش کریں۔ اس مقصد کے لیے مجھے بلایا گیا اور جب میں حاضر ہوا تو اصل مقدمہ خارج ہو گیا اور ایک بالکل نیا سمجھنا کھرا ہو گیا۔ اس زمانے میں مسٹر غلام محمد کا ذہن اسی طور پر کام کرتا تھا۔ ایک روز دفتر پہنچتے ہی پیغام ملا کہ گورنر جزل یاد فرم رہے ہیں۔ میں ان کے بیٹھ روم میں داخل ہوا تو فرش پر ایک فائل پڑی ہوئی نظر آئی۔ میں نے سوچا کسی سے بے خیالی میں گر گئی ہو گی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ گورنر جزل نے اپنا نائم پیس تڑاخ سے میرے سر پر دے ما را اور گرج کر کہا۔ ”فائل کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ نائم پیس اٹھا کر یہاں لاو۔“ میں نے نائم پیس اٹھا کر انہیں واپس دیا تو انہوں نے شول شول کر اس کا بغور جائزہ لیا کہ میرے سر سے نکلا کر اس کا کچھ بگڑ تو نہیں گیا۔ میرے سر میں اس کی ضرب سے گھمٹ سا پڑ گیا تھا۔ میں نے کسی قدر طنز سے کہا۔ ”یہ نائم پیس بڑا نازک اور قیمتی ہے۔ اس سے پھر کا کام لینا جائز نہیں۔“

”تمہارا سر بھی تو سنکریٹ سے بنا ہوا ہے۔“ مسٹر غلام محمد نے مسکرا کر کہا۔

خیر سگالی کی اس گفتگو کے بعد انہوں نے مجھے مسری پر بٹھا لیا اور فرش پر پڑی ہوئی فائل کا قصہ سنایا۔ بات یہ ہوئی کہ کل رات انہوں نے مس بوول کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ وہ حسب معمول اپنی بوڑھی والدہ کو اپنے ساتھ لے کر آئی۔ یہ بات مسٹر غلام محمد کو پسند نہ تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ مس بوول ڈنر پر تھا آیا کرے۔ لیکن مس بوول اکثر ان کی اس آرزو کو پورا نہ کیا کرتی تھی۔ کل رات ڈنر کے دوران مسٹر غلام محمد نے مس بوول کی والدہ کے ساتھ بے رخی کا بر تاؤ کیا اور کچھ نازیبا کلمات

بھی کے۔ مس بول نے اس بات کا بہت برا منیا۔ آج صبح گورز جزل نے اسے ایک فائل کے ساتھ اپنے کمرے میں طلب کیا۔ وہ منہ پھلانے ہوئے آئی۔ مسٹر غلام محمد نے اسے حکم دیا کہ وہ صبح سوریے روشنی صورت لے کر ان کے کمرے میں نہ آئے، بلکہ مسکراتی ہوئی ان سے ملے۔ مس بول اسی طرح منہ پھلانے کھڑی رہی۔ گورز جزل نے تحکمانہ انداز میں کئی بار اسے مسکرانے کا حکم دیا تو اس نے غصے سے فائل نہیں پر دے ماری اور روئی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اب مسٹر غلام محمد نے میرے ذمہ یہ ڈیوٹی سپرد کی کہ میں مس بول کو سمجھا بجھا کر یہاں واپس لاؤں، وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہو اور نہی خوشی فرش پر پڑی ہوئی فائل اٹھا کر گورز جزل کے حضور میں پیش کرے۔ میں مس بول کے پاس گیا، تو وہ غالباً اسی نوعیت کی طلبی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ بڑی زیرک اور نعمگسار طبیعت کی لڑکی تھی اور مسٹر غلام محمد کی مغدوریوں کی وجہ سے اسے ان کے ساتھ ایک خاص قسم کی ہمدردی تھی۔ میں نے اسے نائم پیس سمیت سارا واقعہ سنایا، تو وہ فوراً میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔ گورز جزل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی مسکراہوں کا فوارہ چھوڑا اور فرش پر پڑی ہوئی فائل اٹھا کر اسے بھند ادب و احترام ان کی خدمت میں پیش کیا۔ مسٹر غلام محمد کا چرہ دودھ پیتے پچے کی طرح کھل اٹھا اور ان کے منہ کے دونوں کونوں سے بے اختیار رالیں لےکر لگیں۔ پھر اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ ان کی پیشانی پر مل پڑ گئے اور غرا کر بولے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں یہاں کس نے بلایا ہے؟ فوراً میری نظریوں سے دور ہو جاؤ.....”

مسٹر غلام محمد نے کبھی یہ بات تسلیم نہ کی تھی کہ فالج کی وجہ سے ان کی زبان میں شدید لکنت ہے اور لوگ ان کی بات سمجھنے سے قاصر ہیں۔ غالباً وہ اسی خوش فہمی میں بھلا رہے کہ ان کی باتوں کا معیار اتنا بلند ہوتا ہے کہ کم فہم لوگ انہیں آسانی سے سمجھ نہیں پاتے یا کبھی کبھی وہ سمجھتے تھے کہ دوسرے لوگوں کو ساعت میں کوئی فتور

ہے۔ ایک روز ایک جائش سیکرٹری اپنے وزیر کے ہمراہ گورنر جنرل کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس بچارے کی سمجھ میں گورنر جنرل کی کوئی بات نہ آ رہی تھی۔ نگ آ کر مسٹر غلام

محمد نے پوچھا، ”کیا تم بھرے ہو؟“

جان بچانے کی خاطر جائش سیکرٹری نے بہانہ بنایا۔ ”جی ہاں، سر۔ آجکل میرے کافلوں میں بڑی تکلیف ہے۔“

اب کیا تھا۔ گورنر جنرل نے ڈپنسری سے کمپاؤنڈر کو بلوایا اور وہیں بیٹھے بیٹھے بچارے جائش سیکرٹری کے کافلوں میں پچکاری لگوا کر صفائی کر دی۔

ایک بار عید کے موقع پر مسٹر غلام محمد کے سر پر یہ بھوت سوار ہو گیا کہ وہ قوم کے نام اپنا پیغام خود برداڑ کاٹ کریں گے۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ۔ اے۔

بخاری کو یہ ترکیب سوجھی کہ پیغام ریکارڈ کر کے پہلے گورنر جنرل کو سنا دیا جائے۔ وہ عقل مند آدمی ہیں۔ یہ اشانہ خود سمجھ جائیں گے کہ ان کی آواز اس قابل نہیں ہے

کہ ریڈیو پر برداڑ کاٹ کی جائے۔ چنانچہ بخاری صاحب کی سرکردگی میں بڑے اہتمام سے مسٹر غلام محمد کی تقریر ریکارڈ کی گئی۔ اس کے بعد بخاری صاحب نے بڑے ادب

سے پوچھا۔ ”حضور، کیا آپ اپنی تقریر کا ریکارڈ سننا پسند فرمائیں گے؟“

”ضرور۔“ گورنر جنرل نے گرمجوشی سے جواب دیا۔

اب جو ریکارڈنگ کا ٹیپ چلایا گیا، تو اس سے خر خر، غر غر، غال غال کے ساتھ لپٹی ہوئی ایسی آوازیں برآمد ہونے لگیں جیسے پھٹے ہوئے پاپ سے بہت سی گیس ہے۔ یک وقت خارج ہونے کی کوشش کر رہی ہو۔ آدھا ٹیپ سن کر مسٹر غلام محمد آپ سے باہر ہو گئے اور انہوں نے بخاری صاحب کا ٹیٹوا لیا کہ ریڈیو کا یہ کیا اندازی ڈائریکٹر جنرل ہے جو ایک تقریر بھی صحیح طور پر ریکارڈ نہیں کر سکتا؟ اس روز ہم لوگوں نے بڑی مشکل سے بخاری صاحب کو گورنر جنرل ہاؤس سے صحیح سلامت باہر نکلا اور مسٹر غلام محمد کافی عرصہ تک اپنے ملنے والوں سے ان کی ناالی اور اندازی پن کا روشن روشنے رہے۔

کابینہ کے وزیر، غیر ملکی سفیر اور دوسرے ملاقاتی جب گورز جزل سے ملنے آتے تھے تو انہیں مسٹر غلام محمد کی گفتگو سمجھنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ ایسے موقعوں پر کوئی اے۔ ڈی۔ سی یا مس بوول یا میں موقع پر موجود ہو کر ترجمانی کے فرائض ادا کیا کرتے تھے۔ ایک بار مصر کے صدر جمال عبدالناصر کسی دورے پر جاتے ہوئے ایک رات کے لیے کراچی میں رکے۔ انہیں گورز جزل ہاؤس میں مہمان نہما رایا گیا۔ رات کو ان کے اعزاز میں عشاہیہ تھا۔ ڈنر سے پہلے دونوں صاحبان کچھ دری کے لیے ایک دوسرے سے ملے تو ان کے درمیان انگریزی میں گفتگو ہونے لگی۔ بات چیت کا آغاز اس طرح ہوا:

**مسٹر غلام محمد:** پچھلے سال میں بڑا شدید بیمار ہو گیا تھا۔

**صدر ناصر:** (کچھ نہ سمجھے۔ بلکہ یہ قیاس کیا کہ رسم کے مطابق وہ ان کی خیریت دیافت کر رہے ہیں) لیں، ایکسیلنسی۔ گذ۔ ویری گذ۔

**مسٹر غلام محمد:** میں اتنا سخت بیمار ہو گیا تھا کہ مرنے کے قریب تھا۔

**صدر ناصر:** لیں، ایکسیلنسی۔ گذ۔ ویری گذ۔

اس مرحلے پر ہمارے عملے کا ایک آدمی وہاں پہنچ گیا اور اس نے ترجمانی کا فریضہ سنھال کر صورت حال کو مزید پیچیدگی سے بچا لیا۔

اسی زمانے میں ترکی کے صدر جلال بیار نے بھی پاکستان کا دوہہ کیا تھا۔ وہ انگریزی بالکل نہ سمجھتے تھے اور ان کا ذاتی ترجمان ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ گورز جزل کے سرکاری ڈنر کے دوران ترجمان دونوں کے پیچھے کری پر بیٹھ گیا تاکہ مسٹر غلام محمد کی گفتگو کا ترجمہ ترکی میں اور جلال بیار کی باتوں کا ترجمہ انگریزی میں کرتا جائے۔ تھوڑی دری کے بعد وہ پیمنہ پیمنہ ہو گیا اور سر کپڑ کر وہاں سے غائب ہو گیا کیونکہ مسٹر غلام محمد کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ میں نے اس سے دیافت کیا کہ کیا میں اس کی کچھ مدد کروں؟ اس نے جواب دیا، کہ صدر جلال بیار نے کہا ہے کہ وہ ترجمان کے بغیر ہی صورت حال سے بخوبی نپٹ لیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد کھانے

کے دورانِ مسٹر غلام محمد مسلسل بولتے رہے اور ترکی کے صدر کبھی مسکرا کر، کبھی سر ہلا کر، کبھی آنکھیں گھما کر ان باتوں کا جواب اشاروں ہی اشاروں میں دیتے رہے۔ کھانے کی میز پر دو سربراہانِ مملکت کے درمیان اس قدر طویل یکطرفہ مقالہ اور کمیں نہیں ہوا ہو گا۔

ایک روز کراچی کے چند مشہور و معروف شریوں کی درخواست موصول ہوئی کہ اہالیانِ شر کے نمائندوں کا ایک وفد گورنر جنرل ہاؤس میں ایک تقریب منعقد کر کے مسٹر غلام محمد کی خدمت میں "محافظ قوم" "Saviour of the Nation" کا خطاب پیش کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس پر ایک لمبا چوڑا نوٹ لکھا کہ یہ لوگ خوشامدی ٹھوپیں۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنا ان کا شیوه ہے۔ ایسی تقریبات سے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت کا قرب حاصل کر کے اپنا الو سیدھا کریں۔ یہ لوگ اپنی ذات کے سوا اور کسی کی نمائندگی نہیں کرتے اور ان کی طرف سے گورنر جنرل کو قوی خطاب دیا جانا بڑی مضمونی خیز بات ہے۔ لہذا میں نے مشورہ دیا کہ اس درخواست کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے روکر دیا جائے۔

میرا نوٹ پڑھ کر مسٹر غلام محمد سخن پا ہو گئے۔ انہوں نے میرا نوٹ تو پھاڑ کر نکلے نکلے کر دیا اور ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ ساری قوم تو قدرِ شناسی کے طور پر ان کے سر پر عظمت کا تاج رکھنا چاہتی ہے اور میں اس منصوبہ کو سیوتاڑ کرنے کے لیے بے قرار ہوں۔ انہوں نے حکم دیا کہ اس معاملے کے ساتھ مزید کوئی سروکار نہ رکھوں اور اس خط کا جواب انہوں نے میرے ڈپٹی سیکرٹری سے تحریر کروایا کہ وہ لوگ بڑی خوشی سے تشریف لا سیں اور قوم کی جانب سے (Saviour of the Nation) کا خطاب مسٹر غلام محمد کو مرحمت فرمائیں۔ گورنر جنرل اس اعزاز کو قبول فرمانے کے لیے بخوبی تیار ہیں۔

اس مقصد کے لیے جو تقریب منعقد ہوئی وہ اسی نوعیت کی تھی جیسے چھوٹے چھوٹے بچے جھوٹ مٹ کر گزیا گزیے کی شادی رچاتے ہیں۔ ایک کشاور برآمدے میں قائلین

بچھائے گئے ان پر کریاں اور صوفے لگائے گئے۔ کراچی کے پچیس تیس جغاوری خوشامدی ان پر ادب سے بیٹھے گئے۔ مسٹر غلام محمد کالی شیروانی اور جناح کیپ پنے ایک کمرے سے نمودار ہوئے اور عاجزی سے مسکین صورت بنا کر ایک گرجی پر براجمن ہو گئے۔

ایک صاحب نے سنری چوکھے میں فریم کیا ہوا کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا توصیفی ایڈیس پڑھا اور مبالغے کے جملہ اصناف کو کام میں لا کر مسٹر غلام محمد کو پاکستانی قوم کا نجات دہنہ ثابت کیا۔ جواب میں گورنر جزل نے جذبات سے مغلوب ہو کر کچھ ٹوے بھائے اور بھرائی ہوئی آواز میں اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک اپنے عزیز وطن اور قوم کی اسی طرح بے لوث خدمت سرانجام دیتے رہیں گے۔ حاضرین نے تالیاں بجائیں اور نجات دہنہ قوم۔۔۔ زندہ باد" کے نترے لگائے۔ اس کے بعد سب نے چائے کے ساتھ کیک، پیشہ اور سموے کھائے اور اس ضروری کارروائی کے بعد سب وہ محفل برخاست ہو گئی جس میں جھوٹ، چالپوی اور خوشامد کی ملمع سازی اتنی نمایاں تھی کہ اسے دیکھ کر گھن آتی تھی اور کراہت محسوس ہوتی تھی۔

اگر خوشامدیوں کی صحبت میر آنا خوش قسمتی ہے تو اس باب میں مسٹر غلام محمد واقعی خوش قسمت تھے۔ ان کے قریب تین اور عزیز تین دوستوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو گورنر جزل کے زمانے میں ان کے کھلے بندوں شرمناک حد تک خوشامد نہ کرتا ہو۔ ایک بار وہ اپنے دو تین دوستوں کو ساتھ لے کر کار میں ہوا خوری کے لیے نکلے۔ مجھے بھی اگلی سیٹ پر ساتھ بٹھا لیا۔ ان دونوں کراچی میں غالباً پہلی آنٹھ دس منزلہ عمارت "قرہ باؤس" کے نام سے تعمیر ہو رہی تھی۔ جب ہم اس کے قریب سے گزرے تو مسٹر غلام محمد نے پوچھا، کہ اتنی بڑی بلڈنگ کون بنگا رہا ہے؟ ان کے ایک دوست نے فوراً ادب سے سر جھکا کر کہا۔ "حضور کے اقبال سے بن رہی ہے۔" ایک مسجد سے کچھ لوگ مغرب کی نماز پڑھ کر باہر نکل رہے تھے۔ دوسرے دوست نے گورنر جزل کی توجہ ان کی طرف منعطف کروائی اور کہا۔ حضور کے اقبال سے آجکل مسجدیں خوب آباد ہیں اتنے نمازی پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ سب آپ کی برکت ہے۔" "اس

برکت" کا نزول ۲۷ یا ۲۸ برس بعد آج تک جاری ہے!

ایک روز مسٹر غلام محمد نمونے میں بتلا تھے۔ ان کے ایک عزیز دوست میرے پاس بکرے ذبح کرنے کی چھری لے کر آئے۔ چھری چاندی کی طشتی میں دھری ہوئی تھی اور اوپر ایک بزر ریشمی رومال ڈالا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں اس چھری پر مسٹر غلام محمد کا ہاتھ پھرا لاؤں، کیونکہ وہ اس سے چند بکرے ذبح کر کے ان کی صحت اور سلامتی کے لیے صدقہ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے مسٹر غلام محمد کو یہ بات بتائی تو انہوں نے بڑی خوشی سے چھری پر اپنے دونوں ہاتھ کنی بار پھیر دیئے۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں ان صاحب کے ساتھ اپنا ڈپی سیکرٹری بھی بھیجنा چاہتا ہوں تاکہ صدقہ کی رسم چھری پر ہاتھ پھرانے تک ہی محدود نہ رہے بلکہ بکرے بھی ضرور ذبح ہوں۔"

یہ بات سن کر مسٹر غلام محمد کی آنکھوں میں تیز تیز چمک آئی اور انہوں نے زندگی میں پہلی بار مجھے شباباش دے کر کہا۔ "ہاں، ہاں، ضرور بھیجنा۔ بعد میں مجھے روپورٹ بھی دینا۔"

والپس آکر جب میں نے ان صاحب کو بتایا کہ مسٹر غلام محمد کی خواہش ہے کہ صدقہ کے وقت ان کا ڈپی سیکرٹری بھی ان کی نمائندگی کرے تو ان کا منہ بن گیا اور وہ بڑے بدمزہ ہو کر میرے کمرے سے نکلے۔

خوشامد کی قینچی عقل و فہم کے پر کاٹ کر انسان کے ذہن کو آزادی پرواز سے محروم کر دیتی ہے۔ خوشامدیوں میں گھرا ہوا انسان شیرے کے قوام میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح بے بس اور معدور ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے اپنے حواس معطل ہو جاتے ہیں اور وہ وہی کچھ دیکھتا، سنتا، بولتا، سوگھتا اور محسوس کرتا ہے، جو خوشامدی کیڑے کو کون کی طرح گھس کر اس کے وجود میں پلتے رہتے ہیں۔ جس سربراہ مملکت کی کرسی کو خوشامد کی دیکھ لگ جائے اور پائیدار نہیں رہتی، اس کے فیصلے ناقص ہوتے ہیں اور اس کی رائے دوسروں کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔ اگر سربراہ مملکت مسٹر غلام محمد کی طرح جسمانی طور پر مفلوج ہو تو خوشامدیوں کے دوش پر سوار ہو کر وہ سارے ملک کو

خطرے کی صلیب پر لٹکائے رکھتا ہے۔

پرائم مسٹر، وزراء، کمانڈر انچیف اور دیگر اعلیٰ حکام میں کوئی ایسا مانی کا لال نہ تھا جو مسٹر غلام محمد کے روپ و کسی جائز نکتے پر بھی اختلاف رائے کا اظہار کرتا ہو۔ وہ سب ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور ان کے منہ پر جی حضوری کا دم بھرتے تھے۔ لیکن ان کی پیچھے پیچھے سب ان کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے احکام کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیتے تھے یا اپنی خواہش کے مطابق توڑ مروڑ کر عملی جامہ پہناتے تھے۔ کاروبار حکومت کی ہر سطح پر ذاتی پسند اور شخصی بالادستیوں کا دور دونہ تھا اور مرکز گریز عناصر کو من مانی کاروانیاں کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ خاص طور پر جو لاوا مشرقی پاکستان میں پکنا شروع ہو گیا تھا، اس کی طرف توجہ دینے کی کسی کو فرصت نہ تھی۔ ۱۹۵۲ء کے انتخابات نے مشرقی پاکستان میں سیاست کے ایک نئے رخ اور ایک نئی توانائی کو جنم دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں گورنر جنرل نے مرکز میں کہ پتلیوں کا جو کھیل رچا رکھا تھا، اس کی حیثیت قرون وسطیٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے کسی رجواۓ سے مختلف نہ تھی۔ مولانا بھاشانی نے کامگاری کے جلسہ عام میں مغربی پاکستان کو "اسلام علیکم" کی دھمکی سنا کر ایک خطرناک علیحدگی پسند رجحان کو زیان دے دی تھی۔ مسٹر غلام محمد کی صدارت میں نت روز مرکزی کابینہ کے اجلاس ہوتے رہتے تھے۔ لیکن ایسا اجلاس کبھی نہ ہوا جس میں مشرقی پاکستان کی نئی صورت حال کا سمجھدگی کے ساتھ سیاسی تجزیہ کیا جائے۔ کابینہ کا اجتماعی ذہن نوکر شاہی کی لکیر کا فقیر تھا۔ وہ مشرقی پاکستان میں ابھرتی ہوئی نئی سیاست کا جواب سیاست سے دینے کی الیت نہ رکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تو وہی فرسودہ نو آبادیاتی فارمولہ تھا کہ اگر صوبائی حکومت پسند خاطر نہ رہے تو اسے برطرف کر کے صوبے میں گورنر کا راج نافذ کر دیا جائے۔

آئین ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین خاں نے اسمبلی کی برطرفی کو قبول نہ کیا تھا اور گورنر جنرل کے ہنگامی حالات کے خلاف سندھ ہائیکورٹ میں رٹ دائر کر رکھی تھی۔ سندھ ہائیکورٹ نے فیصلہ دیا کہ گورنر جنرل کو اسمبلی برطرف کرنے کا کوئی اختیار

نہ تھا۔ حکومت نے اس فیصلہ کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ فیڈرل کورٹ نے اس بیلی بر طرف کرنے میں گورنر جزل کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد ایک طویل قانونی کشمکش کا آغاز ہوا جس کے دوران میں گورنر جزل نے ایک ایم جنسی پاورز آرڈر نینس جاری کر کے کئی نئے اختیارات اپنے قبضہ میں لے لیے۔ ان میں ایک تو مغربی پاکستان میں ”ون یونٹ“ قائم کرنے کا اختیار تھا۔ دوسرا اختیار یہ تھا کہ آئین سازی کے متعلق گورنر جزل ہر قسم کے انتظامات کرنے کا مجاز ہو گا۔ دراصل مسٹر غلام محمد کا ارادہ یہ تھا کہ وہ آئین ساز اس بیلی کی جگہ اپنی مرضی کے کچھ لوگوں کو نامزد کر کے ایک Constituent Convention قائم کریں اور اس سے آئین سازی کا کام لیں۔ یہ اختیار اسی ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔

اپنے ان اقدامات کے لیے قانونی آڑ حاصل کرنے کی نیت سے گورنر جزل نے فیڈرل کورٹ کو ایک ریفرنس پیش کی کہ وہ اس بیلی کی بر طرفی سے پیدا ہونے والی صورت حال کا جائزہ لے کر ان عوامل و عوائق کے متعلق انہیں اپنا مشورہ دے۔

مولوی تمیز الدین کیس، یوسف پٹیل کیس اور گورنر جزل کی ریفرنس کے نتیجہ کے طور پر فیڈرل کورٹ نے جو فیصلے دیئے، وہ پاکستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

اول: اس بیلی کو بر طرف کرنے کے لیے گورنر جزل کا اختیار تسلیم کر لیا گیا۔

دوئم: گورنر جزل کا یہ اختیار تسلیم نہ کیا گیا کہ وہ نامزد لوگوں کا کونشن قائم کر کے آئین سازی کا کام اس کے سپرد کر دے۔ بلکہ عدالت نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ فوراً بر طرف شدہ اس بیلی کی جگہ اسی طرز کی نئی اس بیلی قائم کرنے کے لیے انتخابات منعقد کرائے۔

سوم: بہت سے ایسے قوانین تھے، جو کچھلی اس بیلی کی طرف سے ابھی باضابطہ طور پر نافذ نہ ہوئے تھے۔ اس بیلی کی بر طرفی کے بعد گورنر جزل نے ایک آرڈر نینس کے ذریعہ ان کی توثیق کر دی تھی۔ فیڈرل کورٹ نے کہا کہ عبوری دور تک تو یہ توثیق کام آ

سکتی ہے لیکن جب نئی اسمبلی قائم ہو تو وہ ان قوانین کی باضابطہ منظوری دے۔  
ان فیصلوں کے پیچھے ”نظریہ ضرورت“ کی روح کا رفرما تھی۔ ریفارنس کیس میں چیف جسٹس  
نے خود لکھا ہے:

We have come to the brink of a chasm with only three alternatives before us:

(۱) to turn back the way we came by.

(۲) to cross the gap by a legal bridge.

(۳) to hurtle into the chasm beyond any hope of rescue.

(Federal Court of Pakistan، Report on the Special Reference made by His Excellency the Governor General of Pakistan

(Lahore، P.R) (دویں)

”هم ایک خندق کے کنارے آپنے ہیں“

جال ہمارے سامنے صرف تین راستے ہیں۔

(۱) جس راہ سے ہم یہاں تک آئے ہیں اسی راہ واپس مڑ جائیں۔

(۲) خندق پر ایک قانونی پل تعمیر کر کے اسے عبور کر لیں۔

(۳) خندق میں چھلانگ لگا کر تباہی کا شکار ہو جائیں۔“

فیڈل کورٹ نے مسٹر غلام محمد کی کھودی ہوئی اس خندق پر جو قانونی پل تعمیر کیا ہے Necessity

(قانون ضرورت) کے ستون پر کھرا

کیا گیا تھا۔ قانون کی یہ شاخ ہمارے امور

سلطنت میں پہلی بار ۱۹۵۵ء میں داخل ہوئی

اور ہمیں پہنچیں برس میں پہلی پھول کر یہ

ایسا تنومند درخت بن گئی، جس کے سائے

کے نیچے دب کر بہت سے دوسرے قوانین

کی باڑھ ماری گئی۔

جس نامے میں یہ ریفرنس فیڈل کوٹ کے زیر غور تھی، میں نے دیکھا کہ میرا ڈپنی سیکرٹری فرخ امین ہر دوسرے تیرے روز مجھے بتائے بغیر لاہور آ جا رہا ہے۔ ایک روز میں نے اسے ڈائیٹ کہ میری اجازت کے بغیر وہ اتنی بار لاہور کیوں آتا جاتا ہے؟ اس نے صاف گوئی سے کام لے کر مجھے بتایا کہ وہ گورنر جزل کا کوئی خفیٰ پیغام کوڈ ورڈ (Code Words) کی صورت چیف جسٹس مسٹر منیر کے پاس لے جاتا ہے اور وہاں سے اسی طرح کوڈ الفاظ میں چیف جسٹس کا پیغام گورنر جزل کو لا کر دے دیتا ہے۔ فرخ امین نے مزید بتایا کہ غلام محمد صاحب کا تائیدی حکم تھا کہ وہ یہ بات کسی کو ہرگز نہ بتائے۔ مجھے معلوم نہیں کہ گورنر جزل اور فیڈل چیف جسٹس کے ماہین اس خفیہ پیغام رسالی کی کیا نوعیت تھی اور نہ ہی یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس باہمی خفیہ پیغام رسالی نے فیڈل کوٹ کے فیصلہ پر کوئی اثر ڈالا بھی تھا یا نہیں؟ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے موقع پر مملکت کے سربراہ عدیلیہ کے سربراہ کا آپس میں خفیہ رابطہ قائم کرنا دونوں کو نسب نہ دیتا تھا۔

خدا خدا کر کے مسٹر غلام محمد نے کسی قدر بیزاری سے فیڈل کوٹ کا مشورہ تشییم کر لیا اور ایک آرڈیننس کے ذریعہ نئی آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ جس روز آرڈیننس تیار ہو رہا تھا، مسٹر غلام محمد نے مجھے حکم دیا کہ جس وقت بھی کانفرنس مکمل ہو کر آ جائیں، میں فوراً ان سے دستخط کروالوں۔ اگر وہ سوئے ہوئے بھی ہوں تب بھی انہیں جگا کر دستخط لے لیے جائیں۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ سارے کانفرنس آدمی رات کے قریب موصول ہوئے۔ میں انہیں لے کر مسٹر غلام محمد کے بیڈروم میں گیا۔ وہ اپنے بستر پر گری نیند سوئے پڑے تھے۔ اس وقت ان کی قوت ارادی کا ڈانٹمو بند تھا اور ان کا جسم بویسیدہ ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرح پلنگ پر بکھرا ہوا تھا، جیسے کسی پرانی قبر نے اپنے مردے کو اگل کر باہر پھینک دیا ہو۔ میں نے

ان کے ذاتی ملازم کی مدد سے بڑی مشکل کے ساتھ انہیں جگایا۔ بیداری کی لبران کے تن بدن میں اس طرح رک کر، ٹھہر ٹھہر کر داخل ہوئی جیسے بہت سی چیزوں پر  
روئی کے نکٹے کو گھیث گھیث کر دیوار پر چڑھاتی ہیں اور وہ بار بار ان کی گرفت  
سے پھسل پھسل کر نیچے گرتا رہتا ہے۔ مسٹر غلام محمد کافی دیر تک اپنی پیلی آنکھیں  
جھپکا جھپکا کر خلا میں گھورتے رہے۔ پھر اچانک انہوں نے مجھے پہچانا اور اس کے ساتھ  
ہی وہ فوراً گورز جزل کے سنجھاں پر براجمان ہو گئے۔ پہلے انہوں نے وزارت قانون کو  
کچھ جعلی کئی نائیں، جو اتنی ست رفتاری سے کام کرتے ہیں کہ سربراہ مملکت چین  
کی نیند بھی نہیں سو سکتا۔ پھر انہوں نے کافذات پر دستخط کئے اور چائے کے ساتھ انڈے  
کا حلہ تیار کرنے کا آرڈر دیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب شاف کے کچھ  
افراد کو بھی حاضری کا حکم دیا جائے گا اور اس کے بعد یہ محفل صبح تین چار بجے اس  
وقت برخاست ہو گی، جب انہیں نیند آور یہکہ لگا کر دویابہ سلا دیا جائے گا۔ میرے  
پاس دستخط شدہ کافذات وزارت قانون میں واپس پہنچانے کا بہانہ موجود تھا۔ میں نے اسے  
کامیابی سے استعمال کیا اور وہاں سے کھسک کر گھر آگیا۔

اسی عرصہ میں مرکزی کابینہ میں بھی دو بڑی اہمیت کے مالک نئے چہرے داخل ہو چکے  
تھے۔ ایک تو صوبہ سرحد کے مشہور کانگری لیڈر ڈاکٹر خاں صاحب تھے۔ وہ مسٹر آف  
کیونکیشنز بنے۔ دوسرے مسٹر حسین شہید سروردی تھے جن کے سپرد وزارت قانون ہوئی۔  
ڈاکٹر خاں صاحب کی جزل اسکندر مرزا سے ذاتی دوستی تھی۔ اس دوستی کی ابتدا اس وقت  
ہوئی جب اسکندر مرزا صاحب پشاور کے ڈپٹی کمشنز تھے۔ سنی سنائی روایت ہے کہ ایک  
بار کانگری لیڈر جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ اسکندر مرزا نے جلوس منتشر کرنے کے  
لیے کوئی پولیس طلب نہ کی بلکہ اس کے خیر مقدم کے لیے جگہ جگہ ٹھنڈے شربت  
کی سبیلیں قائم کر دیں۔ ہر سبیل پر جلوس والوں کو بڑے تپاک سے شربت پیش کیا  
جاتا تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ کانگریسیوں نے بڑے شوق سے شربت پیا، جس میں جمالگوہ

ملیا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد سب کے پیٹ میں اسیا مرور اٹھا کہ ہزاروں کا جلوس آن کی آن منتشر ہو گیا۔

جب ڈاکٹر خان صاحب مرکزی کابینہ میں شامل ہو گئے تو ایک روز جzel اسکندر مرزا نے چند افسروں کو بر سبیل تذکرہ یہ فصیحت بھی کی۔ ڈاکٹر خان صاحب کو خوش رکھنے کا خاص خیال رکھا کرو۔ اس شخص نے ساری عمر جیل کی ہوا کھائی ہے یا پولیس کے ڈنڈے کھائے ہیں۔ ہم اسے بڑی مشکل سے گھیر گھار کر حکومت میں لائے ہیں۔ اب اسے گذ لائف کا ایسا چکا لگاؤ کہ وہ اس پنجرب سے باہر نہ نکل سکے۔“

مشر سروردی کرنے کو تو وزیر قانون تھے، لیکن دراصل ان کی نظر وزارت عظمی پر تھی۔ وہ پرائم مشر محمد علی بو گرا کو ناقابل توجہ سمجھ کر ان کے ساتھ کچھ خلقی سے پیش آتے تھے اور کابینہ کی مینگ میں اکثر اس کی سبکی کرتے رہتے تھے۔ ایک بار کابینہ کے اجلاس میں وزیراعظم کسی مسئلہ کی وضاحت کر رہے تھے۔ مشر سروردی نے اپنی لاتعلقی اور بےاتفاقی کا اظہار کرنے کے لیے اپنے بیگ سے بیتری سے چلنے والا شیور نکلا اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی داڑھی موندنے میں مصروف ہو گئے۔ البتہ ایک راز انہوں نے بہت اچھی طرح پالیا تھا۔ وہ یہ کہ جس طرز کا نظام حکومت اس وقت ملک میں راجح تھا اس میں عروج حاصل کرنے کے لیے گورنر جzel کی خوشنودی حاصل کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ وہ اس کے لیے حسب توفیق ہاتھ پاؤں مارے رہتے تھے۔ انہیں فونو گرافی کا شوق تھا۔ وہ ساکت اور متحرک تصویریں کھینچنے کے کیمرے کندھے سے لٹکائے مختلف تقاریب میں مشر غلام محمد کی تصویریں کشی میں نمایاں رہنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ گورنر جzel ہاؤس میں بھی بہت آنے جانے لگے تھے۔ ہر مرتبہ آنے کا مقصد گورنر جzel سے ملاقات کرنا نہ ہوتا تھا بلکہ وہ مس بول کے کمرے میں بیٹھ کر کافی وقت خوش گپیوں میں گزارا کرتے تھے۔ مشر غلام محمد کی طرح مشر سروردی بھی خوبصورت عورتوں کی محفل کے شوqین تھے۔ اڑتے اڑتے یہ خبر مشر غلام محمد تک

پنجی تو جذبہ رقبت نے ان کے سینے میں جوش مارا اور انہوں نے بلا کر میری جواب طلبی کی۔

”یہ سروردی روختہ کے کمرے میں اتنی اتنی دیر آ کر کیوں بیٹھتا ہے؟“ مسٹر غلام محمد نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا کہ میں تو اپنے کام میں مصروف رہتا ہوں۔ دوسروں پر چوکیداری کرنے کا مجھے وقت نہیں ملتا۔ اس پر وہ آتش زیریا ہو گئے اور کڑک کر بولے، ”جا کر اسے کہہ دو کہ اگر اس نے دویابہ ایسی حرکت کی تو میں اس کی نانگلیں توڑ دوں گا۔“ سروردی صاحب سے میری تقطیع بندگال کے دونوں سے شناسائی تھی۔ میں اسی شام ان کی کوئی پر حاضر ہوا اور ان کو ساری روئیاد سنا ڈالی۔ اس کے بعد وہ کافی محاط ہو گئے۔ مسٹر غلام محمد بھی کئی روز تک اپنی پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر دن میں متعدد بار مس بوول کے کمرے پر یہ دیکھنے کے لیے چھاپہ مارتے رہے کہ کہیں مسٹر سروردی تو وہاں نہیں بیٹھے۔

نئی اسیبلی قائم کرنے کا حکم مان کر مسٹر غلام محمد کے ولی عزائم کو شکست فاش نصیب ہوئی تھی کیونکہ وہ تو اپنی مرضی کا ساتھ رکنی آئین ساز کونشن کھڑا کر کے کام چلانا چاہتے تھے۔ اس ذاتی ہزیمت کا غم غلط کرنے کے لیے انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی جسمانی قوتوں کو بحال کرنے کی ٹھان لی۔ اس مقصد کے لیے لکھنؤ سے ایک حکیم صاحب طلب کئے گئے، جو نایبنا تھے اور ان کی عمر ایک سو پانچ برس سے اوپر ہتائی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ ان کا ایک بیٹا بھی تھا جس کی عمر دس برس کے قریب تھی۔ یہ برخودار حکیم صاحب کی عمر کے پچانویں برس میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے اسے ان کی طبابت اور خدافت کا جیتا جا گتا سرٹیفیکیٹ تسلیم کیا جاتا تھا۔ حکیم صاحب کے آتے ہی گورنر جنرل ہاؤس کا ایک حصہ طبی دواغانے میں تبدیل ہو گیا۔ دن بھر ہاؤن دستہ چلتا تھا اور حکیم صاحب کی خواہش کے مطابق جڑی بوٹیاں حاضر ہوتی رہتی تھیں۔ دو تین بار انہوں نے سو سو

زندہ اور صحت مند چڑوں کی فرماش کی، جو ہم نے بڑی مشکل سے کمشنر حیدر آباد کے ذریعہ مضافات سے سندھ سے حاصل کئے۔ چڑوں کو ذبح کر کے ان کا مغز تو کسی دوا میں استعمال ہوتا تھا اور گوشت کی بخنی بنا کر حکیم صاحب خود نوش فرمائیتے تھے۔ ایک بار انہوں نے بکری کا ایسا پچھے طلب فرمایا، جسے پیدا ہونے کے بعد آنکھیں کھولنے سے پہلے ذبح کیا گیا ہو۔ گورنر ہاؤس کے کئی ملازم شر کی حاملہ بکریوں کے سرہانے جا بیٹھے اور کسی نہ کسی طرح حکیم صاحب کی یہ فرماش بھی پوری کی گئی۔ ان مغزیات اور لحمیات وغیرہ سے انواع و اقسام کی مقوی ادویات اور کشته جات تیار ہوتے تھے جنہیں مشر غلام محمد کو بڑے اہتمام سے کھلایا جاتا تھا۔ اس ساری کارروائی کا اور کوئی نتیجہ تو برآمد نہ ہوا بلکہ پریشر مزید بڑھ گیا اور ایک روز وہ اچانک بے ہوش ہو کر کوما میں چلے گئے۔ حکیم صاحب تو بستر بوریہ سنپھال کر رفو چکر ہو گئے اور گورنر جزل کو آکسیجن لگا دی گئی۔

مشر غلام محمد کے ذاتی معالج کرنل (بعد میں بریگیڈیئر) سرور دن رات ان کے پاس رہے اگلے روز شام کے چار بجے کے قریب انہوں نے مجھے بتایا کہ گورنر جزل کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے قریب ہے، اس لیے میں پرائم مشر اور کابینہ کے دوسرے وزیروں کو اطلاع دے دوں کہ اگر وہ ان کا آخری دیدار کرنا چاہتے ہیں تو فوراً یہاں پہنچ جائیں۔

مشر غلام محمد کے بیٹہ روم کے دروازے کھول دیئے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا کمرہ وزیر اعظم سمیت کابینہ کے ممبروں اور گورنر جزل کے ذاتی عملے سے کھچا کچھ بھر گیا۔ وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف جزل محمد ایوب خاں فوجی وردي میں ملوس تھے انہوں نے بستر کے پاس کھڑے ہو کر گورنر جزل کو الوداعی سلیوٹ کیا اور ان کی مح میں چند فقرے کہے۔ ان کی دیکھا دیکھی چند دوسرے وزیر بھی اسی قسم کی تقریبیں کرنے کے لیے پرتوں رہے تھے کہ یا ایک مشر غلام محمد کے منہ پر لگے ہوئے آکسیجن ماسک میں کچھ جنبش سی ہوئی۔ پھر ایک ہاتھ ہلا، پھر دوسرا ہلا، اور کرنل سرور نے بڑی خوشی سے اعلان

کیا کہ گورز جزل ہوش میں آ رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ساری کی ساری کینٹ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد مسٹر غلام محمد نگیوں کے سارے بیٹھے چائے اور کشڑڈ پنگ نوش فرم رہے تھے اور ساتھ ہی اپنے شاف کے ایک ایک فرد کو الگ بلा کر تحقیق فرم رہے تھے کہ ان کی بے ہوشی کے دوران کون کتنا خوش تھا اور کون کتنا غمگین تھا۔

اس کے بعد مسٹر غلام محمد پر پے در پے نئی بیماریوں کے حملے شروع ہو گئے۔ کبھی تیز بخار، کبھی نمونیہ، کبھی پلوری، کبھی بلڈ پریشر..... دو چار ہفتوں کے اندر اندر وہ بستر کے ساتھ چپک کر رہا گئے۔ اب فیصلہ ہوا کہ انیں علاج کی خاطر زیورچ (سوئٹر رلینڈ) بھیج دیا جائے۔ ایک پر کانسٹیلیشن ہوائی جہاز چارڑ کیا گیا اور مسٹر غلام محمد کو شرپچر پر لٹا کر خفیہ طور پر جہاز میں پہنچا دیا گیا۔ پرانم مسٹر محمد علی بو گرا دوسرے چند وزیروں کے ساتھ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں گورز جزل کی کار میں مسٹر غلام محمد کا روپ دھار کر ائیرپورٹ تک چلوں۔ مجھے یہ تجویز بڑی بے شکی اور مخفی خیز محسوس ہوئی اور میں نے یہ سوانگ رچانے سے صاف انکار کر دیا۔ اول تو مسٹر غلام محمد کی شکل و صورت کے ساتھ میری کوئی مشابہت نہ تھی۔ دوسرے انیں پہلے ہی سے خاموشی سے ہوائی جہاز میں پہنچا دیا گیا تھا اور اب ان کی رواگی کا نقلي جلوس نکالنے کی بالکل کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وزیر اعظم اور ان کے رفقاء ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے اور جب حکومت کا سربراہ اس قسم کا احتجانہ حکم صادر کرے تو سرکاری ملازم صرف احتجاج کر سکتا ہے، انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مجبور ہو کر میں نے کالا چشمہ لگا کر سیاہ رنگ کی جناح کیپ پہنی اور گورز جزل کی کار میں مسٹر غلام محمد کے انداز میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک اے۔ ڈی۔ سی میرے ساتھ اور دوسرا اگلی سیٹ پر بیٹھا۔ کار پر ایک طرف گورز جزل کا فلیگ اور دوسری طرف پاکستان کا پرچم لگا دیئے گئے۔ ہمارے دائیں بائیں، آگے پیچھے موڑ سائکل سوار فوجیوں کا دستہ تھا۔ پھر سیکورٹی پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ اس

کے بعد وزیر اعظم کی کار تھی۔ ان کے پیچھے دوسرے وزیروں اور افسروں کی گاٹیاں تھیں۔ ہمارا یہ قافلہ بڑی شان و شوکت سے روانہ ہوا لیکن راستے بھر کسی نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ پولیس والوں کی مربانی سے ائیرپورٹ تک ساری سڑک سنان پڑی تھی۔ سارے راستے مجھے یہی خیال آتا رہا کہ اس وقت ہم سب لوگ مل جل کر گورنر جزل کے فلیگ اور پاکستانی پرچم کی جی بھر کر بے حرمتی کر رہے ہیں۔

ایئرپورٹ پر زیورج جانے والا جہاز ہینگر کے اندر کھڑا تھا۔ وزیر قانون مسٹر سروردی اپنے کیمروں سے لیں اس کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ابھی تک انہیں یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ مسٹر غلام محمد جہاز کے اندر پہنچا دیئے گئے ہیں۔ جب ہمارا جلوس وہاں پہنچا تو وہ بڑے شوق سے گورنر جزل کی مخصوص کار کی طرف لپکے اور رکتے ہی اس کا دروازہ بڑے احترام سے کھولا۔ کار سے مسٹر غلام محمد کی جگہ جب میں برآمد ہوا، تو مسٹر سروردی ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ کیا تماشا ہے؟“

میں نے انہیں سارا ماجرا سنایا، تو مسٹر غلام محمد سے ملاقات کرنے ہوائی جہاز کی طرف لپکے۔ لیکن کرنل سرورد نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ گورنر جزل اس وقت کو ماں ہیں ہیں۔

زیورج کے کلینک میں علاج معالجہ کے بعد ان کی طبیعت کچھ سنبھلی، تو ایک روز وہ پنک منانے ایک پر فضا مقام پر گئے۔ لنج کے وقت ایک ریستوران میں شاف کو الگ میز پر بٹھایا گیا اور مسٹر غلام محمد مس بول اور اس کی والدہ کے ساتھ علیحدہ نیبل پر بیٹھے کھانے کے دوران ان پر فانچ کا ایک اور حملہ ہوا اور انہیں ایمبوینس میں ڈال کر زیورج والے کلینگ میں داخل کر دیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد جب مسٹر غلام محمد واپس کراچی آئے تو ان کی دماغی حالت اور بھی چیزیں گی اختیار کر چکی تھی۔ وہ صبح سویرے سوٹ بوٹ پن کر کبنت روم میں آ جاتے تھے۔ اپنے اشاف کے مختلف افراد کو جمع کر کے ہر روز نئی کابینہ بناتے تھے۔ ان سے حلف اٹھواتے تھے۔ پورٹ فلیوز تقسیم کرتے تھے اور اس کے بعد گھنٹوں تک کینٹ مینگ

ہوتی تھی، جس میں وہ خود لگاتار ایسی باتیں بولتے رہتے تھے جو کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔

ایک روز وزیر داخلہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کا ٹیلیفون آیا کہ اسکندر مرزا صاحب نے شام کے پانچ بجے اپنے گھر چائے پر بلایا ہے۔ وہاں پر جزل ایوب کا، چودہ بھی محمد علی اور گورنر جزل کے معالج کرنل سرور پہلے سے موجود تھے۔ علیک سلیک کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح کی تھی:

اسکندر مرزا: گورنر جزل کی صحت کے بار میں ہم نے بڑی تشویشاً ک خبریں سنیں ہیں۔  
ہمارا خیال ہے اب انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔

جزل ایوب خاں: سوال یہ ہے، کیا وہ رضا مندی سے استعفی دینے پر تیار ہو جائیں گے؟  
میں: خوشی سے تو تیار نہ ہوں گے۔ لیکن اگر انہیں سمجھا دیا جائے کہ اس کے بغیر اور کوئی چاہہ نہیں تو شاید مان جائیں۔

اسکندر مرزا: ہم نے سنا ہے وہ تم پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ وہ صرف اس کاغذ پر دستخط کرتے ہیں جو تم ان کے پاس لے جاؤ۔

میں: جی نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ میرے علاوہ وہ مس بول اور میرے ڈپٹی سیکرٹری فرج امین پر بھی مکمل اعتماد کرتے ہیں۔

جزل ایوب خاں: مس بول تو پاکستانی نہیں۔

اسکندر مرزا: مس بول کو چھوڑ کر تم دونوں میں سے کون اس کام میں نیا نہ مدد دے سکتا ہے؟

میں: جناب، میری حقیر رائے میں استعفی کے معاملے میں گورنر جزل کے ذاتی عملے کو بیچ میں نہیں لانا چاہیے۔ اصولاً تو یہ فرض پرائم نشر کو سر انجام دنا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو، تو یہ کام مسٹر غلام محمد کے اہل خاندان کے پرد کر دنا چاہیے۔ وہ سمجھا بجھا کر انہیں مستعفی ہونے پر رضا مند کر سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میری یہ بات جزل اسکندر مرزا اور جزل ایوب خاں کو پسند نہ آئی اور وہ برا سامنہ بنا کر خاموش ہو گئے۔ لیکن چودھری محمد علی نے بڑی گرمجوشی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ”اچھا بھئی، شکریہ۔ تم نے صحیح رائے دی ہے۔“

چند ہفتوں کے اندر اندر مسٹر غلام محمد کی بسکدوشی کا مسئلہ طے ہو گیا۔ پہلے انہوں نے کچھ چھٹی لی اور پھر مستعفی ہو گئے۔ جس روز انہوں نے چارج چھوڑا، مجھے حکم ملا کہ میں ان کی طرف سے قوم کے نام ایک پیغام لکھوں اور ریڈیو سے اسے براڈ کاست بھی کرو۔ یہ بڑا مشکل کام تھا کیونکہ گورنر جزل کے طور پر مسٹر غلام محمد نے کوئی ایسا تعمیری کارنامہ سرانجام نہ دیا تھا جسے ان کے الوداعی پیغام میں فخر کے ساتھ بیان کیا جا سکتا۔ میں نے پانچ منٹ کا ایک رسی سا پیغام لکھا، جو پرانی دہراتی ہوئی عامیانہ، فرسودہ اور پیش پا افتادہ باتوں اور اقوال پر مشتمل تھا۔ اس تقریر کا ڈرافٹ منظور کرنے کے لیے میں پرائم مسٹر سمیت کئی وزیروں کے پاس گیا، لیکن کسی نے اسے پڑھنے تک کی زحمت گوارا نہ کی، کیونکہ کرسی سے اترتے ہوئے گورنر جزل کے ساتھ کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ چنانچہ میں نے اسی غیر منظور شدہ ڈرافٹ کو شام کے وقت نیشنل ہب اپ میں ریڈیو سے براڈ کاست کر دیا۔ ریڈیو اسٹیشن سے نکلا، تو باہر سڑک پر مس بوول کی خوبصورت دورنگی کار کھڑی تھی۔ ماں بیٹی کار کے ریڈیو پر میرا براڈ کاست سن کر زار و قطار رو رہی تھیں۔ اس روز مسٹر غلام محمد کے جانے پر شاید یہی چار آنکھیں تھیں جو اس قدر شدت سے اشکبار ہوئی ہوں اور یہ آنکھیں بھی پاکستانی نہ تھیں۔ گورنر جزل کے عمدہ سے بسکدوش ہونے کے بعد مسٹر غلام محمد اپنی بیٹی کے ہاں کھفنٹھنٹھل ہو گئے۔ سرکاری ذمہ داریوں کا بوجھ اترتے ہی ان کی جسمانی اور روانی صحت حیرت انگیز طور پر اچھی ہو گئی۔ کرٹل سرور باقاعدگی کے ساتھ ان کا علاج کرتے رہے۔ کبھی کبھی اپنی خط و کتابت میں مدد دینے کے لیے وہ مجھے بھی بلا لیتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ سینما دکھانے بھی لے گئے۔

وفات سے چند روز پہلے ان پر ایک عجیب دھن سوار ہو گئی۔ انہوں نے اپنے ڈاکٹر کرنل سرور سے کہا کہ وہ ہوائی جہاز چارٹر کر کے دیوا شریف جاتا چاہتے ہیں۔ دیوا شریف لکھنؤ کے قریب کوئی جگہ ہے جمال حاجی وارث علی شاہ دفن ہیں۔ یہ بزرگ غالباً بیسویں صدی کے اوائل میں فوت ہوئے تھے اور مسٹر غلام محمد کو ان کے ساتھ گھری عقیدت تھی۔ وہ ان کی فونو ہیشہ اپنے بستر کے قریب تپائی پر رکھا کرتے تھے۔ انہوں نے ان کی ملوظات اور سوانح حیات شائع کروانے میں بھی کافی حصہ لیا تھا اور تقسیم سے پہلے کئی بار دیوا شریف میں ان کے مزار پر حاضری دے چکے تھے۔ حاجی وارث علی شاہ کے حالات زندگی پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ درویشانہ اور قلندرانہ وضع کے بزرگ تھے۔ لیکن ان کے مسلک نے مسٹر غلام محمد پر کچھ بھی اثر نہ کیا تھا، کیونکہ وہ جب تک جتنے حب جاہ اور حب دنیا کا عبرتناک مجسمہ بن کر جئے۔ اپنی زندگی کے آخری روز بھی ان کو دیوا شریف جانے کی لگن لگی ہوئی تھی، لیکن کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا۔ اسی رات ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی وفات کی خبر سن کر جو لوگ تعزیت کے لیے آئے، ان میں خواجہ ناظم الدین سرفراست تھے، جنہیں مسٹر غلام محمد نے وزیر اعظم کے عہدہ سے غیر آئینہ طور پر برطرف کر دیا تھا۔

گورنر جنرل کی حیثیت سے مسٹر غلام محمد کا دور پاکستان کے لیے بدشکونی کا زمانہ تھا۔ جمہوری روایات اور اقدار کی بے دریغ پامالی کا سلسلہ ان کے ہاتھوں شروع ہوا۔ اسی کے ساتھ نظام سلطنت میں ”قانون ضرورت“ کے عمل دخل کی ابتدا ہوئی۔ حکومت میں شخصیت پرستی نے فروغ پایا۔ مشرقی پاکستان کی سیاست نے واضح طور پر ایک الگ رخ اختیار کیا، لیکن مرکزی قیادت نوکر شاہی کے پے پٹائے نوآبادیاتی فارمولوں میں پابھولائ رہی۔

بری افواج کے کمانڈر انجیف نے اپنے عہدہ کے ساتھ وزیر دفاع کی خدمت شامل کر کے کابینہ میں شرکت حاصل کی اور اس طرح حکومت کے اندر ہونی کا رویار کی ٹریننگ حاصل

کر کے مستقبل کے لیے اپنے عزم کو پختہ کر لیا۔ اس دور کی مجموعی خصوصیت بے شباتی، بے یقینی، بے اعتمادی اور بدینی تھی۔

URDU4U.COM

مجھ سے کئی بار یہ سوال کیا گیا ہے کہ مسٹر غلام محمد اس قدر شدید بیمار تھے کہ وہ چل پھر نہ سکتے تھے۔ بول نہ سکتے تھے، زیادہ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ بڑے رعب و اب سے حکمرانی کرتے رہے۔ ان کی طاقت کا اصلی راز کیا تھا؟ اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ مسٹر غلام محمد کی طاقت کا سرچشمہ سیاست دانوں کی کمزوری تھی۔

اس کے علاوہ دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ جزل اسکندر مرزا کی شہر پر مسٹر غلام محمد کو کمانڈر انجیف ایوب خاں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی، جو نظر نہ آنے والی روشنائی سے لکھی ہوئی تھی! مستقبل کے بارے میں ان دونوں حضرات کے اپنے اپنے عزم تھے، جو مسٹر غلام محمد کی طرز کے گورز جزل کی اوٹ لیے بغیر پروان نہ چڑھ سکتے تھے۔

## • سکندر مرزا گا عروج و زوال

URDU4U.COM

اگست ۱۹۵۵ء میں میجر جزل اسکندر مرزا نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور دستور کے مطابق اسی روز میں نے چارچ چھوڑنے کی رپورٹ مکمل کر کے ان کی خدمت میں بھیج دی، تاکہ وہ اپنی پسند کا نیا سیکرٹری منتخب کر لیں۔ وہ یہ رپورٹ ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آئے، اور کہا، ”میری خواہش ہے کہ تم اسی جگہ کام کرتے رہو۔“

شرع شروع میں ان کے ساتھ کام کرنے میں ایک عجیب وقت پیش آئی۔ اب تک ہم لوگ گورنر جنرل کی گفتگو آواز سن کر نہیں بلکہ ہونٹوں کی حرکت دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اب معاملہ اس کے بر عکس تھا۔ دو تین بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی نیا گورنر جنرل کوئی بات شروع کرتا، میں غیر ارادی طور پر ٹکٹکی باندھ کر ان کے ہونٹوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا۔ وہ سمجھتے کہ شاید ان کے منہ پر کوئی چیز چکلی ہوئی ہے۔ وہ فوراً اپنا رومال نکال کر منہ صاف کرنا شروع کر دیتے۔ جب کئی بار یہی واقعہ پیش آیا تو میں نے انہیں بڑی صاف مل سے صحیح صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ یہ سن کر وہ بہت ہنسے اور بولے..... ”کوئی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ تمہیں نارمل آواز سننے کی عادت بھی پڑ جائے گی۔“

بیگم ناہید مرزا کے آنے سے گورنر جنرل ہاؤس کی کلیا ہی پلٹ گئی۔ وہ بڑی سلیقہ مند اور نفاست پسند ایرانی خاتون تھیں، اور انہیں گھر بار کی آرائش و زیبائش اور نہست و سجاوٹ بے حد شوق تھا۔ ایک روز وہ میرے دفتر کے کمرے میں تشریف لاکیں اور پوچھنے لگیں، ”تمہیں اپنے کمرے کی نئی ترکیں و ترتیب پسند آئی؟“

میں نے حیرت سے اوہر ادھر دیکھا، تو وہ بڑے تعجب سے بولیں۔ ”کیا مجھ تھمیں اس کمرے میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی؟“

میں بڑی ندامت سے سر کھجانے لگا، کیونکہ میں واقعی اپنے کمرے میں کوئی نیا پن نوٹس نہ کیا تھا۔ بیگم مرزا نے مایوسی سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور کہنے لگیں۔ ”ذرا غور سے دیکھو۔۔۔۔۔ پرانے فرسودہ پردوں کی جگہ کتنے خوبصورت نئے پردے لگائے گئے ہیں۔ صوفیوں کے کشن بھی پردوں کے ہم رنگ ہیں۔ دروازے کے دونوں طرف کھلے ہوئے پھولوں کے گملے ہیں۔ کھڑکی میں بھی تانہ پھولوں کا گلدان ہے اور تمہارا میلا سا کوت جو کھونٹی پر ننگا رہتا تھا، اب ڈرائی کلین کر کے پلاسٹک کے کور میں لٹکایا ہوا ہے۔“

میں شرمende ہو کر بد ذاتی کی معافی مانگنے لگا تو وہ مسکرا کر بولیں۔ ”یہ جرم قبل عفو تو نہیں۔ لیکن ایک کام کرو تو معافی مل سکتی ہے۔“

”آپ حکم دیجئے۔ میں ہر طرح حاضر ہوں۔“

”مس بوہل کو فوراً یہاں سے چلتا کرو۔“ بیگم مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔ اس غیر متوقع فرماش پر میں کسی قدر حیران ہوا، تو وہ بولیں۔ ”حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کامن سنس کی بات ہے۔ جتنی دیر وہ یہاں رہے گی۔ اتنے ہی زیادہ اسکینڈل بننے کا چانس ہے۔ تم اس دفتر کے انچارج ہو۔ جلد سے جلد اسے فارغ کر دو۔ لیکن میرا نام نیچ میں نہ آئے۔“

مس رو تھے بوہل غیر معمولی طور پر حساس اور دور انداش لڑکی تھی۔ گورنر جزل ہاؤس میں تبدیلیاں رونما ہوتے ہی عورت کی چھٹی حس نے خبردار کر دیا تھا کہ اب اس کا یہاں گزارا ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ میرے ہلکے سے اشارے پر اس نے اپنا استغفاری دے دیا اور چند روز بعد اپنی والدہ کو لے کر پاکستان سے رخصت ہو گئی۔

میجر جزل اسکندر مرزا اور بیگم مرزا کے آتے ہی گورنر جزل ہاؤس میں دعوتوں اور پارٹیوں کا دور شروع ہو گیا۔ کبھی ڈری، کبھی ڈانس، کبھی موں لائٹ پکن۔۔۔۔۔ وقتہ فوقہ نبی نی تفریبات منعقد ہوتی رہتی تھیں، جو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے شروع ہو کر رات کے ڈریوں دو بجے تک چلتی تھیں۔ عورتوں کے لیے تو یہ ایک طرح کی فیشن پریڈ ہوتی تھی،

جس میں وہ اپنے حسن و جمال کے علاوہ قسم قسم کے ملبوسات کی نمائش کیا کرتی تھیں۔ کچھ خواتین ایسا لباس پہننے میں مہارت رکھتی تھیں جو جسم کو چھپانے کی بجائے اسے فکاری سے عریان کرنے میں مدد دیتا تھا۔ ان پائیں میں شامل ہونے والے کئی زندہ مل لوگ ایسی خواتین کے کندھوں اور کولہوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کے لباس کے میزیل کی دیر دری تک تعریف کرتے رہتے تھے..... اگرچہ ان کے کندھوں اور کولہوں پر دور دور تک کسی لباس کا کوئی میزیل موجود نہ ہوتا تھا۔ ساغر و مینا کی کرامات بھی اپنا رنگ جانتی تھیں اور بیگم مرزا کی گمراہی میں تیار کئے ہوئے ایرانی پلاو اور کباب اور کوفتے بڑے لاجواب ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں جو لوگ صاحب اقتدار ہوتے تھے، وہ دولت مند تاجریوں اور صنعت کاروں کی طرف بھدھ حسرت و یاس تکتے تھے۔ جن کے پاس دولت کی فروانی تھی، ان کو اقتدار والوں پر رشک آتا تھا اور جن کے پاس دولت اور اقتدار دونوں نعمتیں تھیں، ان کی دلچسپی کا واحد مرکز عورت ذات تھی۔ کثرت میں نوشی کے بعد کچھ لوگ کھانے پر گدھ کی طرح گرتے تھے اور اس طرح بدحواس ہو کر کھاتے تھے۔ جیسے چوپائے کھاتے ہیں۔ کچھ لوگ کھانے پینے سے بے نیاز ہو کر سکتے کے عالم میں آ جاتے تھے اور غنوگی کی حالت میں گم سم بیٹھ جاتے تھے۔ بعض لوگ غسلخاتوں میں جا کر بار بار قے کرتے تھے اور تانہ دم ہو کر ازسر نو شراب ناب کا دور شروع کر دیتے تھے۔ لبو و لعب کے ان مشغلوں میں انسانیت سک سک کر دم توڑ دیتی تھی اور بیہمت نت نئے روپ دھارتی رہتی تھی۔ البتہ میجر جزل اسکندر مرزا شراب پی کر خود کبھی بدست نہ ہوتے تھے۔ وہ گلاس ہاتھ میں لیے اپنی مہمانوں میں منڈلاتے رہتے تھے اور ان کی بدحواسیوں، کم ظرفیوں اور مدھوشیوں کا خوب مزا لیتے تھے۔ ایک روز وہ ایک خوبصورت خاتون کا پلو کپڑے اس کی سائزی کی تعریف کر رہے تھے۔ بیگم مرزا چیل کی طرح جھپٹ کر آئیں اور اس عورت کو ڈالنا کہ وہ ان کے میاں کے ساتھ فلرث کرنے کی کوشش نہ کرے۔ عورت نے احتجاج کیا کہ وہ تو صرف اس

کی سائزی کی تعریف کر رہے تھے۔ اس پر بیگم مرزا نے کہا۔ میرے ساتھ تعلقات کی ابتدا بھی انہوں نے اسی طرح کی تھی۔ ”بیگم ناہید مرزا اسکندر مرزا صاحب کی دوسری بیوی تھیں۔ پہلے وہ پاکستان میں ایران کے ملٹری اپیچی کے ساتھ بیانی ہوئی تھیں۔ پھر اس سے طلاق حاصل کر کے انہوں نے اسکندر مرزا سے شادی کر لی۔ اس وقت وہ ڈینیش سیکرٹری تھے۔

گورز جزل کی ان پاشتوں میں مجھے صرف ایک بار شمولیت کا موقع ملا۔ پاٹنی کے رنگ سے مجھے بڑا بدمزگی اور کراہت محسوس ہوئی۔ دوسری بات جب مجھے اسی قسم کی دعوت ملی تو میں نے بیگم مرزا کو فارسی کا یہ شعر لکھ کر بھیج دیا:

در محفل خود راه مدد ہچھونے را  
افرده دل افرده کند انجمنے را

اس کے بعد انہوں نے سرکاری تقریبات کے علاوہ مجھے اپنی کسی اور دعوت میں شرکت کے لیے مدعو نہ کیا۔

میحر جزل اسکندر مرزا کے کام کرنے کا طریقہ بڑا منظم تھا۔ وہ صبح آنھ بجے سے دوپہر کے ایک بجے تک جم کر دفتر میں بیٹھتے تھے۔ روز کی فائلیں روز ہی پہنچا دیتے تھے۔ اس کے بعد شام کے وقت انہوں نے مجھے کبھی سرکاری کام کے لیے طلب نہیں کیا۔ سیاسی میل ملáp اور جوڑ توڑ کا سارا کام وہ دفتری اوقات کے بعد کرتے تھے۔ ان کی ملازمت کا بیشتر حصہ برٹش دور کی پولیٹیکل سروس میں گزرتا تھا، اس لیے اس کام میں انہیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ میرے کمرے کی ایک کھڑکی گورز جزل ہاؤس کے برآمدے میں کھلتی تھی۔ ایک بجے جب وہ دفتر سے انھ سے اس برآمدے سے گزرتے تھے تو لمحہ بھر کے لیے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر پوچھ لیتے تھے کہ کوئی اہم کام باقی

تو نہیں رہ گیا؟ اس کے بعد میرا اور ان کا رابطہ اگلی صبح تک کے لیے ٹوٹ جاتا تھا۔ اس لائچہ عمل میں فقط ایک بار تبدیلی آئی۔ ایک روز میں اپنے گھر پر تھا کہ رات کے دس بجے گورنر جزل ہاؤس کی کار آئی اور اس میں سے کراچی کے ایک بہت بڑے سینئھ نمودار ہوئے۔ وہ شراب کے نشے میں دہت تھے۔ انہوں نے مجھے گورنر جزل کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک پرچہ دیا جس میں میرے نام حکم تھا کہ میں ان صاحب کو چیف کنٹرولر آف امپورٹ ایکسپورٹ سے پچیس شیورلٹ کاریں درآمد کرنے کا لائنس فوراً دلوں۔ اسکندر مرزا کے دستخط کے نیچے اس روز کی تاریخ تھی اور تاریخ کے نیچے یہ حکم نامہ تحریر کرنے کا وقت ”9 P.M.“ بھی درج تھا۔ سینئھ صاحب نے کہا کہ گورنر جزل نے مجھے بھی اپنے پاس بلایا ہے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو وہ مجھے ایک الگ کمرے میں لے گئے اور کھنے لگے۔ یہ سینئھ ساری شام ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا رہا۔ میں نے بھی جان بچانے کے لیے یہ مضمون خیز نوٹ لکھ دیا۔ اس کے نیچے وقت اس لیے درج کیا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ کہ یہ دفتر کی بات نہیں بلکہ مخفی ناؤ نوش کا حکم ہے۔ اب تم اس سینئھ کو اپنے دفتر میں لے جا کر ڈانٹو ڈپٹو اور یہ حکمنامہ اس کے سامنے پھاڑ کر روی کی ٹوکری میں پھینک دو۔ آئندہ بھی اگر کوئی ایسی تحریر لائے جس پر شام کے آٹھ بجے کے بعد کا وقت درج ہو تو اسے بھی بغیر کسی ہچکپاہٹ کے پھاڑ کر پھینک دو۔“

اسکندر مرزا صاحب کو گورنر جزل بنے تین روز ہوئے تھے کہ شام کے پانچ بجے مجھے گھر پر مسٹر سروردی نے ٹیلیفون کر کے پوچھا۔ ”پرائم مسٹر کے طور پر میرا حلف لینے کے لیے کون سی تاریخ مقرر ہوئی ہے؟“

یہ سوال سن کر مجھے بڑا تجھ بھا، کیونکہ مجھے اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ میں نے یہی بات ان کو بتائی، تو مسٹر سروردی غصے سے بولے۔ ”تم کس طرح کے نکتے سیکرٹری ہو۔ فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب صرف تفصیلات کا انتظار ہے۔ فوراً گورنر جزل کے

پاس جاؤ، اور حلف اٹھانے کی تاریخ اور وقت معلوم کر کے مجھے خبر دو۔ میں انتظار کروں گا۔"

محبوروآ میں اسکندر مرزا صاحب کے پاس گیا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ برج کھیل رہے تھے۔ موقع پا کر میں انہیں کمرے سے باہر لے گیا اور انہیں مسٹر سروردی والی بات بتائی۔ یہ سن کر وہ خوب نہے اور اندر جا کر اپنے دوستوں سے بولے۔ "تم نے کچھ سننا؟ سروردی وزیر اعظم کا حلف لینے کا وقت پوچھ رہا ہے۔ اس پر سب نے تاش کے پتے زور زور سے میز پر مارے، اور بڑے اونچے فرمائش قمیقے بلند کئے۔ کچھ دیر اچھی خاصی ہڑبوگ کاری رہی۔ اس کے بعد گورنر جنرل نے مجھے کہا۔ "میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم سروردی کو بتا دو کہ حلف برداری کی رسم پر رسول منعقد ہو گی اور چودہری محمد علی وزیر اعظم کا حلف اٹھائیں گے۔"

وہاں سے میں سیدھا مسٹر سروردی صاحب کے ہاں پہنچا اور ان کو یہ خبر سنائی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ان کے ساتھ کچھ وعدے وعید ہو چکے تھے۔ اس نئی صورت حال پر وہ بڑے جھلانے اور میرے سامنے انہوں نے بس اتنا کہا۔ "اچھا، پھر وہی محلاتی سازش۔"

دو روز بعد ۱۹۵۵ء کو چودہری محمد علی نے وزارت عظمی کا حلف اٹھا لیا۔ ان کی حکومت مسلم لیگ اور یونائیڈ فرنٹ کی کولیشن سے بنی تھی۔ "شیر بنگال" مولوی اے۔ کے فضل الحق پہلی بار کسی مرکزی کابینہ میں شامل ہوئے اور انہیں وزارت داخلہ ملی۔ کچھ عرصہ قبل ان پر بڑے زور شور سے "غدار" اور "ملک دشمن" کا الزام لگ چکا تھا۔ لیکن اب وہی "غدار" اور "ملک دشمن" پاکستان کا وزیر داخلہ تھا۔ بد قسمتی سے کبھی کبھی ہماری سرکاری، سیاسی، سماجی اور ذاتی قوت برداشت بڑی ضعیف ثابت ہوتی ہے۔ حکومت وقت کے ساتھ اختلاف غداری بن جاتا ہے اور سیاسی سماجی امور میں رائے کا تصادم وطن دشمنی قرار پا سکتا ہے۔ اس فعل عبث میں حب الوطنی کی ساکھ کے علاوہ اور کسی کا کچھ نہیں گزرتا۔

اس کابینہ میں ایک نیا چہرہ سید عابد حسین کا تھا۔ وہ ضلع جہنگ میں شاہ جیونہ کے بہت

بڑے زمیندار تھے اور بڑی خوبصورت، خوب سیرت، روشن خیال اور خوش اخلاق شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے کردار میں میانہ روی، حیا داری اور راست بازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور ان کی گفتگو سادہ اور پرکشش ہوتی تھی۔ وہ ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو دولت مند تو تھے، لیکن دولت کی ریل پیل نے ان کے اخلاق میں کوئی کبھی پیدا نہ کی تھی۔ جسمانی طور پر وہ صحت مندی کا قابلِ رشک نمونہ تھے اور ہر طرح کا لباس ان پر خوب پہبھتا تھا۔ افسوس کہ انہوں نے زیادہ عمر نہ پائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

چوبدری محمد علی کے وزیرِ اعظم مقرر ہونے کے بعد دو ماہ کے عرصہ میں مغربی پاکستان "ون یونٹ" بنانے کا کام مکمل ہو گیا۔ اس منصوبے کی بنیاد تو اسی وقت پڑھلی تھی، جب مارچ ۱۹۵۰ء میں مسٹر غلام محمد نے ویسٹ پاکستان (اسٹیبلشمنٹ) آرڈر جاری کر کے نواب مشتاق احمد گورمانی کو مجونہ صوبے کا گورنر اور ڈاکٹر خان صاحب کو چیف منستر نامزد کر دیا تھا لیکن اس قانون کا بل اسیبلی نے ۳۰ ستمبر کو پاس کیا اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کا صوبہ باضابطہ طور پر معرض وجود میں آگیا۔

انتظایی لحاظ سے یہ بڑا معقول اور قابل عمل منصوبہ تھا لیکن اسے سیاسی اکھاڑے میں اتنا را گیا تو اس کا حلیہ بگڑ کے رہ گیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے زور شور سے اس وقت کام شروع ہوا جب ۱۹۵۳ء میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کو بری طرح شکست ہو چکی تھی۔ اسی وقت سے کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبے مشرقی پاکستان کی نئی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ گھٹ جوڑ کر کے مرکزی قیادت پر قبضہ حاصل کر لیں۔ ایسی ذہنیت کے لوگوں کے نزدیک "ون یونٹ" اس قسم کے "خطرات" کو روکنے کا موثر ذریعہ تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ پنجاب کا صوبہ اپنی آبادی، تعلیم اور ترقی کی وجہ سے ہمیشہ دوسرے صوبوں سے آگے رہا ہے۔ اس وجہ سے میں الصوابی رقبتوں اور تعصبات نے بڑا فروغ

پایا اور پنجاب کے خلاف چھوٹے صوبوں میں کچھ صحیح اور کچھ غلط اور فرضی شکایات اور الزامات کے دفتر کے دفتر کھل گئے۔ ”ون یونٹ“ کے منصوبے میں بھی چھوٹے صوبوں کو پنجاب کی بالادستی کی سازش نظر آنے لگی اور ان کو شہر ہو گیا کہ اس سکیم کے ذریعہ پنجاب ان کے لظم و نق پر بھی براہ راست قبضہ جانا چاہتا ہے۔

تیری بات یہ ہے کہ کچھ سیاست دانوں نے ”ون یونٹ“ کے خلاف کھلم کھلا مجاز قائم کر کے اس کی مخالفت میں ایک منظم تحریک چلانی شروع کر دی۔ اس میں خان عبدالغفار خان، پیر صاحب مانگلی شریف، جی۔ ایم۔ سید، شیخ عبدالجید اور سردار صد خاں اچکزائی پیش پیش تھے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ اور کسی سیاسی پارٹی کا رویہ ”ون یونٹ“ کے حق میں واضح طور پر مثبت نہ تھا بلکہ اس بارے میں کئی چوٹی کے سیاست دانوں کا کردار حیرتناک حد تک متفاہ اور متناقض تھا۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید پہلے ”ون یونٹ“ کے حق میں تھے، لیکن پھر اچانک اس کے برخلاف ہو گئے۔ اس کی پاداش میں ان کی وزارت برطرف کر دی گئی۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک فیروز خاں نون بھی پہلے ون ”یونٹ“ کے حمایتی تھے لیکن پھر مخالف ہو گئے۔ نتیجتاً ان کو بھی وزارت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سندھ کے پیر علی محمد راشدی کا شمار بھی ”ون یونٹ“ کے حمایتیوں میں ہوتا تھا لیکن وہ بھی پینتر ابدل کر اس سکیم کے مخالفین کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔

لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی قلابازی مسٹر سرورودی نے کھائی تھی۔ مسٹر غلام محمد کے زمانے میں جب وہ وزیر قانون تھے، تو ”ون یونٹ“ قائم کرنے کا گورنر جنریلی آرڈر انہی کی گمراہی میں تیار ہو کر جاری ہوا تھا۔ صرف چھ ماہ بعد جب یہی آرڈر مل کی صورت میں اسمبلی کے سامنے آیا تو مسٹر سرورودی نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی۔

کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب کابینہ کے رکن نہ رہے تھے؟ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ وزارت عظیمی حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ سیاست دانوں کی اس

آنکھ پھولی سے صاف ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی کی نظر "ون یونٹ" کے قومی اور انتظامی فوائد اور خوبیوں کی جانب نہ تھی۔ اس منصوبے کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں وہ فقط اپنا ذاتی اور وقتی مفاد پیش نظر رکھتے تھے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ "ون یونٹ" بننے ہی چھوٹے صوبوں کی گورنریاں، وزارتیں اور اسemblian ٹوٹ گئیں اور ان سطحوں کے سارے اختیارات لاہور منتقل ہو گئے۔ نظم و نت میں Decentralization کا ایسا کوئی طریقہ راجح نہ کیا گیا جس کے ذریعہ مقامی معاملات مقامی طور پر ہی طے پاتے رہیں۔ یوں بھی بیوروکریٹی کا روایتی مزاج ایسا ہے کہ جو طاقت ایک بار اس کے ہاتھ میں آجائے اسے واپس کر کے دوسروں میں تقسیم کرنا اس پر بڑا شاق گزرتا ہے۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ بلوجستان، سندھ اور سرحد کے لوگوں کو دور دراز کا سفر اختیار کر کے اپنے بعض چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی لاہور آنا پڑتا تھا۔ اس میں بڑی دشواریوں، پریشانیوں اور تکالیف کا سامنا تھا۔ اس نے بھی بہت سے عناصر کے ذہن میں "ون یونٹ" کی افادیت کی مغلکوک بنا دیا۔ چھٹی بات یہ ہے کہ صوبائی سطح کے سرکاری ملائزین کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ "ون یونٹ" بننے کے بعد شاید ان کے تابدے بھی مغربی پاکستان کے دور دراز علاقوں میں ہوتا شروع ہو جائیں۔ تبادلوں کا یہ خوف شمشیر برہنہ کی طرح ان کے ذہن پر لٹک گیا اور اس طرح سرکاری ملائزین کی ایک کثیر تعداد کے دل میں "ون یونٹ" کے خلاف بدظنی نے راہ بنائی۔

ساتویں بات یہ ہے کہ ہر صوبے میں ایسے سیاست پسند لوگوں کی خاصی بڑی تعداد ہوتی ہے جو خود تو انتخاب نہیں لڑتے لیکن مقامی سیاست میں کئی طریقوں سے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ جب چھوٹے صوبوں کی اپنی اپنی اسemblian نہ رہیں تو یہ میدان خالی ہو گیا اور عملی طور پر فعال لوگوں کی کثیر تعداد احساس محرومی کا شکار ہو گئی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست دانوں کی محاذ آرائیوں، خود غرضیوں اور فلاہا زیوں، بیروکری کی بے تدبیریوں اور کوتاه اندیشیوں، بعض سرکاری ملائزین کی بدظنیوں اور عوام کے ایک

بڑے طبقہ کی دشواریوں اور محرومیوں کی وجہ سے ”ون یونٹ“ کا انتظامی تجربہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

وزیر اعظم کے طور پر چودھری محمد علی کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۵۷ء کے آئین کے نفاذ کا تھا۔ پچھلے نو برس میں خان لیاقت علی خاں سے لے کر اب تک کسی وزیر اعظم نے آئین سازی کے کام کو آگے نہ بڑھایا تھا۔ چودھری محمد علی نے وزیر اعظم کا عمدہ سنپھانے کے بعد پانچ ماہ کے اندر آئین کا مسودہ شائع کر دیا۔ جب یہ مسودہ آئین ساز اسمبلی میں پیش ہوا تو اس کی ۲۳۵ دفعات کے لیے ۶۷۰ تراجمیں پیش ہوئیں۔ خاص طور پر مشرقی پاکستانی میں بڑا طوفان اٹھا۔ وہاں پر ”Resistance Day“ بھی منایا گیا، جس میں جلسے ہوئے، جلوس نکلے اور ہڑتال ہوتی۔ مولوی اے، کے فضل الحق نے بڑی سخت تقریس کیں۔ مولانا بھاشانی نے تو مشرقی پاکستان کو الگ کرنے تک کی دھمکی دے دی۔ اسمبلی کے اندر عوامی لیگ کے ایک لیڈر مسٹر ابو منصور نے یہاں تک کہہ دیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا ایک مذہب ہے اور دونوں نے ایک ہی تحریک کے ذریعے آزادی حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں حصوں میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ دونوں حصے الگ الگ ملک اور الگ الگ قومیں ہیں۔ مسٹر سروردی نے بھی آئین کی خوب مخالفت کی اور جب رائے شماری کا وقت آیا تو اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب یہی سروردی اسی آئین کے تحت وزیر اعظم بنے، تو انہوں نے بلا کسی جھگک کے یہ اعلان کر دیا کہ اس آئین میں مشرقی پاکستان کے اٹھانوے فیصد مطالبات پورے ہو گئے ہیں۔

آئین کے خلاف اس تمام مجاز آرائی، مخالفت اور مخاصمت کا سامنا چودھری محمد علی نے بڑے تحمل، بردباری اور مدیرانہ دانشمندی سے کیا۔ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا پہلا آئین نافذ ہو کر اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ نئے آئین کے تحت چودھری محمد علی کے وزیر اعظم نے طور پر حلف اٹھایا اور میجر جزل

اسکندر مرزا ملک کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو جب ایوان صدر میں نیا آئین نافذ کرنے کی تقریب منعقد ہو رہی تھی، تو اس دوران دو بدشکونیاں ظہور میں آئیں۔ تقریب شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے بڑے زور کی آندھی آئی اور تیز بارش ہوئی جس سے شامیانے کا کچھ حصہ چند مہماں کے اوپر گر گیا، جن میں اسمبلی کے سپیکر مولوی عبدالواہب خاں بھی شامل تھے۔ اس عالمت سے شاید فطرت کے عناصر نے یہ پیشگوئی کر دی تھی، کہ اٹھاہہ ماہ بعد اس آئین کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہونے والا ہے۔ دوسری بدشکونی صدر کے طور پر میجر جزل اسکندر مرزا کا تقرر تھا۔ نیا آئین اسلامی اور جمہوری اقدار کا حامل تھا۔ لیکن ملک کے پہلے صدر کو ان دونوں اقدار سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ نئے آئین کو اسکندر مرزا کی صدارت میں چلانا ویسا ہی تھا جیسے کہ دودھ کو بلی کی رکھوائی میں رکھنا۔

اسکندر مرزا صاحب جوڑ توڑ کے بادشاہ تھے۔ گورنر جزل یا صدر کے طور پر آئینی بندشوں اور پابندیوں میں مقید ہو کے رہنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ جب ان کے دوست ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ نامزد ہوئے، تو انہیں کسی سیاسی پارٹی کی حمایت حاصل نہ تھی۔ ان کی دیگری کے لیے اسکندر مرزا صاحب نے ری پبلکن پارٹی کی داغ نیل ڈالی۔ اس پارٹی کی تشکیل گورنمنٹ ہاؤس میں براہ راست ان کی سربراہی میں ہوئی۔ جس وقت یہ پارٹی بن رہی تھی، ان دونوں اسکندر مرزا صاحب اس کام میں اس قدر منہمک تھے کہ انہیں فائلیں دیکھنے کا بھی وقت نہ ملتا تھا۔ دن میں کسی وقت وہ چند لمحوں کے لیے میرے کمرے میں آتے تھے اور کھڑے کھڑے ضروری ضروری فائلوں پر دستخط کر کے چلے جاتے تھے۔ کئی بار وہ اتنی عجلت میں ہوتے تھے کہ فائلوں کے فیٹے تک نہ کھولتے تھے اور یونہی کاغذوں کو کھینچ کھانچ کر دستخط کر دیتے تھے۔ ری پبلکن پارٹی بنانے کا بھوت ان پر جس شدت سے سوار تھا ویسے ذوق شوق سے میں نے انہیں اور کوئی کام کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ری پبلکن پارٹی بنانے میں مغربی پاکستان کے گورنر نواب مشاق

احمد گورمانی بھی برابر کے شریک تھے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پارٹی کا منشور اور آئین بھی انہوں نے ہی مرتب کئے تھے۔ یہ ازم ری پبلکن پارٹی کے ایک سابق جزل سیکرٹری مسٹر عبدالقیوم نے خاص طور پر لگایا ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر گورمانی کے خلاف جب ایسٹو کے تحت انکوارری ہو رہی تھی، تو مغربی پاکستان کی اسمبلی کے سات ممبروں نے اپنی گواہی میں کہا تھا کہ ری پبلکن پارٹی صدر، وزراء اور گورنر گورمانی کے گھوڑ سے بنی تھی اور وہ اس میں گورنر کے دباؤ سے مجبور ہو کر شامل ہوئے تھے۔ ان گواہوں کے اسامی گرامی جمیل حسین رضوی، گل نواز خان، چودہری محمد احسن، شیخ محمد سعید، رائے نوшیر خاں، حکیم خورشید احمد اور قاضی اور مرید احمد تھے۔

ایک روز اسکندر مرزا نے مجھے قرآن مجید کا ایک نسخہ دیا کہ میں اسے احتیاط سے اپنی خفیہ کاغذات رکھنے والی الماری مقلع کر کے رکھوں اور ان کے سوا اور کسی کونہ دکھاؤ۔ اس نسخہ میں خاص بات یہ تھی کہ سرووق کی پشت پر جو خالی صفحہ ہوتا ہے اس پر درجن بھر سیاستدانوں نے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اور اس مقدس کتاب الہی کو گواہ پنا کر آپس میں تعاون کرنے کا عمد نامہ تیار کیا ہوا تھا۔ اس تحریر کے نیچے پاکستان کے بہت سے چوٹی کے لیڈروں کے دستخط تھے۔ چند ماہ کے اندر اندر یہ مقدس عمد نامہ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ افسوس کہ قرآن شریف کا وہ نادر نسخہ صدر مرزا نے مجھ سے واپس لے لیا۔ ورنہ وہ اس قابل تھا کہ عبرت حاصل کرنے کے لیے اسے ہمارے قوی عجائب گھر میں رکھا جاتا۔

ری پبلکن پارٹی کے بنتے ہی صدر اسکندر مرزا کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی آگئی، جسے گھما کر وہ سیاست میں جب چاہتے اپنی پسند کی تبدیلی لا سکتے تھے۔ آئین نافذ ہونے کے ۱۳ ماہ بعد چودہری محمد علی وزیر اعظم کے عمدہ سے مستعفی ہو گئے۔ ہماری تاریخ میں یہ واحد مثال ہے جس میں کسی وزیر اعظم نے اپنے آپ کسی دباؤ کے بغیر اپنے عمدہ سے استعفی دیا ہے۔ چودہری محمد علی انھک کام کرنے کے عادی تھے۔ ان کی بیانات، امانت

اور منصف مزاجی کا درجہ بھی اعلیٰ تھا۔

وزارت عظمی سے سبکدوٹی کے بعد انہوں نے نہایت صبر اور خاموشی سے زندگی گزاری۔ ایک بار انہیں علاج کے لیے بیرون ملک جانا ضروری ہو گیا۔ لیکن وسائل کی کمی ان کے راستے میں حائل تھی۔ جب صدر اسکندر مرزا کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے خود ان کے ہاں جا کر کوشش کی کہ ان کے اخراجات کے لیے وہ حکومت کی مالی امداد قبول کر لیں۔ لیکن چودہ ری صاحب نہ مانے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ انہوں نے حکومت کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں، ان کا انہیں پورا معاوضہ ملتا رہا ہے۔ اب وہ خواہ مخواہ پاکستان کے خزانے پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتے، لیکن صدر مرزا کے مسلسل اصرار پر انہوں نے بیس ہزار روپیہ قرض حسنہ کے طور پر قبول کر لیا۔ بعد ازاں یہ رقم انہوں نے چند قسطوں میں واپس ادا بھی کر دی۔

اسی زمانے میں چودہ ری محمد علی نے صدر مرزا کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک واکس پریزیڈنٹ بھی رکھ لیں۔ لیکن یہ مشورہ قبول نہ کیا گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر چودہ ری صاحب جیسا فہیم شخص ایوان صدر میں ڈپٹی پریزیڈنٹ کے طور پر موجود ہوتا، تو شاید ہماری تاریخ کا دھارا کوئی اور رخ اختیار کر لیتا۔ واللہ العلم۔

چودہ ری صاحب کے بعد مسٹر سروردی کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور وہ وزیر اعظم بنے۔ ان کی حکومت ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کے اشتراک سے بنی تھی۔ تیرہ ماہ بعد ری پبلکن پارٹی نے ان کا ساتھ بھی چھوڑ دیا اور صدر مرزا نے ان کا استعفیٰ طلب کر لیا۔

آخر میں چھ سیاسی پارٹیوں کی کولیشن سے ملک فیروز خاں نون نے وزیر اعظم کا عمدہ سنبھالا اور نو ماہ کے قریب حکومت کی۔ ان کے زمانے میں کبھی کبھی ایسی نوبت بھی آ جاتی تھی کہ وزیروں کی فوج ظفر موج وزارتوں کی تعداد سے کمیں آگے نکل جاتی تھی۔ حلف لینے والے وزیروں کو معلوم ہوتا تھا کہ ان کی وزارت کی چاندنی چند ماہ سے نیا وہ

نہ چکے گی۔ اس لیے مکملوں کی تقسیم پر بڑا فساد ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ”خٹک“ اور ”تر“ وزارتوں کی اصطلاح بڑی فراوانی سے استعمال ہوا کرتی تھی۔ وزارت خزانہ، تجارت، صنعت، ورکس، خوراک وغیرہ کا شمار ”تر“ وزارتوں میں ہوتا تھا۔ ایک بار ایک کابینہ نامزد تو ہو گئی لیکن کئی روز تک حلف نہ اٹھا سکی کیونکہ مکملوں کی بندوبانٹ کا قضیہ کسی طور طے نہ پاتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ مسئلہ بھی طے ہوا، اور جب سب لوگ حلف اٹھانے کے لیے ایوان صدر میں جمع ہوئے تو اچانک یہ معلوم ہوا کہ رپورٹ فولیوز کی تقسیم کے دوران وزارت تعلیم پر کسی کی نظر انتخاب نہ پڑی تھی:

آئین نافذ ہونے کے بعد تین سال کے عرصہ میں چار مرکزی حکومتیں اقتدار میں آئیں جن میں گیاہ سیاسی پارٹیوں نے حصہ لیا۔ رہی پہلیں پارٹی ان سب میں شامل تھی۔ اس صورت حال کے رونما ہونے پر صدر اسکندر مرزا کے جوڑ توڑ کا بڑا عمل دخل تھا۔ وہ تین باتیں ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اول یہ، کہ نیا آئین قابل عمل نہیں۔ دوسرم یہ، کہ ملک بھر میں ایک بھی ایسی سیاسی شخصیت موجود نہیں جو مشتمل حکومت بنائے کرے۔ خوش اسلوبی سے چلا سکے، اور سوم، کہ عملی سیاست میں کوئی ایسی جماعت نہیں جو ملک کے دونوں حصوں کا اعتماد حاصل کر کے حکومت کا کاروبار سنبھال سکے۔ تین سال کے عرصہ میں انہوں نے اپنا یہ مقصد بڑی حد تک حاصل کر لیا کیونکہ اس عرصہ میں ملک کی تقریباً سب بڑی سیاسی پارٹیاں اور اہم لیڈر یکے بعد دیگرے حکومت میں شامل ہو کر یا ناکام ہو چکے تھے یا ناکام کر دیئے گئے تھے۔

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ صدر اسکندر مرزا جمہوریت سے خوفزدہ تھے اور اسے ناکام ثابت کر کے اپنی شخصی آمریت کا تسلط جنمانا چاہتے تھے۔ وہ شاہانہ ٹھانٹھ بانٹھ کے رسیا تھے اور بادشاہوں کے طور طریقوں کو دیکھ کر بے حد مرعوب ہو جاتے تھے۔ ایک بار وہ افغانستان کے سرکاری دورے پر گئے۔ ظاہر شاہ محفوظ نام کا بادشاہ تھا۔ وہاں پر اصلی حکومت اس کے چھاؤں کی تھی۔ سردار داؤد وزیر اعظم تھے اور اسی وقت

سے درپرده روس کے ساتھ پیغام بڑھانے میں لگے ہوئے تھے۔ ملک میں غربت، افلاس اور پسماندگی کا دور دوہرہ تھا۔ لیکن شاہی محلات میں طاؤس و بباب اور کباب و شباب کا زور تھا۔ بادشاہ کی سرکاری دعوت میں جو مینو کارڈز میز پر سجائے ہوئے تھے، ان کے ایک طرف انگریزی طرز کے کھانوں کے نام تھے اور دوسری طرف افغانی کھانوں کی فہرست تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہر مہمان کی پسند کے مطابق اسے انگریزی یا افغانی کھانے کھلانے جائیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ پہلے سب کے لیے چھ کورس کے انگریزی کھانوں کا دور چلا۔ اس کے بعد آٹھ دس قسم کے مرغن افغانی کھانے میز پر آئے۔ کچھ لوگوں نے دونوں قسم کے کھانوں کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے پورا پورا الصاف کیا۔ کھانے کے بعد بادشاہ سلامت سب مہمانوں کو ساتھ لے کر باہر باغ میں آئے، جہاں پانچ چھ سو معززین رات کے استقبالیہ میں شامل ہونے کے لیے کافی دیر سے جمع ہو رہے تھے یہ حضرات گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بھوکے پیاسے ان میزوں کے گرد منڈلا رہے تھے جو انواع و اقسام کے سامان خورد و نوش سے لدی ہوئی تھیں۔ دونوں ملکوں کے قوی ترانے بجھتے ہی سارا جمیع کھانے کی میزوں پر ڈھی دل کی طرح چھا گیا۔ ہمارے اندر والے مہمان بھی اس میں بڑے شوق سے شامل ہوئے۔ بادشاہی دعوت کا یہ طریقہ صدر اسکندر مرزا کو بڑا پسند آیا، واپس آ کر بہت عرصہ تک اس کی یاد ان کے دل میں چکلیاں لیتی رہی۔

بغداد پکیت کی کانفرنسوں کے سلسلے میں صدر مرزا نے ایران، عراق اور ترکی کے بھی کئی دورے کئے۔ شاہ ایران سے ان کی خوب گاڑھی چھپتی تھی۔ ان دوروں میں بیگم ناہید مرزا ملکہ ثریا کے ساتھ بزم خود اپنی خوش لباسی اور حسن و جمال کا مقابلہ کرتی رہتی تھیں۔ وہ ہر روز طرح طرح کے رنگوں کی نہایت بھرکیلی اور مرصع سازھیاں نیب تن کرتی تھیں اور ہر تصویر میں بڑے اہتمام سے مسکراتی ہوئی نظر آنے کی کوشش میں گلی رہتی تھیں۔ ایک روز انہوں نے شکایتا کہا۔ ”ملکہ ثریا کسی تقریب اور تصویر میں مسکراتی نظر نہیں آتی۔ میرا معاملہ اس کے بر عکس ہے۔ لیکن یہ اخبار والے سب

اندھے ہیں۔ ہمارے درمیان اس فرق پر کوئی کچھ نہیں لکھتا۔“

شاہ ایران کی ہر تقریب میں دو تین شوخ و شنگ لڑکیاں ہمہ وقت ان کے گرد منڈلایا کرتی تھیں۔ با اوقات یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ملکہ ثریا کو برسر عام نظر انداز کر کے شاہ کی توجہ کا مرکز بننے کی کوشش کر رہی ہیں۔ رضا شاہ پہلوی کے اس وقت تک کوئی اولاد نہ تھی، اور نجی محفلوں میں بعض اوقات وہ شاہی وقار کا رنگ و روغن اتار کر بڑی بے حجابی سے ایک گھٹیا سے ”پلے بوائے“ کا اوباشانہ روپ اختیار کر لیتے تھے۔ وہ ”بلیو“ فلموں کے دلدادہ تھے اور یورپ اور امریکہ کے تجہ خانوں، بیسواؤں اور نیشنل نگاروں کے متعلق انہیں بڑی وسیع معلومات حاصل تھیں۔ ایک روز شام کی چائے پر انہوں نے صدر اسکندر مرزا کو ڈیڑھ گھنٹہ تک جنسی علوم و فنون کے مختلف گوشوں سے آگاہ کیا اور آخر میں یہ فتویٰ صادر کیا۔ ”معاشرے کی توائی اور ترقی نانپے کا صحیح پیمانہ یہ ہے کہ اس میں جنسی آزادی کو کتنا فروغ حاصل ہے۔“

ایک بار شاہ ایران صدر مرزا اور بیگم ناہید مرزا کو ہمراہ لے کر اصفہان، شیراز اور شہد کی سیاحت پر گئے۔ طویل فاصلے تو ہوئی جماز سے طے کئے گئے، لیکن مقامی سیر و سیاحت کے لیے شاہ کے جلو میں موڑوں کا بڑا شاندار قافلہ چلتا تھا۔ موڑوں کا یہ شاہی جلوس جب کسی گاؤں یا قبے سے گزرتا تھا، تو کئی جگہ سڑک پر دور دور تک قالین ہی قالین بچھے ہوئے نظر آتے تھے۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ قالین میں اگر بہت زیادہ گرد جم کر بینٹھ جائے تو اسے صاف کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے چلتی ہوئی موڑ کار کے پہیوں کے نیچے روندا جائے۔ اس طرح گرد کی جمی ہوئی تمیں ٹوٹ جاتی ہیں اور تھوڑا سا جھائنے سے بھی قالین صاف ہو جاتا ہے۔ اس ترکیب سے شاہ کی گزر گاہ میں اپنا قالین بچھا کر اس کی وفادار رعایا ایک ہاتھ سے پہلوی خاندان کی ہر دلعزیزی پر اپنی مر تصدیق ثبت کر دیتی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے پرانے قالینوں کی گرد جھائز لیتی تھی۔

شیراز میں ہم ایک رات ٹھرے۔ وہاں پر جو کار مجھے ملی، اسے ایک نوجوان چلا رہا تھا جو یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ یہ کار بھی اس کی اپنی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب کبھی شاہ کے مہمان یہاں نازل ہوتے ہیں، ان کے استعمال کے لیے کاریں اہلیان شر سے جبراً ضبط کر لی جاتی ہیں۔ ڈرائیور بھی کار کے مالک ہی فراہم کرتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس ڈرائیور نہ ہو تو کار کے مال کو بیگار کے طور پر خود ہی یہ فرض انجام دینا پڑتا ہے۔ یہ نوجوان بڑے امیر اور معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس وقت اسے سرکاری ڈرائیور کی ورودی پہنا کر ہماری خدمت کے لیے مفت کی بیگار میں کپڑا ہوا تھا۔ وہ صبح سات بجے ڈیوٹی پر حاضر ہوتا تھا اور رات کے گیاہ بجے اپنی کار کو سرکاری مہمان خانے میں چھوڑ کر گھر واپس لوٹا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شیراز میں تقریباً سارا سال رات کو کافیو نافذ رہتا ہے اور رات کو دس بجے کے بعد لوگ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہر شر اور علاقے پر مقامی فوجی گریٹن کا تسلط ہے اور خود گریٹن پر سیکٹ سروس والوں کا کنٹرول ہوتا ہے۔ سیکٹ سروس کے شعبے میں برہہ راست شاہ کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ یہ نوجوان بڑی شدت سے شاہ ایران کا مخالف تھا اور شاہ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

شاہ ایران کی سرکاری دعوئیں بڑی شاندار ہوتی تھیں۔ ڈزر کے دوران نصف درجن اعلیٰ فوجی افسر تمغوں سے جگہاتی ہوئی وریاں پہنے شاہ کی کرسی کے پیچے بستہ ائشن کھڑے رہتے تھے۔ ایک ڈزر کے بعد بیگم ناہید مرزا نے مجھے کہا۔ ”شاہ کی نشت کے پیچے جو افسر کھڑے تھے، ان میں سے دو کا رینک جرنیل کے برابر تھا اور ادھر کراچی میں کپتان اور میجر کے رینک کے اے۔ ڈی۔ ہی ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے متعلق تم لوگوں کو کچھ سوچنا چاہیے۔“

ایک بار صدر اسکندر مرزا ایران، عراق اور سعودی عرب کے دورے پر ایسے وقت نکلے جبکہ نسر سویز کے قصیہ پر مصر پر برطانیہ اور فرانس کا حملہ ہو چکا تھا۔ وزیر اعظم سروردی

اور کمانڈر انچیف جزل ایوب خان بھی ان کے ساتھ تھے۔ جمال عبدالناصر کی غیر معتدل پالیسیوں کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کی بادشاہیں ان سے بہت خوفزدہ اور ناراض تھیں اور اب سامرانی طاقتوں کے حملے سے ناصر کی نکست اور تباہی کی امید باندھ کر بہت سے شلیان ذی شان خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے۔ خصوصاً بغداد کا سماں بڑا عبرتائک تھا۔ گلیوں اور سڑکوں پر جو عوام تھے، ان کا دل مصر کے ساتھ تھا لیکن سرکاری سطح پر خوشی کے شادیاں بخ رہے تھے۔ عراق کے وزیر اعظم نوری السعید پاشا ہمارے گیٹ ہاؤس میں آئے اور صدر اسکندر مرزا اور سرسری سروردی کے پاس بیٹھ کر انہوں نے صدر ناصر کے خلاف دیر تک زہر اگلا۔ ناصر کا ہوا ان کی رُگ و پے میں اس قدر شدت سے چھایا ہوا تھا کہ، یا تو وہ اسے بر ملا گالی دے کر یاد کرتے تھے یا طنزیہ طور پر ”جمال عبدالناصر علیہ السلام“ کے نام سے پکارتے تھے۔ اسی نشست میں انہوں نے بڑے وثوق سے پیشگوئی کی کہ نہر سویز میں جمال عبدالناصر کی قبر مقدر ہو چکی ہے اور بہت جلد فرعون کی طرح اس کی لاش بھی پانی سے نکال کر عجائب گھر میں رکھ دی جائے گی۔

نہر سویز کے سلسلے میں ہمارے عوام کا رد عمل بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح مصر کے حق میں تھا لیکن حکومت کا رویہ تذبذب، تامل، شش و پنج، پس و پیش اور حیض بیص کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ صدر اسکندر مرزا اور وزیر اعظم سروردی اپنے عوام کے خوف سے برطانیہ اور فرانس کے حملے کی تائید تو نہ کر سکتے تھے لیکن وہ کھلے دل سے مصر کے حق میں کوئی قدم اٹھانے سے بھی قادر تھے۔ جب ہم بغداد میں تھے تو وزیر اعظم سروردی نے اچانک مصر کا دوہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ مصر کی حکومت فرانس اور برطانیہ کے حملے کی تباہ کاریوں کے مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ یوں بھی اس خاص موقع پر سروردی صاحب کے مصر جانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر مصر کی حکومت نے سرسری سروردی کے پروگرام کے متعلق سرد مری سے کام لیا اور ان کے دوہ مصر کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ تاہم ہمارے وزیر اعظم چند افسروں کو ساتھ لے کر بیروت تک

ضرور گئے اور وہاں کچھ سیر و تفریح اور شاپنگ کر کے واپس آ گئے۔ شاپنگ کا جنون ہم لوگوں کی گھٹنی میں پڑا ہوا ہے۔

URDU4U.COM

لبنان کے ہمارے میں مصری قوم تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ ہمارا سرکاری وفد ان کی بہت بڑھانے قاہرہ تو نہ پہنچ سکا، لیکن بیروت کے بارونق بازاروں میں بڑے انہماک سے خرید و فروخت کے مشغلوں میں مصروف ہو گیا۔ اگلے روز جب ہم بغداد سے پاکستان روانہ ہوئے تو کچھ حضرات اپنی بھاری بھر کم شاپنگ سینے سے لگائے جہاز کے اندر ہی لے آئے۔ ہوائی جہاز کے کپتان نے احتجاج کیا کہ اتنا نیاہ سامان کیبین میں رکھنا حفاظتی اصولوں کے خلاف ہے اور جب تک فالتو سامان کو ہولڈ میں منتقل نہیں کیا جاتا، وہ ہوائی جہاز اڑانے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ باہر عراق کے شاہ فیصل، پنس عبدالالہ، وزیر اعظم نوری السعید اور دیگر اکابرین ہماری روائی کے منتظر کھڑے تھے۔ اندر سامان پر جھگڑا سر اٹھائے کھڑا تھا۔ صدر اسکندر مرزا اس قسم کے تنازعوں میں دخل دینے سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وہ تو ایک اخبار اٹھا کر اسے پڑھنے میں مصروف ہو گئے اور وزیر اعظم سروردی نے بیچ بچاؤ کر کے کسی طرح یہ معاملہ سلمھایا۔ خدا خدا کر کے ہمارا جہاز کافی تاخیر کے بعد بغداد ائیرپورٹ سے روانہ ہوا اور باہر کھڑی ہوئی الوداعی پارٹی کی بھی گلو خلاصی ہوئی، جسے غالباً یہ گمان تھا کہ شاید جہاز میں کوئی فنی خرابی واقع ہو گئی ہے۔

ایران، عراق اور سعودی عرب کے اس دورے میں یہ لخراش حقیقت سامنے آئی کہ جمال عبد الناصر کے خلاف نفرت کی وجہ سے مصر کے غریب عوام بھی ان تینوں ملکوں کی حکومتوں کی ہمدردیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ایک اسلامی ملک پر مغرب کی دو بڑی طاقتیں متحد ہو کر حملہ آور ہوئی تھیں لیکن اس کی مدد کے لیے دوسری اسلامی حکومتوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی۔ عالم اسلام میں نزع و نفاق اور انتشار کی یہ کیفیت بے حد شرمناک، عبرناک اور المناک تھی۔ اس ڈرامہ میں ہمارا کردار بھی کچھ ایسا نہ تھا،

جسے یاد کر کے ہم اپنا سر فخر سے اونچا کر سکیں۔

۱۳ جولائی ۱۹۵۸ء کو ایک بار پھر اسکندر مرزا کمانڈر انجیف جزل ایوب خاں کو ہمراہ لے کر تران کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارا جماز علی الصبح چار بجے کے قریب کراچی سے روانہ ہوا۔ پروگرام یہ تھا کہ تران میں چند گھنٹے شاہ ایران کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ہم لوگ اسی شام اسپوں روانہ ہو جائیں گے، جمال بغداد پکیٹ کے سلسلے میں پاکستان، ایران، عراق اور ترکی کے سربراہانِ مملکت کی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ تران پہنچ کر شہنشاہ کے ساتھ ملاقات شروع ہوئی ہی تھی کہ اچانک خبر ملی کہ بغداد میں ایک خون آشام فوجی انقلاب نے بادشاہت کا تحنتِ الٹ دیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی شاہ ایران سائل میں آگئے اور کچھ دیر تک ان پر سکتہ سا طاری رہا۔ انہوں نے فارسی اور فرانسیسی زبان میں جمال عبدالناصر کو چند گالیاں دیں اور پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کمرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کا چکر کائیں گے۔ ان کا ذہنی اضطراب اور کرب پسینے کے قطروں کی طرح ان کے چہرے سے ٹپک رہا تھا اور وہ بار بار اپنے عملے سے پوچھتے تھے کہ ٹیلی پرنس پر بغداد کے متعلق تانہ ترین کیا اطلاع آ رہی ہے۔ ایک بادشاہ کا تحنتِ اللٹ پر دوسرے بادشاہ کا رنج و الم کسی جذبہ ہمدردی اور غمگشیدی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ اس کے اپنے تاج و تحنت کی خود حفاظتی اور فکر مندی کا عکس تھا۔ ہمدردی اور ایثار غریبوں کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ بادشاہوں کے خزانے میں اس جنس نایاب سے خالی ہوتے ہیں۔

اسی روز ہم اسپوں کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں ترکی کی حکومت کا پیغام ملا کہ کانفرنس اسپوں کی بجائے انقرہ میں منعقد ہو گی۔ شہنشاہ ایران بھی شام تک انقرہ پہنچ گئے اور اس طرح بغداد پکیٹ کی وہ تاریخی کانفرنس شروع ہوئی، جس میں بغداد تو پکیٹ سے نکل گیا اور صرف پکیٹ ہی پکیٹ باقی نہ گیا، جسے بعداً زاں سینتو (Cento) کا نام دے دیا گیا۔

انقرہ پہنچ کر عراقی انقلاب کی مزید تفصیلات معلوم ہوئیں۔ شاہ فیصل، پنس عبدالہ اور

وزیر اعظم نوری السعیدی بڑی بے رحمی سے قتل کر دیئے گئے تھے۔ پنس عبداللہ اور نوری السعیدی کی لاشوں کو عوام نے دیر تک بغداد کی سڑکوں پر بھی گھسیٹا۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ جب پنس عبداللہ کے محل پر حملہ ہوا تو اس میں سے کئی نیم برصہ یورپیں لڑکیاں بھی چھپتی چلاتی ہوئی برآمد ہوئیں۔ پنس عیاش طبع آدی تھے اور ان کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے پاس مشرق و سلطی کا بہترین سردابہ شراب تھا اور وہ وقتہ فوقہ یورپ کے نائٹ کلبوں سے نت نئی حسیناؤں کا انتخاب کر کے اپنے محلہ کی زینت بناتے رہے تھے۔ پنس عبداللہ شاہ فیصل کے ماموں یا چچا تھے اور درحقیقت وہی عراق کے اصلی حکمران بھی تھے۔ جواں سال بادشاہ کو انہوں نے اپنے ہاتھ میں کھڑ پتیلی بنا رکھا تھا اور فتحہ اسے بھی اپنی طرز زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ترکی کے متعدد دوروں میں ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ وہ یہ کہ اگر ایک بار کسی قوم کے دل میں اسلام کی روح پوری طرح سما جائے تو پھر اسے اس راہ سے منحرف کرنا قطعی ناممکن ہے۔ پچھلے پچاس برس کے دوران ماذرن ازم اور سیکولر ازم کے نام پر ترکی میں بہت بڑے طوفان آئے لیکن ترک قوم کے سواد اعظم پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ صرف ملازمت پیشہ لوگ، شری آبادیوں کا کچھ حصہ، ڈھل مل لیقین رکھنے والے نئی روشنی کے دلدار، تن آسان مرد، فیشن پرست عورتیں اور بیرونی افکار پر پھلنے پھولنے والے دانشور ہی زیادہ تر اس طوفان کی زد میں آئے۔ اس کے باوجود ترکی میں مسجد میں جا کر نماز پڑھنے والے مرد اور عورتوں کی تعداد بہت سے دوسرے اسلامی مالک سے کمیں زیادہ ہے۔ کئی مسجدوں میں تو صفوں کے سامنے لکڑی کی کسی قدر اونچی تختیاں بھی بچھائی ہوتی ہیں تاکہ انگریزی طرز کی ٹوپیاں اوڑھ کر نماز پڑھنے والوں کو سجدہ کرنے میں وقت پیش نہ آئے۔ ترک عوام بڑے پکے اور چھ مسلمان ہیں اور پاکستان کے لیے ان کے دل میں خاص احترام کا جذبہ ہے۔ ترک قافلے جو ج

پر جاتے ہیں، وہ بھی انتظامی بندوبست، خوش تدبیری، نظم و ضبط اور ایمان و ایقان میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔

جدید ترکی میں بہت سی اسلامی روایات اور اقدار کو ازسر نو زندہ کرنے کا سرا جلال بیار اور وزیر اعظم مینڈریس کے سر ہے۔ غالباً اسی "جم" کی پاداش میں صدر معزول اور مقید ہوئے اور وزیر اعظم تختہ دار پر نکائے گئے لیکن عوام کے دلوں پر ان کی حکمرانی آج بھی قائم ہے۔ لوگ مسٹر مینڈریس کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں اور دیہات میں ان کے متعلق عجیب و غریب مافوق الفطرت کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔ ایک روایت جو طرح طرح کے رنگ لے کر متواتر گردش کرتی رہتی ہے، یہ ہے کہ کئی لوگوں نے کئی بار دیکھا ہے کہ مسٹر مینڈریس سفید گھوڑے پر سوار ترکی کے بعض علاقوں میں گھوم رہے ہیں۔ وزیر اعظم مینڈریس بڑے ہنس کھھ، خوش مزاج اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ان کی پرکشش شخصیت میں اعتدال، اعتماد و عجز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ بڑے دھیمے لمحے میں بات کرتے تھے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ گفتگو کے دوران بھی ان کی گردن میں تواضع کا ہلکا سامنہ آ جاتا تھا۔ ایک باہم انقرہ میں مسٹر مینڈریس نے مجھ سے دیافت کیا۔ ”کیا تم ترکی کی سیر سے مطمئن ہو؟“

میں نے جواب دیا کہ میں مطمئن تو بہت ہوں لیکن ایک حسرت ضرور باقی ہے۔  
”وہ کیا؟“ انہوں نے پوچھا

”ابھی تک مولانا روم کے مزار کی زیارت نصیب نہیں ہو سکی۔“ میں نے کہا۔  
”بے شک قونیہ یہاں سے کافی دور ہے لیکن اگر شوق تیز ہو تو لمبے سے لمبا فاصلہ آن کی آن میں طے ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے کسی قدر فلسفیانہ انداز سے کہا۔ اس وقت تو ان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی، لیکن کچھ دیر بعد اطلاع ملی کہ ژرکش ائیرفورس کا ایک جہاز ہمیں قونیہ لے جانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ پاکستان کی وزارت خارجہ کے سیکرٹری مسٹر اکرم اللہ اور میں چند دوسرے شاہقین کے ساتھ اس جہاز میں سوار ہو

کر قوئیہ پنچے۔ اکرام اللہ بڑا اعلیٰ اور لطیف ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ہوائی جماز کی پرواز کے دوران انہوں نے ہمیں مشنوی مولانا روم کے بہت سے اشعار سنائے اور ان کے معانی پر روشنی ڈالی۔ انہیں اردو اور فارسی استاذتھے کے سینکڑوں اشعار یاد تھے اور موقع و محل کے لحاظ سے عین برجستہ شعر پڑھنے میں انہیں بڑا کمال حاصل تھا۔

قوئیہ میں ڈرکش ائیرفورس کا مقامی کمانڈر ہمیں اپنی گاڑی میں مولانا روم کے مزار پر لے گیا۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم نے کچھ دیر وہاں قرآن شریف کی تلاوت کی۔ اس دوران ہم نے دیکھا کہ وردی پوش کمانڈر بھی مزار کے پاس مودب کھڑا ہے اور آنکھیں نیچی کئے زیر لب کچھ آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہے۔ واپسی پر اکرام اللہ صاحب نے اس سے پوچھا کہ وہ چپکے چپکے کیا پڑھ رہا تھا۔ اس سوال پر جواں سال کمانڈر کچھ جھینپ سا گیا، جیسے اسکی کوئی چوری کپڑی گئی ہو۔ پھر کسی قدر معدتر خواہانہ انداز میں اس نے بتایا کہ وہ بھی فاتحہ ہی پڑھ رہا تھا۔ ائیرفورس کے اس افسر کی طرح ترکی میں ایک خاصا وسیع طبقہ ایسا بھی ہے جو باطن میں تو اسلامی اعمال اور اقدار پر پورا پورا یقین رکھتا ہے لیکن اسے بر ملا ظاہر کرنے سے یا تو از خود ہچکھاتا ہے یا کسی دباؤ کی وجہ سے مجبور ہے۔

ایک بار صدر اسکندر مرزا ترکی کے دورے پر تھے تو عید الاضحی کا دن انقرہ میں آگیا۔ اب ترکی حکومت کے رہنماؤں کو یہ تشویش لاحق ہو گئی کہ اگر پاکستانی وفد نے عید کی نماز پڑھنے پر اصرار کیا تو پرونوکول کے مطابق ان کو بھی مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑے گا۔ اگرچہ صدر جلال بیار اور وزیراعظم عدنان مینڈرس نے ترکی میں اسلامی اقدار کی از سر نو ترویج میں کافی پیش رفت کی تھی لیکن غالباً ابھی ان میں اتنی ہمت یا حمیت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ کھلے بندوں عید کی نماز میں شامل ہوں۔ چنانچہ اس گھنٹی کا حل انہوں نے یہ نکلا کہ عید کے روز منہ انہیرے ہمیں ایک پیش ٹرین میں سوار کر کے اسٹنبول روانہ کر دیا۔ سارا دن ہماری ٹرین ترکی کے بے شمار شرروں، قصبوں اور دیہاتوں سے گزری، اور ہم نے ترک قوم کو بالکل اسی جوش و خروش سے عید مناتے ہوئے

دیکھا جیسے کہ پاکستانی عوام مناتے ہیں۔ کوئی گاؤں ایسا نظر نہ آتا تھا جس میں بلند مینار والی کم از کم ایک مسجد موجود نہ ہو۔ نئے نئے کپڑوں میں ملبوس مرد، عورتیں اور بچے جو ق در جوق عید گاہوں میں جمع ہو رہے تھے اور جگہ جگہ بجے سجائے قربانی کے جانوروں کے گرد لوگوں کے ٹھٹھے کے ٹھٹھے لگے ہوئے تھے۔ جب شام ہوئی تو کئی قصبوں اور آبادیوں میں عید کی خوشی میں چراغاں بھی نظر آیا۔ اگرچہ اس روز ہمیں خود عید کی نماز نہ مل سکی لیکن ترک قوم کو عید مناتے ہوئے دیکھ کر بڑا روح پرور نظارہ نصیب ہوا۔

استنبول میں جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایوب النصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار پر بھی حاضری نصیب ہوئی۔ یہاں پر ہر وقت زائرین کا تکانتا بندھا رہتا ہے۔ بچے مزار پر اپنی عقیدت مندی کا انعام جس سنجیدگی، رکھ رکھاؤ اور نظم و ضبط کے ساتھ کرتے ہیں اسے دیکھ کر بڑا رشک آتا ہے۔

استنبول میں ایک صاحب مجھے محمد امام مرحوم کی قبر پر بھی لے گئے۔ مرحوم محمد امام اس وفد کے ساتھ استنبول آئے تھے جو سلطان نیپونے ۱۷۸۷ء میں ترکی کے سلطان عبدالحمید خاں اول کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس وفد کے سربراہ سید غلام علی تھے جو سلطان نیپون کی جانب سے کچھ خطوط اور تحائف بھی لایا تھا۔ وفد کا مقصد سلطنت عثمانیہ کے ساتھ انگریزوں کے خلاف اتحاد کرنا تھا، جو بوجوہ پورا نہ ہو سکا۔ یہ خطوط آج تک استنبول میں صدارت عظیمی کی Archives میں محفوظ ہیں۔

اس وفد میں سیاسی نمائندوں کے علاوہ بہت سے سوار، سپاہی اور خدمت گار تھے جن کی تعداد ۵۰ بتائی جاتی ہے۔ سردار محمد امام کے زیر کمان ۱۰۰ سپاہی تھے۔

استنبول میں قیام کے دوران وفد میں طاعون کی وبا پھوٹی۔ غالباً سردار محمد امام اسی مرض میں جتلہ ہو کر فوت ہوئے۔ قبر پر سر کی جانب ایک پتھر کی سل پر یہ کتبہ درج ہے:

ہو الخلاق الباقي  
مرحوم و مغفور  
محمد امام سردار

## عکر اپنی نیپو سلطان

ہند روحنہ فاتحہ

۱۴۰۲ ہجری

صدر مرزا نے بیگم مرزا کے ساتھ پین کا بھی طویل دوہ کیا تھا۔ پین میں جس چیز نے ان دونوں کو سب سے نیادہ متاثر کیا تھا، وہ مسجد قربطہ نہ تھی بلکہ جزل فرانکو کی اپنے ملک پر آہنی گرفت تھی۔ اس دورے کے بعد بہت عرصہ تک صدر اسکندر مرزا اور ان کی بیگم پین کے نظام حکومت کے متعلق رطب اللسان رہے۔ انہوں نے وزیرِ اعظم کو ایک تجویز بھی ارسال کی تھی کہ سی۔ ایس۔ پی کے افراد کو نظم و نتیجہ کی ٹریننگ کے لیے جن ملکوں میں بھیجا جاتا ہے، ان میں پین بھی شامل کیا جائے۔

ایک روز اچانک میرے کمرے میں آئے، اور بولے، ”تم زلفی کو جانتے ہو؟“ یہ نام میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، تو وہ بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے، ”تعجب ہے تم زلفی کو نہیں جانتے۔ بڑا سمارٹ لڑکا ہے۔ آجکل کراچی کے نائنٹ لائف اسی کی وجہ سے چمکی ہوئی ہے۔“

میں نے کراچی کی نائنٹ لائف کی رونق سے بھی اپنی محرومی کا اقبال کیا، تو صدر اسکندر مرزا نے مجھے بتایا ذوالفقار علی بھٹو ایک نوجوان بیرون شر ہے۔ بڑا پڑھا لکھا، آدمی ہے۔ سندھ کے امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ کتابیں جمع کرنے کا شووقین ہے۔ وہ ایوان صدر کی لا بھری ی میں سندھ کے متعلق جو بہت سے کتابیں ہیں انہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ صدر مرزا نے مجھے ہدایت کی کہ میں ٹیلیفون کر کے اس نوجوان کو اپنے پاس بلاوں، اور پریزیڈنٹ ہاؤس کی لا بھری ی استعمال کرنے میں اس کی مدد کروں۔

میرے بلاوے پر ایک چھریے بدن کا ایک نہایت خوش لباس، خوبصورت، تیز طرار، شوخ اور سیما ب صفت نوجوان میرے کمرے میں وارد ہوا۔ مشر ذوالفقار علی بھٹو میں بلا کی ذہانت اور فانت تھی اور انہیں بہت سے جدید علوم اور ان کے اظہار پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ چند ہی روز میں انہوں نے پریزیڈنٹ ہاؤس کی چھوٹی سی لا بھری ی کو کھنگال

کے رکھ دیا۔ ایک روز وہ میرے کمرے میں بیٹھے کسی کتاب سے کچھ اقتباسات ناپ کروا رہے تھے کہ صدر اسکندر مرزا دن کے ایک بجے میری کھڑکی کے پاس آ کر رکے۔ بھٹو صاحب کو دیکھ کر انہوں نے بلند آواز سے کہا۔ ”لغتی، گلشنیوز فاریو۔ تمہارا نام یو۔ این۔ او کے ڈیلیگیشن میں شامل ہو گیا ہے۔“

یہ خبر سن کر بھٹو صاحب خوشی سے سرشار ہو گئے۔ صدر مرزا کے جانے کے بعد انہوں نے انگریزی ڈانس کی طرز پر میرے کمرے کے اک دو چکر کائے اور پھر مجھے مخاطب کر کے اپنی مخصوص اردو میں کہا۔ ”آپ صاب دیکھو گے اب میں اس راہ پر آزاد ہوں تو فارلن فنڈر کی کرسی تک دوڑ لگاؤں گا۔“

بھٹو صاحب وزیر خارجہ کی منزل سے بہت آگے تک گئے، اور انجام کار اقتدار کے میدان کو یوں چھوڑا: جو کوئے یار سے لکھے تو سوئے دار چلے۔

انہی پہلی ملاقات ہی سے وہ مجھے ”آپ صاب“ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ وزیر، وزیرِ اعظم اور صدر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اس اسلوب تاختاط کو بڑی وضعداری سے نبھایا۔ ان کے عروج کے آخری دور میں بہت سے وزیروں اور اعلیٰ افسروں کو اکثر یہ شکایت رہتی تھی کہ بھٹو صاحب کابینہ اور دوسری میشگوں میں ان کے ساتھ بڑی سختی، بدسلوکی اور ہنگ آمیز رویہ سے پیش آتے ہیں۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے کبھی کوئی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔ میں جیسا ”آپ صاب“ شروع میں تھا، ویسا ہی آخر تک رہا۔

جون ۱۹۵۸ء کا اوائل تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ صدر اسکندر مرزا حسب دستور پورے ایک بجے اپنے کمرے سے اٹھ کر میرے دفتر کی کھڑکی کے پاس آئے، اور پوچھا، ”کوئی ضروری کام باقی تو نہیں؟“ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ خدا حافظ کہہ کر الیوان صدارت میں اپنے رہائشی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دور چل کر وہ اچانک رکے، اور مژ کر تیز تیز قدم میرے کمرے میں واپس آگئے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بولے، ”میں ایک ضروری بات تو بھول ہی گیا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے میری میز سے پرینزیپل ہاؤس کی سیشنزی کا ایک ورق اٹھایا، اور وہیں

کھڑے کھڑے وزیر اعظم فیروز خاں نون کے ایک دو سطری نوٹ لکھا کہ ہماری باہمی متفقہ رائے کے مطابق بری افواج کے کمانڈر انچیف کے طور پر جزل محمد ایوب خان کی ملازمت میں دو سال کی توسعی کے احکامات فوراً جاری کر دیجئے جائیں۔ اس پر انہوں نے "Immediate" کا لیبل اپنے ہاتھ سے پن کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں ابھی خود جا کر یہ نوٹ پرائم نشر کو دوں، ان کے عملے کے حوالے نہ کرو۔

یہ مختصر سا پروانہ بڑی عجلت اور کسی قدر لاپرواٹی کے عالم میں لکھا گیا تھا۔ صدر اسکندر مرزا کے ہوتیوں میں لٹکے ہوئے سگریٹ کی راکھ بھی اس پر دو بار گر چکی تھی، لیکن کاغذ کے اسے چھوٹے سے پرزے نے ہمارے ملک کی تاریخ کا رخ موز دیا۔ اگر جون ۱۹۵۸ء میں جزل محمد ایوب خان کی میعاد ملازمت میں دو سال کی توسعی نہ ہوتی تو پاکستان کی تقدیر کا ستارہ جس انداز سے چلتا، اس کا زانچہ تیار کرنے کے لیے کسی خاص علم نجوم کی ضرورت نہیں ہے!

۱۹۵۸ کا سال چڑھتے ہی اسکندر مرزا صاحب کی کرسی صدارت پر عام انتخابات کا خوف شمشیر بہنسہ کی طرح لٹک گیا۔ انتخابات نومبر ۱۹۵۷ء میں منعقد ہوئے تھے۔ لیکن کسی قدر ہیرا پھیری کے بعد ۱۹۵۸ء تک ملتی ہو گئے۔ بعد ازاں مزید ہیرا پھیری کے بعد ۱۹۵۹ء تک کھک گئے۔ نئے آئین کے تحت کوئی صدر مسلسل دو میعادوں تک اس عمدے پر فائز نہیں ہے سکتا تھا۔ اگر انتخابات ہوتے تو میجر جزل اسکندر مرزا کو صدارت سے دستبردار ہونا پڑتا یا اگر وہ دوبارہ صدر بننا چاہتے تو اپنے منصب سے استعفی دے کر از سر نو صدارتی انتخابات لڑ سکتے تھے۔ یہ دونوں صورتیں ان کے لیے سوہان روح تھیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کارلا کر انتخابات ہی سے پیچھا چھڑانے کی ٹھان لی۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے کافی حرbe استعمال کئے۔ اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر خان صاحب سے انہوں نے ایک شوشہ چھڑوایا کہ صدر مملکت کی سرکردگی میں ایک انقلابی کونسل قائم ہونی چاہیے جو مملکت کا سارا کاروبار خود چلائے۔ اس احتمانہ تجویز پر کسی نے کوئی

دھیان نہ دیا اور سب نے یہی سمجھا کہ ایک پرانا کانگریسی لیڈر سُھیا کر ایسے ہی دور از کار بڑا ہائک رہا ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب تو لاہور میں ناگہانی طور پر قتل ہو گئے لیکن صدر اسکندر مرزا کے کچھ نادان دوست اس بے نجی اور فضول سکیم پر بدستور تھے رہے۔ چنانچہ ملک کے کئی شروں میں انہوں نے اس مضمون کے پوسٹر چھپوا کر دیواروں پر چپاں بھی کئے، جس کا نتیجہ صرف یہ تکا کہ صدر مرزا کے خلاف سیاسی حلقوں میں بد ظنی اور بھی بڑھ گئی۔

قلات کے ”خانِ عظیم“ میر احمد یار خاں بلوچ نے اپنی کتاب Inside Baluchistan میں صدر اسکندر مرزا کی ایک عجیب سازیاں کا حوالہ دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ صدر نے ان کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ قلات کو ”ون یونٹ“ سے الگ کرنے میں ان کی پوری پوری مدد کریں گے۔ اس کے عوض انہوں نے اپنے صدارتی انتخاب کے لیے ان سے پچاس لاکھ روپے کی رقم طلب کی تھی اور بہاولپور سے چالیس لاکھ اور خیرپور سے دس لاکھ روپے حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میر احمد یار خاں کے بیان کے مطابق صدر اسکندر مرزا نے یہ منصوبی بنایا تھا کہ وہ پاکستان میں مارشل لاء نافذ کر کے نواب بھوپال کو وزیرِ عظم بنا دیں گے اور خود صدارت کی کری پر بینہ کر آمرانہ طریقے سے حکومت کریں گے۔ اس مقصد سے انہوں نے نواب بھوپال کو کراچی بلا بھی لیا تھا۔ لیکن خان آف قلات کا مشورہ سن کر نواب صاحب نے یہ پیش کش قبول نہ کی۔

ایک بار راجہ صاحب محمود آباد نے مجھے خود بتایا تھا کہ صدر اسکندر مرزا نے انہیں بھی کچھ ایسا ہی بزرگ باغ دکھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن راجہ صاحب بڑے صاحب فرست و بصیرت انسان تھے۔ اس لیے ان کے چکر میں نہ آئے۔

ادھر ایوان صدارت میں میجر جزل اسکندر مرزا اپنی محلاتی سازشوں میں مصروف تھے، ادھر باہر ملک کے طول و عرض میں سیاسی سرگرمیاں روز بہ روز تیزی سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ جمہوریت کا خاصہ ہے کہ جس رفتار سے انتخابات کا وقت قریب آتا ہے اسی رفتار سے

سیاست کے رگ و ریشے میں خون کا دباؤ اور درجہ حرارت بڑھنے لگتا ہے۔ ہمارے وطن میں پہلے عام انتخابات آزادی کے گیاہ برس بعد ہونے والے تھے، اس لیے انتخابی بخار میں غیر معمولی جوش و خروش اور حدت و شدت بالکل قدرتی اور لا ازی امر تھا۔ سیاسی جماعتیں، اپنی اپنی انتخابی مسم میں سرگرم عمل ہو گئیں۔ خاص طور پر مغربی پاکستان میں مسلم لیگ نے ایک نئے ولے سے سر اٹھایا اور خان عبدالقیوم خان کی قیادت میں عوام الناس کے ساتھ اپنی وابستگی کے بڑے شاندار مظاہرے کئے۔ خان قیوم کی تقریروں میں صدر اسکندر مرزا کی سیاسی ریشہ دوانیوں کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ ساری کارروائی ایک خالص سیاسی عمل تھا، جسے نوکر شاہی کی آغوش میں پہنچنے ہوئے حکمران طبقے جمہوریت کی عینک سے دیکھنے سے قطعی طور پر قاصر تھے۔ سیاست میں اس طرح کی ارتقائی ترقی اور فروع ان کی عقل و فہم سے سراسر بالا تھے۔ خاص طور پر صدر اسکندر مرزا کو اس میں شرپندی اور ملک دشمنی کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا کیونکہ انتخابات کے نتیجہ میں ان کو خود اپنا سکھاں ڈالتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

مشرق پاکستان میں بھی سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ وہاں پر ایک افسوسناک واقعہ یہ پیش آیا کہ صوبائی اسمبلی کے ڈپنی سپیکر اسمبلی کے اندر ایک ہنگامے میں زخمی ہو کر وفات پا گئے۔ یہ حادثہ اپنی جگہ بڑا المناک بلکہ شرمناک تھا لیکن جمہوریت کی تاریخ میں کوئی ایسا عجوبہ روزگار بھی نہ تھا۔ بڑے بڑے شائستہ، ترقی یافتہ، نستعلیق ممالک کی پارلیمانی نظام کے ارتقا کی تاریخ اشتعال انگلیزی، ہنگامہ آرائی، لپاڑگی اور تشدد کے واقعات سے پڑی پڑی ہے۔ صدر اسکندر مرزا جمہوریت سے اس وجہ سے خائف تھے کہ ان کے اپنی ذاتی مفاد پر زد پڑتی تھی، لیکن ملک کے مفاد کی آڑ لے کر ان کی حکومت نے اس ایک واقعہ پر سراسر غیر مناسب رنگ و روغن چڑھا کر اسے جمہوریت کے تابوت میں ایک موثر کیل کے طور پر گاڑنا شروع کر دیا۔

۲۲ ستمبر ۱۹۵۸ء کو دن کے ایک بجے جب صدر اسکندر مرزا اپنے دفتر سے اٹھے تو حسب

معمول میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر نہ رکے بلکہ مجھے باہر برآمدے میں اپنے پاس بلا بھیجا۔ ان کے ہاتھ میں پاکستان کے آئین کی ایک جلد تھی۔ انہوں نے اس کتاب کی طرف اشادہ کر کے مجھ سے پوچھا۔ ”تم نے اس Trash کو پڑھا ہے؟“ جس آئین کے تحت حلف اٹھا کر وہ کری صدارت پر برآجمن تھے، اس کے متعلق ان کی زبان سے Trash کا لفظ سن کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر انہوں نے آئین پر تنقید و تنقیض کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی پہلے سے رٹا ہوا آموختہ دھرا رہے ہوں کچھ دیر بولنے کے بعد وہ بڑی باقاعدگی سے ٹیپ کا یہ فقرہ دھراتے تھے، کہ یہ آئین بالکل ناقابل عمل ہے۔ اسی طرح تقریر کرتے کرتے وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں اپنے رہائش کمروں کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہاں پر ان کے چند ذاتی دوست لئے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ صدر مرزا تو اپنی تقریرِ ادھوری چھوڑ کر ان میں گھل مل گئے اور میں واپس لوٹ آیا۔ آئین کے متعلق ان کے بہت سے فقرے ہتھوڑی کی طرح کھٹ کھٹ میرے کافنوں میں پھی رہے تھے۔ واپسی پر جب میں سیڑھیاں اتر رہا تھا تو اچانک میری نانگیں بے جان سی ہو گئیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایسکیلیٹر کی طرح نیچے والی سیڑھیاں بڑی تیزی سے اوپر کی طرف آ رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گیا۔ سیکیورٹی کا ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور مجھے سارا دے کر نیچے لاایا۔ برآمدے میں صدر کے معاون کرٹل سرور کھڑے تھے انہوں نے جلدی جلدی میرا معائینہ کیا اور پھر کار میں ڈال کر جناح ہسپتال کے Intensive Care Unit میں داخل کر دیا۔ دو روز کے بعد جب مجھے Intensive Care میں نقل کیا گیا تو بیگم ناہید مرزا مجھے دیکھنے آئیں، اور بولیں ”کرٹل سرور نے ہمیں بتایا ہے کہ تمہارے ہارت کو نیازوں نقصان نہیں پہنچا۔ امید ہے تم دس بارہ روز میں ہسپتال سے فارغ ہو جاؤ گے۔ بلا نازک وقت آنے والا ہے۔ جلدی جلدی ٹھیک ہو کر کام پر آنے کی کوشش کرو۔“

ایک بار صدر اسکندر مرزا بھی آئے اور اسی قسم کی گفتگو کر کے چلے گئے۔ یہ اکتوبر کو مجھے ہسپتال سے چھٹی ملی، لیکن ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ فوراً دفتر جانا شروع نہ کروں بلکہ دو چار روز اور گھر پر آرام کروں۔ یہ اکتوبر کو میں نے اپنے دفتر ٹیلیفون کر کے کام کاج کا حال دریافت کیا تو میرے عملے نے بتایا کہ کئی روز سے دفتری کاروبار بند پڑا ہے۔ صدر مرزا نیا ہد وقت جزل محمد ایوب خاں کے ساتھ ملاقاتوں میں گزارتے ہیں۔ فالٹیں جوں کی توں پڑی رہتی ہیں۔ کئی روز سے کسی نے ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اسی روز رات گئے ایک صاحب نے پریزیڈنٹ ہاؤس سے ٹیلیفون کر کے مجھے اطلاع دی کہ ابھی ابھی ملک بھر میں مارشل لاءِ نافذ ہو گیا ہے۔ آئین منسوخ کر دیا گیا ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور اسٹبلیاں توڑ دی گئی ہیں اور جزل محمد ایوب خاں چیف مارشل لاءِ ایڈمنیسٹریٹ مقرر ہو گئے ہیں۔

۸ اکتوبر کی صبح کو میں اپنے دفتر گیا تو اسکندر مرزا صاحب ایوان صدر کی فضا میں کئی ہوئی پنگ کی طرح ڈول رہے تھے۔ آئین کو منسوخ کر کے انہوں نے اپنے ہاتھوں وہ درخت ہی کاٹ کر پھینک دیا تھا جس کے سائے میں بیٹھ کر انہیں صدارت کی کرسی نصیب ہوئی تھی۔ فوج کے شعبہ قانون کے ماہرین نے صاف طور پر یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ آئین کی منسوخی کے ساتھ ہی صدر کا عہدہ بھی ختم ہو گیا ہے اور اب حکومت کا واحد سربراہ چیف مارشل لاءِ ایڈمنیسٹریٹ ہے۔ میجر جزل اسکندر مرزا نے اپنی پوزیشن منحکم کرنے کے لیے بڑے ہاتھ پاؤں مارے۔ کچھ سول افراد کو ساتھ ملا کر انہوں نے کراچی کے مزدوروں سے اپنے حق میں ایک پھیپھا سا مظاہرہ بھی کروایا تاکہ جزل ایوب خاں پر عوام میں اپنی ہر دلعزیزی کا رعب گانٹھ سکیں۔ مسلح افواج میں پھوٹ ڈالنے کے لیے انہوں نے پاک فضائیہ کے ائمہ کمودور مقبول رب کے ذریعہ چند فوجی جرنیلوں کو گرفتار کرنے کی بھونڈی سی ناکام کوشش بھی کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جزل ایوب خاں کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اپنی روایتی محلاتی سازشوں کے تانے بانے بھی بڑی چلاکی سے بنا شروع کر دیئے لیکن جس محلسرا پر آئین کا سایہ قائم نہ رہے، اس

کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ مارشل لاءِ میں حکومت اس کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو۔ یہ فویت ایوب خاں کو حاصل تھی۔ چنانچہ یعنی بیس روز بعد رات کے وقت فوج کے ایک دستے نے ایوان صدر کو گھیرے میں لے لیا۔ تین جنیل اور ایک مسلح بر گیڈیٹر اسکندر مرزا کے پاس گئے اور انہیں کرسی صدارت سے اتار کر پہلے کوئی اور پھر لندن روانہ کر دیا۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات کو جب میجر جزل اسکندر مرزا اپنی بیگم کے ساتھ پریزیڈنٹ ہاؤس سے آخری بار رخصت ہو رہے تھے تو انہوں نے ایک جنیل کو ایک نیا فاؤنڈن چین پین دے کر کہا کہ یہ الوداعی تحفہ ان کی طرف سے مجھے پہنچا دیں۔ اگلی صبح جب یہ تحفہ مجھے ملا تو مجھے ان کے اعصابی کس بل پر بڑا تعجب ہوا۔ جس وقت میجر جزل اسکندر مرزا اور بیگم ناہید مرزا پریزیڈنٹ ہاؤس سے نکل رہے تھے تو انہیں وثوق سے یہ علم نہ تھا کہ یہاں سے انہیں جیل میں پہنچایا جائے گا یا کسی فوجی بارک میں نظر بند کیا جائے گا یا کہیں لے جا کر گولی سے اٹا دیا جائے گا، یا واقعی کوئی اور لندن بھیجا جائے گا۔ اس بے چینی اور رواروی کے عالم میں اپنے سیکرٹری کو یاد رکھنا اور اس کے الوداعی تحفہ چھوڑنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

جمهوریت کو پامال کرنے کا جو عمل مشر غلام محمد نے شروع کیا تھا، میجر جزل اسکندر مرزا نے اسے پایہ تھکیل تک پہنچا دیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں آئین منسوخ کرنے کا بالکل کوئی جواز نہ تھا۔ اس وقت پاکستان کسی غیر معمولی بیرونی خطرے سے دو چار نہ تھا۔ اندرونی "خطرہ" صرف یہ تھا کہ اگر انتخابات منعقد ہو جاتے تو غالباً اسکندر مرزا صاحب کو کرسی صدارت سے ہاتھ دھونا پڑتا اپنی صدارت کو اس افتاد سے بچانے کے لیے انہوں نے یہ رٹ لگائی کہ ۱۹۵۶ء کا آئین ناقابل عمل ہے۔ یہ بڑا بھوٹا عذر لنگ تھا۔ آئین کو پرکھنے کی کسوٹی انتخابات اور منتخب اداروں کا کردار ہوتا ہے۔ اس آئین کے تحت ایک بھی ایکشن نہ ہوئی تھی۔ اس لیے اس پر ناقابل عمل ہونے کا الزام لگانا سراسر بے

معنی اور بے بنیاد تھا۔ اپنے ذاتی اقتدار کی حفاظت کے لیے صدر اسکندر مرزا نے مارشل لاء کی راہ ہموار کی۔ جزل ایوب خاں پچھلے چار برس سے اسی نفیاتی لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ مارشل لاء نافذ کر کے انہوں نے سب سے پہلے صدر مرزا کو بیک بینی و دوگوش نکال باہر کیا۔ پھر اپنے بنے بنائے پلان کے مطابق حکمرانی شروع کر دی۔ یہ پلان انہوں نے ۳ اکتوبر ۱۹۵۳ء کی رات کو لندن کے ڈارچسٹر ہوٹل میں بیٹھ کر بنایا تھا اور اقتدار کے اگلے دس برس انہوں نے قریباً قریباً انہی خطوط پر اپنی صدارت کو استوار کیا۔

پاکستان میں جمہوریت پہلے ہی سک سک کر جی رہی تھی۔ آئین کی منسوخی نے اس کا گلا اور بھی گھونٹ دیا۔ زندگی اور جمہوریت میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ پے در پے ناکامیوں کی وجہ سے دونوں منقطع نہیں ہوتیں بلکہ جوں توں چلتی رہتی ہیں۔ اگر جمہوریت ناکام ہونے لگے، تو نقل خون (Blood Transfusion) کی طرح اس کا واحد علاج مزید جمہوریت ہے۔ دوبارہ ناکام ہونے لگے تو اور بھی مزید جمہوریت۔ باقی سب طریقے عطائیوں، اناڑی ریفارمروں اور نیم حکیموں کے نخے ہوتے ہیں جو ملک اور قوم کے لیے خطرہ جان ثابت ہو سکتے ہیں۔ بد قسمتی سے جزل ایوب خاں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور جمہوریت کے نام پر انہوں نے جس نظام کی داغ بیل ڈالی، اس نے ان کے دور صدارت کے ساتھ ہی دم توڑ دیا۔

جمہوریت کا سکے اسی وقت تک چلتا ہے جب تک کہ وہ خالص ہو۔ جوں ہی اس میں کھوٹ مل جائے، اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔

## • جزل ایوبؑ خان کی اٹھانہ

یہ جزل اسکندر مرزا کی بر طرفی کے بعد اگلی صبح میں اپنے دفتر گیا، تو ایوان صدارت میں الو بول رہا تھا۔ چاروں طرف ساتھ چھایا ہوا تھا اور اکا دکا نوکر چاکر اور گارڈ کے سپاہی سرگوشیوں میں رات کے واقعات پر بصیرہ کر رہے تھے۔ جزل ایوب خان نے صدارت کا عمدہ سنبھال لیا تھا، لیکن وہ ابھی ایوان صدر میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ اب مجھے اس بیت الجن سے چھنکارا نصیب ہو جائے گا کیونکہ نئے صدر کے لیے فوجی لوگ ضرور اپنی پسند کا سیکرٹری رکھنا چاہیں گے۔ میں نے اپنے کاغذات درست کئے اور دستور کے مطابق اپنی چارج روپورٹ تیار کر ہی رہا تھا کہ یکاکیک یونیفارم میں ملبوس جزل ایوب خان میرے کمرے کی کھڑکی میں نمودار ہوئے۔ وہ اتنے طویل القامت تھے کہ اگر کھڑکی کے پاس سیدھے کھڑے ہو کر بولتے تو چھت کے ساتھ باشیں کرتے نظر آتے۔ انہوں نے جھک کر کھڑکی کی چوکھت سے آگے والی دلیز پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور مجھے باہر آنے کو کہا۔

مجھے ساتھ لے کر وہ کافی دیر تک باہر چبوترے پر ٹھلتے رہے۔ پہلے انہوں نے اسکندر مرزا کے ساتھ اپنی دیہیں دوستی کا ذکر کیا۔ پھر پچھلے دو تین ہفتوں کے دوران ان کی سازشوں اور یوفایوں پر طویل روشنی ڈالی۔ مجھے ان کی اس گفتگو پر بڑی حیرت ہوئی۔ جزل ایوب خان سے میرے کوئی قربی مرام نہ تھے۔ یونہی دور ہی دور سے رسمی سی ملاقات تھی۔ میرا خیال ہے اسکندر مرزا کو بر طرف کرنے کا ان کے ذہن پر کسی قدر بوجھ تھا۔ وہ اس قسم کی گفتگو کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ صبح سوریے میں پہلا سویلین تھا، جو ان کے ہاتھ آگیا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اپنی ذہنی چاند ماری کا تختہ مشق بنائے اسکندر مرزا کے ساتھ اپنی وفاداری کا حق ادا کر دیا۔ انسان کے دماغ میں ایسی خود کار مشین نصب ہوتی ہے، جو اندر ہونی اضطراب کے وقت اسے اپنی مرضی کی سکون آور

گولیاں بنا بنا کر کھلاتی رہتی ہے۔

اس روز صدر ایوب خاں کی پہلی کیبنٹ میننگ ہونے والی تھی۔ کچھ وزیر برآمدے میں آکر جمع ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر صدر نے کہا، ”میں چاہتا ہوں کہ کابینہ کی پہلی  
چند مشتکوں میں تم بھی بیہو تاکہ تم میرے خیالات سے واقف ہو جاؤ۔“

یہ موقع ہاتھ آتے ہی میں نے گذارش کی، ”جناب“ دراصل میں اپنی چارج روپورٹ تکمیل  
کر رہا تھا تاکہ آپ اپنی پسند کا نیا سیکرٹری معین کر لیں۔“

یہ سن کر صدر ایوب چلتے چلتے رک گئے اور بولے۔ ”ہم فوجی لوگ ہر بات کی تحقیق  
کرنے کے عادی ہیں۔ ہم نے انکوارٹری کر لی ہے۔ تم کسی چیز میں ملوث نہیں ہو۔ اس  
لیے میں نے تم کو اپنا سیکرٹری مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

یہ سن کر میرا نفس کچھ پھول سا گیا۔ نفس جتنا فربہ ہو، عقل اتنی ہی کمزور پڑ جاتی  
ہے اور وقت فیصلہ پر خود فرمی کا غبار چھا جاتا ہے۔ میرا بھی حشر ایسا ہی ہوا۔ دوسرے  
بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی اس غلط مہمی میں بھلا ہو گیا کہ نیا صدر جو نیا  
نظام لانا چاہتا ہے، شاید وہی ملک کے لیے سو مند ثابت ہو۔ اس وقت یہ بات میرے  
وہم و گمان میں بھی نہ آئی کہ یہ نظام ریت کا گھروندہ ہے، جو ایوب خاں کی صدارت  
ختم ہوتے ہی دھڑام سے گر جائے گا۔ جمورویت بڑی غیرت مند اور حاصل دہن ہے۔

اس کے اوپر سوکن کا سایہ بھی پڑ جائے تو یہ گھر بار جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔  
اس نے دور میں کام شروع کرتے ہی میرے دل میں یہ بات کھلکھلی کہ مارشل لاء نافذ  
ہونے کے بعد اب تک جتنے سرکاری اعلانات، قوانین اور ریگولیشن جاری ہوئے ہیں۔

ان میں صرف حکومت پاکستان کا حوالہ دیا ہے، حکومت اسلامی جمورویہ پاکستان کا کہیں  
ذکر نہیں آیا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید ڈرافٹنگ میں غلطی سے ایک آدھ بار یہ  
فروگذاشت ہو گئی ہو گی۔ لیکن جب ذرا تفصیل سے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ جس  
تواتر سے یہ فروگذاشت دہرائی جا رہی ہے۔ وہ سواؤ کم اور التزاماً زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

اس پر میں نے ایک مختصر سے نوٹ میں صدر ایوب کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو وزارت قانون اور مارشل لاء ہیڈ کوارٹر کی توجہ اس صورت حال کی طرف دلائی جائے اور ان کو ہدایت دی جائے کہ جاری شدہ تمام اعلانات اور قوانین کی صحیح کی جائے اور آئندہ کے لیے اس غلطی کو نہ دھرا یا جائے۔

صدر ایوب کا قاعده تھا کہ وہ فائلیں اور دوسرے لفڑات روز کے روز نپٹا کر میرے پاس واپس بھیج دیا کرتے تھے۔ لیکن معمول کے بر عکس یہ نوٹ کئی روز تک میرے پاس واپس نہ آیا۔ ۵ نومبر کی شام کو میں اپنے دفتر میں بیٹھا دیر تک کام کر رہا تھا۔ باہر ٹیرس پر صدر ایوب اپنے چند رفیقوں کے ساتھ کسی معاملے پر گمرا گرم بحث کر رہے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب سب لوگ چلے گئے تو صدر میرے نوٹ کا پچھہ ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آئے۔ وہ غیر معمول طور پر سنجیدہ تھے آتے ہی انہوں نے میرا نوٹ میرے حوالے کیا اور کہا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ڈرائفنگ میں کسی نے کوئی غلطی نہیں کی۔ بلکہ ہم نے سوچ سمجھ کر یہی طے کیا ہے کہ اسلامک روپیک آف پاکستان سے اسلامک کا لفظ نکال دیا جائے۔“ یہ فیصلہ ہو چکا ہے یا ابھی کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

President,s Order (Post proclamation) No. 1 of 1958.  
Laws (Continuance in Force), Order, 1958,

10th October, 1958

صدر ایوب نے کسی قدر غصے سے مجھے گھورا اور سخت لبجے میں کہا۔ ”ہاں، ہاں فیصلہ ہو گیا ہے۔ کل صبح پہلی چیز مجھے ڈرافٹ ملنا چاہیے۔ اس میں دیر نہ ہو۔“ اتنا کہہ کر وہ خدا حافظ کے بغیر تیز تیز قدم کرے سے نکل گئے۔ اگر مجھ میں ہمت ہوتی تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا اور انہیں روک کر پوچھتا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان سے اسلامی کا لفظ حذف کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں؟ لیکن اتنی ہمت مجھ میں نہ تھی اس لیے میں بھی دم دیائے چپ چاپ گھر واپس آگیا۔ بڑے سوچ بچار کے بعد صبح کے قریب میں نے پلیس ریلیز تو تیار نہ کیا بلکہ اس کی جگہ دو ڈھائی

صفحوں کا ایک نوٹ لکھا، جس کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کو اسلام سے فرار ممکن نہیں۔ اس ملک کی تاریخ پرانی لیکن جغرافیہ نیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریڈ کلف لائن صرف اس وجہ سے کچھی گئی تھی کہ ہم نے یہ خطہ ارض اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ اب اگر پاکستان سے اسلام کا نام الگ کر دیا گیا تو حد بندی کی یہ لائن معدوم ہو جائے گی۔ ہم پاکستانی صرف اس وجہ سے بنے کہ ہم مسلمان تھے۔ اگر افغانستان، ایران، مصر، عراق اور ترکی اسلام کو خیر باد کہہ دیں تو پھر بھی وہ افغانی، ایرانی، مصری، عراقي اور ترک ہی رہتے ہیں۔ لیکن ہم اسلام کے نام سے راہ فرار اختیار کریں تو پاکستان کا اپنا الگ کوئی وجود قائم نہیں رہتا۔ اس لیے اسلام ہماری طبع نازک کو پسند خاطر ہونہ ہو، اسلام ہماری طرز زندگی کو راس آئے یا نہ آئے، ذاتی طور پر ہم اسلام کی پابندی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، حقیقت بہرحال یہی ہے کہ اگر آخرت کے لیے نہیں تو اسی چند رونہ زندگی میں خود غرضی کے طور پر اپنے وطن کی سلامتی کے لیے ہمیں اسلام کا ڈھول اپنے گلے میں ڈال کر برسر عام ڈنکے کی چوٹ بجانا ہی پڑے گا، خواہ اس کی دھمک ہمارے حسن سماعت پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔ جمہوریہ پاکستان کے ساتھ اسلام کا لفظ لگانے سے اگر کسی کا ذہن قرون وسطی کی طرف جاتا ہے تو جانے دیں۔ دوسروں کی جہالت کی وجہ سے اپنے آپ کو احساس کمتری میں بنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ساتھ ہی میں نے ایک الگ کاغذ پر اپنا استغفاری بھی لکھ لیا کہ خرابی صحت کی بنا پر میں کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لیے میرا ستعفی منظور کر کے مجھے ریٹائر ہونے کی اجازت دی جائے۔

یہ دونوں چیزیں میں نے اپنی بیوی کو دکھائیں تو اس نے مجھے خوب شبابش دی اور غالباً میرا دل بڑھانے کو کہا۔ ”مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ انگریزی بھی اتنی اچھی لکھ لیتے ہیں!“

یہ بات سن کر میں جل گیا۔ ”محترمہ“ تم انگریزی زبان کے چکے میں پڑ گئی ہو۔ یہ

نہیں دیکھا کہ میں نے استغفاری بھی لکھ رکھا ہے۔ شاید مجھ سے اس کی نوبت بھی آ جائے۔ اس کے متعلق کیا خیال ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ظاہر ہے کہ اس معاملے میں اگر آپ کی بات رو ہو گئی تو استغفاری دے دینا چاہیے۔ یہ نوکری چلی گئی تو کچھ اور کام کر لینا۔ کسی کام کو جی نہ چاہے، تو آرام سے گھر بیٹھ کر لکھنا پڑھنا۔ آخر میں نے ڈاکٹری کی ڈگری کس روز کے لیے لی ہے۔“

ہماری شادی کو ابھی صرف ڈیڑھ برس ہوا تھا۔ میں دفتر جانے لگا تو عفت غالباً شرارت سے بولی۔ ”آپ صورت حال سے نپٹ لیں گے یا میں بھی ساتھ چلوں؟“

میں اپنے آفس وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ خیال تھا کہ صدر ایوب کے آنے سے پہلے اپنا نوٹ ٹائپ کروا رکھوں گا۔ لیکن وہاں دیکھا تو صدر صاحب پہلے ہی برآمدے میں ٹھل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کمرے میں آ گئے اور پوچھا۔ ”ڈرافٹ تیار ہے؟“

میں نے جواب دیا کہ تیار تو ہے لیکن ابھی ٹائپ نہیں ہوا۔ ”کوئی بات نہیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”ایسے ہی دکھاؤ۔“

وہ میرے سامنے والی کری پر بیٹھ گئے اور میرے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ پڑھنے لگے۔ چند سطریں پڑھ کر کچھ چونکے اور پھر از سر نو شروع سے پڑھنے لگے۔ جب ختم کر کچھ تو کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے ”Yes, Right You Are“ یہ فقرہ انہوں نے دوبار دھرا�ا اور پھر نوٹ ہاتھ میں لیے کمرے سے چلے گئے۔ اس کے بعد اس موضوع پر پھر کسی نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔

چند روز بعد میں کچھ فائلیں لے کر صدر ایوب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی ڈاک دیکھ رہے تھے۔ ایک خط پڑھ کر بولے۔ کچھ لوگ مجھے خط لکھتے ہیں، کچھ لوگ ملنے بھی آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا بدل گئی ہے۔ اب ماذر ان ازم اور اسلام اکٹھے نہیں چل سکتے۔ میں ان سے کہتا ہوں۔

”As کے بعد انہوں نے پے در پے“ Pakistan has no Escape from Islam.....

میرے نوٹ کے کئی اور فقرے بھی دہرائے..... ان میں یہ عجیب صلاحیت تھی کہ اگر کوئی بات واقعی ان کے دل میں گھر کر جاتی تھی تو وہ بڑی معمومیت سے اسے اپنا لیتے تھے۔

ایک روز وہ کہنے لگے کہ انہوں نے بچپن میں قرآن شریف ختم تو کیا ہے لیکن رسم۔ اس کے معانی کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اس لیے میں انہیں اردو کا کوئی آسان سا ترجمہ لا دوں۔ میں نے انہیں دو تین ساہہ ساہہ سے آسان مترجم قرآن شریف فراہم کر دیئے۔ ان کو انہوں نے بڑی محنت اور غور سے پڑھا۔ بنیادی عقائد، عبادات، نظام کائنات اور فضیل القرآن تو وہ آسانی سے سمجھ گئے لیکن زندگی کی کلیت اور مجموعیت کا احکام الٰہی کے ساتھ جو مربوط، مضبوط اور عملی رشتہ ہے وہ پوری طرح ان کے فہم و ادراک کی گرفت میں نہ آ سکا۔ کچھ عرصہ ان کے سر میں یہ سودا بھی سماں رہا کہ قرآن مجید کو عقائد، عبادات، اخلاقیات، قوانین، تمثیلات، فضیل وغیرہ کے عنوانات کے تحت بھی تدوین کر دینی چاہیے تاکہ ہر موضوع کے حوالہ جات تلاش کرنے میں آسانی ہو۔ اس خیال میں کچھ ایسے عناصر کی بہت افزائی کرتے رہتے تھے جو دین کو انضباطی پابندیوں سے آزاد کر کے اسے سل انگاریوں اور تن آسانیوں کے ساتھ میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جس طرح امتحان پاس کرنے کے لیے کتابوں کے خلاصے اور پاکٹ گائیڈ مقبول ہوتے ہیں، اسی طرح اسلام کا یہ نظر ثانی شدہ آسان رنگ بھی صدر ایوب کو بڑی آسانی سے متاثر کر دیتا تھا۔ لیکن عام طور پر یہ تاثر عارضی ہوتا تھا۔ کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک اچھے اور سیدھے سادے مسلمان تھے۔

۱۹۶۰ء میں جب وہ سعودی عرب کے سرکاری دورے پر جا رہے تھے تو عمرہ ادا کرنے کے لیے انہوں نے خاص طور پر تیاری کی۔ ان کی فرماںش پر میں نے انہیں مختلف دعاوں کے مجموعے دیئے، جن کا انہوں نے چند روز خوب مطالعہ کیا۔ جس روز روانگی کے لیے ہم ہوائی جہاز میں سوار ہوئے، انہوں نے دونوں مجموعے واپس کر دیئے، اور کہا۔ ”مجھے

اپنے مطلب کی چیز مل گئی ہے۔ اب نیا ہدلبی چوڑی دعائیں یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔“

میرے استفسار پر انہوں نے جیب سے کافر کا ایک پرنہ نکلا، جس پر ایک مختصر سی دعا اردو ترجمہ کے ساتھ نقل کی ہوئی تھی۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ یا اللہ مجھے بغیر حساب کتاب کے ہی بخش دے!

مکہ معظمہ میں ایک روز ان کے لیے خانہ کعبہ بھی کھولا گیا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو شاہی معلم نے کہا کہ چاروں طرف منہ کر کے دو دو رکعت نماز پڑھ لیں۔ یہ سنت پوری کرنے کے بعد صدر ایوب بڑے شاداں و فرحاں نظر آتے تھے۔ وہیں اندر کھڑے کھڑے انہوں نے مجھے بتایا کہ چاروں طرف سجدہ کر کے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی مانگی ہے کہ ہندوستان کے سامنے ہمارا سر خم نہ ہو۔ بیت اللہ شریف کے اندر مانگی ہوئی دعا کبھی ریگاں نہیں جاتی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ اس کا کھلا ثبوت ہے۔

مذینہ منورہ میں ہمیں روپہ رسول کے مجرہ مبارک کے اندر جانے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ اندر داخل ہوتے ہی صدر ایوب پر بیت اور رقت طاری ہو گئی۔ لمحہ بھر کے لیے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے روپہ اطہر کا غلاف تھام لیا اور ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ زندگی بھر میں نے انہیں صرف ایک بار اس طرح اشک بار دیکھا ہے۔

صدارت کا کام جزل ایوب خاں نے بڑی محنت، لگن، باقاعدگی اور سلیقے سے شروع کیا۔ سب فائلیں وہ غور سے پڑھتے تھے اور ان پر احکامات بھی اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ روز کی فائلیں روز نہ پتا دیتے تھے۔ کچھ دن میں، کچھ رات کے وقت۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی فائل اگلے روز کے لیے اٹھا رکھی ہو۔ ہر روز اپنی ڈاک بھی پوری دیکھتے تھے۔ کچھ خطوط خود جواب دینے کے لیے منتخب کر لیتے تھے، باقی میرے حوالے کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں صدر کے نام جتنے خط آتے تھے ان سب کے جواب ضرور دیئے جاتے تھے۔

ایک رو پنجاب کے کسی گاؤں سے ایک دل جلے کا خط آیا، جس میں بڑی سخت زبان

استعمال کی ہوئی تھی اور کچھ گالی گلوچ بھی تھی۔ اس شخص کا کوئی چھوٹا سا معاملہ ملکہ مال میں انکا ہوا تھا اور کئی بار رشوت ادا کرنے کے بعد بھی سمجھنے میں نہ آتا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کے ساتھ انصاف نہ ہوا تو وہ ساری عمر صدر ایوب کو بد دعائیں دے دے کر مرے گ۔ میرے عملے نے بہت کہا کہ اس قسم کا خط صدر کو نہ دکھایا جائے کیونکہ اسے پڑھ کر وہ خواہ مخواہ غصے میں آئیں گے یا پریشان ہوں گے۔ لیکن میں نے اس خط کو ان کی خدمت میں اس تجویز کے ساتھ پیش کیا کہ اس کا جوب خود صدر مملکت دیں۔ لاہور کے اگلے دورے میں اس شخص کو گورنر ہاؤس میں طلب کر کے اس کی بات سنی اور اس کا معاملہ گورنر کے سپرد کر کے جب تک وہ انجام تک پہنچ جائے اس کا چیچھا نہ چھوڑیں۔ یہ تجویز صدر ایوب کو پسند آگئی اور اس پر عمل کر کے انہوں نے وقت فوقة مشرقی اور مغربی پاکستان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے لوگوں کے چھوٹے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد دی۔

صدر ایوب کا گھریلو ماحول بھی بڑا سادہ اور خوشگوار تھا۔ بیگم ایوب خاموش طبع، مرنجان مرنج اور پروقار خاتون تھیں۔ ملک کی خاتون اول کے طور پر انہوں نے کبھی ذاتی پلیشی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے بیٹوں کے لیے تو بڑی کمزور ماں ثابت ہوئیں کیونکہ وہ ان میں سے بعض کی خطا کاریوں اور ناپسندیدہ حرکات پر بڑی محنت سے پر وہ ذاتی رہتی تھیں۔ لیکن بیٹیوں کی تربیت پر ان کا اثر بے حد خوشگوار تھا۔ صدر ایوب کی صاجززادیاں حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے ملا مال تھیں اور ان کے کردار میں حیاداری اور خوش اخلاقی کا بڑا گھر امتزاج تھا۔ گھر کے اندر بھی وہ کبھی اپنے والد کے سامنے ننگے سر نظر نہ آتی تھیں۔ ان میں سے کسی نے میری بیوی کو بتایا تھا کہ کبھی کبھی وہ دوپٹے کو بالوں کے ساتھ پنول کے ذریعہ ٹانک کر رکھتی ہے تاکہ بے خیالی میں سرک کر سر سے اترنے جائے۔

صدر ایوب کی سب سے چھوٹی صاجززادی شکلیہ کی شادی ہوئی تو ساوگی میں یہ تقریب بھی

اپنی مثال آپ تھی۔ راولپنڈی سے ان کے ساتھ پرنسل شاف کے فقط ہم چار پانچ آدمی ان کے گاؤں رسخانہ گئے۔ ان کے آبائی مکان کے ایک کھلے احاطے میں درختوں کی چھاؤں میں چند کریاں اور کچھ چاپا یاں بھی ہوئی تھیں۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے برات کا استقبال کیا۔ نکاح کے بعد کھانا ہوا اور انتہائی سادگی کے ساتھ رخصتی ہو گئی۔ اس تقریب میں صرف گاؤں کے کچھ احباب اور برادری کے لوگ شریک ہوئے۔ نہ باجا گاجا۔ نہ ڈھول دھمکا۔ نہ تھنے تھائف۔ جس سادگی سے شادی کی تقریب ہوئی تھی، اسی سادگی سے ہم نے اخبار میں ایک چھوٹی سی دو سطری خبر چھپوا دی۔ لی۔ وہی کا دور تو ابھی نہ آیا تھا، لیکن ریڈیو پاکستان کے کسی بلیشن میں اتنی سی خبر بھی نہ آئی۔ یہ دیکھ کر چند وزیر، افسر اور پیشہ ور خوشامدی صدر ایوب کے سر ہو گئے کہ اس سادہ تقریب کی خاطر خواہ پبلیشنی نہ ہونے کی وجہ سے ان کا "ایج" بڑھانے کا ایک سنری موقعہ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ یہ بات ان کے کافنوں میں بار بار اتنی شدت سے بھری گئی کہ رفتہ رفتہ وہ بھی تذبذب کے عالم میں بنتا ہو گئے۔ ایک روز میں کسی کام سے ان کے پاس گیا، تو ایک ایسا ہی خوشامدی ٹولہ انہیں اپنے زندگی میں لیے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لوگ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے بھی پڑ گئے کہ صدر مملکت کے "ایج" کو فروغ دینے کا ایسا اچھا موقعہ کیوں ضائع کر دیا۔ میں خاموشی سے کھڑا ہوا ان کی پنج پنج بک بک سنتا رہا۔ جب ان کا غونما بند ہوا، تو میں نے اپنے الفاظ کو قلفی کی طرح برف میں جما کر بڑے ادب سے کہا۔ "اگر اس موقع پر آپ صاحبان بھی مدعو ہوتے تو آپ کو بھی ضرور محسوس ہوتا کہ اس تقریب کی سادگی میں بڑا خلوص تھا۔ اب اسے اشتہاری شفت میں تبدیل کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں بلکہ خلوص میں بیا کی کھوٹ ملانا بے برکتی کا باعث بن جاتا ہے۔"

میری بات تو غالباً کسی کو پسند نہ آئی۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس موضوع پر مزید چول چول بند ہو گئی۔

دفتر کے اندر دفتر کے باہر صدر ایوب کے سر پر بھیشہ کام کی دھن سوار رہتی تھی۔ صدارت کا عہدہ سنپھالنے کے بعد مجھے ان کو کافی عرصہ تک کسی قدر قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے انیں کبھی ایسی باتوں میں نیا وہ وقت ضائع کرتے نہیں پایا جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح کام کے کسی نہ کسی شعبے سے نہ ہو۔ ان کے پاس بھیشہ ایک نوٹ بک رہتی تھی، جس میں وہ تاریخ ڈال کر ہر وہ بات درج کرتے جاتے تھے، جو اس روز ان کو خود سوجھتی تھی، یا کسی سے سنتے تھے، یا کہیں پڑھ لیتے تھے۔ ہر اندراج کا نمبر شمار بھی لکھا جاتا تھا، جو نوٹ بک کے شروع سے آخر تک مسلسل چلتا تھا۔ اس طرح درج شدہ باتوں کو وہ کابینہ کے اجلاس، یا گورنروں یا وزیروں یا افسروں کے ساتھ اٹھاتے تھے اور جب ان پر عملدرآمد ہو جاتا تھا تو اس پر نشان لگا دیتے تھے۔ شروع کے دو برس ان کی جو نوٹ بک ختم ہوتی تھی، اسے میں اپنے پاس لے کر رکھ لیتا تھا۔ میرے پاس اس قسم کی چار کاپیاں محفوظ ہیں۔ ان سب کو ملا کر ان کے اندراجات کی تعداد ۱۲۵ ہے۔ یہ سطور لکھنے کے لیے میں نے ان کا کسی قدر غور سے جائزہ لیا، تو ملکی امور کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے بے شمار معاملات پر ان کا تفصیلی عبور دیکھ کر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہا۔ گورنروں کی تقریباً، وزیروں کے دورے، سفیروں سے گفتگو، امریکن ایڈ، نمایاں قابلیت کے چھوٹے بڑے افسروں کی نشاندہی، کسی جگہ کھاد کی سپلائی، کہیں پانی کی کمی، کسی کی پیش کا معاملہ، سیم اور تھور کے مسائل، افریقہ میں اسلام کی تبلیغ، ریڈیو سے درس قرآن، بین الاقوامی معاملات..... ایسے ایسے بے شمار موضوعات ہیں جن سے یہ چاروں کاپیاں بھری پڑی ہیں۔

ہو حلقة یاراں تو بریشم کی طرح نرم  
ہو رزم حق و باطل تو فولاد ہے مومن

## • صدر ایوب، اصلاحاتے اور بیور و کریں

عنان حکومت سنبھالتے ہی صدر ایوب کے سر پر اصلاحات کا بھوت بڑی شدت سے سوار ہے گیا۔ شروع ہی سے انہوں نے اپنے ذہن پر یہ مفروضہ طاری کر لیا تھا کہ پاکستان کے نظام زندگی اور نظام حکومت کا ہر شعبہ بری طرح بگذا ہوا ہے، اور ان کی اصلاح کرنا ان کا فرض منصی ہے۔ دل ہی دل میں ہے اپنے آپ کو ایک انقلابی ریفارمر سمجھتے تھے، لیکن درحقیقت ان کی طبیعت کی افتاد انقلاب پسند تھی نہ انقلاب انگیز تھی۔ ان کے کردار میں میانہ روی، اعتدال پسندی، مصلحت انسانی اور عافیت طلبی کے عناصر اس قدر غالب تھے کہ کسی شعبے میں بھی انقلاب کا کوئی تقاضا پورا کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ Status quo کے آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحات کے نام پر یہ معمولی سی چھان پٹک اور جھاڑ پونچھ کے علاوہ کوئی دور رس کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔ جیسے جیسے ان کے زمانہ اقتدار کی رسی دراز ہوتی گئی۔ ویسے ویسے ان میں احتیاط پسندی کی احتیاج شدت سے بڑھتی گئی۔ صاحب اقتدار اگر اپنی ذات کے گرد خود حفاظتی کا حصار کھینچ کر بیٹھ جائے، تو اس کی اختراعی، اجتماعی اور تجدیدی قوت سلب ہو کر اسے لکیر کا فقیر بنا دیتی ہے۔ خود سلامتی کا نیج کوئیاتی ٹھہراو میں جڑ پکڑتا ہے۔ اور تغیر و تبدل کا زیر و بم اس کی نشوونما کو راس نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحات کا ابتدائی جوش و خروش لمبیرا کے بخار کی طرح بڑی تیزی سے چڑھا اور رفتہ رفتہ کمیں بالکل اتر گیا، کمیں مزمن ہو کر رگوں پھوؤں میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ جب کبھی مارشل لاء لگتا ہے۔ یہ خوابیدہ جراشیم نے سرے سے جوش مارنے لگتے ہیں اور اصلاحات کا شوق باری کے بخار کی طرح کچھ دیر چڑھتا اترتا رہتا ہے اور پھر حسب دستور کمنہ لمبیرا کی مانند اگلے موسم تک کے لیے افقے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

صدر ایوب کا رجحان اصلاحات کی طرف مائل دیکھ کر ہماری فرض شناس نوکر شاہی نے بھی اپنی روایتی نفس شناہی کا ثبوت دیا اور یوروکسی کے اعلیٰ طبقہ نے آناً فاناً اصلاحات کو ہی اپنا اوڑھنا پچھونا بنا لیا۔ اب جتاب صدر جس شعبے کی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے تھے اس شعبے کے نئے اور پرانے افسر اور سرکاری اور نیم سرکاری ماہرین لبیک لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے تھے اور انہیں لوگوں میں سے کچھ حضرات کا انتخاب کر کے ایک کمیشن یا کمیٹی قائم کر دی جاتی تھی۔ عام طور پر یہ لوگ اپنے اپنے ملکمانہ تجربوں، تعصبات، روایات، مفادات اور محرومیوں کی دلمل میں اس قدر دھنسے ہوئے ہوتے تھے کہ ان کا ذہن کسی نئی روشن پر سوچنے سے سراسر قاصر تھا۔ سال دو سال کی محنت کے بعد ہر کمیشن یا کمیٹی ایک بھاری بھرکم اور ضخیم رپورٹ مرتب کرتی تھی۔ اس رپورٹ کا ایک نسخہ پیش کشی سنری حلشیرے والی خوبصورت مراکولیدر کی جلد میں سجا کر صدر ایوب کو ایک خصوصی تقریب میں بڑے طمطراق سے پیش کیا جاتا تھا۔ دونوں جانب سے تعریف و توصیف، خیرگالی اور خوش کلامی کا بڑی فیاضی سے عوض معاوضہ ہوتا تھا اور پھر یہ رپورٹ سیدھی اپنے ہی ملکے میں واپس چلی جاتی تھی، تاکہ جن جن اصلاحات کی سفارش کی گئی ہے، ان پر مزید عمل درآمد شروع کیا جائے۔ یہ عمل اسی طرح کا تھا جیسے بلی کو دودھ کی رکھوائی پر بٹھا دیا جائے۔

اصلاحات کی ناکامی ہو یا کوئی دوسرا منصوبہ ثوف کر گزر جائے، اس کی ذمہ داری ہمیشہ یوروکسی ہی کے سر تھوپی جاتی ہے۔ سیاستدان اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور محرومیوں کا الزام یوروکسی ہی پر لگاتے ہیں۔ مارشل لاء نازل ہو تو سارے بگاڑ کی وجہ یوروکسی کو ہی گردانا جاتا ہے۔ کبھی نوکر شاہی کی تظیر کے لیے سکرینگ کا عمل ظہور میں آتا ہے۔ کبھی تھوک کے بھاؤ ہزاروں ملازم بغیر کسی انکوارری کے بر طرف کر دیئے جاتے ہیں۔ کبھی یوروکسی کو راہ راست پر لانے والے افراد چھوٹے بڑے سرکاری ملازموں کی پتلونیں اتار کر انہیں درختوں پر سر کے بل ناگز دینے کی دھمکیاں سناتے ہیں۔ ایسے

ماحول میں ہر بار نئے حکمران اپنے آپ کو اللہ کے مقرب فرشتے سمجھتے ہیں، اور نوکر شاہی کے ہر فرد کو ابلیس کا ساتھی قرار دیا جاتا ہے۔

یہ سارے ہٹکنڈے سرکاری ملائیشیا پر خوف و ہراس کی دھونس جمانے اور عوام پر اپنی برتری کا رعب گانٹھنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں ہر ملک کی یوروکریسی مملکت کا نظم و نسق چلانے میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یوروکریسی سول حکومت کی ہوتی ہے، کبھی فوج کی، کبھی سیاسی جماعتوں کی، کبھی کسی مخلوط محاذ کی، لیکن ہر صورت میں یوروکریسی سے کوئی نظام سلطنت را فرار اختیار کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ یوروکریسی کا نعم البدل بھی یوروکریسی ہی ہے۔ جمیوری نظام ہو یا آمریت کا دور دوہ، یوروکریسی دونوں کے حق میں یکساں وقاداری سے کام کرتی ہے۔ یہی اس کا بنیادی فرض اور عملی تربیت کا شمرہ ہے۔ نوکر شاہی کے فرانپس میں حکومتوں یا نظام حکومت کو ادلنا بدلا شامل نہیں ہے، بلکہ ان کی نافذ کی ہوئی پالیسیوں پر حتی الوع ویانتداری سے عمل درآمد کرنا ہے۔ حکومت یا نظام حکومت کو بدلا سیاستدانوں کا حق ہے۔ اگر وہ اپنی بد نظمی یا بے بضاعتی یا انتشار کی وجہ سے یہ حق استعمال کرنے سے قاصر رہیں تو مسلح افواج خود بخود میدان میں اتر آتی ہیں۔ حکومت یا نظام حکومت بدلنے کے اس عمل کو عام طور پر "انقلاب" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ سراسر غلط ہی نہیں، بلکہ لفظ "انقلاب" کی توہین بھی ہے۔ کیونکہ انقلاب ہمیشہ عوام الناس ہی لاتے ہیں۔ مثلاً تحریک پاکستان ایک عوای انتساب تھا۔ اس کی کامیابی کے بعد وطن عزیز میں آج تک اور کوئی انقلاب بربا نہیں ہوا۔ صرف حکومتیں تبدیل ہوئی ہیں۔ کبھی سول، کبھی فوجی۔

یوروکریسی کو پالنا پوشا فقط سول حکومتوں کی اجازہ داری نہیں، بلکہ ایک چیز در چیز عالمگیر دستور کی طرح یہ زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہے۔ سول یوروکریسی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مسلح افواج میں ان کی اپنی یوروکریسی چلتی ہے۔ عدیلہ کے نظام میں اس

کی یوروکسی کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ سیاستدانوں کی جماعتوں میں ان کی اپنی یوروکسی راجح ہے۔ نیم سرکاری اداروں، بینکوں، بڑی صنعتوں، تجارتی کمپنیوں اور دیگر میمنش گروپوں میں بھی ان سب کی اپنی اپنی مخصوص یوروکسی کا راج ہے۔ سول یوروکسی کے علاوہ باقی سب یوروکریسیاں پر وہ نشین بی بیاں ہیں۔ اس لیے ان کا نام لینے کا رواج نہیں، البتہ سول یوروکسی کی نہ صرف تعداد بہت زیاد ہے، بلکہ اس کا رابطہ عوام الناس سے بھی ہمہ وقت براہ راست رہتا ہے۔ باہمی خیر سگالی کا جذبہ کار فرما ہو، تو اس رابطہ سے خوش حالی اور امن آشنا اور ترقی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ نکراوہ کی صورت میں چقمانی کی رگڑ کی طرح اسی رابطہ سے حسد اور بعض اور کشاکشی کی چنگا بیاں چھوٹی ہیں، رشوت خوری بد دیانتی، بد اخلاقی، خویش پروری، اقربانو ازی اور نا انصافی کے جرائم کا ارتکاب ساری یوروکسی تو نہیں کرتی۔ لیکن لکن کیونکہ اس کی اجتماعی پیشانی پر یکساں لگ جاتا ہے۔ سول یوروکسی کے جملہ خصائص پر تبصرہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، کیونکہ اس میں ہر رنگ ڈھنگ، ہر چلن اور ہر انداز کے افراد پھلتے پھولتے ہیں، لیکن ایک خصوصیت جوان میں مشترک ہے یہ ہے کہ چھٹپتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

یوروکسی کا نشہ ایسا نہیں جسے ترشی اتار دے۔ خاص طور پر جس یوروکسی پر وی آئی پی کے تین حرفاً پڑ جائیں، وہ دھمکی کے کتے کی طرح نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ یہ تین حرفاً صرف سول یوروکسی کی ذات ہی نہیں بلکہ بگاڑتے، بلکہ مسلح افواج، عدیہ اور سیاسی یوروکریسیوں پر بھی یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس شخص کا قدم ایک بار وی آئی پی کی شاہراہ پر پڑ گیا، بعد میں وہ کسی عام رہگذر پر گامزن ہونے سے بڑی حد تک ناکارہ ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر ہوائی اڈوں کے VIP Lounge دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوڑھیوں کے لیے ایک الگ احاطہ قائم کیا گیا ہے جس میں وہ باقی مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ رکھے جا سکیں۔ سربراہان مملکت اور غیر ملکی اکابرین کے لیے وی آئی پی لاونج استھان کرنا تو واجب اور مناسب ہے۔ لیکن اپنے وطن کے وزیروں،

سفیروں اور اعلیٰ افسروں کو اپنے ہی ہم وطن عوام سے کاٹ کر چھوٹ چھات کے مرتضوں کی طرح خصوصی لاونج میں محبوس کرنا باعث شرم ہے۔ اگر یہ حضرت بھی عام لاونجوں سے گزریں تو لازم نہیں کہ عوام الناس کے دوش بدوسش چل کر ان کی ناک کٹ جائے گی۔ البتہ وی آئی پی کا لبادہ اوڑھ کر ان کے داغ کا ٹیڑھا ہو جانا نیاہ قرن قیاس ہے۔ وی آئی پی کو برہمن اور عوام کو شودر کا درجہ دینا اسلامی اخوت اور مساوات کے تقاضوں کی تذلیل کے مترادف ہے۔

میں نے اپنی تیس سالہ ملازمت کے دوران وی آئی پی لاونج فقط چند بار استعمال کی اہے۔ وہ بھی کبھی، اپنے پی۔ اے کا دل رکھنے کے لیے اور کبھی اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کے رعب میں آ کر اسی طرح کے دباو میں آ کر ایک بار میں کراچی کے وی آئی پی لاونج میں جا بیٹھا۔ لیکن لاونج کے پروٹوکول افسر کو میری ذات میں وی آئی پی کی خصوصیت نظر نہ آئی۔ وہ جھپٹ کر میرے پاس آیا، اور رنگ و شہر سے لبریز لمحے میں پوچھنے لگا۔

”کیا آپ وی آئی پی ہیں؟“

میں نے شرانتا کہا، ”وہ کیا بلا ہے؟“

”اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر میرے علم میں اضافہ کیا۔“

”جی نہیں، میں تو اپنے کو ایسا نہیں سمجھتا۔“ میں نے اقبال جرم کیا۔

”پھر آپ یہاں کیوں آ گئے؟ عوای لاونج میں تشریف لے جائیں۔“ افسر نے حکم دیا۔

میں تو تعیل حکم کے لیے تیار ہو گیا، لیکن عین اس وقت میرا پی۔ اے آڑے آگیا۔ معلوم نہیں کہ اس نے پروٹوکول افسر سے کیا بات چیت کی کہ وہ بیچاہہ محبوب سا ہو کر میرے پاس آیا، اور بولا۔ ”سر،“ میں معافی کا خواستگار ہوں۔ آپ نے اپنی اصلاحیت چھپا کر مجھے بیدار شرمندہ کیا۔“

میں نے جواب دیا۔ ”بھائی کون وی آئی پی اور کہاں کا وی آئی پی؟ شرمندگی تو ان

حضرات کو لاحق ہونا چاہیے، جو اپنے آپ کو سچ مجھ وی آئی پی سمجھ بیٹھتے ہیں۔“  
یہ سن کر نوجوان افسر مسکرا�ا، اور بولا۔ ”جناب آپ کس دنیا کی بات کر رہے ہیں۔  
اب تو وی آئی پی بھی کسی شار قطار میں نہیں رہے، کیونگہ انکے سر پر وی وی آئی  
پی کا درجہ بھی مسلط ہو گیا ہے!

**Very Very Important Person**  
کون کہتا ہے کہ یوروکسی کے سائے تلے وطن عزیز تیز رفتاری سے روز افزوں ترقی کی  
راہ پر گامزن نہیں؟  
اپنی اصلاحات کو نافذ کرنے کے لیے صدر ایوب نے جو کمیشن اور کمیٹیاں قائم کیں، ان  
کی تفصیل درج ذیل ہے۔

## ○ اصلاحی کمیشنوں کی فہرست

- (۱) زرعی اصلاحات کمیشن
- (۲) جماز رانی کمیشن
- (۳) اصلاح قانون کمیشن
- (۴) انتظامیہ کی تنظیم نو کے لیے کمیٹی
- (۵) کمیشن برائے قوی تعلیم
- (۶) صدر مقام کے محل و قوع کی کمیٹی
- (۷) تحقیقاتی کمیشن برائے قرضہ جات
- (۸) غذايی و زرعی کمیشن
- (۹) سائنس کمیشن
- (۱۰) تنخواہ و ملازمت کمیشن
- (۱۱) کمپنی قانون کمیشن

- (۱۲) طبی اصلاحات کمیشن
- (۱۳) سکھیل، ثقافت اور نژاد نو کی کمیٹیاں
- (۱۴) پولیس کمیشن
- (۱۵) آئین کمیشن
- (۱۶) قیتوں کی تعین کا کمیشن
- (۱۷) فلمی معلوماتی کمیشن
- (۱۸) فالتو افرادی طاقت کمیشن
- (۱۹) سماجی برایوں کا کمیشن
- (۲۰) برلنی طاقت کا کمیشن
- (۲۱) مالیاتی کمیشن
- (۲۲) قرضہ جاتی کمیشن
- (۲۳) رائے دی کی کمیشن
- (۲۴) قومی آمنی کمیشن
- (۲۵) قومی مالیات کمیشن
- (۲۶) اقلیتوں کا کمیشن
- (۲۷) نشریاتی کمیشن
- (۲۸) پولیس کمیشن (یہ بہت پہلے قائم ہو چکا تھا لیکن اس کی رپورٹ مئی ۱۹۵۹ء میں موصول ہوئی۔)
- (۲۹) شکر کمیشن (یہ بھی پہلے قائم ہو چکا تھا، لیکن رپورٹ اگست ۱۹۵۹ء میں موصول ہوئی)
- (۳۰) شادی و عائیلی قانون کمیشن۔
- (یہ کمیشن ۱۹۵۳ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کی رپورٹ بھی ۱۹۵۶ء میں موصول ہو چکی تھی لیکن اس پر عمل درآمد مارچ ۱۹۶۱ء میں ہوا)

## • صدر ایوبؑ اور ادیبؑ

جب مارشل لاءِ نافذ ہوا، تو مارشل لاءِ لگتے ہی ایک روز صبح سوریے قرہ العین حیدر میرے ہاں آئی۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ اداس، آنکھیں پریشان ..... آتے ہی بولی، ”اب کیا ہو گا؟“

URDU4U.COM

”کس بات کا کیا ہو گا؟“ میں نے وضاحت طلب کی۔

”میرا مطلب ہے اب ادبی چانڈو خانوں میں بیٹھ کر (Loose Talk) کرنا بھی جرم ٹھرا۔ ہاں“ میں نے کہا۔ ”گپ شپ بڑی آسانی سے افواہ سازی کے زمرے میں آ کر گردن زندگی قرار دی جا سکتی ہے۔“

”تو گویا بھونکنے پر بھی پابندی عائد ہے؟“ یعنی نے بڑے کرب سے پوچھا۔

میں نے مارشل لاءِ کے ضابطے کے تحت بھونکنے کے خطرات و خدشات کی کچھ وضاحت کی، تو یعنی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ آنسو چھپانے کے لیے اس نے مسکرانے کی کوشش کی، اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کسی قدر لا پرواہی سے کہا۔ ”اے بھئی، روز روز کون بھونکنا چاہتا ہے۔ لیکن بھونکنے کی آزادی کا احساس بھی تو ایک عجیب نعمت ہے۔“

میرا انداز ہے کہ قرہ العین حیدر کے تحت الشعور نے اس روز اس لمحے پاکستان سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کوئی باغیانہ خیالات کی لڑکی نہ تھی اور نہ ہی اس کے قلم کی روشنائی میں تخریب پسندی، فاشی، تلخی اور بے راہ روی کی کالک تھی۔ ”میرے بھی صنم خانے“ کی مصنفوہ زندگی کی چلباہلوں، بلکی چھلکی رنگینیوں، رعنائیوں، فلریشنوں، ثقافتی تصادموں، سماجی بوکھلاہلوں اور دل اور دماغ کی فسوں کاریوں میں کچھ حقیقی، کچھ افسانوی، کچھ رومانوی رنگ بھرنے کی ملکہ تھی، لیکن سنر شپ کے تخیل ہی سے اس کو بڑا شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ کچھ عجیب نہیں، اسی جھٹکے کے رد عمل نے اس کے قلم کی

بائگ "آگ کا دیبا" کی طرف موڑ دی ہو۔

اس کے چند ہفتوں بعد ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ اچانک قرہ العین حیدر، جمیل الدین عالی، غلام عباس، ابن الحسن، ابن سعید اور عباس احمد عباسی تشریف لے آئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا آج کل ہر محفل میں گفتگو کا سخ مارشل لاء کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ادبیوں میں بھی اس موضوع پر مختلف النوع خیال آرائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چند دوستوں کی رائے ہے کہ اب تک ہمارے ملک میں ادبیوں کی فلاج و بہود کے لیے نہ کسی نے سوچا ہے نہ کبھی کچھ کیا ہے۔ آج کل جب کہ یہ فوجی حکومت زندگی کے ہر شعبے میں تطییر و تعمیر، ترقی و بہود کے نت نئے اعلان کرتی جا رہی ہے، تو موقع ہے کہ اس بات کو آزا دیکھیں کہ حکومت کے بلند بانگ دعوؤں میں ادبیوں کی ویلفنیر کے لیے بھی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟ انہوں نے مزید بتایا کہ بپائے اردو کی موجودگی میں بھی یہ تذکرہ آچکا ہے اور وہ بھی اس قسم کی کوشش کر دیکھنے کے حق میں مائل نظر آتے ہیں۔

جمیل الدین عالی نے فرمایا کہ آج ہم لوگ یہاں اس سلسلے میں آپ کے ساتھ مشوہ کرنے آئے ہیں۔

اس بات پر مجھے کچھ نہیں آئی۔ یہ حضرات جو میرے سامنے بیٹھے تھے۔ علم و ادب کی دنیا میں اپنا اپنا نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے سامنے میری کوئی خاص حیثیت نہ تھی کہ وہ میرے پاس کسی بات میں مشوہ کرنے آئیں۔ ظاہر ہے کہ وہ میرے پاس صرف یہ ثوہ لگانے آئے تھے کہ اس قسم کی تجویز پر مارشل لاء کی حکومت کا رو عمل کیا ہو گا۔ میرے خیال میں یہ سعی حاصل تھی۔ کیونکہ نئے فوجی حکمران میرے لیے بھی اسی قدر اچبی تھے۔ جس قدر کہ ان لوگوں کے لیے میرے دل میں بھی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ نہ معلوم مارشل لاء کی پٹاری سے کس وقت کوئی ایسا ضابطہ برآمد ہو جائے، جو ادب اور ادب کی آزادی کو سنر شپ کی زنجیروں میں بری طرح

جز کر رکھ دے اس نامعلوم خدشے کے پیش نظر یہ بات میرے دل کو گلی کہ اگر ادبیوں کی برادری کسی طرح منظم ہو سکے، تو ممکن ہے کہ یہ اس کی خود حفاظتی کے لیے ایک موثر ڈھال ثابت ہو سکے۔ اس کے علاوہ اگر حکومت کسی وقت واقعی علم و ادب کے شعبوں میں فلاح و بہبود کے کسی منصوبے کا ڈول ڈالے، تو ادبیوں کی ایک اجتماعی تنظیم اس کی وصول یا بی اور پیش رفت کے لیے پہلے ہی سے عالم وجود میں موجود ہو۔ کسی قدر بحث بحثی کے بعد بات اس پر ختم ہوئی کہ سب سے پہلے پاکستان بھر کے ادبیوں کی ایک کنوشن منعقد کی جائے، اور اس میں سب کی متفقہ رائے سے اس سلسلہ میں کوئی اگلا قدم اٹھایا جائے۔

چند روز بعد یہی حضرات دویاہ تشریف لائے، اور اپنے ساتھ ایک اعلان کا مسودہ بھی لائے جو انہوں نے ادبیوں کی کنوشن بلانے کے متعلق تیار کر رکھا تھا۔ یہ اعلان ۳ دسمبر ۱۹۵۸ء کو آٹھ کنویزز کے دستخطوں سے جاری کیا گیا۔ دستخط کرنے والوں میں میرے علاوہ ابن الحسن، ابن سعید، جمیل الدین عالی، ضمیر الدین احمد، عباس احمد عباسی، غلام عباس اور قره العین حیدر شام تھے۔ کنوشن بلانے کا ابتدائی کام مبلغ ۱۸۰ روپے کی خطیر رقم سے شروع ہوا، جو آٹھ کنویزوں نے میں روپیہ فی کس چندہ دے کر جمع کی تھی۔ ان کے علاوہ میں روپیہ کا چندہ شاہد احمد دلبوی نے ڈالا تھا، جو کنوشن کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر مقرر کئے گئے تھے۔

اعلان کا شائع ہونا گواہ سرمنڈاتے ہی اویے پڑنے کے متراوف تھا۔ کچھ ادبیوں کو گلہ تھا کہ یہ آٹھ افراد خود بخود ہی کیوں کنوشن بلانے کے خدائی فوجدار بن بیٹھے ہیں؟ کسی کو شہہ تھا کہ فوجی حکومت کے اشارے پر ایک نئے مافیا نے سر اٹھایا ہے تاکہ وہ دانشوری کے سب اندھوں کو ایک نوکری میں جمع کر کے مارشل لاء کی جھوپی میں ڈال دے جن شکوک و شہمات کو سب سے بڑی تقویت اس وجہ سے ملتی تھی کہ میں اس زمانے میں صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایئر فورسز کا سیکرٹری بھی تھا۔ چنانچہ ۳ دسمبر

کے اعلان میں میرا نام کچھ اس طرح لکھتا تھا، جس طرح آئینہ خانے میں ایک بچرا ہوا سائنس آگھتا ہے۔ میرے لیے بڑا آسان تھا کہ ان شکوک کے ازالہ کے لیے میں اس سارے کاریوار سے دستبردار ہو کے الگ ہو جاتا، لیکن اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر میں نے نہایت ایمان داری سے یہی سوچا کہ اتفاق سے آج کل میں جس سرکاری عمدے پر معین ہوں، تو ادبیوں کی تنظیم کے سلسلے میں اگر اس کا اثر و رسوخ کسی طرح کام میں آسکتا ہے، تو ضرور کام میں لانا چاہیے۔ اب تقریباً ۲۳ برس کے بعد پچھے کی طرف دیکھتا ہوں، تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔ ہر زمانے اور ماحول کے نشیب و فراز میں میں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی جو تھوڑی بہت خدمت کی ہے، اس پر مجھے ہمیشہ فخر رہے گا۔ خدمت گزاری کے اس جذبہ میں کسی وقت بھی کوئی ایسی مقصدیت شامل نہیں تھی جو ادب اور ادبی کی شرافت اور شان کے منافی ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ کچھ لوگوں کے دل میں غلط فہمیاں پہلے بھی موجود بھیں اور غالباً اب تک موجود ہیں۔ خدا جانے غلط فہمیوں کی یہ دھن کبھی دور بھی ہو گی یا نہیں۔ میری صفائی میں صرف گلڈ کا کھلا ریکارڈ ہے جو سب کے سامنے موجود ہے۔ اس کے علاوہ میرا ضمیر ہے جو میرے اور میرے اللہ کے سامنے ہے۔ ان دونوں کے پیش نظر مجھے ہرگز کوئی شرمندگی لاحق نہیں ہے۔

۲ دسمبر کے اعلان کے بعد شاہد احمد دلوی، جمیل الدین عالی اور عباس احمد عباسی اپنے چند دوسرے رفقاء کے ساتھ کونشن کی تیاریوں میں اس طرف مصروف ہو گئے۔ جو انہی کا حصہ تھا۔ خاص طور پر جمیل الدین عالی کی لگن، انٹک مخت اور نہایت اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیتوں سے ہم سب انتہائی متاثر اور مرعوب ہوئے۔ ان کی دن رات کی لگاتار کوشش اور جدوجہد سے آخر ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو کل پاکستان رائٹرز کونشن کراچی میں منعقد ہوئی۔

کونشن میں ۲۱۲ ادبی شریک ہوئے جن میں ۶۰ مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ ملک بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہر علاقے اور ہر زبان کے ادبیوں کی اتنی تعداد ایک پلیٹ

فارم پر جمع ہوئی تھی۔ ”ہچھوا دیگرے نیست“ پر یقین رکھنے والے احساس، جذباتی، جوشیلے، بے چین اور زودرنج افراد کا اتنا بڑا اجتماع طرح طرح کے تناو، کھچاؤ، کشاکشی اور باہمی شکر رنجیوں سے خالی نہ تھا، لیکن مجموعی طور پر سب مندوین نے کونشن کی کارروائی میں بھرپور حصہ رکا اتفاق رائے سے پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد ڈالی دی۔ کونشن کا کام جن خطوط پر آگے بڑھا، وہ کچھ اس طرح تھے:

۲۹ جنوری پہلی نشست (صع) ۲۱۲ مندوین کے جی اے ہال کراچی میں جمع ہوئے۔ پروفیسر مرزا محمد سعید دلوی نے افتتاحیہ تقریر کی۔ جسم الدین نے صدارت سنبحاں۔ شاہد احمد دلوی نے خطبہ استقبالیہ پڑھا، اور آٹھ ابتدائی کنویزوں کی جماعت ختم کر دینے کا اعلان کر کے باقی ساری کارروائی مندوین کی صوابیدہ پر چھوڑ دی۔

حفیظ جالندھری کی تحریک پر مندوین نے جمیل الدین عالیٰ کو سینچ سیکرٹری نامزد کیا۔

دوسری نشست (سہ پہر) حامد علی خان صدر جلسہ منتخب ہوئے۔ اسٹرینگ کمیٹی کی تشکیل پر بحث اور ۵۶ ادبیوں پر مشتمل اسٹرینگ کمیٹی کا انتخاب۔ نو نو ادبیوں پر مشتمل سات ذیلی کمیٹیاں منتخب ہوئیں۔ پہلی کمیٹی اداہ منصفین پاکستان کے قیام اور اس کے دستور کی تشکیل کے متعلق۔ دوسری ادبیوں کی بہood اور تحفظ حقوق۔ تیسرا پاکستانی ادبیوں کے داخلی و خارجی مسائل کا مطالعہ اور سفارشات۔ چوتھی کمیٹی کالی رائٹ قانون اور مصنف اور ناشر کے باہمی امور۔ پانچویں کمیٹی۔ ادبیوں کے دارالاشرافت کا قیام۔ چھٹی کمیٹی قوی اور علاقائی زبان و ادب کی ترویج و ترقی۔ ساتویں کمیٹی۔ متفرقات اور رابطہ۔

۲۸۹۶ قراردادیں جو اطراف ملک سے موصول ہوئی تھیں، ان منتخب شدہ ذیلی کمیٹیوں کے سپرد کر دی گئیں۔

۳۰ جنوری۔ کمیٹیوں کی کارروائی تاشب۔

سہ پہر۔ اسٹرینگ کمیٹی کا اجلاس۔ اس کے سامنے کمیٹیوں کی منظور شدہ تجویز پیش ہوئیں۔ ان پر بحث ہوئی اور ترمیمات کی گئیں۔ چند ذیلی کمیٹیوں کا کام جاری رہا۔

۳۱ جنوری۔ پہلی نشست۔ بیگم یوسف جمال حسین صدر منتخب ہوئیں۔

(صحیح) گلڈ کے دستور کا مسودہ اجلاس عام کے سامنے پیش ہوا جس پر بحث ہوئی۔ سہ پر تک تمام قرار و ادیس منظور ہو گئیں۔

ساڑھے تین بجے ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء سے ۲۳ اپریل ۱۹۶۰ء تک کے لیے مرکزی مجلس عاملہ کے عبوری انتخاب ہوئے، جس کا نتیجہ یہ تھا:

مرکزی عمدیداران

سیکرٹری جزل..... قدرت اللہ شاپ

اعزاڑی خازن..... عبدالعزیز خالد

اعزاڑی افسر رابطہ..... جمل الدین عالی

حلقة کراچی سے .....

جمیل جالبی

شاہد احمد ولسوی

شوکت صدیقی

غلام عباس

قرہ العین حیدر

ابن سعید علاقائی معتمد

طفیل احمد جمالی

حلقة مغربی پاکستان سے .....

احمد راهی

اعجاز بیلوی

امیر حمزہ شناوری

سید فارغ بخاری

سید وقار عظیم

شیخ ایاز

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

ہاجہ مسرور

اشفاق احمد ..... علاقائی معتمد

حلقہ مشرقی پاکستان سے

ابوالحسن

ابراهیم خان

دیوان محمد اظراف

ڈاکٹر عبدالحقی

سجاد حسین

سید ولی اللہ

بیگم شمس النہار محمود

عبدال قادر

عمرکر بن شیخ

غلام مصطفیٰ

متین الدین احمد علاقائی ..... معتمد

۳۱ جنوری آخری نشست ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے صدارت کی۔

۳۲ بجے شام گلڈ کا منشور پڑھا گیا۔

جلسہ عام کنوش ختم ہونے کے اعلان کے ساتھ سیکرٹری نے گلڈ کے منتخب سیکرٹری جزل کو چارج دیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر سجاد حسین، پروفیسر ممتاز حسین اور پروفیسر ابو رشد نے ادبی مقالے پڑھے۔

سیکرٹری جزل نے تقریر کی۔

مندوں بن کی درخواست پر صدر مملکت نے بھی تقریر کی اور گلڈ کو دس ہزار روپیہ کا ذاتی

عطیہ دیا۔

چھاپے کے حروف کنوشن کی روئیاد کے پیچے وہ گما گری، وہ گما گھی، وہ دھاکہ خیزی اور وہ دھاچوکڑی بیان کرنے سے قاصر ہیں جو اس کے ہر بلے اور ہر کمیثی کا طرہ امتیاز تھے۔ ہر بحث مباحثے میں گری گفتار کی شدت اور حدت کبھی کسی سیاسی تنازعات کا رنگ اختیار کر لیتی تھی، کبھی لسانی اور علاقائی اختلافات کی تمخیاں ابھر آتی تھیں۔

کبھی ذاتیات کی آن اور انا کا شدید نکراوہ ہوتا تھا۔ با اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اچانک سر پھول شروع ہر کر انجمن سازی کا یہ کھڑاگ درہم برہم ہو جائے گا، لیکن ہر قسم کے لڑائی جھگڑے، گالی گلوچ اور لعن طعن کے بعد جب کنوشن اپنے بنیادی مقصد میں کامیاب ہو کر اپنے آخری اجلاس کے لیے جمع ہوئی، تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے کئی مندوین کے گلے پک پک کر بیٹھ چکے تھے۔ سب سے زیادہ گلا جمیل الدین عالیٰ کا بیٹھا ہوا تھا۔

جب انتخابات کا لمحہ آیا، تو مجھے معلوم ہوا کہ چند سینئر انبوں کا ارادہ ہے کہ مجھے گلڈ کے پہلے سیکڑی جزل کے طور پر بلا مقابلہ منتخب کیا جائے۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ انجمن سازی کے بکھیزوں سے نپٹنے کے لیے میری صلاحیت کا رہنمایت محدود ہے۔ اس کے علاوہ مجھے احساس تھا کہ میری سرکاری پوزیشن کی وجہ سے گلڈ پر خواہ مخواہ بے بنیاد شکوک و شبہات کا غبار بدستور چھایا رہے گا۔ میں نے ان خدشات اور اپنی ذہنی چکچاہت کا ذکر کئی افراد سے کیا۔ لیکن کوئی اسے میرا عذر لنگ سمجھ کر ثال دیتا تھا۔ کوئی اسے میری کسر نفسی پر محمول کر کے رو کر دیتا تھا۔ ایک محفل میں تو کوئی جیسم الدین نے اپنی بگالی نما اردو میں آخری فیصلہ اس طرح دے دیا۔ ”ارے بھائی اب تم ہم سے بھاگنا چاہے گا بھی تو بھاگ سکے گا نہیں۔ گلڈ نیا پچھے ہے۔ اس کی سواری کے لیے ایک ٹھوڑا گھوڑا درکار ہے۔ تم پریزیڈینٹ ہاؤس میں پلا ہوا اچھا سرکاری دبारی گھوڑا ہے۔ تم ہمارے بہت سارے کم آ سکتا ہے۔ اب ہم تم کو بالکل نہیں چھوڑے گا۔“ گھوڑے

کا لفظ میں نے فقط اپنی عزت بڑھانے کی خاطر استعمال کیا ہے۔ کوئی جیسیم الدین نے دراصل کسی اور چوپائے کا نام لیا تھا۔

URDU4U.COM  
سیکرٹری جزل منتخب ہونے سے پہلے ہی میری یہ ڈیوٹی لگ گئی تھی کہ کونشن کے آخري اجلاس میں صدر ایوب کو ضرور لاوے۔ میں نے صدر کے ملٹری سیکرٹری بر گیڈیٹر نوازش علی سے اس خواہش کا ذکر کیا، تو اس نے منہ بنا کر، ناک چڑھا کر اپنا سر نفسی میں زور زور سے ہلاایا اور کہا۔ ”صدر اس قدر معروف ہیں کہ اس قسم کی ٹٹ پونجیا تقریبات میں جانے کا وقت ہرگز نہیں نکل سکتا۔“

اس نمانے کی نوکر شاہی کے تصور میں ادیب نام کی کوئی قابل قدر جنس عالم وجود میں موجود ہی نہ تھی۔ کچھ افسران بالا شاید چند شاعروں کے نام سے کسی قدر واقف تھے۔ جنہیں حسب ضرورت کسی مشاعر سے یا تقریب سے طلب کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ادبیوں کی کوئی کونشن بھی ہو سکتی ہے اور وہاں پر سربراہ مملکت کو بھی مدعو کیا جا سکتا ہے۔ یہ کسی یوروکسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ بر گیڈیٹر نوازش علی سے مایوس ہو کر میں سیدھا صدر ایوب کے پاس گیا اور اپنی درخواست ان کی خدمت میں پیش کی۔

کسی قدر تامل کے بعد انہوں نے پوچھا۔ ”کیا میرا وہاں جانا ضروری ہے؟“ ”بھی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ضروری تو بالکل نہیں۔ البتہ مناسب ہے۔“

کچھ مزید سوال جواب کے بعد صدر نے کونشن میں جانا منظور کر لیا اور ٹیلی فون پر بر گیڈیٹر نوازش علی کو حکم دیا کہ ان کی مصروفیات میں ۳۱ جنوری کو شام کے چار بجے سے ایک دو گھنٹے کا وقت رائٹرز کونشن کے لیے مختص کر دیا جائے۔

اس کے بعد بر گیڈیٹر نوازش علی سے جب میری مذہبیز ہوئی، تو ان کا منہ سونج کر کپا ہو گیا تھا۔ صدر کے کونشن میں جانے پر تو وہ برہم تھے ہی۔ اب انہیں مزید غصہ تھا تو یہ کہ ایسی ٹٹ پونجیا تقریب میں ہم لوگ گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر کیا کریں گے؟

میں نے ان کی ڈھارس بندھائی کہ جو مکھیاں ہم ماریں گے، وہی تم بھی مارتے رہنا، لیکن وہ بدستور گبڑا رہا اور پلٹ کر پوچھا۔ ”سکیورٹی کا کیا بندوبست ہو گا؟“

میں نے فی الفور یوروکریٹ کا روایتی عمامہ سر پر رکھا، اور اپنے لجے میں برف کی سی خنکی ڈھال کر جواب دیا۔ ”یہ میرا درود سر نہیں۔ سیکورٹی والوں سے پوچھو۔“ ساتھ ہی تاہذہ توڑا ایک ہی سانس میں یہ بھی کہا۔ ”اور ہاں بریگیڈر۔ صدر کے ساتھ دو سے نیا ہد پر عمل شاف نہ ہو۔ ہمارے پاس نشتوں کی کمی ہے۔“

اس کے بعد غالباً ملٹری سیکرٹری کے ایما پر سکیورٹی والوں کی بھڑوں کا چھتہ کھل گیا اور ہر وقت سعل اور فوجی حفاظتی اداروں کے بھونڈ میرے سر پر بھینختا اور منڈلانے لگے۔ کوئی مارشل لاء والوں کی طرف سے آتا تھا۔ کوئی انتیلی جنس یورو کی جانب سے آتا تھا۔ اور کنوشن میں شامل ہونے والے مندوین کے نام، ولدیت، جائے سکونت، اخلاقی معیار، سیاسی روحان وغیرہ کے متعلق ایک ہی طرح کے درجنوں سوال پوچھتا تھا۔ اس صورتحال سے عمدہ برآ ہونے کے لیے میں نے اپنی آئی۔ سی۔ ایس کی ٹریننگ کو اپنی ڈھال بنایا، اور ایک پختہ کار یوروکریٹ کی طرح کسی اشتعال طبع کے بغیر بچے تک الفاظ میں انتہائی ٹھنڈک اور تحمل سے سب کو یہ کہہ کر نمٹاتا رہا کہ کنوشن میں مدعو ہر مندوب اور رضا کار کو خصوصی نشان امتیاز جاری کئے جائیں گے۔ جس کسی نے یہ بلا پہنا ہوا ہو، آپ کا فرض ہے کہ اس کے احترام اور عزت نفس کا پورا پورا خیال رکھیں۔ حفاظتی تقاضے پورے کرنا آپ کا کام ہے، لیکن اس کارروائی میں کسی غوغائی یا مزاحمانہ یا خلل اندازانہ رنگ کا ہرگز کوئی شائبه نہ ہو۔

چند سر پھرے سکیورٹی افسر کچھ مزید بحثا بحثی کرنے کی کوشش شروع کرتے تھے تو میں پرانے انگریز افسروں کی طرح دو ٹوک انداز میں یہ کہہ کر اٹھ کھرا ہوتا تھا۔

”Well officer, that's all from me“ سکیورٹی والوں کی کشاکشی کسی قدر کم ہوئی، تو کنوشن کے آخری روز ایک اور افاد آپزی۔ میں کے جی اے ہال میں صبح کے اجلاس میں بیٹھا تھا کہ پریزیڈنٹ ہاؤس سے

ملٹری سیکرٹری کا ٹیلی فون آیا۔ اس نے سرت اور بٹاشت سے لبریز لمحے میں مجھے بتایا کہ صدر ایوب کو کل رات سے بخار آ رہا ہے۔ اس لیے آج تمیرے پر ۹ کونشن کے اختتامی اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ٹیلی فون صدر کے ذاتی معالج بریگیڈئر ایم۔ سرور کے حوالے کر دیا۔ جنہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ بخار کہ وجہ سے صدر کونشن میں آنے سے محفوظ ہیں۔

مجھے صدر کے بخار کی خبر کی صداقت پر یقین تو آ گیا، لیکن مایوسی بھی بہت ہوئی۔ میں صدر کی مزاج پری کے بہانے دو بچے پر یڈنٹٹ ہاؤس پہنچا۔ وہ ڈرینگ گاؤن پنے برآمدے میں ایک آرام کری پر دراز تھے اور کچھ فائلیں پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائے اور بولے۔ ”میں یونہی بہانہ نہیں کر رہا۔ اس وقت بھی مجھے ۱۰۰ درجہ کا بخار ہے۔“

”نمیں سر، میں تو صرف آپ کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے ادیب لوگ یہ تو نہیں سمجھیں گے کہ میں بہانہ کر رہا ہوں؟“ انہوں نے پوچھا۔ ”ادیب جو چاہیں سمجھتے رہیں۔ اگر ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا ہے، تو آپ کو ضرور آرام کرنا چاہیے۔“

”کچھ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ یہ ان پڑھ فوجی آدی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے سے بھاگ گیا۔“ صدر ایوب نے کسی قدر سنجیدگی اور کسی قدر مذاق سے پوچھا۔

”نمیں سر، میں نے کہا۔ ”جب انہیں معلوم ہو گا کہ آپ کو ۱۰۰ درجہ کا بخار ہے۔ تو وہ خواہ خواہ ایسا کیوں سمجھیں گے، اور اگر کچھ لوگ ایسا سمجھتے بھی ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بخار آخر بخار ہے۔ وہ بھی ۱۰۰ درجہ کا۔“

اپنی طرف سے تو میں نے اپنے لمحے میں کوئی طنزیہ انداز سونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن میری بات سن کر صدر ایوب کچھ اور ہی طرح مسکرائے اور بولے۔ ”خیر، یہ اتنی بڑی کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔ نوازش اور سرور خواہ خواہ مُکْرِمَہ ہیں۔ میرا خیال ہے میں کونشن میں آؤں گا۔ کوئی تقریر بھی کرنا پڑے گی؟“

”جی نہیں سر، آپ کی طرف سے ہم نے کوئی تقریر نہیں رکھی۔ آپ اگر ہماری چند باتیں سن ہی لیں، تو ہمارے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔“

”Good“ صدر ایوب نے کہا۔ ”میں ضرور وقت پر آ جاؤں گا۔“

مجھے یقین تھا کہ جلے کے اختتام پر سامعین ضرور صدر مملکت سے بھی کچھ سننا چاہیں گے، لیکن میں نے جان بوجھ کر پروگرام میں ان کی کوئی تقریر نہ رکھی تھی، کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو صدر کے سیکرٹری کے طور پر میرا فرض منصبی بتتا تھا کہ ان کی تقریر کا ڈرافٹ تیار کر کے ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ لیکن آج میں نے ایک سوچا سمجھا خطرہ مول لے کر چلا کی سے اپنے اس فرض سے دیدہ و دانستہ کوتاہی اختیار کر لی۔ کیونکہ کونشن میں صدر مملکت کے منہ سے میں اپنے ڈرافٹ کئے ہوئے فقرے نہیں سننا چاہتا تھا، بلکہ دوسروں کی طرح مجھے بھی یہی نہ گلی ہوئی تھی کہ دیکھیں ادب اور ادبیوں کے متعلق صدر ایوب کے اپنے ذاتی خیالات کیا ہیں؟“

کونشن کے آخری اجلاس میں صدر ایوب ٹھیک وقت پر تشریف لے آئے، ہال میں داخل ہوتے ہی حاضرین نے کھڑے ہو کر تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ تین ماہ سے ایوب خان صاحب صدر مملکت اور چیف مارشل لاءِ ایڈمنیسٹر کے طور پر ملک بھر میں سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے تھے۔ اس حیثیت میں وہ ہر محفل اور تقریب میں سب سے اعلیٰ مرکزی اور نمایاں نشست پر ممکن ہونا اپنا قدرتی حق سمجھنے لگے ہوں گے۔ غالباً اسی وجہ سے ہال میں داخل ہوتے ہی وہ لبے لبے ڈگ بھرتے، ناک کی سیدھے شیخ کی جانب لپکے۔ میرے لیے یہ بڑا سکھن مرحلہ تھا، لیکن ہمت کر کے میں نے انہیں روکا اور چند دوسرے ساتھیوں کی مدد سے گھیر گھار کر انہیں سامعین کی اگلی صاف میں لا بٹھایا۔ جہاں ان کے لیے ایک خالی کرسی محفوظ رکھی گئی تھی۔ صدر ایوب کے کان تو کسی قدر سرخ ضرور ہوئے، لیکن پیشانی پر کوئی مل نہ آیا۔ البتہ ان کا پرنسپل فوجی شاف بری طرح سپٹائیا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور وہ ہم سب کو قبر آلود نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

لیکن میرے لیے اس سے بھی نیاہ کئھن مرحلہ اس وقت آیا۔ جب بابائے اردو نے سینج پر آ کر کری صدارت سنبھالی۔ سینج سیکرٹری کی حیثیت سے جمیل الدین عالی ان کے ایک طرف بیٹھے اور منتخب شدہ سیکرٹری جزل کے طور پر مجھے ان کے دوسری جانب بیٹھنا پڑا مملکت کے مطلق العنان صدر کو نیچے سامعین کی صفت میں بٹھا کر اس کے سیکرٹری کا خود سینج پر چڑھ کر براجمان ہونا بظاہر بڑی غیر متوازن اور اہانت آمیز جسارت نظر آتی تھی۔ جو لوگ اس ساری صورت حال پر پہلے ہی سے چیز بجیں تھے۔ ان کے لیے تو خاص طور پر یہ حرکت زخم پر نمک چھڑکنے کا اثر رکھتی تھی۔ سینج پر بیٹھنے کے بعد میں سارا عرصہ بڑی کوشش اور محنت سے صدر ایوب کے ساتھ آنکھیں ملانے سے گریز کرتا رہا۔ ان سے آنکھیں چار کئے بغیر میں وفات فوقة کن انکھیوں سے انہیں چوری چوری جھانک لیتا تھا، تاکہ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ان کے ذہنی رو عمل کا جائزہ لگتا رہے۔ جب اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی، تو میں نے محسوس کیا کہ صدر ایوب کا چہرہ یک سرخ سا ہو رہا ہے۔ میرے دل میں کئی طرح کے وسوسوں نے سر اٹھایا۔ شاید صدر صاحب کا بخار اچانک تیز ہو گیا ہو۔ یا شاید اپنے آپ کو نیچے سامعین کی صفت میں اور اپنے سیکرٹری کو سامنے سینج کے اوپر بیٹھا ہوا دیکھ کر ان کے مزاج کا پانہ چڑھ رہا ہو۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ کے جی اے ہال کے ایک ٹوٹے ہوئے روشنдан سے سورج کی کرنیں براہ راست جناب صدر کے منہ پر پڑ کر انہیں ٹنگ کر رہی ہیں۔ ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ ایوب خان صاحب نے خود ہی کنوش کے چھپے ہوئے پروگرام کا کتابچہ کھول کر پھیلایا اور دھوپ سے بچتے کے لیے اے اپنی آڑ بنا لیا۔ اس کے بعد وہ ہمہ تن کنوش کی کارروائی سننے میں منہک ہو گئے۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا خطبہ صدارت انہوں نے نہایت غور سے سنًا، اور کئی جگہ دوسروں کے ساتھ مل کر انہوں نے تالیاں بجائے میں بھی حصہ لیا۔ چند مقامات پر جہاں بابائے اردو کو بڑی گرم جوشی سے داد ملی، یہ تھے:

”میں اس نادر اجتماع پر نظر ڈالتا ہوں تو اس میں ایسے ایسے فاضل ادیب دیکھتا ہوں جو

جید عمد کے تقاضوں، ادبی نکات و رموز اور ادبیوں کے حقوق و فرائض پر نیاہ بصیرت، گمراہی اور وقت نظر سے بحث کرتے ہیں۔ یہ نوجوان ادیب نیاہ مستعد اور باخبر ہیں۔ میں بہت پچھے رہ گیا ہوں۔ یہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ بنظر الصاف دیکھا جائے تو ان کے ہوتے ہوئے میں اس منصب کا مستحق نہیں جو آپ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ غور کرتا ہوں تو اس کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ بڑے بوڑھوں کا ادب ہماری قدیم تہذیب میں داخل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے زمرے میں کچھ دقیانوی خیالات کے حضرات شریک ہیں جو اپنی آبائی سنت پر قائم ہیں۔ انہوں نے البتہ سفید بالوں کا لحاظ کیا ہے.....

”ہمارے ادب میں جو جمود پایا جاتا ہے، وہ بہت غور طلب ہے..... اب ہمیں ذہنی اور ادبی جمود کو توڑنے کے لیے وہی کرنا ہو گا جو انتحاروں صدی میں فرانس میں انسانیکلوپیڈست Encyclopaedists نے کیا تھا۔ اس عالی بہت، جرت مند مفکروں کی مختصر جماعت نے علم و حکمت کی شمع روشن کی اور اوہام باطلہ اور خیالات فاسدہ کی قلع قع کرنا شروع کیا کائنات اور انسان، بیاست اور معاشرہ، مذہب اور اخلاق کے قدم نظریات اور روایات کو بڑی جرات اور آزادی سے عقل و حکمت کی کسوٹی پر کسا، اور جملہ علوم انسانی کو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس انسانیکلوپیڈیا نے خیالات میں تغیر عظیم پیدا کر دیا اور ملک میں بیداری کی ایک نئی لہر دوڑا دی، مگر حکومت اور کلیسا دو بڑی قوتیں درپے آزاد ہو گئیں۔ طرح طرح کی سختیاں کی گئیں۔ تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ حکومت کی طرف سے کتاب کے چھپنے کی ممانعت کر دی گئی۔ مطبع میں چھپتے وقت مضافین میں تحریف کر کے کتاب مسخ کر دی گئی۔ لیکن باوجود ان تمام مواعنات اور مصائب کے ان علم و ادب کے شیدائیوں نے کام جاری رکھا اور ان ہی معتوب اور ستم رسیدہ ادبیوں کے افکار و خیالات نے اس عظیم انقلاب کی راہ ہموار کی جو ”انقلاب فرانس“ کے نام سے مشہور ہے.....

”ہماری قوم میں بھی ہماری ہی زندگی میں ایک ایسا ذہنی انقلاب واقع ہو چکا ہے۔ یہ انقلاب

سر سید احمد خان کی پر خلوص سرفروشانہ مسائی سے عمل میں آیا۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے قوم کے اس مصلح اعظم کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ سر سید نے جس وقت اس منزل میں قدم رکھا تو مخالفت کا طوفان بہپا ہو گیا۔ لعن طعن سب وشتم کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ کفر کے فتوے صادر ہوئے اور ملحد، 'وجال'، کرشان کے خطاب عطا ہوئے۔ اس نے سب کچھ سما اور اپنے عزم پر قائم رہا....."

"ایسے لوگ بنی نوع انسان کے محض ہیں اور زندہ جاوید ہیں۔ ہمیں ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ صرف انجمن بنا دینا، قرار دادیں منظور کرنا یا حکومت سے امداد حاصل کرنا کافی نہ ہو گا۔ ہمیں کام کرنا ہو گا۔ کام سے مراد یہ نہیں جو سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے کہ ۹ بجے آئے اور ۳ بجے چلتے بنے، یہ کام جو ہمیں کرنا ہے پوری قوت سے کرنا ہو گا۔ دن رات، 'گری سردی'، بارش سے بے نیاز ہو کر کام سے عشق ہونا چاہیے۔ عشق نہیں تو وہ کام نہیں بے گار ہے....."

"سلطنتوں کے تخت الٹ جاتے ہیں۔ قومیں فا ہو جاتی ہیں۔ تمدییں مٹ جاتی ہیں، لیکن ان کے ادبیوں کے کارنائے زندہ رہتے ہیں..... ادب قوموں کی اصل پونجھی ہیں۔ اس پونجھی کی حفاظت اور نگہداشت قوم کا مقدس فرض ہے...."

"ادب ایک شریف پیشہ ہے۔ اس کی شرافت پر آنچ نہ آنے دیجئے۔ راستی اور خلوص آپ کا شعار ہونا چاہیے۔ آپ ادب کے ذریعہ قوم کے اخلاق اور کردار بنانے، روشن خیالی پھیلانے اور باطل خیالات اور اوہام کی تاریکی مٹانے میں بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اپنے پیچھے ایسی یادگار چھوڑ جائیے کہ آئندہ نسلیں اس سے فیض حاصل کرتی رہیں۔"

بارے دنیا میں رہو غمزہ یا شاد رہو  
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تقریر کے بعد چار مقالے پڑھے گئے۔ خاص طور پر ڈاکٹر جاوید اقبال کے انگریزی مقالہ جو ”ادب، قوم پرستی اور لادنیت“ کے موضوع پر تھا۔ صدر ایوب خان نے نہایت غور اور توجہ سے سن، مقالوں کے بعد گلڈ کے منتخب شدہ سیکرٹری جنرل کے طور پر میری کچھ کرنے کی باری تھی۔ میں نے بھی انگریزی میں ”ادب اور آزادی تحریر“ پر ایک مضمون پڑھا۔ پہلے تو صدر ایوب اپنے سیکرٹری کو گھر کی مرغی وال برابر سمجھ کر کسی قدر بے توجی سے ساکن و جامد بیٹھے رہے، لیکن کئی فکروں پر جب کئی بار سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا، تو غالباً وہ بھی متوجہ ہوئے اور پھر کسی مقام پر مسکراتے اور کسی جگہ اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ میرے مضمون کے کچھ حصوں کا ترجمہ درج ذیل ہے:

”اس سے پہلے کہ ادب اور اس کی آزادی تحریر پر گفتگو کی جائے۔ یہ بہتر ہے کہ اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کر دی جائے..... وہ ذمہ داریاں یہ ہیں:  
۱۔ ادب کسی حیثیت سے بھی قانون سے بالا نہیں ہوتا۔

۲۔ وہ ایک ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسرے ملک کا وفادار نہیں ہو سکتا۔

۳۔ کسی ایک نظریہ کی تبلیغ کرتے ہوئے Poetic License شاعری کی آڑ لے کر کسی دوسرے نظریہ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔

”یہ حدیں تمام اچھے شریوں پر عائد ہوتی ہیں، لیکن ان کا اطلاق نیا وہ شدت سے ادب پر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر لمحے عوام کی نظریوں میں رہتا ہے۔ جو کچھ وہ لکھتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یاد کے خزانے میں گم ہو جائے۔ اس کے بر عکس یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی آواز کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی رہے۔ ادب جتنا نیا وہ مقبول ہو گا، اتنا ہی اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ نیا وہ ہو گا..... اثر انداز ہونے کی الہیت ادب کے

لیے نعمت بھی ہے اور مصیبت بھی۔ مصیبت یہ ہے کہ ادیب جیسے غیر معمول فرد کو عام ترازو میں تولا جاتا ہے۔ اگر آپ کو ادیب میں کوئی کمی یا کبھی محسوس ہو تو لازمی طور پر یہ نہ ادیب کا قصور ہے نہ ترازو کا۔ بلکہ ممکن ہے یہ آپ کے جائزے یا آپ کی نظر کا قصور ہو۔“

”ادیب آپ سے بروادشت کی نہیں فہم کی بھیک مانگتا ہے۔ مجھریٹ یا پولیس انپکٹر کا فہم نہیں۔ بلکہ ایک باشور پڑھنے والے کا فہم۔ ایک اعلیٰ اقدار میں یقین کرنے والے کا فہم۔ ایک سچائی کے پرستار کا فہم۔ آپ چور کو پکڑنے کے لیے کسی دوسرے چور کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ادیب کو سمجھنے کے لیے آپ کو پڑھنے والے کی تلاش کرنا ہو گی۔ سرکاری افسر جو ادیب اور اس کے حقوق کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر ان کا مطالعہ صرف دفتری مثلوں اور یادداشتوں تک محدود ہے اور ان کی زندگی کے کوئی لمحات کتابوں کی قسم میں نہیں، تو وہ ہمیشہ ادب کو غلط سمجھیں گے اور اسے حرارت سے دیکھیں گے۔ یہ سرکاری افسر کبھی اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کہ جسمانی سزا میں ضروری نہیں کہ روح کے لیے بھی عذاب ہوں اور یہ کہ دنیا کے تمام قانون اور سائنس کی تمام ترقی وہ زنجیر ایجاد کرنے سے قاصر ہے جو علم اور سچائی کو جکڑ سکے۔“

”ادیب کی آزادی کے لیے دوسرا خطرہ اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ فاصلے اور وقت کی حدود سے ماوراء ہو کر زندہ نہ سکتا ہے۔ وہ ان جانی اور ان دیکھی حقیقوں کو چھوتا ہے اور اس کے مستقبل کے خواب ممکن ہے آج کی زندگی کی مصلحتوں اور تقاضوں کے بالکل بر عکس ہوں۔ وہ نہ پاگل ہے نہ غدار..... بات صرف اتنی ہے کہ اس کی نظر نیا ہد گمری اور اس کے جذبات آپ سے نیا ہد شدید ہیں۔ اگر آپ ان بلندیوں کا احساس اپنے ذہن میں نہیں رکھتے تو آپ ادیب کے ساتھ کبھی انصاف نہ کر سکیں گے۔“

”ادیب کی آزادی کو تمیرا خطرہ اس کی اقتصادی پست حالی ہے۔ ہمارے ملک میں کتابیں

اس لیے نہیں سکتیں کہ وہ سستی نہیں اور تعلیم عام نہیں جو خرید سکتے ہیں وہ پڑھتے نہیں۔  
جو پڑھنا چاہتے ہیں وہ خرید نہیں سکتے۔ اس تمام تضاد میں صرف ایک شخص فائدہ اٹھاتا  
جاتا ہے، اور وہ ہے ناشر.....”

”ادیب کی آزادی کے لیے ایک اور بھی خطرہ ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے ہمارا ملک ایک  
چھوٹا سا ملک ہے۔ ہم غریب ہیں۔ ہم نے اپنے معاملات کو الجھا دیا ہے۔ ان الجھنوں  
کی وجہ سے ہمارے کئی ہمدرد پیدا ہو گئے ہیں۔ مدد دینے والے ہمدرد۔ مذاق اڑانے والے  
ہمدرد۔ ہمدردی کے پردے میں دشمنی کرنے والے ہمدرد.....”

”کوئی ہمارا ذہنی مکہ واشنگٹن بنانے کے درپے ہے۔ کوئی ماسکو اور کوئی کلکتہ۔ ماسکو اور  
کلکتہ والے ہمارے نظریات کی بخ کنی (Subvert) کرنا چاہتے ہیں۔ واشنگٹن والے ہمیں  
اپنی راہ لگانا (Convert) چاہتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے ہمارا ذہنی مکہ صرف پاکستان میں  
ہے اور کہیں نہیں۔۔۔۔۔ پاکستان کے ادیب علمی سیاست کی بساط پر مرے نہیں بنا چاہتے۔  
ہم غریب ہیں۔ لیکن ہمارا اپنا کوئی ذہنی اور ثقافتی افق ہے۔ کچھ دیر ہمیں اپنے چمن  
کی بھی سیر کرنے دیجئے.....”

”آج جب کہ مارشل لاء کے ۶۹ ضابطے میرا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور چیف مارشل لاء  
ایڈمنسٹریٹر بنس نیس میرے سامنے بیٹھے ہیں۔۔۔ میں نہایت آزادی سے وہ سب کچھ کہ  
سکا ہوں جو ابھی کہہ چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ادیب کے طور پر اگر میری اتنی آزادی  
برقرار رہے، تو یہ میرے لیے قابل قبول ہے۔“

ہرچہ بادا بادکشی من ور آپ اندر ختم کے مصدق میں نے بھی آج موقع پا کر آزادی  
تحریر پر اپنے دل کا کچھ غبار نکال باہر پھینکا۔ تقریر ختم کر کے جب میں واپس اپنی  
کرسی پر بیٹھا، تو بابائے اردو نے مجھے دو تین بار شبابش شبابش کہا۔ پھر مسکرا کر بولے۔  
”اب تمہارا کیا بنے گا؟ ایک تو تم صدر کو نیچے بٹھا کر خود سیچ پر چڑھے بیٹھے ہو۔ دوسرے  
ایسی تیز تقریر بھی کر ڈالی۔“ پھر کچھ سوچ کر وہ خود ہی بولے۔ ”خیر کوئی بات نہیں۔

نکال دیئے گئے تو انجمن میں چلے آنا۔“

”آخر میں بابائے اردو نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے کہا۔ ”محترم صدر پاکستان۔ حاضرین جلسہ آپ سے بھی کچھ ارشادات سننے کے آرزو مند ہیں۔ اگر آپ اس جلسہ سے خطاب فرمانا منظور فرمائیں، تو ہماری عزت افزائی ہو گی۔“

یہ سن کر صدر ایوب نے پہلے تو مجھے گھور کر دیکھا، لیکن پھر یہ دعوت قبول کر کے اٹھ کر سینج پر آگئے اور انہوں نے نہایت خود اعتمادی سے انگریزی میں فی البدیہہ تقریر کی جس کے کچھ حصوں کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

”مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ مجھ سے کسی تقریر کے لیے نہیں کہا جائے گا اور اسی لیے میں نے اپنی کری آرام سے سنبھال لی۔ اب مجھے مدعو کیا گیا ہے کہ میں کچھ کہوں۔ میں تقریر پر تیار نہیں ہوں اور ایسے ایسے اہل علم و فضل سامنے ہیں۔ مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں آپ کی کارروائیوں سے بہت متاثر ہوا ہوں..... مجھے یہ دیکھ کر انتہائی سرست ہوئی کہ آپ کے مقررین میں تخلیقی اور مجاہدانہ خصوصیات نمایاں تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خصوصیات پاکستان کے استحکام اور عظمت کے لیے بہت کام آئیں گی.....“

”ایک فوجی کی سادہ زبان میں پاکستان کا نصب العین بہت واضح ہے۔ انسانوں کے لیے بہتر سے بہتر آرام وہ بھرپور اور مکمل زندگی۔ ایک مضبوط اور ترقی پسند معاشرہ..... اس کے لیے ہمیں گھری بنیادوں پر منصوبی بندی اور مخلصانہ اور مسلسل کام کی ضرورت ہے..... کام کا مطلب یہ نہیں کہ صرف عمال حکومت یا فیکٹریوں کے مزدور کام کریں۔ ہم سے ہر ایک کو کام کرنا پڑے گا۔ ہر کام کرنے والا پاکستان کی مشین میں ایک اہم پرزو کی حیثیت رکھتا ہے.....“

کام کے سلسلے میں ہمیں اعتماد ہونا چاہیے کہ ہم درست کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ادب اور دانشور بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ بڑھتی ہوئی ماڈیٹ کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹا سکتے ہیں۔ گو اس دنیا میں ہم ماڈیٹ کی طرف سے آنکھیں بند

نہیں کر سکتے، مگر اس کی قوت کو اسلامی نظریات کے تابع کر سکتے ہیں.....”  
”پہلے انسانی جسموں کے لیے جنگیں ہوتی تھیں۔ آج ذہن انسانی کی تنجیر کے معروکے پہا  
ہیں۔ اس سلسلے میں آپ پر بہت سے فرانش عائد ہوتے ہیں آپ ذہن جدید کی زبان  
میں صالح نصب العین کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔“

”کسی نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ سفر کے قانون کا وجود تخلیقی قوتوں کو دبادتا ہے۔  
ہاں یہ خوشگوار بات ہے۔ لیکن اگر کوئی حکومت واقعی حکومت کھلانے کی اہل ہے، تو اسے  
آنچھ کروڑ انسانوں کے تحفظ کی ذمہ داری پوری کرنی پڑے گی۔“

”اگر کوئی شخص اپنے وطن میں غیر ملکی مفادات اور غیر ملکی نصب العین کی پرورش کرتا  
ہے، تو وہ یقیناً اپنے ملک کے لیے ناقابل برداشت ہے یہ ایک افسوسناک صورت حال  
ہو گی جس کا مقابلہ بے جھکے اور مضبوط دل سے کرنا ہو گا۔ خواہ کوئی ادیب اتنا بڑا  
ہو کہ وہ مرخ سے باتیں کرے، اگر اس نے مادر وطن کی سلامتی کے خلاف کام کیا  
تو میں اپنے فرض میں کوتاہی کروں گا اگر اس سے باز پرس نہ کروں.....“

”میری کوشش یہ رہی ہے کہ لوگوں کو اپنے لیے کام کرنے کے موقع فراہم کرنے  
میں ان کی مدد کی جائے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ آپ کو اپنے لائچہ عمل پر چلنے سے  
کوئی نہیں روکے گا۔ ہر شخص کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے  
اور ہم آپ کے لیے جو کچھ ممکن ہے کریں گے.....“

”آج کے نئے انتظامی ڈھانچے کی زبان بد قسمتی سے مارشل لاء کی زبان ہے۔ لیکن ہم  
نے اسے نرم سے نرم تر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے آپ اسے پسند نہ کرتے  
ہوں۔ لیکن اگر آپ نیتوں اور طریق کار پر غور کرتے رہیں تو دیکھیں گے کہ ہم بہت  
جلد اسے ایک عمدہ لائچہ عمل سے بدل دیں گے، جس سے انفرام بیاست کے ضوابط  
مرتب ہو جائیں گے.....“

”میں نے آپ کا بہت وقت لیا، مگر میں آج بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ نے جو انجمن

بنائی ہے، اس کے لیے آپ کو بہت سی مشکلات درپیش ہوں گی۔ میں اپنے طور پر کہیں نہ کہیں سے دس ہزار کا انظام کر لوں گا جو میں اپنی پہلی پیش کش کے طور پر دتا ہوں، مگر ازراہ کرم یقین سمجھئے کہ میں جواب میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا، آپ اسے ملکی مفاد کے لیے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔“

اگلے روز جب میں یوان صدارت میں اپنے دفتر پہنچا، تو فضا خوشنگوار تھی۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ صدر ایوب کونشن کے اجلاس سے ہشاش بشاش لوٹے، تو ملٹری سیکرٹری اور دیگر عملے کا موڈ بھی خود بخود سازگار ہو گیا، لیکن رفتہ رفتہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ گلڈ کا سیکرٹری جzel منتخب ہو کر میں پیچ در پیچ الجھنوں اور غلط فہمیوں کے گرداب میں پھنس گیا ہوں۔

ایک الجھن تو یہ تھی کہ چند ادبیوں کا ایک گروہ جو گلڈ کا رکن بھی تھا اور مختلف اوقات اور مقامات پر گلڈ کی تقریبات میں خوش مل سے شامل بھی ہوتا تھا، لیکن کسی معقول دلیل یا ثبوت کے بغیر یہ حضرات اسی شک و شبہ پر جسے بیٹھے تھے کہ ہونہ ہو یہ تنظیم کسی خفیہ مقصد کے لیے حکومت کے ایماء پر معرض وجود میں لائی گئی ہے۔ مزمن مرض کی طرح مزمن شک بھی آسانی سے رفع نہیں ہوتا۔ اس کا واحد علاج گلڈ کی ۲۳ سالہ تاریخ ہے جو سب کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح حاضر ہے۔

دوسری الجھن یہ تھی کہ گلڈ قائم ہوتے ہی نوکر شاہی کا ایک مضبوط اور مخصوص عضر بھی اس کے خلاف تکوار سونت کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مغربی پاکستان کے گورنر نواب کلالا باغ سے لے کر کے مرکزی وزیر، سیکرٹری اور مختلف درجنوں کے محکمانہ افسر گلڈ کے نام سے بدکتے تھے اور اپنی بساط کے مطابق اس پر کسی نہ کسی طرح کی کاری ضرب لگانے سے نہ چوکتے تھے۔ مختلف لوگوں کے حوالے سے اس کی مختلف وجوہات تھیں۔ یوروکیسی کا ایک طبقہ اس غلط فہمی میں بنتا تھا کہ ہم نے صدر ایوب کو کامیابی سے یوقوف بنا�ا ہے اور اس کی سرپرستی حاصل کر کے باسیں بازو کے غیر محب وطن دانشوروں کی پشت

پناہی کے لیے ایک خطرناک تنظیم قائم کر رکھی ہے۔ چند بار مجھے کابینہ میں پیش ہو کر گلڈ کی صفائی میں طرح طرح کے احتمانہ سوالات کا جواب بھی دینا پڑا۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ صدر ایوب کے علاوہ ساری حکومت میں اور کوئی گلڈ کا ہمدرد اور بھی خواہ موجود نہ تھا۔

اس کے علاوہ یوروکسی کی طبع نازک پر غالباً یہ بات بھی گران گزرتی تھی کہ یہ دو دو نکے کے ادیب کل تک تو کسپرسی کی حالت میں جوتیاں چٹختے پھرا کرتے تھے، لیکن اب اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری تقریبیوں میں بھی مدعو ہو کر منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ نہ لباس مناسب، نہ حلیہ درست، نہ آداب مجلس سے آشنا۔ لیکن جہاں دیکھو، وہاں کتاب میں ہڈی کی طرح موجود۔ ایک بار میں نے حکومت کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ یوروکسی کے اونچے طبقہ کو تخلوہ کا کچھ حصہ کتابوں کی صورت میں دینا چاہیے، تاکہ ان کا ذہنی افق کسی قدر کشاہ رہے۔ جملہ افران کرام نے اسے اپنی توہین سمجھ کر پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ ایک بار کراچی کے ایوان صدر میں تقسیم اعزازات و خطابات کی تقریب منعقد ہوئی۔ حسب معمول وزیریوں، امیرلوں اعلیٰ افسروں اور بیرونی سفیروں کی تعداد سینکڑوں میں موجود تھی۔ صدر کے سیکرٹری کے طور پر اعزاز پانے والوں کی فہرست میرے پرداز تھی۔ میں باری باری سے ہر اعزاز پانے والے کا نام پکارتا تھا۔ ہر شخص اپنی مخصوص نشست سے انہ کر آتا تھا۔ اپنا تمغہ یا سند وصول کرتا تھا۔ اور صدر کے ساتھ ہاتھ ملا کر اپنی سیٹ پر واپس چلا جاتا تھا۔ جب سرکاری اعزاز یافتگان کی لسٹ ختم ہو گئی، تو میں نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے یہ اعلان کیا:

”مسٹر پریزیڈنٹ، سر۔ سرکاری اعزازات کی فہرست مکمل ہو گئی۔

اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ براہ مریانی پاکستان رائٹرز گلڈ کے ادبی پرائز جیتنے والے ادبیوں میں انعامات تقسیم فرمائیں۔“

صدر ایوب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو میں نے داؤد اور آدم جی انعامات حاصل

کرنے والے ادیبوں کے نام باری پکارے۔ جنہیں ہم نے پہلے ہی سے ایوان صدر میں بلا کر خاص نشتوں پر بٹھا رکھا تھا۔ یہ کارروائی میں نے صدر ایواب کی منظوری سے کی تھی۔ بیرونی سفیروں سمیت حاضرین کے ایک طبقہ نے اس غیر رسمی اعلان کو تانہ ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس کیا اور زور سے تالیاں بجا کر اس کا جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا، لیکن نوکر شاہی کے پڑے ہوئے مرے جو اپنی اتنا کی سلوں کے نیچے دب کر اور آداب و رسوم اور قواعد و ضوابط کے سرخ فیتے میں بے دست و پا ہو کر لکیر کے فقیر بن چکے تھے۔ اس اعلان کو سکردم بخود رہ گئے۔ ان کے نزدیک تقسیم اعزازات کا تقدس پامال ہو گیا تھا اور ادیبوں کی ایک مشتبہ تنظیم پر سرکاری پروٹوکول کی عزت و حرمت بلاوجہ قربان کر دی گئی تھی۔ اس وقت تو وہ خون کا گھونٹ پی کر بھیگی بلی بنے بیٹھے رہے، لیکن ایک سال کے اندر اندر انہوں نے کچھ ایسی ریشه دوانیاں کیں کہ آئندہ کے لیے ایسی ہر تقریب میں اعزازات کی فہرست پڑھ کر نام پکارنے کا انتہاق صدر کے سیکرٹری سے چھین کر کیجئے سیکرٹری کے سپرد کر دیا۔ اس وقت سے آج تک یہی سُمُّ راجح ہے۔

اگلی بار ہماری درخواست پر پھر صدر ایوب نے گلڈ کے ادبی انعامات اپنے ہاتھ سے تقسیم کرنا قبول کر لیا۔ اس بار ہم نے اس مقصد کے لیے راولپنڈی کے ایوان صدر میں ایک سادہ سی تقریب منعقد کی۔ انعام جیتنے والوں میں ”ہفت کشور“ کے مصنف جعفر طاہر بھی شامل تھے۔ وہ پاکستان کی فوج میں بے کمیش کے افسر تھے۔ جب وہ انعام لینے آئے تو فوجی وردی میں ملبوس تھے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے بڑی خنده پیشانی سے ان کی پذیریائی کی، اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جعفر طاہر سے ان کا حال احوال پوچھتے رہے۔ میں بھی نزدیک ہی کھڑا تھا۔ فیلڈ مارشل نے فخریہ انداز سے اپنی موچھوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھے مخاطب کر کے بولے۔ ”تم نے دیکھا، فوج میں بھی کتنے پڑھے لکھے آدمی ہوتے ہیں۔“

جعفر طاہر نے ادبی زبان سے کہا: ”جی ہاں، حضور نان کمشنڈ ریکٹ تک ہی رہتے ہیں!“

اسی طرح کی ایک تقریب ”اداس نسلوں“ پر عبداللہ حسین کو بھی انعام دیا گیا تھا۔ چند روز بعد مجھے مغربی پاکستان کے گورنر نواب کالا باغ کا ٹیلی فون آیا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ”بھائی شباب“ یہ ہمارے محترم صدر صاحب کس سمجھنے میں پڑ گئے ہیں؟“

میری درخواست پر انہوں نے وضاحت فرمائی۔ ”میرا ہوم ڈیپارٹمنٹ اور پولیس کا ملکہ بڑا سچ پا ہو رہا ہے کہ ہمیں پوچھئے بغیر جناب صدر مملکت کس چکر میں پڑ گئے ہیں؟“ میری مزید درخواست پر انہوں نے مزید وضاحت کی۔ ”وہ جو ”اداس نسلیں“ نام کی لچر بکواس ہے، اسے فاشی کے الزام پر ضبط کر کے مقدمہ دائر کرنے کی مکمل تیاری تھی۔ اب جناب صدر نے اپنے دست مبارک سے اسے انعام دے مارا ہے۔ اب ہم کریں تو کیا کریں؟ بھائی شباب، ہم لوگ بھی یہاں صدر صاحب کے خیر خواہ ہی بیٹھے ہیں۔ ایسے نازک معاملوں میں کبھی ہم سے بھی پوچھ لیا کریں۔“

نواب کالا باغ اور یوروکسی کے کل پرنسوں نے صدر ایوب خان کو بار بار یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ حکومت کی سرپرستی کا فائدہ اٹھا کر گلڈ کے زیر سایہ بہت سی خطرناک اور ناپسندیدہ شخصیات کی پروش ہو رہی ہے۔ ان میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، شہید اللہ قیصر، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین وغیرہ کے نام سرفراست تھے، اس کے بر عکس صدر کے قریب میں ہی ایک ایسا تن تھا فرد تھا، جو انہیں یہ باور کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ گلڈ کے ۱۲۰۰ ممبروں میں ابوالاٹھ حفیظ جالندھری، نیم جازی، الٹاف حسین قریشی اور منت عبد الرحمن جیسے فعال اراکین بھی شامل ہیں۔ لطیفہ کے طور پر میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے کچھ ممبر ایسے ہیں کہ جس اجلاس میں خواتین موجود ہوں وہ اس میں شامل نہیں ہوتے، بلکہ کریاں نکال کر باہر برآمدے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کے بر عکس کچھ ممبر ایسے بھی ہیں کہ اگر خواتین موجود نہ ہوں تو وہ اجلاس کے قریب تک نہیں آتے۔

”تم خود کس گروپ میں شامل ہو؟“ صدر ایوب نے ہنس کر پوچھا۔

”اس کا داروددار خواتین پر ہے۔“ میں نے بھی مذاقا کہا۔ سچ وحیج ٹھیک ہو تو اجلاس میں شامل ہوتا ہوں۔ ورنہ شرقا کے پاس برآمدے میں آبیٹھتا ہوں۔“

جب تک میں صدر ایوب کے قرب و جوار میں موجود رہا، اس قسم کے اللہ تللوں سے گلڈ کے متعلق متوازن تاثرات قائم رکھنے کے لیے حسب توفیق کوشش کرتا رہا، لیکن جب مجھے ملک سے باہر بھیج دیا گیا، تو یہ اداہ براہ راست مخالفین کی زد میں آگیا۔ ایوان صدر میں گلڈ کی تقریبات منقطع ہو گئیں اور جمیل الدین عالی جو ابتدائی چند برسوں میں اس انجمن کو مستحکم کرنے اور فعال بنانے کے روح رواں تھے، طرح طرح کی انتقامی کارروائیوں کی لپیٹ میں آ کر ایک دو بار اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ گلڈ کے متعلق غلط فہمیوں اور مخالفتوں کا یہ طوفان صرف سرکاری سطح تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ اس قسم کا انداز فکر قوی صحافت کے ایک ذی اثر، با رسوخ اور مقتدر حلقة میں بھی جاری و ساری تھا۔ میں اسے اپنی بد قسمی سمجھتا ہوں کہ صحافت کے اس شبے کو ہم اپنا نکتہ نظر باور کرنے میں ناکام رہے۔ ادب کی طرح میں صحافت کو بھی ایک شریف اور باوقار پیشہ سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وقت کا وہارا اور تعصبات کے خس و خاشاک کو اپنے ساتھ بھالے جائے گا، جو ہم عصری تاؤ اور کھچاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ماحول بدل جاتا ہے اور اس ماحول میں کھینچا تانی کرنے والے لوگ بھی پرہ عدم میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد صرف تاریخ کا آئینہ باقی رہ جائے گا۔ جس میں کسی ملعم سازی کے بغیر گلڈ کا وہی عکس نظر آئے گا، جو واقعی اس کا اپنا ہے۔ اس وقت تک کے لیے میری یہی گذارش ہے کہ:

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار تو ام  
وگر کشادہ جہنمیم گل بھار تو ام

URDU4U.COM

ان چند درچند اندر ونی الجھنوں اور مشکلات کے علاوہ یونہی بیٹھے بھائے خواہ مخواہ ہمارے سر پر بیرونی سطح کی ایک افたہ بھی نازل ہو گئی۔ گلڈ کے منشور میں درج تھا کہ یہ انجمن کسی صورت میں کسی غیر ملکی حکومت یا ادارے سے کوئی امداد قبول نہ کرے گی۔ یہ شرط ہم نے اس زمانے میں عائد کی تھی، جبکہ ہمارے ملک کا بال بال امریکی امداد کے شکنے میں جکڑا ہوا تھا۔ ہمارا عام سرکاری یا نیم سرکاری یا سراسر غیر سرکاری چلن یہی بن گیا تھا کہ کسی نئے منصوبے کا ڈول ڈالنے سے پہلے یہ لازمی تھا کہ امریکی یا دیگر بیرونی ذرائع سے مال وسائل کی فراہمی کوٹ کرالی جائے۔ اس بندھی بندھائی ڈگر سے اپنی آزادی اور خود مختاری کی تشریک کے لیے ہم نے بیرونی وسائل سے گلڈ کے بے نیازی کا ڈھنڈوارا کچھ اس طرح پیٹا کہ یہ ناموس شور و شغب امریکین سفارت کاروں کے ذوق سماعت پر گراں گزرا۔ وہ اس بات کے خواہ ہو چکے تھے کہ عام طور پر پاکستانی ادارے وجود تو بعد میں آتے ہیں، لیکن ان کے لیے امریکی امداد کا بندوبست پہلے کر لیا جاتا ہے۔ اب گلڈ کی اس مختارانہ لاف ننی کو سن کر انہیں یہی گمان گزرا کہ کنگال ملک کے کنگال ادیبوں نے مل جل کر ایک انجمن بنائی ہے۔ ملک کے بہت سے دوسرے اداروں کی طرح آج نہیں تو کل یہ گلڈ بھی ہمارے سامنے دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جائے گا، لیکن جب ایسا نہ ہوا، تو کچھ امریکینوں کے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ ممکن ہے درپرداز یہ ادائہ روس سے اپنی قیمت وصول کر رہا ہو، کیونکہ ہماری یورو و کسی اور قومی صحافت کے کچھ حلقتے یہ تاثر دے ہی رہے تھے کہ گلڈ دراصل باہمیں بازو کے ”سرخوں“ کی کمین گاہ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس طرح امریکی سفارت خانے کی نظر میں بھی پاکستان رائٹرز گلڈ ایک تجزیہ ادائہ تھا۔

دوسری طرف روی سفارت خانے سے بھی ہمارا بالکل کوئی رابطہ نہ تھا، بلکہ ایک بار تو وہ میرے ساتھ بہت ناراض ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ سویٹ رائٹرز یونین نے مجھے پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جزل کی حیثیت سے اپنے ایک سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ساتھ ہی ایک پیغام بھی مانگا، لیکن یونین کو جو پیغام میں نے بھیجا، اس کا لب لباب یہ تھا۔ ”سویٹ رائٹرز یونین کے حالیہ سالانہ اجلاس کا ایجنڈا بڑا وسیع اور دلچسپ ہے۔ فی زمانہ دنیا کے کئی حصوں میں آزادی اور خود اختاری کی جو تحریکیں چل رہی ہیں۔ ان میں سے چند ایک ذکر آپ کے ایجنڈے میں شامل ہے، لیکن باقی ایسی ہی بہت سی اہم تحریکوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس تفریق کی وجہ میری سمجھ سے بعید ہے مثال کے طور پر بیاست جموں و کشمیر کے تنازعہ پر غور فرمائیے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ آپ کی یونین نے اپنے پلیٹ فارم پر اس مسئلہ کو کبھی پیش ہونے کا موقع نہیں دیا۔ غالباً نہ ہی آپ کے سامنے کبھی یہ معاملہ زیر غور آیا ہے کہ سویٹ یونین جیسی عظیم پاؤر جو دنیا کے کئی حصوں میں مظلوم اور مکحوم قوموں کے حق خودداریت اور آزادی کی نزدیکی میں کوشش کر رہا ہے۔ وہ سکیورٹی کونسل میں کشمیری عوام کو یہ حق دینے کے خلاف بار بار اپنا وہ استعمال کرتی ہے؟ اگر میں آپ کے سالانہ اجلاس میں شامل ہوا تو مجھے امید ہے کہ مجھے آپ یہ سوالات اٹھانے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔“ یہ پیغام پا کر سویٹ رائٹرز یونین نے میرے دعوت نامے کی بات ہی گول کر دی۔ کچھ عرصہ بعد (یہ پیغام بھیجنے کے بعد) ایک سفارتی تقریب میں میری مذہبی روسی سفیر سے ہو گئی۔ وہ بڑا جنبھلایا ہوا اور سخن پا نظر آتا تھا۔ اس نے نہایت کڑوے الفاظ میں مجھے مطلع کیا کہ سویٹ رائٹرز یونین میں میرے پیغام کو نہایت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

کچھ ماہ بعد میں صدر ایوب کے ہمراہ نیپال کے دونوں کھشندو گیا ہوا تھا۔ وہاں پر ان دنوں چند روی ادبیوں کا ڈیلیگیشن بھی آیا ہوا تھا۔ ایک سرکاری تقریب میں ان کے ساتھ

میرا سامنا ہوا، تو انہوں نے مجھے اپنے نرگہ میں لے لیا اور کوئی گھنٹہ بھر تک رائٹرز یونین کے نام میرے پیغام کو تکا بولی کرتے رہے۔ ان کی تلخ و ترش گفتگو میں بار بار شیپ کا بندیسی آتا تھا کہ میں امریکیوں کے ہاتھ بکا ہوا پھو ہوں۔ میرا انداز فکر شاویانہ سامراجیت سے بربی طرح آلودہ ہے اور میرا دماغ سوویت یونین کے خلاف امریکی جارحانہ پروپگنڈے کے دھوون میں پوری طرح دھلا ہوا ہے، اس بے سرو پا الزام تراشی سے کسی قدر آزردہ ہو کر میں ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نیپال کی ہوائی فوج کے کمانڈر اچیف کی یوی لپک کر آئی اور ڈوگری زبان میں مجھے اس طرح الگ تھلک گم سم بیٹھنے کی وجہ پوچھنے لگی۔ یہ جموں کے مضاقفات کی ایک پڑھی لکھی، طرحدار ڈوگرہ خاتون تھی اور پنس آف ولیز کالج جموں کے ناطے سے مجھے جانتی تھی۔ میں نے اسے روی ادیبوں کی تلخ نوابی سے آگاہ کیا، تو وہ کھلکھلا کر نہیں جیسے پہاڑی جھرنا پھوٹا ہے۔ پھر ڈوگری زبان میں اس نے مجھے دو بھینگوں کا قصہ سنایا، جس سے سلیں اردو میں یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ اگر امریکی بھینگا تمہیں روس کی گود میں بیٹھا دیکھتا ہے اور روی بھینگے کو تم امریکہ کی گود میں نظر آتے ہو، تو یقین جانو کہ تم واقعی پاکستان میں ہوا!

پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جزل کے طور پر مجھے دو بار منتخب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس ابتدائی دور میں گلڈ کی تنظیم و تعمیر کا سرا دراصل جمیل الدین عالیٰ کے سر ہے۔ اپنی نوابانہ ک بلاہی، شاعرانہ نازک، مزاجی، جبلی زودرنجی، ذکی الحسی اور طبعی لاابالی پن کے باوجود انہوں نے جنون کی حد تک دھن، لگن اور خلوص کے ساتھ گلڈ کے لیے انتحک کام کیا۔ طرح طرح کے نامساعد حالات میں انہوں نے ہر قسم کی مخالفت اور مزاحمت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اس معركہ آرائی میں انہیں انواع اقسام کے مصائب اور اذتوں سے بھی گزرنا پڑا۔ ایک بار تو وہ اسی کش کمش میں کچھ عرصہ کے لیے اپنی ملازمت تک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن گلڈ کے لیے ان کے جذبہ خدمت میں کوئی کمی

نہ آئی۔ میں نہایت ایمان داری سے اس بات کی گواہی دتا ہوں کہ گلڈ کے ادارے سے عالی صاحب نے اپنی ذات کے لیے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

رائٹرز گلڈ جب وجود میں آیا، تو اس کے منشور کے مطابق ہمارے عزائم نہایت بلند تھے۔ میں اپنی بے فوفیقی اور عدم صلاحیتی کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہم انہیں پورا کرنے میں بڑی حد تک ناکام رہے۔ ان ناکامیوں میں سرفراست گلڈ اشاعت گھر ہے۔ یہ قائم تو ہوا تھا اور غالباً میں باعیں کتابیں شائع بھی ہوئی تھیں، لیکن اس سے آگے نہ چل سکا۔

”ہم قلم“ کے نام سے گلڈ کا اپنا ادبی رسالہ بھی جاری ہوا تھا، لیکن تھوڑا سا عرصہ چل کر بند ہو گیا۔

اکیڈمی آف فرانس کے خطوط پر ہم نے پاکستان اکیڈمی آف لیزرز کا منصوبہ بھی تیار کیا تھا لیکن اس پر بھی کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ ابھی حال میں اسلام آباد میں اکیڈمی آف لیزرز کے نام سے جو ادارہ قائم ہوا ہے۔ اس سے ہمارے منصوبے کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں موجودہ اکیڈمی آف لیزرز بظاہر ایک رسی سی مکملانہ کارروائی نظر آتی ہے جو ایک ادنیٰ متحقہ ڈیپارٹمنٹ (Minor Attached Department) یا بلدیاتی سطح پر ادبی میونپل کمیٹی درجہ سوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ موجودہ صورت میں یہ ادارہ محفوظت اور وسائل کا ضیاع ہے۔

اویبوں کے لیے گروپ انشورنس فراہم کرنا بھی گلڈ کے اہم مقاصد میں شامل تھا، تاکہ بیماری کی حالت میں علاج معالجہ اور موت کی صورت میں لواحقین کے لیے مالی امداد کا خاطر خواہ بندوقت ہو سکے۔ پریکیم ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس وسائل کی کمی، اور رعایت حاصل کرنے کے لیے انشورنس کمپنیوں کے عدم توجیہ سے یہ مقصد بھی عملی جامہ نہ پہن سکا۔

ناکامیوں کی اس طویل فہرست کے مقابلہ میں گلڈ کا کوئی ایسا عظیم کارنامہ نہیں، جو ان کی تلافی کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ لے دے کے ہمارا واحد اثاثہ عزت نفس کا وہ

احساس تھا جو گلڈ کی تنظیم نے ادیبوں کی برادری کیلئے یقینی طور پر اجاگر کیا تھا۔ سونے چاندی کی دنیا میں اس اٹائے کی کوئی وقعت نہیں، لیکن انسانیت کے ترازو میں اس کا وزن بھاری ہے۔

اس زمانے میں یہ چلن تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں کئی ادیبوں کی ذاتی آزادی ان پڑھ پولیس افسروں اور نیم خواندہ مجرمینوں کے رحم و کرم پر منحصر ہوتی تھی۔ ایسے ادیب نہ کسی اخلاقی جرم میں ملوث ہوتے تھے۔ نہ کسی سیاسی بداعمالی کا ارتکاب کرتے تھے۔ لیکن پولیس کے فرضی روزناچوں کی بنیاد پر وقفہ فوقہ گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیئے جاتے تھے۔ نہ کبھی ان پر مقدمہ چلایا جاتا تھا۔ نہ کوئی فرد جرم عائد ہوتی تھی، لیکن پھر بھی یونہی وہ طویل طویل عرصہ تک کسپرسی کی حالت میں بے یار و مددگار جیلوں میں پڑے سڑتے رہتے تھے۔ ہم نے گلڈ کے نام پر ایسے بے گناہ اور معذوب اور مظلوم ادیبوں کی حمایت کا بیزا اٹھایا اور ان کوششوں کے نتیجہ میں درجنوں محبوس ادیبوں کو رہائی نصیب ہوئی۔

گلڈ کے تصورات، مطالعاتی رپورٹوں اور قردادوں کی بنیادوں پر ہی کالی رائٹ کا قانون جاری ہوا۔ نیشنل بک کونسل قائم ہوئی اور مرکزی اردو بورڈ بنا جس کا مقصد اردو کو قومی نفاذ کی سطح پر لانا اور تمام تعلیمی اور درسی ادیبات اور کتبیات کو اردو میں منتقل کرنا تھا۔ آدم جی فاؤنڈیشن، داؤڈ فاؤنڈیشن اور نیشنل بک آف پاکستان کے مہیا کردہ وسائل سے پانچ ادبی انعامات قائم کئے گئے، جو غالباً اب تک جاری ہیں۔ کئی بار اس بات پر تنقید اور تنقیص اور تنازعات کے طوفان اٹھتے رہے کہ فلاں کتاب کو انعام کیوں ملا اور فلاں کتاب کیوں نظر انداز کر دی گئی۔ ادبی تخلیقات کے معیار کی جانچ پڑتاں میں یہ کوئی انوکھا سانحہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ایسے اختلافات کی گنجائش ہمیشہ موجود رہنے کا امکان ہے قطع نظر اس کے کہ بچ صاحبان گلڈ نے نامزد کئے ہوں یا کسی اور ادارے نے۔

جن دنوں گلڈ کا قیام ظہور میں آیا، اسی زمانے میں مارشل لاء حکام نے ایک بُنک میں

قریباً آٹھ لاکھ روپے کی رقم ضبط کی تھی جو چند سیاستدانوں نے انتخابات میں کام لانے کے لیے خفیہ کھاتوں میں جمع کی ہوئی تھی۔ میری تجویز پر صدر ایوب نے اس رقم سے صدر کا ویلفنیر فنڈ قائم کر دیا، جس کا مقصد غریب اور معدنور افراد کی مالی مدد کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے اس ویلفنیر فنڈ میں دو لاکھ روپے کی رقم اس مقصد کے لیے مختص کرائی کہ اس سے بیماری کی حالت میں معدنور ادیبوں، صحافیوں اور فنکاروں کی وقتی مدد اور وفات کی صورت میں حاجت مند لواحقین کی اعانت کی جاسکے۔ ویلفنیر فنڈ کے اس حصہ کو چلانے کے لیے جو کمیٹی بنی، اس کا چنیروں میں مجھے مقرر کیا گیا۔ میں نے یہ طریق کار اختیار کیا تھا کہ اگر کسی ادیب کے حالات اور کوائف کی تصدیق کروانی ضروری سمجھی جاتی تھی، تو یہ کارروائی گلڈ کے علاقائی دفتر کے ذریعہ کروائی جاتی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ اس قسم کا امدادی فنڈ اب بھی قائم ہے اور اس میں رقم کی مقدار پہلے سے کئی گنا زیادہ تقسیم ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی شنید ہے کہ انکوائری کا کام انتظامیہ سے لیا جاتا ہے۔ کبھی پولیس والے تفتیش کرنے ادیبوں کے گھروں میں آگھستے ہیں۔ کبھی مرحوم ادیب کے پس ماندگان کو تھانے میں طلب کیا جاتا ہے۔ اگر یہ صورت حال صحیح ہے، تو میرے نزدیک مناسب نہیں، ادیب کے حالات کی نوہ ادیب کے ذریعہ ہی لگانی چاہیے۔ پولیس کا نشیبل کے ذریعہ نہیں۔

lahor میں اسیلی ہال کے پیچھے ایک وسیع احاطے میں جو گلڈ ہاؤس قائم ہے۔ پہلے یہ ایک ہوٹل تھا۔ یہ متروکہ جائیداد تھی اور بہت سے طاقتوں اور ذی اثر لوگ اسے مستقل طور پر اپنے نام منتقل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ گلڈ کے لیے اس قیمتی الملاک کو حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ داستان طولانی ہے اور اسے بیان کرنے میں خواہ مخواہ کسی قدر خودستائی کا پہلو نکلنے کا اندیشہ ہے۔ بس اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ جیل الدین عالیٰ کے ساتھ ملکہ میں نے کسی قدر تگ و دو کے بعد یہ جگہ بحالیات سے گلڈ کے نام منتقل کروا لی۔ اس کے بعد کئی سال تک اس الائمنٹ کے خلاف اپلیں

چلتی رہیں۔ اس مقدمہ بازی میں بیاض انور نے گلڈ کی طرف سے انتہائی محنت، مستقل مزاجی اور قابلیت سے عدالتوں میں پیروی کی۔ آخری اپیل جتنے کے بعد عمارت کا پورا قبضہ حاصل کرنا اور بہت سے ناجائز قبضین کو وہاں سے بیدخل کرنا ایک الگ مسئلہ تھا۔ اس مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ سلبھانے کے لیے اس وقت کے جزل سیکرٹری محمد طفیل صاحب نے بڑی محنت اور لگن سے کام کیا۔ اب یہ بیش قیمت جائیداد بلا شرکت غیرے گلڈ کے قبضہ میں ہے۔ خدا کرے کہ صاحب جائیداد ہو کر بھی گلڈ زراور نہیں کے روایتی گھریلوں میں گرنے سے محفوظ رہے اور خود کفیل ہو کر ان وسائل کے ذریعے ادبیوں کی فلاج و بہبود کے عظیم الشان منصوبے پروان چڑھائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آئین کے مطابق انتخابات ہوتے رہے اور گلڈ کی تنظیمی رگوں میں پابندی سے نیا خون شامل ہوتا رہا تو اس کا وجود کسی نہ کسی حد تک فعال صورت میں قائم و دائم رہے گا۔

ادھر گلڈ قائم ہوا، ادھر بریگیڈئر ایف آر خان کی رال اس ادارے پر بری طرح لپکنے لگی۔ یہ صاحب اس زمانے میں مارشل لاء کی حکومت کے روح رواں سمجھے جاتے تھے اور بزعم خود صدر ایوب کے لیے وہی خدمت سرانجام دینے کے لیے بے چین تھے جو ڈاکٹر گونبلز نے ہٹلر کے لیے انجام دی تھیں۔ عمدے کے لحاظ سے وہ وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری تھے، لیکن اثر و رسوخ کے اعتبار سے وہ صدر ایوب کو چھوڑ کر باقی سب وزیروں گورنروں اور اعلیٰ حکام پر دھونس جما کر انہیں اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کرنا اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بر ملا فوجی حکومت کا ”دماغ“ سمجھتے تھے اور کسی نہ کسی طریقے سے اس کا اعلان بھی فرماتے رہتے تھے۔ دماغ تو خیر ان کا اتنا ہی بڑا تھا، جتنا کہ ایک عام انسان کا ہوتا ہے، لیکن ان کا ایک خاص ملکہ یہ تھا کہ وہ دوسروں کے دماغ کرید کرید کر ان کے خیالات کو اپنے استعمال میں لانے کے باڈشاہ تھے۔ وزارت اطلاعات و نشریات کا چارج لیتے ہی انہوں نے یورو اف نیشنل ریکنستھرکشن (اداہ قومی تغیر نو) کے نام سے ایک نیا اداہ قائم کر لیا تھا،

جس کا مقصد قوم کی سوچ کو حکومت کی ساتھ ہم آہنگ کرنا تھا۔ جب گلڈ  
قام ہوا، تو بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان مجھے بھی سمجھے کہ میں نے نہایت چالاکی سے  
ان کے نسل پر اپنا دبلا مار دکھایا ہے اور گلڈ کے پردے میں ایک ایسا وصولی گھٹ بنایا  
ڈالا ہے۔ جہاں پاکستان بھر کے سارے چھوٹے بڑے ادبی حکومت کی تال پر چھوچھو  
کر قوم کے اجتماعی دماغ کو حسب فرماش اور حسب خواہش سرکاری صابن سے دھونے  
کا فریضہ سر انجام دیا کریں گے۔ میرے اس کارنائے پر انہوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار  
کیا اور اس ادارے کو اپنے طور پر کام میں لانے کے لیے انہوں نے پہلے تو ترغیب و  
تحمیص کے روپیلی اور سنری باغ دکھانے کی کوشش کی، جب یہ موثر ثابت نہ ہوئے،  
تو انہوں نے اپنے معمول کے مطابق زور آزمائی کا طریق کار اختیار کیا اور مختلف طور  
طریقوں سے میرا بازو توڑنے کا عمل شروع کیا، لیکن کچھ عرصہ بعد انہیں  
محسوس ہوا کہ میرا بازو بھی ریڑ کا بنا ہوا ہے، جو نہ چختا ہے نہ کھلتا ہے نہ نوٹتا ہے  
اس کے بعد بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان نے اپنا رویہ بدل لیا اور اس نے اب اسی بات  
پر قناعت کر لی کہ وہ ہمارے گلڈ کے دفاتر سے مبروں کی فہرست حاصل کرتا رہتا  
تھا اور یورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن کے نمائندے ایسے ادیبوں کی ٹوہ میں لگے رہتے  
تھے جو معاوضہ لے کر حکومت کی مرضی کے مطابق کچھ مضامین یا پہنچ اردو بنگالی،  
انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں میں لکھنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ صدر ایوب کے آئین  
اور بنیادی جمیوری نظام کی تشریف میں ان عناصر نے بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان سے معاوضہ  
لے کر خاصا کام کیا۔ یہ عناصر نہ گلڈ نے پیدا کئے تھے، نہ گلڈ کی وجہ سے پیدا ہوئے  
تھے۔ ادیبوں کی برادری میں ایسا بکاؤ مال ہر دور میں موجود رہا ہے اور رہے گا۔ گلڈ  
کی رکنیت ان کے لیے نہ کوئی رکاوٹ ہے نہ اعانت۔

اب گلڈ کی عمر ۲۳ سال سے اوپر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ اداہ میرے لیے باعث تمغہ  
اور بعض کے نزدیک باعث تمثیل ہے، لیکن میں اپنے آپ کو نہ تمغہ کا مستحق سمجھتا  
ہوں، نہ تمثیل کا۔ مجھے صرف اس بات پر فخر ہے کہ گلڈ کے قیام میں مجھے کچھ حصہ

قدرت اللہ شہاب

شہاب نامہ

لینے کا موقع نصیب ہوا۔

## • صدر ایوب سے اور صحافتے

صدارت سنھالنے سے پہلے اخبارات میں صدر ایوب کی دلچسپی کا مرکز شاک ایکچینج والا صفحہ ہوا کرتا تھا۔ فوج کی ملازمت کے دوران وہ اپنی بچت سے تجارتی اور صنعتی کمپنیوں کے حص خریدا کرتے تھے اور ان کے بھاؤ کے اتار چڑھاؤ پر کڑی نظر رکھنا ان کا روز بروز کا مشغله تھا۔

ان کے ذہن میں یہ بات پھر پر لکیر کی طرح جبی ہوئی تھی کہ ہماری معاشرے میں چھپے ہوئے حرف کی بے انتہا قدر و قیمت ہے۔ وہ اکثر کما کرتے تھے کہ بڑے سے بڑے بھوٹ کو پرنگ پرلیں کی مشین سے گزار کر کافند پر پھیلا دیا جائے تو کئی لوگوں کی نظر میں وہ قابل قبول اور قابل اعتبار بن جاتا ہے۔ اس لیے وہ مذاق سے پرنگ پرلیں کو ذہنی جنگ کا اسلحہ خانہ کما کرتے تھے۔ اقتدار میں آتے ہی صدر ایوب نے وزارت اطلاعات کے سربراہ بر گیڈیئر ایف۔ آر۔ خان پر طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اخبارات کے مالکوں کے تعلیمی اور مالی وسائل کیا ہوتے ہیں؟ جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے ایڈیٹریوں اور صحافیوں کی تعلیم و تربیت اور ٹریننگ کا کیا بندوبست ہے؟ چھاپے خانہ کے مالکوں کو پرنگ پرلیں کے ناجائز استعمال سے کس طرح روکا جاتا ہے؟ صحافیوں کی ملازمت کی شرائط اور اجرت مقرر کرنے کا کیا طریق کار رائج ہے؟ صدر ایوب اپنا یہ نظریہ دو ٹوک انداز میں بیان کیا کرتے تھے کہ معمول سے ڈپنسری میں مرہم پئی کرنے اور میکا لگانے کے لیے جو کماؤنڈر رکھے جاتے ہیں۔ انہیں اس کام کی پہلے سے باقاعدہ ترتیب دی جاتی ہے، لیکن قوم کے ذہن میں صبح و شام میکا لگانے کے لیے جو لوگ صحافت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لیے کسی قسم کی ٹریننگ حاصل کرنا بالکل لازمی نہیں۔

بر گیڈیئر ایف۔ آر۔ خان صدر ایوب کی نفیات سے خوب واقف تھے اور ان کی چشم

و ابرو کا اشائہ سمجھنے میں اس وقت فوجی نولہ میں سب سے نیا وہ ماہر قیافہ شناس تھے۔  
 مارشل لاء حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے وہ ہر چیز میں کیڑے نکالنے کے ریا تھے،  
 اور زندگی کے ہر شعبہ میں تطمیر اور اصلاح کا راستہ وہ اپنے ”فوجی فلسفہ انقلاب“ میں  
 ملاش کیا کرتے تھے۔ یہ خود ساختہ فلسفہ انقلاب چند ڈرامائی اقدامات پر مبنی تھا، جو بریگیڈئر  
 صاحب کے جوش خطابت اور جوش عمل کے بل بوتے پر وقتی ابال کی طرح رونما ہوتے  
 تھے، اور کچھ عرصہ کے بعد گیس چھوڑتی ہوئی کوکا کولا کی بوتل کی طرح بدمزہ ہو کر  
 کانٹھ کباڑ میں پھینک دیئے جاتے تھے۔ سب سے پہلے بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان نے دو  
 منذر والنشری گروپ کے نام سے چند فیشن ایبل خواتین کو جمع کر کے ایک انجمن بنائی،  
 جن کا نعرہ تھا کہ وہ صرف پاکستانی کھدر پہنیں گی، اور باہر سے آیا ہوا بناو سنگھار  
 کا کوئی سامان استعمال نہ کریں گی۔ نام کی حد تک تو بیگم ایوب کو اس انجمن کا سرپرست  
 بنایا گیا تھا، لیکن عملی طور پر وہ ہمیشہ اس قسم کی کارروائیوں سے الگ تھلک رہتی تھیں۔  
 اس لیے اس انجمن کی باغ ڈور ایسی سادگی پسند خواتین کے ہاتھ میں رہی۔ جنہوں نے  
 وسی کھدر میں بھی ایسے ایسے نقش و نگار اور گل بولے کھلانے کہ ایک ایک لباس  
 کی قیمت ریشم و کخواب سے باتیں کرنے لگی۔ ”سادگی اپناو کی یہ تحریک تھوڑا سا عرصہ  
 چند وزیروں اور سیکرٹریوں کی فیشن ایبل بیگمات کے دم قدم سے آراستہ و پیراستہ دیوان  
 خانوں میں چلی اور پھر اپنے آپ خاموشی سے دم توڑ گئی۔ بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان  
 کو گلہ تھا کہ ملک کا پریس اس قدر بے حس ثابت ہوا کہ اس نے اس انقلابی تحریک  
 کی خاطر خواہ پذیرائی تک نہ کی۔

اس کے بعد بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان نے فوجی انقلاب کا بول بالا کرنے کے لیے ایک  
 اور ہتھکنڈا استعمال کیا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح صدر ایوب کو قائل کر لیا کہ  
 ملک میں سب خرایبوں کی جزا یہ ہے کہ وزیروں اور سیکرٹریوں وغیرہ کی موثر کاروں پر  
 جھنڈے لبرائے جاتے ہیں۔ اس سے عوام اور حکومت کے نمائندوں کے درمیان فاصلہ

بڑھتا ہے اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ کابینہ کی ایک میٹنگ میں کافی تلخ بحث بحثی اور روکد کے بعد وزیروں اور سول افسروں کی کاروں سے تمام جھنڈے اتار لیے گئے۔ بریگیڈیر ایف۔ آر۔ خان کے نزدیک پرانے اور بوسیدہ سیاسی نظام کے تابوت میں انقلاب کی یہ آخری کیل تھی، لیکن رفتہ رفتہ جب یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ اس فیصلے سے بریگیڈیر صاحب کی اپنی ذات کے علاوہ اور کسی کا اعتماد نفس بلند نہیں ہوا، تو بہت جلد وزیروں اور افسروں کے جھنڈے ازسر نو اپنی اپنی کاروں پر اسی آب و تاب سے لہرانے لگے۔ اس پر بھی ایف۔ آر۔ خان کے دل میں یہی خیال پیدا ہوا کہ اتنا عظیم انقلابی اقدام بھی قومی پریس کی سرد مری، بے رخی اور عدم توجیہ سے ملک میں اپنا جائز مقام حاصل نہ کر سکا۔

صدر ایوب کو شکایت تھی کہ پاکستان کا پریس بہت نیاہ زود حس ہے۔ اس کے بر عکس بریگیڈیر ایف۔ آر۔ خان کے نزدیک قومی پریس بے حسی کا شکار تھا۔ مارشل لاء حکومت کے چند دوسرے اراکین کا خیال تھا کہ پاکستان پریس مغلون مزاج ہے۔ موقع و محل دیکھ کر زود حسی اور نازک مزاجی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ اور جب جی چاہتا ہے بے رخی اور بے حسی اختیار کر لیتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ صحیح سوریے آنکھ کھلتے ہی حکومت کے چھوٹے بڑے سب اراکین سب سے پہلے روزنامہ اخبارات کی سرخیوں سے دوچارہ ہوتے ہیں۔ کہیں سرکاری توقعات اور خواہشات میں تضاد اور تصادم نظر آتا ہے، کہیں ذاتی احساسات ابھرتے ہوئے یا کچلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے سرکاری عمدہ داروں کی اکثریت پریس کی روشن میں پریس کے معیار کو اپنے داخلی پیانا سے ناپنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔

اس صورت حال کے پیش نظر بریگیڈیر ایف۔ آر۔ خان نے اپنے نو ساختہ یورو آف نیشنری کنسٹرکشن میں چند لوگوں کو ٹائسک فورس کا نام دے کر انہیں یہ کام تفویض کیا کہ وہ پاکستانی پریس کے نفیاتی اور دیگر احوال و کوائف پر جلد از جلد ایک مطالعاتی رپورٹ پیش کریں۔ یہ رپورٹ میری نظر سے تو نہیں گزری، لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس

ٹائک فورس نے تحقیق و تفتیش کا جو پہاڑ کھودا اس میں سے صرف پرلیس کمیشن کی چوہیا برآمد ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بریگیڈئر صاحب کی زبان پر ہمہ وقت ”پرلیس کمیشن“ کی اصطلاح تکمیل کلام کی طرح جاری ہو گئی اور اب جہاں کہیں اخبارات کے متعلق کوئی سوال اٹھتا تھا۔ وہ نہایت وثوق سے سب کو پرلیس کمیشن کی رپورٹ کے آنے تک انتظار کرنے کا مشورہ دیتے تھے، جس کے بعد ان کے زعم میں پاکستان میں اپنے عہد سعادت کا دور شروع ہو جائے گا۔

پرلیس کمیشن کا تاریخی پس منظر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ کمیشن ستمبر ۱۹۵۳ء میں قائم ہوا تھا۔ ہائی کورٹ کا ایک سابق نجج اس کا چیئرمین تھا اور کمیشن کے ۱۳ ممبروں میں سے ۹ ممبر اخبارات کے ایڈیٹرلوں پر مشتمل تھے۔ اس زمانے میں پاکستان ایڈیٹرلوں کی دو متوازی اور عام طور پر متحارب تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔ ایک کا نام آل پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرزوں کا فرننس تھا اور دوسری کونسل آف پاکستان ایڈیٹرزوں کی تھی۔ ان ۹ ایڈیٹرلوں میں سے کچھ ایک تنظیم کے ساتھ وابستہ تھے۔ کچھ دوسری تنظیم کے ساتھ مسلک تھے۔ غالباً اس وجہ سے کمیشن میں صحافت کے پیشتر معاملات پر اتفاق رائے کا شدید نقدان رہا اور پورے چار برس تک پرلیس کمیشن کے کام میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

مارشل لاء کے نفاذ سے ایک ماہ قبل حکومت نے ستمبر ۱۹۵۸ء میں پرلیس کمیشن کی تنظیم نو کی۔ نئی تنظیل کے مطابق کمیشن کا ایک چیئرمین اور ۵ ممبر مقرر ہوئے۔ ان ۵ ممبروں میں صرف ایک پیشہ ور صحافی شامل تھا، جسے ممبر سیکرٹری کے طور پر نامزد کیا گیا تھا۔ یہ کمیشن فوجی حکومت کی تخلیق نونہ تھا، لیکن مارشل لاء لگتے ہی بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان نے اسے اس کے کام میں اس طرح مہیز کرنا شروع کیا کہ اس نے اپنی رپورٹ آٹھ ماہ کے اندر اندر مکمل کر لی۔ بریگیڈئر صاحب اپنی دھن کے آدمی تھے۔ انہوں نے پرلیس کمیشن کی رپورٹ کو آڑ بنا کر وزارت اطلاعات کے لائچہ عمل کو ایسے خطوط

پر استوار کیا جس سے ایک اچھا نتیجہ برآمد ہوا اور دوسرا نہایت برا۔  
اچھے نتیجے سے میری مراد

### The Working Journalists (Conditions of Service)

URDU4U.COM

Ordinance No. XVI of 1960

ہے جو ۲۷ اپریل کو صدر پاکستان نے جاری کیا۔ اس آرڈیننس کے طفیل ملک میں پہلی بار کارکن صحافیوں کی تنخوا، الاؤنس اور شرائط ملازمت کو کسی قدر تحفظ حاصل ہوا۔ وتع بورڈ قائم ہوئے اور پیشہ ور صحافیوں کے لیے پرو ایڈنٹ فنڈ جاری کرنا قانونی پابندی قرار پائی۔

اس خوش آئند آرڈیننس سے صرف ایک روز پہلے ۲۶ اپریل ۱۹۶۰ء کو وہ قانون نافذ ہو چکا تھا، جو

The Press and publications Ordinance No. XV of 1968 کے نام سے موسوم ہے اور پاکستان کی دنیا کے صحافت میں بجا طور پر "کالے قانون" کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس وقت مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ مجموعی طور پر ملک بھر کے اخبارات احتیاط پسندی سے کام لے رہے تھے اور جہاں تک میرا اندانہ ہے۔ کہیں بھی کوئی ایسے حالات رومنانہ ہو رہے تھے جو اس سخت گیر قانون کے نفاذ کو صحیح یا حق بجانب ثابت کر سکتے۔ دراصل فوجی زندگی کی تربیت اور تجربات نے صدر ایوب کو نیا ہد تر "لیں سر" اور "جی ہاں" سننے کا خوگر بنا رکھا تھا۔ ان کے نکتھے نظر پر معمولی سی تنقید یا انحراف ان کو چیز بجیس کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ صحافت کے متعلق چند ایسے تعصبات بھی تھے جو زمانہ دراز سے ان کی رُگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ اپنے دوسرے اصلاحی منصوبوں کی طرح وہ جرنلزم کے پیشے کو بھی بزغم خود مثبت خطوط پر منظم کرنے اور سوارنے کے خواہشند تھے۔ بد قسمی سے بر گیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کی ذات میں ان کو ایک ایسا باصلاحیت اور اطاعت پذیر سیکرٹری اطلاعات مل گیا، جو ان کے ذرا سے اشارے پر بڑے سے بڑا خطرہ مول یعنی کے لیے ہر وقت کمر بستہ کھڑ

رہتا تھا۔ جب اس نے وزارت اطلاعات کی پٹاری سے پرلیس اینڈ پبلی کیشنر آرڈی ننس کا مسودہ برآمد کر کے کابینہ میں منظوری کے لیے پیش کیا، تو سب نے بڑی خوش مل سے اس پر آمنا و صدقنا کہا۔ اس وقت کابینہ میں یونیورسٹری وزیر ایسے تھے جنہوں نے بڑے بڑے سول اور ملٹری عہدوں کی پناہ میں زندگی گزاری تھی اور ملک میں ایک ایسا پرلیس جو ان کی ذات اور وزارت کو ہدف تقيید نہ بنا سکے۔ ان کے لیے انتہائی مرغوب خاطر تھا۔

اپنی تمام تر ناقابل قبول سختیوں اور پابندیوں کے باوجود اس قانون میں صرف ایک مد ایسی تھی جسے کسی قدر اطمینان بخش کما جا سکتا تھا۔ وہ یہ تھی کہ چھاپے خانوں کے زرضانت کی ضبطی وغیرہ کے متعلق تمام امور کا فیصلہ انتظامیہ کی مجائے عدیہ پر چھوڑا گیا تھا، لیکن تین سال کے اندر اندر حالات نے پلٹا کھایا اور اگست ۱۹۶۳ء میں جب مغربی پاکستان کی صوبائی حکومت نے اسی آرڈی ننس کو انتہائی ترمیم شدہ حالت میں ازسر نو جاری کیا، تو یہ مد بھی غائب ہو گئی جون ۱۹۶۲ء میں مارشل لاء ائٹھ گیا تھا، اور نئے آئیں کے تحت بنیادی جمیوریت کے نظام کا درد شروع ہو گیا تھا۔ مارشل لاء کے دوران انہوں نے مجبوراً اپنے اوپر اوڑھ رکھا تھا۔ زور خطابت سے اپنی جولانی طبع دکھانے کے لیے نئے اور پرانے سیاستدانوں کو اسمبلیوں کے ایوان بھی تانہ تانہ ملے تھے، چنانچہ اسمبلیوں کے اندر اور باہر اور اخبارات کے صفحات پر جو کچھ ظہور میں آیا وہ نارمل حالات میں تو بالکل طبعی، باقاعدہ اور معمولی واقعات تھے، لیکن مارشل لاء کی چھتری کے نیچے چھائے ہوئے جھوٹے سکون میں یہ سارا ہنگامہ انتہائی شدید طوفان نظر آتا تھا حکومت کے اراکین جو پہلے مارشل لاء کے حفاظتی حصار میں بیٹھے تھے۔ اب کھلم کھلا عوام اور صحافت کی بے رحم سرچ لائٹ کے نیچے آ گئے۔ اس صورت حال سے صدر ایوب بھی پریشان تھے اور کابینہ میں ان کے بہت سے رفیق بھی بے حد بوکھلائے ہوئے تھے۔

اس پریشانی اور بوکھلاہٹ کا مجھے براہ راست ذاتی علم ہے۔ اس وقت تک وزارت اطلاعات سے بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان کا بستر گول ہو چکا تھا اور وہ جی۔ ایچ۔ کیو میں کسی

بے ضرر اہم اور غیر اسی کی پول میں دھانس دیئے گئے تھے۔ اسکے بعد وزارت اطلاعات کے کانٹوں کی مالا پسلے مسٹر نذیر احمد نے اور پھر سید ہاشم رضا نے کیے بعد دیگرے پہنچی۔ مارشل لاءِ اتحانے اور نیا آئین نافذ کرنے کے موقع پر اس وزارت کا چارج سنپھانے کے لیے صدر ایوب کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی۔ اس وزارت میں قدم رکھتے ہی صدر سے لے کر وزیروں تک فرمائشوں کی وہ بوجھاڑ شروع ہوئی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ کسی کو گلہ تھا کہ اس کی تصویر نہیں چھپی۔ کسی کو شکایت تھی کہ اس کے بیان یا تقریر کا پورا متن نہیں چھپا۔ کوئی کہتا تھا کہ فلاں تنقید غلط ہے اور حکومت کا وقار گرانے کے لیے اچھالی جا رہی ہے۔ عام مخلوق خدا کی طرح کبھی کبھی کچھ وزیر صاحبان بھی وقفہ فوقہ بیمار پڑتے رہتے تھے۔ ان میں سے چند ایسے تھے کہ اگر ان کی بیماری کی خبر اخبار میں شائع ہو جاتی تھی، تو وہ اسے شرائیگزی کا شوشه قرار دیتے تھے جو اخبار والے ان کی وزارت ختم کرنے کے لیے خواہ مخواہ چھوڑتے رہتے ہیں۔ اخباری دنیا میں صدر مملکت کی ذات کے ساتھ شائگنگی اور احترام کا سلوک روا رکھنے کی رسم عام تھی اور ذاتی طور پر صدر کو کسی انتہائی شدید اور غیر مناسب تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا، لیکن جب گوہر ایوب کے نام گندھارا انڈسٹریز کی منتقلی کا کھڑاگ کھڑا ہوا، تو یہ امتیاز بھی اٹھ گیا اور اس معاملے پر نکتہ چینی اورے لے دے کا وہ طوفان برباد ہوا جو اپنی شدت میں بے مثال تھا۔ صدر کے وزیروں اور رفیقوں میں کوئی ایسا نہ تھا۔ جو اس موقع پر انہیں تحمل، تذریز اور ضبط نفس کا مشونہ دے سکتا۔ اس کے برعکس سب لوگ انہیں ایڈ لگا لگا کر اسی راستے پر گامزن رکھنا چاہتے تھے جو انہوں نے میرے خیال میں غلط طور پر اختیار کر رکھا تھا۔ وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب نے ایک خفیہ سی پریس کانفرنس منعقد کی اور اعداد و شمار کی شعبدہ بازی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ گندھارا انڈسٹریز کی تجارتی کارروائی میں ہرگز کوئی پچیدگی نہیں اور یہ انتہائی کھرا، بے لاغ اور صاف سودا ہے، لیکن ان کی منطق کسی کو قائل نہ کر سکی۔ بلکہ اتنا یہ اثر چھوڑ

گئی کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے جسے چھپانے کی اتنی بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔ ایک وزیر نے تو اسمبلی کے ایوان میں کھڑے ہو کر یہاں تک اعلان کر دیا کہ اگر صدر مملکت کا پیٹا گندھارا انڈسٹریز کا حقدار نہیں مانا جاتا، تو کیا اسے کسی تیتم خانے میں داخل کر دیا جائے؟ ہر وزیر اخبار والوں پر حسب توفیق لعن طعن کر رہا تھا کہ گندھارا انڈسٹریز کی آڑ میں قوی صحافت سربراہ مملکت کے وقار کو مجرور اور حکومت وقت کی بنیاد کو کمزور کرنے میں مصروف عمل ہے۔ اس نقار خانے میں طوطی کی آواز سننے کی بھلا کہاں گنجائش تھی؟ پھر بھی میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ سیکریٹری اطلاعات کے طور پر اپنا سرکاری اور صدر ایوب کے ساتھ ذاتی خلوص کی بنا پر اپنا اخلاقی فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کروں۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں ایک تحریری نوٹ پیش کیا جس میں میں نے نہایت ادب سے صدر محترم کو دو برس پہلے کا ایک واقعہ یاد دلانے کی جارت کی، جب کہ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے باضابطہ کارروائی کے بعد مرکز کے وزیر صنعت مسٹر ابوالقاسم خان کو چٹا گانگ میں ایک جوٹ مل قائم کرنے کی منظوری دی تھی۔ جب میں نے یہ فائل صدر ایوب کی خدمت میں پیش کی، تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے اس پر یہ احکام صادر فرمائے تھے کہ ”استحقاق کی بنا پر مسٹر ابوالقاسم یہ کارخانہ لگانے کے جائز طور پر حقدار ہیں، لیکن انقلابی کابینہ کے وزیر کی حیثیت سے ان کا یہ اقدام غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے میں درخواست کروں گا کہ مسٹر ابوالقاسم اس منظوری سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں۔“

اس کے بعد میں نے اپنے نوٹ میں صدر ایوب سے پر زور اپیل کی تھی کہ گندھارا انڈسٹریز کے سلسلے میں بھی اگر وہ اپنے وضع کردہ اس سنگری اصول کو زیر عمل لا سکیں۔ تو بہت سی غلط فہمیوں کا خود بخود سدباب ہو جائے گا۔

صدر ایوب نے میرا نوٹ پڑھا تو ضرور لیکن اسے بلا تبصرہ میرے پاس ولیے ہی واپس بھیج دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں بات ناگوار گزری ہے۔ رفتہ رفتہ ان کے زیر ک اور پرفراست چرے میں مجھے واضح طور پر یہ آثار بھی نظر آتا شروع ہو گئے کہ

و سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے میری پہلی سی افادیت برقرار نہیں رہی۔ اسی زمانے میں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ایک روز صبح صدر ایوب راولپنڈی سے مری روانہ ہونے والے تھے جہاں انہوں نے دن کے دس بجے نواب کلا باغ اور چند مرکزی وزراء کے ساتھ ایک مینگ مقرر کی ہوئی تھی۔ مینگ میں حکومت اور ارکین حکومت کے خلاف ملک کے اخبارات کا روایہ زیر بحث آتا تھا۔ رواگی سے پہلے صدر نے مجھے فون پر کہا کہ راستے میں وہ میرے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں ان کے ساتھ ان کی کار میں بیٹھ کر مری چلوں۔ ٹھیک آئھے بجے صبح میں صدر ایوب کی اڑکنڈیشنڈ کار میں ان کے ساتھ مری روانہ ہونے کے لیے بیٹھ گیا۔ اس خنک اور آرام وہ ماحول میں اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پل بھر کے لیے مجھے کچھ اوپنگ سی آگئی ہو میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں صدر ایوب نے مجھے اوپنگتے ہوئے تو نہیں دیکھ لیا، لیکن وہ کسی قدر آزدگی سے خفا خفما نہ پھلانے بیٹھے تھے، کیونکہ راولپنڈی سے مری تک سارا راستہ میں گھری نیند سو رہا تھا اور اب ہماری گاڑی مری پہنچ کر گورنر ہاؤس میں داخل ہو رہی تھی۔

”میں باتیں خاک کرتا۔“ صدر ایوب نے کسی قدر جنبھلا کر کہا۔ ”تم تو گھنٹہ بھر گھری نیند سوتے رہے۔“

جواب میں میرے پاس کچھ بھی کہنے کو نہیں تھا۔ میں نے شرمندہ ہو کر اقبالی مجرم کی طرح اپنی گردن جھکا لی اور خاموش رہا۔

میری شدید الجھن، پریشانی اور ندامت بجانپ کر صدر ایوب کسی قدر پیچے اور مسکرا کر بولے، ”ایسے حالات میں اتنی گھری نیند اسی کو آسکتی ہے۔ جس کے ضمیر کا بوجھ نہایت بلکا ہو۔“

مینگ کے کمرے میں پہنچ کر صدر ایوب نے غالباً لطیفہ کے طور پر یہ واقعہ سب کو سنایا۔ چند ایک حضرات نے خوشامد افرمائشی قہقہے لگائے، لیکن نواب کلا باغ اور دو تین وزراء بدستور سنجیدہ رہے اور انہوں نے کن انگھیوں سے کئی بار مجھے بری طرح گھورا۔

حکومت کے متعلق مختلف اخبارات کے روایہ پر گفتگو شروع ہوئی، تو ایک مرحلے پر نواب کلا باغ نے کہا۔ ”جناب“ میں نے تو صبح کے وقت اخبار پڑھنا ہی ترک کر دیا ہے۔ آج کل اخبارات ہمارے اوپر اتنی گندگی اچھاتے ہیں کہ صبح صبح انہیں پڑھ کر بلذہ پریشر بڑھتا اور طبیعت منغض ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد دن بھر کام ٹھیک طرح نہیں ہوتا۔“

”یہ سن کر وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب نے پوچھا۔ ”نواب صاحب، اگر آپ اخبارات کو پڑھتے ہیں تو پھر نیند کیسے آتی ہے؟“  
نواب کلا باغ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے۔ ”یہ راز تو مسٹر شام سے پوچھئے۔“

مسٹر محمد شعیب نے بھی طنز کا نشتر چلا کر سچھتی اٹھائی۔ ”ہاں بھی شام۔ یہ گر ذرا ہمیں بھی تو سکھاؤ۔“

ان دونوں حضرات کا یہ طعن آمیز انداز گفتگو سن کر مجھے غصہ آگیا اور میں نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے گزارش کی۔ ”سر، گورنر مغربی پاکستان اور وزیر خزانہ کو یہ نیب نہیں دیتا کہ انسانی کمزوری کے ایک معمول سے واقعہ کو آڑ بنا کر مجھے اس طرح طعن و تشنج کا نشانہ بنائیں۔ ان دونوں کے اس نامناسب روایہ پر میں آپ کی خدمت میں شدید احتجاج کرتا ہوں۔“

نواب صاحب کی عادت تھی کہ غصہ فرو کرنے کے لیے وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اپنی گھنی مونچھوں پر پھریا کرنا شروع کر دیا کرتے تھے۔ وہ تو ہونٹ بھینچ کر اس عمل میں مصروف ہو گئے، لیکن وزیر خزانہ مسٹر شعیب طیش کھا کر آپ سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے غصے سے کپکپاتی ہوئی آواز میں زور زور سے جیخ کر وزارت اطلاعات اور میری ذات پر بے سرو پا شکایات اور الزامات کا دفتر کھول دیا۔ سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وزارت اطلاعات کا پریس والوں پر کوئی کنٹرول نہیں۔ اس کی وجہ یا ناالہیت ہے یا ملی بھگت ہے۔

ناظمیت کا الزام تو میں بخوبی قبول کر لیتا مگر ملی بھگت کے متعلق میں نے شعیب صاحب سے مزید وضاحت طلب کی کہ اس سے ان کا کیا مطلب ہے۔

جواب میں انہوں نے کئی دور از کار واقعات کا حوالہ دیا جن میں ایک یہ تھا کہ کسی وقت وزیر خزانہ میڈیکل چیک اپ کے لیے کمائنڈ ملٹری ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پریس آفیسر کو ہدایت دی تھی کہ یہ بات تکمیل طور پر صیغہ راز میں رہے۔ لیکن اس کے باوجود چند اخباروں میں یہ خبر اس طرح شائع ہو گئی کہ وزیر خزانہ قلب کے عارضہ میں مبتلا ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے ہیں۔ شعیب صاحب کا خیال تھا کہ یہ شر انگیز خبر صرف اس مقصد سے شائع کی گئی تھی کہ ان کو جسمانی طور پر مغذور اور نکما ظاہر کر کے عوام کی نظر میں وزارت کے ناقابل اور نااہل قرار دیا جا سکے۔

گرفتار کی رو میں میرے منہ سے یہ جواب نکل گیا کہ ”عارضہ قلب تو ایک عام بیماری ہے۔ جو ہم سب کو کسی نہ کسی وقت لاحق ہو سکتی ہے، لیکن ہمارے ملک کے عوام تو اس قدر سیدھے، اطاعت شعار اور فرمانبردار ہیں کہ انہوں نے غلام محمد جیسے مغلون، مغذور اور اپائچ انسان کو عرصہ دراز تک سربراہ مملکت کی کرسی پر برضاو رغبت برداشت کیا۔

ماضی کے درستھے میں جھانک کر آج میں اس واقعہ پر دوبارہ غور کرتا ہوں، تو مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میرے لیے اس طرح کا جواب دینا غیر ضروری اور نامناسب تھا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میرا جواب سن کر شعیب صاحب غصے کے مارے کف در دہن ہو گئے۔ کچھ آواز انہوں نے بلند کی۔ کچھ بلند بالگی میری جانب سے اٹھی۔ یہ شور و شبب باہر سنائی دیا، تو صدر کا پرستیں باڑی گارڈ فوراً دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر صدر ایوب کھیانے سے ہو گئے اور ہم دونوں بھی جھینپ کر خاموش ہو گئے۔ صدر نے اسے حکم دیا کہ وہ باہر جا کر چائے بھجوائے۔

چائے کے بعد پریس کے معاملات پر دوبارہ میٹنگ شروع ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں اس مجلس میں ایک اجنبی کی طرح شامل ہوں۔ قومی پریس پر مضبوط کنٹرول

قائم کرنے کے لیے نواب کلا باغ سے لے کر ہر وزیر باتیں اپنی بساط کے مطابق طرح طرح کے نئے تجویز کر رہا تھا۔ ایک صاحب کراچی کے روزنامہ ڈان پر گرج برس رہے تھے۔ دوسرے صاحب کے غنیض و غصب کا لٹکانہ لاہور کا روزنامہ نوائے وقت تھا۔ ان بس کی نظر میں یہ دو اخبار سانپ کے مثل تھے جو حکومت پر ڈینگ مارنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ان دونوں اخبارات کے زہریلے دانت نکلنے کے لیے بھانست بھانست کی تبیریں اور تجویزیں پیش ہو رہی تھیں۔ کسی نے مشوہد دیا کہ ”ڈان“ اور ”نوائے وقت“ کو بھی ”پاکستان نائمز“ اور ”امرورز“ کی طرح حکومت کے قبضے میں لے لیتا چاہیے۔ اس پر صدر ایوب گزر گئے کہ حکومت کے قبضے میں آ کر ”پاکستان نائمز“ اور ”امرورز“ چل نہیں رہے، بلکہ رینگ رہے ہیں۔ اب مزید اخباروں کو قبضے میں لے کر حکومت کون سا نیا تیر مارے گی؟ اس قسم کا بے ترتیب اور مسارکن مذاکہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا اور اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ ”ڈان“ اور ”نوائے وقت“ شائع کرنے والی کمپنیوں میں جو سرمایا لگا ہوا ہے۔ اس کے حصے داروں کی فہرست حاصل کی جائے، اور حکومت کے منتخب افراد اور اداروں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ حکمت عملی سے ان حصوں کو نیا ہد سے نیا ہد تعداد میں خرید کر ان دونوں اخباروں کی شہ رگ اپنے ہاتھ میں قابو کر لیں۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک وزارتی کمیٹی بنائی جائے، جس کا فیصلہ بعد میں ہو گا۔

اس ساری بحث و تمحیص اور منصوبہ بندی کے دوران سب نے مجھے ایک اجنبی کی طرح نظر انداز کئے رکھا، جیسے کسی چھوٹ چھات کی بیماری کے مریض کو الگ تھلک ایک طرف بٹھا دیا ہو۔ ساری بحثا بحثی میں کسی نے مجھ سے نہ کوئی سوال پوچھا نہ کوئی بات کی۔ جب مینگ برخاست ہونے لگی، تو ایک وزیر صدر سے کہا۔ ”جناب میری درخواست ہے کہ اس مینگ کی کارروائی کابینہ کی رو سیداد کی طرح خفیہ رکھی جائے اور یہاں پر جو کچھ کہا اور سنایا ہے وہ باہر نہ نکلنے پائے۔“

یہ بات سنتے ہی سب کی نگاہیں بے اختیار میری جانب اٹھ گئیں۔ مجھے غصہ تو بہت آیا،

اور کچھ جلی کئی سنانے کو جی بھی چاہا، لیکن موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ پنج کا وقت ہو گیا تھا اور سب لوگ صدر ایوب کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے لیے بے تابی سے منتشر ہو رہے تھے۔ پنج پر میں بھی مدعو تھا، لیکن ناسازی طبیعت کا بہانہ کر کے میں نے پریزینٹ کے پرنسپل شاف سے مذکورت کر لی اور ایک دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر راولپنڈی چلا آیا۔

گھر پہنچا تو چار بجے کا عمل تھا۔ عفت بے چاری پریشان بیٹھی تھی۔ کیونکہ مری سے دو تین بار ٹیلی فون آ چکا تھا، جس میں میرا اتا پتہ پوچھا گیا تھا اور پیغام تھا کہ صدر صاحب نے شام کے چھ بجے مجھے ملنے کے لیے طلب فرمایا ہے۔ میں نے عفت کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور اسی وقت اٹھے پاؤں مری کے لیے روانہ ہو گیا۔

شام کے چھ بجے صدر ایوب گورنر ہاؤس کے وسیع و عریض، سربز خوبصورت لان میں چہل قدمی کر رہے تھے، مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا اور بولے۔ ”آج کا دن تمہارے لیے سخت گزرا۔ زیادہ پریشان تو نہیں ہو؟“

”نہیں سر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بلکہ مجھے اس بات پر ندامت ہے کہ آج میں دن بھر آپ کے لیے خواہ مخواہ درود سر بنا رہا۔“

کچھ دیر شش و پنج کی حالت میں خاموشی چھائی رہی۔ بھر میں جی کڑا کر کے حرف مدعا زیان پر لے ہی آیا۔ ”سر،“ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے کام کی صلاحیت اور افادیت کا گراف اپنی حد کو چھو کر اب تیزی سے نشیب کی طرف گرنا شروع ہو گیا ہے۔

صدر ایوب نے لمحہ بھر کے لیے ٹکنکی باندھ کر مجھے دیکھا، اور تیزی سے بولے:

Well, go ahead. What are you driving at?

میں نے پوری دل جتنی اور سکون سے کہا: ”سر، ایسے حالات میں اصول اور غیرت کا تقاضا یکی ہے کہ میں مستغفی ہو جاؤ۔“

صدر ایوب چلتے چلتے رک گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ”دیکھو شہاب میں تمہیں اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی

جو خواہ مخواہ ملازمت سے ہاتھ دھونے کی معقول وجہ بن سکے۔ اس لیے اس خام خیالی کو دل سے نکال دو۔“

صدر ایوب کے اس شفقانہ رویہ کا دل سے شکریہ و شہب کی گنجائش نہیں کہ وزارت اطلاعات میں میری پوسٹنگ اب بالکل بعید از کار اور بے معنی ہے۔“

یہ سن کر صدر ایوب کچھ معنی خیز طور پر مسکرائے جس پر مجھے تعجب ہوا اور فرمائے گے۔  
”خیر، اس کے متعلق میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

چند ہفتے کے بعد انہوں نے خود تو نہیں، لیکن اپنے پرنسل سیکریٹری مسٹر این، اے فاروقی کے ذریعہ مجھے یہ بتا دیا کہ مجھے وزارت اطلاعات سے بسکدوش کیا جا رہا ہے اور میری اگلی تعیناتی بعد میں طے کی جائے گی۔ فاروقی صاحب یہ پیغام لے کر اتوار کے روز دن کے باہم بجے میرے ہاں تشریف لائے تھے۔ میں نے کہا۔ ”آج تعطیل کے روز آپ نے یہ زحمت کیوں اٹھائی؟ یہی بات صدر صاحب مجھے بلا کریا یا فقط ٹیلی فون پر ہی بتا سکتے تھے۔“

”صدر صاحب کی آنکھ میں مروت بہت ہے۔“ فاروقی صاحب بولے۔ ”غالباً یہ ناخوشگوار فیصلہ وہ تمہیں خود نہیں سنانا چاہتے تھے۔“

یہ سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ کہاں کا ناخوشگوار فیصلہ؟ اور کیسی مروت؟ یہی پیشکش تو میں خود ہی چند ہفتہ قبل جناب صدر کی ذات گرامی میں پیش کر چکا تھا۔ اگلی ملاقات پر میں نے دبے لفظوں میں صدر ایوب کے ساتھ اس بات کا گلہ کیا، تو وہ کچھ جیھنپ گئے اور ان کے چہرے پر کسی قدر سرفی سی دوڑ گئی۔ اپنا مافی الصیر صاف صاف بیان کرنے کے لیے انہوں نے ایک طولانی سی تشریحی اور توضیحی تقریر کا سامارا لیا۔ یہ بات ان کی وضع اور معمول کی سراسر خلاف تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ ”اخبارات کو راست پر لانے کے لیے اب ہم نے سخت اقدامات کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس مقصد کے لیے پریس کے قوانین میں ترمیمیں کی جا رہی ہیں۔ نئے آئین کے تحت یہ تبدیلیاں صوبائی حکومتیں نافذ کریں گی۔“

اتنا کہہ کر صدر ایوب نے نواب کلا باغ کی شان میں بہت سے تعریفی کلمات کے اور بولے۔ ”مجھے یقین ہے کہ نواب صاحب اخبار والوں کی ملکیت کس کر انہیں ایسا باندھیں گے کہ ان کو نافی یاد آجائے گی۔“

اُنکے بعد مجھے دلسا دینے کے لیے صدر صاحب نے یہ خوشخبری سنائی۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تمہیں اس کارروائی میں شامل نہیں کیا جا رہا۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ سخت گیر اقدامات کا بھانے کی صلاحیت طبع تم میں موجود نہیں۔ دوسرے رائز گلڈ کے عمدے دار کی حیثیت سے آزادی تحریر وغیرہ کا ساتھ بھی دنباڑتا ہے۔ میں اس کا برا نہیں ملتا۔ ایک روز تم میرے شکر گزار ہو گے کہ میں نے تمہیں صحیح وقت پر وزارت اطلاعات سے سبکدوش ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔“

صدر ایوب کی اس بات سے میں ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ کیونکہ میں صاف بھانپ گیا تھا کہ آج وہ میرے ساتھ روایتی صاف گوئی سے کام نہیں لے رہے۔ مجھے اس بات کا ذاتی علم تھا کہ ملک میں رونما ہونے والے چند واقعات اور حالات کا صدر کے ذہن پر اس قدر شدید دباؤ تھا کہ وزارت اطلاعات سے مجھے الگ کرنا ان کے لیے قریباً قریباً ناگزیر ہو گیا تھا۔ ان حالات اور واقعات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ان کو زبان پر لانا یا تسلیم کرنا ہرگز ان کی شان کے شیلان نہ ہوتا۔ اس معاملے میں ان کا اخفاپ پسندانہ رویہ میرے نزدیک بالکل قدرتی اور قابل فہم ہے۔

ان واقعات کا پس منظر کسی قدر پرانا ہے۔ امریکہ کے ساتھ سالہا سال سے ہماری نمایت برخوردارانہ اور سعادت مندانہ طرز کی دوستی چلی آ رہی تھی۔ اس کے بر عکس ہندوستان کا روس کے ساتھ گٹھ جوڑ تو بالکل عیاں تھا، لیکن امریکہ کے ساتھ بھارت کے تعلقات میں تجاذب عارفانہ اور سرد مری کا عصر غالب رہتا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین کے ساتھ سرحدی جنگ میں ہندوستان کو شکست فاش ہوئی تو امریکہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ہندوستان کو اپنے حلقة اثر میں لانے کے لیے اسے بے دریغ نمایت بھاری مقدار

میں مالی اور فوجی امداد دینا شروع کر دی۔ روس کے علاوہ امریکہ کی طرف سے بھی ہندوستان کو بے تحاشا فوجی امداد کی بھرمار دیکھ کر قدرتی طور پر پاکستان میں اس کا شدید رو عمل ہوا۔ ہمارے محب وطن اخبارات نے اس عکسیں صورت حال کا پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ جائز لیا اور ملک بھر میں امریکہ کے اس رویے کے خلاف مخالفت، تنقید اور تنقیص کی ایک تیز لر دوڑنے لگی۔ پاکستان میں امریکی سفارت کار غالباً اس غلط فہمی میں بنتا تھے کہ یہاں کی صحافت مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں ہے اور ہندوستان کو کشیر اور خلیفہ فوجی مدد دینے پر امریکہ کے خلاف جو کچھ تحریر ہو رہا ہے۔ وہ ضرور وزارت اطلاعات کے ایما پر لکھوا�ا جا رہا ہے۔ اس لیے امریکن ایمبیسی نے میرا نام اپنے ناپسندیدہ اشخاص کے کھاتے میں درج کر لیا۔

پاکستان رائٹرز گلڈ قائم ہوتے ہی امریکیوں سمیت چند عناصر اسے بلاوجہ بائیں بازو کے خطرناک اوپیوں کی پناہ گاہ سمجھنے پر مصر تھے۔ اس ادارے کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے میں پہلے ہی ان عناصر کے حملے میں اعتراض کی زد میں آیا ہوا تھا۔ اس پر مزید غصب یہ ہوا کہ فروری ۱۹۶۲ء میں جب وزیر خارجہ ذولفقار علی بھٹو چین کے ساتھ سرحدی معاهدہ طے کرنے پکینگ گئے، تو صدر ایوب نے مجھے بھی ڈیلیگیٹ بنا کر ان کے ہمراہ بیچج دیا۔ امریکہ تو اس معاهدے پر ہی بے حد سخن پا تھا، لیکن جب میرا نام وفد میں دیکھا تو یقیناً میرے متعلق ان کی ناپسندیدگی میں شدید اضافہ ہو گیا۔

چین سے واپسی کے چند ہفتے بعد اچانک ایک روز میں نے ”ڈان“ اخبار میں خبر پڑھی۔ خبر پڑھ کر میں نے وزیر خارجہ کو خط لکھا، اس خط کی ایک نقل میں نے صدر ایوب کی خدمت میں پیش کی، تو انہوں نے اس پر یہ لکھ کر مجھے واپس کر دیا۔

I should treat such remarks with the Contempt they deserve

M.A.K

12/3

Mr. Shahab

میری توقع تھی کہ یہ قضیہ اب یہیں پر رفع دفع ہو جائے گا۔ لیکن یہ امید بر نہ آئی۔

امریکہ سفارت خانہ انتہائی محنت سے کام کرتا رہا اور انہوں نے چار پانچ ماہ لگا کر مختلف اخباروں سے ایسے بے شمار تراشے جمع کئے جن میں ہندوستان کو بے انداز فوجی مدد دینے اور پاکستان کے تحفظ کو نظر انداز کرنے کے حوالے سے امریکی حکومت پر کڑی نکتہ چینی اور مذمت کا کوئی نہ کوئی پہلو لکھا تھا۔ ان تراشوں کو سلائیڈ کی صورت میں منتقل کیا گیا اور ایک روز امریکی سفیر یہ سارا ساز و سامان لے کر ایک پروجیکٹ کے ساتھ پریزیڈنٹ ہاؤس میں آ دھمکا، وہاں پر اس نے کافی عرصہ سکرین لگا کر صدر ایوب کو ایک ایک سلائیڈ دکھائی اور ساتھ ہی مژہ سنایا کہ امریکہ کے انڈر سیکرٹری آف سیٹ مسٹر جارج بال عنقریب ہی صدر کینڈی کے خصوصی، اپنی کے طور پر پاکستان آنے والے ہیں اور جن امور پر وہ گفت و شنید کریں گے۔ ان میں پاکستان پریس کا رویہ بھی ایجنڈے میں شامل ہے۔ اسی زمانے میں ہمارے اخبارات میں یہ خبر بھی نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی کہ کسی تقریب میں امریکی سفیر مسٹر میکنائی نے بڑے زعم سے فرمایا تھا کہ پاکستانی انتظامیہ کے چند نامنغوں افسروں کو تبدیل کرانا ان کے فرائض منصی میں داخل ہے۔ سفارتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیر کبیر نے کسی افسر کا نام تو نہیں لیا تھا، لیکن صحافتی حلقوں کے مطابق یہ کوئی راز درون پر وہ نہ تھا کہ سفیر صاحب کے بستہ ب میں میرا نام ضرور درج رجسٹر تھا!

ان پے در پے واقعات کا وھاوا اس قدر شدید تھا کہ اس کے دباو تسلی صدر ایوب کا کسی قدر پریشان ہونا بعید از قیاس نہیں۔ خارجہ تعلقات میں وہ مرنجاں مرنج پالیسی کے حاوی تھے۔ خاص طور پر امریکہ کے ساتھ تعلقات کے لیے ان کے دل میں نہایت نرم گوشہ تھا۔ پچھلے اٹھاونہ بیس برس کے دوران امریکہ اور پاکستان میں مالی اور فوجی امداد کے جو گھرے رشتے قائم ہوئے تھے، انہیں پروان چڑھانے میں ایوب خان صاحب کی ذات کا بڑا عمل دخل تھا۔ بری فوج کے کمانڈر انجیف کے طور پر امریکہ کے ساتھ عسکری روابط، مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں انہوں نے اپنے منصب کی آئینی حیثیت سے کہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ پاک امریکہ تعلقات کا یہ ڈھانچہ کافی کافی تھا جس میں ذرا

سی بے احتیاطی اور بے اعتدالی دراڑیں ڈال سکتی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ امریکہ کا رویہ مریانہ اور پاکستان کا فدویانہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک سپرپاور کی طرح امریکہ کے اپنے مفادات ہر صورت میں پاکستان کے مفادات سے نیادہ اہم تھے۔ ہندوستان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی ترنگ میں اگر پاکستان کے جذبات اور تحفظات کو قربان کرنا پڑتا ہے، تو ایسا کرنے میں امریکہ کو کوئی اخلاقی یا سیاسی رکاوٹ یا ہچکپاہٹ درپیش نہ تھی۔

ایک حقیقت پسند سربراہ مملکت کی طرح میں الاقوامی تعلقات کے اس زیر و بم اور چیز و خم سے صدر ایوب بخوبی آشنا تھے۔ چنانچہ انہوں نے کسی قسم کی مقاومت اور مراجحت کی بجائے رفع شر کے لیے آسان ترین رستہ یہ اختیار کیا کہ مجھے بیک بینی و دو گوش وزارت اطلاعات سے نکال باہر کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کارروائی کی اصلی وجہ انہوں نے پوشیدہ رکھی اور اثاثاً مجھ پر احسان دھر کے مجھے اس اخراج پر شکر گزار ہونے کی تلقین کی۔ لیکن صحافت کے مضم جو رپورٹر اس طرح کے راز ہائے دروں کا کھوچ لگانے میں ید طولی رکھتے ہیں۔ پہلے تو ایک خبر یہ شائع ہوئی کہ وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب سے اختلافات کی بنا پر میں نے ملازمت سے استغفار دے دیا ہے، لیکن حکومت نے فوراً اس کی تردید کر دی۔ اس کے بعد جب ہالینڈ میں سفیر کے طور پر میری تعیناتی کی خبر نکلی، تو پرلیس والوں نے اس تبدیلی کی وجہات کا سراغ لگا لیا اور ملک کے بہت سے اخبارات نے یہ وہی دباؤ کے تحت سرکاری ملازموں کے تبادلے پر اپنے شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ کئی روز تک قوی اخباروں میں تبصروں اور اداریوں کا یہی موضوع رہا۔

میرے تبادلے کے سلسلے میں غیر ملکی مداخلت پر اخبارات کی خیال آرائیوں نے کچھ ایسی شدت اختیار کر لی کہ صدر کے پرنسپل سیکریٹری مسٹر این۔ اے فاروقی نے ایک پرلیس ریلیز میں ان قیاس آرائیوں کو قطعی بے بنیاد اور شر انگیز قرار دیا اور کہا کہ تمام سرکاری تبادلے ملکی ضروریات کے پیش نظر کئے جاتے ہیں اور حکومت پاکستان کسی حالت میں

بھی کسی غیر ملکی طاقت کی مداخلت برداشت نہیں کرے گی۔

جو لائی ۱۹۶۲ء کے آخر میں جیسے ہی یہ فیصلہ ہوا کہ میں نے سفیر بن کر ہالینڈ جاتا ہے تو میں نے صدر الیوب سے درخواست کی کہ مجھے فوراً وزارت اطلاعات سے فارغ کر دیا جائے۔ تاکہ میں چند ہفتے یہاں چھٹی گزار کر ہالینڈ چلا جاؤ۔ اس بات پر وہ رضا مند نہ ہوئے کیونکہ مغربی پاکستان کے فائنس سیکرٹری الطاف گوہر جو میری جگہ مرکزی سیکرٹری اطلاعات بنائے جا رہے تھے۔ ان دونوں امریکہ گئے تھے۔ صدر صاحب نے حکم دیا کہ میں ان کے آنے تک بدستور اپنی جگہ کام کرتا رہوں۔

اگلے چھ سات ہفتے میرے لیے بڑے سوہان روح ثابت ہوئے۔ میں ناکام سیکرٹری اطلاعات ضرور تھا، لیکن کام کے لحاظ سے عملی طور پر عضو معطل بنا بیٹھا تھا۔ ان دونوں میرا کام صرف اتنا تھا کہ روئین کے طور پر مشری کا بندھا ٹکا روزمرہ کا دستور العل نجاتا رہوں اس سارے عرصہ کے دوران پالیسی کا ایک معاملہ بھی میرے پاس نہ آیا۔

کافی عرصہ پہلے سے کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کے ساتھ میری ایک میٹنگ مقرر چلی آ رہی تھی ۲۵ اگست کو کونسل کا جو وفد راولپنڈی تشریف لایا۔ وہ مشر الطاف حسین (ڈاں) میر خلیل الرحمن (جنگ) مشر عبد السلام (پاکستان آبزرور ڈھاکہ) مشر تفضل حسین مانک میاں (اتفاق ڈھاکہ) مشر مجید نظامی (نوائے وقت) اور مشر کے۔ ایم۔ آصف۔ (پاکستان نائمنز) پر مشتمل تھا۔

وفد نے مجھے چھ مدیروں کی فرست دی جنہیں کورٹ آف آز کے ممبران کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا۔ یہ کورٹ آف آز اس مقصد کے لیے قائم ہو رہی تھی کہ صحافیوں کے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزیوں کا جائزہ لے کر جلد از جلد نمائشی رہے۔

وفد نے مجھے پریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے پانچ ریٹائرڈ جوہوں کے نام بھی دیے کونسل آف ایڈیٹرز کے خیال میں ان میں سے ہر ایک کورٹ آف آز کا چنیریں مقرر ہونے کی اہلیت رکھتا تھا۔ تاہم گورنمنٹ کے ساتھ باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے اس فرست میں سے چیئرمین کا حصی انتخاب حکومت کی صوابیدہ پر چھوڑ دیا تھا۔

قومی صحافت کے اتنے سر برآورده ایڈیشنوں کی یہ پیش کش مجھے بڑی مشت اور تعمیری نظر آئی۔ اس مینگ کی روئیداد کو میں نے فوراً ایک سرکاری یادداشت میں قلم بند کیا، اور اسے اپنے ساتھ لے کر اسی شام صدر ایوب کی خدمت میں پہنچ گیا، لیکن وہاں کی دنیا ہی بدی ہوئی پائی۔ میرے کافیزات پر انہوں نے ایک سرسری سی نظر ڈال کر ایک طرف دکھ دیئے اور کسی قدر جھلا کر ترشی اور تنہی سے بولے۔ ”اب یہ سب باتیں بالکل فضول ہیں۔ تم اس کام سے فارغ ہو رہے ہو۔ اب تمہیں خواہ مخواہ ان باتوں میں ٹانگ اٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنا لائچہ عمل تیار کر لیا ہے۔ اب اگر عمل ہو گا تو اسی پر ہو گا۔“

میں اپنا سامنہ لے کر واپس آگیا، اور اگلے آٹھ نو روز اپنے دفتر میں بیکار بیٹھا لکھیاں مارتا رہا۔ دسویں روز ۳ ستمبر کو خبر ملی کہ مغربی پاکستان کے گورنر نے پریس اینڈ پبلی کیشنر (ویسٹ پاکستان) (ترمیمی) آرڈی ننس ۱۹۶۳ء نافذ کر دیا ہے۔

دہیت بریت of West Pakistan Ordinance NO.

(The Central Govt. Press and Publications Ordinance No. XV of ۱۹۶۳ was amended in its application to the province of East Pakistan by East Pakistan Ordinance—(i) No. ۱ of ۱۹۶۴ (with effect from ۱st September ۱۹۶۴) and (ii) No. ۲ of ۱۹۶۵ (with effect from ۱st Oct. ۱۹۶۵).

اس قانون کا پہندا وقفہ فوقہ مختلف ترمیموں کے ساتھ آج تک ہماری صحافت کے گلے میں پڑا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں کو خوش نہیں تھی کہ ایوب کے دور کے بعد یہ کلا قانون اپنی موت آپ مر جائے گا۔ لیکن ہر دور میں یہ امید نقش برآب ہی ثابت ہوتی رہی۔

اندھے کے ہاتھ میں ایک بار لاحقی آجائے، تو وہ اس کے سارے کے بغیر دو قدم چلنے سے بھی معدور ہو جاتا ہے۔ حکومت ایوب خان کے دور کی ہو یا بھی کے یا کسی اور کی، ہر زمانے کے حکمران اسی قانون کی بیساکھیوں کا سارا لے کر پاکستان کے ارباب عقل و دانش کو برباد اور روشن خیالی اور فہم و فراست کے میناروں کو تاخت و تاراج

کرتے رہے ہیں۔ ذہنوں پر روک تھام، بندش اور پابندی عائد کرنے والا ہر اقتدار کے دور میں قانون لازمی طور پر قوت تخلیق کو بغیر، بانجھ اور بے شر کر دیتا ہے۔ دھونس اور دھاندلی کا نشہ بھی شراب کی مانند ہوتا ہے دونوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر گلی ہوتی۔

اس ساتھ کے دو تین روز بعد مسٹر الٹاف گوہر امریکہ سے واپس تشریف لے آئے۔ ان کے آتے ہی میں نے وزارت اطلاعات کے استروں کی ملا ان کے گلے میں ڈال دی۔ میرے ساتھ ہی میرے دست محدث سرفراز کو بھی اس فسروی سے فارغ کر دیا گیا۔ سرفراز صاحب میرے دیرینہ دوست اور ایک کمنہ مشق صحافی تھے، آزادی سے پہلے بھی دہلی میں خان لیاقت علی خان سمیت مسلم لیگ کے بہت سے اکابرین کے ساتھ ان کے گھرے روابط تھے۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر آف نیوز کے طور پر انہوں نے بڑی نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک بغداد پکیٹ میں اطلاعات کے ڈپٹی ڈائریکٹر جزل رہے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو پروگریسو پیپرز لیمیٹڈ حکومت کے قبضے میں آپکے تھے۔ چنانچہ سرفراز کو اس ادارے کے اخبارات اور رسائل کا چیف ائڈیٹر بنا دیا گیا۔ یہ فرائض انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے نبھائے، لیکن ایک بات پر صدر ایوب ان سے بہت ناراض ہو گئے۔

وہ بات یہ تھی کہ صدر ایوب کے آئین کے خلاف چودھری محمد علی نے ایک نہایت سخت اور طویل بیان دیا تھا۔ اس بیان کو سب قومی اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ صحافی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے سرفراز نے بھی اسے ”پاکستان نائز“ میں پورے کا پورا چھاپ دیا۔ اس پر صدر ایوب چراگ پا ہو گئے کہ سرکاری تحولی میں لیے گئے اخبار میں ان کے آئین کے خلاف اس بیان کا پورا متن کیوں شائع ہوا۔ میں نے سرفراز کے دفاع میں صحافتی تقاضوں کا کچھ ذکر کیا، تو صدر ایوب ترشی سے بولے۔ ”صحافت جائے بھاڑ میں ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں؟ یہ سرفراز کی شرارت ہے۔ وہ ضرور درپردا چودھری محمد علی کے ساتھ ملا ہوا ہے۔“

URDU4U.COM

جب میں نے وزارت اطلاعات و نشریات کا چارج سنبھالا تھا تو صدر ایوب کی دل خواہش کے برخلاف میں سرفراز کو اسی وزارت میں ڈائریکٹر جزل آف پلیک ریلیشنز کے طور پر لے آیا تھا۔ اس عمدے پر انہوں نے نہایت دیانتداری اور وفاداری سے کام کیا۔ لیکن صدر ایوب کے دل و دماغ پر اس کے خلاف جو غبار چھایا ہوا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ صدر کی دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے وزیر صاحبان بھی سرفراز کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ اب جب کبھی کسی وزیر یا وزارت کے بارے میں کوئی تنقیدی خبر شائع ہوتی تھی، تو سب یہی الزام لگاتے تھے کہ میری پشت پناہی میں سرفراز ہی یہ شرارتیں کروا رہا ہے۔

جونی وزارت اطلاعات سے میرا بوبیا بستر گول ہوا، اسی وقت سرفراز کو بھی نیویارک میں اقوام متحده میں پاکستان سفارت خانے کا پریس کونسلر بنا کر چلتا کیا۔

یو۔ این۔ او میں اپنی پسندیدہ شخصیت اور قابل قدر کارگزاری کی وجہ سے وہ اس زمانے کے سیکرٹری جزل مشر اور تھانٹ کی نظروں میں آگیا۔ دونوں کے درمیان کافی گمرے روابط قائم ہو گئے۔ کچھ برس بعد سیکرٹری جزل نے سرفراز کو اردن میں U.N.D.P کا نمائندہ بنا کر عمان بھیج دیا۔

سرفراز نہایت خوش لباس، خوش کلام اور شاہانہ طبیعت کا انسان تھا۔ وہ گھوڑسواری کے علاوہ پلو، ٹینس اور سکواش کھیلنے کا شو قین تھا۔ عمان میں ایک روز وہ کسی شنزادے کے ساتھ سکواش کھیل رہا تھا کہ اچانک اس پر دل کا دوہرہ پڑا اور آنا فانا سکواش کورٹ ہی میں دم توڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے سایہ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

## • نیشنل پریس ٹرست

۱۹۵۹ء کی تاریخ تھی۔ میں آرام سے سو رہا تھا کہ رات کے ساتھے باہر بجے میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان فون پر بول رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگلی صبح میں کراچی ائیرپورٹ پر پہنچ جاؤں، کیونکہ ہم نے پہلے جہاز سے لاہور کے لیے روانہ ہونا ہے۔

میں نے کہا کہ میں صدر ایوب کی اجازت کے بغیر کیسے کراچی چھوڑ سکتا ہوں؟ علی الصبح جہاز کی روائی سے پہلے ان کی اجازت کیسے حاصل کروں گا؟

”میں پریزیڈنٹ ہاؤس سے ہی بول رہا ہوں“ بریگیڈئر صاحب نے کہا۔ ”صدر صاحب ابھی ایک اہم میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنے بیڈروم میں چلے گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اجازت دی ہے کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ لاہور لے جائیں۔“

”کس کام کے لیے؟“ میں نے پوچھا۔

بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان نے کہا کہ اس سوال کا جواب وہ ٹیلیفون پر نہیں دے سکتے۔

اگلی صبح میں ہواںی اڈے پہنچا، تو بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان لاہور جانے کے لیے موجود تھے۔ روائی سے پہلے اور ہواںی جہاز کے سفر کے دوران میں نے کئی بار لاہور میں کام کی نوعیت کے متعلق پوچھا، لیکن کوئی ٹھیک ٹھیک جواب نہ مل سکا۔ ہر بار بریگیڈئر صاحب اپنی عادت کے مطابق طویل تقریروں میں آئیں باسیں شائیں کر کے میرے سوال کا جواب گول کر جاتے تھے۔ اپنی دانست میں وہ چالاکی سے کام لے رہے تھے، لیکن میرے نزدیک یہ ایک طفلانہ سی حرکت تھی۔

لاہور کے ہواںی اڈے پر چند فوجی افسروں نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں گاڑیوں میں بٹھا کر سیدھے فلیگ شاف ہاؤس لے گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وزیر داخلہ جزل کے۔

ایم۔ شخ بھی لاہور آئے ہوئے ہیں۔ بریگیڈیر صاحب تو لاہور کے جی۔ او۔ سی۔ کے ساتھ آہستہ آہستہ باشیں کرتے ان کے دفتر کی طرف چل دیئے اور میں کافی دیر تک فلیگ شاف ہاؤس کے آراستہ و پیراستہ ڈرائیننگ روم میں اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ ایک نہایت با ادب، خلیق اور شاستہ نوجوان فوجی افسر نے مجھے میرے رہنے کا کمرہ دکھایا اور مشورہ دیا کہ میں نہا دھو کر لجئ تک ایک دو گھنٹے آرام کر لوں۔

پردہ پوشی، رازداری اور سکوت کی یہ فضا میرے لیے بڑا پراسرار معہ بنی ہوئی تھی۔ ایک دو بار میرے دل میں خیال گزرا کہ شاید ہمیں ہندوستان کی جانب سے حملے کا خطرہ درپیش ہو؟ لیکن اگر ایسی بات ہے تو مجھے ساتھ لانے کی کیا تک ہے؟ دوسرا خیال آیا کہ شاید کشمیر کے سلسلے میں کوئی م Mum شروع ہونے والی ہو؟ لیکن اگر یہ فوجی کارروائی ہے تو اس میں میرا کیا کام؟ میں اسی ادھیر بن میں غلطان و پیچاں تھا کہ شام کے چار بجے بریگیڈیر ایف۔ آر۔ خان نے نہایت رازداری سے سرگوشی کر کے مجھے بتایا کہ آج رات اچانک چھاپہ مار کر میاں افتخار الدین کی کمپنی پروگرس پیپرز لمیڈ پر بقدر کرنے کے لیے سارے انتظامات مکمل کر لیے گئے ہیں۔ اخفاۓ راز کا اتنا بڑا پاڑ کھونے کے بعد جب اتنی بیج پوچ اور اولیٰ سی چوہیا برآمد ہوئی تو مجھے بے اختیار نہیں آگئی۔ ”بریگیڈیر صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اخبار والے تو اپنے ہاتھ میں صرف قلم لے کر بیٹھتے ہیں۔ تو پ و تفگ سے لیس ہو کر نہیں۔ آپ کے انتظامات تو بظاہر فوجی نقل و حرکت سے کم نظر نہیں آتے۔“

بریگیڈیر صاحب کھیانی سی نہیں ہنس کر چپ رہے۔ میں نے کہا۔ ”اب آپ نے یہ اہم راز مجھ پر طشت ازیام کر ہی دیا ہے، تو یہ بھی فرمائیے کہ اس سلسلے میں میرے لیے کیا احکامات ہیں؟“

بریگیڈیر ایف۔ آر۔ خان اچھل کر فوراً اپنے مزاج کے بنیادی عصر میں آگئے، اور وثوق سے بولے۔ آج تو آپ آرام کریں۔ کل سے ہمیں تمہارے مشوروں کی ضرورت

پڑے گی۔"

اس فارغ وقت کو غنیمت جان کر میں نے پروگرام بنایا کہ شر چل کر اپنے چند دوستوں سے مل آؤں۔ گاڑی مانگی تو جواب ملا کہ ورکشاپ تک گئی ہوئی ہے۔ جلدی واپس آجائے گی۔ پیدل چل کر باہر جانا چاہا، تو وہی باداب، خلیق اور شائستہ نوجوان فوجی افسر لپک کر میرے ساتھ ہو گیا۔ تاکہ معزز مہمان کا جی بھلانے کی خاطر اس کے ساتھ ساتھ رہے۔ میں نے کئی جگہ ٹیلی فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ ان تمام حالات سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ جب سے مجھے آج رات کی مجونہ کارروائی کا راز معلوم ہوا ہے۔ اس وقت سے اس چار دیواری میں میری حالت عملًا ایک نظر بند کی سی ہو گئی ہے نہ میں کہیں جا سکتا ہوں، نہ کوئی میرے پاس آ سکتا ہے۔ نہ میں کہیں ٹیلی فون کر سکتا ہوں نہ مجھے کوئی ٹیلی فون کر سکتا ہے۔ اپنے اوپر بے یقینی اور بے اعتمادی کا اس قدر گرا غبار چھایا ہوا دیکھ کر میرا وجود میری اپنی نظر میں بڑا حقیر، بے وقار اور فرمایہ محسوس ہونے لگا۔

بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان لاہور کے مارشل لاءِ ہیڈ کوارٹر سے ٹیلی فون لگائے اس طرح مستعد بیٹھا تھا جیسے وہ محاذ جنگ پر کسی فوجی دستے کی کمان کر رہا ہو۔ تین پھر رات گئے جب ڈرانینگ روم سے مبارک سلامت کا غلغله بلند ہوا، تو اس بات کی تقدیق ہو گئی کہ پروگرسو پیپرز لمبیڈ کا قبضہ کسی مزاحمت یا تصادم کے بغیر حکومت کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ اسی کے ساتھ روزنامہ پاکستان نائمز، روزنامہ امروز اور ماہنامہ لیل و نمار بھی سرکاری تحولی میں آ گئے۔

اگلے روز پاکستان نائمز کے ایڈیٹر مظہر علی خان فلیگ شاف ہاؤس آئے اور جزل شیخ کے ساتھ کافی دیر تک مصروف گفتگو رہے۔ ہمیں بعد میں بتایا گیا کہ وہ مشر مظہر علی کو اس بات پر آمادہ کر رہے تھے کہ وہ پاکستان نائمز کی ایڈیٹری بدستور اپنے پاس رکھیں۔ لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہے۔

روزنامہ امروز کے مدیر احمد ندیم قاسی صاحب تھے۔ میرے ذمہ یہ ڈیوٹی گلی کہ میں ان

کو امروز کی ادارت پر فائز رہنے کی درخواست کروں۔ میں قاسی صاحب کی خدمت میں یہ گزارش لے کر حاضر ہوا۔ لیکن وہ نہ مانے۔

پاکستان نائمز کا اگلا شماںہ پریس میں جانے کے لیے تیار ہوا، تو ایڈیٹریل کسی نے نہ لکھا تھا۔ جزل شیخ اور بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ آج کا ایڈیٹریل میں لکھ دوں۔ مجھے اس میں کلام تھا۔ کیونکہ مجھے نہ صحافت کا عملی تجربہ ہے نہ اداریہ سپرد قلم کرنے کا۔ اس کے علاوہ مجھے تو ابھی تک یہ بھی علم نہ تھا کہ اس اخبار کو حکومت کے قبضہ میں لینے کے لیے کیا کیا محرکات اور مقاصد تھے اور وہ ہی یہ معلوم تھا۔ کہ وہ کیا ازمات تھے جن کی پاداش میں سرکار نے اتنا شدید اور غیر معقول قدم اٹھایا ہے۔ اس لاعلی کی وجہ سے میں کوئی پرمیں اور معقول اداریہ لکھنے سے سراسر قادر تھا، لیکن بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان بھی انتہائی ضدی اور اڑیل ذات شریف تھے۔ وہ اپنے اصرار پر مسلسل اڑے رہے اور آخر مجبور ہو کر میں جزل شیخ کے بتائے ہوئے خطوط پر وہیں کھڑے کھڑے بے دل سے ایک مختصر سا اداریہ گھیث دیا جو New Leaf کے عنوان سے پاکستان نائمز میں شائع ہوا۔ یہ تحریر کسی صورت بھی میرے لیے باعث فخر و مباہت نہیں، بلکہ دراصل یہ نامعقولیت اور کچھ نہی کے اس پھندے کی عکاسی کرتی ہے جو ایک سرکاری ملازم کو با اوقات اپنی مجبوریوں کے دباؤ میں آ کر خواہی خواہی اپنے گلے میں ڈالنا پڑتا ہے۔

پروگریسو پیپرز لیمیٹڈ کا قلعہ سر کر کے بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان اس قدر شاداں و فرحاں تھے جیسے انہوں نے کسی نہایت سخت محاذ جنگ پر فتح حاصل کر لی ہو۔ رفتہ رفتہ جب ان کی مسرت و انبساط کا جوار بھائی فرد ہونا شروع ہوا۔ تو مجھے اس غاصبانہ کارروائی کے پس مظہر کے متعلق کسی قدر آگاہی حاصل ہوئی۔ ان اخبارات پر قبضہ جمانے کے لیے مارشل لاء کا کوئی قانون یا ضابطہ جاری نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ کارروائی پاکستان سیکیورٹی ایکٹ میں ایک معمولی سی ترمیم کے عمل میں لائی گئی تھی۔ اس کمپنی کے حصہ داروں

میں سب سے بڑے حصے دار میاں افتخار الدین اور ان کا بیٹا عارف افتخار تھے۔ اس حیثیت سے کمپنی کے کاروبار پر میاں صاحب کو مکمل کنٹرول حاصل تھا۔

پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر بقہہ کرنے کے بعد کمپنی کا بورڈ آف ڈائریکٹرز توڑ ڈالا گیا، اور میاں خاندان کے تمام حصے ضبط کر کے نیلامی پر چڑھا دیے گئے۔ الزام یہ تھا کہ اس کمپنی کے اخبارات چلانے کے لیے بیرونی وسائل سے خفیہ امداد حاصل کی جاتی تھی اور غالباً ثبوت کے طور پر یہ اکٹشاف بھی کیا گیا کہ میاں افتخار الدین کے حصہ کی ضبطی کے وقت ان کے نام لندن کے لائڈز بنک لمیٹڈ میں تین لاکھ باشندہ ہزار ایک سو ترایی پونڈ چودہ شلنگ اور چار پنس کی رقم بھی جمع تھی۔

قانونی اور اخلاقی لحاظ سے مجھے یہ سرکاری کارروائی بڑی کمزور، بے قاعدہ اور غیر اصولی نظر آئی۔ جان اور آبرو کے علاوہ ہر شری کی ذاتی الملاک کا تحفظ بھی ہر حکومت کا مقدس فرض شمار کیا جاتا ہے۔ میاں افتخار الدین ایک کھاتے پیتے امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ زمینوں کی آمنی کے علاوہ ان کے بیرون ملک بھی بست سے تجارتی روابط قائم تھے۔ لاہور میں ان کا گھرانہ نہایت آسودہ اور خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔ پھولوں کی نمائش میں ان کی کوئی کے گلب کتنی بار نمایاں انعامات جیت چکے تھے۔ عیش و عشرت کی اس فراوانی کے باوجود وہ نظری، علمی اور ذہنی سطح پر بائیس بازو کے رحمات کے ساتھ واپسی کا دم بھرتے تھے۔ عملی طور پر وہ فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ بست سے دوسرے ایسے ادیبوں کو بھی اپنے اخبارات کے ساتھ وابستہ کرتے رہتے تھے، جن کے نام ترقی پسند ادب کی تحریک کے حوالے سے زبانِ زد خاص و عام تھے۔ سیاست میں انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی قلابازیاں کھائیں۔ کافی عرصہ انہیں نیشنل کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو کی منچھ کا بال بنے رہے۔ آزادی کے بعد پاکستان میں چند قدم مسلم لیگ کے ساتھ چلے۔ پھر الگ ہو کر آزاد پاکستان پارٹی کے نام سے اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنای، جس کا ڈھانچہ مارکسٹ رنگ ڈھنگ پر تھا۔ اس سے قبل وہ مغربی پنجاب کی مسلم لیگ وزارت میں مہاجرین اور بحالیات کے وزیر بھی

لہ پکے تھے، لیکن نیاہ عرصہ چل نہ سکے، کیونکہ انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بڑی بڑی زمینداریاں توڑ کر انہیں مهاجرین میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تجویز ان کے دوسرے رفقاء خان ممدوح، دولتانہ اور سردار شوکت حیات وغیرہ کو کیے قابل قبول ہوتی؟ آئین ساز اسمبلی میں بھی ان کا روایہ اکثر و بیشتر حکومت وقت کے خلاف ہی رہا۔ جب ۱۹۵۶ء کا آئین منظور ہوا، تو میاں افتخار الدین مغربی پاکستان کے واحد رکن تھے۔ جو مسٹر سرور دی اور کئی دوسرے مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ ایوان سے احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے تھے۔

میاں افتخار الدین آکسفورد کے پڑھے ہوئے امیر کبیر زمیندار اور تاجر تھے۔ قانونی موشاگفایاں کرنے اور کپڑنے میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ طبع وہ نمایت زیریک، فعال، سیما ب صفت اور اپنے موقف پر اڑنے اور لڑنے والے کروار کے مالک تھے۔ مخالفین پر چوکھی دار کر کے انہیں بدھواس رکھنا ان کا دل پسند مشغله تھا۔ اپنے اخبارات کے اس غاصبانہ بقphony پر حکومت کے اس اقدام کو انہوں نے چیلنج تو ضرور کیا۔ لیکن ایک آرڈی ننس کے ذریعے اس معاملے میں عدالت کی جور سذکشن ختم کر دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد وہ شدید عارضہ قلب میں بیٹلا ہو گئے۔ ایک روز اچانک میری ان کے ساتھ لندن میں ملاقات ہو گئی۔ ان کا حلیہ اس قدر بدلہ ہوا تھا کہ انہیں دیکھ کر میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ نہ گئے تھے۔ وہ سکون آور دواوں کے اس قدر زیر اثر تھے کہ دن کے وقت بھی عالم غنوگی میں سوئے سوئے سے نظر آتے تھے۔ ان کی گفتگو میں بھی مجھے بربط کا فقدان محسوس ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ وفات پا گئے۔

لیکن میرے نزدیک میاں افتخار الدین کی وفات کے باوجود یہ سوال جوں کا توں قائم ہے کہ کیا کسی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مروجہ قانونی چانہ جوئی کے بغیر کسی نجی املاک کو زردستی اپنے بقۂ تصرف میں لے آئے؟ جس نظام میں حکومتوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے پاکستان اس سیاسی یا معاشری نظام پر کاربند نہیں۔ اس سارے معاملے

میں ایک متناقضانہ اور بے محل بات اور بھی کھلتی ہے۔ پروگریسو پیپرز لمیڈیا پر یہ الزام تھا کہ یہ اداہ کیونسوں سے ساز باز کر کے خفیہ وسائل حاصل کر رہا تھا، لیکن اس کی تظیر کے لیے حکومت نے جو طریق کار اختیار کیا۔ وہ بھی کیونزم ہی کی ایجاد و اختراع تھا۔ پرائیویٹ املاک کے تحفظ کو بالائے طاقت رکھ کر اسے زردستی ہتھیانا عام طور پر اسی سُسٹم کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

محمد سرفراز کچھ عرصہ تک اس ادارے کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ بعد ازاں حکومت نے فیصلہ کیا کہ یہ اداہ کسی پرائیویٹ پارٹی کے ہاتھ پنج دیا جائے۔ پاکستان نائمز، امروز اور میل و نمار کو بلا کاؤ مال دیکھ کر کئی لوگوں کی رال پسکنے لگی۔ لیکن نیلامی کی بولی سینہ داؤد کے نام ختم ہوئی۔ وہ کروڑ پتی صنعت کار اور تاجر تھے اور حکومت کے اعلیٰ حلقوں میں وہ ازراہ محبت اور مذاق مشبو سینہ کے لقب سے مشہور تھے۔ گجراتی لجے میں ٹوٹی پھوٹی اردو بول کر وہ افران بالا کا جی بھلایا کرتے تھے اور خوشامد کے طور طریقوں کو فن لطیف کا درجہ دے کر انہوں نے حکومت کے سب طبقوں میں ہر دلعزیزی حاصل کر رکھی تھی۔ پیسہ ان کے ہاتھ کا میل تھا۔ سرکاروں درباروں میں انہیں قبول عام کی سند میسر تھی۔ اب صرف اقتدار کا نشہ باقی نہ گیا تھا جسے چکنے کے لیے وہ بے حد بے چین و مضطرب تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ایک سوچی سمجھی بازی لگائی اور چونٹھ لاکھ روپے کی عوض پروگریسو پیپرز لمیڈیا کی صحافتی جاگیر اپنے نام منتقل کرائی، لیکن یہ سودا انہیں منگا پڑا۔ اپنی بڑی بڑی ییکٹائل ملوں اور دوسرے کارخانوں میں تو وہ ہزاروں مزدوروں کو چشم زدن میں اپنی راہ پر لگا لیتے تھے، لیکن اخباری دنیا میں مٹھی بھر صحافیوں کو اپنے قابو میں رکھنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ یوں بھی ان کی تجویری کامنہ گرسنہ بھیزیرے کی طرح کھلا مٹھو سینہ کو بار بار کاٹ کھانے کو آتا تھا کہ چونٹھ لاکھ روپیہ کی سرمایہ کاری پر تجارتی شرح سے میرا منافع کب آئے گا؟ کیسے آئے گا؟ اور کہاں سے آئے گا؟ سینہ داؤد پاکستان کے نہایت کامیاب صنعت

کار اور تاجر تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے دس روپے ڈال کر دوسرے ہاتھ سے بیس نکلنے کے عادی تھے، لیکن اخباری کاروبار میں منافع کی صورت بالکل مختلف تھی۔ اس کے علاوہ مٹھو سینھ کو گمان تھا کہ اخباروں کے مالک بن کر وہ ایک ایسی لفڑ میں سوار ہو گئے ہیں جس کا بہن دباتے ہی وہ آنا فاناً اقتدار کی کسی اعلیٰ کری پر جا بیٹھیں گے، لیکن ایسا کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ اس کے بر عکس جسے دیکھو وہ کسی خبر کا شاکی ہے۔ کسی تصویر کا شاکی ہے۔ کسی تنقید کا شاکی ہے۔ نہ پیسہ نہ منافع نہ اقتدار، بلکہ الٹا ٹکوہ و شکایت کی بھرمار۔ سینھ داؤد بت جلد خارے کے اس سودے سے بوکھلا گئے اور پروگریسو پیپرز کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ ملک کے اندر تو وہ صدر ایوب کے گرد کمھی کی طرح بھجنھناتے ہی رہتے تھے۔ لیکن ایک دو بار وہ صدر کے بیرون ملک دوروں میں بھی ان کے ساتھ سائے کی طرح چپکے رہے۔ روپیٹ کر آخر انہوں نے صدر کو راضی کر لیا اور اس متاع گران کا ایک اور خریدار بھی لاہور سے برآمد کر لائے۔

نئے خریدار کا نام چودھری محمد حسین تھا۔ نیم خواندگی کے باوجود اسمبلی کے ممبر اور لاہور شر کے میزرا تھے۔ ایک روز کسی بیرونی مہمان گرامی کے اعزاز میں شلامار باغ میں ایک نمایت شاندار استقبالیہ منعقد ہو رہا تھا۔ چودھری صاحب میزرا کی حیثیت سے خوش آمدید کا ایڈریس پڑھنے۔ شیخ پر تشریف لائے۔ انہوں نے ماں سیکرڈ فون اپنے قریب کرنے کے لیے اسے ہاتھ لگایا، تو اتفاق سے انہیں بجلی کی کرنٹ کا ہلاکا سا جھنکا لگا۔ بوکھلا کر ان کے منہ سے پنجابی زبان میں ماں بن کی ایک ایسی نقش گالی نکلی جو لاوڈ سپیکر کے ذریعے گونج کر سینکڑوں معزز خواتین و حضرات کے مجمع کو شرمداری سے پانی پانی کر گئی۔

اخباروں کے مالک بن کر بھی چودھری محمد حسین صاحب اسی طرح کی بدحواسیوں اور سراسمیگیوں کے چند اور گل کھلانے کے علاوہ کوئی مزید کارنامہ سر انجام نہ دے سکے۔ وہ تکلیف وہ حد تک خالی الذہن اور کوون شخص تھے۔ انہیں جب جاہ کی ہوس تو بے انتہا تھی، لیکن اسے پورا کرنے کے لیے جس عالی حوصلگی، فراخ ہمتی اور اولوالعزمی کی ضرورت

ہوتی ہے۔ اس سے سراسر عاری تھے۔ ان کے منتهائے زندگی کی اڑان غالباً یہیں تک تھی کہ وقت فوقة انہیں صدر ایوب کی بارگاہ میں رسائی حاصل ہوتی رہے اور ایک دو بار وہ صدر مملکت کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کر سکیں۔ ان کی یہ غرض و غایت پورا ہونے میں کچھ نیا وہ دیر نہ گئی۔ اس کے بعد پروگرسو پیپرز کا بکھیرا اپنے پاس رکھنے ان کے لیے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی، چنانچہ اس ادارے پر ایک بار پھر بہت جلد ”برائے فروخت“ کی تختی آوریاں ہو گئی۔

تیرا گاہک نمایت جہاں دیدہ، سردو گرم چشیدہ، ہوشیار، زیرِ ک، تیزدست اور آزمودہ کار ثابت ہوا۔ یہ گجرات کے چودھری ظہور الہی تھے۔ نو دولتیسے ہونے کے باوجود وہ خوش اخلاقی، ملنسار، اور منکر مزاج انسان تھے۔ وہ لنگر لگوٹ کس کر سیاست کے اکھائے میں اتر رہے تھے اور جاہ و اقتدار کی سیڑھی پر جلد سے جلد چڑھنا چاہتے تھے۔ گجرات کے گرد و نواح میں ان کی داد و دہش کی دھوم تھی، اور وہ بہت سی بیواؤں اور قبیلوں کی کفالت اور نادار طلبہ کے تعلیمی مصارف پر بے دریغ خرچ کرنے میں روز افزون شرط اور نیک نامی کما رہے تھے۔ ان کے سیاسی مقاصد کی تحریک میں ”پاکستان نائمز“ اور ”امریک“ جیسے اخبار ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے بعجلت تمام ان کا سودا طے کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے مالک بن گئے۔ چودھری ظہور الہی احتیاط پسند آدمی تھے اور سیاست کے کاروبار میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے تھے۔ صدر ایوب کا اعتماد تو انہوں نے بہت جلد حاصل کر لیا، لیکن نواب کلا باع کے معاملے میں ان سے ایک بھول چوک سرزد ہو گئی۔ گورنر مغربی پاکستان کے طور پر نواب صاحب صوبے کی سیاست پر بھی اپنی مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ خاص طور پر پنجاب میں سیاسی قیادت کی شکست و ریخت یا ترقی و بقا نواب کلا باع کے رحم و کرم پر منحصر تھی۔ ان کی رضا اور خوشنودی کے بغیر کوئی نیا سیاستدان اقتدار کی شاہراہ پر ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ شومی قسم سے چودھری ظہور الہی نے یہ فاش غلطی کی کہ اپنے سیاسی عزائم پر نزول

برکت کے لیے وہ نواب کالا باغ سے اشیر باد حاصل کرنا بھول گئے یا قصداً نظر انداز کر گئے۔ صدر ایوب کی آمرانہ صلاحیتوں پر چودھری صاحب کا مکمل تکمیل تھا۔ صدر مملکت کو رام کر کے غالباً ان کی اپنی نگاہ مغربی پاکستان کی گورنری پر گئی ہوئی تھی۔ یہ افواہ اڑتے اڑتے نواب کالا باغ کے کانوں تک بھی پہنچی اور وہ طیش میں آ کر چودھری ظہور الٰہی کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان کے اشارے پر مقامی انتظامیہ نے انہیں مختلف جیلوں بہانوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ وقت فوقة صدر ایوب نواب صاحب کے پاس چودھری ظہور الٰہی کی صفائی اور سفارش کرتے رہتے تھے، لیکن پھر یکاکی حالت بے انتہا گزد گئے۔ سواؤ یا قصداً ”پاکستان نائمز“ میں گورنر مغربی پاکستان کی کسی معمولی سی عالالت کے متعلق ایک چھوٹی سی خبر شائع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک بے پرکی یہ بھی اڑائی گئی کہ بحالی صحت کے لیے آرام کرنے کی غرض سے نواب صاحب کچھ چھٹی بھی لے رہے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر نواب صاحب آگ بگولا ہو گئے اور اسے چودھری ظہور الٰہی کی سازش اور شرات سمجھ کر انتقامی کارروائیوں پر اتر آئے۔ پہلے ایک نہایت فرسودہ اور غیر معروف مواصلاتی ایکٹ کے تحت انہیں گرفتار کر لیا گیا اور پھر ان پر ایک پریشان کن اور طویل مقدمہ چلانا شروع ہو گیا۔

ایک بار صدر ایوب لاہور کے گورنر ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام کے وقت انہوں نے مجھے کسی کام کے لیے بلایا، تو نواب کالا باغ بھی ان کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ صدر ایوب بڑی لجاجت اور زی سے چودھری ظہور الٰہی کی صفائی میں کچھ کہہ رہے تھے۔ نواب صاحب کا چڑہ لال بھجوکا ہو گیا۔ اور ان کی موچھوں کے چھتے میں غیظ اور غضب کے بھونڈ بھینٹنا نہ لگے۔ پہلے تو انہوں نے فرش گالیاں نکال کر چودھری ظہور الٰہی کی سات پتوں میں کیڑے نکالے۔ پھر ان کے حکم کے مطابق سپیشل پولیس کی خفیہ برائی کا ایک ایسیں پی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک بھاری بھر کم بنڈل تھا۔ کاغذوں کا ملپندی پولیس افسر سے لے کر نواب صاحب نے میز

پر دے مارا اور گرج کر بولے۔ ”ظهورِ الٰی کا تھوڑا سا کچھا ان کانفڑات میں درج ہے، لیکن وہ سخت جان موزی ہے۔ کانفڈ کی مار سے نہیں مرے گا۔ اس لیے میں بہت جلد اس پر اپنا شکاری کتا چھوڑنے والا ہوں۔ یہ اس حرای کی ہڈی پلی ایک کر کے رکھ دے گا۔“ یہ الفاظ کہتے ہوئے انہوں نے داد طلب نگاہوں سے پولیس افسر کی طرف دیکھا۔

پیش براخ کے ایس پی صاحب نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنا سر تسلیم خم کیا اور گھگھیا کر انتہائی چاپلوی سے کہا۔ ”جو حکم عالی جاہ۔ بندہ ہر وقت حاضر خدمت ہے۔“

اگر ان صاحب کے دم بھی ہوتی، تو یقیناً وہ کھڑے ہو کر اپنی دم بھی ضرور ہلاتے۔ خفیہ پولیس کا یہ افسر تفتیش کے کام میں شہرت رکھتا تھا۔ ملزمون کو انتہائی شدید جسمانی اور روحانی اذیت پہنچا کر ان سے زردستی اقبال جرم کروانا اس کا خاص طرہ امتیاز تھا۔ وہ نواب کلا باعث کا منہ چڑھا منظور نظر تھا اور ان کی زبان مبارک سے اپنے متعلق شکاری کتے کا لقب سن کر خوشی اور فخر سے پھولانہ سماٹتا تھا۔

نواب صاحب کا یہ جارحانہ رویہ دیکھ کر صدر ایوب کسی قدر آزردگی سے خاموش ہو گئے۔ پہلے بھی کئی بار اس معاملے میں ان دونوں کے درمیان تھوڑا بہت کھچاؤ پیدا ہوتا رہتا تھا۔ لیکن آج صدر ایوب طرح دے گئے۔ کیونکہ چودھری ظہورِ الٰی کی خاطر نواب کلا باعث کے ساتھ جھگڑا یا ناچاقی مول لینا انہیں کسی صورت بھی گوارا نہ تھا۔

اگلے روز جب ہم لاہور سے راولپنڈی واپس آ رہے تھے، تو ہوائی جہاز میں صدر ایوب نے مجھے کہا۔ ”میرا اندانہ ہے کہ چودھری ظہورِ الٰی بہت جلد جان چھڑا کر پروگریسو پیپرز سے بھاگ جائے گا۔ اب اس ادارے کا کیا بنانا چاہیے؟“

موقع پا کر میں نے فوراً اپنی ایک دل پسند تجویز پیش کی، جو پہلے بھی کئی بار نامنظور ہو چکی تھی۔ میری تجویز یہ تھی کہ پروگریسو پیپرز لمبینڈ کو ایک کوپریشن سوسائٹی کی شکل دے کر اس کے سارے حص کارکن صحافیوں اور دیگر ملازموں کے ہاتھ پیچ دیئے جائیں اور

اخبارات چلانے کی ساری ذمہ داری انہیں سونپ دی جائے۔ وہیں جہاز میں بیٹھے بیٹھے صدر ایوب نے زور سے نفی میں سر ہلا کر اس تجویز کو قطعی طور پر نامنظور کر دیا۔ اس کے خلاف انہیں دو اعتراض تھے ایک تو یہ کہ اخبارات کے مالک بن کر اگر صحافی اور دوسرے کارکن بغاوت کر کے حکومت کے کنٹرول سے نکل گئے، تو اس کا کیا علاج ہو گا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ان اخبارات کو چلانے کے لیے سرمایہ کہاں سے حاصل کیا جائے گا؟ انہیں یقین تھا کہ صحافیوں اور کارکنوں کی کوپریٹو سوسائٹی پر کوئی سینہ یا بینک آسانی سے سرمایہ لگانے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

میری دوسری تجویز یہ تھی کہ اس لیئڈ کمپنی کا کارپوریشن کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز میں حکومت اپنی مرضی کے فدویانہ قسم کے سرمایہ دار نامزد کر سکتی ہے۔ صدر ایوب کی یہ تجویز بڑی قابل قبول نظر آئی۔ انہوں نے فوراً حکم دیا کہ میں ان خطوط پر کوئی عملی سکیم بنا کر جلد از جلد ان کی خدمت میں پیش کروں۔ اس مفت کی بیگار کو اپنے سر سے ٹالنے کے لیے میں نے صدر ایوب سے گزارش کی کہ ہمارے ملک میں پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی اور واپڈا جیسے عظیم الشان اداروں کو تعمیر کرنے والے مسٹر جی فاروق ماشاء اللہ بقید حیات ہیں۔ میرے خیال میں اس بارے میں ان کے ساتھ مشوہہ کرنا مفید ہو گا۔ غالباً یہ بات صدر ایوب کے دل میں بیٹھ گئی اور انہوں نے اپنی نوٹ بک نکال کر اس میں یہ مشوہہ درج کر لیا۔

اس کے بعد اس موضوع پر میری کسی سے کوئی مزید بات چیت نہ ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد میں بطور سفیر معین ہو کر ہالینڈ چلا گیا۔ سات آنھ مہ بعد میں نے سنا کہ نیشنل پرلیس ٹرست نام کا ایک اداہہ قائم ہو گیا ہے اور مسٹر جی۔ فاروق اس کے پہلے چیز میں مقرر ہوئے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے نیشنل پرلیس ٹرست کا دادہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا، اور پاکستان نائماں اور امروز کے علاوہ مارنگ نیوز اور مشرق بھی اس میں شامل ہو گئے۔ مسٹر غلام فاروق کی ماہرانہ قیادت میں قائم شدہ یہ اداہہ اس قدر سخت جان ثابت ہوا

کہ اب تک کوئی حکومت اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکی۔ شروع شروع میں ہر نئی حکومت یہی نعرہ لگاتی ہوئی آتی ہے کہ ہم نیشنل پریس ٹرست کو جلد از جلد توڑ کے رہیں گے لیکن اقتدار کا نشہ منہ کو لگتے ہی یہ سارے دعوے اور عزائم جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹرست کے اخبار حکومت کے حق میں نیاز کی دیگوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان دیگوں میں خوشامد، تملق، چرب زبانی، چکنی چپڑی باتوں، یا کارانہ گھاتوں اور سرکار کی جاویہجا تعریف و توصیف کے ایسے چمچے اور کف گیر چلانے جاتے ہیں کہ کوئی حکومت نیشنل پریس ٹرست کو ہاتھ سے کھونے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ٹرست کے اخباروں کی اشاعت مسلسل گرتی رہتی ہے لیکن اس کے ظلماتی بھی کھاتوں میں خارے کا نشان کبھی نہیں ابھرتا۔ صرف روزنامہ "مشرق" نے ادبی یا ثقافتی ایڈیشنوں کی وجہ سے ایک اپنے چند شفاقتہ کالموں کے بل بوتے پر کسی نہ کسی طرح اپنا بھرم قائم رکھا ہوا ہے۔ باقی تینوں اخباروں میں کسی آب و تاب اور رنگینی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ بعض اوقات تو وہ محض سرکاری گزٹ کا پھیپھیسا اور بھونڈا سا چبہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

موجودہ صورت میں نیشنل پریس ٹرست کا وجود آزادانہ اور بے لاغ صحافت کے لیے ایک ویال جان سے کم نہیں۔ جب تک صحافت کا یہ سفید ہاتھی حکومت کے تھان میں سونے کی زنجیروں سے بندھا رہے گا۔ اس وقت تک دوسرے اخباروں کے لیے رقبانہ اور حریفانہ ہم چشمی اور مالی وسائل کے مقابلے کا میدان منصفانہ طور پر ہموار نہیں ہو سکتا۔

## • ایوبؑ خانع اور معاشیات

جن دنوں پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو رہا تھا، میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کراچی چھوڑنے سے پہلے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر عمرہ ادا کر آؤ۔ اس مقصد کے لیے مجھے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے کچھ رقم نکلوانے کی ضرورت تھی۔ اے۔ جی۔ پی۔ آر کی ہدایت کے مطابق میں نے ایک فارم بھرا جس پر اپنے ہیڈ آف آفس کے دستخط کروانے بھی لازمی تھے۔ دفتر والوں نے کہا کہ میرے ہیڈ آف آفس بھی صدر ایوب بذات خود ہیں۔ اس لیے مجھے ان سے بھی دستخط کروانا ہوں گے۔ مجھے اس بات میں کسی قدر تردود تھا کہ اتنی چھوٹی سی بات پر ان کو کیا تکلیف دوں۔ لیکن ضابطے کی خانہ پری بھی ضروری تھی۔ اس لیے وہ فارم ان کی خدمت میں دستخطوں کے لیے بھیج دیا۔ ساتھ ہی پندرہ دن کی چھٹی کی درخواست بھی بھیج دی۔

تحوڑی دیر کے بعد صدر ایوب ان کا خذات کو ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آئے اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مسکرا کر بولے۔ پراویڈنٹ فنڈ تو ریٹائرڈ ہونے کے بعد کام میں لانا چاہیے۔ تم ابھی سے اس میں سے یہ رقم کیوں نکلا رہے ہو۔“

میں نے اپنی بیوی کے ساتھ عمرہ پر جانے کا ارادہ بتایا، تو وہ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ ”اگر ایسا ارادہ تھا تو تنخواہ میں سے پیسہ بچا بچا کر رکھتے۔ پراویڈنٹ فنڈ میں سے کچھ نکلوانا دور انسٹیشی کی بات نہیں۔“

میں خاموش رہا، تو انہوں نے جیب سے اپنی ذاتی چیک بک نکالی، اور فرمایا۔ ”اس رقم کے برابر میں تمہیں اپنا ذاتی چیک دیتا ہوں۔ نصف رقم تم اپنی سولت سے رفتہ رفتہ واپس ادا کر دینا۔ باقی نصف میرا تحفہ سمجھو۔“

ان کے اس الطاف کریمانہ سے میں بیجد متاثر ہوا، اور شکریہ ادا کر کے انتہائی لجاجت

سے میں نے انہیں سمجھایا، کہ عمرہ جیسے دینی سفر پر مجھے اپنے خرچ ہی سے جانا چاہیے۔ اس کے بعد اگر مجھے کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی فیاضی سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔

یہ سن کر وہ زور سے ہنسے اور بولے۔ ”ہر روز عید نیست کہ حلو خورد کے۔“ اس کے بعد میرے فارم پر انہوں نے خندہ پیشانی سے دستخط کر دیئے۔

یہ معمول سا واقعہ مالی، اقتصادی اور معاشی زاویوں سے صدر ایوب کے ذہنی روحانیات اور ذاتی کردار پر نہایت دلچسپ روشنی ڈالتا ہے۔ ان کی پنی تملی فیاضی جذبات سے آلوہہ ہو کر بو جعل یا لکھ لٹ نہ بتتی تھی۔ فضول خرچی اور اسراف سے وہ کوسوں دور تھے۔ پس اندازی ان کے نزدیک عقل و دانش اور دور انسٹی کا شعار تھا۔ اور ہر معاملے میں حساب کتاب سے چلنا ان کی عادت ثانیہ تھی۔ ان کے دور حکومت میں اگر یہی ذاتی اوصاف اور مملکتی سطح پر بھی جاری و ساری ہو جاتے، تو پاکستان کا مالی اور معاشی مستقبل نہایت ترقی یافتہ اور خوشحال خطوط پر منظم ہو جاتا۔ لیکن بدقتی سے یہ صورت حال پیدا ہونے سے وہ گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک آزاد مملکت کے فلسفہ معاشیات کے علوم و فنون پر عبور رکھنے والے ماہرین کی بیشہ شدید کمی رہی ہے۔ صدر ایوب کو اپنے دور میں جو اقتصادی اور معاشی امور کے وزیر، مشیر اور ماہر میسر آئے، وہ یا تو نہایت لاائق فائق، قابل اور مستعد اکاؤنٹنٹ تھے یا غیر معمول طور پر فیین و فیین سول سروٹ تھے، جن کا خاص طرہ امتیاز یہ تھا کہ وہ ولڈ بنک، انٹرنیشنل مائیٹری فنڈ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کی اصطلاحات اور جارگن نہایت خوش اسلوبی سے اپنا کر اپنا اوڑھنا پچھونا بنا لیتے تھے۔ ان بلند و بالا، گرنجدار اور پرشوکت الفاظ اور اصطلاحات کی اشکال صوتی میں عقل و دانش، فہم و ادارک اور اقتصادی علوم و فنون کا جو تھوڑا بہت مغز اور گودا ملتا بھی تھا تو اس کی حیثیت ولڈ بینک کے چھوٹے موٹے مشوروں اور مریبوں کے پس خورده اقوال اور مسلمات سے کچھ نیا وہ نہ ہوتی تھی۔ اس طرح پاکستان کی جدید اکانوی کا جیٹ طیارہ سینکڑ کلاس پاکٹوں کے ہاتھ میں آ کر تھرڈ ریٹ پڑوں کے

سارے بلند ترین فضاوں میں پرواز کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

فوجی حکومت کے آتے ہی خوف و ہراس کی جو فضا چھا گئی، اس میں مارشل لاء نے چند سطحی لیکن دلچسپ گل کھلائے۔ ذخیرہ اندوزوں، اور بلیک مارکیٹ کرنے والوں نے اپنی دکانوں کے پٹ کھول دیئے اور مخلوق خدا مذہبی دل کی طرح ٹوٹ کر گری اور دونوں ہاتھوں سے سستے داموں مال و اسباب خریدنے میں مصروف ہو گئی۔ چند لوگوں نے ناجائز دولت سے بھرے ہوئے سوت کیس راتوں رات کھلے میدانوں میں جا پھینکنے کروڑوں روپے کا پوشیدہ کالا دھن وابجی نیکیں ادا کرنے کے بعد ظاہر ہو کہ تجارت صنعت کی گردش میں آگیا۔ مارشل لاء کی عینک لگا کر پولیس کے سراگر سانوں کی بصارت بھی تیز ہو گئی اور ایک روز سمندر کی تہ میں ڈوبا ہوا ناجائز سونے کا بہت بڑا انبار برآمد کر لیا گیا۔

بیرون ملک چھا کر رکھے ہوئے سرمائے کو واپس لانے کے لیے مارشل لاء کا ایک ضابطہ نافذ ہوا جس کے تحت ہر شخص اپنا غیر ملکی زرمبادلہ بغیر کسی روک ٹوک کے پاکستان لا سکتا تھا۔ سرکاری شرح مبادلہ پر اس کو پاکستانی روپے پوری تعداد میں مل جاتے تھے۔ اور اس رقم پر کوئی نیکی بھی نہ لگایا جاتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس رعایت سے خاطرہ خواہ فائدہ اٹھایا، لیکن بڑے بڑے سیمھوں کا ایک منتظم گروہ اس ضابطہ کو پوری طرح ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا، ان حضرات کو یقین تھا کہ ان کا سرمایہ صرف پاکستان سے باہر ہی محفوظ رہ سکتا ہے، ملک کی سلامتی اور بقا کے بارے میں وہ اس قدر متعدد تھے، کہ اپنا سرمایہ یہاں لا کر وہ ہرگز ڈبوٹا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک خفیہ تحریک چلانا شروع کر دی، جس سے وہ اپنے ہم مشرب سیمھوں اور ساہو کاروں کو تسلی اور تشغیل دیتے تھے کہ وہ خواہ مخواہ مارشل لاء کی گیدڑ بھیکیوں میں نہ آئیں، اور اپنا قبیتی زرمبادلہ پاکستان واپس لانے کی غلطی نہ کریں۔ ایک سیمھ کے محب وطن کارندوں نے یہ راز ایک گمنام خط کے ذریعے صدر ایوب کے نام لکھ کر بھیج دیا۔ اس میں یہ بھی درج تھا، کہ ایم، اے رنگوں والا چیئرمین فیڈریشن آف چیبرز آف کامرس اینڈ اینڈسٹری

بے۔ ایں۔ لوبو سیکرٹری کراچی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری۔ اے۔ کے سومار سیکرٹری پاکستان مرچنٹس ایوسی ایشن اور احمد۔ اے کریم اور تحریک کے روح روائی ہیں۔ صدر ایوب کے نام اس خط کے ساتھ ایک اور پرچہ بھی ملک تھا جو میرے نام تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہمیں معلوم ہے کہ دفتر رسم و رواج کے مطابق گمنام خطوط کو روئی کی نوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ لیکن تم اس خط کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز نہ کرنا۔ کیونکہ ہم اللہ اور رسول کی قسم کھا کر اپنے اکشاف کی سچائی کا اعلان کرتے ہیں۔ اگر تم نے اس خط کو نظر انداز کیا تو تم بھی قوم کے مجرموں کی پشت پناہی کر رہے ہو گے۔

صدر ایوب کی اجازت سے میں نے اس خط کے مندرجات کو ایک مخبرانہ رپورٹ کی صورت میں منتقل کیا۔ اور اس پر مختلف ذرائع سے انکوارری شروع کروادی۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ معلوم ہوا کہ بہت سے سربرآورہ اشخاص منظم طور پر یہ سازش کر رہے ہیں، کہ لوگ اپنی پوشیدہ دولت کو ظاہر نہ کریں۔ بیرون ملک جمع کیا ہوا زرمبادلہ واپس نہ لایا جائے اور منگانی بڑھانے کی غرض سے مقامی صنعتوں کو slow go پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس تحریک کے سراغنوں کے طور پر رنگون والا، بولو، سومار اور احمد کریم گرفتار کر لیے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ ان حضرات پر مقدمہ بھی ضرور چلایا جائے گا۔ لیکن کسی نامعلوم وجہ سے ایسا نہ ہوا۔ چند ہفتوں بعد میں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ چاروں کراچی جیل سے رہا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ بات اب تک میرے لیے معہ ہے کہ اچھا خاصا ثبوت مہیا ہونے کے باوجود ان کے خلاف مزید قانونی کارروائی کیوں نہ کی گئی؟

بیرون ملک جمع کیے ہوئے زرمبادلہ کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ مارشل لاء نافذ ہوتے ہی جو کابینہ بنائی گئی تھی، اس میں مسٹر محمد شعیب وزیر خزانہ کے طور پر مقرر ہوئے تھے۔ وزیر خزانہ کا عمدہ انہوں نے اس شرط پر قبول کیا تھا کہ وہ ساتھ ہی ورلڈ بیک کے ڈائریکٹر بھی بدستور رہیں گے۔ ان دو آسامیوں پر ایک شخص

کا بیک وقت فائز رہنا اصول طور پر معیوب اور نامناسب تھا۔ ایک آزاد مملکت کے وزیر خزانہ کا ساتھ ہی ساتھ ایک بین الاقوامی بیک کی اونٹی سی آسائی کے ساتھ چھٹے رہنا ہمارے قومی وقار کے سراسر منافی تھا۔ اس لیے شروع ہی سے میرے دل میں ان کے متعلق کوئی خاص قدر و منزلت نہ تھی۔

جن دنوں میں بیرون ملک جمع کیے ہوئے زرمبادلہ کے سلسلے میں چند بڑے سیمھوں کے خلاف انگوئری شروع کروانے سے مصروف تھا۔ ایک روز محمد شعیب صاحب میرے دفتر میں تشریف لائے۔ ورلڈ بینک کی ملازمت کی وجہ سے امریکہ میں ان کے کئی لاکھ ڈالر جمع تھے۔ انہوں نے صدر ایوب کے نام ایک درخواست لکھ رکھی تھی کہ انہیں یہ رقم امریکہ کے بینک ہی میں رکھنے کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے یہ درخواست میرے حوالے کر کے کہا کہ میں صدر ایوب سے منظور کرواؤ کے اسے جلد از جلد ان کے پاس بھیج دوں گا۔ وزارت کے ساتھ ہی ساتھ ورلڈ بینک کی ملازمت کی وجہ سے شعیب صاحب کے خلاف کچھ قدرے تعصب میرے دل میں پہلے ہی موجود تھا۔ اب ان کی اس درخواست نے جلتی پر نیل کا کام کیا۔ میں نے لگے ہاتھوں انہیں کراچی کے بڑے بڑے سیمھوں کی سازشانہ حرکات کا حال سنایا۔ اور اپنی برخود غلط، عادلانہ اور متقیانہ راست بازی کے جوش میں کہہ بیٹھا۔ ”سر، ملک کے وزیر خزانہ کو پاکستان کے اقتصادی ثبات اور استحکام پر دوسروں کی نسبت نیادہ کامل یقین اور اعتماد ہونا چاہیے۔ اگر آپ اعلان کر کے ڈنکے کی چوت اپنا بیرونی اٹاٹہ یہاں لے آئیں، تو اوروں کے لیے یہ نہایت صحت مند اور قابل تقليد مثال قائم ہو گی۔“

میری بات سن کر شعیب صاحب تاؤ میں آگئے۔ انہوں نے اپنی درخواست جھپٹ کر میرے ہاتھ سے چھین لی اور تیزی سے بولے۔ ”بس بس۔ میں یہاں پندو نصلح سننے نہیں آیا۔“

میرے کمرے سے نکل کر وہ سیدھے صدر ایوب کے پاس گئے۔ اور اپنی درخواست پر ان کی منظوری کے دستخط ثبت کرا لائے۔

ایک طرف وزارت خزانہ کی کرسی۔ دوسری طرف ورلڈ بینک کی ڈائریکٹری کا سھول۔

ان دونوں شناختوں کے درمیان شعیب صاحب کی ذات عجیب و غریب لطائف و ظرافت کا شکار ہوتی رہتی تھی۔ چند بار تو میں بھی ان غلط فہمیوں کی لپیٹ میں بری طرح آیا۔

شعیب اور شاپ میں ایک مبسم سی صوتی ممائٹ کے علاوہ ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ ایک بار صدر ایوب یو گو سلاویہ کے سرکاری دورے پر گئے تو ہم دونوں بھی ان کے ہمراہیوں میں شامل تھے۔ آخری روز مارشل ٹیٹھ نے کچھ تحائف تقسیم کیے۔ مجھے ایک نہایت خوبصورت ریڈیو گرام ملا۔ شعیب صاحب کو ایک نہایت معمولی سی ایش ٹرے ملی۔ وہ میرے سر ہو گئے کہ ہمارے ناموں کی ممائٹ سے غلط فہمی ہوئی ہے، اور میرے نام کا تحفہ غلطی سے تمہیں مل گیا ہے۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی شک گزرا۔ اتفاق سے یو گو سلاویہ کا چیف آف پروٹوکول ادھر سے گزرا تو میں نے اسے روک لیا۔ شعیب صاحب اور میرے تحائف میں غلطی سے ردو بدل کا شبہ بیان کیا، تو وہ مسکرا یا اور بولا۔ ”کوئی غلطی یا غلط فہمی نہیں ہوئی۔ آپ دونوں کو اپنے اپنے صحیح تحائف ملے ہیں۔“

”لیکن مشر شعیب تو مشر کا عہدہ رکھتے ہیں۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”جو تحفہ انہیں دیا گیا ہے وہ ان کے منصب کے شایان شان نظر نہیں آتا۔“

چیف آف پروٹوکول نے کہا۔ ”آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر تقریب میں ہم نے وزیر خزانہ کو ان کے منصب کے مطابق درجہ دیا ہے۔ لیکن تحائف میں ہم نے انہیں ورلڈ بینک کا ڈائریکٹر تسلیم کیا ہے۔“

”کیوں؟“ ہمارے صدر کے ملٹری سیکریٹری نے پوچھا۔

”ہمیں اس میں کسی قدر بچت نظر آئی۔“ یو گو سلاویہ کے چیف آف پروٹوکول نے کسی قدر تمثیر سے کہا۔

اسی طرح کے ایک دو واقعات صدر ایوب کے دونہ امریکہ کے دوران بھی پیش آئے۔ صدر کینڈی اور مزر کینڈی نے صدر ایوب کے اعزاز میں ماونٹ ورنن پر ایک نہایت

شاندار ڈر کا اہتمام کیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے کچھ فاصلہ کشتوں کے ذریعے طے کرنا تھا۔ پہلی کشتی میں مسٹر اور مسز کینڈی کے ساتھ صدر ایوب اور دوسرے جو لوگ سوار ہوئے ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ شعیب صاحب کو دوسری کشتی میں نبٹا کم اہمیت والے مسمانوں کے ساتھ بھایا گیا۔ اس پر وہ بڑے سخ پا ہوئے۔ لیکن امریکن چیف آف پرونوکول سے استفار کرنے پر یہی جواب ملا کہ ورلڈ بینک کے ڈائریکٹر کے رتبہ کے مطابق انہیں صحیح مقام پر بھایا گیا ہے۔

اندرون امریکہ ایک سفر پر ہمیں صدر کینڈی نے اپنے سرکاری جہاز میں بھیجا۔ امریکی محلہ پرونوکول کے ایک افسر بھی ہمارے ساتھ شریک سفر تھے۔ ہر نشست پر انہوں نے ہمارے نام کے کارڈ چپا کیے ہوئے تھے۔ میری نشست ہمارے ممتاز سلنڈان ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ تھی۔ مسٹر شعیب کی نشست بھی ایک عبدالسلام کے ساتھ تھی جو صدر ایوب کا ذاتی خدمت گار تھا۔ اس بات پر شعیب صاحب کا براندوختہ ہونا قدرتی امر تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر شعیب اور شباب کی ممائش کو آڑ بنا کر نشتوں کی رو و بدل کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ اس ناخوشنگوار بک بک جھک جھک نے اس قدر طول کھینچا کہ امریکی پرونوکول افسر نے پیچ بچاؤ کر کے اپنا فیصلہ دیا کہ ورلڈ بینک کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مسٹر شعیب کے ساتھ کوئی نیادتی نہیں ہو رہی۔

جس وقت صدر ایوب نے عنان اقتدار سنبحالی تھی، اس وقت ملک میں بیرونی زرمباولہ کی شدید تلت تھی۔ عام اشیائے صرف کمیاب ہی نہیں تھیں بلکہ ان کی قیمتیں بھی بہت گراں تھیں، بلیک مارکیٹ، ذخیرہ اندوزی، اسمگنگ، امپورٹ لائنسوں کی برسر عام خرید و فروخت اور دیگر ہر طرح کی سرکاری مراعات کا کاروبار کھلے بندوں عام تھا۔ کسی نے صدر کو یہ پٹھا دی کہ ان سب خرایوں اور تقاضوں کا تیر بہدف علاج بونس واوچر سکیم میں مضر ہے۔ یہ تجویز کسی باضابطہ معاشی اصول یا نظریات پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ اس کی حیثیت ان نفیات کے ماہر چوب نیان نیاسیوں کے ٹونے ٹوکلوں کی سی تھی

جو پہاڑی جزی بولیوں کے گیت گا کر مایوس مریضوں کو صحمندی کا مژہ سنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔

اس سکیم کے مطابق جو شخص کوئی چیز ایکسپورٹ کر کے جتنا زرمباولہ کماتا تھا، اس کا ایک خاص حصہ اسے بونس واوچر کے طور پر عطا کر دیا جاتا تھا۔ جس سے وہ اپنی ضرورت یا مرضی کیمطابق جو کچھ چاہے باہر سے درآمد کر سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایکسپورٹ کا کاروبار ہر کسی کا دلپسند مشغله بن گیا۔ جسے دیکھو کوئی نہ کوئی شے برآمد کرنے کی فکر میں غلطان و پیچاں تگ و دو کر رہا ہے۔ بونس واوچروں کا نرخ بالا ہو گیا۔ آسودہ حال لوگ انیں اپنا سامان تعیش درآمد کرنے میں بیدریغ خرچ کرتے تھے۔ چنانچہ دکانوں اور گھروں میں عورتوں کے میک اپ کے اعلیٰ ترین لوازمات عمدہ شرابوں، سرببر ولاستی کھانے پینے کی اشیا کے ڈبوں، فرانسیسی پانی کی بولکوں، سوس چاکلیٹوں، جرمن کیمروں اور طرح طرح کی ٹافیوں، مٹھائیوں، پنیروں اور بسکٹوں کی ریل پیل ہو گئی۔ بونس واوچر ہاتھوں ہاتھ منگے داموں بکتے تھے اور ان کے عوض ایسپورٹ کی ہوئی اشیاء اور بھی نیادہ منگلی ہو کر بازار میں آتی تھیں۔ بونس واوچر کی برکت سے بین الاقوامی سطح پر پاکستانی روپے کی قیمت گر کر نصف کے قریب ہے گئی، لیکن اندوان ملک ہمارے اقتصادی ماہر صدر ایوب موچھ کو تاؤ دیکر ان کے منہ سے یہی اعلان کرواتے رہے کہ ہم کسی دباؤ کے تحت اپنے روپے کی قیمت ہرگز ہرگز نہیں گھٹائیں گے۔ سرکاری شرح سے تو ایک پونڈ کی قیمت گیاہ بارہ روپے بنتی تھی۔ لیکن کھلی منڈی میں اس کا بھاؤ ۱۸ سے چوبیس روپے تک اٹھتا تھا۔ پاکستانی کرنی کی اصلی اور نعلیٰ قیمت میں اتنا بڑا فرق اس کی ساکھ کے لیے انتہائی مضر تھا۔

بونس واوچر سکیم کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ جو سامان زرمباولہ کی سرکاری شرح پر بھی درآمد کیا جاتا تھا، بازار میں اس کا نرخ بھی بونس واوچروں کے ریٹ پر فروخت ہوتا تھا۔ اس سے ہماری ساری درآمدی تجارت کی قیمتوں میں یک بیک شدید اضافہ ہو گیا۔

اس سکیم میں اگر کوئی مثبت پہلو نظر آیا تو وہ یہ تھا کہ ملک بھر میں شری آبادی کا ایک چھوٹا سا مُل کلاس طبقہ امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار میں آ کر زیادہ تر بلیک مارکیٹ اور ذخیرہ اندوزی کے سارے کسی قدر آسودہ حال ہو گیا۔

صدر ایوب صدق دل سے خواہاں تھے کہ ملک میں حقیقی خوشحالی اور آسودگی کا دور دورہ شروع ہو۔ انہیں اکانومی کا خود تو کوئی خاص علم یا تجربہ نہ تھا۔ لیکن ایک مستعد اور چوکس دیساتی کی عقل سليم اور سوجہ بوجہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس لیے انہیں واقعی یہ احساس تھا کہ بونس واوچر سکیم کی ملیع سازی خوشحالی کا فریب نظر تو ضرور ہے لیکن خوشحالی کا صحیح راستہ نہیں۔ ایک حقیقت پسند انسان کی طرح وہ اس بات سے بھی بخوبی آشنا تھے کہ جس نظام میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ اس میں کوئی شدید سقم اور کبھی ہے۔ لیکن عملی طور پر وہ اپنے مالی اور اقتصادی مشوروں اور ماہروں کے زرنے میں آ کر بے دست و پا ہو گئے، اور اپنی جبلی سمجھ بوجہ اور عقل و دانش کو کسی وقت بھی پوری طرح کام میں نہ لاسکے۔ دراصل ان حضرات کو مالی اور اقتصادی ماہرین کہنا اس اصطلاح کا غلط استعمال ہے۔ یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ باجوہ قسم کے بڑے عہدے دار تھے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کی تعلیم و تربیت یا تو محاسبوں منیبیوں اور جمع خرچ نویسوں کے طور پر ہوئی تھی، یا وہ ڈپٹی کمشنز، کمشنز، اور جائیٹ سیکرٹری کے مرحلوں سے بخیر و خوبی گزر کر ملک بھر کے مالیاتی، اقتصادی اور منصوبی بندی کے امور پر قابض ہو گئے تھے۔ ایک آزاد مملکت کے مسائل کو اس کے اپنے وسائل کے حصار میں رکھ کر حل کرنا انہوں نے کہیں سے نہ سیکھا تھا۔ لے دے کے ان کی دوڑ مغرب کے چند ترقی یافتہ ممالک تک تھی جن میں امریکہ سرفراست تھا۔ ان سب ممالک کی اپنی اپنی مصلحتیں، اپنی اپنی ترجیحات اور اپنے مقاصد تھے۔ ہمارے معاشی اور اقتصادی ماہرین کی اکثریت دوسروں کی مصلحتوں، ترجیحات اور مقاصد کے کنویں کے مینڈک بن کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ وہ ہر سال نہایت درست اور صحیح بجٹ بنا لیتے تھے۔

خواہ پورا کرنے کے لیے نئے نئے نیکس لگانے میں نہایت چلکدستی اور چوب زبانی سے کام لیتے تھے۔ ہر میزانیہ میں تو فیری سرخاب کا پر لگانے کے لیے اور اس پر ترقیاتی منصوبوں کا ملٹع چڑھانے کے لیے وہ بیرونی امداد اور قرضے لینے کے لیے دوسروں کے سامنے بے جواباً ہاتھ پھیلانے میں بے حد مشاق ہو گئے تھے۔ غیر ملکی امداد کی بیساکھیوں پر چڑھائی ہوئی ہر اقتصادی اور معاشیاتی عمارت غیر محفوظ اور غیر مامون ہوتی ہے۔ ہم پر جب کبھی کوئی آزمائش کی گھٹری آئی ہے، اس عمارت کا ایک نہ ایک حصہ دھڑام سے نہیں بوس ہوتا رہا ہے۔ ایوب خاں کے دور حکومت کو بہت سے لوگ مادی ترقی کا سنگری دور کرتے ہیں۔ بے شک اس میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن جن ناقابل اعتبار اور غیر یقینی ساروں پر اس کی بنیاد رکھی گئی تھی اسے قائم رکھنے کے لیے ہمیں اب تک ہر نانے میں طرح طرح کے پاپڑ بلنے پڑتے ہیں۔ خود کفالت کی راہ پر قدم بڑھائے بغیر ہر قسم کی ترقی کی اساس مصنوعی اور ناپائیدار رہتی ہے۔ ہماری روز افزوں ضروریات کا گرچھ تو منہ کھلے ہل من مزید کا نعرہ بلند کرتا رہتا ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے دوستوں اور امداد دینے والے بھی خواہوں کی اپنی مصلحتوں کے تقاضوں اور ترجیحات میں زیور ہم اور رد و بدل ایک لازمی اور فطرتی امر ہے۔

ہمارے قوی وسائل کو بیرونی ذرائع کا محتاج بنانے کے علاوہ ہمارے نام نہاد اقتصادی ماہرین نے صدر ایوب کو یہ بھی باور کرا دیا کہ پاکستان کی طرح تیسری دنیا کے پہمانہ ممالک کے لیے مادی ترقی کا ایک ہی راستہ ہے جو طویل بھی ہے اور دشوار گزار بھی۔ اس کے علاوہ نہ تو کوئی متبادل راستہ ہے، اور نہ ہی کوئی شارت کٹ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان لکیر کے فقیروں نے سرخ فیتے کی مدد سے صنعتی اور تجارتی ترقی کا زین اس طرح آوریاں کر دیا کہ اس پر وہی چیز چیز، برگزیدہ اور پسندیدہ اشخاص اور چڑھ سکتے تھے جو قسم کے دھنی تھے اور پہلے ہی سے سیڑھی کے ایک نہ ایک پائیدان پر ایستادہ ہو چکے تھے۔ نئی صنعتیں لگانے کے لائنس یا تو پرانے صنعتکاروں اور تاجریوں کو ملتے تھے،

یا ان دوسرے لوگوں کو ملتے تھے جنہیں سیاسی رشوت، اقیا پوری یا کسی دیگر خوشنودی کے طور پر نوازا تھا۔ یہ دوسرے لوگ لائنس لے کر انہیں منہ مانگی قیمت پر پرانے صنعت کاروں اور تا جروں کے ہاتھ پیچ ڈالتے تھے۔ اس طرح بنیادی طور پر صنعت کاروں کا حلقة اپنے پرانے دائرے کی حدود ہی میں گردش کرتا رہتا تھا۔ اور اس میں تانہ خون بہت کم مقدار میں شامل ہوتا تھا۔ ایک ہی خاندان طرح طرح کی کثیر الانواع صنعتیں لگا لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ان کا اپنا بینک، اپنی انشورنس کمپنی، اور اپنے ہی تجارتی گودام بھی قائم ہو جاتے تھے۔ اس قسم کے کارٹل ملک میں اس قدر عام ہو گئے کہ قوم کی دولت کا پیشتر اثاثہ بیس بائیس خاندانوں کی تجویزیوں میں مرکوز ہو کر رہ گیا۔ وہ زمانہ ایسا تھا جس پر اس ہندی دوہے کی مثل پوری طرح صادق آتی تھی:

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ  
تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

شرع شروع میں وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب نے نمایت ٹمپراتوں سے یہ اعلان کیا تھا کہ ہم کارٹلز کا قلع قلمع کر کے رہیں گے لیکن دو ڈھانی برس کے اندر اندر انسوں نے قلا بازی کھا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ کارٹلز بنانے والوں کو رضا کارانہ طور پر انہیں ختم کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد اس موضوع پر نیب داستان کے لیے اتنی سی بیان آرائی بھی بند ہو گئی۔

مال و زر کی اس تکمیل میں مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں برابر کے شریک تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بنگالی حضرات اپنا لائنس نیاہ تر مغربی پاکستان میں فروخت کرنے کی کوشش کرتے تھے، کیونکہ یہاں پر خریدار نبٹا نیاہ تھے اور قیمت بھی غالباً نیاہ ملتی تھی۔ بظاہر اس سے یہی گمان ہوتا تھا کہ اس بذریعہ میں مغربی پاکستان کیساتھ

ترجیحی سلوک کیا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ بلکہ اس کے بر عکس بنگالی وزیر ارباب سیاست اور ان کے عزیز و اقارب پر مشتمل اور لاکسنوں کی صورت میں اپنی قیمت وصول کرنے میں کسی سے پچھے نہ تھے، اس زمانے میں پان کے تانہ بتانہ پتے بڑی کثیر تعداد میں ہر روز پی آئی اے کے ذریعے مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آیا کرتے تھے۔ یہ نہایت منافع بخش تجارت تھی اور ایک ایک نوکری فی یوم کا لاکسن حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی سفارشوں اور اثر رسوخ سے کام لیا جاتا تھا۔ ان لاکسنوں کی تقسیم کلیہ چند بنگالی وزوروں اور بنیادی جمہوریتوں کے اہم ترین ارکان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ پہلے اپنے بیٹوں، بھانجوں اور بھیجوں کا پیٹ بھرتے تھے۔ اور اس کے بعد اپنے سیاسی حلیفوں کی وفاداریاں مستحکم کرنے اور حریفوں پر ترغیب و تحریص کا جال پھیلانے کے کام میں لاتے تھے۔ ایک بنگالی وزیر بائدیر اس کام میں بے حد پیش تھے۔ جب کبھی وہ کسی کو چند نوکروں کا لاکسن دلوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے تو اپنے ایک چھپے ہوئے خوبصورت کارڈ کے ذریعہ اسے مبارک باد کا خط بھی ضرور بھیجتے تھے۔ اس کارڈ میں کسی من چلنے نے بنگالی ترجمہ کے ساتھ فارسی کا یہ مصروع بھی درج کرو رکھا تھا

### برگ بزر است تحفته درویش

حکومت اور سیاست کے درویشوں کے گال اور ہونٹ تو برگ  
 بزر کی برکت سے گلناہی رہے تھے، لیکن تھفون کی اس  
 ہیرا پھیری میں پانوں کے تاجروں کا ایک کثیر طبقہ اپنے  
 آبائی پیشے سے محروم ہو کر بے کاری کا شکار ہو گیا۔ مشرقی  
 پاکستان کے کچھ لوگوں نے اسے یہ رنگ دیا کہ اب تو  
 مغربی پاکستان والے ہمارے روایتی اور خاندانی پیشہ وروں  
 کی روزی چھیننے کے بھی درپے ہیں۔

اسی زمانے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے چند پروفیسروں نے Economies Two کا شو شہ چھوڑ رکھا تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کسی مشترکہ معاشیات کا وجود ممکن نہیں۔ بلکہ دونوں حصوں کے الگ الگ معاشیاتی تقاضے ہیں۔ اس لیے ایکسپورٹ امپورٹ کنٹرول پی۔ آئی۔ اے، پی۔ آئی۔ ذی۔ سی اور سینٹ بینک سمیت ہر اقتصادی شعبے اور ادارے کو تقسیم کر کے دونوں صوبوں میں الگ الگ طور پر قائم ہونا چاہیے۔ صدر ایوب اس صورت حال پر بہت پریشان تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اس طرز استدلال کا منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ اگر ملک کی معاشیات اور اقتصادیات مرکز سے ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، تو رفتہ رفتہ دو سکے راجح ہو جائیں گے، اور اس کے بعد دو الگ الگ ملک عالم وجود میں آ جائیں گے۔

ایک بار صدر ایوب ڈھاکہ گئے ہوئے تھے۔ وہاں پر انہیں خیال آیا، کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ان پروفیسروں سے مل کر دیکھنا چاہیے کہ دو معاشیات کا شوشه چھوڑنے سے ان کی اصلی غرض و غایت کیا ہے۔ چنانچہ ایک صبح ہم نے چھ سات نوجوان اور ادھیز عمر کے پروفیسروں کو صدر کے ساتھ ناشتے پر مدعو کیا۔ ان میں پروفیسر نورالہدی اور پروفیسر نورالسلام بھی شامل تھے۔ چند جواں سال اساتذہ نے نہایت شدومد سے تیز تیز لمحہ میں مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے استھان کا روٹا رویا۔ اور اس کا واحد حل یہی تجویز کیا کہ دونوں حصوں میں اپنی اپنی معاشیات کو الگ الگ فروغ دیا جائے۔ ان کی باتیں نہایت صبر و سکون سے سن کر صدر ایوب نے کہا۔

”آپ سمجھے دار لوگ ہیں۔ کیا دو معاشیات ہمیں دو الگ الگ ملکوں میں تقسیم نہ کر دیں گی۔“

اس پر نبٹا بڑی عمر کے لوگ تو خاموش رہے۔ لیکن دو تین نوجوان اساتذہ خوشی سے اچھل پڑے۔ ایک نے بے ساختہ کہا۔ ”سر! میرے خیال میں موجودہ صورتحال کا بس یہی ایک منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اسے روکنا کسی کے اختیار میں نہیں۔“

ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسروں کے ساتھ اس گفت و شنید نے صدر ایوب کو مزید الجھن

اور پریشانی میں ڈال دیا۔ اگلے روز انہوں نے مشرقی پاکستان کے تیس پنچتیس سیاستدانوں، اخبار نویسوں اور دیگر اکابرین کے ساتھ مشوہ کرنے کے لیے ایک مینگ منعقد کی۔ شیخ مجیب الرحمن کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن انہوں نے آنے سے انکار کر دیا تھا مینگ میں صدر ایوب نے ڈھا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ اپنی گفتگو کے تاثرات بیان کئے، اور ایک طویل جذباتی تقریر کے اختتام پر کہا

”اگر آپ نے مغربی پاکستان سے الگ ہونے کا عزم کر لیا ہے تو باہمی نور آزمائی“ الزام تراشی اور سر پھول کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم سب کو بھائیوں کی طرح ایک میز کے گرد بیٹھ کر خوش اسلوبی اور خیر سکالی سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔“ چند لمحے بالکل سنائی چھایا رہا۔ اس کے بعد مسٹر نور الدین اور ”اتفاق“ کے ایڈیٹر مسٹر تقضل حسین عرف مانک میاں سمیت کئی حاضرین نے بیک آواز کہا۔ ”ہرگز نہیں۔“ ہرگز نہیں۔“ ایسی بات تو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں۔“

”Never Never, we do not even dream of it“ اس کے بعد باہمی اتفاق، اتحاد، تعاون اور خیر سکالی پر بہت سی تقریریں ہوئیں۔ کئی مقررین کے گلے وفور جذبات سے رندھے ہوئے تھے۔ مانک میاں کے روزانہ ”اتفاق“ کی روشن ایوب خاں کی فوجی حکومت اور ان کے نئے آئین کے خلاف رہا کرتی تھی۔ انہوں نے خاص طور پر صدر ایوب کو مخاطب کر کے کہا۔ ”مسٹر پریزیڈنٹ ہمارے اختلافات آپ کی حکومت کے خلاف ہیں، اپنے ملک کے خلاف نہیں،“ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک میری نسل کے لوگوں کا کچھ اثر و رسمخ باقی ہے، پاکستان کی سالمیت پر کوئی ضرب نہیں آسکتی۔ لیکن ہمارے بعد کیا ہو گا، اس پر ہم نہایت فکر مند ہیں۔“

مانک میاں نے اس بھر مھفل میں ایک اور عجیب اکشاف کیا، انہوں نے کہا ”ہمیں کئی بار دو بڑی طاقتیوں کی طرف سے خفیہ طور پر اسلحہ مہیا کرنے کی پیش کش ہوتی رہتی ہے۔ تاکہ ہم مسلح ہو کر علیحدگی کی تحریک چلا سکیں۔ لیکن ہم نے انہیں بیشہ بھی جواب دیا ہے کہ ہمارے اندر وہی جھگڑے جو کچھ بھی ہوں۔ ان میں کسی بیرونی مداخلت

کو ہم ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ طاقتیں باقی سب امور میں ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار رہتی ہیں۔ لیکن پاکستان کو دولخت کرنے میں دونوں متفق ہیں۔”

اس مینگ نے صدر ایوب پر خواب آور گول کا اثر کیا اور وہ مشرقی پاکستان کے متعلق ضرورت سے زیادہ بخخت ہو کر بیٹھ گئے۔ اب وہ اس صوبے کی ہر پیچیدگی کو اپنی ساہہ لوح اثر سے مفرد شکل میں انتہائی سل بنا کر دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ ایکبار انہوں نے دفعہ یہ فیصلہ کر دیا کہ مشرقی پاکستان میں جتنے غیر بنگالی افسر ڈیپوٹیشن پر گئے ہوئے ہیں ان سب کو واپس بلا لیا جائے اور آئندہ اس صوبے میں باہر سے کوئی افسر تعینات کر کے نہ بھیجا جائے۔ اس پر یوروکسی کے ایک محدود سے طبقے میں معاملی سی واہ واہ ہوئی۔ لیکن ”سنگباد“ ڈھاکہ کے ایڈیٹر ظہور چودھری نے مجھے کہا۔ ”یہ فیصلہ انتہائی غلط اور خطرناک ہے۔ آئندہ یہاں پر مرکز کے خلاف جو زیر نہیں مواد پکے گا، اس کا علم آپ کو اسی وقت ہو گا جب وہ لاوا بن کر پھٹ جائے گا۔ اس سے پہلے یہاں کی نوکر شاہی آپ تک کوئی خبر نہ پہنچنے دے گی۔“

ظہور چودھری کا یہ خدشہ میں نے صدر ایوب کو بتایا تو وہ چڑ کر بولے۔ ظہور چودھری تو شکوک و شبہات کا دائم المریض ہے۔ اچھی سے اچھی بات سن کر بھی اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتا ہے۔“

ایک روز راولپنڈی کے ایوان صدر میں کابینہ کی مینگ تھی۔ مینگ ختم ہوتے ہی صدر ایوب نے مجھے حکم دیا کہ میں تین بنگالی وزیروں خان عبدالصبور خاں، فضل قادر چودھری اور عبدالمنعم خاں کے ساتھ شیخ منظور قادر اور ذوالفقار علی بھٹو کو ساتھ لے کر ان کے کمرے میں آؤ۔ ہم لوگ ان کے کمرے میں پہنچے تو صدر نے کہا۔ ”میں نے آپ لوگوں کے ساتھ ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔ غلام فاروق کی جگہ اب مجھے مشرقی پاکستان کے لیے ایک نئے گورنر کی تلاش ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ موقع اب کسی

مشرقی پاکستانی کو ملتا چاہیے۔ اب بتائیے کہ وہاں کا گورنر کون ہو؟  
یہ سنتے ہی تینوں بنگالی وزریوں کے چھروں پر حسرت و التجا، خوشامد درآمد الماح و زاری، ارمان  
و امنگ کی رنگ برنگ تختیاں کھٹاک سے ثابت ہو گئیں، جن پر جلی حروف میں لکھا  
ہوا تھا۔ ”جناب صدر، اس خاکسار میں کیا کی ہے؟“  
چند لمحے سناتا طاری رہا۔ پھر کمرے میں صدر ایوب کی آواز گونجی۔ ”میں بتاتا ہوں مشرقی  
پاکستان کا نیا گورنر کون ہو گا۔“

گورنری کا طوق اپنی اپنی گرد़ن میں ڈلانے کے لیے تینوں بنگالی وزری عقیدت و احترام سے  
سر جھکا کر بینھ گئے۔

”عبدالمنعم خاں“ صدر ایوب نے نئے گورنر کے نام کا اعلان کیا۔  
اچانک عبدالمنعم خاں کی کرسی سے کرانہ کی سی آواز آئی۔ دراصل یہ شادی مرگ  
کے آثار نہ تھے، بلکہ دوسرے بنگالی وزریوں کی آنکھوں سے دو نالی بندوق کی آتش  
حد کے شعلے چھروں کی طرح نکل نکل کر ان کے تن بدن کو چھٹنی کر رہے تھے۔  
ہم نے سارا دے کر عبدالمنعم خاں کو کرسی سے اٹھایا۔ باہر آ کر وہ کمر پر ہاتھ رکھے  
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اپنی کار کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک بنگالی وزیر نے ہمیں مخاطب  
کر کے کہا۔ ”ویکھو یہ سلا ابھی پوری طرح گورنر تو بنا نہیں، لیکن حرای کی چال میں  
ابھی سے گورنری کا رنگ ڈھنگ آ گیا ہے۔“

مشرقی پاکستان کے گورنر کی حیثیت سے عبدالمنعم خاں نے صدر ایوب کے ساتھ پورا  
پورا حق و فاداری ادا کیا۔ لیکن صوبے کے اندر انہوں نے جبر و استبداد اقربا نوازی، خویش  
پروری، رشوت ستائیوں اور بد عنوانیوں کے زردست جھنڈے کھلم کھلا ڈنکے کی چوت گاڑ  
دیئے۔ بنیادی جمہوریتوں کا تعاون اور وفاداری حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ان اداروں  
کو منافع بخش بد عنوانیوں میں اس طرح لٹ پت کر دیا جس طرح شد میں گرنے کے  
بعد مکھی دوبارہ پرواز کرنے کے قابل نہیں رہتی سائیکلوں، سیالاب یا قحط کے مصائب میں  
غلہ، کپڑا، ادویات اور دیگر مراعات بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کچھ تقسیم کرتے تھے

باقی خود برد کر لیتے تھے، دیسی ترقیاتی پروگرام Rural Works Programme کا سارا کنٹرول بھی انہیں کے ہاتھ میں تھا ان منصوبوں کی بڑی بھاری رقم ان کے ہاتھوں سے گزرتی تھیں، جن کا بیشتر حصہ ان کی اپنی جیب گرم کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کام کے طبقے فقط اپنے دوستوں اور عزیزوں کو دیتے تھے۔ اور غریب عوام پر فقط دھونس اور دھانڈی جاتے تھے۔ اس عمل سے سارے مشرقی پاکستان میں جگہ جگہ مٹھی بھر لوگ خوشحال اور باقی ساری آبادی ان کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔

جن دونوں میں ہالینڈ میں سفیر کے طور پر معین تھا، صدر نے مجھے نیویارک نائمز ۱۸ جنوری ۱۹۶۵ء کا ایک تراشا بھیجا، جس میں یہ عجیب و غریب خیال آرائی درج تھی۔

Pakistan may be on its way to an economic milestone that so far has been reached by only one other popular country, the United States of America.

اپنے خط میں صدر نے یہ روتا رویا تھا کہ اگر سات سمندر پار کے اخبارات کو ہماری معاشریاتی ترقی کی رفتار کے متعلق اس قدر آگاہی حاصل ہے، تو ہمارے اپنے لوگ آنکھوں پر پٹی باندھے کیوں بیٹھے ہیں اور کھلے دل سے اس بات کا نوٹس کیوں نہیں لیتے؟ نیویارک نائمز کی یہ رپورٹ پڑھ کر میں سمجھ گیا کہ اس میں سچائی اور خلوص نہایت کم اور مبالغہ بہت نیاہ ہے۔ لیکن صدر ایوب نے اپنی سادہ لوحڑ سے اسے اپنے دور حکومت کی کامیابی کی سب سے اعلیٰ سند اور دلیل سمجھ رہے تھے۔ ان کے اپنے محکمانہ مشیر بھی خوشامد کے طور پر انہیں اسی قسم کا تاثر دینے میں لگے ہوئے تھے۔ ملک میں نئے کارخانوں کی تعداد تو ہر کوئی بڑھ چڑھ کر بتاتا تھا۔ لیکن یہ کوئی نہ بتاتا تھا کہ ان میں سے کتنے کارخانوں کی مشینری ابھی تک باہر پیٹھیوں میں بند پڑی ہے۔ اور کتنے کارخانے اپنی گنجائش اور استعداد سے نہایت کم چل رہے ہیں۔ میں نے صدر ایوب کو لکھا کہ اس قسم کے تلغیح حاکم کم و بیش ہمارے اخبار نویسوں کے علم میں ہیں۔ اس لیے وہ ترقیاتی منصوبوں کے متعلق حکومت کے یکطرفہ بیانات پر یقین نہیں لاتے۔ اس

کا واحد علاج یہ ہے کہ متعلقہ شعبے صحیح صورتحال کا سچا اور بے لارگ تجویز قوم کے سامنے پیش کریں۔ میرے خیال میں یہ بات انہیں پسند نہ آئی۔ مجھے معلوم ہے کہ نیویارک نائمنز کا یہی تراشہ انہوں نے میرے جانے والے گئی دوسرے پاکستانی سفیروں کو بھی بھیجا تھا۔ ان میں سے چند ایک نے انہیں تارکے ذریعے مبارک باد دی، اور اپنے اپنے حلقة اثر میں امریکی اخبار کے اس بلند بانگ سرٹیفیکیٹ کا پرچار کرنے کا بیڑاہ اٹھایا۔

اپنی تمام تر کمزوریوں، خامیوں، ناتمامیوں اور ادھورا پن کے باوجود مجموعی طور پر ایوب خاں کا دور صدارت پاکستان کی نسبتاً واضح معاشریاتی ترقی کارنامہ تھا۔ صنعت و تجارت کے علاوہ زراعت کے میدان میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے ساتھ لوگ اس معاهدے کے بعد نتائج پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ لیکن زمانہ حال میں یہ معاهدہ ملک کے لیے بے شک ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ اسی کی وجہ سے بڑے بڑے بندوں، بیراجوں اور نسروں کی تغیر ممکن ہوئی۔ منگلا ڈیم مکمل ہوا۔ تربیلا ڈیم پر کام شروع کیا گیا۔ بھلی کی پیداوار میں توسعے سے ہزاروں کی تعداد میں ثبو ب ول اور الکٹرک پہپ لگائے گئے جن سے سیم اور تھور سے ماری ہوئی لاکھوں ایکڑ اراضی بازیاب ہو کر قابل کاشت بن گئی۔ یہ کوئی انقلابی اقدامات تو نہیں تھے۔ لیکن ہماری تاریخ میں پہلی بار ایک طویل عرصہ تک امن و امان کی فضا میں معاشریاتی استحکام کی طرف چند مثبت قدم اٹھائے گئے۔ ہمارے عوام کا ایک کثیر طبقہ بھی اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کرتا ہے۔

## • صدر ایوب اور سیاستے دان

صدر ایوب کا المیہ یہ ہے کہ وہ سیاستدانوں کے خلاف گرفتہ برستے، ان پر لعن طعن کرتے اور ان کے خلاف نفرت و حقارت کے نعرے لگاتے کری اقتدار پر قابض ہوئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے لنگر لگوٹ کس کر بذات خود سیاست کے اکھاڑے میں اتر آئے اور پیس پر عوام، افواج اور سیاستدانوں کے داؤ چیج نے انیں چاروں شانے چت مار گرایا اور گھیث کر اقتدار کے اکھاڑے سے نکال باہر پھینکا۔

سیاست اور سیاستدانوں کے خلاف فیلڈ مارشل کا رویہ کسی گھری سوچ بچار کسی استدلالی چھان بین بالغ نظری کا نتیجہ نہ تھا۔ ان کے ذہن نے بہت سے متفرق اکاڈمیک اور اتفاقی واقعات کو جو کہیں کہیں اور کبھی کبھی رونما ہو چکے تھے، یکجا کر کے کہنہ ملا کی طرح گلے میں پن رکھا تھا، ان واقعات کی روشنی میں وہ سیاست اور سیاستدانوں کے خلاف ہر قسم کے الزامات، مفروضات اور نظریات قائم کر کے انیں حد درجہ ناقص، ناکام اور بدراہ ثابت کرنے میں ہمہ وقت کمربستہ رہتے تھے۔ بریگیڈئر ایف۔ آر۔ خان کے یوروآف نیشنل ری کنسٹرکشن سے انہوں نے خان لیاقت علی خان سے لے کر اپنے زمانے تک نئے اور پرانے چیزیں سیاستدانوں کے کردار، گفتار اور اعمال کے متعلق تفصیلی یاداشتیں مرتب کروا رکھی تھیں، جن کا حوالہ دے کر اس موضوع پر وہ اپنی گفتگو کو نہایت چٹکارے دار اور لچھے دار بنانے کے ریا تھے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان کو وہ دوسرے سیاستدانوں کی نسبت نیا دہ دانمشند مدرس اور قابل احترام تسلیم کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ مسٹر حسین شہید سروردی کے بارے میں ان کا ایک واقعہ بار بار سنانے کے شوقین تھے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۵۰ء کو کراچی میں قائد اعظم کے دوسرے یوم وفات کی یاد میں ایک بہت بڑا عام جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے کو خطاب کرنے والوں میں آئین ساز اسمبلی کے صدر

تمیز الدین خان سندھ کے محمد ایوب کھوڑو اور سید میراں محمد شاہ، سرحد کے یوسف ٹک کے علاوہ وزیر اعظم لیاقت علی خان بھی شامل تھے۔

نوابرداہ لیافت علی خان کی طویل تقریر میں مسٹر شہید سروردی کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس موضوع پر ان کی تقریر کے کچھ حصے جو اخبارات میں شائع ہوئے تھے درج ذیل ہیں:

Pakistan Time, Lahore, 13 September, 1950.

”مسٹر سروردی آج کل ہر روز تقریں کرنے اور بیانات جاری کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ وہی صاحب ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کا اتحاد پاہ پاہ کرنے کے بعد یہاں تشریف لائے ہیں۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس ولی میں منعقد ہوا تھا تو اس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس جماعت کو انڈیا مسلم لیگ اور پاکستان مسلم لیگ کے نام سے تقسیم کر کے دو حصوں میں بانٹ دیا جائے، سروردی نے مخالفت کر کے انڈیا مسلم لیگ کو قائم نہ ہونے دیا اور اپنے اس موقف کا پرچار شروع کر دیا کہ ہندوستان میں اب فرقہ وارانہ بنیادوں پر کسی جماعت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہاں پر ہندو مساجد اور سکھ اکالی دل جیسی فرقی وارانہ پارٹیاں موجود نہیں تھیں؟ سروردی کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا اتحاد ختم کر دیا جائے اور آئندہ وہ اپنے اوپر ڈھائے گئے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اب تک ان کا کیسی سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ ہے۔“

”اب پاکستان آنے کے بعد بھی مسٹر سروردی اور ان کی سیاسی جماعت عوامی مسلم لیگ پاکستانی مسلمانوں کے اتحاد اور یقین کو توثیق کرنے میں مصروف عمل ہے۔ سروردی کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کے حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں..... اس قسم کی باتوں کا پرچار کر کے کس کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں؟ بے شک ہمارے دشمنوں نے یہ کہتے ہمارے خلاف بھونکنے کے لیے چھوڑ رکھے ہیں۔ یہ لوگ وطن کے غدار ہیں،“

جوئے ہیں، منافق ہیں....."

"For whose benefit I ask is all this being said\ The enemies of Pakistan have let loose dogs who talk like this. I say they are traitors, liars and hypocrites"

وزیر اعظم لیاقت علی خان کی تقریر کے مندرجہ بالا حصے صدر ایوب نے اپنی ایک ڈائری میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں درج کر رکھے تھے۔ اقتدار میں آنے کے بعد کچھ عرصہ تک ان کا یہ دستور رہا کہ اپنے چیہہ چیہہ ملاقاتیوں اور نجی محفلوں میں ہ سیاست پر تنقید کرتے ہوئے اس تقریر کا یہ حصہ بھی نہایت چٹکارے لے لے کر سنایا کرتے تھے یہ عمل ہ اتنی بار دہرا چکے تھے کہ میرا اندانہ ہے کہ اس کے بہت سے فقرے انہیں زبانی یاد ہو گئے تھے۔ کئی بار ان کی یہ حرکت بڑی طفلانہ اور مسحکہ خیز نظر آتی تھی، لیکن ان کے ملاقاتیوں اور نجی محفلوں میں شریک ہونے والے افراد کی اکثریت جی حضوریوں پر بنی تھی، اس لیے کسی میں یہ بہت نہ تھی کہ ہ اپنے ممدوح کو اس بھونڈے اور بچگانہ فعل کی وجہ سے خواہ مخواہ سرمایہ تفحیک بننے سے روکتے۔

سیاست اور سیاستدانوں کو اپنی تنقید کا ہدف بنانے کے ضمن میں صدر ایوب وزیر اعظم لیاقت علی خان کے زمانے کی ایک اور مثال بھی بڑے شوق سے بیان کرنے کے عادی تھے۔ جنوری ۱۹۷۹ء میں حکومت پاکستان نے ایک ایسا قانون نافذ کیا تھا۔ جسے عرف عام میں ”پروڈا“ کہا جاتا تھا۔ اس قانون کا پورا نام یہ تھا:

Public and Representative office (Disqualification) Act  
اس قانون کی نزد میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے ایسے وزیر، نائب وزیر اور پارلیمنٹی سیکرٹری آتے تھے۔ جو جانبداری، اقرباً پروری اور دیدہ دانستہ بدانتظامی کے مرتكب ہو رہے ہوں۔ اگرچہ یہ ایک ۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو جاری ہوا تھا، لیکن عملی طور پر اسے ۱۳ اگست ۱۹۷۸ء سے نافذ العمل قرار دیا گیا۔ یہ قانون سیاسی عمدہ داروں کے سر پر ایک مستقل شمشیر برہنہ کی طرح آوریاں ہو گیا۔ کیونکہ ان پر بدعنوایوں کے الزامات عائد کر کے

انکوائریاں شروع کروانا اس ایکٹ کی رو سے ہر کس و ناکس کی دسترس میں دے دیا گیا تھا۔ اگر پانچ افراد ایک ایک ہزار روپیہ چندہ کر کے پانچ ہزار کی رقم کے ساتھ کسی مرکزی یا صوبائی وزیر کے خلاف الزامات لگا دیں، تو اسے نہایت آسانی سے ”پروڈا“ کی صلیب پر لٹکایا جا سکتا تھا۔ الزامات ثابت ہونے کی صورت میں ”بلوم“ کو دس سال تک کے لیے سیاسی عمدوں سے معطل کرنے کی سزا مقرر تھی۔ اس قانون کا سب سے نیا وہ استعمال صوبہ سندھ میں ہوا، جہاں صرف ایک وزیر کو چھوڑ کر صوبائی کابینہ کے تمام وزراء کرام یکے بعد دیگرے اس ایکٹ کی لپیٹ میں آئے۔ ایک جموروی دور میں جب کہ صوبوں میں بھی ایک ہی سیاسی جماعت کی وزارتیں قائم تھیں۔ اس قسم کے قانون کا نفاذ بلاشبہ محل نظر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قانون ایک سیاسی ہتھیار کی حیثیت سے عالم وجود میں آیا تھا اور سیاسی مقاصد کے لیے استعمال بھی ہوا، لیکن ستمبر ۱۹۵۳ء میں جب آئین ساز اسمبلی اور گورنر جنرل غلام محمد کے درمیان محاذ آرائی شروع ہوئی، تو اس خوفناک ہتھیار کو گورنر جنرل کے ہاتھ سے چھیننے کے لیے اسمبلی نے یہ قانون منسوخ کر دیا۔ اس مثال کو بار بار دہرا کر اس سے صدر ایوب یہ نتیجہ اخذ کیا کرتے تھے کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان سمیت پاکستان کی تاریخ کے کسی دور میں بھی حکمرانی کا کوئی بھی سیاسی نظام کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ خاص طور پر برطانوی طرز جمورویت کا تجربہ ہمیشہ ناکام رہا ہے۔

عنان اقتدار سنبھالتے ہی صدر ایوب نے سیاستدانوں کا قلع قلع کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے دو قانون نافذ کئے۔ پہلا قانون عرف عام میں ”پڑو“ کہلایا۔ یعنی 1959

Public Offices (Disqualification) Order, 21 March

اپنے پیشوں منسوخ شدہ ”پروڈا“ کی طرح اس کا اطلاق صرف سیاسی عمدیداروں پر ہوتا تھا اور فرد جرم ثابت ہونے پر پندرہ سال تک سیاسی عمدوں پر فائز ہونے سے ناہیت کی سزا ملتی تھی۔

لیکن صدر ایوب کا مقصد صرف سیاسی عمدیداروں کی بخش کنی ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ سیاست

کے میدان میں سرگرم عمل تمام عناصر کو کائنے کی طرح نکال کر باہر پھینک دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد ایک دوسرا قانون بھی نافذ کر دیا۔ جسے ”ایئٹو“ کے مخفف نام سے شہرت عام نصیب ہوئی۔ یعنی Disqualification order, 7 August, 1959 Elective Bodies (Disqualification) order, 7 August, 1959 اس آرڈر کا اطلاق ان سب افراد پر ہوتا تھا، جو کسی سیاسی عمدے پر رہے ہوں یا کسی منتخب شدہ اسمبلی یا ادارے کے رکن بنے ہوں۔ یہ قانون بھی ۱۹۵۷ء سے نافذ العمل قرار دیا گیا تھا۔ تاکہ نئے اور پرانے سب سیاستدان اس کے پھندے میں جکڑے رہیں۔

”ایئٹو“ کے تحت فرد جرم ثابت ہونے پر ملزم کو چھ برس تک سیاست سے کنایہ کش رہنے کی سزا ملتی تھی۔ البتہ اتنی رعایت ضرور تھی کہ اگر کوئی صاحب عدالت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا نہ چاہتے ہوں، تو وہ رضا کارانہ طور پر چھ سال کے لیے سیاست سے دست برداری کا اعلان کر کے اپنی گلو خلاصی کر سکتے تھے۔

مشرقی پاکستان سمیت قومی اور صوبائی سطح کے ۹۸ متاز سیاستدانوں کے خلاف ایئٹو کی کارروائی کی گئی تھی۔ ان میں سے ۷۰ نے رضا کارانہ طور پر چھ سال کے لیے سیاست سے توبہ کر کے اپنی جان چھڑا لی۔ ان میں میاں متاز محمد خان دولانہ، مسٹر محمد ایوب کھوڑو اور خان عبدالقیوم خان کے اماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ ۲۸ سیاستدانوں نے اپنی صفائی پیش کر کے مقدمہ لڑا۔ ۲۲ ہار گئے جن میں ایک سابق وزیر اعظم مسٹر حسین شہید سروردی مغربی پاکستان کے سابق گورنر میاں مشتاق احمد گورمانی اور سید عابد حسین شامل تھے۔ صرف چھ سیاستدان ایسے تھے جو بری ہوئے۔

ان بڑے اور متاز سیاستدانوں کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے، تو اس زمانے کے سیاست کی کوئی اہم شخصیت ”ایئٹو“ کی زد سے باہر نظر نہیں آتی۔ نمونہ کے طور پر صرف مغربی پاکستان کے چند چیزیں چیزیں نام درج ذیل ہیں:

- ۱۔ ملک فیروز خان نون، سابق وزیر اعظم
- ۲۔ سردار امیر اعظم خان، سابق مرکزی وزیر

- ۳۔ حاجی مولا بخش سومرو، سابق مرکزی وزیر
- ۴۔ مسٹر یوسف اے۔ ہارون، سابق سفیر
- ۵۔ خان محمد جلال الدین، سابق مرکزی وزیر
- ۶۔ قاضی محمد عیسیٰ، سابق سفیر
- ۷۔ مسٹر حسین شمید سروردی، سابق وزیر اعظم
- ۸۔ مسٹر سی۔ ای۔ گبن، سابق ڈپٹی پیکر قومی اسمبلی
- ۹۔ مسٹر ممتاز حسن قزلباش، سابق چیف منسٹر خیرپور
- ۱۰۔ خان افتخار حسین خان آف ممودٹ، سابق وزیر اعلیٰ پنجاب
- ۱۱۔ پیرزادہ عبدالستار، سابق مرکزی و صوبائی وزیر
- ۱۲۔ قاضی فضل اللہ، سابق صوبائی وزیر
- ۱۳۔ پیر الہی بخش، سابق صوبائی وزیر
- ۱۴۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، سابق وزیر اعلیٰ پنجاب
- ۱۵۔ نواب مظفر علی خان قزلباش، سابق وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان
- ۱۶۔ سید حسن محمود، سابق صوبائی وزیر
- ۱۷۔ مسٹر محمد ہاشم گزور، سابق صوبائی وزیر
- ۱۸۔ صوفی عبدالحمید، سابق صوبائی وزیر
- ۱۹۔ خان غلام محمد خان لندخور صوبہ سرحد کے سیاستدان
- ۲۰۔ ارباب نیاز محمد، سابق کرٹل پاکستان آری
- ۲۱۔ آغا غلام نبی پٹھان، سابق صوبائی وزیر
- ۲۲۔ قاضی محمد اکبر، سابق چیئرمین حیدر آباد میونسپلی
- ۲۳۔ مسٹر محمد ایوب کھوڑو، سابق وزیر اعلیٰ سندھ
- ۲۴۔ مسٹر محمد اکبر خان گلگتی، سابق صوبائی وزیر
- ۲۵۔ چودھری محمد حسین چھٹہ، سابق صوبائی وزیر
- ۲۶۔ کرٹل محمد امیر خان آف ہوتی، سابق صوبائی وزیر

- ۲۷۔ ارباب نور محمد خان، سابق صوبائی وزیر
- ۲۸۔ سید ہادی علی شاہ، سابق میسر لاہور کارپوریشن
- ۲۹۔ سردار عبدالحمید خان دستی، سابق صوبائی وزیر اور وزیر اعلیٰ
- ۳۰۔ سید علمند احمد حسین شاہ گیلانی، سابق صوبائی وزیر
- ۳۱۔ میر علی نواز خان تالپور، سابق صوبائی وزیر
- ۳۲۔ چودھری عبدالغنی گھمن، سابق صوبائی وزیر
- ۳۳۔ سید علی حسین شاہ گردیزی، سابق صوبائی وزیر
- ۳۴۔ سید عابد حسین، سابق صوبائی وزیر
- ۳۵۔ بیگم سلطی تصدق حسین، سابق صوبائی ڈپٹی منشیر
- ۳۶۔ خان عبدالقیوم خان، سابق وزیر اعلیٰ سرحد
- ۳۷۔ نواب مشائق احمد گورمانی، سابق گورنر مغربی پاکستان
- ۳۸۔ سردار محمد خان لغاری، سابق صوبائی وزیر
- ۳۹۔ میاں افتخار الدین، سابق رکن مرکزی و صوبائی اسمبلی اور چیئرمین پروگرسو پیپرز لمبڈ۔

لاہور  
بڑے اور مشہور سیاستدانوں کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں دو ہزار سے اوپر تک  
سلطہ کے سیاسی کارکن بھی "ایسٹو" کا شکار ہوئے۔ یہ ۹۷ء سے لے  
کر ۱۹۵۸ء تک کسی وقت بھی کسی اسمبلی، میونسپلی، ڈسٹرکٹ بورڈ یا دیگر منتخب شدہ ادارے  
کے رکن نہ چکے تھے۔

ان اعداد و شمار سے صرف ایک بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ایک فوجی افسر چھاؤنیوں  
کی محدود فضا میں اپنی عمر عزیز کے باون سال گزارنے کے بعد اچانک مسلح افواج کے  
ناجاائز استعمال سے ایک بہتی سوں حکومت کو زردستی نکال باہر کرتا ہے اور خود مند اقتدار  
پر قبضہ جما کے بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن اس ایک عمل سے یہ لازمی نہیں کہ اس پر عقل  
و دانش کی ایسی بارش شروع ہو جائے کہ وہ ملک بھر کے تمام اکابرین اور ہزاروں کارکنوں

کو بیک جبنتش قلم ناہل، ناکارہ اور نالائق ثابت کرنے میں حق بجانب بھی ہو۔

صدر ایوب کو یہ چکا تھا کہ ”ایئڈو“ کی زد میں آئے ہوئے خاص خاص مشہور و معروف سیاستدانوں کی بداعمالیوں اور بدعنوائیوں کی تفصیلات ان کے اپنے علم میں بھی آئیں۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے باشہ ناموں کا انتخاب کیا اور مجھے حکم دیا کہ ”ایئڈو“ کے تحت مقدمات ساعت کرنے والی خصوصی عدالتون (Tribunals) سے میں ان سب کے مکمل ریکارڈ حاصل کروں، اور ہر ایک کی بداعمالیوں اور بدعنوائیوں کا خلاصہ تیار کر کے ان کے ملاحظہ کے لیے پیش کروں۔

”ایئڈو“ کے ان باشہ بلند و بالا پہاڑوں کو جب میں نے کھود کھود کر دیکھا، تو ان میں سے بداعمالیوں اور بدعنوائیوں کی ایسی چھوٹی چھوٹی چوہیاں برآمد ہوئیں جو آج کے ماحول میں انتہائی بے وقت اور بے ضرر نظر آتی ہیں۔ چند سیاستدانوں پر ان کے مخالفین کی طرف سے وقتہ فوقة ”غداری“ کا الزام ضرور لگ چکا تھا، لیکن کسی فائل میں کسی کے خلاف وطن دشمنی کی کوئی شادوت یا علامت تھی اور نہ کوئی ثبوت تھا۔ ملک کے مفاد کے خلاف کام کرنے کا الزام بھی جگہ جگہ چسپاں تھا۔ لیکن اس کی بنیاد بھی یا تو ذاتی عداوتوں اور مفہومیتیں تھیں یا سیاسی رقبتوں کی وجہ سے ایسے مبہم مفروضوں اور تہمتوں پر مبنی ہوتی تھیں جو واقعات اور شواہد کی روشنی میں کسی صورت بھی قابل گرفت قرار نہ پاتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ باشہ نامور سیاستدانوں جو کسی نہ کسی وقت وزیر یا کسی اور عمدے پر نہ چکے تھے۔ ان کے خلاف الزامات کی نوعیت عموماً کچھ اس طرح کی تھی:

سرکاری ٹیلی فون اور شاف کار کا بے جا استعمال۔

پی۔ اے۔ یا پرائیویٹ سیکرٹری کے لیے ان کے اتحاق سے نیا نہ مراعات۔

اپنے انتخابی حلقوں میں ترجیحی طور پر سڑکوں، سکولوں یا ڈپنسریوں کی تغیر۔

اپنے بااثر دوستوں، رشتہ داروں یا سیاستدانوں کے علاقوں میں سڑکیں، سکول یا ڈپنسریاں

تغیر کرنے میں ترجیح سلوک۔

اپنے با اثر دوستوں، رشتہ داروں، سیاستدانوں یا ووٹروں کے مفاد میں سرکاری افسروں پر دباؤ یا سفارشیں۔

اپنے انتخابی حلقوں اور اپنے دوستوں اور سیاستدانوں کے علاقوں میں پڑواریوں، تھانیداروں،  
نائب تحصیلداروں اور دیگر سرکاری کارندوں کے تبادلوں اور تقریبوں میں دخل اندازی۔

انتخابات کے وقت وہاندی کے بلا ثبوت الزامات۔

سرکاری تقریبوں میں پلک سروس کمیشن کی سفارشات کو نظر انداز کرنے کا رجحان۔

سرکاری دوروں پر سرکاری انتظامات کا سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے استعمال۔

محکمانہ اخراجات کا منظور شدہ بجٹ سے بڑھ جانے کی مثالیں۔

ایسے منصوبوں کی مثالیں جن پر اخراجات منظور شدہ تجویزوں سے تجاوز کر گئے۔

بے شمار مثالیں جن میں فلاں فلاں نیکیں لگائے جا سکتے تھے، لیکن اس لیے نہ لگائے گئے

کہ سیاسی حکمران ہر دلعزیز بنے رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

باشہ چیدہ چوٹی کے سیاستدانوں کے خلاف صدر ایوب نے جب اس قسم کی بے مزہ،

پھیکی اور پھیپھی سی فرد جرم پڑھی، تو وہ بے حد حیران ہوئے۔ انہوں نے تعجب سے

کہی بار یہ سوال دہرا�ا۔ ”بس اتنا کچھ ہی ہے؟“

میں نے انہیں یقین دلایا کہ جو فائلیں مجھے دستیاب ہوئی ہیں، ان میں بس اتنا کچھ ہی

ہے۔

”اگر یہ بات ہے۔“ صدر ایوب نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ ”تو یہ ساٹھ ستر جنگادروی

سیاستدان دم دا کر بھاگ کیوں گئے؟ مردانگی سے کام لے کر ایسٹو کا مقدمہ کیوں

نہ لڑے؟“

شاید مارشل لاء سے ڈرتے ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یا شاید عزت بچانے کی خاطر اپنے

آپ رٹائر ہو کر بیٹھ رہے ہوں۔“

”یہ بات نہیں۔“ صدر ایوب نے فیصلہ صادر کیا۔ ”تمہاری فائلیں ان کا جرم ثابت کریں

یا نہ کریں۔ لیکن ان کے ضمیر مجرم ہیں۔ یہ بات ان کو بخوبی معلوم ہے۔“

کہنے کو تو انہوں نے یہ بات بڑے طمطراق سے کہہ دی، لیکن میرا اندانہ ہے کہ یہ محفوظ دکھاوے کی بہادری کا ابال تھا۔ ایک تجربہ کار فوجی کی طرح ان میں خود حفاظتی اور خود بقائی کی رگ نہایت مضبوط تھی۔ چنانچہ انہوں نے ذہنی طور پر یہ بات گہ باندھ لی کہ سیاستدان اتنی گلی سڑی فا پذیر جس نہیں ہیں جنہیں ”ایٹھو“ کی تلوار یا رضا کارانہ طور پر چھ سال کے لیے سیاست سے کناہ کشی ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دے۔ میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ اس کے بعد رفتہ رفتہ انہوں نے ہر وقت موقع و بے موقع سیاستدانوں کے غلاف بد کلامی، گلی گلوچ اور طعن و تشنج کا بر ملا اظہار بنت کم کر دیا۔

ساتھ ہی انہوں نے ”بنیادی جمہوریت“ کا نظام راجح کر کے سر توڑ کوشش کی کہ ملک میں پرانی طرز سیاست کی جگہ ایک بالکل نئی اور انوکھی سیاست کو جنم دیا جائے۔ ان کو یقین تھا کہ بنیادی جمہوریتوں کے تحت جو اسی ہزار نمائندہ منتخب ہوں گے، ان میں کم از کم کچھ لوگ تو ایسے ضرور نہیں گے جو قابلیت، ذہانت، وجہت اور صلاحیت میں پرانے سیاستدانوں کے ہم پلہ یا ان سے بھی ارفع و اعلیٰ ہوں۔ لیکن ان کی یہ امید بر نہ آئی۔ البتہ لگے ہاتھوں بنیادی جمہوریتوں کے اسی ہزار منتخب اراکین کا اتنا فائدہ ضرور اٹھایا گیا کہ ان کے ووٹ حاصل کر کے ایوب خان صاحب نے اپنی صدارت پر مر تصدیق ثبت کروالی۔ اس استھواب رائے کا نتیجہ مجھے آدمی رات کے بعد معلوم ہوا۔ اس وقت صدر ایوب سوچکے تھے۔ اگلے روز صبح سویرے ان کے پاس گیا، تو وہ بیگم ایوب کے ساتھ بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ان کے حق میں ۵۲۸۳ ووٹ ڈالے گئے ہیں جو مجموعی تعداد کا ۹۵.۶ فیصد حصہ ہیں، تو انہوں نے فوراً کافہ پہلے کر ۸۰۰۰۰ میں سے ۵۲۸۳ کا ہندسہ تفریق کیا اور کسی قدر مایوسی سے بولے۔ ”بلکہ یوں کہو کہ ۷۱۷۳ ووٹ میرے خلاف بھی پڑے ہیں۔“ اس کے اس رو عمل سے مجھے

محسوس ہوا کہ وہ اپنے دل کے نہاں خانے میں امید کا چراغ جلائے بیٹھے تھے کہ اس ریفرندم میں انہیں سو فی صد ووٹوں سے کامیابی حاصل ہو گی۔ غالباً یہ خوش فہمی ان کی فوجی تربیت کا نتیجہ تھی۔ جہاں کمانڈر کے ایک اشارے پر پوری پلٹن کی پلٹن بے چوں و چرا ”قال ان“ ہو جاتی ہے!

اس ریفرندم کے دو روز بعد ۱۹۷۰ء کو انہوں نے صدر پاکستان کے طور پر ازسر نو حلف اٹھایا اور اس کے فوراً بعد آئین سازی کی طرف متوجہ ہوئے۔ جسٹس شباب الدین کی سرکردگی میں آئین کمیشن نے جو سفارشات پیش کیں، وہ صدر ایوب کو قابل قبول نہ تھیں۔ اب وہ چند ماہرین کو ساتھ لے کر بذات خود آئین کا خاکہ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ یہ عمل بڑا طویل، صبر آزمہ اور بسا اوقات مسحکہ خیز بن جاتا تھا۔ صدر ایوب انتہائی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر کری پر بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے ایک طرف وزیر خارجہ مسٹر منظور قادر آئینی مشیر کے طور پر جگہ سنبھالتے تھے۔ دوسری جانب ایک دو قانونی ماہر بیٹھتے تھے۔ سامنے چند ایسے افسر بٹھائے جاتے تھے جو رائے دینے کی ہمت یا الہیت تو نہیں رکھتے تھے۔ البتہ نہایت سرگرمی سے ہاں میں ہاں ملانے کے خوب ماہر تھے۔ ایسی محفلوں کی روئیاد قلم بند کرنے کے لیے صدر کے سیکرٹری کے طور پر مجھے بھی حاضر رہنا پڑتا تھا۔ کم و بیش گھنٹہ بھر صدر ایوب اپنے ”سیاسی فلسفہ“ پر تقریر فرماتے تھے۔

جی حضوری حاضر باش سر ہلا ہلا کر اور ہاتھ نچا نچا کر داد دیتے تھے اور منظور قادر صاحب کو یہ فریضہ سونپا جاتا تھا کہ وہ آج کے صدارتی ملفوظات کو آئینی شفuoں میں ڈھال کر لائیں۔

ایک روز صدر ایوب نے حسب معمول اپنے ”سیاسی فلسفہ“ پر ایک طولانی تقریر ختم کی، تو ایک سینئر افسر وجد کی کیفیت میں آ کر جھومتے ہوئے اٹھے اور سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر عقیدت سے بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ”جناب‘ آج تو آپ کے افکار عالیہ میں پیغمبری شان جھلک رہی تھی۔“

یہ خراج تحسین وصول کرنے کے لیے صدر ایوب نے بڑی تواضع سے گردن جھکائی۔ یہ

سینر افر مرزائی عقیدہ سے تعلق رکھتے تھے۔ معاً مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں صدر ایوب پنج بج اس جھوٹ موت کے اڑن کھولے میں سوار ہو کر بھک سے اوپر کی طرف نہ اڑنے لگیں۔ چنانچہ اس غبارے کی ہوا نکلنے کے لیے میں بھی اسی طرح عقیدت سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور نمایت احترام سے گزارش کی۔ ”جناب“ آپ ان صاحب کی بالتوں میں بالکل نہ آئیں۔ کیونکہ انہیں صرف خود ساختہ پیغمبروں کی شان کا تجربہ ہے۔“

بات بڑھنے لگی تھی، لیکن صدر ایوب نے پنج بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا اور حکم دیا کہ باہر جانے سے پہلے ہم ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ ہاتھ ملائیں اور گلے ملیں۔ اسی طرح کی چھان پچک اور لگاتار محنت کے بعد خدا خدا کر کے صدر ایوب کا آئین مرتبا ہوا۔ اس کی نوک پلک درست کرنے کے لیے وقت فوقة بیرون ملک سے بھی کچھ ماہرین آتے رہے۔ ۱۹۶۲ء کے شروع ہی سے اس قسم کی خبروں اور افواہوں کا تاثنا بندھ گیا کہ عنقریب نیا آئین نافذ ہوتے ہی مارشل لاءِ اٹھ جائے گا اور اس کے بعد ملک میں ازسر نو سیاسی سرگرمیوں کی اجازت مل جائے گی۔ غالباً ۷ یا ۸ فروری کا دن تھا۔ میں ایوان صدر راولپنڈی میں اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اچانک صدر کا ہیڈ ارڈری میرے لیے چائے کی پیالی لے کر آیا اور پریشانی کے لمحے میں رازداری سے بولا۔ آج جی۔ ایچ۔ کیو سے کئی جریل صدر صاحب سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ گھنٹہ بھر سے مینگ چل رہی ہے۔ بیرا چائے لے کر گیا تو ڈانٹ کر نکال دیا کہ ابھی مت آؤ۔ کبھی کبھی اندر سے کافی بلند آواز سنائی دیتی ہے۔ اللہ خیر کرے۔“ یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ کیونکہ فوجی جریلوں کے ساتھ اس قسم کی کوئی طویل مینگ صدر کے آج کے پروگرام میں درج نہ تھی۔

اس بات کے کوئی نصف گھنٹہ بعد صدر ایوب نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ کسی قدر پریشان سے نظر آتے تھے۔ وہ پھیکے طور پر بدھی سے مسکرائے اور بولے۔ ”چند روز قبل اخباروں

میں کسی نجومی نے پیش گوئی کی تھی کہ دنیا عنقریب ختم ہونے والی ہے۔ لیکن آج جو باتیں میں نے سنیں، ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا کا خاتمه آج ہی ہونے والا ہے۔“

صدر ایوب نے کسی قدر وضاحت سے مجھے بتایا کہ جی۔ ایچ۔ کیوں کے سینز افسران پر یہ زور دینے آئے تھے کہ آئین نافذ کر کے مارشل لاءِ ہرگز نہ اٹھانا۔ اگر ایسا کیا تو حالات بے حد بگڑ جائیں گے۔ نہن پھٹ جائے گی۔ آسمان گر پڑے گا۔ ان کا اصرار تھا کہ صدر ایوب کم از کم پانچ سال اور مارشل لاء کے زیر سایہ آرام سے حکومت کرتے رہیں۔

”آپ نے ان کو کیا جواب دیا؟“ میں نے کسی قدر بے صبری سے پوچھا۔  
صدر ایوب مسکرائے۔ ”میں نے ان کی بات فوراً مان لی۔ اس شرط پر کہ وہ مجھے یہ گارنٹی لا دیں کہ میں پانچ سال ضرور زندہ رہوں گا۔“

غالباً صدر ایوب اس بات پر خوش تھے کہ فوجی افسران کی دلیل سے لا جواب ہو کر واپس لوٹ گئے ہیں، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت کے جرنیلوں میں ایسا کوئی مائی کا لال نہ تھا جو صدر ایوب کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا اور اپنا مطالبہ رو ہوتا دیکھ کر علم بغاوت بلند کر دیتا۔ سول حکومت کے علاوہ فیلڈ مارشل کو اب تک فوج پر بھی پورا کنٹرول حاصل تھا۔ البتہ میرے ذہن میں یہ سوالیہ نشان اب تک باقی ہے کہ ملک میں امن و امان کی صورت حال بالکل درست تھی۔ کوئی بیرونی خطرہ بھی سر پر سوار نہ تھا۔ آئین سازی کا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ ایک محدود طرز کی لنگری لوی جمیوریت کی طرف پیش رفت جاری تھی۔ ایسے ماحول میں آئین نافذ کرنے اور مارشل لاء اٹھانے پر جی۔ ایچ۔ کیوں کی اعلیٰ سطح کے جرنیلوں کو اگر اعتراض تھا تو کیوں تھا؟ یہ فرمودی ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ اس پس منظر میں بعد کے بہت سے واقعات کا زانچہ بنانے کے لیے کسی خاص علم نجوم کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

خدا خدا کر کے کیم مارچ ۱۹۶۲ء کا روز آیا، جب کہ صدر ایوب نے ریڈیو پر تقریر کر

کے اپنے نئے آئین کا اعلان کر دیا۔ اسی روز شام کو کراچی کے گورنر ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس بھی بلائی گئی۔ مشرق اور مغربی پاکستان سے قوی، صوبائی اور دوسری سطح کے اخبارات اور رسائل کے بہت سے مدیر جمع ہوئے۔ نئے آئین میں میں یہ درج تھا کہ آئین کے نفاذ کے دو برس بعد صدر مملکت کا ازسر نو انتخاب ہو گا۔ کابینہ کے چند وزیروں کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اگر صدر کا انتخاب دو برس کے بعد ہوا تو ان کی وزارت بھی دو برس کے قلیل عرصہ ہی میں ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اپنی وزارتی میعاد کو طول دینے کے لیے انہوں نے یہ چال چلی کہ انہوں نے حیلے بھانے سے صدر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ آئین میں اپنا انتخاب دو کی بجائے پانچ برس کے بعد رکھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ صدر نے بہت سے انقلابی اصلاحات کا ڈول ڈالا ہوا ہے ان اصلاحات کی بیل منڈھے چڑھانے کے لیے دو برس کا وقفہ نہایت ناکافی ہے۔ اس لیے آئین کی رو سے صدر کا انتخاب پانچ برس کے بعد مقرر ہونا چاہیے۔ (اس نکتے پر جی۔ ایچ۔ کیو کے جرنیلوں اور کابینہ کے نامزد وزیروں میں کمل ہمیختگی تھی۔) لیکن صدر ایوب اپنے ان خیرخواہ وزیروں کے دل کا اصلی مقصد بخوبی بھانپ گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے کسی نہ سنی اور آئین میں اپنا انتخاب دو برس کے بعد رکھنے پر ہی مصر رہے۔ کم مارچ کو پریس کانفرنس سے چند گھنٹے قبل یہ وزراء کرام صدر مملکت کے اردوگرد شد کی مکھیوں کی طرح بھجنھناتے رہے اور دو برس کا عبوری دور بڑھانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے رہے۔ صدر نے انسیں بار بار ڈانٹا ڈپٹا اور اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا، لیکن وہ حضرات بھی اپنی دھن کے کپے تھے۔ انتہائی مستقل مزاجی سے اپنی کوششوں میں لگاتار مصروف رہے۔ یہاں تک کہ دوسری منزل پر دوبار ہال میں پریس کانفرنس میں جانے کے لیے جب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، تو ایک وزیر صاحب نے گھنٹے شیک کر صدر ایوب کا راستہ روک لیا اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ”سر، خدا کے لیے عبوری دور کی مدت کچھ تو ضرور بڑھائیے۔“

”اچھا بابا اچھا۔“ صدر ایوب نے جنجلہ کر کما۔ ”میری جان خلاصی کرو۔ میں دو سال کی بجائے تین سال کا اعلان کر دوں گا۔“

یہ سن کر میں نے صدر سے کہا۔ ”سر آئین کی جو کالپی ہم صحافیوں میں پہلے تقسیم کر چکے ہیں اس میں تو یہ مدت صریحاً دو سال درج ہے۔ اب اچانک اسے بڑھا کر تین سال کا اعلان کرنا ایک خواہ مخواہ کی عجیب سی پس اندازی نظر آئے گی۔“

صدر ایوب نے جنجلہ کر میری طرف دیکھا اور غصے سے بولے۔ ”بس بس۔ اب تم بھی مجھے مزید نرس نہ کرو۔ میں صورتحال سے بخوبی نپٹ لوں گا۔“

اس کش کمش اور کھینچا تانی کے بعد صدر ایوب جب پریس کانفرنس میں پہنچے تو ان کا موڈ کافی خراب اور بہم تھا۔ دوبار ہال اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹریوں سے کچھ بھرا ہوا تھا۔ نئے آئین کے متعلق صدر نے اپنا تحریری بیان کسی قدر غصیلے لمحے میں اس طرح پڑھنا شروع کیا جیسے وہ محاذ جنگ پر بیٹھے دشمن پر گولہ باری کر رہے ہوں۔ جب انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ تین برس کے بعد نیا انتخاب لڑیں گے، تو ایک صاحب نے ٹوک کر پوچھا۔ ”سر آئین کا جو ڈرافٹ ہمیں تقسیم ہوا ہے۔ اس میں تو دو برس کی مدت درج ہے۔“

”اے آپ بھول جائیں۔“ صدر ایوب نے چڑ کر کما۔ ”میں نے تین برس کا اعلان کیا ہے تو لانا نہ یہ مدت تین برس کی ہی ہو گی۔“

ایک اور ایڈیٹر نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ”سر، نئے آئین میں کیا ہم اس تبدیلی کو پہلی آئینی ترمیم ثمار کرنے میں حق بجانب ہوں گے؟“

یہ سن کر صدر ایوب کا ناریل چٹ گیا۔ انہوں نے جھلا کر آئینی ترمیم کی اصطلاح پر انتہائی سخت الفاظ استعمال کئے۔ یہ الفاظ سخت ہی نہ تھے، بلکہ ان میں ایک دو غیر ثقہ اور نخش الفاظ بھی در آئے تھے، جن کا استعمال بھری محفل میں بے حد غیر موزوں تھا خاص طور پر جہاں ایک خاتون بھی موجود تھی۔ جو نبی صدر ایوب کی نگاہ مشرقی پاکستان

کی اس خاتون صحافی پر پڑی۔ وہ ٹھنک کر جھینپ گئے اور انتہائی بے بسی سے زیر لب بڑیڑائے۔ ”حماقت ہو گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔“

اس حادثہ کے بعد صدر ایوب کسی قدر سنبھل کر بیٹھ گئے اور صحافیوں کے سوالوں کے جواب نبٹا تھل سے دیتے رہے۔ لیکن بنگالی اخبار سنگ باد کے ایڈیٹر ظہور چودھری نے جب پوچھا کہ کیا اخبارات کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ آئین پر آزادانہ تنقید کر سکیں۔ تو صدر صاحب کا مزاج پھر برہم ہو گیا۔ اس روز ساری پریس کانفرنس کے دوران ان کا پانہ بار بار چڑھا اور بار بار اترتا۔ میرے تجربہ میں اس پریس کانفرنس میں صدر ایوب کی کارکردگی انتہائی درجہ کی ہلکی، پست، ناکافی اور کمزور تھی۔

۸ جون ۱۹۶۲ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے صدر ایوب نے نیشنل اسمبلی میں جا کر مارشل لاءِ اٹھانے کا اعلان کرنا تھا۔ آٹھ بجے وہ تیار ہو کر ایوان صدر کے برآمدے میں آئے، تو جمیل الدین عالی اور میں ان کی تاک میں بیٹھے تھے۔ ہم نے کافی محنت سے کالپی رائٹ قانون کا ایک مسودہ تیار کر رکھا تھا۔ ہماری کوشش تھی کہ مارشل لاء کے دوران ہی یہ قانون آرڈی ننس کے طور پر نافذ ہو جائے تو آسانی رہے گی۔ ورنہ بعد ازاں اسمبلی میں جا کر خدا جانے اس کا کیا حشر ہو۔ کیونکہ اسمبلی میں تو لانا پبلیشور کی لالبی بھی اس کے خلاف اپنا اثر و رسوخ بیدریغ استعمال کرے گی۔ چنانچہ جب صدر اپنی کار کی طرف روانہ ہوئے، تو ہم نے انہیں روکا اور برآمدے میں کھڑے کھڑے ہی کالپی رائٹ آرڈی ننس پر ان سے دستخط کروالیے۔

پریس کانفرنس میں تو ایک صحافی نے آئین میں پہلی ترمیم کا چکلا چھوڑ کر صدر ایوب کو آتش زیر پا کر دیا تھا، لیکن اسمبلیوں کا کاروبار شروع ہوتے ہی آئین میں ترمیمات کا طوفان بد تیزی الہ آیا اور صدر ایوب بڑی خوشی سے ان پر برابر آمنا و صدقہ کتے رہے۔ پہلی ترمیم آئین نافذ ہونے کے بعد چار روز کے اندر اندر عمل میں آگئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا اور ایوب خان صاحب کے دور صدارت میں ان کے اپنے بنائے ہوئے آئین میں آٹھ بار ترمیم ہوئی۔ آئین کی ۳۹ دفعات تبدیل

کی گئیں۔ ان میں سے چند دفعات تو کئی کئی بار تبدیل ہوئیں۔ ان میں بعض دفعات کا تعلق صدارتی انتخاب سے تھا اور ترمیم کا واحد مقصد یہ تھا کہ اگلے انتخاب میں ہر قیمت پر صدر ایوب کا پلہ بھاری رہے۔ اس کے علاوہ ایک پورے کا پورا باب تبدیل کر کے بالکل نئے سانچے میں ڈھال دیا گیا۔ جس سرعت اور تواتر سے ترمیم و تجدید کا یہ عمل وقوع پذیر ہو رہا تھا اس سے یہی شبہ پیدا ہوتا تھا کہ صدر ایوب کے احاطہ فکر میں آئیں کے تقدس نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہیں۔

یوں بھی جن اصولوں کی آڑ لے کر صدر ایوب نے اپنا فوجی انقلاب برپا کیا تھا، بہت جلد وہ بھی ریت کی دیوار کی طرح اسی طرح معدوم ہونے لگے۔ جس طرح ان کے اپنے بنائے ہوئے آئین کا حلیہ تبدیل ہو رہا تھا۔ معاشرے کو سیاسی جماعتوں سے نجات دلانا ان کا ایک نہایت بلند بانگ دعویٰ تھا، لیکن مارشل لاءِ اٹھے ہوئے ابھی چالیس دن بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ صدر کی منظوری کے ساتھ پولیسیکل پارٹیز ایکٹ جاری ہوا جس کی رو سے اسمبلیوں کے اندر اور باہر سیاسی جماعتوں ازسر نو بحال ہو گئیں۔ اس قانون کے نافذ ہوتے ہی صدر ایوب اپنے نام نہاد انقلابی نصب العین کے بلند پایہ ستون سے لڑک کر دھڑام سے نیچے گئے اور سیاست کی اسی دلدل میں آپھنے جس کی سڑاند اور عفو نیت مٹانے کے لیے انہوں نے مارشل لاء کا سارا کھڑاگ کھڑا کیا تھا۔ اس نئی صورت حال میں صدر ایوب کا زاویہ نگاہ یکسر بدل گیا۔ اور جو پرانے سیاستدان ”ایئڈو“ کی زد میں آ کر چھ سال کے لیے معطل ہو چکے تھے، ان کی نظر میں وہ لوگ بھی یا کیک پسندیدہ اور قابل اعتماد بن گئے۔ چنانچہ صدر ایوب کے ایما سے قومی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا کہ ”ایئڈو“ کے تحت سیاست دانوں پر عائد کی ہوئی پابندیاں اٹھائی جائیں، لیکن اسمبلی میں آئے ہوئے نئے سیاستدانوں کو اس میں اپنے لیے شدید خطرات نظر آئے۔ چنانچہ انہوں نے اس بل کو مسترد کر دیا۔ ان نئے حالات میں صدر ایوب نے پہلے اپنی ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ اس میں وال

گلتی نہ دیکھی، تو پھر ان کی نگاہ انتخاب مسلم لیگ پر پڑی۔ دل ہی دل میں وہ اس جماعت کی قیادت کو ایک طرح سے اپنی جائز و راش بھی سمجھتے تھے۔ ان کے گرد روز افزوں بڑھتے ہوئے خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں کا ایک گروہ رفتہ رفتہ انہیں اس غلط فہمی میں جبتلا کر رہا تھا کہ صدر ایوب قائد اعظم کے صحیح جانشین پیدا ہوئے ہیں اور جو کام محمد علی جناح ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں پورا کرنا ایوب خان کے مقدار میں لکھا ہے۔ کبھی کبھی چند ایک پیشہ ور روحانی بزرگ بھی انہیں اس قسم کے نوشہ تقدیر کی خوشخبری سن کر نذرانے میں اپنے لیے کوئی ٹرانسپورٹ روٹ پر مٹ یا امپورٹ لائسنس یا نیشن کا پلاٹ حاصل کر لیتے تھے۔ سیاسی گماشتہ اور دلال تو خیر کاسہ گدائی ہاتھ میں لیے ہر وقت ان کے گرد منڈلانے کے لیے تیار ہی رہتے تھے۔

صدر ایوب ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے ملک میں سیاست پیسے کا کھیل ہے۔ جس کے پاس دولت کی کمی ہے۔ وہ سیاست میں بھی ناکام ہے۔ چنانچہ انہوں نے بعض سیمینے صاحبان سے چند جمع کر کے ایک اچھی خاصی رقم مسٹر اے۔ کے۔ ایم نفل القادر چودھری کے حوالے کی۔ مشرقی پاکستان کے یہ صاحب پرانے مسلم لیگی تھے۔ پہلے صدر ایوب کی کابینہ میں وزیر تھے۔ بعد ازاں قومی اسمبلی کے سپیکر رہے۔ ان کی یہ ڈیوٹی لگی کہ مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کے لیے وہ صدر ایوب کی راہ ہموار کریں۔

ان دونوں مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا مرکز ڈھاکہ بنا ہوا تھا۔ جماعت کی تنظیم نو کے لیے بزرگ مسلم لیگی لیڈر مولانا اکرام خان کے مکان پر پرانے رہنماؤں کے بہت سے اجتماع ہوئے اور مسلم لیگ کونسل کی ایک میٹنگ منعقد کرنے کا اعلان بھی جاری ہوا۔ یہ اعلان سن کر صدر ایوب کے سیاسی دلالوں پر مردمنی چھا گئی۔ کیونکہ ڈھاکہ مسلم لیگ کونسل میں بیشتر تعداد ان پرانے، مستند اور کثیر رہنماؤں کی تھی جو صدر ایوب کو اپنی صفوں میں جگہ دینے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے۔ چنانچہ اس کاروبار کو سیوتاڑ کرنے کے لیے نفل القادر چودھری صاحب جملہ ساز و سامان سے لیس ہو کر بھاگ بھاگ ڈھاکہ پہنچے۔

تفصیلات کا تو مجھے علم نہیں، لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح مولانا اکرم خان کو شیشے میں اتار لیا اور بغیر کوئی وجہ بتائے مولانا نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کا اعلان منسوخ کر دیا۔ ساتھ ہی مسٹر چودھری نے ڈھاکہ سے میرے میکروفون پر صدر کے لیے پیغام بھیجا، کہ سیاسی مقاصد کے لیے جو فنڈ ان کے پرورد کیا گیا تھا۔ وہ ختم ہو چکا ہے اور اب انہیں مزید پانچ لاکھ روپے کی فوری ضرورت ہے۔

ایک دو روز بعد یہ خبر بھی شائع ہو گئی کہ عنقریب مسلم لیگ کی ایک نمائندہ کونشن راولپنڈی میں منعقد ہو گی جس میں ایک ہزار سے زیادہ لیڈر اور کارکن شرکت کریں گے۔ بعد ازاں اس کونشن کا مقام انعقاد راولپنڈی سے تبدیل ہو کر کراچی مقرر ہو گیا۔ مولانا اکرم خان کو اس کونشن کی صدارت کے لیے پہنانے کے لیے سر توڑ کوشش ہوئی۔ ان کے انکار پر چند وزیروں نے ان کے اخبار ”آزاد“ کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دیں۔ لیکن مولانا بدستور اپنے انکار پر اڑے رہے۔

مولانا اکرم خان کی طرف سے مایوس ہو کر کونشن کی صدارت راجہ صاحب محمود آباد کو پیش کی گئی، راجہ صاحب انتہائی سلیمانی ہوئے، دیانتداری، پر خلوص اور پاکیزہ سیرت انسان تھے۔ جب انہوں نے بھی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا، تو ایک روز صدر ایوب نے مجھ سے کہا۔ ”یہ تمہارے دوست راجہ صاحب بھی صرف باتیں بناتا جاتے ہیں۔ ملک کی خدمت کے لیے اگر انہیں کوئی عملی کام سونپا جائے تو جان چھڑا کر بھاگتے ہیں۔ معلوم نہیں بے چارے قائد اعظم ایسے بے عمل لوگوں کے ساتھ کیسے گزارہ کر لیتے تھے۔“

میں نے یہ بات راجہ صاحب کو سنائی، تو وہ مسکرانے اور بولے۔ ”صدر صاحب کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے کونشن کی صدارت کے لیے ایک نمائیت کار آمد نام تجویز کر دیا ہے اور انہوں نے اسے منظور بھی کر لیا ہے؟“

”وہ کون سا نام ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”چودھری خلیق الزماں۔“ راجہ صاحب نے بتایا۔ ”اس کام کے لیے ان سے زیادہ اور کون

شخص موزوں ہو سکتا ہے؟“

چودھری خلیق الزماں صاحب بھی پرانے مذکور ہوئے ہی سیاستدان تھے۔ ۱۹۷۰ء کے تاریخی لاہور ریزولوشن کا متن انہیں کاڑ رافت کردا تھا۔ بعض وجوہات سے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے زمانے میں مسلم لیگ کے حلقوں میں چودھری صاحب کی حیثیت کسی قدر متازہ فیہ چلی آ رہی تھی، لیکن صدر ایوب کی بنائی ہوئی کونشن مسلم لیگ کو انہوں نے نہایت چلکدستی اور ہنر مندی سے سنبھالا۔ اپنی شیریں بیانی، خوش کلامی اور حکمت عملی سے انہوں نے صدر ایوب کے دماغ سے مسلم لیگ کی قیادت کا کیڑا نکال باہر پھینکا اور رفتہ رفتہ انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل تو ضرور ہو جائیں، لیکن ایک عام رکن کی حیثیت سے ۱ چنانچہ میں ۱۹۷۳ء میں ایوان صدر راولپنڈی میں ایک خاص گورنر کانفرنس منعقد ہوئی۔ مرکزی وزیروں کے علاوہ بعض چیزوں چیزوں صوبائی وزیر بھی اس میں شامل ہوئے۔ کونشن مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں خصوصی دعوت پر شریک ہوئے۔ موضوع بحث یہ تھا کہ صدر ایوب کو کونشن مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کرنی چاہیے یا نہیں۔ چودھری خلیق الزماں نے ایک فصح و بلغ طولانی تقریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صدر ایوب کا مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کرنا ہی ملک اور قوم کے بہترین مفاد میں ہے۔ اس کے بعد نواب کالا باغ سمیت تمام حاضرین نے یکے بعد دیگرے اس تجویز کی نہایت شدت سے تائید کی۔ چنانچہ مبارک سلامت کے غلغلے میں صدر نے دو فارموں پر دستخط کر کے کونشن مسلم لیگ کی دہری رکنیت حاصل کر لی۔ ایک مشرقی پاکستان کی طرف سے، دوسری مغربی پاکستان کی جانب سے۔ اس کے بعد دعائے خیر ہوئی۔ پھر کسی من چلنے نے رکنیت کا فارم نواب کالا باغ کے سامنے رکھ دیا کہ وہ بھی اس پر دستخط کر کے کونشن مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ نواب صاحب نے جھٹک کر یہ فارم اس طرح کھینچ کر دور دے مارا، جیسے ان کے دامن پر کوئی

بچو آگرا ہو، ساتھ ہی وہ کسی قدر ناراضگی سے بولے۔ ”اے بابا۔ مجھے معافی دو۔ مجھے خواہ نخواہ اس گندگی میں کیوں گھینٹتے ہو۔“

URDU4U.COM

اتفاق سے یہ فقرہ صدر ایوب نے بھی سن لیا۔ حیرت اور شکایت کے ملے جلے انداز سے گھور کر وہ پچھے لب کشائی کرنے والے تھے کہ نواب صاحب نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا اور انتہائی لجاجت اور اعساری سے کسمسا کر بولے۔ ”عالیٰ جاہ۔ گورنر تو جناب کے لگائے ہوئے اونٹی غلام ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے سرکاری ملازمین کی طرح گورزوں کو بھی سیاست سے الگ رکھنا ہی مناسب ہو گا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے تائید حاصل کرنے کے لیے مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمنعم خان کی طرف دیکھا، جو ناک سکیرے اور تیوبیاں چڑھائے اپنے گلے سے فوں فاں، غون غان، شوں شاں قسم کی بے معنی سی آوازیں برآمد کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے انداز سے کسی پر یہ عقدہ نہ کھل سکا کہ وہ نواب صاحب کے موقف کی تائید کر رہے ہیں یا تردید۔

اس کے چند روز بعد ایک شادی کی تقریب میں میری ملاقات چودھری خلیق الزمان صاحب سے ہوئی۔ وہ نہایت ہشاش بشاش اور خوشگوار موڈ میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمائے گے۔ ”لو میاں شب“ میں نے تمہارے فیلڈ مارشل کی فوجی وروی اتار کر انہیں مسلم لیگ کے دونی مارکہ کارکنوں کی صفت میں لا کھڑا کیا ہے۔“

”چودھری صاحب“ اب تو یہ فرمائے کہ مسلم لیگ اور ایوب خان دونوں کا اپنا کیا حشر ہو گا؟“ میں نے سوال کیا۔

چودھری خلیق الزمان نے چمک کر ایک زور کا قلقہ لگایا اور پھر انہوں نے لہک لہک کر یہ شعر پڑھا:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا  
آگے آگے دیکھنے ہوتا ہے کیا

ہمارے قریب ہی ایک صاحب ہماری باتوں کی طرف کان لگائے ہمہ تن گوش کھڑے تھے۔ شعر سن کر وہ بدکے اور کان سمجھاتے ہوئے ہمارے درمیان آکھڑے ہوئے آتے ہی انہوں نے اسی بحر، قافیہ اور رویف میں ایوب خان اور مسلم لیگ کے متعلق ایسے فخش اور مغلظات سے برے ہوئے اشعار سنانے کا تائنا باندھ دی اکہ الحفیظ و الامان۔ چودھری خلیق الزماں تو پچکے سے وہاں سے کھک گئے، لیکن چند دیگر لوگوں نے آکر ہمیں گھیر لیا اور ایک ایک فخش شعر پر بڑھ چڑھ کر داد دینے لگے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شعر سنانے والے صاحب چودھری خلیق الزماں کے بھائی تھے اور ان کا اسم گرامی غالباً مشق الزماں تھا۔ نہ ہے کہ ان کے پاس بہت سے موضوعات پر فخش اور غلیظ اشعار کا بہت بڑا ذخیرہ موجود رہتا تھا اور ایسے اشعار سناتے وقت ترنگ میں آکر وہ خواتین اور بچوں کی موجودگی کا بھی کوئی لحاظ نہ فرماتے تھے۔

میرے نزدیک بھی صدر ایوب کا سیاست کے خارزار میں قدم رکھنا ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ بدشکونی کے طور پر ان کا پہلا قدم ہی ایک پیچیدہ تحریک کا باعث بن گیا۔ وہ یہ کہ قائداعظم کی مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو کر کونشن مسلم لیگ اور کونسل مسلم لیگ بن گئی۔ اس طرح بٹ کر یہ جماعت مستقبل میں کوئی موثر کردار ادا کرنے سے قطعاً معدور ہو گئی۔ موجودہ زمانے میں مزید حصے بخڑے ہو کر یہ تین گروہوں میں بھر گئی ہے جن کا وجود اصولوں کے بجائے چند شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ قوم مسلم لیگ خواجہ خیر الدین لیگ اور پیر پگارا مسلم لیگ۔ ان تینوں گروہوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو قوی سطح پر کسی سنجیدہ اور باوقار قیادت کا علمبردار ہو۔ سیاست میں داخل ہو کر مسلم لیگ کی شکست و ریخت کے علاوہ صدر ایوب نے اور

کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ سیاست پر انہوں نے اپنی الگ کوئی خاص چھاپ نہیں لگائی، بلکہ اس کے بر عکس وہ مروجہ سیاست کے انہی ثیڑھے ترچھے سانچوں میں برباد رغبت ڈھلتے گئے، جن کی تطہیر کے لیے انہوں نے مارشل لاء کا سوانگ رچایا تھا۔

اگر ۸ جون ۱۹۶۲ء کو مارشل لاء اٹھانے کے بعد صدر ایوب اپنا وضع کرده آئین قوی اسمبلی کے سپرد کر کے کہتے کہ سپردم بتوایہ خویش را۔ تو واثق حساب کم و بیش را۔ اور اس کے بعد خود کناہ کش ہو کر گوشہ عافیت اختیار کر لیتے، تو تاریخ کا دھارا کوئی اور رخ اختیار کرتا؟

فیلڈ مارشل لاء کی وقت سے کئی ماہ پہلے یہی سوال میں نے ان کے سامنے اسلام آباد میں دھرا یا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر سنجیدگی سے بولے۔ ”تمہارا یہی سوال ہے تاکہ مارشل لاء اٹھا کر اور نیا آئین نیشنل اسمبلی کے سپرد کر کے اگر میں گھر آ بیٹھتا، تو پھر کیا ہوتا؟ میرا جواب سن لو کہ پھر یقیناً جزل موی ہوتا۔“

جزل موی اس زمانے میں پاکستانی فوج کے کمانڈر ان چیف تھے۔

سات برس بعد جب صدر ایوب واقعی گھر آ کر بیٹھ رہنے پر مجبور ہو گئے، تو ان کی جگہ آئین کے مطابق قوی اسمبلی کے سپیکر نے نہ لی، بلکہ جزل بھی آئین منسوخ کرنے کے بعد مارشل لاء لگا کر اقتدار سنبھال بیٹھے۔

یہ بھی تاریخ کی ایک عجیب ستم طرفی ہے کہ پاکستان میں آئین بنتے ہی ایک نہ ایک فوجی جرنیل اس کا سر کچلنے کے لیے مارشل لاء کا گرز اٹھائے تیار کھڑا ہوتا ہے۔ چودھری محمد علی والا آئین تین برس چل کر جزل ایوب خان کے ہاتھوں منسوخ ہو گیا۔ ایوب خان کا آئین سات برس بعد جزل بھی خان نے پاؤں تلے روند ڈالا۔ ۱۹۷۳ء کا ہمه جماعتی متفقہ آئین بھی۔ ۱۹۷۷ء سے جزل ضماء الحق کے مارشل لاء میں ہر چند کیس کہ ہے نہیں ہے! آئین کی پے در پے پامالی کے بعد وطن عزیز میں اس افسوسناک اور تشویشناک صورت حال کی وجہ آخر کیا ہے؟ کیا اس کہ وجہ آئین کی متواتر اور مزمن

بے وقعتی ہے؟ یا شعبہ سیاست کی کم مائیگی و بدحالی ہے یا بری فوج کے کمانڈر انجیف کی نفیات میں ایسے اجزا شامل ہو گئے ہیں کہ سول حکومت پر قبضہ جمانے کی ترغیب کے سامنے اس کی قوت مزاحمت جواب دے جاتی ہے؟

صدر ایوب کے آئین کے نفاذ کے سوا سال بعد جب میں بطور سفیر تعینات ہو کر ہالینڈ جا رہا تھا، تو میں اس وقت کے بری فوج کے کمانڈر انجیف جزل موئی کو خدا حافظ کرنے جی۔ ایچ۔ کیو۔ گیل۔ باتوں باتوں میں مجھے یہ صاف انداز ہو گیا کہ جزل موئی بڑی بے چینی سے اس امر کا جائزہ لے رہے ہیں کہ اگر وہ مارشل لاے کے ذریعے صدر ایوب کی حکومت کا تحفظہ الٹ دیں۔ تو اس کارروائی پر ملک بھر میں کیا رو عمل ہو گا؟ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی ہمت کی کمی اور شخصیت کی کمزوری کی وجہ سے وہ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کبھی کوئی معمولی سا قدم بھی اٹھانے سے معذور ہے، البتہ ان کے بعد آنے والے کمانڈر انجیف جزل بھی خان کا حال دوسرا تھا۔ کمانڈر انجیف کے طور پر بھی خان کا انتخاب اخباروں میں شائع ہوا، تو کئی خفیہ نویس اداروں نے صدر ایوب کو یہ رپورٹیں بھیجیں کہ اس خبر کے بعد ملتان، لاہور اور راولپنڈی میں بھی خان کے قریبی رشتہ داروں نے بغلیں بجا کیں، چاغاں کیا، اور اس اعلان کے ساتھ مٹھائی بانٹی کہ ”اب صدارت ہمارے گھر میں آگئی ہے۔“

خدا کرے موجودہ مارشل لاے کی حکومت ہمارے وطن عزیز میں اس طرز کی آخری حکومت ثابت ہو۔ اس کے بعد مسلح افواج برضاء و رغبت اپنے پیشہ ورانہ کار میں قناعت پذیر ہو کر ترقی اور عروج کی منزلیں طے کریں۔ عدیلیہ اور سیاست آزاد ہو کر اپنا فطری کار منصی سنبھالیں۔ جموروی ادارے ازسر نو قائم ہوں۔ پے در پے انتخابات اس لیے بھی لازمی ہیں کہ سیاسی عمل سے چمن و ہمن کرنی قیادت جنم لے۔ نئی قیادت ہماری سب سے اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ پرانی قیادت جو کسی نہ کسی وقت عملی یا ذہنی یا جذباتی طور پر مارشل لاے کی آسیجن سے چوری چھپے سانس لے لے کر سکتی رہی ہے۔

اب مکمل طور پر دم توڑ چکی ہے اور کوئی سیاسی معجزہ اب اسے دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ مستقبل اب نئی قیادت کا منتظر ہے۔ اس وقت تک ایک خلا کی سی کیفیت طاری رہے گی۔ جس کے متعلق یہ بھی ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خانہ خالی را دیوی گیرد۔

○○○

## • صدر ایوب اور طباء

مرکزی وزارت تعلیم کا سیکرٹری معین ہونے سے پہلے صدر ایوب ایک روز مجھے اپنے ساتھ اپنے آبائی گاؤں سچانہ لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ان کی والدہ محترمہ، جو اس وقت بقید حیات تھیں، آج ان سے شدید ناراض ہیں اور ان کے ساتھ ملاقات نہیں کریں گی۔ یہ خبر سن کر صدر صاحب پریشان ہو گئے اور اپنے چند عزیزوں کی وساطت سے اپنی والدہ کی خفیٰ کی وجوہات معلوم کرنے میں مصروف ہو گئے۔

کسی قدر تگ و دو کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ صدر ایوب کی والدہ محترمہ کو ان کے خلاف تین شکایات تھیں۔ ایک شکایت یہ تھی کہ پریزیڈنٹ ہاؤس کی موڑ کاریں جب کسی کام پر گاؤں میں آتی ہیں، تو یہاں کی چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر وہ بڑی تیز رفتاری سے چلتی ہیں جس سے لوگوں کی جان و مال کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ جو گاڑی بھی گاؤں میں آئے وہ آرام سے آہستہ اور احتیاط کے ساتھ چلے۔

دوسری شکایت یہ تھی کہ گاؤں کے کئی لڑکے کالج کی تعلیم ختم کر کے گھروں میں بے کار بیٹھے ہیں۔ ان کو نوکری کیوں نہیں ملتی؟ اگر نوکری نہیں ملتی تھی، تو کالجوں میں پڑھایا کیوں گیا؟

بڑی بی کو تیسرا شکایت یہ تھی کہ میری نہیں کا پنواری ہر فصل کے موقع پر پچاس روپے فصلانہ وصول کر کے خوش رہا کرتا تھا، لیکن اب وہ زردستی سو روپے مانگتا ہے، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ تمہارا بیٹا اب پاکستان کا حکمران ہو گیا ہے۔ اس لیے پچاس روپے کا نذرانہ میرے لیے بہت کم ہے۔ بڑی بی کو گلہ تھا کہ ایوب خان کی حکومت میں رشوت کا ریث ڈبل کیوں ہو گیا ہے؟

واپسی پر صدر ایوب نے اقبال کیا کہ اماں کہ پہلی شکایت کا ازالہ ناممکن ہے، کیونکہ

اين۔ کول کا تذکرہ کیسے آگیا؟" ہندوستانی افسر نے انہیں بتایا کہ میں بھی جموں میں کول کے کالج ہی میں پڑھ چکا ہوں۔ پنڈت جی مسکرائے اور بولے۔ "ان کو بھی تو کبھی کشمیر آنے کی دعوت دو۔ ہماری طرف سے خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ ہو گی۔" میں نے نہایت احترام سے گزارش کی۔ "سر، اگر آپ کی وجہ سے کشمیر کا مسئلہ ہی حل ہو جائے، تو اس سے بڑی خاطر تواضع اور کیا ہو سکتی ہے؟" یہ سنتے ہی پنڈت جی کے تیور گڑ گئے، جیسے ان کے منہ میں زردستی کڑوی گولیاں ٹھونس دی ہوں۔ انہوں نے بے اعتنائی سے گردن گھمائی اور منہ دوسری جانب موڑ کر بیٹھ گئے۔

مری میں صدر ایوب نے پنڈت جی کے ساتھ خاص خاطرداری سے کام لیا۔ لیکن اس تواضع اور تپاک نے بھارتی وزیر اعظم کے دل میں جمی ہوئی سرد مری کی برف پر گرم جوشی کی ایک بہلکی سی آنج بھی نہ ڈالی۔ صدر ایوب نے نقصوں کی مدد سے پاکستان کے لیے کشمیر کی دفاعی اور معاشری اہمیت پر پوری پوری روشنی ڈالی اور کہا کہ پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کے مسئلہ لیدر ہیں۔ پاکستان میں بھی لوگ میری بات سنتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم نے اپنی زندگی میں قضیہ کشمیر کا حل تلاش نہ کیا تو یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور پھر شاید کبھی دوبارہ ایسا موقع ہاتھ نہ آئے۔

پنڈت جی نے صدر ایوب کی تمام باتیں نہایت توجہ اور انہاک سے سنیں۔ پھر سوچ سوچ کر ایک ایک لفظ تول تول کر انہوں نے نہایت صاف گوئی سے اپنا موقف اس طرح واضح کیا کہ کشمیر کا مسئلہ بہت سی غیر معمول چیزیں گیوں میں الجھا ہوا ہے۔ اسے جوں کا توں پڑا رہنے دیا جائے تو اسی میں ہم سب کی عافیت ہے کشمیر میں دو بار انتخابات منعقد ہو چکے ہیں۔ اب عنقریب تیر انتخاب بھی آنے والا ہے۔ وہاں پر حالات امن و امان کی فضا میں مستحکم ہو رہے ہیں۔ ان حالات کو دگرگوں کرنے کی کوشش کرنا بھڑوں کے چھتنے کو چھیڑنے کے مترادف ہو گا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقلیت کو بھی ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ انہیں ہندوستانی قوم میں ختم کرنے کا

عمل جاری ہے۔ اگر کشمیر میں موجودہ صورت حال کو الٹ پلٹ کیا گیا، تو اس عمل میں شدید رکاوٹ پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ دوسرے الفاظ میں پنڈت نہرو نے صدر ایوب کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کو مسئلہ کشمیر کا یعنی ملکی بنائے بٹھا دیا یعنی اگر مسئلہ کشمیر کو از سر نو چھپیرنے کی کوشش کی گئی تو سارے ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ صدر ایوب کے پاس اس کھلی دھمکی اور انوکھی منطق کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ اور اس طرح مری کی سات ہزار فٹ کی بلندی پر مسئلہ کشمیر ایک بار پھر برلن میں ڈال کر سربھر کر دیا گیا۔

کشمیر کے معاملے میں پنڈت نہرو کی خواہشات اور عزائم نے ایک نیا گل اس وقت کھلایا، جب ۱۹۶۳ء میں شیخ عبداللہ اور مرزا نفضل بیگ پاکستان کے دورے پر تشریف لائے۔ ان دونوں میں ہالینڈ میں بطور سفیر معین تھا۔ میری واپسی کے بعد ایک بار مجھے صدر ایوب نے خود بتایا کہ چکلالہ کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی انہوں نے پے در پے ایسے بیانات دینا شروع کر دیئے ہیں جن میں بھارت کی نام نہاد سیکولرزم، دوستی اور امن پسندی کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف کا پرچار تھا۔ اس کے علاوہ ان دونوں حضرات نے پنڈت نہرو کے گن گا کر برطانیہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ تین آزاد ممالک یعنی ہندوستان، پاکستان اور کشمیر کی ایک کنفیڈریشن بنانا ہی ہمارے تمام مسائل کا واحد حل ہے۔ صدر ایوب کا کہنا تھا کہ یہ سن کر وہ ان دونوں سے بے حد مایوس ہوئے اور ان سے کہا کہ اگر آپ ہندوستان کی طرف سے یہی مشن لے کر آئے ہیں، تو آپ سے کسی معاملے میں کوئی سنجیدہ گفتگو کرنا بے کار ہے۔ البتہ آپ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ جہاں جی چاہے خوشی سے گھومئے پھریئے، جس کے ساتھ جی چاہے آزادی سے ملئے جائے۔ ہماری طرف سے آپ کے لیے ہر طرح کی سولت حاضر ہے۔

شیخ عبداللہ اور مرزا نفضل بیگ پاکستان کے دورے پر ہی تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو دہلی میں سرگباش ہو گئے۔ اگر واقعی کنفیڈریشن کا خناس ان کے ذہن میں سمیا ہوا تھا تو یہ فتنہ بھی ان کی موت کے ساتھ اپنے آپ ختم ہو گیا۔

مری میں قیام کے دوران پنڈت نرسو نے صدر ایوب سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ چین کے ساتھ کسی قسم کی سرحدی معاهدہ طے کرنے کے لیے گفت و شنید کر

رہے ہیں؟ صدر ایوب نے بچ بچ بتا دیا کہ اس موضوع پر بات چیت ضرور ہو رہی ہے، لیکن یہ معاملہ ابھی تک بالکل ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ پنڈت جی نے اپنی شاطرانہ چال کو ہمدردانہ لجھے میں لپیٹ کر وہ نقشہ دیکھنے کی فرمائش کی جس کی بنیاد پر ہم چین کے ساتھ اپنی سرحدیں طے کرنا چاہتے ہیں۔ صدر ایوب نے بغیر سوچ سمجھے انتہائی سادہ لوگی سے متعلقہ نقشہ کھول کر ان کے سامنے بچھا دیا۔ پنڈت جی نے ایک اور داؤ کھیلا اور درخواست کی کہ کیا آپ اس نقشے کی ایک نقل مجھے عطا فرمائے سکتے ہیں۔ صدر ایوب نے پھر بغیر سوچ سمجھے سادہ لوگی سے فوراً حامی بھر لی۔ ان دونوں کے درمیان یہ گفتگو سراسر ذاتی، غیر رسمی اور دوستانہ سطح پر ہوتی تھی لیکن ولی واپس پہنچتے ہی پنڈت نرسو نے بات کا بتنگڑ بنا ڈالا اور چین اور پاکستان کے مابین سرحدی گفت و شنید کو ملی بھگت قرار دے کر اس کے خلاف کڑی تنقید شروع کر دی ساتھ ہی سرکاری سطح پر بھارتی حکومت نے احتجاجی انداز میں وہ نقشہ بھی طلب کر لیا جس کی بنیاد پر پاکستان چین کے ساتھ اپنے سرحدی معاملات طے کرنا چاہتا تھا یہاں پر ہماری متعلقہ ودارتوں کا مشونہ تھا کہ بھارت کا یہ رویہ ناجائز ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے انہیں نقشہ فراہم کرے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن صدر ایوب مصر تھے کہ انہوں نے پنڈت نرسو سے وعدہ کر لیا ہے، اور اب وہ اس معاملے میں کسی قسم کی وعدہ خلافی بالکل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مجبوراً، مطلوبہ نقشے کی نقل سرکاری طور پر بھارتی حکومت کو ارسال کر دی گئی۔

پنڈت جواہر لال نرسو کی تمام چالبازیوں، قلابازیوں، وعدہ خلافیوں اور ہٹ دھرمیوں کے باوجود غالباً صدر ایوب کے دل میں امید کی یہ کرن ٹھہراتی رہی کہ شاید دنیا کے دوسرے بڑے یہڈر پنڈت جی پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے پاکستان کے بارے میں انہیں راہ راست پر لانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس زمانے میں امریکہ میں صدر کینڈی کی ایک نئی اور

جو ان قیادت ابھری تھی۔ اقتدار سنبھالتے ہی صدر کینڈی نے پنڈت نہرو کے ساتھ قومی اور ذاتی سطح پر پینگلیں بڑھانے کے لیے ایڈی چوڑی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی ایک خاص معتمد اور معاشیات کے بین الاقوامی ماہر پروفیسر گلبریتہ کو بھارت میں امریکن سفر کے طور پر متعین بھی کر دیا۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں صدر کینڈی کی دعوت پر صدر ایوب امریکہ کے سرکاری دورے پر گئے۔ مز جیکو لین کینڈی خصوصاً صدر ایوب کی شخصیت سے غیر معمول طور پر متاثر ہوئیں اور دونوں میاں یہوی نے ان کی پذیرائی کے لیے انتہائی پروقار اور شاندار تقریبات منعقد کیں۔ ایک روز بھی سے پہلے ہلکی پھلکی گفتگو ہو رہی تھی۔ صدر ایوب نے اچانک کسی قدر جذباتی انداز میں صدر کینڈی اور مز جیکو لین کینڈی کو مخاطب کر کے کہا۔ ”آپ دونوں ایک مثالی جوڑا ہیں۔ آپ کے حسن صورت اور حسن سیرت کے جادو سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ کیا آپ یہ جادو چلا کر پنڈت نہرو کو مسئلہ کشمیر حل کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتے؟ اس سے ہماری بہت سی مشکلات رفع ہو جائیں گی۔“

مز جیکو لین کینڈی تو یہ سن کر تھوڑا سا جھینجھی اور تھوڑا سا مسکراتی، لیکن صدر کینڈی زور سے نہے اور بولے۔ ”مشر پریزیڈنٹ“ پنڈت جواہر لال نہرو دنیا کے ہر موضوع پر نہایت عالمانہ گفتگو کرنے کی الہیت رکھتے ہیں لیکن جونہی کشمیر کا ذکر آئے وہ فوراً سر جھکا کر اپنی نگاہیں شیروانی کے کاج میں ٹنگے پھول پر گاڑ کر چپ سادھ لیتے ہیں، اور یو گیوں کی طرح آسن جما کر کسی گھرے مرائبے میں ڈوب جاتے ہیں۔“

ایک تو وہ زمانہ تھا جب پنڈت نہرو کے نخوت بھرے ناز و نخرے سر آنکھوں پر اٹھانے کے لیے دنیا کے بہت سے چھوٹے اور بڑے ملک ہر وقت چشم براہ رہتے تھے لیکن چین اور بھارت کے درمیان سرحدی جنگ کے دوران پنڈت جی کی ناقابل تسبیح شخصیت کی قلعی ایک دم کھل گئی، اور چینی یلغار کے ایک تھیڑے سے ان کی عظمت اور بہادری کے ملمع کا بھرم چشم زدن میں آنا فانا اٹھ گیا۔

”ہندی چینی بھائی بھائی“ کا بلند بانگ نعروہ کافی عرصہ سے سرد پڑ چکا تھا۔ اور اکتوبر ۱۹۶۲ء کے اوائل ہی سے پنڈت نرود یہ گیدڑ بھبھکیاں دے رہے تھے کہ ہندوستانی فوجیں چینیوں کو لداخ اور نیفا کے متنازعہ علاقوں سے بہت جلد نکال باہر پھینکیں گی۔ اسی ماہ کی غالباً ۲۰ تاریخ تھی کہ میں ہار لے شریٹ راولپنڈی میں اپنے گھر سیا پڑا تھا، رات کے ڈھائی بجے تھے کہ اچانک میری کوئی کمپاؤنڈ میں ایک کار داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں بعد میرے ملازم نے اندر آ کر مجھے بتایا کہ ایک چینی آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ غالباً وہ چینی پاکستان میں اردو زبان سیکھنے آیا ہوا تھا اور پہلے بھی مجھ سے کئی تقریبوں میں مل چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بھارت نے چینی سرحدوں پر پے درپے حملے کر کے چین کو جوابی کارروائی پر مجبور کر دیا ہے اور چینی فوج چند مقامات پر بھارت میں داخل ہو کر آگے بڑھ رہی ہے۔ اور وہ اس وقت مجھے یہی اطلاع دینے آیا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ نے یہ بات ہماری وزارت خارجہ تک بھی پہنچا دی ہے؟“  
چینی مسکرا�ا اور بولا۔ ”ہمارا خیال ہے کہ شاید صدر ایوب کو اس خبر میں خاصی دلچسپی اور اہمیت محسوس ہو۔ ہمارے اندازے کے مطابق آپ یہ خبر ان تک فوری طور پر پہنچانے میں نیا وہ کام آ سکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے آپکو ایسے بے وقت جگا کر یہ تکلیف دی ہے۔ یہ میرا ذاتی فعل ہے۔ سفارت خانے کی جانب سے نہیں۔“

سفارت کاری کے فن میں چینیوں کا اپنا ہی ایک خاص اور نرالا انداز ہے۔ وہ اپنے دوستوں پر بھی اپنی رائے یا مشورہ یا نصیحت خواہ یا بر ملا ثنوں کے عادی نہیں ہیں۔ لیکن اشاروں کنایوں میں اپنا عنديہ نهایت خوش اسلوبی سے واشگاف طور پر ظاہر کر دینے میں انتہائی مہارت رکھتے ہیں۔ میرا انداز ہے کہ رات کے ڈھائی بجے مجھے جگا کر غالباً وہ اپنے مخصوص انداز میں یہ پیغام پہنچا رہے تھے کہ جنگ کے یہی ابتدائی گھنٹے انتہائی اہم ہیں، ہندوستانی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے ہیں اور چینیوں کے خوف سے سر پر پاؤں رکھ کر ہر محاذ سے بھاگ رہی ہے۔ اگر پاکستان اس موقع سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے،

تو ہرگز وقت ضائع نہ کریں۔

میں نے فوراً لباس تبدیل کیا اور اپنی کار نکال کر تیز رفتاری سے ایوان صدر جا پہنچا۔ اس وقت کوئی تمیں بجے کا عمل تھا۔ کسی قدر تگ و دود کے بعد مجھے صدر ایوب کی خواب گاہ تک رسائی حاصل ہو گئی۔ میں نے انہیں چینی کے ساتھ اپنی گفتگو تفصیلی سنائی، تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ کوئی غیر متوقع خبر ہرگز نہیں۔ لیکن اتنی رات گئے تمہیں صرف یہ خبر سنانے کے لیے آئے سے اس کا اصلی مقصد کیا تھا؟“

میں نے اپنا قیاس بیان کیا کہ شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ ہم ان لمحات کو اپنے حق میں کسی فائدہ مندی کے لیے استعمال میں لے آئیں

”مشلا؟“ صدر ایوب نے پوچھا۔

”مشلا؟“ میں نے انہیوں کی طرح تجویز پیش کی۔ اسی لمحے اگر ہماری افواج کی نقل و حرکت بھی مقوضہ کشیر کی سرحدوں کے خاص خاص مقامات کی جانب شروع ہو جائے، تو.....“

صدر ایوب نے تیز و تند لمحے میں میری بات کاٹ کر کہا۔ ”تم سویلین لوگ فوجی نقل و حرکت کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہو۔ جاؤ اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔“

آج تک میرا یہی خیال ہے کہ اس رات صدر ایوب نے اپنی زندگی اور صدارت کا ایک اہم ترین سنری موقع ہاتھ سے گنو دیا۔ اگر ان کی قائدانہ صلاحیتوں پر نیند کا غبار نہ چھایا ہوتا اور ان کے کروار میں شیعہ دیوانگی اور شیعہ مردانگی کا کچھ امتزاج بھی موجزان ہوتا، تو غالباً اس روز ہماری تاریخ کا دھارا ایک نیا رخ اختیار کر سکتا تھا۔

سیالب کے سیلے کی مانند جس طرح چینی فوجیں ہندوستان میں آگے بڑھی تھیں، بھارتی فوج کی اچھی طرح گوشمالی کرنے کے بعد اسی طرح تیزی سے واپس بھی لوٹ گئیں، پنڈت جواہر لال نہرو کی بے بی، بیکسی اور ٹکست خوروگی کو اپنے مفاد کے سانچے میں ڈھانلنے کے لیے صدر کینڈی نے صدر ایوب پر نور ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ پنڈت جی

کو فوراً ایک ذاتی پیغام بھیج کر انہیں یہ یقین دلائیں کہ چین کے ساتھ جنگ کے دوران ہندوستان کی سرحدوں پر پاکستان کی جانب سے ہرگز ہرگز کوئی گڑبڑ رونما نہ ہو گی۔ صدر ایوب نے پنڈت نرسو کو اس نوعیت کا پیغام تو کوئی نہ بھیجا، لیکن پاکستان میں اپنے طرز عمل سے ہندوستان کو ہماری طرف سے ہر قسم کے خطرات اور شکوک و شبہات سے بے نیاز کر دیا۔

ہندو بنیوں میں ایک کماؤت ہے کہ چڑی جاتی ہے تو جائے لیکن دمڑی ہاتھ میں آئے۔ چین کے ہاتھوں ہندوستان نے ٹکست تو نمایت شرمناک کھائی، لیکن اس داغ کو غیر ملکی امداد کی ریل چیل سے دھونے کے لیے پنڈت نرسو ساری دنیا کے سامنے نمایت بے جا بیلی سے چینی جارحیت کا ایک مظلوم اور مخصوص پیکر بن کر کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ اس بت کو رام کرنے کے لیے امریکہ اور انگلستان نے مل کر ہر قسم کی فوجی امداد اور جدید ترین اسلحہ جات نمایت بھاری پیانے پر ہندوستان کو دینے کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے، پاکستان نے دبے لفظوں میں تھوڑا بہت احتجاج تو ضرور کیا، لیکن کسی نے ہماری باتوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ہر کوئی ہمیں بس اتنا کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ یہ فوجی امداد ہندوستان کو صرف چین کے خلاف استعمال کرنے کے لیے دی جا رہی ہے پاکستان کو اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ ہرگز لاحق نہ ہو گا۔

امریکہ کے اس رویے پر پاکستانی اخبارات میں بڑا شدید رو عمل شروع ہو گیا خود امریکہ میں بھی چند اخبارات نے یہاں تک لکھ دیا کہ ہندوستان کو بڑے پیانے پر فوجی امداد دیتے وقت اسے قضیہ کشمیر کو حل کرنے پر پابند کرنے کا یہی ایک مناسب موقع ہے۔ غالباً یہ اسی قسم کے دباؤ کا نتیجہ تھا کہ اچانک ایک اعلیٰ سطحی میں الاقوامی وفد راولپنڈی میں آوارد ہوا۔ اس وفد میں برطانیہ کے کامن ویلتھ سیکرٹری مسٹر ڈنکن سینڈز (Sandys) اور امریکہ کے اسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر ایڈویل ہیریمن (Mr Duncan Harriman) شامل تھے۔ ڈنکن سینڈز ایک زمانے میں ونسن چرچل کے داماد بھی ہے اور مسٹر ایڈویل ہیریمن دوسری جنگ عظیم کے دوران روز ویلت کے خصوصی چکے تھے، اور مسٹر ایڈویل ہیریمن

اپنی کے طور پر عالی شرتوں حاصل کر چکے تھے۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ ایوان صدر راولپنڈی کے لان میں نہایت خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ یہ دونوں حضرات صدر ایوب کے ساتھ باہر دھوپ میں بیٹھ گئے۔ اور کوئی گھنٹہ بھر کی محنت کے بعد انہوں نے ایک نہایت بے اثر، بے شر اور بوگس قسم کے اعلان کا ڈرافٹ تیار کیا جس کا متن یہ تھا:

### Resolution

The President of Pakistan and the Prime Minister of India have agreed that a renewed effort should be made to resolve the outstanding differences between their two countries on Kashmir and other related matters so as to enable India and Pakistan to live side by side in peace and friendship.

In consequence, they have decided to start discussion at an early date with the object of reaching an honourable and equitable settlement.

These will be conducted initially at the ministerial level. At the appropriate stage direct talk will be held between Mr Nehru and President Ayub.

صدر ایوب نے تو بلا چوں و چراں اس معاہدے پر وسخنٹ کر دیئے۔ اور مسٹر ڈنکن سنیڈز اس دستاویز کو سینے سے لگا کر پنڈت نہرو کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لپچ کے فوراً بعد دہلی روانہ ہو گئے۔ پروگرام یہ تھا کہ جونی پنڈت نہرو اس دستاویز پر اپنے وسخنٹ ثابت فرمائیں، مسٹر سنیڈز فوراً ٹیلیفون پر یہ خوشخبری راولپنڈی پنچاۓ میں گے یہ تو معلوم نہیں کہ دہلی پہنچ کر مسٹر ڈنکن سنیڈز پر نہرو جی کے ہاتھوں کیا گزری۔ لیکن یہاں راولپنڈی میں شام کے پانچ بجے ہی سے مسٹر ایوب ہیریمن ایوان صدر کے ڈرائیننگ روم میں ہمہ تن انتظار ہو کر بیٹھ گئے۔ بے تابی کے عالم میں وہ کمرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹھلتے تھے، بار بار اپنی گھڑی دیکھتے تھے۔ اور پھر بت بن کر عالم سکتہ میں کری پر بیٹھ جاتے تھے۔ پورے سوا دو گھنٹے وہ اسی طرح آتش زیر پا حالت اضطراب میں بنتا رہے، خدا خدا کر کے سوا سات بجے نئی دہلی سے ٹیلیفون آیا کہ پنڈت

جواہر لال نرسو نے ٹھیک سات بجکر دس منٹ پر معاهدے پر دستخط کر دیئے ہیں۔ یہ سنتے ہی مسٹر ایول ہیریمن مسرت و شادمانی سے ایسے سرشار ہو گئے جیسے انہوں نے ماڈن ایورسٹ کی چوٹی سر کر لی ہو۔ انہوں نے گرجوٹی سے اٹھ کر صدر ایوب کے ساتھ ہاتھ ملایا انہیں مبارک باد دی (کس بات کی؟ یہ مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکا) اور کامیابی اور کامرانی (کس کی؟) کے لمحات منانے کے لیے شیمپین کی بوتل کھونے کی فرمائش کی۔ شیمپین کا دور چل رہا تھا کہ مسٹر ایول ہیریمن نے کسی قدر بلند آواز میں صدر ایوب کو مخاطب کر کے کہا۔ ”مسٹر پرینزیڈنٹ۔ آج کا دن ایک تاریخ ساز دن ہے۔ اس سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے آپ کی وزارت خارجہ کو اب ایسے خطوط پر چلتا پڑے گا“ کہ امریکہ اور ہندوستان دونوں کے ساتھ یکساں صاف گوئی سے بات چیت کی جا سکے۔“

صدر ایوب حرمت سے کسی قدر چونکے اور بولے۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی بات کا مفہوم صاف صاف نہیں سمجھ سکا۔“

مسٹر ہیریمن نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے، آپ کو اپنا فارن سیکرٹری تبدیل کر لینا چاہیے۔ کم از کم ہمارا سفارت خانہ ان کے ساتھ آزادانہ گفتگو کرنے میں شدید اچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔“

ان دونوں مسٹر ایس کے دلوی ہماری وزارت خارجہ کے سیکرٹری تھے۔ مسٹر ایول ہیریمن کے احکام کی پیروی میں صدر ایوب نے انہیں بہت جلد غیر معین کر کے قاہرہ بھیج دیا۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کے معاهدہ پر پنڈت نرسو کے دستخطوں کی مضمون سر کرتے ہی مسٹر ڈنکن سنیندز فتح و نصرت کے جھنڈے لہراتے دہلی سے بوئے لندن روانہ ہو گئے۔ ابھی ۰۷ کراچی تک ہی پہنچ پائے تھے کہ پنڈت جی نے ہندوستان کی لوک سماج میں صدر ایوب کے ساتھ اپنے معاهدہ کی وضاحت میں منافقت سے بھرا ہوا ایک عجیب و غریب بیان دے ڈالا جس کا لب لباب یہ تھا کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ محض ایک رسمی سی

کارروائی تھی، اور اس معاملہ کی وجہ سے کشمیر کے متعلق ہندوستان کے رویے میں ہرگز کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ سنتے ہی مسٹر ڈنکن سنیڈز نے لندن کا سفر منسوخ کیا، اور کراچی سے صدر ایوب کو بتایا کہ وہ ابھی نہیں دہلی واپس جا رہے ہیں، اور پنڈت نہرو کو اس بے معنی اور مفسدانہ بیان کی تردید کرنے پر مجبور کریں گے۔ اسی شام ایک بار پھر ایوان صدر راولپنڈی کا ڈرائیکٹ روم زحمت انتظار کی لپیٹ میں بری طرح آگیا۔ کل کی طرح آج بھی مسٹر ایوب ہیریمن میں کا ما مادھو بنے ایک کرسی پر آ کر گم سم بینہ گئے۔ بے چینی سے انھوں نے اٹھ کر کرے میں بدھوایی سے ٹھلتے تھے، بار بار گھڑی دیکھتے تھے، اور پھر یو گیوں کی طرح آس جما کر بے حس و حرکت بینہ جاتے تھے، گزشتہ شام ہم سب نے اس ماحول میں سوا دو گھنٹے گزارے تھے، لیکن آج انتظار کی یہ سکھن گھریاں بے حد طویل ہو گئیں۔ رات کے گیارہ بجکر بیس منٹ پر ٹیلیفون کی گھنٹی بھی۔ پہلے صدر ایوب نے مسٹر ڈنکن سنیڈز کے ساتھ چند منٹ گفتگو کی۔ پھر مسٹر ایوب ہیریمن نے بے تابی سے لپک کر رسور تھاماً اور کافی طویل عرصہ تک ان کے ساتھ بات چیت کرتے رہے، ٹیلیفون کی اس ساحرانہ گھنٹی نے کمرے پر چھائی ہوئی مردنی کو مکڑی کے جالے کی طرح اتار پھینکا۔ اور ڈرائیکٹ روم میں ازسر نو چہل پل کی رونق واپس آگئی۔

مسٹر ڈنکن سنیڈز کے ٹیلیفون سے یہ عقدہ کھلا کہ انہوں نے رات گئے پنڈت نہرو کو ایسے وقت جا پکڑا جب وہ شب خوابی کا لباس پہن کر سونے کے لیے اپنے بلنگ پر لیٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ پہلے تو وہ صاف مکر گئے کہ انہوں نے کوئی ایسی بات کی ہے جس سے کسی قسم کی غلط فہمی یا بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ پھر ڈنکن سنیڈز کے پروزور اصرار پر انہوں نے آئیں بائیں شائیں کر کے حیلے بہانوں سے لوک سجا میں اپنے بیان کو توڑ مروڑ کر کچھ عذر لنگ پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مسٹر سنیڈز نے جب ان کی نرم و نازک کلامی کو کسی قدر مزید مروڑا تو پنڈت جی نے حسب

عادت فوراً یہ وعدہ کر لیا کہ وہ بہت جلد ایک ایسا بیان جاری کر دیں گے جس سے ہر قسم کی غلط فہمی اور بدگمانی کا پورا پورا ازالہ ہو جائے۔

URDU4U.COM

لیکن پنڈت جی کے دوسرے بہت سے وعدوں کی طرح ان کا یہ وعدہ بھی ایک بھونڈا سامناق ہی ثابت ہوا۔ دو روز کے بعد انہوں نے بغیر کسی سیاق و سبق کے ایک ایسا گول مول سا بیان فرمایا جس سے تازعہ کشمیر کے حل کی جانب تو بالکل کوئی راستہ و نہ ہوا، البتہ برطانیہ اور امریکہ کی جانب سے ہندوستان کی جھوٹی میں مالی اور فوجی امداد بدستور بڑھتی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنا الو سیدھا کرنے اور دوسروں کو کامیابی سے الوبنانے میں پنڈت جواہر لال نہرو کو خاص مہارت حاصل تھی۔

لیکن یہ بھی درست ہے کہ پنڈت جی کی تمام تر چالبازیوں، ہیرا پھیریوں اور متفقتوں کے باوجود ان کا نفیاتی ہوا صدر ایوب کے دل و دماغ پر کسی نہ کسی حد تک ہمیشہ چھایا رہا، میرے تجربے میں ایسا کوئی موقع دیکھنے میں نہیں آیا جب وہ پنڈت جی کے سامنے اکثر اوقات دبے دبے سے مرعوب ہوتے ہوئے نظر نہ آ رہے ہوں۔ لیکن پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات کے بعد یہ صورت حال یک لخت تبدیل ہو گئی۔ جب شری لال بہادر شاستری بھارت کی وزارت عظمی پر برآ جمان ہوئے تو صدر ایوب اچانک خود اپنی ہی نظر میں قد آور ہو گئے۔ پنڈت نہرو کی موجودگی میں وہ بلاوجہ احساس کمتری میں بیٹلا رہا کرتے تھے، لیکن لال بہادر شاستری کے آتے ہی وہ اسی طرح بلاوجہ احساس بدتری کا شکار ہو گئے۔ یہ نفیاتی زیریوم ان کے کردار کا ایک ایسا المیہ تھا، جس نے رفتہ رفتہ انہیں غلط راستوں اور غلط فیصلوں پر گھیٹ گھیٹ کر انجام کار زوال کے قدر مذلت میں جا پھینکا۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں وزیراعظم لال بہادر شاستری قاہرہ میں غیر جانبدار ممالک کی ایک کانفرنس میں شرکت کے بعد واپسی پر مختصر سے قیام کے لیے کراچی ائیرپورٹ پر رکے، تو صدر ایوب نے انہیں ہوائی اڈے پر ہی لپخ کھلایا۔ شاستری جی چھوٹے قد کے دبليے پتلے اور نحیف سے آدمی تھے، ملاقات خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ لیکن نفیاتی طور پر صدر ایوب

بیٹھے بھائے بلاوجہ شیر ہو گئے۔ اب وہ جگہ جگہ موقع بے موقع جمل کمیں لال بادار شاستری کا ذکر آتا، ان کو تفسیر و تفہیک کا نشانہ بناتے، اور اکثر اوقات کہا کرتے تھے، کہ ”اس بالشت ڈیڑھ بالشت کے آدمی کے ساتھ کوئی سنجیدہ گفتگو کرنا بیکار وقت ضائع کرنا ہے۔“

مشریع زوالفقا علی بھٹو نے مجھے تاشقند کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے باہمی مذاکرات ایک مقام پر آ کر شدید قتل کا شکار ہو گئے تھے۔ روس کے وزیر اعظم کو سیجین نے کئی بار آ کر صدر ایوب پر زور دیا کہ وہ مذاکرات کو ناکام نہ ہونے دیں اور مشریع شاستری کے ساتھ اپنی گفتگو جاری رکھیں۔ ایک بار صدر ایوب مذاق مذاق میں مشریع کو سیجین سے یہ کہہ بیٹھے۔ ”مجھے ہرگز یہ توقع نہیں کہ اس بالشت ڈیڑھ بالشت کے مختی سے شخص کے ساتھ کوئی فیصلہ کن گفتگو ہو سکے۔“ مشریع بھٹو کا کہنا تھا کہ یہ سنتے ہی مشریع کو سیجین سخ پا ہو گئے اور انہوں نے نہایت سختی سے صدر ایوب سے کہا۔ ”مشریع شاستری ایک عظیم قوم کے مسلمہ اور عظیم لیڈر ہیں، ہم ان کی دل سے عزت کرتے ہیں۔ آپ کو یہ ہرگز نیب نہیں دیتا کہ میرے سامنے ان کی شان میں اس قسم کے گھٹیا الفاظ استعمال کریں۔“

مشریع بھٹو کا کہنا تھا کہ وزیر اعظم کو سیجین کی اس ایک ڈاٹ نے صدر ایوب کے دل و دماغ سے خود اعتمادی کا غباہہ بھک سے اڑا کر نکال باہر پھینکا، اور اس کے بعد وہ معالیہ تاشقند میں شاستری جی کی ہر ضد کے سامنے بلا پس و پیش ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔ تاشقند میں تو خیر جو ہوا سو ہوا لیکن اس میں شک نہیں کہ شروع ہی سے صدر ایوب کی نگاہ میں شری لال بادار شاستری کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جنوری ۱۹۶۵ء میں انہوں نے تقریباً تمام سیاسی پارٹیوں کی اجتماعی مخالفت کے باوجود مس قاطمہ جناح کے مقابلے میں صدارتی انتخاب جیت لیا تھا۔ اس مقابلے میں فیلڈ مارشل کو مس جناح سے تقریباً اکیس ہزار ووٹ نیاہ ملے۔ چنانچہ اب وہ اپنے آپ کو واقعی قوم

کا مسلمہ اور منتخب صدر سمجھنے لگے اور اپنے ہر قول و فعل کو ملک و قوم کی متفقہ آواز کی صدائے بازگشت قرار دینے لگے۔ اس پس منظر میں جس تناسب سے ان کے اندر خود اعتمادی کا احساس فروغ پاتا گیا، اسی رفتار سے ان کے اردوگرد ایسے خود غرض خوشامدیوں اور جی حضوریوں کا حلقة بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا جو چوب زبانی سے ان کی ہاں میں ہاں ملا کر انہیں صحیح یا غلط راہوں پر ڈالنا اپنے باسیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے تھے۔

صدراتی انتخاب جیتنے کے چند ماہ بعد رن آف کچھ کا سانحہ پیش آگیا۔ یہ تازعہ آٹھ دس برس سے چلا آ رہا تھا، لیکن بھارت نے اچانک یہ ازام تراشی شروع کر دی کہ کچھ آڑ بنا کر پاکستان گجرات میں زیر نہیں تبل کے کچھ علاقوں کو ہضم کرنا چاہتا ہے۔ بھارتی اور پاکستانی فوجوں کے درمیان ایک ہنگامی جھڑپ میں ہمارا پلہ کافی بھاری رہا اور ہندوستانی فوج کا کچھ ساز و سامان بھی ہمارے قبضہ میں آگیا۔ برطانیہ نے ٹالی اختیار کر کے ۳۵۰ مربع میل کا علاقہ پاکستان کے حوالے کر دینے کا فیصلہ دے دیا۔ اس پر بھارت میں بڑا شور و غونقا ہوا، اور وزیر اعظم لال بہادر شاستری پر کڑی نکتہ چینی شروع ہو گئی۔ ان واقعات نے صدر ایوب کے دل میں بھارتی فوج پر پاکستانی فوج کی برتری کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز تصورات کو جنم دیا اور لال بہادر شاستری کی قائدانہ صلاحیت ان کی نظر میں اور بھی زیادہ گر گئی۔ شاستری جی نے ایک موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ رن آف کچھ کے واقعہ کو ہرگز نہیں بھلا سکتے۔ بلکہ اپنی مرضی کے وقت اور مقام پر ۹ اس کا حساب ضرور بے باق کر کے رہیں گے۔

اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کی رفتار روز افزون بڑھتی ہی چلی گئی۔ ۱۹۴۵ء کے وسط ہی میں لال بہادر شاستری اور ان کے وزیر خارجہ نے ڈیکن کی چوٹ یہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ جموں و کشمیر کی بیاست بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور پاکستان کا اس کے کسی حصہ پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں۔

اس صورت حال میں صدر ایوب کو کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا؟ ۹ یہ معاملہ ازسر نو یو۔ این۔ او کی سیکورٹی کونسل میں لے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ امر یقینی تھا کہ اگر سیکورٹی

کونسل کوئی ایسا فیصلہ کرنا چاہتی جو بھارت کو ناقابل قبول ہوتا تو روس ضرور اس کے خلاف اپنا ویٹو استعمال کرتا۔ ۲۳ جون ۱۹۶۲ء تک روس پہلے ہی اس مسئلہ پر ہندوستان کے حق میں اور پاکستان کے خلاف ۱۰۰ مرتبہ اپنا ویٹو استعمال کر چکا تھا۔

ہندوستان کے ساتھ براہ راست یا کسی تیرے ملک کی نگرانی میں گفت و شنید کے ذریعہ مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنا بھی ایک دور از کار بات ہوتی۔ کیونکہ ماضی میں اس سلطے میں ہماری تمام کوششیں ناکام اور تنخ ثابت ہو چکی تھیں۔

جبکہ تک اس مسئلہ پر جنگ کرنے کا تعلق ہے، پہلے تو صدر ایوب جنگ کا نام لیتے ہی کافوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ یہی کما کرتے تھے کہ تازعہ کشمیر کا حل ہم نے پاکستان کے مفاد کی خاطر ڈھونڈھنا ہے۔ اس حل کی تلاش میں پاکستان کو داؤ پر نہیں لگانا، پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے یا کیک ایسے اقدامات شروع کر دیئے، جن کا قدرتی اور منطقی نتیجہ وہ جنگ تھی جو ستمبر ۱۹۵۶ء میں بھارت اور پاکستان کے درمیان لڑی گئی۔

یہ جنگ اب تک میرے لیے ایک معہد ہے۔ ان دنوں میں ہالینڈ میں بطور سفیر معین تھا۔ اس لیے اس جنگ کے اندر ہونی اسباب اور سیاق و سباق کا مجھے ذاتی طور پر کوئی علم نہیں ہے۔ اگر صدر ایوب چاہتے تو وہ نہایت آسانی سے اپنی کتاب ”جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی“ Friends not Masters میں خود اس موضوع پر خاطر خواہ روشنی ڈال سکتے تھے۔ یہ کتاب ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی تھی، اور دیباچہ میں ان کے اپنے بیان کے مطابق اس کا مسودہ ۱۹۶۵ء کے دوران بھی ان کے زیر غور تھا۔ یہ جنگ ان کے عہد صدارت کا ایک نہایت اہم تاریخی واقعہ تھا۔ اس لیے یہ امر میرے لیے باعث حیرت ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اگرچہ اس جنگ میں پوری پاکستانی قوم نے صدر ایوب کا بھرپور ساتھ دیا تھا، تاہم ممکن ہے کہ پچھے کی طرف مڑ کر وہ اس جنگ کو اپنی فوجی مہارت، تدریب، سیاسی بصیرت، دو اندیشی اور دانشمندی کا کوئی خاص امتیازی نشان نہ سمجھتے ہوں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ

جنگ بندی کے بعد معاهدہ تاشقند کے خلاف مسٹر بھٹو کی شدید مم کا سکھلم کھلا دو ٹوک مقابلہ کرنے سے وہ اپنے آپ کو کسی قدر قاصر پاتے ہوں۔ صدارت کی کرسی انسان کو با اختیار تو ضرور بنا دیتی ہے۔ لیکن بعض معاملات میں حالات کی نزاکت ان سے زبان بندی کا تقاضا بھی ضرور کرتی ہے۔

فوچی یا کسی دوسرے ادارے کی جانب سے ابھی تک اس جنگ کی کوئی مستند تاریخ تجزیہ اور جائزہ ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ رٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خاں کی کتاب (Round The First) اس موضوع پر ایک دلچسپ تفصیف ہے۔ اصغر خاں صاحب ایک چے دیانتدار اور پر خلوص انسان ہیں۔ اس لیے جو واقعات انہوں نے قلم بند کیے ہیں، انہیں صحیح اور معتبر تسلیم کرنے میں مجھے بالکل کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کی رائے کا توازن اعتدال کی حد سے باہر نکلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

مثلاً ایک مقام پر انہوں نے لکھا ہے کہ کمیم یا دوئم ستمبر ۱۹۴۵ء کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو چین کے وزیر خارجہ مارشل چن بی سے کراچی کے ہوائی اڈہ پر تھوڑی دری کے لیے ملے تھے۔ مارشل چن بی اس وقت پیرس جا رہے تھے۔ اس ملاقات کے بعد مسٹر بھٹو اور وزارت خارجہ کے سیکرٹری مسٹر عزیز احمد نے مارشل چن بی کے حوالے سے صدر ایوب کو یقین دلا یا تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں ہم اپنے گوریلا لڑاکوں، اور مجاہدین اور دیگر فوجی دستوں کو بھیج بھیج کر جو کاروانیاں جی چاہے کرتے رہیں، بھارت کسی صورت میں بھی یہ جرات نہ کرے گا کہ وہ بین الاقوامی سرحد توڑ کر پاکستان پر حملہ آور ہو۔ اس واقعہ کو مثال بنا کر اصغر خاں صاحب نے اپنی ذاتی رائے سے خود ہی یہ نتیجہ نکال لیا کہ بھٹو صاحب کو اپنی جگہ پر یقین تھا کہ ایسے حالات میں ہندوستان لازمی طور پر پاکستان پر براہ راست حملہ کرے گا۔ لیکن وہ جان بوجھ کر صدر ایوب کو گمراہی کے راستے پر ڈال رہے تھے۔ تاکہ ہندوستان کے ہاتھوں پاکستان کو شکست فاش نصیب ہو اور اس کے بعد بھٹو صاحب بذات خود پاکستان کی مند صدارت پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ ماروں

گھٹنا پھوٹے آئکھ۔ ریٹائرڈ ائیر مارشل کی یہ نرالی منطق میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ غالباً بھنو دشمنی کے اسی جذبہ بے نیام کے تحت اصغر خاں صاحب اپنی کتاب میں مزید فرماتے ہیں کہ برسر اقتدار آنے کے لیے ۱۹۷۵ء میں تو بھنو صاحب کے عزم شرمندہ تحریکیں نہ ہو سکے۔ لیکن چھ برس بعد ان کی آرزو پوری ہو گئی جب ۱۹۸۷ء میں پاکستان کو زردست فوجی تخلیق ہوئی، جزل سیکھی خاں معزول ہوئے، ملک دو نیم ہوا اور انعام کار مسٹر بھنو صدر اور چیف مارشل لاءِ ایڈمنیسٹریٹ کے عمدے سنہال کر برسر اقتدار آگئے۔ میں السطور غالباً ریٹائرڈ ائیر مارشل صاحب یہی تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کہ ذمہ داری تمام تر مسٹر ذوالقدر علی بھنو کی ذات پر تھی اور وہ اس تجزیہ کا روایتی میں ۱۹۷۵ء ہی سے مصروف عمل تھے۔

۱۹۷۵ء کی جنگ کی بابت ایک دوسری کتاب جو میری نظر سے گزری ہے، وہ جزل موسیٰ کی تصنیف "My Version" ہے۔ اس کتاب کو پڑھنا نہایت سخت ہے اور صبر آزا کوشش ہے۔ اس جنگ کے متعلق عوام الناس کے ذہن میں جو سوالات ہیں، یہ کتاب ان میں سے کسی کا بھی کوئی جواب فراہم نہیں کرتی اور کسی نکتے پر کوئی خاص یا مزید روشنی نہیں ڈالتی۔ پاکستان کی بری فوج کے ایک سابق کمانڈر اچیف کے قلم سے اس سے کہیں بہتر تحریر کی توقع رکھنی چاہیے تھی، خاص طور پر جو اس جنگ کے دوران بری فوج کا سربراہ بھی وہ چکا ہو۔

اس جنگ کے متعلق ان دو کتابوں کے علاوہ عوام اور خواص کے مختلف طبقوں میں طرح طرح کی قیاس آرائیوں کا کوئی شمار نہیں۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ جنگ قادیانیوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ اس لیے فوج کے ایک نہایت قابل قادیانی افسر یہجر جزل اختر حسین ملک نے مقبوضہ کشمیر پر تسلط قائم کرنے کے لیے ایک پلان تیار کیا جس کا کوڈ نام "جبرالز" تھا۔ صاحبان اقتدار کے کئی افراد نے ان کی مدد کی۔ ان میں مسٹر ایم ایم احمد سرفراست ہتائے جاتے ہیں جو خود

بھی قایانی تھے اور عمدے میں بھی پلانگ کمیشن کے ڈپٹی چیئر مین ہونے کی حیثیت سے صدر ایوب کے نمایت قریب تھے۔ جزل اختر ملک نے اپنے پلان کے مطابق کارروائی شروع کی اور اکھنور کو فتح کرنے کے قریب ہی تھے کہ فوج میں جزل موئی سمیت کئی اور جریل بھی تشویش میں پڑ گئے کہ اگر اختر ملک کی مہم کامیاب ہو گئی تو وہ ایک فوجی ہیرو کی حیثیت سے ابھریں گے۔ صدر ایوب سمیت غالباً باقی بہت سے فوجی اور غیر فوجی صاحبان اقتدار یہ نہیں چاہتے تھے کہ مجرم جزل اختر ملک اس جنگ کے ہیرو بن کر ابھریں اور فوج کے اگلے کمانڈر انچیف کے عمدے کے حقدار بن سکیں۔ کیونکہ یہ عمدہ صدر ایوب نے ذہنی طور پر پہلے ہی سے جزل بھی خان کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔ چنانچہ عین اس وقت جب مجرم جزل اختر حسین ملک انتہائی کامیابی سے چھمب اکھنور سکیڑ پر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں معاً ان کی کمانڈ سے ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ جزل بھی خان کو یہ کمانڈ سونپ دی گئی۔ غالباً اس لیے کہ وہ پاکستانی فوج کو اکھنور فتح کرنے کی کوشش سے باز رکھ سکیں۔ یہ فریضہ انہوں نے نمایت کامیابی سے سر انجام دیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ بھارت کے عزائم سے ہمارے فوجی اور سول ادارے اتنے بے خبر تھے کہ انہیں ہندوستان کے محلے کا اس وقت علم ہوا جب رات کے اندر ہرے میں بھارتی فوج ہماری سرحد کو پار کرنے کے بعد تیزی سے لاہور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اثنیلی جس یورو کے ایک اعلیٰ افسر نے مجھے خود بتایا کہ ان کا ایک ایجنس اپنے معمول کے مطابق سرحد کی طرف کسی خفیہ مشن پر جا رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ اگلی جانب سے تیز تیز روشنیاں بڑھتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ کسی قدر چھان بین کے بعد اسے معلوم ہوا کہ بھارتی فوج کے نیک سرحد پار کر کے لاہور پر چڑھائی کر رہے ہیں۔ وہ بھاگم بھاگ واپس آیا۔ اس نے اپنے کسی پولیس افسر کو یہ خبر دی، پولیس افسر نے کسی فوجی افسر کو ٹیلیفون کیا۔ فوجی افسر نے لاہور کے جی او سی کو جگا کر خبردار کیا،

کہتے ہیں کہ جی۔ او۔ سی نے فوری طور پر اس خبر کوچ ماننے سے کسی قدر بچکچاہت سے کام لیا۔

ایک بار میں نے نواب آف کالا باغ سے اس جنگ کے متعلق کچھ دیافت کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے فرمایا ”بھائی شب“، یہ جنگ پاکستان کی جنگ ہرگز نہ تھی۔ دراصل یہ جنگ اختر ملک، ایم۔ احمد۔ بھٹو، عزیز احمد اور نذیر احمد نے شروع کروائی تھی۔“

جب میں نے پوچھا، کہ جنگ شروع کرانے سے ان حضرات کا کیا مقصد تھا، تو نواب صاحب نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ ایوب خاں کو شکنخی میں کس کر اپنی طاقت بڑھانا چاہتے تھے۔ اس عمل میں اگر پاکستان کا ستیاہاں ہوتا ہے تو ان کی بلا سے۔“

میں بالکل نہیں کہہ سکتا کہ اصلی حقیقت کیا ہے۔ لیکن اس جنگ میں ہماری فوج کی ہائی کمائنڈ نے برسر عام اپنی ہمت، مہارت اور الہیت کا کوئی خاص مظاہرہ نہیں کیا۔ بھارتی حملے روکنے اور پسپا کرنے کا سرا ہماری ایئرفورس اور فوجی نوجوان افسروں اور جوانوں کے سر ہے جنہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر حریت انگلیز جوانمردی دکھائی اور بعض نے وطن عزیز کے دفاع میں جام شادت نوش کیا۔

پاکستان پر ہندوستان کے حملے کی خبر میں نے ہالینڈ کے دارالخلافہ ہیگ میں سب سے پہلے بی بی سی لندن کے ایک براڈ کاست میں سنی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانی ہائی کمائنڈ لندن کے ایک اعلان کے مطابق بھارتی افواج نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں نے فوراً ہالینڈ کے ریڈیو اور ٹی وی کے اداروں کو ٹیلیفون کیا اور درخواست کی کہ وہ فوراً اس خبر کی تقدیق یا تردید کر کے مجھے مطلع فرمائیں۔ چند منٹ کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ بھارت کے وزیراعظم لال بہادر شاستری نے لوک سمجھا میں یہ اعلان کیا ہے کہ لاہور ہندوستانی فوج کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ یہ سنتے ہی عفت بے اختیار رونے لگی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ تھوڑی دری کے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ باہر صوفی مشرف خاں اور ان کے مرید صوفی Witteveen

کھڑے تھے۔ صوفی (Witteveen) ایک عالم و فاضل پروفیسر تھے جو ان دونوں ہالینڈ کی کابینہ میں وزیر خزانہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ اندر آ کر وہ دونوں غمگینی کے عالم میں خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ عفت ان کی خاطر و مدارت کے لیے ایک ٹرالی میں چائے وغیرہ کے لوازمات سجا کر لے آئی صوفی مشرف خان بولے۔ ”بیٹی“ اس سے غم کھانے کے علاوہ اور کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔“

عفت پھر رونے لگی اور سکیاں بھرتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی۔ صوفی مشرف خان اسے دلasse دینے اس کے پاس ہی نہیں پر آ بیٹھے۔ اپنے پیر و مرشد کی پیروی میں ولندیزی وزیر صاحب بھی کری چھوڑ کر نیچے آ بیٹھے۔ میں بھی انہیں کے حلقے میں شامل ہو گیا، کچھ دری ہم یونی خاموش اور غمگین نہیں پر بیٹھے رہے۔ پھر اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میرا جی نہ چاہتا تھا کہ میں اٹھ کر ٹیلیفون سنوں۔ اگر لاہور ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو اب نہ جانے کس دوسرے شر کی خبر ہمارے کانوں میں پڑے۔ میں اسی شش و نیج میں تھا کہ ڈچ وزیر صاحب نے اٹھ کر ٹیلیفون سنا اور پھر عربی میں الحمد للہ الحمد للہ، سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے ہوئے میرے ساتھ لپٹ گئے اور بولے کہ ڈچ ریڈیو نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ لاہور کے متعلق بی بی سی کی خبر اور لال بہادر شاستری کا اعلان بالکل غلط اور جھوٹ ہیں۔ ہندوستان نے بغیر اعلان جنگ کے پاکستان پر حملہ ضرور کیا ہے لیکن پاکستانی افواج نہایت بہادری سے ہر مجاز پر ان کا بھر پور مقابلہ کر رہی ہیں۔

کئی گھنٹوں کی تگ و دو کے بعد بڑی مشکل سے ٹیلیفون کے ذریعہ میرا رابطہ پہلے اپنے وزیر خارجہ مسٹر بھٹو اور پھر صدر ایوب کے ساتھ قائم ہوا۔ دونوں کی آواز میں ہمت اور خود اعتمادی کا وزن تھا۔ ان کی ہدایات کے مطابق اگلے روز میں نے ہالینڈ کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ سے ملاقات کی۔ ان دونوں نے نہایت خوشی سے وعدہ کیا کہ یو، این، او اور سیکیورٹی کونسل میں جمال کمیں بھی ضرورت پڑی، وہ پاکستان کی بھر پور حمایت

کریں گے۔ وزیر خارجہ نے تو میری موجودگی ہی میں نیویا رک ٹیلیفون کیا اور یو۔ این۔ او میں ہالینڈ کے نمائندے کو اس بارے میں نہایت واضح ہدایات دے دیں۔

اسی شام ہالینڈ کی ایک بہت بڑی صنعت کے چند انجینئرنگ ہمارے سفارتخانے میں آئے اور ہمارے ڈارنسگ روم میں چند ایسے حاس آلات نصب کر گئے جن کا ایک بٹن با کر ہم ریڈیو پاکستان کی نشریات کسی وقت بھی نہایت آسانی سے سن سکتے تھے۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ یہ بندوست ہماری سولت کے لیے میرے ولندریزی دوست اور وزیر کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔

اس کھن آنائش کے عین دوران ہمارے دیرینہ آقا اور مری امریکہ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان کو ہر قسم کا جنگی سامان فراہم کرنا بند کر دیا جائے۔ اس وقت بھی ہالینڈ کے وزیر خزانہ مسٹر (Witteveen) نے چند فوری ضروریات پورا کرنے میں ہماری کافی مدد فرمائی۔ یہ سامان میری طرف سے Diplomatic Bags کی حیثیت سے کے۔ ایل۔ ایم کے عام پروازوں سے وزیر خارجہ ذوالقدر علی بھٹو کے نام کراچی پہنچایا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ فقط کاغذات کے تھیلے نہ ہوتے تھے۔

اس جنگ کے دوران ایران اور ترکی نے بھی حسب توفیق ہماری مدد کی، لیکن انڈونیشیا کے صدر ڈاکٹر احمد سوینکارنو نے کئی لڑاکا ہوائی جہاز، چند میزائل بردار سمندر جہاز اور دو جنگی آبدوزیں فراہم کر کے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ چین نے بھارت کے ساتھ شمالی سرحدوں پر اپنی فوجوں کے اجتماع کا مظاہرہ کر کے اور ہندوستان کو ایک سخت الٹی میثم دے کر اس جنگ کا نہ صرف رنگ بدلنے کی دھمکی دی بلکہ ہمارے ساتھ اپنی گھری دوستی کا عملی ثبوت بھی دیا۔

اس کے برعکس امریکہ اور برطانیہ کا رویہ ہمارے ساتھ بالکل مختلف تھا۔ میں نے سنا ہے کہ جس شب ہندوستان نے لاہور کی جانب اپنا حملہ شروع کیا تھا، اسی صحیح سب سے پہلے امریکن سفیر راولپنڈی کے ایوان صدر میں آ دھکے۔ اس وقت غالباً صدر ایوب ناشہ کر رہے تھے۔ سفیر صاحب اپنے ہاتھوں کا ٹکنچہ سا بنا کر صدر ایوب کی گردان کے قریب

لے گئے اور کسی قدر سخت لمحے میں بولے۔ ”مسٹر پرینڈنٹ“ ہندوستان نے آپ کو گلے سے دبوچ رکھا ہے۔ ان کے ساتھ صلح کرنے میں جلدی کیجیے۔“ برطانوی ہائی کمشنر مورس جیمز بھی وقفہ فوقہ کبھی سکھلم کھلا، کبھی چوری چھپے صدر ایوب سے ملتے رہتے تھے، اور ہندوستان کے ساتھ کسی قمیت پر بھی جنگ بند کرنے کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔

ہالینڈ میں بیٹھ کر پہلے چند روز تو جنگ کا نقشہ ہمارے حق میں بڑا حوصلہ افزا نظر آتا رہا۔ لیکن پھر یاکیک جمود کی کمر چھا گئی، اور اس کے بعد طرح طرح سے جنگ بندی کی باتیں سننے میں آنے لگیں۔ اسی زمانے میں افغانستان کا ایک دو رکنی وفد کسی تجارتی مشن پر ہیگ آیا ہوا تھا۔ ایک لپخ کی دعوت میں میری ان سے ملاقات ہوئی، تو میں نے وفد کے سربراہ سے پوچھا کہ پاکستان ہندوستان کے ساتھ جنگ کی مصیبت میں جتنا ہے۔ ایسے نازک زمانہ میں افغانستان میں عام لام بندی اور فوجی ملانیں کو فوری طور پر رخصت سے واپس بلا لینے کے اعلان کی وجہ سے ہماری تشویش میں بہت نیاہ اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ افغانی وزیر صاحب صرف فارسی اور فرانسیسی زبان بولتے تھے۔ ان کے مترجم نے کہا کہ وفد کے رئیس آپ کی بات کا شلفی جواب دینا چاہتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہوٹل میں اپنے کمرے میں انتظار کریں گے۔ آپ وہاں تشریف لے آئیں اور ہمارے ساتھ کافی نوش فرمائیں۔

لپخ کے فوراً بعد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ نہایت مروت اور شفقت سے پیش آئے۔ ان کے ساتھ میں کوئی پون گھنٹہ رہا۔ اس عرصہ میں انہوں نے اپنی گفتگو میں جو کچھ فرمایا، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح کا تھا کہ بیاستوں کے درمیان سیاسی تعلقات ہوتے ہیں، مسلمانوں کے درمیان اسلامی تعلقات ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر ہماری بیاست چاہے بھی تو ہمارے مسلمان عوام ہمیں ہرگز یہ اجازت نہ دیں گے کہ ہم ایسے نازک موقع پر اپنے اسلامی برادر ملک پاکستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیں۔ اس وقت افغانستان میں جو اقدامات آپ کے لیے باعث تشویش نظر آ رہے ہیں، وہ ہمارے اندر ہوئی

اور کچھ بیرونی سیاسی تقاضے ہیں۔ ان کی وجہ سے آپ کے دل میں پاکستان کے لیے کوئی مزید خطرہ ہرگز نہ ابھرنا چاہیے۔ عام طور پر افغانیوں کی سیاسی اور سفارتی گفتگو کسی قدر ذو معنی یا مہم یا پیچدار ہوا کرتی ہے۔ لیکن اس گفتگو میں مجھے کسی قدر خلوص کے رنگ کی جھلک محسوس ہوئی۔ گھر آتے ہی میں نے راولپنڈی میں صدر ایوب کے ساتھ ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا۔ اس وقت پاکستانی نامم کے مطابق رات کے تقریباً دس یا پونے دس بجے ہوں گے، لیکن صدر ایوب کی آواز میں غیر معمولی تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے انہیں افغانی وزیر کے ساتھ اپنی گفتگو کا لب لباب سنایا، تو وہ چڑھے گئے اور تیز لمحے میں صرف اتنا کہہ کر ٹیلیفون بند کر دیا: ”یہ ایک چال بھی ہو سکتی ہے، ہر ایسے غیرے نتوخیرے کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر میں پاکستان کو تباہی کے عار میں ہرگز نہیں دھکیل سکتا۔“

صدر ایوب کی اس جنبلاہت، اور اس غصیلے رویے سے یہی اندازہ لگتا تھا کہ وہ کسی شدید ابھن میں مبتلا ہیں، اور جنگ کے غیر معمولی تقاضوں کے سامنے بے اختیار ہتھیار ڈالنے والے ہیں۔ اس کے بر عکس جب ہم ٹیلوویژن پر وزیر خارجہ مسٹر بھشو کو یکیوپلی کونسل میں بڑھ چڑھ کر جوشیلی تقریس کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو صورت حال بالکل مختلف نظر آتی تھی۔ مملکت کا سربراہ جلد از جلد جنگ بندی کی طرف مائل تھا۔ لیکن ان کا وزیر خارجہ اقوام متحده کی کونسل میں ہندوستان کے ساتھ طویل سے طویل یہاں تک کہ ہزار سالہ جنگ تک کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس تضاد اور تصادم میں قدرتی طور پر پہ صدر ایوب کا ہی بھاری رہا۔ اور ۲۳ ستمبر کو جنگ بندی کا اعلان ہو گیا۔ جس طرح اس جنگ کے آغاز کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں وقہ فوقة اڑتی رہتی ہیں، اسی طرح اس کے اچانک اختتام پر بھی مختلف قسم کی قیاس آرائیوں کی گنجائش موجود ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کے دباو میں آ کر صدر ایوب حوصلہ ہار بیٹھے تھے۔ کسی کا خیال ہے کہ ہماری فوجی ہائی کمانڈ بھی اس لڑائی کا بوجھ

اٹھانے سے مendum تھی، اور جلد از جلد اس جنگ کے جنجال سے باہر نکلنا چاہتی تھی، وغیرہ۔

سیز فائز کے اعلان کے بعد مسٹر بھٹو نیویارک سے واپسی پر لندن سے گزرے۔ لندن سے پاکستان جانے کے لیے وہ ایک ایسے ہوتی جہاز میں بیٹھے جو ہالینڈ کی ائیرپورٹ ایمسٹرڈم پر بھی رکتا تھا۔ ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈے پر اتر کر انہوں نے مجھے ہیگ میں ٹیلیفون کر کے کہا۔ ”میں یہاں پر صرف تم سے ملنے اترا ہوں۔ فوراً ائیرپورٹ پر آ جاؤ۔ اپنے سفارتخانے والوں کو ہرگز نہ بتانا کہ میں یہاں اترا ہوں۔ تم اکیلے آ جاؤ۔“

میں جلدی جلدی کار میں بیٹھ کر ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈے پر پہنچا جو ہیگ سے بیس پچھیں کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ نہایت وسیع و عریض ائیرپورٹ ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ مسٹر بھٹو کو یہاں پر کسی خاص جگہ تلاش کروں کہ کے ایل ایم کے دی آئی پی مسافروں کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون میری طرف بڑھی اور بولی۔ ”آئیے،“ میں آپ کو آپ کے فارن مسٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔“

راستے میں اس خاتون نے کہا کہ جس جہاز سے مسٹر بھٹو کراچی جا رہے ہیں، وہ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد روائی کے لیے تیار ہے۔ انہیں دس منٹ بعد ضرور جہاز پر سوار ہو جانا چاہیے۔ آپ ان کے ساتھ یہڑیوں تک جا کر الوداع کہہ سکتے ہیں۔“ میں نے بھٹو صاحب کو یہ بات بتائی تو وہ بولے۔ ”دراصل میں صرف دس بارہ منٹ باتیں کرنے کے لیے یہاں نہیں رکا۔ کیا یہ خوبصورت خاتون ایسا بندوبست نہیں کر سکتی کہ میں دو تین گھنٹے بعد کسی اور فلاٹ سے کراچی روانہ ہو سکوں۔“

کے ایل ایم کی میزبان خاتون نے مسکرا کر کہا۔ ”نو پر ابلم سر۔ اپنا نکٹ مجھے دیجئے۔ میں ابھی سارا انتظام کر کے آتی ہوں۔“

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بھٹو صاحب کا سامان نکلوایا اور تین گھنٹے بعد شام کے ساڑھے سات بجے ایک دوسری ہوائی کمپنی کی پرواز میں کراچی کے لیے ان کی نشت بھی محفوظ کرالی۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ ”اگر آپ یہ وقفہ ائیر پورٹ پر ہی گزارنا چاہیں تو

ہمارا وی آئی پی ریسٹ روم حاضر خدمت ہے۔

بھٹو صاحب نے کہا۔ ”شکریہ“ ہم کچھ دیر کے لیے باہر گھونٹنے جائیں گے۔ یہ خیال رکھئے کہ میں یہاں پر صرف اپنی ذاتی حیثیت سے رکا ہوں اس لیے پریس اور پروٹوکول والوں کو خبر نہ دیں، تاکہ ان کی خواہ مخواہ زحمت نہ ہو۔“

”نو پر ابلم سر۔“ میزبان خاتون نے کہا۔ ”لیکن آپ سات بجے تک ضرور واپس آ جائیں۔ میں آپ کا سامان اگلی فلاٹ میں رکھوا کر آپ کے بورڈنگ کارڈ کے ساتھ اسی جگہ آپ سے ملوں گی۔“

ایئر پورٹ سے باہر آ کر میں نے بھٹو صاحب سے گلہ کیا کہ اگر وہ لندن سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے ٹیلیفون کر دیتے تو میں یہ سارے انتظامات پہلے ہی سے کروا رکھتا۔ وہ بولے کہ یہاں کچھ دیر رکنا ان کا ذاتی فیصلہ تھا اور وہ اس کا چرچا کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ میری کار کا ڈرائیور کیا کیا زیانیں جانتا ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ وہ ہمارے سفارت خانے میں بالکل نیا ملازم ہوا ہے، صرف ولندزی زبان جانتا ہے۔ ابھی تک اردو اور انگریزی سے قطعی تاواقف ہے۔

”بس یہ ٹھیک ہے“ بھٹو صاحب خوش ہو کر بولے۔ ”اب دو ڈھائی گھنٹے مجھے اپنی کار میں ایکسٹرڈم کی سیر کراؤ اور ہوائی جہاز کے وقت پر واپس ائیر پورٹ پہنچنا دو۔“ ڈرائیور کو تاکید کر کے کہ ہم نے سات بجے سے پہلے واپس ائیر پورٹ پہنچنا ہے، ہم دونوں کار میں بینہ گئے۔ کار ایکسٹرڈم کے خوبصورت اور خوشنما علاقوں سے گزرتی رہی لیکن مشرب بھٹو نے کسی منظر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ وہ لگاتار بولے چلے جا رہے تھے اور ان کے سینے میں دبا ہوا تنقیوں کا لاوا ان کی گفتگو کی روانی میں بہہ بہہ کر مسلسل باہر نکل رہا تھا۔ اس میں صدر ایوب اور چند فوجی جرنیلوں کی کم ہمتی، کوتاہ انسٹی اور فن حرب کی مہارت کے فقدان کا روٹا تھا، جنگ کے دوران چیڈہ چیڈہ موقع پر ہماری حربی حکمت عملی کی ناکامیوں کا بیان تھا۔ قبل از وقت جنگ بندی پر کڑی نکتہ چینی تھی اور غالباً سانس لینے کے لیے وہ بار بار شیپ کا یہ بند دھراتے تھے

کہ پہاڑ جیسی غلطیوں اور بلاوجہ ناکامیوں کے اس کاروبار میں وہ صدر ایوب کا مزید ساتھ نہیں دے سکتے، انہوں نے دو ٹوک طور پر تو یہ بات نہیں کی تھی لیکن ان کی گفتگو کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صدر ایوب کی کابینہ سے باہر نکلنے کے لیے پر توں رہے ہیں۔ اور مستقبل کے لیے اپنا ایک الگ سیاسی لائچہ عمل وضع کرنے کی فکر میں ہیں۔

ان کی باتیں سنتے سنتے میں اس شش و پیش میں بیٹھا رہا، کہ وہ ایمیڈم میں رک کر خاص طور پر میرے سامنے یہ گفتگو کیوں کر رہے ہیں؟ ایک خیال تو مجھے یہ آیا کہ شاید وہ اپنے یہ خیالات صدر ایوب تک پہنچانے کے لیے مجھے آلہ کار بنانا چاہتے ہوں۔ دوسری بات مجھے یہ کھلکھلی کہ شاید وہ اپنے نئے سیاسی لائچہ عمل کے بارے میں مجھ سے کوئی رائے یا مشورہ لینے آئے ہوں۔ میں نے اپنے یہ دونوں مفروضے ان کو بتائے تو وہ ہنئے لگے اور میرا ہاتھ دبا کر بولے۔ ”ارے بھائی میں ان میں سے کسی مقصد کے لیے نہیں آیا۔ میں صرف اس لیے یہاں رکا ہوں کہ تمہارے ساتھ صاف گوئی سے باتیں کر کے اپنے دل کا غبار نکال لوں کیونکہ مجھے مکمل اعتماد ہے کہ تم میری باتیں اپنے تک ہی رکھو گے اور ان کا کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ گے۔“

مجھے خوشی ہے کہ میں نے بھتو صاحب کے اعتماد کو پورا پورا نبھایا، اور آج اس واقعہ کو قلم بند کرنے سے پہلے کسی کے ساتھ اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

کار میں بیٹھے بیٹھے ہم دونوں اس گفتگو میں اس درجہ محو تھے کہ ہمیں وقت کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ میں نے گھری دیکھی تو سائز چھ بجے کا عمل تھا۔ ابھی ائیرپورٹ چار پانچ میل دور تھی اور ہماری کار نہایت سست رفتاری سے سڑک پر رینگتی ہوئی جا رہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کے ہجوم کا وقت (Rush Hour) اپنے عروج پر تھا اور ہم اپنے آگے پیچھے، داسیں باسیں ہزاروں موڑکاروں کے اٹڈہام میں بری طرح گھرے ہوئے تھے۔ ان حالات میں ہمیں ائیرپورٹ تک پہنچنے میں کئی گھنٹے لگنے کا اندیشہ تھا۔ ڈرائیور نے عکنندی سے کام لیا اور کار کی ہنگامی بیان ٹھیما کر ایک ٹریفک سارجنٹ کو اپنی طرف

متوجہ کیا، پھر گاڑی سے اتر کر اس نے ٹریفک سارجنس سے کچھ گفتگو کی اور دیکھتے ہی دیکھتے موڑ سائیکلوں پر سوار ٹریفک پولیس کے چند سپاہیوں نے ہماری کار کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ فائر بر گیڈ کی طرح ہنگامی سائز بجائے وہ ہمارے آگے پیچھے تیز رفتاری سے روانہ ہو گئے۔ ان کی آواز پر سڑکوں پر چھایا ہوا ہجوم چھتا گیا اور ہم ٹریفک کی سرخ بیوں سے بھی گزرتے ہوئے چند منٹ میں ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ وہاں پر ڈچ وزارت خارجہ کے ایک پرونوکول افسر نے لپک کر بھنو صاحب کا خیر مقدم کیا۔ کے۔ ایل۔ ایم کی میزبان خاتون نے معدہ رتائی انداز میں کہا۔ ”سر میں نے کسی کو آپ کے متعلق بالکل کچھ نہیں بتایا۔ آپ مشہور شخصیت ہیں، آپ کی نقل و حرکت سب کو معلوم ہو جاتی ہے۔“

جنگ بندی کے بعد ہی یہ خبریں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں کہ روس یہ کوشش کر رہا ہے کہ قفیہ کشمیر اور جنگ سے پیدا شدہ دیگر مسائل حال کرنے کے لیے وہ اپنی گمراہی میں بھارت اور پاکستان کے مذاکرات کروائے۔ رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوا کہ مذاکرات منعقد ہونے کے لیے تاشقند کا مقام تجویز ہو رہا ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے صدر ایوب کو ایک طویل خفیہ تاریخی کہ اگر واقعی ایسی کوئی تجویز آپ کے زیر غور ہے تو آپ اسے فوراً روکر دیں۔ کشمیر کے تبازعہ میں روس ہمارے خلاف اور ہندوستان کے حق میں بار بار اپنا ویٹو استعمال کر چکا ہے۔ اب روس کی سرکردگی میں اور اس کی سرنیشن پر اس بارے میں جو بھی مذاکرات ہوں گے، ان میں حالات اور ماحول کا نیا وہ سے نیا وہ دباؤ اور جھکاؤ بھارت ہی کے حق میں جانے کا خدشہ ہے۔ اگر ہم نے اس دباؤ اور جھکاؤ کے خلاف نیا وہ ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی تو یقیناً روس ہمارا مزید دشمن ہو جائے گا۔ ہمارے موجودہ حالات میں ہمیں روس کی مزید دشمنی مول لینا ہرگز مناسب نہیں۔

اس تاریخی دوسری بات میں نے یہ لکھی تھی کہ اب تک تبازعہ کشمیر کی اصلی عدالت یو۔ این۔ او کی سیکیورٹی کونسل رہی ہے، وہیں پر تمام بحث مباحثے ہوئے ہیں اور وہیں

پر سب قرار دادیں منظور ہوئی ہیں جو تمام کی تمام ہمارے حق میں ہیں۔ ہمارے مفادات کا تقاضا ہے کہ ہم یہ مقدمہ اسی عدالت میں قائم رہنے دیں۔ اگر ایک بار یہ معاملہ کسی اور فورم مثلاً تاشقند میں منتقل ہو گیا تو اس کی نوعیت بالکل بدل جائے گی۔ یکیوٹی کونسل کی تمام پچھلی قراردادیں متروک الاستعمال ہو جائیں گی اور رفتہ رفتہ فرسودگی اور دینیانویت کی گرد میں دب کر عملًا منسوخ اور کالعدم سمجھی جائیں گی۔ مستقبل میں ہمارے پاس کشمیر کی بابت صرف وہی حوالہ باقی ہے جائے گا جو مذکرات تاشقند فراہم کریں گے۔ ایسی صورت حال ہمارے موقف کشمیر کے لیے انتہائی زوال پذیر رجعت پذیری ثابت ہو گی۔

اس تاریخی میں تیری بات یہ درج تھی کہ کشمیر کے معاملے میں اگر روس بھارت اور پاکستان کے مابین اپنی خیر سکالی کا مظاہرہ کرنا ہی چاہتا ہے، تو یہ مذکرات یو۔ این۔ او میں یکیوٹی کونسل کے زیر انتظام منعقد ہونے چاہیں۔ وہاں پر روس کو بھی ضرور خصوصی طور پر مدعو کیا جائے تاکہ وہ اپنی خیر سکالی کا برہما عمل اظہار کرنے میں پورا پورا آزاد ہو۔

صدر ایوب نے تو میری اس ٹیلیگرام کا کوئی جواب نہ دیا، لیکن چند روز بعد ہماری وزارت خارجہ سے میرے نام ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ میری تاریخ پڑھ کر صدر ایوب نے اس پر یہ نوٹ تحریر فرمایا تھا۔

“There is a Lot of Sense in what he says?”

صدر کا یہ نوٹ پڑھ کر مجھے ہلکی سی امید بندھ گئی کہ شاید میری معرفات نے ان کے دل پر کچھ اثر کیا ہے اور وہ میرے مشورے پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہوں گے۔ لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی، کیونکہ چند ہفتوں کے بعد یہ خبر آئی کہ ۳ جنوری ۱۹۶۶ء کو پاکستان کا وفد صدر ایوب کی قیادت میں تاشقند پہنچ گیا ہے۔ بھارتی وفد کے سربراہ وزیر اعظم لال بہادر شاستری تھے۔

مذکرات تاشقند آٹھ روز جاری رہے اس موضوع پر بھی کوئی مستند اور جامع دستاویز ابھی

تک ہمارے سامنے نہیں آئی۔ چند راویوں سے جو ہمارے وفد میں شامل تھے، میں نے اتنا سنا ہے کہ ابتدائی چند ایام تعطل کا شکار رہے۔ کیونکہ شاستری جی نے ان مذاکرات میں کشمیر کا ذکر شامل کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ کشمیر پہلے ہی سے طے شدہ مسئلہ ہے، اور یہ مذاکرات صرف ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ہو رہے ہیں جو حالیہ جنگ سے پیدا ہوئے ہیں۔ غالباً روسیوں کی مداخلت سے شاستری جی کسی قدر چیزے اور پاکستانی وفد کو ان مذاکرات کے دوران کشمیر کا نام لینے کی اجازت مل گئی۔ البتہ بھارتی وزیراعظم کا روایہ بدستور سخت اور بے لوج رہا، ان کے نزدیک یہ مسئلہ طے ہو چکا ہوا تھا اور اب اسے ازسر نو چھیڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کا خیال تھا کہ ایسے حالات میں یہ مذاکرات بے مقصد ہوں گے اور پاکستانی وفد کو بغیر کوئی معاملہ کیے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ شروع میں صدر ایوب بھی غالباً اسی خیال سے متفق تھے۔ لیکن روی وزیراعظم مسٹر کوہیجن نے صدر ایوب سے پے در پے چند ملاقاتیں کر کے ان پر کچھ ایسا جادو کیا کہ ان کا روایہ ڈرامائی طور پر بدل گیا۔ اور وہ وفعہ اس بات کے حاصل ہو گئے کہ کسی معاملہ پر دستخط کیے بغیر ہمیں تاشقند سے واپس جانا نیب نہیں دیتا۔

مذاکرات کے دوران کسی نکتے پر مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کو کچھ مشونہ دینے کی کوشش کی تو صدر کا ناریل اچانک چٹھ گیا۔ انہوں نے غصے میں مسٹر بھٹو کو اردو میں ڈانٹ کر کہا ”لو کے پٹھے بکواس بند کرو۔“

مسٹر بھٹو نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا ”سر، آپ یہ ہرگز فراموش نہ کریں کہ روی وفد میں کوئی نہ کوئی اردو زبان جانے والا بھی ضرور موجود ہو گا۔“

میرا اندازہ ہے کہ غالباً یہی وہ نکتہ آغاز ہے جہاں سے صدر ایوب اور ذوالقدر علی بھٹو کے راستے عملی طور پر الگ الگ ہو گئے۔

وزیراعظم کو سیگن نے صدر ایوب پر کیا جادو چلایا یا کیا دباؤ ڈالا، اس کا ہمیں اب تک

کوئی سراغ نہیں ملا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں رہنماؤں کی ایک یا دو ملاقاتیں ایسی تھیں جن میں ہمارے وفد کا کوئی اور رکن موجود نہ تھا۔ شاید اسی بات کی آڑ لے کر مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کے خلاف اپنی مضم میں یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ معالہہ تاشقند میں کچھ ایسے امور بھی پوشیدہ ہیں جو ابھی تک صیغہ راز میں ہیں اور وہ بہت جلد ان کا بھانڈہ پھوڑنے والے ہیں۔ میرے خیال میں یہ حض ایک سیاسی شعبہ بازی تھی جسکا مقصد صدر ایوب پر ایک عامیانہ الزام تراشی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یوں بھی صدر ایوب کی معزولی کے بعد مسٹر بھٹو نے اس تھمت کی طرف اشارة تک کرنا چھوڑ دیا تھا، کیونکہ انہیں بخوبی علم تھا کہ یہ الزام شروع ہی سے بے بنیاد تھا۔

۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو وزیراعظم شاستری اور صدر ایوب نے معالہہ تاشقند پر دستخط کر دیئے اور مسٹر کوسیجن نے اس پر اپنی گواہی ثبت کر دی۔ اس کے بعد خوشی منانے کی غرض سے دو تقریبات منعقد ہوئیں۔ ایک تو میں الاقوامی صحافیوں کی پریس کانفرنس کا استقبالیہ۔ دوسرا مسٹر کوسیجن کا دونوں وفود کے لیے ایک شاندار ڈنر۔ ان دونوں تقریبات میں پاکستانی وفد کے اراکین کسی قدر بجھے بجھے اور افسرہ دل تھے۔ لیکن بھارتی اراکین خوشی سے پھولے نہ ساتے تھے، اور پھدک پھدک کر، چمک چمک کر اپنی شادمانی اور سرسرت کا بر ملا اظہار کر رہے تھے۔ لال بہادر شاستری صاحب بھی فخر و انبساط سے سرشار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈنر کے بعد جب وہ اپنے والا (Villa) میں واپس گئے تو کچھ دری ٹیلیفون پر ولی سے باتیں کرتے رہے۔ غالباً اپنی کامیابی اور فتحیابی کی خبر دے رہے ہوں گے۔ اس کے بعد شادی مرگ نے انہیں آ دیوچا اور دو تین گھنٹوں کے اندر اندر دل کی حرکت بند ہو جانے سے وفات پا گئے۔

دو تین روز بعد ہائینڈ کے ایک اخبار میں معالہہ تاشقند کی تفصیلات پڑھیں۔ ساتھ ہی ایک فونو دیکھی جس میں صدر ایوب روی وزیراعظم کے ہمراہ لال بہادر شاستری کے تابوت کو کندھا دے کر ولی جانے والے ایک جہاز کی طرف جا رہے تھے۔ اس تابوت میں صرف شاستری جی کا جسد خاکی ہی نہ تھا۔ بلکہ اس میں مسئلہ کشمیر پر یو۔ این۔ او میں ہماری

تمام پیش رفت بھی پیٹ کر مغل کر دی گئی تھی۔ کیونکہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء کے بعد مسئلہ کشمیر کا حوالہ یکیوائی کونسل کی قرار دادیں نہ رہی تھیں، بلکہ معاهدہ تاشقند کی وجہ سے گئی تھی جس میں یاست جموں و کشمیر کا ذکر محض ضمی طور پر اس طرح آیا تھا:

"The prime Minister of India and the President of pakistan agree that both sides will exert all efforts to create good neighbourly relations between India and Pakistan in accordance with the United Nations Charter, they reaffirm their obligation under the Charter not to have recourse to force and settle their disputes through peaceful means."

"They considered that the interest of peace in the region and particularly in the Indo-Pakistan Subcontinent and indeed the interests of the people of India and pakistan were not served by the continuance of the tension between the two countries. It is against this background that Jammu and Kashmir was discussed, and each of the sides put forth its respective position."

### ہندوستان کے علاوہ معاهدہ تاشقند کا اصلی میر

روس کے حصے میں بھی آیا۔ یہ مذاکرات اپنی سرنیمن پر منعقد کرنے میں روس کی پیش قدی میں غالباً یہ دعویٰ بھی مضر تھا کہ حق ہمسایگی کے طور پر جنوبی ایشیا کے معاملات اس کے حلقة اثر کا جزو لا یقیک ہیں۔ سپر پاور کے درمیان دنیا میں اپنے اپنے حلقة اثر کی بذریعت کے حوالے سے یہ بات انتہائی اہمیت کی حالت ہے کہ امریکہ نے روس کے اس خاموش لیکن واضح دعوے کو بلا چوں و چرا تسلیم بھی کر لیا۔

۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء کو مسئلہ کشمیر معاهدہ تاشقند کے تابوت میں ڈال دیا گیا تھا۔ چھ برس بعد

۱۹۷۲ء کو معاهدہ شملہ نے اس تابوت میں ایک اور کیل ٹھونک دی۔ یہ کیل ان الفاظ کے ساتھ گاڑی گئی تھی:

In Jammu and Kashmir, the Line of Control resulting from the cease fire of December ۱۹۷۱ shall be respected by both sides without prejudice to the recognised position of either side. Neither side shall seek to alter it unilaterally, irrespective of mutual differences and legal interpretations. Both sides further undertake to refrain from threat or the use of force in violation of this Line.

اس کے بعد رفتہ رفتہ اب یہ نوبت آگئی ہے، کہ اگر ہم کسی بین الاقوامی پلیٹ فارم پر تنازعہ کشمیر کا نام تک بھی لیں، تو بھارتی حکمران سخن پا ہو کر ہم پر گرفتنے برئے لگتے ہیں کہ ہم ان کے اندر وہی معاملات میں دخل اندازی کیوں کر رہے ہیں؟ مجموعی طور پر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ فیلڈ مارشل ایوب خاں کے عمد کا ایک انتہائی اہم سنگ میل ہے۔ اس موقع پر پوری قوم نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ لیکن ان کے فوجی مشوروں کی ہمت اور الیت قوم کی توقعات پر پوری نہ اتر سکی۔ ان کے دریںہ حلیف امریکہ اور برطانیہ نے ان کے ساتھ بے وفائی کی۔ تاشقند میں روس نے ان پر یقیناً کسی نہ کسی قسم کا دباؤ ڈالا۔ معاهدہ تاشقند میں مسئلہ کشمیر کو اس کی بنیادی پسزی سے اتار کر کھٹائی میں ڈال دیا گیا۔ اس کے خلاف ملک میں شدید رو عمل کی رو ابھری۔ اور اسی کے ساتھ صدر ایوب کے زوال اقتدار کے آثار مرتب ہونا شروع ہو گئے۔

## ○ امریکہ

اقتدار میں آنے سے بہت عرصہ قبل ہی ایوب خاں صاحب امریکہ پرستی کے بین الاقوامی فیشن ایبل مرض میں بیٹلا ہو چکے تھے۔ بری افواج کے کمانڈر انجیف کی حیثیت سے انہوں نے پاکستانی حکومت سے بالا بالا واشنگٹن میں امریکی فوجی ہیڈ کوارٹر Pentagon سے

نہایت گھرے دوستانہ روابط قائم کر رکھے تھے۔ امریکی فوجی لیڈروں کے اثر و رسوخ کے تحت اور ان کی رہنمائی میں ہمارے کمانڈر انچیف نے اپنی افواج کو اس طور پر منتظم آراستہ اور مسلح کرنا شروع کیا کہ آئندہ ہمیں امریکہ کی فوجی امداد کے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا یا تبادل دفاعی حکمت عملی اختیار کرنا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا۔ ۱۹۵۵ء میں امریکہ نے ”بغداد پیکٹ“ کے نام سے مشرق وسطی میں روس کے خلاف مجاز آرائی کا ڈول ڈالا تو دنیاۓ عرب میں اس کے خلاف شدید رو عمل پیدا ہوا۔ ایران اور ترکی پہلے ہی اپنے طور پر امریکہ کے سامنے زانوئے ادب تھے کئے بیٹھے تھے۔ اس لیے ”بغداد پیکٹ“ میں ان کی شمولیت کوئی حیران کرن بات نہ تھی۔ عراق میں وزیر اعظم نوری السعید اور ان کی ہم خیال نولہ صدر ناصر کی انداھا و ہند و شمنی میں حواس باختہ ہو کر امریکن ترغیبات کی بنسی میں ایک کینچوے کی طرح لٹکا ہوا تھا اور ”بغداد پیکٹ“ کی میزبانی کا شرف حاصل کر کے عرب دنیا میں انتشار اور نفاق کا بیج بو رہا تھا۔ اس وقت پاکستان کو ایسی کوئی خاص مجبوری لاحق نہیں تھی کہ وہ دنیاۓ عرب کی ناراضگی مول لے کر خواہ مخواہ اس پیکٹ میں شامل ہوتا۔ یوں بھی اس معاهدے کے ساتھ پاکستان کا کوئی فوری مفاد وابستہ نہ تھا کیونکہ ہمارے ابدی دشمن نمبر ایک یعنی بھارت کی طرف سے پاکستان پر حملے کی صورت میں یہ معاهدہ ہمارے دفاع کی کوئی ذمہ داری قبول نہ کرتا تھا۔ تاہم بری فوج کے کمانڈر انچیف کے دباو میں آ کر حکومت پاکستان بغیر سوچے سمجھے اس پیکٹ میں شامل ہو گئی۔

عراق میں انقلاب کے بعد بغداد تو اس پیکٹ سے خارج ہو گیا اور یہی معاهدہ یعنی (Central Treaty Organization) کا لبادہ اوڑھ کر انقرہ منتقل ہو گیا۔ اس نئی ہیئت میں بھی ہم بدستور اس پیکٹ کے ساتھ چکپے رہے۔ اس عمل میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ اس کا اندازہ صرف ایڈ، ٹریڈ، توب و تفنگاوار گولہ بارود کے گوشواروں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کا اصلی جائزہ لینا تو اس وقت ممکن ہو گا جب آزادی اقوام کے

آئینے میں وطن عزیز کے واقعات و شواہد تاریخ کی چھلنی سے گزر کر اپنے صحیح پس منظر اور پیش منظر میں رکھے جا سکیں گے۔ فی الحال صرف یہی کہنا کافی ہو گا کہ ”بغداد پیکیٹ“ عرف سینتو میں پاکستان کی شمولیت نے مسئلہ کشمیر کو زردست و ہچکا پہنچایا اس معاهدے میں شمولیت سے پہلے جب کبھی یہ تنازعہ یو۔ این۔ او میں پیش ہوتا تھا تو اس پر روس کا رویہ غیر جانبدارانہ رہا کرتا تھا۔ اور سیکیورٹی کونسل میں رائے شماری کے دوران رویہ نمائندہ کسی جانب بھی ووٹ ڈالنے سے اجتناب برتا کرتا تھا۔ لیکن اس پیکیٹ میں ہمارے شامل ہوتے ہی روس نے مسئلہ کشمیر پر اپنا رویہ مکمل طور پر بدل لیا اور وہ اس موقف پر اڑ گیا کہ کشمیر بھارت کا انوٹ حصہ ہے اور وہاں پر اب کسی قسم کا استصواب رائے کروانا ضروری ہے اور نہ ہی ممکن ہے۔ سیکیورٹی کونسل میں بھی روس نے اس معاملے میں پاکستان کے خلاف ویٹو استعمال کرنا شروع کر دیا۔

سینتو CENTO کی طرح سینتو SEATO بھی ایک دوسرا فوجی معاهدہ تھا جو خواہ مفت میں ہمارے سر بڑا عرصہ منڈھا رہا۔ سینتو (ساوتھ ایسٹ ایشیا ٹریئی آرگنائزیشن) بھی امریکہ کی رہنمائی میں مغربی مفاد پرستی کا ایک حربہ تھا جو جنوب مشرق ایشیا میں چین کی ناکہ بندی کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اس میں ہماری شمولیت بھی نہ پاکستان کے لیے ضروری تھی نہ سود مند تھی۔

اس نامے میں یہ افواہ بھی گرم تھی کہ ستمبر ۱۹۵۳ء میں جب اس معاهدہ پر غور و خوض کے لیے متعلقہ ممالک کی کانفرنس فیلا میں منعقد ہوئی تو اس میں پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں کو محض آبزور (Observer) کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ حکومت پاکستان نے انسیں اس بات کی اجازت نہ دی تھی کہ وہ اس معاهدہ میں پاکستان کی شمولیت تسلیم کر کے آئیں۔ لیکن کسی وجہ سے چودھری ظفر اللہ خاں نے خود اپنی صوابیدہ پر اس معاهدہ پر دستخط کر دیے تھے اور اسی طرح کی کسی اور وجہ سے کانفرنس کے شرکا نے فل پاور Full Power کے بغیر ان کے دستخط قبول بھی کر لیے۔ اگر یہ افواہ

واقعی صحیح ہے تو یہی سمجھنا چاہیے کہ بچارے پاکستان کو زردستی ایک ناپسندیدہ اور غیر نافع میں الاقوامی معاهدے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

میں نے صدر ایوب سے درخواست کی کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں وزارت خارجہ اور کابینہ کے ریکارڈ دیکھ کر اس افواہ کی تصدیق یا تردید کر سکوں جو ہر دور میں ایک نیا رنگ لے کر زیان زد خاص و عام ہوتی رہتی ہے۔ انسوں نے بخوبی اجازت دے دی لیکن وزارت خارجہ اور کیبنٹ سیکرٹریٹ والوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا ایسے اطلاع صدر مملکت نے کسی سرکاری حوالے کے لیے طلب فرمائی ہے یا میں یہ تنقیش صرف اپنی ذاتی حیثیت سے کر رہا ہوں۔ میں نے حقیقی تسلیم کر لیا کہ یہ اطلاع صدر ایوب نے کسی سرکاری غرض کے لیے طلب نہیں کی۔ اس پر ان دونوں دفاتر کے بابوں صفت افسر دفتری معاملات کو صیغہ راز میں رکھنے والے بے معنی اور فرسودہ قواعد و ضوابط کی آڑ میں چپ سادھ کر بیٹھ گئے۔ آزاد دنیا کے مہذب ممالک میں خفیہ سے خفیہ راز ہائے سربستہ کو بھی کم و بیش تمیں برس گزرنے کے بعد برسر عام فاش کر دیا جاتا ہے تاکہ قوی تاریخ کی تدوین و تصدیق کے تقاضے ہر نانے میں بعنوان شائستہ پورے ہوتے رہیں۔ سینٹو میں بھی ہماری شمولیت کو اب کوئی تمیں برس ہوا چاہتے ہیں۔ امید رکھنی چاہیے کہ اب حکومت پاکستان اس موضوع پر متعلقہ کاغذات اور دستاویزات منظر عام پر لانے میں پس و پیش نہ کرے گی۔ تاکہ تاریخ کے طالب علم ان سے کھلے بندوں استفادہ کر سکیں۔ اور اس سلسلے میں اگر کسی غلط افواہ نے وقتہ فوقہ سر اٹھایا ہے تو اس کا مناسب سدباب ہو سکے۔

جب ہم نے بغداد پکیٹ (سینٹو) اور سینٹو میں شمولیت اختیار کی تو ہمارے خلاف بھارت میں بھی شدید واپیلا مچایا گیا۔ پہنچت جواہر لال نسرو نے یہ الزم لگایا کہ ان معاهدتوں میں شامل ہو کر ہم سپر پاورز کی باہمی "سرد جنگ" کو پاک بھارت برصغیر کی حدود میں کھینچ لائے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ امریکی ڈالروں کی چمک دک سے تو ہماری آنکھیں روز اول ہی

سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ لیکن خود امریکیوں کی نگاہ میں پاکستان کی حقیقی قدر و قمیت کیا تھی، اس کا اندازہ تاریخی واقعات اور شواہد کی روشنی ہی میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دو باتوں کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ امریکہ ایک نمایت عظیم پر پاور ہے۔ اس کی طاقت، عظمت اور خوشحالی کا انعام نہ پاکستان کے وجود پر ہے اور نہ ہی پاکستان کی خیر سکالی اور خوشنودی پر ہے۔ پاکستان کے ساتھ امریکہ کی دلچسپی، دوستی اور گرمجوشی وقہ فوقة صرف اسی حد تک قائم ہو سکتی ہے جس حد تک کہ ہم عالی بساط سیاست پر شطرنج کے مرے کی طرح اس کے لیے کار آمد ثابت ہوتے رہیں گے۔ ہماری اسی افادیت کے اتار چڑھاؤ پر ہمیں کبھی امریکی فوجی یا معاشی امداد ملنے لگتی ہے کبھی بند ہو جاتی ہے یا کبھی اس میں ترمیم و تجدید یا تخفیف و تعویل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ امریکین ایڈ کا کوئی پیانہ قابل عمل نہیں اور قابل اعتبار نہیں کیونکہ لین دین کے اس کاروبار میں کسی اصول، خلوص یا مروت کا بالکل کوئی عمل دخل نہیں۔ دوسری بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے، یہ ہے کہ ہر امریکی حکومت میں عموماً یہودیوں کا عنصر کافی حد تک غالب رہتا ہے۔ اسلام کے حوالے سے یہودی پاکستان کے انلی اور ابدی دشمن ہیں اور اپنے مفاد کے محدود تقاضوں کے علاوہ اس کی کوئی مزید مدد کرنا کبھی قبول یا گوارا نہ کریں گے۔

کمانڈ اچیف کی حیثیت سے جزل ایوب خاں نے امریکین فوجی ہیڈ کوارٹر کے ساتھ جو پیغامیں بڑھائی تھیں، ان کا ایک منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان ایک فوجی معاملہ طے کرنے کی گفت و شنید شروع ہو گئی۔ اسی زمانے میں پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بو گرانے کافی دوڑ دھوپ کے بعد طرح طرح کے ہاتھ پاؤں مار کر پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنے کے لیے ولی میں ایک ملاقات کا راستہ ہموار کیا اس ملاقات کے بعد اگست ۱۹۵۳ء میں دونوں وزراءً اعظم نے ایک مشترکہ اعلان جاری کیا جسمیں واشگٹن طور پر اپنے اس موقف کا اعماقہ کیا گیا تھا کہ تباہ

کشمیر یا سات کے عوام کی خواہشات کے مطابق حل کیا جائے گا۔ اور کشمیری عوام کی خواہشات ایک منصفانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعے معلوم کی جائے گی۔

URDU4U.COM  
(Plebiscite Administrator)

ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ آٹھ ماہ کے اندر اندر ایک بھی تعینات کر دیا جائے گا۔ لیکن جونی پنڈت جواہر لال نہرو کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان کوئی دفاعی معاملہ طے ہو رہا ہے، وہ فوراً قلابازی کھا کر اپنے اس اعلان اور فیصلے سے بے جگاباہ مکر گئے۔ انہوں نے انتہائی سخت اور تندریجی میں وزیراعظم محمد علی بو گرا کو لکھا کہ اگر پاکستان نے امریکہ کے ساتھ کوئی فوجی معاملہ طے کیا تو پاک بھارت تعلقات پر نہایت مضر اور ناخوشگوار اثر پڑے گا اور تنازعہ کشمیر کے متعلق پچھلے تمام فیصلے اور سمجھوتے کا عدم تصور کیے جائیں گے۔ ہندوستان کی اس بے جا غوغما آرائی کے باوجود پاکستان اور امریکہ کے درمیان ایک دفاعی معاملہ پر جو (Mutual Defence Assistance Agreement) کے نام سے موسم تھا مئی ۱۹۵۳ء میں دستخط ہو گئے۔ پاکستان ایشیا کا واحد ملک تھا جو بھارت کی شدید ناراضگی مولے کر اور کشمیر میں استصواب رائے کے متفقہ فیصلے سے ہاتھ دھو کر امریکہ کے ساتھ فوجی معاملے میں ملک ہوا تھا۔ روس کی ناراضگی مولے کر اور مسئلہ کشمیر میں روس کی شدید مخالفانہ روشن اختیار کرنے کے باوجود بغداد پکیٹ عرف دینٹو کا رکن بنا۔ اور چین کی ناراضگی کا خطرہ مولے کر سینٹو کی رکنیت اختیار کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ”ہندی چینی بھائی بھائی“ کا نعرہ ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے پورے عروج پر گونج رہا تھا۔ پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنی اس عاجزانہ وفاداری اور فدویانہ اطاعت شعاری کو جس خلوص، نیازمندی اور پابندی سے نبھایا وہ ہماری مجبوری یا معدوری یا کوتاہ اندیشی تھی۔ لیکن جواباً امریکہ نے وقتہ فوقہ ہمیں جس سلوک سے نوازا اسے بیان کرنے کے لیے ایک سپر پاور کے پاس کوئی الفاظ ہوں، تو ہوں، عام انسانیت کا نصاب اخلاق ان الفاظ سے قطعی کورا ہے۔

پانچ برس بعد ۱۹۵۹ء میں پاکستان اور امریکہ کے مابین ایک باہمی تعاون کا معاملہ طے پایا

Bilateral Agreement of Co-operation between the United States of America and Pakistan جس کی ایک سم شق یہ تھی کہ اگر پاکستان

پر کوئی جارحانہ حملہ ہوا تو امریکہ اس کی مدد پر آئے گا۔ اس معاهدے کی خبر پاتے ہی بھارت نے امریکہ کو ایسا آئٹے ہاتھوں لیا کہ بہت جلد پنڈت نرسو نے لوک سبھا میں ڈنکے کی چوت یہ اعلان کیا کہ امریکہ حکومت نے انہیں یقین دہانی دلا کر ضمانت دی ہے کہ اس معاهدے کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہو گا۔ دوسرے الفاظ میں بھارت کو کھلی آزادی تھی کہ وہ جب چاہے اور جتنی بار چاہے پاکستان پر حملہ آور ہوتا رہے۔ امریکہ اپنے حلیف پاکستان کی ہرگز کوئی مدد نہ کریگا۔ درحقیقت ہوتا بھی یونہی رہا ہے۔ اسی زمانے میں کسی غیر ملکی صحافی نے صدر ایوب سے سوال کیا تھا کہ اگر آپ کی ہندوستان کے ساتھ جنگ چھڑ جائے، تو کیا آپ بھارت کے خلاف وہ اسلحہ استعمال کر سکیں گے جو کسی معاهدے کے تحت امریکہ سے حاصل کیا گیا؟ صدر ایوب نے سیدھا دو ٹوک یہ جواب دیا تھا کہ فوجی اسلحہ جنگ کی صورت میں استعمال کرنے کے لیے ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ کچی روئی (Cotton Wool) میں لپیٹ کر رکھا نہیں جاتا۔ اس پر امریکی سفارتخانہ بڑا برہم ہوا تھا۔ بلکہ ایک پارٹی میں کسی امریکین سفارتخانے نے تندی و تلنی سے یہ پھیتی اڑائی تھی کہ ہم نے صدر ایوب کی یہ بات سنی ہی نہیں کیونکہ اس وقت ہم اپنے کانوں میں کچی روئی ٹھونے بیٹھے تھے۔

صدر کینڈی کی دعوت پر صدر ایوب نے جولائی ۱۹۶۱ء میں امریکہ کا دورہ کرنا تھا۔ اس دورے میں ہمارے صدر کی تقاریر اور گفت و شنید کے موضوعات متعین کرنے کے لیے مختلف وزارتوں سے تجویز طلب کی گئیں۔ اور ان تجویز پر غور کرنے کے لیے متعلقہ وزیروں کی ایک مینگ بھی منعقد ہوئی۔ اس مینگ کی کارروائی دیکھ کر میں دم بخود لہ گیا۔ کیونکہ ان سب تجویز کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ صدر ایوب اپنے دونوں ہاتھوں میں سکول گدائی اٹھائے امریکہ جائیں اور منت ساجت، خوشابد اور چالپوسی کی باشیں کر کے امریکیوں کی خوبی پسندی کو تقویت دیں اور اپنی جھوپی میں امریکی امداد کی رقم بڑھوایا۔

کر فتح و نصرت کے شادیاں بجاتے گھر واپس آ جائیں۔ ڈالروں کی ریل پیل بڑھنے کی توقع اور امکان پر صدر ایوب کے منہ میں بھی پانی بھر آیا، اور وہ غلامانہ ذہنیت کی ان تجاویز پر نہایت خوشی سے اثبات میں سر ہلاتے رہے۔

یہ مینگ ختم ہوئی تو وزارت خارجہ کے سیکرٹری ایس کے دلوی اور سیکرٹری اطلاعات نذرِ احمد میرے کمرے میں آئے۔ وہ دونوں بھی اس مینگ کے رنگ ڈھنگ پر سخت برہم تھے۔ ان کا وسیع تجربہ، قابلیت اور جذبہ حب الوطنی اس قدر جوش میں آیا ہوا تھا کہ ان کا اصرار تھا کہ اگر صدر ایوب اسی طرح کامہ گدائی ہاتھ میں لے کر امریکہ گئے تو وہ اپنے اپنے عمدوں سے بکدوش ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اس رات ہم تینوں میرے گھر میں ساری شب بیٹھے رہے۔ اور ہم نے صدر کے دونہ امریکہ کے لیے ایک نیا بریف (Brief) تفصیل سے تیار کر لیا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ صدر کو ایک آزاد مملکت کے باوقار سربراہ کی حیثیت سے امریکہ کا دونہ کرنا چاہیے اور پاکستان کے مسائل اور مشکلات کو حسن تدیر اور بے باکی سے امریکی عوام، حکومت اور کانگرس کے سامنے بیان کرنا چاہیے۔ جہاں تک امریکہ امداد کا تعلق ہے، وہ ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے نہیں ملتی۔ بلکہ امریکہ کے اپنے مفاد کے پیانے سے ناپ کر دی جاتی ہے۔ امریکہ کے اس دورے کا بنیادی مقصد یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس کے ذریعہ وطن عزیز کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو اور یہاں الاقوای سلطھ پر ہماری عزت نفس بڑھے۔

چونکہ اس زمانے میں میں صدر ایوب کے سیکرٹری کے طور پر معین تھا، اس لیے میری ڈیوٹی لگی کہ یہ نوٹ میں خود جتاب صدر کی خدمت میں پیش کروں۔ اس پر دھنخط ہم تینوں نے کیے تھے۔

صحیح سویرے دفتر پہنچ کر میں نے یہ نوٹ صدر ایوب کے پاس بھیج دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرے اینٹر کام (Intercom) کا بلب ٹھٹھیا جس کا مطلب تھا کہ صدر صاحب خود ٹیلیفون پر ہیں۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو وہ غضبناک لمحے میں گرج برس رہے تھے۔ ان کے الفاظ یہ تھے۔

"میں نے یہ لغو بات پڑھ لی ہیں۔ تم لوگ اس خیال میں ہو جیسے میں امریکہ صرف سکنی کھلیں اور آئیں کرم کھانے جا رہا ہوں۔ نہیں جناب، نہیں جناب۔ میں ملک کے لیے کوئی بہتری کرنے کی کوشش میں ہوں۔ آخر تم لوگوں کو یہ جسارت ہی کیسے ہوئی کہ میرے وزیروں کے متفقہ فیصلوں کو رد کرنے کا سوچو؟ نہیں جناب۔ اس طرح کام نہیں چل سکتا۔"

اتنا کہہ کر صدر ایوب نے دھماکے کے ساتھ اپنا رسیور ٹیلیفون پر دے مارا اور مجھے کچھ کہنے کا موقع تک نہ ملا۔ میں نے فوراً فون کر کے دہلوی صاحب اور نذیر احمد صاحب کو اس صورت حال کی خبر دی۔ دہلوی صاحب تو کسی قدر پریشان ہوئے۔ لیکن نذیر احمد نے زور کا قفقہ لگایا اور کہا۔ تم فائزگ لائن میں بیٹھے ہو۔ اب بھگتو۔ لیکن خبردار ڈرنا مت، بس ڈٹے رہو۔"

اس روز دن کے ڈیڑھ بجے کے قریب صدر ایوب اپنے دفتر سے اٹھے۔ ان کا معمول تھا کہ برآمدے سے گزرتے ہوئے وہ اکثر میرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے لمحہ دو لمحہ رک کر سلام وعا کرتے تھے اور اگر ان کے ذہن میں میں یا میرے پاس کوئی ضروری کام ہوتا تو اس کے متعلق چند باتیں بھی کر لیتے تھے۔ لیکن آج وہ اس قدر تاؤ میں تھے کہ میری کھڑکی کی جانب آنکھ تک نہ اٹھائی اور ناک کی سیدھہ میں آگے بڑھ گئے۔ دوسری صبح اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے بھی انہوں نے یہی رویہ روا رکھا اور دوپر کے وقت بھی ایسا ہی کیا۔ ان دو دنوں کے دوران انہوں نے میرے ساتھ نہ کوئی بات کی اور نہ ہی ٹیلیفون کیا۔ ان کے اس بر تاؤ نے میرے دل میں بھی کسی قدر آزدگی پیدا کی۔ قوی سطح کے کسی اہم سرکاری معاملے پر اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کرنا ہمارا فرض تھا۔ اسے مان لینا یا رد کر دینا صدر مملکت کا اپنا اختیار تھا۔ اگر ہمارے فرض کی ادائیگی ان کو اس قدر گراں گزری تھی تو وہ ہم تینوں کو ہمارے عہدوں سے تبدیل کر سکتے تھے یا یک جنبش قلم ہمیں رٹائر یا موقوف بھی کر سکتے تھے لیکن گھٹے ہوئے پچے یا بد مزاج ساس کی طرح اٹوانٹی کھوانٹی لے کر روٹھ بیٹھنا ان کی

شان کے شایاں نہ تھا ان کے اس طرز عمل کے جواب میں تیرے دن میں نے بھی ایک ایسی ہی طفلاں حرکت کی۔ میں نے برآمدے کی طرف کھلنے والی کھڑکی اندر سے بند کر کے کنڈی چڑھا لی۔ غالباً میری اس حرکت پر ان کی رُگ ظرافت پھر ک اٹھی اور چوتھی صبح وہ اپنے دفتر میں جانے کی بجائے میرے کمرے میں آگئے۔ اندر آ کر انہوں نے نیم سنجیدگی سے کہا۔ ”تا نہ ہوا صحت کے لیے مفید ہے۔ کمرے کی کھڑکی کھول کر بیٹھنا چاہیے۔“

پھر وہ اپنے پرانے معمول کے مطابق میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور کسی ہچکاہٹ کے بغیر مجھے بتایا کہ کافی سوچ بچار کے بعد امریکہ کے دورے کے متعلق اب وہ ہمارے ہمخیال ہو گئے ہیں۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے انہوں نے ان موضوعات اور نکات کا جائزہ لیا جو انہیں امریکہ میں جا کر اٹھانے چاہیئں۔ امریکی کامگروں کے سامنے اپنی تقریر کا انہیں خاص خیال تھا۔ وہاں پر وہ لکھی ہوئی تقریر پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ فی البدیلہ خطاب کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے چند مختصر سے نوٹ تیار کرنے کی ہدایات دیں۔ آخر میں انہوں نے حکم دیا کہ ان کا دوہرہ شروع ہونے سے چند روز قبل میں دبلوی صاحب اور نذیر احمد صاحب کے ہمراہ واشنگٹن پہنچ جاؤ۔ اور ہم لوگ اپنے سفیر مسٹر عزیز احمد کے ساتھ مل جل کر اس دورے کے نئے رخ کو بعنوان شائستہ نجحانے کی کوشش کریں۔

صدر ایوب کا دوہرہ شروع ہونے سے چار پانچ روز قبل ہم تینوں واشنگٹن پہنچ گئے۔ وہاں پر مسٹر عزیز احمد نے ہمیں بتایا کہ پریزیڈنٹ کینڈی بذات خود تو نہایت ذہین، روشن خیال اور حقیقت شناس انسان ہیں۔ لیکن ہاوارڈ یونیورسٹی کے دانشوروں کے ایک ایسے گروہ نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے جو جذباتی طور پر پاکستان کے مقابلے میں بھارت کی جانب نیا نہ مائل ہیں۔ اس لیے صدر ایوب کو اپنے دورے میں ہر مقام پر پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہو گا۔

واشنگٹن میں صدر ایوب کی آمد سے چند منٹ پہلے پریزیڈنٹ کینڈی بھی صدارتی ہیلی کاپٹر

کے ذریعے ہوائی اڈے پر آ گئے۔ مسٹر عزیز احمد نے ان کے ساتھ ہم تینوں کا تعارف کرایا تو وہ مسکراتے اور بولے ”میں مان گیا۔ صدر ایوب واقعی ایک عملی فوجی کمانڈر بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے وفد کا ہر اول دستہ تو پہلے ہی سے یہاں بھیج رکھا ہے!

صدر کینڈی اور مسٹر عزیز احمد نے جو سوت زیب تن کیے ہوئے تھے وہ ایک ہی جیسے کپڑے سے بنے ہوئے تھے۔ جونہی مسٹر کینڈی کے مشاہدے میں یہ بات آئی انہوں نے فوراً کہا۔ مسٹر ایمبیسڈر۔ کیا یہ نیک فال نہیں کہ ہم دونوں نے ایک ہی سالباس پہنا ہوا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ہمارے مذاکرات میں بھی ایسی ہی ہمیختگی قائم رہے گی۔“

صدر کینڈی جوانی، رعنائی، خوش گفتاری اور ذہانت کا سیما ب صفت پیکر تھے۔ کبھی کبھی ان کا انداز ایک ایسے الحمد نوجوان کے ساتھ مشابہت کھانے لگتا تھا جو ابھی ابھی اپنے کالج کی کلاس میں کسی قسم کی شرارت کر کے بھاگا ہو۔ ان کی نیلی نیلی آنکھوں میں بلا کی تیزی اور گراہی تھی، وزیروں، مشیروں اور سفیروں کے ہجوم کے درمیان بھی وہ یوں نظر آتے تھے جیسے اکیلے اور تھا ہوں۔ صدر ایوب کے ساتھ دوبار امریکہ کے دوروں میں مجھے صدر کینڈی کو کئی بار کافی نزدیک سے دیکھنے کا موقع میر آیا۔ ہر بار مجھے یہی احساس ہوا کہ ان کی دلنواز مسکراہٹ اور چلبلاہٹ کے پردے میں ایک بے نام سا حزن و ملال بھی پوشیدہ ہے۔ صدر ایوب نے اپنے پہلے دوسرے امریکہ کو نہایت خوش اسلوبی، خودداری اور خود اعتمادی کے ساتھ بھایا۔ مسٹر اور مسز کینڈی نے بھی دل کھول کر ان کی خاطر و مدارات کی مذاکرات بھی اچھے رہے۔ اس نمانے میں یہ افواہ نوروں پر تھی کہ امریکی حکومت Mutual Security Act میں ایسی ترمیم لا رہی ہے، جن سے غیر جانبدار ممالک کو بھی معاشی، اور فوجی امداد فراہم کرنا ممکن ہو جائے گا۔ صدر ایوب نے کہا کہ اگرچہ بھارت روس سے باضابطہ ہر قسم کی فوجی اور معاشی امداد حاصل کرتا رہا ہے لیکن امریکہ کی نظر میں وہ بیشہ ایک غیر جانبدار ملک ہی رہا ہے۔ اب اگر قانون میں مجونہ ترمیم کے بعد بھارت بھی امریکن فوجی امداد کا قانونی طور پر حقدار بن

گیا تو پاکستان جیسا آپ کا پرانا دوست کہاں جائے گا؟

صدر کینڈی نے دو ٹوک الفاظ میں برملا یہ یقین دلایا کہ امریکہ بلاشبہ پاکستان کی دوستی کی قدر کرتا ہے۔ صدر ایوب خاطر جمع رکھیں کہ ہندوستان کو کسی قسم کی فوجی امداد فراہم کرنے سے پہلے امریکہ پاکستان کو اعتماد میں لے کر اس سے ضرور مشورہ کرے گا۔

لیکن حیف صد حیف کہ صدر کینڈی اپنا یہ وعدہ وفا نہ کر سکے۔ جونی بھارت اور چین کے درمیان سرحدی جھڑپ رونما ہوئی، امریکہ کی بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ چینی فوج سے بری طرح شکست کھا کر بھارتی فوج سر پر پاؤں رکھ کر میدان جنگ سے بھاگی تو امریکہ نے بھی فوراً اپنی خیر سگالی کا ڈول ڈالا اور پاکستان کو اعتماد میں لیے بغیر برطانیہ کے ساتھ مل کر ہندوستان کو بے دریغ ہر قسم کی فوجی امداد دینا شروع کر دی۔ واشنگٹن میں ہمارے سفير نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس کے احتجاج پر کسی نے کان تک نہ دھرے۔ سب لوگ یہی کہہ کر ٹالتے رہے کہ ہندوستان کو جو اسلحہ یا جا رہا ہے وہ صرف چین کے خلاف استعمال ہو گا، پاکستان کے خلاف استعمال ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن پاکستان میں ہم بھارت کے اصلی عزائم سے خوب واقف تھے، ہم پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ دشمنی کی ترجیحات میں بھارت کے نزدیک اس کا سب سے بڑا دشمن پاکستان ہے، چین نہیں۔ اس لیے جلدی یا بدیر یا اسلحہ پاکستان ہی کے خلاف استعمال ہو گا جیسا کہ حقیقت میں ہوا، پہلے ۱۹۷۵ء میں۔ بعد ازاں ۱۹۷۱ء میں۔ روز اول ہی سے پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنی وفاداری اور تابعداری بھانے میں کوئی وقیفہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ہمارے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے روس کا دعوت نامہ پس پشت ڈال کر امریکہ کا دونہ قبول کر لیا۔ گورنر جنرل غلام محمد اور صدر اسکندر مرزا کے زمانے میں امریکی مشیر ہمارے کاروبار حکومت پر مددی دل کی طرح چھائے رہے۔ کمانڈر انچیف کی حیثیت سے صدر ایوب نے ہماری افواج کو اس طرز پر منظم اور مسلح

کیا کہ ہماری دفاعی شہ رُگ ہمیشہ کے لیے امریکہ کی مٹھی میں دب کر رہ گئی۔ روس اور عرب ممالک کی ناراضگی مول لے کر ہم بغداد پکیٹ عرف سینتو کے رکن بنے تاکہ امریکہ کی خوشنودی ہمارے شامل حال رہے۔ سینتو میں شامل ہو کر ہم نے چین کی ناکہ بندی میں حصہ لیا تاکہ امریکہ کی خیر سکالی ہمارے ساتھ قائم و دائم رہے۔ لیکن ہماری جانب سے یہ صرف یکطرفہ ٹریفک تھی۔ دوسری جانب سے ہمیں گھر کی مرغی دال برابر سمجھ کر حسب ضرورت پیٹ بھرنے کے لیے تھوڑا بہت داتا دنا کا ڈال دیا جاتا تھا ورنہ امریکہ کی اصلی کوشش اور خواہش ہندوستان کو رام کرنے کی تھی جو روس کی گود میں بینہ کر امریکہ کو ٹھینگا بھی دکھاتا تھا، اور اپنی نام نہاد غیر جانبداری کا گھونگھٹ نکال کر ۱۹۵۱ء سے ایک Mutual Defence Assistant Agreement کے تحت چپکے امریکن فوجی امداد بھی مسلسل حاصل کر رہا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی امریکہ کے چند عناصر نے اس کی مخالفت پر کمر باندھ لی تھی۔ بٹوانہ تو ہندوستان کا ہوا تھا، لیکن اس کا چرکہ امریکہ کے کچھ یہودی اور یہودی نواز طبقوں نے بری طرح محسوس کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ ڈھاکہ میں ایک امریکن کارروباری فرم کا ایک نمائندہ کچھ عرصہ سے مقیم تھا۔ بظاہر اس کا نام (Mr Crook) تھا لیکن باطن میں بھی وہ اسم بسمہ ثابت ہوا۔ کیونکہ رفتہ رفتہ یہ راز کھلا کہ وہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کا نیج بونے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ پاکستان کی سالمیت کے خلاف اس کی کارروائیوں کا علم ہوتے ہی حکومت نے اسے بلا تاخیر ناپسندیدہ شخص قرار دے کر ملک سے نکال باہر کیا۔

چند قابل قدر مستشنيات کو چھوڑ کر پاکستان میں وقار فوقة معین ہونے والے امریکی سفیر اور سفارت کار بھی بعض اوقات ایک مشہور کتاب "The Ugly American" کے چلتے پھرتے کردار نظر آتے تھے۔ ایک سفیر صاحب ایسے تھے جو صدر مملکت کے ساتھ اپنی ملاقات کا وقت پہلے سے مقرر کروانا اپنی ہٹک عزت تصور فرماتے تھے۔ ان کا جب جی

چاہتا تھا وہ اپنی کار میں بیٹھ کر اچانک ایوان صدر ات میں وارد ہو جاتے تھے۔ اور جناب صدر ہزار کام چھوڑ کر انہیں خوش آمدید کرنے پر مجبور تھے۔

ایک بار کراچی کے ایوان صدر میں رات کے وقت کوئی لمبی چوڑی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ گری کا موسم تھا۔ ڈنر کے بعد باہر لان میں صدر کے باڑی گارڈ کا بینڈ اپنے جوہر دکھانے لگا۔ مہمان چھوٹے گروہوں میں بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ ایک ایسا ہی گروپ چند امریکی سفارت کاروں اور عالمی بینک کے کارکنوں پر مشتمل شراب ناب سے شغل فرم رہا تھا۔ دو تین پاکستانی افسر بھی انکی خاطر تواضع میں لگے ہوئے تھے۔ شامت اعمال سے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کے ساتھ اردو زبان میں چند فقرے بول بیٹھا۔ اس پر ایک امریکی سفارت کا پانہ چڑھ گیا، اور اس نے دونوں کو چیخ کر ڈانٹا (Shut up No Urdu here) (بکواس بند کرو، یہاں اردو نہیں چلے گے) اس کے علاوہ وہ بلند آواز میں پاکستانیوں کے مجلسی آداب و رسوم میں کیڑے نکالنے بھی بیٹھ گئے۔ بیچ بچاؤ کرنے کے لیے میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس نے ڈانٹ کر مجھے بھی ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کی اس بد تمیزی پر مجھے غصہ آگیا، اور میں نے اس کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو کے چند فقروں نے اس نازک بدن کے کس مقام پر شدید ضرب لگائی ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس قدر بلبلہ رہا ہے۔“

یہ سن کر ایک اور امریکی اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا نام غالبا Bell Mr تھا۔ اور وہ کسی مالیاتی یا معاشریاتی ادارے کے ساتھ وابستہ تھا اس نے نہیں دھیسے انداز سے کہا۔ ”اس کی وجہ میں سمجھاتا ہوں۔ اردو نہ کوئی مجلسی زبان ہے اور نہ ہی تمدنی زبان ہے۔ اس زبان میں Public کے لیے اپنا کوئی لفظ نہیں کیونکہ آپ لوگ پیلک کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اس زبان میں Public Servant کے لیے افسر کے علاوہ اپنی کوئی اصطلاح نہیں۔ کیونکہ یہاں پر Public service کا تصور سرے سے مفہود ہے۔“ وہ کچھ دیر اسی طرح بے تکان بولتا رہا۔ اس کے امریکی ساتھی تو خیر اسے داد

دے ہی رہے تھے لیکن ہماری نوکر شاہی کے چند کل پر نے بھی موقع واردات پر آپنے اور بڑی خوشی سے اثبات میں سر ہلانے لگے۔

صدر ایوب کے افتخار کے آخری چند برسوں میں یہاں پر امریکہ کے جو سفیر معین تھے ان کا اسم گرامی مسٹر بی ایچ اوہرٹ (Mr B.H Oelhert Jr) تھا۔ یہ صاحب نسل یہودی تھے، اور کسب کو کولا کولا بنانے والی کمپنی کے غالباً واکس پریزیڈنٹ تھے۔ وہ وضع قطع میں بے ڈول، چال ڈھال میں بے ہنگم، اخلاق و آداب میں اکھڑ اور سفارتی رکھا اور شائستگی سے بڑی حد تک بے نیاز تھے۔ ایک روز راولپنڈی کے ائمہ کاظمی نیشنل ہوٹل میں کوئی استقبالیہ تھا، وہاں سے فارغ ہو کر ہم لوگ برآمدے میں کھڑے اپنی اپنی گاڑیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر اوہرٹ کی گاڑی پہلے آگئی۔ انہوں نے اصرار کر کے اسلام آباد جانے کے لیے مجھے اپنی کار میں بٹھا لیا۔ جتنا عرصہ ہم مری روڈ سے گزرتے رہے۔ وہ پاکستانی سڑکوں پر ٹریفک اور پیدل چلنے والوں کے رنگ ڈھنگ پر طرح طرح کی پہنچیاں کرتے رہے موڑوں، بسوں، رکشاوں اور سکوڑوں کے ہجوم میں بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھیکلنے والے راہگیروں کو وہ تمثیر اور تکبر سے Bipeds (دو پایہ مخلوق) کے لقب سے نوازتے تھے۔ فیض آباد کے چوک پر پہنچ کر جب ہم شاہراہ اسلام آباد کی طرف مڑنے والے تھے تو مسٹر اوہرٹ نے اچانک اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے اور اپنا سر گھٹھنوں میں دے کر سیٹ پر جھک گئے۔ مجھے یہی خیال آیا کہ ان کی آنکھ میں کوئی چھر یا کمھی گھس گئی ہے اور وہ بے چارے سخت تکلیف میں بتلا ہیں۔

میں نے ازراہ ہمدردی ان سے دیافت کیا۔ ”آپ خیریت سے تو ہیں؟“

مسٹر اوہرٹ نے اپنی گاڑی ایک طرف رکوائی اور سنکھے لبھے میں بولے ”میں بالکل خیریت سے نہیں۔ میں کس طرح خیریت سے ہو سکتا ہوں؟ وہ دیکھو۔“ انہوں نے باہر کی طرف اشارہ کر کے کہا ”وہ دیکھو آنکھوں کا خار، میں جتنی بار ادھر سے گزرتا ہوں، میری آنکھوں میں یہ کائنات بڑی طرح کھلتتا ہے۔“

میں نے باہر کی طرف نظر دوڑائی تو چوراہے میں ایک بڑا اشتہاری بورڈ آؤریاں تھا۔ جس

پر پی۔ آئی۔ اے کا ایک رنگین اشتہار دعوت نظارہ دے رہا تھا اس اشتہار میں درج تھا کہ پی آئی اے سے پرواز کیجیے اور چین دیکھیے!

URDU4U.COM

میں نے انیں اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ یہ محض ایک ائیرلائن کا تجارتی اشتہار ہے۔ اے اپنے اعصاب پر سوار کر کے سوہان روح بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس زمانے میں چین کے خلاف بعض اور دشمنی کا بھوت پوری امریکن قوم کے سر پر بری طرح سوار تھا۔ خاص طور پر اس معاملے میں مسٹر اولبرٹ مریضانہ حد تک ذکر الحس تھے۔ اس لیے میری بات سن کر وہ خوش نہ ہوئے بلکہ کسی قدر برا منا کر گم سم بینھ گئے۔

چند روز بعد میں نے دیکھا کہ فیض آباد چوک سے چین والا بورڈ اٹھ گیا ہے اور اس کی جگہ پی آئی اے کا اشتہار بنکاک دیکھنے کی دعوت دے رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تبدیلی محض تجارتی نکتہ نظر سے رونما ہوئی تھی یا اس معاملے میں مسٹر اولبرٹ کے آشوب چشم کی کچھ رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی تھی۔

چین کے حوالے سے مجھے مسٹر اولبرٹ کی نازک مزاجی کا ایک اور تجربہ بھی ہوا۔ ایک بار راولپنڈی کے گورنمنٹ گزار کالج میں کوئی امریکی پروفیسر تقریر کرنے آیا ہوا تھا۔ پرنسپل صاحب نے صدارت کرنے کے لیے مجھے مدعو کر لیا۔ اپنی تقریر کے دوران پروفیسر صاحب نے ایک عجیب و غریب طرز بیان اور پیرائی استدلال اپنایا۔ انہوں نے یہ الزام لگایا کہ ترقی پذیر ممالک امریکی امداد ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگتے تو ضرور یہیں لیکن اسے حاصل کرنے کے بعد بھی وہ بدستور فرسودہ اقدار ثقافت کے ساتھ چھٹے رہتے ہیں۔ یہ سراسر ناشکری کی علامت ہے کیونکہ امریکی امداد کا مقصد صرف ڈالر اور اسلحہ ہی تقسیم کرنا نہیں، بلکہ دراصل ہمارا بنیادی مقصد امریکی اقدار، امریکی ثقافت، امریکی طرز حیات اور امریکی رسم و رواج کو بھی ساری دنیا میں پھیلانا اور فروغ دینا ہے۔ خاص کر تعلیم کے شعبہ میں پروفیسر صاحب نے نور دے کر کہا جو طلباء و طائف پر امریکن یونیورسٹیوں

میں جا کر پڑھتے ہیں اور صرف ڈگریاں اور ڈپلوے لے کر واپس آ جاتے ہیں وہ ہمارا وقت اور پیسہ ضائع کرتے ہیں، ہمیں صرف ایسے طباء اور طالبات کو وظیفوں کا مستحق سمجھتا چاہیے جو ڈگریوں کے علاوہ امریکن اقدار و ثقافت، امریکن اخلاق و عادات، امریکن بود و باش کے نقوش بھی اپنے ہمراہ واپس لا سیں اور انہیں اپنے اپنے ممالک اپنے اپنے ماحول اور اپنے اپنے گھروں میں جاری و ساری کریں۔

ان لغویات کے جواب میں میں نے پروفیسر صاحب کو آٹے ہاتھوں لیا اور کہا کہ اگر امریکی امداد کو امریکی اقدار اور کلپر اپنانے کے ساتھ مشروط کر دیا گیا تو کئی غریب اور خود دار ممالک ایسی امداد کو بے نیازی سے ٹھکرا دیں گے۔ جن شرائط پر پروفیسر صاحب ہمارے طلباء اور طالبات کو تعلیمی و طائفی دینا چاہتے ہیں، وہ ہمیں قابل قبول نہیں اور ہم ایسے وظائف کو بھی دور ہی سے سلام کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہمیں علوم حاصل کرنے کے لیے دوسرے ممالک کی طرف رخ موڑنا ہو گا۔ یوں بھی ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ علم حاصل کرو، خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔

میری تقریر کے کچھ ہے ہمارے کئی اخبارات نے بڑے نمایاں طور پر شائع کیے۔ چین والا فرمان رسول پڑھ کر امریکی سفیر مسٹر اوہلٹ سخت پا ہو گیا۔ ان کا پیغام آیا کہ فوری طور پر میرے دفتر میں آ کر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان کے عزائم بجانپ گیا۔ اور میں نے وزارت خارجہ سے درخواست کی کہ اس ملاقات کی روئیاد قلم بند کرنے کے لیے وہ اپنا ایک افر بھی میرے دفتر میں بھیج دیں۔ انہوں نے مسٹر بیاض پر اچھے کام پر مامور کر دیا، جو اس وقت وزارت میں غالباً جائش سیکرٹری تھے اور بعد میں سیکرٹری امور خارجہ کے علاوہ کابل، دہلی اور ہائینڈ میں سفیر کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ مسٹر اوہلٹ بھی سفارت خانے کا ایک کونسلر اپنے ہمراہ لائے تھے۔ وہ شدید اعصابی تناؤ میں بتلا نظر آتے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہو کر وہ بیٹھنے کی بجائے دیوانہ وار ادھر ادھر گھومتے رہے۔ پھر اچانک رُک کر بولے۔ ”کیا مجھے کچھ کافی مل سکتی ہے؟“

میں نے انہیں یقین دلایا کہ کافی ابھی حاضر ہو جائے گی۔

بے چینی کے عالم میں انہوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھر کر کافی کی پیالی ختم کی اور پھر بیس پچیس منٹ تک وہ نہایت تلنخ انداز میں میری تقریر کے بخیے ادھیزتے رہے۔ انہوں نے دھمکی آئیز انداز میں کہا کہ اگر آپ امریکہ امداد سے منہ موز کر چین کے ساتھ اپنا تعلیمی رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہمیں لکھ کر بھیج دیجیے پاکستان کو امداد دیئے بغیر امریکہ بحر اوقیانوس میں غرق نہیں ہو جائے گا۔

میں جانتا تھا کہ سفری صاحب اس قسم کا تیز و تند اور اشتعال انگلیز رویہ جان بوجھ کر اختیار کر رہے ہیں تاکہ میں بھی برانگیختہ ہو کر ترکی بہ ترکی جواب دینے پر اتر آؤں۔ اور اس طرح یہ واقعہ ایک Diplomatic Scene (سفارتی حادثہ) بن کر حکومت اور صدر ایوب کے لیے مفت کا درد سر بن جائے۔ اس لیے میں نے صبر و تحمل سے کام لیا اور ان کی تلنخ و تندی نظر انداز کر کے ایک عام اور نارمل انداز کی گفتگو شروع کر دی۔ اپنا وار خالی جاتا دیکھ کر وہ بڑے مایوس ہوئے۔ کافی کی دوسری پیالی پی کر جب میں انہیں ان کی کار تک چھوڑنے جا رہا تھا تو راستے میں انہوں نے کسی قدر معذرتانہ انداز میں کہا۔ ”وراصل میں پیشہ ور سفارتکار (Professional diplomat) نہیں ہوں۔ اس لیے میری گفتگو میں اگر کوئی بات آپ کو بری لگی ہو تو اسے نظر انداز کر دیں۔“

”یور ایکسیلیننسی“ میں نے نہایت ٹھنڈے لمحے میں کہا۔ ”یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ امریکہ جیسی عظیم سپر پاور پاکستان جیسے مخلص حلیف کو اپنے پیشہ ور سفارتی ماہرین سے نوازا ضروری نہیں سمجھتی۔“

میرے اس جملے کی چین امریکی سفیر اور کونسلر دونوں نے صریحاً محسوس کی اور کسی قدر جھینپ کر زیر لب مننا تے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

جنوری ۱۹۶۸ء کے آخری ایام میں اچانک صدر ایوب پر دل کا شدید دورا پڑا۔ کمانڈر اچھیف

جزل بھی اور وزیر دفاع ایڈ مرل اے۔ آر۔ خان نے مل کر فوراً ایوان صدر کو اپنے کنٹرول میں لے لیا اور صدر ایوب دس بارہ روز تک عملہ صرف ان دونوں کی تحویل میں رہے۔ حکومت کے باقی تمام اراکین سے ان کا رابطہ مکمل طور پر کٹ چکا تھا۔ ان ایام میں بھی مسٹر اولٹ کا صبح و شام کا واسطہ اگر کسی سے تھا تو جزل بھی سے تھا۔

مارچ ۱۹۶۹ء میں جب صدر ایوب کے خلاف ملک گیر ایجی ٹیشن اپنے عروج پر تھی، یا کیک یہ خبر نکلی کہ انیس تاریخ کو امریکی سفیر مسٹر اولٹ ایک اہم مشوہ کے لیے واشنگٹن روانہ ہو گئے ہیں، کئی لوگوں نے اندازہ لگایا کہ وہ بھی خان کو اقتدار منتقل کرنے کے نیچلے پر مر تصدیق ثبت کروانے واشنگٹن گئے ہیں۔ واللہ اعلم باصواب۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی واپسی کے ایک یا دو روز بعد ۲۵ مارچ کو صدر ایوب مستعفی ہو گئے، اور جزل بھی نے چیف مارشل لاءِ ایڈ فیشریٹر اور صدر کی گدی سنبھال لی۔

۱۹۶۷ء میں جب صدر ایوب کی خود نوشت سوانح عمری شائع ہوئی تو انہوں نے غالباً امریکے حوالے سے اس کتاب کا نام (Friends Not Masters) رکھا تھا۔ اردو ترجمے کا عنوان تھا۔ ”جس رنق سے آتی ہوں پرواز میں کوتاہی۔“ اگر یہی کتاب ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کے بعد لکھی جاتی تو امریکہ کے حوالے سے صدر ایوب اس کا یہ عنوان مختب کرنے میں حق بجانب ہوتے:

”نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔“

○ چین

اگرچہ پاکستان ۱۹۵۳ء ہی سے سیٹو (SEATO) کا ممبر ہو کر چین کی ناکہ بندی میں شامل تھا، لیکن عوامی جمہوریہ چین کی قیادت نے کبھی ہمارے اس اقدام کو بنائے فساد اور تنازع فیہ نہیں بنایا تھا۔ اس کی وجہ ان کی عالی حوصلگی اور حسن تدریب ہی نہیں بلکہ ان کی حقیقت شناسی بھی تھی۔ کیونکہ غالباً انہیں ہماری اندر ہونی اور بیرونی مجبوروں اور

معدوریوں کا بھی ضرور احساس تھا۔

روس کے ساتھ تو چین کا نظریاتی بھائی چارا شروع ہی سے تھا۔ لیکن ایک زمانے میں ”ہندی چینی بھائی بھائی“ کا بلند باگ نعرہ بھی برصغیر کے کونے کونے میں گونج رہا تھا۔ رفتہ رفتہ حالات نے کروٹ لی۔ روس اور چین میں شدید نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان کا باہمی اقتصادی بندھن ٹوٹ گیا۔ روس نے چین میں ترقیاتی منصوبوں کی بساط لپیٹ کر ہر قسم کے تعاون اور امداد سے ہاتھ کھینچ لیا، یہاں تک کہ جو فیکٹری یا منصوبہ جس منزل میں تھا، وہیں پر ادھورا چھوڑ کر ان کے بیوپرنٹ تک اپنے ساتھ واپس لے گئے۔

ہندوستان نے ایشیا کی قیادت کا تاج اپنے سر پر سجائے کے لیے چین کے ساتھ رقبت اور مسابقت کا راستہ اختیار کیا تو دونوں کے درمیان قدرتی طور پر ٹھن گئی اور باہمی سرحدی مذاقات اور اختلافات بھی سر اٹھانے لگے۔ ایسے معاملات میں بھارت کی ہٹ دھرمی اور اپنی من پندی کو اجاگر کرنے کے لیے چین نے برا اور نیپال جیسے چھوٹے ملکوں کے ساتھ نہایت معقول سرحدی معاملے طے کر کے اپنی فراغلی کا ثبوت دیا۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہماری وزارت خارجہ نے بھی اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا، اور چین اور پاکستان کے درمیان ایک سرحدی معاملہ طے کرنے کے لیے تفصیلات طے کر لیں۔ شروع میں تو صدر ایوب کسی قدر یہ صیغہ، ’شش و پنج اور طرح طرح کی پچکچاہوں میں ڈانوں ڈول رہے۔ لیکن ۱۹۶۲ء کی بھارت اور چین جنگ کے رنگ نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور فروری ۱۹۶۳ء کے اواخر میں انہوں نے ایک پاکستانی وفد کو سرحدی معاملہ طے کرنے کے لیے چین جانے کی اجازت دے دی۔

اس وفد کے قائد ہمارے وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ حسن اتفاق سے مجھے بھی اس وفد میں شامل کر دیا گیا تھا۔ دوسرے اراکین وزارت خارجہ کے ایک سنیشنر افسر مسٹر خراس، پاکستان کے سرویر جزل اور پکینگ میں ہمارے سفیر میجر جزل رضا تھے۔ صدر ایوب کو تشویش تھی کہ سرحدی معاملہ پر دستخط ہونے سے پہلے اگر ہمارے وفد کی

خبر عام ہو گئی تو ہماری راہ میں روٹے انکانے کی غرض سے ان پر طرح طرح کے دباؤ بڑھنا شروع ہو جائیں گے اور چین کے دشمن ممالک بھی ہمارے منصوبے کو سیوتاڑ کرنے کے لیے مختلف قسم کی ریشہ دوانیوں میں معروف ہو جائیں گے چنانچہ فیصلہ ہوا کہ ہم نہایت خاموشی سے سفر کر کے پکینگ چین میں اور سرحدی معالہ پر دستخط ہونے سے قبل اس وفد کی کوئی خبر باہر نہ لٹکنے پائے۔

ہمارے سروئیر جزل صاحب تو الگ پکینگ کے لیے روانہ ہو گئے اور مسٹر خراس اور میں مسٹر بھٹو کے ساتھ کراچی سے ہانگ کانگ جانے کے لیے Lufthansa کے ایک ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ جہاز گھنٹہ بھر کے لیے لکلتہ کے ہوائی اڈے پر بھی رکا۔ وہاں پر ہمارے کونسل جزل مسٹر ایم۔ اے علوی ہمیں ملنے اندر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر کافی کوشش کی کہ ہم ٹرانزٹ لاونج میں چند خالی کرسیوں پر بیٹھنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اول تو لاونج میں بجوم زیادہ تھا۔ دوسرے اگر ہم کسی خالی کرسی کی طرف بڑھتے بھی تھے تو دوسرے مسافر لپک کر اس پر بقضہ جما لیتے تھے۔ آخر مجبور ہر کر علوی صاحب ہمیں ریشوران میں لے گئے جہاں چائے کا آڑور دے کر ہم پون گھنٹہ کے قریب بیٹھے رہے۔

ہانگ کانگ میں سارا دن بھٹو صاحب مجھے اپنے ہمراہ لے کر نوادرات کی دکانوں اور بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل شورز میں گھومتے رہے۔ ایک فیشن ایبل شور میں انہوں نے اپنے لیے پانچ سوٹ سلوانے کا آڑور دیا۔ جو چین سے ان کی واپسی پر تیار ملیں گے۔ اصرار کر کے انہوں نے پانچ سوٹوں کا آڑور میرے لیے بھی دے دیا میں نے بہت احتجاج کیا کہ یہ سوٹ مہنگے ہیں اور مجھے ان کی ضرورت بھی نہیں لیکن وہ نہ مانے اور واپسی پر میرے سوٹوں کی قیمت بھی اپنی جیب سے ادا کی۔ ان میں سے ایک آدھ سوٹ آج تک بھی میرے پاس موجود ہے۔

چین میں ہمارے وفد کی نہایت شاندار پذیرائی ہوئی۔ چینی وزیر خارجہ مارشل چن ٹی بڑے زندہ دل اور بذله سنیج انسان تھے۔ ہمارے پروگرام کی سب تفصیلات وہ اپنی ذاتی گمراہی

میں طے کرتے۔ ۲ مارچ ۱۹۶۳ء کو ایک پروقار تقریب میں انہوں نے مسٹر بھٹو کے ساتھ پاک چین سرحدی معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ دستخط کرتے وقت ان دونوں کی کرسیوں کے پیچے جو لوگ قطار بنا کر کھڑے ہوئے ان میں چین کے صدر لیوشاؤچی اور وزیر اعظم چو این لائی بھی شامل تھے۔

وزیر اعظم چو این لائی تھل، تدریج، فراست اور ذہانت کا ایک بے مثال پیکر تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکے سے تبسم کی ایک مددم سی لہر ہر وقت یوں کھیلتی رہتی تھی کہ کسی کو یہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ مسکرا چکے ہیں یا مسکرانے والے ہیں ان کی تیز نگاہی ماحول میں پیوست ہو کر گرد و پیش کو اپنی گرفت میں جگڑ لیتی تھی۔ اور ان کی شفقتہ بیانی عالمی سیاست کے تجزیے کو فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھال کر عجیب و غریب جادو جگاتی تھی، مشاہیر عالم میں ایسی غیر معمولی خصوصیات کا اور کوئی رہنمای میری نظر سے نہیں گزرتا۔

ایک روز وزیر اعظم چو این لائی نے بھٹو صاحب کے ساتھ مذکورات شروع کئے تو وہ تقریباً سارا دن بولتے رہے۔ پانچ ساڑھے پانچ گھنٹوں میں انہوں نے سیاست عالم کا انتہائی گمرا اور بھرپور تجزیہ کیا۔ یہ تجزیہ اور تبصرہ نہ زبانی کرتے رہے، اور ایک بات بھی نہ تو انہوں نے کسی فائل یا یادداشت کی طرف رجوع کیا، نہ اپنی کوئی بات دھرائی اور نہ ہی کسی مقام پر رکے یا چکچکائے۔ ان کے دلائل ٹھوس حقائق و شواہد پر مبنی تھے اور ان کا انداز بیان جذبات، مروضات اور داخلی آرزو مندی کی ملاوت سے خالی تھا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ اب وہ اپنے تجزیے کا خلاصہ پیش کر کے یہ گفتگو ختم کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے تجزیے کا لب لباب اسی ترتیب سے سمیٹ کر بیان کر دیا جس ترتیب سے انہوں نے صبح سے شام تک اسے وضاحت سے بیان کیا تھا۔ انسانی دماغ کو ایک خود کار مشین اور کمپیوٹر کی مانند اس طرح کام کرتے ہوئے میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔

وزیر اعظم چو این لائی کی گفتگو کو مسٹر خراس اور میں قلم بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یوں تو وہ صرف چینی زبان بولتے تھے، لیکن یقیناً انہیں انگریزی زبان پر بھی ضرور عبور حاصل ہو گا۔ ان کا ترجمان جب ان کی گفتگو کا انگریزی میں ترجمہ کرتا تھا، تو کئی بار مسٹر چو این لائی اسے ٹوک کر اس کے ترجمہ کی اصلاح بھی کر دیتے تھے۔ جب مسٹر چو این لائی واقعات عالم پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ایک چینی لڑکی وفات فوقة ہمیں چینی چائے کے تانہ مگ تقسیم کرتی رہتی تھی۔ یہ ابتا ہوا گرم پانی تھا جس میں چائے کی ایک یا دو پتیاں تبر رہی ہوتی تھیں۔ اس میں دودھ شکر ملانے کا رواج نہ تھا۔ چائے ڈھانپنے کے لیے ہر مگ کا اپنا خوبصورت سا ڈھکن بھی ہوتا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ وزیر اعظم چو این لائی روانی سے بولتے بولتے کسی قدر نہیں کر رہا تھا جاتے ہیں اور ان کی نگاہیں بار بار میری جانب اٹھ رہی ہیں، مجھے خیال آیا کہ شاید میرے بیٹھنے کے انداز میں کوئی کبھی یا قباحت پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے فوراً پینترا بدلت کر پہلو تبدیل کر لیا لیکن اس کے باوجود مسٹر چو این لائی کی نظریں بدستور میری طرف اٹھتی رہیں۔ اس پر پریشان ہو کر میں کسی قدر جھینپا تو انہوں نے چائے تقسیم کرنے والی لڑکی کو بلا کر کچھ کہا۔ وہ میرا مگ اٹھا کر ان کے پاس لے گئی مسٹر چو این لائی نے مگ کا ڈھکن اٹھا کر اسے دکھایا کہ یہ چھوٹا ہے اور اس مگ پر اچھی طرح نہیں جملک۔ لڑکی کا چڑھ عرق مذامت سے شرابور ہو گیا۔ اور وہ جا کر میرے لیے چائے کا ایک اور مگ لے آئی۔ اس کے بعد مسٹر چو این لائی سکون سے بیٹھ گئے اور اپنے تبصرے میں بدستور مصروف ہو گئے۔ ایک نہایت سنجیدہ تجزیے کے دوران ایک انتہائی کثیر المشاغل شخص کے ذہن کا اس قدر باریک تفصیل کی طرف منتقل ہونا میرے لیے بے حد حیرت ناک تھا۔ ایک پڑھی لکھی چینی خاتون مترجم کے فرائض سر انجام دینے کے لیے میرے ساتھ بھی مامور تھی۔ میں نے اس سے دیافت کیا کہ چائے تقسیم کرنے والی جس لڑکی کی غلطی پکڑی گئی ہے، کیا اسے اب کوئی سزا بھی ملے گی؟

اس نے جواب دیا کہ چیزیں ماوزی ٹنگ کا فرمان ہے کہ انسان غلطی کا پتلا ہے۔ ہر غلطی جرم کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس لڑکی کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ معزز مہماں کے سامنے اس کی غفلت اور غلطی کا بھانڈا پھوٹ گیا۔

ایک روز ہمارے وفد کو چیزیں ماوزی ٹنگ کے ساتھ ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ وزیر اعظم چو این لائی اور وزیر خارجہ مارشل چن ٹھی بھی وہاں موجود تھے۔ لیکن سارا عرصہ دونوں خاموشی سے مودبانہ بیٹھے رہے۔ اس وقت چیزیں ماوز کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کا گول مثول چہرہ نیم خوابیدہ بچوں کی طرح پر سکون اور مطنشن دکھائی دیتا تھا۔ مسٹر بھنو کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہی چیزیں ماوز نے جو پہلا سوال کیا یہ یہ تھا۔ (کیا مشرقی پاکستان میں امن و امان ہے؟)

اس زمانے میں مشرق پاکستان میں بظاہر کسی خاص شورش کے آثار نمایاں نہ تھے۔ اس لیے چیزیں ماوز کا یہ سوال مجھے کسی قدر بے تک اور بے موقع و بے محل محسوس ہوا۔ لیکن اس کے بعد کئی دعوتوں اور استقبالیوں میں وزیر اعظم چو این لائی اور وزیر خارجہ مارشل چن ٹھی کے علاوہ چند دوسرے چینی اکابرین بھی اپنے اپنے انداز سے ہمیں مشرق پاکستان کے متعلق خاص طور پر باخبر اور چوکنا رہنے کی فرداؤ فرداؤ تاکید کرتے رہے۔

چین کے ساتھ ہمارے سرحدی معاملے کی خبر عام ہوئی تو اس کے خلاف بھارت میں بڑا شور و غونقا ہوا، روس کو بھی یہ بات پسند نہ آئی اور امریکہ نے بھی ہمارے اس اقدام پر توبیاں چڑھائیں۔ پاکستان میں امریکی سفارت خانہ اس غلط فہمی میں بتلا تھا کہ یہ معاملہ طے کروانے میں میرا کوئی خاص ہاتھ تھا۔ اس لیے کھیانی بلی کھمبانوچے کے مصداق ان کے غم و غصے کا نیا ہد نزلہ میری ذات پر ہی گرا۔ مارچ ۱۹۶۳ء ہی سے انہوں نے صدر ایوب کے ذہن میں میرے خلاف اپنے دباؤ کا چیخ ایسے انداز سے مروڑ مروڑ کر کنا شروع کر دیا تھا کہ چھ سات ماہ کے اندر اندر مجھے پاکستان سے اٹھا کر ہالینڈ بھیج دیا گیا۔

تین برس بعد جب میں ہالینڈ سے واپس آکر وزارت تعلیم کا سیکرٹری مقرر ہوا تو ۱۹۶۶ء میں مجھے ایک بار پھر چین جانے کا موقع نصیب ہوا۔ اس بار میں چین کے ساتھ ایک ثقافتی معاملہ اور پروگرام طے کرنے گیا تھا۔ اس دورے میں میری الہیہ عفت بھی میرے براہ راست، ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے وہاں کے ہسپتالوں کا نظام دیکھنے کا شوق تھا جیسے پہنچتے ہی ایک چینی لیڈی ڈاکٹر اس کے ساتھ مامور ہو گئی اور عفت نے پیکینگ شنگھائی کے بڑے ہسپتالوں کے علاوہ دور دراز دیساں میں پہلی ہوئے چھوٹے چھوٹے شفायتوں اور ڈپنسریوں کا بھی معائنہ کیا۔

Barefoot Doctors کے عملی روانج اور روایتی نظام کا بھی اس نے کسی قدر مطالعہ کیا۔ اور ایکوپنچھر طریقہ علاج کے چند حیرت انگیز نمونے بھی اس کے مشاہدے میں آئے۔ اس کا کہنا تھا کہ چین کا طبی نظام ستا اور موثر ہے، اور ہر کس دن اس کو فوری طور پر با آسانی میر ہے۔ ایک اور دلچسپ بات اس نے یہ بتائی کہ چین میں موٹے مرد اور موٹی عورتوں کی تعداد بے حد کم ہے۔ سب سے زیادہ موٹے بچے صرف زسری سکولوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جوں جوں وہ بڑے ہو کر اگلی جماعتوں میں جاتے ہیں، اسی طرح ان کے اجسام بھی سدول ہو کر متناسب ہوتے جاتے ہیں۔

عفت کی میزبان چینی لیڈی ڈاکٹر نے وضاحت کی کہ انقلاب کے بعد سے چینی قوم نے جسمانی ورزش کو انتہائی پابندی سے اپنا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ چینی خوراک بھی صحت مند اور متوازن ہے۔ موٹاپے کا تعلق سستی، غلاظت اور جعت پسندی سے ہے۔ اس لیے چینی معاشرہ میں ہر کوئی اس سے بچنے کی سعی کرتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”چائے کے نام پر یہ جو آپ ہر وقت کھوتا ہوا گرم پانی پیتے رہتے ہیں، کیا موٹاپا روکنے میں اس کا بھی کوئی عمل دخل ہے؟“

”میں نہیں جانتی۔“ وہ بہت کر بولی۔ ”لیکن یہ ہمارا قومی مشروب ہے۔ اس میں بھی ضرور کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہو گی۔“

اس دورے کے وقت چین ماؤنٹینگ کے ثقافتی انقلاب کی زد میں آیا ہوا تھا۔ یہ ایک

عجیب اور عظیم تجربہ تھا، جو اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ چیزِ مین ماڈریٹ کی زندگی ہی میں چین کی سیاسی اور ثقافتی قیادت ۱۵ سے ۲۵ برس کی جوان سال نسل کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے، چیزِ مین ماڈریٹ کے فوجی لانگ مارچ کی طرح یہ ایک نئی طرز کا ذہنی لانگ مارچ تھا جو ناکام رہا اس کی ناکامی کی متعدد وجہات تھیں۔ اگرچہ چین کی جوان نسل نے چیزِ مین ماڈ کا بھرپور ساتھ دیا لیکن انقلابی جوش و خروش میں ان سے کچھ ایسی غلطیاں اور نیادتیاں سرزد ہوئیں، جن کی وجہ سے اس انقلاب کا مستقبل عوامِ الناس کی نظرؤں میں مشکوک اور مندوش ہو کر نہ گیا۔ اس کے علاوہ اس نئی اور جوان نسل کے اوپر ادھیر عمر اور بوڑھے لوگوں کی کم از کم دو نسلیں بعید حیات تھیں جو چین کی سیاسی اور ثقافتی قیادت سے دستبردار ہونے کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہ تھیں۔ ان دو نسلوں کے لوگ چین کی قیادت کو اپنی جائز اور ناقابل منسوخ وراثت سمجھتے تھے۔ اپنی اس وراثت پر حق قائم رکھنے کے لیے انہوں نے ثقافتی انقلاب کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ناکامی کی تیری وجہ غالباً یہ تھی کہ چیزِ مین ماڈریٹ تک ضعیف العری کی ایسی منزل میں تھے جہاں سے نوجوانوں کے اتنے عظیم اور شدید انقلاب کو اپنی زیر نگرانی کامیابی سے ہمکنار کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر چند دوسرے لوگوں نے اس انقلاب کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کی۔ یہ بات چینی دانشوروں اور پارٹی لیڈرتوں کو قابل قبول نہ تھی۔ چنانچہ چیزِ مین ماڈ کی آنکھ بند ہوتے ہی ثقافتی انقلاب نے بھی دم توڑ دیا، اور ماڈریٹ کی عظمت کے بت پر بھی بہت سی بدنما خراشیں چھوڑ گیا۔

چین کے دوسرے دورے کے دوران میں نے عظیم چینی شاعر اور دانشور کو مورو سے درخواست کی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں ثقافتی انقلاب میں ریڈ گارڈز (Red Guards) کے کسی کمپ کو جا کر دیکھ سکوں؟

انہوں نے حاجی تو نہ بھری لیکن وعدہ کیا کہ وہ کوشش کر دیکھیں گے۔ دو روز کے

بعد تین لڑکوں اور تین لڑکیوں پر مشتمل ریڈ گارڈز کا ایک دستہ مجھے ایک جیپ میں بٹھا کر پکینگ سے کافی دور ایک کمپ میں لے گیا، یہ کمپ ایک نہایت وسیع کھلے میدان میں پھیلا ہوا تھا۔ ۱۵ سے ۲۵ برس تک کے کئی ہزار لڑکے اور لڑکیاں انتہائی منظم طور پر اس کمپ میں خیمه زن تھیں۔ کمپ کی ساری آبادی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر نہایت تن وہی سے انواع و اقسام کے مشاغل میں مصروف ٹولیاں قومی اہمیت کے مختلف مسائل پر نہایت بے باکی اور گرم جوشی سے بحث و مباحثہ کر رہی تھیں۔ کسی کسی جگہ کھلی کچریاں قائم تھیں جن میں ملک کے نامور دانشور ادیب، سیاستدان اور صنعت کار ملزموں کے کثرے میں کھڑے تھے۔ ان کے خیالات، اعمال اور کردار پر کھلے بندوں طرح طرح کے الزم عائد کیے جا رہے تھے۔ اور ہر "لزم" نہایت شد و مد سے اپنی صفائی پیش کرنے میں مصروف تھا۔

ریڈ گارڈز کے اس وسیع و عریض کمپ میں ہزاروں تیز و تند اور جوانسال اذہان چقماق کے نکلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے جو انقلابی فکر و عمل کی رگڑ سے چاروں طرف شراروں کی پھلپڑیاں چھوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس کمپ میں آٹھ دس گھنٹے گزارنے کے بعد جب میں واپس لوٹا تو میرا یہی تاثر تھا کہ اگر یہ عجیب و غریب تجربہ کامیاب ہو گیا تو چین میں ایک ایسا انقلاب رونما ہو گا جو چشم فلک نے اور کہیں نہیں دیکھا اور بصورت دیگر اگر یہ تجربہ ناکام ہو گیا تو خدا جانے اس کا رد عمل کیا گل کھلائے۔

چین کے اندر وطنی حالات ان کا اپنا معاملہ ہیں۔ بیرونی سطح پر چین ہیشہ پاکستان کا قابل اعتماد، پر خلوص اور وفادار دوست ثابت ہوا ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ جب چین کے ساتھ ہماری دوستی کے فراسم ابتدائی دور سے گزر رہے تھے مجھے ان تعلقات کی پیش رفت میں کسی قدر حصہ لینے کا موقع نصیب ہوا۔ وہ دن دور نہیں جب روس اور امریکہ کے علاوہ چین بھی دنیا میں تیسری پر پاور کے طور پر ابھرنے والا ہے۔ اگر ہم نے اپنی

خارجہ پالیسی میں تدیر، تشكیر، تکفیر اور تصور کا توازن برقرار رکھا تو مجھے یقین ہے کہ چیز کے ساتھ ہماری دوستی ہر دور میں بدستور زندہ و تابندہ رہے گی۔

## ○ ایران اور ترکی اور آر سی ڈی

ایران اور ترکی میں ایک خاص قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں امریکہ کے حلقہ گوشوں میں شامل تھے۔ اس کے سوا یہ دونوں ممالک اپنے درمیان کسی قسم کا شفاقتی رواحتی یا اسلامی بھائی چارہ کھلے بندوں تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ دونوں ”جدیدیت“ کی دلمل میں بری طرح دھنسے ہوئے تھے اور اپنی اقدار کو مغربی تہذیب و تمدن کے نام نہاد سانچوں میں ڈھالنے کی سر توڑ کر شش میں بیٹلا تھے۔ بغداد پکیت عرف سینتو میں شامل ہو کر ان دونوں ممالک کا رشتہ دنیائے عرب سے مزید کٹ گیا تھا۔ اور اس طرح عالم اسلام کے ساتھ بھی ان کے رابطے میں ایک خلاء کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

اس خلاء کو پر کرنا پاکستان کے مقدر میں لکھا تھا۔ اپنی گوناں گوں مغرب پرستی اور امریکہ نوازی کے باوجود پاکستان کو یہ فضیلت حاصل رہی ہے کہ اپنے اسلامی شخص اور نصب العین کو بر ملا تسلیم کرنے اور اس کا ڈنکے کی چوت اعلان کرنے میں ہم نے کبھی کوئی حجاب یا چکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

آزادی کے بعد پاکستان کا پہلا سرکاری دوہر کرنے والے غیر ملکی سربراہ مملکت ایران کے شہنشاہ رضا شاہ پهلوی تھے۔ سکندر مرزا صاحب کی صدارت کے دوران شاہ ایران کے ساتھ یہ دوستانہ مراسم خاص طور پر گھرے ہو گئے۔ دونوں حضرات بلا تکلف فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ اور بیکم ناہید اسکندر مرزا کا تعلق بھی ایک معروف ایرانی قبیلے اور خاندان سے تھا۔ شاہ ایران اور صدر سکندر مرزا کے باہمی ذاتی اور سرکاری مراسم اس قدر گھرے نظر آئے تھے کہ ان کے جلو میں وقت فوقہ طرح طرح کی افواہیں جنم لیتی رہتی تھیں۔

اس زمانے میں اس افواہ نے بھی سر اٹھایا تھا کہ شاہ ایران کی سربراہی میں پاکستان اور ایران کی ایک متحده کنفیڈریشن بنانے کا منصوبہ تیار ہو رہا ہے۔ اگر اس قسم کی خواہش کہیں موجود تھی تو ممکن ہے ان دونوں سربراہوں کے ذہنوں کے نہایت خانے میں کسی جگہ پوشیدہ ہو۔ عملی سطح پر میں نے ایسی کسی تجویز کا کبھی کوئی ذکر نہیں سنایا تھا۔ اعلیٰ ترین سرکاری سطح پر تو ایران اور پاکستان کے باہمی تعلقات نہایت مستحکم اور خوشنگوار تھے۔ لیکن ایرانی علام، فضلا، طلباء، اساتذہ، دانشوروں اور عوام کے ساتھ ہمارا رابطہ بے حد کمزور تھا۔ اندر وون بیرون خود ایرانی حکومت کا بھی کم و بیش کچھ ایسا ہی حال تھا۔ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی اور ان کے دببار کے برگزیدہ اراکین تہران کے ایک مخصوص حصے میں ایک ایسی الگ تھلک مخلوق نظر آتے تھے جن کا اپنے وطن کی دوسری آبادی کے ساتھ بظاہر کوئی رشتہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ یہ حضرات فرانسیسی زبان بولنے کے ریا تھے اور اپنی نشت و برخاست، لباس و طعام اور بود و باش میں فرانسیسی تہذیب و تمدن اور مغربی اقدار و اطوار میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے تھے۔ ایک سرکاری دورے کے دوران میں نے شمار کیا کہ ہم نے ایرانی دبباریوں سمیت صبح سے شام تک چار مرتبہ اپنے لباس ہائے فاخرہ تبدیل کیے۔ مذاکرات کے وقت لاوانج سوٹ، لنج پر مارنگ ٹیل سوٹ۔ شام کے استقبالیہ میں بلیک ٹائی ڈزر سوٹ۔ رات کے ڈنر پر وہاںٹ ٹائی ٹیل سوٹ! اسی تہران کے گلی کوچوں میں ایسے غربا اور ماساکین کی کمی نہ تھی جنہیں شدید سردیوں میں بدن ڈھانپنے کے لیے پورا کپڑا تک میر نہ تھا اور یہاں میں جا بجا ایسی خواتین چلتی پھرتی نظر آتی تھیں جن کے پاؤں نگے اور بر قعے تار تار تھے۔

۱۹۵۸ء میں صدر ایوب نے مجرم جزل اسکندر مرزا کو بر طرف کر کے عمان اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو شاہ ایران اس تبدیلی پر کسی قدر بہم ضرور تھے۔ لیکن صدر ایوب نے ان کی خیر سکالی حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت اور کوشش سے کام لیا تیل کے بل بوتے پر جیسے جیسے ایران کی دولت اور فوجی قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی تناسب سے

شاہ میں رعونت، خودسری اور فرعونیت کا ماہ بھی پروان چڑھتا گیا۔ اس کے وجہ سے ایک طرف تو اس کے پنجہ استبداد کی گرفت ایرانی قوم پر مزید سخت ہو گئی۔ دوسری طرف ذاتی سطح پر صدر ایوب کے ساتھ اس کے تعلقات میں وہ گرمگوشی باقی نہ رہی جو کسی زمانے میں اسکندر مرزا کے ساتھ موجزن رہا کرتی تھی، بایس ہمہ پاکستان کے حق میں شاہ کے تعلقات بدستور استوار رہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر انہوں نے اپنی خیر سکالی کا عملی ثبوت بھی دیا۔ امریکہ کی لگائی ہوئی بندش کے باوجود انہوں نے خفیہ طور پر ہمیں کئی قسم کا مطلوبہ جنگی سامان فراہم کرنے میں کسی چکچاہٹ سے کام نہ لیا۔ اس جنگ کے دوران امریکہ اور برطانیہ کے رویہ پر شاہ نے شدید نکتہ چینی کی اور واشنگٹن پوسٹ کے ایک انسٹریو میں گلہ کیا کہ پاکستان یعنیو کا محبر تھا۔ اس کے باوجود ہندوستان نے اس کی سالمیت پر جارحانہ حملہ کیا، تو امریکہ اور برطانیہ نے پاکستان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران کے ساتھ بھی ایسی ہی افتاد پیش آ سکتی ہے۔

(Washington Post ۲۰ جولی ۲۰۱۷ء)

۱۹۶۷ء میں جب صدر ایوب کی آٹو بائیو گرافی "جس رنق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" (Friends Not Masters) شائع ہوئی، تو اس میں صدر جمال عبدالناصر کے حق میں چند توصیفی کلمات شاہ ایران کو بہت ناگوار گزرے۔ اس لیے صدر ایوب کا زوال ان کے نزدیک ایک قدرتی اور قابل قبول واقعہ تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ صدر ایوب کے جانشین جزل آغا محمد یحییٰ تھے جو مسلک شیعہ تھے۔ لساناً فارسی بول سکتے تھے اور مشرباً شاہ ایران کے اس فلسفہ پر عملی طور پر کار بند تھے کہ جنسی آزادی قوی ترقی کا نیشن ہے۔

امام ہمیتی کے اسلامی انقلاب سے پہلے دولت کی فراوانی، اقتدار کی بد لگائی، انداز حکومت کی بد عنوانی، اور عدل و انصاف اور اخلاق کی سونتہ سامانی کے طفیل شاہ ایران ایسی منزل

پر جا پہنچے تھے جس کے بعد اگلی منزل صرف عذاب الہی باقی رہ جاتی ہے۔ بیسوی صدی میں چشم فلک نے ایک ایسا عبرتاک نظارہ دیکھا کہ ایک شخص کے دنیا بھر میں جگہ جگہ مال و دولت کے انبار جمع ہیں۔ جایجا بڑے بڑے شاہانہ محلات اس کے انتظار میں چشم راہ کھڑے ہیں۔ لیکن نہیں کی ساری وسعت اس پر سکر گئی ہے اور وہ اپنی قبر کے لیے دو گز نہیں کی تلاش میں ساری دنیا میں مارا مارا پھر رہا ہے۔

ایران کے بر عکس ترکی میں پاکستان کی حیثیت کی نوعیت مختلف تھی۔ حکومتی سطح پر ترکی اور پاکستان کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ اور مخلصانہ رہے ہیں۔ خاص طور پر صدر جلال بیار اور وزیر اعظم عظیم عدنان مینڈرس کے دور حکومت میں ان تعلقات میں کسی حد تک ذاتی گرمبوشی کا عصر بھی نمایا تھا۔ لیکن ان کے زوال کے بعد بھی دونوں حکومتوں کے تعلقات میں کوئی کبھی کمزوری یا دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن ترک عوام میں عموماً اور سیدھی سادی دیساتی آبادی میں خصوصاً پاکستان کے لیے ہمیشہ خیر سگائی اور عزت و احترام کا جذبہ موجز نہ رہا ہے۔ اس جذبے کی اصلی بنیاد ان کا اسلام کے ساتھ گرا لگاؤ ہے۔ کیونکہ ترک عوام انتہائی سچ کے اور جامیت مسلمان ہیں۔ چند مخصوص اور محدود طبقوں کی دین سے بے اعتنائی اور بے زاری کے باوجود یہ ترکی کے غیور عوام ہی کی برکت ہے کہ انہوں نے یورپ کے عین دہانے پر اپنے وطن کو اسلام کا ناقابل تغیر قلعہ بنائے رکھا ہے۔ وہ دن بہت زیادہ دور نہیں جب وہاں پر اسلام کے نام پر شرمنے والے احساس کمتری کے مارے ہوئے مریضانہ عناصر بھی عنو معطل ہو کر رفتہ رفتہ پر وہ عدم میں روپوش ہو جائیں گے۔

بغداد پکیٹ عرف سینو میں شمولیت کی وجہ سے دنیائے عرب کی ایران، ترکی اور پاکستان کے ساتھ بے گاگنی اور برگشتگی کا احساس کافی شدید حد تک بڑھ چکا تھا حکومتی سطح پر ایران اور ترکی کو اس صورت حال سے کوئی خاص پریشانی لاحق نہ تھی۔ لیکن عربوں کے ساتھ ہمارے جذباتی اور روایتی لگاؤ اور اسلام کے ساتھ ہماری کھلم کھلا وابستگی کے

پیش نظر پاکستان کے لیے یہ صورت باعث تشویش تھی۔ صدر ایوب کا خیال تھا کہ یعنوں کی مخالفت اس وجہ سے ہے کہ اسی پکیٹ کی نوعیت سیاسی اور فوجی ہے۔ اس مخالفت کا زور توڑنے کے لیے انہوں نے ہمیخالِ ممالک کے مابین تجارتی، ثقافتی اور معاشی تعاون کے لیے کوئی مناسب اداہ قائم کرنے کا ڈول ڈالا۔ یہ خیال شاہ ایران اور ترکی کے صدر گورسل اور وزیر اعظم عصمت اتوں کو بھی پسند آیا۔ شاہ نے اپنے طور پر افغانستان کو بھی اس نئے معاملے میں شامل کرنے کی سر توڑ کوشش کی جس میں وہ ناکام رہے۔ اس طرح ۱۹۶۳ء میں آر۔ سی۔ ڈی کا اداہ وجود میں آیا۔

### ○ صدر ناصر

نومبر ۱۹۶۰ء میں مصر کا سرکاری دوہرہ کرنے سے پہلے صدر ایوب کے دل میں صدر ناصر کے متعلق وہی جذبات اور تعصبات موجود تھے جو اس زمانے میں دوسرے بہت سے پاکستانیوں کے دلوں میں موجود تھے۔ بر سر اقتدار آنے کے بعد صدر ناصر نے جس سختی سے اخوان المسلمين کی تحریک کو کچلنا شروع کر دیا تھا، اس کی وجہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں رنج و اضطراب کی ایک لہر دوڑی ہوئی تھی، دنیائے عرب کے عین مخدھار مصر میں روس کا بظاہر بے تحاشا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ بھی عالم اسلام کے نزدیک کوئی نیک فال تصور نہ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اتحاد المسلمين کی بجائے جب صدر ناصر نے عرب نیشنلزم کا نعرہ انتہائی زور و شور سے اپنا لیا تو یہ بات بھی بہت سے پاکستانیوں کے نزدیک بڑی مایوس کن تھی۔ اس کے علاوہ نسر سویز پر فرانسیسی اور برطانوی حملے کے موقع پر پاکستانی حکومت اور اس کے نمائندوں نے جس بے تدبیری، بے حسی اور غیر مردوی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس پر صدر ناصر کو قدرتی طور پر اس قدر شدید غم و غصہ تھا کہ اپنی ایک تقریر میں انہوں نے پاکستان کو ”مغربی سامراجیت کے زر خرید غلام“ کے لقب سے نوازا تھا۔ اسی غیظ و غصہ کے عالم میں انہوں نے ایک اور موقع پر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ نسر

سویز مصر کو اتنی ہی عزیز ہے جس قدر کہ کشمیر ہندوستان کو عزیز ہے۔ ان افسوسات واقعات کی وجہ سے پاکستان میں صدر ناصر کی شخصیت ملے جلے جذبات اور طرح طرح کے شک و شبہات کی دھول میں اٹی ہوئی تھی۔

قاہرہ میں چند روز کی ملاقاتوں اور مذاکرات کے بعد صدر ایوب کے ذہن سے صدر ناصر کی ذات پر جمی ہوئی گرد بڑی حد تک چھٹ گئی۔ جمال عبدالناصر کے کردار میں کوئی بدنما پیچ و خم نہ تھا۔ وہ صوم و صلوٰہ کے پابند تھے اور ان کے چہرے مرے سے صدق و صفا، خلوص اور دیانتداری کی پھوار پیکتی تھی ان کی گفتگو میں سادگی، متانت اور (directness) راستی کا رنگ غالب تھا۔ مذاکرات کے پہلے ہی دور میں انہوں نے بچپن ہی سے اسلام کے ساتھ اپنی والہانہ وابستگی، شاہ فاروق کے عمد میں مصر کی شدید پستی، جزل نجیب کے ذہنی اور نظریاتی کشمکش، مصر میں امریکہ کے عزم اور پالیسیوں کی طرف سے بے یقینی اور مایوسی اور رد عمل کے طور پر مصر کا روس کی جانب جھکاؤ کی تفصیلات پر ایسا سمجھہ، مدبرانہ اور متوازن تبصرہ کیا جس میں صدر ناصر کے جذبات اور احساسات کی دلسوzi کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

ایک موقع پر صدر ایوب نے کہا ”تاریخ میں پہلی بار یہ موقع آیا ہے کہ بہت سے اسلامی ممالک حقیقی طور پر آزاد اور خود مختار ہوئے ہیں۔ کیا میرا اور آپ کا یہ فرض نہیں کہ ہم مل کر غیر مسلم ممالک میں اسلام کی تبلیغ اور ترویج کے لیے بھی کوئی عملی قدم اٹھائیں؟“

یہ سن کر صدر ناصر نے بے اختیار اپنی نشست سے کسی قدر اٹھے اور جذبات میں بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ”آپ کی بابت تو میں کچھ نہیں جانتا۔ صرف اپنے متعلق کہتا ہوں کہ میں اپنے اس فرض سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہیں ہوں۔“

اس کے بعد صدر ناصر نے وضاحت کی کہ غیر جانبدارانہ تحریک کے ساتھ ان کی وابستگی

اور روس کے ساتھ سفارتی اور سیاسی گھٹ جوڑ، یہ سب دنیاداری کے دھندے ہیں۔ تو شنہ آخرت کے طور پر وہ صرف دین کی خدمت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اعداد و شمار کی مدد سے ہمیں کئی منصوبے بتائے جن کے ذریعہ وہ افریقہ کے کئی ملکوں میں تبلیغ اسلام کے لیے کیا کیا خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

صدر ایوب نے چند بار صدر ناصر کو گھیر گھار کر کشمیر کے موضوع پر لانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نمایت چاک دستی سے طرح دیکر اس موضوع پر کچھ کہنے سے کافی کتراء جاتے تھے۔ پھر اچانک نیشنل یونین کے ایک عظیم اشان جلسہ میں ایک نمایت دچپ واقعہ رونما ہوا۔ یہاں پر صدر ناصر نے ایک طویل اور ولولہ انگیز تقریر کی جس کے دوران سامعین نے عموماً اور نوجوان طبقہ نے خصوصاً بار بار فلک شگاف نعرے بلند کر کے تمہین و آفرین کے ڈونگرے بر سائے۔ اس تقریر میں دنیا بھر کے مسائل کا ذکر تھا۔ لیکن بے چارے پاکستان کے کسی مسئلہ کی طرف ہلاکا سا بھی اشانہ موجود نہ تھا۔ جب صدر ایوب کی باری آئی تو انہوں نے اپنی پسلے سے تیار شدہ تقریر لپیٹ کر ایک طرف رکھدی اور نمایت دھیسے اور پروقار لبجے میں گھنٹہ بھر ایک انتہائی مدلل اور موثر فی البدیلہ تقریر کرتے رہے۔ ان کی کھڑی کھڑی باتیں سن کر پسلے تو سامعین پر سنائیا سا چھایا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ نوجوان طبقہ نے ان کی باتوں کا اثر قبول کر کے وقت فوقہ نمایت پر جوش نعرے لگانا شروع کر دیے۔

صدر ایوب نے اپنی تقریر میں تاریخی حوالے دے کر فلسطین سمیت دنیائے عرب کے ہر مسئلہ پر پاکستان کی بھرپور حمایت اور یقینتی کا احوال بیان کیا۔ اور کسی قدر دکھ کے ساتھ گلہ کیا کہ پاکستان کو اپنی گوناں گوں مشکلات اور مسائل میں عربوں کی ہمدردی اور حمایت کا ابھی تک انتظار ہے۔ اس موقعہ پر انہوں نے صدر ناصر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہلاکا سا توقف کیا اور پھر ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”مستقبل میں ہمیں آپ کی جواں سال قیادت سے بہت سے خوشگوار امیدیں ہیں۔“ اس فقرے پر سارا ہال تالیوں

سے گونج اٹھا، اور سامعین نے صدر ایوب اور صدر ناصر کے حق میں نہایت پر جوش نعرے لگائے۔

صدر ناصر نے صدر ایوب کی فی البدیلہ تقریر نہایت غور اور توجہ سے سنی۔ میں قریب ہی بیٹھا ٹکٹکی باندھ کر ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ان کا رو عمل بھانپتا رہا۔ میرا انداز ہے کہ ایک دو مقامات پر وہ کسی قدر کھیانے ہو کر مسکرائے۔

صدر ایوب کی تقریر ختم ہوئی تو صدر ناصر نے نہایت گرمجوشی سے ان کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا۔

(Truth and sincerity win the hearts of people.

Indeed there is no substitute for truth and sincerity)

(سچائی اور خلوص لوگوں کا دل جیت لیتے ہیں، بے شک سچائی اور خلوص کا کچھ نعم البدل نہیں۔“

مصر کے اس دورہ نے یہ حقیقت صدر ایوب پر روز روشن کی طرح عیاں کر دی تھی کہ مشرق و سطی میں صدر ناصر کے مقابلے میں کسی اور رہنمایا کا چراغ جانا ناممکن ہے۔ اس بات کا اعتراض انہوں نے اپنی کتاب (Friends Not Masters) میں کسی قدر محتاط انداز سے کیا، تو شاہنشاہ ایران اس پر چراغ پا ہو گئے۔

صدر ناصر کا انعام دل ٹکٹکی، ناکامی اور مایوسی کی آغوش میں ہوا۔ زندگی بھر ان کے انقلابی فلسفہ کا کوئی مقدمہ یا منصوبہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ عرب یشلم کا بلند بانگ نعروہ کھوکھلا ثابت ہوا۔ بین المللکتی سطح پر مصر اور شام کا اتحاد تاریخیت کی طرح ثبوت گیا۔ تنظیم آزاد فلسطین کی پامالی اور ٹکست و ریخت کا عمل بھی ان کی آنکھوں کے سامنے شروع ہو چکا تھا۔ خاص طور پر اردن میں مهاجرین فلسطین کے کیپوں پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑے گئے۔ وہ ان کی ناکامیوں کے تابوت کا آخری کیل تھے۔

صدر ایوب کے دورہ مصر کے نو برس بعد مجھے ایک بار پھر صدر ناصر سے ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ صدر ایوب کے زوال کے بعد جزل بھی پاکستان میں بر سر اقتدار آ گئے تھے۔

میں بھی ملازمت سے مستغفی ہو کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ تاہم میں ذاتی حیثیت سے یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر منتخب ہو چکا تھا۔ ان دونوں عرب ممالک یہ شکایت کر رہے تھے کہ یہ وحشی سمت مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل نے فلسطینی مهاجر بچوں کے لیے یونیسکو کے قائم کردہ سکولوں میں یہودی استاد تعینات کر کے غیر اسلامی نصاب تعلیم جاری کر دیا ہے۔ یونیسکو کے اپنے ذرائع سے جب ان شکایات کی خاطر خواہ تصدیق نہ ہو سکی تو میں نے اسرائیل کا خفیہ دوہہ کر کے اصل صورت حال تحقیق کرنے کی پیشکش کی۔ اس منصوبہ کو صدر ناصر کی منظوری اور سرپرستی حاصل تھی۔ اسی سلسلے میں انہوں نے مجھے قاہرہ طلب کر کے ملاقات کا موقع دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ پچھلے نو برس کے دوران صدر ناصر کی شخصیت میں نہیں آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اب وہ جسمانی اور ذہنی طور پر اپنی عمر سے بہت زیادہ بوڑھے نظر آتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اولوالعزمی کی وہ پہلی سی چمک دمک دمک پڑ چکی تھی۔ مغرب کا وقت آنے پر انہوں نے نماز تو ضرور ادا کی، لیکن مجموعی طور پر اسلام کے متعلق ان کے نظریات اب کسی قدر زنگ آلوو نظر آتے تھے۔ وہ اس بات پر خوش تھے کہ مصر کے دانشوروں کی نئی نسل مصر کی عظمت کے ڈانٹے دور فراعنة کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ملانے میں کوئی حجاب یا ہچکپاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ خاص طور پر وہ اس پر بھی مطمئن تھے کہ نوجوان لڑکیوں کے زیورات اور بناؤ سنگھار کا فیشن دن بدن فرعونوں کے زمانے کی سچ وجہ میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ صدر ناصر کافی دری قوموں میں تسلسل ثقافت کی اہمیت پر کسی قدر بے سروپا باتیں کرتے رہے۔ ان کے نزدیک مصر کی تاریخی عظمت میں کئی دوسری تحریکیوں کی طرح اسلام کی تحریک کا بھی اہم حصہ تھا۔ ان کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ دوام تاریخ کو حاصل ہے تحریک کو نہیں۔

جس طرح دنیائے عرب اور میں الاقوامی سیاست میں صدر ناصر منفی اثرات کے علاوہ کوئی تغیری کردار ادا نہ کر سکے۔ اسی طرح غالباً آخری عمر میں وہ اپنی ذہنی اور باطنی دنیا

میں بھی انتشار، اضطراب، اپتری اور پرائنگی کا شکار رہے۔ یہ ایک ایسے انسان کی عبرت اک  
مثال ہے جس کی خوبیوں پر اس کی بے برکتیاں غالب آگئیں۔

## ○ صدر ایوب کے دیگر غیر ملکی دورے

صدر ایوب کے اور بھی کئی غیر ملکی دوروں میں مجھے ان کی ہمراہی کا موقع حاصل ہوا۔  
ان ممالک میں برطانیہ، کینیڈا، مغربی جرمنی، یو گوسلاویہ، لبنان، عراق، سعودی عرب، برماء،  
فلپائن، ہانگ کانگ، سنگاپور، اندونیشیا اور جاپان شامل تھے۔ اس کے علاوہ اپریل ۱۹۶۵ء  
میں وہ روس بھی گئے تھے۔ اس زمانے میں ہالینڈ میں میں بطور سفیر معین تھا۔ اس لیے  
ان کے اس اہم دورے کا مجھے ذاتی طور پر کوئی علم نہیں۔ البتہ صدر ایوب کے دل  
میں یہ خوش نہی قائم تھی کہ اس دورے کی وجہ سے وہ پاکستان کے متعلق روی لیدروں  
کے دل میں جبی ہوئی سرد مری کی برف کو کسی حد تک پھلانے میں کامیاب ہو گئے  
ہیں۔

## ○ لندن

کامن ولٹہ وزراء اعظم کانفرنس میں شرکت کے لیے صدر ایوب قریباً قریباً ہر دوسرے  
برس لندن جایا کرتے تھے۔ اس کانفرنس میں کوئی بڑا مسئلہ تو کبھی حل نہ ہوا لیکن  
انگلستان میں بے ہوئے لاکھوں تارکین وطن کی فلاج و بہود کے لیے یہ اجتماع اکثر و  
بیشتر سو دن مدد ثابت ہو جایا کرتا تھا۔ یوں بھی دولت مشترکہ کی حکومتوں کے سربراہوں  
کا میل جوں باہمی خیر سکالی کو فروغ دینے کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔ اس موقع سے فائدہ  
انھا کر صدر ایوب نے ایک دو بار پنڈت نہرو کے ساتھ کشمیر کے بارے میں کچھ مفید  
مطلوب گفتگو کرنے کی کوشش ضرور کی۔ لیکن ہر بار پنڈت جی چکنا گھڑا ہی ثابت

ہوتے رہے۔

میرے خیال میں کامن ویلٹہ سے ہماری علیحدگی جلد بازی سے کیا ہوا ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ ہمارے اس احتجاج سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی بلکہ اتنا پاکستان ہی ایک بنے بنائے بین الاقوامی فورم پر کوئی موثر کردار ادا کرنے سے محروم ہو گیا۔ کامن ویلٹہ کی برادری میں ہمارے دویاہ شامل ہونے کی خواہش اور کوشش کے جواب میں زیانی کلائی تو سب ہمارا ساتھ دینے کی حاوی بھرتے ہیں لیکن عملی طور پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یقیناً ہندوستان ہماری کامن ویلٹہ میں ازسر نو شمولیت کی راہ میں طرح طرح کے روڑے انکانے میں کوئی وقیفہ فرد گذاشت نہ کرے گا۔ اس کے علاوہ برطانیہ اور چند دیگر ممالک بھی غالباً یہی چاہتے ہیں کہ عبرت کے طور پر ہماری اچھی طرح ناک رگڑوائے بغیر کامن ویلٹہ میں ہماری واپسی کی راہ بعجلت اور با آسانی ہموار نہ ہو۔

ایک روز لندن میں اتفاقاً میری ملاقات بیگم ناہید اسکندر مرزا سے ہو گئی وہ نوکری ہاتھ میں لے ایک دکان سے بزری خرید رہی تھیں۔ پہلے تو انہوں نے کافی کترانے کر مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑھ کر سلام کیا تو بڑی خندہ پیشانی سے ملیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اگر میں ان کے میاں سے ملاقات کرنے ان کے ہاں آنا چاہوں تو اس میں کوئی اعتراض کی بات تو نہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ ”ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ تمہارے باس ایوب خاں کو ضرور اعتراض ہو گا۔“

میں نے کہا کہ میں صدر ایوب سے اجازت لے کر ہی ملنے آؤں گا بیگم ناہید مرزا بولیں۔ ”ایوب خاں شکلی مزاج کا آدمی ہے۔ اپنا برا بھلا سوچ سمجھ کر اجازت مانگنا۔“

میرے اصرار پر انہوں نے مجھے اپنا ایڈریس اور ٹیلیفون نمبر دے دیا جو خفیہ رکھنے کی غرض سے انہوں نے ٹیلیفون ڈائریکٹری میں درج نہ کروائے تھے۔

اپنے ہوٹل واپس آ کر میں نے صدر ایوب کو بیگم مرزا سے ملاقات کا واقعہ سنایا تو ان کے ہونٹوں پر ایک کینہ درانہ سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ بولے۔ ”اچھا تو بیگم صاحبہ اب ٹوکری اٹھائے سبزی خریدتی پھر رہی ہیں۔ ایک زمانے میں ان کا دماغ اتنا گبڑا ہوا تھا کہ وہ پاکستان کی ملکہ بننے کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔“

میں نے صدر ایوب سے اسکندر مرزا صاحب کو ملنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے حیرت سے مجھے گھور کر دیکھا، اور کہا۔ ”کیا ضرورت ہے ملنے کی؟“

میں نے وضاحت کی کہ میں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے اور معزوفی کے عین بعد ایوان صدارت سے رخصت کے وقت وہ میرے لیے ایک فاؤنسنیں پن کا تحفہ بھی چھوڑ گئے تھے۔ اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ میں خود مل کر ان کا شکریہ ادا کروں۔

صدر ایوب نے کسی قدر سوچ کر جواب دیا۔ ”تم اصرار کرتے ہو تو تھوڑی دیر مل آؤ۔ اسکندر چرب زبان آدمی ہے۔ اس کی باتوں پر نیا وہ دھیان نہ دیتا۔“

میں ٹیلیفون پر وقت طے کر کے رات کے ساری ہے نو بجے اسکندر مرزا صاحب کے ہاں پہنچا۔ فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو بیگم مرزا نے دروانہ کھولا۔ ہائیڈ پارک کے قرب میں اچھا خاصا کشاہ فلیٹ تھا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کسی پاکستانی صنعتکار نے انہیں رہائش کے لیے وہ رکھا تھا۔ فرنچر کافی پرانا اور معمولی تھا۔ باقی ساز و سامان بھی کسی قدر بویسیدہ نظر آتا تھا۔ اسکندر مرزا صاحب ڈرینگ گاؤن پسے ڈرینینگ روم میں کھڑے وہ سکلی پی رہے تھے۔ غالباً انہیں ثقل ساعت کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ اونچا سنتے تھے، اور خود بھی بلاوجہ اونچا بولتے تھے۔ بیگم مرزا نے مجھے کافی بنا کر پلاٹی اور ایوان صدر کرائی سے اپنے اخراج کا واقعہ کسی قدر تلغیت نہیں میں سنایا۔ انہیں خاص طور پر یہ گلہ تھا کہ جو جریل صاحبان اسکندر مرزا سے استغفاری طلب کرنے آئے تھے وہ ڈراؤے کے طور پر اپنے ساتھ ایک موٹا سا بریگیڈیر بھی لائے تھے جس نے جارحانہ طور پر ایک فوجی پستول بھی اپنی کمر سے لٹکا رکھا تھا!

اسکندر مرزا صاحب نے پاکستان یا صدر ایوب کے متعلق میرے سامنے کوئی بات نہ کی۔ وہ نیا وہ تر اپنی گرتی ہوئی صحت اور لندن میں زندگی کی مشکلات کا روتا روتے رہے۔ قریباً نصف گھنٹہ گزرنے کے بعد انہوں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”تمارے آنے کا شکریہ! میرا خیال ہے اب تمہیں چلا جانا چاہیے۔“

بیگم مرزا نے کہا۔ ”آغا اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو یہ آیا ہے۔“

”نمیں خانم۔“ اسکندر مرزا صاحب بولے۔ ”کچھ بعید نہیں کہ دوسری جانب بھی کوئی گھڑی لیے حاب لگا رہا ہو کہ یہ کتنی دیر یہاں بیٹھا ہے۔“

اسکندر مرزا صاحب طبع شاہ خرج انسان تھے۔ ان کے کئی دوسرے ملنے والوں سے میں نے یہی سنا کہ لندن میں اکثر انہیں تنگدستی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ ان کے ذی اثر انگریز دوستوں نے انہیں چند ریسانہ کلبوں کا ممبر مفت بنوا دیا تھا جہاں وہ اپنا برج کھیلنے کا شوق با آسانی پورا کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ریجسٹریشن شریٹ میں دیرا سوائی ریشورٹ کے بوڑھ آف ڈائریکٹر نے انہیں اپنے شعبہ ایکسپورٹ کا ڈائریکٹر بھی نامزد کر رکھا تھا، جہاں سے انہیں کوئی معقول معاوضہ بھی ضرور ملتا ہو گا۔ لیکن کراچی کے ایوان صدر میں تین ساڑھے تین برس داد عیش دینے کے بعد لندن میں کمپری کی زندگی کا دونوں میاں یہوی کے لیے سوہان روح ثابت ہونا ایک لازمی اور قدرتی امر تھا۔

## ○ مارشل ٹیٹو

یو گوسلاویہ کے دورے پر مارشل ٹیٹو سے ہماری ملاقات ایک نہایت دلکش اور فرحت بخش تجربہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں مارشل ٹیٹو ہٹلر اور مسولینی کے خلاف اپنے وطن کی آزادی کے لیے ایک گوریلا جنگی ہیرو کے طور پر عالمی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ جنگ

کے بعد روس سے ایک زردست نظریاتی نکر لے کر انہوں نے یو گوسلاویہ کو ایک نبٹا آزاد، کشاہ اور غیر قشید طرز اشتراکیت کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ غیر جانبدارانہ تحریک کی تخلیق، قیام اور فروع میں بھی ان کا نام سرفراست تھا۔ صدر ایوب کے ساتھ مذاکرات کے دوران مارشل نیٹو کی شخصیت کا نقش بذا رفع الشان اور پر شوکت طور پر ابھرا۔ واقعات عالم کا عموماً اور پاکستان کے مسائل کا خصوصاً انہیں گمرا شعور تھا۔ خاص طور پر مسئلہ کشمیر پر ان کی سوجھ بوجھ انتہائی منصفانہ اور حقیقت پسندانہ تھی۔ غیر جانبدارانہ تحریک کے حوالے سے ان کے پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ بید گھرے ذہنی اور سیاسی رشتے تھے لیکن مسئلہ کشمیر پر انہوں نے اپنا موقف انصاف اور حقائق کی بنیادوں پر ہی استوار رکھا۔ اور استھواب رائے کی تجویز کے خلاف کچھ نہ بولے ایسی سطح کے بے لائگ اور باوقار مدر کے سامنے صدر ناصر جیسے رہنماء کو تاہ قد بالشتبہ نظر آتے تھے جو عارضی مصلحتوں اور ذاتی مروتوں کے ایچ پچ میں الجھ کر منصفانہ اصولوں کی حمایت سے بھی منحرف ہو جاتے تھے۔

## ○ صدر سوئیکارنو

انڈونیشیا کے دورے میں صدر ایوب کی صدر احمد سوئیکارنو سے خوب گاڑھی چھپنی۔ ان دونوں حضرات کے مزاج میں نہیں و آسمان کا فرق تھا۔ ڈاکٹر سوئیکارنو لو و لعب کے رسیا تھے اور ان کے کردار میں شوخی، چلبلاہٹ اور زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سرکاری ضیافت اور دوسری تقریبات سے فارغ ہو کر صدر ایوب تو رات دس یا گیاہ بجے تک سونے کے لیے چلے جاتے تھے لیکن صدر سوئیکارنو چیدہ چیدہ مہمانوں کو روک کر ڈانس ہال میں رقص و سرود کی محفل گرم کرتے تھے۔ تین تین چار چار گھنٹے تک مغربی اور انڈونیشی ڈانس اپنا رنگ جاتے تھے جنمیں ڈاکٹر سوئیکارنو خود بھی انتہائی ولوں اور انہماک سے حصہ لیتے تھے، صبح کے تین یا چار بجے کے قریب یہ مجلس برخاست ہوتی

تھی۔ نہ معلوم وہ سوتے کب تھے کیونکہ صبح سات بجے دن کی پہلی تقریب میں صدر سوئیکارنو ہشاش بشاش، چاق و چوپند تانہ دم موجود نظر آتے تھے۔

URDU4U.COM  
صدر سوئیکارنو بے حد نازک مزاج اور نفاست پسند طبیعت کے مالک تھے۔ وہ دن بھر میں تین یا چار بار لباس تبدیل کرتے تھے اور موقع و محل کے حساب سے بربی یا بحری یا ہوئی فوج کی وردی نسبت فرماتے تھے۔ کسی مقام پر چلتے چلتے اگر چند قدم بھی دھوپ آ جاتی تھی تو ایک اے۔ ڈی۔ سی لپک کر انہیں سولا ہیٹ پیش کر دیتا تھا، اس کے بعد چھاؤں میں قدم رکھتے ہی وہ فوراً دوسری ٹوپی پہن لیتے تھے۔ اسی طرح لکھنے پڑھنے کے علاوہ دھوپ اور چھاؤں میں استعمال ہونے والی عینکیں بھی وہ بار بار تبدیل کرتے تھے جو ان کے اے۔ ڈی۔ سی نہایت پابندی اور اہتمام سے ان کی خدمت میں پیش کرتے رہتے تھے۔

صدر ایوب کو اپنے ہمراہ لے کر صدر سوئیکارنو جمال کہیں جاتے تھے رنگ برنگ کے کپڑوں میں ملبوس نوجوان لڑکیاں دور رویہ قطاروں میں کھڑے ہو یہ ان کا استقبال کرتی تھیں اور پھولوں کی پتیاں ان پر نچحاور کرتی تھیں۔ پھر انڈونیشی ترانوں کے ساتھ کچھ رقص پیش کیے جاتے تھے اور اس کے بعد کسی دوسرے پروگرام کی باری آتی تھی۔

خاص طور پر جزیرہ بالی میں بالکل پرستان کا سماں تھا۔ چاروں طرف پھولوں سے لدی ہوئی نازک اندام پر اچین عورتوں کے جھنڈ کے جھنڈ جگہ جگہ محور رقص و سرود تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جزیرے کی ساری آبادی کا واحد نصب العین گانا اور ناچنا ہے۔ جزیرے کی دو شیزاریں قدم قدم پر صدر سوئیکارنو کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھیں اور وہ ان کے درمیان راجہ اندر کی طرح گھل مل کر خوشی سے پھولے نہ ساتے تھے۔

بندوںگ میں صدر سوئیکارنو نے ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اپنے زور خطابت کا کمال دکھانے وہ صدر ایوب کو بھی اس جلسے میں لے گئے۔ چار پانچ لاکھ کا مجمع تھا۔ صدر سوئیکارنو ڈیڑھ گھنٹہ تک بے تکان بولتے رہے۔ وہ ایسے جادو بیان مقرر تھے کہ لاکھوں کا ہجوم دم بخود انتہائی خاموشی سے انہیں سنتا رہتا تھا۔ پھر اچانک وہ سامعین میں جوش

و خروش کی ایسی بجلی دوڑاتے تھے کہ سارا مجع سمندر کے جوار بھائے کی لہروں کی طرح تھے و بالا ہو جاتا تھا۔ اس جوش و خروش اور زیر و زر میں بہت سے لوگ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ اور رفاه عامہ کے رضاکار انسین ایمپولینسون میں ڈال ڈال کر ہسپتال لے جاتے تھے۔ صدر سوئیکارنو کی تقریر انڈونیشی زبان میں تھی۔ لیکن انہوں نے جگہ جگہ قرآن شریف کی چھوٹی چھوٹی عربی آیات بھی بکثرت استعمال کیں۔ اس کے علاوہ وہ متعدد بار ولندیزی زبان میں بھی گرجے برے۔ میرے ساتھ مامور مترجم لڑکی نے بتایا کہ غصے میں آکر صدر سوئیکارنو جب کسی کو ڈانٹتے ہیں یا گالی دیتے ہیں تو ایسے موقع پر بے اختیار ڈچ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ غلامی کے دور میں انڈونیشی قوم نے ڈچ زبان میں گالی گلوچ اور ڈانٹ ڈپٹ سنتے سنتے کئی صدیاں گزاری ہیں۔ غالباً اسی لیے ڈانٹ اور دشام کے لیے یہ زبان اب ہماری گھٹتی میں پڑی ہوئی ہے!

صدر سوئیکارنو مغربی سامراجیت کی عجیب و غریب کہانیاں بیان کرنے کے بڑے شوقین تھے۔ ایک محفل میں انہوں نے انگریزی زبان کے متعلق ایک لطیفہ اس طرح سنایا۔

"In their arrogance and superiority complex, the British imperialists did not refrain even from corrupting their own language. For instance, their grammar says that the word "arrive" should be followed by the "at". So you arrive at Washington, at Rome, at Berlin, at cario, at Karachi, Delhi, at Jakarta, at Tokyo, in short, at every place in the world except London - the capital of British Empire. According to the Standard English grammar, you arrive not at but in London."

ذکرات میں صدر سوئیکارنو کی ہمدردیاں واضح طور پر پاکستان کے ساتھ تھیں وہ پنڈت نہرو سے بالکل مرعوب نہ آتے تھے۔ بلکہ پنڈت جی کی دانشوری میں حیله سازی اور مکاری کی ملاوٹ خوب بھانپ چکے تھے۔ اس کے علاوہ ایشیا کی قیادت کا سرا اپنے سر باندھنے کا جو خناس پنڈت جی کے دماغ میں سمایا ہوا تھا وہ بھی ڈاکٹر سوئیکارنو کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ روس اور امریکہ دونوں سے کسی قدر بدل اور مایوس تھے اور چین کی جانب ان کا جھکاؤ صاف اور غیر مبہم تھا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں انہوں نے جس

کھلے دل سے ہماری عملی مدد کی اسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

صدر سوئیکارنو کی پالیسیوں کی وجہ سے روس اور امریکہ ان کے برابر کے دشمن تھے۔ ۱۹۷۵ء

URDU4U.COM

کے بعد سے بھارت بھی ان کے خون کا پیاسا تھا۔ انڈونیشی عوام میں وہ اس قدر مقبول تھے کہ کوئی اندروئی سازش ان کا بال بیکا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ جی بی اور سی آئی اے دونوں کی ساز باز اور سانحہ گانٹھ بروئے کار آئی، اور دنیا کی دو متصادم اور متحارب پر پاورز کے اشتراک عمل نے انڈونیشی قوم کو اس کے محبوب ”بنگ کارنو“ (عظمیم بھائی) سے محروم کر دیا۔

جس زمانے میں صدر سوئیکارنو انڈونیشیا میں اقتدار سے معزول ہوئے۔ اس وقت میں ہالینڈ میں بطور سفیر معین تھا۔ میں نے چند نہایت اہم، نازک اور خفیہ ذرائع سے صدر سوئیکارنو کے خلاف سازشوں کی تفصیلات معلوم کر کے صدر ایوب کو ایک (Top Secret) رپورٹ پہنچی تھی۔ اس رپورٹ میں میں نے ان خلطوں کی نشاندہی بھی کی تھی کہ جن پر پاکستان میں ان کے خلاف بھی ہچل اور کھلبلی نمودار ہونے کا امکان تھا۔ اس وقت تو صدر ایوب نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن جب ان کے خلاف چلنے والی تحریک اپنے عروج پر تھی تو ایک روز انہوں نے کسی قدر حرست سے مجھے کہا۔ ”آج میں نے تمہاری ہالینڈ والی رپورٹ پھر نکلا کر پڑھی ہے۔ بے شک تمہارے سب اندازے صحیح تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔“

## ○ جاپان

جاپان کے دورے میں جب ہم نوکیو پہنچے تو ہمیں شہنشاہ ہیرودتو کے ایک ذاتی محل میں ٹھہرایا گیا جو خاص خاص موقع پر مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد جاپان کی ثافت بظاہر امریکی اثرات کی زد میں آگئی تھی۔

لیکن دراصل اس قوم کی روح اپنی قدیمی روایات اور اقدار کے جادہ سے ذرا بھی نہ بھکلی تھی، بے شک جاپانیوں کے دماغ جدیدیت کی روشنی سے منور تھے لیکن ان کے دل بدستور قدامت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ تھے۔ عیر ملکی سیاحوں کی لطف اندوزی کے لیے انہوں نے اپنی گیشاوں کو روایتی کیمینو پہنا کر بڑے بڑے عالیشان نائٹ کلبوں کی نیت بنا دیا تھا۔ لیکن گھروں کی چارویواری میں جاپان کے اپنے قدیمی رہن سُن، لباس، خوراک، پوشاک اور رسوم و رواج کا چلن مسلسل اور غیر منقطع طور پر جاری و ساری تھا۔ اگرچہ مذہب کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی لیکن شہنشاہ پرستی کے جذبہ میں کوئی فرق نہ آیا تھا، اگر کوئی جاپانی باہر بازار میں ہم میں سے کسی کے پاس شاہی مہمان خانے کا سگریٹ یا ماچس کی ڈبیا کا کافنڈ کا پنکن دیکھ لیتا تھا جس پر بادشاہ کے ذاتی نشان کی علامت ثبت ہوتی تھی تو فرط حیرت و عقیدت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی نہ جاتی تھیں اور وہ ہماری طرف یوں دیکھنے لگتے تھے جیسے ہم کسی دوسرے خلائی کہ کی مخلوق ہوں، ہماری پارٹی کا ایک رکن کسی دکان میں سوٹ کیس خریدنے گیا۔ اس کے ہاتھ میں مہمان خانے کی ایک ماچس کی ڈبیہ تھی جس پر بادشاہی emblem کا نشان ثبت تھا۔ دکاندار نے پہلے تو وہ ڈبیہ لے کر چوما اور سر آنکھوں سے لگایا اور پھر نہایت لجاجت سے یہ ڈبیہ اپنے پاس رکھنے کے لیے مانگ لی۔ ہمارے دوست نے بخوبی اسے دے دی۔ شکرانے کے طور پر دکاندار نے سوٹ کیس کی قیمت وصول نہ کی۔

پوری جاپانی قوم جس محنت اور لگن سے دن رات محنت کرنے کی عادی ہے اس کی مثال دنیا بھر میں اور کہیں نہیں ملتی۔ ہم نے ملک بھر میں کوئی بھک منگا نہیں دیکھا۔ نہیں کی اصل قدر و قیمت بھی جاپان میں نظر آئی۔ وہاں پر آبادی زیادہ اور نہیں کی وسعت کم ہے جہاں کہیں بھی اراضی کا کوئی قطعہ موجود ہے، وہ لازمی طور پر تعمیراتی، یا صنعتی یا زرعی مقاصد کے لیے زیر استعمال ہے۔ ہم نے ریل اور موڑ کار کے ذریعہ جاپان میں کئی لمبے سفر کیے۔ ہمیں غالی نہیں کہیں نظر نہیں آیا۔ شروں کی

سرکوں کے کناروں پر، دیہاتوں کے گلی کوچوں میں یا گھروں کے اندر یا باہر کسی کونے  
کھدرے میں جہاں بالشت دو بالشت خالی نہیں نظر آئے، جاپانی فوراً وہاں پر موسمی پھول  
اور سبزی ترکاری بو دیتے ہیں۔ ہم نے نوکیو کے گنجان ترین علاقوں میں مکانوں اور دکانوں  
کی دلیزوں کے کونوں اور کناروں میں اس طرح کی بے شمار لمحاتی ہوئی کھیتیاں دیکھی  
ہیں۔

جاپان جانے سے پہلے ہم برا میں بھی چند روز کے لیے ٹھہرے تھے۔ واپسی پر پھر ایک  
روز وہاں پر رکے۔ اس وقت برا کے وزیر اعظم مسٹر اونو تھے۔ وہ بدھ بھکشوؤں کی طرح  
ایک درویش سیرت انسان تھے۔ ان کے متعلق مشور تھا کہ وہ ہر سال کم از کم ایک  
ماہ کسی غار یا معبد میں معتکف ہو کر عبادت اور مرائبے میں برس رکتے تھے۔ انہوں  
نے صدر ایوب سے پوچھا کہ ان کا جاپان کا دوہ کیا رہا؟ صدر ایوب نے جاپانی قوم  
کی انتحک محنت، لگن اور ترقی کی خوب تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”جاپانی لوگ واقعی  
مشین کی طرح کام کرتے ہیں۔“

یہ سن کر مسٹر اونو کھلکھلا کر ہنسے اور بولے ”بے چارے بد نصیب جاپانی۔ انسان کی  
عظمت انسان بننے میں ہے۔ مشین بننے میں نہیں۔“

وزیر اعظم اونو نے قوموں کی مادی ترقی کے متعلق اپنا فلسفہ کسی قدر تفصیل سے بیان کیا  
جس کا لب لباب یہ تھا یہ زمانہ مادی ترقی کا زمانہ ہے۔ رفتہ رفتہ مادی ترقی ساری دنیا  
کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گی جس طرح کہ برف، مٹی اور رنگ کا توہہ پہاڑ  
کی چوٹی سے پھلتا ہے۔ اگر کوئی ملک مادی ترقی سے بچنے کی کوشش کرے بھی تو وہ  
اس میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا، ہم سب مادی ترقی کی زد میں بے دست و پا مقید  
ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ترقی یافتہ ہو کر بھی انسان ہی رہیں۔ ایسی مشین نہ بن  
جائیں جس میں حرکت تو تیز ہو لیکن روح نداردا!

## • ماں جی کی وفات

۲ مارچ ۱۹۶۲ء کو رات کے ساری گیاہ بجے ماں جی جناح ہسپتال کے ایک کمرے میں اچانک ہم سے رخصت ہو گئیں۔ اس وقت میری جیب میں ریل گاڑی کے دو ٹکٹ تھے۔ کیونکہ اگلی صبح میں نے ان کو اپنے ہمراہ لے کر راولپنڈی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ لیکن انہوں نے یک ایک اپنا ارادہ بدل لیا، اور اکیلے ہی اکیلے سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

ماں جی کو کراچی کے قبرستان میں چھوڑ کر جب میں تھا راولپنڈی واپس پہنچا۔ تو معاً یوں محسوس ہوا کہ گھر کی چھت اڑ گئی ہے اور اب دھوپ، بارش اولے اور آندھی سے بچنے کا کوئی حفاظتی سارا موجود نہیں رہا۔ ایوان صدر میں اپنے دفتر گیا تو وہ بھی اجزا اجزا سا نظر آیا۔ کئی روز تک میرے سامنے میز پر فائلوں کا مپنڈہ جمع ہوتا رہا اور میں دیر تک اس ڈھیر پر سر نکائے بے حس و حرکت بیٹھا رہتا تھا۔ چند بار سب سے اوپر والی فائل بھیگ جاتی تھی۔ جسے میرا اردو عرفان باہر دھوپ میں رکھ کر سکھا لاتا تھا۔

ایک روز نہ جانے دل میں کیا ابال اٹھا کہ فائلیں میز پر جمع ہوتی رہیں۔ اور میں ایک کلفڈ پر سر جھکائے بے ساختہ ”ماں جی“ کے عنوان پر ان کے بارے میں لکھتا رہا۔ لکھنے آنکھوں سے بار بار آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرتے تھے اور کلفڈ پر تحریر شدہ الفاظ کو بھگو کر لکھروں کی صورت میں پھیلا دیتے تھے۔ میرے اردو نے بتایا کہ اس دوران صدر ایوب کوئی بات کرنے بذات خود میرے کمرے میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مجھے کلفڈ پر جھکے ہوئے آنسو بھاتے دیکھا۔ تو بغیر کچھ کہے نے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ دو تین گھنٹے میں میری تحریر مکمل ہو گئی اور دل پھول کی پتی کی طرح ہلکا ہو گیا۔ صدر کے ملاحظہ کے لیے میں نے جلدی جلدی چند فائلیں تیار کیں۔ اور انہیں لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ان کی میز پر فائلوں والی ٹرے خالی پڑی تھی اور

وہ کرسی میں نیم دراز سے ہو کر کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ میری فائلوں کو انہوں نے خاموشی سے دیکھا اور ان سب پر مناسب احکامات درج کر کے مجھے لوٹا دیں۔ جب میں اٹھ کر باہر آنے لگا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے واپس بٹھا لیا۔ چند لمحے مکمل خاموشی طاری رہی پھر وہ نہایت نرم اور ہمدردانہ لمحے میں بولے۔ ”مجھے احساس ہے کہ تمہارا زخم ابھی ہرا ہے۔ میری مانو تو چند روز کے لیے سواد ہو آؤ۔ تم اور نگ نزیب اور اس کے والد کو اچھی طرح جانتے ہو۔ خوش مزاج اور زندہ دل لوگ ہیں۔ میں انہیں ٹیلیفون کر دوں گا۔ شاید تمہارا غم کسی قدر ہلاکا ہو جائے۔“ میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے کہا۔ ”سر، آج ایک خاص بات تھی۔ وہ پوری ہو گئی ہے۔ اب میں بالکل نارمل ہوں۔“

”ایسی کیا خاص بات تھی؟ کچھ ہمیں بھی اعتماد میں لو۔“ وہ نرمی سے بولے۔ میں نے کسی قدر بچکچاہت سے جواب دیا۔ ”سر، میں نے اپنی ماں کی یاد کو الفاظ میں ڈھال کر کافند پر منتقل کر دیا ہے۔ اب یہ الیہ صرف میرا ہی غم نہیں رہا۔“ ”کہاں چھپواو گے؟ انہوں نے پوچھا۔

”کسی رسالے میں۔ غالباً نقوش میں۔“ میں نے جواب دیا۔

”جب چھپ جائے تو مجھے بھی پڑھنے کے لیے دینا۔“ انہوں نے فرماش کی کچھ عرصہ بعد جب ”ماں جی“ نقوش میں شائع ہوئی۔ تو میں نے رسالہ کی ایک جلد صدر ایوب کی خدمت میں بھی پیش کر دی۔ معلوم نہیں انہوں نے اسے کبھی پڑھا بھی یا نہیں۔

البتہ بت سے دوسرے لوگوں نے اسے شوق سے پڑھا۔ اور عرصہ تک مجھے نہایت اچھے اچھے خط آتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد جب ابن انساء نے ”نفسانے“ کے منتخب افسانوں کو شامل کر کے میری تحریروں کے ساتھ ”ماں جی“ نام کی کتاب شائع کروائی۔ تو اب بھی وقہ فوقہ کچھ قارئین مجھے بڑے حوصلہ افزا خط لکھتے رہتے ہیں۔

”ماں جی“ پر اردو کے نامور افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، ”ناول سٹ“، نقاد اور دانشور میرزا ادیب کا تبصرہ بھی جو ”نقوش“ کے سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) میں شائع ہوا تھا، یہاں پر شامل کر رہا ہوں۔

میری طرح کے جزو قتنی نیم ادیب کے لیے یہ تبصرہ بڑا قیمتی اور باعث صد افخار ہے۔  
یہی احساس اسے یہاں پر نقل کرنے کے لیے میرے لیے وجہ ترغیب ہے یہ خود ستائی کی بات نہیں بلکہ جذبہ تشكیر کا اظہار ہے۔

○○○

## • مال جی

## اردو ادب کا ایک زندہ کار نامہ

میرزا ادب  
 اگر آپ قدرت اللہ شاپ کا نام لیتے ہیں  
 اور آپ کے ذہن میں یہ نام لیتے ہی "مال  
 جی" کا تصور نہیں ابھرتا، تو یوں سمجھئے کہ آپ  
 نے شاپ کا پورا نام نہیں لیا۔ اسی طرح  
 آپ "مال جی" کا ذکر کرتے ہیں اور ایک  
 برقی روکی مانند شاپ کا نام آپ کے دماغ  
 میں در نہیں آتا۔ تو "مال جی" کا ادھورا  
 خیال آپ نے کیا ہے۔ اصل میں قدرت اللہ  
 شاپ اور "مال جی" اس طور پر ایک دوسرے  
 سے وابستہ ہو گئے ہیں کہ ایک نام دوسرے  
 نام کے بغیر غیر مکمل لگتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں ان گنت  
 ایسی تحریریں مظہر عام پر آئی ہیں، جنہوں نے  
 اپنے مصنفوں کو شہرت کے بلند سے بلند تر  
 افق پر پہنچا دیا ہے، مگر ایسی تخلیقات بہت  
 کم وجود پذیر ہوئی ہیں جو اپنے غالقوں کا ایک  
 طرح سے جزو لانیفک بن گئی ہیں۔ جو اپنے  
 غالقوں کو اپنے ساتھ لے کر چلی ہیں اور

ہمیشہ ہم قدم رہی ہیں۔ ہم قدی کا یہ انداز ”ماں جی“ اور قدرت اللہ شباب کے ہاں موجود ہے۔

شباب بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کی تعداد چالیس پینتالیس سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن ”ماں جی“ لکھ کر تو انہوں نے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا ہے جو گردش شام و سحر کے درمیان پہلے بھی بہت نمایاں تھا اور آج بھی اس کی اس قابل رشک حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس افسانے کو نہ جانے میں نے کتنی مرتبہ پڑھا ہے اور ہر بار اس کی پراسرار مقناطیسی کیفیت میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے اور چھائی ہوئی ہے۔

”ماں جی“ کا ایک حد تک تجزیاتی مطالعہ کرنے سے پہلے شباب کی دو ایک خصوصیات کا ذکر ضرور کروں گے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شباب نے مختصر افسانے کے اساسی تقاضوں کو بہت اچھی طرح سمجھ کر ادب کی اس صنف کی طرف بھرپور توجہ کی ہے۔ ان کا افسانہ صحیح معنوں میں مختصر افسانہ ہوتا ہے۔ افسانے کی پوری تحریر میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا فقرہ ملے گا جو افسانے کی تعمیر میں اس حد تک اہم حصہ نہ لے کر اسے فالتو سمجھا جاسکے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں طنز کیسیں تو واضح طور پر محسوس ہو جاتا ہے اور کہیں دبا دبا رہتا ہے۔ طنز کا جو رنگ شباب میں ہے، اردو کے کسی بھی افسانہ نگار کے ہاں نہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد نے شباب کو اردو کا سب سے بڑا طنز نگار افسانہ نگار کہا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

آئیے اب شباب کے اس افسانے کی طرف توجہ کرتے ہیں جس کا عنوان ”ماں جی“ ہے اور جسے میں نے شباب کا جزو لاینک قرار دیا ہے۔ ماں کا اولین فقرہ یہ ہے:

”ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔“

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال کیونکر معلوم ہو سکتا تھا۔ صحیح سن ولادت تو اس شخص کا معلوم ہو سکتا ہے جس کا تعلق دوران وقت سے ہو۔ جو ہستی زمان و مکان کے حدود

سے ماورا ہو اسے وقت کے پیانے سے کیسے ناپا جا سکتا ہے؟ ”ماں جی“ ایک ہستی، ایک فرد، ایک شخصیت کی بجائے، آفاقی مامتا کا تصور دیتی ہے۔ ایک انلی اور ابدی وجود (Motherhood) شباب نے یہ الفاظ جب لکھے تھے، تو ان کے ذہن میں یہ تصور نہیں ہو گا، جس کی طرف میں نے اشائہ کیا ہے۔ مگر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم غیر شعوری طور پر کچھ ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں جن کی اپنی کتنی پر تیں ہوتی ہیں۔ شباب نے ایک عام مفہوم کے لیے یہ فقرہ لکھا ہے۔ مقصود ان کا اپنی والدہ کے سن پیدائش سے ہے جو انہیں معلوم نہیں، لیکن یہ فقرہ لکھتے وقت انہیں یہ احساس نہیں ہو گا کہ وہ ایک خاص ماں کا ذکر نہیں کریں گے بلکہ حقیقتاً اس روح کا کریں گے جو ہر ماں کے اندر کار فرمًا ہے۔ جو آفاقی ہے اور جسے عام مفہوم میں ”متا“ یا مامتا کہا جاتا ہے۔

”ماں جی“ نے دنیا میں آنے کے بعد ایک ایسے ماحول میں اپنی طفولیت کا دور گزارا ہے جو حد درجہ معصوم ہے۔ ان کے والد کے پاس چند ایکڑ زمین تھی، جو نر کی کھدائی میں ختم ہو گئی تھی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضہ دیئے جاتے تھے۔ یہ بزرگ معاوضہ لینے کے ڈھنگ سے واقف ہی نہیں تھے۔ نتیجہ یہ کہ معاوضہ حاصل کرنے کی بجائے خود نر کی کھدائی میں محنت مزدوری کرنے لگے۔ تو یہ ماں جی کے والد تھے۔

اب دیکھئے جو لڑکی ایسے باپ کے زیر تربیت اپنے شب و روز گزارے گی وہ قدرتاً کس سانچے میں ڈھنل جائے گی۔ اسے دنیا داری کی کیا خبر ہو گی؟ اس کے باطن میں اول تو وہ انگلیں پیدا ہی نہیں ہوں گی جو ایک سوجھ بوجھ اور زمانے کے نشیب و فراز کو سمجھنے والی ہستی میں پیدا ہو سکتی ہیں اور اگر پیدا ہوں گی بھی تو صبر و شکر کے گھرے احساس میں مدغم ہو جائیں گی۔

”ماں جی“ کا سفر بڑی سادگی کے عالم میں شروع ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے شاداب راستوں پر سفر نہیں کرتیں۔ ان راہوں پر قدم اٹھاتی ہیں جن پر کہیں کہیں سایہ دار درخت

مسافر کو تیز دھوپ سے بچا لیتے ہیں۔ بس وہ اسی کو زندگی کا انعام سمجھ لیتی ہیں اور کبھی بھی حرف شکایت لب پر نہیں لاتیں۔ ان کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ بقر عید کا تھوار آتا ہے تو ان کے والد انہیں تین آنے بطور عیدی کے دے دیتے ہیں۔ یہ تین آنے اتنی بڑی رقم تھی کہ اس کا مصرف ہی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

یہ تین آنے ان کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہتے ہیں۔ پھر ایک روز وہ گیا وہ پیسوں کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیتی ہیں اور ایک پیسہ اپنے پاس محفوظ رکھتی ہیں۔

اس کے بعد جب کبھی ان کے پاس گیا وہ پیسے جمع ہو جاتے ہیں، تو کسی مسجد کے دیے میں تیل ڈالنے کا انتظام کر لیتی ہیں، اس کے علاوہ ان گیا وہ پیسوں کا کوئی مصرف وہ نہیں جانتیں۔ ”ماں جی“ کی اس حرکت یا طریق عمل کو مخفی ایک رسی اور روایتی کہا جائے گا مگر ایسا نہیں ہے۔ شباب نے ماں جی کی اس عادت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

”ساری عمر جعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بخلی آگئی، لیکن لاہور اور کراچی جیسے شروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ”ماں جی“ کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ چونکہ وہ جعرات کی شب تھی۔“

شباب کے اس افسانے کا ایک ایک فقرہ بلا بلیغ اور پر معنی ہے۔ مگر یہ پیرا جو میں نے نقل کیا ہے، اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ اس کے ذریعے ”ماں جی“ کا پورا کردار واضح ہو جاتا ہے۔

میں نے ماں جی کے کردار پر غور کیا ہے تو یہ باتیں میری سمجھ میں آئی ہیں۔ تمہیدی سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ ”ماں جی“ ایک فرد واحد تو ضرور ہیں مگر ان

کا کردار فرد واحد سے نیا وہ اس جذبے کی تجسیمی صورت ہے جو ماتا کھلاتا ہے۔ خداۓ رحیم و رحمن نے نزول رحمت کی خاطر بے شمار ذرائع اختیار کئے ہیں لیکن ان ذرائع میں سب سے موثر، سب سے قوی اور ہمہ گیر اور آفاق گیر ذریعہ ماتا ہے۔ پیدا کرنے والے نے ماتا کو اپنی رحمت کا مظہر بنا کر اس خاکدان تیرہ و تاریک میں بھیجا ہے۔ رحمتوں کی ایک صورت ضیا افروزی ہے اور ”ماں جی“ کا یہ عمل جس کی وساطت سے وہ اندھروں میں روشنی پھیلاتی ہیں۔ نزول رحمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان کے عمل سے روشنی پھیلتی ہے اور روشنی رحمت و برکت کا دوسرا نام ہے۔

روشنی وہیں پھیلاتی جاتی ہے، جہاں تاریکی ہو۔ ماں جی جہاں بھی رہتی ہیں تاریک گوشوں کو ڈھونڈتی رہتی ہیں کہ وہاں جا کر روشنی بکھیریں۔ یہ عمل ہنگامی نہیں، عارضی نہیں، مستقل ہے۔ خدا کی رحمت جب مستقل ہے تو دنیا میں اس کی رحمت کا مظہر عارضی کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہاں ایک اور بات کا بھی خیال رہے۔ ماں جی کی اس روشنی کا تعلق مجدوں سے ہے۔ مجدوں کے حوالے سے یہ روشنی جو ان کے دم قدم سے ظہور پذیر ہوتی ہے، ایک قسم کا تقدس حاصل کر لیتی ہے۔

رحمت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ خود کو چند افراد، چند خاندانوں، چند لوگوں تک محدود نہیں کرتی۔ کیا سورج جب طلوع ہوتا ہے تو وہ اپنی کرنوں کو پھیلانے کے لیے رنگ، نسل، امارت، غربت وغیرہ کا امتیاز روا رکھتا ہے۔ کیا یہ کرنیں سیاہ فام نسل انسانی کو اپنا نور دینے سے انکار کر دیتی ہیں۔ کیا یہ کرنیں اوپنچے مکانوں کے ارد گرد ہی اپنا دامن پھیلا دیتی ہیں۔ غریبوں کی جھونپڑیوں کی طرف نہیں جاتیں؟

ماں جی تو سب کے لیے ہیں۔ رحمت خداوندی کی طرح۔ وہ سب کا بھلا چاہتی ہیں۔ ان کی دعا ہے ”سب کا بھلا“

ماں جی کو ایک بالکل مختلف خاتون کی حیثیت سے شباب نے پیش کیا ہے۔ ایک تو وہ زمانہ تھا کہ ”ماں جی“ اور ان کا خاندان بمشکل اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ روکھی سوکھی کھا کر سب سو جاتے تھے یا مخت مزدوری کرنے لگتے تھے مگر ماں جی کے شوہر جب گلگت

کے گورز بنے تو ان کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بغلہ، وسیع باغ، نوکر چاکر، دروازے پر سپاہیوں کا پرہ۔ لیکن ماں جی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس سارے جاہ و جلال نے ان کی طبیعت میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ وہ ویسی کی ویسی رہی۔ بالکل سادہ، درولیش منش خاکسار۔ اگر وہ کوئی عام عورت ہوتیں، تو ان کے خیالات بدل جاتے۔ مگر وہ تو سب کی طرح ہونے کے باوجود سب سے مختلف تھیں۔

کیا وہ حق مجھ ایک آئینڈیل ہستی تھیں؟ عام انسانوں سے ماوراء، محض ایک زندہ، متحرک نصب العین۔

ماں جی میں ہزار دو ہزار خوبیاں موجود ہیں مگر شباب اس گھری حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ انسان دیوتا کی عزت کرتا ہے۔ اس کی عظمت کا نہ دل و جان اعتراف کرتا ہے۔ مگر اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ پیار نہیں کر سکتا۔ پیار وہ انسان ہی سے کرے گا۔ شباب کا یہ انتہائی خوب صورت کردار بڑا اونچا، بڑا مختلف کردار ہے۔ لیکن اپنی ساری خوبیوں، اپنی ساری بلندی کے باوصف وہ آخر ایک انسان ہی رہتا ہے۔

ایک بار ”ماں جی“ رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں، جو ہر عورت کا اپنی ورثہ ہے۔ گلگت میں ہر قسم کے احکامات ”گورزی“ کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔ ”بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں،“ لیکن گورزی گورزی کہہ کر مجھ غریب کا نام مجھ میں کیوں لایا جاتا ہے، ”خواہ مخواہ“

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے، رُگ طرافت پھرک اٹھی اور بے اعتمانی سے فرمایا۔ ”بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورزی تو دراصل تمہاری سوکن ہے۔ جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔“

یہ سن کر ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔ آخر ایک عورت تھیں۔ سوکن کا جلاپا مشہور ہے۔ اگر وہ اس مقام پر وسعت قلب کا مظاہرہ کرتیں، تو وہ شاید اس سے نیا وہ عظیم کردار بن جاتیں۔ مگر انسانی دنیا سے الگ

تحلیگ ہو جاتیں۔ ہمارے دلوں میں ان کے لیے صرف عظمت ہوتی، صرف احترام ہوتا۔ وہ پیار نہ ہوتا، جو ہم ان سے کرتے ہیں، وہ محبت نہ ہوتی جو انہیں انسانوں کی اس دنیا میں حاصل ہے کیونکہ ایک کردار کی صرف عزت کرنے کے لیے اس کی ملکوتی صفات کی ضرورت ہوتی ہے اور جب اس کی عزت بھی کی جائے، اس سے پیار بھی کیا جائے، اس سے محبت بھی کی جائے تو یہ اس کی انسانی صفات کی وجہ سے ہوتا ہے۔

شباب کا ناقابل فراموش کردار ”ماں جی“ جہاں اپنے اندر ملکوتی صفات رکھتا ہے، وہاں انسانی صفات سے بھی محروم نہیں ہے۔ ملکوتی اور انسانی صفات اسے عظیم اور پیارا کردار بنا دیتی ہیں۔ میں نے اپر بتایا ہے کہ طنز نگاری کا جو جوہر شباب میں ہے۔ وہ اردو کے بہت ہی کم نثر نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔ ان کے یہاں طنز کی کاٹ بڑی گھری ہوتی ہے۔ اس پورے افسانے پر سنجیدگی کی فضا چھائی ہوتی ہے۔ مگر شباب کا قلم یہاں بھی طنز کا رنگ جمادیتا ہے۔

”ماں جی“ دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں اور اب شباب کا مسئلہ ان کے اپنے الفاظ میں سنئے۔

اگر ”ماں جی“ کے نام پر خیرات کی جائے تو گیاہ پیسے سے زیادہ کی ہمت نہیں ہوتی لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بھلی کا ریث بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔ ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو تکنی کی روئی اور نمک مرچ کی چشمی سامنے آتی ہے۔ لیکن کھانے والا درویش کہلاتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاو اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

آخر میں ایک فقرہ لکھنا چاہتا ہوں، شاید اسے ایک رسی فقرہ گردانا جائے مگر میں اپنی طرف سے ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں، مجھے یقین ہے کہ اگر شباب صرف یہی ایک افسانہ لکھ کر قلم ہاتھ سے رکھ دیتے تو بھی وہ ادب کی تاریخ میں زندہ رہتے۔ فقط اس افسانے کی بدولت، یہ افسانہ زندہ رہنے والی تخلیقات میں سے ہے، تو پھر اس تخلیق کا خالق کیوں کر فراموش کیا جا سکتا ہے؟

شباب نے اس افسانے میں ایسی نثر کا نمونہ دیا ہے جسے میں شعری اصطلاح میں سل ممتنع کہہ سکتا ہوں۔ ایسی نثر لکھنے کی ہزار کوشش کرو، نہیں لکھی جائے گی۔ وہ شاعری نہیں کرتے مگر ان کی اس نثر میں شاعری موجود ہے۔ ایسی روانی جیسے ہم اقبال کا "ساقی نامہ" پڑھ رہے ہیں۔

"پچھہ لگا" کی ترکیب یا تو محمد حسین آزاد کے ہاں پڑھی تھی یا شباب کے ہاں پڑھ رہے ہیں۔ یہ ترکیب انہوں نے اس طرح استعمال کی ہے۔ انہی دنوں پچھہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے۔

کتنا سبک فقرہ ہے۔ "پچھہ" کی جگہ اطلاع لفظ رکھنے فقرے کی ساری خوبصورتی پا مال ہو کر رہ جائے گی۔

"ماں جی! آپ کی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟" ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

"توبہ توبہ پت" ماں جی کافلوں کو ہاتھ لگاتیں۔

اس "توبہ توبہ پت" کا جواب نہیں ہے۔

یہ افسانہ پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں ایک سوال آیا تھا۔ ممکن ہے کسی اور قاری کے ذہن میں بھی یہ سوال آیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ شباب نے "ماں جی" کے کردار کو تو بہت خوش اسلوبی سے بنایا سنوارا ہے۔ اپنے باپ کے کردار کی طرف توجہ کیوں نہیں کی۔ وہ انہیں افسانے میں جہاں کہیں ان کا ذکر آتا ہے "عبداللہ صاحب" کہتے ہیں۔

میں عرض کروں گا کہ "ماں جی" کے کردار میں جیسا کہ میں نے کہا ہے، شباب نے "یونیورسل مدرہوڈ" یا ان کے آفاقی جذبے کی تجھیم کی ہے۔ باپ کے معاملہ میں ان کے پیش نظر کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ ان کے والد مکرم کا کردار بھی اپنی جگہ ایک منفرد کردار محسوس ہوتا ہے۔

سرید احمد خاں عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلواتے ہیں کہ انگلستان میں جا کر آئی

سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔ مگر عبدالله صاحب کی والدہ بیٹی کو انگلستان جانے سے روک دیتی ہیں۔

عبداللہ صاحب وظیفہ واپس کر دیتے ہیں، سریں سخت خفا ہو کر پوچھتے ہیں۔ ”کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو۔“

”جی ہاں“ عبدالله صاحب جواب دیتے ہیں۔

کیا یہ اس کردار کی انفرادیت نہیں ہے۔ مگر اس افسانے کا مرکزی کردار ”ماں جی“ ہی ہے۔ ”ماں جی“ جو سدا بھار کردار ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والا کردار ہے۔

(ب) شکریہ ”نقوش“ لاہور

○○○

## • صدر ایوب سے گا زوال

صدر ایوب کے زوال کے اسباب مفرد نہیں بلکہ مرکب تھے۔ ان کے اقتدار کے عصا کو ۱۹۶۹ء سے برسیں پہلے زوال کی دیمک نے اندر ہی اندر چاننا شروع کر دیا تھا لیکن حکمرانی کی ترینگ میں انہوں نے کبھی اسے محسوس نہ کیا۔

صاحب اقتدار کا زوال سب سے پہلے اس کے اپنے اندر شروع ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ صدر ایوب کی نیت کو گھن لگنا کس وقت شروع ہوا۔ (اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان کی نیت میں ابتدا ہی سے کوئی فتور تھا) نیتوں کا اندانہ قرائی شادت ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ فروری ۱۹۶۲ء میں ایک صاحب مدرس (بھارت) سے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں گزارنے سعودی عرب جا رہے تھے۔ ایک برس سے ان کے بہت سے خطوط مدرس سے آچکے تھے کہ پاکستان میں چند روز قیام کے دوران وہ صدر ایوب سے ضرور ملتا چاہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ علم جعفر کے بہت بڑے ماہر ہیں اور ایوب خاں کو چند اہم پیشیں گوئیاں سنانا چاہتے ہیں۔ صدر کے ساتھ ان کی نصف گھنٹہ کی ملاقات بڑا صبر آزم مرحلہ تھی۔ کیونکہ ان صاحب کی عمر سو برس سے اوپر تھی۔ ضعیف العمری اور لکھت کے علاوہ وہ بہت اونچا سنتے تھے۔ ان کی گفتگو بھی کافی حد تک بے سر و پا تھی۔ لیکن ایک بات جو ہمارے پلے پڑی، وہ یہ تھی کہ ان کے علم جعفر کی رو سے صدر ایوب پاکستان پر آئھ یا نو برس تک حکومت کریں گے۔

جب وہ صاحب چلے گئے تو صدر ایوب نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”یہ بڑھا کیا بک رہا تھا کہ میں آئھ یا نو برس حکومت کروں گا۔ کیا اس کے علم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ نیا آئین نافذ ہو رہا ہے جس میں میری صدارت کی معیاد فقط دو سال اور ہے۔ اس کے بعد نئی اسمبلیاں ہوں گی اور نئے وزر ہوں گے۔ شاید وہ صدر بھی نیا منتخب کرنا

چاہیں۔

میرا اندانہ ہے کہ اس وقت یہ ان کی ایماندارانہ رائے تھی جو سراسر نیک نیت پر منی تھی۔ لیکن اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کا رخ بدل گیا۔ اور نیک نیت کا سارا بھرم نفسانی خواہشات، آئینی ترمیمات اور سیاسی ریشه دوائیوں کی نذر ہو گیا۔ اس انحطاطی عمل کا آغاز بظاہر مئی ۱۹۶۳ء میں شروع ہوا۔ جب صدر ایوب نے قومی اسمبلی میں اپنے آئین میں دوسری ترمیم منظور کروائے کے لیے سر توڑ کوشش شروع کر دی۔ آئین کی رو سے صدر کے انتخاب سے پہلے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات مکمل ہونا لازمی تھے لیکن اب صدر ایوب کی نیت بدل گئی۔ ان کے ایماء پر اس بندوبست کو الٹ کرنے کے لیے جو آئینی ترمیم پیش کی گئی، اس کے خلاف قومی اسمبلی میں شدید رد عمل ہوا۔ ترمیم منظور کرنے کے لیے اسمبلی میں مطلوبہ ووٹوں کی تعداد حاصل کرنا دشوار ہو گئی، تو حکومت نے دھونس، دھانڈلی، لاجج اور فریب سے کام لے کر حزب مخالف کے آٹھ اراکین کو توڑ لیا۔ اس سے قبل صدر ایوب نے بڑے اہتمام سے پولٹیکل پارٹیز ایکٹ میں یہ شرط رکھوائی تھی کہ اگر قومی یا صوبائی اسمبلی کا کوئی ممبر اپنی پارٹی چھوڑے گا تو اسے اسمبلی کی نشست سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا اور اس نشست کے لیے اسے از سر نو انتخاب لڑنا ہو گا۔ لیکن قومی اسمبلی کے آٹھ بھگوڑے ممبروں کے خلاف ایسی کوئی کارروائی عمل میں نہ لائی گئی بلکہ ان میں سے ایک کو تو بعد ازاں ہائیکورٹ کا بچ بھی بنا دیا گیا۔ دوسرے سات ممبروں کو کیا انعام دیا گیا، اس کا مجھے علم نہیں۔

چنانچہ اس ترمیم کے ذریعہ اب یہ قرار پایا کہ نیا صدر منتخب ہونے تک موجودہ صدر بدستور عنان اقتدار میں رکھے گا۔ اور صدر کا انتخاب مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے قبل عمل میں لایا جائے گا۔ بلاشبہ ان آئینی تبدیلیوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ اگلے انتخاب میں صدر ایوب کا پلہ بھاری رہے۔ صدارتی انتخاب میں دھانڈلی کی راہ ہموار کرنے کے لیے آئین کی یہ توڑ مروڑ عوام کی نظرؤں سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی۔ اور صدر ایوب کے اپنے بنائے ہوئے آئین کی ان کے اپنے ہاتھوں پامالی نے ان کی ذات

پر بھرم اور بھرو سے کا گراف کئی درجہ نیچے گرا دیا۔

اس ترمیم کے جلو میں اسی برس کیکے بعد دیگرے دو مزید آئینی ترمیم بھی معرض وجود میں آئیں۔ ایک کے ذریعے دیہاتی سطح پر نمبرداروں، انعام داروں، سفید پوشوں اور ذیلداروں کو بنیادی جمیوریتوں کے انتخابات لڑنے کا اہل قرار دے دیا گیا تا کہ حکومت کے اپنے کارندے اور حلقوں بگوش زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان اداروں میں شامل ہو سکیں۔ دوسری ترمیم سے سرکاری ملازمین کی معیاد ملازمت اور بسکدوشی کے نئے قواعد و ضوابط نافذ ہو گئے اور حکومت کی گرفت ان کی شہ رگ پر براہ راست اور بھی مضبوط ہو گئی۔ ان اقدامات سے ان شکوک و شبہات کو مزید تقویت ملی کہ صدر ایوب سیاست کے علاوہ نظم و نتیجے کے ہر شعبے میں بھی طرح طرح کے ہتھنڈے استعمال کر کے اگلا صدارتی انتخاب ہر قیمت پر جیتنے کا جال بچھا رہے ہیں۔

ان آئینی ترمیم کے ساتھ ہی صدر کے عہدہ کے لیے انتخابی مسم پرے نور و شور سے شروع ہو گئی۔ ملک کے بہت سے سربر آوروں صدر ایوب کی مخالفت کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ ان میں خواجہ ناظم الدین، میاں ممتاز دولتانہ، شیخ مجیب الرحمن، مولانا بھاشانی، خان عبدالولی خان، چودھری محمد علی اور مولانا مودودی کے نام سر فرست تھے۔ ان رہنماؤں کی قیادت میں کونسل مسلم لیگ، عوامی لیگ، بیشن عوامی پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کے اتحاد سے ”کمپانی اپوزیشن پارٹیز“ کی تنظیم قائم ہوئی۔ جس کا واحد مقصد صدر ایوب کو صدارتی انتخابات میں شکست دینا تھی۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور مشترکہ لائجہ عمل یا منشور نہ تھا۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ یہ متحده محاذ ایک ایسا صدارتی امیدوار نامزد کرے جو ایوب خان کو شکست دینے کی الہیت رکھتا ہو۔ ان کے سامنے ایک نام تو مس فاطمہ جناح کا تھا جو قائد اعظم کی بن ہونے کے ناطے سے ملک بھر میں ایک خاص عزت و احترام اور جذباتی قدر و منزلت کی حامل تھیں۔ دوسرا امکان جزل محمد اعظم

خان کے نام کا تھا۔ گورز کے طور پر وہ مشرقی پاکستان میں نمایاں ہر دلعزیزی حاصل کر چکے تھے۔ اور وزیر مهاجرین و بھالیات کی حیثیت سے وہ مغربی پاکستان میں بھی خاصے نیک نام تھے۔ مس جناح کی جگہ اگر جزل اعظم کو صدارتی امیدوار نامزد کیا جاتا تو یقیناً صدر ایوب کو بہت نیازِ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا لیکن وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اس موقع پر ایک عجیب ترپ کی چال چلی۔ نیشنل عوای پارٹی کے ایک متاز رکن مسٹر مسح الرحمن سے ان کا گمرا یارانہ تھا۔ مسح الرحمن بھٹو صاحب کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کے علاوہ مولانا بھاشانی کے دست راست بھی تھے۔ ذاتی طور پر وہ اچھی شرط کے مالک نہ تھے۔ اور سیاست میں مول تول کرنے کے اسرار و رموز سے واقف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر بھٹو نے انہیں پانچ لاکھ روپے کے عوض خرید لیا۔ بعض ذراائع تو اس پانچ لاکھ روپے کی بانٹ میں مولانا بھاشانی کو بھی شراکت کا حصہ دار ٹھہراتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسح الرحمن کے داؤ چیچ میں آ کر مولانا بھاشانی نے کمپانیڈ اپوزیشن پارٹیز پر شرط عائد کر دی کہ وہ صرف ایسی شخصیت کو صدارتی امیدوار نامزد کریں جس کا مارشل لاء کی حکومت سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ جزل اعظم خان مارشل لاء کی حکومت کا ایک نہایت اہم رکن وہ چکے تھے اس لیے یہ شرط عائد ہونے کے بعد صدارتی امیدوار کی حیثیت سے ان کا نام خود بخود خارج از بحث ہو گیا۔

اسی طرح کا چیچ دار حربہ استعمال کر کے صدارتی انتخابات کے سلسلے میں مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کی ایک اور اہم خدمت بھی سرانجام دی تھی۔ چند قانونی ماہرین کے مشورے سے کمپانیڈ اپوزیشن پارٹیز نے یہ خفیہ فیصلہ کیا کہ ایوب خان کی صدارتی امیدوار کی حیثیت کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے کیونکہ فیلڈ مارشل کے طور پر ان کی تقرری کے جو احکام جاری ہوئے تھے ان کے پیش نظر وہ آئینی طور پر کسی انتخاب میں حصہ لینے کے اہل نہیں رہے۔ اپنی قیمت وصول کر کے مسح الرحمن نے متحده محاذ کا یہ راز

درون خانہ بھی مشرب بھٹو پر فاش کر دیا۔ حفظ ماقدم کے طور پر صدر ایوب نے فوراً اپنی تقریری کے احکامات میں موثر بر ماضی رو و بدل کر کے انہیں آئینی تقاضوں کے ہم آہنگ کر لیا۔

صدر ایوب اپنے انتخاب کی راہ میں ہر رکاوٹ کو دور کرنا اپنا حق سمجھنے لگے تھے۔ اس عمل میں ان کے نزدیک جائز یا ناجائز طریق کار کی کوئی تمیز باقی نہ رہی تھی۔ میرے خیال میں زوال کی طرف یہ ان کا ایک یقینی قدم تھا۔

صدرتی الیکشن کے دوران صدر ایوب نے دین اور دنیا دونوں سے بے دریغ فائدہ اٹھایا۔ پہلے تو ایک مشہور پیر صاحب نے اعلان فرمایا کہ انہیں بذریعہ کشف یہ الہام ہوا ہے کہ کمائنڈ اپوزیشن پارٹیز کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل نہیں۔ اس کے بعد چند علمائے کرام نے یہ فتویٰ بھی صادر کر دیا کہ اسلام کی رو سے کسی عورت کا سربراہ مملکت کے عہدے پر فائز ہونا جائز نہیں۔ اس مسئلہ پر جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کی یہ رائے تھی کہ اسلام میں عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی اجازت تو ہے لیکن مناسب نہیں۔ صدر ایوب کے حواریوں نے مس قاطمہ جناح کو نجا دکھانے کے لیے حسب توفیق اسلام کا ہر ممکن استعمال یا استھصال کیا۔

صدرتی الیکشن کے دوران دین کے علاوہ دنیا بھی بے حساب کمائی اور لٹائی گئی۔ ایوب خان کی کنوش مسلم لیگ کے ہاتھ میں کروڑوں کا الیکشن فنڈ موجود تھا۔ اسے جمع کرنے کے لیے ہر طرح کے حرбے استعمال کئے گئے تھے۔ اکثر تاجریوں اور صنعت کاروں کو امپورٹ لائسنوس پر مقررہ شرح سے الیکشن فنڈ میں چندہ دینا ہوتا تھا۔ کچھ لائسنس فرضی ناموں پر جاری کر کے بھاری قیمت پر ضرورت مند تاجریوں اور صنعت کاروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ پٹ سن کے کارخانوں اور سوتی اور اونی ٹیکسٹائل ملوں سے بھی بھاری بھر کم چندے وصول کئے گئے تھے۔ اس بہتی گنگا میں ہر کوئی نگا اشنان کر رہا تھا اور بہت سے کارکن اپنا اپنا ہاتھ رنگنے میں نہایت بے محابی سے سر عام مصروف تھے۔ صدر ایوب کے صدارتی انتخاب کی مم میں پیسے کی ریل پیل نے

سیاسی گلن اور سزن کو ایسا فروع بخشا جس کی مثال ہماری تاریخ میں پہلے نہیں ملتی۔ انہوں نے سیاست کی تطہیر کی خاطر پوری فوج کے ساتھ سیاستدانوں پر چڑھائی کی تھی۔ اور اب ان کی پارٹی خود ہی الیکشن کے تالاب میں گندی مجھلی کا روایتی کردار ادا کرنے میں سرگرم عمل تھی۔

الیکشن کے بعد ۳ جنوری ۱۹۶۵ء کو جب نتیجہ برآمد ہوا تو صدر ایوب کے حق میں ۷۴۹۲  
ووٹ اور مس قاطمہ جناح کے حق میں ۲۸۳۳۵ ووٹوں کا اعلان ہوا۔ بظاہر ایوب خاں  
صاحب ۲۱۳۰۲ ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے تھے لیکن اس تعداد سے کتنی گناہ نیاہ  
عوام کی نظر میں دراصل وہ بازی ہار بیٹھے تھے۔ کیونکہ اب وہ اس طرح کا امیج لے  
کر نہیں ابھرے تھے جس کے ساتھ وہ پہلے پہل اقتدار میں آئے تھے۔

انتخاب میں ڈھاکہ اور کراچی نے بھاری اکثریت سے صدر ایوب کے خلاف ووٹ ڈالے  
تھے۔ ڈھاکہ کے متعلق تو وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ لیکن کراچی میں ان کے  
فرزند دلپذیر گوہر ایوب نے اہالیان شر کی گوٹھالی کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ ۵ جنوری کو جشن  
فتح یا بی کے نام پر کراچی میں ایک بہت بڑا جلوس نکلا گیا۔ جس کی قیادت گوہر ایوب  
کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے جلو میں سڑکوں، جیپوں، ویگنوں، بسوں اور رکشاوں کی طویل  
قطار تھی۔ ان سب کے ڈرائیور اور سواریاں نیاہ تر پھانوں پر مشتمل تھیں۔ صدارتی  
الیکشن سے کتنی ماہ قبل کراچی میں ضلع ہزارہ کے پھانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی اور  
جشن فتح یا بی کے روز وہ شر کی فضنا پر ایک دہشتگار کی طرح چھائے ہوئے تھے۔  
لیاقت آباد اور چند دوسرے علاقوں میں جلوس اور شریوں کے درمیان کچھ جھڑپیں ہوئیں۔

اس کا بدلہ چکانے کے لیے رات کے اندھیرے میں ان بستیوں پر شدید حملے کئے گئے۔  
آگ لگائی گئی اور کافی جانی اور مالی نقصان پہنچایا گیا۔ اس نقصان کا صحیح اندازہ کسی  
کو نہیں لیکن ”شہیدان لیاقت آباد“ کی یاد منانے کے لیے ہر سال ۵ جنوری کو ایک تقریب  
منانی جانے لگی۔ کتنی روز تک کراچی میں خوف و ہراس طاری رہا۔ اور پھانوں اور مهاجرین

کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہو گئی۔ کچھ راویوں کے مطابق اس زمانے میں ایک بار پھر ہندو مسلم فسادات کے واقعات کی یاد تانہ ہو گئی۔ صدارتی انتخاب جیتنے کے فوراً بعد یہ صورت حال صدر ایوب کے نئے دور حکومت کے لیے صریحاً ایک شدید بد شکونی کی علامت تھی۔

گندھارا انڈسٹریز کے بعد گوہر ایوب کا یہ دوسرا شکوفہ تھا جس نے صدر ایوب کی ساکھ پر بدناہی، بد سگالی، بد فالی اور نخوست کی گمری دھول اڑائی۔ اس کارنامے کے بعد اس فرزند دلپذیر نے مزید کل پرنسے نکالنا شروع کئے جس سے بادی انظر میں یہ گمان گزرتا تھا کہ شاید صدر ایوب اس برخوردار کو اپنی ولی عمدی کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ کراچی کے نظم و نقش میں بڑی حد تک دخیل ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب انہیں کراچی مسلم لیگ کی رابطہ کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا گیا تو فی الفور یہ افواہ پھیل گئی کہ اس تقریر کے پردے میں اس نوجوان کو اگلا صدارتی انتخاب لڑنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ کراچی میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جن کے دل میں گوہر ایوب کے خلاف غم و غصے کی آگ پہلے ہی سے سلگ رہی تھی۔ اس افواہ نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ اس صورت حال کا علم نہ صدر ایوب کو تھا نہ گوہر ایوب کو۔ کیونکہ بیشتر سرکاری اور سیاسی ادارے ان دونوں کی خوشامد اور چالپوسی میں لگے ہوئے تھے۔ اہالیان کراچی کی آشنگلی، برہمی اور جھلاہٹ کا بھانڈا اس وقت پھوٹا، جب رمضان المبارک کے پہلے جمعہ کے موقع پر گوہر ایوب نے کراچی کی میمن مسجد میں تقریر کرنے کی کوشش کی۔ اس پر مسجد میں نزدیک ہنگامہ ہو گیا۔ لوگوں نے تقریر سننے سے صاف انکار کر دیا۔ کسی قدر ہاتھا پائی بھی ہوئی۔ اور گوہر ایوب کو بمشکل پولیس کی حفاظت میں مسجد سے باہر لاایا گیا۔ اس احتجاجی واقعہ نے ایک طرف گوہر ایوب کی بڑھتی ہوئی توقعات اور خواہشات کی بساط الٹ دی۔ دوسری جانب صدر ایوب کے اقتدار کی سیر ھی کے پائیان کو بھی جھنجور کر رکھ دیا۔

یوں بھی اقتدار کی سیڑھی کے اس پاسیدان میں پلے ہی سے بہت سی دراٹیں پڑ چکی تھیں۔ میمن مسجد والے حادثہ سے تقریباً چار ماہ قبل کراچی میں ایک اور واقعہ بھی رونما ہو چکا تھا۔

جولائی ۱۹۶۷ء میں مادر ملت مس فاطمہ جناح کی وفات پر کراچی میں لاکھوں شری ان کے جنازے میں شامل ہوئے۔ جلوس کے ایک حصے نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ کچھ نعروے حکومت کے خلاف بلند ہوئے۔ کچھ نعروں میں ”ایوب خاں مردہ باد“ کہا گیا۔ اس پر پولیس کی مشینری حرکت میں آئی اور لائنی چارج اور آنسو گیس کے علاوہ گولی بھی چلانی گئی۔ مرنے والوں کی صحیح تعداد مصدقہ طور پر کبھی معین نہیں ہوتی لیکن خون کی جس قدر مقدار بھی اس موقع پر بھائی گئی بلاشبہ اس نے صدر ایوب کے زوال کی راہ ہموار کرنے میں بد نصیبی کا چھڑکاؤ کیا۔

کراچی کی میمن مسجد میں گوہر ایوب کو جو سانحہ پیش آیا تھا، اس کے بعد پے در پے بدقال واقعات کا ایسا تانتا بندھ گیا جس نے صدر ایوب کے راج سنگھاں کو نہایت بری طرح ڈگنا کے رکھ دیا۔ دسمبر ۱۹۶۷ء کے آخری حصے میں ۹ مشرقی پاکستان کے دوسرے پر گئے ہوئے تھے۔ میں بھی اسی سلسلہ میں ڈھاکہ گیا ہوا تھا۔ یا کیک خبر اڑی کہ صدر ایوب کو اغوا کر کے انہیں قتل کرنے کی سازش پکڑی گئی ہے۔ اس خبر کے پہلے ہی صدر کی ذاتی حفاظت کا انتظام کئی گنا نیاہ سخت کر دیا گیا اور ڈھاکہ میں ایوان صدر پر پولیس اور فوجی گارڈ بھی غیر معمول طور پر بٹھا دی گئی۔

انہی دنوں صدر ایوب کے احکام پر میں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کی یونیورسٹیوں سے پولیکل سائنس کے بہت سے اساتذہ کو ڈھاکہ میں جمع کر رکھا تھا۔ کیونکہ صدر ان کے ساتھ قوی اتحاد اور سالمیت کے موضوع پر تبادلہ خیالات کرنے کے خواہشمند تھے۔ مقررہ وقت پر ہم سب ایوان صدر کے وسیع برآمدہ میں جمع ہو کر بیٹھے گئے۔ میں صدر کو بلانے کے لیے اندر گیا تو ڈرائیور روم میں عجائب سماء دیکھنے میں آیا۔ ایک صوفے پر صدر ایوب سر ایمگی کے عالم میں بیٹھے ہوئے گورنر عبدالمنعم خاں کے ساتھ سرگوشیاں

کر رہے تھے۔ دوسری جانب چند وزراء کرام ایک دوسرے کے ساتھ کالا پھوسیوں میں مصروف تھے۔ تیری طرف فوج اور سول انٹلی جس کے دو تین اعلیٰ افسروںی طرح سر سے سر جوڑے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی صدر ایوب نے کہا۔ ”کیا یہ میٹنگ ملتی نہیں کی جا سکتی؟“

میں نے جواب دیا کہ کئی پروفیسر صاحبان دور دراز مقامات سے آئے ہوئے ہیں اور آج شام یا کل صبح واپس جانے کے لیے بکنگ کروائے بیٹھے ہیں۔ اگر یہ میٹنگ آج نہ ہوئی تو انہیں مایوسی ہو گی۔

صدر ایوب نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں صرف چند منٹ کے لیے آ جاؤں گا۔ زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہو گا۔ باقی بحث مبادثہ تم لوگ خود کرتے رہن۔“

پولیسیکل سائنس کے پروفیسروں اور کچھ صحافیوں کی ملی جلی میٹنگ میں آ کر صدر نے مختصر طور پر چند اکھڑی اکھڑی سی باتیں کیں۔ اور پھر نہایت عجلت کے ساتھ گورز عبدالمنعم خاں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گورز ہاؤس روانہ ہو گئے۔

اسی رات گورز ہاؤس میں صدر کے اعزاز میں ایک پر تکلف عشاہیہ تھا۔ معمول کے مطابق مہمانوں کا ہجوم تھا لیکن سارے مجمع پر ایک پر اسرار سی مردنی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے آپس میں کھر پھر کر رہے تھے۔

اپنی عادت کے خلاف صدر ایوب دو گھنٹے سے زیادہ تاخیر کے بعد دعوت میں تشریف لائے۔ اس وقت بھی ان کے چہرے پر کسی قدر تھکاوٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ آج ہی اگر تھے سازش کا راز ان پر فاش ہوا ہے اور وہ صبح سے شام تک اس سازش کی تفصیلات کا جائزہ لینے میں مصروف رہے ہیں۔

جنوری ۱۹۶۸ء کے اوائل میں اس سازش کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا۔ سازش میں شیخ مجیب الرحمن کے علاوہ ۲۸ دیگر افراد ملوث تھے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ ڈھاکہ میں بھارتی سفارتی مشن کے فرست سیکرٹری پی این اوجھا کے زیر انتظام یہ لوگ ہندوستانی عناصر کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی سازش میں مصروف عمل تھے۔ اس

مقصد کے لیے اگر تله (بھارت) میں ایک مرکز قائم کیا گیا تھا جہاں سے علیحدگی کی تحریک کو اسلحہ اور دوسرا تجزیہ میاد فراہم کیا جاتا تھا۔ شیخ مجیب الرحمن تو پہلے ہی مئی ۱۹۶۶ء سے اپنے چھ نکاتی پروگرام کی پاداش میں ڈینفس آف پاکستان روز کے تحت جیل میں تھے۔ لیکن اب انہیں اگر تله سازش کیس میں ملزم کے طور پر از سر نو گرفتار گردانا گیا۔

اگر تله سازش کے مقدمہ کی ساعت کے لیے ایک خصوصی ٹریوٹل قائم کیا گیا۔ جس کے سربراہ پاکستان کے ایک سابق چیف جسٹس مسٹر ایس اے رحمان تھے۔ سترہ برس قبل ۱۹۵۱ء میں بھی راولپنڈی سازش کیس کے لیے ایک خصوصی ٹریوٹل قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اس مقدمے کی ساعت کھلی عدالت میں نہیں بلکہ بے صیغہ راز ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اگر تله سازش کیس کی ساعت کھلی عدالت میں رکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساعت کے دوران مشرقی پاکستان کی علیحدگی اس کے الگ نام، پرچم اور قومی ترانے تک کی تفصیلات کھل کر بر سر عام آگئیں۔ اور علیحدگی پسند عناصر کو اپنی جائز اور ناجائز شکایتوں کی تشریف کا بھی ایک نادر موقع ہاتھ آگیا۔ جس کر و فر سے یہ سب تفصیلات اخبارات میں اچھالی جاتی تھیں۔ اس کے دو پہلو یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے خلاف نفرت بڑھتی تھی اور صدر ایوب کی مرکزی حکومت پر اعتماد کمزور پڑ جاتا تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ علیحدگی کے جراثیم عوام کے ذہن میں جڑ کپڑتے گئے اور شیخ مجیب الرحمن کی قیادت کو بیٹھے بھائے انتہائی فروع حاصل ہو گیا۔ بلاشبہ اگر تله سازش کا مقدمہ صحیح حقائق و شواہد پر مبنی تھا۔ لیکن جس طور پر اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ سے اس مقدمے کی پہنسچی اور تشریف ہوئی اس نے اس کے حقائق کو سیاسی اور عوامی یہجان کی دلیل میں ملیا میٹ کر دیا۔ یہ یہجان اس قدر شدید تھا کہ ایک روز ڈھاکہ کے ایک بے قابو ہجوم نے اس اثیث گیٹ ہاؤس پر حملہ کر دیا جس میں اگر تیلہ سازش کیس ٹریوٹل کے سربراہ جسٹس ایس اے رحمان قیام پذیر تھے۔ انہوں نے بمشکل تمام ایک

وفادار بُنگالی خدمت گار کی کوٹھری میں روپوش ہو کر اپنی جان بچائی۔ اور پھر چپکے چپکے پوشیدہ طور پر ہوائی جہاز میں بینہ کر لاہور واپس چلے آئے۔

۲۹ جنوری ۱۹۶۸ء کے روز ارون کے شاہ حسین کراچی آئے ہوئے تھے۔ اسی شام راولپنڈی کے ائمہ کاظمی نیشنل ہوٹل میں ان کا عشاء یہ تھا۔ صدر ایوب جب ہوٹل پہنچنے تو ان کا رکھ رکھاؤ اور چہرہ مرہ ان کے معمول کے حساب سے نارمل نظر نہ آتا تھا۔ دعوت کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے وہ سیدھے بار (شراب خانہ) گئے اور ایک گلاس میں بہت سی وہسکی ڈلووا کر پانی یا سوڈا واٹر ملائے بغیر اسے ایک ہی سانس میں غٹ غٹ چڑھا گئے۔ اس کے بعد یہی عمل انہوں نے چند بار دھرا یا۔ شراب وہ ضرور پیتے تھے لیکن اس طرح کھڑے کھڑے ندیدوں کی طرح نیٹ وہسکی کے گلاس پر گلاس چڑھانا ان کا بدستور نہ تھا۔ ہوٹل کی بار میں اس طرح کئی گلاس پینے کے بعد ان کی آواز کس قدر خمار آلو دھو گئی۔ کھانے کے بعد جب وہ پہلے سے تیار کردہ لکھی ہوئی تقریر پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو غالباً ان کا عارضہ قلب ان کی رُگ و پے میں کسی نہ کسی صورت میں رینگنا شروع ہو چکا تھا۔ ان کی طبیعت ہرگز ٹھکانے نہ تھی۔ یہاں تک کہ اپنی تقریر پڑھتے پڑھتے وہ بیک بار اس کے دو ورق الٹ گئے۔ اور انہیں اپنی اس غلطی اور بے ربطی کا احساس تک نہ ہوا۔ اور وہ بدستور آگے پڑھتے چلے گئے۔ دعوت ختم ہونے کے بعد جب وہ ایوان صدر واپس گئے، تو اسی رات ان پر نہایت شدید ہارت ایک ہوا۔

صدر ایوب کی عالات کی خبر ملتے ہی راتوں رات کمانڈر انچیف جزل بھی خان اور وزیر دفاع ایڈمرل اے آر خان نے مل کر ایوان صدر پر قبضہ جمالیا۔ پریزیڈنٹ ہاؤس کا صدر دروانہ بند کر دیا گیا۔ اور گارڈ کے سپاہیوں کو حکم ہو گیا کہ فوجی عملے کے چند مخصوص افراد کے علاوہ کسی اور شخص کو ایوان صدر میں داخل ہونے کی بالکل اجازت نہ دی جائے۔

اگلی صبح آٹھ بجے کابینہ کے سینئر وزیر خواجہ شاہ الدین کا ائمرویو صدر کے ساتھ پہلے

سے مقرر تھا۔ پونے آٹھ بجے خواجہ صاحب اپنی کار پر جھنڈا لراتے ایوان صدر کے گیٹ پر پہنچے تو اسے بند پایا۔ گارڈ کے سپاہیوں نے انہیں باہر ہی باہر سے واپس لوٹا دیا۔ کیونکہ اندر داخل ہونے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ خواجہ صاحب اپنا سامنہ لے کر واپس آگئے۔ انہوں نے ایک بار مجھے بتایا تھا، کہ یہ صورت حال دیکھ کر معاً انہیں یہ شک گزرا کہ شاید راتوں رات کسی نوعیت کا ناگہانی انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ اور اب صدر ایوب معزول ہو کر ایوان صدر میں محبوس یا مقتول پڑے ہیں۔

اس قسم کے شک میں بھلا ہونے والوں میں تنہ خواب شب الدین ہی شامل نہ تھے، جو سینئر وزیر ہونے کی حیثیت سے قریب قریب وزیر اعظم کا درجہ رکھتے تھے۔ بلکہ ایوان صدر کی چار دیواری کے اندر بننے والی مخلوق کے کچھ افراد بھی ایسے ہی وہم و گمان کا شکار تھے۔ اس روز صبح سوریہ ایوان صدر کا ایک ڈرائیور محفوظ علی میرے پاس آیا۔ اللہ اسے غریق رحمت کرے۔ مرحوم کئی برس پہلے میرے ساتھ بھی کام کر چکا تھا۔ اس روز وہ گھبرا یا ہوا اور کسی قدر پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے نہایت رازداری سے مجھے بتایا، کہ رات بھر ایوان صدر میں قیامت کا سامان رہا ہے۔ بیگم ایوب سمیت سب بیٹے اور بیٹیاں غمگین، پریشان اور گم سم ہیں۔ ڈاکٹروں کے آنے جانے کا تاثنا بندھا ہوا ہے۔ کچھ مشینیں بھی لائی گئی ہیں۔ چار دیواری کے سارے گیٹ بند کر کے قفل چڑھا دیئے گئے ہیں۔ جزل بیکی اور ایڈمرل اے آر خاں بار بار آ کر کھر پھر کرتے ہیں۔ ڈرائیور نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”صاحب ہمیں تو یہ بھی یقین نہیں کہ صدر صاحب زندہ ہیں یا مر چکے ہیں یا مار ڈالے گئے ہیں۔ ہاں ہم یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ صدر کے مکان پر اب چیف صاحب کا قبضہ ہے۔“

یہ باتیں سن کر میں نے فوراً ایوان صدر ٹیلیفون کیا اور ملٹری سیکرٹری یا کسی اے ڈی سی سے بات کرنا چاہی۔ آپریٹر مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے معنی خیز انداز میں بتایا کہ آج سب نمبر مصروف ہیں۔ کسی اور روز ان سے بات کریں۔

اس جواب پر میرے دل میں بھی یہ شبہ پیدا ہوا کہ ہونہ ہو صدر ایوب بیماری کے پردے میں کسی اور آفت کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔ صحیح واقعات معلوم کرنے کے لیے میں اسی روز وزارت اطلاعات و نشریات کے سکریٹری الاف گوہر کے پاس پہنچا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ہم سب کی طرح ایوان صدر کے اندر ورنی حالات سے وہ بھی قطعی طور پر لا علم ہیں۔

شروع میں ہر طرف طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ سب کو یہ معلوم گیا کہ جناب صدر واقعی شدید بیمار ہیں۔ ان کی بیماری کی نوعیت پر پرده ڈالنے کی غرض سے سرکاری سطح پر انواع و اقسام کے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے ہیں لیکن یہ سب حربے بے سود ثابت ہوئے۔ چند روز بعد جب صدر کی صحت کے بارے میں میڈیا کل بلیشن جاری ہونا شروع ہوئے تو یہ اس قدر سطحی، جھر جھرے اور بعض اوقات خود تردیدی ہوتے تھے کہ کسی کو ان کی صفات پر یقین نہ آتا تھا۔ چاروں طرف افواہوں کی بھرمار تھی۔ اور ہر شخص اپنی پسند کی افواہ کو اپنی آرزومندی کے ساتھ میں ڈھال کر مزید قیاس آرائیاں اڑانے اور پھیلانے میں مکمل طور پر آزاد تھا۔

صدر ایوب کی بیماری کے پہلے سات آٹھ روز انتہائی خطرناک اور غیر یقینی تھے۔ جب تک وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار رہے، جزل بیجی خان نے ان کا رشتہ بیرونی دنیا سے پوری طرح منقطع رکھا اور صدر کی ذات اور ایوان دونوں پر اپنا تصرف مکمل طور پر جماعت رکھا۔ اس پورے عرصہ کے دوران کسی سولیں کو ایوان صدر کے بیرونی احاطے کی دیوار تک چھونے کی اجازت نہ تھی لیکن جب ان کی حالت کسی قدر سنبل گئی اور فوری موت کا خطرہ سر سے ملتا ہوا نظر آنے لگا تو یہ پابندیاں بھی کسی حد تک نرم پڑ گئیں۔ چنانچہ دسویں روز صدر ایوب کی خواہش پر محمد بشیر خالد صاحب پہلے سولیں تھے جنہیں چند منٹ کے لیے ان کے ساتھ ملاقات کی اجازت ملی۔ اس زمانے میں وہ پرشیل اسٹاف کے طور پر صدر کے خصوصی معتمد تھے۔ بعد ازاں تران میں آرسی ڈی

کے ثقافتی ادارے میں ڈپٹی ڈائریکٹر رہے۔ اور آج کل وفاقی وزارت ثقافت میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔ غالباً صدر ایوب کو اس احساس نے ستانا شروع کر دیا تھا کہ بیماری شروع ہونے کے بعد سے اب تک انہیں پاکستان کی سول حکومت کے ہر فرد و بشر سے خاص طور پر جان بوجھ کر زبردستی مطلقاً الگ تھلگ رکھا گیا ہے۔ اس لیے اپنے اختیار و اقتدار کو آزمائے یا شاید از سر نو جملے کا مظاہرہ کرنے کی خاطر انہوں نے اصرار کر کے خالد صاحب کو ملاقات کے لیے طلب کیا تھا۔

انہی دنوں اچانک یہ افواہ بڑی تیزی سے گردش کرنے لگی کہ صدر ایوب پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور وہ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے سے معدور ہو گئے ہیں۔ اس افواہ کی تردید ایک تصویر سے کر دی گئی جو تقریباً تمام اخبارات میں شائع ہوئی۔ تصویر میں صدر ایوب ڈرینگ گاؤن پنے مغربی پاکستان کے گورنر جزل موئی کے ساتھ گفتگو میں مصروف دکھائے گئے۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ اس تصویر کو جعلی شعبدہ بازی سمجھ کر اسی خوش فہمی میں رہنے پر مصر تھے کہ مفلوج ہو کر صدر ایوب اب کسی کام کے نہیں رہے۔ لیکن ایسے حلقوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب کم اپریل ۱۹۶۸ء سے صدر ایوب نے قوم کے نام پریڈیو اور ٹی وی سے اپنے ماہانہ خطاب کا سلسلہ از سر نو جاری کر دیا۔ پہلے اعلان ہوا کہ ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر مسلح افواج کی پریڈ کی سلامی بھی وہ خود ہی لیں گے۔ لیکن ناتوانی کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس روز پریڈ کی سلامی وزیر دفاع ایڈ مرل اے آر خاں نے لی۔ جزل بھی خان ان کے ساتھ بھی بلی بنے کھڑے رہے۔

بیماری سے جانبر ہو کر جب صدر ایوب دویانہ کری صدارت پر رونق افروز ہوئے تو ان پر یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی تھی کہ ان کے اقتدار کا سرچشمہ ان کا اپنا بنا یا آئین یا بنیادی جمیوریت کا نظام یا قومی اسمبلی یا مرکزی کابینہ نہیں، بلکہ ان کے صدارتی وجود اور عہدے کی شہ رگ کلیہ کمانڈر انچیف جزل بھی کی مٹھی میں ہے۔ جس آئین کے تحت انہوں نے صدارت کا حلق اٹھایا تھا، اس میں صاف طور پر درج تھا کہ

بیماری کی صورت میں اگر مملکت کا سربراہ اپنے فرائض ادا کرنے سے مغدور ہو جائے تو قومی اسمبلی کا سپیکر ان کی قائم مقامی کرے گا۔ صدر ایوب ڈیڑھ دو ماہ تک صاحب فراش رہے۔ لیکن اس تمام عرصہ میں قومی اسمبلی کے سپیکر عبدالجبار خاں سے کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ میاں تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ بیماری کے ابتدائی چند ایام میں جب صدر ایوب زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہے تھے، اس وقت جزل بیجی خاں ان کے تن بدن پر بنس نہیں منڈلاتے رہے کہ جونہی یہ ٹھنڈا ہو تو وہ فوراً گدھ کی طرح اس پر جھپٹیں۔ ان کی یہ امید تو بر نہ آئی لیکن موت کا خطرہ ٹلنے کے باوجود صدر ایوب مزید پانچ چھتے ہفتے اپنے فرائض منصبی سر انجام دینے سے قطعاً مغدور رہے۔ اس طویل عرصہ میں انہوں نے ایک بار بھی ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہ کیا کہ اپنے نافذ کردہ آئین کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر وہ قومی اسمبلی کے سپیکر کو چند روز کے لیے اپنی قائم مقامی کا موقع عطا فرمادیں۔ یا ممکن ہے کہ جزل بیجی کے تیور دیکھ کر وہ اس طرح کا کوئی ارادہ زبان پر لانے ہی سے باز رہے ہوں۔

بیماری سے اٹھنے کے بعد ڈاکٹروں نے صدر ایوب کو دن میں چند بار دواوں کی متعدد گولیاں پابندی سے کھانے پر لگا دیا تھا۔ غالباً ان میں کچھ سکون آور دواوں (Tranquilizer) کا غضر بھی شامل تھا۔ جس کی وجہ سے ان پر ہمہ وقت کسی قدر غنوگی، آنکس اور سستی سی چھائی رہتی تھی۔ امور سلطنت میں ان کی روایتی سوجھ بوجھ، اثر پذیری اور ذہنی رد عمل کی صلاحیت بڑی حد تک ماند پڑ گئی تھی۔ اور کئی معاملات میں صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی قوت فیصلہ بھی کسی قدر متاثر ہوئی ہے۔ یہ حالت تین چار ماہ کے قریب رہی۔ اس کے بعد جولائی کے مینے میں وہ لندن گئے۔ کچھ علاج معالجه ہوا۔ چند روز مسافتات میں ایک خوبصورت مقام پر آرام فرمایا۔ اور جب وہ واپس لوٹے تو ان کی خود اعتمادی اور صحت پوری طرح بحال ہو چکی تھی۔ اسلام آباد میں چند وزیروں کی ایک محفل میں انہوں نے اپنی صحت کے متعلق استفارہ کے جواب میں انتہائی خود اعتمادی سے کہا۔ ”نامی گرامی ڈاکٹروں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اگر میں مناسب احتیاط سے کام لوں تو مزید

چھپیں برس تک اس عمدے کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔"

اسی زمانے میں صدر ایوب کے دور کی ترقی کا دس سالہ جشن بھی اپنے عروج پر تھا۔

یہ کارروائی ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۷ء سے شروع ہو چکی تھی اور اس تقریب کو مسلسل ایک برس تک منایا گیا۔ سرکاری دفتروں میں اسٹیشنری سے لے کر ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات اور نشر و اشاعت کے دیگر تمام ذرائع بھی سال بھر اسی جشن کا اشتمار بنے رہے۔ تمام سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی پیشانی پر ایک ہی نعرہ ثبت تھا۔

The Great Decade of Development and Reform  
اخبارات باری باری اپنے خیمے شائع کرتے تھے۔ جن میں بینکوں، زراعت، آپاٹشی، ریلوے، جہاز رانی، تجارت، صنعت و حرفت کے علاوہ سیاست، ثقافت، آئین اور لفظ و نطق کے جملہ شعبوں میں تغیر و ترقی کے تفصیلی نقوش اجاگر کئے جاتے تھے۔ بعض اخبارات کے ایک ایک شمارے میں اکثر دیشتر صدر ایوب کی آٹھ یا دس یا اس سے بھی زیاد تصاویر شائع ہوتی تھیں۔ شروع شروع میں کچھ لوگوں نے ایک معقول حد تک تو اس میں دلچسپی کا اظہار کیا لیکن جب یہ سلسلہ حد سے زیاد دراز ہوتا چلا گیا اور دن رات چاروں طرف یہی ڈھنڈوں پہنچنے کی آواز سنائی دینے لگی، تو لوگ اس سے بیک آ کر آتا گئے۔ رفتہ رفتہ اس کا مذاق اڑنے لگا۔ اور اس پر طرح طرح کی پھیلیاں کسی جانے لگیں۔ اس پر بھی یہ مضمون بدستور جاری رہی۔ تو لوگ اس سے چڑنے اور گھن کھانے لگے۔ جس زمانے میں یہ مضمون ایوب خاں کے دور کی برکتوں کے قصیدے الائچے میں مصروف تھے۔

بد قسمتی سے اسی زمانے میں آٹا، چاول، چینی اور دالوں کے دوسرا بہت سی اشیاء خورد کی قیمتوں میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ گرانی کے علاوہ ان اشیاء کی قلت بھی بار بار رونما ہونا شروع ہو گئی تھی۔ خاص طور پر کراچی میں آٹا اور میدہ کی قیمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہاں کی بیکریوں نے ایک روز احتجاج کے طور پر مکمل ہڑتاں کر دی۔ چینی کی شدید گرانی اور قلت کے پیش نظر کراچی اور لاہور میں چینی کی راشن بندی کر دی گئی۔ مرکزی وزیر تجارت نواب عبدالغفور خاں ہوتی کے اس اقدام پر بہت

سی الزام تراشیاں ہوئیں۔ اور عوام الناس میں ان کا لقب ”چینی چور“ مشور ہو گیا۔ یوں بھی عوام میں ان پر کئی طرح کے آوازے کے جانے لگے۔ ایک آوانہ جس نے کافی زور پکڑا، یہ تھا۔ ”عبدالغفور ہوتی ..... ایوب خاں دی گھوٹی“ ڈھاکہ میں لوگوں نے شہید مینار کے سامنے ایک خستہ حال بُدھیوں کا انسانی ڈھانچہ آویراں کر رکھا تھا جو ترقی و اصلاحات کے جشن کا دن رات منہ چڑاتا رہتا تھا۔

اشیاء کی گرانی اور قلت کے ان ہنگاموں میں ایوبی دور کے دس سالہ کارناموں کا ذکر ہے معنی نظر آنے لگا۔ اور جس حد تک وہ نیک نای، عزت اور وقت کے جائز طور پر مستحق تھے، وہ بھی انہیں خاطر خواہ طور پر نصیب نہ ہو سکی۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو عرصہ سے موقع کی تاک میں بیٹھے تھے۔ لوہا گرم دیکھ کر انہوں نے ہتھوڑے کی ضرب لگائی اور صدر ایوب کے خلاف اپنی مُم کا آغاز کر دیا۔ ماحول کی سازگاری کے علاوہ انہیں جی ایچ کیو کے چند عناصر کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ ان میں جزل بھی خاں کے دست راست میجر جزل پیرزادہ کا نام سر فرست تھا۔ یہ صاحب ایک زمانے میں صدر ایوب کے ملٹری سیکرٹری وہ چکے تھے۔ وہاں پر انہیں ہارت ایک ہوا تو صدر ایوب نے انہیں واپس جی ایچ کیو بھیج دیا۔ اس پر پیرزادہ صاحب صدر سے ناراض ہو گئے اور ان کے خلاف اپنے دل میں شتر کینہ پال کر ان سے بدله لینے کی ٹھان لی۔ مسٹر بھٹو کے ساتھ ان کی پلے سے کچھ راہ و رسم تھی۔ اب پیرزادہ نے اپنے ہتھکنڈوں سے ان پر یہ بات واضح کر دی کہ اگر انہوں نے صدر ایوب کے خلاف کوئی تحریک شروع کی تو وہ اس مُم میں تھا نہ ہوں گے بلکہ پاکستانی فوج کا ایک بڑا غضر بھی ان کی پشت پر ہو گا۔ اس ملی بھگت سے پیرزادہ کا مقصد مسٹر بھٹو کو بر سر اقتدار لانا نہیں تھا بلکہ ایوب خاں کے زوال کی خاطر انہیں ایک کٹھ پتلی کی طرح استعمال کر کے جزل بھی کی راہ ہموار کرنا تھا۔ اس قسم کی شاطرائنا دو رخنی میجر جزل پیرزادہ کی عیاری اور زمانہ سازی کا طرہ امتیاز تھی۔ جب صدر ایوب انہیں اپنا ملٹری سیکرٹری بنا کر ایوان صدر میں لا رہے تھے، تو ایک روز میں نے ان سے پوچھا تھا۔ ”نیا ملٹری سیکرٹری کیسا

شخص ہے؟" صدر ایوب نے مسکرا کر جواب دیا۔ "خچرا آدمی ہے۔" پنجابی زبان کی یہ فصح و بلیغ اصطلاح میجر جزل پیر زادہ کی ذات پر یوں چھپا ہوتی ہے جیسے دنبے کے بدن پر کھال مڑھ ہوئی ہوتی ہے۔

چنانچہ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۸ء کے روز مسٹر بھٹو نے حیدر آباد (سنده) میں ایک جلسہ عام منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جلسہ عام کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ تو لوگ جو ق در جو ق ایک پرائیویٹ اھالیہ میں جمع ہو گئے۔ وہاں پر بھٹو صاحب نے ایک تیز و تند تقریر میں قسم کھاتی کہ وہ صدر ایوب کو مند اقتدار سے اتارے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ انہوں نے ایوبی دور حکومت پر شدید نکتہ چینی کے علاوہ صدر ایوب کی ذات پر بھی بزرگی، بد دیانتی، خیانت، اقرباء پوری اور سیاسی بد نیتی کے بے شمار الزام لگائے۔ اس کے بعد مسٹر بھٹو کی ہر تقریر میں ان دھمکیوں اور الزامات کے علاوہ معاهدہ تاشقند پر بھی نہایت کڑی تنقید ہوتی تھی اور وہ ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کرتے تھے کہ وہ عنقریب اس معاهدہ کی چند ایسی خفیہ شقول کا بھانٹہ پھوٹنے والے ہیں جو انتہائی چلاکی سے اب تک صیغہ راز میں رکھی گئی ہیں۔ اس الزام تراشی کا جواب دینے کے لیے سویت یونین نے صدر ایوب کے حق میں ایک غیر معمولی حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ روس کی سرکاری خبر رسال اجنبی "تاں" نے یہ تردید شائع کی کہ معاهدہ تاشقند میں کسی قسم کی کوئی خفیہ شق ہی موجود نہیں ہے۔ لیکن لوگوں نے اس تردید کو کوئی وقت نہ دی۔ چاروں طرف بھٹو صاحب کا طوٹی بول رہا تھا۔ ان کا منہ بند کرنے کے لیے صوبائی اور مرکزی حکومت نے طرح طرح کے حرbe استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ مغربی پاکستان کے گورنر جزل موسیٰ اور کئی وزیروں نے پہلے تو دھمکی آمیز اور جارحانہ تقریروں سے مسٹر بھٹو کو دبانا چاہا۔ جب اس سے کام نہ بنا تو لاڑکانہ اور سکھر کی عدالتوں میں ان کے خلاف اراضیات وغیرہ کے متعلق تفتیشات اور مقدمات دائر کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان کے غنڈہ آرڈیننس میں ایک ایسی ترمیم لائی گئی جس کی رو سے تقریباً ۲۶ قسم کے مختلف افراد "غمڈہ" کے زمرہ

میں آگئے۔ اس ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے ناقدین اور مخالفین کو نہایت آسانی سے غنڈہ قرار دے کر قانون کے فیکنگہ میں لایا جاسکے۔ شروع شروع میں مسٹر بھٹو کے کچھ ساتھی اس آرڈی ننس کی زد میں آئے تھے لیکن یہ حربہ بھی نیا ہد موثر ثابت نہ ہو سکا۔ کیونکہ ملک میں طلباء کی بڑھتی ہوئی بد نظمی اور بد امنی دن بہ دن اپنا رنگ لا رہی تھی۔ ۱۹۶۸ء کے وسط ہی سے طالب علموں کی ہنگامہ آرائی اپنے زوروں پر تھی اور اکثر سکول اور کالج نیا ہد تربند رہتے تھے۔ اس وجہ سے پرائیویٹ اداروں کے اساتذہ کی اکثریت بھی اپنی تھنخوا ہوں سے محروم رہتی تھی۔ تنگدستی سے مجبور ہو کر وہ بھی طلباء اور عوام کے احتجاجی مظاہروں میں برضاء و رغبت شریک ہونے لگے۔ اور ان کی دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے شعبوں اور اداروں کے مخت کشوں کی دلچسپی اور ہمدردی بھی صدر ایوب کے خلاف پھیلتی ہوئی فضا میں شامل ہوتی گئی۔

پھر اچانک ۷ نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں ایک المناک واقعہ رونما ہوا۔ طلباء کا ایک گروپ طورثم وغیرہ کی سیاحت سے واپس آ رہا تھا۔ راولپنڈی پولی ٹینکیک پہنچتے ہی پولیس نے انہیں روکا اور الزام لگایا کہ وہ لندی کوٹل کی باٹھہ مارکیٹ سے بہت سا سامان اسمگل کر رہے ہیں۔ اس لیے ان کی تلاشی لی جائے گی۔ یہ ایک بندھا بندھالیا معمول تھا کہ بہت سے سیاح لندی کوٹل کے باٹھہ بازار سے کچھ خرید و فروخت کا سامان اپنے ساتھ لایا کرتے تھے اور ان سے کبھی کوئی باز پرس نہ کی جاتی تھی۔ اس دستور کے بر عکس جب پولیس نے طلباء کی تلاشی لینے پر اصرار کیا تو انہوں نے مشتعل ہو کر ہنگامہ برپا کر دیا۔ پولی ٹینکیک کے بہت سے طالب علم بھی اس میں شامل ہو گئے۔ پولیس نے جی بھر کر لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کیا۔ جب اس سے صورت حال قابو میں نہ آ سکی تو انہوں نے گول چلا دی جس سے ایک نوجوان طالب علم عبدالحمید جاں بحق ہو گیا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو بر ق رفواری سے موقع واردات پر پہنچے۔ انہوں نے مرحوم عبدالحمید

کی لاش کو اس کے آبائی گاؤں پنڈی گھیپ پہنچانے کے لیے ایک زردست جلوس ترتیب دیا۔ اس طرح راولپنڈی کے گرد و نواح میں سانچھ ستر میل تک جس جس گلی یا گاؤں یا قریہ سے یہ ماتھی جلوس گزرا، وہاں پر صدر ایوب کی قسم کا ستارہ ڈوٹا چلا گیا۔

یوں بھی جواں سال عبدالحمید کا خون ناحق بنتے ہی ملک کا گوشہ گوشہ بد امنی اور شورش کے لا متناہی طوفان کی زد میں آگیا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء سے لے کر ۲۸ نومبر ۱۹۶۸ء کے صدر ایوب کی معزوفی تک کوئی ایسا دن نہ گزرا جب کہیں نہ کہیں طباء اور عوام کے جلے، جلوس، توڑ پھوڑ، لوٹ مار، پتھراو، گھیراؤ یا جلاو وغیرہ کے واقعات رونما نہ ہوئے ہوں۔ عبدالحمید کی موت کے دوسرے روز راولپنڈی میں عوام کا غم و غصہ انتہائی شدت اختیار کر گیا۔ پولیس کی فائرنگ سے دو اور افراد موت کے گھاث اتر گئے۔ عوامی غیظ و غصب کے سامنے پولیس بے دست و پا ہو گئی تو امن قائم رکھنے کے لیے فوج کو میدان میں آتا را گیا۔ لیکن بہت جلد یہ راز کھل گیا کہ فوجی افسروں کو درپرده ہدایت تھی کہ صدر ایوب کے خلاف مظاہرے کرنے والوں پر کسی قسم کی کوئی سختی نہ کی جائے۔ چنانچہ شر میں دفعہ ۳۲۳ کے نفاذ کے باوجود لوگ ہزاروں کی تعداد میں بھوٹ صاحب کی تقریں سننے کے لیے جلوس اور جلوسوں میں شامل ہوتے رہے۔ انہی دونوں مختلف شرروں کی دیواروں پر ایک اشتہار چپا پایا گیا۔ جس میں پاکستان کی بری فوج کے کمانڈر انجیف کے نام اپیل تھی کہ ملک میں امن و سلامتی برقرار رکھنے کے لیے جزل بھی کو فوراً عطا حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھال لینی چاہیے۔ خفیہ اداروں کے ذرائع نے اکٹھاف کیا کہ اس کارستانی کے پیچھے اسٹینڈرڈ بنک کے مالک مسٹر علوی کا ہاتھ ہے۔ یہ صاحب جزل بھی کے لگنوئے یار تھے۔ اور ان دونوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت بہت سی چہ میگویوں کا دل پسند موضوع تھی۔

عبدالحمید کی موت کے چار روز بعد ۱۱ نومبر کو پشاور میں صدر ایوب پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا۔ ۹ ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ اچانک سامعین میں سے ایک نوجوان

ہاشم نائی اٹھا اور اس نے پستول تان کر ان کی طرف دو فائر کئے۔ نثانہ خطا گیا۔ یوں بھی صدر ایوب نے اپنی فوجی مہارت سے کام لے کر ڈائیس پر گولی روک کر روشنرم کے پیچھے بر وقت پناہ لے لی تھی۔ فوج کے ایک پنشنر صوبیدار نے حملہ آور پر قابو پا کر اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کارگزاری کے صلے میں اسے دس ہزار روپے کا نقد انعام دیا گیا۔

اس کے دو روز بعد مسٹر بھٹو اور خان عبدالولی خاں کو دوسرے بہت سے اہم سیاستدانوں سمیت ڈینیش آف پاکستان روڑ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ ان گرفتاریوں نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ مغربی پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شر میں شدید ہنگاموں نے مزید زور پکڑ لیا۔ جگہ جگہ پولیس اور مظاہرین کے درمیان تصادم کے واقعات بڑھ گئے اور نہتے عوام پر پولیس کی نیادیوں کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہو گئیں۔ کئی مقامات پر کچھ لوگوں نے لائھی چارج اور آنسو گیس سے بچنے کے لیے بھاگ کر مسجدوں میں پناہ لی، تو پولیس نے وہیں جا کر انہیں بیدرودی سے زد و کوب کیا۔ ایسے ہنگاموں کے دوران ایک دو جگہ قرآن حکیم کی بے حرمتی کی خبریں بھی سننے میں آئیں۔ خاص طور پر کراچی کی آرام باغ والی مسجد کا واقعہ بہت بدnam ہوا۔ جس میں جو توں سمیت گھس کر پولیس نے بعض لوگوں کو اس قدر پیٹا کہ مسجد کا فرش تک لہولمان ہو گیا۔

یوں تو وطن عزیز میں ہماری پولیس پلے بھی کبھی نیک نام نہ تھی، لیکن اس قسم کے تشدد آمیز واقعات نے عوام کے دل میں اس کے خلاف اور بھی نیادہ نفرت پھیلا دی۔ اس کے بعد اچانک کھایاں میں خانم کے سانحہ کی خبر نکلی جس نے صدر ایوب کی حکومت کے آخری ایام پر ایک عجیب بے برکتی کا سایہ ڈال دیا۔ خانم ایک سولہ برس کی جوان لڑکی تھی جو اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ کسی قتل کی تفتیش کے سلسلے میں کھایاں پولیس اسٹیشن میں لائی گئی تھی۔ رات کو پولیس والے اسے ایک الگ کوٹھڑی میں لے گئے۔ جہاں سے ساری شب اس کے چیختنے اور چلانے کا شور سنائی

دیتا رہا۔ صبح کے وقت وہ اپنی کوٹھڑی میں مردہ پائی گئی۔ پولیس والوں کا کہنا تھا کہ اس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی ہے۔ لیکن میڈیکل رپورٹ نے یہ ثابت کر دیا کہ کثیر التعداد لوگوں نے خانم کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔

اسی زمانے میں کئی اور شروں میں بھی جنسی بے راہروی کی بہت سی خبریں آندھی کی طرح اٹھیں اور بگلوں کی طرح پھیل گئیں۔ خبریں اس قسم کی تھیں کہ چند بڑے بڑے مخصوص اور با اقتدار خاندانوں کے نوجوان دن دیہاڑے شریف اور باعزت گھرانوں میں گھس کر ان کی لڑکیاں زردستی اٹھاتے تھے۔ اور پولیس ڈر کے مارے ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتی تھی۔ غالباً ان خبروں میں حقیقت کم اور افواہ سازی کا عصر زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن انہوں نے ماحول کی کثافت اور غلاظت کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ ان خبروں اور افواہوں میں جتنا بھی تھوڑا بہت حقیقت کا عنصر تھا، اس نے صدر ایوب کے آخری ایام حکومت کی بے برکتی میں بہت زیادہ ظلمت کو فروغ دیا۔

دوسری جانب مشرقی پاکستان کو بھی عوامِ الناس نے اسی طرح اپنے غیظ و غضب کی پیٹ میں لے رکھا تھا۔ پہلے وہاں پر یہ خبر ٹکلی کہ اگر تله سازش کے ایک ملزم فلاںسٹ سارجنٹ ظہور الحق کو فوج کی حرast میں گولی مار کر سُکنینوں سے بلاک کر دیا گیا ہے۔ الزام یہ لگایا گیا کہ وہ جیل سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کسی کو اس الزام کی صداقت پر یقین نہ آیا۔ عام خبر یہی تھی کہ وہ حرast کے دوران وحشیانہ تشدد کا شکار ہو کر مرا ہے۔ اس پر صوبہ بھر میں جگہ جگہ فساد شروع ہو گئے۔ ڈھاکہ میں مشتعل عوام نے دو وزیروں کے گھروں کو آگ لگا دی۔ ایک ہجوم نے اس سرکاری مہمان خانے پر ہلہ بول دیا۔ جہاں پر اگر تله سازش کیس ٹریوغل کے صدر جسٹس ایس اے رحمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ کھانا میں ایک مرکز وزیر خان عبدالصبور خاں کے مکان

کو نذر آتش کر دیا گیا۔ راج شاہی یونیورسٹی کے طباء نے ایک احتجاجی جلوس نکالنے کی کوشش کی۔ یونیورسٹی کے ایک ہر دلعزیز استاد ڈاکٹر مسٹر الفتحی نے انہیں یونیورسٹی کے صدر دروازے پر روک لیا۔ اور طباء کو سمجھا بجھا کر منتشر ہو جانے کی تلقین کر ہی رہے تھے کہ ایک پاہی نے جھپٹ کر انہیں اپنی ٹنگیں پر دھر لیا اور مار کر اسی جگہ ہلاک کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں فلاٹ سارجنت ظہور الحق اور ڈاکٹر مسٹر الفتحی کے نام شہیدوں کی فرست میں شامل ہو گئے۔ اور عوام نے جگہ جگہ پولیس اور فوج کے نافذ کردہ کفروں کی دھیان اڑا کر رکھ دیں۔ کئی مقامات پر بنیادی جمہوریت کے اراکین کو پکڑ کر بر سر عام پینا گیا۔ چند ایک جان سے بھی مارے گئے۔ کسی کسی جگہ ان کی رہائش گاہوں یا دکانوں یا یونیورسٹی کو نسلوں کے دفاتر کو توڑ پھوڑ کر آگ لگا دی گئی۔ لوگوں کے اس تیز و تند سیلاح کے سامنے بے بس ہو کر کچھ ممبر مستغفل ہو کر روپوش ہونا بھی شروع ہو گئے تھے۔

فروری کے وسط میں ایک روز صدر ایوب نے مجھے ایک سرکاری فائل کے ساتھ اپنے دفتر میں طلب کیا۔ جس وقت میں ایوان صدر پہنچا تو ایک نای گرامی عالم دین ملاقات کے بعد ان کے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ اندر جا کر میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر غیر معمولی شکستہ مل کے آثار نمایاں ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا چوڑا کاغذ تھا جس پر عربی اور اردو میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ غالباً میرے آنے سے پہلے والے ملاقاتی انہیں بہت سے وظائف پڑھنے کے لیے دے گئے تھے۔ صدر نے کسی قدر بے مل سے اس کاغذ کو میز کی دراز میں ٹھونٹے ہوئے کہا۔ ”سب یہی کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دھراتی ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ تاریخ اپنے آپ کو منسوخ کرنے کے لیے بھی دھراتی ہے۔“

چند لمحے توقف کرنے کے بعد وہ یوں گویا ہوئے۔ ”تمہیں یاد ہو گا کہ ۱۹۶۲ء کی فروری میں مسلح افواج کے اعلیٰ افسروں پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ آئین نافذ کرنے کا نام نہ لو۔ سیاستدانوں کے قریب تک نہ جاؤ۔ اور اسی طرح مارشل لاء کے سامنے میں بیٹھ کر

نہی خوشی حکومت کرتے رہو۔ اور آج سات برس بعد اسی میں میں وہی لوگ مجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ سیاستدانوں کو مناؤ۔ ان کی منت سماجت کر کے ان کے ساتھ سب معاملات فوراً طے کرو ورنہ حالات قابو سے نکل جائیں گے۔”

”اب آپ نے کیا سوچا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”سوچنے کے لیے میرے پاس اب تک کیا گیا ہے؟“ صدر ایوب تکنی سے بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ اگلے چند روز انتہائی نازک اور فیصلہ کن ہوں گے۔“

اس روز مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ صدر ایوب مسلح افواج کی حمایت سے قطعی طور پر ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ باہر چاروں طرف شورش اور بد امنی کا زور بدستور بڑھ رہا تھا۔ ایک روز پشاور میں لوگوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر کو جلا کر راکھ کر دیا۔ پھر ۱۳ فروری کو ملک بھر میں مکمل ہڑتاں ہوئی۔ سڑکوں پر نکلنے والی ہر بس، ٹرک، ویگن، ٹیکسی، موڑ سائیکل، تانگہ اور رکشانے سیاہ ماتھی جھنڈے لرائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ میونسل کارپورشنوں، کمیٹیوں اور کمی دیگر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی گاٹیاں بھی سیاہ جھنڈیاں لگائے ہوئے تھیں۔ اس روز جو گاڑی سیاہ جھنڈی لرائے بغیر باہر نکلتی تھی اس پر پھراؤ کر کے اسے توڑ پھوڑ دیا جاتا تھا۔ راولپنڈی شریں میں چند موڑ کاریں ہجوم نے نذر آتش بھی کر دیں۔ چند سینئر افسروں کا رہاں میں بیٹھے مری روڑ سے گزر رہے تھے تو لوگوں نے انہیں روک لیا اور ان سے ”ایوب کتا مردہ باد“ کے نعرے لگوا کر آگے بڑھنے دیا۔ ڈیوٹی پر متعین پولیس ڈر کے مارے بے بس تھی اور سڑکوں پر گشت کرتی ہوئی فوج بھی خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ ہڑتاں والے دن لاہور، کراچی اور حیدر آباد میں شدید ہنگائے اور تصادم بھی ہوئے اور بہت سے لوگ مارے گئے۔ اسی روز مسٹر بھٹو نے ۱۹۶۵ء سے نافذ شدہ ایم جنی کے خلاف تادم زیست بھوک ہڑتاں شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔

ان حالات سے مجبور ہو کر صدر ایوب نے ڈیمو کریک ایکشن کمیٹی کے صدر نوابزادہ نصراللہ خاں کو دعوت دی کہ وہ اپنی پسند کے ساتھوں سمیت ۷۱ فروری کو ایک راؤنڈ نیبل

کافرنیس میں ان سے آ کر ملیں۔ نوابزادہ صاحب نے شرائط عائد کیں کہ یہ ملاقات اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ڈینیش آف پاکستان رولز اور ائم جنی کا نفاذ فوراً ختم کیا جائے، جلسوں اور جلوسوں پر دفعہ ۱۳۲ کی پابندی اٹھا لی جائے، اور تمام گرفتار شدہ طلباء اور سیاسی کارکنوں کو رہا کیا جائے۔ موقع شناسی سے کام لے کر صدر ایوب نے ان کی بہت سی شرائط مان لینے کی ٹھان لی۔ اور ایک تجربہ کار فوجی کی طرح نہایت منظم طور پر اپنے ہتھیار ڈالنا شروع کر دیئے۔ پہلے انہوں نے ائم جنی ختم کرنے کا اعلان کیا۔ پھر ڈینیش آف پاکستان رولز اٹھائے۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر بھٹو سمیت سب سیاستدان اور سیاسی قیدی رہا ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کی دلجمی کے لیے انہوں نے روزنامہ اتفاق کے چھاپے خانہ کی ضبطی کا وہ حکمنامہ منسون کر دیا جو تین برس قبل جاری ہو چکا تھا۔ صدر ایوب نے شیخ مجیب الرحمن کو بھی پیرول پر رہا کر کے راولپنڈی میں دوسرے سیاستدانوں کے ساتھ راؤنڈ نیبل کافرنیس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ شیخ صاحب نے یہ دعوت قبول کر لی اور انہیں راولپنڈی لانے کے لیے ایک خصوصی طیارہ بھی ڈھاکہ کی ائم پورٹ پر تیار ہو کر آکھڑا ہوا۔ لیکن سیاستدانوں اور صدر ایوب کے درمیان صلح صفائی کی یہ پیش رفت جزل بھی، میحر جزل پیر ناہ اور ان کے ہم خیال ٹولہ کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ چنانچہ انہوں نے فی الفور اپنے ہتھکنڈے استعمال کر کے اس پیش رفت کو سیوتاڑ کر دیا۔ ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمن اگر تھے سازش کیس کے سلسلہ میں فوجی حرast میں تھے وہاں پر کچھ ایسے تار ہلائے گئے کہ وہ پیرول پر راولپنڈی آنے سے اچانک مکر گئے۔ اب انہیں یہ ضد ہو گئی کہ وہ ایک زیر حرast قیدی کی حیثیت سے کسی مذکورات میں ہرگز شرکت نہ کریں گے۔ ان کو رام کرنے کے لیے حکومت نے اگر تھے سازش کا مقدمہ عدالتی ٹریویوں سے واپس لے لیا۔ یہ مقدمہ واپس ہوتے ہی شیخ مجیب الرحمن سمیت سازش کیس کے سارے ملزم رہا ہو گئے۔

سیاستدانوں کے ساتھ مذکورات کی راہ ہموار کرنے کے لیے صدر ایوب نے اپنے بنائے ہوئے

آئین سے بھی ہاتھ اٹھا لیا اور برطانیہ اعلان کر دیا کہ عوام کے نمائندے اپنی مرضی کا نیا آئین ملک میں نافذ کرنے کے لیے قطعی طور پر آزاد ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے قوم کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اگلے صدارتی انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑے نہ ہوں گے۔

اس پس منظر میں ۲۶ فروری ۱۹۶۹ء کو صدر ایوب اور سیاستدانوں کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کے اراکین کے علاوہ شیخ مجیب الرحمن اور ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خاں شریک ہوئے۔ مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشان نے کانفرنس میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد کانفرنس کا اگلا اجلاس ۱۰ مارچ تک ملتوی ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی صدر ایوب اور جزل بھٹی خاں کے درمیان ایک خاموش اور زیر نہیں قسم کی زور آزمائی شروع ہو گئی۔ مسٹر بھٹو، مولانا بھاشان اور ائیر مارشل اصغر خاں پر تو صدر ایوب کا کوئی بس نہ چلتا تھا۔ لیکن باقی سیاستدانوں کا دل ان کی جانب کسی قدر پیچا ہوا تھا۔ جس انداز سے صدر ایوب نے یکے بعد دیگرے ان کی سب شرائط مان لی تھیں۔ اس سے متاثر ہو کر جملہ سیاستدان ان کے ساتھ کوئی فیصلہ کرن گفتگو کرنے پر آمادہ تھے۔ لیکن مذاکرات کی اصل کنجی شیخ مجیب الرحمن کے ہاتھ میں تھی۔ ان کو اپنی راہ پر لانے کے لیے صدر ایوب نے کافی ہاتھ پاؤں مارے۔

مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمنعم خان کی جگہ انہوں نے شیخ مجیب کے ایک پسندیدہ سیاستدان اور اقتصادی ماہر ڈاکٹر ایم این ہدیٰ کو وہاں کا گورنر متعین کر دیا۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں بھی جزل موسیٰ کی جگہ مسٹر یوسف ہارون کی تقرری بطور گورنر ہو گئی۔ شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ ہارون خاندان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ ہارون فیصلی اور بھٹو فیصلی کے درمیان بھی قدیمی دشمنی تھی۔ یوسف ہارون کو گورنر بننا کر غالباً صدر ایوب ایک تیر سے دو شکار کرنے کی امید رکھتے تھے۔ ان کی یہ کوشیں کسی حد تک رنگ بھی لائیں۔ اور پارلیمانی نظام حکومت اور عام بالغ رائے دیندگی کی بنیاد پر

شیخ مجیب الرحمن راؤنڈ نیبل کانفرنس میں کوئی سیاسی سمجھوتہ قبول کرنے پر مائل بھی ہو گئے تھے لیکن جی اپچ کیوں میں صدر ایوب کے مخالف ٹولہ نے بنا بنا یا کھیل بگاڑ دیا۔ جزل بھی اور مجرم جزل پیر زادہ وغیرہ نے ڈھاکہ اور راولپنڈی میں اپنے ذراائع سے شیخ مجیب الرحمن کی یہ بین واٹنگ کر دی کہ اس بڑھے (صدر ایوب) کے ہاتھ میں اب کوئی اقتدار باقی نہیں جسے وہ سمجھوتہ کرنے کے بعد سیاستدانوں کو خفیل کر سکے۔ اقتدار حاصل کرنے کا شوق ہے تو ہمارے ساتھ چلو۔

شیخ مجیب الرحمن نے یہ بات اپنے پلے باندھ لی اور ۱۰ مارچ کو جب راؤنڈ نیبل کانفرنس دوبارہ شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے بریف کیس سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر ایک طویل اور کسی قدر بے ربط تقریر پڑھی جس میں ذکر تو ان کے چھ نکات کا تھا لیکن انجام علیحدگی اور تخریب پر مبنی تھا۔ اپنی تقریر ختم کرتے وقت شیخ صاحب نے زور دے کر کہا تھا کہ ان کی پیش کردہ تجویز پر عمل کرنے ہی سے ملک سلامت ہے سکتا ہے۔

اس پر صدر ایوب نے برجستہ پوچھا تھا۔ ”کون سا ملک؟“

اس رنگ اور سر پر راؤنڈ نیبل کانفرنس تو ناکام ہو کر ختم ہو گئی لیکن ملک کے طول و عرض میں بد امنی اور ہنگاموں کا زور نہ ٹوٹا تھا نہ ٹوٹا۔ بلکہ ان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ سعل محکموں اور اداروں کی نمائندہ یونینیں اور انجمنیں بھی پنجے جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور انہوں نے اپنے حقوق منوانے، تحریکیں بڑھوانے اور سی ایس پی وغیرہ کو ختم کروانے کی تحریک شروع کر دی۔ مغربی پاکستان میں ڈاکٹر ز، اساتذہ، پوشل ملائیں، گودیوں کے مزدور اور دوسرے بہت سے محنت کش بھی ہڑتاول پر چلے گئے۔ قدم قدم پر مار پیٹ قتل و خون، توڑ پھوڑ، گھیراؤ جلاو کے واقعات رونما ہونے لگے۔

ایک روز نیشنل بنک کے ہیڈ آفس میں چھوٹے ملائیں نے بنک کے سربراہ اور فینگنگ ڈائریکٹر کا آدمی رات تک گھیراؤ کر کے ان سے اپنے سب مطالبے زردستی منظور کروا لیے۔

اندرون خانہ ملک کی معیشت انتہائی شدید بحران میں بنتا تھی۔ باہر امن عامہ کی چادر تار تار تھی۔ ایک مشتعل ہجوم نے کراچی لس کورس پر حملہ کر کے وہاں پر ہر شے کو توں نہ س کر دیا۔ پی آئی ڈی سی، سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ تجارتی اداروں کے علاوہ سب چھوٹی بڑی صنعتی ملیں اور فیکٹریاں بھی گھیراؤ اور جلاؤ کی زد میں آئی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے ملک کے اقتصادی نظام پر گمرا جمود چھا گیا۔ ۱۳ مارچ کو کراچی کا اشناک ایکچھنج بھی بند ہو گیا۔ ڈھاکہ میں آدم جی جوٹ ملز اور پاکستان تمباکو کمپنی پر مزدوروں نے اپنا قبضہ جما لیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کا شر شر، گلی گلی، کوچہ کوچہ ”ایوب کتا ہائے ہائے“ اور ”ایوب کتا مردہ باد“ کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ اس ماحول میں صدر ایوب نے کابینہ کا اجلاس بلایا جوان کے عمد صدارت کی آخری کیبینٹ مینگ ثابت ہوئی۔ کمانڈر انچیف جزل بھی کو اس مینگ میں خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ صدر نے ملک بھر میں پھیلی ہوئی بد امنی اور بد نظمی کا تجزیہ بیان کر کے یہ تجویز پیش کی کہ اس گزرتی ہوئی صورت حال پر قابو پانے کا واحد طریقہ مارشل لاء کا نفاذ ہے۔ سب کی آنکھیں بری فوج کے کمانڈر انچیف کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ جب جزل بھی سے اس تجویز پر رائے طلب کی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر کہنا کرتا ہی کہ وہ اس بارے میں صدر ایوب سے الگ بات کریں گے۔ اس کے بعد صدر ایوب کی آخری کابینہ کا آخری اجلاس ہیشہ کے لیے برخاست ہو گیا۔

بعد ازاں تخلیہ میں صدر ایوب اور جزل بھی کے مابین جو گفتگو ہوئی اس کا براہ راست کسی کو کچھ علم نہیں البتہ بعض قرائیں و شواہد سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ جزل بھی نے مارشل لاء نافذ کرنے کی حامی اس شرط پر بھری کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا جائے، صوبائی گورنزوں کو ان کی کابینہ سمیت موقوف کر دیا جائے اور ۱۹۶۲ء کے آئین کو منسوخ قرار دیا جائے۔

صدر ایوب عاقل آدمی تھے۔ جزل بھی کا اشارہ پا گئے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنیستریٹر

بن کر وہ خود صدارت کی کرسی سنبھالنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کی اپنی ذاتی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اپنے پر درود جزل آغا محمد بھی خاں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ چنانچہ ایوان صدر کے بند کمرے میں انہوں نے خاموشی سے بلا چول و چوال ان کی ساری شرائط منظور کر لیں۔

تمن چار روز بعد میں نے سنا کہ پاکستان میں معین امریکن سفیر اچانک ایک خصوصی پرواز سے واشنگٹن روانہ ہو گیا ہے۔ اسی شام ایک سفارتی تقریب میں چند غیر ملکی نامہ نگار ایک طرف کھڑے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو سے میری شناسائی تھی۔ ایک انگریز صحافی سے میں نے پوچھا۔ ”پاکستان میں اس شدید بحران کے دوران یہ امریکی سفیر واشنگٹن کیا کرنے گیا ہے؟“

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”کیوں نہیں؟ منتقل اقتدار پر عملدرآمد سے پہلے واشنگٹن سے OK حاصل کرنا بھی تو لازمی ہے؟“

معلوم نہیں، اس کا یہ جواب فکاہیہ تھا یا سنجیدہ لیکن یہ حقیقت ہے کہ امریکی سفیر کے واپس آتے ہی ۲۵ مارچ کو صدارت کی کرسی بدل گئی۔ اس روز صبح دس بجے ایوان صدر میں صدر ایوب نے اپنا آخری پیغام ریڈیو اور ٹیلیویژن کے لیے ریکارڈ کروایا گیا۔ ریکارڈنگ کے دوران جزل بھی غمگین صورت بنائے ٹوے ہمانے کے انداز میں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جونہی ریکارڈنگ کے ثیپ ان کے قبضہ میں آ گئے۔ ان کا چہرہ خوشی سے تتمتا اٹھا۔ وہ ہشاش بشاش جھومتے جھامتے کمانڈر اچیف ہاؤس واپس واپس آئے۔ اپنے چند لنگوٹے دوستوں اور منظور نظر خواتین کو طلب کیا۔ شراب ناب کا دور چلا اور دیر تک سب نے ”ہے جمالو“ کی تان پر آپس میں مل جل کر دیر تک بھنگڑا ڈالا۔

۲۵ مارچ کو جزل بھی نے چیف مارشل لاءِ ایڈمنیستر کا عمدہ سنبھالا۔ اسی روز مجھے سابق صدر ایوب کا ایک خط ملا جو درج ذیل ہے۔

My Dear Shahab،

You must have heard my broad cast to the nation today in which I announced my decision to relinquish office. I know that you must have been shocked by this and I deeply value your sentiments toward me. I assure you my decision was dictated by only one consideration namely the need to preserve the unity and integrity of Pakistan. All my life I have believed in certain principles and I could not compromise them merely to continue in office. As senior functionaries of Government you know that this country cannot exist and make progress without a viable centre. I could not possibly preside over the liquidation of Pakistan by agreeing to all manner of demands. It was through a strong central Government that we were able to achieve a great deal during the last ١٢ years. In this your personal contribution and the contribution of your colleagues has been tremendous. Today all civil servants are under pressure but they represent one of the most valuable assets of our national life. So, don't lose heart and continue to do your duty without fear. You must do your job whatever the conditions and I expect you to give full co-operation to the new regime. I have no doubt in my mind that you will be treated with respect and that you will receive a fair deal.

I part from you with a heavy heart because I have come to have great affection and regard for You. You worked with dedication and a tremendous sense of loyalty.

Your Sincerely،

صدر ایوب کی شخصیت چنار کے درخت کی طرح خوبصورت، تناور اور شاندار تھی۔ لیکن گرتے گرتے اس کا تنا کافی حد تک کھوکھلا ہو چکا تھا۔ ذاتی طور پر وہ نیکی، شرافت، عمل پندی اور رحمی کے خونگر تھے۔ اقتدار میں آ کر انہوں نے ایک محنتی طالب علم کی لگن سے اپنا کام سیکھا۔ اور اس میں نمایاں مہارت حاصل کی۔ ان کی رگ میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خارجہ پالیسیوں میں نئے زاویے قبول کر کے انہوں نے دنیا بھر میں پاکستان کا وقار بلند کیا۔ اندر وون ملک انہیں زرعی اور صنعتی اور تجارتی ترقی کو بام عروج تک پہنچانے کا جنون تھا۔

ان شعبوں میں انہوں نے اتنی کامیابی ضرور حاصل کی کہ بہت سے لوگ ان کے دور حکومت کو پاکستان کی مادی ترقی کا سنبھالی زمانہ کہتے ہیں۔  
سیاست میں وہ ناکام رہے۔

تینوں مسلح افواج نے بڑی حد تک ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ لیکن اقتدار کے آخری ایام میں ان کے پروارہ چند بڑے افسران کے ساتھ یوفوائی کر گئے۔ اقتدار سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کے ایام نہایت خاموشی اور وقار سے گزارے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں ان کی اچھی اور خوشنگوار یادیں بیشہ تمانہ رہیں۔ اسلام آباد میں جب کبھی وہ عید کی نماز پڑھنے عید گاہ میں آتے تھے تو ایک بڑا ہجوم ان کے ساتھ گلے ملنے یا ہاتھ ملانے کے شوق میں انہیں گھیر لیتا تھا۔

ایک روز وہ راولپنڈی میں ایک کتابوں کی دکان سے باہر نکل رہے تھے تو کچھ طبلاء نے انہیں گھیر لیا۔ ایک لڑکے نے کہا۔ ”سر، آپ دوبارہ صدارت کیوں نہیں سنبھالتے؟“

ایوب خاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بیٹا! اب ایوب کتا بڑھا ہو گیا ہے۔“  
کئی جگہ نیکیوں کے اندر، بسوں کے اڑوں پر اور چھوٹی چھوٹی دکانوں میں اب تک ان کی تصویریں آؤ رہاں نظر آ جاتی ہیں۔ جب کبھی وطن عزیز پر کسی خطرے کے بادل منڈلانے لگتے ہیں تو کئی دیساتی علاقوں میں فوجی وردی میں لمبوس پاکستان کا علم بلند کئے ایوب خاں کی تصویر کے نیچے ایک فلمی گیت کے یہ بول درج ہوتے ہیں۔

”تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد“

## • روزگار سفیر

جب مجھے سفیر ہالینڈ سیجنے کا فیصلہ سنایا گیا تو مجھے یہ کرید لگ گئی کہ میں نوع انسانی کی اس جنس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کروں جنہیں انگریزی میں "دپلومیٹ" اور اردو میں پہلے اپنی کما جاتا تھا اور اب سفارتکار کہتے ہیں۔

اب تک میں نے سفیر حضرات کو سطحی طور پر کسی قدر بے اعتمانی سے زیادہ تر سرکاری تقریبات میں کھاتے پیتے یا ہوئی اڈوں پر استقبالیہ اور الوداعیہ موقعوں پر قطاریں بناتے دیکھا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے اپنے ملک کی الگ الگ نمائندگی کرتے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ عجیب الخلق تخلق ایک ہی تھیلی کے پڑے بڑے نظر آتی ہے۔ ان سب کی وضع قطع، تراش خراش، چال ڈھال، بول چال، لب و لجہ اور بندھی بندھائی، پی پٹائی اصلاحات و تسلیمات و محاورات پر اس محدود چار دیواری کی واضح چھاپ لگی ہوتی ہے جسے عرف عام میں Diplomatic Enclave کما جاتا ہے۔ عام طور پر ان کے چروں پر ایک ایسی مستقل اور مصنوعی مسکراہٹ چپاں ہوتی ہے جیسے کسی بڑھی نے بولی کا ثانکا مار کر خلک کڑی پر خط منحنی تراش دیا ہو۔ خوش طبعی اور زندہ دل سے کھلکھلا کر ہتنا ان کے آداب میں داخل نہیں، بلکہ موقع و محل یا ماحول کی رعایت سے ٹھٹھا لگانا یا ناک بھوں چڑھا کر منہ سکیرنا اور شانے اچکانا ان کی عادت ثانیہ ہے۔ گفتگو میں وہ چھپاتے زیادہ اور بتاتے کم ہیں اور ذو معنی اور گنجلک بات کو ابہام کی سان پر چڑھانا ان کا خاص طرہ امتیاز ہے۔ پروٹوکول کی رو سے سب سفیر برابر کا درجہ رکھتے ہیں لیکن چھوٹے ملک کے سفیر کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس کی کار بہت بڑی ہوتی ہے۔ غریب ممالک کے سفیر اپنے سفارت خانوں پر امارت کا چونا لگانے کی مہارت حاصل کرتے ہیں۔ جس سفیر کا ملک جس قدر غیر اہم ہو گا، اسی تناسب سے وہ اپنی اہمیت قدر و منزلت اور وقار کے وزن تلے دب کر خمیدہ کر نظر آنے کی کوشش میں لگا ہو گا۔ بڑے اور طاقتور

ممالک کے سفیر بھی کسر نفسی سے کام لینا نہیں جانتے اور بشرط ضرورت سفارتی اکھاڑے میں اپنے مخصوص جوڑو کرائے کے کرتب آزمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتے۔ دراصل کچھ سفیر بہت جلد اپنی انفرادیت پس پشت ڈال کر اس خود فرمی میں بتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کی ذات ان کے ملک کا نقش ثانی ہے۔ اس ممائش کو بجاہنے کے لیے بعض اوقات وہ ایسے ایسے مضمکہ خیز جتن کرتے ہیں کہ ان پر چلتے پھرتے انسانوں کی بجائے دیوار پر ٹنگے ہوئے نقشوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سفارت کاری کا فن یونانی علم الاصنام کے ایک دیوتا Herms کے زیر سایہ جنم لے کر پروان چڑھا تھا۔ یہ نہایت دلچسپ اور معنی خیز حسن اتفاق ہے کہ یونانی دیو مala میں اسی نام کے دیوتا کو بیک وقت جھوٹوں، اٹھائی گیروں، آوازہ گردوں اور لچوں لفتگوں کا سرپرست بھی مانا جاتا ہے۔

قدم یونان میں سفیروں کی کامیابی کا معیار صرف اتنا تھا کہ وہ طویل گفتگوؤں اور تقریروں میں فصاحت و بلاغت کے دیا تو ضرور بہائیں، لیکن ان میں معانی و مطالب کا شائیبہ تک نہ آنے دیں۔ سلطنت روما میں حکومت اپنے مفاد میں معاهدے تیار کر کے دارالخلافہ میں معین غیر ملکی سفیروں کو حکم دیتی تھی کہ وہ ان پر بلا چوں و چڑاں دستخط کر دیں۔ اگر کوئی سفیر کسی معاهدہ کو ماننے میں پس و پیش کرتا تھا، تو اسے باغی اور جاسوس قرار دے کر قید و بند کی حالت میں اس کے وطن واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ معاهدوں پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے بعض اوقات سفیروں سے ضمانت کے طور پر یہ غمال بھی طلب کر لیے جاتے تھے۔

سفارت کاری کو سب سے پہلے کاربوار حکومت میں ایک باقاعدہ اور منظم شعبے کا درجہ دینے کا سرا بزنطینی سلطنت کے سر ہے، لیکن قسطنطینیہ میں جتنے غیر ملکی سفیر معین ہوتے تھے، ان کی نہایت کڑی گمراہی کی جاتی تھی۔ سفیروں کی رہائش کے لیے حکومت انہیں نہایت عالیشان حوالیاں فراہم کرتی تھی۔ جن میں داخل ہونے کے بعد وہ بڑی حد تک

نظر بند قیدیوں کی طرح زندگی بسرا کرتے تھے۔ اگر کوئی سفیر باہر جانے کے لیے قدم اٹھاتا تھا، تو فوجی گارڈِ سلامی دینے کے بعد اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ باہر سے بھی کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ آج کل کی طرح ہر زمانے میں عام شریوں کا سفارت خانوں سے میل جوں بڑھانا شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کئی ممالک میں اس جرم کی سزا قید تھی۔ یورپ میں ایک ملک ایسا بھی تھا جہاں پر سفارت خانوں سے میل جوں رکھنے والا شری تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ انگلستان کے حکمران کرامویل نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہاؤس آف کامنز کا جو ممبر کسی غیر ملکی سفارتکار سے بات چیت کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اسے پارلیمنٹ کی رکنیت سے فی الفور خارج کر دیا جائے گا۔

سفارت خانوں کے اخراجات ان کی افادیت کے پیش نظر ہمیشہ بھاری تصور کئے جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں سفیروں کو کھلے بندوں تجارت کرنے کی اجازت تھی، لیکن یہ بندوں سے دریا ثابت نہ ہوا، کیونکہ سفیر حضرات سرکاروں و دیباڑوں میں حاضری دینے کی بجائے اپنا زیادہ وقت منڈیوں اور بازاروں میں صرف کرنے لگے تھے۔ کچھ یورپیں ممالک نے چھوٹے چھوٹے دستکاروں، کارگیروں اور اہل حرفة کو سفارتی عہدوں پر مامور کر کے بھی دیکھا۔ فرانس کے ایک بادشاہ نے اپنے حمام کو سفارت کی کرسی پر بٹھایا۔ فلورنس کے حکمران نے ایک عطار کو یہی اعزاز بخشنا۔ اس سے سفارت خانوں کے اخراجات میں تو ضرور نمایاں کی واقع ہوئی۔ لیکن روم میں پاپائے اعظم نے صدائے احتجاج بلند کی کہ ان کے پاس جو سفیر بھیجے گئے ہیں، ان کا معیار زندگی اتنا پست ہے کہ ان کے تن بدن سے بدبو آتی ہے۔ اسی طرح انگلستان کے بادشاہ ہنری هفتم نے ایسے سفیروں کو اپنے دیباڑ سے نکال دیا جن کے کپڑوں میں جو کہیں ریتیقی تھیں اور جو نمانے دھونے کے عادی نہ تھے۔

اس تجربہ کی ناکامی کے بعد کچھ حکومتوں نے اعلیٰ حسب نب کے ایسے امیر کبیر افراد کو چن چن کر اپنا سفیر مقرر کرنا شروع کر دیا۔ جو سفارت خانوں کے پورے اخراجات

اپنی جیب سے پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آرام پسند امراء میں اس مفت کی بیگار کو قبول کرنے سے کافی کتراتے تھے۔ بعض ممالک میں ایسے لوگوں پر بھاری جمانے کئے جاتے تھے۔ بعض دوسرے ملکوں میں انہیں پولیس اور فوج کی نگرانی میں زردستی ان کے سفارتی عمدوں پر روانہ کر دیا جاتا تھا۔

مختلف زمانوں میں سفارت کاری کے آداب اور معیار بھی مختلف رنگ اختیار کرتے رہے ہیں۔ ایک زمانے میں سفارتی مشن کی وقت اور اہمیت کا دار و مدار ان بیش بہا اور نادر تھنوں پر ہوتا تھا جو شاہی دربار میں پیش کئے جاتے تھے۔ بعد ازاں تھنوں تحائف کی جگہ سفیروں کا ذاتی جاہ و جلال اور حسن و جمال رنگ لانے لگا۔ انہارہوں صدی کے آخر میں انگلستان نے روس میں اپنا ایک ایسا سفیر متعین کیا جو مردانہ حسن صورت میں یوسف ثانی سمجھا جاتا تھا۔ سفارت کاری میں اس کا اہم ترین کارنامہ یہ شمار ہوتا تھا کہ ملکہ کیتھرائیں نے اسے اپنے پرائیویٹ ڈرینگ روم میں شرف بایابی بخشنا اور فرمایا۔ ”اگر میری عمر کچھ کم ہوتی تو میں اس قدر مصلحت اندیشی اور اختیار سے ہرگز کلام نہ لیتی۔“ روس کی ملکہ کیتھرائیں کی عمر پچاس برس سے اوپر تھی اور خوبصورت مرد اس کی کمزوری مشہور تھے۔

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ڈبلوی میں برطانیہ کا تجربہ دوسروں کی نسبت نیا وہ طویل اور وسیع ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ انگریزوں نے سفارت کا ڈھونگ رچا کر مغل بادشاہوں سے ایسی مراعات حاصل کر لیں جن کو آڑ بنا کر رفتہ رفتہ وہ اس بر صیر کے حکمران بن بیٹھے لیکن یہ سفارت کاری کا عمل کم اور تجارت کے پردازے میں سیاسی سازشوں اور فوجی ریشه دوائیوں کا نتیجہ نیا وہ تھا۔ لارڈ پا مرسن (متوفی ۱۸۲۵ء) کے زمانے تک سارے دنیا میں انگلستان کے صرف تین سفیر یعنی پیئرز برگ، پیرس اور ویانا میں متعین تھے۔ باقی مقامات پر فقط ایک آدھ کونسلر اور دو تین کلرک کافی سمجھے جاتے تھے۔ لارڈ پا مرسن خود بھی لندن کی وزارت خارجہ میں ہفتہ میں دو یا تین روز سے نیا وہ آ کر بیٹھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ فارن آفس کا مٹھی بھر عملہ اپنا نیا وہ وقت شغل بیکاری میں گزارتا

تحا۔ وقت کائے کے لیے ان کا ایک محبوب مشغله یہ تھا کہ شیشوں کا گھما پھرا کر وہ سڑک کے دوسری جانب نمبر ۱۰ ڈاؤنگ اسٹریٹ میں پرائم نشر کے ہاں کام کرنے والی خادماں پر روشنی کی تیز تیز شعاعیں ڈالا کرتے تھے۔

ٹیلیگراف، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلیوریشن، ہوائی جہاز اور موجودہ ایمی میڈیا دور کی "ہٹ لائن" سینٹلائٹ اور دیگر برق رفتار ذرائع رسائل و رسائل کی ایجادات نے سفارت کاری کی اہمیت اور نوعیت کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ ایک زمانے میں امریکہ کے صدر لفکن کی موت کی خبر ہندوستان میں تین ماہ بعد پہنچی تھی۔ صدر کینیڈی کے قتل کی خبر ساری دنیا میں چند منٹ کے اندر پھیل گئی۔ آج کل مملکتوں اور حکومتوں کے سربراہ ایک دوسرے کے ساتھ فوری طور پر مل کر یا "ہٹ لائن" پر گفتگو کر کے بڑے بڑے نازک مسائل پر قابو پا لیتے ہیں۔ موجودہ دور میں سفارت کاری کا سب سے بڑا کمال غالباً یہی ہے کہ وہ حکمرانوں کے درمیان افہام و تفہیم اور باہمی میل ملاپ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھیں۔

آج کل بیشتر ممالک میں سفارتی عہدوں فارن سروس کے پیشہ ور افراد سے پر کئے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی سیاست کے علاوہ دوسرے شعبوں سے بھی بعض لوگوں کو بوجوہ منتخب کر کے ان عہدوں سے نواز دیا جاتا ہے۔ البتہ امریکہ واحد ملک ہے جہاں ایک انجینئر تاجر، سیاستدان، صنعت کار، پینکر، انشورنس ایجنت، وکیل یا یونیورسٹی کا پروفیسٹر بھی آسانی سے سفیر کا عہدہ حاصل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کروڑ پتی ہو اور جیتنے ہوئے صدر کی انتخابی مضم میں جی کھول کر چندہ دے چکا ہو۔ ایک بہت بڑے تاجر میکسول گلگ کے متعلق مشہور ہے کہ ۱۹۵۷ء میں اس نے ۲۱۵۰۰ ڈالر کا چندہ ادا کر کے سری لنکا میں سفیر کا عہدہ حاصل کیا تھا۔ جب وہ سینیٹ کی فارن ریلیشنز کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے تو ان سے پوچھا گیا کہ سری لنکا میں کیا مسائل ہیں جن کے ساتھ امریکن سفیر کا واسطہ پڑے گا؟ اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

پھر پوچھا گیا۔ "ہندوستان کے وزیر اعظم کا نام کیا ہے؟"

مشریع گلگ نے جواب دیا۔ ”مجھے نام یاد نہیں آ رہا۔“  
پھر پوچھا گیا۔ ”سری لنکا کا وزیر اعظم کون ہے؟“

مشریع گلگ نے جواب دیا۔ ”اس کا کچھ عجیب اور ناماؤس سا نام ہے، مجھے یاد نہیں۔“  
سری لنکا میں سفیر کے طور پر مشریع گلگ کی تقریبی منظور ہو گئی۔ وزیر اعظم مشریع بذریعیکے  
تک جب یہ خبر پہنچی کہ کولبو آنے سے پہلے امریکی سفیر ان کا نام تک نہ بتا سکتے  
تھے، تو انہوں نے بھس کر ٹال دیا اور کہا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ  
وہ چار برس آکسفورڈ یونیورسٹی میں رہے اور صرف دو شخص ان کے نام کا صحیح تلفظ  
ادا کرنے میں کامیاب ہوئے۔

پاکستان کو بھی ایک ایسے امریکی سفیر سے واسطہ پڑ چکا ہے، جو امریکہ میں غالباً کوکا کولا  
کی تجارتی فرم کے واکس پریزیڈنٹ تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ عمدہ جلیلہ  
کس قدر چندہ کے عوض حاصل کیا تھا۔

پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ہائینڈ جانے کے لیے میں نے عفت اور ٹاپ کے ساتھ  
کراچی سے نیپلز تک سمندری جہاز سے سفر کیا اور چند روز روم میں ٹھہرنا کے بعد  
ریل کے ذریعہ ہم پہلے ایمسٹرڈیم اور پھر دی ہیگ پہنچے۔ ہیگ میں ہماری رہائش گاہ ایک  
تاریخی چوک پلین ۱۸۱۳ میں تھی۔ اس چوک کے چاروں کونوں میں صرف ایک ایک  
عمارت تھی۔ ایک کونے میں ہماری دو منزلہ رہائش گاہ تھی جس کے سامنے خوبصورت  
باغ اور پیچھے نہایت وسیع لان تھا۔ یہ عمارت حکومت پاکستان کی اپنی خرید کردہ ملکیت  
ہے۔ اس کے سامنے والے کونے میں وزیر خارجہ کی سرکاری قیام گاہ ہے۔ تیرے کونے  
میں وزیر اعظم کا دفتر اور اس کے سامنے کینڈا کا سفارت خانہ ہے۔ یہ چوک قوی آثار  
قدیمہ میں شمار ہوتا ہے اور ان پر چار عمارت کے علاوہ یہاں پر کوئی اور مکان یا دکان  
تعمیر کرنے کی اجازت نہیں۔

ہائینڈ کا دارالسلطنت تو ایمسٹرڈیم کھلاتا ہے۔ لیکن حکومت کے دفاتر ہیگ میں ہیں۔ اور

ملکہ کا محل ہیگ سے ۳۰ کلومیٹر دور واقع ہے۔ جب میری باری آئی کہ میں ملکہ جولیانا کے سامنے حاضر ہو کر ان کی خدمت میں اپنی سفارتی اسناد پیش کروں تو شدید برفباری کے دن تھے۔ صبح آٹھ بجے شاہی محل کی ایک خوبصورت کار اور موڑ سائیکل سوار پولیس کے آٹھ جوان ہمارے ہاں آگئے۔ سائز ہے آٹھ بجے میں اس کار پر پاکستان کا سبز پرچم لہراتا ہوا شاہی محل کے لیے روانہ ہو گیا۔ موڑ سائیکل سوار پولیس نے کار کو اپنے حصار میں لے لیا۔ چار آگے چار پیچے۔ پولیس کے دستے کا سائز سننے ہی سڑک کا سارا ٹرینیک ہمارے قافلہ کو راستہ دے دیتا تھا۔ کوئی چالیس پنٹالیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد جب ہم شاہی محل کی حدود میں داخل ہوئے تو صدر دروازے پر ایک چست اور مستعد فوجی گارڈ نے سلامی دی۔ اندر شاہی دربار کا ایک مارشل مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں پر ہم کچھ دیر کافی پیتے اور خوش گپیاں کرتے رہے۔ اتنے میں وزات خارجہ کا چیف آف پرولوگول اندر آیا اور مجھے اپنے ساتھ ملکہ جولیانا کی خدمت میں لے گیا۔ اسناد سفارت پیش کرنے کے بعد ہم دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ملکہ جولیانا کچھ دیر پاکستان کے بارے میں خیر سگالی کی باتیں کرتی رہیں۔ انہوں نے بیگم لیاقت علی خان کا بھی خاص احترام سے ذکر کیا جو مجھ سے پہلے ہالینڈ میں پاکستان کی سفیر نہ چکی تھیں۔ پھر پرولوگول کا عملہ ہمارے سفارت خانہ کے ایک افسر مسٹر جیل المحن کو اندر لے آیا۔ میں نے ان کا تعارف ملکہ سے کرایا اور اس کے بعد ہم اسی طرح موڑ سائیکل سوار پولیس کے ہمراہ ایک جلوں کی صورت میں واپس ہیگ آگئے۔

ہالینڈ کے ساتھ ہمارے تعلقات میں کوئی اجھاؤ نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں وہاں پر پاکستانیوں کی تعداد بھی نہیں کم تھی۔ اس وقت تک ان کے بھی کوئی خاص مسائل پیدا نہ ہوئے تھے۔ اس لیے سفارت خانے میں میرا کام غیر معمولی حد تک آسان اور ہلکا تھا۔ میرے ساتھ کام کرنے والا سارا عملہ بھی مخفی اور دیانتدار تھا۔ اپنے فالتو وقت کو مصرف میں لانے کے لیے میں نے لائڈن یونیورسٹی کی ایشن انسٹی ٹیوٹ سے کسی قدر استفادہ کیا۔ صوفی مشرف خان اور ان کی ولندیزی بیگم سے راہ و رسم بڑھی، تو

صوفی عنایت خان کے حوالے سے میں نے یورپ میں صوفی تحریک کا تھوڑا بہت جائزہ لیا۔ اس کے علاوہ یوٹریکٹ یونیورسٹی کی انسٹی ٹیوٹ آف پیراسائیکالوجی کے ڈائریکٹر پروفیسر ٹینن ہاف کے ساتھ بھی میرے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ ان کی اجازت سے میں نے کچھ عرصہ پیراسائیکالوجی کی ایک پوسٹ گریجوایٹ کلاس میں شرکت بھی کی۔ وہاں پر یقیناً دینے دنیا بھر کے ماہر روحانیات، نفیات اور مابعد النفیات کے علم اور علاج بالاعتقاد کرنے والے نامی گرامی ڈاکٹر آیا کرتے تھے۔ ان میں مسٹر جیرڑ کرانسیٹ کی بین الاقوامی شخصیت کا خاص درجہ تھا۔ قومیت کے لحاظ سے تو وہ ولندیزی تھے لیکن سارے یورپ اور امریکہ میں ان کا طویلی بولتا تھا۔ علاج بالاعتقاد Faith Healing کے علاوہ ان کے فن میں کشفیات کو خاص دخل تھا۔ خصوصاً وہ گمشدہ بچوں اور لاپتہ عورتوں اور مردوں کی نشاندہی کرنے میں عجیب مہارت دکھاتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی زندہ بچے، عورت یا مرد کا سراغ لگانے میں وہ کبھی کامیاب نہ ہوئے۔ ان کا کشف جب کبھی بروئے کار آیا فقط لاشوں کا کھون لگانے کے کام آیا۔ ان تمام حضرات کے عملی کمالات اور پیراسائیکالوجی کے علمی نصاب کا بغور تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مغرب کا یہ سارا کاروبار اسلامی تصوف کی ابجد تک کو نہیں چھوتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پیراسائیکالوجی کے سربراہ ٹینن ہاف اکثر میں میں ایک ویک اینڈ ہمارے ہاں گزارا کرتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کمی کی تصانیف ضیاء القلوب کا انگریزی ترجمہ کر کے میں نے انہیں دیا تو وہ ششدر ہ گئے۔ ان کا جی تو بہت لچکا کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائیں، لیکن اپنی ملازمت کے تحفظ کی نظر اور معاشرے کے خوف سے اس سعادت سے محروم رہے۔ البتہ ان کی اشینو گرافر مس جین ڈالٹن پر بیٹھے بھائے اللہ کا فضل ہو گیا۔ اپنے ادارے میں واپس جا کر پروفیسر صاحب نے ضیاء القلوب کا انگریزی ترجمہ اپنی اشینو گرافر کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ان کے کاغذات کے ساتھ سنبھال کر رکھ دے۔ مسٹر ڈالٹن تجسس کا

شوق رکھنے والی تحقیق پسند لڑکی تھی۔ اس نے ضیاء القلوب کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر ایسا اثر قبول کیا کہ ایک روز ہمارے ہاں آئی اور درخواست کی کہ ہم اسے مسلمان کر لیں۔

میں نے کہا کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر بتائے کہ وہ کیوں مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ اس راہ سلوک پر چلنے کی آرزو مند ہے جسے اختیار کرنے کا طریقہ ضیاء القلوب میں بتایا گیا ہے۔

ہم نے نہایت خاموشی سے اسے مشرف بہ اسلام کر کے اس کا نام رابعہ رکھ دیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک وہ ہمارے ہاں رہی۔ عفت نے اسے قرآن شریف ختم کروایا۔ پھر وہ ملازمت چھوڑ کر اپنے گاؤں چلی گئی اور عبادت اور ریاضت کے سارے راہ سلوک پر ایسا قدم رکھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم جیسے گنگاروں کی پنج سے بہت دور نکل گئی۔ اس نے ساری عمر شادی نہیں کی اور اب کچھ عرصہ سے اس کا مستقل قیام مکہ معظمه اور مدینہ منورہ میں ہے۔

دنیا کے دوسرے بہت سے دارالخلافوں کی طرح ہیگ میں بھی مقامی لوگوں کا ایک ایسا گروہ موجود تھا۔ جو سفارت خانوں کے استقبالیوں میں بن بلائے مہمانوں کی حیثیت سے شریک ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ قریباً قریباً ہر سفارت خانے کی ریسپشنز میں یہ جانے پچانے ”مان نہ مان میں تیرا مہمان“ نظر آیا کرتے تھے۔ خوش لباسی اور خوش گفتاری ان کا خاص طرہ امتیاز تھا اور موقع محل کے لحاظ سے وہ ہلکی چھلکی گپٹ اور مقامی سکینڈل سنانے میں بھی ید طولی رکھتے تھے۔ ہالینڈ کی وزارت خارجہ کے افسران لوگوں کی طرف نہایت قرآنیوں نگاہوں سے گھورا کرتے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں غیر ملکی تقریبات میں گیٹ کریش Gate Crash کر کے یہ افراد ڈچ قوم کا وقار گرا رہے تھے، لیکن عام طور پر سفارت خانے ان سے قطع تعلق کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ البتہ کیونٹ ممالک کی تقاریب میں شامل ہونے سے یہ لوگ بھی احتیاط برنتے تھے۔

اپنے اپنے وطن کا قومی دن ہر سفارت خانے کے لیے خاص اہمیت اور جشن کا دن Day Red Letter ہوتا ہے۔ اس دن کو منانے کے لیے عام طور پر ایک شاندار استقبالیہ منعقد کیا جاتا ہے، جس میں اکثریت ایسے مدعوئی کی ہوتی ہے جو یوں بھی وقہ فوچہ ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے ہی رہتے ہیں۔ بھیڑ بھاڑ، ناؤ نوش، خوش خوری اور سبک گفتاری کے انبوہ کے درمیان یہ استقبالیہ بعض اوقات ماہی منڈی کا سامان پیش کرتے ہیں۔ جمال پر ایک دوسرے کے ساتھ سنجیدہ گفت و شنید کا امکان سراسر مفقود ہوتا ہے۔ ایسے ہجوم میں خاموش نہ کر صرف کھانے پینے سے دلچسپی لینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے ہر کوئی ایک غیر معین سی خیر سگالی کی آڑ لے کر ایسی ایسی سال ناک (Small Talk) کرنے میں لگا ہوتا ہے جن کی مثال اور کسی جگہ ملنا محال ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص خوب سے خوب تر کی تلاش میں اس قدر سرگردان ہوتا ہے کہ گفتگو کے دوران اگر اپنے مخاطب سے زیادہ کوئی اہم شخصیت نزدیک نظر آجائے تو منہ کی بات ادھوری چھوڑ کر آنا فلانا اس کی طرف رجوع کرنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھا جاتا۔ دنیا بھر کے بہت سے ممالک میں اس طرح کی بے شمار تقاربیں شریک ہونے کے بعد میرا اندانہ ہے کہ ان استقبالیوں میں کوئی مقصد پورا نہیں ہوتا اور تھوڑی سی وقتی نمائش کو چھوڑ کر ان کا حاصل فقط وقت اور وسائل کا ضیاع ہے۔ ایک بار میں نے وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کو ہالینڈ سے یہ تجویز لکھ کر بھیجی تھی کہ ہمارے سفارت خانے اس قسم کے رسماں پر جو لاکھوں زر مبادله ہر سال خرچ کرتے ہیں، اس کا زیادہ بہتر مصرف یہ ہو گا کہ اس رقم سے دوائیاں خرید کر اپنے وطن کے غریب بیکاروں میں مفت بانٹ دی جائیں۔ اس خط کا تو مجھے کوئی جواب نہ ملا لیکن مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک روز کوئی نہ کوئی حقیقت شناس ملک جرات سے کام لے کر اس بے معنی بے مقصد اور سرفائدہ رسم سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

ہالینڈ پہنچ کر ملکہ پرونکول کے ایک افرانے مجھے بر سبیل تذکرہ یہ بتایا کہ اگر ہم سور کے گوشت (پورک ہیم، بیکن وغیرہ) سے پہنچ کرتے ہیں تو بازار سے بنا بتایا قیمه نہ

خریدیں کیونکہ بنے ہوئے قیمے میں اکثر ہر قسم کا ملا جلا گوشت شامل ہوتا ہے۔ اس انتباہ کے بعد ہم لوگ ہالینڈ کے استقبالیوں کا ایک من بھاتا کھاجا قیمے کی گولیاں (Balls) Meat کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔

ایک روز قصر امن میں بین الاقوامی عدالت عالیہ کا سالانہ استقبالیہ تھا۔ چودھری ظفر اللہ خان بھی اس عدالت کے بجھ تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قیمے کی گولیاں سر کے اور رائی کی چنی میں ڈبو ڈبو کر مزے سے نوش فرم رہے ہیں۔ میں نے عفت سے کہا کہ آج تو چودھری صاحب ہمارے میزبان ہیں، اس لیے قیمہ بھی ٹھیک ہی منگوایا ہو گا۔ وہ بولی، ذرا ٹھہرو پلے پوچھ لینا چاہیے۔

ہم دونوں چودھری صاحب کے پاس گئے۔ سلام کر کے عفت نے پوچھا۔ ”چودھری صاحب! یہ تو آپ کی ریسپشن ہے۔ قیمہ تو ضرور آپ کی ہدایت کے مطابق منگوایا گیا ہو گا؟“

چودھری صاحب نے جواب دیا۔ ”ریسپشن کی انتظامیہ کا محکمہ الگ ہے۔ قیمہ اچھا ہی لائے ہوں گے۔ لو یہ کتاب چکھ کر دیکھو۔“

عفت نے ہر قسم کے ملے گوشت کا خدشہ بیان کیا۔ تو چودھری صاحب بولے۔

”بعض موقعوں پر بہت نیاہ کریں میں نہیں پڑتا چاہیے۔ حضور کا فرمان بھی یہی ہے۔“

دین کے معاملات میں عفت بے حد منہ پھٹ عورت تھی۔ اس نے نہایت تیکھے پن سے کہا۔ ”یہ فرمان آپ کے حضور کا ہے یا ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا؟“

ہیگ میں ہمارے قیام کے دوران چودھری صاحب کا معمول تھا کہ اتوار کے روز شام کے چار بجے ہم کا رنجیج کر انہیں اپنے ہاں لے آتے تھے۔ رات کا کھانا کھلا کر نو بجے کے قریب ہم انہیں ان کے فلیٹ میں واپس پہنچا آتے تھے۔ ان کی یادداشت غصب کی تیز تھی اور ان کی زندگی کے مختلف ادوار کے متعلق ان کی گفتگو نہایت دلچسپ ہوتی تھی۔ ایک دو گھنٹے وہ ہمارے ساتھ انتہائی اشماک سے Scrabble بھی کھیلا کرتے تھے۔ انگریزی زبان پر اس قدر عبور حاصل ہونے کے باوجود وہ دوسروں کے حروف پر

کن انگھیوں سے نظر ڈالنے سے دربغ نہ کرتے تھے، اور ان چھوٹی چھوٹی چالاکیوں سے بازی جیت کر وہ بچوں کی طرح خوش ہوا کرتے تھے۔

جس روز وہ پہلی بار ہمارے ہاں آئے، ثاقب انہیں دیکھ کر بے حد حیران ہوا اس کی عمر اس وقت دو برس کی تھی۔ چند روز قبل ہم اسے ہالینڈ کے سب سے بڑے چڑیا گھر کی سیر کروا کر لائے تھے۔ چودھری ظفر اللہ خاں کے سرخ و سفید چہرے پر سفید داڑھی اور سر پر سرخ روپی ٹوپی دیکھ کر وہ نور سے بولا۔ ”کیا یہ بہر شیر ہے؟“ چودھری صاحب طبع چھوٹے بچوں میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اس لیے ہر اتوار کو جب وہ چار پانچ گھنٹے ہمارے ہاں گزارتے تھے، تو اتنا عرصہ ثاقب قدرتی طور پر نظر انداز رہتا تھا۔ یہ بات اس پر اتنی شاق گزرتی تھی کہ وہ دل ہی دل میں ان کے خلاف شدید دشمنی کے جذبات پالتا رہتا تھا۔ ان جذبات کا اظہار کرنے کے لیے وہ دو موقعوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ ایک تو یہ کہ چودھری صاحب کے ارو گرد منڈلا کر وہ زیرِ لب ببریڑایا کرتا تھا۔ ”توڑ کر پکا کر کھا جاؤں گا۔“ عفت نے ثاقب کو بہت ڈائنا ڈپٹا، ڈرایا دھمکایا کہ وہ معزز مہمان کے قریب جا کر ایسی بد تمیزی کی باتیں نہ کرے، لیکن وہ کبھی بازنہ آیا۔ البتہ غنیمت یہ ہوئی کہ چودھری صاحب اس کا یہ فقرہ کبھی سمجھے ہی نہ پائے۔ ٹھیک سائز ہے پانچ بجے چودھری صاحب دودھ کے ایک گلاس میں شد کے دو چمچے ملا کر پیا کرتے تھے جو نہیں ان کے لیے دودھ کا گلاس لایا جاتا، ثاقب بھی ضرور کہیں نہ کہیں سے آ کر عین سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی وہ شد کا دوسرا چمچہ دودھ میں ڈالنے لگتے تھے، ثاقب چلا کر کہتا تھا۔ ”بس بس ختم ہو جائے گا۔“ ہم نے اس کو اس حرکت سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن بے سود۔

ہیگ میں محمود ربانی نام کا ایک لبنانی نوجوان بھی رہائش پذیر تھا۔ اس کا بہت بڑا اور وسیع کاروبار تھا اور وہ نہایت امیرانہ ٹھاٹھ بانٹھ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ چودھری ظفر اللہ خاں کی دوسری بیگم بشری کا بھائی تھا۔ کچھ عرصہ قبل چودھری صاحب اور بشری بیگم

کے درمیان علیحدگی ہو چکی تھی۔ کسی وجہ سے محمود بیانی چودھری صاحب کا مداح نہ تھا۔ بلکہ ان کے خلاف معاندانہ اور سوچیانہ گفتگو کرنے کے موقع کی تلاش میں رہا کرتا تھا۔ وہ کئی بار میرے پاس آیا اور چودھری صاحب کی ذات کو الف لیلوی انداز سے بے نقاب کرنے کی پیش کش کی، لیکن میں اسے خوش اسلوبی سے نالتا رہا، البتہ ہیگ میں ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو محمود بیانی کو ہاتھوں ہاتھ لے کر سرفراز اللہ خاں جیسی میں الاقوامی شرط کے مالک اور عالمی عدالت کے بجھ کی کردار کشی کی داستانوں کو چٹخارے لے لے کر سننے کے شوقین نہ ہوں۔

ہیگ میں جتنے سفیر متعین تھے۔ ان میں ایک خاص کنڈہ ناتراش بھارتی سفیر تھا۔ وہ کسی چھوٹی موٹی بیاست کا راجکمار تھا اور ضرورت سے زیادہ بلند آواز میں باتیں کرنے کا عادی تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں جب یہ غلط خبر پھیلی کہ ہندوستانی افواج نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے تو اچانک سفارتی حلقوں میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ بعض نجی محفلوں میں بھارتی سفیر یہ ڈینگیں مار رہا ہے کہ وہ عنقریب ٹپین ۱۸۱۳ میں پاکستانی سفارت خانے کی عمارت پر قبضہ کر کے اس میں ہندوستانی آرٹ اور لپچر کا مرکز کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس قسم کی خبریں سن کر ترکی کے سفیر خاص طور پر مجھے ملنے آئے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ جو باتیں ہندوستانی سفیر سے منسوب کی جا رہی ہیں، وہ مخفی بے بنیاد افواہیں ہیں۔“

ترکی کے سفیر نے مسکرا کر پوچھا۔ ”آپ کی اس خوش نہی کی کیا خاص وجہ ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں کوئی ذمہ دار سفیر بھائی ہوش و حواس اس قسم کی بیووہ باتیں نہیں کر سکتا۔“

ترکی کے سفیر استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”ہندوستان کی اسیٹ پالیسی کی بنیاد کوئی یا چاکنیہ کے قلفہ پر ہے۔ ان کی سیاسی اور سفارتی باسیل ”ارتح شاستر“ ہے۔ غالباً ارتھ شاستر کی رو سے ایسی باتیں کرنا بالکل منوع نہیں جو آج

کل یہاں پر ہندوستانی سفیر کے ساتھ منسوب ہو رہی ہیں۔ سنا ہے کہ نئی ولی میں سفارت خانوں کے علاقوں کو چانکیہ پوری ”کما جاتا ہے۔“

URDU4U.COM  
۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پر ٹگال کا سفیر مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بار بار ملا کرتا تھا اور زور زور سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تیز تیز لجے میں کما کرتا تھا۔ ”ان کو مارو۔ ایسا مارو کہ ان کا سر کچل ڈالو۔“

پر ٹگال کا سفیر دل سے خواہشمند تھا کہ اس جنگ میں ہندوستان کو شکست فاش نصیب ہو۔ اس کی خفگی کی وجہ یہ تھی کہ کشمیر، جونا گڑھ اور حیدر آباد کی طرح بھارت نے گوا آپ بھی زردستی قبضہ کر رکھا تھا۔

ایران کے سفیر ایک کمزور شخصیت کے مالک تھے، ان کی سب سے بڑی مضبوطی صرف یہ تھی کہ شہنشاہ رضا پہلوی کے خاندان کے ساتھ ان کا کسی قسم کا رشتہ تھا۔ وہ اس رشتے کے زعم کی کلغی ہر وقت سر پر سجائے رکھتے تھے۔ شراب کے ریا تھے لیکن بہت جلد اتنا غنیل ہو کر دنیا و مافینا سے بے نیاز ہو جیا کرتے تھے۔ تھوڑی سی سو نوشی کے بعد وہ بھری محفل میں لکڑی کا کنہ بن کر ایستادہ ہو جاتے تھے اور دیر دیر تک نہیں جنبد نہ جنبد گل محمد کی مثال بے حس و حرکت کھڑے رہتے تھے۔

امریکی سفیر پہلے تو میرے ساتھ کچھ کھنپے کھنپے سے رہے لیکن ایک چھوٹے سے واقعہ کے بعد ہمارے درمیان جمی ہوئی سرد مری کی برف پکھل گئی۔ ایک اتوار کے روز دوپہر کے بالہ بجے کے قریب میں، عفت اور ٹاقب سڑک کے کنارے کھڑے ساحل سمندر کی طرف جانے والی ٹرام کا انتظار کر رہے تھے۔ امریکی سفیر اپنی بیوی کے ساتھ کار میں ادھر سے گزرا۔ ہمیں دیکھ کر وہ رک گئے اور پوچھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ہم ساحل سمندر کی طرف جانے والی ٹرام نمبر ۸ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بولے کہ وہ بھی وہیں جا رہے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ کار میں بینچے جائیں۔ میں نے کہا۔ ”ہم بیچ پر پکنک منانے ہمیشہ ٹرام ہی سے جاتے ہیں۔ اگر ہم کار

سے جائیں تو ہمارا بیٹا برا منتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا ہمارے پاس ڈرام میں سفر کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں؟"

یہ سن کر سفیر کی بیوی مسز نیل خوب نہیں اور بولی۔ "اچھا، آپ اپنے بچے کی خوشی کی خاطر آئیں تو بے شک ڈرام سے، لیکن وہاں پر یورپا ہوٹل میں آکر ہمارے ساتھ لج پڑو رکریں۔"

عفت نے کہا۔ "مسز نیل، اگر وہاں پر بھی آپ نے ہوٹل کے اندر بیٹھ کر لج کھانا ہے، تو بچ پر جانے کا فائدہ؟ ..... میری تجویز ہے کہ آپ اپنی کار چھوڑ دیں اور ہمارے ساتھ مل کر ڈرام میں چلیں۔ آپ کو واقعی پکنک کا لطف آئے گا۔"

معلوم نہیں، انہیں یہ بات اچھی لگی یا بری، لیکن اخلاقاً اور مردوں انسوں نے اپنی موڑ کار واپس بھیج دی اور ہمارے ساتھ ڈرام میں بیٹھ کر سخیونینگن کی طرف روانہ ہو گئے۔ بچ پر بچ کر ہم نے کہیں سے موںگ بچلی خریدی۔ کہیں سے لکھتی کی میٹھی اور نمکین کھلیلیں، کچھ آئس کریم کے ڈبے، چند کوکا کولا کی بوتلیں اور اپنے ساتھ لائے ہوئے آلو کے بھرے ہوئے پرانے، مزر قیمه اور گھر کا بنا ہوا آم کا اچار ان کی خدمت میں پیش کیا۔ خشک ریت پر بیٹھ کر انسوں نے یہ کھانا ایسی رغبت سے کھایا کہ اس کے بعد وہ اور بھی کئی بار اسی طرح ہمارے ساتھ ڈرام میں بچ پر آئے۔ ہماری دیکھا دیکھی کئی اور سفیر بھی گریبوں کے موسم میں اتوار کے اتوار اسی طرح بے تکلفی سے بچ پر اکٹھے مل کر پکنک منانے لگے۔ البتہ برطانوی سفیر نے اپنی اکٹھوں بدستور قائم رکھی۔ وہ ہمیشہ اپنی شاندار روزگار میں آتا تھا اور تحری پیس سوت اور فیلٹ ہیٹ میں ملبوس ریتلے گرد و غبار سے دامن بچاتا۔ کمی سڑک پر کچھ دیر سمندری ہوا کھا کر داد عیش دے جاتا تھا۔

ہیگ میں چینی سفارت خانہ ایک ناظم الامور کے چارج میں تھا۔ اس کے ساتھ ہمارے نہایت اچھے تعلقات تھے اور ہم ایک دوسرے کو اکثر کھانے یا چائے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ ناظم الامور عوامی جمہوریہ چین کی جدوجہد آزادی کا ایک پرانا اور آزمودہ کار سپاہی

تحا۔ ایک بار چند چینی ماہرین کا کوئی وفد ہیگ آیا ہوا تھا۔ وہ سب چینی سفارت خانے کی بالائی منزل میں قیام پذیر تھے۔ کسی طرح مقامی خفیہ اداروں نے وفد کے ایک رکن کو ورگلا کر چین سے مخفف ہونے اور ہالینڈ میں سیاسی پناہ حاصل کرنے پر آمادہ کر لیا۔ غالباً چینی ناظم الامور اس شخص کی نیت کو بھانپ گیا اور اسے سفارت خانے سے باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ پھر ایک روز ایک خاص وقت پر اس شخص نے سفارت خانے کی بالائی منزل کی کھڑکی سے باہر سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ کچی سڑک پر گر کر وہ کافی زخمی ہو گیا۔ عین اس وقت ایک ایمبولینس جو کہیں پاس ہی منتظر کھڑا تھا، عیوب سے نمودار ہوا اور زخمی چینی کو اس میں ڈال کر ہسپتال روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز چینی ناظم الامور اور اس کے چند ساتھیوں نے آپریشن تھیٹر میں کام کرنے والے ڈاکٹروں اور نرسوں کی وردی پہنی۔ چہرے پر جراشیم روکنے والی جالیاں اور ماسک چڑھائے اور جلیہ بدل کر ہسپتال پہنچ گئے۔ زخمی چینی کو آپریشن تھیٹر لے جانے کے بہانے انہوں نے اسے ایک اسٹریچر پر لٹایا اور اپنی کار میں ڈال کر چینی سفارت خانے لے آئے۔ جب ہسپتال والوں کو حقیقت حال کا علم ہوا تو ڈچ پولیس نے فوراً سفارت خانے کا محاصرہ کر لیا۔ حکومت زخمی چینی کو اپنے قبضہ میں لے کر دوبارہ ہسپتال لے جانا چاہتی تھی، لیکن ہر سفارت خانے کی چار دیواری مقامی قانون کی دسترس سے باہر ہوتی ہے اور اجازت کے بغیر کوئی شخص کسی سفارت خانے میں داخل ہونے کا مجاز نہیں ہوتا۔ پولیس کا محاصرہ دس روز تک جاری رہا اور وہ زخمی چینی سفارت خانے کے اندر ہی پڑا پڑا دم توڑ گیا۔ اس پر ناراض ہو کر ڈچ حکومت نے چینی ناظم الامور کو ناپسندیدہ شخص قرار دے کر چوبیں گھنٹے میں ہالینڈ سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ ہیگ چھوٹنے سے پہلے وہ چند منٹ کے لیے مجھے بھی الوداع کرنے آیا۔ اس روایت کے عالم میں بھی اس نے پاکستان کے ساتھ اپنی خیر سگالی کا خوب ثبوت دیا۔

میرے قیام ہالینڈ کے دوران ہم نے ”اقبال ڈے“ منانے کا اہتمام ہر برس لاہور یونیورسٹی

میں کیا۔ ایک بار وہاں کے وزیر تعلیم اقبال ڈے کی صدارت کے لیے آئے، تو ان کے ہمراہ ان کے ایک دوست بھی تھے جنہیں میں پہچانتا تھا۔ کئی برس پہلے ہم دونوں ایک ٹریننگ کورس میں اکٹھے ہو چکے تھے اور اس وقت سے ہمارے درمیان نہایت اچھے تعلقات استوار تھے۔ اب یہ صاب ایک عالی سطح کے خفیہ ادارے میں کسی اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ اقبال ڈے پر اس تجدید ملاقات کے بعد وہ اکثر ہمارے ہاں آنے جانے لگے۔ کسی وجہ سے وہ یہودیوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور کثر عیسائی ہونے کے باوجود مسلمانوں کے لیے ان کے دل میں کسی قدر نرم گوشہ تھا۔ انہوں نے براہ راست تو مجھے کبھی کوئی راز کی بات نہ بتائی۔ لیکن ان کی باقتوں کے یہیں السطور میں نے بہت سے دلچسپ نتائج اخذ کئے۔ خاص طور پر انڈونیشیا کے صدر سائیکارنو کے خلاف دونوں سپر پاورز کی سازشوں کی تفصیلات اور چند برس بعد پاکستان میں صدر ایوب کے نام ایک ثاپ سیکڑ خط میں لکھ دیں۔ انہوں نے اس خط کا کوئی خاص نوٹ نہ لیا، اور اسے پڑھ کر داخل دفتر کر دیا۔ ممکن ہے کہ انہوں نے میرے خط کے اس حصہ کا برا بھی منیا ہو گا جس میں ان کے خلاف اٹھنے والے طوفان کے امکان کے متعلق کچھ اشارے کئے گئے تھے، لیکن فروری ۱۹۶۹ء میں اقتدار چھوڑنے سے ایک ماہ قبل انہوں نے مجھے کہا، آج میں نے تمہارا ہیگ والا خط فائل سے نکلا کر دویاہ پڑھا ہے۔ تم نے جو کچھ لکھا تھا، بڑی حد تک ٹھیک لکھا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟“

ہیگ میں عید کی نماز کی جماعت ہماری رہائش گاہ میں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر محمود جو آج کل کینیڈا میں پروفیسر ہیں، امامت کرایا کرتے تھے۔ وہ اس زمانے میں داخینینگن یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ اس موقع پر بہت سے پاکستانیوں کا اجتماع ہو جاتا تھا۔ ایک عید پر

ایک نوجوان سے میں نے پوچھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے؟

”میں کمرشل آرٹ سکول کی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”میں نے سنا ہے کہ کمرشل آرٹ سکول بہت بھاری فیسیں لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جی ہاں، فیسیں تو بھاری ہیں۔“ وہ بولا۔ ”لیکن اللہ اس ملک کے کتنی کو سلامت رکھے گزارا ہو رہا ہے۔“

اس عجیب پر جواب پر مجھے حیرت ہوئی تو اس نے یوں وضاحت کی۔ ”یہاں پر ایک قانون ہے کہ اگر کوئی پالتو کتا کسی شخص کو کٹ لے یا صرف پتلون پر دانت کے نشان لگ جائیں تو انشورنس کمپنی سے اسے کافی بھاری ہرجانہ مل سکتا ہے۔ دکانوں پر ایسا مالہ بھی دستیاب ہے جو پتلون کے پانچوں پر چھڑک پر باہر نکلا جائے تو کتنے بے اختیار منہ کھول کر اس کی طرف لپکتے ہیں۔ کمرشل آرٹ کی فیس کی ادائیگی کے وقت میں ان سوالوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتا رہتا ہوں۔“

مجھے اس نوجوان کی حاضر دماغی، سوچ بوجھ اور خوش تدبیری پر واقعی رشک آیا۔ ساتھ ہی مجھے افسوس ہوا کہ تمیرہ چودہ برس قبل جب میں اسی شر کی انسنی ثبوت آف سوشن اسٹڈیز میں ایک کورس کر رہا تھا، تو اس زمانے میں مجھے یہ گر کیوں نہ معلوم ہوا۔

## • سی ایم ٹپ سے استعفیٰ

جزل بھی کے اقتدار میں آتے ہی حالات نے کچھ ایسا رنگ اختیار کیا کہ میں نے سول سروس آف پاکستان سے استعفی دے دیا۔ عمر کے لحاظ سے اس وقت میری ملازمت کے ابھی آٹھ یا نو برس باقی تھے۔

URDU4U.COM

درالصل شروع ہی سے سول سروس میرے لیے بازیچہ اطفال کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ ملازمت کے دوران پہلے بھی میں نے چار بار استعفی دے کر سول سروس کے بے رنگ و بو شیش محل سے نکل بھاگنے کی کوشش کی تھی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

پہلی بار جب مجھے استعفی پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس وقت مجھے آئی سی ایس میں داخل ہوئے فقط دس ماہ گزرے تھے۔ میں صوبہ بہار کے ضلع بھاگلپور میں اسنٹ کمشنر کے طور پر معین تھا۔ درجہ سوم کی محضی کرنا اور پولیس کے تھانوں کی کارکردگی کا جائزہ لینا میرے فرانس منصبی میں شامل تھا۔ میری کچھری میں جو مقدمات آتے تھے ان میں ملزموں کی اکثریت یہ کہ چلانے والوں، رکشا کھینچنے والوں، فٹ پاتھ پر چھاپڑی لگانے والوں اور منوع علاقوں میں بر سر عام پیشab کرنے والوں کی ہوا کرتی تھی۔ مجھے یہ لوگ بڑے مظلوم اور بے بس دکھائی دیتے تھے، جو چھوٹی چھوٹی بے ضابطگیوں کی پاداش میں زبردستی دھر لیے جاتے تھے۔ میں ایسے مقدموں کی ساعت پر نیاہ توجہ نہ دیتا تھا اور ضروری کارروائی پوری کر کے بعض ملزموں پر ہلاکا سا جمانہ کر دیتا تھا۔ بعض کو عدالت کے برخاست ہونے تک قید نا دیتا تھا اور اکثریت کو باعزت بری کر دیتا تھا۔ اس پر میرا کمشن اور سیشن بجج دونوں بڑے ناخوش تھے اور وقت فوقة مجھے تحریری طور پر ڈاٹ پلاتے رہتے تھے۔ البتہ تھانوں کے معاینے کا فرض میں نے بڑی تندی سے نبھایا۔ میں پروگرام بنائے بغیر کوئی دور افتادہ تھانہ چن کر وہاں اچانک یوں نازل ہو جیا کرتا

تحا جیسے پولیس والے جوئے کے اڈوں پر چھاپہ مارا کرتے ہیں۔ دن دن، رات رات معاشرہ کر کے میں تھانوں کی کارکردگی میں ہزاروں کیڑے نکال کر بڑی بڑی طویل روپوں لیں لکھا کرتا تھا۔ اس پر بھاگلپور کا انگریز ایس پی مجھ سے نالا رہتا تھا۔

انہی دنوں ”ہندوستان چھوڑ دو“ کی تحریک شروع ہوئی اور اس کی شدت نے آنا فنا بھاگلپور کے پورے ضلع کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کانگریسیوں نے ریل کی پیشیاں اکھاڑ دیں۔ سڑکوں کے پل توڑ دیئے، دیا کی کشتیاں جلا ڈالیں اور ڈاک خانوں، تار گھروں اور تھانوں پر حملے کر کے انہیں تباہ کر دیا۔ ضلع کے ساتھ سارے ذرائع آمد و رفت اور رسائل منقطع ہو گئے اور جگہ جگہ دہشت انگیزی اور تشدد کے واقعات رونما ہونے لگے۔ ایک روز خبر آئی کہ کسی گاؤں میں کانگریسیوں نے ایک پولیس کانٹیبل کو مار ڈالا ہے اور اس کی لاش کو یونین جیک میں لپیٹ کر ایک درخت سے لٹکا دیا ہے۔ کمشز، کلکش، ڈی آئی جی اور ایس پی نے فوراً حکم لگایا کہ میں موقع واردات پر جاؤں اور تفییش کے بعد طزموں کو گرفتار کر کے بھاگلپور لاو۔

میں نے دفعدار شیر خاں کی سربراہی میں مسلح گھوڑ سوار پولیس کا ایک دستے ساتھ لیا اور جائے وقوع کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ Mounted Armed Polices پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں سے بھرتی کی جاتی تھی اور بریش حکومت اسے ہندو اکثریت کے صوبوں میں نظم و ننق برقدار رکھنے کے لیے استعمال میں لاتی تھی۔ اس بندوست میں آم کے آم، ٹھیکھلیوں کے دام تھے۔ ایک طرف تو امن بحال رہتا تھا، دوسری طرف ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف عموماً اور پنجاب مسلمانوں کے خلاف خصوصاً منافرتوں کا جذبہ بڑی مضبوطی سے جڑ کپڑتا تھا۔

گاؤں پہنچ کر میں نے اپنا کیمپ لگایا اور مقامی کانگریسی لیڈرلوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہاں کا ایک لیڈر بھارت کے سابق صدر بابو راجندر پرشاد کا بیٹا تھا۔ وہ اور نیشنل لائف انشورنس کارپوریشن کے ایجنت کے طور پر کام کرتا تھا۔ اور چند ماہ پہلے

میں نے اس سے پانچ ہزار روپے کی انشورنس پالیسی لی تھی۔ میرے بلاوے پر وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ میرے کمپ میں آگیا۔ پہلے انہوں نے آزادی کی برکات پر جی بھر کے لمبی لمبی تقریس کیں۔ میں بھی کانج سے تانہ تانہ نکلا ہوا تھا۔ جواباً میں نے بھی غلامی کی لعنت پر حسب توفیق تبرہ کیا۔ میری باتیں سن کر وہ لوگ جیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ دفعدار شیر خاں نے چائے تیار کروائی۔ چائے کے دوران کا گرسی لیڈروں نے ازراہ خیر سگالی اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر آئی سی ایس میں میرے ہم خیال لوگ زیادہ تعداد میں ہوتے تو آج پولیس کے سپاہیوں کے قتل و خون کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں نے عرض کیا کہ اگر میں پولیس کا نشیل کے قاتلوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہا۔ تو میرے یہ خیالات دھرے کے دھرے وہ جائیں گے اور ضلع کی انتظامیہ مجھے عضو معطل بنا کر ایک طرف بٹھا دے گی۔ کچھ بحث و مباحثہ کے بعد کا گرسی لیڈر اس بات پر رضامند ہو گئے کہ اگر میں ایک دو روز صبر سے کام لوں تو وہ سپاہی کے قاتلوں کی نشاندہی میں ضرور میری مدد کریں گے۔

گاؤں واپس جا کر راج زائن پرشاد نے ایک عجیب حماقت کی۔ اس نے کا گرسیوں کے اجتماع میں میرے ہمدردانہ اور معقول رویے کی مبالغہ آمیز تعریف کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک خاصا بڑا جلوس میرے کمپ کی جانب روانہ ہو گیا۔ جلوس میں دو ہاتھی، آٹھ دس گھوڑے، کئی ڈھول بجائے والے اور دو ڈھانی سو عوام شامل تھے۔ وہ حکومت کے خلاف کا گرس کے مخصوص نعرے لگا رہے تھے اور پیچ پیچ میں کبھی کبھی ”اسٹنٹ کشر جنہے باد“ کا نعرہ بھی سنائی دیتا تھا۔ میرے کمپ کے پاس آ کر جلوس رک گیا۔ اور چند نوجوانوں نے آ کر اصرار کرنا شروع کیا کہ میں ان سے خطاب کروں۔ بڑی منت سماجت سے میں نے انہیں ٹالا اور وہ نعرے لگاتے ڈھول بجائے خوشی خوشی واپس لوٹ گئے۔ ایک چھوٹی سی پچی نے آگے بڑھ کر گیندے کے پھولوں کا ہار بھی مجھے پہنیا۔ جب یہ خبر بھاگلپور پہنچی تو حکام بالا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اگلی صبح انگریز گلکھر مسٹر پریڈو، ایس پی مسٹر سٹوک اور اسپیشل ڈیوٹی پر آیا ہوا ایک ڈی آئی جی مسٹر

سیووارٹ مشین گنوں اور واٹر لیس سے مسلح جیپ میں سوار ہو کر گاؤں پہنچے۔ ان کے ساتھ برا شیل کا بڑا سا ٹینکر تھا جو پڑول سے لباب بھرا ہوا تھا۔

یہ تینوں حضرات بغیر علیک سلیک کے میرے خیے میں داخل ہوئے۔ میری موجودگی کو سراسر نظر انداز کر کے آپس میں مینگ کرنے لگے۔ ان کی گردیں بھرے ہوئے خنزیروں کی طرح تنی ہوئی تھیں اور غیظ و غضب سے تمتما کر ان کے چہرے گلے سڑے چندروں کی طرح سیاہی مائل سرخ ہو رہے تھے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ وہ گاؤں کو آبادی سے خالی کر کے پڑول چھڑک کر آگ لگا دیں اور اسی طرح آس پاس کی فصلوں کو بھی نذر آتش کر دیں تا کہ آزادی مانگنے والوں کی پیٹھ پر خاطر خواہ تانیانہ عبرت لگایا جاسکے۔ جب وہ آپس میں اس نامعلوم منصوبے کی تفصیلات طے کرنے لگے۔ تو میں نے انہیں ٹوک کر یاد دلایا کہ یہ خاکسار بھی خیے میں حاضر ہے اور اپنا مشورہ ان کی خدمت میں پیش کرنے کا خواہشمند ہے۔

ڈی آئی جی نے پستول پر ہاتھ رکھ کر مجھے گالی دی۔ ”شٹ اپ یو باسڑا“ خیے سے دفع ہو جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔ ڈیم سن آف چیز“

کلکٹر اور ایس پی بھی خوب گرجے برے لیکن میں اڑا رہا کہ میں اس انکوارٹری کا انچارج ہوں۔ میرے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ایس پی نے اٹھ کر میرے منہ پر زنائے سے ایک تھپٹر ریسید کر دیا۔ میں نے بھی جواب آں غزل کے طور پر اسی طرح کا زور دار چانٹا اس کے منہ پر دے مارا۔ بھاری بھر کم ڈی آئی جی غصے سے چنگھاڑ کر اٹھا، مجھے گردن سے دبوچ کر ہوا میں اچھالا اور میری پیٹھ پر نزدست ٹانگ ریسید کر کے خیے سے باہر پھینک دیا۔

خیے سے اس طرح برآمد ہو کر میں نے دفعدار شیر خاں سے مشورہ کیا۔ ہم دونوں نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا کہ سرکاری فرانس کی ادائیگی تو بہر حال لازمی ہے۔ لیکن ایک غریب گاؤں کو آگ کے شعلوں سے بچانا بھی ہمارا فرض ہے۔ چنانچہ میں نے تینوں فرگنگی افسروں کے نام ایک حکم نامہ لکھا کہ ہر گاہ کہ آپ کے عزائم حکومت، ملک

اور انسانیت کے مفاد کے سراسر خلاف ہیں اس لیے علاقہ بھریٹ کی حیثیت سے میں آپ کو پابند کرتا ہوں کہ تا حکم ثانی آپ خیہے کے اندر ہی تشریف رکھیں۔ اس حکم کے خلاف ورزی کر کے اگر آپ میں سے کسی نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو عین نتائج کی ذمہ داری آپ کی گردن پر ہو گی۔

دفعدار شیر خاں کی ہدایت پر مسلح پولیس کا دستہ گھوڑوں پر سوار ہو خیہے کا محاصرہ کر کے ایستادہ ہو گیا۔ شیر خاں رائق کندھے پر رکھ کر اندر گیا، اور سلیوٹ کر کے میرا حکم نامہ میز پر رکھنے کے بعد دروازے کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔

خیہے کے اندر پہلے تضیییکی قمقے بلند ہوئے۔ پھر فسح و بیان گالیوں کا طوفان امدا۔ کچھ دیر بعد کلکٹر مسٹر پریڈو نے اپنی لمبی یہودیانہ ناک ذرا سی باہر نکال کر صورت حال کا جائزہ لیا تو اس کا سر ریڑ کی گیند کی طرح پچک کر شاک سے اندر چلا گیا۔ اس کے بعد خیہے کے اندر مردی چھا گئی۔

میں نے ان افراد کی جیپ سے بیز کی بوتلیں، گلاس، سینڈوچ کے پیکٹ اور واٹر لیس کا سیٹ ایک سپاہی کے ہاتھ خیہے میں بھجوا دیا۔ اور برمائیل کے پڑوں نیکر کو حکم دیا کہ وہ فوراً بھاگلپور واپس چلا جائے۔

خیہے میں کچھ دیر سناتا رہا۔ صرف بیز کی بوتلوں اور گلاسوں کی کھن سنائی دیتی تھی۔ پھر ایس پی نے واٹر لیس سیٹ چلایا اور بھاگلپور پولیس لائن کے ذریعہ کمشنر کے نام کلکٹر کی جانب سے ایک پیغام لکھوا�ا۔ جب یہ پیغام کمشنر مسٹر بی کے گوکھلے تک پہنچا تو انہوں نے گورا فوج کا ایک دستہ ساتھ لیا اور ہے نفس نہیں ہمارے یکمپ کی جانب روانہ ہو گئے۔

اس اثناء میں اس سارے واقعے کی خبر متاثرہ گاؤں اور اس کے مضافات میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ خبر کم اور قیاس آرائیاں نیا وہ۔ کوئی کہتا تھا کہ انگریز افراد نے مجھے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے، کسی کا خیال تھا کہ میں نے ایک انگریز افسر

مار ڈالا ہے اور دو کو حرast میں لے رکھا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ افواہوں کے اس ریلے میں آٹھ نو سو افراد کا ہجوم ہمارے یکمپ کے آس پاس جمع ہو گیا۔ کچھ لوگ ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار تھے۔ کچھ نیل گاڑیوں اور رتھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی مخلوق پاپیاہ تھی۔ یہ لوگ ڈھول بجا رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے اور فرنگیوں کو بے نقط گالیاں دے رہے تھے۔ کمشنر گوکھلے آیا تو بڑے طنطئے سے تھا کہ میری گوشمالی کرے لیکن مجمع کا یہ رنگ دیکھ کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے دم دبا کر گلکھر، ڈی آئی جی اور ایس پی کو گورا فوج کی حفاظت میں دیا اور مجھے ”باغی“ مسلح پولیس کے دستے کے ہمراہ فوراً بھاگلپور حاضر ہونے کی تاکید کی۔

ہیڈ کوارٹر پہنچ کر دفعدار شیر خاں اور اس کے ساتھیوں کو نہتا کر کے کوارٹر گارڈ کر دیا گیا اور مجھے ناہلی، بد انتظامی، سرکشی، حکم عدالتی اور مسلح پولیس کو بغاوت پر اکسانے کی چارچ شیٹ ملی۔

جواب میں میں نے آئی سی ایس سے دو سطری استغفار لکھ دیا۔

چند روز بعد صوبہ بھار کے انگریز گورنر نے مجھے صبح کے ناشتے پر گورنمنٹ ہاؤس پنڈ میں مدعو کیا۔ ان کی فرمائش پر میں نے سارا واقعہ حرف بہ حرف بیان کر دیا، جسے سن کر انہوں نے میرا استغفار مجھے واپس کر دیا۔ اور بولے۔ ”شلاش“ تم نے صورت حال کو مزید پیچیدہ ہونے سے بچا لیا۔ اس پر تمہیں مستغفاری ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

گورنر کے حکم پر میں نے اس سارے واقعے کی تحریری روپورٹ بھی ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس کے دو ڈھائی ماہ بعد ایک روز مجھے اچانک یہ حکم ملا کہ میں نی دہلی میں وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ہوم ممبر کی خدمت میں حاضری دوں۔ ان کا اسم گرایی سر ریجنیالڈ میکسول تھا۔ یہ ایک مسخرے سے بیار صورت آدی تھے۔ اس سانحہ کے متعلق ان کے سامنے کئی متفاہ رپورٹیں تھیں۔ گورنر کی روپورٹ میرے حق میں تھی۔ لیکن چند انگریز افسروں نے دیگر ذرائع سے اس کے بر عکس رپورٹیں پہنچا رکھی تھیں۔

جب میں مقررہ وقت پر سر ریجنیالڈ کے دفتر پہنچا، تو وہاں کونسل کے ایک مسلمان ممبر سر سلطان احمد بھی موجود تھے۔ ہوم ممبر نے ان کے سامنے مجھے بری طرح لتاڑنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید سر سلطان احمد میرے حق میں کچھ کلمات خیر ارشاد فرمائیں گے۔ وہ صوبہ بھار کے رہنے والے تھے۔ وہاں کے صحیح واقعات سے پوری طرح واقف تھے اور پہنچ میں میری ان کی تھوڑی بہت صاحب سلامت بھی تھی۔ لیکن وہ دم سادھے چپ چاپ بیٹھ رہے۔ جب ہوم ممبر آٹھ دس منٹ بول چکے تو انہوں نے قدرے چیخ کر کہا۔ ”تم بھی تو کچھ بولو۔“ کیا تمہارے منہ میں زیان نہیں۔“

میں نے جواب دیا۔ ”سر،“ میں اپنی تحریری رپورٹ گورنر کو دے چکا ہوں۔ اپنا استغفار بھی پیش کیا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو میں تحریری رپورٹ یا استغفار دونوں از سر نو آپ کی خدمت میں پیش کر دوں؟“

”بے شک اور غیر متعلق باتوں سے میرا وقت ضائع مت کرو۔“ انہوں نے جنبھلا کر کہا۔ ”کیا تمہارے پاس اپنی صفائی میں ایک بھی معقول دلیل نہیں ہے؟“

میں نے ملتمنت سے کہا۔ ”سر، آپ آئی سی ایس کے آخری زینے پر ہیں۔ میں ابھی پہلی یہڑھی پر ہوں۔ اگر آپ میری جگہ موقع واردات پر ہوتے تو اپنے وسیع تر تجربے کی روشنی میں کیا قدم اٹھاتے؟“

اس پر ہوم ممبر سرکس کے کلاون کی طرح اپنی کرسی پر گھوئے، اور ہنس کر بولے۔ ”غالباً وہی جو تم نے اٹھایا۔ تمہارا فیصلہ صحیح لیکن طریق کار غلط تھا۔ خیر جاؤ، آئندہ احتیاط برٹنا۔“

میں نے پوچھا کہ دفعدار شیر خاں اور اس کے ساتھیوں کا کیا حشر ہو گا؟ سر ریجنیالڈ نے کہا کہ ان کے خلاف بھی کوئی ایکشن نہیں لیا گیا، البتہ انہیں صوبہ بھار سے کہیں اور تبدیل کیا جا رہا ہے۔

جب میں ہوم ممبر کے کمرے سے نکلا تو سر سلطان احمد بھی میرے ساتھ ہی باہر آ گئے۔ انہوں نے بڑی شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مشورہ دیا کہ آئی سی

ایس میں پہلے ہی مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ چائے پلائی اور کچھ دیر تک اپنی قومی خدمات کا ذکر کرتے رہے۔

اس کے بعد دوبارہ سابق صدر اسکندر مرزا اور ایک بار فیلڈ مارشل ایوب خاں کے زمانے میں بھی ملازمت سے استعفی دینے کا شوق چرایا، لیکن تینوں بار تیر نشانے پر نہ بیٹھ سکا۔

لیکن جب بھی خاں اپنے بے ضمیر باطن کی اندر گنگری سے چوپٹ راجہ بن کر ارض پاک پر نازل ہوا، تو میرے اندر کسی دبے ہوئے جنون نے بھی کروٹ لی۔ اس شخص کو میں مدت سے پہچانتا تھا۔ اس کی پیشانی پر بے برکتی اور بد توفیقی کی ایک واضح مرثبت تھی۔ جن دنوں آزاد کشمیر کا جماں زوروں پر تھا، بھی خاں کسی سلسلے میں پونچھ فرنٹ کی طرف آیا۔ میں آزاد کشمیر حکومت کا سیکرٹری جزل تھا۔ پلندری اور تراڑ کھیل کے درمیان ایک پاڑی جو نجاح میں پر ہمارا سیکرٹریٹ واقع تھا۔ یہاں پر چند کچے مکان تھے جن میں آزاد کشمیر کے صدر، وزراء اور دوسرے ملازمین کی رہائش گاہیں اور دفاتر تھے۔ دن کے وقت سیکرٹریٹ کا کام عموماً درختوں کے سامنے میں ہوتا تھا۔ کسی کے پاس لوہے کی کرسی تھی۔ کسی کے پاس چوبی اسٹول، کوئی پتھروں کا چبوترہ بنا کر بیٹھتا تھا، کوئی گھاس پر نیم دراز ہو کر فالکیں چلاتا تھا۔ دن میں کئی بار ہندوستان کے بمبے طیارے ہمارے اوپر سے گزرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی پرواز اس قدر نیچی ہوتی تھی کہ پالٹ کا چہرہ تک نظر آنے لگتا تھا۔ ایک روز ہم کوئی میٹنگ کر رہے تھے کہ ایک گول مٹول سافٹی جیپ سے اتر کر ہمارے پاس آیا۔ چہرے پر سوچن اور آنکھوں میں گندے انٹے کی ابلی ہوئی زردی سی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی اور دوسرے میں چڑے کا گول تھیلا تھا۔ آتے ہی اس نے اپنی جھونپڑی میری ناک کے عین سامنے گھمائی اور قدرے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”یہاں کیا تماشا ہو رہا ہے؟“

میں نے عرض کیا کہ یہ آزاد جموں و کشمیر گورنمنٹ کا سیکرٹریٹ ہے۔

یہ سن کر اس کی توند تسلی میں پڑی ہوئی باسی او جھڑی کی طرح گدگدائی اور گلے سے غوغو غاغا کی کچھ رندھی ہوئی آوازیں برآمد ہوئیں۔ یہ اس بات کی دلیل تھی، کہ آغا محمد یحیٰ خاں صاحب ازراہ تمثیر تحقیقہ فرماء رہے ہیں۔ ہمارے سیکرٹریٹ کی بیت کنائی پر چند تحقیری اور تضھیکی پھتبیاں کرنے کے بعد آغا صاحب بور ہو گئے اور کچھ دور پرے جا کر درختوں کی اوٹ میں ایک چٹان پر بیٹھے گئے۔ اپنا تھیلا کھول کر انہوں نے کچھ سینڈوچ نوش فرمائے، اور پھر پیاس بجھانے کے لیے غالباً پیسر کی بوتل نکالی۔ رمضان کے دن تھے۔ یہ دیکھ کر میرا پوچھی اردوی جلال میں آگیا اور اس نے دور ہی دور سے انیں لکارا۔ ”خبردار صاحب! یہ حرام بند کرو، ابھی ابھی مینڈھر کی وادی ہمارے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ اب خدا کے غصب کو اور نہ بلاو۔ بوتل توڑ دو۔ ورنہ خون خرابہ ہو جائے گا۔“

یحیٰ خاں نے بوتل تو نہ توڑی۔ لیکن جلدی جلدی سامان سمیٹ کر زیر لب بڑھتا ہوا نو دو گیاہہ ہو گیا۔

کئی برس بعد مجھے یحیٰ خاں کی نیارت ایک اور رنگ میں نصیب ہوئی۔ جب پاکستان کا دارالخلافہ راولپنڈی اور اسلام آباد منتقل ہو رہا تھا، تو ارباب پنڈی کلب نے کراچی سے تانہ واردان بساط ہوائے دل کی خیر سگالی کے لیے ایک زردوست محفل ناؤ نوش منعقد کی۔ مارشل لاء کا بول بالا تھا۔ کئی سوں سرونوٹ چند کلیدی فوجی حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ کچھ بیگمات بھی اس میں اپنے خاوندوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے سچ دھج کر شریک محفل تھیں۔ اس انجمن میں یحیٰ خاں چمک کر پھدک کر کبھی ایک بیگم کبھی دوسری بیگم سے نکراتا تھا۔ بڑی محنت مشقت کے بعد اس نے ایک طرحدار خاتون کو پھانا اور اسے گھیر گھار کر باہر لان میں لے گیا۔ کچھ دیر آنکھ پھولی کا کھیل ہوتا رہا۔ بد مستی کے عالم میں یحیٰ خاں کی بیہمانہ ہنہناہست اور طرحدار خاتون کے نزم و نازک قبیلے اندر بیٹھے ہوئے دوسرے امیدواروں

کی چھاتی پر موگ دلتے رہے۔ پھر نور کا دھماکا ہوا، اور سب لوگ بھاگ کر باہر آ گئے۔ خاتون تو ایک میز پر نالگیں لٹکائے بیٹھی بڑے آرام سے شیمپن کا جام پی رہی تھی لیکن غریب بیجی خان کسی کری سے نکرا کر آدھ موئے دنبے کی طرح نہیں پر چاروں شانے پت گرا پڑا تھا۔ یار لوگوں نے دھکیل دھکال کر اسے بھٹایا۔ وہ حنوٹ شدہ اکڑی ہوئی لاش کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا اور کسی نے اس کی پتلوں اور کھینچ کر توند کے نشیب پر از سر نوفٹ کی۔

جس زمانے میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے بیجی خان کو فیڈرل کیپٹل کمشن کا چیئرمین نامزد کیا تو میں اس حسن انتخاب پر عش کر اٹھا۔ میں نے سوچا کہ فیلڈ مارشل نے غصب کی مردم شناسی سے کام لیا ہے۔ اور بڑی حکمت عملی سے اس شخص کو فوج سے الگ کر کے کیپٹل کمیشن کی پول میں دھانس دیا ہے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جب سابق صدر ایوب نے اس تھیور اور بد مست شخص کو پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف بنا ڈالا تو یہ راز کھلا کہ یہ مردم شناسی کا اعجاز نہیں۔ بلکہ خود حفاظتی کی ڈھال کے طور پر کوئی معشق ہے اس پردة نگاری میں!

کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز ہوتے ہی آغا صاحب نے فوج کی قیادت کے علاوہ ملک کی صدارت کی رسروسل بھی شروع کر دی۔ اس رسروسل کا پہلا زریں موقع بیجی خان کو اس وقت ملا جب ۱۹۶۸ء کی جنوری میں ایک رات فیلڈ مارشل ایوب خان پر اچانک عارضہ قلب کا شدید حملہ ہوا۔ وہ تو رفتہ رفتہ صحت یاب ہو گئے لیکن بیجی خان کو صدارت کی اس رسروسل کا کچھ ایسا چکا پڑا کہ اب اس نے برسر اقتدار آنے کی با ضابطہ منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس جوڑ توڑ کو پروان چڑھانے کے لیے اسے بڑی آسانی سے ایک سدھا سدھایا بھاڑے کا ٹو بھی پاس ہی مل گیا۔ اس شخص کا نام مجر جزل ایس جی ایم، ایم پیر زادہ تھا۔ جس زمانے میں وہ صدر ایوب کا ملٹری سیکرٹری بن کر آیا تھا، اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر وقت بلا وجہ مسکرانے کی کوشش میں

رہا کرتا تھا۔ یا کاری کے اس رندے نے اس کے چرے پر دو ایسی مستقل سلوٹیں تراش رکھی تھیں کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی کا منہ چڑھا رہا ہے۔ یوں بھی اس کے کان کی لوؤں اور چرے بشرے کے مساموں سے ٹنگلک، رویاہی، چکہ سازی، حیله گری اور ہچھر پھر کا گدلا سالعب اس طرح رس رس کر پلکتا تھا جیسے چیز کے تنے سے لٹکے ہوئے بدنے میں لیسدار گندہ بیرونہ قطرہ قطرہ پھسل کر گرتا ہے۔ کبھی کبھی جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوتا تھا تو خبث باطن کا تعفن پھٹنے ہوئے گزر کی سزادگی مانند چاروں طرف پھیل جاتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ لپک کر بہت سی کھڑکیاں کھول دی جائیں اور باہر کی صاف ہوا کو اندر آنے دیا جائے۔

ملٹری سیکرٹری کے طور پر کام کرتے ہوئے مجر جزل پیر زادہ کو نیاہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس پر بھی دل کا دوہہ پڑا۔ چند ماہ بعد صدر ایوب نے اسے جی ایچ کیو واپس بھیج دیا۔ یہ واپسی اس کی خواہش اور توقع کے خلاف تھی۔ اس لیے جاتے وقت وہ علی بابا چالیس چور کی مرجعنا کی طرح ایوان صدر کے چھانک پر اپنی ناکام آرزوؤں کی کالک سے اپنی مراجعت کے عزم کا نشان ڈالتا گیا۔

اس کے بعد جزل پیر زادہ سے میری ملاقات چند بار بر گیڈ بیر ایف آر خاں کے گھر پر ہوئی۔ جمال وہ مفت کی شراب پینے بالاتر ام آیا کرتا تھا۔ شراب کے نشے میں وہت ہو کر وہ اکثر قالمین پر ٹانگیں پسار کر پینھ جاتا تھا۔ اور ملک کے بگڑتے ہوئے حالات پر بے سلط قسم کا تبصرہ شروع کر دیتا تھا۔ ایک روز موضوع سخن بدلنے کے لیے میں نے اس سے کہا کہ افواج پاکستان کی پیش کمیٹی نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ جزل بھی کی رائے بھی لی جائے کہ کمانڈر انچیف کی پیش متعین کرنے کے لیے کیا فارمولہ وضع کرنا چاہیے؟ یہ سن کر مجر جزل پیر زادہ فوراً اکڑوں ہو کر پینھ گیا۔ شراب کے نشے میں بکھری ہوئی اس کی ٹیڈھی ترچھی آنکھیں سست کر سکڑ گئیں، جیسے پلاسٹک کے باوا کو ملایا جائے تو اس کی آنکھوں کے منکے گھوم

گھوم کر ایک دوسرے کے پاس آ جاتے ہیں۔ اس نے سر جھنجھوڑ کر زور سے تمثیر بھرا قبھہ لگایا اور بولا۔ ”تم اس فکر میں نہ چڑو۔ کمانڈر انچیف کی پشناش تمہارے بس کا روگ نہیں۔ وقت آنے پر آغا جزل محمد بھی اسے خود ہی طے کر لیں گے۔ انشاء اللہ“

URDU4U.COM

پاکستان کی بحیری، بربی اور فضائی افواج کے لیے ایک منظم اور باضابطہ پشناش کوڈ تجویز کرنے کے لیے حکومت نے ایک کمیٹی قائم کی تھی۔ میں اس کا چیئرمین تھا۔ اور بریگیڈیئر عبدالحمید کمودور اے حمید اور گروپ کیپٹن غلام حسن اس کے ممبر تھے۔ یہ تینوں افسر بڑے مختی، لاکٹ اور واقعیت شناس تھے۔ ایک برس کی لگاتار محنت کے بعد ہم نے کوڈ مرتب کر لی۔ اسے آخری شکل دینے سے پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ بحیری، فضائی اور بربی افواج کے سربراہوں سے بھی مشوہد کر لیا جائے کہ ان کے ہم مرتبہ افسروں کی پشناش کن اصولوں کے تحت تجویز کی جائے۔ ایئر فورس اور نیوی کے سربراہوں نے تو اپنی رائے دے دی لیکن جزل بھی چپ سادھ کر بیٹھ گیا۔ تک آ کر میں نے وزیر دفاع ایڈمیٹرل اے آر خاں سے اس بات کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے مجھے اپنے ہمراہ لے کر بھی خاں کی خدمت میں خود حاضر ہونے کی حामی بھر لی۔ راستے میں میں نے ان سے پوچھا۔ ”وزیر دفاع کے طور پر آپ کو یہ اختیار ہو گا کہ آپ آرمی کے کمانڈر انچیف کو اپنے دفتر میں بھی طلب کر سکیں؟“ ایڈمیٹرل صاحب نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

بھی اسی کیوں پہنچ کر پشناش کے متعلق جزل بھی سے جتنے سوال پوچھئے گئے۔ غالباً وہ سب اسے کسی قدر ناگوار گزے۔ جس غیر سمجھیدہ اور لا ابالی انداز میں اس نے سارے مسئلے کو ٹرخا دیا۔ اس سے عیاں ہوتا تھا کہ کمانڈر انچیف کے عمدے سے پشناش پر جانا اس شخص کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔

ایوب خاں کے زوال پر جس روز بھی خاں نے زندہ ناج گانے کے ساتھ اپنا جشن تاجپوشی منایا۔ اسی روز جزل پیر زادہ نے بھی ایوان صدر پر قبھہ کر کے اس میں اپنا آسن جما لیا۔ اس گھر کی غلام گردشوں سے وہ پہلے ہی بخوبی واقف تھا۔ یہ ایک ایسے بے برکتے

دور کی ابتدا تھی جس کی بسم اللہ ہی اللہ پڑی۔ اگلے روز اس کے ایماء پر ایک حکمنامہ جاری ہوا کہ ایڈرل اے آر خاں، سید فدا حسین شاہ اور میاں ارشد حسین کو صدر پاکستان کا مشیر مقرر کیا گیا ہے۔ یہ خبر پا کر فضائیہ اور بحربیہ کے کمانڈر انچیف بھی خاں پر چڑھ دوڑے۔ اور ایک ہنگامی میٹنگ میں انہوں نے مارشل لاء کے مال غنیمت میں اپنا اپنا حصہ طلب کیا۔ یہ میٹنگ اس قدر طوفانی تھی کہ ایک کمانڈر انچیف نے جو عام طور پر شراب نہیں پیتے تھے، برانڈی کا آدھا گلاس منگوایا اور اسے ایک ہی سانس میں غٹاٹ چڑھا گئے۔

جزل پیر زادہ نے ہاتھ پاؤں تو بہت مارے لیکن مشیروں کی تقریب کا پروانہ منسون ہو گیا اور ان کی جگہ ایک مشترکہ انتظامی کونسل قائم ہوئی، جو جزل عبدالحمید، ائمہ مارشل نور خاں اور ایڈرل احسن پر مشتمل تھی۔ مرکزی حکومت کی وزارتیں ان تینوں میں بٹ گئیں اور بعد جزل پیر زادہ بھی خاں کو سنبھال کر بیٹھ نہیں گیا۔ بلکہ انتظامیہ کونسل کو درہم برہم کرنے کی سازش میں مصروف ہو گیا۔

جزل عبدالحمید خاں اپنے حصوں کی وزارتوں میں زیادہ دخل نہیں دیتے تھے، کیونکہ ان کی زیادہ تر توجہ فوجی ہیڈ کوارٹر کے کام پر مرکوز تھی۔ ایڈرل احسن بھی میانہ رو انسان تھے۔ البتہ ائمہ مارشل نور خاں نے اپنا کام بڑی سنجیدگی سے شروع کیا۔ وزارت تعلیم انہی کے چارج میں تھی۔ وہ چکلالہ کے ائمہ فورس میں میں رہتے تھے اور اسلام آباد سیکریٹ ہیلی کاپٹر سے اڑ کر آیا جایا کرتے تھے۔ بات چیت میں وہ گفتگو کم اور تقریر نیادہ فرماتے تھے۔ اور کام کاچ میں پھر تیلی اور نیم پخت منصوبہ بندی کی نمائش نسبتاً زیادہ ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنے ارد گرد چند پڑھے لکھے ذین نوجوانوں کا گروپ جمع کر رکھا تھا جن کے خیالات کرید کر وہ اپنے کام میں لایا کرتے تھے۔ کم از کم تعلیم کے متعلق ائمہ مارشل کا انداز فکر کچھ اس قسم کا تھا، کہ علم صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا جنہیں ست روی سے ورق ورق اللہنا پڑتا ہے، بلکہ یہ ہوائی جہازوں میں لاد

کر اٹانے والا کوئی کارگو ہے۔ پہلے روز جس طمطراق سے انہوں نے وزارت تعلیم پر نزول اجلال فرمایا۔ اس سے عیاں ہوتا تھا کہ وہ جب چاہیں گے کھڑکی سے منہ نکال کر ”کھل جاسم“ کا نعرہ لگائیں گے۔ اور مارگلا ہل کی چنانوں سے فوراً علم و ہنر کے چشمے پھوٹ پھوٹ کر بننے لگیں گے۔

مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد دس دن تک مرکزی سیکریٹ کا کام کم و بیش معطل رہا۔ کیونکہ نیا حکمران نولہ کاروبار سلطنت کی بندرا بانٹ میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ہم لوگ دفتر جاتے تھے، چائے پیتے تھے۔ قیاس آرائیاں کرتے تھے اور اس طرح دن بھر کی روزی حلال کر کے گھر آ جاتے تھے۔ ان ایام میں سول سیکریٹ کا اپنی حکومت کے ساتھ ہمارا واحد رابطہ روزانہ اخبارات کے ذریعہ تھا۔

ان دس دنوں میں ملک پر بلا شرکت غیرے نظام سقے کا راج تھا جس نے سالہا سال کی سازشوں کے آواگوں چکر سے نکل کر میحر جزل پیر زادہ کی صورت میں نیا جنم لیا تھا۔ چام کے دام تو اس نے بعد میں قوم کی کھال سے چلائے لیکن اس دس روز کی بادشاہی میں اس کے زریں کارناۓ جو ہم تک مختلف ذرائع سے پہنچتے رہے، کچھ اس طرح کے تھے۔

آج فلاں دفتر کے دروازے سات نج کر بیس منٹ پر بند کر دیئے گئے۔ دیر سے دفتر پہنچنے والوں کو فٹ پاتھ پر دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا۔

آج ایک دفتر کی اچانک حاضری بلائی گئی، غیر حاضر ملائمین کی جواب طلبی۔ آج سڑکوں پر جھاؤ پھر گئی۔ کوڑے کرکت کے ڈھیر غائب۔

آج نایلوں کی صفائی کا حکم نامہ جاری ہو گیا، اور فینائل چھڑکی گئی۔ آج کمھی مارنے کی مسم کا آغاز ہو گیا۔

آج دودھ، دہی اور مٹھائی کی دکانوں پر جالی لگانے کے احکامات صادر ہو گئے۔

آج یہ ..... آج وہ .....

پھر اچانک ایک حکمنامہ آیا کہ کل مورخہ ۳ اپریل صبح دس بجے صدر پاکستان اور

چیف مارشل لاءِ ایڈمنیسٹر آغا جزل محمد بھی خاں پریزیڈنٹ گیٹ ہاؤس میں مرکزی سیکریٹریوں اور دیگر اعلیٰ سول حکام سے خطاب فرمائیں گے۔

URDU4U.COM  
بارے مارشل لاءِ ٹولے کو یاد تو آیا کہ پاکستان میں سول سیکریٹریٹ نام کی کسی شے کا بھی کوئی وجود موجود ہے۔ مارشل لاءِ گلے ہوئے دس روز گزر چکے تھے۔ اس تمام عرصہ میں یہ برگزیدہ لوگ یا تو اقتدار کی باہمی چیننا چھینی میں الجھے ہوئے تھے یا دفتروں کی حاضریاں گن کر، سڑکوں پر جھاڑو پھراوا کر، یا نالیاں صاف کروا کر قوم کے ہنگامی مسائل حل کرنے میں مصروف تھے۔ اب تک کسی سول افسر کو ایوان صدارت یا چیف مارشل لاءِ ہیڈ کوارٹر تک بایا بی کا شرف حاصل نہ ہوا تھا، یوروکری کے کچھ خاص گرو آلوں پیادے جو چڑھتے سورج کی پرستش پر ایمان رکھتے ہیں۔ انتظار کی گھریاں گن گن کر چور ہو گئے تھے کہ کب نئے خداوندان نعمت کی زیارت نصیب ہو اور کب وہ اپنا ہدیہ دل ان کے قدموں پر ثان کریں۔ آخر ان کی امید بر آئی۔ مینگ کا نوٹس وصول ہوتے ہی ہمہ وقت کو نوش بجائے والے کئی افسروں کی خمیدہ کمر میں جی حضوری کی ایک تانہ چک پیدا ہو گئی۔

اگلی صبح میں پونے دس بجے پریزیڈنٹ گیٹ ہاؤس پہنچا۔ مینگ کا کمرہ پہلے ہی کھچا کچھ بھرا ہوا تھا۔ پہلی صفحہ میں فوجی ہی فوجی بھرے ہوئے تھے۔ صرف ایک کنارے پر چار سینٹر سیکریٹری کسی قدر پچکے ہوئے سے بیٹھے تھے۔ باقی افسران کرام پچھلی صفحوں پر تھے۔ میں بھی کہیں ایک خالی کرسی پا کر بیٹھ گیا۔

جب دس بجے تو ہم سب کن انگلیوں سے بار بار دروازے کی طرف جھانکنے لگے۔ لیکن بھی خاں ہے کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ آخر عین دس بج کر چالیس منٹ پر آگے آگے بھی خاں اور اس کے پیچھے میجر جزل پیر زادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ صدر کے چہرے پر ایک درشت گھر کی چمگاڑ کے پروں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ پیر زادہ کے گالوں پر مصنوعی مسکراہٹ کی دو مستقل سلوٹیں سنجیدگی کا غانہ لگا کر مردار جھریوں کی

طرح لکھی ہوئی تھیں۔

بھی خاں مغلنی انداز سے چھاتی نکال کر کری پر بیٹھ گیا۔ اور ہم سب پر تھارت سے بھرپور نظر دوڑائی۔ چند لمحے کمرے میں سناثا طاری رہا۔ پھر اس نے منہ کھولا اور ڈانٹ ڈپٹ کے لمحے میں بڑی اچھی باتیں لکیں۔ اس نے کہا۔ ”تم سول سروٹ بڑے خوشامدی اور چالپوس لوگ ہو۔ تم ہر نئے حکمران کی ہاں میں ہاں ملا کر اسے غلط راستے پر لگاتے ہو۔ تم اخلاقی جرات سے عاری ہو۔ صحیح رائے دینے سے احتراز کرتے ہو۔ خوشامد اور جی حضوری سے کام لے کر اپنا الو سیدھا کرتے ہو۔ لیکن اب خبردار ہو جاؤ۔ میں سیدھا سادا سپاہی آدمی ہوں۔ میں تمہارے ہتھکنڈوں میں نہیں آؤں گا۔ میرے ساتھ صاف گوئی سے کام لینا ہو گا میں اپنی خوشی سے صدارت کی کری پر نہیں بیٹھا۔ تم لوگوں کی مریبانی سے ایوب خاں ناکام ہو گیا۔ ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ فوج کے پہ سالار کی حیثیت سے اسے بچانے کا فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ میں اس فرض کو پورا کرنے آیا ہوں۔ میں اس فرض کو پورا کر کے رہوں گا۔ میں جلد از جلد ملک میں نارمل حالات پیدا کر کے اپنی بیرک میں واپس چلا جاؤں گا۔ تم لوگ بھی ہوش میں آ جاؤ۔ اپنا کام تندھی سے کرو، جرات سے کام لے کر سیدھی بات کرو۔ بے لاغ رائے دو۔ خوشامد سے پرہیز کرو۔ اگر کسی نے کوئی سوال پوچھتا ہے تو خوشی سے صاف صاف پوچھو۔ میں سو لمحہ آدمی ہوں۔“

وہ پندرہ منٹ اس قسم کی معقول باتیں کر کے بھی خاں خاموش ہو گیا۔ پھر سول سروٹ کے ہیڈ پپ مسٹر ایم ایم احمد نے لب کشائی کی۔ انہوں نے کھڑے ہو کر نماز توبہ کی نیت تو نہ باندھی لیکن بڑے خضوع و خشوع سے اعتراف جرم کا خطبہ دیا، کہ بے شک سول سروٹ سے بڑی بڑی کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں، لیکن الحمد للہ کہ اب اللہ تعالیٰ نے ملک پر رحم فرمایا ہے۔ ماشاء اللہ آپ جیسا ناخدا اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو نصیب ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم آپ کو اپنی بے لوث خدمت

اور وقاری کا پر خلوص یقین دلاتے ہیں۔

ایک دو اور حضرات نے بھی حسب توفیق اسی طرح کے خوشامدانہ کلمات خیر ارشاد فرمائے۔

بھی خاں نے اپنا گول مٹل سر بلا بلا کر چالپوسی کا یہ نذرانہ بڑی گرمجوشی سے قبول کیا۔ اس کی گدلی گدلی آنکھوں سے فخر و مبارکات کی شعاعیں پھوٹ نکلیں۔ اس کا نیلا نیلا، پیلا پیلا سوجا ہوا چہرہ خوشی سے تتمتا اٹھا۔ اس کی لکھی ہوئی ڈھیلی ڈھالی ٹھوڑی گھوڑے کی زین کی طرح کس گئی۔ اور کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔  
اس خاموشی کو میں نے انھ کر توڑا۔

”مسٹر چیف مارشل لاءِ ایڈمنیسٹریٹ“ میں نے کھڑے ہو کر بھی خاں کو مخاطب کیا۔  
اس طرز تمخاطب پر بھی خاں کے کان کھڑے ہوئے۔ پھر اس نے اپنا سر جھٹک کر اوپر اٹھایا اور نیم باز آنکھوں سے گھور گھور کر مجھے دیکھا۔ اگلی صفت میں لکھی ہوئی تمام گردئیں بھی بے پنیدے کے لونوں کی طرح گھوم کر مجھے تاکنے لگیں۔

”مسٹر چیف مارشل لاءِ ایڈمنیسٹریٹ“ میں نے کہا۔ ”میں صرف سرکاری ملازم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست کی طرح کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں ہاں“ بھی خاں نے جنبلا کر کہا۔ ”ہم بھی تو دوست ہیں، ہم کوئی بالشویکی تو نہیں۔“

”سر“ میں نے کہا۔ ”آپ نے صاف گوئی کا حکم دیا ہے، اس لیے میں جو کچھ کہوں گا بلا کم و کاست عرض کروں گا۔“

”ہاں ہاں، بولو بولو“ بھی خاں نے گھری دیکھ کر مزید جنبلاہٹ سے کہا۔  
”جناب“ میں نے گزارش کی۔ ”پچھلے دس برس میں یہ دوسری بار مارشل لاءِ نافذ ہوا ہے۔ یہ بیچاہے ملک بار بار مارشل لاءِ کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس لیے.....“

اگلی صفت میں پہلے کھر پھر ہوئی۔ پھر ”اس لیے کیا؟“ ..... ”اس لیے کیا؟“ کی چند طنزیہ سول اور ملٹری آوازیں بلند ہوئیں۔

”اس لیے جناب!“ میں نے کہا۔ ”جس کام کا بیڑا اٹھا کر آپ تشریف لائے ہیں، اسے

جلد از جلد شروع کر کے ....."

اگلی صفحہ سے پھر انواع و اقسام کے آوازے بلند ہوئے۔

"یہ کیا بات ہوئی جی؟"

"یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟"

URDU4U.COM

"سب کام ہو رہے ہیں۔"

"سب کچھ شروع ہے جی"

ان آوازوں کے حق میں بھی خاں نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ اور مجھے ڈانٹ کر پوچھا۔

"کیا تم صحیح اٹھ کر اخبار نہیں پڑھتے؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔ "آج کل خاص طور پر ضرور پڑھتا ہوں۔ کیونکہ اپنی حکومت کے ساتھ آج کل ہمارا یہی واحد رابطہ ہے۔"

"کیا پڑھتے ہو؟" بھی خاں نے جھلا کر کہا۔ "یہ پڑھتے ہو کہ ہم بیکار بیٹھے ہیں؟ ہم کچھ کام نہیں کر رہے؟"

"جناب!" میں نے کہا۔ "سر کیس صاف ہو رہی ہیں، نالیوں میں فینائل چھڑکی جا رہی ہے، دکانوں میں جالیاں اور دفتروں میں حاضریاں لگ رہی ہیں اور .....

"اور کیا؟" بھی خاں نے مجھے غھے سے ٹوکا۔ "کیا یہ ضروری کام نہیں ہیں؟"

"سر" میں نے جواب دیا۔ "یہ کام ضروری تو ہیں لیکن ان کے لیے مارشل لاء ضروری نہیں۔ آپ کے اپنے اعلان کے مطابق مارشل لاء کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ .....

ایک بار پھر اگلی صفحہ میں شور برپا ہو گیا۔ بھانت بھانت کی آوازیں بھانت بھانت کا غونما چا رہی تھیں۔ ان سب کا خیال تھا کہ یہ شخص خواہ مخواہ اس مینگ کا وقت ضائع کر رہا ہے۔ ورنہ مارشل لاء جن مقاصد کو پورا کرنے آیا ہے وہ نہایت خوش اسلوبی سے پورے ہو رہے ہیں۔ میں بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جب یہ شور و شر قدرے فرو ہوا تو میں نے چیف مارشل لاء ایڈمنیسٹر سے پھر مخاطب کیا۔

"سر" میں نے پوچھا۔ "کیا میں اپنی بات پوری کر سکتا ہوں۔"

یحییٰ خال نے میری گزارش سنی ان سنی کر کے کہا۔ ”چلو چلو، اب چائے پین۔“  
چائے کے کمرے میں یحییٰ خال مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میجر جزل پیر زادہ بھی چیل کی طرح ہمارے آس پاس منڈلاتا رہا۔ یحییٰ خال بولا۔ ”بھی ہم لوگ صرف کرنے والے خاکروب ہی تو نہیں، تم دیکھتے جاؤ۔ ہم تو بہت بڑے کام کرنے والے ہیں۔“

میں نے جواب دیا۔ ”آپ بے شک بڑے بڑے کام کریں لیکن ایک بات کا ضرور خیال رکھیں۔“

”وہ کیا؟“ یحییٰ خال نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ انگریزی فوج میں اگر کوئی ثانی رومان حروف میں تھوڑا بہت اردو سیکھ لیتا ہے تو اسے بر صغیر کے معاملات کا ماہر سمجھ لیا جاتا تھا۔ یہ میجر جزل پیر زادہ جو ہماری طرف کان لگائے آس پاس منڈلا رہا ہے، کچھ عرصہ صدر ایوب کا ملٹری سیکرٹری نہ چکا ہے۔ اب کہیں اس وجہ سے آپ اسے پاکستانی امور سلطنت کا ماہر نہ سمجھ بیٹھیں۔

یہ سن کر یحییٰ خال جنگلی بلے کی طرح مجھ پر غرایا۔ اس کی دیکھا دیکھی پیر زادہ بھی غراٹا ہوا ہماری طرف لپک۔ ان دونوں کی غراہٹ آس پاس کھڑے ہوئے کئی دوسرے افراد نے بھی سنی۔ جب میں اپنے لیے چائے کی پیالی لینے ان کی میز پر گیا تو یہ لوگ بدواہی میں ایک دوسرے سے تکراتے ہوئے وہاں سے فوراً تتر بترا ہو گئے۔ البتہ ہوم سیکرٹری اے بی اعوان صاحب سکون سے کھڑے رہے اور میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔

اگلے روز صبح سوریے راجہ صاحب محمود آباد ہمارے ہاں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ میرے دیرینہ برادرانہ تعلقات تھے، انہوں نے مجھے بتایا کہ کل رات یحییٰ خال نے انہیں اور اسٹینڈرڈ بیک کے مسٹر علوی کو ڈنر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ جوں جوں وہ سکی کانشہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا تھا۔ یحییٰ خال گفتگو کے باقی تمام موضوع چھوڑ کر اس خاکسار پر پرستا

شروع کر دتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صبح کی میئنگ میں لب کشائی کر کے میں نے مارشل لاء اور حکمران ٹولے کے خلاف مزاحمت کا جذبہ اکسانے کی کوشش کی ہے۔ راجہ صاحب نے مجھے مشوہد دیا کہ میں صبر و تحمل سے کام لوں اور اپنی ملازمت کے کے بارے میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کروں۔

اسی روز اسٹینڈرڈ بنک کے مسٹر علوی بھی ہمارے ہاں آئے۔ ان کی ذات شریف سے میرے کوئی مراسم نہ تھے۔ کئی برس پلے فقط ایک بار کراچی میں سرسری سی ملاقات ہوئی تھی لیکن انہوں نے آتے ہی بڑے بے تکلفانہ اور مریبانہ انداز میں گلہ شروع کر دیا۔ ”بھائی صاحب! یہ آپ نے کیا غصب کیا؟ بڑے صاحب کو اس قدر ناراض کر دیا۔ ہم نے تو آپ سے بہت کچھ کام لینا ہے۔ آپ کے لیے ہم نے ایک نہایت اہم پوسٹنگ سوچ رکھی تھی۔ خیراب بھی وقت ہے، ہم ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔“

علوی صاحب کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ میں حکومت پاکستان کا نہیں بلکہ اسٹینڈرڈ بنک کا ملازم ہوں۔ ان کی باتوں سے یہ اعتماد بھی ٹکتا تھا، کہ حکومت کا کچھ کاروبار اب غالباً اسٹینڈرڈ بنک کے اشاروں پر چلا کرے گا۔ میں نے کسی قدر رکھائی سے علوی صاحب کو ٹال دیا کہ وہ میری ملازمت اور پوسٹنگ کے بارے میں فکر مند نہ ہوں۔ میں یہ معاملات خود ہی طے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

اس کے بعد غالباً دو بار پھر بھی خان کے ساتھ میرا آمنا سامنا ہوا۔ ہر بار کی ملاقات پلے سے بھی نیا ناخوٹگوار ثابت ہوئی۔ اس کے وجود کی ساری نجاست اور کشافت سنڈاں کی بدرو کی طرح اس کے روئیں روئیں سے بے برکتی کی سڑاند چھوڑتی تھی۔ میجر جزل پیر زادہ کی بیساکھیوں کا سارا لے کر جب وہ سربراہ مملکت کی کرسی پر متمن ہوا تو ایوان صدر کی ہر دیوار پر نوشتہ تقدیر کی صورت میں ذلت اور تحریک کے اٹل اور ناگزیر کتبے آؤڑاں ہو گئے۔ میرے لیے وہ ساعت نیک تھی۔ جب ایک روز میں نے اچانک ائمہ مارشل نور خان سے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں ملازمت سے بے کدوش ہو کر

اب زندگی کے باقیہ ایام لکھنے پڑھنے میں صرف کرو۔ میرا خیال ہے کہ میرا یہ ارادہ سن کر ائیر مارشل نور خاں کی طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ اور یہ خبر ان کے چہرے پر یوں گلی جیسے ڈاک خانے کی مر لفافے کے ٹکٹ پر ثبت ہوتی ہے۔

انہی دنوں پیرس میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا ایک اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ چند ماہ پہلے میں اس بورڈ کا رکن منتخب ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں یونیسکو ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر اپنی ذاتی حیثیت سے منتخب ہوا کرتے تھے۔ اس میٹنگ میں شامل ہونے کے لیے میں نے رخت سفر باندھا تو میر جزل پیر زادہ نے کہنی طرح کی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی ہر کوشش ناکام رہی۔ پیرس پہنچ کر میں نے خاموشی سے عفت اور ثاقب کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ اور جزل بھی کوئی ایسی پی سے اپنا استعفی بھیج دیا۔ میرا خیال تھا کہ میرا استعفی چشم زدن میں منظور ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا، ہر کوئی اپنے اقتدار اور غور کے گھوڑے پر چڑھا بیٹھا اس بات کا منتظر تھا کہ پہلے میں واپس آ کر ان کے حضور میں سر تسلیم خم کروں تو اس کے بعد وہ میرے استعفی پر غور فرمائیں گے۔ یہ ان کی ناجائز ہٹ دھری تھی۔ میں ان سے کچھ مانگ تو نہیں رہا تھا۔ بلکہ اپنی ملازمت کے آٹھ نو سال برضاء و رغبت چھوڑ رہا تھا۔ اس لیے میں نے ان کی یہ طفلانہ ضد ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

خدا خدا کر کے ایک برس کی کشاکشی اور خدا خدمی کے بعد میرا استعفی تو منظور ہو گیا لیکن میری پیش تین برس تک بند رہی۔ تین برس کے بعد مجھے پیش اس وقت ملنا شروع ہوئی۔ جب ملک کو ایک عظیم تباہی اور ذلت کے کنوئیں میں گرا کر بھی خاں اور پیر زادہ ایوان صدر سے نکل بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ طویل عرصہ ہم نے انگلستان کے کئی چھوٹے چھوٹے دیہات میں رہ کر بسر کیا۔ ہر سال اپریل اور اکتوبر کے مہینوں میں پیرس میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا اجلاس منعقد ہوا کرتا تھا۔ ہر اجلاس چار سے پانچ ہفتے تک جاری رہتا تھا۔ وہاں پر کسی نہ کسی طرح تنگی ترشی سے گزاہ کر کے میں

اپنے روزانہ الاؤنس کا کچھ حصہ بچا لاتا تھا۔ اور واپس آکر رقم عفت کے حوالے کر دیتا تھا۔ جس سے وہ اگلے چھ ماہ تک گھر کا کاروبار چلاتی تھی۔ ان تھوڑے سے پیسوں میں وہ گھر بھی سنjalati تھی اور آنے جانے والے مہمانوں کو بھی کسی نہ کسی طرح بھگلتاتی رہتی تھی۔ ثاقب کی عمر ان دونوں آٹھ برس کے قریب تھی۔ سکول آنے جانے کے لیے عفت ہر صبح اسے بس کا کرایہ دیا کرتی تھی۔ ایک روز باد و باراں اور برفباری کا شدید طوفان تھا۔ جب سکول بند ہونے کا وقت ہوا تو میں بس اسٹاپ پر جا کھڑا ہوا تا کہ ثاقب کو اپنے ساتھ حفاظت سے گھر لے آؤں۔ کئی بیس گزر گئیں۔ لیکن ثاقب کسی بس سے نہ اترتا۔ کچھ دریے بعد میں نے دیکھا کہ دورفت پاٹھ پر وہ افغان و خیز ایک طوفان کے تھجیروں میں لڑکتا ہوا پیدل چلا آ رہا ہے۔ تیز و تند آندھی میں پھسل کر گرنے سے اس کے دونوں گھٹنے زخمی ہو گئے تھے۔ جن سے خون رس رس کر بھہ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بس میں کیوں نہیں سوار ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ ہر روز سکول سے پیدل ہی آیا کرتا ہے اور بس کا کرایہ بچا کر ہر ہفتے بچوں کا ایک پسندیدہ رسالہ خرید لیتا ہے۔ میں نے عفت کو یہ بات بتائی، تو لمحہ بھر کے لیے تو خوش ہوی لیکن پھر بے اختیار روپڑی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تھوڑے سے پیسوں میں پورا گھر چلانا عفت کی کوئی خاص مهارت تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ عقده کھلا کہ وہ مجھے اور ثاقب کو اور ہمارے مہمانوں کو خوب کھلاتی پلاتی رہتی تھی۔ لیکن مشرق کی روایتی خواتین کی طرح اپنی ذات پر شدید نفکشی اور ایثار سے کام لیتی رہی تھی۔ یہ راز مجھ پر یوں افشا ہوا کہ اچانک اس کی صحت گرنے لگی۔ میں نے ہسپتال جا کر اس کا طبی معائنہ کرایا تو معلوم ہوا کہ اس کے گردوں کا نظام بڑی طرح بگڑ گیا ہے۔ پے در پے آپریشنوں کی وجہ سے اس کے گردے پہلے ہی سے کمزوری کی ندیں غیر محفوظ تھے لیکن اب ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ مرض کی پچیدگی غذا کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

میرا معمول تھا کہ یونیکو کے ایگزیکٹو بورڈ کی میشگوں میں شامل ہونے کے لیے میں ہمیشہ لندن اور پیرس کے درمیان پی آئی اے سے سفر کیا کرتا تھا۔ غریب الوطنی میں یہ چھوٹا سا سفر بڑا تسلیم بخش ثابت ہوتا تھا۔ ایک روز میں پکیلی اسٹریٹ میں پی آئی اے کے دفتر اپنا ٹکٹ بنا نے گیا۔ کاؤنٹر پر کام کرنے والی لڑکی کے پاس اس کی ایک سیلی بھی بیٹھی تھی، جو ائیر ہوش کی وردی میں ملبوس تھی۔ جب میں نے اپنا نام لکھوا�ا تو ائیر ہوش چونک کر میری طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔ ”میں کچھ عرصہ عفت کی ہم محلہ رہی ہوں۔ آپ سے آج پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ اب ٹکٹ تو بعد میں بنائیں، پہلے مجھے چائے پلا کیں۔“

یہ کہتے ہی وہ کاؤنٹر سے اٹھ کر میری طرف آگئی اور کہنے لگی۔ ”آپ ہرگز نہ سوچیں کہ میں کوئی فارورڈ قسم کی لڑکی ہوں۔ جو مان نہ مان میں تیرا مہمان بن کر ہر کسی کے ساتھ چائے پینے اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ دراصل میں آپ کو ایک ضروری بات بتانا چاہتی ہوں۔“

باہر نکل کر ہم ایک قریبی کافی ہاؤس میں جا بیٹھے۔ وہاں پر اس نے مجھے بتایا کہ چند ہفتے قبل وہ اسلام آباد سے کراچی والی فلاٹ پر اپنی ڈیوٹی ادا کر رہی تھی۔ اسی فلاٹ میں بیکھڑی خان اور چند سینٹر افسر بھی سفر کر رہے تھے۔ پرواز کے دوران اس نے بیکھڑی خان کو ایک سینٹر پولس افسر پر گرفتے برستے سنا کہ قدرت اللہ شباب کو واپس لا کر اب تک ان کے حضور پیش کیوں نہیں کیا گیا۔ بیکھڑی خان نے پولیس افسر کو دھمکی دی کہ اگر اس حکم کی تعییل میں مزید تاخیر ہوئی تو وہ اس افسر کی چڑی اتار دیں گے۔

اتنی بات بتا کر لڑکی نے مجھے مشوہد دیا کہ مناسب یہ ہے کہ میں لندن اور پیرس کے درمیان پی آئی اے کا سفر کرنے کا خطرہ مول نہ لوں۔ اس نے اپنا نام بتانے سے انکار کر دیا اور یہ کہہ کر پی آئی اے کے دفتر واپس چلی گئی کہ ”اگر عفت کو کوپر روڈ پر اپنی کوئی ہمسایہ سیلی یاد ہے، تو وہ شاید مجھے پہچان جائے۔“

گھر آ کر میں نے عفت کو یہ واقعہ سنایا۔ اس نے اپنی بہت سی ہمسایہ سیلیوں کے نام اور حلئے بتائے لیکن ہماری یہ فرشتہ رحمت ہمیشہ گنم ہی رہی۔

URDU4U.COM  
جس چھوٹے سے گاؤں میں ہم رہتے تھے، وہاں سے کچھ فاصلے پر جلنگھم کا بارونگ شر تھا۔ اس کی ہائی اسٹریٹ میں خود کار واشنگٹن مشینوں والی ایک لانڈری تھی۔ میں ہر پر کے روز میلے کپڑوں کا ایک بندل وہاں لے جا کر دھو لایا کرتا تھا۔ ایک دن میں لانڈری پہنچا تو باہر فٹ پاتھ پر بڑی بڑی موچھوں والا ایک لمبا تڑنگا پاکستانی جناح کیپ اوڑھے کھڑا تھا۔ اس نے زور سے کھنکار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اپنا اوہ بجھا سگریٹ میرے کندھے پر پھینک کر پنجابی زبان میں بولا۔ ”اے دھوپی کے بچے، کپڑے مشین میں ڈال کر باہر آؤ۔ تمہارے ساتھ باتیں کرنی ہیں۔“

یہ شخص میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ اس کی بے تکلفی کے انداز میں ایک خوفناک جارحیت کا عزم جھلک رہا تھا۔ مجھے فوراً ایئر ہوسٹس کی بات یاد آگئی۔ لانڈری کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون مجھے جانتی تھی۔ مشین میں کپڑے ڈالتے ہوئے میں نے اس کو پہلا، کہ باہر فٹ پاتھ پر جو شخص منڈلا رہا ہے غالباً وہ یہاں پر میرے خلاف کوئی واردات کرنے آیا ہے، تم فوراً پولیس کو ٹیلیفون پر خبردار کر دو۔

میں لانڈری سے باہر آیا، تو وہ شخص لپک کر مجھ سے بغل گیر ہوا۔ میں نے پوچھا۔  
آپ کی تعریف؟

اس نے دو چار مغلظات سن کر کہا۔ ”میری تعریف باتوں سے نہیں بلکہ ہاتھوں اور لاتوں سے ہو گی۔“

اس نے دوستانہ طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہا۔ ”بیٹا! اب سے تم میرے قبضہ میں ہو۔ اب کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کرنے دیکھنا۔ کسی کی جانب کوئی اشانہ نہ کرنا۔ جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرنا۔ ورنہ یاد رکھو ہمارا ایک آدمی تمہارے گھر کے اندر متین ہے۔ دوسرا آدمی سکول کے باہر بیٹھا تمہارے بیٹے کا انتظار

کر رہا ہے۔ ہم رحمی سے کام لے رہے ہیں۔ ہماری بے رحمی کو بیدار کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھنا۔“

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے ساتھ ابھی اپنے گھر چلو۔ اپنا پاسپورٹ اور سامان اٹھاؤ۔ آج شام کی پرواز سے کراچی روانہ ہونا ہے۔“

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ تو اس نے پھر چند مغلظات بک کر کہا۔ ”دیکھو اب کوئی چالبازی نہ سوچنا۔ ورنہ ہم آج شام کو تمہاری بیوی اور بچے کو اپنے ساتھ لے کر کراچی میں چل دیں گے پھر تم خود ہی سر کے بل ان کے پیچھے آؤ گے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے منظور ہے،“ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ آؤ اب گھر چلیں۔“

”گھر کیسے چلیں؟“ اس نے گزر کر کہا۔ ”تم اس شر سے واقف ہو۔ ایک نیکی منگاؤ۔“

میں نے اسے بتایا کہ یہاں پر نیکی ٹیلیفون کر کے ہی منگوائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہم دونوں لا انڈری کے اندر گئے۔ لا انڈری والی خاتون کو میں نے اپنا ایڈیسیس دیا اور درخواست کی کہ وہ ٹیلیفون کر کے ایک نیکی بلا دے جو ہمیں اس ایڈیسیس پر پہنچا آئے۔ خاتون نے ٹیلیفون کرنے کے بعد بتایا کہ نیکی پانچ سات منٹ میں آجائے گی۔

ہم دونوں باہر آ کر فٹ پاتھ پر نیکی کے انتظار میں کھڑے ہی ہوئے تھے کہ ایک پولیس کار لا انڈری کے عین سامنے آ کر رک گئی۔ اس میں تین باوروی پولیس کا نشیبل سوار تھے۔ ان میں سے ایک کار سے اتر کر اندر لا انڈری میں چلا گیا۔ انہیں دیکھ کر میرا پاکستانی ساتھی شدید گھبراہٹ میں بتلا ہو گیا اور بولا۔ ”یہ حرامی یہاں کیا لینے آئے ہیں؟“

میں نے نہ کر جواب دیا۔ ”ان کے کپڑے بھی میلے ہو جاتے ہوں گے،“ شاید دھلوانے آئے ہوں۔“

چند منٹ بعد ہماری نیکی آگئی اور ہم دونوں اس میں سوار ہو کر گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک اسی وضع قطع کا لمبا ترੱਨگا پاکستانی کالے

رنگ کی جناح کیپ پنے ہمارے ڈرائیور میں بیٹھا چائے پی رہا ہے۔ عفت کا رنگ  
ہلدی کی طرح چیلا پڑا ہوا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتایا کہ ان لوگوں  
کا ایک ساتھی ثاقب کے سکول کے باہر بھی اس کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ یہ باتیں ہو  
ہی رہی تھیں کہ لانڈری والی وہی پولیس کار ہمارے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ دو  
کانشیبل سُخنی بجا کر ہمارے گھر میں داخل ہوئے تو عفت نے واویلا مچایا کہ ان غنڈوں  
کا ایک ساتھی ہمارے بیٹے کی تاک میں اس کے سکول کے باہر بیٹھا ہے۔ یہ سنتے ہی  
تیرے کانشیبل نے عفت کو اپنے ساتھ پولیس کار میں بٹھایا اور چند منٹ بعد وہ سکول  
کے باہر منڈلاتے ہوئے ایک مشنڈے کو جو کالی جناح کیپ پنے تھا، اپنے ساتھ ہمارے  
ہاں لے آئے۔

ایک کانشیبل نے میرے اور عفت کے بیانات لکھے۔ دوسرے نے پاکستانیوں کے کاغذات  
اور شناختی کارڈ وغیرہ دیکھ کر کچھ خانہ پری کی اور پھر وہ تینوں پاکستانیوں کو اپنے ساتھ  
لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اسی شام وہی تینوں انگریز پولیس کانشیبل پھر ہمارے  
ہاں آئے۔ انہوں نے معدترت کی کہ ان کے علاقے میں ہمارے ساتھ ایسا ناخوشگوار  
سانحہ پیش آیا۔ اور ساتھ ہی ہمیں یقین دلایا کہ ہم مطمئن رہیں کہ اب دوبارہ اس قسم  
کا کوئی واقعہ رونما نہ ہو گا۔

لیکن ان کی اس یقین دہانی نے عفت پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس واقعہ نے اس کے دل  
کا سکون مکمل طور پر چھین لیا۔ وہ رات کو بار بار اٹھ کر ثاقب کو دیکھتی تھی کہ وہ  
صحیح سلامت اپنے بستر پر موجود ہے یا نہیں۔ جتنا عرصہ وہ سکول میں رہتا تھا وہ قریب  
کی لاہبری میں بیٹھ کر یہ جائزہ لیتی رہتی تھی کہ سکول کے آس پاس کوئی مشتبہ شخص  
منڈلا تو نہیں رہا۔ چند ہی روز میں اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقتے پڑ گئے۔ اور دیکھتے  
ہی دیکھتے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایک آباد والی چند راوتی کی طرح عفت کے بدن  
کا کنکن بھی سنار کی کٹھائی میں پکھل پکھل کر رینہ رینہ ہو رہا ہے۔ میں اسے پھر

ہسپتال لے گیا۔ طویل معاشرہ کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کا مشورہ تھا کہ میں اسے امریکہ لے جاؤ۔ جہاں ان دونوں اس مرض کے کچھ کامیاب آپریشن ہوئے تھے۔

میں نے جزل بھی خان کو کئی خط لکھے اور تاریخ بھیجیں کہ میری اپنی تنخواہ سے کاتا ہوا پراویڈنس فنڈ حکومت کے پاس جمع ہے، مجھے وہ فوراً ادا کر دیا جائے تاکہ میں اپنی بیوی کا علاج کروانے کے قابل ہو سکوں۔ لیکن جواب ندارو۔

استعفی دینے کے تین برس بعد جب مجھے میری پشن ملنا شروع ہوئی اور میرا پراویڈنس فنڈ ادا ہوا تو اس وقت تک عفت کا مرض لا علاج ہو چکا تھا۔

انگلستان میں یہ تین برس میرے لیے بڑے سبق آموز ثابت ہوئے۔ بنی نوع انسان کی طوطا چشمی کے علاوہ اس کی مروت، رواداری اور خلوص کا بیک وقت خوب تجربہ ہوا۔ خاص طور پر لندن میں پاکستانی سفارت خانے میں جب یہ خبر پھیلی کہ بھی خان کی ناراضگی مول لے کر میں نے استعفی دے دیا ہے تو ایمبیسی کے اشاف کی اکثریت میرے سامنے سے بھی دور بھاگنے لگی۔ ان میں کچھ افراد یہ بھی تھے، ماضی میں جن کی میں نے کچھ نہ کچھ مدد کی تھی۔ البتہ سفارت خانے میں ایجوکیشن کوئسلر تنوری احمد خان کا رویہ ان سب سے مختلف تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے بر ملا ملتے تھے۔ جب کبھی میں لندن آتا تھا۔ تو تنوری ہر بار اپنی کار میں مجھے وکنوریہ ریلوے اسٹیشن سے لے جاتے تھے۔

بلا خوف مجھے اپنے دفتر میں بٹھاتے تھے اور شب بسری کے لیے اپنے ہاں لے جاتے تھے۔ گھر آ کر وہ اور ان کی بیگم رشیدہ اپنا کمرہ (Master Bed Room) مجھے دے دیتے تھے۔ اور میاں بیوی دونوں اپنے بچوں کے چھوٹے کرے میں جا کر سو رہتے تھے۔ میں بار بار احتجاج کرتا تھا کہ میری خاطر وہ اس قدر تکلیف نہ اٹھایا کریں۔ لیکن انہوں نے اپنا یہ معمول کبھی ترک نہیں کیا۔ سفارت خانے کے چند بڑے افراد نے انہیں کئی بار مشورہ دیا کہ وہ میرے ساتھ اس طرح بر سر عام میل جوں نہ رکھیں۔ لیکن تنوری صاحب نے اس طرح کے مشوروں اور انتباہ پر کبھی کان نہ دھرا۔ ان کی اس شفقت

اور حسن سلوک کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ آج کل وہ بُنگلہ دیش میں ہمارے سفیر ہیں۔  
خدا انہیں مزید ترقیاں عطا فرمائے۔

میرے دوست اور رفیق کار محمد سرفراز کے برادر نیم غور کی یاد بھی میرے دل میں زندگی بھر تاہم رہے گی۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، جن کا وسیع کاروبار ہندوستان، پاکستان، جمنی اور انگلستان میں پھیلا ہوا تھا۔ لندن کے مضائقات شن (Sutton) میں ان کا ایک خوبصورت اور شاندار قلیٹ ہے۔ لندن میں پہنچتے ہی انہوں نے اپنا قلیٹ ہمارے حوالے کر دیا۔ جس میں ہم کئی ماہ رہے۔ بعد ازاں ہم پہلے نوٹنگھم اور پھر جلنگھم کے قریب وگور نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں منتقل ہو گئے وہاں پر نیم غور نے ہمیں ایک چھوٹا سا مکان خریدنے کے لیے چھ ہزار پونڈ کی خطیر رقم قرض حصہ کے طور پر دے دی۔ اس رقم کی انہوں نے کوئی رسید تک نہ لی۔ ۱۹۷۲ء میں بھی خاں کی معزولی کے بعد جب ہم پاکستان آنے لگے تو یہ مکان ہم نے بیچ دیا۔ اس وقت تک ہر چیز کی قیمت بڑھ چکی تھی۔ اس لیے اس مکان کی قیمت فروخت اس کی قیمت خرید سے نیاہ ملی۔ لیکن نیم غور نے اپنے قرض حصہ کے فقط چھ ہزار پونڈ ہی واپس لینا منظور کیا۔

نیم غور باغ بہار طبیعت کے آدمی ہیں۔ شگفتہ مل، بذله سنجی اور خوش اخلاقی ان کا طرہ امتیاز ہے۔ جب کبھی وہ لندن آتے تھے تو وگور سے ہمیں اپنی کار میں بٹھا کر اپنے شن والے قلیٹ میں لے جاتے تھے۔ انواع و اقسام کے پاکستانی کھانے پکانے میں انہیں خاص مہارت تھی۔ بارہا انہوں نے ہمیں اپنے ہاتھوں سے بڑے لزیذ کھانے پکا کر کھلائے۔

ثاقب سے وہ بے حد پیار کرتے تھے۔ ثاقب بھی آج تک ان کا گرویدہ ہے۔ اسی زمانے میں راجہ صاحب محمود آباد بھی لندن میں مقیم تھے۔ وہ ریجسٹ پارک والی مسجد کمپیٹ کے ڈائریکٹر تھے اور وہیں پر بالائی منزل کے چند کمروں میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیں کئی بار اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ نوابی طرز کے خوش ذائقہ کھانے وہ خود

پکایا کرتے تھے۔ ایک روز عفت نے انہیں باورچی خانے میں ہائٹیاں پکاتے ہوئے دیکھا تو اس کے آنسو آگئے کہ اتنا بڑا رئیس اور تحریک پاکستان کا ممتاز کارکن خود باورچی خانے میں کام کر رہا ہے۔ وقت تک انہوں نے ہمارے ساتھ شفقت اور محبت ہی کا برتاو روا رکھا ہے۔

اس طرح کی روشن مثالوں کے برعکس لندن میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک ذمہ دار افسر کا روایہ بھی قابل ذکر ہے۔ ان حضرت کو میں لاہور میں ایک معمولی سے عمدے سے اٹھا کر ایوان صدر میں لے آیا تھا۔ ترقی پر ترقی کرتے ہو لندن میں ہمارے سفارت خانے کے ایک اہم شعبے کے سربراہ بن گئے۔ جب تک میں ملازمت میں رہا ہو اور ان کی بیگم صاحبہ وقت بے وقت میری اتنی خوشابد اور خاطر تواضع کرتے تھے کہ مجھے الجھن اور پریشانی محسوس ہونے لگتی تھی۔ لیکن جو نبی میں نے ملازمت سے استعفی دیا انہوں نے یا کیک اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ پورے تین برس انہوں نے میرے ساتھ ٹیلیفون پر بھی بات تک نہ کی۔ اس کے علاوہ وقفہ لندن کے اردو اخبارات اور پاکستان میں ایک دو اخباروں میں میرے خلاف من گھڑت خبریں بھی آنا شروع ہو گئیں۔ ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ میرے خلاف ہر خبر چھپانے کے لیے پانچ سے دس پونڈ تک معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ مجھے شک ہے کہ یہ ممکن انہی حضرت کی سرکردگی میں چل رہی تھی۔ واللہ اعلم اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔

تیری بندہ پوری سے میرے دن گزر رہے ہیں  
نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایت زمانہ

## • یونیسکو

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا میں امن و امان کو فروغ دینے کے لیے لیگ آف نیشنز وجود میں آئی تھی، لیکن یہ انجمن کفن چوروں کی جماعت ثابت ہوتی اور اقوام عالم کی بہت سی قبریں آپس میں تقسیم کرنے کے بعد اس نے آرام سے جنیوا میں دم توڑ دیا۔

URDU4U.COM

دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحده کی تنظیم نو، یو این او نے جنم لیا۔ اس ادارے کا رہنمای اصول جس کی لائٹی اس کی بھیں ہے۔ جب کوئی لائٹی والا طاقتور ملک جارحیت سے کام لے کر کسی چھوٹے اور کمزور ملک کی بھیں زردستی ہنکا کر لے جاتا ہے تو یو این او فوراً جنگ بندی کا اعلان کر کے فریقین کے درمیان سیز فائز لائن کھینچ دیتی ہے۔ جنگ بندی کے خط پر یو این او کی نامزوں فوج اور مبصر معین ہو جاتے ہیں۔ جو اس بات کی خاص نگہداشت رکھتے ہیں کہ مسروقہ بھیں دوبارہ اپنے ملک کے پاس واپس نہ پہنچنے پائے۔ اس کے بعد یہ سارا معاملہ جزل اسبلی اور سکیورٹی کونسل کی قراردادوں میں ڈھل ڈھل کر نہایت پابندی کے ساتھ یو این او کے سرد خانوں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔

نیویارک میں جگہ کی کمیابی کے باعث مختلف شعبوں کے اپنے اپنے سرد خانے یو این او کے دم چھلا بین الاقوامی اداروں کے نام سے بہت سے دوسرے یورپی ممالک میں قائم ہیں۔ غالباً سیاسی گرو و غبار، موسمیاتی تپش و حرارت اور ناخواندگی و افلاس کی گرم بازاری کے پیش نظر مشرق وسطی اور مشرق بعید سمیت کسی افریقی اور ایشیائی ملک کو اقوام متحده کے کسی بڑے ذیلی ادارے سے نہیں نوازا گیا۔ البتہ ابھی حال ہی میں Prog کے متعلق ایک بین الاقوامی ادارہ نیروی میں قائم ہوا ہے۔ جس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ وہ عین خط استوا کے قریب واقع ہے۔

اقوام عالم میں تعلیم، سائنس اور ثقافت کی ترقی و تعمیر و ترویج کے لیے یو این او کا جو

اداہہ پیرس میں قائم ہے اس کا نام یونیسکو (UNESCO) ہے۔

(United Nation's Education, Science and Culture Organization) اس کا ایک خاص طرہ امتیاز یہ ہے کہ یہ اداہہ اپنے بجٹ کا تقریباً دو تھائی حصہ پیرس میں تعین اپنے ہیڈ کوارٹر اشاف پر صرف کرتا ہے اور باقی ایک تھائی حصہ ساری دنیا میں تعلیم، سائنس اور ثقافت کے فروغ پر لگاتا ہے۔ یعنی سارے عالم میں تیس روپے کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی پروگراموں پر عمل درآمد کے لیے یونیسکو کا ہیڈ کوارٹر پیرس میں بیٹھے ہوئے اشاف پر ستر روپے خرچ کرتا ہے۔

شرع میں یونیسکو کا ہیڈ کوارٹر ایک پانچ منزلہ عمارت میں سماں ہوا تھا۔ جوں جوں یونیسکو کا بجٹ بڑھتا گیا، اسی رفتار سے اس کے عملے میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نویت بہ ایں جا رسید کہ ایک دوسری عمارت بھی تعمیر ہوئے جس کی بلندی گیاہہ منزلہ ہے۔ سنا ہے کہ بتدریج بڑھتے ہوئے اشاف کی ضروریات کے لیے یہ دو عمارتیں بھی اب تاکافی ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ مضائقات میں ایک نمایت خوبصورت محل نما وسیع و عریض بغلہ بھی ہے جو خاص الخاص لوگوں کے لیے مناسب اوقات پر عیش و نشاط فراہم کرنے کے کام آتا ہے۔

یونیسکو کی یہ ترقی ملعوس اس کے ایک فرانسیسی ڈائریکٹر جزل موسیو رینے ماہیو کے زمانے میں ہوئی۔ یہ صاحب نیچے درجے کی اسمایوں سے ترقی کرتے کرتے اس عمدہ جلیلہ پر نیچے تھے اور پورے بارہ برس تک یونیسکو کے سیاہ و سفید پر چھائے رہے۔

یو این او کے دیگر بین الاقوامی اداروں کی طرح یونیسکو کی خود مختاری ہر نوعیت کے احصا سے بالا تر ہے۔ رینے ماہیو جیسا کائیاں ڈائریکٹر جزل یونیسکو میں دونوں سپر پاورز کی ترازو کے پڑے قرباً قرباً ہم وزن رکھتا تھا۔ دوسرے ممالک کے نمائندے اگر کسی موضوع پر کوئی حرف شکایت زیان پر لاتے تھے تو ان کا منہ بند کرنے کے لیے سیکرٹریٹ میں ملازمتوں کی رشوت فوراً کام آتی تھی۔ کچھ لوگ دنیا بھر میں سفر کرنے والے کمشنروں اور کمیلوں میں شمولیت پر ہی آسانی سے ٹرخا دیئے جاتے تھے۔ بعض لوگوں کی قیمت صرف

اتنی تھی کہ وہ وقت فوقة یونیکو کے خرچ پر پیرس آتے جاتے رہیں۔ ان حربوں سے ہر طرح کی تنقید و تنفیص کا راستہ بند کرنے کے بعد جزل کانفرنس اور ایگزیکٹو بورڈ کا کوئی اجلاس ڈائریکٹر جزل کا بال تک بیکا نہ کر سکتا تھا۔

خود حفاظتی کا یہ حصار کھینچ کر موسیو رینے ماہیو نے باہہ برس تک یونیکو میں اپنی اندر سمجھا قائم کئے رکھی۔ ان کا زمانہ اخلاقی اقدار کی پامالی نا انصافی، خویش پوری اور جنسی بے راہروی کا دور تھا۔ انہوں نے اپنی ایک داشتہ کو اپنے ذاتی عملے میں ایک بڑی اسماں پر مامور کر رکھا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرا بہت سا اسٹاف بھی اسی دوش پر چل نکلا۔ جب میں پہلی بار یونیکو کی جزل کانفرنس میں شریک ہونے پیرس گیا، تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دفتر کے بہت سے کاکب نما کمروں میں ایک ایک مرد کے سامنے ایک ایک عورت سج دھج کر بیٹھی ہے اور دونوں ٹکٹکلی باندھے ایک دوسرے کی جانب نکل دیدم دم نہ کشیدم کے مصدق لگاتار دیکھ رہے ہیں۔ یونیکو کی غلام گردشوں میں گھوتتے پھرتے یہ بھی نظر آیا کہ کہیں کہیں یہ جوڑے اسی محیت کے عالم میں سارا سارا دن آمنے سامنے گلانوں کی طرح بجے رہتے تھے۔ اس زمانے میں یہ دستور عام تھا کہ یونیکو کے کئی منیچلے انٹر نیشنل سول سروٹ اپنی محبوباؤں کو سیکرٹری کے طور پر بھرتی کر کے اپنے دفتر کے کمرے کی زینت بنا لیتے تھے۔ انہی دنوں فرانس میں ایک اسٹیچ ڈرامہ انتہائی مقبول ہو رہا تھا جس کا موضوع پیرس کی سڑکوں پر ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے مرد حضرات کی بے بی اور بے چارگی تھا۔ ڈرامے کا مرکزی کردار ایک بین الاقوامی ادارے (غالباً یونیکو) کا ملازم تھا جس کی ایک یوں گھر میں منتظر ہوتی تھی۔ ایک داشتہ کو دفتر سے گھر پہنچانا ہوتا تھا اور اس کے بعد پیرس کے مضافات میں دوسری داشتہ سے ملنے کے لیے جاتا بھی ہر روز لازمی تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک جام اس مظلوم عاشق مزاج بین الاقوامی سول سروٹ کے پروگرام کو اس قدر درہم برہم کر دیتا تھا کہ اس کی زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی جاتی تھی۔ جس میں شیرینی گھولنے کے لیے یونیکو کا بجٹ

ہر سال اس کی تھنواہ اور دیگر مراعات میں خاطر خواہ اضافہ کرتا رہتا تھا۔ جس طرح ڈائریکٹر جزل اپنی من مانیاں کرنے میں مختار کل تھا، اسی طرح اس کا منظور نظر عملہ بھی اپنے ماتحتوں پر ہر طرح کی مشق ناز آذانے میں آزاد تھا۔ لیکن فرعونے رامو سے، رینے ماہیو کی فرعونیت کا ظلم توڑنے کے لیے یونیکو میں احتجاج اور مزاحمت کی جو آواز اٹھی۔ وہ ایک پاکستانی کے مقدمہ میں لکھی تھی۔ ان کا نام نیم انور بیگ ہے۔

نیم بیگ گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک ممتاز طالب علم تھے۔ وہ اپنے زمانے کے نہایت نامور مقرر تھے اور طلباء کے آل ائمہ مباحثوں میں حصہ لے کر بہت سی ٹرافیاں جیت چکے تھے۔ اکنامکس میں ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے لاہور لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ پنجاب مسلم اشتوڈیس فیدریشن کے سرگرم کارکن بھی تھے اور تحریک پاکستان میں طلباء کے کردار کے بارے میں قائد اعظم سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں کئی بار حاضر ہو چکے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں لاہور میں خضر حیات ٹوانہ کی حکومت کے خلاف تحریک میں حصہ لے کر وہ کچھ عرصہ تک جیل میں بھی رہے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ انٹرنیشنل سول سروس میں داخل ہو کر یونیکو کے ہیڈ کوارٹر میں آگئے۔ یہاں پر وہ کئی برس متواتر یونیکو اسٹاف یونین کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ ملائیں کے حقوق کی حفاظت کے لیے انہوں نے جس دور اندیشی اور جرات مندی کا مظاہرہ کیا اس کی دھوم یو این او کے تمام بین الاقوامی اداروں میں پھیل گئی اور یونائیٹڈ نیشنز کے تمام اداروں کی یونیونوں کی فیدریشن نے بھی ان کو کافی عرصہ تک اپنا مشترکہ صدر منتخب کئے رکھا۔ اس حیثیت میں نیم بیگ کا یونیکو کے آمرانہ ڈائریکٹر جزل رینے ماہیو کے ساتھ کئی بار شدید نکراو ہوا۔ اس قسم کے ہر تصادم میں ڈائریکٹر جزل نے ہمیشہ منہ کی کھائی لیکن ذاتی سطح پر اس نے نیم بیگ کی ملازمت میں ہر طرح کے رخنے ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ نیم بیگ صاحب کی ہمت تھی کہ ڈائریکٹر جزل کی منتفعات کا روایوں کو خاطر میں لائے بغیر وہ اپنے عمل و انصاف

کے موقف پر کامیابی سے ثابت قدم رہے اور یونیسکو میں تیس سالہ بے لوث خدمت کی روایات چھوڑ کر ابھی حال ہی میں وہاں سے رٹائر ہوئے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۶۸ء میں مجھے پاکستانی وند کا سربراہ بنا کر یونیسکو کی جزل کانفرنس میں شرکت کے لیے پیرس بھیجا گیا تھا۔ وہاں پر میں نے یہ چلن دیکھا کہ تقریباً ہر ملک کے وند کا قائد زیانی کلامی تو ڈائریکٹر جزل کے خلاف بڑھ چڑھ کر تنقید و تنفیص کرتا ہے۔ لیکن اسٹینچ پر آ کر اپنی تقریر میں اس کی تعریف و توصیف میں نہیں آسمان کے قلا بے ملانا شروع کر دیتا ہے۔ بین الاقوامی سٹھ پر منافقت اور خوشامد کے اس گھٹیا معیار نے ایک بندھی بندھائی رسم کے صورت اختیار کر رکھی تھی۔ یا کاری کی اس بدعت کو توڑنے کا موقع حسن اتفاق سے میرے ہاتھ آ گیا۔ میں نے اپنی تقریر میں اعداد و شمار اور حقائق و شواہد کو بنیاد بنا کر یونیسکو کی انتظامیہ میں پھیلی ہوئی بد نظمیوں، بد عملیوں، نا انصافیوں، فضول خرچیوں، بد اعتدالیوں اور عیاشیوں کا تشصیل کے ساتھ پرده چاک کیا۔ یہ باتیں سن کر چند لمحے تو ہال میں گمرا سننا چھایا رہا۔ لیکن اس کے بعد زبردست تالیعوں کے ساتھ ایک ایک فقرے کی یوں پذیرائی ہوئی جیسے مشاعروں میں اشعار پر داد ملتی ہے۔ ڈائریکٹر جزل رینے ماہیو بھی اسٹینچ پر بیٹھا تھا۔ میری تقریر سن کر وہ اتنا بے چین ہوا کہ اس نے پے در پے اور نجھ جوس کے چار یا پانچ گلاں نوش کئے اور تقریر ختم ہوتے ہی غیظ و غصب کے عالم میں بھٹکا ہوا انٹھ کر چلا گیا۔

اسی جزل کانفرنس کے دوران ایگزیکٹو بورڈ کی چند خالی نشتوں کے لیے انتخاب بھی منعقد ہونے والا تھا۔ ایک نشت کے لیے انتخاب لڑنے کا میں بھی امیدوار تھا۔ ہندوستان، روس اور امریکہ تینوں میری مخالفت پر کمر بستہ تھے۔ ہندوستان تو صرف اس لیے میرے خلاف تھا کہ میں پاکستانی ہوں، لیکن روس اور امریکہ کے پاس ناراضگی کی یہ مشترکہ وجہ تھی کہ چین کو یونیسکو کا ممبر بنانے کی مصمم میں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ کو یہ شکایت بھی تھی کہ یو ٹائم اور مقبوضہ عرب علاقوں میں

اسلامی تاریخ آثار اور اسلامی ثقافت کے نشان کو مسخ کرنے اور مٹانے پر میں اسرائیل کے خلاف شدید احتجاج کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ اب اس پر مستزاد یہ کہ ڈائریکٹر جزل بھی میری مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے اپنے حواریوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے ایگزیکٹو بورڈ میں آنے سے روکیں۔

مخالفانہ قوتوں کے اس بھاری بھر کم صفت آرائی کے مقابلے میں میرا بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر تھا۔ نیم انور بیگ نے اپنا اثر و رسوخ بھی میرے حق میں بے دریغ استعمال کیا، اور اپنے دفتر کا کمرہ عملی طور پر میری انتخابی مضم کے مرکز میں تبدیل کر دیا۔ پاکستانی وفد کے تین اراکین تنویر احمد خان، عبداللطیف مرحوم اور ڈھاکہ کی بیگم رقیہ کبیر نے دن رات کی محنت اور جانشناختی سے انتہائی مفید کام کیا۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں عرب ممالک نے جزل کانفرنس میں یہ قرارداد پیش کر رکھی تھی کہ یونیسکو میں انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی اور روسی زبانوں کی طرح عربی کو بھی بین الاقوامی زبان کا درجہ دیا جائے۔ امریکہ، برطانیہ اور تمام یورپی ممالک اپنے حواریوں سمیت اس تجویز کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ کسی قدر تیاری اور محنت کے بعد میں نے ہر موقع پر عربی زبان کے حق میں ایسی تقریبیں کیں کہ عرب ممالک کے وفد نے مطمئن ہو کر یونیسکو میں اس تحریک کی قیادت میرے اوپر چھوڑ دی۔ ساتھ ہی مجھے معلوم ہوا کہ ہر طرح کے دباؤ اور مخالفت کو نظر انداز کر کے عرب ممالک کا پورا گروپ ایگزیکٹو بورڈ کی ایکشن میں مجھے ووٹ دینے پر رضا مند ہے۔ اسی طرح افریقہ اور لاطینی امریکہ کے گروپوں کی جانب سے بھی یہی اشارے ملے کہ وہ بھی میرے حق میں ووٹ دینے پر متفق ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ایگزیکٹو بورڈ میں وہ ایک ایسا شخص بھیجا چاہتے تھے جو ڈائریکٹر جزل کی آمریت اور بد عنوانیوں پر کھل کر بات کر سکے۔ یہ ساری وجوہات اندازے اور قیاس آرائیاں محض طفل تسلیاں تھیں۔ اصل بات صرف یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا اور جب ایکشن ہوا تو میں ۷۱ میں سے ۹۰ ووٹ حاصل

کر کے چھ برس کے لیے ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر منتخب ہو گیا۔

ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے مجھے یونیکو کے ظاہر اور باطن کو اچھی طرح کھنگانے کا موقع نصیب ہوا۔ مجموعی طور پر میں نے اس کا اندر اور باہر کھوکھلا کر دیا۔ گرمی گفتار اس کی روح اور چھپا ہوا کاغذ اس کا پیر ہن ہے۔ اس کی چار دیواریوں میں ہر دوسرے برس تحریری اور تقریری الفاظ کا سیلا ب طوفان نوح کی طرح اٹھتا ہے اور نیا بجٹ اور پروگرام منظور ہوتے ہی دفعہ فرو ہو کر زیر نہیں غائب ہو جاتا ہے۔ یونیکو کی تحریر اور تقریر کی اپنی مخصوص زبان پر اپنا لجھ اپنی اصطلاح اور اپنا اسلوب ہے۔ اس ادارے کا سب سے نمایاں خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اس کے زیر سایہ تقریباً ڈھائی تین ہزار ملائیں پیرس کے سیکرٹریٹ میں اور تقریباً ڈیڑھ دو ہزار افراد دنیا کے دوسرے حصوں میں اچھی تنخوا ہوں پر آرام اور سکون کی زندگی بس کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد نہایت عمدہ پُشش پاتے ہیں۔ یونیکو کے اسی ایک کام کو غالباً اس کا سب سے بڑا فلاحت اور تغیری درجہ دیا جا سکتا ہے۔

ایک بار نوجوانوں کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کے لیے یونیکو کے زیر انتظام پیرس میں ایک سینیار منعقد ہوا۔ اس میں حصہ لینے کے لیے دنیا بھر سے جو نمائندے مدعو کئے گئے، ان سب کی عمر ساٹھ برس سے اوپر تھی۔ ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے میں بھی اس میں شریک ہوا۔ میری عمر بھی اس وقت ۱۵ برس کے قریب تھی۔ اس کے باوجود میں اس سینیار کا سب سے کم عمر ڈیلیگیٹ تھا۔ میں نے سینیار کے افتتاحی اجلاس میں یہ پوائنٹ آف آرڈر اٹھایا کہ یہ انتہائی غیر نمائندہ اجلاس ہے کیونکہ پچاس ساٹھ برس سے اوپر والی عمر کے لوگ آج کل کی نوجوان نسل کے مسائل سمجھنے اور حل کرنے کی الہیت نہیں رکھتے۔ اس پر بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ تماشا یوں کی صاف سے کچھ نوجوان کو دکھان کر ہال میں آگئے اور انہوں نے اٹھی میٹم دیا کہ جب تک نہیں نسل کے نمائندوں کو اس سینیار میں شامل نہیں کیا جاتا، وہ اس اجلاس کی کارروائی کو جاری رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ مجبوراً ان کی شرط مانی گئی اور نوجوانوں کی بعض تنظیموں

کے نمائندوں کو بھی سینار کے اجلاس میں شامل کیا گیا۔

سینار میں ایک مقالہ میں نے بھی پڑھا۔ اس کا ایک حصہ کچھ علمی طبقوں میں کسی قدر پسند کیا گیا۔ خاص طور پر یورپ میں نوجوانوں کی کئی تظییموں نے اس کی کئی زبانوں میں خاصی تشریکی۔

يونیکو کے اشاف میں ایک اسامی ڈپٹی ڈائریکٹر جزل کی بھی تھی۔ ایک بار موسیو رینے ماہیو کے سر پر بھوت سوار ہو گیا کہ اس کے نیچے ایک کی بجائے دو ڈپٹی ڈائریکٹر جزل ہونا چاہیے۔ دوسری اضافی اسامی کی نہ کوئی ضرورت تھی، نہ کوئی جواز تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ وہ اپنے کسی منظور نظر کو خواہ مخواہ ترقی دے کر اس عمدے پر فائز کرنا چاہتا تھا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر جزل کی دوسری اسامی کی منظوری کے خلاف ایگزیکٹو بورڈ میں بڑی لے دے ہوئی۔ رینے ماہیو اس تجویز کو جزل کونسل میں لے گیا۔ حسن اتفاق سے وہاں پر تقریر کرنے کے لیے پہلے میری باری آئی۔ میں نے انتظامی لحاظ سے اعداد و شمار کا تجویز کر کے اس تجویز کی شدید مخالفت کی اور اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی۔

If You have two bottle necks instead of one, does it really double the capacity of the bottle? Please answer this question.  
Mr. Director General

میری تقریر کا یہ فقرہ چل نکلا۔ میرے بعد بہت سے مندوین جو اس مسئلہ پر تقریر کرنے آئے ان میں سے ہر ایک نے یہ سوال ضرور دہرا�ا۔ صبح سے شام تک سارا دن یہ فقرہ سنتے سنتے ڈائریکٹر جزل کے اعصاب جواب دے گئے اور ووٹ اندازی سے پہلے ہی اس نے اپنی تجویز واپس لے لی۔

فلسطینی مهاجرین کے بچوں کے لیے یونیکو نے اپنے خرچ پر یو ٹائم، دیایے اردن کے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں بہت سے سکول کھول رکھے تھے۔ ان سکولوں میں تربیت یافتہ مسلمان اساتذہ بھی یونیکو کی منظوری سے تعینات ہوتے تھے، اور ان میں جو درسی کتابیں

پڑھائی جاتی تھیں۔ وہ بھی یونیسکو کی جانب سے منظور شدہ ہوتی تھیں، جب یوٹلیم سمیت ان علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا تو رفتہ رفتہ یہ خبریں آنے لگیں کہ اسرائیل حکومت نے ان سکولوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ یونیسکو کے متعین کردہ مسلمان اساتذہ کو زردستی گھر بھاڑ دیا گیا ہے۔ ان کو تنخواہ تو باقاعدہ ملتی ہے، لیکن کسی سکول کے قریب تک آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اگر کوئی استاد کسی جگہ حرف شکایت زبان پر لاتا ہے، تو وہ اپنے بال بچوں سمیت ناقابل بیان مظلالم اور تشدد کی زد میں آ جاتا ہے۔ ان مسلمان اساتذہ کی جگہ ہر سکول میں اب کثیر یہودی اشاف فلسطینی مهاجر بچوں کو پڑھانے پر مامور ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سکول سے یونیسکو کی منظور شدہ دری کتابیں بھی نصاب سے خارج کر دی ہیں۔ اور ان کی جگہ اب ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں اسلام سیرت مبارکہ اور عرب تاریخ و ثقافت کے خلاف انتہائی گمراہ کن، غلیظ اور شرمناک پروپیگنڈا ہوتا ہے۔

ایگریکٹیو بورڈ کے ہر اجلاس میں عرب ممالک کے نمائندے اور اسرائیل کی ان نہ مموم حرکات کا کچھ چھڑا کھولتے تھے اور اپنے ثبوت میں ان کتابوں کے نمونے بھی پیش کرتے تھے جو اس نے یونیسکو کے قائم کردہ سکولوں میں زردستی رائج کی ہوئی تھیں۔ صحیح حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے دو بار ایک معائشہ ٹیم اسرائیل گئی، لیکن دونوں بار ہمیں یہ رپورٹ ملی کہ عربوں کے اڑامات کی تصدیق میں مقامی طور پر کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ نہیں اسرائیلی حکومت کے ساتھ پہلے سے اپنا پروگرام طے کر کے وہاں جاتی تھیں، اور معائشہ کے روز اسرائیلی حکام متعلقہ سکولوں میں یونیسکو کے منظور شدہ اساتذہ اور کتابوں کی نمائش کا ڈرامہ رچا دیتے تھے۔

ایگریکٹیو بورڈ میں عرب نمائندوں کے ساتھ میرے بڑے گھرے ذاتی تعلقات تھے۔ ہم لوگ آپس میں مل جل کر اکثر ایسی تدبیریں سوچا کرتے تھے جن سے اسرائیل کی اس صریح دھاندلی اور اسلام دشمنی کا بھانڈا پھوڑا جائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد سب کی یہی متفقہ

رائے ہوئی کہ کسی قابل اعتماد شخص کو خفیہ مشن پر اسرائیل بھیجا جائے اور وہ وہاں سے اسرائیل کے خلاف عائد کردہ الزامات کا ایسا ثبوت فراہم کرے جو ناقابل تردید ہو۔ کئی ہفتوں کی چھان بین اور بحث مبادثہ کے بعد انعام کار قرعہ قال میرے نام لکلا۔ میں نے بھی اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ یہ بات نہیں کہ میں جیمز بانڈ کی طرح کسی خطرناک اور سننی خیز مسم میں کوڈ کر جان کی بازی لگانے کا شوقین تھا، بلکہ وجہ صرف یہ تھی کہ ملازمت سے استغفار دینے کے بعد اس زمانے میں میرے پاس کچھ فالتو وقت تھا۔ اس کے علاوہ میرے دل میں ایک لگن یہ بھی تھی کہ شاید اسی بہانے میرے ہاتھوں ہزاروں فلسطینی بچوں کی کوئی خدمت ہو جائے جو اسرائیل کے قبضہ اختیار میں آ کر ایسی کتابیں پڑھنے پر مجبور تھے۔ جن میں دین اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پر انتہائی رکیک، بے بنیاد، غلیظ اور گمراہ کن حملے کئے گئے تھے۔ چنانچہ میرا رابطہ ایک خفیہ تنظیم سے قائم ہو گیا۔ چند ہفتے مجھے پیرس، قاہرہ اور بیروت میں زیر تربیت رکھا گیا۔ اس کے بعد ایک جعلی ایرانی پاسپورٹ پر مجھے دس روز کے لیے اسرائیل بھیجنے کا پروگرام طے ہو گیا۔ اس زمانے میں سابق شاہ ایران کی حکومت نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا تھا۔

ٹریننگ کے دوران میری سب سے بڑی کمزوری یہ پائی گئی کہ میں اپنا اصلی نام بھلا کر اپنا فرضی ایرانی نام اپنانے میں بار بار چوک جاتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ انسان اپنی ذات کے گنبد میں اتنا اسیر ہوتا ہے کہ اپنے نام کی زنجیر تک سے چھکنکارا پانا محال ہے۔ میری اس کمزوری یا معدنوں کو بھانپ کر میرے مددگاروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسرائیل میں قیام کے دوران میں سونے سے قطعاً پرہیز کروں۔ انہوں نے مجھے متنبہ کیا کہ نیند کے دوران یا نیند سے اچانک چونک کر میرے ذہن میں اپنی اصلی اور فرضی نام گلٹھ ہونے کا شدید احتمال ہے۔ اس لیے خود احتیاطی اور عقل سليم کا یہی تقاضا ہے کہ میں وہاں پر اپنا تمام وقت عالم بیداری میں ہی گزاروں۔ نیند سے

بچنے کے لیے انہوں نے مجھے ایک خوبصورت سی ڈبیس (Pillbox) میں کچھ گولیاں دیں۔ پہلے روز ایک گولی، دوسرے روز دو گولیاں، تیسرا روز تین ..... اسی طرح ہر روز ایک گولی بڑھانے سے رات بھر نیند نہ آنے کا قوی امکان تھا۔ ان گولیوں کے علاوہ اس ڈبیس میں سرخ رنگ کا ایک کیپوول بھی تھا۔ یہ کیپوول دراصل موت کی پڑیا تھی۔ اسے نگتے ہی انسان آنا فناً ابدی نیند سو جاتا تھا۔ مجھے حکم تھا کہ اسرائیل میں اگر کسی وقت میرا راز فاش ہوتا ہوا محسوس ہو تو میں فوراً اس کیپوول کو نگل کر جان جان آفریں کے سپرد کر دوں۔ کیونکہ اسرائیلیوں کے ہاتھ آکر زندہ درگور ہونا انتہائی ذلت اور اذیت کی زندگی کو دعوت دینا تھا۔ اس کے علاوہ زندہ گرفتار ہونا خفیہ تنظیم کے وجود کو بھی خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

ایک روز میں نے تربیت دینے والے ماہرین سے پوچھا کہ اسرائیل سے میرے صحیح سلامت واپس آجائے کا کتنے فیصد امکان ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایسی مہماں میں عموماً پچاس فیصد کامیابی اور پچاس فیصد ناکامی کا تناسب رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس تناسب کا تمہارے کیس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ تمہارے اپنے اصلی نام سے مختلف رسالوں اور اخباروں وغیرہ میں تمہاری تصویریں شائع ہوتی رہی ہیں اس لئے دوسروں کی نسبت تمہارے کچڑے جانے کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔

یہ سن کر میری ہمت کا غباہ اندر سے پچک گیا۔ موت کے خوف سے میرے دل اور دماغ کی گھلٹی بندھ گئی۔ دو تین روز میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں دم سادھے یوں بے حس و حرکت پڑا رہا جیسے چیز کا بے بال و پر پچھے گھونٹے سے گر کر نہیں پر چونچ کھولے سک رہا ہو۔ خدمت اسلام کا نشہ ہرن ہو گیا اور فلسطینی مهاجر بچوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی خوف و ہراس کے ملے میں دب کے نہ گیا۔ پورے تین روز میں طرح طرح کے جیلے بمانے تراشتا رہا جنہیں آڑ بنا کر میں کسی طرح اس مضم سے کناہ کشی اختیار کر لوں لیکن چوتھے روز ایک اتفاقیہ حادثے نے میرے خوفزدہ اور پراؤنڈہ ذہن

کی سوچ کا دھارا بدل دیا۔

میں اپنے ہوٹل سے نکل کر سڑک عبور کرنے کے لیے ایک قربی ٹرینیک لائس پر کھڑا تھا۔ جب ہمارے سامنے والی بیتی بزر ہوئی تو بہت سے دوسرے راہگیروں کے ساتھ میں نے بھی ایک زیبرا کراسنگ پر سڑک کو پار کرنا شروع کیا۔ عین اس وقت سرخ تیوں کی جانب سے ایک مریض ڈریز کار اچانک نمودار ہوئی اور نمایت تیز رفتاری سے چار راہگیروں کو کچلتی ہوئی کچھ دور آگے جا کر رک گئی۔ کار کو ایک خاتون چلا رہی تھی جو کسی خطرناک نشے میں مہوش تھی۔ دو راہگیریز تو موقع پر ہی ہمارے سامنے ہلاک ہو گئے۔ باقی دو شدید زخمی ہو کر سڑک پر اوندھے پڑے تھے۔ میں نے حساب لگایا کہ اگر میں دو یا تین فٹ آگے ہوتا تو یقیناً میرا شمار بھی مرنے والوں میں یا زخمی ہونے والوں میں ہوتا۔ اس المناک جائے وقوع پر دو لاشوں اور دو قریب المrg ڈھانچوں کے درمیان کھڑے کھڑے میرے منطق گزیدہ دماغ کو زندگی میں پہلی بار اس بات کا یقین آ گیا کہ اگر موت مقدر میں ہے تو اسرائیل جانے یا نہ جانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہاں پیرس میں اپنے ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر بزر ٹرینیک لائس کی حفاظت میں زیبرا کراسنگ پر چلتے ہوئے بھی موت کا فرشتہ میرا گلا دیوپنے کے لیے آنا فاناً غیب سے نازل ہو سکتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد میری خود اعتمادی کسی قدر بحال ہوئی اور میں نے اپنی ٹریننگ کا باقی حصہ بھی خوش اسلوبی سے طے کر لیا۔ چند آزمائشی مشقوں میں پورا اترنے کے بعد میں نے عفت اور ٹاقب کے نام ایک مختصر سا وصیت نامہ لکھ کر اس م Mum کے معتمد کے حوالے کیا، اور پھر ایک روز پیرس کے اولی ہوائی اڈے پر تل ابیب جانے کے لیے اسرائیل ہوائی کمپنی (ElAl) کے جہاز پر سوار ہو گیا۔

جہاز میں بیٹھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں واقعی سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میرے دل پر بزدلی، افسردگی اور مردی کی برف جم گئی۔ خوف و ہراس نے ایک بار پھر مجھے اپنی گرفت میں دبوچ لیا۔ جب جہاز کا دروازہ بند ہوا تو میری حالت اس لاش کی طرح ہو گئی جس کے اوپر پتھر کی سلیں اور منوں مٹی ڈالنے کے بعد سب

لوگ اسے اکیلا چھوڑ کر قبرستان سے واپس چلے گئے ہوں۔ نہن پر تاحد نگاہ پھیلے ہوئے مکانوں کے مکینوں پر مجھے رشک آنے لگا جو ہر خوف اور خطرے سے بے نیاز اپنے اہل و عیال کے ساتھ نہی خوشی وقت گزار رہے تھے۔ مجھے بے اختیار اپنی بیوی، اپنا بیٹا، اپنا بھائی، اپنی بیوی، اپنے سارے عزیز و اقارب اور دوست یاد آنے لگے جو ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ایک ایک کر کے ماضی کی کسی بے تھاہ سرگنگ میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ اگر یہ جہاز اسرائیلی ہوائی کمپنی کا نہ ہوتا تو شاید میں اپنی نشت پر کھڑا ہو کر زور زور سے چھپیں مار کر رونے لگتا۔

ہوائی جہاز تھوڑی دیر کے لیے روم کے ہوائی اڈے پر بھی اترा۔ ٹرانزٹ لاونج کی قد آدم کھڑکیوں سے میں نے باہر جھانکا تو دور تک ملک ملک اور کمپنیوں کے طرح طرح کے ہوائی جہاز قطار در قطار کھڑے نظر آئے۔ ان میں ایک جگہ پی آئی اے کا ڈی سی ۱۰ بھی دکھائی دیا۔ پی آئی اے کے ہوائی جہاز کی جھلک میرے اضطراب پر تسلی اور سکون کی شہنم بن کر ٹپکی۔ اس سکون بخش منظر نے میرے خوفزدہ وجود میں تحلیل نفسی کی ایسی اگرمتی سلگا دی کہ معاً نجات، ندامت، تشکر اور خود اعتمادی کے ملے جلے احساس سے میرا دل بھر آیا۔ ایک قریبی نائلک میں گھس کر میں نے اندر سے کندھی چڑھا لی۔ پہلے خوب رویا۔ جب دل کی بھڑاس اچھی طرح نکل گئی، تو میں نے اپنے پاؤں کا جوتا کھولا اور اسے ہاتھ میں لے کر سات آٹھ بار اپنے سر پر زور سے مارا۔ غالباً اس جھاڑ پھونک سے خوف و ہراس اور کمزوری اور بزدلی کے بھوت کا سایہ میرے سر سے اتر گیا۔

تل ابیب کے ہوائی اڈے پر کشم والوں سے فارغ ہو کر جب میں اپنا سامان لیے باہر نکلا، تو اسرائیل کی ٹورسٹ کارپوریشن کے ایک خوش لباس نوجوان نمائندے نے لپک کر مجھے خوش آمدید کہا۔ گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے دلی زیان سے وہ شناختی الفاظ بھی ادا کئے جن کے متعلق مجھے پیرس میں آگاہ کر دیا گیا تھا۔ جواباً میں نے بھی

اپنے مقرر کردہ شناختی الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد "مصطفیٰ" نے اگلے دس روز کے لیے میرا مکمل چارج سنبھال لیا۔

مصطفیٰ اس نوجوان کا کوٹ نام تھا۔ چھبیس سال میں برس کا یہ پڑھا لکھا فلسطینی جوان کئی سال سے جان کی بازی لگا کر اسرائیل میں آزادی وطن کی خاطر طرح طرح کے خفیہ فرانپس سر انعام دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک بجلی کی طرح کوندھی تھی اور اس کی رُگ میں جہاد کا جوش اور جنون سیما ب کی مانند بے چینی سے گردش کر رہا تھا۔ دن رات وہ میرے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا تھا اور قدم قدم پر انتہائی شفقت اور احترام سے میری رہنمائی اور خدمت کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے اخی اور سیدی کے القاب سے پکارتا تھا۔ اسی کے زیر اہتمام میں یونیسکو کے قائم کردہ بہت سے سکولوں میں گیا اور ۱۳ شر انگیز کتابوں کے نئے حاصل کئے جو اسرائیلوں نے یونیسکو کے نصب شدہ نصاب کی جگہ وہاں پر نردوستی رائج کر رکھے تھے۔ ان کتابوں پر میں نے ہیڈ ماسٹروں اور کئی دیگر اساتذہ کے آٹو گراف بھی لیے۔ یہ وہ یہودی ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ تھے جنہیں اسرائیلوں نے یونیسکو کو دھوکہ دے کر مسلمان اساتذہ کی جگہ تعینات کر رکھا تھا۔ کئی جگہ میں نے ان کو بہت سی خفیہ تصویریں اتاریں۔ ایک دو سکولوں میں وہاں کے یہودی اشاف کے ساتھ میرا گروپ فوٹو بھی کھینچا گیا۔ ایک سکول میں ایک فلسطینی بچے کو انتہائی بے دردی کے ساتھ نہایت کڑی اور ذلت آمیز سزا مل رہی تھی۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنی کتاب کا وہ حصہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں انتہائی گستاخ الفاظ درج تھے۔ ہم نے اپنے خفیہ کیمرے کی مدد سے اس میں کی پوری قلم اتاری جس کی لمبائی دو سو فٹ سے کچھ اوپر تھی۔

اسرائیل میں آئے ہوئے مجھے پانچواں روز تھا کہ اچانک مصطفیٰ بولا۔ "یا اخی، اب تک تو تم نیند کے بغیر ٹھیک گزانہ کر رہے تھے، لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے قدم

لڑکھرانے لگے ہیں اور تمہاری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقة پڑے گئے ہیں۔“  
”اب کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”ابھی پانچ روز باقی ہیں۔ کام تو ختم کرنا ہے۔“

URDU4U.COM

اس وقت تو وہ مسکرا کر چپ ہو گیا، لیکن نماز عشاء کے وقت مجھے ایک ٹیکسی میں بٹھا کر مسجد القصیٰ لے گیا۔ اس زمانے میں عشاء کے بعد اگلی اذان تک مسجد کے دروازے مقفل ہو جاتے تھے۔ الاقھا کے کلید بردار مصطفیٰ کے ہمراز تھے۔ ان کے ساتھ ساز باز کر کے نماز کے بعد اس نے مجھے اندر اکیلا چھوڑ کر باہر تالا لگوا دیا اور یہ ہدایت کر گیا کہ میں رات بھر خوب اطمینان سے اپنی نیند پوری کر لوں۔ نجمر کے بعد وہ مجھے اسی گلے آ ملے گا۔

قبلہ اول کی چار دیواری کے اندر جب میں اکیلا ہو گیا تو تاریخ اور تقدس کے ایک مہیب سنائے نے مجھے سر سے پاؤں تک غذاپ سے نگل لیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی پا کیزہ شیش محل میں ایک کتا غلطی سے بند ہو گیا ہے۔ لرزے کے بخار کی طرح میرے تن بدن پر کچپی طاری ہو گئی اور دانت بے اختیار کٹ کر بختے لگے۔ مرگی کے مریض کی مانند تشنج میں گرفتار ہو کر آنا فاناً لڑھکتا ہوا ایک ایسی نائم نسل میں جا گرا جہاں پر نسل انسانی کی ہزاروں سال کی خوابیدہ تاریخ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی اور کمکش کی طرح جگنگ کرتی ہوئی شاہراہوں پر بڑے بڑے ذیشان پیغمبروں کے قدموں کی خاک سے نور کے چشمے پھوٹنے لگے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پھر اللہ کے آخری نبی خاتم النبیین رحمت اللعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جنہیں اللہ کی پاک ذات شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد القصیٰ تک لے گئی تا کہ ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھائے۔ اسی مسجد میں فرش سے عرش تک نوری فرشتوں نے وہ راستہ منور کر دیا جس پر نبوت کا سفر اختیار کر کے حضور نے رسالت کی معراج کو پایا۔ سده المنتہ کے پاس جس کے قریب جنت الماوی ہے۔ جب اس سده المنتہ کو لپٹ رہی

تھی، جو چیزیں لپٹ رہی تھیں نگاہ تو نہ ہٹی اور نہ بڑھی، انہوں نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے عجائب دیکھے۔“

خبر نہیں یہ وصال کی گھڑی تھی یا فراق کا لمحہ، کہ یعنی اس وقت فضا میں اذان کی آواز گونجی اور بچپن میں کہیں پڑھا ہوا یہ پرانا شعر مجھے بے اختیار یاد آ گیا۔

URDU4U.COM

خدا سمجھے موذن سے کہ ٹوکا یعنی عشرت میں  
چھری مجھ پر چلا دی نعمۃ اللہ اکبر سے

خدا کا شکر ہے کہ پیرس واپس آنے کے بعد اسرائیل سے لائی ہوئی میری شادتوں کو یونیکو والوں نے تسلیم کر لیا۔ ڈائریکٹر جزل نے ایسے اقدامات کے کہ مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیکو کے قائم کردہ تمام سکولوں میں عربوں کا منظور شدہ درسی نصاب از سر نو رائج ہو گیا۔ اور اسرائیل کی لگائے ہوئی ۱۳ شر انگیز کتابیں بھی منسخ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ آئندہ اس صورت حال پر کڑی نظر رکھنے کے لیے قابل اطمینان بندوبست کر دیا گیا۔

میری اس حقیر سی خدمت کے اعتراف کے طور پر پیرس میں معین تمام عرب سفیروں نے ایک مشترکہ تقریب منعقد کی۔ صدر ناصر کا ایک ذاتی نمائندہ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے خاص طور پر قاہرہ سے آیا۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ ملازمت سے استغفار دینے کے بعد میں ان دنوں پیروزگار تھا، اس لیے کتنی سفیروں نے اشاروں کنایوں میں اور چند ایک نے کھلے بندوں مجھے منہ مانگے اغماٹ نذر کرنے کی پیشکش کی۔ ان سب کی خدمت میں میرا صرف یہ جواب تھا کہ یہ معمولی سا فرض میں نے کسی دنیاوی لالج یا غرض و غایت سے ادا نہیں کیا، میں اسے اپنے لیے محض تو شہ آخرت سمجھتا ہوں۔

اس واقعہ کے ایک برس بعد انگلستان کے گاؤں و گمور میں ایک رات میں اپنے گھر سو

رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب مصطفیٰ بیروت کے ایک ہسپتال سے بول رہا تھا۔ ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ اس طرح کی تھی۔

”ہیلو مصطفیٰ تم کیسے ہو؟“

”الحمد للہ خوش و خرم ہوں۔“

”اگر خوش و خرم ہو تو ہسپتال سے کیوں بول رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”بلڈ کینسر تشخیص ہوا ہے۔ علاج کروا رہا ہوں۔“

”توہہ توہہ، بلڈ کینسر کی بات تم ایسے کر رہے ہو جیسے معمولی زکام ہو۔ تم اصلی بات بتاؤ کہ تمہارا حال کیا ہے؟“

”یا اخی، اللہ کی رضا پر راضی ہوں۔“

”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اندازہ ہے کہ انشاء اللہ میں بہت جلد اپنے خالق سے جا ملوں گا۔“

”تم موت کا ذکر یوں کر رہے ہو جیسے کسی پنک پر جا رہے ہو۔ علاج تو سنجیدگی سے کروا رہے ہو نا؟“

”الحمد للہ علاج خوب ہو رہا ہے۔ ماشاء اللہ میں راضی برضا ہوں۔ تم میرے لیے حسن خاتمه کی دعا کرنا۔ میرے بعد اگر میرا والد تمہیں کوئی خط لکھے تو اسے جواب ضرور دینا۔“

چند ہفتے بعد مجھے اس کے والد کا خط ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ مصطفیٰ مرحوم ان کا اکلوٹا بیٹا تھا۔ اس کی یاد میں وہ بلڈ کینسر کے نادر مریضوں کے علاج اور مدد کے لیے دس لاکھ امریکن ڈالر کا ایک فنڈ قائم کر رہا ہے۔ جس کا انتظام ایک تین رکنی بنیگنگ کمپنی کے ہاتھ میں ہو گا۔ مصطفیٰ کی وصیت تھی کہ اس کمپنی کا ایک رکن مجھے نامزد کیا جائے۔

میں آٹھ برس تک اس فنڈ کی منظمه کا ممبر رہا۔ اس عرصہ میں بلڈ کینسر کے ۱۱۵۳

نادر مریضوں کو قومیت اور مذہب کے امتیاز کے بغیر طبی اور دیگر مالی سوتیں فراہم کی گئیں۔ پھر مصطفیٰ کے والد گرامی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد بیروت کے فسادات اور خانہ جنگلی کے دوران مصطفیٰ کے نام پر یہ صدقہ جاریہ بھی رفتہ رفتہ بند ہو گیا۔

صوم و صلوٰہ کے پابند جواں سال مصطفیٰ کی سیماں صفت شکل و صورت آج تک میری آنکھوں کے سامنے گھومتی پھرتی نظر آتی ہے۔ کروڑ پتی باپ کے اس اکلوتے مجاہد بیٹھے نے اسرائیل میں دس روز تک لگاتار میری خدمت گھریلو ملازموں کی طرح کی۔ ہم جمال کمیں ستانے کے لیے کچھ دیر بیٹھتے تھے، وہ فوراً اپنے بریف کیس سے ایک جھاڑن نکال کر میرے بوٹ صاف کر دتا تھا۔ اسرائیل سے واپسی کے وقت میرے پاس آخر اسرائیلی پاؤند بچے ہوئے تھے جو اس زمانے میں تقریباً ۱۸ روپے کے برابر تھے۔ حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر میں نے یہ ساری رقم ٹپ کے طور پر مصطفیٰ کو دے دی۔ اس نے اسے وصول کر کے آنکھوں سے لگایا اور انتہائی اظہار تشکر کے ساتھ جیب میں ڈال لیا۔ مصطفیٰ کا اصلی بھید تو مجھے معلوم نہیں، لیکن جب کبھی یہ چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آتے ہیں تو اس کے کردار کی عظمت کی حرارت میرے وجود پر جبی ہوئی بے حسی کی برف کو کسی قدر پچھلا دیتی ہے۔ اور اس کی جدائی کا احساس ایک بار پھر میرے دل و دماغ کی ظلمت پر چند لمحوں کے لیے ایک ناقابل بیان غمگینی، رنگینی اور نور کی پھوار سی برسا جاتا ہے۔

سورج بتا ہے تار زر سے  
دنیا کے لیے روائے نوری ا  
علم ہے خوش و مست گویا  
ہر شے کو نفیب ہے حضوری  
دیا، کھسار، چاند، تارے  
کیا جائیں فراق و ناصبوری

شلیاں ہے مجھے غم جدائی  
یہ خاک ہے محروم جدائی

○○○

۱۹۷۳ء  
آج عفت مر گئی۔

میں اسے مذاقاً اپنی ”بڑھیا“ کہا کرتا تھا۔ لیکن جب میں کنٹربری کاؤنٹی کونسل کے دفتر میں تدفین کا اجازت نامہ حاصل کرنے گیا تو ایک فارم پر گرنا تھا۔ اس میں مرحومہ کی تاریخ پیدائش بھی درج کرنا تھی۔ جب میں نے اس کا پاسپورٹ نکال کر پڑھا، تو میرا لکھبہ دھک سے نہ گیا۔ اس کی عمر فقط ۲۱ برس تھی۔

لیکن میرے لیے وہ ہمیشہ میری ”بڑھیا“ کی بڑھیا ہی رہی۔ کنٹربری ہسپتال میں ہم نے اسے گرم پانی میں آب ززم ملا کر غسل دیا۔ پھر کفنایا اور جب اسے قبلہ رو کر کے لکڑی کے بنے ہوئے ہلکے بادامی رنگ کے تابوت میں رکھا تو تنوری احمد خاں نے بے ساختہ کہا۔ ”اے، یہ تو ایسے لگتی ہے جیسے ابھی کالج کے فرست ائیر میں داخلہ لینے جا رہی ہو۔“

بات بھی پچی تھی۔ جب میں اسے بیاہ کر لایا تھا، تو وہ لاہور کے فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے فائل ائیر سے نکلی تھی۔ جب میں نے اسے دفنایا تو واقعی وہ ایسے لگ رہی تھی جیسے ابھی ابھی فرست ائیر میں داخلہ لینے جا رہی ہو۔ درمیان کے اٹھاونہ سال اس نے میرے ساتھ یوں گزارے جس طرح تھرڈ کلاس کے دو مسافر پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوں۔ سامان بک ہو چکا ہو۔ ٹرین کا انتظار ہو۔ اس کی گاڑی وقت سے پہلے آگئی۔ وہ اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ میری ٹرین لیٹ ہے۔ جب آئے گی، میں بھی اس میں سوار ہو جاؤں گا۔ لیکن سامان کا کیا ہو گا؟ جو کبھی آگے جاتا ہے اور کبھی پیچھے، اور کوئی اسے وصول کرنے کے لیے موجود نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارے سامان میں آخر رکھا ہی کیا ہے؟ کچھ کلفڈ، ڈھیر ساری کتابیں، کچھ کپڑے،

بہت سے برتن اور گھریلو آرائش کی چیزیں جنہیں عفت نے بڑی محنت سے سیلز میں گھوم گھوم کر جمع کیا تھا۔ اور ایک ٹاقب۔ لیکن ٹاقب کا شمار نہ سامان میں آتا ہے نہ احباب میں۔ یہ باہہ سال کا بچہ میرے لیے ایک دم بوڑھا ہو گیا۔ کنٹربری کے قبرستان میں جب مٹی کے گرتے ہوئے ریلوں نے عفت کے تابوت کا آخری کونہ بھی ہماری نظر سے اوچھل کر دیا تو ہم دونوں جو بڑی بہادری سے کھڑے ہوئے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے، بیک وقت گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے گھنٹے ہمارے اندر کے بوجھ سے دب کر اچانک دہرے ہو گئے۔ چند لمحوں کے لیے ٹاقب نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اسے زور سے دیا، پھر خاموشی سے چھوڑ دیا۔ ہم دونوں نے اب تک ایک دوسرے کے سامنے کبھی آنسو نہیں بھائے۔ نہ آئندہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔ لیکن صد حیف! کہ اب میرے پاس وہ بچہ نہیں جسے گلے سے لگا کر میں دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ میرے پاس صرف ایک باہہ سال کا بوڑھا انسان ہے جو باپ کی طرح میری دیکھ بھال کرنے پر مامور ہو گیا ہے۔ یہ گراس نے اپنی امی سے سیکھا ہے۔ ہماری شادی خانہ آبادی کے پانچ برس بعد جب ماں جی فوت ہو گئیں، تو عفت نے بھی یہی چلاکی برتنی تھی۔ ماں جی کے مرتبے ہی عفت نے فوراً ان کا کردار اپنا لیا تھا۔ عین اس طرح جیسے عفت کے مرتبے ہی ٹاقب میرا مائی باپ بن بیٹھا ہے۔ پتہ نہیں یہ ماں اور بیٹا کیسے لوگ ہیں۔ یہ خود تو صبر و شکر کا بادیان تان کر نہی خوشی زندگی اور موت کے سمندر میں کو جاتے ہیں اور مجھے بے یار و مددگار اکیلا ساحل پر چھوڑ جاتے ہیں، جیسے میں انسان نہیں پھر کی چٹان ہوں۔ خیر، اللہ انہیں دونوں جہان میں خوش رکھے۔ میرا کیا ہے؟ میں نہ اس جہان کے قابل نہ اس جہان کے۔ کوئی تھائی سی تھائی ہے۔

میرا خیال ہے کہ میری اس عجیب سی تھائی کا احساس عفت کو بھی ضرور تھا۔ بات تو اس نے کبھی نہیں کی۔ لیکن عملی طور پر اس نے اس بے نام خلا کو پر کرنے کی بے حد کوشش کی۔ یہ کوشش پورے ۱۸ سال جاری رہی۔ لیکن میرے لیے اس کا ڈرامائی کلائفیکس اس کی وفات سے عین پندرہ روز پہلے وقوع پذیر ہوا۔

۲ جون کی تاریخ اور اتوار کا دن تھا۔ چاروں طرف چکلیلی دھوپ چھلی ہوئے تھی۔ عفت صبح سے ٹاق کے ساتھ ایک کیا ری میں دھنیا، پودینہ، ٹماڑ اور سلاڈ کے بیج بجوا رہی تھی۔ پھر اس نے گلب کے چند پودوں کو اپنے ہاتھ سے پانی دیا۔ اس کے بعد ہم تینوں لان میں بیٹھ گئے۔ عفت نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”یہ کیا سماں سماں ہے۔ غالباً بہشت بھی کچھ ایسی ہی چیز ہو گی۔“

”پتہ نہیں۔“ میں نے کہا۔

عفت کھلکھلا کر بنس پڑی۔ یہ اس کا آخری بھرپور ترقیہ تھا جو میں نے سن۔ وہ بولی۔ ”تم مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ ممتاز مفتی جو کچھ لکھتے ہیں، اس سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مجھ سے نیا ہدایہ جانتے ہیں۔ آخر مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”ممتاز مفتی کو جانتی ہو،“ بت بڑا افسانہ نگار ہے۔ جو جی میں آئے لکھتا رہتا ہے۔ اس نے میرے سر پر بزر عمامہ باندھ کر اور اس پر مشک کافور کا برادہ چھڑک کر مجھے ایک عجیب و غریب پتلہ سا بنا رکھا ہے۔ وہ دیدہ و دانستہ عقیدے سے بھاگتا اور عقیدت کا روگ پاتا ہے۔ اس کی کسی بات پر وھیان نہ دو۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”یہ ممتاز مفتی بھی عجیب آدمی ہیں۔ میرے ساتھ بڑی محبت کرتے ہیں۔ ٹاق کے ساتھ گھنٹوں بچوں کی طرح کھلتے ہیں۔ لیکن وہ جب میرے پاس تمہاری باتیں کر کے جاتے ہیں تو مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے جیسے میں تمہاری بیوی نہیں یا وہ ہوں۔“

”یہی تو اس کی افسانہ نگاری کا کمال ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ نشک کر بولی۔ ”مفتی جی کو گولی مارو۔ آؤ آج ہم دونوں عیش کریں۔ اس ملک میں ایسی اچھی دھوپ روز روز تھوڑا نکلتی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھی۔ جلدی جلدی مژر اور قیمه پکایا۔ کچھ چاول ابائے اور سلاڈ کاتا۔ ہمیں کھانا کھلا کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جامنی رنگ کی شلوار قیض پسی، ڈھیر سارا میک اپ کیا، اور جب خون بن ٹھن کر نکلی تو ٹاق نے بے ساختہ کہا۔ ”واہ واہ

ای! آج تو بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ اب تو ابو کی خیر نہیں۔“

”نیاہ بک بک نہ کیا کرو۔“ اس نے ٹاقب کو ڈانٹا۔ ”تم اپنا سائیکل نکالو اور خالد کے گھر چلے جاؤ۔ شام کو طاقت کی سالگرہ ہے۔ ہم بھی پانچ بجے تک پہنچ جائیں گے۔“

ٹاقب نے گھڑی دیکھ کر شرارت سے کہا۔ ”ای، ابھی تو صرف دو بجے ہیں۔ پانچ بجے تک آپ اکیلے کیا کریں گے؟“

”ہم مزے کریں گے۔“ عفت نے کہا۔ ”اب تم جاؤ۔“

ٹاقب اپنے بائیکل پر بینٹھ کر خالد کے ہاں چلا گیا۔ میں نے عفت سے کہا۔ ”آج تو تم زردست موڑ میں ہو۔ بولو، کیا ارادہ ہے؟“

اس کی آنکھیں ڈبڈیا آئیں۔ کہنے لگی۔ ”اب میں تمہارے کسی کام کی نہیں رہی۔ چلو پارک چلیں۔“

ہم دونوں نیکی لے کر اس کے ایک مرغوب پارک میں چلے گئے، چاروں طرف جوان بوڑھے جوڑے ایک دوسرے کے ساتھ لپٹنے ہوئے بزر گھاس پر لیٹنے ہوئے تھے۔ بہت سے فوارے چل رہے تھے۔ گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چیری کے درخت گلابی اور سرخ پھلوں سے لدعے ہوئے تھے۔ آس پاس ٹھنڈے دودھ اور رنگ رنگ مشروبات کی بوتلیں بک رہی تھیں۔ ہم دونوں لکڑی کے اس نیچ پر ایک دوسرے سے ذرا ہٹ کر بینٹھ گئے۔

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بولی۔ ”بہشت کا نظاہہ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہو گا!“

”پتہ نہیں۔“ میں نے کہا۔

”تم مجھے کچھ نہیں بتاتے۔“ اس نے شکایت کی۔ ”ممتاز مفتی تمہیں مجھ سے نیاہ جانتا ہے۔“

”مفتی جی افسانہ نگار ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ان کو گولی مارو، اپنی بات کرو۔“

”میری بات صرف اتنی ہے کہ میں تمہرے کسی کام نہ آسکی۔“ وہ بولی۔

”یہ فضول بکواس چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی کام کی بات کرو۔“

”واقعی کرو؟“ اس نے ایسے انداز سے کہا جیسے کوئی پچھے ثانی خریدنے کے لیے خوشامد کر کے پیسے مانگنے والا ہو۔ ”برا تو نہیں مناؤ گے؟ بات کاٹو گے تو نہیں؟ ثالو گے تو نہیں؟“

”بالکل نہیں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

وہ لکڑی کے نجف پر مجھے تکیہ بنا کر لیٹ گئی۔ اور بولی۔ ”سنو، جب میں مر جاؤں تو مجھے کثربری کے قبرستان میں دفناؤ۔“

اس کے منہ سے موت کا یہ پیغام سن کر مجھے بڑا شدید وچکا لگا۔ لیکن میں نے اس کی بات نہ کائیں کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس لیے بالکل خاموش رہا۔

وہ بولتی گئی۔ ”یہ شر مجھے پسند ہے۔ یہاں کے ہسپتال نے مجھے بڑا آرام دیا ہے۔ یوں بھی اس شر پر مجھے حضرت مریم کا سایہ محسوس ہوتا ہے۔ یہاں پر تمہیں بھی کچھ محسوس ہوتا ہے یا نہیں؟“

اس نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلا ب امڈ رہا تھا۔ اس نے اپنے جامنی رنگ کے دوپٹے کے پلو سے میرے آنسو پوچھے اور بے حد غیر جذباتی انداز میں اپنا سلسہ کلام جاری رکھا۔ ”اس ملک میں ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ اس لیے میرے جنازے پر کسی کونہ بلانا۔ یہاں پر تم ہو، ثاقب ہے، خالد ہے، زہرہ ہے، آپا عابدہ ہے۔ خالد کے چند مسلمان ڈاکٹر دوست ہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔“

اب میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”بزنس آخر بزنس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جرمنی سے توریز احمد خاں اور پیرس سے نیم انور بیگ شاہید آ جائیں۔ ان کے متعلق کیا حکم ہے؟“ ”وہ آ جائیں تو ضرور آئیں۔“ اس نے اجازت دے دی۔ ”وہ بھی تو اپنے ہی لوگ ہیں۔ لیکن پاکستان سے ہرگز کوئی نہ آئے۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”ایک دو عزیز جو استطاعت رکھتے ہیں ضرور آ جائیں گے۔ لیکن دوسرے بہت

سے عزیز جن میں آنے کی تڑپ تو ہے، لیکن آئیں سکتے خواہ مخواہ ندامت سی محسوس کریں گے۔ ٹھیک ہے نا؟”

”میدم“ آپ کا اشائہ سر آنکھوں پر۔“ میں نے چھوٹی سی نہیں بس کر کھا۔

URDU4U.COM

”اور کوئی ہدایت؟“

”میری قبر کے کتبے پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ضرور لکھوانا۔“

”ضرور“ میں نے کھا۔ ”اور کوئی حکم؟“

”ہاں، ایک عرض اور ہے۔“ اس نے کھا۔ ”اپنے ہاتھوں کے ناخن بھی خود کاٹنا سیکھ لو۔ دیکھو اس چھوٹی سی عمر میں بھی ثاقب کیسی خوبی سے اپنے ناخن کاٹ لیتا ہے۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھی، اپنا پرس کھولا۔ ایک چھوٹی سی قینچی نکالی اور بولی۔ ”لاو، آج میں پھر تمہارے ناخن تراش دوں۔“

اس نے میرے ناخن کاٹے۔ اس آخری خدمت گزاری کے بعد وہ میرے گلے میں بانسیں ڈال کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

مجھے اچھا تو بڑا لگا کیونکہ اس سے پہلے ہم بر سر عام اس طرح کبھی نہ بیٹھے تھے۔

لیکن اس کی بالوں میں الوداعیت کا جو پیغام جھلک رہا تھا، اس نے مجھے بے تاب کر دیا۔ میں نے کھا۔ ”میدم، اٹھو۔ ہمارے ارد گرد جو بے شمار بچے کھیل کو رہے ہیں،“

وہ کیا سمجھیں گے کہ یہ بڑھا بڑھی کس طرح کی عاشقی میں بتلا ہو رہے ہیں۔“

وہ چک کر اٹھ بیٹھی اور حسب دستور مسکرا کر بولی۔ ”یہ لوگ یہ سمجھیں گے نا کہ کوئی بوالہوں بوڑھا کسی چھوکری کو پھانس لایا ہے۔ کبھی تم نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی

ہے۔“

”ہاں، روز ہی دیکھتا ہوں۔“ میں نے کھا۔

اس نے میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے آخری بار کنگھی کی، اور بولی۔ ”تمہارے بال

کتنے سفید ہو رہے ہیں۔ میں نے اتنی بار کہا ہے کہ مینے میں کم از کم ایک بار کلر گلو کا شیپو کر لیا کرو۔ لیکن تم میری کوئی بات نہیں مانتے۔“

میں خاموش رہا۔

اس نے مجھے گدگدا کر ہنسایا اور کہنے لگی۔ ”تمہیں ایک مرے کی بات سناؤ۔“

”ضرور سناؤ۔“ میں نے کہا۔

وہ بڑے فخریہ انداز میں کہنے لگی۔ ”کوئی دو برس پہلے میں نیم انور بیگ کی بیگم اختر کے ساتھ آکسفورڈ اسٹریٹ میں شانگ کے لیے گئی تھی۔ وہاں اس کی ایک سیلی مل گئی۔ اس نے میرا تعارف یوں کرایا کہ یہ عفت شباب ہے۔ یہ سن کر اختر کی سیلی نے بے ساختہ کہا، ارے ہم نے تو سنا تھا کہ شباب صاحب کا صرف ایک بیٹا ہے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ان کی اتنی بڑی بیٹی بھی ہے۔ دیکھا پھر.....؟“

”ہاں ہاں بیگم صاحبہ، دیکھ لیا۔“ میں نے جھینپ کر کہا۔ ”پانچ بجتے کو ہیں۔ چلو، طارق کی سالگرد پر بھی تو جانا ہے۔“

یہ ہمارا آخری انٹرویو تھا۔ اٹھاہے سال کی ازدواجی زندگی میں ہم نے کبھی ایک دوسرے کے ساتھ بیک وقت اتنی ڈھیر ساری باتیں نہ کی تھیں۔ دوستوں، یاروں اور عزیزوں کے ساتھ بیٹھ کر ہم کئی کئی گھنٹے ہی ہی، ہا ہا کر لیتے تھے۔ لیکن اکیلے میں ہم نے اتنی دل جنم کے ساتھ اتنے موضوعات پر کبھی اتنی طویل گفتگو نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ جب میں نے سی ایس پی سے استغفاری دیا تو یوں ہی ایک فرض کے طور پر مناسب سمجھا کہ اپنی بیوی سے بھی مشورہ کر لوں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں ملازمت سے مستغفی ہونا چاہتا ہوں تو وہ ثاقب کے سکول جانے سے پہلے اس کے لیے آمیٹ بنا رہی تھی، آمیٹ بنانے کا چچہ ہاتھ سے چھوڑے بغیر اور میری طرف آنکھ اٹھائے بغیر وہ بولی۔

”اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو بسم اللہ۔ ضرور استغفار دے دو۔“

اس کی اس شان استغفا سے جل کر میں نے شکایت کے لجھے میں کہا۔ ”بیگم صاحبہ،

آپ کی رضامندی کے بغیر میں ایسا قدم کیسے اٹھا سکتا ہوں؟ اور ایک آپ ہیں کہ کوئی توجہ ہی نہیں دیتیں۔“

اس نے چچہ ہاتھ سے رکھ دیا اور میری طرف یوں پیار سے دیکھا جیسے پلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پھر بولی۔ ”اے یار، تجھے کیسے سمجھاؤں کہ جو تمدی مرضی وہ میری مرضی۔“ مجھے یہ زعم تھا کہ میں خود فنا کی تلاش میں ہوں۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ عفت پلے ہی اس مقام سے گزر چکی ہے۔ جب وہ تابوت میں لیٹی پڑی تھی تو میں نے چپکے سے اس کے سر پر آخری بار ہاتھ پھیر کر پیار کیا۔ میرے اندر کے توهات نے میرے سینے میں عجیب و غریب امیدوں کی موم بتیاں سجا رکھی تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی معجزے کی ایک بھی موم تھی روشن نہ ہوئی۔ وہ مر گئی تھی۔ ہم نے اسے قبرستان میں لے جا کر دفا دیا۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

یوں تو آپس کی روٹھ رانٹھ، چھوٹی مولیٰ ناراضگیاں اور باہمی شکر رنجیاں ہمارے درمیان درجنوں بار ویسے ہی ہوئیں جیسے ہر میاں یوں کے درمیان ہونا چاہیں۔ لیکن ہماری اصلی بڑی لڑائی صرف ایک بار ہوئی۔ اسلام آباد میں میں نے اپنے ڈرائیکٹ روم کے لیے قالین خریدتا تھا۔ میں نے بڑے شوق سے ایک قالین پسند کیا۔ جس کی نیمن سفید اور درمیان میں رنگیں پھول تھے۔ عفت نے اسے فوراً یہاں مسترد کر دیا جس طرح وہ چلا کے سبزی فروش کو والٹے ہاتھوں باسی پالک، مولیٰ، گاجر اور گوبھی کے پھول لوٹا رہی ہو۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ گھر آ کر میں نے سارا دن اس سے کوئی بات نہ کی۔ رات کو وہ میرے پہلو میں آ کر لیٹ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ میرے گالوں پر رکھ کر کہنے لگی۔ ”دیکھے تیرا منہ پلے ہی بڑا گول ہے۔ جب تو ناراض ہوتا ہے تو یہ اور بھی گول مثل ہو جاتا ہے۔ آج بھلا تو اتنا ناراض کیوں ہے؟“ میں نے قالین کی بات اٹھائی۔

”قالین تو نہایت عمدہ ہے۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن ہمارے کام کا نہیں۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”دراصل بات یہ ہے۔“ وہ بولی۔ ”جن لوگوں کے لئے یہ قالین بنا ہے ان میں سے کوئی بھی ہمارے ہاں نہیں آتا۔“

URDU4U.COM  
”کیا مطلب؟“ میں نے تجھی سے دریافت کیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور سکول کی استانی کی طرح بڑی وضاحت سے گن گن کر سمجھانے لگی کہ ہمارے ہاں اب انشاء آتا ہے، وہ پھکڑا مار کر فرش پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک طرف مالک، دوسری طرف موگ پھلی، سامنے گندیوں کا ڈھیر۔ جمیل الدین عالی آتا ہے، آتے ہی فرش پر لیٹ جاتا ہے اور سگریٹ پر سگریٹ پی کر ان کی راکھ ایش رے میں نہیں بلکہ اپنے ارد گرد قالین پر بکھیرتا ہے۔ ممتاز مفتی ایک ہاتھ میں کھلے پان اور دوسرے ہاتھ میں زردے کی پڑیا لئے آتا ہے۔ اشفاق احمد قالین پر اخبار بچا کر اس پر تربوز چیرنا پھاڑنا شروع کر دیتا ہے۔ ملکان سے ایثار راعی آم اور خربوزے لے کر آئے گا۔ ڈھاکہ سے جیم الدین کیلے اور رس گلوں کی پیکتی ہوئی نوکری لائے گا۔

وہ یہ سب تجھے لا کر بڑے تپاک سے قالین پر سجا دیتے ہیں۔ سال میں کئی بار سید ممتاز حسین شاہ بی اے سانچھ سال کی عمر میں ایم اے الگش کی تیاری کرنے آتا ہے اور قالین پر فاؤنٹین پن چھڑک چھڑک کر اپنی پڑھائی کرتا ہے۔ صرف ایک راجہ شفیع ہے، جب کبھی وہ لمکنی کی روٹی، سرسوں کا ساگ اور تانہ مکھن اپنے گاؤں سے لے کر آتا ہے تو آتے ہی انہیں قالین پر نہیں انڈیلتا بلکہ بڑے قرینے سے باورچی خانے میں جا کر رکھ دیتا ہے کیونکہ وہ نہ شاعر ہے نہ ادیب۔ فقط ہمارے دوستوں کا دوست ہے۔ بات بالکل حق تھی۔ چنانچہ ہم نے ایک نہایت میل خورده قالین خرید کر آپس میں صلح کر لی۔

عفت کو میرے دوستوں کے ساتھ بڑا انس تھا۔ وہ ادیب پرست بھی تھی اور ادب شناس بھی۔ ”شاہنامہ اسلام“ کے سینکڑوں اشعار اسے زیانی یاد تھے۔ حفظ جالندھری کا وہ اپنے

باپ کی طرح ادب کرتی تھی۔ جوش صاحب کی ”یادوں کی بارات“ کی بھی مداح تھی۔ ایک روز میں نے کہا۔ ”میں جوش صاحب کی طرف جا رہا تھا۔ آؤ تم بھی ان سے مل لو۔“

”تم جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میرے لیے جوش صاحب کے دور کے ڈھول ہی سانے ہیں۔“

بھی خاں کے زمانے میں جب ہم انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں خاموشی سے اپنے دن گزار رہے تھے تو فیض احمد فیض لندن آئے۔ وہاں سے انہوں نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ میں کل تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ دوپہر کا کھانا تمہارے ہاں کھاؤں گا۔ عفت نے بڑا اچھا کھانا کھایا۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ شدید برف باری ہو رہی تھی۔ لندن سے ہمارے ہاں آنے کے لیے ایک گھنٹہ ریل کا سفر کا تھا۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ بس کا سفر، اور پھر کوئی پندرہ منٹ پیدل۔ ڈھائی، تین بجے جب فیض صاحب گھنٹے گھنٹے برف میں دھستے دھستاتے افلان و خیزان ہمارے ہاں پہنچے تو عفت کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ کھانا گرم کرتے ہوئے اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور بڑی عقیدت سے کھنے لگی۔

”ہم کتنے خوش نصیب ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے دور کا اتنا بڑا شاعر ایسے خراب موسم میں اتنی دور تم سے ملنے آیا ہے۔“

”یہ فیض صاحب کی مروت ہے۔“ میں نے کہا۔

”مروت نہیں۔“ اس نے مجھے ٹوکا۔ ”یہ ان کی عظمت اور سخاوت ہے۔“

ہمارے اچھے سے اچھے دنوں میں اس کا ایک مرغوب مصرع یہ تھا۔

ہبیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اس پر اس نے غالباً اپنی طرف سے دوسرا مصرع یہ گانٹھ رکھا تھا۔

نہ نہیں ہو نہ زماں ہو آسمان کوئی نہ ہو

بیماری کے دنوں میں وہ بار بار پڑھا کرتی۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی  
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

URDU4U.COM

اپنی تین سال کی بے وطنی کے زمانے میں ہمیں اکثر اوقات مالی تنگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دفعہ جب ہم تیری چوتھی بار نقل مکانی پر مجبور ہو گے تو اس نے بڑی محنت سے ہمارا سامان باندھا۔ اس کی تھکن اس کے بند بند سے یوں نیک رہی تھی جیسے شدید بارش کے بعد نوٹی ہوئی چھت پکنے لگتی ہے۔

میں نے اس کے پاؤں دبا کر کہا۔ ”عفت میری وجہ سے تمہیں کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔“

مال جی کی طرح وہ کبھی کبھی بہت لاؤ میں آ کر مجھے ”کوکا“ کما کرتی تھی۔ بولی ”اے کوکے میں تو تیرے ساتھ بہت خوش ہوں لیکن بے چارے ٹاقب پر ترس آتا ہے اس نسخی سے عمر میں یہ اس کا آٹھواں سکول ہے۔“

”ٹاقب کی بات چھوڑو۔“ میں نے کہا۔ ”آخر ہمارا بیٹا ہے۔ ہر نئے سکول میں جا کر آسانی سے فٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن تجھے اتنا تھکا مانہ دیکھ کر مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟“

”ہاں، ٹھیک ہی ہوں۔“ اس نے اپنا سر میرے شانوں پر ٹیک کر کہا۔ مجھے اس کے بند بند سے غالب کا یہ شعر آہ و زاری کرتا ہوا سنائی دے رہا تھا۔

کیوں گروش عدام سے گھبرا نہ جائے دل  
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

میرا خیال ہے کہ اسی زمانے میں در بدتری کی محنت و مشقت نے اسے وہ روگ لگا دیا

جس نے انعام کار اسے کنٹربری کے گورستان میں جا بسایا۔ یہ خیال اب ہر وقت احساس جرم کا تازیانہ بن کر میرے ضمیر پر بڑے بے رحم کوڑے مارتا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ ایک فقیر حقیر، بندہ پر تفہیر، اسیر نفس شریر کر بھی سکتا ہے۔

جی چاہتا ہے خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم  
تو نے وہ سخن ہائے گراں مایہ کیا کئے؟

# • نیا گھر

ایک نیا گھر با لیا تو نے  
URDU4U.COM  
 ہم سے دامن چھرا لیا تو نے

دل کی دنیا میں حور ہے نہ قصور  
 دعویٰ بے رنگ، دار بے منصور  
 خالی خالی سی رات کی بانسیں  
 شیشہ بے آب، چاندنی بے نور

جانے کیا کیا چرا لیا تو نے  
 ایک نیا گھر با لیا تو نے

چھا گئے ظلمتوں کے لات و منات  
 کیا ہوئی کائنات ذات و صفات  
 بے عصا طور پر کھڑا ہے کلیم  
 نہ جتو نہ تجی نہ آرزو نہ بات

کچھ تو ہے جو اڑا لیا تو نے  
 ایک نیا گھر با لیا تو نے

تائناہ تائناہ سی تیرگی کا سماں  
 میٹھی میٹھی سی آگ ہلکا دھواں  
 موتیوں کی لڑی میں تھائی  
 سنگریزوں میں گمشدہ سا نشاں

ڈھونڈھا میں نے تھا پا لیا تو نے  
 ایک نیا گھر با لیا تو نے

موج در موج خاک کا انبار  
 سور و ملخ و ملائکہ کی قطار  
 ایک تابوت نقد جاں کے عوض  
 ڈولی دلمن کے ساتھ چار کمار

راز جینے کا پا لیا تو نے  
 ایک نیا گھر با لیا تو نے

کیا وہاں بھی فساد اٹھتے ہیں  
 آگ لگتی ہے سانس گھختے ہیں  
 کیا وہاں بھی برات آئی تھی  
 کیا وہاں بھی ساگ لٹتے ہیں

جانے کیا کیا پتہ لیا تو نے  
ایک نیا گھر با لیا تو نے

خیر تیری، ترے مکال کی خیر  
تمت آرزوئے جاں کی خیر  
ہم تو پھر بھی زیاد رکھتے ہیں  
یا خدا میرے بے زیاد کی خیر

اک نیا گھر با لیا تو نے  
ایک نیا گھر با لیا تو نے

○○○

## • موسم موسم گا راگ

جاڑا آیا جاڑا آیا موںگ پھلی چلغوڑے لایا  
 ہم تم مل بیٹھیں تو گوا کشمش اور بادام  
 گری کا موسم جو آیا باہر محنت اور پیشہ  
 اندر سردے گرے پیچی ٹھنڈی میٹھے آم

برکھا رت کی بات نہ کرنا برکھا رت تو بیت گئی  
 تیری آنکھیں سوکھے ساگر میری آنکھوں میں طوفان  
 موسم گل کی رعنائیوں کو ڈھل جانے کا خوف  
 پت جھڑ کی سوکھی شاخوں میں جینے کے ارمان

دنیا ایک تماشا لوگو تمbole کا کھیل  
 نہ تو ہارے نہ تو جیتے نہ تو پاس نہ فیل  
 آنے والے ایسے آئیں جیسے جھوٹے خواب  
 جانے والے ایسے جائیں جیسے خیر میل

دنیا بھر کی نیرنگی دیکھی جس کا عرض نہ طول  
 پھلوں کی پھلواری جس میں کانٹے اور بپول  
 شیروں جیسے غازی جن کے بازو بے ششیر

# کندن جیسی ناریں جن پر کچڑ کنکر دھول

URDU4U.COM

پھر بھی بار بار وہ پوچھے کیا نعمت جھلائے؟  
میں بولوں کافر کھلاوں، کون کے سمجھائے؟

○○○

## • ایک دن

ایک دن میں نے سوچا چلو جی تو لیں میں نے  
جی بھر کے اذن طرب دے یا  
جام و مینا لیے ساقیوں کے پرے رقص  
و نغہ کا جادو جگانے لگے  
ایک دن کعبہ و سونات و کلیسا و آتش  
کدے جوں کے توں ہ گئے  
صبر و ایماں کے فانوس گل ہو گئے،  
آگی کے قدم ڈمگانے لگے  
ایک دن ڈھل گیا، شام ڈنے گی، رات کا  
ناگ پرے پ پھر آگیا  
چاند کی جھیل میں یاد کے پاساں کرچشم اطریاں  
کے موئی چرانے لگے  
ایک دن ایسا ایسا جو آتا رہے گا، تیری عادتوں  
سے سوا بھی نہیں  
مری بندگی کا تقاضا یہی ہے میں کس منہ سے  
کہہ دوں خدا بھی نہیں

URDU4U.COM

## ○ ڈاکٹر عفت شبے

کرچم اطریاں

## ○ ڈاکٹر عفت شبے

میں عفت سے کبھی نہیں ملا۔

حالانکہ ان کے دو سگے بھائیوں حامد اور محمود سے میری بیس سال کی یادِ اللہ ہے۔ میں قدرتِ اللہ شب سے بھی کبھی نہیں ملا، صرف دور سے ہسپتال کے کمرے میں دیکھا تھا۔ جب عفت پیار تھیں اور ان سے کسی کو ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ حامد کی بیوی بھائی سعیدہ نے فون کیا تھا اور میں اور نفیسه صرف رسم پوری کرنے کو گئے تھے۔ کیونکہ مزاج پرسی تو صرف دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔ کچھ روز پہلے میں لاہور گیا تھا۔ سعیدہ بھائی سیالکوٹ سے آئی تھیں۔ کہنے لگیں۔ ”سیارہ ڈائجسٹ“ میں شب نامہ میں عفت کی موت کا ذکر ہے۔ میں پڑھتی جاتی تھی اور روتنی جاتی تھی۔“

میں اس روز سرگودھا دورے پر جا رہا تھا۔ راستہ بھر اس کا خیال رہا کہ قدرتِ اللہ شب نے ایسی کیا چیز لکھی ہے کہ انسان روتا رہا۔ سرگودھا کے ائمہ فورس میں میں جا کر ٹھہرا اور یہ بھی عجیب بات ہے، قدرتِ اللہ شب کا ”ماں جی“ جب پڑھا تھا تو فوراً وضو کر کے ماں جی کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچایا تھا اور ”شب نامہ“ پڑھ کر بھی میں نے یہی کہا۔ عفت کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچایا۔ شب کی تحریک اور میرے اس جذبہ میں کیا تعلق ہے، میں نہیں جانتا نہ بیان کر سکتا ہوں، میں رو نہیں سکتا، کیونکہ دو جنگوں میں میں نے موت بڑے قریب اور بڑے عزیزوں کی دیکھی ہیں۔ باقی اندر سے دل کی وہ کیفیت تھی جب انسان اپنے آپ کو موت کے قریب پاتا ہے۔ شاید یہی جذبہ ہر انسان کو اپنے معبود کی طرف کھینچتا ہے۔

کنٹربری میں نے آج سے ۲۲ سال پہلے دیکھا تھا، بہت خوبصورت جگہ تھی۔ میں خیالوں ہی میں اس قبرستان کا چکر لگانے لگا جہاں عفت دفن ہیں۔ یہ قبرستان بہت دلفریب اور پر سکون جگہ پر ہے۔

عفت نے کیا خوب اپنے لیے مستقل مقام چنا۔ یہ وہ قبرستان ہے جہاں آج سے ۲۲ سال پہلے میں نے اپنے ایک انگریز دوست کو دفن کیا تھا۔ جب میں انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، لیکن انگلستان کی شرہ آفاق دھند چھائی تھی،

جب ہم لوگ اس نوجوان کے جنازے کو لے کر کنٹربری کے اس قبرستان میں پہنچے تھے۔ جوانی میں اپنے دوستوں کی موت کا غم دیسے ہی بڑا گمرا اور اثر پذیر ہوتا ہے۔ اپنے دوست کے تابوت کو قبر کی گرایوں میں جاتے دیکھ کر میں نے اپنی روح کی گرایوں سے اس کے لیے دعائے مغفرت کی تھی اور اس کیفیت سے میں ہفتون نڈھال رہا تھا۔

عفت کی موت نے بھی مجھ پر وہی اثر کیا۔ میں نے روح کی گرایوں سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ تصور میں میں نے عفت کے جنازے میں شرکت کی۔ ان کے تابوت کو قبر میں جاتے ہوئے دیکھا۔ قدرت اللہ شباب کے دھنڈلائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ اس پنجے کا تصور کیا جو بن ماں کے ہو گیا۔ اور پھر خیالات بھکلتے ہوئے ہوئے نہ جانے عفت کی والدہ تک جا پہنچے، جنوں نے اپنے بڑے بیٹے کی اچانک موت کا غم دیکھا تھا جو فوج کا کرغل تھا اور ایک صبح ہنسنے ہوئے دفتر گیا اور پھر زندہ واپس نہ آیا اور اب بیٹی کا غم دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ یہ گھرانہ اتنا خدا ترس، اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے والا اور ایسی روزمرہ کی زندگی گزارنے والا ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تانہ ہو جاتی ہے اور عفت کی والدہ اس گھرانے کی وہ نیک بخت بی بی ہیں جنوں نے جوان بیٹے کی موت پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اور مرضی مولا کہہ کر چپ ہو رہیں۔

حامد میرا دوست، عفت کا بھائی سیالکوٹ کے ہر فلاجی ادارے کا سرگرم رکن ہے۔ اس نے اپنی ذاتی کوششوں سے ایک ایسی سوسائٹی علامہ اقبال کے نام سے قائم کی ہے، جس کے ذریعے سینکڑوں مستحق طلباء کو وظیفہ ملتا ہے اور اس سوسائٹی کے کئی وظیفہ پانے والے طالب علم ماشاء اللہ اب ڈاکٹر اور انجینئر ہیں۔

یہ میرے ذاتی مشاہدہ کی بات ہے کہ حامد نے اپنے ہر اس دوست سے جو ذرا سا بھی خوشحال ہے اس سوسائٹی کے ممبر ہونے کی درخواست کی ہے اور خدا کی قسم وہ اس کام کو اس محنت اور گلن سے کرتا ہے کہ بعض اوقات میں اپنی کم مائیگی پر آنسو بھائے

بغیر نہیں نہ سکتا۔ حق ہے دنیا ایسے ہی لوگوں کے دم سے قائم ہے۔

سعیدہ بھالی نے نہ جانے کتنی بیتیم اور بے سارا لڑکیوں کی شادیاں کرائی ہیں اور کتنے اجڑے گھرانوں کو بسوایا ہے اور یہ کام یہ دونوں میاں بیوی اس خاموشی سے کرتے ہیں کہ کسی کو کافنوں کاں خبر نہیں ہوتی۔ حمد، رشید اور سعیدہ بھالی پچھلے ۲۷ سال سے سیالکوٹ میں مقیم ہیں اور وہاں کا بچہ بچہ ان کو عزت و احترام سے دیکھتا ہے۔ ان کی خاموش روی کو دیکھتے ہوئے میں مزید اس میں کچھ اضافہ نہ کروں گا۔ قدرت اللہ شب  
کو ایک انسان اور ایک دوست کی حیثیت سے جانے کی حرمت ہی رہی لیکن اگر ممتاز  
مفتی پے ہیں تو شباب اپنے اندر ایک درویش صفت انسان کو چھپائے ہوئے ہیں جو خدا  
کے بہت قریب ہیں۔

خدا کے اتنے اچھے بندوں سے تعلق خاطر رکھتے ہوئے بھی عفت اتنی جلدی کیوں مر  
گئیں؟

میرے مولی! کیا تو صرف اپنے نیک بندوں ہی کا احساب کرتا ہے یا یہی تیری مشیت  
ہے!

(ب) شکریہ "سیارہ ڈا جسٹ" فروری ۱۹۷۵ء)

## • پاکستان کا مستقبل

وطن عزیز میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں وقت فوقة شکوک و شبہات میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بہت کم عوام اور بہت زیادہ خواص کی تعداد ہوتی ہے۔ خواص میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کی ایک جیب میں پاکستانی پاسپورٹ اور دوسری جیب میں امریکن گرین کارڈ یا دیگر ممالک کے اقامت نامے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ان کے مال و متعہ کا بیشتر حصہ بھی بیرونی بیکنوں کی تجویاز گرماتا ہے اور پاکستان میں وہ صرف ایسے کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے پر قناعت کرتے ہیں جن پر زکوہ لٹنے کا خطرہ لاحق نہ ہو۔ اس کے علاوہ اکم نیکس، ویلٹہ نیکس اور زکوہ سے بچ بچ کر اور غالباً منشیات کے کاروبار سے ہاتھ رنگ کر بھی کالے دھن کے انبار ایسی مہارت سے جمع کرتے ہیں کہ انجام کار حکومت ہی ان کے سامنے گھٹنے نیک کر دھوپی گھاث کھول دیتی ہے جہاں پر سرکاری افسر عجیب و غریب قوانین کا صابن مل مل کر کالی پونچی کو سفید کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ دیانت اور امانت کے ساتھ ساتھ ایک بھونڈا مذاق ہے۔

بہت سے لوگوں کے نزدیک پاکستان کی سلامتی اور استحکام کا راز فقط اس بات میں مضر ہے کہ حالات کے ائمہ چڑھاؤ میں ان کے ذاتی اور سراسر انفرادی مفاد کا پیکانہ کس شرح سے گھٹتا یا بڑھتا ہے۔ ایسے لوگ قابل رحم ہیں۔ وہ بنیادی طور پر نہ تو وطن دشمن ہوتے ہیں اور نہ ہی ان پر غداری کا الزام لگانا چاہیے۔ مریضانہ ذہنیت کے یہ لوگ حررص و ہوس کی آگ میں سلگ سلگ کر اندر ہی اندر بزدلی کی راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ حادث دنیا کا ہلکا سا جھونکا اس راکھ کو اڑا کر تتر پر کر دیتا ہے۔ ان کا اپنا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ ان کا اصلی وطن محض ان کا اپنا نفس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو سر نہیں بھی ان کی خود غرضی، خود پسندی، خود فروشی اور منافقت کو راس آئے وہ وہیں کے

ہو رہتے ہیں۔ پاکستان میں اس طرح کے افراد کا ایک طبقہ موجود تو ضرور ہے لیکن خوش قسمتی سے ان کی تعداد محدود ہے۔

اس کے برعکس پاکستانیوں کا سواد اعظم حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی حب الوطنی پر بار بار انتہائی کڑی آنائش کے دور آتے رہے ہیں لیکن اب تک ان کے پائے ثبات میں کسی نمایاں لغزش کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے۔ البتہ ہمیں یہ ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے کہ بار بار کفران نعمت کا مرتكب ہونے سے اللہ کے عذاب کی گرفت بھی بڑی شدید ہوتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ قوم کی قوت برداشت کا ضرورت سے زیادہ امتحان لیا جا چکا ہے۔ اب اس کے پیمانہ صبر کو لبریز ہونے سے بچانا ہم سب کا اجتماعی اور انفرادی فرض ہے۔

ایک مختصر ساقہ چھوڑ کر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے لے کر بڑے طویل عرصہ تک ہماری فوجی اور سول دونوں طرح کی حکومتیں مارشل لاء کی چھتری تلے برضاء و رغبت نہیں خوشی حکمرانی کرتی رہی ہیں۔ اس عمل سے ہماری مسلح افواج پر کیا اچھے یا بے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ان کا تجزیہ کرنا فوجی ماہرین کا کام ہے۔

البتہ یہاں پر ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ ۱۹۶۹ء میں جب میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر تھا تو ایک صاحب سے میرے نہایت اچھے مراسم ہو گئے، جو مشرقی یورپ کے باشندے تھے۔ اور ان کا ملک اپنی مرضی کے خلاف روس کے حلقة اقتدار میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے وطن میں بعض کلیدی اسامیوں پر نہ چکے تھے اور روس کی پالیسیوں اور حکمت عملی سے بڑی حد تک واقف اور نالاں تھے۔

ایک روز باتوں میں انہوں نے کہا۔ ”اگرچہ روس اور امریکہ ایک دوسرے کے حریف ہیں لیکن بعض امور میں اپنے اپنے مفاد کی خاطر دونوں کی پالیسیاں اور منصوبے ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت اختیار کر لیتے ہیں۔“

”مشلا؟“ میں نے پوچھا۔

”مثلاً پاکستان“ وہ بولے۔

میری درخواست پر انہوں نے یہ وضاحت کی۔ ”یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ پاکستان کی مسلح افواج کا شمار دنیا بھر کی اعلیٰ افواج میں ہوتا ہے۔ یہ حقیقت نہ روس کو پسند ہے اور نہ امریکہ کو۔ روس کی نظر افغانستان کے علاوہ بحیرہ عرب کی جانب بھی ہے۔ اس کے علاوہ روس کو بھارت کی خوشنودی حاصل رکھنا بھی مرغوب خاطر ہے۔ ان تینوں مقاصد کے راستے جو چیز حاصل ہے۔ وہ پاکستان کی فوج ہے۔ امریکہ کا مقصد مختلف ہے۔ امریکہ کی اصلی اور بنیادی وفاداری اسرائیل کے ساتھ ہے۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ اگر کسی وقت اسلامی سطح پر جہاد کا فتویٰ جاری ہو گیا تو پاکستان ہی وہ ملک ہے جہاں کی مسلح افواج اور نہتی آبادی کسی مزید حکم کا انتظار کئے بغیر جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ایک دم بسوئے اسرائیل اٹھ کھڑی ہو گی۔ عالم اسلام میں اپنی تمام کامیاب ریشہ دوائیوں کے باوجود امریکہ یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ اس کے علاوہ روس کی مانند امریکہ بھی بھارت کی خیر سگالی اور خوشنودی حاصل کرنے اور بڑھانے کا آرزو مند ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج روس، امریکہ اور بھارت کی آنکھ میں برابر ٹھکلتی ہیں۔ اس لیے تمہاری فوج کو نکلا اور کمزور کرنا تینوں کا مشترکہ نصب العین ہے۔

”لیکن وہ اس مشترکہ نصب العین کو پورا کیسے کر سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ وہ نہ کر بولے۔ ”ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہر کوئی اپنا اپنا طریق کار و ضع کرنے میں آزاد ہے۔ بدی اور شر کو بروئے کار لانے کے لیے ہزاروں راستے کھل جاتے ہیں۔ تیری دنیا کے چھوٹے ممالک میں ایک طریقہ جو نمایاں کامیابی سے آزمایا جا رہا ہے۔ یہ ہے کہ وہاں کی مسلح افواج کو طویل سے طویل تر عرصہ کے لیے سول حکومت کے امور میں الجھائے رکھا جائے۔“

یہ گفتگو اس زمانے میں ہوئی جبکہ روس نے ابھی افغانستان پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی مشرقی پاکستان میں بغلہ دیش کی تحریک نے شدت اختیار کی تھی۔ اس کے بعد آج تک ۷۱ میں سے ۳۲ برس ہمارا وطن مارشل لا کے تحت رہا ہے۔ خدا نہ کرے یہ

صورت حال روس اور امریکہ اور اسرائیل کی ملی خواہش پورا کرنے کے لیے نہیں ہمار کرنے کا کام دے۔

سول حکومت کی مشینری کے بارے میں میرا تجربہ اور اندازہ یہ ہے کہ اس کی بہت سی اہم چولیں بتدریج پڑتی جا رہی ہیں۔ اوپر سے نئی تک خود حفاظتی کی آڑ میں احساس ذمہ داری سے جان بچا کر ٹال مثول کرنا عام ہو گیا ہے۔ ہر سطح پر قوت فیصلہ کمزور پڑ گئی ہے۔ رشوت کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور اس کا دائرہ عمل بھی افقہ اور عموداً دونوں جانب بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ ان رذائل کا گندہ مواد طرح طرح کے ناسور بن کر معاشرے کے بیشتر شعبوں میں پھوٹ رہا ہے۔

اس کا واحد علاج یہ ہے کہ مارشل لاء خنہ پیشانی ہیشہ کے لیے اپنے غروب آفتاب کا رخصتی کا بگل بجا کر بیرکوں میں واپس چلا جائے۔ ملک بھر میں بغیر کسی رکاوٹ کے سیاسی عمل از سر نو جاری ہو۔ ہر چوتھے یا پانچویں سال ہر سیاسی جماعت کے اپنے انتخاب لازمی ہوں۔ تاکہ جماعتی سطح پر قیادت کی چھان پٹک ہوتی رہے۔ اور ان میں تانہ خون بھی باقاعدگی سے شامل ہوتا رہے۔ اس کے ساتھ اگر اگلے پنڈہ برس میں مرکزی اور صوبائی اسمبیلوں کے بھی چار پانچ منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات ہوتے رہے تو ۲۰۰۰ء میں انشاء اللہ ہمارے جمہوری نظام کا بھی ویسا ہی چرچا ہو سکتا ہے جس طرح کہ آج کل ہماری سکوائش، ہاکی اور کرکٹ کا ڈنکہ چار دنگ عالم میں نج رہا ہے۔  
علامہ اقبال نے خبردار کیا تھا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو  
تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

ہندوستان تو کسی حد تک سمجھ گیا ہے۔ اس لیے سنبھل بھی گیا ہے اور اس کی داستان ہر جگہ بڑی آب و تاب سے جاری و ساری ہے۔ اب اپنے پاکستان میں ہمارے سمجھنے

کی باری ہے۔

قومی سطح پر ہماری سیاسی قیادت کا ایک بڑا حصہ اپنی طبعی یا ہنگامی زندگی گزار کر ہمارے درمیان سے اٹھ چکا ہے، یا جمود کا شکار ہو کر غیر فعال ہو چکا ہے۔ کچھ سیاسی پارٹیوں کے رہنماء پیر تسمہ پا کی طرح اپنی اپنی جماعتوں کی گردن پر زردستی چڑھے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے چند ایک نے کھلم کھلا یا درپرده مارشل لاء کی آسیجن سے سانس لے کر سک سک کر زندگی گزاری ہے۔ ان نیم جان سیاسی ڈھانچوں میں نہ تو کوئی تغیری سکت باقی ہے اور نہ ہی ان کو عوام کا پورا اعتماد حاصل ہے۔ پرانی سیاست کی بساط الٹ چکی ہے۔ اب جب کبھی سیاست کا دور دوہرہ شروع ہو گا تو اس میں فقط ایسی نئی قیادت ابھرے گی جس کا دامن ماضی کی بہت سی آلاتشوں سے پاک ہو۔ خدا کرے یا دور جلد سے جلد آئے اور اسے پوری پوری ایمانداری، خلوص اور نیک نیتی سے فروغ دیا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا یا اس سے رکاوٹیں پڑتی رہیں تو پھر کیا ہو گا؟ اس کے تصور ہی سے دل لرز اٹھتا ہے۔ اس کے بارے میں نوشته دیوار جلی حروف میں ہمارے سامنے موجود ہے جسے پڑھنے کے لیے کسی خاص عینک لگانے کی ضرورت نہیں۔

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے  
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

کچھ عرصہ سے یہ فیشن بھی عام ہو رہا ہے کہ سول اور فوجی اعلیٰ افسر اپنی اپنی ملازمتیں پوری کرنے کے بعد خاصی تعداد میں بعض سیاسی جماعتوں میں نمایاں مقامات حاصل کر رہے ہیں۔ یہ سیاست اور جماعتوں دونوں کی بد قسمتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں کو اپنا اپنا الگ چلن اور رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ اس میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد انسان کی سوچ، وضع قطع، اخلاق و آداب، رکھاوا، طور طریقہ اور انداز زندگی ایک ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ سانچہ ان ضروریات سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو ایک کامیاب

سیاستدان بننے کے لیے لازمی ہیں۔ ایسے سابق اعلیٰ افسر چلے ہوئے کارتوس ہوتے ہیں ان میں سیاسی بارود بھر کر دویاہ چلانے کی کوشش کرنا عملًا بیکار، بے حاصل اور بے اثر ہے جو سیاسی جماعتیں ایسی بیساکھیوں کا سارا لے کر زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ عوام میں ان کی مقبولیت کی رفتار بھی بڑی حد تک لوٹی لٹکڑی رہنے کا امکان ہے۔ اسی طرح جو افسران کرام ساری عمر سرکاری ملازمتوں کی کریاں گرمانے کے بعد پیش خوار بن کر سیاست میں کوڈ پڑتے ہیں تاکہ وہ اقتدار کی ان سیڑھیوں پر چڑھ بیٹھیں جن کے ماتحت وہ عمر بھر کام کرتے رہے ہیں۔ تو سیاست کو داغدار کرنے کے علاوہ وہ خود بھی جنت الحمقاء میں رہتے ہیں۔ سیاست کا ایک ہمہ وقتی اور محترم پیشہ ہے۔ یہ بھروسیوں کا بازیچہ اطفال ہیں جہاں پر رٹائرڈ سول اور فوجی افسر اپنے والوں کو خضاب لگا کر اور پلپے مسوڑھوں پر نئی بتیسیاں چڑھا کر قوم کو الوبانے میں کامیاب ہو سکیں۔

اسی طرح غیر مخلص اور سخن ساز نفرے بھی سیاست کے وجود کو کھلکھلا کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل چند سیاسی جماعتوں نے مل کر اپنی ایک مخالف جماعت کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ سیاسی اصولوں کے مطابق یہ ایک جائز اور روایتی عمل تھا۔ لیکن جب ان جماعتوں کے گھٹ جوڑ سے ”نظام مصطفیٰ“ کا نفرہ بلند ہوا تو اس ایجی ٹیشن کا رنگ بدل گیا۔ نظام مصطفیٰ کا نفرہ لگانے والوں پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ مقدس نفرہ منہ سے نکالنے سے پیشتر ان سب کو اپنے اپنے گریبان میں جھائک کر اپنی ذاتی طرز معاشرت، رہن سن، حقوق اللہ اور حقوق العباد پر کس حد تک پورا اترتا ہے۔ اس خود احتسابی کے بغیر محض ایک سیاسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایسا محترم نفرہ بلند کرنا اس کی بے حرمتی ہے۔ چنانچہ جونہی مخالف حکومت کا تختہ الٹا، اسی وقت تحریک میں شامل جماعتوں کا اتحاد تاریخی کی طرح ثوث گیا۔ اور نظام مصطفیٰ کا نفرہ بھی طاق نیاں کی نہست بن گیا۔ نظام مصطفیٰ کے حوالے سے اس تحریک کو چلانے کے لیے عوام اور خواص نے دل کھول کر چندہ بھی دیا تھا۔ اس فنڈ کی بد نظری اور بد انتظامی کے بارے میں کافی عرصہ تک اخبارات میں ایسی خبریں آتی رہیں جنہیں

پڑھ کر ایک عام مسلمان کا سر شرم سے جھک جاتا تھا۔ کسی سیاسی جماعت کے منشور میں دین کو بنیاد بناتا یا سرفہرست رکھنا ایک قابل فہم بات ہے۔ لیکن دین کی آڑ لے کر وقق طور پر سیاسی مقاصد حاصل کرنا دین کی تفحیک اور بے حرمتی ہے۔ ہماری سیاست کے جو عناصر اس مذاقت کے مرتكب ہوتے رہیں گے۔ وہ بیشہ منہ کی کھائیں گے اور اقتدار کی ہوس ان کے سینوں میں بیشہ ناکامی کی راکھ میں دب کر سلگتی رہے گی۔

سیاست کی اساس یا دین ہوتی ہے یا دنیا، یا دونوں کا حسن امتراج۔ اگر ہم اپنی سیاست میں دین اور دنیا کے حسین امتراج کو کسی حد تک نبھانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ ہماری عین خوش نصیبی ہے۔

سیاست کی خود کفالت اس کی پا کیزگی اور تو ادائی کی کلید ہے۔ جو سیاسی عناصر دوسرے ممالک کی بخشی ہوئی بیساکھیوں کا سارا لینے پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کی آزادی اور نمائندگی کی الہیت نہیں رکھتے بلکہ اتنا غلامی کا نفع بونے کے مجرم ہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ رسم بھی چل نکلی ہے کہ کچھ صاحبان اقتدار اور سیاسی رہنماء ایک نہ ایک پر پاور سے اپنے حق میں سریشیکیٹ حاصل کرنا ضروری تصور کرتے ہیں۔ اگر وفاق میں صوبائی اختیارات نیک نیتی، دیانتداری، خلوص، باہمی افہام و تفہیم اور حقیقت شناسی سے متعین کر کے اس پر سچائی سے عمل درآمد نہ کیا جائے۔ تو فیڈریشن کا وجود کھوکھلا ہو کر کتفیڈریشن کے نعرے میں ڈھل جاتا ہے۔ سیاست اور لظم و نقش میں اس زہر کا فوری طور پر حسن تدریس کام لے کر تریاق فراہم نہ کیا جائے۔ تو رفتہ رفتہ کتفیڈریشن کا تصور بھی انتشار کے صحراء میں پھیل کر باد سوم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس زہر کا تریاق سیاسی عمل کی آزادی سے ظہور میں آتا ہے فوجی دباؤ کی گھنٹن سے نہیں۔

ایئمی تو ادائی کا حصول ہر آزاد ملک کا حق ہے۔ اس پر چند مختلف ممالک کی اجائیہ داری ایک نئی شہنشاہیت اور سامراجیت کی بالا دستی کے نظام کو جنم دیتی ہے۔ بجلی، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلیویژن، ہوائی جماز وغیرہ کی ایجادات فروغ علم کا نتیجہ ہیں۔ علم نہ دبائے دتا

ہے، نہ چھپائے چھپتا ہے۔ ایسی تو انائی کا علم بھی دوسرے علوم کی طرح رفتہ رفتہ عام ہو رہا ہے۔ نیو کلیئر نیکنالوجی کے حصول اور استعمال کا انحصار وسائل کی دستیابی پر ہے۔ وسائل کی کمیابی سے تاخیر تو ممکن ہے۔ لیکن مدیر کی کامیابی سے ہمیشہ کے لیے فرار ناممکن ہے۔ پاکستان میں ایسی سائنس کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا ہماری ہر حکومت کا فرض ہے۔ اس میں معدودت خواہی سے کام لینا ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ روس، امریکہ، اسرائیل اور بھارت ہمارے ایسی مراکز کو تباہ کرنے میں یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارا اصلی دفاع یہ ہے کہ ہم نیوکلیئر السلح جات سے پوری طرح لیس ہوں۔ ”اسلامی بم“ کے طعنوں اور دھمکیوں میں آ کر گھٹنے ٹیک دینا ایک مجرمانہ لغوش ہو گی۔ جو ممالک ”اسلامی بم“ پر قدغن لگانے میں پیش پیش ہیں۔ ان سے بعید نہیں کہ وہ کسی وقت اسلامی اعمال کو بھی منوع قرار دینے کا نادر شاہی حکم صادر فرمادیں۔ ایسے عناصر کو پائے حقارت سے ٹھکرانے میں ہی ہماری خود اعتمادی اور عزت نفس کی بقا ہے۔

دنیا بھر میں جنگ کی بنیاد انفرادی یا محدود قبائلی سطح پر زر، زن اور نین کی حرص میں شروع ہوئی تھی۔ پھر اس نے سامراجیت (Colonialism) کا رنگ چڑھا کر زبردست کی حکمرانی کی اور زبردست کی غلامی کا وظیرہ اختیار کر لیا۔ اس کا بنیادی مقصد ملک گیری کی ہوں تھا۔ اگلی منزل میں سیاسی نظام، معاشی نظریات اور سماجی اقدار میں اختلافات اور تصادم نے بڑے پیانے پر عالمگیر جنگوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اب رفتہ رفتہ ہوا کا رخ مزید بدل رہا ہے۔ حالیہ آثار گواہی دیتے ہیں کہ جلد یا بدیر سب سے بڑی اور ممکن ہے کہ آخری جنگ دین کی اساس پر دو تمثیبوں اور تمثیلوں کے درمیان لڑی جائے۔ دنیا کے اسلام ایک طرف اور باقی تمام غیر مسلم عناصر باہم مل جل کر دوسری جانب اس امکان کو فراموش کریں یا اس سے نبرد آزما ہونے کی تیاری میں غفلت سے کام لینے میں عالم اسلام کو عموماً اور پاکستان کو خصوصاً سب سے بڑا اور ملک خطرہ ہے۔ اسرائیل کے خلاف ہماری پالیسی عربوں کو خیر سگالی حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ بلکہ

اسلام اور فقط اسلام کے ناطے سے ہے۔ یہود اور نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے اس پالیسی میں کسی قسم کی لپک یا کمزوری کو جگہ دینا لاریب اسلام کے ساتھ غداری کے مترادف ہے۔ ایسی حرکت بے برکتی کی آندھیوں کو دعوت دے کر وطن عزیز کے وجود کو طرح طرح کے خطرات میں بنتلا کر سکتی ہے۔ یہ محض سیاسی حماقت ہی نہیں بلکہ دینی جرم بھی ہے۔

اسی طرح بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے (Normalization of Relations) کی آڑ میں بیڈ کلف لائے کو مدھم ہونے سے بچانا ہر صورت میں لازمی ہے۔ ”بغل میں چھری اور منہ میں رام رام“ والا محاوہ ایک ابدی اور اٹھ حقیقت ہے۔ بھارت کے عزائم اور اعلانات میں ان کے ظاہر اور باطن کی تمیز کو چشم بصیرت، حسن تدریج اور شیوه دیوانگی سے پرکھنا ہمارا اولین فرض ہے۔ اگر یہ تمیز مصلحتوں یا غفلتوں کی نذر ہو گئی تو بربادی، تباہی اور فتا کا اندھا کنوں منہ چھائے سامنے کھدا پڑا ہے۔

افغانستان پر روس کا تسلط اسلام پر کھلا جملہ ہے۔ مشرق اور مغرب کے نام نہاد یکور اور آزادی پرست اقوام کے دل میں اسلام کے خلاف ہمدردی نہیں بلکہ بعض اور کینہ ہے۔ زبانی کلامی اعلانات اور ایک سپر پاور کے خلاف محدود مالی یا اسلحہ جاتی امداد محض نمائشی ڈھونگ ہے۔ اس بھرم کو قائم رکھنے کے لیے بہت سے ملک ہمارے ساتھ ہیں لیکن یہ قفسیہ ہمیں کوچکلتا ہے۔ رفتہ رفتہ روس کی افواج کسی نہ کسی حد تک واپس چلی جائیں تو چلی جائیں لیکن روی اثرات کے جراشیم آسانی سے جانے والے نہیں ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ جراشیم جڑ پکڑتے رہیں گے۔ اگر سنترل ایشیا کے پے ہوئے خوابیدہ مسلمان بیدار نہ ہوئے، تو ممکن ہے کہ افغانستان بھی انہی کا ہرگز ہو جائے۔ پاکستان میں اسلام کے فروع کا نصب الین فقط ہمارے مفاد ہی میں نہیں، بلکہ افغانستان اور سنترل ایشیا کے لیے بھی کام آ سکتا ہے لیکن Islamization کے پردے میں Cosmetic Islam کا ڈھونگ رچانا منافقت کی دھول اڑانے کے علاوہ کوئی مقصد پورا نہیں کر سکتا۔ ہمیں

اسلام کے بنیادی اور حقیقی اصول Funamentalism کو اپنانے کی ضرورت ہے۔  
اس کے بغیر امور ریاست میں اسلام کے نام پر سب کچھ بیکار بے بنیاد ہے۔

URDU4U.COM  
ہمیں حب الوطنی کا جذبہ نہیں بلکہ جنون درکار ہے۔ جذبہ تو محض ایک خطوط شدہ لاش کی مانند دل کے تابوت میں مخدوم ہے سکتا ہے۔ جنون جوش جہاد اور شوق شادت سے خون گرماتا ہے۔ اسی میں پاکستان کی سلامتی اور مستقبل کا راز پوشیدہ ہے۔

عطا اسلاف کا جذب دروں کر  
شریک زمرہ لا یحزنون کر  
خود کی گھنیاں سلجا چکائیں  
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر